صلی اللہ علیہ وسلم
رسول نمبر
نقوش

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسول نمبر

جلد اوّل

شمارہ نمبر ۱۳۰

دسمبر ۱۹۸۲ء

مُدیر:
محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

سیرت کا دورِ اوّل

[سیرت نگارانِ رسولؐ]

سیرتِ نبویؐ کی اوّلین کتابیں

[اور اُن کے مؤلفین]

(محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا)

ایک دن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری نظر تفسیر کے ایک ابتدائی صفحہ پر پڑی، لکھا تھا:

"حضرت شاہ صاحب (شاہ عبدالقادر) کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو انشاء اللہ ایسا نہیں کہ اہلِ علم و دیانت میں کوئی اس کا منکر ہو۔ ہاں احقر نے جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے، اس کی نسبت ضرور ہم کو غلجان ہے۔ اس لیے اہلِ علم و انصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو کر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابلِ اصلاح ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرمائیں اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرمائیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہلِ علم اور عوام دونوں کو مفید ہے ایک تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آ جائے۔ جس طرح ہو اور جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔"

جو خواہش مولانا محمود حسن صاحب کی تفسیر کے بارے میں تھی ویسی ہی خواہش میری اس نمبر کے بارے میں ہے۔ وہ عالم سہی، میں طالب علم سہی، وہ برگزیدہ سہی، میں گنہگار سہی، اس کے باوجود خواہش میری بھی وہی ہے کہ اس کام کو بھی بہتر سے بہتر بنایا جاتے۔ لہٰذا اس نیکی میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا، نئے مضامین لکھ کر بھی، موجودہ شماروں سے متعلق اپنی رائے سے نواز کر بھی۔ تاکہ آیندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کی جا سکے۔

مجھے اس نمبر کے سلسلے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، محمد اجمل اصلاحی، مولانا نعیم صدیقی، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا عبدالمتین ہاشمی، جناب رفیع اللہ شہاب اور جناب محمد عالم مختار حق کا بھی تعاون حاصل رہا۔ کسی نے مشوروں سے نوازا، کسی نے مواد کی فراہمی میں مدد دی۔ جس نے جس حد تک مدد کی خدا اُن کے اُتنے ہی درجات بلند کرے گا۔

—— اور مَیں تو شکر گزار ہُوں ہی! —— تہ دل سے شکر گزار!

[محمد طفیل]

طلوع

[یہ اداریہ میں نے زیارتِ روضۂ رسولؐ سے پہلے لکھا تھا]

میں ادبی گنہگار ہوں ۔ دربارِ رسولؐ تک کون سا جذبہ لے آیا ۔ یہ میں نہیں جانتا ۔ مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں !

مَیں نے آج تک جو کچھ بھی کیا اُس کی بھی توفیق نہ تھی ۔ اس لیے کہ اہلِ نظر نے جو کچھ دیکھا وُہ بھی میری سعی کا نہیں، "تائید کا نتیجہ ہے ۔

میرے حصہ میں کیا آیا ؟ حیرانی اور صرف حیرانی !

آج بھی میں جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہُوں ، یہ توفیق نہیں انعام ہے ۔کیونکہ مجھے اپنے گناہوں کا حال اوروں سے زیادہ معلوم ہے ۔

مُجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے ، وہ لے رہا ہے ۔کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں، اور کچھ بھی نہیں ہُوں !

میری گنہگاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ ۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرے اِس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے ؟

میں حاضر ہُوں یا رسولؐ اللہ !

میں حاضر ہُوں !

میں حاضر !

○

محمد طفیل

اس شمارے میں

مجھ سے ایک دن، رسولؐ نمبر کے خوشنویس نے کہا: میں نے اس نمبر کی کتابت ۱۹۷۲ء میں شروع کی تھی اور آج ۱۹۸۲ء ہے کہ سیرت نمبر ہی لکھ رہا ہوں۔

اس نمبر کی اشاعت، میرے لیے وُہ سعادت ہے کہ جس کی تڑپ ایک عرصہ سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اس نمبر کے لیے بڑی محنت کی اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دُعائیں مانگیں۔ جذبۂ اوّل کا ثمر محدود ہوسکتا ہے اور جذبۂ دوم کا ثمر لامحدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں کسی قابل ہُوا ہوں۔

"آج سے تقریباً ستر (۷۰) برس پہلے مولانا شبلی نعمانی کے دل میں سیرۃ النبیؐ لکھنے کا خیال آیا تو بقول سید سلیمان ندوی اُنھوں (مولانا شبلی) نے ۱۹۱۲ء میں اس بارِ امانت کو اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پچاس ہزار کے سرمایے کا قوم میں مرافعہ پیش کیا۔ سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لیے آگے بڑھے۔ اُن میں فقرائے اُمّت بھی تھے اور امرائے ملّت بھی۔ لیکن یہ سعادت اُخروی ازل ہی سے نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال کے لیے مقدر تھی۔ اس لیے وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانح نگارِ نبوّت کو دُوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا۔ فرمانروا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دئے ہیں، آیندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔"

یہ اور ایسے کام جو بڑے اہتمام اور سرمایہ سے شروع کیے جاتے ہیں، اُسے اس ہیچمدان نے اپنے جذبہ ہی کو ساری پُونجی سمجھ کر شروع کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کام کس پایہ کا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔ میں نے سیرت کے موضوع پر جتنے اچھے مقالے موجود تھے انھیں اکٹھا کیا ہے (کچھ دُوسری جلدوں میں آئیں گے) جن موضوعات پر کام کا مواد نہ ملا اُن پر نئے مقالے لکھوائے۔

سیرت کی دُوسری کتابوں سے، اس پہلی جلد میں قدرے مختلف اور اہم پہلو یہ نظر آئے گا کہ جہاں اور کتابوں میں سیرت نگارانِ رسولؐ کا ذکر ایک ایک دو دو صفحات میں ملے گا وہاں اس جلد میں خاصی تفصیل سے یعنی بیس بیس چالیس چالیس صفحات میں۔ اس طرح ہم نے تکنیک اور مصادر پر ۱۰۶ صفحات پیش کیے، جو ضروری تھا مگر ایسا ضروری کام پہلے ہوا نہ تھا۔

میں نے آج تک جتنے نمبر پیش کیے، وہ سب فخریہ انداز میں پیش کیے۔ مگر یہ نمبر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ معاملات دل کے ہیں! کبھی اُس طرح خوش، کبھی اِس طرح خوش!

[محمد نقوش]

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ

دیکھو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں

پندرھویں صدی ہجری ——— ماضی و حال کے آئینہ میں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس وقت دنیا میں پندرھویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے۔ عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے[1]، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے، لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا بلکہ پیغام پر رکھا ہے۔ اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرزِ عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا۔ یہی خصوصیت اس صدی کی ہے۔ اس صدی کا آغاز بھی کسی بڑی شخصیت، یہاں تک کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب و محترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے عقیدہ اور نظر میں سب سے محبوب و محترم شخصیت ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے اور نہ آپؐ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں، بلکہ آپؐ کے واقعۂ ہجرت سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہو گی تو ایک پیغام لے کر آئے گی، وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپؐ نے ایک عظیم مقصد کے لیے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہا، اور ایک نئے شہر میں بود و باش اختیار کی۔ یہ بات ایک پیغام اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے، آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اس کو ساری دنیا تک پہنچانے کا موقع مہیا کرنے کے لیے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے کہ کسی عظیم مقصد کے لیے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جا سکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جا سکتا ہے، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز

---

[1] مثلاً عیسوی تقویم (جنتری) جو ساری دنیا میں رائج ہے حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے۔ بکرمی جنتری کی جو ہندوستان میں رائج تھی نسبت بکرماجیت بادشاہ کی طرف ہے، ایران میں اور زردشتیوں کے یہاں یزدگرد ثالث کے دو سنہ مستعمل تھے، ایک اس کی تخت نشینی سے شروع ہوتا تھا دوسرا اس کی موت سے۔ گریگورین کیلنڈر پوپ گری گوری سیزدہم کی طرف منسوب ہے جو ۱۵۸۲ء سے (باستثنائے روس و یونان) تمام یورپ میں جاری ہے۔

خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اس کی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے، اور ارادہ میں عزم و پختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا، اور اس کی قسمت میں کامیابی و کامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اس لیے یہ پندرھویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لیے وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کے لیے حیاتِ نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرھویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہوگی، یا (خدانخواستہ) منحوس و نامبارک؛ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں، اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ؛

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (سورہ النجم۔ ۳۹) اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

انسان کو اپنی زندگی، اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے، جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اس کی سعی آئے گی اور سعی کے نتائج آئیں گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی۔ (سورہ النجم۔ ۴۰) اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں اور تاریخ کے تمام دوروں کے لیے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، اور اس کے اثرات و نتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔ (سورہ النجم۔ ۴۱) پھر اس کو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی اور بارآوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے، وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے۔ اقبالؔ نے انسان کے لیے کہا تھا ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا "خاکی" کی جگہ آپ "صدی" کہہ لیجئے، یہ پندرھویں صدی، اور وہ صدیاں جو گزر چکی ہیں، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں نہ منحوس، اس کے مبارک و منحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رُخ پر ہونے، اور صحیح طریقہ پر انجام پانے پر منحصر ہے، ہم کسی صدی کے متعلق، بلکہ کسی سال، کسی مہینہ، کسی دن، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہوگی یا منحوس؛ اسلام میں برکت و نحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں، جو بعض جاہل قوموں میں (جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے محروم رہی ہیں)

اب بھی پایا جاتا ہے، ہم یہ کہیں کہ آنے والی صدی بہت مبارک ہے اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہوگا، یا یہ صدی کسی ملت یا تقدیرِ انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہوگی۔ یہ بالکل اسلامی طرزِ فکر نہیں ہے اور کتاب و سنت سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ تخیل فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس، انسانی قوتِ عمل کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے، اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعتِ نحس آنے والی ہے، یا فلاں گھڑی منحوس ہے، تو اس کے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے اور اس کی قوتِ عمل کیا بلکہ قوتِ فیصلہ بھی جواب دے جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے وہم پرستی، بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا، ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا، خدا کو اس اُمت کی تربیت مقصود تھی، اس سے کچھ پہلے ہی فرزندِ رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال[1] ہوا تھا، عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے، اور اس کے اثرات تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے، واقعہ بھی ایسا غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ کیوں نہ ہو اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہوا اور سورج اس سے متاثر نہ ہو! دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علمبردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اس کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں' (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آئے ہوں) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بے شک اس کی مثال مل سکتی ہے لیکن بانیانِ جماعت' اور سیاسی رہنماؤں کے یہاں نہیں مل سکتی۔ آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا اور فرمایا:

إن الشمس والقمر آيتان من آيات الله لا يخسفان لموت أحدٍ ولا لحياته[2]	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی موت یا زندگی پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپؐ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، اور ان کا قانون دوسرا ہے، وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے، یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقع پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد پیدا ہونے والا نہیں تھا، بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی، اور محبت و عظمت

---

[1] یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ کا ہے، حضرت ابراہیم کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی، جب ان کا انتقال ہوا۔

[2] کتاب الکسوف، صحیح مسلم ج ۱، ص ۲۹۶

پر مبنی تھا ، پیدا ہوا تھا ، اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا ، اللہ کا رسول اس کو بھی برداشت نہ کرسکا ، اور کہا کہ نہیں نہیں ! میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں ، کائنات اس سے زیادہ وسیع ، اور اللہ کی ذات اس سے زیادہ غنی ہے ۔ اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے ۔ یہ ایک اصولی رہنمائی تھی جو پوری نسلِ انسانی ، بلکہ ذہنِ انسانی کو دی گئی ، ذہنِ انسانی نسلِ انسانی سے بھی زیادہ قیمتی اور قابلِ لحاظ ہے ، وہ ساری نسلِ انسانی پر حکومت کرتا ہے ۔ نسلِ انسانی ذہنِ انسانی پر حکومت نہیں کرتی ، یہ ذہنِ انسانی کا انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے ، اور اس کا علاج اور سدِ باب ضروری تھا ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جاسکتی ہے نہ منحوس ، میں گلاس کی مثال دُوں گا ، گلاس اگر خالی ہے تو آپ اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا بُرا ہے ۔ اس کا انحصار اس "مظروف" پر ہے ، جس کا یہ گلاس ظرف ہے ، یہ پانی کا گلاس ہے ، خدانخواستہ اگر شراب ہوتی تو یہ شراب کا جام ہوتا ، اگر اس کے اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالہ ہوتا ۔ یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم ، ایک بالکل غیر جانب دار چیز ہے ۔ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کو کس چیز سے بھرتے ہیں ! آپ اس کو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے ، اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے ، اس لیے نسلِ انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی ، مبارک ہوگی ، یا منحوس ہوگی ؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے ، جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے ۔

اس سلسلہ میں میں تین مثالیں دُوں گا ، دو مثالیں ان صدیوں کی جن کا آغاز نہایت ہولناک ، مایوس کُن ، ہمت شکن اور حوصلہ فرسا واقعات سے ہوا ، اس وقت کے مؤرخوں اور اہلِ نظر نے اس صدی کا استقبال ناگواری سے نہیں ، بلکہ جگر کے زخموں ، دل کے داغوں اور آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے کیا ، ابن اثیر و ابن کثیر کی شہادت موجود ہے کہ اسلامی حلقوں نے ساتویں صدی کا استقبال کس طرح کیا ! تمام آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ صدی مسلمانوں کے حق میں نہیں ، ملّتِ اسلامیہ کے حق میں نہیں ، بلکہ پوری انسانیت کے حق میں منحوس ترین صدی ثابت ہوگی ، اس کا آغاز ایسے غیر معمولی واقعہ سے ہوا تھا ، جس طرح کا واقعہ (مورخ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) کے بقول) " اگر کوئی شخص دعوٰی کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دُنیا میں پیش نہیں آیا ، تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا ، اس لیے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا"[1]

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے ، جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی (EMPIRE) علاء الدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا ، یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا ، اور تیرھویں صدی مسیحی چل رہی تھی ، "تاتاری مور و ملخ کی طرح اُٹھے اور عالمِ اسلام پر چھا گئے ، ترکستان اور ایران کو زیر و زبر اور پورے پورے شہروں کو انھوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا ۔ انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے ، جن پر چڑھ چڑھ کر انھوں نے صدا لگائی ، پورے

---

[1] الکامل لابن اثیر ، ج ۱۲ ، ص ۱۴۷ - ۱۴۸

پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "سقوط و زوال روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھا ہے کہ:

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی وحشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔"[1]

خیال کیجیے کہ سویڈن کہاں واقع ہے؛ انگلستان کا ساحل اس علاقے سے جس پر تاتاریوں کی تاخت ہوئی تھی، جغرافی طور پر کتنی دُور تھا، سویڈن کے ماہی گیر جن کا پیشہ ماہی گیری تھا، کچھ عرصہ انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے خوف و وحشت کے مارے نہیں آئے، کیمبرج کی "تاریخ عہد وسطی" کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچنے کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ "آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دیا۔"

یہ دونوں ان مغربی مصنفین کے بیانات ہیں، جو جذبات اور گرد و پیش کے حالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور جن پر براہِ راست تاتاری حملہ کی زد نہیں پڑتی تھی، مسلمانوں نے اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھا، اس کا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جا سکتا ہے، جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زبان زد تھی:

"اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدّق۔"[2]

(ہر بات مان لینا، لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا)

وہ مسلمان قوم جو یاس کے مفہوم سے ناآشنا تھی، جس سے کہا گیا تھا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ (الزمر۔ ۵۳) — اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ مسلمان جنھوں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (سورہ یوسف۔ ۸۷) — اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی لوگ ہوتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر ایسی مایوسی طاری تھی کہ ان کے لیے یہ کہاوت بن گئی تھی کہ ہر بات قابلِ تسلیم ہے، قرینِ قیاس ہے، کوئی بات دنیا میں ناممکن نہیں، ناممکن بات صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے "حصار" سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ

---

[1] گبن ص ۱۶

[2] ماخوذ از "چنگیز خاں" از ہیرلڈ لیمب ص ۲۶۶

میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے اور انھوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان اور ایران و عراق کا تختہ اُلٹ دیا تھا، اور ان ملکوں کی حکومت اور تہذیب و تمدن کا چراغ گُل کر دیا تھا، یہی وقت ہے جب ذہین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے، اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، آرنلڈ نے اپنی کتاب "PREECHING OF ISLAM" میں مسلمانوں کی مایوسی اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس وقت ہر حساس آدمی جس کو خدا نے دیکھنے کے لیے دو آنکھیں دی تھیں، اور مقدمات و اسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہو چکے ہیں، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو رہا ہے، اس عالم آشوب واقعہ سے مسلمانوں کو اصل نقصان پہنچا تھا کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اسی لیے سب سے زیادہ مسلمانوں کے لیے کام کرنے کا میدان تنگ تھا اور سب سے کم اُمید ان کے لیے تھی۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

"(اسلام کے علاوہ) دو مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دُنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی، جس وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب، اور اسلام اس جدّوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔

اسلام کے لیے ایسے وقت میں بودھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔"[1]

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اس لیے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دُوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں، اور ان کے پادری ان کے درباروں میں تھے، اس لیے اگر قبولِ مذہب کا سوال ہوتا، تو حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ وُہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنا پڑے کہ:

"بالآخر اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے اسلام اُٹھا اور واعظینِ اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا مسلمان کر لیا۔"[2]

آرنلڈ مزید لکھتا ہے:

"باوجود ان مشکلات کے مُغلوں اور وحشی قوموں نے جو بعد میں آئیں، انھیں مسلمانوں کا

---

[1] دعوتِ اسلام ص ۲۴۰، ۲۴۱

[2] ایضاً ص ۲۴۵ - ۲۴۶

مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا"[1]

وہ صدی جس کا آغاز نحوست سے ہوا تھا (اگر نحوست کا کوئی لفظ اسلام کی ڈکشنری میں ہے) وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا، وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی، اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بلکہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔

ہوورتھ لکھتا ہے کہ:

"مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کیے کہ چینی تماشے والے جو پردے پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹتے گھسیٹتے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے۔"[2]

لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس اسلام نے فاتح تاتاریوں کو فتح کر لیا۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، خدا پر اعتماد نہیں کھویا تھا، ایمان و عقیدہ نہیں کھویا تھا، روحانی طاقت نہیں کھوئی تھی، شکست کس نے کھائی تھی؟ شکست کھائی تھی (مجھے بہت تکلیف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) نالائق مسلمان بادشاہوں نے، ایک کمزور و مریض معاشرہ نے، اسلام اپنی جگہ پر تھا، اسلام کے شیشہ پر کوئی بال بھی نہیں پڑا تھا، مسلمانوں نے اس وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ تاتاریوں کو تلوار سے زیر کرنا ممکن نہیں، اسلام کی تلوار کند ہو چکی ہے، تقریباً ٹوٹ چکی ہے یا نیام میں جا چکی ہے۔ تاتاری یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان کے پاس مسلمانوں سے بہتر فوجی طاقت ہے، وہ دولت و حکومت، اور تمدن و تہذیب کی خرابیوں اور بیماریوں سے دور ہیں، ان کے اندر مشقتوں اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی وہ طاقت ہے جو کبھی تازہ دم عربوں اور فاتحین اسلام میں تھی، وہ صدیوں کے بعد صحرا سے نکلے ہیں، ان کی ساری توانائی (ENERGY) ان کے اندر محفوظ ہے، ان کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جا سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پھر کس نے تاتاریوں کو فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟

اس نازک گھڑی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اہل دل سامنے آئے، جن کے اندر روحانی طاقت تھی، اور تقریباً نصف صدی کے اندر اندر انھوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنا لیا، قبول اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، افراد کے قبولِ اسلام کے، خاندانوں کے قبولِ اسلام کے، شہروں کے قبولِ اسلام کے، لیکن

---

[1] دعوتِ اسلام، ص ۲۲۵ - ۲۲۶

[2] HOWORTH: HISTORY OF THE MONGOLS V.I. (LONDON 1876-80) P. 159.

قوموں کے من حیث القوم قبولِ اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں، عربوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا، افغانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا (افسوس ہے کہ وُہ بھی آج ابتلاؤ آزمائش میں ہیں) تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں من حیث القوم سَو فیصدی اسلام قبول کیا۔ تاریخ کا یہ معمہ ہے۔ اور میں بھی اس آزمائش سے گزر چکا ہُوں۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا واقعہ) پیش آئے، اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ ملیں جن کے سر تاتاریوں کے قبول اسلام کا سہرا ہے، یہ کیا بات ہے؟

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آیا کہ جب مدائن کی فتح میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا، اور وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواجِ اسلامی سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا، جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے "ایھا الامیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے" پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصع تاج زریں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی، اس کو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اس کو اپنے خیمہ میں لے جا کر رکھ دے۔ کہا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کی طرف مُنھ کر کے اور پیٹھ پھیر کر کہا کہ "جس چیز کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے" اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک فرد کا واقعہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہُوں کہ تاتاریوں کو کلمہ پڑھانے والوں کا یہی طرزِ عمل تھا، انھوں نے اپنے نام کو چھپایا۔ مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا دو آدمیوں کے نام ملے ہیں، ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام[1] جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیر اعظم تھے، وہ صوفی منش اور عابد و زاہد وزیر تھے، اور ان کا عمل اس پر تھا کہ: ع

درویش صفت باش، و کلاہ تتری دار

تاتاری بادشاہ کے کان میں وُہ اچھی بات ڈالتے رہے، حتّٰی کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے اور تاتاری حکمران سلطان غازان اور اس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لیے ہوئے مسجد کو جا رہے ہیں[2]

دُوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے، جن کے خلوص بے پایاں، سچی روحانیت اور دلی دردمندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ میں جو بلادِ متوسطہ میں (جس کا مرکز کاشغر تھا) اسلام پھیلا اور پوری شاخ مسلمان ہوگئی۔ واقعہ

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[2] البدایہ والنہایہ، ج ۱۳، ص ۳۴۰

یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جا رہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے وقعت تھے، وہ ان کو طعنہ دیتے تھے اور چڑاتے تھے کہ ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں! اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے، یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا، جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، اور اس کی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا کچھ سال باقی تھے، شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں، اور یہ لوگ تو سخت وہم پرست تھے۔ شیخ جمال الدین کو دیکھا کہ وہ شکار گاہ میں داخل ہو گئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا، اس نے کہا کہ آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی میں نے صورت دیکھ لی، یہ ایرانی کمبخت یہاں آگیا، اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ تم اچھے ہو کہ میرا یہ کتا اچھا ہے؟ خیال کیجئے اور اس منظر کو سامنے لائیے، اور دیکھیے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا ہے، ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا، کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا! شہزادہ نے کہا کیا مطلب؟ یہ کون سی مشکل بات ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں، ورنہ یہ کُتا اچھا ہے۔

تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی، محض کچھ کہہ دینے سے ایسی ضرب نہیں لگتی، لیکن ع

ہر چہ از دل می خیزد، بر دل می ریزد

جو چیز دل سے اُٹھتی ہے دل پر گرتی ہے، انھوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہوگا اس کے ساتھ کتنی دُعائیں، کتنے آنسو، کتنی آہیں رہی ہوں گی۔ خدایا! کہنے کو تو میں یہ جملہ کہتا ہُوں اثر تو پیدا کر، یہ وقت ہے اسلام کی قسمت کے فیصلہ کا! اگر اس شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ تو ابھی نہیں ہو سکتا، اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب میں کلمہ پڑھتا ہوا، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اس وقت یقیناً میں اشرف المخلوقات ہوں، میں افضل ہوں، ورنہ یہ کُتا ہزار درجہ مجھ سے بہتر رہے گا۔ یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے آرنلڈ کی کتاب "PREACHING OF ISLAM" میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے[1]

تغلق تیمور نے کہا کہ اچھا اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہد سلطنت ہوں آپ کہیں بھی ہوں جب یہ سُنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو مجھ سے ملیے گا، اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعت سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو اور میں خدا کا پیغام اس تک پہنچاؤں، ان کی قسمت میں نہیں تھا، وقت اخیر آگیا، مرض موت میں انھوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا، اور کہا کہ بیٹا! ایک بہت بڑی سعادت تھی جو میری قسمت میں معلوم ہوتا ہے نہیں ہے،

---

[1] آرنلڈ کی کتاب میں اس واقعہ پر شیخ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے کہ "اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتّے سے بھی بدتر تھے۔"

شاید تمھاری قسمت میں ہو، جس وقت تم یہ سُنناکہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی، اس تک میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ آپ نے میرے والد سے کچھ کہا تھا؟ چنانچہ وُہ گئے، کون ان بے چاروں کو محل میں گھسنے دیتا؟ وہ تاتاری شہنشاہ کا محل تھا، دربانوں نے ان کو روک دیا، اس وقت تو انھوں نے انتظار کیا کہ کوئی موقعہ ملے، نہیں موقعہ ملا، ایک درخت کے نیچے مصلّیٰ ڈال کر وہاں بیٹھ گئے جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے اور نماز پڑھ لیتے، خدا کو منظور تھا، ایک دن صبح کے وقت جو میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے، انھوں نے اذان دی، وہ آواز محل اور خواب گاہ سلطانی میں پہنچی یا پہنچائی گئی، بادشاہ نے کہا یہ کون باؤلا شخص ہے؟ کیا صدا بے ہنگام لگاتا ہے یہ؟ میں نے تو آج تک یہ آواز نہیں سُنی، محل کے قریب حفاظت (SECURITY) کے بڑے انتظامات ہوتے ہیں، داروغہ نے کہا کہ حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہوا ہے ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا کہ کوئی مسکین آدمی ہوگا صدا لگاتا ہے، بادشاہ نے حکم دیا اسے پکڑ کر لاؤ۔ بلایا گیا۔ بادشاہ نے کہا تم کون ہو؟ یہ کیا صدا لگاتے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے؟

شیخ رشید الدین نے کہا کہ سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ شکار کھیلنے کے لیے نکلے تھے، ایک مسلمان فقیر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، آپ نے ان سے پُوچھا تھا کہ تم اچھے ہو یا میرا کتّا اچھا؟ اُنھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکتا، میں آپ کو یہ بتانے آیا ہُوں کہ اس کا فیصلہ ہوگیا، الحمدللہ وہ ایمان کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہُوئے۔

بادشاہ نے سُنا اور وزیر اعظم کو بلایا، کہا کہ ایک راز ہے جو میرے سینے میں تھا، یہ واقعہ میرے ساتھ گذرا ہے، اس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہوجاؤں گا، تمھاری کیا رائے ہے؟ وزیر نے کہا کہ حضور والا! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، میں تو اپنے اسلام کو چھپا رہا تھا، میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وزراء بلائے گئے، اور جب بادشاہ کا منشأ معلوم ہوا تو سب مسلمان ہوگئے۔

ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ تہذیب تھی نہ علم و ادب، نہ کوئی آسمانی مذہب جس کو عقل قبول کرے، قانون بھی انھوں نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (سورہ فتح۔ ۷) اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کے لشکر ہیں۔

یہ خدائی تدبیر تھی، اتنے متمدن اور ترقی یافتہ مملکت کا نظم و نسق کرنا تاتاریوں کے بس کا روگ نہ تھا، وہاں مسلمان قانون ساز موجود تھے، آب پاشی کا نظام، تحصیل وصول کا نظام، مقدمات کے فیصلے، ان کے پاس ایک مختصر و محدود قانون تعزیرات تھا، جو صحرا کی محدود زندگی اور اس کے تجربات پر مبنی تھا، پہلے سے وہ مسلمانوں کے دست نگر تھے، مسلمان دانشور، ماہرینِ قانون اور علمأ پہلے ہی اپنا کام کر چکے تھے، اور انھوں نے اتنی بڑی مملکت کے نظم و نسق میں ان کی مدد کی تھی، اور اسلام کی زندگی کی رہنمائی، اور معاشرہ و مملکت کی تنظیم کی صلاحیت کا نقش ان کے دماغوں پر قایم کر دیا تھا، اُنھوں نے دیکھا کہ اب صرف عقیدہ اور ایمان کی بات باقی تھی، وہ مرحلہ یہاں طے ہوگیا۔

اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا، اور پُورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہو گئے، ادھر امیر توزون کی کوشش سے عراق میں جو خاندان حکومت کر رہا تھا، اسلام قبول کر چکا تھا۔ جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے، یہ مسلمان دانشور، مخلص علمائ، واعظین، مبلغین اور سب سے بڑھ کر اہلِ دل کا کارنامہ تھا، اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، پُوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہلِ دل نے اندر اندر کام کیا ہے، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں، یہ لاکھوں انسان (جنھوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انھیں کے حساب میں شمار ہوں گے، ان اہلِ دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ رہا ہے ؎

اچھے وہی ہیں آج، جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے، انھیں کے ہزاروں گلے ہُوئے

میں نے ایک ایسی صدی کی مثال دی جس کا آغاز نہایت ہولناک حالات، اور اسلام کے حق میں پیام موت سے ہوا تھا، لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری، انھوں نے سلطنت ہاری تھی، ہمت نہیں ہاری تھی۔ اور مسئلہ یہی ہے کہ سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے گیارھویں مرتبہ آ سکتی ہے، ہمت ایک مرتبہ ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی' داعیانِ اسلام بغیر کسی پروپیگنڈے کے خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے اس وقت کوئی انجمن بنائی ہو کہ تاتاریوں کو مسلمان کرنا ہے، پہلے اُنھوں نے یہ اشتہار دیا ہو کہ تاتاری مسلمان ہوں گے، تو یہ فائدہ ہوگا' اس سے کھوئی ہوئی سلطنت ملے گی، اقتدار قایم ہوگا، کچھ نہیں، خود مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اچانک یہ معلوم ہوا کہ پُوری کی پوری قوم اسلام کی جھولی میں ڈال دی گئی۔

میں نے ایک مثال ساتویں صدی ہجری' اور تیرھویں صدی عیسوی کی دی، جس کا آغاز ایسے مہیب اور ایسے ہولناک حالات سے ہُوا تھا، جس سے مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے، اور خدانخواستہ اگر ان میں عقیدہ کی طاقت نہ ہوتی، تو اگر ایمانی ارتداد نہیں تو تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو ضرور آ جاتا، اس وقت نہ تہذیبی ارتداد آیا نہ ذہنی ارتداد، اور ایمانی ارتداد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دُوسری مثال میں دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کی دُوں گا، میں اس موقع پر عالمِ اسلام کی وسعتوں میں نہیں جاؤں گا، ہندوستان کا تذکرہ کرتا ہُوں، دسویں صدی ہجری کا وسط اس حالت میں آیا کہ ہندوستان اسلام کی قیادت و رہنمائی بلکہ اسلام کے برکات ہی سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہو گیا تھا، بظاہر نظر آ رہا تھا کہ چند دنوں کا معاملہ ہے، تفصیلات آپ بڑی کتابوں میں پڑھیے[1]۔ اس وقت عالمِ اسلام میں دو سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، ایک عثمانیوں کی سلطنت ایشیائے کوچک اور مشرقِ وسطیٰ میں۔ دوسری مغلوں کی سلطنت اس تحتی برِاعظم میں، اس کے بعد اگر نمبر تھا تو ایران کی صفوی سلطنت کا، یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک قوی الارادہ، صاحبِ عزم، ذہین

---

[1] مثلاً تاریخِ دعوت و عزیمت حصّہ چہارم

فاتح اور کشور کشا سلطانِ وقت کے ساتھ اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابو الفضل اور فیضی کا نام سب سے نمایاں ہے) ایک تحریک میں شامل ہو گئے، جس کا مقصد ہندوستان کا رُخ اسلام سے ہٹا کر اکبر کے دینِ الٰہی اور اس وحدت ادیان کی طرف موڑنا تھا، جس میں پلڑا ہمیشہ دُوسری طرف جُھکا ہوا ہوتا تھا[۱]۔

یہ مادّی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلق العنان سلطنت، اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی، جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا کہ دسویں صدی ختم ہو رہی ہے، گیارھویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کے لیے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے، ایران و ہندوستان کے بہت سے فاضلوں نے جن کو خوفِ خدا اور دین کا گہرا علم نہیں تھا، اور جاہ و اقتدار اور منصب و عہدہ کی ہوس تھی، اس کے لیے مواد فراہم کر دیا کہ فلاں مذہب کا ستارۂ اقبال اتنے دنوں تک بلند رہا، ایک ہزار سال کے بعد دُوسرا مذہب آیا، اور دُوسری فکری رہنمائی اور قیادت میدان میں آئی، اب دینِ عربی کی عمر پوری ہو گئی ہے، اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت پر ایک ہزار سال گزر گئے ہیں، اس نسل کو نئے دین و آئین کی ضرورت ہے، اکثر ایسے فتنے ان فلسفوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو مذہب اور اخلاقیات کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس خطرہ کا ذرا اندازہ کیجئے، اس تحریک کا علم بردار اور رمز (SYMBOL) وہ شخص تھا جس کی تلوار کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی، جس نے ہر ناقابلِ تسخیر مہم کو سر کیا تھا، اور جو شکست و ناکامی کو جانتا نہیں تھا، جس میں جوانی کا خُون تھا، اور اپنے جدِّ اعلیٰ تیمور کی حوصلہ مندی، اور بابر کی مشکل پسندی، ایک طرف وہ شہنشاہ ہے، اور دوسری طرف وہ ذہین ترین انسان ہیں، جن کی آج بھی آپ تحریریں پڑھیں تو ان کی ذہانت کا لوہا مان جائیں گے۔

پھر کیا ہوا؟ دسویں صدی کا آخر یہ خبر لے کر آیا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اُکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری طاقتوں اور فلسفوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے، یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پہ پانی پھیر رہا تھا، جنھوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا، اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنھوں نے اپنے اپنے گوشوں میں بیٹھ کر سعید رُوحوں کو انسانیت اور محبّت، مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا درس دیا تھا، باہر

---

[۱] اس رواداری اور صلح کل تحریک میں اسلام کے ساتھ مساویانہ و منصفانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرۃً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جُھک گیا، جس کا دربار میں رسوخ، اور بادشاہ کی طبیعت میں رجحان غالب تھا" مختصر تاریخ ہند" کے مصنفین ڈبلیو، ایچ مورلینڈ اور اے، سی، چیٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ:

"اکبری قوانین دینِ اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے۔"

(ص ۲۵۱)

رہ کر حکومتِ وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی اور امانت دار، خدا ترس، انسانیت دوست افراد مہیا کیے تھے اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی رُوح پھونک دی تھی۔[1]

پھر کیا ہوا؟ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی افق سے نہیں، کسی مادی افق سے، صرف اسی ایمان و روحانیت کے گوشہ سے، اسی اخلاص و للّٰہیت کے گوشہ سے، اسی علم و حکمت کے گوشہ سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے، اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، جس کا نام شیخ احمد سرہندی حضرت مجدّد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ – ۱۷۹۱ء) ہے، جس کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے:

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے جس میں اس وقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزّت و آزاد طریقہ پر رہنے، اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کیے جاتے ہیں، اور صرف انھیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جا رہا ہے؟

پھر کیا نتیجہ ہوا؟ گیارھویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے، اس کے بعد سے دو تین صدیوں تک کے لیے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کر دیا گیا، اس وقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت و رسالتِ محمدی کی ضرورت و بقا اور شریعت و سنّت کے مقام و دوام کے خلاف جو علمی و اشراقی مغالطے تھے ان کا پردہ چاک کیا اور اس پر اعتماد بحال کیا۔[2] دُوسری طرف اس خطرہ کا سدِّباب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس کی حکمتِ عملی (STRATEGY) کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو منظم کرنے کی کوشش نہیں، اس کے تاریخی مطالعہ نے بھی، اور اس کی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دیئے جاؤ گے، تمھیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا۔ اللہ سے دُعائیں کرو، اپنے گرد مخلص اور لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو۔ وہ دولت اور حکومت کے دریا سے گزر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وُہ جاہ و حشمت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربارِ جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز ہیں۔ ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ "ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اس وقت موت و زندگی کے آخری

---

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی، اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخِ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم، باب پنجم

مرحلہ سے گزر رہا ہے، آپ کو کچھ کرنا چاہیے، جارحانہ طریقہ سے نہیں، بالکل تعمیری، علمی اور فکری طور پر، اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ۔"

مجدد صاحب نے خط و کتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے، جن سے انھوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں، اور نواب مرتضیٰ خاں (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ ۱۵۔۲۰ برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا، ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کے لیے نہیں، پورے عالم اسلام کے لیے مرجع و مرکز بن گئے، اور روحانیت میں، علم حدیث اور عربی لغت میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی، اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر و محقق پیدا ہوئے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (۱۱۱۴ - ۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سامنے آئی، جنھوں نے ایک نیا "علم کلام" پیدا کیا، نظام خلافت کی ایسی تشریح و تفصیل، اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو (جس کا بدل اس وقت موجود نہیں تھا) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے کی کوشش کی کہ اس کی شکست وریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی و اخلاقی انتشار کا خطرہ تھا[1]

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پیش پیش تھے) اس ملک میں کتاب و سنّت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقاید، اعمال و رسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔

اسی سلسلۂ طلائی کی ایک زریں، اور مستحکم کڑی اصلاح و جہاد، احیائے سنّت و احیائے خلافت کی وہ عظیم الشان تحریک تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) کی قیادت میں اس برعظیم میں شروع ہوئی، اور جس نے انقلاب حال، اسلامی سیرت، دینی حمیت، اور آدم گری اور مردم سازی کے وہ نمونے پیش کیے جنھوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی، اس جماعت نے دعوت و اصلاح کے اتنے وسیع اور طویل محاذ پر اپنی جدّ و جہد جاری رکھی، جس کی نظیر عالم اسلام کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[2]

پھر عظیم دینی مدارس کا دور آیا، اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور وہ دوسرے مدارس جابجا قائم ہوئے، جن کی بنیاد خالص کتاب و سنّت کی تعلیم و اشاعت پر تھی[3] ان مدارس کے عالی مرتبہ بانیوں، اور مخلص و

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، اور "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" از ابوالحسن علی ندوی [3] ان کے تفصیلی تعارف کے لیے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ" ملاحظہ ہو۔

راسخ العلم فضلاً کی مساعی جمیلہ سے بڑے پیمانہ پر عقاید و اعمال کی اصلاح ہوئی، دینی ذوق اور اسلامی حمیت پیدا ہوئی، ان میں سے ایک بڑی تعداد نے آزادی کی تحریک اور ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، اور ان کی وجہ سے (بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح) مذہب و سیاست کی تفریق کا اصول کامیاب نہیں ہونے پایا، اور ملک کے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ، علمأ و اہل دین کی قیادت سے (باغی ہونے کا کیا ذکر) ان کی رہنمائی و اثرات سے بھی آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکے۔

ان علمأ کی علمی کاوشوں کی بدولت ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی کہ اگر یمن میں، مراکش میں، کسی شخص کو علم حدیث میں کمال پیدا کرنا مقصود ہوتا تو سیدھا ہندوستان آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو روحانی پیاس بجھانے کا شوق ہوتا، اور وہ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتا تو ہندوستان کا رُخ کرتا، مولانا خالد رومی پیدا ہوتے ہیں، عراق اور شام کے شمالی حصہ میں جو ترکی میں داخل ہے، ساری تعلیم و تربیت ان کی شہر زور اور دمشق کی ہے، لیکن جب ان کو اپنی رُوح کی پیاس بجھانے اور اللہ کی باتوں پر، غیبی حقائق پر، وہ یقین پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا' جو بدیہیات اور ریاضی کے نتائج پر ہوتا ہے' تو وہ کہاں گئے؟ وہ اپنے وطن شہر زور سے سیدھے دہلی شاہ غلام علی صاحب (م ۱۲۴۰ھ) کی خانقاہ میں آئے، اور وہاں آ کر پڑ گئے، اور یہاں سے کامیاب ہو کر گئے، اور عراق اور شام اور ترکی کے ملکوں میں انھوں نے اخلاق و روحانیت، اور معارف و حقایق کے دریا بہا دیے، اور ایک نئی رُوح پھونک دی، جس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

اگرچہ یہ گفتگو ہندوستان کی اصلاحی و تجدیدی تحریکوں تک محدود تھی، لیکن اس میں بیرون ہند، بلکہ مرکزِ اسلام (جزیرۃ العرب) کی عظیم تحریک تطہیرِ عقائد' اور دعوت دین خالص کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوت تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر ہیں[1]۔ اس تحریک نے بعض خاص تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر وُہ کامیابی حاصل کی، جو کم مصلحین اور داعیوں کے حصے میں آئی تھی، اس کے نتیجہ میں ایک پوری نسل، ایک وسیع سلطنت، اور ایک مکتب فکر پیدا ہُوا جس کے اثرات دُور دُور پھیلے، اسی زمانہ میں یمن میں علامہ محمد بن الشوکانی (۱۱۷۲ - ۱۲۵۰ھ)، عسیر میں احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی بانیِ سلسلۂ ادریسیہ' اور لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۲۰۶ - ۱۲۷۶ھ) پیدا ہوئے[2]، جنھوں نے اپنے اپنے مقامات پر اصلاح عقائد و رسوم، اشاعتِ کتاب و سنّت، اور مجاہدانہ تربیت و سیرت سازی کا عظیم کام

---

[1] شیخ محمد بن عبدالوہاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً ہم عمر ہیں، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے' اور شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ کی۔ شیخ کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو" محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

[2] مشہور مجاہد و مصلح سیدی احمد الشریف السنوسی (امام سنوسی) انھیں محمد بن علی السنوسی کے پوتے تھے، جنھوں نے طرابلس اور برقہ کی جنگ میں اطالیوں کے چھکے چھڑا دیے' اور تیرہ برس تک محض اپنے تربیت یافتہ رفقاء اور تلامذہ کی مدد سے یورپ کی اس بڑی طاقت کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے، وہ سیف و تسبیح' اور قرآن و شمشیر کے بیک وقت حامل تھے، اور ان کا شمار اپنے وقت کے شیوخ کبار' اور اہل اللہ میں سے تھا، ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۳ء) میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو" حاضر العالم الاسلامی" از امیر شکیب ارسلان۔ ج ۲۔

انجام دیا، مغربی مستشرقین ان سب مصلحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک کا خوشہ چین اور ان کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا ثبوت مشکل ہے، مغربی ذہن اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ قرآن و حدیث کا مخلصانہ مطالعہ ہر دور میں ایسی اصلاحی شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے، جو بگڑے ہوئے حالات اور فاسد خیالات سے نبرد آزما رہیں، اور اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اسی کے کچھ بعد علامہ سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء) نے اسلامی حمیت، اور اتحاد عالم اسلامی کا صور پھونکا، جس سے مصر و شام اور ترکی کے دشت و جبل اور بام و در گونج اٹھے۔ انھوں نے اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مصری (م ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے اپنے عہد کی ذہین اور بے چین نوجوان مسلمان نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا[1]۔

جہاں تک چودھویں صدی ہجری کا تعلق ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ کامیابیوں اور ناکامیوں، غلطیوں اور تلافی کی کوششوں، مسلمان قوموں کی فریب خوردگی اور سادہ لوحی، اور اسی کے ساتھ سیاسی شعور اور بیداری، کثیر التعداد آزاد مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے قیام، اور اسی کے ساتھ متعدد طاقتور اسلامی تحریکوں کی صدی ہے، اس صدی میں واقعات و حوادث کا جو تنوع اور تضاد نظر آتا ہے، اس کی مثال پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کر و فر کے ساتھ موجود تھی اور مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید خان ثانی (۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء - ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۶ء) متمکن تھے، جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنی رہی ہے، اور مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین موقر عربی و ترکی رسائل میں شائع ہوئے ہیں، نیز ان کے روز نامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں، اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردعمل بھی) ایک نہایت باحمیت اور صاحب غیرت مسلمان حکمران تھے، جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرتے، اور یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور جنھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیشکشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اور زمین سے مٹی کی مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ "بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لیے تیار نہیں"[2]، اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں

---

[1] پچھلے چند برسوں سے دونوں (استاد و شاگرد) کی شخصیتیں تنقید و تحقیق کا موضوع بن گئی ہیں، اور ان کے خلاف عربی رسائل اور علمی مجالس میں مضامین اور خطبات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن کی وجہ سے ان دونوں کی شخصیتوں کی عظمت اتنی مسلّم نہیں رہی جتنی ربع صدی پہلے تھی، لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے نوجوانوں کا اسلام کی صلاحیت اور عقلیت پر اعتماد بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش"۔

[2] یہ روایت میں نے مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کی زبان سے کئی بار سنی، جو اس سلسلہ کے ایک معتبر راوی اور ثقہ گواہ تھے۔

ایک نئی روح، اور عالمِ اسلام میں وحدتِ اسلامی اور "جامعہ اسلامیہ" کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

دولتِ عثمانیہ جو تولیتِ حرمین شریفین کے شرف، اور خلافتِ اسلامیہ کے اعزاز سے مفتخر تھی، اپنی ساری کمزوریوں اور داخلی و خارجی فتنوں اور مہیب سازشوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ کے لیے خواہ وہ کہیں بستی ہو، قوت و عزت کا سرچشمہ، اور مقاماتِ مقدسہ اور ممالکِ عربیہ کے لیے ایک آہنی حصار تھی، جس کی موجودگی میں یہ مقامات و ممالک (جن سے مسلمانوں کی عزت و قسمت وابستہ تھی اور ہے) لاوارث آدمی کے مال کی طرح تقسیم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس صدی کی ابتدا میں دولتِ عثمانیہ مشرق میں یمن و عسیر سے لے کر، مغرب میں ایک طرف یورپ میں ادرنہ و البانیہ، افریقہ میں طرابلس، تونس، قیروان تک، دوسری طرف جنوب میں اسوان، مصر، برقہ سے لے کر شمال میں بلگیریا بریاست ہائے بلقان، طرابزون اور ایڈریانوپل تک وسیع تھی۔ دولتِ عثمانیہ کے حدود میں ایشیائے کوچک کا اکثر حصہ، شام (جس میں موجودہ فلسطین، لبنان اور شرقِ اردن بھی شامل تھے) مصر، جزیرۃ العرب، عراق، جزیرۂ قبرص شامل تھا، اور یورپ پر بھی اس "مردِ بیمار"[1] کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن مسلمانوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی (جو خلافت اور ایک وسیع مسلم امپائر کی شکل میں ان کو خدا نے دی تھی) سلطان عبد الحمید خاں کی ۱۹۰۹ء میں معزولی تو ایسا المناک واقعہ نہ تھا، جس سے تاریخ بدل جائے، وہ اس وقت کے سیاسی حالات یا سلطان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ان کے بعد علی الترتیب سلطان رشاد، سلطان وحید الدین خاں اور سلطان عبد المجید تختِ سلطنت اور خلافت پر متمکن ہوئے، لیکن اصل المناک واقعہ جس سے پورے عالمِ اسلام کو ذلت و نکبت کا سامنا کرنا پڑا، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور بقول مولانا شبلی کے "حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی نگاہیں اٹھیں" ممالکِ عربیہ مصر و شام (عظیم) عراق اور افریقہ کی پوری شمالی پٹی براہِ راست یا بالواسطہ مغربی اقوام ممالک کے زیرِ حکومت یا زیرِ انتداب آئے اور جس کی سزا کی میعاد (جہاں تک مغربی ایشیا کے عرب ممالک کا تعلق ہے) ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترکوں کے خلاف، وہ اقدام تھا جو عربوں نے اپنے ممالک کی چالاک عیسائی اقلیت کی سازش کا شکار، اور اتحادیوں کے پُر فریب وعدوں پر اعتبار اور قومیتِ عربیہ کے سحرِ سامری سے مسحور ہو کر پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر کیا، اور جس کے قائد شریفِ مکہ شریف حسین تھے جنھوں نے ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے نتیجہ میں ۱۹۱۷ء میں شام و فلسطین ترکوں سے آزاد ہو گئے۔ مصر برطانوی اقتدار میں چلا گیا۔ ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شریف حسین کے فرزند امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے، فرنچ جنرل گورو نے فاتح بیت المقدس اور آبروئے اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ "لو صلاح الدین ہم یہاں تک آ گئے اور ہم نے شام فتح کر لیا، تم کب تک سوتے رہو گے۔" اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق و عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آ چکے تھے۔

---

[1] یورپ کے مصنفین اور اہلِ سیاست ترکی سلطنت اور قوم کو مردِ بیمار (SICK MAN) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

سارا عالمِ اسلام اس صورتِ حال سے بے چین تھا اور مسلمان ذلیل، لیکن سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس پر بے چینی محسوس کی، اور اپنے قلبی و ذہنی اضطراب کا مظاہرہ کیا، یہی زمانہ ہے جب تحریکِ خلافت نے (جو اس صدی کی سب سے بڑی نیم دینی نیم سیاسی تحریک تھی) مسلمان علماء و قائدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی قیادت میں (جو اپنی طاقتور شخصیت، اسلامی حمیت اور جوشِ خطابت میں عالمِ اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے) سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کا دل ناسُور کی طرح بہا، اور ملّی احساس کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ اس زلزلہ انگیز تحریک سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ پورے ملک میں سیاسی شعور اور مغربی اقتدار اور تہذیب سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ خود گاندھی جی جیسے عظیم ملکی قائد نے اس تحریک کا ساتھ دیا، اور اس کے قائدین کے ساتھ ملک گیر دورے کیے۔

لیکن جب ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی۔ اقبال نے اسی موقع پر کہا تھا: ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالمِ اسلام کے لیے رُوح فرسا اور ہوش ربا تھا، اور ایک طرح سے اس کو ساتویں صدی ہجری کے اس نصفِ اوّل سے مماثلت تھی جس میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام کے زرخیز و مردم خیز متمدن اور مرکزی ممالک پر حملہ، اور پھر قبضہ کر کے اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا، لیکن وہ محض ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کی متمدن و تن آسان اسلامی دُنیا تاب نہ لا سکی، اس کے ساتھ کوئی فکری فلسفہ، کوئی تازہ دم تہذیب اور نئے افکار و اقدار نہ تھے، لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس تاخت کی جو چودھویں صدی کے پہلے ثلث اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جُدا تھی۔ اس کے ساتھ نئے فلسفے، نیا نظامِ تعلیم، نئے افکار و اقدار، الحاد و تشکیک کا نیا لشکر اور مادیت و مادہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہُوا کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب پیش آیا، جو صرف تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی نقشہ کو ہی تبدیل کرنے والا نہ تھا اور وہ اقتصادیات و سیاسیات کے حدود میں محدود نہ تھا۔ عقیدہ و عمل، اصول و مبادی، اخلاق و معاشرت بلکہ حیاتِ انسانی اور شعورِ انسانی کی بنیادوں کو منہدم کرنے والا اور ان کے ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والا تھا، اس کی زد سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں پر پڑنے والی تھی، جو ایک مثبت، متعین اور مختتم دین کے پیرو اور داعی تھے، اور جن کے دین کی حقیقت اور فرائض میں "احتسابِ کائنات" کا فریضہ بھی شامل تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں بروقت اس خطرہ کو محسوس کرنے والے اور اس کا مقابلہ کرنے والے بہت کم تھے اور انھوں نے اس معاملہ میں اس "فراستِ مومن" کا ثبوت نہیں دیا، جو اس سے پہلے اس سے کم درجہ کے خطرات کو بھانپ لینی تھی، مغربی عالمِ اسلام میں ترکی کے

سابق وزیر حربیہ اور مومن مجاہد غازی انور پاشا مرحوم نے بالشویکی خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کیا، انھوں نے ترکستان کے باشندوں کو منظم کرکے کمیونسٹوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء میں ان کے اور بالشویکوں کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں۔ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے قریب انھوں نے ایک روسی فوج پر حملہ کیا، غنیم کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس جنگ میں انور پاشا شہید ہوئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کی غالباً ساتویں تاریخ[1]

اسی انقلاب سے نہ صرف یہ کہ وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی کے مردم خیز و تاریخ ساز ممالک روسی و چینی ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہاں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو نہ صرف ذہنی و تہذیبی ارتداد بلکہ اعتقادی و ایمانی ارتداد کے خطرے سے دوچار کردیا، اور وہاں اسپین کی وہ تاریخ دہرائی جانے لگی جو نویں صدی ہجری میں پیش آئی تھی، بلکہ صرف اس تحتی براعظم کو نہیں، ممالک عربیہ و مرکز اسلام کو بھی اس تحریک سے متاثر ہونے کے خطرے سے دوچار اور اس کا حلیف یا حریف بننے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا، اور نوبت یہاں تک آئی کہ بعض عرب ممالک[2] نے اس سے صرف اسلحہ، جدید مصنوعات ہی درآمد نہیں کیں اس کی آئیڈیالوجی اور اس کا فلسفہ بھی درآمد کیا، اور اس کے پرجوش حامی اور داعی بن گئے، اور اب ماضی قریب میں اس افغانستان پر بھی اس کا فوجی تسلط ہوگیا جو اسلامی شجاعت اور حمیت کا معدن و مخزن تھا اور جس نے ہندوستان کو ہر دور میں لائق منتظم حاکم و قائد اور عالم و درویش مہیا کیے تھے، اور جو اس کی آزادی کا پاسبان اور اس کا بیرونی قلعہ تھا، اور اس طرح یہ فتنۂ عالم آشوب برصغیر کے دروازہ پہ پہنچ گیا۔

لیکن چودھویں صدی کے وسط کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جب عالم اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی، بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ اور بقول اقبالؔ : ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا ——— سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے ——— تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عالم اسلام میں ایک طرف نمایاں طریقہ پر سیاسی شعور بیدار ہوا، غیر ملکی اقتدار کے خلاف جابجا آزادی کا علم بلند کیا گیا، جس کے نتیجہ میں مصر، شام (اپنے تمام حصوں کے ساتھ) عراق، لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش آزاد ہوئے افریقہ میں نئی نئی مسلم حکومتیں قایم ہوئیں، انڈونیشیا اور ملیشیا نے آزادی حاصل کی، پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا، ہندوستانی مسلمانوں نے جنگِ آزادی میں شریک ہوکر، اور قربانیاں دے کر، سیاسی شعور اور حب الوطنی کا ثبوت دیا اور بالآخر دنیا کے سیاسی نقشہ پر ۴۵ سے اوپر آزاد مسلم ممالک اور سلطنتیں نمودار ہوئیں، جن میں سے ۲۴

---

[1] انور پاشا کے اسلامی جذبات اور ان عظیم خدمات کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو امیر شکیب ارسلان کا (جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھے) وہ ولولہ انگیز مضمون جو ان کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں شامل ہے۔

[2] مثلاً شام، عراق، جنوبی یمن۔

اقوامِ متحدہ کی ممبر ہیں، اور ان کے جھنڈے یونائیٹڈ نیشن کی پُرشکوہ عمارت پر لہرا رہے ہیں۔ مسلمان اقوامِ متحدہ میں بھی اور بین الاقوامی مسائل و مذاکرات میں بھی، اور دنیا کے سیاسی ترازو کے پلڑے میں بھی اپنا ایک خاص وزن رکھتے ہیں، اور اگر ان کا سیاسی شعور بالغ اور ان کو اپنی سیاسی طاقت و وزن کا احساس ہو اور وہ متحد ہو جائیں تو دنیا میں بہت سی ناانصافیوں کو روک سکتے ہیں، بہت سی کمزور اور مظلوم قوموں اور ملکوں کی مدد کر سکتے ہیں، اگر خدا ان کو خدا ترس، مخلص قائد و سربراہ عطا فرمائے یا اس کے قائدین اور سربراہانِ مملکت کو توفیق اور ہدایت نصیب فرمائے تو وہ ان اسلامی ممالک اور اپنے دائرۂ حکومت میں صحیح اسلامی حکومت قائم اور نظامِ شرعی کو نافذ اور جاری کر سکتے ہیں اور اپنی قلمرو اور حدودِ حکومت میں وہ معیاری مسلم معاشرہ اور وہ پاکیزہ، بلند کردار، اطاعت شعار، ذمہ دار اخلاقی و روحانی ماحول پیدا کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں صرف تاریخ کے صفحات میں صدیوں کے فاصلہ سے نظر آتی ہیں اور جن سے دُنیا یکسر مایوس اور خود مسلمان غافل اور مستغنی ہو چکے ہیں اور جو آج بھی ذہنِ انسانی کو چونکانے اور مغرب و مشرق کے بلاکوں کو مسئلہ پر غور کرنے پر مجبور اور اشاعتِ اسلام کے لیے ایک نیا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے سیاسی وزن و اہمیت کا صحیح استعمال کرنے کا عزم کر لیں اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کا مکمل طریقہ پر احساس کریں تو وہ اس انسانیت کو بھی تباہی سے بچا سکتے ہیں، جس کی قسمت کے مالک بزعمِ خود مغربی و مشرقی بلاک بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی وہ اپنی دانشمندی، اتحاد اور اخلاقی طاقت سے نہ صرف اپنے ملّی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں بلکہ ہندوستان کو بھی ایک نئی اخلاقی، روحانی قیادت عطا کر کے اس عام تباہی سے بچا سکتے ہیں جو روز افزوں سیاسی انتشار اور خطرناک اخلاقی بحران کی بنا پر اس کی طرف منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف عالمِ اسلام میں وہ چند وسیع و طاقتور، اصلاحی، فکری اور انقلابی تحریکیں پیدا ہوئیں، جن کی نظیر اپنی وسعت و قوت میں ماضی قریب میں بھی ملنی مشکل ہے۔ ان تحریکوں کا ایک درخشاں اور امید افزا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک طرف خواص، ذہین (INTELLECTUAL) طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور اس طبقہ کو مطمئن کرنے اور اس کا اسلام پر اعتماد بحال کرنے کے لیے واضح اور پُرکشش علمی مواد فراہم کرتی ہیں۔ دُوسری طرف ان کا دائرہ جغرافیائی حدود سے آزاد ہے، اور وہ عالمِ اسلام کے ایک بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان تحریکوں سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پہلی مرتبہ نہ صرف متاثر، بلکہ اپنے دیرینہ سال ہم مذہبوں کے مقابلہ میں ان کا زیادہ پرجوش داعی اور مبلّغ ہے۔ اس سلسلہ میں مصر کی عظیم و جلیل تحریک "الاخوان المسلمون" ترکی کی نوری تحریک و جماعت، اردن و فلسطین کی تحریک "حزب التحریر"، انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، برصغیر کی عالمگیر تبلیغی دعوت، اور تحریکِ جماعتِ اسلامی کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جن سے خواہ کسی کو کلّی اتفاق نہ ہو، ان کی اثر انگیزی اور وسعت و مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں میں اس ایمان افروزی، ہمت آفرینی اور خودشناسی میں اقبال کے ولولہ انگیز اور خیال افروز کلام کا بھی بڑا دخل ہے، جس کی اپنی قوت و تاثیر اور عالمگیری میں پچھلی صدیوں کے اسلامی ادب و شاعری میں مثال نہیں ملتی۔

پندرھویں صدی اب پُورے عالم پر سایہ فگن ہو گئی ہے۔ اگر ملّتِ اسلامیہ اور عالمِ اسلام اس عظیم سرمایہ، اور

اس اعتقادی، فکری، علمی، سیاسی، طبعی اور انسانی ثروت وصلاحیت، طاقتور تحریکوں اور کثیر التعداد آزاد ملکوں اور وسیع سلطنتوں سے بھی محروم ہوتا، جس کی طرف کچھ مختصر اشارے اوپر کیے گئے ہیں، تب بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے پاس قرآن مجید کا یہ صحیفہ، اور اللہ کا آخری اور ابدی دین (اسلام) موجود ہے جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں ملت کے تنِ مُردہ اور قلبِ افسردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوتی رہی ہے، اور معجزات وعجائبات کا ظہور رہا ہے۔

پھر مسلمان ہی اس دور میں تنہا انسانیت کی امیدوں کی پناہ گاہ، خدا کا آخری پیغام اور انسانیت کے امین و پاسبان ہیں۔ شاید یہ صدی ایک ایسا فیصلہ کن موڑ لائے جو پورے عالم انسانی پر اثر انداز ہو۔ اللہ کی رحمت سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انسانیت کی زبوں حالی، انسانوں کی ذلت ونگوں ساری اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکی ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب رحمتِ الٰہی، بلکہ غیرتِ الٰہی کو حرکت ہوتی ہے، اور دُنیا میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔

"مغربی تہذیب کو پُورے طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لیے کہ بدقسمتی سے کوئی دُوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کو تیار نہیں۔ اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالمِ اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالمِ اسلامی میں پیدا ہوگا تو اس کو دُنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے، جو سنت اللہ کے مطابق ایک جری وقوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔ اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری اور کشکول گدائی مناسب ہے یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں، کیا اس کے لیے ظاہری نام نمود، عہدہ ومنصب، لذت، راحت اور مادی وجسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے، اگر اس کے لیے لٹو جائیں بھی قربان کی جائیں تو درحقیقت گھاٹے کا سودا، اور زیاں ونقصان کا معاملہ نہیں ہے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں[1]"

میں اپنے اس مختصر جائزہ اور مخلصانہ پیغام کو اقبالؔ کے ان روح پرور اور حیات آفریں اشعار پر ختم کروں گا، جن میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا ہے:

ناموس ازل را تو امینی تو امینی ۔۔۔ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ۔۔۔ صہبائے یقین درکش و از دیر گماں خیز

---

[1] واوین کے درمیان کا حصہ مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ص ۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

پندرھویں صدی میں عالمِ اسلام کے لیے دس نکاتی پروگرام

ساتویں صدی اور دسویں صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے جو واقعات اور اسباب بیان کیے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کو ہر دور میں ایسے ربانی، حقانی، بیدار مغز، عالی ہمت مصلحین اور داعیوں کی ضرورت ہے جو دعوتِ الی اللہ اور نفوسِ قدسیہ کی اصلاح و تربیت کا کام ناسازگار سے ناسازگار ماحول میں انجام دیں، جب اسلامی حکومتیں زیر و زبر ہو رہی ہوں، مادیت اور خواہشاتِ نفسانی کے سیلابِ بلا میں لوگ تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے ہوں، مال و دولت کے حصول کی ایک اندھی "ریس" جاری ہو، وہ گرتے ہوئے دلوں کو تھامتے، اللہ تعالیٰ سے ان کو جوڑتے، اور ان میں تازہ ایمان و یقین، محبت اور خوفِ الٰہی اور اعتماد و توکل پیدا کرنے کے کام میں لگ جائیں، وہ لوگوں کو پست اغراض سے بلند رہنے کا سبق دے رہے ہوں، دنیا کے مال و متاع کی حقارت ان کے دل میں جاگزیں کر رہے ہوں، دولت و حشمت اور سلطنت و قوت کے سامنے سرنگوں اور سجدہ ریز ہوتے، ضمیر و ملت فروشی اور ملکوں اور قوموں کا سودا کرنے سے بیزار اور بالاتر بنائیں اور عقیدہ و اصول کے لیے قربانی اور راہِ خدا میں شہادت کی آرزو سینوں میں بیدار کر دیں، ناامیدیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال کر رحمت و نصرتِ الٰہی کی روشنی میں لے آئیں، زوال آمادہ اور کرم خوردہ معاشرہ کو ایسے اہل، طاقتور اور امانت دار اشخاص مہیا کریں جو حکومت کی نازک سے نازک ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت کر سکیں۔ یہ وہ ربانی حقانی لوگ ہیں جو اپنے معاشرہ و ماحول میں وہ خدمت انجام دیتے ہیں، جو خواجہ حسن بصریؒ نے بنو امیہ کے دور میں اور حافظ ابن جوزیؒ، حجۃ الاسلام غزالیؒ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے عباسیوں کے دور میں انجام دی تھی۔

ان ربانی اشخاص کا وجود ہر ملک اور ہر زمانہ کی بنیادی ضرورت ہے، وہ اس وقت کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ جب حکومتیں ناکام و نامراد ہو جاتی ہیں[1] ان کا علمِ دولت و اقبال اس وقت بلند ہوتا ہے جب حکومتوں اور طاقتوں کے فلک بوس

---

[1] پروفیسر ہٹی (HITTI) نے (جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں نقل کیا ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

"سیاسی اسلام" کے نازک ترین لمحات میں "مذہبی اسلام" نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔

(HISTORY OF THE ARABS, P-475)

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھنڈے سرنگوں ہو جاتے ہیں، اسلامی معاشرہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ سے سراسر محروم ہو جائے، بہت سے وہ اسلامی اور عرب ملک جہاں اللہ تعالیٰ نے رزق اور اپنی نعمتوں کے دہانے کھول دیے ہیں، وہاں آج بشدت یہ " دعوتی و روحانی خلاء" محسوس ہوتا ہے، یہ خلاء وسیع تنظیمات، عظیم علمی اداروں، سیاسی و اشاعتی سرگرمیوں، فلک شگاف نعروں اور خدمتِ دین کے بلند بانگ دعووں سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

دعوتِ دینی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جو کوششیں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف انداز سے اور اپنی اپنی بصیرت، تجربے اور حالات کے تقاضا سے ہو رہی ہیں ان کو اپنے اپنے مرتبے پر رکھتے ہوئے، اور ان کی کسی نہ کسی درجہ میں افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پندرھویں صدی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور مسلم معاشرہ کو مزید انحطاط و زوال کے خطرے سے بچانے اور نئی صدی ہجری کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ معین نقاط (POINTS) اور چند واضح خطوط (LINES) (خواہ ان کی حیثیت اشارات اور عنوانات سے زیادہ نہ ہو) پیش کر دیے جائیں، شاید با توفیق اور بلند حوصلہ کارکنوں اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے فکر مند جماعتوں کو اُن سے کچھ روشنی یا مدد حاصل ہو:

۱۔ مسلم عوام میں ایمان و عقیدہ کو طاقت پہنچانے (جس کی چنگاریاں اس کے خاکستر میں بہر حال موجود ہیں) اور ان کے دینی شعور کو بیدار و متحرک بنانے کی ضرورت ہے، ان مسلم عوام کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لیے گرم جوشی (خواہ وہ بعض اوقات حالات و حوادث ہی کا نتیجہ ہو) ایک ایسی بلند و مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار رہے جس کی بدولت بہت سی مسلم (یا مدعی اسلام) قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر و الحاد کی آغوش میں ڈال دینے کی ہمت نہیں ہوتی، اور اسلام ان تمام سازشوں اور منظم اور وسیع منصوبوں کے باوجود جو اس کو ان ملکوں سے بے دخل کرنے کے لیے اندرون یا بیرونِ ملک تیار کیے جاتے ہیں، ان ملکوں میں زندہ اور کسی نہ کسی درجہ میں فعال اور مؤثر ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یعنی اسلام نے ایک دین اور جادواں پیغام کی حیثیت سے کامیابی و کامرانی حاصل کی جبکہ اسلام ایک نظامِ حکومت کی حیثیت سے بعض اوقات شکست و ہزیمت سے دوچار رہا۔ واضح رہے کہ اسلام میں دین و سیاست کی کوئی تفریق نہیں ہے جیسا کی ہٹی کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔

یہی بات ہالینڈ کے ایک فاضل مورخ لوکے گارڈ (FRCIDE LOKKE GAARD) نے بھی کہی ہے، وہ لکھتا ہے:

" گو اسلام کا سیاسی زوال تو بار ہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔"

ان کی روحانی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہوگئی تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت اور ان قیادتوں (LEADERSHIPS) اور حکومتوں کے کھُل کھیلنے اور اپنے ملکوں کو اسپین اور ترکستان بنا دینے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ پھر یہی عوام اور نرم اور بارآور زمین ہے، جس سے ہر طرح کی قدرتی دولت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس پر ہر طرح کے پُرثمر باغات، لگائے جاسکتے اور محل تعمیر کیے جاسکتے ہیں، یہ وہ خام مال (RAW MATERIAL) ہے جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں اور مردم سازی اور آدم گری کا کام کیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں اور قابلِ اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے جس پر پیغمبرانہ توجہات اور اہلِ قلوب اور اہلِ خلوص کی محنتیں صرف ہوئی ہیں اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت اور گرم جوشی اور ایثار و قربانی کے جذبہ اور صلاحیت میں دُوسری انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق و ممتاز ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ ان مسلم عوام (MASSES) اور مسلم ممالک کی مسلم آبادی میں ان صفات کو بھی پیدا کرنے اور اس اسلامی سیرت کو بروئے کار لانے کے لیے بھی سخت جد وجہد کی جائے، جن کی بنا پر انسانی نفوس، نصرت آسمانی اور فتح و کامرانی کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے پہاڑ گرد و غبار بن جاتے ہیں۔ مثلاً صحیح عقیدہ توحید خالص جو شرک کے شائبہ سے محفوظ ہو، اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ جو جاہلی رسم و رواج اور غیر مسلم اقوام کی تقلید سے پاک ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس مرض نفاق اور اس "تضاد" سے پاک کیا جائے جو عرصہ سے اس میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو اسلام کی اصل تعلیمات اور مثالی مسلم معاشرہ کے منافی ہے۔ اسی طرح اُن کے اخلاق و عادات اور نفسِ امّارہ کو دولت و طاقت کے ان اثرات سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کی جائے جن کی بنا پر انبیاء سابقین کی بہت سی اُمتیں مستحقِ عذاب اور موردِ غضبِ الٰہی ہوئیں۔ اسی طرح مغربی اقوام کے اس "اخلاقی جذام" سے بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے جس میں مغربی تہذیب اور اہلِ مغرب مبتلا ہیں، اور اب وُہ چاہتے ہیں مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم ملکوں میں بھی وہ پوری طرح پھیل جائے۔

لیکن یہ اصلاحی کام ادھورا رہے گا اور اس کے صحیح نتائج ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ مسلمانوں میں صحیح دینی شعور پیدا نہ کیا جائے اور ان کو صحیح ذہنی تربیت نہ ہو، ضرورت ہے کہ ان میں حقایق اور مسائل کا صحیح فہم اور دوست و دشمن میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ اور ان کا دینی فہم اتنا عمیق ہو کہ وہ گہرے سیاسی مقاصد رکھنے والے رہبروں، سیاسی بازی گروں اور کھوکھلے نعروں سے دھوکا نہ کھائیں اور عالمِ اسلام میں پھر روح فرسا المیوں (TRADGADIES) کا اعادہ نہ ہو، جن میں بعض بڑی پُرجوش مسلم قومیں اور ممالک، جاہلی قوم پرستی (NATIONALISM) یا لسانی (LINGUISTIC) اور ثقافتی (CULTURAL) تعصبات کی آندھیوں میں پتّوں کی طرح اُڑ گئے اور آسانی کے ساتھ شاطر قیادتوں اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی ناپختگی کے بھینٹ چڑھ گئے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ (اردو، عربی، انگریزی، بنگالی ایڈیشن)

۲۔ دینی حقایق اور قرآنی و ایمانی اصطلاحات کو، نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچایا جائے، اور ان کو جدید عصری و مغربی تصورات اور سیاسی و اقتصادی نظاموں کے (بے اعتدالی کے ساتھ) تابع اور مطابق بنانے اور اسلام کی خالص سیاسی تشریح و تعبیر اور اسلام کو ایک نظریۂ حیات ثابت کرنے اور عصری فلسفوں، سیاسی نظاموں کی سطح پر لے آنے میں شدید احتیاط برتی جائے اس لیے کہ حکومت و اقتدار اور نظام و فلسفہ تغیر و ترقی پذیر چیزیں ہیں، لیکن یہ دینی حقایق اور دین کا صحیح عقیدہ اسلام کی دائمی بنیاد اور وہ نقطہ ہے جس سے اس کا آغاز اور انجام مربوط ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ میں انھیں کی دعوت دی اور انھیں کے راستہ میں ان کی ساری جدوجہد اور جہاد تھا۔ اسی طرح ہر ایسی چیز سے احتیاط ضروری ہے جس کی بنیاد "ایمان بالآخرۃ" پر نہ ہو اور جس سے حصولِ رضائے الٰہی کا جذبہ کمزور اور ایمان و احتساب[1] کی روح مضمحل ہوتی ہو، اور تقرب الی اللہ زندگی کی اصل غایت نہ ٹھہرتی ہو، نیز جس تعلیم و تلقین اور تفہیم و تشریح سے دورِ جاہلیت کی بت پرستی (جو ابھی زندہ ہے) اور شرک اور اس کے عام اعمال و مظاہر کی قباحت و نفرت کم ہوتی ہو اور اس کو دورِ جاہلیت کی ایسی یادگار سمجھنے کا ذہن پیدا ہوتا ہو، جس کا زمانہ لد گیا اور جس کی اب اس ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں[2] حالانکہ بقول اقبال ؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات

۳۔ ذاتِ نبوت (علیہ الف الف سلام) سے مسلمان کے روحانی اور جذباتی تعلق پیدا ہونے اور برقرار رہنے کی کوشش، دل میں آپ کے لیے گہری محبت اور مسلم معاشرہ میں عشقِ نبوی پیدا کرنے کی کوشش جو ایک مسلمان کی نظر میں آپ کو اہل و عیال یہاں تک کہ اپنی ذات سے زیادہ محبوب بنا دے، جیسا کہ صحیح احادیث کے مطابق وہ ایمان کا تقاضا اور اس کی علامت ہے، اور اس بات پر ذہنی طور پر پورا اطمینان اور اعتقاد کہ آپ "ختم الرسل، مولائے کل، دانائے سبل" ہیں اور ایسے تمام اثرات سے احتراز جو محبت کے ان سرچشموں کو خشک یا پایاب کر دیں، سنت پر عمل کرنے، اسوۂ رسول کی پیروی اور سیرت کے مطالعہ کے شغف اور اس کے تاثر کو کمزور کر دیں۔ یہی وہ وابستگی اور گرویدگی تھی جس نے عجمی قوموں کو اسلام کے رشتہ سے منسلک اور غیر اسلامی تہذیب اور قومیتوں میں تحلیل ہو جانے سے محفوظ رکھا۔

یہ پہلو اس زمانہ میں ممالک عربیہ کے لیے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جہاں پچھلے برسوں میں عرب قوم پرستی کی تحریکوں عیسائی اور یہودی مصنفین کی کتابوں اور جدید عرب ادیبوں اور ان داعیوں و فضلا نے جو محبت کے عنصر سے محروم یا مقامِ "محمد عربی" سے ناآشنا تھے، اس کو اس حد تک کمزور کر دیا ہے کہ اب اس کے دوبارہ احیاء اور تقویت اور ایک ایسے ایمان افروز اور روح پرور اسلامی ادب کی ضرورت پیدا کر دی ہے[3]، جس کے پیش کرنے والے ایک عجمی عاشقِ رسولؐ

---

[1] کسی کام کو محض اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے موعود اجر و ثواب کے لالچ میں انجام دینے کو "احتساب" کہتے ہیں۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"۔ (اردو، عربی، انگریزی)

[3] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "الطریق الی المدینۃ" یا اس کا ترجمہ "کاروانِ مدینہ"۔

(اقبال) کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ :

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

۴۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں' اور جن کے ہاتھ میں آج ممالک اسلامیہ کی فکری، تعلیمی قیادت اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ اسلام کی ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے، نئے نئے مسائل کا سامنا کرنے، نئی نئی گتھیوں کو سلجھانے اور انسانی قافلہ کو اس منزلِ مقصود پر پہنچانے اور کشتیِ حیات کو کنارے لگانے کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی جو غلط تعلیم اور مغربی افکار کے اثر سے یا تو ختم ہو گیا ہے یا متزلزل ہو چکا ہے اس طبقہ نے فرض کر لیا ہے کہ اسلام ایک ایسی بیٹری یا ٹارچ ہے جس کا مسالہ ختم ہو گیا ہے، یا ایک ایسی بتی ہے جس کا تیل ختم، اور اس کا فتیلہ جل چکا ہے، اس کے دل میں از سرِ نو یہ اعتقاد اور اعتماد پیدا کرنا کہ اسلام ایک عالمی اور جاوداں پیغام ہے جس میں زمان و مکان کی کوئی تفریق نہیں، اس کی ہر زمانہ میں کشتیِ نوح کی حیثیت ہے جو تنہا غرق ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اس اعتماد کا اس طبقہ کے دلوں سے بالکل نکل جانا یا اس کا کمزور پڑ جانا اس طبقہ کا وہ اصلی مرض ہے جو اس وقت اس کے اکثر خلافِ اسلام اقدامات اور" اصلاحات" کا محرک اور اس ذہنی و تمدنی ارتداد کا سبب ہے، جس نے اس وقت پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے ان رہنماؤں اور اہلِ حکومت اور مسلم عوام کے درمیان وہ عمیق و عریض خلیج پیدا ہو گئی ہے جو کسی طرح سے پُر نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے ان ملکوں میں ایک شدید ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی کشمکش برپا ہے، جو کبھی کبھی بغاوت اور انقلابات پر منتج ہوتی ہے۔

۵۔ اسلامی ممالک میں نظام و نصابِ تعلیم کی بنیادی تبدیلی اور از سرِ نو تشکیل جو ان مسلم اقوام و ممالک کے قدوقامت، پیغام و فرائض اور اغراض و مقاصد سے پوری مطابقت رکھتی ہو، اور جو قطعاً کسی دوسرے ملک یا "کیمپ" سے درآمد نہ کی گئی ہو، بلکہ ان مسلمان ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ فنون کے اجتہاد و مطالعہ، اسلام کے عمیق و جامع فہم، اور بصیرت و تجربہ کا نتیجہ ہو، جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خود ساختہ حدود و خطوط سے بالاتر اور آزاد ہوں، یہ ایک ایسا ضروری کام ہے جس میں مطلق تاخیر کی گنجائش نہیں، اس کے بغیر یہ اسلامی ممالک اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ اپنے دماغ سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں، نہ اپنے عزم و ارادہ سے ان ممالک کا نظام چلا سکتے ہیں اور نہ ان ممالک کی دانش گاہیں، ادب و صحافت اور ذرائع ابلاغ، اسلام کے مزاج و روح اور معاشرہ کی ضرورت کے مطابق فرض انجام دے سکتے ہیں[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مصنف کی اس عنوان پر مستقل تصنیف "نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ" یا اردو کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "مغربی نظامِ تعلیم" اور "زہر کا تریاق" ص ۲۲۰ - ۲۳۴

۶۔ ایک ایسی طاقت ور، عالمگیر، علمی و تحقیقی تحریک، جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کر سکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے، اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، وہ ایسے ابدی اصولوں پر قایم ہے، جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصرِ حاضر کا وہ "تجدیدی" کام ہے جو اسلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے اور مغرب زدگی و تجدید کے اس دھارے کو روک سکتا ہے جو عالمِ اسلام میں اس وقت پوری طغیانی پر ہے[1]۔

۷۔ اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اس اسلامی تمدن کی کارفرمائی اور جلوہ نمائی کی کوشش جو اسلام کے اصول و مقاصد، طہارت و عفت، اعتدال، ذوقِ سلیم، قرآنی تعلیمات، اسوۂ رسول اور قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی اور اسلام کے مثالی معاشرہ کے بہت سے محاسن کا جامع ہے۔ کسی ملک اور قوم کا محض عقاید و عبادات سے وابستہ رہنا اور اس تمدن سے کنارہ کشی اختیار کر لینا جو ان دینی تعلیمات اور ان کے وسیع، جامع اور لچکدار اصول کے ماتحت پروان چڑھا ہو اور کسی اجنبی تمدن کا اختیار کر لینا' دین کو عبادت گاہوں اور مذہبی رسوم (RITUALS) میں محدود اور ان ممالک کو تہذیبی و معاشرتی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دینے کے مرادف ہے۔ جہاں تک ان مسلم ممالک کا تعلق ہے جو مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ہیں، ان میں دانایانِ فرنگ کی سازش پورے طور پر کامیاب ہو گئی ہے، جنھوں نے ان ممالک کو چند عبادات اور اسلامی شعائر کو چھوڑ کر بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور حکومت کے دفاتر سے لے کر قومی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں، سکونتی مکانات اور ہوٹلوں میں بعض اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی مسلم ملک میں ہیں یا کسی خالص مغربی ملک میں۔ ملی تشخص اور دین کے ساتھ زندہ اور طاقت ور ربط کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے لیے پیدا کیا ہوا مخصوص تمدن اور طرزِ زندگی بھی ان ملکوں میں کارفرما ہو کہ تمدن اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے[2]۔

عالمِ اسلام کی اس وقت ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فکری قیادت اُبھرے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت و اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیبِ جدید کے مختلف سانچوں، مکاتبِ فکر اور طریقہ ہائے عمل کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جو تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "قانون اسلامی میں تدوینِ جدید کی ضرورت" ص ۲۵۱ - ۲۵۵

[2] اس موضوع پر مصنف کا مستقل رسالہ ملاحظہ ہو "اهمية الحضارة في تاريخ الديانات وحياة اصحابها" ص ۲۷۶ تا ۲۸۱ (مذہب کی تاریخ اور ان کے پیرؤوں کی زندگی میں تمدن کی اہمیت) شائع کردہ دارعرفات رائے بریلی۔

محفوظ، ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو۔ حقائق اور وسائلِ قوت اور مغز کی طرف توجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ اُلجھے۔ مغربی تہذیب اور علوم کے ساتھ خام مال (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر اور زندگی کا ایک ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدے اور اس کے اصولِ اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ یہ وہ انقلاب انگیز اور مجتہدانہ کام ہے جس کے بغیر عالمِ اسلام حقیقی طور پر آزاد اور خود کار نہیں ہو سکتا۔[1]

۹۔ ان حکومتوں کو جو مسلم اکثریت کے مالک ہیں دین پسند اور اسلام دوست عناصر سے برسرپیکار ہیں اور وہاں ایک معنوی و اقتصادی نسل کشی (GENOCIDE) کی مہم جاری ہے، اور اس پر اس ملک کے قائدین اور حکمرانوں کی (جو کسی فوجی انقلاب کے نتیجہ میں یا کسی سازش کے ماتحت) حکومت و اقتدار میں آگئے ہیں۔ بہترین توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، نیز بعض ان عرب ممالک کے سربراہوں کو جو دینی حقائق و مفاہیم اور شرعی احکام و نصوص میں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو ان کے سیاسی اغراض، شخصی کمزوریوں یا غیر ملکی منصوبوں کی کامیابی میں مدد کر سکیں۔ یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ یہ حکمتِ عملی بے نتیجہ، قومی سالمیت اور استحکام کے لیے مضر اور انتشار انگیز کوشش ہے جو ہر مسلم ملک میں ناکام ہو چکی ہے۔ ان کو ان مقاصد اور کوششوں کی طرف متوجہ کرنا جو ملک کے لیے حقیقی طور پر مفید اور اس کی طاقت و حفاظت کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح سے ان مسلمان حکومتوں اور ان کے سربراہوں کو جن کے دل میں اسلام کی عزت و محبت ہے۔ شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اسلامی قوانین کے اجراء پر اور اس مقصد کے لیے مناسب فضائل اور ماحول تیار کرنے پر آمادہ کرنا اور اس بات کا یقین دلانا کہ یہ تبدیلی خدا کی طرف سے فتح و نصرت اور معاشرہ میں سعادت و برکت پیدا ہونے کا موجب ہوگی۔

اسی کے ساتھ عالمِ اسلام میں ایک ایسی مرکزی قیادت کے عالمِ وجود میں آنے کی فکر و سعی جو "شورائیت" کے اسلامی اصول اور تعاون علی البرّ والتقویٰ کی بنیاد پر قائم ہو اور اپنی اس کوتاہی اور محرومی پر کم سے کم تاسف و ندامت کہ اس وقت عالمِ اسلام خلافت کے اس ضروری ادارے اور اس مبارک نظام سے محروم ہے جس کے قیام کے مسلمان مکلف بنائے گئے تھے اور جس سے محرومی کا جرمانہ وہ مختلف شکلوں میں ادا کر رہے ہیں۔

۱۰۔ جہاں تک خالص غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے وہاں اسلام کا ایسا مؤثر اور معقول تعارف اور اس طرح اسلامی دعوت کا پیش کرنا جو اسلام کے مزاج اور اس زمانہ اور ان کی قوموں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس لیے کہ ان ممالک میں (صحیح دین اور روحانی و اخلاقی تعلیم کا خلا موجود ہونے اور تہذیبِ حاضر کی ناکامی کی وجہ سے) اسلام کے لیے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اس کی اشاعت کا وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں مسلم اقلیتیں پائی جاتی ہیں وہاں مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کے آزاد و خود کفیل انتظام، اپنے پرسنل لا کے تحفظ، نئے نئے قوانین کے بارے میں بیدار مغزی اور خودداری کا ثبوت دینے کے ساتھ ان ممالک کی

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "عالمِ اسلام کا سب سے بڑا خلا"۔

[2] ملاحظہ ہو دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش اور مسلم پرسنل لا بورڈ (مونگیر) کی طرف سے شائع کیا ہوا لٹریچر۔

اخلاقی قیادت کے خلا کو پُر کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کو صرف وہی پُر کر سکتے ہیں بلکہ جس کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنی افادیت وضرورت ثابت کر سکتے ہیں بلکہ اس برسر انحطاط معاشرہ اور ان زوال پذیر ملکوں کے نجات دہندہ اور معمار بن کر ان کے محبوب رہنما اور محترم قائد بھی بن سکتے ہیں[1]۔ اور اس طرح اسلام کے لیے خدمت اور ان مسلمانوں کے لیے عزت و اعتماد کا راستہ کھل سکتا ہے جو مخصوص سیاسی حالات اور گذشتہ تاریخ نے اگر بند نہیں تو سخت و شوار گذار بنا دیا ہے۔

تاریخ انسانی بلکہ درحقیقت نسل انسانی کی اس نئی صدی کے آغاز میں ایسے مردانِ کار کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے، جو نہ صرف اسلام بلکہ عصرِ حاضر کی ان ضرورتوں کی تکمیل کریں اور ایسے مجتہدانہ اور جرأت مندانہ اقدامات کریں جو تاریخ کے دھارے کو بدل دے۔ زمانہ کا حقیقت شناس، فراخ نظر اور کشادہ دل مورخ قلم ہاتھ میں لیے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ وہ ان کارناموں کو سنہرے حروف سے لکھے اور ان کے انجام دینے والوں کو خراجِ عقیدت ادا کرے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "تحریک پیامِ انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو" شائع کردہ "حلقہ پیامِ انسانیت"، لکھنو۔

سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول

قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

سرکارِ دو عالم فخرِ بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں بلکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے جو کسی شخص واحد کا دستورِ زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لیے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ جُوں جُوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا اُسی حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لیے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اُس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نہ معلوم کہاں تک جا پہنچے لیکن وہ کہیں بھی پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین و آسمان اور فضاء، خلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اُس کے تدین کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم و اصلاح کے لیے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون و اطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت وانک لعلیٰ خلقٍ عظیم کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی اس خلقِ عظیم کی سیرت و اخلاق کے سلسلے میں پُوچھا گیا تو فرمایا کہ:

وکان خلقہ القرآن۔

آپ کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے۔ اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحب سیرت علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ:

ولا تنقضی عجائبہ ولا یخلق عن کثرۃ الرد۔

اس قرآن کے عجائبات (علوم و معارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پُرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دِل اکتا جائیں)

اس سے صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے اور نکل بھی سکتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منقضی ہونے والے نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں یہ لا محدود عجائبات علمی صورت میں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، گویا ایک علمی قرآن ہے جو اوراق میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دُوسرے پر من و عن منطبق ہیں، پس قرآن کا کہا ہوا حضور کا کیا ہوا ہے اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہُوا ہے، اس لیے قرآنِ حکیم کی یہ

ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرت مقدسہ کے علمی اور تعارفی ابواب ہیں اور ادھر سیرت کے یہ ہزاروں گوشے قرآن کے عملی پہلو ہیں پس قرآن میں جو چیز قال ہے وہی ذاتِ نبوی میں حال ہے اور جو قرآن میں نقوش و دوال ہیں وہی ذاتِ اقدس میں سیرت و اشکال ہیں، اس لیے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں متشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس قرآن حکیم کے مختلف مضامین اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں، قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ کے عقائد ہیں اور احکام کی آیتیں آپ کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ کا استدلال ہیں اور تشریح کی آیتیں آپ کا حال، قصص و امثال کی آیتیں آپ کی عبرت ہیں اور تذکیر کی آیتیں آپ کی موعظت، خدمتِ خلق کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں اور کبریائے حق کی آیتیں آپ کی نیابت، اخلاق کی آیتیں آپ کا حسنِ معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپ کا حسنِ معاشرت، توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ کی خلوت ہیں اور تربیت خلق اللہ کی آیتیں آپ کی جلوت، قہر و غلبہ کی آیتیں آپ کا جلال ہیں اور مہر و رحمت کی آیتیں آپ کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپ کا مراقبہ، ترکِ دنیا کی آیتیں آپ کا مجاہدہ ہیں اور احوالِ محشر کی آیتیں آپ کا محاسبہ، نفی غیر کی آیتیں آپ کی فنائیت ہیں اور اثباتِ حق کی آیتیں آپ کی بقائیت، انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں اور ہو کی آیتیں آپ کی غیبت، نعیم جنت کی آیتیں آپ کا شوق ہیں اور جحیم نار کی آیتیں آپ کا وہم و غم۔ رحمت کی آیتیں آپ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپ کا خوف، انعام کی آیتیں آپ کا سکون و انس ہیں اور انتقام کی آیتیں آپ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپ کا بغض فی اللہ ہیں اور امن و ترحم کی آیتیں آپ کا حبِ فی اللہ، نزولِ وحی کی آیتیں آپ کا عروج ہیں اور تعلیم و تبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذ اوامر کی آیتیں آپ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپ کی عبادت، وغیرہ وغیرہ۔ بغرض کسی بھی نوع کی آیت لو وہ آپ کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے اور آپ کی سیرت اُس کی تفسیر، جس سے صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زریں مقولہ وکان خلقہ القرآن سے قرآن اور ذاتِ اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے اس لیے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے تو سیرت نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور اگر قرآن علمی طور پر تاقیام قیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامعہ بھی تا یوم محشر اپنے شاخ در شاخ عملی اسووں سے اقوامِ عالم کی تکمیل و تسکین کی کفیل رہے گی۔

اس توجیہہ و استدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے، قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہو جاتے ہیں، اس لیے اگر قرآن حضور کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لیے کتب حدیث کے ہزاروں ابواب و فصول درحقیقت سیرت مقدسہ ہی کے ابواب و فصول ہیں جن سے گذر کر ہی آدمی اقلیم سیرت میں داخل ہو سکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن و حدیث سیرت مقدسہ کی تعبیر ہے اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے مضامین کی ترتیب میں جو درحقیقت سیرت مقدسہ اور حیات نبوی کے مراتب کی ترتیب ہے اولیت ایمان و عقائد کو اور پھر عبادات کو

دی گئی ہے ، فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق پھر اُس کی ربوبیت عامہ پھر رحمت عامہ اور پھر مالکیت عامہ اور پھر عبادت و استعانت سے شروع کیا گیا ہے، سورۂ بقرہ کو لو تو اُس کی ابتدا بھی ایمان بالغیب اور نماز و انفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے، بہرحال قرآن میں اولیت عقاید اور عبادات کو دی گئی ہے۔

اُس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے، اسی طرح عموماً کتب حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب و فصول کی ابتدا کتاب الایمان پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد اخلاق معاملات نکاح طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف پھر وسائل معاش زراعت تجارت صنعت وحرفت ملازمت اور پھر ان معاملات نفاذ کے لیے قضاء، تعزیرات وکفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لیے آخر میں خلافت وامارت اور جہاد و سیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرت مقدسہ ہی کے ابواب ہیں، لیکن اس ترتیب نبوی اور اس کی متابعت ہیں ان ترتیبات نائبانِ نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں، خود حضورؐ نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا:

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وصوم رمضان وحج البیت ان استطاع الیہ سبیلا۔ (مشکوٰۃ)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز کا قایم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج اگر استطاعت ہو۔

جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں اور انتظامی اور سیاسی ابواب اُس کے محافظ ہیں جو ابعدیت کا درجہ رکھتے ہیں تاکہ یہ بر وتقویٰ اور یادِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظام سیرت نبوی میں رخنہ کی جرأت نہ ہو۔

قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت ودیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اُس کا وسیلہ قرار دیا ہے، فرمایا:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

اگر ہم ان (مسلمانوں) کو زمین کی سلطنت دے دیں تو یہ نماز قایم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رکھیں گے۔ الخ

یہی وجہ ہے کہ دین ودیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد وجنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی گئی دی گئی ورنہ نہیں دی گئی، حضورؐ نے بھی اعلانِ نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ کو تربیت دی وہ یہی ایمان باللہ، مبدا، معاد، توحید رسالت اور سزا وجزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کے لیے عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادت اور تقدس ہے اور وُہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے یعنی اس کا طبعی رُخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادات انجام دیں جن میں رضائے الٰہی اور یادِ خداوندی کی روح کار فرما ہو، وُہ جو کچھ بھی کریں اللہ کے لیے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کے بجائے ربّانی راہ اختیار کریں، اور ان کا ہر عمل مجاہدہ و جہاد ہو یعنی عبادت ہو عادت نہ ہو جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو اعلائے نفس نہ ہو حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیل پاک حضرت ابراھیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لاشریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین۔

کہہ دو (ابراہیم) کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔

یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ نے اپنی دعا میں کھولا ہے، فرمایا:

اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکّلت وبک خاصمت والیک حاکمت والیک انبت والیک المصیر۔

اے اللہ میں تیرے ہی لیے اسلام لایا اور تیرے ہی اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حکم مانا اور تیری ہی طرف میں ہر جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا تھا تو تفویض کے عجیب و غریب عنوانات اُن کی زبانوں پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے اور پھر اُٹھتے اور پھر وہی رباعی پڑھ کر پھر سجدہ میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرّہٗ ہیں، فرمایا:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و بہ زیرِ پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و از برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہر وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکر الٰہی تفویض مطلق اور عبادت خداوندی کی روح تھی۔ گویا اسی کے لیے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا کہ اُس میں یہ ذکر و فکر کی رُوح پھونکی جائے، چنانچہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکر آخرت سے بھرپور تھا، ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ:

کان یذکر اللّٰہ علیٰ کل احیانہ۔

آپ ہر لمحہ ذکر الٰہی میں لگے رہتے تھے۔

اور فکر دائمی کے بارے میں ارشاد حدیث ہے کہ:

کان دائم الفکرۃ حزینا۔

آپ ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔

پس آپ کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست نہ غلبہ وقہر تھی نہ تسلط واستیلاء، نہ تعیش تھی نہ تزین، نہ آرائش زیبائش تھی، نہ راحت طلبی وآسائش بلکہ بندگی سرافگندگی، نیازکیشی عبودیت اور طاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی نقل وحرکت تھی وہ اسی فکر دائمی اور ذکر دوامی کے رنگ میں تھی، قرآن نے اسی ذکر وفکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور اولو الالباب یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

الذین یذکرون اللّٰہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض۔

(دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ ہیں۔

پس قرآن کی رو سے محض متفکر بھی دانشمند نہیں جبکہ وہ ذاکر نہ ہو اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جبکہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو، حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی، عقل بھی ہو اور عشق بھی، محبت بھی اور ہوش بھی۔ پس حضورؐ کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی، جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی وہیں آپ کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی سرکارِ دو عالمؐ خلیفۂ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی دے رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصل فرما رہے ہیں جہاد کے لیے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کر رہے ہیں حدود و قصاص کا اجراء بھی ہو رہا ہے، فتوحات ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کیے جا رہے ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر صحن مسجد میں ذکر اللہ اور فکر آخرت کے ساتھ کیا جا رہا ہے یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادت الٰہی کے ہی رنگ میں تھا ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اُس میں کارفرما تھی اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسبِ حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان وعبادت اور ذکر وفکر تھا جس میں عقل وعشق، محبت و بصیرت، مادیت وملکیت، امارت ومسکنت، خلافت وعبادت کا کامل اجتماع و امتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے لگ نہیں بنا سکتی تھی، حتیٰ کہ آپ غزوات اور جنگوں میں بہ نفس نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ ان کی قیادت فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور رنگِ عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں

ادا ہوتی تھی عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جبکہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی، بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی۔ سہ

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز

قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان و عبادت تھا جس کے لیے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے، پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی۔

اب اس سیرت جامعہ کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ سیرت مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس۔ تعلق مع النفس کے سلسلہ میں پاک دامنی و پاک نفسی عفت و عصمت، حیاء و انکسار، غیرت و حمیت، ہمت و شجاعت، صبر و سماحت، حلم و ضبط، اعتماد و توکل، زہد و قناعت، مجاہدہ و ریاضت، تحمل شدائد و مصائب اور خدا ترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاق حمیدہ آپ کی فطرت صالحہ کا خمیر تھے۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت و اعانت، جود و سخا، ایثار و عطاء، راحت رسانی اور کف اذی (ایذا رسانی سے بچنا) عفو و درگزر، محبت و شفقت، دلسوزی و ہمدردی، تعلیم و تربیت، ارشاد و تزکیہ وغیرہ آپ کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

اور تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ، کسر شہوات و لذات، تقرب و انابت، توبہ و استغفار، تہجد و شب بیداری، ذکر اور فکر وغیرہ آپ کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔

لیکن ان تینوں تعلقات میں تعلق مع اللہ ہی دونوں تعلقات کی استواری کی رُوح تھی جو نفس و خلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے۔ اگر نفس انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اُس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، آج بھی جو لوگ اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں وہ طرح طرح کی مہلک لغزشوں کا شکار اور نفسانی جذبات میں گرفتار ہیں جن کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ و فساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔

آج یورپ میں عقل و فہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور اُن کی تدابیر کی کمی نہیں حتیٰ کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لیے متحدہ کونسل یو، این، او بھی قائم ہے جس میں رات دن ممالک کے معاملات آتے رہتے ہیں۔ خانگی زندگی کے لیے تربیتوں کے بے انتہا ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لیے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود انہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ ہی واضح ہے کہ گھر اور باہر سے چین اور سکھ مفقود ہے یہی نفوس جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے امن و اطمینان کی ہوا تک سے بھی کوسوں دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ فقدان اسباب نہیں کہ وہ تو سب مہیا ہیں بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خدا پرستی خوف

آخرت اور مالک الملک کے سامنے جواب دہی کا فکر معدوم ہے۔ اعتقاداً ہو یا عملاً جوان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا جس سے ان نفوس میں جذبہ القیاد واتباع حق کے بجائے خودرائی اور خود بینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں۔ مدار کار غرورِ نفس ہے یقین حق نہیں جس کے تحت خود غرضیوں، اور قومی ونسلی اور وطنی تعصبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وبا سکون وامن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا اُن کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات بھی لیے ہوئے اور اُن کی جبری قیادت کا جواسروں سے اتار پھینکنا بھی چاہتی ہے۔ یہ محبوبیت کا فقدان اُسی خدا پرستی کے نہونے اور خود پرستی کے ہونے سے رونما ہے، جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے ہموار رہنا ممکن نہیں، اسی لیے حضرت صاحب سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرت مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطہ حیات ارشاد فرمایا کہ:

من اصلح فیما بینہ وبین اللہ اصلح اللہ فیما بینہ وبین الخلق۔ (کنز العمال)

جس نے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ درست کر لیا تو خدا اُس کا اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ خود درست فرما دیتا ہے۔

اس لیے اگر آج ہم اس سیرت پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں تو اُس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے اُن کی رُوح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی بنانا ہوگا۔ جیسا کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

اب اگر ہم سیرت عبادت واخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہو کر مثلاً محض قہر وسیاست اور اقتدار وغلبہ کی سیرت کو مطمح زندگی بنالیں جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض یعنی کٹکھنا ملک ہو کر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی ظلم وستم، زبردستی اور زبردست آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہیت عامہ کو مقصد زندگی ٹھہرالیں جس میں خدا ترسی اور اخلاقی قدریں نہوں تو وہ کوری خود غرضی نمود نمائش اور شہرت پسندی ہو کر رہ جائے گی جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح وذم سے بالاتر ہو کر غناء واستغناء کی دولت نصیب نہ ہو سکے گی۔ پھر اسی کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہو کر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاون باہمی کی اُن تمام توتوں سے محروم ہو جائیں گے جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت انجام نہیں پا سکتی جو سیرتِ پاک اور طبیعتِ اسلام کے تقاضے ہیں بلکہ اس قید تنہائی میں گلہ سے الگ ہو کر کسی وقت بھی نفس وشیطان کی مکاریوں سے پناہ نہیں پاسکیں گے جنھوں نے خلوت گزیں راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمتِ نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے انقطاعی عبادت بلا خدمتِ خلق رہبانیت ہے اور ریاست بلا عبادت ملوکیت واستبدادیت ہے اور ظاہر ہے کہ نہ رہبانیت حضورؐ کی سیرت ہے نہ

ملوکیت نہ نفسانیت آپ کی سیرت ہے نہ انانیت، کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتی ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رو نقشوں اور رسوم کے ساتھ اجزاء سیرت بھی نہیں کہلائی جا سکتیں کہ انھیں جزوی سیرت ہی کہا جا سکے، البتہ جب اس خدمت خلق اور خدمتِ نفس کے خانوں میں اخلاق و عبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور یہ سب اجزاء اپنے مطلوبہ نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں تو پھر اُس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اُس کا کام کرنا چاہتے ہیں، اب اُسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت، نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی ہر نقل و حرکت کا مرجع و محور اپنے رب کو بنا لے گا، پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم کی جامع ترین سیرت ہے جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ ہے اور (رعایا) کی الگ۔ اُس میں دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، انفرادیت بھی ہے اور اجتماعیت بھی، خدمت بھی ہے اور عنائیت بھی۔ اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرت صالحہ کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر اُن پر عقل کی حکومت ہو، عقلی نظریات بھی ہوں مگر اُن پر وحی الٰہی کی نگرانی ہو، آزادیِ ضمیر بھی ہو مگر اُس میں حق کے ساتھ تقید ہو غرض، نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز بھی پامال نہ ہو، سب کے تقاضے کارفرما رہیں مگر ہر ایک کی نقل و حرکت کا محور طاعتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیِ حق سے آزاد نہ ہوں، بس اسی جامعیت اور اعتدال کامل کا نام سیرت مقدسہ حضرت خاتم الانبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

آج اگر ہم اپنے نونہالوں کے لیے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اُونچے پیمانہ کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں بے راہ روی، بے قیدی، بد اعتقادی اور اصول سے آزادی نہ ہو اُن کی نگاہ خدا پر ہو اور اُسی پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوں اور دُوسری طرف وُہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات و معاملات میں دیانت، صداقت، راست گوئی اور راست بازی ہو شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد اُن پر غالب ہو، ایک طرف وہ مساجد و مدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں فروغ پا رہا ہو، ایک طرف اُن کی خلوت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دُوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر اُن کی عدل گستری سے معمور ہوں، ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال اور خوش مآل ہوں اور دوسری طرف دُوسرے ملک ان کی طرف رجوع لا کر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات و معاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھیں بلکہ اُن کے مثالی معاملات سے درس بھی لیں تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرت جامعہ کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انھیں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پیشتر انسانوں کی یہ دنیا دین کے نام سے تو رہبانیت اور انقطاع کا شکار تھی، ترکِ لذّات اور ترکِ مرغوبات ہی اصل دین بن گیا تھا تعذیب جسمانی ہی کا نام تہذیب روحانی رکھ لیا گیا تھا اور اس قسم کے لوگ ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر پہاڑوں کی کھوہ اور وِتروں میں چھپے ہُوئے پڑے تھے نہ وہ دنیا کے کارآمد تھے نہ دنیا ان کے کام کی تھی، جن کو حدیث نبوی میں فتلک بقایاھم فی الصتوامع والدیار سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اور

میں توحید و عدل کا رنگ صاف نمایاں ہوگیا، توحید نے لاکھوں انسانوں کی کثرتوں کو ایک کرکے اُن میں جماعتی عبادت کا جذبہ پیدا کیا اور عدل و مساوات نے اونچ نیچ میں پڑے ہُوئے بے اعتماد انسانوں میں اعتماد باہمی اور مابین خدمت و تعاون کے جذبات پیدا کر دیے جس سے اُن میں یکسانی آگئی اور اس طرح پہاڑوں میں پڑے ہُوئے رہبان تو منظرِ عام کی عبادت گاہوں میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے اور عرشِ حکومت پر بیٹھے ہُوئے ملوک فرشِ خاک پر اُتر کر عوام کے ساتھ آملے، ادھر جو لوگ استبداد پسندوں کی غلامی میں پڑے ہُوئے دم توڑ رہے تھے اُن میں حوصلے پیدا ہوئے اور وہ اس آزادی و حریت کی چمک دمک دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں توڑ کر میدان مساوات میں آگئے، اور جو لوگ تمدن کی ظاہری چمک دمک پر فریفتہ رہ کر خالق کے سامنے سرِ عبودیت جھکانے کا وقت ہی نہیں پاتے تھے وُہ اپنی دنیا کے جھرمٹ میں رہ کر بھی دین سے محروم نہ رہے، غرض اس سیرت مقدسہ نے مرتی ہوئی دنیا کو سنبھال لیا اور مادیت و روحانیت اور دیانت و سیاست کے صحیح امتزاج سے ایک ایسی مخلوط اور معتدل راہ دکھائی کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہ کر دین اور دنیا دونوں سے متمتع ہونے کے قابل بن گیا۔

آج تیرہ سو برس کے بعد دنیا کا نقشہ پھر وہی بن گیا ہے جو تیرہ صدی پیشتر بنا ہوا تھا، آج بھی مشرق و مغرب کی دنیا دو ہی گروپوں میں بٹی ہُوئی ہے، ایک طرف امریکن گروپ ہے جو مغرب پر اثر انداز ہے اور دوسری طرف "رشین" گروپ ہے جو مشرق پر اپنے اثرات قایم کیے ہُوئے ہے، آج دنیا کی ہر چھوٹی بڑی ریاست انہی دو گروپوں میں سے کسی ایک کے ماتحت یا زیرِ اثر رہنے پر مجبور ہے اور پوری دنیا دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہے، وہی ملوکیت، وہی اقتدار پرستی، وہی اونچ نیچ اور وہی آقائی اور غلامی کے جراثیم مثل سابق پل پل کر شباب پر آئے ہُوئے ہیں۔ قیصریت نے امریکیت کا چولا پہن رکھا ہے اور کسرویت نے رشیائیت کا لباس زیبِ تن کیا ہُوا ہے فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے شخصی اقتدار بلا واسطہ کار فرما ہوتا تھا اب وہ عوام کی آڑ میں کام کرتا ہے، پہلے اُس کا نام شخصیت تھا اب جمہوریت ہے، بہرحال جو نقشہ فارس و روم کا تھا وہی اب یکہ و روس کا ہے فرق صرف شخصیت و عوامیت کے عنوان کا ہے۔ ع

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

لیکن جس سیرت مقدسہ نے اُس وقت کی قیصریت و کسرویت کا زور توڑا تھا وہ آج کی قیصریت و کسرویت کا بھی صحیح علاج کرسکتی ہے، اور جس سیرت کی ہمہ گیر معنویت سے اُس وقت کے دو عالمگیر گروپوں کی قوت ٹوٹی تھی وہی آج بھی اس گروپ بندی کا نقشہ بدل سکتی ہے، اور وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ ہے جس میں نہ شخصیت ہے نہ رسمی جمہوریت، نہ رہبانیت ہے نہ عوامیت نہ کوری سیاست خشک دیانت بلکہ اصل خلافت ہے خواہ وہ شخص کے پردہ میں کام کرے یا جماعت کے، اصل دیانت ہے خواہ وہ سیاست کے چولے میں نمودار ہو یا عبادت کے بھیس میں اصل توجہ الی اللہ اور خوفِ آخرت ہے خواہ وُہ تدین کے روپ میں نمایاں ہو یا تمدن کے لباس میں، غرض ان دونوں سے بالاتر ہو کر سیرتِ نبوی نے وہ ہمہ گیر اصول پیش کر دیا جس کے وسیع دائرہ میں دین و دنیا، دیانت و سیاست، انفرادیت و اجتماعیت سب باقی بھی رہیں اور اُن کے اصلی جوہر کارآمد بھی ہوگئے اور پھر ان دونوں متضاد کناروں کو اس ہمہ گیر اصول میں جوڑ کر اُن کی آمیزش سے ایک ایسا جامع رنگ

دنیا کے سامنے لا رکھا جس سے اب تک دنیا ناآشنا تھی آج کی ناہموار دنیا ہمواری کی تلاش میں ہے اور آج کے جدید تمدن کے پجاری خود اپنے تمدن کی مبالغہ آرائیوں سے تنگ آ چکے ہیں انھیں خود ایک معتدل مسلک کی تلاش ہے، وُہ آج کی مدنیت کے انتہا پسندانہ جذبات سے عاجز آ کر خود ہی دوسرا راستہ مانگ رہے ہیں اور اس تمدن کی کشمکش اور بے سکونی و بے اطمینانی سے پریشان ہو کر سکون دل کی تلاش میں ہیں جو تمدن کو چھوڑے بغیر اور رہبانیت اختیار کیے بغیر انھیں مل جائے، تو کیا یہ جامع راستہ انھیں بجز اسی سیرتِ مقدسہ کے کہیں اور دستیاب ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں یہود و نصاریٰ سے تو یوں نہیں کہ وہ خود ہی ایک متلاشی کی حیثیت سے سرگرداں ہیں اور پھر اُن کے سوا کسی اور قوم سے یُوں نہیں کہ اور سب قومیں ان ہی متمدنوں کی نقالی اور پیروی کو آج اپنی بقاء و ارتقاء کا راستہ سمجھ رہی ہیں اس لیے یہ ذمہ داری اسی قوم کی ہو سکتی ہے جس کا نام اس سیرت کی پیروی سے مسلم ہوا تھا اور جس طرح اس قوم نے اس ذمہ داری کو تیرہ صدی پیشتر پورا کیا تھا آج بھی وہی پُورا کر سکتی ہے، ہاں اگر یہ قوم اپنی ذمہ داری ہی محسوس نہ کرے تو جس خدا نے ذمہ داری نباہنے پر اس قوم کے لیے اپنا وعدہ استخلاف پورا کیا تھا اور اس قوم کو زمین کی سلطنت عطا کی تھی جیسا کہ آیت استخلاف میں ارشاد ہے:

وعد الله الذين اٰمنوا منكم وعملوا الصّٰلحٰت ليستخلفنهم فى الارض۔

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان سے جو ایمان لائے اور عمل صالح اختیار کیا کہ انھیں زمین میں خلافت دے گا (اور سلطنت عطا فرمائے گا)

وہی خدا اس ذمہ داری کو محسوس نہ کرنے پر وعید استبدال بھی پُوری کر سکتا ہے کہ اس قوم سے زمین کی سلطنت چھین کر دُوسری قوموں کے حوالے کر دے جیسا کہ آیت استبدال میں ارشاد ہے:

وان تتولوا يستبدل قوما غيركم ثم لا يكونوا امثالكم۔

اور اگر تم (اس دین کی خدمت سے) پھر جاؤ گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم بدل کر لے آئے گا اور وہ تم جیسے (سُست اور کاہل) نہ ہوں گے۔

پس جیسے استخلاف کا وعدہ اپنے وقت پر پورا کر دیا گیا ایسے ہی استبدال کی وعید بھی اپنے وقت میں برسرِ کار آ سکتی ہے، پس آج ضرورت ہے کہ مسلم قوم اُٹھے اور سیرتِ مقدسہ کو پریشان دنیا کے سامنے پیش کرے مگر نہ اس طرح کہ سیرتِ مقدسہ ایک نعرہ ہو کر رہ جائے بلکہ اسوہ اور نمونہ عمل کے لباس میں سامنے آئے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایسی شخصیتیں اس کام کو آگے بڑھائیں جو اس سیرت سے ہم آہنگ ہوں یعنی سیرت کی ترویج محض لٹریچر محض پروپیگنڈہ اور محض کانفرنسوں سے نہیں بلکہ صحیح لٹریچر کے ساتھ صحیح شخصیتوں اور ایسے عملی نمونوں سے ہو سکتی ہے جو تقشف اور زہدِ خشک سے بھی بالا ہوں، اور فکری بے قیدیوں اور آزادروشی سے بھی بری ہوں کیونکہ جہاں قوم کی اجتماعیت کو ایسے افراد سے نقصان پہنچ رہا ہے جو تقشف کی راہ سے جمود محض اور رہبانیت کو سیرت سمجھے ہُوئے ہیں وہیں ایسے طبقات سے بھی مضرت پہنچ رہی ہے جو آزادی ضمیر اور حریت فکر کے نام پر دین میں طبع آزمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے راہ بنانے کا نام سیرت رکھے ہوئے ہیں، اگر پہلے طبقہ کے نزدیک آیات و روایات

اور سلف کے اقوال و مقالات میں محدود رہنے کے معنی ہر فکری قوت کو زائل کر دینے اور ہر عبرت و بصیرت سے کنارہ کش ہو جانے کے ہیں تو دوسرے طبقہ کے نزدیک ان روایات سلف کے تمام مقالات اور ان کی قایم کردہ حدود کو توڑ دینے کا نام استنباط فکر اور حریت رائے کے ہیں، لیکن یہ دونوں چیزیں سیرت سے تعلق نہیں رکھتیں، جمود کے طریقہ کو تو قرآن حکیم نے دعوتِ فکر دے کر آیتِ ذیل سے ردّ کر دیا ہے کہ:

ولیتذکر اولوا الالباب ۔

اور چاہیے کہ تذکر کریں دانشمند۔

اور فرمایا:

لم یخروا علیھا صما و عمیانا۔

(آیات الٰہیہ کی یاد دہانی پر) وہ بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ فکر و بصیرت سے حقایق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں)

اور آزادیٔ نفس کے طریقہ کو قرآن حکیم نے آیت ذیل سے مردود قرار دیا ہے:

ثم جعلنا علی شریعۃ من الامر فاتبعھا و لا تتبع اھواء الذین لا یعلمون ۔

پھر ہم نے آپ کو قانونِ شریعت پر قایم کیا ہے تو اسی کا اتباع کیجیے اور جاہلوں کی اھواء (تخیل آفرینی) کی پیروی نہ کیجیے۔

پس یہ دونوں راستے سیرت کی اقلیم تک پہنچانے والے نہیں، جس سے صاف واضح ہے کہ سیرت کا ایک رکن اگر تقلید کامل ہے تو دُوسرا رکن اصول حقہ کی روشنی میں تدبر کامل بھی ہے، چنانچہ تقلید کامل کے بارے میں تو تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح سیرت قرآن نے یہ بیان کی کہ:

ما کنت بدعا من الرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحیٰ الیٰ ان انا الا نذیر مبین ۔

میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، میں تو اپنی طرف آئی ہُوئی وحی کے سوا کسی چیز کا اتباع نہیں کروں گا، میں سوائے اس کے کہ ایک کھلا ڈرانے والا ہوں اور کچھ نہیں۔

اور آیات الٰہیہ کی روشنی میں فکر و بصیرت کی آزادی کے بارے میں سیرتِ پاک یہ بیان کی ہے:

قل ھذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا و من اتبعنی ۔ (۱۲: ۱۰۸)

فرما دیجیے کہ یہ ہے میرا راستہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں۔

بہرحال اپنی اپنی حدود میں پابندیٔ کامل اور آزادیٔ کامل کے کامل امتزاج کا نام سیرت ہے جس سے واضح ہے کہ ذہن میں آزادی کے

معنی اصول کے اندر آزادی کے ہیں اصول سے آزاد ہو جانے کے نہیں اور دین میں پابندی کے معنی منقول پروگرام کی پابندی کے ہیں۔ خیالی یا رد اجی پروگرام کی پابندی کے نہیں، اس لیے بے بصیرت متقشف بھی سیرت کی راہ نہیں چل سکتا اور اصول سے آزاد مفکر بھی اس سیرت کی راہ نہیں پا سکتا، سیرت ان دونوں راستوں کے بیچ میں ہے جس میں پابندی اور آزادی حریت اور عبدیت فکر اور اتباع استنباط اور ادب قانون اور اخلاق عقل اور عشق ذکر اور فکر تعلق مع اللہ اور تعلق مع الخلق دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہوں نہ پابند بے حریت سیرت پر ہوگا نہ آزاد بے عبدیت، نہ مفکر بے اتباع سیرت سے مربوط ہوگا نہ مجتہد بے ادب نہ مقنن بد خلق سیرت سے متعلق رہ سکتا ہے نہ خلیق الا قانون نہ عاقل بے عشق سیرت پا سکتا ہے نہ عاشق بے عقل نہ ذاکر بے بصر اصل سیرت پر ہے نہ مبصر بے ذکر نہ دیانت بے خدمت سیرت ہے نہ خدمت بے دیانت بلکہ دونوں کی معتدل آمیزش سے جو جامع اسوہ بنے گا وہی سیرت مقدسہ ہے۔

پس اس جامع سیرت میں جہاں گلیم پوشی ہے وہیں عالمی حکمرانی بھی ہے جہاں شاہی ہے وہیں درویشی بھی ہے جہاں انا النبی لا کذب کا نعرۂ جلال ہے وہیں لاتقولوا انا خیر من یونس ابن متّی کا نعرۂ جمال بھی ہے، وہاں جس طرح ایک ہاتھ میں خدا کی روشن کتاب ہے وہیں دوسرے ہاتھ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی چمکتی ہوئی تلوار بھی ہے، وہاں جس طرح البغض فی اللہ کے تحت اللہ اکبر کا رجز ہے وہیں حب فی اللہ کے تحت مکہ کو انت احب البلاد الی اللہ کا خطاب بھی ہے وہاں جس طرح خانگی زندگی میں کلمینی یا حمیرا کلمی کے محبت آمیز مخاطبات ہیں وہیں بین الاقوامی زندگی میں سلاطین عالم کو فرامین نبوت کے ذریعہ خطاب بھی کیا جارہا ہے، غرض انا الضحوک اور انا القتال کے نعرے بیک وقت جمع ہیں اور شدت و رحمت ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اللہ کی طرف سے اپنے رسول کو یہ بھی حکم ہے کہ فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم اور یہ بھی امر ہے کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم نہ شدت میں رحمت مانع ہے نہ رحمت میں شدت، نہ جہاد میں مجاہدہ نفس حارج ہے نہ مجاہدہ میں جہاد، قاہرانہ اور مشفقانہ دونوں شانیں جمع ہیں، یہ بھی ارشاد ہے کہ انا سید ولد آدم — اور سچا ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا اور بجا ارشاد ہے، جلو میں عبدالرحمٰن ابن عوف، جابر بن عبداللہ اور عثمان غنی جیسے اغنیاء صحابہ بھی اور ابوذر غفاری، مقداد، عمّار بن یاسر اور ابو ہریرہ جیسے فقراء صحابہ بھی ہیں، حضرت عمر اور خالد جیسے تلوار کے دھنی اور شجاعان عرب بھی قدموں سے لگے ہوئے ہیں اور زید بن ثابت اور حسان بن ثابت جیسے قلم کے دھنی بھی وابستہ دامن ہیں اور سب کے ساتھ اور صدیق اکبر جیسے جامع صفات صحابی بھی، جو ایک امت واحدہ بن تابع فرمان ہیں اور ان سب پر رحمت نبوت کی کرنیں یکسانی کے ساتھ پڑ رہی ہیں لیکن نہ اغنیاء کو فقیر ہو جانے کی ہدایت ہے نہ فقراء کو اغنیاء بن جانے کا امر ہے نہ ارباب سیف کو قلم سنبھالنے کی ہدایت ہے نہ ارباب قلم کو تلوار پر مجبور کیا جارہا ہے، بلکہ سب طبقے اپنے اپنے حال میں مست رہ کر انہی متفاوت احوال سے بارگاہ حق میں واصل ہو رہے ہیں ۔ ع

یوں بہم کس نے کیے ساغر و سنداں دونوں

اسی جامع سیرت پر آپ نے اپنی امت کو تربیت دی اور یہی جامعیت و اعتدال امت سے ہر وقت مطلوب بھی ہے جو اس سیرت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس سیرت سے اُس وقت کی مضطرب دنیا کو امن و چین ملا تھا اور اسی سیرت سے آج کی دنیا کو بھی راہ دکھانے کا

راستہ مطلوب ہے۔

پس آج دولت عزت وجاہت حکومت سب کچھ مل سکتی ہے لیکن اس سیرت میں اسے رنگے بغیر وہ مقبولیت پیدا نہیں کر سکتی۔

اس مختصر تحریر کا موضوع سیرت کے ابواب پر کلام کرنا یا اُس کی تفصیلات بیان نہ تھا۔ جبکہ یہ کسی ایک تحریر میں ممکن بھی نہ تھا، جو سیرت قرآن میں بصورت متن حدیث میں بصورت شرح فقہ میں بصورت مسائل اصول فقہ میں بصورت دلائل اور علماء کی بے شمار تصانیف میں بصورت اجزاء و تفاصیل موجود ہے اُسے کسی تحریر میں کس کا یارا ہے کہ سما کر پیش کرے اور سارے قرآن و حدیث اور فقہ و اصول فقہ کا عطر کھینچ کر ایک کاغذ پر رکھ دے نہ یہ ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے پس اس تحریر کا موضوع سیرت کا پیش کرنا نہیں بلکہ سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول بیان کر کے سیرت کی نشان دہی کرنا تھا تاکہ اس عظیم بین الاقوامی کانفرنس میں اس کی نوعیت کا فی الجملہ تعارف کرایا جا سکے، اگر ہمارے عوام اور ہمارے خواص ہماری قومیں اور ہماری اسلامی حکومتیں اپنے نظام اجتماعی کا آخری نقطہ اور نصب العین کا جزء اخیر اس نشان دادہ جامع سیرت اور اس کی تمرین و ترویج کو بنا لیں جس کی آج دنیا متلاشی ہے تو وہ بلا شُبہ عالمی امن قائم کرنے میں ایک بڑا رول ادا کریں گی، پوری دنیا کی محسن ثابت ہوں گی اور تاریخ کے صفحات میں ان کا نام اور یہ کام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

لہ یہ مقالہ بین الاقوامی سیرۃ النبی کانفرنس منعقدہ ۲۷، ۲۸ فروری و یکم مارچ ۱۹۷۶ء بمقام کراچی میں پڑھا گیا۔ (ادارہ)

سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو

ندیم الواجدی

سیرت کیا ہے؟

لغت میں سیرت کے معنی ہیں طریقہ اور راستہ۔ بعد میں یہ لفظ عام لوگوں کے حالات کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، اذکار اور تعلیمات کے مجموعے پر اس لفظ کا اطلاق ہوا[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے سیرت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

آنچہ متعلق بوجود پیغمبر ما صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرامؓ و آں عظام است و از ابتدائے تولد آنجنابؐ تا غایت وفات آں را سیرت گویند[2]

جو کچھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ اور آں عظام کے مبارک وجود کے ساتھ متعلق ہو اور آنجنابؐ کی پیدائش سے وفات تک واقعات پر مشتمل ہو سیرت کہتے ہیں۔

فقہا اور محدثین کے یہاں لفظ سیرت مغازی اور جہاد کے معنوں میں مستعمل ہے، چنانچہ امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی جامع میں "کتاب السیر والجہاد"[3] اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) کی فتح الباری میں "کتاب المغازی والسیر" کے عنوانات موجود ہیں[4] فقہی کتابوں میں بھی یہ استعمال ہے[5] ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) اور واقدی (م ۲۰۷ھ) کی کتب مغازی کو کتب سیر بھی کہا جاتا ہے اور غالباً اسی لیے اولین بعض سیرت نگاروں نے سیرت پر جو کتابیں لکھیں ان میں غزوات زیادہ ذکر کیے گئے ہیں، لیکن بعد میں یہ فن غزوات ہی کے ساتھ نہیں رہا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی تفصیل سے لکھا جانے لگا۔ مثال کے طور پر ابن سعد (م ۲۳۰ھ) کی "الطبقات الکبریٰ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے احوال بھی لکھے گئے ہیں۔

حدیث اور سیرت کا فرق!

محدثین اپنے فن میں ان تین امور سے بحث کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ کیا کیا؟ اور آپؐ کے سامنے کیا کیا گیا؟

اسی کو قول، فعل اور تقدیر کے اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے[6] ارباب سیر بھی اپنی کتابوں میں یہی تین چیزیں پیش کرتے

---

[1] البستانی۔ دائرۃ المعارف ج ۱۰ ص ۳۰۹ [2] شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) عجالہ نافعہ ص ۱۴ [3] ابوالحسین القشیری (م ۲۶۱ھ) جامع صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۱ [4] حافظ ابن حجر العسقلانی (م ۸۵۲ھ) فتح الباری ج ۷ ص ۲۱۷ [5] امام ابن الہمام حنفی (م ۸۶۱ھ) فتح القدیر (شرح ہدایہ) ج ۴ ص ۲۸۶ [6] علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) فتح الملہم ج ۱ ص ۱

ہیں[۸] موضوع کے اعتبار سے یہ دونوں فن ایک ہیں، لیکن تفصیل میں یہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ محدثین کا مقصد احکام و مسائل کا علم اور ان کا بیان ہوتا ہے۔ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے یہاں التزامی موضوع نہیں ہے سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بحث کرتے ہیں، احکام کی بحث ان کے یہاں ضمنی ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں واقعات کی تفصیل ہوتی ہے اور ایک ایک پہلو واضح کیا جاتا ہے۔ حدیث میں واقعات کی تفصیل نہیں ملتی اور کسی خاص پہلو کی وضاحت کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

حدیث اور سیرت میں یہ فرق بھی ہے کہ ثانی الذکر میں درجۂ صحت سے کم روایات بھی اعتناء کے لائق ہوتی ہیں۔ حدیث میں اس کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ صرف ان احادیث کے لیے ہے جن کا تعلق احکام و مسائل سے ہوتا ہے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ علماء کا ایک اچھا خاصا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حدیث ضعیف سے فضائل اعمال اور قصص وغیرہ میں استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس گروہ میں امام احمدؒ، ابو داؤدؒ، ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، نوویؒ جیسے اصحاب رائے شامل ہیں[۸] امام ابو حنیفہ حدیث ضعیف سے احکام میں بھی معتبر سمجھتے ہیں اگر وہ اُسے حدیث صحیح پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ حدیث صحیح کی تائید کے لیے پیش کرتے ہیں، یا ایسے مسائل میں ضعیف روایات سے استدلال کرتے ہیں جن کے لیے اعلیٰ درجے کے دلائل میسر نہیں ہوتے۔ امام احمد کے یہاں کچھ زیادہ ہی توسع ہے[۹]

حدیث اور سیرت کے درمیان صرف اتنا ہی فرق نہیں ہے، بلکہ بعض واقعات میں محدثین اور سیرت نگار اس حد تک مختلف ہیں کہ کھلا تضاد محسوس ہوتا ہے۔ اس فرق کی وضاحت کے لیے ذیل میں کچھ واقعات درج کیے جا رہے ہیں۔

غزوۂ ذات الرقاع مشہور غزوہ ہے۔ اکثر اہل سیر کی رائے یہ ہے کہ اس غزوہ کا وقوع خیبر کی جنگ سے پہلے ہوا[۱۰] لیکن محدثین خیبر کے بعد وقوع کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) نے اپنی جامع میں تعلیقاً اس کی تصریح کی ہے۔

وھی بعد خیبر[۱۱] اور غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد ہے۔ اس طرح مسلم نے جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی جو روایت غزوۂ ذات الرقاع کے ذیل میں ذکر کی ہے، اس سے بھی امام بخاری کے قول کی تائید ہوتی ہے[۱۲] خود امام بخاری بھی اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں خود راوی شریک رہے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ابوموسیٰ اشعریؓ خیبر کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، اس کی تصریح امام بخاریؒ نے بھی فرمائی ہے[۱۳] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ خیبر سے پہلے ہوا ہے تو اس میں ابوموسیٰ اشعریؓ کی شرکت کس طرح ممکن تھی۔ امام بخاریؒ نے یہاں حضرت جابرؓ کی یہ روایت بھی پیش کی ہے کہ اس غزوہ میں آپ نے صلوٰۃ

---

[۸] مولانا عبدالرؤف دانا پوری اصح السیر ج ۱ ص ۸، [۸] فتح الملہم ج ۱ ص ۵۸ [۹] امالی حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸، ۵۹ [۱۰] مولانا شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ) سیرۃ النبی ج ۱ ص ۸ [۱۱] ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) الجامع الصحیح ج ۲ ص ۵۹۲ [۱۲] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۸۸ [۱۳] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۲۔

خوف بھی ادا فرمائی تھی [۱۳] مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابو عیاش زرقی رضی اللہ عنہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ خوف سب سے پہلے غزوہ عسفان میں پڑھی گئی ہے [۱۵] اور یہ ثابت ہے کہ غزوہ عسفان، غزوہ خندق اور غزوہ خیبر کے بعد ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزوہ ذات الرقاع غزوۂ خیبر کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے۔

اصحاب سیر و محدثین کے یہاں دمیاطی (م ۷۰۵ھ) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سیرت کے موضوع پر ان کی ایک نہایت محققانہ تصنیف ہے جس میں اہل سیر کے اتفاق کو شیخین کی روایات پر ترجیح دی گئی ہے۔ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر قسطلانی مؤلف "ارشاد الساری الی شرح البخاری" (م ۹۲۳ھ) اور حافظ ابن حجر مؤلف "فتح الباری شرح البخاری" (م ۸۵۲ھ) نے دمیاطی کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس نقطہ نظر پر خاص طور سے تنقید کی ہے کہ جو انہوں نے غزوہ ذات الرقاع کے سلسلے میں اختیار کیا ہے [۱۶]

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ زرقانی نے شرح المواہب اللدنیہ میں دمیاطی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اہل سیر کے اتفاق کو صحیحین کی روایات پر ترجیح دینے کی جو کوشش کی تھی اس میں وہ غلطی پر تھے، دمیاطی چاہتے تھے کہ وہ اپنی کتاب میں ترمیم کر دیں، مگر کتاب کے نسخے عام ہو چکے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے [۱۷]۔

اسی قسم کا اختلاف غزوہ ذات قرد کے سلسلے میں بھی ہے۔ اصحاب سیر کہتے ہیں کہ اس کا وقوع صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا [۱۸] جب کہ محدثین صلح حدیبیہ کے بعد وقوع کے قائل ہیں [۱۹] ان کا استدلال سلمہ ابن الاکوع کی اس طویل روایت سے ہے جو ان کے بیٹے ایاس بن سلمہ سے منقول ہے اور جس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوہ ذی قرد کے تاریخ وقوع سے خیبر میں تین راتیں باقی تھیں [۲۰] حافظ ابن حجر نے اس موقع پر قرطبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لا یختلف اھل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیۃ	اہل سیر کا اتفاق ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے ہے۔

سلمہ ابن الاکوع کی روایت کا جواب قرطبی نے یہ دیا ہے۔

فیکون ما وقع فی حدیث سلمۃ وھم بعض الرواۃ	حدیث مسلم میں جو کچھ آیا ہے وہ بعض راویوں کا وہم ہو سکتا ہے۔

لیکن اس پر حافظ ابن حجر نے تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ زیر بحث روایت بالکل صحیح روایت ہے، اہل سیر کی رائے اس کے مقابلے میں راجح قرار نہیں دی جا سکتی [۲۱]

---

[۱۳] حوالہ سابق [۱۴] امام احمد بن حنبل الشیبانی (م ۲۴۱ھ) مسند احمد ج ۲ ص ۵۹ [۱۶] فتح الباری ج ۷ ص ۳۲۲ [۱۷] علامہ عبد الباقی زرقانی (م ۱۱۲۲ھ) شرح المواہب اللدنیہ للقسطلانی ج ۲ ص ۱۱ [۱۸] علی بن برہان الدین حلبی (م ۱۰۴۴ھ) انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ج ۲ ص ۶ [۱۹] بخاری ج ۲ ص ۶۰۳ [۲۰] مسلم ج ۲ ص ۱۱۱ [۲۱] فتح الباری ج ۷ ص ۳۴۱۔

غزوۂ اوطاس کے جائے وقوع کا مسئلہ بھی اختلافی مسائل کی فہرست میں ہے۔ بعض اہلِ سیر کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ اوطاس اور غزوۂ حنین دونوں ایک ہی مقام پر ہوئے۔ لیکن حافظ نے اس رائے کو مجروح قرار دیا ہے اور محدث ابنِ اسحاق کا وہ بیان نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اوطاس و حنین کے الگ الگ مقامات بتلائے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین سے فراغت کے بعد فوجی صحابہ کی تین جماعتیں ترتیب دی تھیں۔ ایک جماعت کو طائف روانہ فرمایا تھا۔ دوسری جماعت کی روانگی نخلہ کی طرف ہوئی تھی اور تیسری جماعت اوطاس بھیجی گئی تھی[۲۲] اوطاس جانے والے دستے کی قیادت ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔ جیساکہ بخاری میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے[۲۳]

یہ چند واقعات بطورِ مثال ذکر کیے گئے ہیں۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ سیر اور محدثین کے درمیان اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ سوال کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں، بات یہ ہے کہ جب ایک ہی واقعہ متعدد اشخاص نقل کریں تو بیان میں اختلاف یقینی ہے۔ بیان کا اختلاف نفسِ واقعہ میں اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ حدیث میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چند راوی ایک روایت بیان کرتے ہیں مختلف راویوں کی وجہ سے روایت میں کمی بیشی واقع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات مقامات اور سنین بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ اب یہ علما کی ذمہ داری اور ان کے ذہن و دماغ کا کمال ہے کہ وہ مختلف و متضاد روایات میں مطابقت کی کوشش کریں یا صحیح و سقیم میں امتیاز پیدا کر کے ترجیح کا راستہ اختیار کریں، یا تقدیم و تاخیر کی تعیین کے بعد ترتیب کی شکل اپنائیں۔ مختلف روایات میں تطبیق، ترجیح یا تنسیخ کے عمل کے نمونے فقہ، حدیث اور سیر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ابنِ قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ) نے تو اس سلسلے میں تاویل مختلف الحدیث کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ اردو میں ائمہ اور فقہا کے درمیان اختلاف کے اسباب پر حضرت مولانا محمد زکریا مد ظلہ نے "اختلاف الائمہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اگرچہ محققانہ یا حرفِ آخر نہیں ہے تاہم اس موضوع پر مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

اہلِ سیر اور محدثین کے درمیان اختلافِ روایات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کسی ایک روایت پر اعتبار کریں اور دوسری روایت کو ضعیف قرار دے کر رد کر دیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو روایت بخاری و مسلم کی شرطوں کے مطابق ہوگی وہ اہلِ سیر کے اتفاق کے باوجود راجح قرار دی جائے گی اس کے مقابلے میں دیگر روایتیں غیر راجح تو ہو سکتی ہیں مگر انہیں صرف اسی بنیاد پر موضوع اور غیر صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جو اختلافی واقعات ہم نے ابھی ذکر کیے ہیں، ان میں محدثین میں سے کسی نے بھی بخاری و مسلم کی بیان کردہ احادیث کے مقابلے میں دوسری حدیث کو موضوع یا غیر صحیح نہیں کہا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو بعد کے آنے والے اہلِ سیر اپنے سابقین کی روایت زندہ نہ رکھتے اور محدثین ہی کی رائے قبول کرتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے سیرت نگار اپنے سے پہلوں کی اتباع کرتے ہیں، اور واقعات کی ترتیب میں اپنے پیش روؤں کی ترتیب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیرت نگار اہلِ سیر کی رائے کے مقابلے میں محدثین کی رائے زیادہ وقیع سمجھتے ہیں مگر سابق سیرت نگاروں کے اسلوب سے انحراف نہیں کرتے۔ اردو میں اس کی مثال مولانا حکیم دانا پوری صاحب "اصح السیر" ہیں۔ اگرچہ اہلِ سیر کی رائے کو ترجیح نہیں دیتے۔ تاہم واقعات کی ترتیب وہی ہے جو

---

[۲۲] فتح الباری ج ۸ ص ۳۱۔ [۲۳] بخاری ج ۲ ص ۶۱۹

دوسرے مصنفین کے یہاں ہے۔ مولانا داناپوری خود بھی غزوۂ ذی قرد کے سلسلے میں اس کی تصریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں[۲۴]

وہ روایات جو بخاری و مسلم کی شروط کے مطابق ہوں اپنے سے کم درجہ والی روایات کے مقابلے میں راجح ہوں گی، لیکن یہ عام قاعدہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایسے نظائر بھی ہیں کہ محدثین اپنی اسانید کے علو کے باوجود اہل سیر کی رائے کو فوقیت دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ میں امّ حبیبہؓ کو آپؐ کے عقد میں دیتا ہوں[۲۵]۔ اصحاب سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت امّ حبیبہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حبشہ میں ہوا تھا اور آپؐ کی جانب سے نجاشی (شاہ حبشہ م ۹ھ) کے مقرر کردہ وکیل حضرت خالد ابن سعید ابن العاص نے ایجاب قبول کیا تھا[۲۶] وہ ابوسفیان جن کا ذکر مسلم کی روایت میں ہے امّ حبیبہؓ کی شادی تک اسلام بھی نہ لائے تھے بلکہ یہ فتح مکہ کے سال ۸ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے[۲۷] اس کی تائید امام بخاریؒ کی بیان کردہ روایت سے بھی ہوتی ہے[۲۸] حافظ ذہبی نے بھی مسلمؒ کی روایت کے بارے میں "ما صح" (صحیح نہیں ہے) کہا ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ شارحین اس حدیث کو عقد جدید کے التماس پر محمول کرتے ہیں، ذہبیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوسفیان امّ حبیبہؓ سے نہیں بلکہ اپنی دوسری بیٹی سے نکاح کرانا چاہتے تھے (یاد رہے کہ امّ حبیبہؓ ابوسفیان کی صاحبزادی اور حضرت معاویہؓ کی ہمشیرہ تھیں)، ذہبی نے اس دوسری بیٹی کا ذکر بلکہ صرف "اسمہا" کہہ کر رہ گئے۔ ذہبی کی سیر اعلام النبلاء کے محقق اور محشی ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے لکھا ہے کہ اصل نسخے میں اسی طرح ہے[۲۹]

نوویؒ نے ابوسفیان کے فضائل کی حدیثوں کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو قاضی عیاضؒ نے غریب اور ابن حزمؒ نے بعض راویوں کا وہم قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس حدیث کو موضوع بھی کہا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ حدیث کا ایک راوی عکرمہ ابن عمار واضع حدیث ہے۔ ابن حزم کی اس رائے پر عمرو بن الصلاح نے شدید نقد کیا ہے، ان کی رائے میں مسلم کی حدیث کو موضوع قرار دینا جسارت کی بات ہے۔ کسی بھی ناقد نے ابن عمار پر وضع حدیث کا الزام نہیں لگایا، بلکہ وکیع اور ابن معین نے تو ان کی توثیق بھی کی ہے۔ ابن صلاح نے یہ بھی لکھا ہے کہ عکرمہ مستجاب الدعوات بھی تھے[۳۰]

عمرو ابن صلاح کے الفاظ "وكان مستجاب الدعوات" کا تعلق اگر دعویٰ کے ساتھ دلیل کا تعلق ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عکرمہ کا مستجاب الدعوات ہونا ثقاہت کے لیے دلیل کیسے ہے؟

---

[۲۴] اصح السیر ج ۱ ص ۲۰۰ [۲۵] مسلم شریف ج ۲ ص ۳۰۴ [۲۶] علامہ ابن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) تاریخ الطبری ج ۳ ص ۱۵۷۰
[۲۷] طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲ [۲۸] بخاری ج ۲ ص ۶۱۳ [۲۹] حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۱۵۷۔ امام نووی نے مسلم حدیث کی کچھ تاویلات بھی کی ہیں جنہیں شرح مسلم نووی ج ۲ ص ۳۰۴ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
[۳۰] مسلم ج ۲ ص ۳۰۴،

سیرت اور تاریخ میں فرق :

سیرت تاریخ کی ایک نوع ہونے کے باوجود فن تاریخ سے الگ اور ممتاز صنف ہے۔ تاریخ کی چند تعریفیں کی جاتی ہیں مشہور ماہر تاریخ کافیجی (م ۸۷۹ھ) نے اپنی کتاب "المختصر فی علم التاریخ" میں یہ تعریف کی ہے کہ تاریخ زمانے کے حالات اور ان حالات کے متعلقات کی یقینی تلاش کا نام ہے۔ سخاوی (م ۹۰۲ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" میں کہا ہے کہ زمانے کے واقعات کی مؤقت جستجو کا نام تاریخ ہے۔ دور وسطیٰ کے مغربی مفکرین کہتے ہیں کہ تاریخ زندہ مطالعہ کا نام ہے [۳۱]

اس فرق کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ سیرت کے مآخذ جس قدر مستند اور قابلِ اعتبار ہیں تاریخ کو ان کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں ہے۔ تاریخ کا مدار صحت سند مآخذ کے بجائے قیاس پر زیادہ ہوتا ہے لیکن سیرت میں قیاس کو دخل نہیں ہے بلکہ روایات جس طرح پہنچیں انہیں من وعن ذکر کر دینا سیرت نگار کا پہلا فرض ہے۔ ان روایات میں جس قدر چھان پھٹک اور کاوش سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ الگ قابلِ غور ہے۔

ایک الزام کا جائزہ :

اگر جس طرح حدیث پر اعتراض کرتے ہیں اسی طرح یہ اعتراض سیرت پر بھی ہے کہ اس کا بہت کچھ دار و مدار زبانی روایتوں اور سُنی سنائی باتوں پر ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ محدثین نے روایتوں کے قبول و رد کے لیے سخت اصول مقرر کیے ہیں اور محض حدیث کی صحت یا عدم صحت کا پتہ لگانے کے لیے متعدد علوم معرضِ وجود میں آئے۔ اس صورت میں حدیث و سیرت کے ذخیرے کو بے بنیاد و بے اصل کہہ دینا کوئی جاندار الزام نہیں ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ کو انتہائی تعلق تھا جس کی تفصیل ہمیں کتابوں میں ملتی ہے اس محبت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ لوگ پیارے نبیؐ کے ہر فعل اور ہر قول کو اپنے دلوں پر نقش کر لیں اور آپؐ کی مبارک زندگی کا کوئی پہلو بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں اس پر یہ ارشاد مبارک کہ "جس نے عمداً مجھ سے کوئی کذب بیانی کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا" [۳۲] خود اس کا مستقاضی ہے کہ صحابہؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی جھوٹ منسوب نہ کریں۔

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ حدیث و سیرت کا مدار زبانی روایات اور سُنی سنائی باتوں پر ہے اُن کے پیش نظر وہ روایات ہیں جن میں کتابت حدیث سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابُو سعید خدری رضؓ کی حدیث میں ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج [۳۳]	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے کچھ مت لکھو اور اگر کسی نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھ لیا ہو اسے مٹا دینا چاہیے۔ ہاں حدیث بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

---

[۳۱] عبدالصاحب جعفر جمال الدین "عربوں میں تاریخ کا مطالعہ" ترجمہ ندیم الواجدی ، "رگ سنگ" کانپور جنوری ۱۹۷۳ء [۳۲] شیخ ابو عبداللہ خطیب تبریزی (م ۷۴۲ھ) مشکوٰۃ ص ۳۲ باب العلم [۳۳] مسلم ج ۲ ص ۴۱۴۔

اسی مضمون کی روایات سعد بن مالک رضؓ، ابوہریرہ، اور زید بن ثابت رضؓ سے مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہیں[۳۴]

وہ روایات جن میں کتابت حدیث سے روکا گیا ہے۔ اسلام کے دورِ آغاز سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن پاک کا نزول ہو رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر صحابہ رضؓ کو حدیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی تو قرآن کریم کی طرف سے ان کی توجہ کم ہو جائے گی۔ ابنِ قتیبہ نے "تاویل مختلف الحدیث" میں یہی توجیہہ کی ہے[۳۵]۔ امام نووی رحؒ کی رائے میں ممانعت ان لوگوں کے لیے تھی جن کے حافظے قوی تھے، وہ لوگ جنہیں سوءِ حفظ کی شکایت تھی، اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیے گئے تھے[۳۶]۔ علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی رائے یہ ہے کہ کمزور یادداشت رکھنے والے لوگوں کے لیے کتابت ضروری ہے۔ انہیں اپنے حافظوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے[۳۷]

بعض کم نظر لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فنِ کتابت سے نفرت تھی اسی لیے وہ اپنے تلامذہ کو لکھنے سے منع کیا کرتے تھے۔ تاریخی شواہد اس دعوے کے خلاف ہیں۔ حافظ ابن الاثیر نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص کے ترجمے میں یہ تصریح کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اہلِ مدینہ کو فنِ کتابت کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا[۳۸]۔ اسی طرح شفاء بنت عبداللہ رضؓ حضرت حفصہ رضؓ کو کتابت سکھلانے کے مقرر کی گئی تھیں[۳۹]۔ جو لوگ اسلامی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اسلام نے فنِ کتابت کو ترقی دی ہے۔ دورِ جاہلیت میں مکہ مکرمہ میں صرف سترہ آدمی کتابت کے فن سے واقف تھے[۴۰] اور مدینہ منورہ میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف نو تھی[۴۱]۔ عربوں کو کتابت کے فن سے نفرت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اُسے حاصل کرنا وقار کے منافی ہے[۴۲]۔ لیکن اسلام نے اس فن کو ترقی دی۔ مسلمانوں کی دلچسپی سے کاتبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ معاشرے میں کتابت کو اس قدر پذیرائی ملی کہ جو لوگ کتابت، تیراندازی اور تیراکی سے واقف ہوتے تھے انہیں الکامل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[۴۳]۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کاتب یا کتابت کے مخالف نہ تھے۔ بیشمار روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ رضؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں احادیث لکھیں، اور انہیں صحیفوں میں جمع کیا۔ چنانچہ بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک خطبہ جو کسی شخص کے قتل کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا ایک شخص کو لکھ کر دینے کا حکم فرمایا۔ بخاری کی اس روایت میں اس شخص کے نام کی صراحت نہیں ہے، صرف "لابی فلان" کے الفاظ ہیں۔ مگر دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان صحابی کا نام ابوشاہ تھا[۴۴]۔ حافظ ابن حجر نے ابورافع رضؓ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابتِ حدیث کی اجازت حاصل کی تھی[۴۵]۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ

---

[۳۴] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۴۰۲، ۳۹۰ ص ۱۲، ج ۵ ص ۱۸۲ [۳۵] ابن قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ) تاویل مختلف الحدیث ص ۳۶۵ [۳۶] امام محی الدین النووی (م ۶۷۶ھ) شرح صحیح المسلم ج ۱ ص ۱۴ [۳۷] مقدمہ فتح الملہم ج ۱ ص ۹۲ (علامہ عثمانی رحؒ غیر منقسم ہندوستان کے جلیل القدر محدث تھے۔ دارالعلوم میں مسلم شریف کے درس کے لیے مشہور رہے۔ آپ نے مسلم شریف کی ضخیم شرح بھی تالیف فرمائی۔ اس کے شروع میں علم حدیث پر مبسوط مقدمہ ہے۔ فتح الملہم عرصے سے نایاب تھی۔ اب دیوبند کے ادارہ شرکت علمیہ سے یہ کتاب دوبارہ چھپ رہی ہے [۳۸] ابن الاثیر جزری (م ۶۳۰ھ) اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۵، [۳۹] احمد بن یحییٰ البلاذری فتوح البلدان ص ۴۷۷، [۴۰] دیکھیے حوالہ سابق [۴۱] ابن سعد (م ۲۳۰ھ) الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۹۱ [۴۲] ابوالفرج الاصبہانی (م ۳۵۶ھ) کتاب الاغانی ج ۶ ص ۱۳۰۔ [۴۳] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۹۱ [۴۴] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۲ کتابۃ العلم [۴۵] حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۷

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص احادیث لکھا کرتے تھے[۴۶] غالب خیال یہ ہے کہ جو روایات حضرت عبداللہ ابن عمر ابن عاص لکھا کرتے تھے وہ اس صحیفے میں ہوں گی جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے[۴۷] اور جس کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس صحیفے کا نام "الصادقہ" تھا اور اس میں ایک ہزار احادیث موجود تھیں[۴۸] اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں صحابہ رضؓ کو نماز، روزہ، زکواۃ، حج، صدقات اور دین (قرض) کے احکامات املا کروادیے تھے[۴۹] آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ کو ایک ایسا فرمان بھی ملا تھا جس میں صدقات کے احکام درج تھے[۵۰] حضرت علی رضؓ کے پاس احادیث کا ایک صحیفہ موجود تھا[۵۱] بخاری میں ابو جُحیفہ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[۵۲] حضرت ابوہریرۃ رضؓ کے پاس بھی صحیفہ ہمامؒ کے نام سے ایک صحیفہ موجود تھا[۵۳] سعید ابن عبادہ ابن الصامت کے پاس بھی احادیث کا ایک مجموعہ تھا۔ ربیعہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کی اطلاع سعید رضؓ کے بیٹے نے دی تھی[۵۴] عتبان ابن مالک رضؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی احادیث تھیں[۵۵] عبداللہ ابن عباس کے پاس بھی حدیث کے مجموعے تھے[۵۶]

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدیث کا بڑا ذخیرہ دور نبویؐ میں جمع کر لیا گیا تھا اور وہ غیر مرتب شکل میں صحابہ رضؓ کے پاس موجود تھا۔ بعد میں اسی سرمائے کی بنیاد پر امام مالکؒ بخاری اور مسلم وغیرہ نے اپنے مجموعے ترتیب دیے۔

صاحب اصح السیر نے ابن قیم صاحب زاد المعاد اور زرقانی محشی للمواھب اللدنیہ للقسطلانی کے حوالے سے کچھ ایسے صحابہ رضؓ کے نام لکھے ہیں جنھوں نے دور نبویؐ میں تحریری خدمات انجام دیں۔ حضرات ابوبکر رضؓ، عمر رضؓ، عثمان رضؓ، علی رضؓ، فہیرہ رضؓ، عمرو بن العاص رضؓ ابی بن کعب رضؓ، عبداللہ ابن ارقم رضؓ، ثابت بن قیس رضؓ، حنظلہ ابن الربیع الاسدی، مغیرہ بن شعبہ رضؓ، عبداللہ ابن رواحہ، خالد ابن ولید رضؓ خالد ابن سعید ابن العاص رضؓ، معاویہ ابن ابی سفیان رضؓ، زید بن ثابت رضؓ، طلحہ ابن عبیداللہ رضؓ، سعید ابن العاص رضؓ، خالد رضؓ، ابان ابن عثمان رضؓ سعد ابن ابی وقاص رضؓ شرحبیل ابن حسنہ العلاء الحضرمی رضؓ دحیؓ، حذیفہ رضؓ بن یمان، حویطب ابن عبدالعزی رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین[۵۷] یہ فہرست ان لوگوں کے لیے قابل غور ہے جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کاتب اور کتابت سے نفرت تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کاتبوں سے نفرت تھی تو ان صحابہ سے بھی رہی ہوگی جن کے اسماء ابھی درج کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سوں کے لیے کلمات خیر منقول ہیں۔ سیرت کے متعلق تحریری مواد بھی تھا جس کے مستند ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور زبانی سرمایہ بھی موجود تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ سیرت نبویؐ کے سلسلے میں جن بزرگوں سے روایات نقل کی جاتی ہیں ان کی تعداد تیرہ[۱۳] ہزار ہے[۵۸]

---

[۴۶] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۲، [۴۷] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۴۸] ابو عمر یوسف بن عبد البر (م ۴۶۳ھ) جامع بیان العلم وفضلہ ص ۷۷، واسد الغابۃ ص ۸، وابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۴۹] حافظ علی ابن عمر الدارقطنی (م ۳۸۵ھ) سنن دار قطنی ص ۲۰۴ و ۲۰۹ و ۲۸۵ و حافظ ابوالقاسم طبرانی (م ۳۶۰ھ) طبرانی ص ۲۱۷ و شیخ علاء الدین الھندی (م ۹۷۵ھ) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج ۳ ص ۱۸۲ و طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۹ [۵۰] ابوداؤد السجستانی (م ۲۷۵ھ) سنن ابی داؤد باب زکوۃ السائمۃ ص ۲۳۴ [۵۱] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۵۲] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۵۳] ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۳۱۲ [۵۴] ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ابن سورۃ الترمذی (م ۲۷۹ھ) جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۸ [۵۵] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۵۶] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶ [۵۷] اصح السیر ج ۱ ص ۱۲ [۵۸] ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سیرت نگاری کی ابتداء

ہم نے مستند کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ احکام اور سیرت نبوی سے متعلق تحریری سرمایہ موجود تھا۔ مگر تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا نہیں ہُوا تھا۔ اس لیے عرصہ دراز تک یہ سرمایہ تدوین و ترتیب سے محروم رہا۔ بعد میں امراء اور حکام کی توجہ سے اس کا ذوق پیدا ہُوا اور اہلِ علم تصنیف و تالیف میں مصروف ہُوئے۔ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے عبید ابن شریح کو یمن سے بُلا کر قدماء کے حالات تحریر کرائے اور اس تحریری سرمایہ کا نام "اخبار الماضیین" رکھا[۵۹] اس کے بعد عبدالملک ابن مروان نے حضرت سعید بن جبیر سے تفسیر قرآن پاک لکھوائی۔ ذہبی کی تحقیق کے مطابق یہ تفسیر عطاء ابن دینار کی طرف منسوب ہے[۶۰] علماء کو اس زمانے میں تصنیف و تالیف کے لیے کتنا مجبور کیا گیا۔ اس کا اندازہ مشہور محدث ابنِ شہاب زہریؒ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم علوم کی کتابت کو مکروہ خیال کرتے تھے لیکن اُمراء نے ہمیں لکھنے پر مجبور کیا[۶۱]

امراء میں علوم اسلامیہ کی تدوین و ترتیب کا سہرا حضرت عمر ابن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کے سر ہے۔ مشہور مؤرخ ابو نعیم نے اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے دَور کے محدثین کو تدوین حدیث کا حکم دیا تھا[۶۲] ابن سعد نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے آپ نے مدینے کے قاضی اور مشہور عالم ابنِ شہابؒ زہری کے استاد ابوبکر بن محمد ابن عمرو ابن الانصاری کو طلب کیا اور انہیں حدیث کی جمع و ترتیب کی طرف متوجہ کیا[۶۳] ابن سعد کی تائید امام بخاریؒ کی "باب کیف یقبض العلم" کے تحت ذکر کردہ سطور سے بھی ہوتی ہے۔

كتب عمر ابن عبد العزيز الى ابى بكر بن حزم انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه[۶۴]	حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے ابوبکر ابن حزم کو لکھا کہ جہاں کہیں بھی آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث دیکھیں انہیں نوٹ کر لیں۔

ابنِ عبدالبر نے سعد ابن ابراہیم سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر ابنِ عبدالعزیزؓ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم حضورؐ کی سنن جمع کریں[۶۵]
ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد ابن عبدالعزیز میں احادیث کی تدوین ہوئی اور ابن حجر کی تصریح کے مطابق ابنِ شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔

اول من دون علم الحديث بامر عمر بن عبد العزيز محمد بن مسلم بن عبيد الله بن عبد الله شهاب الزهرى ـ	حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ کے حکم سے سب سے پہلے علم حدیث کی تدوین ابن شہاب زہری نے کی۔

چند سطروں کے بعد علامہ عثمانی نے حافظ ابن حجر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ابن شہاب زہری کی تدوین بحیثیت مجموعی تھی۔ فقہی ترتیب کے ساتھ حدیث کی تدوین میں شعبی فوقیت لے گئے[۶۶] روایت کے جانچنے اور صحیح و غیر صحیح میں تمیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیباچہ - دورِ نبویؐ میں کتابت حدیث کے موضوع پر راقم السطور کا ایک طویل مقالہ "برہان" دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔

[۵۹] ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) الفہرست ص ۱۳۴ [۶۰] حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۷ [۶۱] جامع بیان العلم ص ۱۳۶ [۶۲] ابو نعیم اصبہانی (م ۴۳۰ھ) تاریخ اصبہان بحوالہ اصح السیر ص ۷ [۶۳] ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۴ [۶۴] بخاری شریف ۱۹ ص ۲۲ [۶۵] جامع بیان العلم ص ۳۶ [۶۶] فتح الملہم مقدمہ ج ۱ ص ۹۲

کرنے کے لیے جو فن وضع کیا گیا۔ اس کے بانی بھی ابن شہاب زہری ہیں اور اس کا حکم بھی حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے دیا تھا[۶۷]۔ عمر ابن عبدالعزیز رح نے مغازی کی طرف بھی توجہ کی اور عاصم ابن عمر ابن قتادہ انصاری (م ۱۲۱ھ) کو حکم دیا کہ وہ حلقہ درس قائم کریں اور مغازی (سیر) کے مضامین پڑھائیں[۶۸]۔ مخلصانہ کوششیں ٹھکانے لگیں اور علماء میں مغازی کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوا سلسلہ آگے بڑھا تو صاحب قلم محدثین نے اس فن میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ محققین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ مغازی یا سیر میں سب سے پہلی تصنیف کس شخص کی ہے؟ حاجی خلیفہ صاحب "کشف الظنون" کی رائے یہ ہے۔

اوّل من صنف فیہ الامام المعروف محمد بن اسحاق بن یسار رئیس اہل المغازی[۶۹]	مغازی میں سب سے پہلے امام محمد بن اسحاق ابن یسار رئیس اہل مغازی نے کتاب تصنیف فرمائی۔

عصر حاضر کے محقق ڈاکٹر مصطفٰے صبری کی تحقیق یہ ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے ابان ابن عثمان رضؓ نے قلم اٹھایا، موصوف نے "موقف العقل والعلم" میں لکھا ہے "سیرت نگار بہت سے ہیں، ابن ہشام (م ۲۱۸ھ) مقدم نہیں ہیں، سیرت نگاری کا آغاز حضرت ابان ابن عثمان رضؓ سے ہوا۔ پھر عروہ ابن الزبیر اور شرحبیل ابن سعد نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ پھر زہری رضؓ نے زہری بخاری کے استاذ ہیں اور ان کا شمار بڑے ائمہ میں ہوتا ہے ممکن ہے انھوں نے عمر ابن عبدالعزیز کے اشارے پر قلم اٹھایا ہو[۷۰]۔" سہیلی رح کی رائے یہ ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے امام زہری رح نے لکھا ہے، فرماتے ہیں۔

ھی اوّل سیرۃ الفت فی الاسلام[۷۱]	یہ پہلی سیرت (کی کتاب) ہے جو سلام میں تالیف کی گئی۔

ڈاکٹر صبری کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگوں نے سیرۃ ابن ہشام کو سیرت کی اوّلین کتاب قرار دیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے سہیلی کی رائے پر اعتماد کیا ہے اور ابن شہاب زہری کو سب سے پہلا سیرت نگار مانا ہے۔

ہم اپنی سہولت کے لیے تدوین حدیث کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح شاید اس تضاد کا حل ہو سکے گا۔ تدوین حدیث کا پہلا دور وہ ہے جب اس کا آغاز ہوا اور لوگوں نے احادیث کے متعدد مجموعے ترتیب دیئے ان مجموعوں میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہ تھا۔ بلکہ صرف احادیث جمع کی جاتی تھیں۔ ان میں جہاں احکامات اور دوسرے موضوعات سے متعلق روایات جمع ہوئیں وہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے متعلق احادیث بھی آ گئیں۔ اس دور میں عروہ ابن الزبیر رضؓ، ابن العوام، ابان بن عثمان رضؓ، شرحبیل بن سعد اور وہب بن منبہ کا نام لیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر صبری نے ابان ابن عثمان رضؓ کو سیرت نبوی کا پہلا قلم کار قرار دیا ہے لیکن اسے سیرت نگاری کا نام دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان حضرات نے کسی خاص موضوع کا التزام کیے بغیر روایات جمع کی ہیں۔ دوسرے دور میں محدثین نے مختلف موضوعات کی احادیث الگ الگ جمع کیں اور ان میں ترتیب کا خیال رکھا۔ اس دور میں

---

[۶۷] شیخ ابراہیم بیجوری، المواہب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ للترمذی ص ۶ [۶۸] تہذیب التہذیب فی ترجمۃ عاصم بن قتادۃ الانصاری [۶۹] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹ [۷۰] ڈاکٹر مصطفٰے صبری "موقف العلم والعقل والعالم من رب العالمین"، ج ۱ ص ۴۷
[۷۱] ابو قاسم عبدالرحمٰن سہیلی (م ۵۸۱ھ) الروض الانف ج ۱ ص ۱۲۲

مغازی اور سیر پر بھی توجہ کی گئی اور متعدد علمائے نے تحریری کام کیا۔ ان علماء میں اُبوبکر بن حزم انصاریؒ عاصم ابن قتادہ انصاری اور ابن شہاب زہریؒ کے نام سرفہرست ہیں۔ آخرالذکر کا نام اس لیے بھی اہم ہے کہ ان کی ذاتی جدوجہد سے اس فن کو ترقی ملی اور علماء میں اس کے مُطالعے کا ذوق پیدا ہوا۔ آپ نے درس مغازی کے حلقے بھی قائم کئے۔ اس طرح باصلاحیت تلامذہ کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی۔ ان میں سے بیشتر کے ساتھ امتیازی لقب "المغازی" وابستہ ہے، موسیٰ ابن عقبہ (م ۱۴۱ھ) اور محمد ابن اسحاق ابن یسار (م ۱۵۰ھ) امام زہریؒ کے نامور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ تدوین سیرت کا تیسرا دور ان ہی دونوں بزرگوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان حضرات نے مغازی کے سِلسلے میں کتابیں لکھیں اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ موسیٰ ابن عقبہ کی "مغازی الرسول" اگرچہ زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکی، تاہم سیرت کی معتبر کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ابن اسحاق نے اس فن میں بے پناہ شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی کتاب المغازی کے اعتبار کے لیے یہ بات کافی ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب الغزوات ان ہی کی روایت سے شروع کی ہے[41] امام احمد ابن حنبلؒ ابن اسحاق کی ثقاہت کی نفی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابنِ اسحاق یہود و نصاریٰ کی روایات قبول کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے[42] لیکن بخاری نے غزوات اور قرأت خلف الامام میں ان کی روایات لی ہیں اور اس طرح اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ باقی صحاح ستہ میں بھی اُن کی روایات قبول کی جاتی ہیں۔ یحییٰ ابن معین، شعبہ، عجلی، ابوزرعہ اور ابن مبارک جیسے ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام مالکؒ انتہائی خلاف ہیں۔ ایک جگہ دجال تک کہہ ڈالا ہے لیکن علی ابن مدینی نے امام مالک کی رائے پر سخت تنقید کی ہے اور ابنِ اسحاق کا وقار بحال رکھا ہے[43] حافظ ذہبی جیسے متشدّد انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں[44]

ابن اسحاق کی مغازی الرسول بھی اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہ سکی۔ لیکن اس کی یادگار سیرت ابن ہشام ہے جسے ابن ہشام عبدالملک (م ۲۱۸ھ) نے ابن اسحاق کی مغازی الرّسول کی مدد سے لکھا ہے اور اس میں ابنِ اسحاق کی کتاب کے مشکل الفاظ اور اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔

ابن اسحاق کے بعد سیرت نگاروں میں جس شخص کا نام اہم ہے وہ محمد بن عمر ابن واقد الواقدی (م ۲۰۷ھ) ہیں گو احکام و مسائل میں متروک الحدیث ہیں، لیکن سیرت میں ان کی روایات قبول کر لی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق ابن کثیر کی رائے یہ ہے:
"واقدی کے پاس عُمدہ تفصیلات، اور تحریر شُدہ واقعات موجُود تھے اور وہ اس فن کے بڑے ائمہ میں سے ہیں"[45]
مولانا شبلی واقدی سے ناراض ہیں اور انہیں چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ حیرت اس پر ہے کہ اُنہوں نے اپنی سیرت میں طبقات ابنِ سعد کی روایات نقل کی ہیں جس کا بڑا حِصّہ واقدی کی مغازی الرّسول سے ماخوذ ہے۔ اُردو میں واقدی کی مغازی الرّسول کا ترجمہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۵ء) میں جناب سید عنایت حسین سیدن پُوری نے کیا تھا جسے نول کشور نے شائع کیا اس کے علاوہ بھی اردو

[41] بخاری کتاب الغزوات ج دوم [42] ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) الموضوعات ص ۸۵ [43] مولانا احمد رضا صاحب بجنوری (بقید حیات) مقدمہ انوار الباری ج ۱ ص ۲۱۵ [44] تہذیب التہذیب فی ترجمۃ محمد بن اسحاق ابن یسار [45] حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) البدایہ والنہایہ فی التاریخ ج ۴ ص ۲۳۴۔

یں مغازی الرسول کے کچھ تراجم ہیں۔

سیرت نگاری میں ابن اسحاق اور واقدی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی آج ان کی تصانیف موجود نہیں ہیں۔ بعد کے آنے والے ان ہی دو بزرگوں کے خوشہ چیں ہیں جس طرح ابن اسحاق کو ابن ہشام نے زندہ جاوید بنایا اور ان کی مغازی کو نئے اسلوب میں پیش کیا۔ حسن اتفاق سے ایسا ہی شخص واقدی کو بھی ملا۔

محمد ابن سعد، واقدی کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بصرے سے بغداد کا سفر کیا اور واقدی کی شاگردی اختیار کی۔ واقدی کے بارے میں علما کے خیالات کا ذکر ہو چکا ہے۔ ابن سعد اپنے استاد کی طرح بدنام نہیں ہیں، مؤرخ خطیب بغدادی نے انہیں اصحاب علم و فضل میں شمار کیا ہے۔[۱] ابن سعد نے "الطبقات الکبریٰ" تصنیف کی۔ اس کتاب کی دو جلدیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر مشتمل ہیں۔ بقیہ جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے احوال درج ہیں۔ یہ کتاب جرمنی میں تھی۔ شہنشاہ جرمن نے اس کی اشاعت کا ارادہ کیا، متعدد حضرات کی تصحیح و ترتیب کے بعد بارہ جلدوں میں ہالینڈ سے شائع ہوئی۔ کتاب میں بعض بے اصل چیزیں بھی موجود ہیں۔ خیال ہے کہ ان مواقع پر عیسائیوں نے اسلام کے خلاف اپنی پرانی عداوت کا اظہار کیا ہے۔

ان حضرات کے بعد عربوں میں سیرت نگاری کا عام ذوق پیدا ہوا۔ اور اس موضوع پر تالیفات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں بعض کتابیں انتہائی ضخیم ہیں۔ بیشتر کتابیں مشہور و متداول ہیں۔ ایسے حضرات کی ایک نامکمل فہرست مولانا شبلی نعمانی نے تیار کی ہے جنہوں نے اس فن میں کتابیں لکھیں یا ان کا اس سے تعلق رہا۔[۲]

ذیل میں چند کتابوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

'سیر النبی' محب الدین احمد ابن عبداللہ الطبری (م ۶۹۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ حافظ حدیث، فقیہہ حرم اور محدث حجاز تھے۔ 'سیر النبی' میں تمام روایات سندوں کے ساتھ مذکور ہیں 'کشف الظنون' میں حاجی خلیفہ مرحوم نے اس کا ذکر اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔[۳] اسی کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی ہے جس کے مصنف ابو عمر و صالح ابن اسحاق الجرمی نحوی (م ۲۲۵ھ) ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں 'سیرت شامیہ' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کا اصل نام "سبیل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" ہے۔ محمد ابن یوسف الدمشقی (م ۹۴۲ھ) اس کے مصنف ہیں۔ سیرت کے موضوع پر یہ سب سے زیادہ مبسوط کتاب ہے۔ تقریباً سات ضخیم جلدوں میں، اس کی تالیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تعداد تین سو ہے۔[۴] اس کے بعد شہرت میں سیرت حلبیہ کا نام ہے علی ابن برہان الدین حلبی اس کے مؤلف ہیں "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" کتاب کا اصل نام ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ دیوبند سے شائع ہو رہا ہے۔ مشہور محدث شیخ شہاب الدین احمد ابن محمد القسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے اس موضوع پر المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی۔ ایک مؤرخ کی رائے میں یہ کتاب "جلیل القدر، عظیم المرتبت

---

[۱] تہذیب التہذیب، ترجمہ محمد ابن سعد [۲] سیرۃ النبی، مولانا شبلی، ج ۱ ص ۸ تا ۴۸ [۳] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹ [۴] حافظ سید عبدالحی الکتانی، فہرس الفہارس، ج ۲ ص ۳۹۲۔

اور کثیر النفع ہے، سیرت کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی"[۵۱] المواہب پر علامہ محمد ابن عبدالباقی زرقانی (م ۱۱۲۲ھ) نے حواشی تحریر فرمائے جس سے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ امام ابن تیمیہ کے تلمیذ رشید حافظ شمس الدین ابن القیم الجوزی (م ۷۵۱ھ) کی کتاب 'زاد المعاد فی ہدی خیر العباد' انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پاکستان میں چھپ چکا ہے۔

دور حاضر کے ممتاز عربی مصنفین اور اہل قلم نے بھی سیرت پر طبع آزمائی کی ہے اور گرانقدر کتابیں لکھی ہیں، یہاں ہم صرف تین کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اپنی ادبی چاشنی کے لیے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر طہ حسین کی "علی ہامش السیرۃ"، محمود عقاد کی "عبقریۃ محمد" اور سید حسنین ہیکل کی "سیرۃ محمد" اہم کتابیں ہیں۔

گذشتہ سطور میں عام وقائع سیرت پر لکھی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مخصوص پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ محض کتابوں کے اعداد و شمار ہی سے ایک مبسوط مقالہ ترتیب پا سکتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم اتنا عرض کرتے ہیں کہ بعض اکابر علم نے غزوات اور سرایا کو بحث و تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس فن کی اہم کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ متعدد نامور علماء نے معجزات اور روحانی واقعات پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس فن میں جن لوگوں نے داد تحقیق دی ہے۔ ان میں ابو اسحاق حربی (م ۳۴۵ھ)، امام بیہقی (م ۴۳۰ھ)، ابو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) مستغفری (م ۴۳۳ھ) ابو القاسم اسماعیل اصفہانی (م ۵۲۵ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے زبردست شہرت حاصل کی ہے۔ شمائل، اخلاق و عادات اور حلیہ کے موضوع پر اہم کتاب امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی "کتاب الشمائل" ہے جو ہندوستان کے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ سیرت نبوی سے متعلق یہ حصہ ادب عربی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اردو میں کتاب الشمائل کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔ ان میں شیخ ابراہیم بیجوری کی "المواہب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ" بہت مقبول ہے۔ شمائل میں کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن میں قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) کی "کتاب الشفا فی حقوق المصطفےٰ" ابو العباس مستغفری (م ۴۳۳ھ) کی "شمائل النبی" ابن المقدمی غرناطی (م ۵۵۲ھ) کی "شمائل النور الساطع" اور مجد الدین فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) کی "سفر السعادۃ" قابل ذکر ہیں۔ "کتاب الشفا" زیادہ ضخیم ہے شہاب خفاجی (م ــــھ) نے اس کی شرح "نسیم الریاض" کے نام سے کی ہے۔

اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ اس موضوع پر سب سے پہلے جو اہم اور مبسوط کتاب فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی۔ وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کی "مدارج النبوۃ" ہے۔ خواجہ عبدالحمید نے اس کا ترجمہ کیا۔ نول کشور پریس کانپور نے یہ ترجمہ ایک ہزار آٹھ سو بتیس (۱۸۳۲) صفحات پر شائع کیا۔ "سرور المحزون" کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) نے فارسی میں ایک مختصر رسالہ سیرت پر لکھا تھا۔ اس کے متعدد ترجمے اور شروح موجود ہیں۔ شوکت علی شاہ جہاں پوری نے "درمکنون" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ قیمتی حواشی سے مزین ہے۔ ۱۲۵۸ھ میں اسے مطبع رونق ہند کانپور نے شائع کیا۔ اسی نام سے ایک ترجمہ مولانا سراج الیقین کرسوی کا ہے جو ۱۳۳۲ھ میں مجتبائی لکھنؤ سے چھپا تھا۔ "ظہور المحزون" کے نام سے اس کا ترجمہ شعبہ فارسی دار العلوم دیوبند کے سابق صدر خلیفہ محمد عاقل مرحوم نے کیا اور دیوبند ہی سے کتب خانہ عثمانیہ نے

---

۵۱ عبدالقادر رودسی (م ۱۰۳۸ھ) النور السافر ص ۱۱۴

چھاپا۔ سرور المحزون کی اردو شرح "قرۃ العیون" پھ جلدوں میں سابق والی ٹونک کے مصارف پر ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی تھی۔

ترمذی کی کتاب الشمائل کو اردو میں سب سے پہلے مولانا کرامت علی جونپوری نے منتقل کیا اور "انوار محمدی" نام رکھا۔ یہ صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ شمائل کی ایک عمدہ شرح بھی ہے "خصائل نبوی" کے نام سے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے اس کا ترجمہ کیا۔ مولانا عبدالشکور لکھنوی کا ترجمہ بھی مقبول ہے۔ سنہ ۱۳۴۰ھ میں دفتر "النجم" نے اسے شائع کیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اسے بچوں کی زبان میں منتقل فرمایا۔ تراجم کے علاوہ اردو میں مستقل تصانیف کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ کچھ اہم کتابوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ سنہ ۱۲۷۵ھ میں حضرت مفتی عنایت احمد نے تاریخ حبیب اللہ، تصنیف فرمائی۔ کتاب کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ مصنف نے دوران تالیف صرف یا دو نسخوں کو مآخذ قرار دیا، لیکن اس کے باوجود تمام صحیح روایات اس میں سما گئی ہیں، اردو میں سیرت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ضخامت اور حسنِ بیان کے لحاظ سے مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی مشترکہ تالیف سیرت النبی سب پر فوقیت لے گئی ہے۔[۹۲]

سیرت کے مآخذ

سیرت نبویؐ کے دو اہم مآخذ ہیں۔ پہلا ماخذ قرآن کریم ہے جس کی صحت اور جس کا درجۂ استناد شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آپؐ کی زندگی کے اہم پہلوؤں کے لیے صحیح معلومات قرآن کریم سے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ کی یتیمی کا دور، قبل نبوت کی زندگی، معراج کا واقعہ، ہجرت کے وقائع، فتح مکہ کا ذکر، غزوات۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے عرض کیا گیا کہ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر روشنی ڈالیں آپؓ نے جواب دیا قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔ قرآن آپؐ کے اخلاق کی صحیح تفسیر ہے بہت سے علما نے صرف قرآن پاک سامنے رکھ کر سیرت رسولؐ مرتب کی ہے اردو میں اس سلسلے کی اہم کتاب مولانا محمد میاں دیوبندی مرحوم کی ہے جس کی ایک جلد الجمعیۃ پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ سیرت کا دوسرا ماخذ حدیث نبوی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کو آپؐ کی ذاتِ پاک سے عشق تھا۔ آپؐ کی ہر ادا، آپؐ کی ہر بات اور آپؐ کی ہر کیفیت اُن کے دلوں پر نقش ہو جاتی تھی۔ دلوں سے نکل کر زبان پر آتی اور زبان یہ امانت کتابوں کے سپرد کر دیتی — سیرت نبوی پر یہ الزام کہ اس کا مدار زبانی روایات پر ہے غلط ثابت ہو چکا ہے ہمیں زبانی روایات کے وجود سے انکار ممکن نہیں اور کتابوں کی تدوین میں ان سے استفادہ بھی کیا گیا ہے لیکن اگر روایات کے رد و قبول کے اصول ملحوظ رہیں تو ماخذ کی صحت میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

سب سے پہلے ہم شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (م سنہ ۱۲۳۹ھ) کا ایک گرانقدر اقتباس پیش کریں گے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے حدیث کی حفاظت کے لیے شروع ہی سے بڑی جد و جہد کی ہے۔

صدر اوّل یعنی از زمانۂ تابعین و تبع تابعین تا زمان	صدر اول یعنی تابعین و تبع تابعین کے دور سے
بخاری و مسلم رنگے دیگر داشت کہ ازحال رجال	امام بخاری و امام مسلم کے دور تک راویوں کے حالات

۹۲؎ اردو میں اس موضوع پر ایک جامع مقالہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (جنوری ۲ ء تا نومبر ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔ مقالہ نگار الحاج سید محبوب رضوی مصنف تاریخ دیوبند ہیں۔ اس سلسلے میں قاموس الکتب ج اوّل شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر شہر و ہر زمانہ بحث و تفتیش می کردند، و در سر کہ بوئے از بے دیانتی و کذب و سوءِ حفظ می شمیدند حدیث او را قبول نمی کردند، لہٰذا در احوال رجال مبسوط کتب مضبوط نوشتہ اند۔[۵۳]

کی تحقیق کا رنگ کچھ اور رہا کہ وہ لوگ ہر زمانے اور ہر شہر کے راویوں کے حالات کی جستجو کرتے اور جس شخص میں شمہ برابر بھی بد دیانتی، کذب یا سوءِ حفظ کی شکایت پاتے اس کی حدیث قبول نہ کرتے۔ راویوں کے حالات میں ضخیم ضخیم کتابیں انھوں نے لکھی ہیں۔

اہلِ اسلام کو اس پر جس قدر بھی فخر ہو کم ہے کہ فنِ حدیث کے لیے علماء نے بے مثال جد و جہد کی ہے۔ جن رواۃ کے حالات کی مکمل تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے اور حالات بھی صرف اتنے نہیں کہ وہ کون تھا؟ کب پیدا ہوا؟ کہاں تھا؟ اور کب وفات ہوئی؟ بلکہ یہ بھی کہ اس کے اساتذہ و تلامذہ کون ہیں؟ حافظہ کیسا تھا؟ دیانت اور علم میں اس کا مقام کیا تھا؟ محدثین اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آج کے ایٹمی دور میں سینکڑوں وسائل اور ذرائع تحقیق کے باوجود کسی ایک شخص کے بارے میں صحیح معلومات کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے حدیث کی حفاظت کے لیے لاکھوں افراد کے حالات جمع کیے ہیں ان کی دشواریوں کا اندازہ لگائیے۔

راوی کے حالات کی چھان بین کے فن کو اسی لیے فنِ رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب مشہور محدث یحییٰ ابن سعید القطان (م ۱۹۸ھ) نے لکھی تھی، پھر اُن کے تلامذہ یحییٰ ابن معین (م ۲۳۳ھ) امام احمد (م ۲۴۱ھ) ابو خیثمہ (م ۲۳۴ھ) اور عمرو ابن علی الفلاس (م ۲۴۹ھ) وغیرہ نے اس فن میں دادِ تحقیق لی۔ پھر ان لوگوں کے تلامذہ امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ نے ادھر توجہ کی۔[۵۴]

لیکن یحییٰ ابن سعید القطان اور ان کے تلامذہ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ باقی نہ رہ سکا۔ جو کتابیں موجود ہیں، وہ یا تو مخطوطوں کی شکل میں لائبریریوں کی زینت ہیں یا اس فن پر حاوی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی "التاریخ الکبیر" جو اگرچہ آٹھ اجزاء میں ہے مگر اپنے فن کو محیط نہیں ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد (دکن) سے چھپی ہے۔ اس فن کی اولین تفصیلی کتاب علامہ یوسف ابن الزکی مزنی (م ۷۴۲ھ) کی "تہذیب الکمال" ہے۔ پوری کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے "الاکمال فی بیان احوال الرجال" کے نام سے اس پر اضافے کیے ہیں۔ حافظ شمس الدین ذہبی نے مزنی کی "تہذیب الکمال" کی تلخیص کر کے "تہذیب التہذیب" اور "الکاشف فی اسماء الرجال" ترتیب دی ہیں۔ "میزان الاعتدال فی اسماء الرجال" اور "تذکرۃ الحفاظ" بھی ذہبی کی کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب تین جلدوں میں ہے اور دوسری چار ضخیم جلدوں میں۔ "سیر اعلام النبلاء" بھی ذہبی کی محققانہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کی تصحیح و ترتیب کے بعد یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے۔

مشہور ماہرِ رجال حافظ ابن حجر نے ذہبی کی "میزان الاعتدال" پر اضافے بھی کیے۔ اس کا نام انھوں نے "لسان المیزان"

---

[۵۳] عجالۂ نافعہ ص ۲ [۵۴] میزان الاعتدال (مقدمہ)

رکھا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر ابن حجرؒ کی مستقل تصانیف بھی ہیں جن میں "تہذیب التہذیب" نہایت ضخیم ہے اور بارہ جلدوں میں حیدر آباد سے چھپی ہے "تقریب التہذیب" اور "طبقات الحفاظ" بھی اہم کتابیں ہیں۔ اس مختصر سی گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے ان لوگوں کے سلسلے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کوئی حدیث روایت کی ہے۔

روایات میں بھی محدثین نے درجات قائم کر دیئے ہیں۔ احادیث مرفوع بھی ہیں، منقطع و موقوف بھی۔ شاذ بھی ہیں، مرسل بھی، غریب بھی منکر بھی، حسن یا صحیح بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کا الگ حکم۔ پھر یہ کہ راوی نے "عن فلان" کہہ کر روایت بیان کی ہے۔ یا "اخبرنا" کے ساتھ یا دوسرے لفظوں میں۔ ان سب صورتوں کے احکام علیحدہ ہیں بعض صورتیں اہم ہیں اور بعض اس سے کم درجے کی۔ اس پوری کد و کاوش سے جو فن سامنے آیا اسے علم درایت کہتے ہیں۔[۵۵]

اس موضوع پر بھی اَن گنت کتابیں لکھی گئیں۔ حافظ ابن حجر کی "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح اصول حدیث کی مشہور کتابیں ہیں اور دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ کتاب کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ متعدد علماء نے اس کی شرح لکھیں مثلاً ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے "شرح شرح النخبۃ" مولانا عبدالحیٰ خطیب جامع، رنگون نے "المسلعۃ العربی فی توضیح شرح النخبۃ" اور مولانا اکرم ابن عبدالرحمٰن سندھی نے "امعان النظر" لکھی۔ اس فن پر کچھ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ابو محمد عبدالرحمٰن رازی (م ۳۲۷ھ) "علل الحدیث"، تقی الدین ابن صلاح (م ۶۴۳ھ) مقدمہ ابن صلاح، امام نووی (م ۶۷۶ھ) "تدریب الراوی طاہر صالح الجزائری" "توجیہ النظر"، حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) "الھدی الساری فی مقدمۃ شرح البخاری" شمس الدین السخاوی (م ۹۰۲ھ) "شرح الفیہ" وغیرہ۔

ہندوستان کے علماء نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان میں مولانا عبدالحیٰ لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) کی "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" اور "ظفر فی مختصر الجرجانی" بہت مشہور ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) کی کتاب "مختصر" کی شرح ہے۔ شیخ نظام الدین حلوی کاکوروی نے "المنہج" سید مرتضیٰ ابن محمد حسین بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) نے "بلغۃ الغریب فی مصطلح آثار الحبیب" شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے "العجالۃ النافعہ"، نواب صدیق حسن بھوپالیؒ (م ۱۳۰۷ھ) نے "حدیث منہج الاصول الی اصطلاح احادیث الرسولؐ" لکھیں۔ اصول حدیث میں ایک عربی رسالہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ یہ مقدمہ بڑے سائز کے ۱۰۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا شریف حسنؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اصول حدیث میں اس سے بہتر کتاب نہیں ہے۔ ادارہ شرکت علمیہ دیوبند نے فتح الملہم کی پہلی جلد شائع کی ہے۔ اس میں یہ مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔

روایت کے رد و قبول کے سلسلے میں کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ آیئے صرف کذب راوی کے مسئلے پر مختصر سی گفتگو

---

[۵۵] فتح الملہم مقدمہ ج ۱ ص ۲

کریں۔ اس سے بھی سیرت نبوی کے مآخذ کی صحت پر روشنی پڑے گی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "عجالۂ نافعہ" میں روایت میں کذب کی حسب ذیل علامات بیان کی ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ ہم یہاں ان علامات کا واضح اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

حسب ذیل اصول میں سے کوئی اصل اگر کسی روایت میں پایا جائے گا تو اُسے رد کر دیا جائے گا (۱) مشہور و معروف تاریخ کے خلاف روایت ہو مثلاً کسی کا یہ کہنا کہ جنگ صفین میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایسا فرمایا۔ حالانکہ ابن مسعودؓ جنگ صفین سے قبل خلافتِ عثمانؓ میں انتقال فرما چکے تھے (۲) راوی رافضی ہو اور صحابہ پر طعن کے متعلق احادیث بیان کرے یا ناصبی ہو اور اہل بیت پر طعن کے سلسلے میں حدیث بیان کرے (۳) راوی ایسی بات بیان کرے جس کا جاننا اور عمل کرنا ہر مکلف پر فرض ہو اور وہ روایت میں تنہا ہو تو یہ حدیث جعلی قرار دی جائے گی (۴) وقت یا حالت ہی راوی کے جھوٹا ہونے کا قرینہ ہو جیسے غیاث بن میمون کا واقعہ کہ وہ مہدی خلیفہ عباسی کی مجلس میں حاضر ہوا۔ خلیفہ اس وقت کبوتر بازی میں مصروف تھا۔ غیاث نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر   بازی جائز نہیں مگر اونٹ، تیر، گھوڑے اور پرندے ہیں

او جناح

اس میں جناح کا لفظ غیاث نے مہدی کو خوش کرنے کے لیے بڑھایا تھا (۵) روایت عقل و شرح کے مقتضیٰ کے خلاف ہو اور شرعی اصول سے اس کی تکذیب ہو جائے۔ مثلاً یہ روایت: لا تاکلوا البطیخ حتی تذبحوھا، خربوزے کو ذبح کر کے کھاؤ (۶) ایسا کوئی واقعہ بیان کیا جائے جو اگر واقع ہوتا تو ہزاروں لوگ اس کو نقل کرتے۔ مثلاً کوئی یہ روایت کرے کہ آج بروز جمعہ خطیب کو برسر منبر قتل کر دیا گیا (۷) حدیث کے الفاظ رکیک ہوں اور عبارت کی ساخت عربی قواعد کے خلاف ہو، اس طرح کی روایات وقار نبوت کے منافی ہیں (۸) صغیرہ گناہ سے ڈرانے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہو یا تھوڑے سے عمل پر حج و عمرے کے ثواب کی امید دلائی گئی ہو (۹) خیر کے کام کرنے والوں کو یہ امید دلانا کہ انہیں انبیاءؑ کے ثواب کے بقدر ثواب ملے گا یا ستر نبیوں کا ثواب حاصل ہو گا (۱۰) راوی حدیث وضع کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف کرے[1]

ملا علی قاری نے بھی کچھ علامات بیان کی ہیں۔ (۱) وہ حدیث جو صریح احادیث کے خلاف ہو (۲) وہ احادیث جن میں آئندہ واقعات کی بقید تاریخ پیشین گوئی کی گئی ہو (۳) وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً یہ کہ عوج ابن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا (۴) وہ حدیث جو قرآن کی صراحتوں کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے[2]

سیرت کی ضرورت کیا ہے؟

اس عنوان کے تحت ہمیں اب سیرت کی ضرورت پر گفتگو کرنی ہے۔ ایک ایسا شخص جس پر چودہ سو برس کا طویل زمانہ گزر گیا۔ نئے دور کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؟ اور ہمیں اس کی پاک زندگی کے مطالعہ سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہو گا۔

---

[1] العجالۃ النافعۃ ص ۵۸-۶۰ [2] الموضوعات ص ۹۲

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس شخص کے حالاتِ زندگی جاننے کی کوشش کریں جس نے خدا کی طرف سے ہمیں حق کا، ہدایت کا پیغام دیا اور کفر کی تاریکیوں میں اسلام کی روشنی عطا کی۔ جو شخص ہمارا محسنِ اعظم ہے جس کی آواز پر ہم نے لبیک کہا ہے۔ وہ کون ہے؟ کب پیدا ہوا؟ کہاں پیدا ہوا؟ اس کا کیا پیغام ہے؟ اس نے اپنے مشن کی تکمیل میں کتنے مصائب برداشت کیے؟ کس قدر تکلیفیں برداشت کیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات ہمیں سیرت کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ پاک کا ہر حکم واجب العمل ہے۔ اس مقدس کتاب کا حکم ہے " مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا " اس لیے کہ " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " اور اس لیے بھی " وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى " اسی لیے قرآنِ پاک نے یہ اعلان فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ " اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم سیرت کے مطالعے کے پابند ہیں۔

سیرت کی ضرورت انسانی حیثیت سے بھی ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے " وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ " قرآنِ پاک نے جو دعویٰ کیا ایک انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیاتِ پاک میں اس دعویٰ کی صداقت تلاش کرے۔

دنیا میں ہمیشہ بڑی شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اکثر نگاہوں سے اوجھل ہیں جو لوگ تاریخ کی روشنی میں آ گئے۔ ان کے حالات اتنے مختصر ہیں کہ زیرِ بحث شخصیت کے خدوخال اچھی طرح واضح نہیں ہو پاتے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے متبعین تسلسل کے ساتھ موجود رہے ہیں مگر ان کے حالات پر بھی تخیلات کا گہرا پرتو ہے۔ بودھ مت، ویدک دھرم، آریہ دھرم اور زرتشت کے پیشواؤں کے حالات بھی تاریخی صداقتوں سے محروم ہیں، اور ان پر گمنامی کا دبیز کہر چھایا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس بیان میں کتنی صداقت ہے کہ " آج مذاہب کی تاریخ میں کتنے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہمارے اوتار، ہمارے پیغمبر، ہمارے بھگوان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کریں گے بھی تو اس کی کوئی حقیقت نہیں ہو گی۔ کتابیں بتاتی ہیں کہ بعض مذاہب والے تو اپنی کتابیں بھی محفوظ نہ رکھ سکے لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنا سرمایہ مذہب محفوظ رکھا فللّٰہ الحمد علیٰ ذالک "[58]

علمِ کلام کے نقطۂ نظر سے بھی سیرت ہمارے لیے اہم اور اس کا مطالعہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسلام میں خدا کی معبودیت اور وحدانیت کے اعتراف کے بعد سب سے اہم مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا ہے جو ذات ہمارے لیے اتنی اہم ہو اور جس کا نام لیے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہ ہوتا ہو اس کے حالات سے لاعلمی بدترین جرم ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر سیرتِ نبوی انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی لیے ابن تیمیہؒ نے اس شخص کو جو مدعیانِ علم و مملکت کے ہاتھوں یقین و ایمان کی دولت ضائع کر چکا تھا۔ یہ وصیت کی تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر حیاتِ طیبہ کے مطالعے میں لگ جاؤ اور بقول مولانا آزادؒ (م ۱۹۵۸ء) " انھوں نے اس طرح یہ بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصل سرچشمہ صرف حیاتِ نبوت اور منہاجِ مقامِ رسالت ہے جس کو قرآن نے الحکمۃ سے تعبیر فرمایا ہے "[59]

---

[58] مناظر احسن گیلانی۔ النبی الخاتم ص ۷ [59] مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ ص ۱۶۰

سیرت نگاری کے چند پہلو

ڈاکٹر سید معین الحق

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو یقیناً دوسرے انبیاء و بانیان مذاہب کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ ممتاز اور نمایاں نظر آئے گی، اس گہری عقیدت کے علاوہ، جو راسخ العقیدہ مسلمانوں کو آپؐ کی ذات گرامی سے رہی ہے اور رہے گی۔ بعض غیر مسلم مورخین نے بھی جہاں تک ان کے تعصبات و مخصوص مزاجی کیفیت اور اسالیب بیان و طرز استدلال نے اجازت دی ہے آنحضرتؐ کی عظمت اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ تہذیب و تمدن کے مختلف ابواب اور خاص طور پر ان انقلابات کا بغور مطالعہ کریں جن کی بدولت حیات کی بنیادی اقدار بلند سے بلند تر ہوتی رہی ہیں، اور جن کے ذریعہ مادی ترقی کے علاوہ زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں نے جلا حاصل کی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے، کہ کوئی انقلابی تحریک اسلام سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی، اور اس میں قطعی شک کی گنجائش نہیں کہ اسلام کی صحیح اور مکمل تصویر، رسول اللہؐ کی حیات طیبہ ہے، آپؐ ہی کی زبان مبارک کے ذریعہ قرآنی آیات انسان تک پہونچیں اور آپ ہی کے اقوال و افعال نے اس انقلاب کو عملی جامہ پہنایا، جو نزول قرآن کا مقصد تھا۔ اسی خصوصیت اور امتیاز نے آپؐ کی زندگی کو تاریخ کا اہم ترین باب بنا دیا ہے جس کے ہر گوشہ کا مطالعہ ضروری ہے، صرف ان ہی لوگوں کے لیے نہیں جو آپؐ کی اتباع کو اپنے لئے ذریعۂ نجات اور باعث صد افتخار سمجھتے ہیں بلکہ تاریخ تہذیب کے ہر اس طالب علم کے لئے جو ترقی کی ارتقائی منازل کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ کی سوانح حیات کی صحیح اور مکمل تصویر تیار کرنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آپؐ کی ذات جس کاملیت اور جامعیت کی حامل ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کام سہل نہیں۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے وہ بنیادی اصول جن کی تعلیم آپؐ نے دی ہے، دوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں معلومات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کا نئے انداز سے مطالعہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپؐ کی زندگی کے واقعات اور ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا پہلا قدم ہے۔ اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے "تاریخ اسلام اور متعلقہ علوم کے علاوہ، انسانی تہذیب اور اس کے ارتقائی مدارج کا تجزیہ بھی لازمی ہے، اس وسیع اور مسلسل مرقع میں اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ کی بلند مقامی کا اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جبکہ تصویر کے ہر پہلو کا غور سے جائزہ لیا جائے۔

اس نظریہ سے اب اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ کسی تاریخی شخصیت کے حالات اور اقوال اس اہتمام اور تفصیل کے ساتھ محفوظ نہیں کئے گئے، جیسے آنحضرتؐ کے کئے گئے ہیں۔ محدثین و مورخین اسلام کی اس کوشش کا ذکر کرتے ہوئے اسپرنگر نے جو مغربی مستشرقین میں سیرت پر اپنی تصنیف کی وجہ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ "کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری، نہ آج

موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔
ان تفصیلات کے محفوظ کئے جانے کے سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر اہم ہے کہ رسول اللہ کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق نجی زندگی سے ہی کیوں نہ ہو، اسی قدر ظاہر اور عیاں تھا، جیسے وہ اقدامات جو اعلیٰ مسائل حل کرنے یا ان سے متعلق اعلانات و ہدایات جاری کرنے کی غرض سے کئے جاتے تھے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص چاہے اس کی شخصیت کسی قدر بلند کیوں نہ ہو، اپنے گھر میں یعنی اپنی بیوی بچوں اور نجی ملازموں کے سامنے معمولی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ان کو اس کی کمزوریوں سے اتنی ہی واقفیت ہوتی ہے جتنی اس کے کمالات سے والٹیر (VOLTAIRE) نے صحیح کہا ہے کہ کوئی شخص اپنے نجی خدمت گار کی نظر میں ہیرو نہیں ہو سکتا، (NO MAN IS A HORO TO HIEVOLET) لیکن رسول اللہؐ کی زندگی اس اصول سے مستثنیٰ اور بالاتر ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ آپؐ کی شریک حیات، آپؐ کا غلام، آپؐ کا چچازاد بھائی جو آپؐ کے ساتھ رہتا تھا اور آپؐ کا عزیز ترین دوست ہی سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ نبوت سے قبل آپؐ کی چالیس سالہ زندگی، ایک کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح، روشن اور آئینہ کی طرح صاف اور پاک تھی؟ عمر کے آخری دور میں آپؐ کے متعدد شادیاں کرنے پر مخالفین اسلام نے کس کس انداز سے اعتراضات کئے ہیں لیکن کیا کبھی اس پہلو پر بھی غور کیا گیا ہے کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اپنی رفیقہ حیات کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ خلوت و جلوت کی ہر بات برملا کہہ دے، لیکن آنحضرتؐ کی ایک وقت میں نو بیویاں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کو "اذنِ عام تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں برملا سب سے بیان کر دو، جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کر دو، جو بند کوٹھڑیوں میں دیکھو اس کو کھلی ہوئی چھتوں پر پکار کر کہہ دو، اس اخلاقی وثوق و اعتماد کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟"[1] اس سوال کا جواب "تاریخ" صرف نفی میں دے سکتی ہے شمائل کی کتابیں، آپؐ کے اخلاق و عادات اور اعمال و افعال کی جزئیات سے پُر ہیں، یہاں مختصراً بھی ان ابواب کا ذکر ناممکن نہیں جو ان کتابوں میں قائم کئے گئے ہیں، لیکن بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی اخلاق و اوصاف کی پاکیزگی کا یہ حیرت انگیز مجموعہ کسی دوسری ایسی شخصیت میں نظر نہیں آئے گا، جس نے نسلِ انسانی کی روحانی قیادت کے ساتھ ساتھ معاشرتی مساوات اور مادی ترقی و خوشحالی کے لئے مؤثر اور انقلابی اقدامات کئے ہوں، جس نے راتیں جاگ جاگ کر ذکر و عبادت میں گذاری ہوں اور دن کے وقت میدانِ جنگ میں معمولی سپاہی کی طرح جہاد میں جان کی بازی لگائی ہو اور آخر میں وسیع پیمانہ پر کامیابیاں حاصل کر کے ایک بڑے ملک میں نظامِ حکومت قائم کیا اور چلایا ہو، اور جس نے حکمرانی کی ذمہ داری اور اقتدار کے باوجود تخت و تاج نہیں بلکہ فقر و غنا پر فخر کیا ہو۔

سیرت سے متعلق ہم عصر و نیم ہم عصر مآخذ اور مواد کی کثرت، مورخ کے لیے سہولتیں بھی بہم پہونچاتی ہے اور اس کے راستہ میں دشواریاں بھی پیدا کرتی ہے۔ کلام اللہ کے بعد سب سے اہم اور مستند معلومات وہ ہیں جو حدیث اور سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں، لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ ان ہی کے غیر محققانہ مطالعہ کی بنیاد پر یا نسلی و مذہبی تعصب کی وجہ سے بعض مستشرقین نے ایسے غلط اور گمراہ کن "نتائج" اخذ کئے ہیں جن کو دیکھ کر خود فنِ تاریخ نویسی کو شرم آنے لگتی ہے، اس سلسلہ میں یہ ذکر ضروری ہے کہ خود ہمارے مصنفوں نے بھی سیرت اور مغازی

---

[1] سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس۔

پر ایسی روایتیں جمع کر دی ہیں جو کسی صورت سے بھی تاریخی شہادت کے جدید معیار پر پوری نہیں اتر سکتیں اس کے علاوہ موضوع اور ضعیف حدیثوں کی موجودگی نے مزید مشکلات پیدا کر دی ہیں، اس سے خوف کھا کر بعض لوگ کلیتہً حدیث کی افادیت اور استناد سے منکر ہو گئے ہیں، یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ممکن نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ دورِ جدید کی تحقیقی موشگافیوں اور کوششوں کے پیشِ نظر اس منفی نظریہ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا، وضع حدیث کا مسئلہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں موضوعِ بحث رہا ہے، اور اس پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس پر مزید تحقیق۔ تنقید کی اب بھی کافی گنجائش ہے اور تاریخ نویسی کے نظریات میں تبدیلیوں کے ساتھ یہ گنجائش بڑھتی ہی رہے گی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کام سخت محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم فرار ذہنیت کا مظاہرہ کریں اور حدیث سے منکر ہو جائیں، اس بزدلی اور احساس کمتری کو کسی طرح قابلِ تحسین نہیں کہا جا سکتا۔

دورِ جدید کے مورخین نے تاریخی شواہد و اسناد کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں جو اصول قائم کئے ہیں ان کا معیار بہت بلند سمجھا جاتا ہے، لیکن جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ مستند روایتوں کو ہم عصر اور قابلِ استناد شہادت ماننے پر مجبور رہیں، انیسویں صدی کے مشہور ترین مستشرقین میں اسپرنگر اور گولڈزیہر کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ بھی حدیث کی سند سے کلیتہً انکار نہیں کرتے، انہوں نے اور بعض دوسرے فضلائے نے تحفظ و تدوینِ حدیث کی ابتدائی تاریخ پر تفصیلی بحثیں کی ہیں اور اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ آں حضرتؐ کے عہد میں ہی حدیث کی روایت اور تحریر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور آپؐ کے بعد جمع حدیث اور اس کی تعلیم کا رواج برابر ترقی کرتا رہا، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تدریس اور وضع حدیث کا فتنہ بھی جلد ہی شروع ہو گیا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں لاتعداد جھوٹی حدیثیں رواج اور شہرت پا گئیں، اس فتنہ کو روکنے اور صحیح حدیثوں کو ضعیف اور موضوع حدیثوں سے علیحدہ کرنے کی غرض سے محدثینِ اسلام نے جس خلوص، محنت اور جانفشانی سے ان کی چھان بین کی اور اس مقصد میں جس حد تک وہ کامیاب ہوئے، وہ علمی تحقیق کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ اس بے مثال کوشش کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر مارگولیتھ نے کہا ہے کہ مسلمان اپنے علمِ حدیث پر جتنا بھی فخر کریں جائز ہے۔ خود ہمارے زمانہ میں سر ہملٹن گب نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ مستشرقین میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ان کی رائے میں "پہلی صدی کی ایک مخصوص کوشش یہ تھی کہ محمدؐ کی زندگی اور ان کے افعال سے متعلق ہر چیز کو جمع اور دوسروں تک پہنچایا گیا، یعنی آپؐ نے کسی موقع پر کیا کہا اور کیا کیا اور کیسے کیا، اور آپؐ نے اپنی موجودگی میں اور اپنے علم میں کیا کہنے کی اجازت دی، چونکہ آپؐ کی شخصیت کا آپؐ کے متبعین پر نہایت گہرا اثر تھا، یہ کوشش فطرتی تھی جس پر کوئی بیرونی اثر نہ تھا۔"

اسی بحث کے سلسلہ میں پروفیسر مذکور صحیح بخاری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"من حیث المجموع صحیح بخاری انتہائی دلچسپ اور محتاط عالمانہ تالیف ہے . . . . ہر غور سے پڑھنے والے طالب علم پر وہ، دیانتداری اور تقویٰ کا بہت نمایاں اثر چھوڑتی ہے۔"

آخر میں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

"جب تک تنقید کے دوسرے اصول دستیاب نہ ہوں، میدان ابتدائی دور کے ناقدین (یعنی محدثین) کے ہاتھ میں

رہے گا۔"

انہوں نے صحیح حدیث کا جو معیار قائم کیا ہے، اس کی وجہ سے پہلی صدی کی پراپیگنڈا والی (موضوع) حدیثیں اور بعد کی سب حدیثیں ترک ہوگئی ہیں، پروفیسر گب ایک دوسرے فاضل کی رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ:

"بلا شک و شبہ ان (حدیثوں) میں اصل موجود ہے، جو چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کے الفاظ نہ رکھتی ہوں، لیکن ان کے خیالات اور افعال کا عکس ان میں ضرور ہے، یا عرب کے ان رواجوں کا جن کو انہوں نے اس طریقہ پر اختیار کر لیا ہے یا شامل کر لیا، جیسے کہ ان پر ابتدائی عہد اسلام میں عمل ہوتا تھا۔[1]"

موجودہ دور کے ایک اور مستشرق پروفیسر مانٹگمری دیٹ کا خیال ہے کہ "حدیثوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، تشریعی (جن کی بنیاد پر شرعی قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔) اور تاریخی، جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے، بعض حدیثیں یقیناً موضوع ہیں، لیکن ان حدیثوں کے متعلق جن کا تعلق تاریخ سے ہے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مواد کو مقصد پر مبنی ہونے کا TENDENTIOUS (SHOPING) رنگ دے دیا گیا ہے، اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ حدیث اور اخبار میں جو معلومات محفوظ ہیں ان کو صحیح سمجھا جائے اور جو واقعات ان میں بیان کئے گئے ہیں ان کے صحیح ہونے میں شک کی کوئی وجہ نہیں بشرطیکہ تاریخی شہادت کے معیار پر وہ پورے اترتے ہوں۔[2] یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر دورِ جدید کے مستشرقین نے ان مآخذ کو اپنا ذریعہ معلومات بنایا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے کس طرح غلط تاویلیں کر کے اپنے مخصوص انداز میں نتائج اخذ کئے ہیں۔ سربرآوردہ مستشرقین کا حدیث کو مجموعی طور پر مستند ذریعہ معلومات تسلیم کر لینا، اس لئے اور بھی اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بعد ہمارے ان فضلاء کا مقام، مورخ کی نظر میں بہت گر جاتا ہے جو حدیث کی سند تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام مورخ اسی شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو جائیں تو تاریخ اسلام کے لاتعداد ابواب اس کے صفحات سے غائب ہو جائیں گے۔ غیر مستند مواد کو قابلِ اعتماد ذرائع معلومات سے علیحدہ کر کے صحیح واقعات کی ترتیب تو تاریخ کے طالب علم کا انتہائی اہم بلکہ اولین فرض ہے، موضوع حدیثوں کی موجودگی کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہم صحیح حدیثوں کو بھی سند کی حیثیت سے نظر انداز کر دیں، کسی مسئلہ کا حل یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ترکِ حل کا راستہ اختیار کر لیا جائے۔

اسلام میں فنِ تاریخ نویسی کی بنیاد بھی اصولِ حدیث کے طرز پر قائم ہوئی، شروع زمانہ میں بڑے مورخوں میں سے اکثر محدث بھی تھے چنانچہ ان کا طرزِ تحریر تاریخ کی کتابوں میں بھی وہی ہے جو حدیث کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ بعد میں جب تحریری مواد آسانی سے ملنے لگا تو اسناد نقل کرنے کا طریقہ ترک کر دیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات (سیرۃ) کو محفوظ کرنے اور اس پر مواد جمع کرنے کی کوشش بہت جلد شروع ہو گئی تھی، عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر سب

---

[1] دیکھو محمڈنزم۔ ہوم یونیورسٹی لائبریری باب پنجم۔

[2] دیکھو، محمد ایٹ مکہ صفحہ XIV

سے پہلی کتاب ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ ؐ ہے جو ایک مدت سے نایاب ہے[1] اگرچہ اس کا کافی حصہ ابن ہشام کی تصنیف میں محفوظ ہے۔ حال ہی (۱۹۵۵ء) میں پروفیسر گلامی نے ابن ہشام کے علاوہ دوسری کتابوں[2] سے مدد لے کر ابن اسحاق کی سیرت کا انگریزی ترجمہ " دی لائف آف محمد ؐ " کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ سیرت پر ابن اسحاق کی تصنیف ہمیشہ ایک اہم اور مستند تصنیف سمجھی گئی ہے اور سمجھی جاتی رہے گی لیکن اس موضوع پر مواد جمع کرنے اور اس کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کا کام اُن سے پہلے شروع ہو گیا تھا، ان کے بعض پیشروؤں کا ذکر مولانا شبلی ؒ نے اپنی عالمانہ تصنیف " سیرۃ النبی ؐ " میں کیا ہے، اس لئے ہم یہاں اس کا تفصیلی ذکر ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر یہ امر قابل غور ہے کہ سیرت پر روایات جمع ہونے کا زمانہ آنحضرت ؐ سے اس قدر قریب ہے کہ ان کو معاصر شہادت کا درجہ حاصل ہے، ابتدائی دور کے جن لوگوں نے یہ روایات جمع کی ہیں ان میں یہ قابل ذکر ہیں:

ابان ابن عثمان (۲۰ — ۱۰۰ھ) ان کی روایت کا ذکر واقدی نے ابن المغیرہ کے بیان میں اس طرح کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ؐ کی احادیث میں سے صرف مغازی کی روایات ابان کی سند پر لکھی تھیں[3]۔ عروہ ابن زبیر (۲۳ — ۹۴ھ) حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے نواسے اور حضرت عائشہ ؓ کے بھانجے تھے، اس موضوع پر ان کی روایتیں بکثرت موجود ہیں، بعض لوگوں نے ان کو تاریخ اسلام کا بانی کہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید ان کی تحریری یادداشتیں باقاعدہ کتاب کی شکل میں تھیں۔ بہرحال اس قدر یقینی ہے کہ ابن اسحاق ہی نہیں بلکہ ابن سعد، طبری اور دوسرے مورخوں نے بھی ان کی روایتیں کثرت سے بیان کی ہیں، ان کا قدرے مفصل ذکر آگے کیا گیا ہے۔

شرحبیل ابن سعد (ف۔ ۱۲۳ھ) کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت علی کو دیکھا تھا موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ جنگ بدر و احد میں حصہ لینے والوں کی فہرستیں انہوں ہی نے تیار کی تھیں۔

وہب ابن منبہ (۳۴ — ۱۱۰ھ) کے صحیفہ کا ۲۲۸ھ کا لکھا ہوا مخطوطہ اب مل گیا ہے، یہ نامکمل ہے اور اس سے زیادہ نئی معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں لیکن اس لئے اہم ہے کہ وہ اس امر کی بین شہادت ہے کہ رسول اللہ کے سوانح حیات پہلی صدی میں جمع کر لئے گئے تھے۔

عاصم بن عمر بن قتادہ (ف۔ ۱۲۰ھ) دمشق میں مغازی کا درس دیا کرتے تھے، ابن اسحاق ان کے شاگرد ہیں۔

ابن شہاب زہری (۵۰ — ۱۲۴ھ) اس فن کے امام ہیں اور اس پر پہلی تصنیف ان ہی کی ہے، وہ اپنے عہد کے اعلم العلماء تھے، موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق ان کے مشہور شاگرد تھے۔

ابن حزم (ف ۱۳۰ یا ۱۳۵ھ) اور ابن نوفل (ف۔ ۱۳۱ یا ۱۳۷ھ) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ابن اسحاق کی کتاب کا ایک نامکمل نسخہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ یہ مراکش میں ایک مسجد کے کتب خانہ میں موجود ہے قیاس کیا گیا ہے کہ شاید یہ اسی نسخہ کا ایک حصہ ہے جو ابن اثیر کے پاس تھا۔ اس کا روٹو گراف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] پروفیسر مذکور نے یہ نام تحریر کئے ہیں: واقدی، ازرقی، ابن سعد، ابن قتیبہ، بلاذری، طبری، سیرانی، ماوردی، ابن اثیر، ابن الزیات، ابن کثیر اور ابن حجر عسقلانی۔

[3] بحوالہ پروفیسر گلامی۔ مقدمہ صفحہ ۱۴۔

موسیٰ بن عقبہ (۵۵ - ۱۴۱ھ)، امام مالک، شافعی اور احمد ابن حنبل نے ان کی کتاب کی تعریف کی ہے لیکن ابن اسحاق نے ان کا ذکر نہیں کیا، ان کی کتاب کا کچھ حصہ مل گیا ہے جس کو مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا[1] ایک نہایت اہم روایت جو اس نامکمل دستاویز میں ملتی ہے، یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور زبیر بن عوامؓ دونوں نے حضرت ابوبکرؓ کی قیادت کو مکمل طور پر یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ، ہماری ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ ہم کو مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد اقتدار اعلیٰ کے سب سے زیادہ اہل حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں، غار میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ وہی تھے۔ اور ہم ان کی بزرگی اور مرتبہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ نے نماز کی امامت اس وقت جب کہ وہ ہم موجود تھے ان ہی کے سپرد کی تھی۔

ابن اسحاق (ف - ۱۵۰ھ) جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی کتاب کا بڑا حصہ ابن ہشام (۱۶۸ - ۲۳۰ھ) اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

تیسری صدی میں ابن سعد نے الطبقات الکبیر لکھی جس میں دو جلدیں سیرت پر ہیں، اسی طرح طبری نے بھی آں حضرتؐ کے مفصل حالات لکھے، بعد کے مورخین میں جن میں ابن اثیر بھی شامل ہیں ان کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، ان کے علاوہ بھی سیرت پر اور کتابیں تصنیف ہوئیں اور بعض عام تاریخوں میں مفصل واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

سیرت کے طالب علم کو ایک اور دشوار مسئلہ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، مغربی مصنفین اور اہل قلم تاریخ اسلام کو ہمیشہ ایک مخصوص رنگ دیتے رہے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی پاک شخصیت کو غلط انداز سے پیش کرنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ ہر زمانہ میں اعتراضات کی نوعیت اور شدت نے نیا اور مختلف رنگ اختیار کیا ہے، دورِ جدید کے مورخ اپنی حقیقت پسندی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوسری اقوام کی تاریخ مرتب کرتے وقت وہ خود اپنے قائم کردہ اصولوں سے انحراف کرنے لگتے ہیں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مغربی اقوام کو دنیا کے وسیع علاقوں پر سیاسی اقتدار حاصل تھا، اس بالا دستی نے ان کے اندازِ فکر اور فلسفہ پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ وہ مفتوحہ اقوام کے کردار اور کارناموں کا جائزہ لیتے وقت ان کی موجودہ پسماندگی کے آئینہ میں اپنے نظریات قائم کرتے ہیں، یہاں ہم ان مسائل پر مفصل بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن آنحضرتؐ کی ذات سے متعلق بعض مستشرقین اور دوسرے مغربی ادبا و شعرا کے چند بیانات بطور مشتے نمونہ از خروارے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کو یورپ میں تاریک عہد کہا جاتا ہے، یہ صحیح ہے، اس لئے کہ وہاں اس زمانہ میں جہالت اور تعصب کا دور دورہ تھا، لیکن اس دورِ جہالت میں بھی یہاں کے شعرا اور مصنفین، اسلام اور پیغمبر اسلام کی تنقیص میں سرگرم نظر آتے ہیں، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ کلیسائی تنظیم کے پیرو، اسلام کو بت پرستی سے متہم کرتے ہیں اور رسول اکرمؐ کو ایک بڑا بت تبلاتے ہیں آپ کے نام کو محامیٹ (MAHMET) اور پھر اس کو بگاڑ کر مامٹ (MAMET) کیا۔ اس دور کے یورپ میں آنحضرتؐ کے نام کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا مثال کے طور پر فرانس کی قومی نظم رولینڈ پیش کی جا سکتی ہے، اس لفظ کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اس کا اسم صفت یعنی محامیٹری یا مامیٹری، یعنی بت پرستی استعمال ہونے لگا، بت کے علاوہ میمٹ (MAMMET) گڑیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا شیکسپیر میں وھننگ میمٹز WHNN NG MAMMATS کا محاورہ استعمال ہوا ہے یہ لفظ احمق بلکہ گالی کے لئے بھی بولا جاتا تھا ایک

[1] اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر گلامی نے اپنے مقدمہ میں شائع کیا ہے۔

اور انگریزی لفظ ٹرمیگنٹ TERMAGANT بھی قابلِ غور ہے۔ فرانسیسی نظم رولینڈ میں یہ ایک ایسے بت کے لئے استعمال ہوا ہے جس کی مسلمان پرستش کرتے تھے، شیکسپیئر کے الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی کیا اہمیت اور استعمال تھا، وہ لکھتا ہے

I COULD HAVE SUCH A TERMAGANT FELLAIVHIPT FOR

O, ERDOING TERMAGANT, IT OUT HERODS HEROD.

جہل اور تنگ نظری نے تعصب اور عناد کی مغربی ذہن میں جو بنیاد مستحکم کر دی تھی وہ سیاسی اور حربی مخالفتوں کے ماحول میں مضبوط ہوتی رہی سولہویں صدی میں لوتھر اور ریفارمیشن REFORMATION کے دوسرے رہنماؤں نے بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے معاملہ میں وہی رویہ اختیار کیا جو کلیسائی نظم کے متبعین کا تھا، چنانچہ اعتراضات اور اتہامات کا سلسلہ جاری رہا، یہ صحیح ہے کہ مغربی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ان کی نوعیت اور طریق تحریر و استدلال میں نمایاں تبدیلیاں ہوگئیں، لیکن بنیادی مخالفت اپنی جگہ پر قائم رہی۔

ہر دَور کی طرح ہمارے عہد کے فضلا بھی اپنی قائم کی ہوئی اقدار کو مثالی سمجھتے ہیں اور انھیں کے معیار پر اسلامی تصورات اور تعلیمات کو جانچتے ہیں، تاریخی شہادت کے اصولوں کا بھی وہ اسی انداز سے جائزہ لیتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انتہائی محنت اور جانفشانی (اور بعض کی حقیقت پسندی) کے باوجود وہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں، جن سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے پیشروؤں کے بعض اعتراضات دہراتے ہوئے ندامت محسوس کرتے ہیں اور ان کو ترک کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اسناد کا سارا ذخیرہ وضع کیا ہوا ہے اور وہ کسی طرح قابلِ استناد نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ جدید ترین تحقیق کے پیشِ نظر یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاتا کہ وہ سب کچھ فرضی ہے، لیکن ثقہ سے ثقہ راویوں میں نقائص دریافت کرنے اور ان کے ان بیانات کو جو کسی نہ کسی سبب سے پسند خاطر نہیں، غلط اور ناقص ثابت کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے استدلال میں وزن ہو یا نہ ہو، وہ اپنے اعتراضات کو پختہ تصور کرتے ہیں اور قطعی طور پر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ایک روشن مثال عروہ بن زبیر کی ہے، ان کو مسلمہ طور پر ثقہ مانا گیا ہے، سیر اور مغازی میں ان کی روایتیں کثرت سے ملتی ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو عالماً بالسیرۃ کہا ہے اور کشف الظنون[1] کے بیان کے مطابق تو سیرۃ کی پہلی کتاب ان ہی کی تصنیف تھی، عروہ کی دیانت اور تقویٰ کی اس سے بہتر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ بقول ابن حجر عسقلانی وہ اپنے عہد کے جھگڑوں (فتن) میں شریک نہیں ہوئے، وہ پہلی صدی کے راوی ہیں اور جن لوگوں کی سند پر انھوں نے روایت کی ہے ان میں اسلام کی بہترین شخصیتیں شامل ہیں، لیکن ان خصوصیات کے باوجود مستشرقین کو ان کی روایات پر اعتبار نہیں۔ پروفیسر واٹ WATT ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (عروہ) ایک خاص ماحول MILIE سے تعلق رکھتے تھے، یعنی اس پارٹی سے جو محمدؐ کے زمانۂ حیات میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کی مجلس ثلاثہ[2] TRI UMVIRATE کی سرکردگی میں

---

[1] جلد دوم م۔ کالم ۱۰۱۴۷ ۔ [2] یہ اصطلاح روما کی تاریخ سے لی گئی ہے وہاں ایک زمانہ میں اقتدار اعلیٰ تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی یا مجلس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اسی مجلس کو تزام وبری (TRIUM VIRATE) کہتے تھے۔

برسرِ اقتدار تھی، اس کے بعد عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کی پارٹی سے جس نے ۳۶ھ میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کی مخالفت کی، اس کے بعد اس پارٹی سے جس نے ۶۲ - ۷۲ھ میں بنو امیہ کے اقتدار کے خلاف جنگ کی یہ تینوں پارٹیاں ایک تو نہیں تھیں بلکہ علیحدہ علیحدہ تھیں لیکن پھر بھی ان میں تسلسل کا ربط CONTINUELY موجود تھا اس پر ہم کو تعجب نہ ہونا چاہئے کہ جو مواد انہوں نے ہم پہونچایا ہے اس کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے، جو بنو امیہ اور ان دوسرے لوگوں کو جنہوں نے محمدؐ اور ابوبکرؓ کی مخالفت کی تھی بُرے رنگ میں پیش کرتا ہے، مثلاً بنو عبدِ مناف کے بزرگوں کے متعلق محمدؐ کی شکایت، مخالفین کی فہرست، ابوجہل کی گستاخی اور جنگ کی کوششیں، لیکن یہ مسئلہ سہل نہیں، قدیم گروہ شکستہ ہونے لگے تھے اور عبدالملک کی کوشش یہ تھی کہ کسی صورت سے عروہ کو ہموار کرے۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عروہ بنو امیہ کے جانی دشمن تو نہ تھے مگر ان کی ہمدردیاں ایک مدت تک حزبِ اختلاف کے ساتھ رہیں اگرچہ شاید ۷۲ھ کے بعد وہ قدرے بدل گئیں علاوہ ازیں انکی خاندانی روایات بھی جن سے ان کی بیان کی ہوئی روایتیں ضرور متاثر ہوئی ہوں گی بنو اُمیہ کے خلاف ہی تھیں، لہٰذا اس کیلئے کچھ جواز موجود ہے کہ عبدالملک کے نام ان کا خط تعصب سے پاک نہیں (IS NOT IMPARTIAL) اس بنا پر یہ خیال غیر معقول UNREASONABLE نہ ہوگا کہ اس خط میں مظالم سے بچنے کے لئے مسلمانوں کے حبشہ کو ہجرت کر کے چلے جانے پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ ظلم کرنے والوں میں بنو امیہ اور دوسرے لوگ تھے جو قدیم سے ابوبکرؓ، زبیرؓ اور ان کے خاندانوں کے دشمن تھے، اگرچہ ہجرت حبشہ میں ابوبکرؓ اور ان کے احباب کا نمایاں حصہ تھا، قبیلہ اور خاندان کی روایت اس پر زیادہ زور نہ دیتی کیونکہ یہ اقدام بہت زیادہ باعث افتخار نہ تھا، لیکن اس کی تشہیر میں حریفوں کی تحقیر کا پہلو آسانی سے مل جاتا ہے[1]۔"

اس طویل اقتباس کو خود مصنف کے الفاظ میں پیش کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ پروفیسر وٹ کے طرزِ استدلال کا جائزہ لینے میں سہولت ہو، اس کو غور سے پڑھنے پر وہ دلائل سامنے آجاتے ہیں جن کی بنیاد پر پروفیسر وٹ، عروہ کی ثقاہت کو مجروح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چونکہ بعض لوگوں کی رائے میں فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی اور سیرت سے متعلق کثرت سے ان ہی کی روایتیں ہیں جو دوسرے مصنفین نے نقل کی ہیں، اس لئے اگر کسی صورت سے ان کے بیانات کی تنقیص کی جاسکے تو بہت سے واقعات کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں گے اور اس صورتِ حال سے مخصوص نتائج اخذ کر کے سیرت کی اپنی من مانی تصویر تیار کرنے میں دقت نہ ہوگی اگر ہم پروفیسر وٹ کے الفاظ کو غور سے پڑھیں تو بغیر کسی دقت کے معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دلائل کس قدر ناقص اور ناقابلِ قبول ہیں، سب سے پہلی دلیل جس پر تاریخ کے طالب علم کو ہنسی آتی ہے ان کی یہ کوشش ہے کہ آنحضرتؐ کے دور میں پارٹی سسٹم کا وجود ثابت کریں، رسول اللہؐ، ابوبکر صدیقؓ اور ابو عبیدہؓ کو "مجلسِ ثلاثہ"

---

[1] محمد ایٹ مکہ (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۳ء) ص ۱۸۱ - ۱۸۲۔

(TRIUM VIRATE) کہنا تاریخ اور فنِ تاریخ نویسی کا مذاق اُڑانا ہے، پروفیسر وٹ جیسے فاضل کے قلم سے ایسے الفاظ لکھے جانے پر حیرت ہوتی ہے اور صرف یہی تبصرہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے وہ ہر دلیل پیش کرنے کو تیار ہیں، چاہے وہ مضحکہ خیز ہی کیوں نہ ہو، پروفیسر مذکور جب خود ہی تاریخی واقعات پر غور کرتے ہیں تو ان کو خیال آتا ہے کہ عروہ کے متعلق ان کے بیان میں تضاد پیدا ہو گیا ہے، اس لئے وہ نئی تاویل کر کے کہتے ہیں کہ ۷۲ھ کے بعد اُن کی ہمدردیاں بدل گئیں، مثال کے طور پر انہوں نے ہجرت حبشہ سے متعلق روایات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ قابل غور ہے ان کے نظریہ کے مطابق ہجرت حبشہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے احباب کے لئے کوئی باعثِ افتخار عمل نہ تھا، بلکہ اس سے ان کی حیثیت اور عظمت پر داغ آتا تھا، اس صورت میں عروہ کو اس ہجرت سے متعلق روایات پر زیادہ زور نہ دینا چاہئیے تھا لیکن انہوں نے روایات بیان کی ہیں، چنانچہ پروفیسر مذکور اس کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ عروہ چاہتے تھے کہ بنوامیہ کی اسلام دشمنی کی تشہیر ہو۔

مستشرقین کے تبصروں اور تاویلوں کے انداز و مقاصد کی طرف ان مختصر اشارات سے کم از کم یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری تاریخ کو مخصوص رنگ دینے کے لئے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں، اس تنقید سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم اس دور کے مغربی اہلِ علم اور فضلاء کی نیت یا تحقیقی معیار کے متعلق شبہ کریں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مبنی بر مقصد-TANDNET-ING طریقہ استدلال کا یہ غیر شعوری مظاہرہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے مستشرقین اور خود ہمارے طلبہ و مصنفین جوان کی تحقیقات اور تبصروں سے متاثر ہو جاتے ہیں ان ہی دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تصورات و نظریات مرتب کرتے ہیں، یہ امر قابل غور ہے کہ پروفیسر وٹ اپنی دلیلوں کو قطعی طور پر صحیح سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ انہوں نے ایک ایسے راوی کو جو تقریباً ہم عصر ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے ثقہ اور قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے، کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا وہ بظاہر اپنی اس کامیاب کوشش سے مطمئن ہیں، لیکن ایک تاریخ کا طالبِ علم بجا طور پر یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اس مسئلہ کے تجزیہ میں عروہ کے کردار اور ان کے اخلاقی و دینی تصورات و اعمال[1] کو نظر انداز کر دینا صحیح ہے؟ کیا ہم کو اس پر غور کرنا نہیں چاہیے کہ وہ کون سے مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے اقتدار میں آنے والی پارٹی کی خوشامد ضرور اور پھر بنوامیہ کے دَورِ عروج میں ان کے آباواجداد کی تنقیص میں روایتیں بیان کرنے سے ان کو کیا حاصل ہو سکتا تھا، وہ اپنے عہد کے اختلافات میں کیوں ملوث نہیں ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کی مادی زندگی میں تقویٰ اور خدا ترسی کے لئے کوئی مقام نہیں، چنانچہ دورِ جدید کے ناقدین اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ اسلامی

---

[1] عروہ کے اخلاق اور اوصاف رجال کی کتابوں میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ نہایت پابندی سے نمازِ تہجد ادا کرتے تھے اور ہمیشہ روزے رہتے تھے، چنانچہ انتقال کے دن بھی روزے سے تھے۔ ان کے تقویٰ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ زخم کی وجہ سے ان کا پیر کاٹنے کی ضرورت ہوئی، جراح نے تکلیف کا احساس کم کرنے کے لیے شراب پلانا چاہی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، سیاسی فتنوں سے بچنے کے لئے انہوں نے شہر چھوڑ کر مدینہ کے قریب ایک گاؤں عقیق میں قیام کر لیا تھا۔

تاریخ کے مسائل اور شخصیات کو سمجھنے کے لئے زندگی کے اس عنصر کی حیثیت پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم صرف ان ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں جن سے عروہ نے روایت کی ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ اموی دور کی گروہ بندی میں ان کی دلچسپی کا ذکر ان پر کتنا بڑا اتہام ہے۔

تاریخی شواہد کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں ایک اور مسئلہ قابلِ غور رہے، دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ آج کل قرائنی شہادت پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے، محدثین و مورخینِ اسلام نے بھی درایت کو اہمیت دی تھی، لیکن دورِ جدید کے بعض مصنفین قرائنی شہادت کے مقابلہ میں ثقہ راویوں کے بیانات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ قرائنی شہادت کی ترتیب اور اس کی اہمیت میں خود مورخ کے قیاسات بلکہ مزاجی کیفیات اور عقائد کو بھی دخل ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ بعض واقعات کی تاویل اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں یہ لوگ غلط راستہ پر پڑ جاتے ہیں مثلاً اوپر نقل کی ہوئی مثال میں یہ نظریہ قائم کر لینے سے کہ عہد نبوت میں اس زمانہ کی طرح پارٹیاں اور گروہ بندی موجود تھی کس قدر غلط نتائج نکالے گئے ہیں، ثقہ سے ثقہ راویوں کو شک کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم درایت اور قرائنی شہادت کو ثقہ راویوں کے بیانات کے مقابلہ میں غیر ضروری سمجھیں، یہ اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ان کی اہمیت کو حد سے زیادہ آگے لے جانے میں خطرہ ضرور ہے، ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ بعض حالات میں قرائنی شہادت پر اعتماد ناگزیر ہو جاتا ہے صحیح واقعات کی ترتیب اور ان کی بنا پر صحیح نتائج مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قابلِ اعتماد روایات، تحریری مواد اور قرائنی شہادت میں توازن قائم رکھا جائے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف سیرت ہی نہیں بلکہ تمام تاریخ اسلام سے متعلق مستشرقین کے پیش کردہ نظریات اور ان کے عائد کردہ الزامات و اعتراضات، ہمارے لئے ایک چیلنج ہیں، اگر ہم اپنے شاندار دینی، اخلاقی اور ثقافتی ورثہ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کے سامنے اسلامی تہذیب اور تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہمارے لیے یہ چیلنج قبول کرنا ناگزیر ہے، اور یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اگر اس مسئلہ میں ہماری طرف سے غفلت برتی گئی تو یہی غلط تصویر جو مغربی مصنفین کی طرف سے پیش ہوتی رہتی ہے صحیح تسلیم کر لی جائے گی، ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ وہ مصنفین بھی جن کو ذاتی طور پر تحقیق مسائل کے مواقع نہیں ملتے، اسی کو اپنا لیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے، ہر قوم اور ملت کے مستقبل کی عمارت اس کی تاریخی روایات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، قوم کی تعمیر کے لئے ان روایات کا صحیح علم انتہائی ضروری ہے، پاکستان کے لئے اس کی اہمیت خاص طور پر زیادہ ہے، کیوں کہ ہماری آئیڈیالوجی کی بنیاد اسلامی تعلیمات و تصورات ہی پر قائم ہے۔

سیرت رسولؐ اور تاریخ اسلام کی غلط تصویر رائج ہو جانے کے خطرناک نتائج کو گذشتہ صدی میں سر سید احمد خاں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ سر ولیم میور کی کتاب "دی لائف آف محمدؐ" شائع ہونے پر ان کو خیال آیا کہ مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے اور جو غلط فہمیاں ان کی وجہ سے پھیل رہی ہیں ان کا سدِ باب کیا جائے۔ ان کے لندن میں قیام کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ سیرت کے بعض پہلوؤں پر تحقیق کریں اور سر ولیم میور کی مرتب کردہ بعض ان مسائل کا جائزہ لیں جن کو میور اور دوسرے مستشرقین نے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے، خطباتِ احمدیہ جن کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا، اسی کاوش کی عملی شکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں کی بعض تاویلات اور نظریات تسلیم نہیں کئے گئے، لیکن ہم ان کی اس کوشش کو غیر مقبول اور ناقابلِ اعتنا نہیں کہہ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے انہوں

نے چند اصول قائم کیے تھے اور ان پر عمل کرنا ان کی رائے میں اس قوم کی بقا کے لئے ضروری تھا، ان ہی کے پیش نظر وہ اسلامی عقائد اور تصورات کی تاویل کرتے تھے۔ مسلمانوں کے اُس طبقہ نے جو قدیم روایات کا سختی سے حامی تھا، ان کی اکثر تاویلوں کو یکسر رَدّ کر دیا، لیکن روشن خیال طبقہ نے اُن کی بہت سی تشریحات و تاویلات کو پسند کیا، بہرحال اس کارِ خیر میں اوّلیت کا فخر سید احمد خاں ہی کو حاصل ہے، اس کے بعد جسٹس سید امیر علی کی کتاب قابلِ ذکر ہے، جو آج بھی اپنے نئے ایڈیشن اور نئے عنوان 'دی اسپرٹ آف اسلام' کے ساتھ مقبول ہے۔ سید امیر علی جدید تصنیفات کا براہِ راست مطالعہ کر سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دلائل اور بیانات میں زیادہ وسعت ہے، مگر سید امیر علی نے بھی سید احمد خاں کی طرح اپنے استدلال اور طرزِ تحریر میں مدافعانہ بلکہ بعض مواقع پر معذرت آمیز انداز اختیار کیا ہے۔ جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد برصغیر میں جو ماحول پیدا ہو گیا تھا اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں مغربی اقوام کو جو سیاسی و تمدنی بالادستی حاصل تھی اس کے پیشِ نظر ہم کو اس مدافعانہ روش پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بہرحال زمانہ کے ساتھ حالات اور ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی، سید احمد خاں کی قائم کردہ روایت نے علی گڑھ میں پرورش پائی، مگر اب اس کا لباس بدل چکا تھا، مولانا شبلی کی کوششوں میں ہم کو اس تبدیلی کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ علی گڑھ میں چند سال ہی رہے لیکن اس مختصر قیام نے ہی ان کے خیالات میں وسعت پیدا کر دی، اور اسلامی علوم کے سلسلہ میں ان مسائل سے ان کو واقفیت ہو گئی، جن پر جدید انداز سے تحقیق اور ان کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری تھا الفاروق، المامون اور نگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ میں ہم کو مولانا کی یہ کوشش صاف طور پر نظر آتی ہے لیکن مولانا کا سب سے اہم کارنامہ ان کی آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ ہے، جس کی تکمیل ان کے شاگردِ رشید اور اس دور کے بلند پایہ مورخ سید سلیمان ندوی نے کی۔

مغربی ممالک میں اب سیرت اور تاریخ اسلام کا مطالعہ وسیع پیمانہ پر کیا جا رہا ہے، دورِ جدید کے مستشرقین بعض قدیم نظریات کو نئے لباس میں اور کچھ نئے تصورات و نظریات پیش کر رہے ہیں، جوں جوں تحقیق کے امکانات اور دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے، نئے نئے مسائل اور خیالات ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ بعض دستاویزیں جو اُب تک ناپید خیال کی جاتی تھیں وہ اب دستیاب ہو گئی ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط جو مقوقس، حاکمِ اسکندریہ کے نام بھیجا گیا تھا حال ہی میں مل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس خط کی جو عبارت حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے وہ اصل خط کے متن سے ملتی ہے، مُہر میں بھی نام کے وہی الفاظ اور ترتیب وغیرہ ہیں جو حدیثوں میں بیان کی گئی ہے[1]۔ اسی طرح صحیفہ ہمام بن منبّہ جو انھوں نے صحیفۂ ابو ہریرہؓ سے اخذ کیا تھا اور جس کا ذکر علمائے حدیث نے کیا ہے، اس کا ایک حصّہ دستیاب ہو گیا ہے، ان کے بھائی وہب بن منبہ کے صحیفہ[2] کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان انکشافات اور قدیم دستاویزوں کے ملنے سے ایک طرف تو حدیث کی صحت و حجیت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف سیرت اور متعلقہ موضوعات پر جدید تحقیق کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

---

[1] بحوالہ خطبات مدراس از سید سلیمان ندوی۔ ص ۵۰

[2] اس کا ذکر تہذیب التہذیب (جلد اول ۲۔ ۳۰۶) میں موجود ہے۔

سیرت نگاری کی ذمہ داریاں

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

وہ پہلا مکتب اور مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنفِ کتاب کا داخلہ ہُوا، وہ سیرتِ نبوی کا مدرسہ ہے۔ اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہُوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل نہیں کیے جاتے۔ یہ اس کے گھرانے اور خاندانی ماحول اور فضا کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھی۔ سیرت کو اس ثقافت اور کلچر کے ایک اہم اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی جس سے بہرہ مند اور آراستہ ہونا گھر کے بچوں اور لڑکوں کے لیے اس عہد میں ضروری خیال کیا جاتا تھا اس میں اس بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بھی بڑا دخل ہے جو نظم و نثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی اور برابر گردش میں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس میں سب سے بڑا حصہ اس کے برادرِ اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحبؒ کی حکیمانہ تربیت اور رہنمائی کا ہے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نو عمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور عہدِ آخر میں اس پر سب سے بڑا کام ہُوا ہے[1]

جب عربی زبان و ادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت کے عربی ماٰخذ پر مرکوز کر دی ان میں سرِفہرست دو کتابیں تھیں، ایک ابنِ ہشام کی کتاب "السیرة النبویة" دوسرے امام ابن القیم کی کتاب "زاد المعاد" اس نے کتابوں کو صرف علمی یا روایتی طریقہ سے پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انہیں کتابوں میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کیے۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کا دل ایمان و یقین کی حلاوت سے آشنا ہُوا اور جذبۂ شوق و محبت کو نئی غذا ملی اور اس کی از سرِ نو آبیاری ہُوئی اس لیے کہ سیرت کے مؤثر واقعات تربیت و رہنمائی کا سب سے طاقتور ذریعہ اور انسان کے قلب و دماغ کے لیے (قرآن مجید کے بعد) سب سے زیادہ اثر انگیز اور حیات آفریں سرچشمہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے بعد عربی اور انگریزی میں سیرت کی جو قدیم و جدید کتابیں اس کی دسترس میں تھیں وہ بھی برابر مطالعہ میں آتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت اس کی کتابوں اور تحریروں کی ہمیشہ سب سے بڑی بنیاد رہی، اس کے دم قدم سے اس کا سارا سوز و ساز اور آب و رنگ تھا اور اسی کے نقشِ قدم کے طفیل اس کے نقوشِ قلم میں تازگی تھی، اپنے مقاصد و مطالب کی وضاحت کے لیے اس کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے بلیغ مثالیں سیرت کے جمال و کمال ہی سے ملتی تھیں اور سیرت ہی سے اس کی طبع میں روانی اور جولانی پیدا ہوتی تھی اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، اس کی کوئی قابلِ ذکر تحریر ایسی نہیں جس پر اس جمالِ محمدی کا کوئی پرتو اور سیرتِ نبویؐ کے گہرے مطالعہ اور تدبر کا کوئی عکس نہ ہو۔

---

[1] اسکی دلچسپ کہانی مصنف نے اپنی کتاب "الطریق الی المدینة" میں الکتاب الذی لا انسی فضلہ کے عنوان سے لکھی ہے اور اس میں خاص طور پر قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مقبول کتاب رحمة للعالمین کے مطالعہ کے گہرے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

سیرت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں اور بعثتِ محمدی کی عظمت اور اس کے محیّر العقول اثرات و نتائج پر اس کے یہ مقالات و خطبات "کاروانِ مدینہ"[1] میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

مصنف نے اس طویل عرصہ میں بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن خاص سیرت کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب اس کے قلم سے نہ نکل سکی حالانکہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں قدیم و جدید دونوں قسم کے مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو، دوسری طرف سیرت کے اولین اور اصل ORIGINAL مآخذ پر اس کی بنیاد ہو اور قرآن و حدیث سے اس میں سرِ مو انحراف نہ کیا گیا ہو، وہ موسوعی ENCYCLOPEDIE طرز پر نہ لکھی گئی ہو جس میں سارے معلومات بغیر کسی بحث و تمحیص کے بھر دیے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہ وہ طرزِ تصنیف اور اسلوبِ تحریر ہے جس کے دورِ آخر کے اکثر مصنفین اور بعض متقدمین بھی عادی رہے ہیں۔ یہ طرز بہت سے ایسے غیر ضروری اشکالات و سوالات پیدا کرتا ہے جن سے سیرت نبوی بالکل بری و بے داغ ہے اور جس میں بادیہ پیمائی اور آشفتہ سری کی مسلمانوں کو کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ تحقیق و تنقیح کا قلم (تجدد پسندانہ رجحانات اور مستشرقین کی تشکیک کا کوئی اثر قبول کیے بغیر) اپنا کام کر چکا ہے اس کے ساتھ وہ ان دینی مسلمات و حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جن کی روشنی و رہبری کے بغیر، آسمانی کتابوں، انبیاء کی سیرت، معجزات و غیبی واقعات و حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے اور جو اس اصول پر کاربند اور اس عقیدہ کا حامل ہو کہ یہ ایک نبیؐ کی سیرت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں مبعوث کیا گیا ہے اور جس کو ہر دم و ہر لحظہ خدا کی نصرت و تائید حاصل تھی نہ کہ کسی بڑے قومی لیڈر اور ملّی رہنما کے حالاتِ زندگی — یہ وہ سیرت جو ہر منصف مزاج، تعلیم یافتہ شخص (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے سامنے کسی تحفظ RESERVATION استثناء اور کسی تاویل کا سہارا لیے بغیر پیش کی جا سکے، چنانچہ مصنف نے اس کتاب میں خود ان واقعات و حالات اور سیرت کے اصل و بنیادی مواد پر زیادہ اعتماد کیا ہے اور اس کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والے کے دماغ و دل اور ذہن و نظر میں اپنا راستہ خود بنائے، ان منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفہ کا رنگ دینے، واقعات کی تاویل کرنے اور اس کے لیے طویل و عریض مضمون باندھنے کی اس میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت اپنے حسن و جمال، اپنی موزونیت و لطافت اور اپنی اثر انگیزی و دل آویزی کے لیے، کسی بڑے آدمی کی سفارش، کسی حکیم کے علم و دانش اور کسی ادیب اور صاحبِ قلم کے اندازِ نگارش یا رنگینیِ بیان کی محتاج نہیں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک مصنف کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے حسنِ بیان، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب۔

پھر اس میں عقل و جذبات دونوں کی بیک وقت اور شانہ بشانہ جلوہ گری اور کارفرمائی ہونی چاہیے ایسا نہ ہو کہ عالمانہ بحث اور معروضی نقد و جائزہ جذبۂ محبت اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد اور افسردہ کر دے جو سیرت کے جمالِ جہاں آراء

[1] کتاب کے تین عربی ایڈیشن مدینہ منورہ، لکھنؤ، اور دمشق سے اور اردو میں دو ایڈیشن لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکے ہیں، عربی میں اس کا نام "الطریق الی المدینۃ" ہے۔

سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدہ و دل کو اس سے روشن اور منور کرنے کی ایک ناگزیر ضرورت اور اس سے صحیح و کامل استفادہ اور اس کے مسائل، احکام اور واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی لازمی شرط ہے، اگر سیرت کی کوئی کتاب اس جذباتی اور ایمانی عنصر سے خالی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چوبِ خشک کا مصنوعی ڈھانچہ ہے جس میں زندگی کی کوئی حرارت اور نمی موجود نہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جذباتی و ایمانی عنصر عقلِ سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آجائے جن کی اہمیت عصرِ حاضر نے خاص طور پر بڑھا دی ہے، نہ وہ منطق کے صحیح، معقول اور قابلِ فہم اصولوں کے منافی ہو نہ عقیدہ اور تقلید پر مبنی ایسا خراج عقیدت اور ایسا خراجِ تحسین ہو جن کو صرف قوی الایمان پشتینی مسلمان اور وہ علماء راسخین قبول و تسلیم کر سکیں جن کی بیرونی دنیا اور جدید ثقافت سے کوئی راہ و رسم نہیں، یہ عقیدت و محبت بلاشبہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمت خداداد ہے لیکن یہ بات ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ بہرحال اس نبی کی سیرت ہے جس کو رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا کے تمام انسانوں اور نوعِ انسانی کے تمام طبقوں کی طرف بھیجا گیا ہے اس لیے اس طبقہ کے افراد کے لیے ممنوع یا مہر بند نہیں کیا جا سکتا جن کو حالات نے اس اسلامی و ایمانی ماحول میں نشو و نما حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا اور تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ غیر اسلامی ماحول ہی میں پیدا ہوں، وہیں ان کی نشو و نما ہو پھر لطفِ الٰہی ان کی مساعدت کرے اور سیرتِ محمدیؐ کا کوئی معطر و جاں نواز جھونکا اپنی دل آرائی و مسیحائی کے ذریعہ ان کو اس جگہ سے اٹھا کر اسلام کے سایۂ رحمت اور ایمان کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غیر مسلموں کا حق سیرت پر ان مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایۂ رحمت میں ہیں، اس لیے کہ دوا و علاج کی تندرست سے زیادہ ایک بیمار کو ضرورت ہے۔ دریا کے اس پار رہنے والے کو پُل کی جتنی حاجت ہوگی اتنی حاجت پُل کے اسی طرف رہنے والوں کو کیوں کر ہو سکتی ہے؟

مصنف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا جس میں نبوتِ محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لیے اس عہد کی عالم گیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی مسیحی میں ہمیں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں فساد، اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی و اضطراب کس درجہ پر پہنچ چکا تھا اس کی اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب و فساد کے کیا کیا اسباب و عوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے اور کیسی کیسی ظالمانہ حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ و خیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں اپنا کام کر رہی تھیں، جب مصنف نے اپنی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"[1] کی تمہید اور مقدمہ کے طور پر عہد جاہلیت کی ذرا تفصیل کے ساتھ تصویر کھینچنے کی کوشش کی تو اس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو اسے آج تک یاد ہے، اس کو اس کیلئے ان تمام مغربی مآخذ کا جائزہ لینا پڑا جن میں ظہورِ اسلام کے وقت کے متمدن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، اس نے ان تمام ضخیم کتابوں سے ان منتشر حالات کو اس طرح جمع کیا جیسے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کیے جائیں[2]

---

[1] جس کے اردو ترجمہ کا نام "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔

[2] ملاحظہ فرمائیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"، باب "بعثت سے پہلے"، شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ۔ و مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی۔

یہ تمہید جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے روشنی کا کام کرتی ہے اور اس کے سامنے بعثت محمدیؐ کی عظمت و وسعت اور منصب نبوت کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے، عہد حاضر کے سیرت نگار کے لیے بہت ضروری ہے اور اس کا کام اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جائے گا جب تک اس بحث و تحقیق کا یہ انداز اختیار نہ کیا گیا ہو اور آغاز اسلام کے وقت عہد جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد و اضطراب، اخلاقی پستی اور خود فراموشی و خود کشی کی زندہ و متحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بے کم و کاست پیش نہ کی گئی ہو۔ یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوت حق کے قافلہ نے پہلا قدم آگے بڑھایا، جہاں آپؐ کی عمر مبارک کے ۵۲ سال گزرے، اور جہاں تیرہ سال دعوت اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی جو سطح تھی اس سے باخبر ہو نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات، اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی و عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف ہو تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج و افتاد طبع، ان کے ذہن و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

یہی بات بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی یثرب کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے جہاں اسلام مکہ سے منتقل ہوا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ہجرت فرمائی اور تقدیر الٰہی نے اس کو اسلام کا اولین مرکز قرار دیا، اس لیے کہ اس کے پس منظر کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات کو جانے بغیر ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اسلام نے ان افراد کی کیا اور کس طرح تربیت کی، ان کو کیسے حیات نو بخشی، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد و متحارب عناصر کو کس طرح شیر و شکر کیا، اس سلسلہ میں نبوت محمدیؐ کا کارنامہ کیا تھا؟ اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوئے انسانوں کو ملانے اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا۔ یہ بات صرف اسی وقت سمجھی جا سکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب و غریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کرنا پڑا، بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث و سیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گزرتے ہیں۔ اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جا سکتے۔ جب تک مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت، اس کے جغرافیہ، اس کے گرد و نواح، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات و روابط، معاہدوں اور عہد ناموں اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور قومی و ملکی دستور اور رسم و رواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے بالکل ناواقف ہو کر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک سرنگ میں چلنے والے کی سی ہوگی جس کو اپنے دائیں بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو۔

یہی اصول اس وقت کی معاصر و متمدن حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس لیے کہ ناظرین کے سامنے دعوت اسلامی کے اس اقدام کی اہمیت اور اس کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کی کوئی صاف و واضح تصویر اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک اس کو ان حکومتوں کے حجم اور قوت و شوکت کا اندازہ نہ ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام دی

اوران کے نام فرامین جاری کیے اور ان کی تہذیب و ثقافت، عسکری قوت، فارغ البالی اور مرفہ الحالی نیز ان کے سلاطین کی مطلق العنانی، رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کا صحیح علم نہ ہو جدید معلومات نے ان حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان کے معاشرہ پر خاصی روشنی ڈال دی ہے اور بہت سے ان حالات اور حقائق کا پردہ فاش کر دیا ہے، جو عہدِ قدیم میں لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے، یا زیادہ صاف اور واضح نہ ہو سکے تھے۔ اس زمانہ کے سیرت نگار کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ان تمام معلومات سے پوری مدد لے اور تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ (COMPARETIVE STUDIES) کے میدان میں جو جدید ترین (UPTO DATE) مباحث و معلومات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائے۔

مصنف کو ان تمام باتوں کا احساس تھا اور سیرت نگاروں کی ناقابلِ فراموش خدمات اور مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اُن کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی قیمت و افادیت کا پورا اعتراف بھی اس نے اپنی سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرتِ نبوی پر ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب و جلیل القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست میں شامل ہو جائے۔

لیکن تنگیٔ وقت اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے مصنف کو تفصیل و اطمینان کے ساتھ اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لیے کہ اس کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کی سیرت (نبی اور سید الاولین و الآخرین و اشرف المرسلین کا معاملہ تو اس سے کہیں برتر و بالا ہے) مصنفین کے لیے سب سے مشکل اور نازک موضوع ہے۔ مصنف کو مشہور و اہم شخصیات کے سوانح حیات اور متقدمین و متاخرین کے حالات زندگی اور کارنامے لکھنے اور بیان کرنے کا شاید اپنے بہت سے معاصرین اور رفقاء سے زیادہ اتفاق ہوا ہے۔ اس نے آغازِ جوانی بلکہ لڑکپن ہی سے جب سے قلم پکڑنا سیکھا، اہلِ حق، مصلحینِ اُمت اور اصحابِ دعوت و عزیمت کے حالات و تراجم پر لکھنا شروع کر دیا۔ اور اپنے قلم سے سیر و تراجم کے موضوع پر کئی ہزار صفحے سیاہ اور اپنے نصیب کو روشن کیا اور بچپن ہی سے ان اسلافِ کرام اور ائمہ رشد و ہدایت کے ساتھ زندگی گزاری اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا اور بہت کچھ لکھنے کی توفیق ہوئی۔ ان سب وجوہ کی بناء پر اس کو اس موضوع کی نزاکت اور اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مصنف پر کوئی خاص رجحان یا ذوق ایسا غالب آتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنے اس ذوق و رجحان کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ تصنیف اور تحریر صرف اس رجحان اور ذوق کی نمائندگی کرتی ہے جو اس وقت مصنف پر حاوی تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تصویر کشی کے ارادہ سے قلم اُٹھاتا ہے لیکن بجائے اس کے خود اپنی تصویر اُتار دیتا ہے وہ اس کے حالات و سوانح پر معروضی اور بے لاگ طریقہ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کو اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنی نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنے اور ان حالات و واقعات کو اپنے مخصوص پیمانوں سے ناپنے لگتا ہے۔

جس کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچہ سے کبھی گزر ہوا ہے، معاصر شخصیتوں کے مطالعہ و مشاہدہ کا اسے کبھی موقع ملا ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت و صحبت میں گزارا ہے وہ بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہہ تک پہنچنا اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی، علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے

دشوار، نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے اور اس کا تھوڑا بہت حق وہی ادا کر سکتا ہے جو نفس انسانی کے احساسات و جذبات، اس کے سوز و ساز، سرور و شوق اس کی روح کی تپش اور دل گداز سے بہت کچھ واقف ہو اور یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کی راتیں کیسی کٹتی ہیں اور اس کے دن کس طرح گزرتے ہیں، وہ اپنے گھر میں کیا نظر آتا ہے اور اپنے رفقاء و دوستوں سے کس طرح پیش آتا ہے۔ اس نے اس کو صلح و جنگ میں بھی دیکھا ہو اور اشتغال اور سکون، تنگی و راحت اور ضعف و قوت میں بھی، اس لیے کہ انسان کے اندر بہت سے ایسے جذبات و احساسات اور اس کے جمال و کمال کے بہت سے ایسے نادیدہ و ناشنیدہ پہلو بھی ہیں جن کے لیے انسانی لغت میں ابھی تک الفاظ وضع نہیں کیے جا سکے اور جن کی منظر کشی و ترجمانی کے لیے لغت کا بڑے سے بڑا ذخیرہ کفایت نہیں کرتا ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

سیرت نبویؐ دوسرے افراد بنی آدم میں (بشمول انبیاء دغیر انبیاء) اپنی نزاکت و لطافت، وسعت و جامعیت، زندگی کی نازک سے نازک تفصیلات اور دقیق سے دقیق معانی و مطالب اور دل کی دھڑکنوں اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ و استیعاب اور اس کی مکمل تشریح و ترجمانی میں سب سے ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے۔ ایسا دراصل حدیث کی وجہ سے ممکن ہو سکا جس کی کوئی نظیر دوسرے انبیاؑ یا تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں کہیں نہیں ملتی، سیرت و شمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں، دن رات کے مختلف حصوں میں آپؐ کے اوراد و اذکار اور خدا کے حضور آپ کی آہ سحر گاہی اور گریۂ نیم شبی اور اس امت اور پوری انسانیت کے لیے آپ کی بے قراری و دل سوزی کے جو عجیب نمونے آپ کے ادعیۂ مسنونہ کے وسیع ذخیرہ[1] میں ہمیں نظر آتے ہیں، اس کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، اسی طرح آپ کے اقوال ماثورہ اور جوامع الکلم اور آپ کے باکمال وصف نگاروں اور اہل بیت کرام نے آپ کے جو شمائل و خصائل، عادات و معمولات اور روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں، ادبیات عالم اور تاریخ و انساب کے وسیع لٹریچر نے اس سے زیادہ نازک تصویر کشی اور منظر نگاری اور انسانی خد و خال اور اس کی اخلاقی بلندیوں اور لطافتوں کی اس سے عمیق اور عظیم ترجمانی اب تک ریکارڈ نہیں کی[2] اس لحاظ سے سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری اور ابہام، معروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی بالکل ضرورت نہیں جو مصلحین و قائدین کے تذکرہ میں بہت پیش آتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان سب سے زیادہ مکمل بھی ہے اور حسین بھی، اس بنیاد قرآن مجید کے وہ صریح نصوص و تاریخ کی ناقابل قدر تردید شہادتیں آپ کا جمال صوری و معنوی، شمائل و خصائل، عادات و عبادات اور اخلاق و معاملات

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے مصنف کا مقالہ "سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں" ملاحظہ فرمائیں جس میں سیرت سے ان دعاؤں کا تعلق، انسانی زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات و اخلاقیات سے آپ کی گہری واقفیت اور اس کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک پہلوؤں کی کامل رعایت کا اندازہ ہوتا ہے یہ مقالہ ایک مستقل رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مصنف کی کتاب منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین "مضمون" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و حیات قیامت تک کے انسانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ اور اسوہ اور اس کے لیے غیبی انتظامات" ساتواں خطبہ صہ ۲۰۵ - ۲۱۳۔

کی وہ واضح، روشن اور متعین تفصیلات وجزئیات ہیں جن سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ وہ حقیقت اور امرِ واقعہ سے بھی اتنی قریب ہیں جس سے زیادہ تصور ناممکن ہے اور باوجود حیاتِ طیبہ پر اتنا طویل زمانہ گزرنے کے اس سے آگے بڑھنے کی خواہش اور طمع بھی کسی انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔

لیکن ان تمام باتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور مُصلحینِ عالم کے سوانح وحالاتِ زندگی بلکہ خود دوسرے انبیاءِ کرام کی سیرت میں اس قدر فرق وتفاوت اور سیرتِ محمدیؐ کی اس گیرائی اور ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود جو کمالِ نبوت اور کمالِ آدمیت کی سدرۃ المنتہیٰ اور معراج ہے، ہم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ کی زندگی اور مکارمِ اخلاق کی صحیح تصویر اور آپ کے ان معجزات کا استیعاب وتفصیل جن کی جلوہ ریزی آپ کی پوری سیرت ودعوت اور انفرادی واجتماعی زندگی میں نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ، آپ کا حسنِ صورت وسیرت وکمالِ ظاہر وباطن، آپ کی محبت وشفقت اور دلداری ودلنوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرضِ حال، بنی نوعِ انسان اور انسانیت کے مستقبل کے لیے آپ کی بے قراری ودل سوزی، آپ کی فصاحت وبلاغت، علم وحکمت اور کمال وجامعیت کی ان روشن وجاں نواز نشانیوں اور زندہ ولافانی معجزوں کا مفصل ومکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے۔ سیر وشمائل کی کتابوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ (ان کے کمال دیدہ وری وعرق ریزی کے اعتراف کے ساتھ) آپ کے جمالِ سیرت اور کمالِ نبوت کا صرف ایک ہلکا سا عکس ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان مصنفین کی سعی محمود ہے کہ انہوں نے اس قدر ضبط واتقان اور غایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان حالات کو قلمبند کیا اور اس کی بہترین جزا اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا، یہ ایسی مشترک، عالم گیر اور غیر مختتم دولت ہے جس میں ہر فرد بشر، ہر انسانی نسل اور انسانوں کا ہر گروہ اور ہر طبقہ ہدایت وروشنی اور اتباع وپیروی میں اپنا حصہ رسدی پا سکتا اور اپنے طالعِ خفتہ کو بیدار کر سکتا ہے۔

تم کو پیغمبرِ خدا کی پیروی کرنی بہتر ہے یعنی اس شخص کو جس کو خدا سے ملنے اور روزِ قیامت کے آنے کی اُمید ہو اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔	لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیراً ط (سورۃ الاحزاب الآیۃ ۲۱)

شاید یہی اسباب ووجوہ تھے جن کی وجہ سے سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر کسی نئی تالیف کی مجھے اب تک ہمت نہ ہو سکی اور میں اس عظیم الشان کام کو اپنی حیثیت سے بہت بلند سمجھتا رہا۔ میرے بعض فاضل اور محترم دوستوں[۱] نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی کہ میں عربی زبان میں سیرتِ نبوی پر ایک ایسی کتاب تیار کر دوں جس میں نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور اس کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو، نیز ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں اور اس طرزِ تحقیق اور طرزِ کلام کی اس میں پوری رعایت ہو، جو موجودہ دور میں رائج ہے اس لیے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص اسلوبِ بیان اور زبان ہوتی ہے جس کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ دواؤں اور غذاؤں کی بھی خاص خوراکیں اور ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جو حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے

---

[۱] بالخصوص مصنف کے فاضل ومحترم دوست شیخ محمود الصواف رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ ومشیر وزارت تعلیم حکومت سعودیہ۔

لیکن یہ سب کچھ (جیسا کہ اُوپر اشارے کیے جا چکے ہیں) سیرت کو اپنی خواہشات و اغراض اور ان علمی نظریات کا تابع بنائے بغیر ہونا چاہیے جو صبح و شام بدلتے رہتے ہیں اور اس کو ان شبہات و اعتراضات کی ہر آمیزش اور آلودگی سے پاک و صاف ہونا چاہیے جو اکثر مذہبی تعصب، کم علمی و ناواقفیت یا سیاسی مفادات و اغراض سے پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس معاملہ میں شرحِ صدر نصیب فرمایا اور میں پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ میرے سارے لمحات اور سانسیں اسی ماحول میں گزرنے لگیں، مَیں نے اس سلسلہ میں نہ صرف سیرت و حدیث کی کتابیں پڑھنا شروع کیں بلکہ قدیم اور جدید لٹریچر میں جو بھی کام کی چیز مجھے ملی، مَیں نے اس سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی، اس کے بعد مَیں نے اس موضوع پر جو سب سے زیادہ مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس مبارک کام کا آغاز کیا۔ اس میں سرِ فہرست یہ کتابیں تھیں کتبِ صحاح، سیرت ابنِ ہشام، امام ابن القیم کی زاد المعاد اور سیرت ابن کثیر (جو اصلاً ان کی بڑی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں شامل تھی۔ پھر اس نے چار جلدوں میں ایک مستقل تصنیف کی شکل اختیار کر لی)[1] عہدِ حاضر میں اس موضوع پر جو کچھ کام ہوا ہے اور مغربی زبانوں کے اہم ماخذ سے بھی (جن سے سیرت کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے اور اس عہد پر اور ان حکومتوں اور سلطنتوں نیز اس زمانہ کے معاشرہ اور سوسائٹی پر روشنی پڑتی ہے) سے بھی استفادہ کی کوشش[2] کی گئی اور اس کی کوشش کی کہ کتاب علمی اور تربیتی و دعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو اور ان میں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آ جائے، نیز اس میں وہ زندہ مُنہ سے بولتے ہوئے اور زندگی و حرارت سے بھرے ہوئے اقتباسات زیادہ سے زیادہ پیش کیے جائیں جن سے اسوۂ نبوی کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور جن کی نظیر کسی انسان کی سیرت، کسی عظیم سے عظیم شخصیت کے سوانح کسی نسل اور قوم کی تاریخ اور کسی دعوت و تحریک اور دین و مذہب کے نقشہ میں نہیں ملتی، یہ سب کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھ دیا جائے کہ جمالِ فطرت اور حسنِ حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روئے دل آرام را حاجت مشاطہ نیست

---

[1] طبع عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاہ ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) بتحقیق استاد مصطفیٰ العبد الواحد

[2] عربی و دیگر زبانوں کے ماخذ کا انڈکس کتاب کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

قرآن اور عملی قرآن یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ جس نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا وہ قرآن کو دیکھے لیکن جنھوں نے پورا قرآن نہیں دیکھا تھا اُن کے لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کافی تھے[1]۔ اُن کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک واقعہ، قرآن کی ترجمانی کرتا ہے اور اُس کے احکام کی صحیح عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ جس نے اُن کو دیکھ کر قرآن پڑھا اُسی نے ہدایت پائی اور جس نے اُن کو دیکھے بغیر اُس کا مطالعہ کیا وہ ہدایت سے محروم رہا۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد وغیرہ جیسے اہم قرآنی احکام پر عمل کس طرح کیا جائے اور معروف و منکر کو کس طرح پہچانا جائے؟ اس کا جواب صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے مل سکتا ہے۔ گویا قرآن کی ہر آیت اور ہر واقعہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی تصدیق ہے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اُنہی سے اس کا تعلق ہے۔ مولانا جامیؒ نے صحیح فرمایا تھا کہ:۔ ع

ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ

اس حقیر سی کوشش میں اسی قول کی تشریح اور توضیح ہے۔ سعد اللہ مسیحا پانی پتیؒ نے کس جذبے سے کہا ہوگا:۔ ؎

ز عشقِ مصطفیٰؐ دل ریش دارم　　رقابت با خدائے خویش دارم

لیکن یہ غلام صرف اللہ پاک اور اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کا محتاج ہے۔ اور محمد بن سلیمان الجزولیؒ کے الفاظ میں یہی عرض کرتا ہے:۔

يَارَحْمَةَ اللهِ إِنِّي خَائِفٌ وَّجِلٌ　　يَانِعْمَةَ اللهِ إِنِّي مُفْلِسٌ عَانٍ

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت، رأفت اور شفقت سے محرومی کیسی؟ وہ سب کے لئے ہیں اور اُن کی امتیازی خصوصیات ایسی ہیں کہ جن پر ساری کائنات قربان ہے۔ دیکھیے کچھ خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ آپ ہی اشرف الانبیاء اور آپ ہی افضل البشر ہیں۔ (خیر البریّہ)۔

---

[1] سورۂ توبہ کی آیت ... میں ہے کہ شروع شروع کے مہاجرین اور انصار، نیز وہ جنھوں نے اُن کی پیروی کی وہ سب جنّتی ہیں۔ یہ شروع شروع کے لوگ وہ تھے جبکہ قرآن پاک پورا نازل نہیں ہوا تھا اور اُن کو صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی تھی۔

۲-آپ ہی خاتم النبیین ہیں۔
۳-آپ ہی تمام انسانوں کے لئے (کافۃ للناس) رسول ہیں۔
۴-آپ ہی رحمۃ للعالمین ہیں۔
۵-آپ ہی نے دین کو مکمل کیا (الیوم اکملت لکم دینکم)
۶-آپ ہی کے قرآن کو بے مثل قرار دیا گیا اور رہتی دنیا تک اس کی جیسی سورۃ بنا لانے کا چیلنج دیا گیا۔
۷-آپ ہی کے قرآن کو چھونے والے مُطہّر کہے گئے ہیں (لا یمسہ الا المطھرون) جو لوگ مطہر کیے گئے ہیں وہی اسے چھو سکتے ہیں (حفظ کر سکتے ہیں) اور جو مُطہّر نہیں کیے گئے وہ حفظ نہیں کر سکتے۔
۸-آپ ہی کے قرآن کو ہر طرح محفوظ رکھا گیا۔ جب کہ کوئی چھوٹی سی کتاب بھی حفظ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو قائم نہیں رہتی
۹-ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام تشریف لائے لیکن صرف آپ کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھا گیا اور سب کے صحیفے منسوخ، سب کے اقوال و تعلیمات مفقود اور سب کے حالات بلکہ نام بھی (سوائے انتیس ناموں کے جو قرآن پاک میں آئے ہیں) ہمیشہ کے لیے محو لیکن اس کے برعکس آپ کا قرآن محفوظ، آپ کے اقوال محفوظ، آپ کے حالات کی تمام جزئیات محفوظ اور حالات بھی ایسے بے داغ کہ " جو بات خلوت میں دیکھو وہ جلوت میں بیان کرو اور جو بات چند لوگوں میں دیکھو وہ سارے عالم میں پہنچا دو"۔ پوری کائنات میں کوئی اور بھی ہے جو اس طرح فرما سکے ؟
۱۰-صرف آپ کے قول کو وحی کہا گیا (وما ینطق عن الھویٰ ہ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ)[1]
۱۱-صرف آپ کو معراج پر بلایا گیا اور اتنا قریب کہ فکان قاب قوسین او ادنیٰ
۱۲-صرف آپ کو اللہ پاک نے اپنے ناموں میں سے کئی نام دیئے۔ رؤف۔ رحیم۔ نور۔ متین۔ برّ۔ عزیز وغیرہ۔
۱۳-صرف آپ کے ذکر کو (سب سے زیادہ) بلند کیا گیا۔ اللہ کے ساتھ آپ کا نام بھی وضو، اذان، خطبہ، نماز، درود اور سلام وغیرہ میں لیا جاتا ہے اور جتنا آپ کو یاد کیا جاتا ہے پوری دنیا میں کسی کو بھی نہیں۔ بعض حضرات تو ہزاروں مرتبہ ہر روز درود پڑھتے ہیں۔
۱۴-صرف آپ کی محبت سب سے زیادہ ہے۔ گناہ گار، سیاہ کار، بدکار اُمتی بھی آپ کے نام پر مرنے مٹنے کو تیار رہے اور آپ کی شان میں کسی گستاخی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔
۱۵-صرف آپ کو کوثر عطا کیا گیا۔ عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ تو گویا آخرت میں بخشش کرانے کا پورا اختیار آپ کو دیا گیا۔

---

[1] آپ کو خواب میں بھی وحی ہوتی تھی۔ قصیدہ بردہ میں ہے :-

لَا تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُؤْيَاهُ إِنَّ لَهُ ‏ قَلْبًا إِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

۱۶۔ صرف آپ کو ہمیشہ پیار کے ناموں سے قرآن پاک میں یاد کیا گیا۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یا آدم، یا نوح، یا ابراہیم، یا موسیٰ، یا عیسیٰ کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن آپ کو یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا بلکہ اسے کملی والے، اسے لحاف والے، اسے طاہر وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا۔

۱۷۔ اللہ نے اپنا محبوب بنانے کے لیے آپ کی غلامی کو شرطِ اول قرار دیا (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ)۔

۱۸۔ صرف آپ کا "اسوۂ حسنہ" عالم کے لیے ہے۔ پہلے آپ کو عمل سکھایا گیا، پھر آپ کے عمل پر عمل کرنے کا نام "عملِ صالح" قرار دیا گیا۔

۱۹۔ صرف آپ کے غلاموں کے لیے یہ فضیلت ہے کہ "ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔

۲۰۔ جتنی بُرائی ہوگی اتنی ہی سزا دی جائے تو یہ عدل ہے اور ایک نیکی اگر دس نیکیوں کے برابر بھی جائے تو یہ رحمت ہے۔ (سورۃ الانعام۔ ۱۶۱)۔ یہ بات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اُن کی اُمت کے لیے مخصوص ہے۔

۲۱۔ صرف آپ کے غلاموں کے لیے یہ نعمت مخصوص ہے کہ شب قدر ایک ہزار مہینوں (کی عبادت) سے افضل ہے۔

۲۲۔ صرف آپ کو "النبی الاُمّی" کہا گیا۔ لفظ "اُمّی" کے معنی میں علماً کا اختلاف ہے۔ اُمّ القریٰ (مکہ معظمہ) یا اُمت کثیرہ یا اُمّ (ماں کے پیٹ سے پاک صاف پیدا شدہ) سے تعلق بتاتے ہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ وہ ہستی جس کو صرف اللہ پاک نے تعلیم دے کر ایسا معلّم بنایا ہو جس سے انسان کو ہر اُس چیز کا علم حاصل ہُوا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون۔ البقرہ)

۲۳۔ صرف آپ نے تمام سابقہ کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا لیکن کیا سابقہ اُمتوں والے بھی (باوجود اُن کے پیغمبروں کی پیش گوئیوں کے) ایسے ہیں جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے قرآن پر ایمان رکھتے ہوں؟

پھر یہ بھی روایت ہے کہ صرف آپ کی وجہ سے کائنات خلق ہوئی (لولاک لما خلقت الافلاک)

یہ بھی روایت ہے کہ شیطان (خواب میں) صرف آپ کا متمثل نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی روایت آتی ہے کہ صرف آپ کا سایہ نہ تھا۔

یہ بھی روایت (بخاری) ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پاک سُنا رہے تھے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے:۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (اُس وقت کیسا ہوگا جب ہر ایک اُمت پر خدا ایک گواہ کھڑا کرے گا اور آپ کو ہم سب اُمتوں پر شہادت کے لیے کھڑا کریں گے)۔ فرمایا۔ بس ٹھہرو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ "حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مطیع کو بشارت پہنچاتے، عاصی کو ڈر سُناتے، بے خبروں کو پناہ دیتے۔ خدا کے بندے اور رسولؐ۔ جملہ کاروبار کو اللہ پر چھوڑ دینے والے، نہ درشت خو، نہ سخت گو۔ نہ چیخ کر بولتے۔ بدی کا بدلہ ویسا ہی نہ دیتے۔ معافی مانگنے والے کو معاف کر دیتے، گنہگار کو بخش دیتے، اُن کا کام مذہبوں کی کجی کو درست کر دینا ہے۔ اُن کی تعلیم اندھوں

کو آنکھیں، بہرے کو کان دیتی، غافل دلوں کے پردے اُٹھا دیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک خوبی سے آراستہ، جملہ اخلاقِ فاضلہ سے متصف۔ سکینہ اُن کا لباس۔ نکوئی اُن کا شعار۔ تقویٰ اُن کا ضمیر۔ حکمت اُن کا کلام۔ عدل اُن کی سیرت ہے۔ اُن کی شریعت سراپا راستی۔ اُن کی ملت اسلام۔ ہدایت انکی رہنما ہے۔ وہ ضلالت کو اُٹھا لینے والے گم ناموں کو رفعت بخشنے والے۔ مجہولوں کو نام ور کر دینے والے قلت کو کثرت اور تنگ دستی کو غنا سے بدل دینے والے ہیں"۔ ایسے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق پیاری باتیں اب قرآن پاک میں دیکھیے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الفاتحہ

سورۃ الفاتحہ، قرآن پاک کا مقدمہ ہے۔ اس میں اسم ذات (اللہ) کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:۔

۱۔ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (خواہ کوئی اُسے جانے اور مانے، خواہ نہیں)۔

۲۔ رحمٰن ہے۔ (قرآنِ پاک میں ۵۲ جگہ یہ لفظ[۵۱] بطورِ صفت نہیں، بلکہ بطورِ علَم استعمال ہُوا ہے)۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے کہ جب اُس سے مانگا جائے تو وہ عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ اُس سے نہ مانگا جائے تو وہ غضب میں آئے (فتح الباری ۸/۱۱۸)

۳۔ رحیم ہے۔

۴۔ یومِ دین کا مالک ہے۔

۵۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔

۶۔ وہی مدد فرماتا ہے۔

۷۔ وہی صراطِ مستقیم کے لیے ہدایت فرماتا ہے۔

۸۔ اُس میں غضب کی صفت بھی ہے اور

۹۔ وہ راہِ راست سے ہٹا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اللہ پاک کی اِن تمام صفات کی پیہم تبلیغ اور ہر رکعت میں ان صفات کی تسبیح، صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اور وہ بھی مکی زندگی ہی سے کرائی جا رہی ہے اور قیامت تک کرائی جائے گی، کیونکہ صرف وہی اس ابلاغ کے اہل ہیں۔ (سورۃ الحجر کی آیت ۸۷ میں بھی اس سورۃ الحمد کا ذکر آئے گا۔)

---

[۵۱] رحمٰن غالباً عبرانی لفظ ہے اور وہ اسلام سے پہلے عموماً عربوں میں مستعمل نہیں تھا۔ دیکھیں ارض القرآن از مولانا سلیمان ندویؒ جلد ۲۔ ص ۲۳۹۔

سورۃ البقرہ

سورۃ الفاتحہ میں بندے کو ہدایت حاصل کرنے کی دعا سکھلائی گئی تھی۔ الٓمّٓ سے والناس تک اسی دعا کا جواب ہے جو ہدایت ہی ہدایت ہے اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ شروع میں مومن، کافر اور منافق کی پہچان بتائی گئی ہے، پھر علم کی اہمیت اور اس سے حاصل کی ہوئی صلاحیت کو صحیح طریقے پر بروئے کار لانے کی تعلیم ہے اور مختلف انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے تاکہ عقائد اور اصلاح معاشرہ میں صحیح رہبری حاصل ہو سکے اور حقوق اللہ، نیز حقوق العباد میں کوتاہی نہ ہو۔

یہ سورۃ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے جنھیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔ پورے قرآن پاک میں جہاں جہاں حروف مقطعات آئے ہیں اُن کے بعد ہی قرآن پاک یا اس کی آیات کا ذکر آیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حروف میں خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی سے ہے۔ (گو کہ ان حروف کے اصل معنی پوشیدہ رکھے گئے ہیں)

پھر متقین کی تعریف آتی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اُن کو روزی دی گئی ہے اُس میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کرتے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے قبل کے انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحائف پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ نماز اور زکوٰۃ کے واسطے حکم ہے لیکن نماز جیسی سب سے اہم چیز کس طرح ادا کی جائے؟ اس سوال کا جواب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی سے مل سکتا ہے۔ گویا قرآنِ پاک کی عملی تفسیر صرف ذاتِ گرامی ہے جس کے بغیر قرآن پاک بھی مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

تیسرے رکوع میں منافقوں اور کافروں کو توحیدِ باری سمجھائی جا رہی ہے اور اسی رکوع میں رہتی دنیا تک کے لیے چیلنج ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ قرآن دیا گیا ہے کہ پوری کائنات میں اور ہر زمانے میں کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس قرآن کی کسی سورۃ کے مقابلے میں کوئی سورۃ بنا سکے۔ یہ امتیازی شان صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی گئی ہے۔ چوتھے رکوع میں انسان کو خلافتِ الٰہیہ کے منصب عطا ہونے کا واقعہ یاد دلایا ہے کہ یہ منصب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں بخشا گیا ہے۔ پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سبق دیا گیا ہے کہ زندگی کی جدّ و جہد میں ہر مشکل کا علاج عزم، استقلال اور رجوع الی اللہ ہے جس کی عملی تعلیم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہے۔ چھٹے اور ساتویں رکوع میں بنی اسرائیل کے واقعات اور اُن پر اللہ پاک کے احسانات کا ذکر ہے اور آٹھویں رکوع میں بتایا ہے کہ عزت و فضیلت صرف ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے۔ اُمم سابقہ میں اُن کے انبیاء علیہم السلام کی پیروی کا نام ایمان اور اُن کے بعد جب کہ وہ قوانین سابقہ منسوخ ہو چکے اور قرآن پاک آ گیا تو اب صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا نام ایمان اور عمل صالح ہے۔ آیت نمبر ۶۲ میں یہی بات فرمائی گئی ہے۔

نویں رکوع میں پھر بنی اسرائیل کی قلبی کیفیات اور حالات کا بیان ہے اور دسویں رکوع میں پھر ایمان اور عملِ صالح کی تشریح ہے گیارھویں رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی ترویج کا ذکر ہے کہ اس کے لئے زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام بھی تشریف

لائے لیکن یہود نے اُن کو قتل کر دیا۔ آیت ۹۴ میں فرمایا ہے کہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ " اگر اللہ کے یہاں آخرت کا گھر اور لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے نہیں، محض تمھارے لیے ہے تو ذرا موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو"۔ یہاں یہی فرمایا گیا کہ یہود اللہ کے لیے مرنے کی تمنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ایسی موت کے بڑے آرزو مند ہوتے ہیں علامہ اقبال نے بھی ایک صحیح لیڈر کی یہی پہچان بتائی ہے :-

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

آگے چل کر اسی رکوع میں اللہ پاک نے فرشتوں کے دشمنوں (یہود وغیرہ) کو اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ اسی آیت سے ملائکہ پر ایمان لانا بھی ثابت ہوتا ہے۔ پھر اسی رکوع میں (آیت ۱۰۱) فرمایا ہے کہ " اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے جو تصدیق فرماتے ہیں اس (تورات) کی جو اُن (یہود) کے پاس ہے تو اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب (تورات) کو پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ (اس کو) جانتے ہی نہیں۔

تیرھویں رکوع میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو اپنے آقا سے خطاب کرنے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے کہ "اے ایمان والو (ایسے ذومعنی الفاظ استعمال نہ کیا کرو جن سے دشمن دین کوئی توہین کا پہلو نکال سکتا ہو۔ مثلاً اپنے آقا کو متوجہ کرنے کے لیے) تم 'راعنا' نہ کہا کرو، 'اُنظرنا' (ہماری طرف توجہ کی نظرِ عنایت فرمایئے) کہا کرو اور ہمہ تن گوش ہو کر سُنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ آیت ۱۰۶ میں سابقہ قوانین کے منسوخ کیے جانے اور نئے قانون کے نفاذ کا ذکر ہے کہ اس میں "خیر" ہے۔

آیت ۱۰۸ میں (آدابِ تخاطب سکھلانے کے بعد اب) یہود کی طرح کج بحثی سے منع کیا گیا ہے کہ وہ طریقہ یہود کا تھا جو شعارِ اسلام نہیں۔

چودھویں رکوع میں پھر یہود و نصاریٰ کی بنیادی کمزوریوں کا ذکر ہے تاکہ مسلمان اُن کی بُرائیوں سے محفوظ رہیں۔ اور اسی رکوع کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا کہ " (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے آپ کو (دین) حق کے ساتھ بھیجا، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (بنایا) اور آپ سے اہلِ دوزخ کے متعلق سوال تک نہ کیا جائے گا"۔

پھر آیت ۱۲۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ذکر ہے کہ " وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (قرآن) دی وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے (یعنی زبان اور دل کی یکسانیت کے ساتھ پڑھتے ہیں)۔ وہی اس پر یقین لاتے ہیں ......"

پندرھویں رکوع میں ابراہیم علیہ السلام کے درجاتِ عالیہ کا ذکر ہے کہ اُن کی آزمائش کس کس طرح کی گئی اور وہ کس طرح پورے اُترے۔ آیت ۱۲۵ میں فرمایا کہ " اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے (اللہ کی طرف) رجوع ہونے اور امن کی جگہ بنا دیا اور (حکم دیا کہ) ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے، پاک کر رکھو (تاکہ ان کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی اس مقام کو اپنا مرکز بنائیں)۔ اسی رکوع کی آخری آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر ہے جب

وہ خانۂ کعبہ کی بنیاد قائم کر رہے تھے اور فرماں بردار اولاد کی جماعت کے لیے بھی دعا کر کے ایک ایسے رسول (اسی اولاد میں سے) کی تمنا ظاہر کر رہے تھے جو " تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور اُن کو کتاب سکھائے اور دانائی کے راز بتائے اور اُن کو مُزکّی کر دے۔ بےشک تو بہت بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے۔" ع

دعائے خلیل و نوید مسیحا[۱]

اسی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے تھی جس کی خاطر یہ کائنات بنائی گئی اور کعبہ کو جس کا مرکز قرار دیا گیا۔

سولھویں رکوع میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے اور یہ کہ ملّتِ ابراہیم[۲] (یعنی اسلام) کی پیروی ہی ایمان اور دانش کا اصل معیار ہے۔ آیت ۱۳۶ میں کتبِ سابقہ پر ایمان لانے (اور قرآن پر عمل کرنے) کا عقیدہ ہے اور یہ کہ مسلمان " ان پیغمبروں میں کسی ایک میں فرق نہیں کرتے۔"

آیت ۱۴۰ میں اللہ پاک نے اُن لوگوں کو ظالم کہا ہے جنھوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے متعلق شہادتوں (پیشن گوئیوں) کو چھپا دیا ہے —— پھر آخری آیت (۱۴۱) میں اس طرح مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ " وہ ایک اُمّت تھی جو گذر چکی۔ اُن کے لیے تھا جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ لوگ کرتے رہے اُس کی پُرسش تم سے نہیں ہوگی۔"

—— اب دوسرا پارہ شروع ہوتا ہے ——

مدینہ منورہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ہوتی رہی لیکن جب تحویلِ قبلہ کا حکم ملا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے عین نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف پھیر لیا یعنی صف آگے ہو گئی اور امام پیچھے (مسجدِ قبلتین کا نام اسی وجہ سے ہے)۔

اس پارے کے پہلے رکوع کی تمام آیتوں میں اسی موضوع کا ذکر ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابع داری پر زور دیا گیا ہے اور یہود سے گریز و احتراز کرنے کا حکم ہے کہ وہ تحویلِ قبلہ پر اعتراض کر رہے تھے۔ آیت ۱۵۰ میں ہے کہ " اور (اے رسولؐ) آپ جس جگہ تشریف لے جائیں نماز میں اپنا رُخ خانۂ کعبہ کی سمت کر لیا کیجیے اور (اے مسلمانو) جس جگہ بھی تم ہوا کرو تم بھی اسی سمت اپنا منہ پھیر لیا کرو تاکہ (یہودی) لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع نہ رہے، سوائے اُن کے جو بے انصاف ہیں (جو حق پوشی کرتے ہیں) سو تم (اُن کے اعتراضوں سے) مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہی تکمیل نعمت ہے تاکہ تم راہِ حق پا جاؤ۔" آیت ۱۵۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، تمھارا تزکیہ کرتے ہیں، تم کو علم کتاب اور علم حکمت (قرآنی) سکھاتے ہیں۔ (آل عمران ۱۶۴۔ جمعہ ۲ میں بھی یہی مضمون ہے) اور آیت ۱۵۲ میں ہے کہ " پس تم مجھ کو یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا اور تم میرا احسان مانو اور میری ناشکری مت کرنا۔" گویا اُس کے ذکر اور شکر سے اسلام کی تمام نعمتیں مل سکتی ہیں اور کفر سے دوری ہوتی ہے۔ اور یہ ذکر اور شکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال تابع داری سے حاصل ہوتا ہے۔ البقرہ کے انیسویں رکوع میں (یعنی پارۂ دوم کے تیسرے رکوع میں) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّتیوں کے درجات کی بلندی کا ذکر ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ مُردہ نہیں، زندہ ہیں۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے اللہ کی اعانت حاصل ہوتی ہے۔ ناگوار کو گوارا کرنا اور رضائے الٰہی کو ہر بات پر مقدم رکھنا

ان شہداً کا منصب ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اور انہی غلاموں کو حیات ابدی حاصل ہے اور انہی کو اُن کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں حاصل ہیں ۔ پھر صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے جو رضا و تسلیم اور صبر و صلوٰۃ والوں کی یادوں سے وابستہ ہیں ۔ اور ابراہیم علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام کی یادگار ہیں جن کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جن کے قرآن کو پوشیدہ کر دینے والوں پر اللہ پاک لعنت فرماتا ہے ۔ آئندہ رکوع میں اللہ پاک کے ماننے ، جاننے اور پہچاننے کے لیے سات نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کی تبلیغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے وابستہ ہے اور جن کے نہ پہچاننے والوں کے لیے سخت عذاب ہے — اس کے بعد کے رکوع میں مسلمانوں کو اپنے معاشرے کے سنوارنے کے لیے حکم ہے اور طیبؔ چیزوں کے استعمال کرنے کے لیے ارشاد ہے تاکہ برائی اور بے حیائی سے بچ سکیں کیونکہ حرام چیزوں کے استعمال سے بُرائی کی طرف میلان ہوتا ہے اور نافرمانی پیدا ہوتی ہے جس کے لیے عذاب ہے ۔ بعد کے (بائیسویں) رکوع میں (۱) صحتِ عقیدہ (۲) حسنِ معاشرہ اور (۳) تہذیبِ نفس کے لیے احکام ہیں جن کا مجموعہ اسلام ہے تاکہ تقویٰ پیدا ہو ۔ یعنی ایمان لائیں اللہ پر ، قیامت ، فرشتوں اور کتاب پر (قرآن پر جو پہلے کی کتابوں کی بھی تصدیق کرتا ہے) اور پیغمبروں پر (جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق کرتے رہے ہیں) ۔ اس کے بعد حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے "تاکہ حسنِ معاشرہ حاصل ہو اور تہذیبِ نفس کے لیے نماز ، زکوٰۃ ، ایفائے وعدہ اور مصیبت تکلیف اور جنگ میں صبر جیسے محاسن حاصل ہو سکیں ۔ قصاص کا فرض ہونا ، میراث میں اپنے عزیزوں کے لئے وصیت کر جانا بھی حسنِ معاشرہ اور تہذیبِ نفس کے لیے ضروری ہے آئندہ آیتوں میں روزے (صیام) کا حکم ہے جو اسی تہذیبِ نفس کیلئے ضروری ہے اور اس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے ، پھر حج کا ذکر آتا ہے جس کے لیے چاند کے مہینوں کے تعیّن اور اس کی مصلحت کی طرف اشارہ ہے ۔ پھر جہاد کی تعلیم بھی بیان فرمائی ہے کہ " اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اللہ پاک کی خوشنودی (حاصل کرنے) کے لیے اپنی جان کو بھی بیچ ڈالتا ہے . . . . " ۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ پاک نے یہاں نماز ، زکوٰۃ ، روزہ ، حج اور جہاد جیسے فرائض کو بالترتیب سمجھایا ہے اور فرمایا ہے کہ " اے ایمان والو ، تم کافّۃً اسلام میں داخل ہو جاؤ (یعنی ہر لحاظ سے تم مسلمان بن جاؤ) " — آئندہ رکوع میں پھر بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود اللہ پاک کی نعمتوں کی قدر نہیں کی — اس کے بعد بشارت آتی ہے کہ اگر مسلمان تکلیف اور آزمائش میں ثابت قدم رہیں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اُن کے معمولی سے اضطراب پہ اللہ پاک کی رحمتیں نازل ہونے لگتی ہیں ۔ پس مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہراساں نہ ہو اور اللہ پہ نظر رکھے ۔ اس کے بعد یہ آیت آتی ہے :-

" (اے رسولؐ) آپ سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں ۔ آپ فرما دیجیے کہ جو کچھ مال خرچ کرو تو تمہارے ماں باپ کا حق ہے اور (پھر درجہ بدرجہ) قرابت داروں اور مسکینوں کا اور راہ کے مسافر کا اور جو کچھ بھی تم نیکی کرو اللہ خوب جانتا ہے " اس کے بعد ہی پھر جہاد کی ترغیب ہے ۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کفار کے دھوکے میں نہ آئیں کہ وہ لوگ تم کو اگر شہرِ حرام میں ماریں تو تم خاموش رہو بلکہ اُن سے جنگ کرو تاکہ اُن کے فتنے کا انسداد ہو ۔ پھر مسلمانوں کے

ملہ طیبؔ وہ ہے جس سے انسانی زندگی کو کوئی مضرت نہ ہو ۔ اس کا تعین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے کائنات میں پہلی بار ہوا ہے ۔

لیے ہجرت کی اجازت آتی ہے کہ "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" پھر شراب اور جوئے کو "اثم کبیر" فرمایا ہے کہ اس سے معیشت اور معاشرت دونوں کا نقصان ہے اور عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں یتیموں کے ساتھ بھلائی، مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت اور سب کچھ دے کر خود کو کنگال بنا لینے کی ممانعت بھی آئی ہے۔ پھر محیض کا بیان ہے کہ یہود ایسی حالت میں اپنی عورتوں کو دیکھتے بھی نہ تھے اور نصاریٰ ایسی حالت میں بھی مباشرت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے صحیح راہ تجویز فرمائی کہ ایسی حالت میں صرف الگ رہو۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص اپنی بیوی کو پسند نہ کرتا اور نہ یہ چاہتا کہ کہیں دوسری جگہ اُس کی شادی ہو تو وہ قسم کھا لیتا کہ میں کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس طرح وہ بیچاری نہ شوہر والی سمجھی جاتی اور نہ بیوہ ——— اللہ پاک نے اس ظالمانہ طریقے کو ناپسند فرمایا۔ پھر طلاق شدہ عورتوں کا ذکر ہے کہ وہ کتنی مدت کے اندر اپنے شوہروں سے رجوع ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد تین رکوع میں طلاق کے مسائل اور بچوں کی پرورش وغیرہ کے مسائل بیان فرمائے ہیں تاکہ خانگی زندگی اصلاح پذیر ہو سکے۔ پھر حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ سے کم از کم پانچ نمازوں کا حکم پایا جاتا ہے ——— "صلوات" جمع ہے تثنیہ نہیں۔ اس لیے درمیانی نماز وہی ہو سکتی ہے جو کم از کم دو دو نمازوں کے درمیان ہو۔ خانگی زندگی کی اصلاح کے بعد انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے لیے احکام آ رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی قومی اور ملی زندگی صحیح بن جائے، جہاد کا پھر حکم ہے اور قوم بنی اسرائیل کے بعض واقعات آ جاتے ہیں کہ اُن کے فتنوں کا سدِ باب کرنے کے لیے داؤد علیہ السلام نے کس طرح جالوت کو قتل کیا۔ ان تمام مسائل اور واقعات کے بعد پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ "یہ آیتیں اللہ کی (ہماری) ہیں، ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں اور بے شک آپ ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔" (بنی اسرائیل کے واقعات سے مسلمانوں کو سبق دیا گیا ہے اور انفرادی، نیز اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے مختلف مسائل سمجھائے گئے ہیں)۔

اس کے بعد تیسرا پارہ شروع ہوتا ہے ———

"یہ سب پیغمبر (جو ہم بھیجتے رہے ہیں) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ پاک نے باتیں کیں اور بعض کے درجات (دوسری طرح) بلند کیے ......" ان انبیا علیہم السلام نے واضح نشانیاں پہنچائیں، پھر بھی کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نہیں لائے۔ اب ایمان والوں کو فرمایا ہے کہ جو کرنا ہے ابھی کر لو اور اس روزی میں سے جو تم کو دی گئی ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن (قیامت) آ جائے جب کہ کوئی سودا نہ ہوگا اور نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آئے گی۔ پھر آیۃ الکرسی آتی ہے جس میں اللہ پاک کی توحید اور عظمت کو نہایت بلیغ انداز میں بٹھایا گیا ہے ——— پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بتایا ہے کہ اُن کے لائے ہوئے دین کو جو پکڑے گا اُس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ (عروۃ الوثقیٰ) پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا واقعہ اور دوسرے پیغمبر (حضرت عزیر علیہ السلام یا حضرت یرمیاہؑ) کے واقعات میں اللہ پاک کی قدرت اور عظمت کا ذکر آیا ہے اور اللہ پاک کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو سراہا گیا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم خوئی کا اس طرح بیان ہے کہ "نرمی سے جواب دینا اور درگذر کرنا اُس خیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد دل آزاری ہو اور اللہ پاک بے نیاز اور حلیم ہے۔" پھر اللہ

پاک کی راہ میں خرچ کرنے والے جو (احسان رکھ کر یا دل آزاری کر کے نہیں بلکہ) اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں اُن کے لئے اجرِ عظیم کی خوش خبری سُنائی ہے — "طیّب" اور "خبیث" مال کی تعریف اور تشریح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّے چھوڑ دی ہے اور یہاں صرف یہ لفظ (بغیر تشریح) استعمال کیے گئے ہیں۔ اور سود کی مذمت بھی فرما دی ہے — (سود کی صحیح اور مکمل تشریح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہی سے معلوم ہو سکتی ہے) - پھر باہمی لین دین کا طریقہ بتایا ہے - اور یہ کہ "اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے - اور اگر تم اس چیز کو جو تمھارے دلوں میں ہے ظاہر کر دو یا اُسے پوشیدہ رکھو، اللہ پاک تم سے اُس کا حساب لے گا۔ پھر جسے چاہے گا بخش دے اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔" اس آیت کے نزول پر صحابہ کرام بھی کانپ اُٹھے کہ دل کے خیالات پر حساب بہت سخت چیز ہے — تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی توجہ، شیوہ تسلیم و رضا کی طرف پھیر دی - اس پیارے طریقے پر اللہ پاک کی رحمت کو جوش آیا اور اس سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں نازل ہوئیں - پہلی آیت یہ ہے :- "مان لیا رسول نے جو اُن پر اُن کے رب کی طرف سے اُترا اور مومنوں نے بھی - سب نے اللہ کو اور اُس کے فرشتوں کو اور اُس کی کتابوں کو اور اُس کے رسولوں کو مانا (اور سب کا کہنا یہ ہے کہ) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور (اللہ کا حکم پاتے ہی) بول اُٹھے کہ ہم نے سُنا اور قبول کیا - اے رب ہمارے، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

سورۃ آلِ عمران

نجران کے ساٹھ عیسائیوں کا ایک وفد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں متنازع فیہ مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے آیا تو اس سورۃ کی تقریباً ۸۰ - ۹۰ آیتیں اسی سلسلے میں نازل ہوئیں، الوہیت، وحدانیت، رسالت اور معاد کے بنیادی مسائل سمجھانے کے بعد اُن امور پر خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی جو معاشرے کو درست کرنے اور اخوتِ اسلامی کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں تاکہ اس برادری میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ دین اور مخلوق کی صحیح خدمت ہو سکے۔

آیت ۱۳ میں بدر کے مسلمانوں کی طاقت کا ذکر ہے جو اپنے سے بہت بڑی طاقت پر غالب ہوئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت سے مستفیض ہوئے۔ انھیں دنیا کی چیزیں مرغوب نہیں۔ آخرت مرغوب ہے - یہ وہ لوگ ہیں (آیت ۱۷) جو "(تکالیف پر) صبر کرنے والے اور سچے اور با ادب (عبادت گذار) اور اللہ کی راہ میں (خرچ کرنے والے اور راتوں کے پچھلے پہر استغفار کرنے والے ہیں"۔ (آیت ۲۰) "پس (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اگر وہ (عیسائی) آپ سے کج بحثی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا رُخ اللہ پاک کی طرف کر لیا ہے ......" نجران کے وفد کو بتایا جا رہا ہے کہ حق سے انحراف اور انبیاء علیہم السلام کا قتل، بنی اسرائیل کا شیوہ رہا ہے اور انہوں نے دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال بگاڑ لیے ہیں - آیت ۲۸ میں مومنوں سے فرمایا ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں - پھر آیت ۳۱ میں واضح طور پر حکم ہے کہ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے، اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو - اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور (اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ) اللہ پاک تمھارے

گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔" پھر عمران کی بیوی (عیسیٰ علیہ السلام کی نانی)، زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ اللہ پاک نے اُن کو کس کس طرح نوازا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو یہود نے آپ کے خلاف سازشیں کیں اور اُن کو واجب القتل قرار دیا۔ اللہ پاک نے اُن کو محفوظ رکھا۔ اور کافروں کے لیے سخت عذاب ہے، آیت ۶۱ میں عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت اور اللہ پاک کی ربوبیت سے متعلق عیسائیوں سے جو مباہلہ ہُوا چاہتا تھا اُس کا ذکر ہے۔

یہود و نصاریٰ اس بات پر بھی بحث کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین کیا تھا۔ آیت ۶۷ میں فرمایا کہ" ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔ وہ تو سیدھی راہ چلنے والے مسلمان تھے اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھے" اور آیت ۶۸ میں ہے کہ" بے شک ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اُن کی پیروی کی اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ جو آپ پر ایمان لائے اور اللہ پاک مسلمانوں کا دوست ہے"۔

پھر یہود کی دینی خیانت اور نفاق کے ساتھ اُن کی دنیوی خیانت کا ذکر بھی آتا ہے (آیت ۷۵) اور اہلِ کتاب کی تحریفِ کتاب (آیت ۷۸) اور اللہ پاک پر بہتان تراشی کا بیان ہے۔

آیت ۸۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سید المرسلین اور خاتم النبیین ہونے کی اُس تصدیق کا ذکر ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام نے ارواح کی تخلیق کے وقت کی تھی:۔" اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت سے سرفراز کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے اس کتاب کی تصدیق کرنے والا جو تم کو دی گئی ہے تو تم اس رسول پر ضرور ایمان لاؤ گے اور لازماً اُس کی مدد کرو گے (مزید تاکید کے لیے) فرمایا، کیا تم (سب پیغمبروں) نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ (تم خود اُس نبی کو پاؤ تو اُس کی تصدیق کرو۔ یعنی تمہاری اُمتیں اُن کا زمانہ پائیں تو تصدیق کریں)۔ سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ (اس عہد و پیمان کے) گواہوں میں سے ہوں"۔۔ آیت ۸۲ میں ہے کہ" پھر جو کوئی (اُن اُمتیوں میں سے) اس کے بعد روگردانی کرے تو وہی فاسق (نافرمان) ہیں"۔ پھر مُرتد کے لیے وعید آتی ہے اور پارہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب چوتھا پارہ شروع ہوتا ہے ——

شروع ہی میں یہودیوں کے دو اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن نے اُن چیزوں کو حرام نہیں کیا جو یہود کے یہاں (توریت میں) حرام نہیں تھیں (توریت اٹھا کر دیکھ لو) اور یہ کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر خانۂ کعبہ کو اس لیے قبلہ قرار دیا گیا ہے کہ" وہ بے شک سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے تعمیر کیا گیا جو مکّہ میں ہے، بڑا برکت والا اور تمام عالموں کے لیے ہدایت ہے"۔ (آیت ۹۶)۔ اور دیکھو کہ وہیں مقامِ ابراہیم بھی تو ہے۔ جہاں استطاعت والے لوگ حج کرنے جاتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے کہ" اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم (آپس میں) دشمن تھے (تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں) اُس نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی۔ پس تم رحمتِ الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم تو (اپنے کفر و عصیان کی وجہ سے) دوزخ کے

گڑھے کے کنارے تھے، پس اُس نے تم کو اس سے نجات دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کھول کھول کر اپنی نشانیاں تمھارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" (آیت ۱۰۳)

پھر مسلمانوں کی فضیلت کا ذکر ہے کہ "(اے مسلمانو) تم بہترین اُمت ہو (کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل میں) تم کو سب کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔۔۔۔ ۔۔۔۔" (آیت ۱۱۰)۔ پھر نافرمانوں کا ذکر ہے جن کو اللہ کے عذاب سے بچانے میں نہ اُن کا مال کام آئے گا اور نہ اُن کی اولاد۔ اس کے بعد منافقوں (یہود اور کفار) کو اپنا رازدار بنانے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ وہ تمھارے دشمن ہیں اور تمھاری تکلیف سے اُن کو خوشی ہوتی ہے (آیت ۱۲۰)۔ اس کے بعد غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کا ذکر ہے جب کہ منافقین کی فریب کاری کے باوجود مسلمانوں کا پلّہ بھاری تھا اور غیبی امداد شاملِ حال تھی۔ غزوۂ احد میں گو کہ ستّر صحابہ شہید ہوئے لیکن کفار میں سے اکثر بعد میں تائب ہو کر مسلمان ہوئے۔ کیونکہ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ معاملہ آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ (اللہ) یا تو اُن کی توبہ قبول کرے یا اُن کو عذاب دے کہ وہ لوگ بے شک ظالم ہیں۔" (آیت ۱۲۸)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے متقی غلاموں کا ذکر ہے کہ "وہ فراخی اور تنگ دستی (ہر حال) میں (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اور وہ غصّے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں (ان باتوں سے وہ نیکوکار بن جاتے ہیں) اور اللہ ان نیکوکاروں سے محبّت کرتا ہے۔" (آیت ۱۳۴)۔ آگے چل کر مسلمانوں کو تسلّی دی جاتی ہے کہ "تم ہمت نہ ہارو اور حزن و ملال میں نہ پڑو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" (آیت ۱۳۹)۔ آگے آتا ہے کہ "اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نہیں مگر رسول (یعنی جب سے محمد ظہور میں آئے رسول ہیں)۔ بے شک اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر وہ (محمدؐ) وفات فرمائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا اور اللہ جلد ہی شکر گذاروں کو جزائے خیر دے گا۔" (آیت ۱۴۴)۔

آیت ۱۵۲ میں اللہ پاک نے غزوۂ احد کا پھر ذکر کیا ہے کہ جب تک مسلمان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے تابع رہے فتح حاصل کرتے رہے اور جونہی اُن کے حکم سے بے اعتنائی کر کے تیر اندازوں نے درّہ چھوڑا اور مالِ غنیمت کی طرف بڑھے تو اللہ پاک نے فتح کو شکست سے بدل دیا، پھر بھی اللہ پاک نے معاف فرما دیا۔ اور امن و امان (سکون و اطمینان) نصیب فرمایا۔"

اس کے بعد بھی اللہ پاک کی رحمتیں اور نعمتیں ہر وقت اور ہر حالت میں مسلمانوں کے لیے عام ہیں۔ غزوۂ احد کی شکست سے بعض صحابہ کو غیر معمولی غم و اندوہ تھا جس کا ذکر مسلسل ہے۔ پھر آیت ۱۵۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی نرم دلی کا ذکر ہے کہ آپ کی وجہ سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ منتشر ہو جاتے۔ پھر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں اور مشورہ کر لیا کریں۔ لیکن بھروسا صرف اللہ پاک پر رکھیں — تاہم جو لوگ اللہ پاک اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی کے تابع ہیں اُن کے درجات بہت بلند ہوں گے۔ اس کے بعد ہی آیت ۱۶۴ میں ہے کہ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم جیسی ذاتِ گرامی ہم لوگوں کو عنایت کر کے ہم سب پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔" بلاشبہ اللہ پاک

اللہ پاک نے ایمان والوں پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ اُن میں اُنھی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سُناتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور (اُن کے آنے سے) پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چار خصوصیات (۱) آیتیں پہنچانا (۲) تزکیہ نفس کرنا (۳) قرآن کا علم اور (۴) حکمت سکھلانا یہاں مذکور ہیں۔ (یہی خصوصیات البقرہ کی آیت ۱۵۱ میں بھی مذکور رہیں)۔

آیت ۱۷۲ میں ہے کہ "جن لوگوں نے (جنگِ احد میں) زخم کھانے کے باوجود اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانا (لڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے) اُن میں جو کہ نیکو کار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے اجرِ عظیم ہے"۔ ان بزرگوں کی شان آگے والی آیت میں بھی بیان کی ہے کہ بجائے خوف کے اُن کے ایمان میں اور تازگی پیدا ہوگئی اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لیئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اس ایمانی جذبے کی وجہ سے وہ پھر کامیاب ہوئے اور اُس کے فضل سے خوش خوش واپس آئے۔ (آیت ۱۷۴)۔

آیت ۱۷۶ تا ۱۷۸ میں عذاب کی قسمیں بتائی ہیں۔ شریعت کے مقابلے میں کفر کرنا "عذابِ عظیم" ہے۔ ایمان کے بدلے میں کُفر مول لینا "عذابِ الیم" ہے اور دنیا کی راحتوں سے یہ قیاس کرنا کہ عذابِ آخرت ڈھکوسلا ہے۔" عذابِ مہین" کہلاتا ہے۔ لیکن ان تینوں عذابوں سے محفوظ رہنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ" اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ گے تو تم کو بہت بڑا اجر (اجرِ عظیم) ملے گا۔" (آیت ۱۷۹)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب کفار سے رنجیدہ ہوئے تو ارشاد ہوا۔" پس اگر وہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا جو واضح دلائل اور صحیفے اور کتابِ منیر لے کر آئے" (آیت ۱۸۴) اس کے بعد پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ" اور جب اللہ نے اہلِ کتاب سے (نبیوں کے ذریعے) پختہ وعدہ لیا کہ اس (کے حقائق) کو لوگوں سے صاف صاف بیان کرو گے اور اُس کو (یعنی بشارتِ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) نہ چھپاؤ گے۔ مگر انھوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیوی منفعت) حاصل کی۔ کیا ہی بُرا (سودا) ہے جو یہ لوگ خرید رہے ہیں"۔ (آیت ۱۸۷)۔ پھر ایسے لوگوں کے لیے "عذابِ الیم" کی وعید ہے ـــ اس کے بعد اللہ پاک نے اپنی قدرت کا ذکر کیا ہے اور اُن غلامانِ رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف کی ہے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ پاک کو یاد کرتے ہیں اور اُسی سے گڑگڑا کر مانگتے ہیں۔ ان کے بڑے درجات ہیں۔ پھر آیت ۲۰۰ میں ان غلاموں کے لیے یہ نصیحت آئی ہے کہ" اے ایمان والو، صبر کرو اور ثابت قدم رہو اور آپس میں مل جُل کر مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔

سورۃ النّسآء

سورۃ البقرہ نے حیوانیت سے نکالا، سورۃ آلِ عمران نے نفسانیت سے بچنے کے آداب سکھائے۔ اب سورۃ النساء سے معاشرت کے آداب معلوم ہوتے ہیں اور زندگی کو سنوارنے کے لیے نکاح اور میراث کے آئین سمجھائے جاتے ہیں۔ معاشرے میں یتیم کے

بعد عورت کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی کمزور ہے۔ شادی کے لیے حکم ہے لیکن وہ نفس پرستی کے لیے نہ ہو۔ معاشرتی نظام کی بھلائی کے لیے ہو۔ پہلے اور دوسرے رکوع میں میراث کا ذکر ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس تفصیل کے ساتھ ہم کو سمجھایا گیا ہے، تیسرے رکوع میں اُن حدود کا بیان ہے جو معاشرے کی خرابی کی جڑ ہیں اور جن سے خاندان تباہ ہوتے ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ رواج تھا کہ جب چاہتے ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کر لیتے اور پہلی پر تہمت لگا کر اُس سے مال واپس لے لیتے۔ اللہ پاک نے اس کام کی ممانعت فرمائی اور اس سے بھی ممانعت فرمائی کہ سوتیلی ماں یا دوسری محرمات سے شادی کی جائے۔ چوتھے رکوع میں تفصیل آتی ہے کہ کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ عورت کی عزت اور وقار کو پہلی بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں متعین کیا گیا اور اُس کے حقوق منوائے گئے۔

—— اب پانچواں پارہ شروع ہوتا ہے ——

گذشتہ آیت میں اُن محرمات کا ذکر تھا جن سے نسبی یا رضاعی رشتہ تھا۔ اب دوسری عورتوں کا ذکر ہے جن سے شادیاں حرام کی گئیں۔ حلال و حرام کے احکامات کا مقصد کوئی اور نہیں سوائے اس کے کہ اسلامی معاشرے میں فلاح و خیر کے راستے کھل جائیں اور انسانی زندگی میں سہولتیں پیدا ہو جائیں۔ آیت ۲۹ میں ناجائز طور پر ایک دوسرے کا مال کھانے سے ممانعت فرمائی گئی ہے اور اس طرح کھانے سے اخون ریزی سے روکا گیا ہے۔ آیت ۳۳ میں ہے کہ "(اے مسلمانو) ہم نے (تمھارے) ماں باپ اور قرابت والوں کے ترکہ میں سے ہر کسی کے لیے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے اُن کو اُن کا حصہ (ضرور) دے دو۔ بے شک ہر چیز، اللہ کے پیشِ نظر ہے"۔ ترکہ و میراث کی تفصیل کہاں ملے گی؟ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی احادیث و اقوال ہی سے حاصل ہو گی۔

آیت ۳۴ میں دنیوی زندگی میں عورت پر مرد کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ آئندہ آیتوں میں میاں بیوی کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ پھر اللہ کی بندگی کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم ہے۔ پھر قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب کے پڑوسیوں، دور کے پڑوسیوں، ہم مجلسوں، مسافروں اور جن کے تم مالک بن گئے (غلاموں، لونڈیوں اور ملازموں) اُن سب کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ غرور، بخل، ریا کے طور پر خرچ سے بھی منع فرمایا اور نافرمانوں کے لیے یہ وعید ہے کہ "اس دن، کفر کرنے والے اور پیغمبروں کی نافرمانی کرنے والے آرزو کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر ہو جاتی اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے"۔ (آیت ۴۲)

اس کے بعد نماز اور تیمم کی سہولتوں کا انعام ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں کتنی آسانیاں ہیں۔ یہود کی عیاری، تحریف اور منافقت کا پھر ذکر ہے کہ وہ کس کس طرح اسلام کے درپئے آزار ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُن پر اللہ کی لعنت ہے اور آیت ۵۴ میں فرمایا ہے کہ "کیا یہ (یہود) حسد کرتے ہیں (مسلمان) لوگوں پر اُن نعمتوں کی وجہ سے جو اللہ پاک نے اپنے فضل سے ان کو دی ہیں؟ (حالانکہ) پس ہم نے (تو) ابراہیم علیہ السلام (ہی) کے خاندان (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کو کتاب (قرآن) اور حکمت دی اور ان کو ہم نے بڑی سلطنت دی"۔ یہود کی خیانت، خباثت اور ناانصافی کے ذکر کے بعد مسلمانوں کو (آیت ۵۸) حکم ہوتا ہے کہ

وہ امانت، دیانت اور عدل کو اپنا طرۂ امتیاز بنائیں اور آیت ۵۹ میں ہے کہ "اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو حاکم ہوں (اُن کی اطاعت کرو)۔ پس اگر مسئلے میں تمھارا اختلاف ہو جائے (حق بات واضح نہ ہو) تو اس کو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی چیز بہتر ہے اور اس کا انجام اور بھی نیک ہے۔"

اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تم میں سے جو حاکم ہو اُس کی اطاعت کرو — یعنی تم میں سے جو حاکم ہو گا وہ وہی ہو گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہو گا۔ ورنہ وہ حاکم تم میں سے نہیں کہلایا جائے گا۔ یہی آیت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے یزید کی اطاعت نہیں فرمائی اور خود کو، نیز اپنے بہتّر رفقاء کو بھی قربان کر دیا۔

آیت نمبر ۶۰ (اور مابعد) کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی اور ایک منافق (جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا تھا) کے درمیان کسی معاملے میں نزاع تھا۔ منافق چاہتا تھا کہ یہود کے سردار کعب بن اشرف سے فیصلہ کرائے لیکن یہودی اس منافق کو لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ حضور نے معاملے کا فیصلہ اس یہودی کے حق میں فرما دیا تو منافق کو وہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ اور وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اچھا ذرا ٹھہرو۔ یہ کہہ کر آپ اندر تشریف لے گئے اور ننگی تلوار لا کر اُس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا کہ جو شخص اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو نہ مانے اُس کے لیے یہی فیصلہ بہترین ہے۔ اسی آیت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے "فاروق" کا لقب عطا ہوا۔ آیت ۶۵ میں ہے کہ "پس (اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس کے ہر اختلاف میں یہ لوگ آپ کو (دل وجان سے) حکم نہ بنائیں۔ پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں اُس سے کسی طرح بھی وہ دل گیر نہ ہوں اور اُسے دل سے خوشی خوشی قبول کریں۔" — اور آیت ۶۹ میں یہ انعام بھی مذکور ہے کہ "اور جو اللہ کی اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (اپنا خاص) انعام کیا، (یعنی) انبیاء (علیہم السلام)، صدیقین، شہداء اور دوسرے نیک بندے اور یہ لوگ (کیسے) اچھے ساتھی ہیں۔" —

پھر جہاد کا حکم آتا ہے "اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے (یعنی شہید ہو) یا غلبہ پائے (غازی ہو) تو (دونوں صورتوں میں) ہم (قیامت کے دن) اس کو اجرِ عظیم دیں گے۔" اس کے بعد آیت ۷۵ میں آتا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور مظلوم مسلمانوں کو کافروں سے چھڑانے کے لیے کافروں سے لڑنا چاہیے۔ پھر اُن لوگوں کا ذکر ہے جو جہاد سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ جو فائدہ پہنچتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے تو وہ انسان کے نفس کی طرف سے ہوتی ہے (آیت ۷۹) اور آیت ۸۰ میں ہے کہ "جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو اُس نے اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو (آپ فکر نہ کریں) آپ کو ہم نے اُن پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔" پھر آیت ۸۴ میں یہاں تک ہے کہ اگر کم ہمت مسلمان یا منافق لوگ آپ کا ساتھ نہ دیں "تو آپ (تنہا) راہِ خدا میں جہاد کریں۔ آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی اور آپ مسلمانوں کو (جہاد کی) ترغیب دیتے رہیے . . . ." پھر حسنِ گفتگو کی ترغیب ہے اور یہ کہ "(اے مسلمانو) جب تم کو سلام کیا جائے (دعا دی جائے) تو تم اُس سے بہتر طور پر سلام کرو یا (کم از کم یہ

تو ہو کہ) وہی الفاظ دُہرا دو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے“۔ (آیت ۸۶)

اس کے بعد مسلمانوں کو خطاب ہے کہ وہ منافقوں کے راہ پر لانے کی فکر نہ کریں بلکہ اُن کی اصلاح حال کریں جن کو ہدایت کی خواہش ہو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ کن لوگوں سے کب نہ لڑو اور کن سے جہاد کرو۔

پھر فرمایا ہے کہ لڑائی تو دین کی حفاظت کے لیے کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو مارنے کے لئے نہیں۔ اگر سہواً کسی مسلمان کو نقصان پہنچ جائے تو اس کے احکام بتا دیے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو اپنے کو مسلمان کہے اُسے مسلمان سمجھو۔ پھر ہجرت کی فرضیت کا ذکر ہے کچھ لوگ جو دنیوی تعلقات اور دولت کی وجہ سے ہجرت کے فرض ہونے کے بعد مکہ معظمہ میں رہ گئے، اُن کو عبرت دلائی گئی ہے۔ کچھ ایسے تھے جو ضعیفی اور مجبوری کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے۔ اُن کے لیے بھی بخشش کی بشارت ہے اور کچھ ایسے تھے جنھوں نے محض اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی اُن کے لیے انعامات کا ذکر آتا ہے۔ خواہ وہ راستے میں فوت ہو گئے، تب بھی اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ پھر صلوٰۃ قصر اور صلوٰۃ خوف کی سہولتوں کا ذکر آتا ہے اور اللہ کی یاد پر زور دیا گیا ہے۔ پھر یہ فرمایا ہے کہ قوم کی عزت کسی ایک فرد کی بُرائی سے چلی نہیں جاتی اور یہ کہ صحیح شہادت حاصل ہونے پر مجرم کی قسم کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ذکر ہے (جیسا کہ البقرہ کی آیت ۱۵۱۔ اور آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں ہے) کہ اُن کی وہ ذات گرامی ہے کہ منافق لاکھ چاہیں آپ کو بہکا نہیں سکتے اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے ہی سے خیر کثیر ملتی ہے۔ اور جو اُن کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ جاتا ہے وہ گویا اللہ پاک کے حکم کی توہین کرتا ہے۔ آیت ۱۱۵ میں ہے کہ ”اور جو کوئی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے اُس کے بعد کہ اُس پر راہِ ہدایت کھل چکی اور جو مسلمانوں کی راہ سے ہٹ کر ایک الگ راہ پر چلے تو ہم اُس کو اُسی راہ پر ڈال دیں گے جو اُس نے اختیار کی ہے اور ہم اُس کو دوزخ میں ڈالیں گے اور وہ بہت ہی بُرا مقام ہے“۔ پھر شرک سے بچنے کا حکم آتا ہے اور ہدایت ہے کہ جو کچھ مانگنا ہے اللہ پاک سے مانگیں کہ سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اور جس کے پاس کچھ نہیں اُس سے مانگنا خود اپنی توہین ہے۔ شیطان (جس پر اللہ کی لعنت ہے) مختلف طریقوں سے بہکانا چاہتا ہے لیکن جو لوگ اُس سے بچ کر اللہ سے لَو لگاتے ہیں اُن کے درجات بہت بلند ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ آیت ۱۲۵ میں ہے کہ ”اور اُس شخص سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ نیک کاموں میں لگا رہا اور یکسو ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (اسلام) کی پیروی کرتا رہا اور ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ پاک نے اپنا دوست بنا لیا ہے“۔

آیت ۱۲۷ سے یتیم عورتوں کا ذکر ہے جن سے اُن کے والی نکاح کر سکتے ہیں اور اگر زوجین میں موافقت نہ ہو سکے تو جُدا بھی ہو سکتے ہیں، پھر بھی نیکی اور پرہیزگاری ضروری ہے، اور ”جو کوئی دنیا (میں عمل) کا بدلہ چاہتا ہو تو (وہ دنیا کے فائدے کے ساتھ اللہ سے تعلق ہی کیوں نہ پیدا کرے کہ) اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا اجر ہے۔ اور اللہ پاک سب کچھ سُنتا (اور) دیکھتا ہے“۔ (آیت ۱۳۴)۔

اب انصاف، سچائی اور حقوق کے ادا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے (حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح فرمایا

ہے کہ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اُس کی عبادت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول سمجھنا یہ ہے کہ اُن کی پیروی کرو)۔
آیت ۱۳۶ میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے لائے ہوئے احکام کی پیروی پر زور دیا گیا ہے (صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں)۔ آیت ۱۳۹ میں ہے کہ "وہ (منافق) جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں تو کیا وہ اُن کے پاس عزت کی تلاش کرتے ہیں۔ پس ساری عزت تو اللہ ہی کے واسطے ہے"۔ پھر منافقوں کے انجام کا ذکر ہے جس پر یہ پارہ ختم ہوتا ہے اب چھٹا پارہ شروع ہوتا ہے ———

اللہ پاک اپنے بندوں کی بُرائیاں دیکھ کر بھی اُن کو مشتہر نہیں کرتا تو پھر ایک بندہ دوسرے بندے کی بُرائیوں کا ڈھنڈورا کیوں پیٹے؟ یہ بات بھی منع کی گئی کہ کچھ رسولوں کو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ بلاشبہ کافر ہیں (آیت ۱۵۱)۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ دوسرے پیغمبروں کو مانتے ہیں لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے وہ بلاشبہ کافر ہیں۔ پھر یہود کی کج بحثی کا ذکر ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایسا ہی مطالبہ کرتے تھے جیسا کہ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہے ہیں کہ آپ اُن پر ایک لکھی لکھائی کتاب نازل کرا دیں (آیت ۱۵۳)۔ اُن یہود کی گستاخیوں کی وجہ سے اُن کو سزائیں بھی ملیں (عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا جھوٹا دعویٰ بھی کیا)۔" اور (قیامت کے قریب جب عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے تو) اہل کتاب کے جتنے فرقے ہیں وہ عیسیٰؑ پر اُن کی وفات سے پہلے ایمان لائیں گے اور وہ قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوں گے" (آیت ۱۵۹)۔" لیکن ان میں جو علم میں پختہ ہیں اور مومنین اس (قرآن) پر جو آپؐ پر نازل ہوا ہے اور اُن (کتابوں) پر جو آپؐ سے قبل نازل ہوئیں ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو ہم عنقریب اجر عظیم عطا کریں گے"۔ (آیت ۱۶۲)۔ پھر مختلف انبیا علیہم السلام پر نزولِ وحی کا ذکر ہے جنہوں نے ہدایت فرمائی۔ لیکن پھر بھی لوگوں نے انکار کیا اور انہوں نے اپنا ٹھکانا جہنم بنایا۔" اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) آ چکا۔ پس (اگر اُن پر) تم ایمان لاؤ تو تمہارا ہی بھلا ہوگا اور اگر تم نے انکار کیا تو (اللہ بے نیاز ہے) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے" (آیت ۱۷۰)

——— بعض لوگوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے بندہ ہونے سے انکار ہے حالانکہ انھیں اس بات سے عار نہیں —" رسول برحق" اور صریح دلیل (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہی۔ انہی کے ماننے والے رحمت اور فضل کے مستحق ہیں (آیت ۱۷۵) اور انھی سے صراطِ مستقیم حاصل ہو سکتی ہے۔ (قرآن پاک کی پہلی منزل یہاں ختم ہوتی ہے اور کلالہ یعنی جس کے اصول و فروع نہ ہوں اُس کے حقوق کی حفاظت کا بیان اس منزل کی آخری آیت ہے)۔

سورۃ المائدہ

اس سورۃ میں مسلمانوں کے لیے بہت سی نعمتیں مذکور ہیں جن سے اُن کی جسمانی اور روحانی اصلاح منظور ہے۔ پہلے عہد و اقرار کے پورا کرنے کی تعلیم ہے، پھر حلال و طیب چیزوں پر زور دیا گیا ہے تاکہ ذاتی اور معاشرتی زندگی سنور جائے اور اسی سورۃ میں

"الیوم اکملت لکم دینکم" کا مژدہ سنایا گیا ہے جو انسانی زندگی کی فلاح کا آخری پیغام ہے اور جس کے علمبردار صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قول و قرار کو پورا کرنا، پاک جانوروں کو غذا بنانا، شعائر اللہ کی حرمت کرنا، شہر الحرام، ھدی اور وہ جانور جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں (خدا کی نذر کے لیے شناخت کے طور پر) اور وہ لوگ جو خانۂ کعبہ کی زیارت کو جا رہے ہیں اُن سب کا لحاظ کرنا بھی تربیت اور تادیب کے لیے ہے۔ پھر اُن چیزوں سے روکا گیا ہے جن سے جسمانی یا معاشرتی صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان چیزوں کے ذکر کے بعد مسلمانوں سے خطاب ہے کہ "آج (جمعہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر) کافر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم اُن سے مت ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر میں نے اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمھارے واسطے اسلام کو بطور دین کے پسند کیا۔۔۔۔۔۔" (آیت ۳)۔ یہ وہ موقع تھا جب کہ دنیا میں پہلی بار دین کی تکمیل کا اعلان کیا جا رہا تھا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی اہمیت کو پیش کیا جا رہا تھا کہ یہ تکمیل اُنہی کی ذات سے وابستہ ہے اور ہر خیر اور ہر نعمت انہی سے تعلق رکھتی ہے ــــ اپنوں کے لیے حیاتِ صافی اور مجرموں اور ظالموں کے لیے عام معافی اسی موقع کی یادگار ہے۔ آج پاک چیزیں (جو انسانی جسم، ذہن اور فہم کے لیے مضر نہ ہوں) اور پاک بیبیاں (پاک مقصد کے لیے) بھی حلال کی گئیں۔ پھر ظاہری طہارت کے لیے وضو کے احکام اور تیمم کا طریقہ بتایا گیا کہ "اللہ پاک تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں چاہتا بلکہ وہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے تاکہ تم پر اللہ اپنا احسان پورا فرمائے تاکہ تم اُس کا شکر ادا کرو۔" (آیت ۶)

آیت ۷ سے ۱۱ تک اللہ پاک نے مسلمانوں کو اپنی نعمتیں یاد دلا کر اُن کو ڈھارس اور ہمت دلائی ہے کہ عدل و انصاف اور تقویٰ پر قائم رہیں اور انھیں تو اللہ پاک ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کے میثاق کے ساتھ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر آتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سے گیارہ سال کی قلیل مدت میں اس میثاق پر عمل کرنے کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی جو ہزاروں سال میں بنی اسرائیل پیدا نہ کر سکے۔ بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے اُن پر اللہ کی لعنت ہوئی اور اُن کے دل سخت کر دیے گئے یہاں تک کہ وہ خود توریت میں تحریف کرنے لگے جو نصیحتیں اُن کو کی گئی تھیں اُن میں سے اکثر کو بھلا دیا۔ یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ آیت ۱۵ - ۱۶ میں ہے کہ "اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بلا شبہ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس آئے۔ وہ تم سے بہت سی باتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جن کو تم اللہ کی کتاب (جو تم کو دی گئی تھی) میں سے چھپاتے ہو۔ اور وہ تمھاری بہت سی باتوں سے درگذر بھی کرتے ہیں۔ بے شک اللہ پاک کی طرف سے تمھارے پاس نور آ چکا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) اور کتاب روشن (یعنی قرآن)۔ اس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو سلامتی کی راہوں پر لے جاتا ہے اور انھیں اندھیرے سے نور کی طرف اپنے حکم سے نکال لاتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔"

پھر آئندہ آیتوں میں نصاریٰ کو کافر کہا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں اور یہود و نصاریٰ کے اس قول کی بھی تردید ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا سمجھتے ہیں۔ آیت ۱۹ میں ہے کہ "اے اہلِ کتاب بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آ گیا ہے جو تمھارے لیے (احکام الٰہی) صاف بیان کرتا ہے بعد اس کے کہ رسولوں کا آنا بند تھا تاکہ تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور

نذیر نہیں آیا۔ پس (اب تو) تمھارے پاس بشیر اور نذیر آچکا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" پھر موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کا ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو ارضِ مقدس (شام) میں داخل ہونے کا حکم دیا کہ وہاں اُن کو حکمرانی نصیب ہوگی لیکن ان کی قوم نے کہا کہ وہاں کے لوگ بڑے زبردست (طاقت ور) ہیں، پہلے اُن کو نکالو تو ہم داخل ہوں گے۔ آخر وہ قوم وہاں نہ گئی اور وہ زمین (شام) اُن پر چالیس برس کے لیے حرام کر دی گئی۔ پھر قابیل کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا قتل کے بعد ندامت ہوئی لیکن یہ بھی قابیل کو معلوم نہ تھا کہ ہابیل کو کس طرح دفن کرے، تو دو کوّے لڑتے ہوئے آئے۔ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور زمین کرید کر دفن کیا۔ قابیل یہ واقعہ دیکھ کر نادم ہُوا کہ میں اس کوّے کی طرح بھی نہ ہو سکا۔

آیت ۳۲ میں ہے کہ" اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر حکم نازل کیا کہ جو کوئی (نفس کی خواہش سے) کسی کو مار ڈالے، سوائے قصاص کے یا ملک میں فساد پھیلانے کے، تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی جان کو قتل سے بچا لیا تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو بچا لیا ....."۔ اللہ پاک نے پھر بھی توبہ کرنے والوں کے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ اور آیت ۳۵ میں ارشاد ہے کہ" اے ایمان والو، تم اللہ سے ڈرتے رہو اور اُس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن کے متبعین کا وسیلہ) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" پھر چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا کا ذکر ہے اور اس سزا میں بڑی حکمت ہے۔ پھر اُن لوگوں کا ذکر ہے جو منافق ہیں یا صحیفوں کے احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلی دی ہے کہ آپ اُن لوگوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں اور کوئی خیال نہ کریں۔ آیت ۴۸ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو فرمایا گیا ہے کہ آپ کی کتاب سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور آپ اسی کے مطابق فیصلہ دیا کریں اور جو لوگ اس فیصلے کو نہ مانیں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کو یہی منظور ہے کہ ان لوگوں کو مصیبت میں گرفتار کر دے۔

اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمھارے دوست نہیں۔" بے شک تمھارا دوست اللہ اور اُس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا کے سامنے عاجزی سے جھکے رہتے ہیں۔" (آیت ۵۵) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو دوست رکھیں گے تو وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہیں اور انہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

یہود و نصاریٰ ہمارے دین اور ہماری اذان کا بھی مذاق اُڑاتے تھے تو ایسے نافرمانوں پر اللہ نے لعنت کی ہے اور پہلے ایسے اعمال والوں کو بندر اور سُوّر بھی بنا دیا گیا تھا۔ یہود و نصاریٰ کو تو اُن کے علماء نہ سمجھاتے اور نہ اُن کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے روکتے۔ اس لیے" اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ تو پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہُوا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں (یعنی آپ تو پہنچا دیں اور کوئی خیال نہ کریں) اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ، کافروں کی ہدایت نہیں فرماتا۔" (آیت ۶۷)۔ پھر یہود اور مشرکین کا حال بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کس قدر فتنے پھیلائے اور نفس کی خاطر کیا کیا نہ کیا۔ آیت ۸۲ میں ان یہود اور مشرکین کو مسلمانوں کا شدید ترین دشمن کہا گیا ہے۔ البتہ وہ نصاریٰ جو مسلمان ہو گئے وہ یقیناً مسلمانوں سے محبت میں قریب ہیں۔

—اب ساتواں پارہ شروع ہوتا ہے —

اس میں پہلے اُن نیکو کاروں کا ذکر ہے جو ایمان لائے، پھر فرمایا ہے کہ جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں اُن کو اپنے اوپر حرام نہ کرلو اور نہ حد سے بڑھو۔ پھر قسم کھانے کا کفارہ بتایا ہے۔ شراب، جُوا، بُت اور پانسے کی ممانعت آئی ہے کہ یہ شیطان کے گندے کام ہیں اور آیت ۹۳ میں توبہ، ایمان عمل صالح تقوی اور حسنات کی منزلیں سمجھائی گئی ہیں۔ احرام کی حالت میں خشکی کا شکار کرنے کو منع فرمایا ہے تاکہ پوری طرح رجوع الی اللہ رہے۔ لیکن دریا کا شکار اور اُس کا کھانا اس حالت میں بھی جائز ہے آیت ۹۷ میں بھی (آیت ۲ کی طرح) احکام ہیں اور آیت ۱۰۳ میں جہالت کی رسموں سے منع فرمایا ہے کہ اب صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنا ہے۔ مرتے وقت وصیت کرنا بھی اسلامی طریقہ ہے۔ امانت کا ادا کرنا اور اللہ کے قانون کا پاس کرنا بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خصوصیت ہے۔ اب مسلمانوں کو یوم قیامت سے (آیت ۱۰۹) بھی ڈرایا جا رہا ہے جبکہ تمام پیغمبر جمع ہوں گے اور اُن سے اُن کی اُمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے دین میں غلط باتیں کیوں شامل کیں مثلاً نصاریٰ سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کو کیوں خدا ٹھہرایا۔ ایسے سوالات اسی لیے ہیں کہ ہم مسلمان صدق پر قائم رہیں اور اللہ ہم سے راضی رہے۔

سورۃ الانعام

اس سورۃ میں حلال و حرام کے متعلق خیالاتِ فاسدہ کی تردید کی گئی ہے جو مشرکین مکہ سے مخصوص تھے۔ گویا اُمتِ مسلمہ کو بتایا گیا ہے کہ غذا کا مقصد بقائے حیات ہے، نہ کہ بہیمیت کے اثرات پیدا کرنا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے صحیح توحید حاصل ہو سکتی ہے جس کا ذکر اس سورۃ کے شروع میں بھی ہے۔ اللہ پاک کی رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر بھی ہے کہ کتنی اُمتوں کو نوازا گیا تھا لیکن انہوں نے سرکشی کی اور ہلاک کیے گئے۔ اور "آپ فرما دیجیے کیا میں اس اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی کھلاتا ہے اور اُس کو کوئی نہیں کھلاتا (وہ کسی کا محتاج نہیں) اور آپ فرما دیجیے کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں خود فرماں بردار ہو جاؤں اور (مجھے یہ حکم ہے کہ) تم ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہونا" نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ پاک ہے۔ پھر نہایت بلیغ انداز میں فرمایا ہے کہ "آپ پوچھیے کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے؟ فرما دیجیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور (اُسی کی طرف سے) یہ قرآن مجھ پر اُتارا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تم کو اور اُن کو بھی جن کے پاس یہ پہنچے (یعنی تمام عالم کے پاس) ڈراؤں (اور)۔ کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہیں؟ — آپ فرما دیں کہ میں تو ایسی شہادت نہ دوں گا اور فرما دیں کہ وہی ایک معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں" (آیت ۱۹) اور "وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے (میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو) ایسا پہچانتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (مگر) جو اپنی جانوں کو خود خسارے میں ڈال چکے وہی ایمان نہیں لاتے۔" (آیت ۲۰) - یعنی اُن لوگوں کو سابقہ صحیفوں سے آپ کی تشریف آوری کی اطلاع مل چکی تھی لیکن وہ ہنوز انجان بنے ہوئے ہیں اور باتیں بناتے ہیں — پھر حضور انور صلی اللہ

علیہ وسلم جب تبلیغ فرماتے تو وہ لوگ بظاہر کان لگائے رہتے لیکن وہ بالکل سمجھنے کی کوشش نہ کرتے اور دوسروں کو بھی قرآن سے روکتے۔ "اور (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر دیکھیں کہ جب یہ لوگ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم پھر (دنیا میں) واپس بھیج دیے جائیں تو ہم اپنے پروردگار کی نشانیاں (اب کبھی) نہ جھٹلائیں گے اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں گے" (آیت ۲۷)۔ پھر کافروں کے خسارے کا ذکر ہے جو اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اس دنیوی زندگی کو جو صرف لعب و لہو ہے اپنائے ہوئے ہیں" (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان (کافروں) کی وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے رہتے ہیں تو (اے پیارے رسولؐ) وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں (نشانیوں) ہی کا انکار کرتے ہیں"۔ (آیت ۳۲) ۔ پھر آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں۔ وہ لوگ تو کیا کیا مطالبے کریں گے لیکن ایمان نہیں لائیں گے" آپ (ان منکرین سے) فرمایئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ٹوٹ پڑے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو"(آیت ۴۰) یعنی مصیبت کے وقت منکرین کو بھی خدا یاد آتا ہے اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو خدا کو پھر بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض انہیں ایسی سخت دل بھی ہوئی ہیں کہ اُن پر مصیبتیں آئیں تب بھی وہ اللہ کے آگے نہ جھکے اور " پھر جب وہ اُس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی فراموش کر بیٹھے تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے (ڈھیل دے دی) یہاں تک کہ جب وہ اس پر جو انہیں ملا، اترانے لگے تو ہم نے اُن کو اچانک پکڑ لیا تو وہ ناامید ہو کر رہ گئے" (آیت ۴۴) پھر ان ظالموں کی جڑ ہی کاٹ دی گئی۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشادِ باری ہے کہ اگر اللہ پاک ان ظالموں کے کان آنکھ چھین لے اور دلوں پر مُہر لگا دے (یعنی سمجھ بھی ختم کر دے) تو پھر سوائے اللہ کے کون ہے جو ان صلاحیتوں کو واپس لا سکے؟۔

آیت ۵۰ میں ہے کہ" آپ فرما دیجیے کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی بات جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کیا جاتا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھ والا برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟"۔

پھر اُن غریب مسلمانوں کا ذکر ہے جو اللہ کی بات سنتے ہیں۔ اللہ کے یہاں انسان کی قدر اُس کے ایمان اور عمل سے ہے، دولت و ثروت سے نہیں۔" اور (اے رسولؐ) جب آپ کے پاس ہماری آیتوں کے ماننے والے آئیں تو فرما دیجیے کہ تم پر سلام ہو، تمہارے رب نے اپنے آپ پر (تمہارے لیے) رحمت لازم کر رکھی ہے کہ جو کوئی تم میں سے لاعلمی کی بنا پر کوئی بُرائی کر بیٹھے پھر توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے تو بے شک وہ (اللہ) بڑا بخشنے والا مہربان ہے" (آیت ۵۴)۔

پھر فرمایا ہے کہ" آپ فرما دیجیے کہ اگر میرے پاس وہ (عذاب) ہوتا جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو میرے تمہارے درمیان جھگڑا ہی طے ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔ (آیت ۵۸) کفار کہتے تھے کہ اگر نافرمانی کی وجہ سے عذاب ہو گا تو ابھی کیوں نہیں ہوتا؟۔ اس کا جواب اِس آیت میں تھا۔

اور اللہ پاک ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اور وہ خشکی اور تری کی ہر چیز کو اور ہر جگہ کی ہر بات کو جانتا ہے اور اسے علم کامل کے ساتھ قدرت کاملہ بھی حاصل ہے۔" اور وہی ہے جو تمہیں رات کو مار دیتا ہے (نیند طاری کر دیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے

ہو اُس کو جانتا ہے۔ پھر تم جو (اعمال یہاں) کرتے رہے تم معینہ وقت (عمر) کو پورا کرو، پھر تم کو اُسی کی طرف واپس جانا ہے۔ پھر تم جو اعمال یہاں) کرتے رہے تم کو اُس سے باخبر کر دے گا۔" (آیت ۶۰) — اللہ اپنے بندوں پر قادر ہے اور اُن کے لیے اپنے نگران کار (محافظ) بھی بھیجتا ہے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ جنگل اور سمندر کے اندھیروں سے تم کو کون نجات دیتا ہے۔ تم اُس کو گڑگڑا کر اور خاموشی سے پکارتے ہو کہ اگر وہ ہم کو اس مصیبت سے بچا لے تو ہم ضرور اُس کے شکر گذار ہو جائیں گے۔" (آیت ۶۳) "آپ فرما دیں کہ وہ اس (بات) پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے، تمھارے اوپر سے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے (زمین کے اندر سے) یا تم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے آپس میں لڑا دے اور تم کو ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ (اب بھی) سمجھ جائیں۔" (آیت ۶۵) — دین کو جن لوگوں نے لعب و لہو بنا رکھا ہے اُن سے کنارہ کشی کا حکم بھی آتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع نہ کی جائے کہ وہ خود گمراہ ہو کر بتوں کے سامنے سر رکھیں گے جو خود ہی اپنے نفع اور نقصان کے مالک نہیں۔ اب ابراہیم علیہ السلام کی شان بتائی گئی ہے کہ اللہ کے لیے اپنے بابا کو چھوڑا، ستارے، چاند اور سورج کی روشنی سے مرعوب نہ ہوئے (اللہ کے لیے نمرود کی آگ میں کود پڑے۔ پھر بیوی اور شیر خوار بچے کو ایسی وادی میں چھوڑا جہاں نہ آبادی تھی اور نہ کھانا پانی تھا۔ اللہ کے لیے صاحبزادے کو بھی ذبح کرنے کے لیے لٹایا اور اللہ کے لیے اپنا سب کچھ لٹایا) — ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام اور اُن کے بعد اور پہلے بکثرت پیغمبروں نے دین کی تبلیغ کی لیکن دین کی توفیق اُنہی کو حاصل ہوئی جن کو اللہ پاک نے چاہا۔" یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی پس تم بھی اُن کے طریقے پر چلو اور اے (میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ میں اس (تبلیغ) پر تم سے کچھ معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ (قرآن) تو محض سارے جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پہلے بھی وحی آتی تھی اور یہ خیال کرنا کہ قرآن، اللہ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے بلکہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، اللہ پر بہتان ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ ایسے خیال رکھنے والوں پر جو سخت عذاب ہوگا اُس کا ذکر آیت ۹۴ میں ہے۔

اللہ پاک اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیوں کی طرف متوجہ فرماتا ہے کہ :- نباتات، جمادات، حیوانات، سورج، چاند، تارے، بارش، مختلف درختوں کے مختلف رنگ اور مختلف ذائقے وغیرہ سب کو دیکھ کر اللہ کو پہچانا جا سکتا ہے کہ سوائے اُس کے ان کو کوئی بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن لوگ پھر بھی شرک کرتے ہیں تو اس میں بھی اللہ کی مشیئت ہے۔" اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک ہی نہ کرتے اور ہم نے آپ کو اُن پر محافظ نہیں بنایا اور نہ آپ اُن کے ذمہ دار ہیں۔" (آیت ۱۰۸) — پھر مسلمانوں کو منکرین کی باتوں پر صبر کرنے کے لیے حکم ہے اور یہ کہ وہ لوگ اگر غیر خدا کو پکارتے ہیں تو پکارنے دو، تم اُن کو بُرا نہ کہو ورنہ وہ از راہ عداوت اپنی نادانی سے اللہ کو بُرا کہنے لگیں گے۔

— اب آٹھواں پارہ شروع ہوتا ہے —

اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ہم اُن پر (آسمان سے) فرشتے اُتار دیں اور اُن سے مُردے (قبر سے اُٹھ کر) باتیں کریں

اور ہم اُن کے آمنے سامنے ہر چیز جمع کر دیں، تب بھی یہ لوگ سوائے اس کے کہ اللہ ہی چاہے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں اور ان میں سے اکثر جاہل ہیں" (اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں) ۔ (آیت ۱۱۱) ۔ پھر مختلف انبیاء علیہم السلام کے نافرمان لوگوں کا ذکر ہے کہ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، آپ غمگین نہ ہوں ۔ پھر کافروں کا ذکر ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا چاہتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ مسلمان اللہ کا نام لے کر جانوروں کو ذبح کرتے ہیں تو گویا خود کا مارا ہوا کھاتے ہیں اور جو جانور خود بخود مر جائے یعنی جس کو اللہ مارے اُسے یہ نہیں کھاتے ۔ اس قسم کے وسوسے اللہ پاک نے دور فرما دیے ہیں اور صاف فرما دیا کہ "جس جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُس کو تم ہرگز نہ کھاؤ کہ اس کا کھانا فسق ہے اور شیاطین (تو) اپنے ساتھیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے اُن کا کہنا مانا (جیسا کہ وہ چاہتے ہیں) تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے" (آیت ۱۲۲)

شیاطین لاکھ بہکائیں، مومن کا دل جب نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں وہ صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹ سکتا ۔ لیکن جو لوگ شیاطین کے فریب میں آ جاتے ہیں وہ حشر کے دن جمع کیے جائیں گے اور وہ حیلے بہانے کرنے کے باوجود جہنم میں ٹھکانے لگائے جائیں گے ۔

اب جنوں اور انسانوں کی جماعتوں سے اُس سوال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن اُن سے کیا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں پہنچے ؟ وہ اقرار کریں گے کہ ہاں پہنچے تھے ۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو تم اپنی جگہ کام کرتے رہو ۔ میں (اپنا) کام کیے جاتا ہوں ۔ سو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کو ملتا ہے (عاقبت کس کی درست ہوتی ہے) ۔ یقیناً ظالموں کا بھلا نہ ہو گا ۔" (آیت ۱۳۶) ۔ پھر مشرکانہ عادات اور اطوار کا ذکر ہے جن کی اصلاح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اور اللہ پاک کے احسانات اور انعامات کا ذکر ہے ۔ حلال و حرام کی تمیز صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہو سکتی ہے اور یہود کے لئے جو چیزیں حرام کی گئی تھیں اُن کا بھی ذکر ہے ۔ اور "عنقریب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کوئی چیز (خود ہی) اپنے اوپر حرام کر لیتے ۔ اسی طرح ان سے قبل کے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا ۔ آپ اُن سے کہیے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اُس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو (حقیقت یہ ہے کہ) تم محض وہم و گمان پر چلتے ہو اور صرف اپنے اندازوں پر کام کرتے ہو ۔" (آیت ۱۴۹) ۔ "آپ فرما دیجیے کہ کامل دلیل (اور سند) تو اللہ ہی کے لیے ہے (اللہ کی حجت کامل ہے) پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کی ہدایت کر دیتا ۔" (آیت ۱۵۰)

مشرکین نے جن چیزوں کو حلال و حرام ٹھہرایا تھا اُس کی تردید کی گئی ۔ اس کے بعد بتایا جا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھو کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے ۔ اور ایمان حاصل ہو جائے تو اللہ کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت اولاد کی پرورش، یتیم کا خیال، ناپ تول میں انصاف وغیرہ پر زور دیا گیا ہے ۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی وہ سب کی سب ایک ہی وقت میں دی گئی تھی لیکن قرآن "بتدریجاً" نازل ہو رہا ہے تاکہ ہر زمانے کے ہر شعبۂ حیات پر محیط ہو سکے اور تعلیم محدود نہ رہے ۔

اس کتاب (قرآن) کے آ جانے کے بعد اب کس چیز کے لوگ منتظر ہیں؟ کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا آپؐ کا رب خود آئے یا آپؐ کے رب کی کوئی نشانی آئے؟ (لیکن) جس دن آپ کے رب کی کوئی نشانی آ جائے گی تو (اس وقت) کسی (ایسے) شخص کا ایمان لانا اُس کے کام نہ آئے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا یا ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہ کر لی تھی۔ آپ فرما دیجیے کہ تم (بھی ان آثار کی) راہ دیکھو اور ہم بھی (اللہ کے حکم کا) انتظار کرتے ہیں۔" (آیت ۱۵۹)۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے (رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ سے) ایک انعام یہ بھی ہے کہ "جو شخص ایک نیکی لاتا ہے تو اُس کے لیے اس کا دس گنا (ثواب) ہے اور جو کوئی ایک بُرائی لاتا ہے تو اُسی کے برابر سزا پاتے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا"۔ (آیت ۱۶۱) یعنی بُرائی کی سزا دس گنا نہیں ہے لیکن نیکی کی جزا دس گنا ہے۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو "ملت ابراہیمی" (سراپا تسلیم و رضا) کہا گیا ہے اور "آپؐ فرما دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں" (آیت ۱۶۳-۱۶۴) یعنی انبیاء علیہم السلام میں بھی اولیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ (اور امر پر چلنے والا ہی اللہ کا نائب ہو سکتا ہے)۔

سورۃ الاعراف

یہ سورۃ مکی ہے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری بڑھ چکی تھی اور کفار نے حد سے زیادہ مظالم روا رکھے تھے اُس وقت اس سورۃ میں تبلیغی جدوجہد پر زور دیا گیا تھا۔ حروف مقطعات "آلمّٓصٓ" کے معنی اللہ کو اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو معلوم ہیں لیکن اس کے بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اس لیے اور حروف مقطعات کی طرح یہاں بھی یہ حروف حضورؐ ہی کے پیارے ناموں میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ آپؐ کو تسلی دی ہے کہ آپ کفار کی شدید مخالفت کی وجہ سے غمگین نہ ہوں اور مسلمانوں کے لیے ارشاد ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہ کریں۔ قیامت کے دن اُن لوگوں سے جو کافر ہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے رسولوں کی ہدایت پر کہاں تک عمل کیا اور رسولوں سے بھی سوال ہوگا کہ اُن کی اُمتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا۔ اُس روز اعمال تولے جائیں گے۔ اللہ پاک نے انسان پر اپنے احسانات کا ذکر کیا ہے کہ اُسے دنیا میں معیشت کے لیے قرار و قیام عطا کیا۔ لیکن اس انسان میں شکر قلیل ہے۔ پھر انسان کی پیدائش، فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا، ابلیس کا انکار اور اس کا انجام مذکور ہے۔ ابلیس نے تکبر سے کہا کہ "چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں بھی تیرے صراطِ مستقیم پر اُن کی تاک میں بیٹھوں گا"۔ (آیت ۱۶)۔ ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو حکم ہوا کہ جنت میں ٹھہرے رہیں لیکن اُس درخت کے قریب نہ جانا۔ لیکن وہ دونوں شیطان کے فریب میں آ گئے۔ "دونوں التجا کرنے لگے کہ ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم بڑے خسارے میں پڑ جائیں گے"۔ (آیت ۲۳)

پھر بنی آدم سے خطاب ہے کہ تمہارا سب سے بہتر لباس تقویٰ ہے اور شیطان کے فریب میں نہ آنا۔ اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) "آپ فرما دیجیے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور (اے مسلمانو) ہر نماز کے وقت اپنی توجہ اُس کی طرف کر لیا کرو اور اُس کے خاص فرمان بردار ہو کر اُس کو پکارو، جیسا تم کو پہلے پیدا کیا دوبارہ بھی پیدا ہو گے"۔ (آیت ۲۹)۔ کفار کی رسم تھی کہ وہ طواف کعبہ

کے وقت کپڑے اتار دیتے تھے مسلمانوں کو اس رسم سے منع فرمایا اور کافروں کے اُس طریقے کو بھی منع فرمایا کہ وہ لوگ بعض چیزیں کھانا چھوڑ دیتے تھے۔" آپؐ فرما دیجیے کہ میرے رب نے تو حرام کر دیا ہے بے حیائی کی باتوں کو، ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو۔ اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اُس نے کوئی سند نہیں اُتاری اور اس بات کو بھی کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تم کو علم تک نہیں" (آیت ۳۳)۔ پھر جن لوگوں نے اللہ پاک کی آیتوں کو جھٹلایا ہے اُن کے انجام کا ذکر ہے کہ جب فرشتے اُن کی جان لینے آئیں گے اور پوچھیں گے کہ اللہ کے علاوہ جن کو تم پکارتے تھے وہ کہاں ہیں؟ وہ کہیں گے کہ وہ ہمیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ پھر اسی طرح اُنھیں نافرمانی کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گی۔

اس کے بعد تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے رہے اور دوزخ کے مستحق قرار پائے، دوسرے وہ جو اللہ سے ڈرتے رہے اور نیک عمل کی وجہ سے جنت کے مستحق ٹھہرے اور تیسرے وہ جو اہلِ ایمان تو ہوں گے لیکن ان کے نیک اور بدعمل بالکل مساوی ہیں۔ ایسے لوگ جنتیوں کو اُن کے نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو اُن کی سیاہی سے پہچانیں گے اور اُن کو دیکھ کر اللہ سے پناہ مانگیں گے۔

اب تخلیقِ کائنات خلق و امر کا ذکر ہے تاکہ انسان اپنے رب کو یاد کرے اور دنیا میں شر اور فساد نہ پھیلائے۔" اور جو بستی پاکیزہ ہے وہاں اس کے رب کے حکم سے (خوب) سبزہ نکلتا ہے اور جو خراب ہے اُس میں (سبزہ) کم تر (ناقص) ہی نکلتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی آیتوں کو مختلف طور پر بیان کرتے ہیں اُن کے لیے جو شکر گذار ہیں۔" (آیت ۵۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح دلوں کی بستی کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں اور جو لوگ اُن سے مستفیض نہیں ہوتے وہ ناقص رہ جاتے ہیں۔

نوح علیہ السلام نے بھی اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ آپ ہی بہکے ہوئے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے نافرمانوں کو غرق کر دیا۔ وہ لوگ "اندھے" تھے۔ پھر ہود علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو اُن کو کم عقل اور غلط بیان قرار دیا گیا۔ بالآخر ایسے لوگوں پر بھی عذاب آیا۔ پھر صالح علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر ہے کہ انھوں نے قوم ثمود کو اللہ کی بندگی سکھائی لیکن انھیں بھی جھٹلایا گیا اور جھٹلانے والوں پر زلزلہ آیا اور نافرمان لوگ تباہ ہوئے، پھر شام کی چند بستیوں میں لوط علیہ السلام نے اصلاح چاہی لیکن اُن کی بھی نافرمانی کی گئی اور وہ لوگ پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئے۔ بحرِ احمر کے کنارے عرب میں مدین ایک بستی تھی جہاں شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ انہوں نے توحید اور اصلاحِ معاشرہ، نیز حقوق العباد پر زور دیا۔

اب نواں پارہ شروع ہوتا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم کے سرداروں نے شہر سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ آسمان سے آگ برسی، بادلوں سے ہولناک آوازیں آئیں اور لوگ اس طرح زلزلے سے تباہ ہوئے "گویا کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے۔" پھر فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے کسی قوم کی پکڑ اس وقت تک نہیں کی جب تک کہ کسی نبی کو بھیج کر اُن کی اصلاح نہ کرائی ہو یعنی جب لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی تب اُن پر عذاب آیا، اب مسلسل متعدد آیتوں میں موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور فرعون کا ذکر تفصیل سے کیا جا رہا ہے تاکہ انسان کو عبرت حاصل ہو۔ اور آگے چل کر یہ بھی ہے کہ جب فرعون ہلاک ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک سے توریت مانگی۔

چالیس راتوں کا اعتکاف بھی کیا اور اللہ کے جلوے کے مشتاق ہوئے۔ لیکن جواب ملا کہ "تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔" پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ (لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کے قریب اس قدر تھے کہ "فکان قاب قوسین او ادنیٰ"۔ پھر بھی اُن کے درجات اتنے بلند تھے کہ "مازاغ البصر وما طغیٰ") ـــ موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملی اور تبلیغ فرمائی گئی۔ لیکن نافرمان لوگ کب سنتے ہیں؟ جب موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور ہارون علیہ السلام اُن کے جانشین ہوئے تو اُن کی قوم نے بچھڑا بنا کر اُس کی پوجا شروع کر دی۔ موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اللہ پاک نے اس واقعے سے باخبر کر دیا تھا تو وہ غصے میں اپنی قوم کی طرف آئے اور بھائی کے بال پکڑ کر گھسیٹنے لگے اور ناراض ہوئے، قوم عذاب میں گرفتار ہوئی سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی۔ اس کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو توبہ اور اعتکاف کے لئے کوہ طور پر لے گئے لیکن ان لوگوں نے وہاں بھی نافرمانی کی تو زلزلے نے اُن کو گھیر لیا۔ اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ذکر آتا ہے کہ "وہ لوگ جو رسول امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں جس (کے ذکرِ مبارک) کو وہ اپنے یہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان (پیروکاروں) کو نیک کام کا حکم فرماتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور سب پاک چیزیں اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور اُن پر سے اُن کے بوجھ اور وہ طوق و قیود اجو اُن پر (اُن کی نافرمانیوں کے باعث) لگائے گئے تھے اُتار دیتے ہیں۔ پس جو لوگ ان پر ایمان لائے اور اُن کی تعظیم کی اور اُن کی مدد کی اور اس نور (قرآن و حدیث) کی پیروی کی جو اُن پر نازل ہوا تھا یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح کو پہنچے۔" (آیت ۱۵۷)۔ پھر ارشاد ہے کہ "آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔ (وہ اللہ) جس کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس اللہ پر اور اُس کے رسولِ اُمی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اُس کے کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور تم اُن کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" (آیت ۱۵۸)۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر پھر اللہ پاک نے نوازش فرمائی مگر گرم علاقے میں بارہ چشمے پانی کے دیئے اور من و سلویٰ دیا لیکن بجائے مغفرت چاہنے اور سجدہ کرنے کے، ان لوگوں نے اللہ کے حکم میں من مانی تبدیلی کر لی۔ تو اُن پر عذاب نازل ہوا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ان یہود کی نافرمانی، حق پوشی، افترا پردازی، حیلہ سازی، گستاخی وغیرہ عیوب سنائے جا رہے ہیں تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور راہ سے نہ بھٹکیں۔ اُن یہود کا قصہ بھی آتا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ یہود کی گذشتہ قوموں میں کچھ لوگ صالح بھی تھے لیکن اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے جنھوں نے توریت کے احکام بھی دنیا کی خاطر بدل ڈالے اور رذیل ہوئے۔

"(اور اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کو وہ واقعہ یاد دلائیے) جب آپؐ کے رب نے بنی آدم کی پشت در پشت اولاد کو نکالا اور خود اُن سے اُن کے نفسوں پر گواہی دلوائی۔ (فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (سب نے) کہا۔ کیوں نہیں؟۔ ہم اقرار کرتے ہیں (یہ عہد اس لیے تھا) کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی" (آیت ۱۷۲)

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ ایک شخص جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں لیکن وہ نافرمان ہو گیا اور وہ اپنی خواہشات کا پیرو بن گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک کُتا۔ جس پر بوجھ لادا جائے تو ہانپتا ہے اور نہ بھی لادا جائے تب بھی ہانپتا ہے یعنی اس پر کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے ہی لوگ وہ ہیں جن کے پاس دل ہے لیکن اُسے سوچنے کے لیے استعمال نہیں کرتے، آنکھیں ہیں لیکن

دیکھتے نہیں اور کان بھی ہیں لیکن سنتے نہیں ۔ یہی لوگ جانوروں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر ہیں ۔" اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ (پیارے پیارے نام) ہیں تو اُس کو اُنھی (ناموں) سے پکارو اور جو لوگ اُس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں اُن کو چھوڑ دو ۔ وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پائیں گے ۔ اور ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے (صحابہ کرام رضؓ اور ان کے متبعین کی) جو راہِ حق بتاتی ہے اور اسی کے موافق فیصلہ کرتی ہے ۔" (آیت ۱۸۰-۱۸۱) ۔

پھر جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے اُن کے لیے ارشاد ہے کہ " ان کو ہم آہستہ آہستہ ایسی جگہ سے پکڑیں گے کہ اُن کو خبر تک نہ ہوگی ۔" " کیا یہ لوگ اتنا غور نہیں کرتے کہ اُن کے صاحب (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم) کو ذرا بھی جنون نہیں ۔ وہ تو صرف کھلے طور پر ڈرانے والے ہیں ۔" (آیت ۱۸۴) ۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت پر وہ لوگ غور کریں تب بھی اللہ کو پہچان سکتے ہیں ۔ وہ تو قیامت کے وقوع کے متعلق سوال کرتے ہیں جس کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ پھر انسان کی تخلیق کا ذکر ہے کہ میاں بیوی دونوں دعا کرنے لگتے ہیں کہ ہم کو صحیح سالم بچہ دے اور جب ایسا بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر دینے والے اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں اور ایسوں کو خدا بنا لیتے ہیں جو محض محض ہیں اور جو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے اور ان بُت پرستوں کو دین کی طرف بلایا بھی جاتا ہے تو وہ بات نہیں سنتے ۔" (اسے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ درگذر سے کام لیجیے اور نیک کام کے لیے حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کش رہیے ۔" (آیت ۱۹۹) ۔ پھر قرآن کے سننے اور خاموش رہنے کا حکم ہے اور اپنے پروردگار سے غافل نہ رہو ۔

سورۃ الانفال

غزوۂ بدر میں پہلی بار مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی تو کثرت سے مال ہاتھ آیا ۔ اس سورۃ میں یہی سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مومنین نے اپنی جان و مال اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے سپرد کر دیا تھا اسی طرح وہ مالِ غنیمت بھی اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے سپرد کر دیں ۔ اور مومن وہ ہیں :- " ایمان والے تو صرف وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں ۔" (آیت ۲) ۔ اور " جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں ۔" (آیت ۳) " اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تم سے دو جماعتوں (ابوسفیان اور ابوجہل کی) میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمھارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ غیر مسلح جماعت تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ (مسلمان) حق کو حق کر دکھائے اپنے حکم سے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے ۔" (آیت ۷) ۔ غزوۂ بدر میں اللہ پاک نے ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ " فتح اللہ ہی کی طرف سے ہے ۔ بے شک اللہ بڑا زور آور حکمت والا ہے " (آیت ۱۰) ۔ پھر ریتلے میدان میں (بدر میں) اللہ پاک نے ایسی بارش کی کہ پانی بھی مسلمانوں کو ملا ، چلنے میں بھی آسانی ہو گئی اور کفار دلدل میں پھنس گئے ۔ پھر حکم ہے کہ میدانِ جنگ میں کافروں سے پیٹھ مت پھیرو (کہ یہ ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا) ۔

" پس (اسے مسلمانو ، جنگِ بدر میں) تم نے انھیں نہیں مارا بلکہ اللہ نے انھیں مارا اور (اے رسولؐ) جب آپؐ نے (مٹھی بھر

خاک دشمن پر اچھینکی تھی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ اور تاکہ ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان فرمائے۔ بیشک اللہ بڑا سُننے والا، خوب جاننے والا ہے" (آیت ۱۷)۔ اس کے بعد پھر مومنوں سے خطاب ہے کہ وہ اللہ پاک اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور اُن کے احکام سُن کر روگردانی نہ کریں۔ مسلمانوں کو اُس وقت سے بھی آگاہ کرایا ہے۔ جو فتنہ و فساد کی حالت میں اچھے بُرے سب پر آجاتا ہے اور اُن کو وہ وقت بھی یاد دلایا جارہا ہے جب کہ وہ مکہ میں کمزور تھے اور مدینہ میں خوشحال ہوئے۔ پس شکر گذاری یہ ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق ادا کرو (دین کو پھیلاؤ) اور جان لو کہ تمھارا مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہیں یعنی ان دونوں کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کردو۔ اور اگر تم اللہ سے ڈرتے رہوگے تو حق و باطل میں صحیح تمیز نصیب ہوگی اور تم سے تمھارے گناہ دور ہوں گے۔ (آیات ۲۵ تا ۲۹ ملخصاً)

"اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب کافر آپ کے متعلق تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو قید کردیں یا قتل کردیں یا (وطن سے) نکال دیں اور وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ پاک اپنی تدبیر۔ اور اللہ کی تدبیر سب سے بہتر ہے" (آیت ۳۰)۔

جب ان کفار کو اللہ کی آیتیں سُنائی جاتی ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہ دین اللہ کی طرف سے ہے تو نافرمانی کی وجہ سے ہم پر پتھر کیوں نہیں برسائے جاتے اور عذاب کیوں نہیں آتا؟" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ ایسا نہیں کہ جب تک آپ ان میں موجود ہیں اللہ اُن پر عذاب کرے اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ انھیں وہ عذاب دے جبکہ وہ بخشش کے طلب گار ہوں"۔ (آیت ۳۳) یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے اور استغفار کرنے سے عذاب نہیں آسکتا۔ اسلام سے پہلے کافروں کی نماز کیا تھی؟ خانۂ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانا (آیت ۳۵)۔ وہ کفار اس لیے بھی خرچ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو لالچ میں ڈال کر اللہ کی راہ سے روک لیں (آیت ۳۶) لیکن ایسے لوگوں (کفار) کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ البتہ وہ اگر دین کی مخالفت سے باز آجائیں تو وہ معاف کردیے جائیں گے۔ اور اگر وہ لوگ پھر وہی کریں تو اُن سے مسلمان لڑیں یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور سب اللہ ہی کا دین ہو جائے اور اللہ ہی مسلمانوں کا کارساز اور مددگار ہے۔

اب دسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسولؐ کے قرابت داروں کے لیے اور یتیموں اور محتاجوں کے لیے ہے۔ جنگ بدر میں کفار کی کثیر تعداد، قلیل تعداد میں مسلمانوں کو دکھائی گئی اور مسلمان آسانی سے غالب ہوئے یہ اللہ پاک کا خاص فضل تھا۔ اور جب کبھی کفار سے مقابلہ ہو تو مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور اللہ کو یاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے "اور اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تمھاری ہمت ٹوٹ جائے گی اور تمھارا رعب جاتا رہے گا۔ اور صبر سے کام لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (آیت ۴۶)۔ منافقوں کو حیرت تھی کہ اتنی بے سروسامانی کے باوجود مسلمان کس طرح کامیاب ہوئے اور "جب منافقین اور وہ جن کے دل میں بیماری ہے کہہ رہے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو اپنے دین پر بڑا غرور ہے اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو کوئی اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے" (آیت ۴۹)۔ جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں تو اُن کے منہ اور اُن کی پشت پر مارتے جاتے ہیں اور

(کہتے ہیں کہ) آگ کا مزہ چکھو" (آیت ۵۰)۔

فرعون (اور اُس سے قبل) کے لوگوں نے بھی اللہ کی آیتوں سے انکار کیا اور اُن کی پکڑ بھی اسی طرح ہوئی اور" اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کو ایک نعمت دے کر اُس نعمت کو نہیں بدلتا (اس سے محروم نہیں کرتا) جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدل نہ ڈالے اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے" (آیت ۵۳) "بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں، پھر وہ ایمان نہیں لاتے" (آیت ۵۵) ۔ پھر اللہ پاک نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ عہد شکن لوگوں سے جنگ میں مقابلہ ہو تو اُن کو ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پشت پناہ ہیں وہ بھی عبرت حاصل کریں۔ پھر مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے تاکہ دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے اور صلح ہو یا جنگ ہو، ہمیشہ اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے اور (اے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ (دغاباز) آپ کو دھوکا دیں تو آپ کے لیے اللہ کافی ہے ۔ اُسی نے اپنی مدد سے اور ایمان والوں کے ذریعے آپ کی تائید کی ہے"۔ (آیت ۶۲)۔ اور اُسی نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کر دی ۔ پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے کہ" اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کو جنگ کے لیے ترغیب دلائیے (کہ) اگر تم میں بیس (مسلمان) ثابت قدم ہیں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سو (ثابت قدم) ہیں تو وہ ہزار کافروں پر غالب ہوں گے ۔ اس لیے کہ وہ (اہلِ کفر) سمجھ نہیں رکھتے" مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش تھی کہ اتنی بڑی تعداد کا مقابلہ کرنا تھا ۔ پھر اللہ پاک نے آسانی کر دی اور فرمایا کہ" اب اللہ نے تم پر بوجھ ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ (ابھی) تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سو شخص ثابت قدم ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے (وہ چاہے تو دس ہزار پر بھی فتح دے گا)۔

بدر میں ستر کافر قیدی ہوئے ۔ حکم ہوا کہ" نبیؐ کے شایانِ شان نہیں کہ اُس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) وہ زمین پر خون نہ بہا دے (جس سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ جائے) تم لوگ دنیا کا مال و متاع اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت (کی نعمتیں) چاہتا ہے اور اللہ زور آور حکمت والا ہے" (آیت ۶۷)۔ کفار کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا اس لیے فدیہ لینا قبل از وقت تھا" اگر اللہ ایک بات پہلے سے لکھ نہ چکا ہوتا تو اس (فدیہ) لینے پر تم کو بڑی تکلیف پہنچتی" (آیت ۶۸) " اس لیے جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا ہے وہ کھاؤ حلال اور پاک اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے" (آیت ۶۹)۔ پھر مہاجرین اور انصار کی محبت اور اُن کی مدد کا ذکر ہے ۔ ان کو باہم بھائی بنایا اور ان کا مال ایک دوسرے کے لیے اللہ نے جائز فرما دیا ۔

سورۃ التوبہ

سورۃ الانفال کے بعد سورۃ التوبہ ایک ضمیمہ کی طرح ہے جس میں جنگ کے واقعات، منافقوں کی دغابازیاں، صحابہؓ کی جاں نثاریاں اور اسلام کی فتوحات کا ذکر ہے ۔ مکہ کے قریش نے مسلمانوں سے بدعہدی کی تو اللہ نے مسلمانوں کو بری الذمہ کر دیا کہ" (مسلمانو) جن مشرکین سے تم نے (صلح) معاہدہ کیا تھا۔ اب اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ان کے لیے صاف جواب ہے" (آیت ۱)۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی اعلان کرا دیا کہ کفار پر اچانک حملہ نہیں کیا جائے گا۔ چار ماہ کی مہلت ہے کہ کفار اپنی بدعہدی اور اللہ کی نافرمانیوں سے باز آجائیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجز نہیں کر سکتے " پھر جب حرمت کے مہینے (جن میں جنگ کی ممانعت کردی گئی ہے) گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان کو پکڑ و اور ان کو گھیر دو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں تو ان کا راستہ نہ روکو (آزادی سے رہنے دو)۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۵) " اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اس کی امن کی جگہ بھیج دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ بے علم قوم ہیں۔" (آیت ۶) — پھر واضح فرمایا ہے کہ مومن کا مشرک سے معاہدہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ آیت ۸ تا ۱۳ میں مشرکوں کے قول و قرار کا راز فاش کیا جا رہا ہے کہ خوفِ خدا کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

پھر مشرکوں نے کہا کہ ہم تو اچھے کام کرتے ہیں کہ حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کو بناتے اور آباد رکھنے والے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ وہ پہلے مسلمان تو ہو جائیں، پھر مسجدوں کو آباد کریں گے۔ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو بنانا تو دنیا کے فائدے کے لئے ان کا فعل ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ " جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے رہے، اللہ کے یہاں ان کے درجے بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔" (آیت ۲۰) پھر باپ بیٹے اور عزیزوں، مال و دولت، مکانوں وغیرہ کی تحقیر فرمائی ہے کہ یہ چیزیں اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر اللہ کے عذاب کے منتظر رہو۔ بدر کے بعد حنین کی جنگ ہیں (جب کہ مسلمان اپنی کثرت پر نازاں تھے اور فرار ہونے لگے) اللہ پاک نے غیب سے مدد فرما کر فتح عنایت فرمائی اور بہت زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ فتح مکہ (۹ ہجری) کے بعد اعلان ہو گیا کہ مشرک نجس ہیں (یعنی نہا دھو کر صاف کپڑے پہننے سے پاک نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایمان سے دل پاک نہ ہوں) اور انھیں مسجد حرام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ اس کے بعد اہلِ کتاب سے بھی جنگ کرنے کا حکم ہو گیا۔ اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں جانتے اور نہ سچا دین قبول کرتے ہیں ان سے بھی (اور مشرکین سے بھی) جزیہ لینے کا حکم آگیا۔

یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا اور وہ اسلام کے چراغ کو بھی بجھانا چاہتے ہیں لیکن۔ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دین اسلام کے پھیلنے کا مکمل انتظام ہو چکا ہے کہ " وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو کتنا ہی شاق گزرے۔" (آیت ۳۳)۔ (یہ ٹکڑا دوبارہ آیا ہے۔ پہلے تو مشرکین کی ناکامی پر اور اب اسلام کے فروغ کے سلسلے میں)۔ اہلِ کتاب کے عالموں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں، تو ایسے لوگوں پر سخت عذاب ہو گا اور سونے چاندی کے جمع کرنے والوں کو (جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) مزہ چکھایا جائے گا۔ اور حکم ہے کہ :۔

" بے شک اللہ کے یہاں جس دن سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا (اسی دن سے) اللہ کے نوشتے میں مہینوں کی گنتی

بارہ ہے۔ ان میں چار مہینے (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) لائقِ احترام ہیں۔ یہی دین مستقیم ہے تو تم ان (مہینوں) میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور تم (بھی) مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ لوگ تم سے اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔" (آیت ۳۶)۔

مسلمانوں کو پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے کہ "اگر تم ان کی (یعنی اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی) مدد نہ کرو گے تو (ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، دیکھو) اللہ نے ان کی اس وقت مدد فرمائی جبکہ ان کو کافروں نے (مکہ سے) نکالا تھا۔ جب کہ (رسولؐ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ) دُو میں سے دوسرے تھے۔ جب دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اُن پر تسکین نازل فرمائی اور اُن کی مدد ایسی فوجوں سے کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ نے کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ ہی کی بات اُونچی ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" (آیت ۴۰)

پھر منافقوں کا ذکر ہے کہ وہ جہاد سے کس طرح جی چُراتے ہیں "(جنگ میں شریک نہ ہونے کی) اجازت تو وہ لوگ طلب کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل میں شکوک ہوتے ہیں۔ پس وہ اپنے شک ہی میں سرگرداں ہیں" (آیت ۴۵) مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو منافق خوشیاں مناتے ہیں" آپ فرما دیجیے کہ ہم کو ہرگز کچھ نہ پہنچے گا مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں" (آیت ۵۱) پھر منافقوں کی مختلف خصوصیات بتائی گئی ہیں لیکن مسلمانوں کو تو اللہ ہی کی طرف رغبت ہے۔

چونکہ منکرین نے صدقات وخیرات سے متعلق زبان درازی کر رکھی تھی اس لیے اب ارشاد ہے کہ "بے شک صدقات (زکوٰۃ) تو صرف فقرا کا (جن کے پاس کھانے کے لیے نہ ہو) اور مسکینوں کا اور زکوٰۃ کے محصلین کا حق ہے اور ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے اور گردنوں کو چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کا قرض ادا کرنے کے لیئے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کا مقرر کردہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔" (آیت ۶۰) صدقات کی اس تقسیم کے باوجود منکر لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بدگوئی کرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ اس کے بعد پھر منافقوں کی حالت بیان کی گئی ہے اور اُن کا انجام بھی بتایا ہے۔ اس کے برعکس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان رکھنے والوں کے لیئے جنت کا وعدہ ہے جس کے بیے اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑی کامیابی ہے (آیت ۷۲)۔ پھر کفار اور منافقوں سے جہاد کرنے کا اور سختی کرنے کا حکم ہے کہ ان منافقوں نے اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ میں (عہد کرنے کے باوجود) خرچ نہیں کیا اور جو لوگ خرچ کرتے ہیں اُن کا مذاق اڑایا تو (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم" آپ اُن کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (ان کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا ہے) اگر آپ اُن کے لیے ستر بار بھی بخشش طلب فرمائیں تب بھی اُن کو نہ بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔" (آیت ۸۰)

غزوۂ تبوک میں منافقین پیچھے رہ گئے اور نہیں گئے، بڑے خوش تھے کہ جہاد اور گرمی سے بچ گئے لیکن دوزخ سے نہ بچ سکے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو فرمایا گیا ہے کہ اب وہ جہاد میں آنے کے لیے اجازت طلب کریں تو آپ منع فرما دیں اور آپ

اُن کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھیں" اور (اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز (جنازہ) نہ پڑھیے اور نہ اُس کی قبر پر کھڑے ہوئیے (آپ کا کھڑا ہونا بھی باعث رحمت ہے) اور یہ تو اللہ اور اُس کے رسول کے منکر تھے اور منکر ہی مر گئے۔[1]" (آیت ۸۴) - پھر جہاد کے جو لوگ مکلف نہیں ہیں اُن کا ذکر آتا ہے کہ "نہ تو ضعیفوں پر گناہ ہے اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ رہیں نیکو کاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (آیت ۹۱)

پھر اُن کا ذکر ہے جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہونے پر روتے تھے۔ لیکن جو خوش حال تھے اور جہاد سے بھاگنا چاہتے تھے تو اُن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے کہ انھیں اچھے بُرے کا ہوش نہیں۔

اب گیارھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے بعد جب مسلمان واپس ہوں گے تو منافقین پھر عذر پیش کریں گے کہ جہاد میں کیوں شریک نہ ہوئے تو مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ تم اگر اُن سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ اُن سے راضی نہیں (آیت ۹۶) یہ دیہاتی گنوار اپنے کفر اور نفاق میں بہت سخت واقع ہوتے ہیں اور اگر کچھ خرچ کرتے ہیں تو اُسے تاوان سمجھتے ہیں اور مسلمانوں پر گردش آنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن درحقیقت انھی پر گردش آنے والی ہے اور اگر وہ اپنے خرچ کو اللہ کے قرب اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھیں تو بے شک وہ ان کے لئے قرب ہی کا موجب ہے۔" عنقریب اللہ اُن کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے صدقے میں یہ رحمت حاصل ہوگی)۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۹۹) — پھر آیت ۱۰۰ میں ہے کہ" اور مہاجرین اور انصار میں سے سب سے پہلے سبقت لے جانے والے اور وہ جو اُن کے نقش قدم پر خوبی (احسان) کے ساتھ چلے، اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہوئے اور (اللہ نے) اُن کے واسطے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔" اس آیت میں شروع شروع کے مہاجرین اور انصار، نیز اُن کے متبعین کے لیے حکم ہے کہ وہ قطعی جنتی ہیں۔ یہ شروع شروع کے صحابہ وہ تھے جن کو پورا قرآن نہیں ملا تھا (وہ ۲۳ سال میں مکمل ہوا) تو ظاہر ہے کہ ان صحابہ کو یہ درجہ قرآن کی وجہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی وجہ سے حاصل ہوا۔

غزوۂ تبوک میں جو لوگ شریک نہ ہو سکے لیکن توبہ کی اور ندامت کا اظہار کیا تو اللہ پاک نے معاف فرما دیا۔ صدقات اور توبہ سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ تبوک سے واپسی پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں دو رکعت نماز پڑھی تو مسلمانوں نے وہاں مسجد بنادی۔ منافقین نے اس کے قریب ایک اور مسجد بنادی کہ وہاں سازش ہو اور مسلمانوں میں نفاق ڈالا جائے۔ اللہ پاک کہتے

---

[1] منافق عبداللہ ابن اُبی مر گیا تو اُس کے بیٹے نے جو صحابی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اپنی قمیص دے دیں کہ اس میں کفنایا جائے۔ آپ نے دے دی۔ پھر نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آپ کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا کہ آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے (منع نہیں فرمایا) میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا۔ غرض آپ نے نماز پڑھی تو پھر یہ آیت ولا تصلی ...... نازل ہوئی۔ پھر آپ نے منافقین کی نماز نہیں پڑھی۔

نے اس مسجد (ضرار) کی مذمت فرمائی اور مسجد قبا کے لئے فرمایا کہ "اس کی بنیاد اوّل دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی اور وہ اسی لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" (آیت ۱۰۸)

پھر اللہ پاک کی بے پایاں شفقت کا لہجہ دیکھیے۔ فرمایا ہے کہ "بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لیے ہیں۔ اس قیمت پر کہ اُن کے لیے جنت ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے (بھی) ہیں اور شہید (بھی) ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ توریت اور انجیل اور قرآن میں ہے اور اللہ سے زیادہ کون وعدہ کا پکا ہو سکتا ہے؟۔ پس (اے مسلمانو) اس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور بڑی کامیابی یہی ہے۔" (آیت ۱۱۱)۔

(یہی بات سورۃ الفتح کے آخر میں بھی ہے)

پھر مسلمانوں کی نو صفات آیت ۱۱۲ میں بتائی گئی ہیں:۔ "یہ توبہ کرنے والے، بندگی کرنے والے، شکر کرنے والے، بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم کرنے والے اور بری بات سے منع کرنے والے اور ان حدود (شریعت) کی جو اللہ نے قائم کی ہیں حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسولؐ آپ ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔"

(ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے بخشش کی دعا کی تھی (کہ وہ ایمان لے آئے لیکن جب وہ کفر پر فوت ہُوا تو آپ نے بیزاری ظاہر فرمائی۔)

غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے والوں میں سے بعض نے خود کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معاف نہ فرمائیں گے وہ اپنے کو نہ کھولیں گے۔ وہ معاف کر دیے گئے۔ لیکن تین حضرات ایسے بھی تھے جو اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہے تھے۔ اللہ پاک نے مؤخر الذکر کو پچاس دن کے بعد معاف فرمایا۔ یہ مدت بھی اُن پر بہت سخت گزری۔ اس کے بعد پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے اور آخر سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا ذکر آتا ہے کہ "(اے مسلمانو) بے شک تمھارے پاس تم ہی میں سے (پاک نفوس میں سے) ایک رسولؐ آئے ہیں۔ جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے (وہ تم سے زیادہ) اُن پر گراں گزرتی ہے۔ تمھارے لیے وہ (رحمت کی) فراوانی کے طالب رہتے ہیں مومنوں کے حق میں نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔ پھر (اب بھی) یہ لوگ اگر روگردانی کریں تو آپؐ فرما دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔" (آیت ۱۲۸-۱۲۹)۔

اب تیسری منزل شروع ہوتی ہے۔ جس کی ہر سورۃ (سوائے آخری سورۃ کے) "الٓر" سے شروع ہوتی ہے۔

سورۃ یونس

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے لوگوں کو تعجب ہے کہ بنی آدم ہی میں سے ان کو پیغمبر کیوں منتخب کیا گیا۔ اللہ پاک اپنی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے۔ آسمان، زمین، عرش، سورج، چاند، رات، دن وغیرہ اللہ کو پہچاننے کے ذریعے ہیں اور جو نہیں پہچانتے اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور ایمان و عمل صالح والے جنت میں ہوں گے۔" اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے بھی اور بیٹھے بھی اور کھڑے بھی (ہر طرح) ہم کو پکارتا ہے اور جب ہم اُس کی وہ تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گذر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر اُس نے کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا ......" (آیت ۱۲)۔

پھر خلافت فی الارض کا ذکر ہے اور یہ کہ جب قرآن کی آیتیں نافرمانوں کو سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی قرآن کو بدل دو (کیونکہ اس میں تو کفر کے خلاف آیتیں ہیں)۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے (کہ بدلنا تو الگ رہا) اگر اللہ چاہتا تو میں نہ تو اس کو تم کو پڑھ کر سنا سکتا، نہ (اللہ) اس کی تم کو خبر کرتا۔ پھر میں تو ایک عمر اس سے قبل تم میں رہ چکا ہوں (کیا کبھی تم نے میری صداقت اور امانت پر شک کیا؟) کیا تم بالکل نہیں سمجھتے؟" (آیت ۱۶)۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے! انسان تو ایک امت تھا۔ لیکن اختلاف پیدا ہوا۔ پھر اللہ پاک نے خشکی اور تری کی سیر کا ذکر کیا ہے کہ کشتی پر جب سخت ہوا آتی ہے اور وہ ڈوبنے لگتی ہے تو اس وقت لوگ اللہ کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ جب اس آفت سے نجات پاتے ہیں تو اسی اللہ سے بغاوت کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو اس پانی کی طرح ہے جو زمین کو سیراب کر کے کھیتی پیدا کر دیتا ہے لیکن ناگہاں ہمارا عذاب پہنچتا ہے اور وہ کھیتی ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی زندگی بظاہر اچھی سمجھ لی جائے لیکن نافرمانوں پر عذاب آتا ہے تو پھر ان کی زندگی کا وجود ہی یکایک ختم ہو جاتا ہے۔ "آپ (ان مشرکین سے) پوچھیے کہ تم کو آسمان اور زمین میں سے رزق کون دیتا ہے یا (تمہارے) کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور کون جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور (پھر) امور (کائنات) کی تدبیر کون کرتا ہے۔ پس وہ بول اٹھیں گے کہ اللہ۔ تو آپ ان سے کہیے کہ (پھر اللہ سے) ڈرتے کیوں نہیں؟" (آیت ۳۱)۔ مشرکین نے اپنے خداؤں اور اوہام باطلہ کی پیروی کی ہے جو بالکل لغو ہیں اور یہ قرآن وہ نہیں جسے اللہ کے سوا کوئی بنا سکے۔ ہے کوئی ابھی یا کبھی جو اس جیسی کوئی سورۃ بنا لائے (آیت ۳۸)۔ منکرین کی کیفیت کا آگے چل کر بھی ذکر ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان اندھے بہروں کو کس طرح راہ دکھائیں گے؟ اور ہر امت کے لئے رسول اتارا ہے لیکن منکرین نہیں مانتے "اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟ (آیت ۴۸)۔ لیکن "کیا جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے؟" اور (قیامت کا دن ایسا ہولناک ہوگا کہ) اگر ایک گناہ گار کے پاس روئے زمین کی تمام دولتیں ہوں تو یقیناً وہ اپنے (گناہوں کے) بدلے میں دے ڈالے (لیکن وہ عذاب سے نہ بچے گا) ....." (آیت ۵۴)۔ "اللہ پاک کی طرف سے نصیحت (موعظت) آگئی۔ یہ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے" (آیت ۵۷)۔ اللہ پاک کو ہر حالت اور ہر چیز کا علم ہے اور اللہ پاک نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لیے فرمایا ہے کہ "سن لو، جو اللہ والے ہو گئے ان کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے یہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا" (آیت ۶۲-۶۳)۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ منکرین کو نوح علیہ السلام کا حال سنا دیں کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اگر تم لوگوں کو میرا رہنا اور اللہ کی آیتوں سے نصیحت کرنا گراں گزرتا ہے تو میں نے اللہ پر توکل کیا۔ لیکن ان کو بھی جھٹلایا گیا۔ ان کے بعد کتنے انبیاء علیہم السلام دنیا میں آئے لیکن لوگ انہیں جھٹلاتے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے حق بات پہنچائی تو اسے بھی جادو کہا گیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر ہے اور فرعون کی نافرمانی بیان کی گئی ہے۔ "اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار کر دیا۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظالمانہ انداز سے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب وہ (اپنی فوج سمیت) ڈوبنے لگا تو (گھبرا کر) بولا کہ میں ایمان لایا

...... (اللہ پاک کا حکم ہوتا ہے کہ تجھے شرم نہیں آتی) اب (کہتا ہے کہ میں ایمان لایا) اور اس کے قبل نا فرمانی پہ قائم رہا اور مفسدوں میں سے تھا...... پس آج ہم تیرا جسم بچا دیتے ہیں تاکہ تو بعد میں آنے والی اُمتوں کے لیے ایک نشان (عبرت) بن جائے اور بے شک اکثر لوگ ہماری نشانیوں پہ توجہ نہیں دیتے" (آیت ۹۰-۹۲)۔ آج بھی فرعون کی لاش مصر کے عجائب خانے میں عبرت کا مجسمہ ہے۔ یہ واقعات اور پھر یونس علیہ السلام کی مومن امت کا ذکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عبرت کے لیے ہے۔ پھر نافرمانیوں کی وجہ سے جب عذاب آجاتا ہے تو "ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کو بچا لیتے ہیں، اسی طرح ایمان والوں کو بچا لینا ہمارا ذمہ ہے" (آیت ۱۰۳)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ "آپ فرما دیجیے۔ اے لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تم کو حق پہنچ چکا۔ اب جو کوئی راہ ہدایت اختیار کرتا ہے تو وہ ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور میں تمھارے کاموں کا ذمہ دار نہیں ہوں" (آیت ۱۰۸)

سورۃ ھود

(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیں) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور میں اُسی کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں اور یہ کہ اپنے پروردگار سے بخشش مانگو۔ پھر اس کی طرف رجوع کیے رہو۔ پھر اس کے حکم پہ عمل پیرا رہو۔ اسی سے دونوں جہانوں میں فلاح ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی حیا کے ذکر پر یہ پارہ ختم ہوتا ہے۔ اور۔

اب بارھواں پارہ شروع ہوتا ہے ————

"اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جاندار ایسا نہیں کہ جس کی روزی اللہ پاک نے اپنے اوپر واجب نہ کر لی ہو اور وہ اُس کے ٹھہرنے اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے (اور یہ) سب کچھ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے" (آیت ۶)۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اسی دنیا (ارض) میں چلنے پھرنے والے (جاندار) ہیں اور ان کی روزی کا جہاں تک تعلق ہے اللہ پاک (معمولی حیلے سے بھی) وے دیتا ہے اور چلنے پھرنے (حرکت۔ عمل) سے کام بنتا ہے۔ "اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دن (چھے مراتب) میں پیدا کیا اور (اُس وقت) اُس کا عرش پانی پر تھا......" (ابھی تک انسانی دماغ اس حقیقت سے نا آشنا ہے) اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ منکرین کی وجہ سے آپ آزردہ نہ ہوں۔ آپ نے تبلیغ فرما دی تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ منکرین عجیب عجیب سوالات کرتے ہیں "کیا یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو آپ نے خود بنا لیا ہے۔ آپ فرما دیجیے کہ تم ایسی دس ہی سورتیں (آیتیں) بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بُلا سکو (اپنی مدد کے لیے) بُلا لو۔ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو" (آیت ۱۳)۔ یہ منکرین اللہ پہ جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں تو یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے۔ پھر نوح علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کے لیے پیام دیا اور فرمایا کہ "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور

نہ میں اُن لوگوں کے متعلق جو تمھاری نگاہ میں حقیر ہیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ اُن کو بھلائی نہ دے گا اور اللہ ہی خوب جانتا ہے جو اُن کے دلوں میں ہے (اگر میں بھی تمھاری طرح یہ کہوں) تو اس وقت میں بھی نا انصافوں میں ہو جاؤں "۔ (آیت ۳۱) - اس تقریر کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے منکر ہونے کی وجہ سے جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اُسے لے آیئے - اللہ پاک نے اس واقع سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر تسلی دی ہے کہ منکرین کا یہ وطیرہ شروع ہی سے رہا ہے - آخر نوح علیہ السلام کے منکرین کو غرق ہونا پڑا۔ کشتی تیار کرنے کا حکم ملا - اس میں ہر جنس سے ایک جوڑا سوار کر لیا گیا اور نوح علیہ السلام کی "اہل" (سوائے اُس کے جس کے لیے عذاب کا حکم ہو چکا ہے) اور ایمان والے کشتی میں بٹھا لیے گئے - یہ لوگ طوفان سے محفوظ رہے لیکن نوح علیہ السلام کا بیٹا جو کسی پہاڑی کی پناہ لینے کا دعویٰ کر رہا تھا غرق ہو گیا۔ نوح علیہ السلام نے اللہ پاک سے عرض کیا کہ وہ تو میری " اہل " میں سے ہے - جواب ملا کہ نہیں، وہ تمھاری " اہل " میں سے نہیں اگر ایسا ہوتا تو عمل صالح پیش کرتا (یعنی پیغمبر وقت کی پیروی) - پھر ہود علیہ السلام کی قوم (عاد) کا ذکر ہے کہ وہ لوگ (یمن میں) مادی طور پر بہت آگے بڑھے ہوئے تھے لیکن اکثر ہدایت پر نہ آئے اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے - پھر صالح علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انھوں نے قوم ثمود میں تبلیغ فرمائی لیکن وہ لوگ اپنے خالق کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے رہے اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے - لوط علیہ السلام کی قوم جس گندگی میں مبتلا ہوئی اُس سے لوط علیہ السلام عاجز آ گئے - ابراہیم علیہ السلام (جو بُردبار، رقیق القلب اور ہر وقت اللہ کی طرف رجوع ہونے والے تھے) لوط علیہ السلام کی قوم پر سے عذاب دور کرنے کے لیے دعا کرنا چاہتے تھے تو اللہ پاک نے منع فرمایا اور اس قوم کو تہ و بالا کر دیا - پھر شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور قوم کی ذہنی کیفیت کا بیان ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ جب قومیں نافرمان ہو جاتی ہیں تو کیونکر تباہ کی جاتی ہیں - اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر ہے کہ جوش اور ولولہ تھا اور ہم کلامی (اللہ سے) حاصل تھی لیکن قوم نے قدر نہ کی - پھر آیت ۱۱۲ سے ۱۱۵ تک مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ منکرین کے باعث پریشان نہ ہوں، ظالموں کی طرف مائل نہ ہوں، پانچوں نمازیں قائم کریں اور صبر سے کام لیں - پہلے بھی گذشتہ قوموں کا ذکر کیا گیا تھا - اب پھر وہ حالات سنائے جا رہے ہیں تاکہ " آپؐ کا دل قائم (برقرار) رہے اور اس میں آپ کے پاس " حق " پہنچا ہے اور ایمان والوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے "۔ (آیت ۱۲۰) -

سورۃ یوسف

یہ سورۃ بتاتی ہے کہ انسان کو اپنے ہم جنسوں اور اپنی نفسانی خواہشات سے کس طرح بچ کر رہنا چاہیے - حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے قصے میں بڑی نصیحت ملتی ہے - کن کن مصیبتوں اور آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے - بھائی دھوکا دیتے ہیں (جو اللہ کا خوف نہیں رکھتے) - حالی کہتے ہیں :-

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا

دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

عزیز مصر کی بیوی کی خواہش بھی ایک فریب ہے جو اللہ سے ہٹا دیتا ہے - قید کے رفیقوں سے بھی اللہ کا رشتہ جوڑنے کی تبلیغ ہے کہ

"اے میرے قید خانے کے ساتھو، کئی کئی جُدا جُدا معبود اچھے یا ایک یگانہ اور غالب اللہ (اچھا ہے)؟" (آیت ۳۹) عزیز مصر نے بھی ایک خواب کی تعبیر چاہی۔ یوسف علیہ السلام نے کہلا بھیجا کہ پہلے اُن عورتوں سے میرے متعلق دریافت کرو۔ وہ بول اٹھیں "اللہ کی قسم، ہم نے اس (یوسفؑ) میں کوئی برائی نہ پائی۔ عزیز کی بیوی نے کہا کہ اب حق بات سب پر ظاہر ہو چکی ہے۔ میں نے ہی اُس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا بے شک وہی سچا ہے" (آیت ۵۱)۔ یوسف علیہ السلام انکشاف حق چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اس قصے میں بھی بہت بڑا سبق ہے ۔

اب تیرھواں پارہ شروع ہوتا ہے :۔

یوسف علیہ السلام کو ملک کے خزانوں پر مامور کیا گیا۔ قحط کے زمانے میں یوسف علیہ السلام کے تدبر سے ملک مُضر اثرات سے محفوظ رہا اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی ان کے یہاں غلہ خریدنے کے لیے آتے تھے، یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی طبیعت کی مناسبت سے کچھ لالچ، کچھ تنبیہہ فرمائی تھی اور یعقوب علیہ السلام کے لیے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ بن یامین کو بھیجنے میں متردد نہ ہوں۔ بہرحال آگے تفصیل آتی ہے کہ کس طرح یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو روک لیا اور اپنے والد صاحب کے پاس اپنا پیراہن بھیجا۔ یعقوب علیہ السلام کی بصارت واپس آگئی اور یوسف علیہ السلام کو اُن کے والدین کی تشریف آوری سے جو خوشی ہوئی اس کا اظہار یوں کیا تھا:۔

"اے میرے رب (میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں) تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور تعبیر (تدبیر بھی سکھائی۔ اے زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ میرا خاتمہ مسلمان کی حیثیت سے کر اور مجھے صالحین میں شامل کر" (آیت ۱۰۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعات سُنائے گئے ہیں کہ حق، حق ہی ہے اور شر کی اصلاح مشکل ہے منکرین کو عذاب الٰہی سے صرف اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت بچا سکتی ہے اور یہ احسن القصص اہل بصیرت کے لیے ہے۔ "بے شک ان کے حالات میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے عبرت ہے۔ کوئی بنائی ہوئی بات تو ہے نہیں۔ بلکہ تمام پہلی صداقتوں کی تصدیق کرنے والا، ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والا اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے" (آیت ۱۱۱)

سورۃ الرّعد

المّٓرٰ حروف مقطعات سے پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ کتاب (الٰہی) کی آیتیں ہیں اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا وہی حق ہے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ان منکرین کو متوجہ کرائیے کہ کائنات کو دیکھیں اور سمجھیں کہ کس نے سب کچھ پیدا کیا۔ زمین، پہاڑ، دریا اور ہر طرح کے پھلوں میں جوڑے اُسی نے پیدا کیے، دن کو رات کا لباس اُسی نے پہنایا (لیل و نہار کی گردش سے دنیا میں کیا کیا ہے۔ ع

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات)

غرض کائنات کی ہر چیز اللہ کے وجود پر شہادت دیتی ہے۔ مٹی سے اُگتے ہوئے دانہ سے بھی انسان کو دوبارہ پیدا ہونے کا ثبوت

مل سکتا ہے۔ کفار جو معجزے کے خواہاں ہیں تو قرآن کونسا چھوٹا معجزہ ہے؟ ۔ اللہ پاک ہر چیز اور اُس کی جزئیات کا خالق اور اُس سے واقف ہے۔ ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔ اللہ کے پہرہ دینے والے ہر بندے کے ساتھ مامور ہیں جو اللہ کے حکم سے اُس کی نگہبانی کرتے ہیں۔ پھر بھی اللہ پاک کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ حالی نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے:۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی یاد دلا رہی ہے اور ہر چیز اُسی کے آگے سر جھکاتی ہے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُن سے پوچھیے کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ آپ (ہی) فرما دیں کہ اللہ۔ آپ کہیے کہ پھر تم اُس کو چھوڑ کر ایسوں کو کیوں حمایتی (معبود) بناتے ہو جو اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ آپ پوچھیے کیا نابینا اور بینا برابر ہیں یا تاریکی اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا ان لوگوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں کہ انہوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا ہے تو انہیں ان کا اور اس کا بنانا ایک سا معلوم ہوا۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی اکیلا زبردست ہے" (آیت ۱۶)۔

پھر حق و باطل کی تمیز کے لیے ایک مثال ہے۔ بہرحال، اللہ اور اُس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی سے حق کی راہ مل سکتی ہے اور منکرین کے لیے جہنم جیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

کیا وہ شخص جو آپ کے کلام کو حق جانتا ہے اُس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ ۔ اولی الالباب (صحیح عقل والے) وہ ہیں" جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے عہد کو نہیں توڑتے (ایمان والا عہد) اور وہ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے (ایمان) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب سے ڈرتے ہیں اور جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور علانیہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کر کے بُرائی کو دور کرتے ہیں۔ اُنہی کے لیے آخرت کا گھر (جنت ہے)" (آیت ۲۰-۲۲)۔ اہل ایمان بھی وہی ہیں" (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے تسکین پاتے ہیں۔" (آیت ۲۹)۔ یہ ایمان والے اور عمل صالح والے وہ ہیں جن کے لیے خوشی اور آفرین ہے اور بہترین ٹھکانا (آخرت کا) ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی کتاب ایسی ہوتی جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور مردے بولنے لگتے تو کیا وہ قرآن کے علاوہ کوئی اور کتاب ہو سکتی تھی؟ اور کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی قدرت و حکمت کی مالک ہے؟ یہی قرآن وہ نعمت ہے جس سے ہدایت والوں کو قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے (آیت ۳۶) اور یہ عربی زبان میں ہے (آیت ۳۷) اور جس طرح آیاتِ قرآنی اور کائنات کی نشانیوں میں کوئی تناقض نہیں ہے اسی طرح انبیا سابقین (علیہم السلام) اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں بنیادی فرق کوئی نہیں کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ اُن کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اللہ پاک جلد حساب لینے والا ہے (آیت ۴۱)۔ اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا انکار کر رہے ہیں اُن سے" آپ فرما دیجیے کہ میرے اور

تمہارے درمیان بس اللہ (ہی) گواہ ہے ......" (آیت ۴۳)—

سورۃ ابراہیم

یہ سورۃ بھی الٓر کے حروف مقطعات سے شروع ہے اور فوراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ " یہ ایک (پُرنور) کتاب ہے - اس کو ہم نے آپؐ پر اتارا ہے تاکہ آپ (بھولے ہوئے) لوگوں کو اُن کے رب کے حکم سے اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکالیں - عزیز (غالب) اور حمید (قابلِ تعریف) خدا کے راستے کی طرف (لے جائیں)" ہر رسول کو اُسی کی قوم کی زبان میں تبلیغ کا حکم ہُوا - (یہی معاملہ قرآن کے ساتھ ہے) - موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم تھا کہ وہ بھی اندھیروں سے نور کی طرف (اپنی قوم کو) لائیں - اللہ پاک ہی نے اُن کی قوم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دلائی جو سخت تکلیف پہنچاتے تھے اور بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے لیکن بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے - قوم نوح اور قوم عاد و ثمود کی نافرمانی کا ذکر بھی آتا ہے :- توحید کی راہ میں اذیتیں اٹھانا تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور منکرین کی مثال یوں آتی ہے :- " وہ لوگ جو اپنے رب سے منکر ہوئے اُن کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی سی ہے جس پر آندھی کے دن ہوا تیزی سے چلے (یعنی اُڑا لے جائے اور کچھ نہ بچے) - اُن کو اپنی کمائی سے کچھ حاصل نہ ہوگا - یہی تو بہک کر دُور جانا ہے " (آیت ۱۸) - قیامت کے دن اللہ کے روبرو سب لوگ پیش ہوں گے تو وہ جھوٹے معبود بھی پیش ہوں گے جو بے بس ہیں - اُس وقت حق و باطل کا فرق کھل جائے گا - اور ایمان و عمل صالح والے لوگ جنتوں میں داخل کئے جائیں گے - کلمۂ طیبہ (توحید) کی مثال یوں ہے کہ ایک پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑیں مضبوط اور ڈالیاں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور کفر و شرک کی مثال ایسی ہے جیسے ایک فضول (خبیث) درخت جس کو زمین میں سے اکھاڑ پھینکا ہو اور اُسے قرار نہ ہو (آیت ۲۴-۲۶) - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مزرعِ آخرت فرمایا ہے - توحید کی وجہ سے دنیا میں یہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور پر اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کی مخلوق کو دیا جائے -

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (سعدیؒ)

یہ شعر آیت ۳۲ - ۳۴ کی ترجمانی کرتا ہے -

ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں دعا مانگی تو وہ امن کا شہر بن گیا ، اُن کی اولاد کو اصنام پرستی سے بچا لیا گیا اور بڑھاپے میں اُن کے دو صاحبزادے (اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ) پیدا ہوئے - جن کی اولاد میں کتنے جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوئے ! ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی اولاد میں سے (اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں) ہیں " (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو اُس دن سے ڈرایئے جب اُن پر عذاب آجائے گا ، پھر یہ ظالم التجا کریں گے کہ اے ربّ ہم کو کچھ دنوں کی مہلت دے کہ ہم تیری دعوت (دنیا میں جاکر) قبول کریں اور (تیرے) رسولوں کی پیروی کریں - کیا تم لوگ اس سے قبل قسمیں نہیں کھایا کرتے تھے کہ تم کو زوال نہیں -

(اب کیوں ہُوا؟)"۔ (آیت ۴۴) ۔ منکرین زنجیروں میں جکڑے جائیں گے اور اُن کے کُرتے گندھک (یا تانبے) کے ہوں گے اور آگ اُن کے چہروں کو ڈھانک رہی ہو گی"۔ (آیت ۵۰) ۔ آپؐ ابلاغ فرماتے رہیں ۔

سورۃ الحجر

اس سورۃ کی پہلی آیت کے بعد ہی :

چودھواں پارہ شروع ہوتا ہے

الٓرٰ ۔ حروف مقطعات کے ہی بعد قرآن مبین کا ذکر ہے اور یہ کہ قیامت میں کفار بار بار آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے ۔ کُفار کی بستی اپنے وقت پر تباہ کی جاتی ہے ۔ آپؐ کے زمانے میں وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ تو (معاذ اللہ) دیوانہ ہیں اور انکار کرنے پر عذاب کے منتظر ہیں جس کو ڈھیل دی گئی ہے ۔ "ہم ہی نے یہ نصیحت (کتاب) نازل کی ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں" (آیت ۹) ۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ پاک نے لیا ہے ۔ قرآن پاک کا حفظ ، تراویح میں حفظ کا سالانہ امتحان ، الفاظ ، معانی ، حرکاتِ حروف ، ترتیب ، تدوین ، تجوید ، ترتیل ، تفسیر وغیرہ کا پورا انتظام اللہ پاک نے اس طرح کیا ہے کہ دنیا میں کسی اور صحیفے اور کسی کتاب کا ایسا انتظام نہ کبھی ہُوا ہے اور نہ ہو گا ۔ پھر اُس کی ادبیت علمیت اور افادیت کے مقابلے کے لیے ہمیشہ سے دنیا کے سامنے چیلنج ہے ۔ ان اوصاف کے باوجود منکرین اس پر ایمان نہیں لاتے ۔ آسمان کے بروج ، زمین پر سخت وزن کے پہاڑ ، زمین میں ہر طرح کی معین مقدار کی چیزیں ، معیشت کے اسباب ، ابر آلود ہوائیں ، بارش اور بالیدگی وغیرہ سے بھی ان کے خالق کو پہچانا جا سکتا ہے ۔ انسان اور جنوں کی تخلیق ، پھر شیطان کا انکار ، اُس پر لعنت وغیرہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچانا جا سکتا ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انہی چیزوں کو منکرین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اُن سے خطاب ہوتا ہے کہ (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) "میرے بندوں کو مطلع فرما دیجیے کہ میں بخشنے والا بڑا مہربان ہوں اور (کافروں پر) بلا شبہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے"۔ (آیت ۴۹ ۔ ۵۰)

پھر ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ کبر سنی کے باوجود اُن کو صاحبزادے کی ولادت کی خوش خبری سُنائی گئی ۔ لوط علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا اُس کا ذکر آیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر عجیب کیفیات رونما ہوئیں ۔ اللہ پاک نے یوں خطاب کیا کہ "اے (میرے پیارے) آپؐ کی جان کی قسم وہ لوگ (لوط علیہ السلام کی قوم) اپنی مستی میں مدہوش ہو رہے تھے (ان کا علاج یہی تھا کہ اُن کو ہلاک کیا جائے) پس طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی اُن کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا ۔ پھر ہم نے اس بستی کو تہ و بالا کر ڈالا اور اُس پر کنکر (سنگِ گل ۔ سجیل) کے پتھر برسائے"۔ (آیت ۷۲ ۔ ۷۴) ، درختوں کی گھنی جھاڑیوں میں رہنے والے (اصحاب الایکہ) ، حجر کی بستی والے (اصحاب الحجر) جو پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے وہ بھی قہر الٰہی سے نہ بچ سکے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سات آیتوں والی سورۃ (الفاتحہ) اور قرآن پاک عطا فرمایا ہے (آیت ۸۷) جس کی تلاوت سے ایسا تزکیہ ہو جاتا ہے کہ اگلے وقتوں کی قوموں والے عذاب سے انسان کو چھٹکارا مل سکتا ہے"۔ اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم جانتے ہیں کہ ان (کافروں) کی باتوں سے آپ

کا جی تنگ ہوتا ہے۔ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہیے (جو آپ کا معمول ہے) اور سجدہ کرنے والوں میں رہیے اور اپنے رب کی عبادت وصال بالرفیق الاعلیٰ تک کیے جائیے۔" (آیت ۹۷ تا ۹۹)۔

سورۃ النّحل

انبیاء علیہم السلام پر طعن و تشنیع کرنا منکرین کا شیوہ رہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے منکرین کو بتایا جا رہا ہے کہ "اللہ کا حکم آ پہنچا۔ پس اس کے لیے جلدی نہ کرو (یعنی اُن کی شکست اور تباہی کا وقت آ پہنچا)۔ وہ (اللہ) اُس شرک سے پاک تر ہے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔" (آیت ۱) اللہ پاک کی شان اور قدرت کی بھی تبلیغ ہے کہ آسمانوں، زمین، انسان، حیوانات، بارش، شجر، کھیتی، زیتون، کھجور، انگور، رات دن، سورج چاند، رنگ برنگ کی چیزوں، سمندر کی تسخیر، اُس میں سے گوشت، زیور (موتی وغیرہ) کشتیوں وغیرہ سے اللہ پاک کی شان کو پہچانا جا سکتا ہے اور اُس کی اتنی نعمتیں ہیں کہ اُن کو شمار نہ کر سکو گے۔ لیکن منکرین نہیں پہچانتے اور قرآن کو بھی اساطیر الاولین (آیت ۲۴) سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شامتِ اعمال اور ان اعمال کے نتائج کا ذکر ہے۔ اور "ہم نے ہر امت کے لیے ایک رسول بھیجا ....." (آیت ۳۶) اور "جب ہم کسی شئے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا اس کو اتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔" (آیت ۴۰)۔

کفار کے ذکر کے بعد مومنوں کی کیفیت کا بیان ہے اور مشرکانہ توہمات کی تردید ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی تابع ہے اور اپنی عاجزی کی معترف ہے لیکن نافرمان انسان سرکشی کرتا ہے اور اللہ کو نہیں پہچانتا۔ کافروں کا یہ حال ہے کہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے بتوں کا حصہ نکالتے ہیں اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔" اور ہم نے تو قرآن آپ پر اس لیے نازل کیا کہ آپ اُن پر وہ باتیں واضح فرما دیں جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں (مثلاً توحید، رسالت، آخرت، حلال و حرام وغیرہ) اور (قرآن تو) ہدایت و رحمت اُنہی کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں" (آیت ۶۴) اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے (وہ تمھارے لیے تنومند ہیں)۔ اُن کے پیٹ میں سے گوبر اور خون کے درمیان سے ہم خالص دودھ تم کو پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔" (آیت ۶۶)۔" اور کھجور اور انگور کے میووں میں سے بھی (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو) تم اُن سے نشہ کی چیزیں بناتے ہو اور کھانے کی عمدہ غذائیں۔ بے شک اس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔" (آیت ۶۷)۔ شہد کی مکھی ہر قسم کے درختوں سے کھا کر شہد بناتی ہے۔" جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔" (آیت ۶۹)۔

اللہ پاک نے رزق کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت دی (آیت ۷۱)، بیوی بچے بنائے اور طیّب چیزیں کھانے کو دیں۔ لیکن لوگ پھر بھی اُس کو نہیں پہچانتے اور اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا ایک غلام (مجبورِ محض) ایک صاحبِ اختیار آقا کے برابر ہو سکتا ہے اور کیا ایک گونگا (محتاج) اُس کے برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو انصاف کے ساتھ (کام کرنے کا) حکم دیتا ہے اور خود بھی راہِ حق پر قائم ہے (آیت ۷۶)۔ تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا، کان، ناک، آنکھیں دیں، پرندوں کو ہوا میں پرواز کرنے کی طاقت دی، تم کو گھر دیے، خیمے دیے، اون بال والے جانور، آرام کے لیے چیزیں دیں۔" پھر بھی اگر یہ لوگ روگردانی کریں [illegible]

میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے ذمے صرف اللہ کا حکم صاف صاف پہنچا دینا ہے۔" (اور بس) (آیت ۸۲)۔
" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) جس دن ہر امت پر ہم ایک گواہ اُن میں سے اٹھائیں گے (یہ وہی پیغمبر ہوں گے جو اُن کے اعمال پہ گواہی دیں گے) اور ان سب پر ہم آپؐ کو گواہ بنائیں گے (کیونکہ آپ سب سے افضل ہیں) اور آپ پر (وہ) کتاب نازل کی جو ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت ہے اور رحمت ہے اور بشارت ہے۔" (آیت ۸۹)۔ اس آیت میں قرآن پاک کی چار خصوصیات بتائی ہیں)۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ پیام ہے کہ "بے شک اللہ پاک تم کو انصاف احسان اور رشتہ داروں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور کھلی بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور ظلم سے منع کرتا ہے تم کو نصیحت کرتا ہے کہ تم یاد رکھو۔" (آیت ۹۰)۔ خدا کی قسم کھا کر توڑنا تو ایسا ہے کہ اللہ کو شاہد بنا کر اس کا انکار کیا۔ یا ایک دیوانی عورت، محنت اور مشقت سے سوت کاتے اور پھر تاگے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ (آیت ۹۲)۔ دھوکا دینے کے لیے قسموں کو ذریعہ نہ بناؤ، دنیوی عزت اور دولت کے لیے دین کو نہ بیچو۔ اللہ کے پاس تمھارے لیے بڑا فائدہ ہے اگر اس کی اطاعت کرو۔ کیونکہ نیک عمل سے "حیات طیبہ" (اس دنیا میں بھی) مل سکتی ہے اور قرآن پڑھتے وقت بھی شیطان سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ یہ قرآن جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے اور ایسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہنچایا جس نے سوائے خدا کے کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔ اللہ پہ بہتان باندھنے والے عذاب عظیم کے لیے تیار رہیں۔ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کی زندگی کے مقابلے میں عزیز رکھا۔ "یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پہ اور کانوں پہ اور آنکھوں پہ اللہ نے مہر لگا دی اور یہی لوگ غفلت میں پڑے ہیں۔" (آیت ۱۰۸)۔ مسلمانوں پر جب سخت مظالم ڈھائے جا رہے تھے تو اُن کے لیے تین صورتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ مجبور ہو کر اسلام کو چھپانے کے لیے کلمہ کفر کہے اور جان بچائے لیکن دل میں پوری صداقت ہو، دوسری یہ کہ مرتد ہو جائے۔ جس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تیسری یہ کہ ہجرت کرے۔ یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔ "پھر جن لوگوں نے تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور (ہر حال میں اسلام پہ) قائم رہے (تو) بے شک اللہ (ان آزمائشوں) کے بعد (ان کو) بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۱۱۰)۔ پھر "حلال طیب" چیزوں کے کھانے کا حکم ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں دنیا کو حاصل ہوئیں ورنہ پہلے ان کے احکام بھی پوری طرح مرتب نہیں ہوئے تھے۔ آیت ۱۱۶ میں حلال اور حرام کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ نے اگر کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کہا تو اللہ سے ایسا کہنا کیوں منسوب کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے "حلال طیب" کی پہچان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے بنی نوع انسان کو سمجھ میں آئی ہے۔ اللہ نے خود کوئی تفصیل نہیں بتائی لیکن حضورؐ کے ذریعے ہم کو سمجھائی ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کی تعریف ہے جن کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اُن سے بھی "ملت ابراہیمی" کی پیروی کے لیے فرمایا گیا ہے۔ اور یہ کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیتے رہیے حکیمانہ اور مشفقانہ نصیحتوں کے ساتھ (بلاتے رہیے) اور (اگر ان لوگوں سے بحث کرنے کی نوبت آئے تو) بہتر طریقے پر مباحثہ کیجیے۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ اُس کی راہ سے کون بھٹکا ہوا ہے اور کون ہدایت پر ہیں" (آیت ۱۲۵)۔ پھر اُن مظالم کا ذکر ہے جو مسلمانوں پہ توڑے جا رہے تھے کہ اگر بدلہ لو تو اُسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کرنے

والوں کے حق میں یہ بہت اچھی بات ہے" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر کیے جائیں اور آپ کا صبر بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور اُن پر غم نہ کیجیے اور اُن کے فریب سے دل تنگ نہ ہوں" (آیت ۱۲۷) "و بے شک اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکو کار ہیں" (آیت ۱۲۸)۔

—اب چوتھی منزل اور پندرھویں پارہ کا آغاز ہے ——

سورۃ بنی اسرائیل

" پاک ہے وہ ذات (اللہ) جو اپنے بندے کو ایک رات خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) لے گیا جس کے گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں آنکھوں سے دکھائیں بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے"۔ اس آیت میں اپنے بندے کہا ہے، بندے کی روح نہیں کہا۔ یعنی نبوت کے بارہ سال بعد اور ہجرت سے ایک سال پہلے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اپنی چچا زاد بہن حضرت ام ہانی کے مکان پر تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر لے گئے۔ ہر آسمان پر دروازے کھلواتے یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے۔ اس کے آگے جبرئیل علیہ السلام نہ جا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب رف رف پر (براق کی سواری کے بعد) سوار ہوئے اور عرش سے بالائے عرش تک کا سفر تھا۔ اس آیت کے آخر میں اللہ پاک کی دو صفتیں سمیع اور بصیر کی ہیں جن کا آئینہ دار حضور کو بنایا گیا (سورۃ النجم میں اس سفر مقدس کی اور تفصیل ہے) یہ امتیازی شان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی تاہم بنی اسرائیل کیلئے حضرت یعقوب سے لے کر عیسیٰ تک جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے انہوں نے بڑے درجات حاصل کیے لیکن اس کی قوم میں سے اکثر نے نافرمانی کی اور یہ بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں جن میں سے اکثر نے ملک میں دو بار فساد برپا کیا (پہلی بربادی جالوت کے ہاتھوں اور دوسری بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ بعض مفسرین نے اس قول سے کچھ اختلاف کیا ہے)۔ "تاہم اگر بنی اسرائیل اب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے سدھرنا چاہیں تو سدھر سکتے ہیں ورنہ دوزخ کو ہم نے کافروں کے لیے (دائمی) قید خانہ بنا رکھا ہے (آیت ۸)۔ اور "بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے اور ان ایمان والوں کو جو عمل صالح کرتے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں) بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے" (آیت ۹)۔ اور ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے جسے وہ قیامت کے دن خود پڑھ لے گا۔

" اور جب ہم کسی بستی کو (اُس کی بداعمالیوں کی وجہ سے) تباہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اُس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں (ان کو رسولوں کے ذریعے احکام پہنچا دیتے ہیں تاکہ وہ خود کو درست کریں اور اپنے اثر سے عوام بھی درست ہوں) پھر وہ نافرمانی کرتے ہیں، اس طرح اُن پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس (بستی) کو تباہ کر ڈالتے ہیں"۔ (آیت ۱۶)۔ دنیا کے طالب اور عقبیٰ کے طالب اگر اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں تو وہ ہر ایک کی مدد کرتا ہے (آیت ۲۰)۔ "اللہ کے ساتھ کسی کو معبود نہ بناؤ" اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار کا یہ فرمان (عام) ہے کہ (اے لوگو) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کیا کرو۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو،

بلکہ ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور اپنے بازو نہایت عاجزی کے ساتھ محبت سے اُن کے سامنے جھکا دو اور اُن کے لیے دعا کرو کہ اے پروردگار تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تھا۔" (آیت ۲۳-۲۴) - ان آیتوں میں اللہ کی عبادت کے بعد ہی والدین کی خدمت کا ذکر ہے جس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ تیسرا حکم رشتہ دار، مسکین، مسافر کے حقوق کے لیے ہے (لیکن اپنا مال بے موقع نہ اُڑا دو) - چوتھا حکم ہے کہ "نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو (بخل پر اُتر آؤ) اور نہ اُس کو بالکل ہی کھول دو (کہ خود شکستہ حال رہ جاؤ۔" (آیت ۲۹) پانچواں حکم ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مار ڈالو (آیت ۳۱) - چھٹا حکم ہے کہ زنا کے قریب (بھی) مت جاؤ (آیت ۳۲) - ساتواں حکم ہے کہ جس کو اللہ نے قتل سے منع کیا ہے اُسے مت مارو (آیت ۳۳) - آٹھواں اور نواں حکم ہے کہ یتیم کے مال کے قریب (بھی) نہ جاؤ (بے جا تصرف نہ کرو) - آیت ۳۴) اور دسواں حکم ہے کہ ناپ تول برابر (صحیح) رکھو (آیت ۳۵) - گیارھواں حکم یہ ہے کہ جس بات کی تحقیق (صحیح) خبر نہیں اُسکے پیچھے نہ پڑو (باز پرس کے دن پوچھ گچھ ہوگی - آیت ۳۶) اور بارھواں حکم ہے کہ زمین پر اکڑ کر مت چلو (آیت ۳۷) "یہ (ہدایت کی) باتیں اس حکمت سے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی فرمائی (تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق سمجھا جائے) ....." (آیت ۳۹) اور ہم نے قرآن میں (تمام اہم امور) پھیر پھیر کر (طرح طرح سے) بیان کیے ہیں تاکہ (لوگ) نصیحت حاصل کریں۔ مگر (افسوس کہ) وہ اور بدک جاتے ہیں۔" (آیت ۴۱) ـــ" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور اُن لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک نظر نہ آنے والا حجاب حائل کر دیتے ہیں۔" (آیت ۴۵) - وہ لوگ آپ کے خلاف کیا کیا گوشیاں کرتے ہیں - اگر وہ لوگ پتھر یا لوہا بھی ہو جائیں تب بھی اللہ کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں سے فرما دیجیے کہ بات ایسی کریں جو احسن ہو....."۔ (آیت ۵۳) اور "آپ فرما دیجیے کہ (اے مشرکو) جن کو تم نے اللہ کے سوا (خدا) سمجھ رکھا ہے اُن کو پکارو (اُن کی مدد چاہو) تو (تم دیکھو گے کہ) ان کو تمہاری تکلیف دور کرنے یا بدل دینے کا قطعی اختیار نہیں (وہ خود مجبور ہیں)" (آیت ۵۶) -

"اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب ہم نے آپ سے کہا کہ آپ کے رب نے لوگوں کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے (یعنی نہ تو وہ کفار آپ کو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ خود کو بچا سکتے ہیں) اور جو منظر ہم نے آپ کو (شب معراج میں) دکھایا تو وہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش ہے اور وہ (تھوہڑ) درخت (بھی ایک آزمائش ہے) جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے (دوزخ کے درخت اور وہاں کے عذاب پر کفار نے اعتراض کیا تھا) اور ہم (طرح طرح سے) اُن کو ڈراتے ہیں لیکن اُن کی سرکشی بڑھتی ہی جاتی ہے۔" (آیت ۶۰) - پھر شیطان کا ذکر ہے کہ اُس نے نافرمانی کے بعد بنی آدم کو بہکانے کا عزم کیا تو اللہ پاک نے فرمایا کہ "بے شک جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا قابو نہیں چل سکتا اور آپ کا رب کارساز کافی ہے۔" (آیت ۶۵) اور بنی آدم کو (اس دنیا میں بھی) بزرگی بخشی ہے کہ خشکی اور تری میں اُن کو سواری (عزت) دی، پاک روزی دی اور کثیر مخلوقات پر فضیلت دی ہے -

پھر کفار کا واقعہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک میں سے وہ احکام نکال دیں جو کفار کے معتقدات کے خلاف ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کو مکہ معظمہ سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں لیکن (اے میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) "آپ

سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی) نماز قائم رکھیں اور صبح کی نماز بھی۔ بے شک فجر کی نماز حضوری کا وقت ہے۔" (آیت ۷۸)۔ تہجد آپ کے لیے مزید ہے (آیت ۷۹)۔ "اور آپ (علی الاعلان) فرما دیجیے کہ حق آگیا اور باطل بھاگا۔ بیشک باطل تو نکل بھاگنے والا ہے۔" (آیت ۸۱) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں (حضورؐ کی طرح) مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ (آیت ۸۲)

لوگ روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ وہ کیا سمجھیں گے جب کہ ایمان ہی کو نہیں سمجھتے اور بے شک آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے (آیت ۸۷)۔ کفار کے سامنے پھر قرآن جیسی چیز بنا لانے کا چیلنج ہے اور کفار کے جو ہتھکنڈے ہیں اُن کا ذکر ہے۔ "آپ فرما دیں۔ تم سمجھو یا نہ سمجھو میرے اور تمھارے درمیان (حق کی) گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں (کی نیت) سے باخبر اور (ان کے اعمال کا) دیکھنے والا ہے۔" (آیت ۹۶)

موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح معجزات عطا کیے گئے لیکن پھر بھی اُن کو جادوگر کہا گیا اور فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو زمین میں چین نہ لینے دے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ اور اُس کے ساتھی ڈبو دیے گئے (آیت ۱۰۳)۔ پھر سبق ہے کہ موسوی معجزات ایک وقت معینہ کے لیے تھے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ (قرآن) جو تدریج نازل ہوا ہے وہ ہمیشہ رہے گا اور "آپ فرما دیجیے کہ تم اس کو مانو یا نہ مانو، البتہ جن لوگوں کو اس کے نازل ہونے سے قبل علم دیا جا چکا ہے (کتب سابقہ سے) جب یہ انھیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے (سب پاکی اُسی کے لیے ہے) بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں، روتے جاتے ہیں اور اُن کا خشوع بڑھتا جاتا ہے۔" (آیت ۱۰۷-۱۰۸) "اور فرما دیجیے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اُس کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کسی کمزوری کے باعث اس کا کوئی مددگار ہے اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُس کو بڑا جان کر اُس کی بڑائی (بیان) کرتے رہیے" (آیت ۱۱۱)۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے توحید کی تبلیغ سب سے زیادہ پُرزور انداز میں کی گئی ہے کیونکہ وہی اس طرح تبلیغ کرنے کے اہل تھے۔

سورۃ کہف

"سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی اور جس میں کوئی بھی کجی نہ رکھی (کتاب کیسی) ٹھیک کہ وہ (منکرین کو) ایک سخت عذاب سے متنبہ کرے جو اللہ کی طرف سے (آنے والا) ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں) خوش خبری سنا دے کہ اُن کے لیے نیک اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (آیت ۱-۳) "پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کے پیچھے غم سے اپنی جان گھلا نہ ڈالیں کہ وہ اس بات پر (توحید پر) ایمان کیوں نہ لائے" (آیت ۶)۔ وہ لوگ تو عجیب عجیب باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کہف (CAVE) والے (جو غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے) کتنے تھے۔ اس گنتی کی بحث سے کیا فائدہ؟ ان لوگوں نے تو اللہ سے لو لگائی

تھی اور اللہ نے اُن کو سالہا سال تک تھپک کر سُلا دیا تھا تاکہ لوگ اللہ پاک کی قدرت کو سمجھیں کہ وہ کس طرح آخرت میں پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اصحاب کہف کے دلوں کو اللہ کی یاد نے مضبوط کر دیا (آیت ۱۴) اور انہوں نے غار میں پناہ لی" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سورج کو دیکھیں گے کہ جب وہ نکلتا ہے تو اُن کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو اُن سے بائیں جانب کترا کر جاتا ہے اور اس (غار) کے ایک کشادہ میدان میں تھے (جو پہاڑیوں کے درمیان میں تھا۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو حالتِ گمراہی میں چھوڑ دے تو پھر آپ اس کے لیے کوئی رفیق راہ بتانے والا نہ پائیں گے"۔ (آیت ۱۷)۔ یعنی جب آپؐ ہی کی بات یہ نہیں سنیں گے تو پھر ان کی ہدایت کون کر سکتا ہے ؟ اس کے بعد آیت ۲۲ تک پھر اور آیت ۲۵ - ۲۶ میں بھی اصحاب کہف کا حال ہے۔ اس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اُمت کو تعلیم دی ہے کہ ایسا نہ کہیں کہ ہم یہ کل کر دیں گے بلکہ انشاء اللہ بھی کہیں" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم") آپ اپنے کو ان (اصحاب) کے ساتھ روکے رکھیے (صبر و استقامت کے ساتھ) جو اپنے پروردگار کو صبح و شام (ہر وقت) یاد کرتے ہیں۔ جو اُس کی رضا کے طالب ہیں اور آپ بھی اپنی آنکھیں (نظرِ التفات) دنیوی زندگی کی زینت کے خیال سے نہ ہٹائیں اور آپ اُس کا کہنا نہ مانیں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اُس کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے"۔ (یہود چاہتے تھے کہ غریب مسلمانوں کو حضورؐ چھوڑ دیں)۔ آیت ۲۸۔ کافر اور مومن کے صلے کا ذکر تھا، اب دولت مند کافر اور مومن فقیر کی مثال دی جا رہی ہے کہ اصل دولت ایمان ہے اور اسی ضمن میں دنیا کی بے ثباتی، کفر و تکبر کے انجام اور ایمان و تقویٰ کی مقبولیت سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ (آیت ۳۲ تا ۴۴) "مال اور اولاد تو دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور (حقیقی سرمایہ حیات وہ) باقی رہنے والی نیکیاں ہیں جو آپ کے رب کے یہاں ثواب کے اعتبار سے بہت اچھی اور امید کے اعتبار سے بہت بہتر ہیں"۔ (آیت ۴۶) پھر انسان کو غیرت دلائی گئی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر اس قدر سرکشی اختیار کرے حالانکہ اسے مسجودِ ملائک بنایا گیا تھا اور اُسے دشمن شیطان سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام اور اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اُسی کی بھلائی کے لیے تشریف لائے ہیں، اب موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے کہ وہ اللہ کے ایک بندے سے جو مجمع البحرین میں تھے ملنے کے آرزومند ہوئے۔ پتا یہ دیا گیا کہ تلی ہوئی مچھلی ساتھ رکھو، جہاں وہ گم ہو جائے وہیں وہ بندہ ملے گا۔ بہر حال وہ (خضر علیہ السلام) مل گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سے" انہوں نے کہا۔ اچھا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو تم مجھ سے کسی بات پر سوال نہ کرو گے جب تک کہ میں خود اس کا ذکر تم سے نہ کر دوں"۔ (آیت ۷۰)۔ —— خضر علیہ السلام نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک لڑکے کو قتل کر دیا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دیا۔ یہ تینوں باتیں موسیٰ علیہ السلام کے نظریے (شریعت) کے لحاظ سے قابلِ اعتراض تھیں، علامہ اقبال رحمہ نے اسی واقعے کے متعلق کہا ہے:-

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اب سولھواں پارہ شروع ہوتا ہے ——

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا قصہ جاری ہے۔ تیسرے موقع پر خضر علیہ السلام نے ایک دیوار کو سیدھا کر دیا جو گرنے والی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام کا کچھ معاوضہ لے لیتے تاکہ کچھ غذا ہی میسر آ جاتی کیونکہ بھوکے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ "اب میرے اور تمہارے درمیان جُدائی ہے۔" پھر بتایا کہ وہ جو کشتی تھی چند غریبوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس میں نقص پیدا کر دوں تاکہ اُس طرف کا بادشاہ جو (ثابت) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا، اس کو نہ چھین سکے اور جو لڑکا میں نے مار ڈالا تھا اُس کا ماجرا یہ ہے کہ اُس کے ماں باپ ایمان والے تھے، اور اندیشہ تھا کہ وہ لڑکا اُن کو اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز کر دے گا۔ اور وہ جو دیوار تھی وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی جس کے نیچے ان دونوں کے لئے مال دفن تھا اور ان لڑکوں کا باپ بڑا نیک آدمی تھا۔ پس اللہ پاک نے چاہا کہ یہ لڑکے جب جوان ہو جائیں تو اپنے باپ کا مال دیوار کے نیچے سے نکال لیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہوئے ہیں۔

ان واقعات سے مقصود یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو تسلی دی جائے کہ کفار کی ظاہری خوش حالی اور مومنین کی خستہ حالی (جس کا ذکر شروع میں آ چکا ہے) یا جو بھی اللہ پاک کے کام ہیں اُن سب میں مصلحت ہے جسے ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اس لیے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنا کام (تبلیغ) کرتے رہنا چاہیے۔ واقعات کا ظاہر اُن کے باطن سے مختلف بھی ہوتا ہے ——

آیات ۸۳–۱۰۱ میں ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ سد تعمیر ہوئی اور اس کے استحکام کا ممکن حد تک بندوبست کیا گیا لیکن وہ لازوال نہیں ہو سکتی۔ جب تک اللہ پاک کی مرضی ہے وہ قائم رہے گی اور جب وقت آ جائے گا تو اُس کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

آخری رکوع (آیت ۱۰۲–۱۱۰) میں ارشاد ہے کہ جن لوگوں نے اللہ پاک کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز بنا لیا ہے اُن کے لیے جہنم تیار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا اور اس بات کو نہیں مانا کہ انھیں پروردگار کے سامنے جانا ہے باقی رہے مومنین تو اُن کے لیے جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" آپ فرما دیجیے کہ میں بھی تم جیسا ایک بشر ہوں (لیکن) مجھ پر وحی آتی ہے۔ (اور میری تبلیغ کا خلاصہ یہ ہے) کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ پس جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو تو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔" (آیت ۱۱۰)

"نیک عمل" وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق ہو۔ اور یہ چیز ایمان کے ساتھ ساتھ ہے ——

سورہ مریم

اس سورۃ میں پہلے رکوع (آیت ۱ تا ۱۵) پھر دوسرے رکوع (آیت ۱۶ تا ۴۰) پھر تیسرے رکوع (آیت ۴۱ تا ۵۰) بعد ازاں چوتھے رکوع (آیت ۵۱ تا ۶۵) میں حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیا علیہم السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ سورۃ شروع کرتے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ تمہارے پروردگار کی اُس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ پر کی تھی ہے۔ انبیا علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہی وہ حضرات ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام

فرمایا اور ان ہی میں ان کی ذریات بھی داخل ہیں جو ایمان لائیں۔ لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے وہ ناخلف تھے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور نمازیں چھوڑ دیں۔ غرض جو لوگ ایمان لائے وہ تو جنت میں ہوں گے۔ اسی درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی دیر سے آنے پر تسلی بھی دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھولنے والا نہیں ہے۔ وحی مصلحت کے مطابق خدا تعالیٰ کے حکم سے ہی نازل ہوتی ہے۔

یہ سورۃ بہت دیر کے بعد نازل ہوئی اس لیے آپ مضطرب تھے چنانچہ آپ کو ان الفاظ میں جبرئیل علیہ السلام کی زبانی تسلی دی گئی کہ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمھارا رب بھولنے والا نہیں۔" اللہ اللہ کس قدر پاس خاطر اپنے محبوب کی پیش نظر ہے کہ جب بھی کوئی اضطراب انگیز مرحلہ پیش آتا ہے تو اطمینان دلایا جاتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو بھول نہیں سکتا۔ وہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اس لیے آپ اس کی عبادت کریں اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہیں۔ "انسان کہتا ہے کیا مرنے کے بعد پھر زندہ کیا جاؤں گا؟ کیا اُسے یاد نہیں کہ اس کو پہلے پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ہم تو بلاشبہ ان کو اکٹھا کریں گے پھر جو منکرین ہیں ان کو تو جہنم میں اور جو متقین ہیں اُن کو جنت میں داخل کریں گے۔ جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کفار، مومنین سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس شاندار ہے؟ حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ظاہری شان و شوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں۔" اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے خداوند تعالیٰ انھیں ڈھیل دیا کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے تب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھا کمزور ہے۔" کیا آپ نے دیکھا کہ ہماری آیتوں کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ میں تو مال اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا۔ کیا ان لوگوں کو غیب کا پتا چل گیا ہے۔ اور یہ تو ہمارے پاس تنہا حاضر ہوں گے۔ ان لوگوں نے جو مجھے چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لیا ہے اور اپنا مددگار سمجھ رکھا ہے۔ یہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور اُلٹے ان کے مخالف بن جائیں گے۔"

اب پانچویں رکوع (آیت ۸۳ تا ۹۸) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ان لوگوں کی زیادتیوں پر بے صبر نہ ہوں۔ ان کی شامت قریب آگئی ہے۔ ان کی مہلت کے دن اور باقی ہیں انھیں پورا ہونے دیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان منکرین پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو ان کو مخالفت پر خوب خوب اُکسا رہے ہیں۔ آپ ان پر نزول عذاب کے لئے جلدی نہ کریں ہم ان کے دن گن رہے ہیں۔ وہ دن آنے والا ہے جب متقی تو ہمارے دربار میں مہمان بن کر حاضر ہوں گے اور مجرمین جہنم کی طرف کشاں کشاں لے جائے جائیں گے یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنایا ہے سخت بیہودہ بات کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی شان یہ نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ یہ تمام لوگ فرداً فرداً میرے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور جو لوگ ایمان لے آئے اور عمل صالح کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت پیدا کر دے گا چنانچہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کی زبان میں اس کتاب کو آسان کر کے اسی لیے نازل کیا ہے کہ آپ متقین کو خوش خبری سنائیے اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیے۔ ہم ان لوگوں سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کا آج آپ کہیں نشان نہیں پاتے اور نہ ان کی بھنک ہی کہیں سنائی دیتی ہے۔ (یہی وہ

سورۃ ہے جو حضرت جعفرؓ نے شاہ نجاشی کے دربار میں پڑھ کر سنائی تھی۔)

سورۃ طٰہٰ

یہ سورہ مکی ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے یہ سورۃ نازل ہو چکی تھی۔ پہلے اس سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ہم نے قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں خدا کا خوف نہیں تو ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا اور تمام چیزوں کا مالک ہے پھر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کیا آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر بھی پہنچی ہے اس کے بعد (آیت ۹ تا ۱۰۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے پھر (آیت ۱۰۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں کہ آخر قیامت کے دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے تو آپ ان سے کہہ دیجیے یہ پہاڑ کوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے جیسے ریت کے ذرے اور اُن کو دھوئیں کی طرح اُڑا کر ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس کی کوئی اونچ نیچ نہ رہے گی۔ احوال قیامت بیان کرنے کے بعد پھر (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵ میں) آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے اسی طرح قرآن عربی کر کے نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ یہ لوگ ڈریں یا یہ قرآن اُن کے لیے کچھ سمجھ پیدا کر دے اور قرآن میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجیے۔ اور آپ یہ دعا کیا کیجیے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا دے ہم پہلے بھی آدمؑ کو ایک حکم دے چکے تھے مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

آیت ۱۱۶ تا ۱۲۹ میں حضرت آدمؑ کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا گیا کہ یہ منکرین اصل میں اپنے ازلی دشمن شیطان کے بہکائے میں آگئے ہیں ان سے پہلے بھی ہم بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں اور یہ بھی ہلاک ہوں گے لوگوں کو گذشتہ قوموں سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔

پھر آیت ۱۳۰ تا ۱۳۵ میں براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر آپ صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے ضمناً نماز کے اوقات بھی بیان کر دیئے گئے اور کہا گیا کہ آپ دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیے جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں۔ ہم نے صرف ان کی آزمائش کے لیے ایسا کیا ہے اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس کی پابندی کیجیے، ہم آپ سے کوئی رزق کمانا نہیں چاہتے رزق تو ہم ہی تمھیں دے رہے ہیں یہ مشرکین آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا کیا اس سے پہلے ان کے پاس اگلے صحیفوں کا بیان نہیں ہو چکا اگر ہم اس کے آنے سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے کہہ دیجیے کہ سب انتظار کر رہے ہیں سو تم

بھی انتظار کرو اب عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست والے کون ہیں اور کون ہے جس نے راہ پائی اور مقصود تک پہنچا۔

سترھواں پارہ شروع ہوتا ہے ———

سورۃ الانبیاء

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی ابتدا ہی اس آیت سے ہوتی ہے کہ "لوگوں کے حساب کا وقت آ گیا ہے اور وہ ہیں کہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی آتی ہے ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بہ تکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں"۔ ان ابتدائی آیات میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قیامت کے درمیان کسی نبی کی دعوت نہیں آئے گی اسی مضمون کو آپ نے بھی ایک حدیث میں اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے ارشاد فرمایا کہ "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ اب کوئی نبی درمیان میں نہیں آئے گا۔ پھر بتایا گیا کہ ظالم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں یہ تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے پھر کیا دیکھتے ہوئے بھی تم جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے یہ لوگ آپ کو شاعر بھی قرار دیتے ہیں حالانکہ آپ سے پہلے بھی انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ ہم نے ان لوگوں کی طرف جو کتاب بھیجی ہے اس میں ان ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

پھر آیت ۱۰ تا ۲۴ میں بیان کیا گیا کہ ہم نے بہت ہی ظالم قوموں کو ہلاک کر دیا کیونکہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ شرک کیا تھا اور یہ لوگ بھی تباہ ہوں گے۔ یہ لوگ شرک کرتے ہیں یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن سے وہ پاک ہے کیا دنیا جس نظم و ضبط سے چل رہی ہے اگر ایک سے زائد خدا ہوتے تو یہ نظم و ضبط قائم نہ رہتا اور پورا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہی ہے۔

بعد ازاں آیت ۲۴ تا ۲۹ میں فرمایا گیا کہ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لیا ہے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے فرما دیجیے کہ تمہارے پاس اگر اس کے متعلق کوئی دلیل ہے تو وہ پیش کرو یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے تم لوگ میری ہی عبادت کرو۔ یہ لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں چنانچہ اپنا شفیع سمجھتے ہوئے فرشتوں کو معبود قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ تو صرف بندے ہیں۔

پھر آسمان و زمین کی تخلیق شب و روز اور شمس و قمر کی پیدائش کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ سب فانی ہیں اور اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی ہے اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ منکرین حق جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔ جلد بازی نہ کرو۔ عنقریب میں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کب وہ وعدہ پورا ہو گا کاش یہ لوگ جانتے کہ کس طرح اچانک وہ وقت ان پر آئے گا جبکہ وہ اس کو دفع نہ کر سکیں گے نہ اپنے منہ کو آگ سے بچا سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھیں اور نہ کہیں سے انھیں مدد پہنچے گی۔

اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے لیکن مذاق اڑانے والے تباہ ہو گئے آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ کون ہے جو رات کو یا دن کو تمھیں رحمان کے عذاب سے بچا سکتا ہے کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلہ میں ان کی مدد کر سکیں۔ وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تم کو وحی کی بنا پر ڈرا رہا ہوں لیکن یہ بہرے ہیں آپ کی پکار کو نہیں سنیں گے قیامت میں ان کا پورا پورا احتساب ہو جائے گا۔

ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور ذکر عطا کیا تھا تاکہ خدا سے ڈرنے والے متقین اس سے مستفید ہوں۔ اب یہ بابرکت ذکر یعنی قرآن نازل کیا ہے تو کیا یہ لوگ اس کا انکار کریں گے۔

آیت ۵۱ تا ۹۲ میں متعدد انبیائے کرام مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، اسحٰق، یعقوبؑ علیہم السلام وغیرہم کا قصہ ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ تمھاری یہ اُمت ایک ہی ہے لیکن ان لوگوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا پھر قیامت اور اس کی ہولناکی بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ہم قیامت ضرور قائم کریں گے اور وہاں میرے صالح بندے اُسی زمین کے وارث ہوں گے اب (آیت ۱۰۶ تا ۱۱۲) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے یہ مشرکین آپ کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے ہیں حالانکہ آپ زحمت نہیں بلکہ رحمت ہی رحمت ہیں آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے تو کیا تم سر اطاعت جھکاؤ گے؟ اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دیجیے کہ میں نے تمھیں خبردار کر دیا ہے اب میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا دور۔ اللہ جانتا ہے وہ باتیں جو بلند آواز سے کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو۔

سورۃ الحج

اس سورۃ کے شروع میں قیامت کے ہولناک منظر کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ یقیناً قائم ہو کر رہے گی جس طرح اللہ تعالےٰ عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے اسی طرح دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے، جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور جنہوں نے اس کو مان لیا وہ جنتی ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کعبہ اور اعلان حج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد (آیت ۳۸ تا ۴۱) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ان لوگوں سے جنگ کی اجازت دی گئی جو جنگ کریں اور ظلم کریں۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اپنے گھروں سے ناحق محض اس بنا پر نکالے گئے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور عبادت گاہیں مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد فرمائیں گے یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر اللہ تعالےٰ ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

آیت ۴۲ تا ۴۶ میں کہا گیا۔ "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ مشرکین آپ کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں آپ سے

پہلے دیگر انبیاؑ کی قوموں نے بھی انھیں جھٹلایا لیکن ہم نے ان جھٹلانے والوں کو مہلت دی پھر ہم نے ان کی گرفت کی اور کتنی ہی ظالم آبادیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے ہوتے مگر ان کے دل اندھے ہیں۔"

(آیت ۴۹ تا ۵۱) "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اے لوگو میں تو صرف تمہارے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں - اس لیے جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے۔"

(آیت ۵۲ تا ۵۴ میں) پھر فرمایا گیا "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے جو رسول یا نبی ہیں سبھوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ جب انہوں نے تمنا کی تو شیطان ان کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ تعالے ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کرتا ہے تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے - ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو لوگ علم والے ہیں وہ جان لیں کہ یہ حق ہے جو آپ کے رب کی طرف سے آیا ہے۔"

آیت ۶۵ تا ۷۸ میں فرمایا گیا "کہ ہم نے ہر اُمّت کے لیے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے اس لیے اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اس معاملہ میں آپ سے جھگڑا نہ کریں - آپ تو اپنے رب کی طرف دعوت دیں اگر وہ لوگ آپ سے جھگڑیں تو کہہ دیجیے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے قیامت میں اللہ ان کی ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو پھر آخری آیت میں تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے - اللہ تعالے نے تم لوگوں کو اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر قائم ہو جاؤ - اللہ تعالے نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تمھارا یہی نام ہے "تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو" اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو "شہید" یعنی گواہ کہا گیا ہے ترمذی کی روایت ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت پیش ہوگی اللہ تعالے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمائے گا کیا تم نے تبلیغ کر دی تھی ؟ وہ جواب میں عرض کریں گے ہاں اے پروردگار میں نے تیرے احکام پہنچا دیے تھے پھر ان کی قوم سے اللہ تعالے فرمائے گا کیا نوح (علیہ السلام) نے میرے احکام پہنچا دیے تھے ؟ تو وہ لوگ جواب دیں گے کہ نہیں ہمارے پاس تو کوئی نبی ہی نہیں آیا - پھر اللہ تعالے حضرت نوحؑ سے فرمائیں گے کوئی ہے جو تمہاری گواہی دے سکے ؟ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں عرض کریں گے جی ہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی اُمّت اس بات کی گواہ ہے کہ ہم نے آپ کے احکام پہنچا دیے تھے - چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصدیق فرمائیں گے اور امّت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کی تصدیق کرے گی۔"

اٹھارھواں پارہ شروع ہوتا ہے :-

سورۃ المومنون

اس سورۃ میں اطاعتِ رسول اور اتباع نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بحث کو مرکزی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اس کی ابتدا ہی اس آیت سے ہوتی ہے کہ جو لوگ مومن ہیں یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات جن لوگوں نے مان لی ہے وہ کامیاب ہو گئے ہیں - پھر ان

لوگوں کی چند بنیادی صفات بیان کی ہیں وہ یہ کہ نماز میں خشوع سے کام لیتے ہیں، لغو سے پرہیز کرتے ہیں - زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں امانت وعہد کا پاس رکھتے ہیں - نماز کی پابندی کرتے ہیں ایسے لوگ جنت کے وارث ہیں۔

پھر آیت ۱۲ تا ۲۵ میں انسان کی تخلیق، آسمان و زمین اور نباتات وحیوانات وغیرہ کی پیدائش کو بیان کرکے انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کیے ہیں اُن قصوں سے مقصود یہ ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیم ایک رہی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں لیکن بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا - اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے اس لیے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے تو انھیں چھوڑ دیں اپنی غفلت میں ایک خاص وقت تک ڈوبے رہیں - مومنوں اور مشرکوں کا حال بیان کرتے ہوئے۔

(آیت ۶۹) میں فرمایا گیا کہ منکرین آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ کو جنون ہے حالانکہ آپ حق لے کر آئے ہیں لیکن ان کی اکثریت کو حق ناگوار ہے - اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

(آیات ۸۱-۹۰) یہ کفار کہتے ہیں کہ کیا مر جانے اور مٹی ہو جانے پر ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے ایسی باتیں تو اس سے پہلے بھی ہم سے کہی جا چکی ہیں؟ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ زمین اور اس پر کی ساری چیزیں کس کی ہیں، ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ ہی ہے - پھر کیوں یہ لوگ دھوکے میں ہیں۔

(آیت ۹۳-۹۸) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) دعا کیجیے کہ پروردگار جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے تو اے میرے پروردگار مجھے ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔"

پھر حکم دیا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) برائی کو اس طریقہ سے دفع کیجیے جو بہترین ہو یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں آپ دعا کیجیے کہ "اے پروردگار میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے پروردگار میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔"

(آیت ۹۹ تا ۱۱۵ میں) موت اور حشر کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ کیا ان لوگوں کا خیال ہے ہم نے ان لوگوں کو عبث پیدا کیا ہے اور یہ میری طرف لوٹائے نہیں جائیں گے جنھوں نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا تو اس کا حساب ان کے پروردگار کے پاس ہے یہ لوگ فلاح نہیں پا سکتے پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دعا کریں کہ میرے رب درگذر فرما اور رحم کر اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔

سورۃ النور

یہ سورۃ زنا، قذف اور لعان کے قانون پر مشتمل ہے - پردے کے قواعد و احکام بیان کیے گئے ہیں شادی کے قابل لوگوں کے مجرد بیٹھے رہنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے کسی کے گھر جانے پر اذن طلبی کا قاعدہ بیان کیا ہے غرض اس طرح کے معاشرتی ومجلسی آداب اس سورۃ میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں ان احکام کو بیان کرتے ہوئے آیت ۵۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ آپ

کہہ دیں کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اسی کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی اطاعت کروگے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔ پھر آیت ۶۲ - ۶۳ میں فرمایا گیا کہ" مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے ہیں اس لیے جب وہ آپ سے اجازت مانگیں تو آپ جسے چاہیں اسے اجازت دے دیں اور ایسے لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں اللہ تعالےٰ یقیناً غفور و رحیم ہے پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ذہن نشین کراتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ دیکھو" اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔" گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کسی فتنہ میں پڑ جانے کا عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے کا سبب ہے اللہ تعالےٰ ہم سبھوں کو آپ کے حکموں کے خلاف ورزی سے محفوظ رکھیں۔ آیت میں" دعاء الرسول" کا لفظ ہے اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ رسول کو دوسروں کی طرح نہ پکارو۔ یا یہ کہ رسول پکاریں تو دوسروں کے پکارنے کی طرح اُن کی پکار کو ناقابلِ اعتنا نہ سمجھو۔ یا یہ کہ رسول کی دعا کو دوسروں کی دعا کی طرح نہ سمجھو۔ بہرحال تینوں مفہوم کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بزرگی ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ الفرقان

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ" بابرکت ہے وہ جس نے یہ فرقان (قرآن) اپنے بندے پر (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر) نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو۔ نذیر کے معنی ہیں ڈرانے والا، خبردار کرنے والا، گمراہی کے نتائج سے باخبر کرنے والا۔ آپ سے پہلے جو انبیاء آتے تھے وہ ایک مخصوص آبادی کے لیے آتے تھے لیکن آپ سارے جہان کے لئے نذیر ہیں لیکن کفار اس قرآن کو کہتے ہیں کہ من گھڑت چیز ہے جس کو آپ نے خود گھڑ لیا ہے اور لوگوں نے اس کام میں آپ کی مدد کی ہے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے (آیت ۶ میں) فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اس کو تو اس نے نازل کیا ہے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔

پھر (آیت ۷) میں کفار کا قول نقل کیا ہے کہ" یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور دوسروں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ اس قول کے نقل کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے (آیت ۹ میں) کہا گیا ہے کہ آپ دیکھیے کیسی کیسی عجیب حجتیں یہ لوگ آپ کے آگے پیش کر رہے ہیں۔ بہک گئے ہیں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اللہ اگر چاہتا تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی بہتر چیزیں دے دیتا۔ یہ لوگ ایسی باتیں جو کہتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان لوگوں

نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے اور ان جھٹلانے والوں کے لیے ہم نے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے۔

(آیت ۱۵) اسے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن سے پوچھیے کہ یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے۔" آپ سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے تھے۔ (اصل بات یہ ہے کہ) ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کہ آیا تم ثابت (قدم) بھی رہتے ہو (یا نہیں) اور بے شک آپ کا رب سب کچھ دیکھتا ہے" (آیت ۲۰)

انیسواں پارہ شروع ہوتا ہے:-

منکرین اب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل ہوئے یا ہم اللہ ہی کو دیکھ لیتے، یہ رسولوں کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ پاک فرماتا ہے کہ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ دن ان مجرموں کے لیے خوشی کا دن نہ ہوگا۔ (یعنی جس دن آسمان پھٹ جائیں گے اور فرشتوں کا ہجوم نظر آئے گا تو یہ مجرمین چاہیں گے کہ ان کے اور فرشتوں کے درمیان کوئی مضبوط آڑ واقع ہو جائے تاکہ انھیں نہ دیکھ سکیں)" اُس دن حقیقی بادشاہی (خدائے) رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔ آیت ۲۶) اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا ہے (جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ شور کرتے ہیں اور اسے سُننے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے)۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں، بلکہ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کو ایسے سرکشوں سے کم یا زیادہ سابقہ ہوا ہے جو دین کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالتے اور لوگوں کو راہ حق سے روکتے تھے۔

پھر اسی کے ساتھ آیت ۳۲ میں کفار کا یہ قول نقل کیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ پر قرآن یکبارگی ہی کیوں نہیں اتار دیا گیا، اس کے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ ہاں ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ اس کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو قوی رکھیں اور ہم نے اس کو بہت ٹھیر ٹھیر اکر اتارا ہے اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں۔

پھر آیت ۴۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ" یہ لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کیا یہی شخص ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ تو ہمیں اپنے معبودوں سے ہی ہٹا دیتا اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے" پھر فرمایا گیا کہ" عنقریب جبکہ وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہ تھا گویا آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان کے مذاق اڑانے پر صبر کیجیے اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی خبر لے گا"

آیت ۵۱ - ۵۲ میں ارشاد باری ہے کہ" اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک نذیر مبعوث کر دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اس لیے اسے نبیؐ آپ کافروں کی بات ہرگز نہ مانیے اور اس قرآن کے ذریعے آپ ان کے ساتھ جہاد کبیر کیجیے"

آیت ۵۶ - ۵۷ میں آپؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو تو بس ایک خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں اس کام پر تم لوگوں سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے اور آپ تو اس خدا پر بھروسا رکھیے جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی

حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے "۔
آخری آیت ۷۷، میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میرے رب کو تمھاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے تو عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہو گی"۔ یعنی اگر تم لوگ اللہ سے دعائیں نہ مانگو اور اپنی حاجتیں اللہ سے نہ مانگو تو اللہ اس کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسے اس کی پروا ہے بلکہ تم خود اس کے محتاج ہو اور تمھارا اس میں فائدہ ہے۔

سورۃ الشعراء

پانچویں منزل شروع ہوتی ہے۔
اس سورۃ کی ابتداء میں قرآن پاک کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کتاب مبین ہے۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اضطراب کا ذکر ہے جو لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ " شاید اس بات پر کہ وہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں گے"۔ (آیت ۳)۔ یہی بات سورۃ کہف کی آیت ۶ میں بھی ہے اور سورۃ فاطر کی آیت ۸ میں بھی یہی مضمون ملتا ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کے انکار پر آپ دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے۔ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ " میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے روشنی کے لیے آگ جلائی مگر پروانے جل جانے کے لیے اُس پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں مگر پروانے اس کی چلنے نہیں دیتے۔ ایسا ہی میرا حال ہے کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں کودے جاتے ہو"۔ اللہ اللہ کس قدر اُمت کی خیر خواہی آپ کے دل میں تھی۔ غرض، ان آیات میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ اس کا اتنا غم نہ کریں۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ اُن کی گردنیں اُس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ رحمٰن کی طرف سے جو نصیحت بھی آتی ہے تو یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ یہ لوگ جس چیز کا مذاق اُڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کی حقیقت ان کو مختلف طریقوں سے معلوم ہو جائے گی۔ اگر یہ زمین ہی کو دیکھ لیں اور اس پر غور کریں تو اسی میں انھیں بہت سی نشانیاں نظر آئیں گی۔ لیکن ان میں اکثر جاننے والے نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ پاک کا (خاص) رحم ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ ورنہ اگر وہ چاہے تو فوراً انھیں تباہ کر دے۔
پھر آیت ۱۰ تا ۱۹۱ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، قوم عاد و ثمود اور لوط علیہ السلام کی قوم اور شعیب علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان تمام واقعات میں یہ بات قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے کہ انکار کرنے والوں کو اللہ پاک نے پہلے تو خوب ڈھیل دی لیکن پھر وہ لوگ اُس کے عذاب میں ایسے گرفتار ہوئے کہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔
پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ یہ قرآن، رب العالمین کی نازل کی ہوئی چیز ہے جسے روح الامین (جبریل علیہ السلام) لے کر آپ کے قلب پر اُترے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ یہ کتاب صاف عربی زبان میں نازل ہوئی ہے۔ یہی الٰہی تعلیم سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ پھر آیت ۱۹۶ - ۲۰۲ میں ہے کہ کیا ان منکرین کے لیے یہ نشانی (کافی) نہیں کہ اسے علمائے بنی اسرائیل (خوب) جانتے ہیں (اگرچہ اہل مکہ اس علم کتاب سے ناآشنا ہیں) کہ یہ وہی تعلیم ہے جو سابقہ کتب آسمانی میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ اس قدر ہٹ دھرم

ہیں کہ اگر ہم اس کتابت کو کسی عجمی پر نازل کرتے (جیسا کہ انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی) اور وہ عجمی ان کو یہ کتاب پڑھ کر سُناتا تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ یہ لوگ دردناک عذاب دیکھنا چاہتے ہیں، پھر مہلت مانگیں گے۔

آیت ۲۱۰-۲۲۷ میں بھی قرآن کے متعلق ہے کہ اس کو شیاطین لے کر نہیں اُترے بلکہ ان کو تو اس کے کان لگا کر سننے کا موقع بھی نصیب نہیں پھر آپ کو اپنے قریب ترین عزیزوں کو ڈرانے کا حکم ہے اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ آپ کی پیروی کریں تو اُن سے نرمی کا برتاؤ کیجیے۔ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ فرما دیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے بَری ہوں - اور آپ بڑے غلبہ والے رحیم پر بھروسا کیجیے جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ (تنہائی میں عبادت کے لیے) اُٹھتے ہیں اور (جب) آپ نمازیوں کے ساتھ ہوتے ہیں - پھر فرمایا کہ شیاطین ان لوگوں پر اُترتے ہیں جو جعل سازاور بدکار ہیں، سُنی سُنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں - آپ جو کلام پیش کر رہے ہیں اُس کو شعر سے کیا نسبت؟ شعرا کی پیروی تو بہکے ہوئے لوگ کرتے ہیں اور یہ لوگ ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے - بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر عمل کیا اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا - یہ ظالم جو آپ پر ظلم کرتے ہیں کہ آپ کو شاعر، کاہن، ساحر اور مجنون کہتے ہیں اور اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں - عنقریب اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں -

سورۃ النّمل

یہ سورۃ مکی ہے اس کی ابتدا بھی اسی بات سے کی گئی ہے کہ یہ قرآن کی اور کتاب مبین کی آیتیں ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری مومنین کے لئے ہے جو نماز کی پابندی کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لئے بُرا عذاب ہے اور یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں -

پھر آیت ۶-۷ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ یہ قرآن ایک حکیم وعلیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہیں - آپ ان لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنائیے - پھر حضرت موسیٰؑ کا اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کا اور ملکہ سبا کا حضرت صالحؑ اور قوم لوطؑ کے واقعات بیان کر کے بتایا گیا کہ جن لوگوں نے نافرمانی کی اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے انکار کیا وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور تباہ ہو گئے - آیت ۵۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر فرمایا گیا کہ آپ کہہ دیجیے کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے برگزیدہ کیا - پھر ان سے پوچھئے کہ اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنھیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں -

<u>بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

(آیت ۶۰-۶۴) میں آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے - بارش کون برساتا ہے جس کی وجہ سے تمہاری کھیتیاں سرسبز وشاداب ہو جاتی ہیں؟ مصیبت زدہ کی پکار کون سنتا ہے اور کون ہے جو مصیبتوں کو دور کرتا ہے؟ خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں کون راستہ دکھاتا ہے؟ اور کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور آسمان

زمین سے کون تم کو رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک ہے؟ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ اور ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔

کفار کہتے ہیں کہ جبکہ ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے کیا ہمیں قبروں سے نکالا جائے گا؟ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیجیے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے؟ اور آپ ان لوگوں کے حال پر رنج نہ کریں اور نہ ان کی چالوں سے دل میں تنگی محسوس کریں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو وہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ کیا عجب کہ جس عذاب کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمھارے قریب ہی آ گیا ہو۔ آپ کا پروردگار لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ گویا یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ فوری طور پر گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اگر سنبھل گئے تو فبہا ورنہ تباہ ہو گئے۔

آیت ۷۳۔۸۱ میں فرمایا گیا کہ "آپ کا پروردگار جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اس لیے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ پر بھروسا رکھئے آپ ہی صریح حق پر ہیں۔ آپ ان مُردوں کو اور نہ بہروں کو سُنا سکتے ہیں۔ یہ لوگ تو مُردوں کی طرح ہیں کہ ان میں کسی بات کے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اور نہ ہی آپ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں۔ آپ تو ان ہی لوگوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور فرمانبردار بن جاتے ہیں۔"

پھر قیامت کی ہولناکی بیان کرنے کے بعد آیت ۹۲۔۹۳ میں فرمایا گیا کہ "جو شخص نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ قیامت کے ہول سے محفوظ ہوں گے اور جو برائی لے کر آئے گا تو ایسے لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ اس کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو ان سے کہہ دیجئے کہ "مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان بن کر رہوں نیز یہ بھی حکم دیا گیا کہ میں قرآن پڑھ کر سُناؤں۔ اس لئے جو شخص ہدایت اختیار کرے گا تو اپنے بھلے ہی کے لئے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو تو اس سے کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ اور کہہ دیجیے کہ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں دکھائے گا تو تم انھیں پہچان لو گے اور پروردگار ان کاموں سے بے خبر نہیں ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ قرآن آپ پڑھ کر سنا دیں اب ہدایت حاصل کرنا ان کا کام ہے اگر یہ نصیحت کو قبول کر لیں تو اس میں ان ہی کا فائدہ ہے اور نہ قبول کریں تو ان ہی کا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں آپ ان لوگوں کے قبول ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

سورۃ القصص

یہ سورۃ مکی ہے اس میں بھی یہ کہہ کر کہ "یہ کتاب مبین کی آیات ہیں" فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح فرعون نے تکبر کی راہ اختیار کی قتل و خونریزی کا بازار گرم کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے گھر میں پرورش کرائی پھر ان ہی کو اس کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اس طرح کہ ایک طرف شاہی جاہ و جلال تھا تو دوسری طرف بے سروسامانی اور ظاہری ضعف و

کمزوری تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کامیاب و بامُراد ہوئے اور فرعون غرق ہوُا اور تباہی سے دوچار ہوا۔ ان کا پورا واقعہ آیت ۱-۴۲ تک بیان ہوا پھر آیت ۴۳ میں ذکر کیا گیا کہ "ہم نے پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر، ہدایت اور رحمت بنا کر تاکہ شاید یہ لوگ سبق حاصل کریں۔ پھر آیت ۴۴ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہماری آیتیں پڑھ کر جو آپ سُناتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر قوموں کا حال بیان کر رہے ہیں تو آپ اس وقت موجود نہ تھے۔ وہ خبریں تو ہم بھیجتے ہیں۔ آپ تو مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب موسیٰ ع (علیہ السلام) کو ہم نے یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے آپ اہلِ مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے اور آپ طور کے دامن میں بھی موجود نہ تھے۔ جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پہلی مرتبہ پکارا تھا۔ یہ تو آپ کے پروردگار کی رحمت ہے کہ آپ کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ وہ لوگ ہوش میں آ جائیں لیکن جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آ گیا تو وہ آپ کے متعلق کہنے لگے کہ کیوں نہ آپ کو وہی چیزیں دی گئیں جو موسیٰ کو دی گئی تھیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ اگر آپ کو وہی چیزیں دی جاتیں جو موسیٰ کو دی گئی تھیں تو بھی وہ ایمان نہ لاتے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کر چکے ہیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں یہ تو قرآن اور توریت دونوں کو جادو کہتے ہیں، اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ لاؤ کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو کہ میں اس کی پیروی کروں۔ اب اگر وہ آپ کا مطالبہ پورا نہیں کرتے تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ اصل میں اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں ان سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

آیت ۵۶ میں فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے، وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔

آیت ۶۸-۷۲ میں ارشاد ہے کہ آپ کا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے خود ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا نہیں اللہ پاک ہے۔ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں بہت ہی بالاتر ہے آپ کا پروردگار جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دنیا اور آخرت میں اُسی کی فرمانروائی ہے آپ ان لوگوں کو توجہ دلائیے کہ بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کیلئے رات مسلط کر دے تو کس کی طاقت ہے کہ دن کی روشنی لے آئے یا اگر دن ہی ہمیشہ کیلئے مسلط کر دے تو کون ہے جو رات لائے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو، یہ اللہ کی ہی رحمت ہے کہ اُس نے رات اور دن پیدا کئے تاکہ تم لوگ سکون حاصل کرو اور رزق تلاش کر سکو۔

پھر آیت ۷۵-۸۴ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود راہِ حق میں خرچ کرنے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں وہ زمین میں اپنے خزانہ سمیت دھنسا دیا گیا۔ کیونکہ انجام کی بھلائی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو ڈرنے والے ہیں بعد ازاں (آیت ۸۵-۸۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا جا رہا ہے اور تسلی بھی دی جا رہی ہے کہ یہ منکرین آپ کے خلاف ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ یقین جانیے کہ جس نے یہ قرآن آپ پر فرض کیا ہے (یعنی لوگوں تک اس کے پہنچانے اس کی تعلیم دینے اور اصلاح کی ذمہ داری ڈالی ہے) وہ آپ کو ایک بہترین انجام تک پہنچانے والا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کون کھُلی گمراہی میں مبتلا ہے۔ آپ اس کی امید تو نہ رکھتے تھے کہ آپ پر کتاب

نازل کی جائے گی یہ تو صرف آپ کے پروردگار کی مہربانی ہے کہ اُس نے آپ پر کتاب نازل کی اس لئے آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں - اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب آپ پر نازل ہوں تو کفار مکہ آپ کو ان کی تبلیغ و اشاعت سے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے باز رکھیں - آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں اور مشرکوں میں ہرگز شامل نہ ہوں - اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریئے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ، اللہ کی ذات کے سوا تمام چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں - اسی کی ذات باقی رہنے والی ہے - اسی کی فرمانروائی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے -

سورۃ العنکبوت

یہ سورۃ مکی ہے - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے شیدائیوں اور جاں نثاروں پر ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے - چنانچہ ان لوگوں کو ہمت دلائی گئی اور ان میں عزم و استقامت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی کفار مکہ کو تہدید بھی کی گئی کہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو دیگر انبیائے کرام کو جھٹلانے والوں کا ہوتا رہا ہے -

(آیت ۱-۷) اس سورۃ کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ کیا جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ بغیر آزمائش کے چھوڑ دیئے جائیں گے ہم تو ان سے پہلے بھی لوگوں کو آزمائش میں ڈال چکے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اپنے دعویٰ میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں - اور جو لوگ بُری حرکتیں کر رہے ہیں کیا ان کا خیال ہے کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے ، ایسا نہیں ہو سکتا ، جو شخص اللہ کی لقا کا اُمیدوار ہو تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ وقت یقیناً آنے والا ہے اور جو شخص بھی جہاد کرے گا تو وہ اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اللہ تو بے نیاز ہے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی برائیاں دور کر کے ہم ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے -

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص مسلمان ہوئے تو ان کی ماں نے کہا کہ جب تک تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کرے گا - میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے - اگر تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کا مرتکب ہو گا - حضرت سعدؓ پریشان ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا اس پر آیت نازل ہوئی کہ " ہم نے انسان کو نصیحت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے معبود کو شریک ٹھیرائے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے ، پھر میں تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو -

پھر (آیت ۹-۱۳) منافقین کا ذکر ہے آیت ۱۴-۴۴ میں حضرت نوح علیہ السلام حضرت لوطؑ - اور حضرت شعیب علیہ السلام اور قوم عاد و ثمود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے تمام منکرین اور مخالفین حق کی گرفت کی کسی پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا ، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا - اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے - ان واقعات کے ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شیدائی پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہوں اور سخت ترین مصائب و مشکلات میں بھی صبر استقامت کے ساتھ حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھیں - اور اللہ پر بھروسہ رکھیں - دوسری طرف منکرین اور مخالفین کو دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر تم مخالفت سے باز نہ آئے تو

تم کو بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے دیگر قوموں کو دوچار ہونا پڑا ۔ شرک کرنے والوں کی حقیقت ایک مثال سے سمجھائی گئی کہ " جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے "

اور یہ مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے لیے دی جاتی ہیں اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں ۔

اکیسواں پارہ شروع ہوتا ہے

اس سورہ کے ابتدائی گذشتہ چار رکوعوں میں (آیت ۱ - ۴۴) اہل ایمان کو صبر و استقامت اور توکل کی تلقین اور کفار کو دیگر اقوام کا عبرتناک انجام یاد دلانے کے بعد اب (پارہ ۲۱، آیت ۴۵)

بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا جا رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ تمام اہل ایمان مخاطب ہیں ۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اے نبی آپ تلاوت کیجیے اس کتاب کی جو آپ کی طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کیجیے ، نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے ۔ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو ۔

پھر آیت ۴۶ - ۵۲ میں اہل کتاب سے عمدہ طریقے پر بحث کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ " اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر پہلی کتابوں کی طرح کتاب اتاری چنانچہ وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں اور آپ تو اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے یعنی آپ جو نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ پڑھنا ہی جانتے ہیں آپ امی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا پیش کرنا خدا ہی کی جانب سے ہو سکتا ہے اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ علم آپ کو وحی کے ذریعے حاصل ہوا ہے ۔ اگر آپ لکھے پڑھے ہوئے ہوتے تو البتہ ان منکرین کو شک و شبہ کی گنجائش ہوتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے ۔ اور ہماری آیتوں کا انکار ظالم ہی کرتے ہیں ۔ یہ منکرین کہتے ہیں کہ آپ پر کوئی نشانی یعنی معجزہ کیوں نہیں اتارا گیا جنھیں دیکھ کر یہ یقین آ جائے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں تو آپ فرما دیجیے کہ نشانیاں اور معجزات تو اللہ کے پاس ہیں ۔ میں تو صرف کھول کھول کر خبردار کرنے والا ہوں ۔ کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہی کے لئے کافی ہے وہ آسمان اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے جو باطل پرست ہیں وہ خسارے میں رہنے والے ہیں ۔

آیت ۵۳ ۔ ۵۵ میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ آپ سے عذاب میں جلدی کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا ، عذاب تو یقیناً اپنے وقت پر آ کر رہے گا اور اچانک اس حال میں آئے گا کہ انھیں خبر بھی نہ ہو گی وہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے اور انھیں اس روز پتا چلے گا جبکہ عذاب انھیں اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانگ لے گا ۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب تم اعمال کا مزہ

پچھے ہو ظلم کرتے تھے۔

آیت ۵۶، ۵۷ میں فرمایا گیا کہ "اے میرے مومن بندو میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرو"۔ اس سے ہجرت کی طرف اشارہ ہے یعنی اگر کسی جگہ خدا کی عبادت مشکل ہو رہی ہے تو "ہر ملک ملکِ خدا تنگ نیست"۔ جہاں بھی تم خدا کی بندگی کر سکتے ہو۔ وہاں چلے جاؤ۔ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے پھر تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آیت ۵۸-۶۳ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُن کے لیے جنت ہے جہاں صبر کرنے والوں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں کو بہترین اجر ملے گا۔ ہجرت میں تمھیں روزی روزگار کے لیے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق نہیں اُٹھائے پھرتے ہیں اللہ ان کو رزق دیتا ہے تمھیں بھی رزق دے گا۔ وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند سورج کو کس نے مسخر کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے پھر یہاں کیوں دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کس نے برسائی جس سے زمین مردہ میں جان پڑ جاتی ہے تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے بارش برسائی۔ آپ کہہ دیں کہ الحمدللہ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔

آیت ۶۴، ۶۹ میں بتایا گیا کہ یہ دنیوی زندگی صرف کھیل اور دل کا بہلاوا ہے اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش ان لوگوں کو اس کا علم ہوتا۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں اور جب وہ انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں" تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفرانِ نعمت کریں۔ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں یا جھٹلانے والوں سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔ آخری آیت میں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ جدوجہد کرتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا ہے بلکہ ان کی دستگیری اور رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لیے کھول دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ "جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سورۃ الروم

یہ سورۃ مکی ہے۔ رومیوں اور ایرانیوں یا نصرانیت اور مجوسیت میں سخت کشمکش تھی۔ جنگ میں رومی مغلوب ہوئے۔ چونکہ عیسائی توحید و آخرت کو مانتے تھے اور رسالت کو سرچشمۂ ہدایت مانتے تھے اس لیے روم و ایران کی جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ تھیں اور کفارِ مکہ ایران سے ہمدردی رکھتے تھے رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کو ایران کا غلبہ ناگوار ہوا لیکن کفارِ مکہ اس پر خوش تھے، چنانچہ اس سورۃ کی ابتدا اس سے کی گئی کہ اگرچہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند سال گزرنے نہ پائیں گے کہ یہی رومی غالب آ جائیں گے اس پیش گوئی سے مسلمانوں کو اطمینان ہوا۔ جن دنوں یہ آیت نازل ہوئی اس زمانے کے حالات سے کسی طرح بھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ رومی چند سالوں ہی میں پھر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ کفارِ مکہ نے ان آیات کے نزول پر مسلمانوں کا خوب مذاق اڑایا۔ اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے حضورِ انور

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں "بضع سنین" کا لفظ آیا ہے اور "بضع" کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے۔ اس لئے دس سال کے اندر کی شرط کرو۔ اور اونٹوں کی تعداد دس سے سو کر لو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا۔ خدا کی قدرت ہے کہ دس سال کے اندر ہی اندر یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے موقع پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فتح نصیب ہوئی۔ ظاہر بین نگاہیں کچھ اور دیکھتی ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے جس سے انسان بے خبر ہوتا ہے اُدھر رومی ظاہر حالات کے بالکل برعکس دس سال کے اندر ہی اندر پھر غالب آ گئے تو اِدھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار شیدائی بدر کے میدان میں اپنی ظاہری بے سروسامانی کے باوجود غالب آ گئے۔

غرض اس سورۃ میں ابتداً تو رومیوں کے غلبہ کی پیش گوئی سنا کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی گئی پھر خود مسلمانوں کی بھی کامیابی کی پیش گوئی کی گئی۔

چنانچہ آیت ۲-۷ میں فرمایا گیا کہ قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر پھر وہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور وہ دن وہ ہو گا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے یہ اللہ کا وعدہ ہے اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں، لوگ دنیوی زندگی کا صرف ظاہری پہلو جانتے ہیں بعد ازاں آخرت کا مضمون شروع ہو گیا اور تین رکوع تک مختلف طریقوں سے آخرت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا کہ (آیت ۱۶-۱۷) "تسبیح کرو اللہ کی جبکہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اور اس کی تسبیح کرو تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔" اس آیت میں نماز کے چار اوقات یعنی فجر، مغرب، عصر اور ظہر کی طرف اشارہ ہے خدا کی نشانیاں بیان کی گئیں کہ زندہ کو مُردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ انسان کو مٹی سے پیدا کیا، انسان کے لئے انسان ہی کی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ آپس میں محبت و رحمت پیدا ہو آسمان و زمین کی تخلیق کی، زبان اور رنگ کا اختلاف، رات کو سونا، دن کو طلب رزق کرنا، بجلیوں کی چمک، آسمان سے بارش۔ آسمان و زمین کا اس کے حکم سے قائم رہنا یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تخلیق کی ابتدا کی ہے وہ اس کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے لیکن ظالم خواہشاتِ نفس کے بدلے اس کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کو کون راستہ دکھا سکتا ہے۔ اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ یکسو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی سمت جما دیجیے اور اس فطرت پر قائم ہو جائیے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کے خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی دین بالکل راست ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

آیت ۳۹ میں سود کی مذمت بیان کی گئی اور یہ پہلی آیت ہے جو اس کی مذمت میں نازل ہوئی۔

آیت ۴۱-۴۴ میں پھر روم و ایران کی جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے۔ لوگوں کے اعمال کے سبب سے" تاکہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید کہ وہ باز آ جائیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ پہلے گزری ہوئی قوموں کا کیا انجام ہوا، ان میں سے اکثر مشرک تھے اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ اس سیدھے دین کی سمت میں جما دیجئے اس دن کے آنے سے پہلے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں جس نے کفر

کیا تو اس کفر کا وبال اُسی پر ہوگا اور جس نے نیک کام کئے تو وہ اپنے ہی لئے فلاح کا راستہ ہموار کر رہا ہے۔

آیت ۵۲ - ۵۳ میں فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ان بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیرے جارہے ہیں اور نہ تو آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست دکھا سکتے ہیں آپ تو صرف ان ہی کو سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ گویا یہ منکرین مُردہ ہیں اور بہرے ہیں اور اندھے ہیں کہ نہ سُن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں، اس لئے آپ تو اپنا کام کئے جائیں کسی کو راہِ راست پر لے آنا آپ کا کام نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

پھر قیامت کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالوں سے سمجھایا ہے آپ کوئی بھی نشانی لے آئیں منکرین یہی کہیں گے آپ باطل پر ہیں اللہ تعالیٰ بے علم لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ گھبرائیں نہیں بلکہ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور یہ مخالفین آپ کو ہلکا نہ پائیں کہ آپ ان لوگوں کے شور و غوغا سے دب جائیں یا ان کے استہ ہے پست ہمت ہو جائیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعمال و کردار کے ذریعے اپنا وزنی ہونا ثابت کر دیا اور دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مشن سے نہ ہٹا سکی۔ ہلکی چیزیں تو ہوا کے ہلکے جھونکے سے اِدھر اُدھر ہو جاتی ہیں لیکن وزنی چیزوں کا ہٹانا مشکل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو آپ نے پورا کر دیا۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی اصحابہ وعلی اتباعہ اجمعین۔

سورۃ لقمان

یہ سورۃ کی ہے ابتدا میں (آیت ۲-۵) فرمایا گیا کہ یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں جو نیکو کار لوگوں کے لیے رحمت اور ذریعہ ہدایت ہے۔ پھر نیکو کاروں کے اوصاف بیان کئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ایک طرف یہ لوگ ہیں کہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ ایسی کھیل کی باتوں کو خریدتے ہیں

"تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اس کی ہنسی اُڑائے تو ایسے لوگوں کے لئے رسوا کن عذاب ہے"

نضر بن حارث نے قریش سے کہا تھا۔ تم جس طریقے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تم جوان کو ساحر کاہن شاعر اور مجنون کہتے ہو اس پر کون یقین کرے گا جبکہ اس سے پہلے چالیس سال کی عمر تک اس کو صادق اور امین کہتے اور سمجھتے رہے ہو۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر عراق چلا گیا اور وہاں سے شاہان عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لے کر آیا اور داستان گوئی کی محفلیں شروع کر دیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے اور اس مقصد کے لئے کچھ گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ چنانچہ لہو الحدیث "کھیل کود کی باتوں سے اشارہ اسی کی طرف ہے پھر آیت ۷-۸ میں ارشاد ہوا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تکبر کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتے ہیں گویا کہ انہوں نے سنا ہی نہیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایسے لوگوں کو

دردناک عذاب کی بشارت دے دیں۔ ہاں جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ان کے لیے جنت ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

پھر آثار کائنات کی طرف توجہ دلا کر حضرت لقمان کے ان نصائح کو بیان کیا گیا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں اس سے اہل مکہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم لقمان کے حکیمانہ اقوال سے واقف ہو وہ بھی یہی باتیں کہتے تھے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، آپ کوئی نئی بات نہیں فرما رہے ہیں۔

آیت ۲۰-۲۴ میں فرمایا گیا کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ جو شخص اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے تو گویا اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا لیکن جس نے کفر کیا تو آپ اس کفر پر غم نہ کریں انھیں آخر کار پلٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے۔ ہم ان کے سارے کرتوت ان کو بتلا دیں گے۔

آیت ۲۵ میں ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے اور حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ ان چیزوں کا خالق ہے بلکہ اللہ ان کا مالک بھی ہے پھر آیت ۲۷ میں فرمایا گیا کہ اگر ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں تو اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہوں گی بے شک اللہ تعالےٰ زبردست اور حکیم ہے۔

پھر آثار کائنات کی طرف توجہ دلانے کے بعد قیامت سے ڈرایا گیا اور بتایا گیا کہ قیامت کی اسی گھڑی کا علم اللہ ہی کو ہے وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کوئی شخص جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

مختصر یہ کہ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم پیش کر رہے ہیں وہ کوئی نئی تعلیم نہیں توحید و رسالت اور آخرت کی دعوت اس سے پہلے بھی انبیاء دیتے رہے ہیں اس لئے ان لوگوں کو چاہئے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید چھوڑ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیں۔

سورۃ السجدہ

اس سورۃ میں توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے تو اس قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ کتاب بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے لیکن یہ لوگ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو گھڑ لیا ہے حالانکہ یہ حق ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں پھر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بیان کی گئیں انسان کی پیدائش اور موت کا ذکر کیا گیا۔ ماننے اور نہ ماننے والوں کا انجام بتایا گیا پھر آیت ۲۵ میں فرمایا گیا کہ آپ کا پروردگار قیامت کے روز ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

پھر آخر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا یہ منکرین آپ کی باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ

فیصلہ کُن فتح آپ کو کب نصیب ہوگی؟ آپ ان لوگوں سے فرما دیجئے کہ فیصلے کے دن ایمان لانا ان کافروں کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور انتظار کیجئے یہ بھی منتظر ہیں۔

سورۃ الاحزاب

یہ سورۃ مدنی ہے۔ عرب میں منہ بولے بیٹے کو وہی حیثیت حاصل تھی جو نسبی بیٹے کو حاصل تھی۔ حضرت زیدؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دیا تھا، اس نکاح سے حضرت زینبؓ مطمئن نہ تھیں اور خاندان کے لوگ بھی خوش نہ تھے کیونکہ حضرت زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام تھے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مجبور تھے۔ منہ بولے بیٹے کی بیوی سے خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانا ضروری تھا۔ اسی لئے جب حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو آپ کو حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے میں اندیشہ یہ لاحق رہا تھا کہ کہیں اس رسم کہن پر تیشہ چلانے سے کفار و منافقین کو یہ موقع مل جائے گا کہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کر دیں۔ چنانچہ اس سورۃ کی ابتدا ہی اس طرح کی گئی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آیت (۱-۳) اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ سے ڈریئے اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کیجیے بیشک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ آپ تو اس چیز کی پیروی کیجئے جس کا اشارہ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ کو کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو اور اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ ہی وکیل ہونے کے لئے کافی ہے۔

آیت ۵ میں فرمایا گیا کہ حقیقی باپ ہی کی طرف منسوب کر کے منہ بولے بیٹوں کو پکارا کرو۔

آیت ۶ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ آپ مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک مومن جس قدر خود اپنی ذات سے محبت رکھ سکتا ہے اور اپنی ذات کا جس قدر خیر خواہ ہو سکتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ اس سے خیر خواہی کرتے ہیں پھر دوسری خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں یعنی تمام مومنین کی مائیں ہیں۔ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرما لینے کے بعد بھی ان ازواج مطہرات سے کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ نیز یہ بتایا گیا کہ جہاں تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ مختلف ہے لیکن عام مسلمانوں کے درمیان تعلقات اس طرح قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر مقدم ہوں گے۔

پھر آیت (۷-۸) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اے نبی اس عہد و پیمان کو یاد رکھئے جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے۔ آپ سے بھی نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابن مریم سے بھی۔ اور ہم نے پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اب آیت ۹ سے ۲۷ تک غزوہ بنی قریظہ اور غزوہ احزاب کا ذکر ہے۔ چنانچہ ان مہموں میں مسلمانوں کی جو مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی اس کی یاد دہانی فرمائی گئی کہ اے ایمان والو اللہ کے احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے کہ جب تم پر لشکر چڑھ کر آ گئے تو ہم نے ان پر ایک آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں بھیج دیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس

وقت کر رہے تھے ۔

جنگ کی اس آزمائش میں مسلمان مبتلا کیے گئے ۔ منافقین طرح طرح کی باتیں بنا کر اس جنگ سے فرار کی خواہش کرنے لگے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ یہ فرار تمھیں موت یا قتل سے نہیں بچا سکتا ۔

منافقین کے طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا (آیت ۲۲) کہ درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا ۔ ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے ۔ یعنی جب اس جنگ کی شدت اور مصیبت کو برداشت کرنے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے پیچھے نہیں تھے ، اور آپ تمام لوگوں کی مصیبتوں میں شریک تھے تو جو لوگ ایمان کے مدعی تھے ان کو آپ کے طریقہ کار کو اختیار کرنا چاہیے تھا ، نہ کہ فرار کی راہ اختیار کرتے ۔ اسی طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر معاملہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو نمونہ سمجھیں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں ۔ پھر آیت ۲۱-۲۴ میں سچے مسلمانوں کی حالت بیان کی گئی کہ جب ان سچے مومنین نے حملہ آور لشکر کو دیکھا تو بول اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ نے اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی تھی اور اس واقعہ نے ان لوگوں کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا ۔ ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا اور بعض نے اپنی نذر پوری کر دی اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے ۔ اور انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی ، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے ۔

آیت ۲۵ - ۲۷ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا منہ پھیر دیا اور وہ کوئی فائدہ اٹھائے بغیر دل کی جلن لیے ہوئے یونہی پلٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لئے کافی ہو گیا ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو ان کے قلعوں سے نکالا جنھوں نے ان مشرکین کا ساتھ دیا تھا ، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ آپؐ نے ان میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو قید کر لیا اور آپؐ کو ان کے گھروں ان کی زمینوں اور ان کے مالوں کا مالک بنا دیا ۔

آیت ۲۸ - ۲۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ " اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لئے بڑا اجر چھپا کر رکھا ہے ۔

یہ آیت " آیت تخییر " کہلاتی ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں چار بیویاں تھیں حضرت سودہؓ ، حضرت عائشہؓ ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا کہ " میں تم سے ایک بات کہتا ہوں جواب میں جلدی نہ کرنا اپنے والدین کی رائے لے لو پھر فیصلہ کرو ۔ " اسکے بعد آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی حضرت عائشہؓ نے جواب یا رسول اللہ ! میں اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں میں تو اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہوں ۔ اس کے بعد دیگر ازواج کے پاس باری باری سے تشریف لے گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا ۔

آیت ۳۰ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویو تم میں سے

جو کھلی ہوئی ناشائستہ بات کرے گی تو اس کو دوہری سزا دی جائے گی۔

- بائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے —

آیت ۳۱ میں فرمایا گیا کہ "تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی ہم اس کو دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لئے ایک عمدہ روزی تیار کر رکھی ہے"۔

آیت ۳۲ - ۳۴ میں ازواج مطہرات سے خطاب کیا گیا اور ان کو ان کی امتیازی خصوصیات بتائی گئیں۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ پھر انھیں خصوصی احکام دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔ اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں اور ان کا چرچا ہوتا رہتا ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچاؤ"۔

پھر عام مومن مردوں اور عورتوں کے اوصاف بیان کر کے آیت ۳۶ میں فرمایا گیا کہ "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کسی بات کا حکم دیں تو ان کو ان کے کام میں کوئی اختیار رہے (کہ اس کام کو کریں یا نہ کریں) اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہنا نہ مانے وہ صریح گمراہی میں پڑا"۔ یہ آیت اگرچہ خاص موقع پر نازل ہوئی لیکن حکم عام ہے کہ جس مسئلہ میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم موجود ہو تو کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنی آزادی رائے استعمال کرے۔

آیت ۳۷ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "آپ وہ موقع یاد کریں جبکہ آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور آپ نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔ اس وقت آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنا چاہتا تھا"۔ پھر حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت ۴۰ میں فرمایا گیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات کہہ دی گئی کہ تم لوگ جو منہ بولے بیٹے کو بیٹا کہتے ہو اور حضرت زیدؓ کی بیوی سے آپ کے نکاح پر اس قدر طوفان اٹھائے ہوئے ہو" حالانکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ پھر آپ کی وہ امتیازی شان بھی بیان کر دی کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اور نبوت آپ پر ختم ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

آیت ۴۵ میں پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو اس شان کا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں"۔ گویا آپ آفتاب نبوت و ہدایت ہیں کہ اس کے طلوع ہونے کے بعد کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں رہی۔ سب روشنیاں اس نور اعظم میں خود مدغم ہو گئیں۔

آیت ۴۷ — ۴۸ میں حکم دیا گیا کہ آپ مومنین کو بشارت دیدیں کہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے بڑا فضل ہے اور آپ کافروں اور منافقین کا کہنا نہ مانئے اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجیے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے

آیت ۵۰ — ۵۲ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے نکاح کے کچھ احکام بیان کئے جو آپ کی خصوصیات ہو سکتے ہیں

آیت ۵۳-۵۵ میں مسلمانوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں داخلہ کے آداب بتائے گئے۔

آیت ۵۶ میں فرمایا گیا اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پہ درود و سلام بھیجو۔

آیت ۵۷، ۵۸ میں ارشاد باری ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو اذیت دیتے ہیں بغیر کسی قصور کے تو انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔

آیت ۵۹-۶۰ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ آپ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومن عورتوں کو پردہ کا حکم دیجیے۔

آیت ۷۱ میں مومنین کو حکم دیا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال درست کر دے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔" پھر فرمایا گیا کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کی" گویا کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے اور جس نے انحراف کیا اس کے لیے ناکامی اور تباہی ہے۔

سورۃ السبا

یہ سورۃ مکی ہے اس میں کفار مکہ کے طنز و تمسخر کا جواب دیا گیا ہے جو وہ دعوت توحید و آخرت پر کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان و داؤد علیہما السلام اور قوم سبا کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو طاقت و حشمت عطا فرمائی لیکن یہ غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے۔ قوم سبا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر اترانے لگی۔ اوّل الذکر کا نام اب تک باقی ہے لیکن قوم سبا کے افسانے ہی رہ گئے ہیں غرض توحید و آخرت کے عقیدہ پر جو زندگی مبنی ہو اور جس کی بنا ان کے انکار پر ہو ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا فرق ہے کہ پہلی زندگی کامیابی کی ہے تو دوسری زندگی تباہی اور ناکامی کی طرف لے جاتی ہے۔

اس سورۃ کی ابتدا اس سے کی گئی کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمان و زمین کا مالک ہے اور حکیم و خبیر ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ کفار قیامت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ قیامت آکر رہے گی اور جن لوگوں نے جیسے کام کئے ہوں گے ان کے ذرے ذرے کا حساب ہوگا۔ آیت ۱-۹ میں قیامت کا ذکر کرنے کے بعد آیت ۱۰ سے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا قصہ آیت ۱۴ تک پھر آیت ۲۱ تک قوم سبا کا ذکر کرتے کے بعد آیت ۲۲ سے پھر قیامت کا ذکر ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ تم اپنے ان معبودوں کو پکار کر دیکھو جن کو تم اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ آسمان و زمین میں ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اللہ کے سامنے کسی کی شفاعت مفید نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔

آیت ۲۴-۲۷ میں ارشاد باری ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہیے کہ تم کو آسمان و زمین سے کون رزق دیتا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ جو جرم ہم نے کیا ہو اس کی بازپرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی بازپرس ہم سے نہ

ہوگی۔ ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔"
آپؐ ان سے کہیے کہ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ وہ کون سی ہستیاں ہیں جنھیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے ہرگز نہیں بزبردست اور حکمت والا تو وہی ہے۔

آیت ۲۸ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب بڑی خصوصیت بیان کی گئی کہ پہلے انبیا تو ایک مخصوص عہد کے لیے اور ایک محدود آبادی کے لئے آئے تھے۔ لیکن آپ کی رسالت سارے جہان کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے ہے اور کسی مخصوص عہد کے لئے نہیں ہے بلکہ قیامت تک کیلئے ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔
آیت ۲۹ - ۳۰ میں ہے کہ "یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ وہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ آپ فرما دیجیے کہ تمہارے لئے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک گھڑی پہلے اُسے لا سکتے ہو۔
آیت ۳۴ - ۳۶ میں ارشاد فرمایا گیا کہ "ہم نے جس بستی میں بھی ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے کہا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ میرا پروردگار جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ماپ کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

منکرین کے انجام بد کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ (آیت ۴۳ - ۵۰) ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے حالانکہ نہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا تھا اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں، جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا اس کے عشر عشیر کو یہ نہیں پہنچے ہیں، لیکن جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ آپ تو ان لوگوں سے کہئے کہ میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم خدا کے واسطے دو دو ایک ایک کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو کہ تمہارے اس ساتھی کو جنون نہیں ہے وہ تو تم کو ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمے ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار حق بات کو غالب کر رہا ہے۔ وہ علام الغیوب ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا۔ آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ پر وبال ہوگی اور اگر میں راہ پر رہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے جس کو میرا پروردگار میرے پاس بھیج رہا ہے بیشک وہ سب کچھ سنتا ہے نزدیک ہے۔
پھر منکرین کے انجام بد کا ذکر آیا ہے۔

سورۃ فاطر

اس سورۃ میں اللہ پاک کی خالقیت، ربوبیت اور پھر آخرت کی اہمیت کا ذکر ہے۔ اللہ پاک نے آسمان، زمین فرشتے (دو دو تین تین چار چار پر والے) بنائے۔ وہ جس جنس میں چاہے اضافہ فرما دے۔ وہ لوگوں پر رحمت کے دروازے کھول دے تو کوئی روکنے والا

نہیں ۔" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ (منکرین) آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے قبل بھی کتنے پیغمبر جھٹلائے گئے اور اللہ ہی کی طرف تمام امور رجوع کرتے ہیں" (آیت ۴)

شیطان کھلا دشمن ہے۔ وہ دوزخی بنانا چاہتا ہے اور اللہ ہواؤں کو بھیجتا ہے اور مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اللہ ہی کو سب عزت حاصل ہے۔ میٹھے پانی کا دریا، کڑوے پانی کے دریا کے برابر نہیں ہوگا۔ کشتیاں، رات، دن، سورج، چاند سب اُس کے حکم کے تابع ہیں" اور جن کو تم اُس کے سوا (معبود) پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے برابر بھی تو اختیار نہیں رکھتے۔" اللہ (تمہاری عبادت کا) محتاج نہیں تم ہی اللہ کے محتاج ہو" اور" اگر وہ چاہے تو تم کو (دنیا سے) لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے اور یہ بات اللہ کیلئے مشکل نہیں"۔ (آیت ۱۶-۱۷)

قیامت میں کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ مومن اور کافر کا کیا مقابلہ؟" اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ۔ اور نہ تاریکیاں اور روشنی ہی ۔ اور نہ سایہ اور (گرم) لو ۔ اور نہ زندہ لوگ اور مُردے برابر ہو سکتے"۔ (آیت ۱۹-۲۲)۔

" ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری سُنانے والا اور نصیحت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی اُمّت ایسی نہیں ہوتی جس میں کوئی نصیحت کرنے والا (پیغمبر) نہ گزرا ہو"۔ (آیت ۲۴)۔

اللہ پاک نے آسمان سے پانی اتارا، پھر مختلف رنگ کے پھل پیدا کیے، انسانوں، جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ ہیں ۔ لیکن اللہ پاک سے علم والے (جاننے سمجھنے والے) ہی ڈرتے ہیں "بے شک وہ لوگ جو اللہ کی کتاب (قرآن) پڑھتے اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہ ہوگا"۔ (آیت ۲۹)

" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب ہم نے آپ پر اُتاری ہے وہی حق ہے۔ اپنے سے قبل کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں سے باخبر، دیکھنے والا ہے ۔ پھر جنّت اور دوزخ والوں کی کیفیات کا ذکر ہے۔ اللہ پاک ہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور اللہ پاک ہی نے تم کو اپنا خلیفہ بنایا (اللہ کے بعد ہی تمہارا درجہ ہے) منکرین کے معبود کیا بنا سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں؟" بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر یہ ہٹ جائیں تو اس کے سوا کوئی اُن کو تھام نہیں سکتا۔ بلا شبہ وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے"۔ (آیت ۴۱)۔

منکرین نے بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ہر اُمّت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے ۔ پھر جب اُن کے پاس اللہ سے ڈرانے والا آیا تو اُس سے ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔ کیا منکرین نے اُن لوگوں کا انجام نہیں دیکھا جو اُنہی کی طرح منکر تھے؟" اور اگر اللہ، انسانوں کو (فوراً) اُن کے اعمال پر پکڑنے لگتا تو زمین پر ایک بھی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑتا۔ لیکن اللہ، لوگوں کو ایک مدّتِ معینہ تک مہلت دیتا ہے (کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں) پھر جب اُن کا وقت مقررہ آ جاتا ہے (تو اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا) ۔ پس بے شک اللہ اپنے تمام بندوں کو آپ دیکھ لے گا"۔ (آیت ۴۵)۔

اللہ پاک کی خالقیت اور قدرتِ کاملہ کی یہ تبلیغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھی ——

سورۃ یٰسین

یہ سورۃ ، قرآن پاک کا دل ہے ۔ اس میں سات " مبین " ہیں :-

۱ - امام مبین - انسان جو کرے گا وہ لوحِ محفوظ میں موجود ہے اور اللہ پاک کے علیم وقدیر ہونے پر شاہد ہے ۔

۲ - بلاغ مبین - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیا علیہم السلام کا کام دین کا ابلاغ ہے ۔ صرف اُن کی فرمان برداری کا نام عملِ صالح ہے جو اللہ پاک کی فرمان برداری کے لیے اساس ہے ۔

۳ ، ۴ - ضلالِ مبین - قادرِ مطلق کو چھوڑ کر غیر کی عبادت کرنا کھلی گمراہی ہے (دُو جگہ یہ لفظ آیا ہے) ۔

۵ - عدوٌ مبین - اللہ پاک نے شیطان کے متعلق ہمیشہ آگاہ کرایا ہے کہ وہ انسان کا کُھلا دشمن ہے ۔

۶ - قرآن مبین - خالص نصیحت جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم ہی پہنچا سکتے تھے ۔

۷ - خصیم مبین - وہ انسان جو حقیر پیدائش کے باوجود اپنے خالق اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پہچاننا نہیں چاہتا ۔

" (اے میرے پیارے ، اے سرورِ کائنات) اِس قرآنِ حکیم کی قسم ہے کہ بے شک آپ (اللہ کے) پیغمبروں میں سے ہیں ، سیدھے راستے پر ہیں ۔ (یہ قرآن) عزیز الرحیم (ہر چیز پر غالب اور رحمت کرنے والے) نے نازل کیا ہے " تاکہ آپ ان لوگوں کو جن کے آبا کو ڈرایا نہیں گیا تھا (اُن کو بھی) ڈرائیں کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں " (آیت ۱-۶) ۔ منکرین ، اصرارِ کفر کی وجہ سے مغرور ، محروم اور اندھے ہو گئے ہیں " اور اُن کو آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ، ان کے لیے (سب) برابر ہے ۔ وہ ایمان نہ لائیں گے ۔ آپ تو صرف اُسی کو ڈرا سکتے ہیں جو آپ کے سمجھانے پر چلے اور (خدا) رحمٰن سے بغیر دیکھے ڈرے ۔ (ایسے کو) پس آپ اس کو مغفرت اور بڑے درجے کے ثواب کی بشارت دیجیے ۔ بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی (ہمارے فرشتے) وہ سب لکھتے جاتے ہیں جو (اعمال) یہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے اثرات (جو یہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں) اور ہم نے ہر چیز کو ایک روشن کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھ رکھا تھا (آیت ۱۰-۱۲)

. . . . اللہ پاک نے پچھلی کسی قوم (اصحاب القریہ) کا ذکر کیا ہے کہ اُن کے پاس پے در پے تین رسول بھیجے گئے لیکن انہوں نے ان سب کو جھٹلایا بلکہ اُن میں سے ایک صالح شخص نے ان رسولوں کی تائید بھی کی تھی ۔

اب تئیسواں پارہ شروع ہوتا ہے ۔

اس شخص کو اُن لوگوں نے شہید کر دیا اور اللہ پاک نے اُسے جنت میں داخل کر دیا لیکن وہ لوگ عذاب الٰہی سے ایک دم میں بجھ کر رہ گئے ۔ منکرین کے لیے اللہ پاک کی پہچان کے لیے ایک نشانی مُردہ زمین بھی ہے جس میں سے کیا کیا اُگتا ہے اور چشمے جاری ہوتے ہیں تاکہ یہ سب لوگ ان سے مستفید ہوں ۔ انہوں نے تو نظام قدرت نہیں بنایا " پاک ہے وہ ذات جس نے زمین سے تمام اُگنے والی چیزوں کے جوڑے بنائے اور اُن جانوں میں سے بھی اور اُن میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے " (آیت ۳۶) - رات ، دن ، سورج اور چاند کا نظام اور " نہ آفتاب کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ، دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب (ستارے) اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں " (آیت ۴۰)

— پھر منکرین کی روگردانی کی مثالیں آتی ہیں اور ان کا انجام بیان کیا گیا ہے ۔ اور قیامت میں مؤمنوں کو بلا واسطہ " ربِ رحیم کی طرف سے سلام "

کہا جائے گا"۔ (آیت ۵۸) اللہ پاک کا امتِ محمدیہؐ پر کتنا بڑا اور خصوصی انعام ہے سبحان اللہ! ۔ قیامت کے دن منکرین سے کہا جائے گا۔ کہ "اے اولادِ آدمؑ، کیا میں نے تم کو (انبیاء علیہم السلام کے ذریعے) تاکید نہ کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا ۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ (آیت ۶۰) ۔ پھر وہ اللہ جو بڑھاپے میں طاقت سلب کر لیتا ہے تو کیا وہ جوانی میں نہیں کر سکتا ۔ یا جس نے ایک بار یہ طاقت دی کیا وہ آخرت میں زندہ نہیں کر سکتا؟ یہ باتیں شعر و افسانہ نہیں ۔ بلکہ حقیقت ہے ۔" اور ہم نے ان (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ شعر کہنا سکھایا اور نہ یہ اُن کے شایانِ شان ہے ۔ یہ تو خالص نصیحت ہے ۔ واضح قرآن ۔ تاکہ ایسے شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو (ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو) اور منکروں پر حجت تمام کر دے"۔ (آیت ۶۹ – ۷۰) "پس (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (منکرین) کی باتوں سے غمگین نہ ہوں، ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں"۔ (آیت ۷۶) "کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک نطفے سے پیدا کیا، پھر اسی لیے (یہ سرکش ہو کر اللہ اور اُس کے رسولؐ کا) کھلا دشمن بن گیا"۔ (آیت ۷۷) ۔ انسان اپنی حقیر پیدائش کو بھول گیا اور اللہ پاک پر اعتراض کرنے لگا"۔ اس (اللہ) کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس سے کہتا ہے کہ ہو جا ۔ پس وہ ہو جاتی ہے ۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیارِ کامل ہے اور اُسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے"۔ (آیت ۸۲ – ۸۳) ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تبلیغ اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ اور خالقیتِ تامہ کے لیے بہت قوی ہے۔

سورۃ الصّٰفّٰت

چھٹی منزل شروع ہوتی ہے :۔

اس سورۃ میں توحید کے مضامین ہیں۔ درمیان میں انبیاء علیہم السلام بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بار بار آتا ہے کیونکہ اُن کو یہود و نصاریٰ ایک جلیل القدر پیغمبر مانتے تھے۔ اللہ پاک نے عابدین، مجاہدین اور قرآن پاک کے تلاوت کرنے والوں کو گواہ کر کے فرمایا ہے کہ وہی (اللہ) بے شک تم سب کا معبود ہے جو آسمانوں، زمین، اور جو اُن کے درمیان ہیں اُن سب کا پروردگار ہے ۔ اُسی نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی آرائش سے مزین کیا اور ہر شیطانِ سرکش سے اُن کی حفاظت کی۔ وہ شیاطین کبھی ملاء اعلیٰ کی بات نہیں سُن سکتے اور اگر اوپر جاتے ہیں تو اُن پر انگارے پھینکے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ یہ انسان کیوں شیطنت پر آمادہ ہے ۔ اس کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں اور وہ اللہ پاک کی نشانی کا مذاق اڑاتا ہے ۔ پھر حشر میں جو کیفیت ہوگی اُس کا بیان ہے کہ منکرین اپنی غلطیوں کا الزام اپنے ساتھیوں پر رکھیں گے لیکن عذاب میں وہ سب شریک ہوں گے ۔ اور ایمان والوں کے لیے کیا کیا انعامات ہوں گے اور جوشِ مسرت میں جنتی کہیں گے کہ "کیا اب تو ہم کو مرنا نہیں سوائے (اُس) پہلی بار مرنے کے اور (اب تو) ہم کو عذاب بھی نہیں ہونے کا"۔ (آیت ۵۸-۵۹) اب ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح بتوں کی پوجا سے روکنا چاہا تو قوم نے انہیں آگ میں ڈالا لیکن اُن کا بال بیکا نہ ہُوا۔ پھر آپ نے وطن سے ہجرت کی (اور شام کی طرف روانہ ہوئے) ۔ اولاد کے لیے دعا مانگی اور اسمٰعیل علیہ السلام جب اتنے بڑے ہو چکے کہ ساتھ ساتھ چل سکیں "پھر جب وہ (اسمٰعیل) اُن کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچے، فرمایا اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں

تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم بھی غور کر لو کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ (بیٹے نے بلا تامل عرض کیا کہ پھر دیر کیا ہے) جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے (اللہ کا) حکم مان لیا تو (ابراہیم علیہ السلام نے) اُن کو ماتھے کے بل لٹایا (اور چاہا کہ ذبح کریں) اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم (علیہ السلام) تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو یوں ہی بدلہ دیتے ہیں" (آیت ۱۰۲-۱۰۵) یہی اسمٰعیل علیہ السلام وہ تھے جن کی اولاد میں سلسلۂ نبوت قائم ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا جن کی تمام صفات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے سابق انبیا علیہم السلام کے حالات بار بار بیان کیے جاتے ہیں۔ اب موسیٰ علیہ السلام، الیاس علیہ السلام، لوط علیہ السلام، یونس علیہ السلام کے حالات ہیں کہ کس کس طرح اُن کی آزمائش ہوئی اور وہ کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو آزمائشیں ہوئیں یا جس طرح اُن کی پیغمبرانہ شان اُجاگر ہوئی اُس میں ان سابق انبیا علیہم السلام کے واقعات سے بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کافروں نے فرشتوں اور جنوں کا ناتا بھی اللہ پاک سے لگا دیا ہے۔ "پس (اے کافرو) تم لوگ اور وہ جن کی تم پرستش کرتے ہو (سب مل کر بھی) کسی کو اس (اللہ) کے خلاف بہکا نہیں سکتے" (آیت ۱۶۱-۱۶۲) "پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (کفار) سے کچھ عرصے تک اعراض کریں اور اُن کو دیکھتے رہیے (اُن کی بگڑتی ہوئی حالت کو) پھر عنقریب وہ (خود بھی اپنا انجام) دیکھ لیں گے" (آیت ۱۷۴-۱۷۵) "آپ کا رب بڑی عظمت والا رب ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ (منکرین) بیان کرتے ہیں" (آیت ۱۸۰)

سورۃ صٓ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "قسم ہے اِس قرآن کی جو نصیحت والا ہے بلکہ کافر غرور اور مخالفت میں (مبتلا) ہیں۔ ایسے کتنے کفار تباہ کیے جا چکے۔ انھیں تعجب یہ تھا کہ انھی میں سے ایک شخص کو کس طرح پیغمبر بنایا جا سکتا ہے اور سب معبودوں کی جگہ صرف اللہ کو کیوں معبود سمجھا جائے۔" اور جب (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحدانیت کی تلقین فرمائی تو بجائے ایمان لانے کے) ان کے سردار یہ کہتے ہوئے (ابو طالب کے پاس سے) اُٹھ کھڑے ہوئے کہ (لوگو، اپنی) ڈگر پر چلتے رہو اور اپنے معبودوں پہ قائم رہو۔ بے شک اس بات (تلقینِ وحدانیت) میں ان کی اپنی کوئی غرض ہے" (آیت ۶)۔ پھر نوح علیہ السلام کی قوم، عاد، اور حشمت والے فرعون، ثمود، لوط علیہ السلام کی قوم اور بَن والوں کا تذکرہ ہے کہ انھوں نے کس طرح رسولوں کو جھٹلایا اور اُن پر عذاب ہوا۔ داؤد علیہ السلام کی نبوت اور شاہی کا ذکر بھی ہے بعض اوقات اللہ کے برگزیدہ حضرات دو خیر کی باتوں میں سے ایک خیر کو منتخب کر لیتے ہیں لیکن پھر خیال کرتے ہیں کہ شاید دوسرا خیر بہتر تھا اس لیے وہ اس کو بھی اپنی لغزش سمجھ کر اللہ کی طرف رجوع ہو کر گڑگڑاتے ہیں۔ اس طرح اللہ اُن کے درجات اور بھی بلند فرماتا ہے۔ پھر سلیمان علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی طرح بتایا گیا ہے کہ وہ بھی ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور اللہ پاک نے انھیں عالم پر سرفراز فرما کر حکومت دی۔ ان کو گھوڑے (جہاد کے لیے) پسند آئے اور اولاد کثیر بھی (جہاد کے لیے) طلب کی۔ پھر ایسی حکومت دی گئی کہ ہوا بھی تابع ہوئی، جن بھی تابع ہوئے۔ یہ سب اللہ پاک کا انعام تھا" اور بے شک اُن کا ہمارے یہاں اعلیٰ مرتبہ اور بہتر انجام ہے۔" (آیت ۴۰)۔ ایوب علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام الیسع، ذوالکفل (علیہما السلام) کا ذکر بھی ہے جس سے پرہیزگاروں کے درجات کی بلندی ظاہر ہوتی ہے گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سابق انبیا علیہم السلام کے واقعات تسلی او

تشفی کے لیے بھی ہیں اور اس لیے بھی کہ آپ کی صلاحیتیں تو اور بھی بلند ہیں اس لیے آزمائشیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اور کفار تو ہمیشہ مذاق ہی اُڑاتے رہتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ میں تو (عواقب سے) ڈرانے والا ہوں اور معبود (تو) صرف وہی اللہ ہے جو اکیلا اور غالب ہے۔ آسمانوں اور زمین کا اور جو ان کے درمیان ہے (اس سب کا) پروردگار ہے، بڑا زبردست، بڑا بخشنے والا ہے۔" (آیت ۶۵-۶۶)

پھر انسان کی تخلیق اور شیطان کا سجدے سے انکار کا ذکر ہے کہ وہ امرِ رب کو چھوڑ کر اپنی فضیلت کے گھمنڈ کی وجہ سے مردود اور ملعون ہوا۔ اللہ کا امر دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی "تابع داری" ہے۔ جو اس تابع داری میں کامیاب ہوا وہی مسجودِ ملائک کے درجات تک فائز ہو سکتا ہے۔

سورۃ الزمر

اس سورۃ میں توحید اور رسالت کے مضامین کے ساتھ کافر و مومن کے مزاج کا بیان ہے اور آخر میں دوزخیوں اور جنتیوں کو گروہ در گروہ اپنے اپنے مستقر پر پہنچنے کا ذکر ہے۔ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے یہ کتاب آپ پر حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ پس آپ (جس طرح مشغولِ عبادت ہیں اسی طرح) اللہ کے ہو کر خالص اسی کی بندگی کرتے رہیں۔ (اور لوگوں کو علی الاعلان سنا دیجیے کہ) یاد رکھو خالص عبادت اللہ ہی کے لیے ہے (جہاں عبادت میں اخلاص نہ ہو اللہ کے یہاں اسکی قدر نہیں) اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کا مقرب بنائیں (کیا کیا مکاری کرتے ہیں)۔ بے شک جن باتوں میں یہ اختلاف کر رہے ہیں (یعنی وحدانیت اور رسالت وغیرہ) اللہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ بلاشبہ اللہ ایسے کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہے۔" (آیت ۲-۳)

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ پاک کی خالقیت، بے نیازی اور قدرتِ کاملہ کی تبلیغ ہے اور انسان کی عجیب فطرت کا ذکر ہے کہ مصیبت میں تو وہ اللہ کو یاد کر لیتا ہے لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو پھر اسے بھول جاتا ہے۔ پھر اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کو فراموش کرنے والے کے بارے میں ہے کہ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے اپنے رب سے ڈرتے ہو، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین (ان کے لیے) کشادہ ہے (وہ صبر سے کام لیں) بلاشبہ صبر کرنے والوں ہی کو ان کے صبر کا پورا (اور) بے حساب اجر ملے گا" (آیت ۱۰)۔ پھر خلوص کے ساتھ عبادت کرنا، ہر حکم پر عمل پیرا ہونا، قیامت کے دن سے ڈرنا۔ ہر مومن کا شیوہ ہے۔ منکرین کے لیے دوزخ اور مومنین کے لیے جو اسلام کی پیروی کرتے ہیں جنت ہے اور وہی صحیح عقل والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے کہ "بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہو وہ تو اپنے رب کی طرف سے نور (روشنی) پر ہے۔ پس خرابی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہو گئے ہیں یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں" (آیت ۲۲)۔ "اللہ پاک نے بڑا اچھا کلام نازل فرمایا ہے (قرآن) جس کی آیتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور دہرائی جاتی ہیں (تاکہ دل نشین ہو سکیں) جن کو پڑھنے سے ان لوگوں کے بدن کے

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے چمڑے اور دل، نرم ہو کر اللہ کی یاد میں محو ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔" (آیت ۲۳)۔ پھر ابوجہل کے انجام کا ذکر ہے اور عربی قرآن کی کھلی ہوئی باتوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد ایک مثال ہے کہ "اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے۔ ایک (غلام) مرد ہے جس میں کئی شریک ہیں (کئی آقا ہیں) مختلف المزاج اور بد سرشت۔ اور ایک (دوسرا) شخص ہے جو خاص ایک ہی کا (غلام) ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ تمام خوبی اللہ کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ (ان باتوں کو) سمجھتے ہی نہیں" (آیت ۲۹) — اللہ کے آگے سب کو پیش ہونا ہے۔

چوبیسواں پارہ شروع ہوتا ہے ——

"پھر اس سے بڑھ کر ظالم [illegible] اللہ پر جھوٹ باندھے اور جب سچی بات اس کے پاس پہنچ جائے تو اس کو جھٹلائے۔ کیا (ایسے) کافروں کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے؟ اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچا جانا وہی لوگ متقی ہیں۔" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جاننے والے ہی متقی ہو سکتے ہیں۔ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح تسلی دی ہے کہ "کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اور یہ منکر آپ کو اس (اللہ) کے سوا اوروں سے ڈراتے ہیں (وہ خود گمراہ ہیں) اللہ جس کو گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔" (آیت ۳۶)۔ "اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو (یہ برجستہ) کہیں گے کہ اللہ نے۔ آپ فرمایئے بھلا بتاؤ کہ جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف دینا چاہے تو کیا وہ اس کی (دی ہوئی) تکلیف کو دور کر سکتے ہیں، یا [illegible] اللہ مجھ پر مہربانی فرمانا چاہے تو کیا اس کی عنایت کو وہ روک سکتے ہیں؟ آپ فرما دیجیے کہ میرے لیے بس اللہ کافی ہے۔ اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں۔" (آیت ۳۸) "اللہ ہی جانوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن پر موت طاری نہیں [illegible] ان کی نیند کے وقت (کھینچ لیتا ہے) پھر ان جانوں کو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم صادر کر چکا ہے اور دوسری جانوں کو ایک وقت معین تک چھوڑ دیتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں (بڑی) نشانیاں ہیں۔" (آیت ۴۲)

قیامت کے دن منکرین کے معبود ان کی سفارش نہیں کر سکتے حالانکہ وہ لوگ ایسے معبودوں کے ذکر سے خوش ہوا کرتے ہیں۔ جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اللہ ہی کو پکارتا ہے اور جب اُسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اللہ کو بھول جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ میری اہلیت کی وجہ سے ملی ہے۔ اللہ ہی فراخی سے بھی رزق دیتا ہے اور نپا تُلا بھی دیتا ہے۔ "آپ فرما دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے (اُلٹے سیدھے کام کر کے) اپنے آپ پر زیادتیاں کی ہیں (حد سے گزرے ہیں) اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بے شک [illegible] سب گناہ بخش دے گا۔ بے شک وہ بڑا بخشنے (اور) بڑا رحم فرمانے والا ہے۔" (آیت ۵۳)۔

ہر ایک کو عذاب سے اس لیے باخبر کیا جاتا ہے کہ وہ پھر افسوس کرے یا یوں نہ کہے کہ اگر اللہ مجھے راہِ حق دکھاتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہو جاتا — قیامت کے دن اُن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اُن کو کوئی تکلیف [illegible] ہوگی اور نہ وہ غمگین ہوں گے —" اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں (وہ جس کو چاہے یہ کنجیاں دے دے) اور جو لوگ اللہ کی [illegible] کے منکر ہوئے وہی خسارے میں ہیں۔" (آیت ۶۳)۔

افسوس کہ کافروں نے اللہ پاک کی قدر شناسی جیسی کہ چاہیے تھی نہیں کی ۔ قیامت کے دن تمام زمین اللہ کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان (کاغذ کی طرح) لپٹے ہوئے اُس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے ، صور پھونکا جائے گا تو سب بیہوش ہو جائیں گے سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے کہ ان پر بے ہوشی طاری نہ ہو ۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو جائیں گے ۔ محشر کی زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا ۔" اور ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اُس کو خوب معلوم ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں ۔" (آیت ۷۰) ۔

کافروں کو جہنم میں جھونکا جائے گا تو اُن سے دوزخ کے محافظ کہیں گے کہ کیا تمھارے پاس تم ہی میں سے کوئی رسول نہیں آتے تھے ۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے ، پھر وہ دوزخ میں بھر دیے جائیں گے لیکن جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ ذوق و شوق سے جنت میں داخل ہوں گے ۔" اور وہ کہیں گے ، اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنایا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں ۔ پس عمل کرنے والوں کا کیا خوب بدلہ ہے ۔" (آیت ۷۴)

پھر ہر طرف سے یہی صدا آئے گی کہ " تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۔"

سورۃ المؤمن

حٰمٓ سے یہ سورۃ شروع ہے ۔ (سات سورتیں مسلسل اسی نام سے شروع ہوتی ہیں)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے تبلیغ ہے کہ اللہ پاک غالب اور علم والا ہے ۔ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے ۔ نافرمانوں کو عذاب دینے والا اور بڑی قدرت والا ہے ۔ اُسی سے ڈرو ۔ نوح علیہ السلام کو اور اُن کے بعد کی قوموں نے بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا اور خود دوزخی بنے ۔ اللہ کے فرشتے بھی ایمان والوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ " اے ہمارے پروردگار ان (توبہ کرنے والے اور حضورؐ کے متبعین) کو ہمیشہ کی جنتوں میں داخل فرما جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا اور اُن کو بھی جو اُن کے آبا و اجداد میں سے اور اُن کی بیویوں میں سے اور اُن کی اولادوں میں جو نیک ہوں ۔ بے شک تو بڑا ہی غالب حکمت والا ہے ۔" (آیت ۹)

پھر کافروں کے انجام کا ذکر ہے جو اللہ کو ایک نہیں مانتے تھے ۔ اور قیامت کا ذکر ہے جب کہ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا ۔" اور اللہ تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اللہ کے سوا جن کو یہ (کافر) پکارتے ہیں وہ تو کچھ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے (وہ تو مجبور محض ہیں) ۔ بے شک اللہ ہی سُننے والا ، دیکھنے والا ہے ۔" (آیت ۲۰) ۔

منکرین حق نے دنیا میں کیا کیا تعمیرات نہیں کیں لیکن عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوا ۔ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ہی کا قصہ دیکھو کہ فرعون اُن کو قتل کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن اُسی کے لوگوں میں سے ایک شخص جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا بولا کہ اُن کو قتل نہ کرو ، کیونکہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو اُن کا جھوٹ اُنہی پر پڑے گا اور اگر وہ سچے ہیں تو جو پیش گوئی وہ کر رہے ہیں اُس میں سے تم پر پڑے گا (تم ذلیل ہو گے) ۔ فرعون نے نوح علیہ السلام ، یوسف علیہ السلام وغیرہ کے زمانے کے نافرمانوں کا حال بھی سُنا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا اور ازراہ تمسخر اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ایک بہت اونچی عمارت بناؤ کہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کو جھانک کر دیکھوں — بہرحال فرعون پر تبلیغ بے کار ثابت

ہوتی اور وہ تباہ ہوا" "بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے (اور) جس دن بہانہ بازیاں منکروں کے کچھ کام نہ آئیں گی اور اُن پر (اللہ کی) لعنت ہوگی اور اُن کے واسطے (دوزخ) بدترین گھر ہے" (آیت ۵۱-۵۲)

"پس (اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر فرمایئے۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے (اس کی نصرت آپ کے اور آپ کی امت کے ساتھ ہے) اور آپ اپنے (مومنوں کے) گناہوں کی (اللہ سے) مغفرت کیجیے اور شام و صبح اپنے رب کی تعریف و تسبیح کرتے رہیے" (آیت ۵۵)۔

پھر اللہ کی قدرت اور حاکمیت کا ذکر ہے کہ اس نے رات آرام کے لیے اور دن کو روشن بنایا (تاکہ اپنا کام کاج معیشت تلاش کرو) اور وہ خالق ہے۔ زمین کو قیام کے لیے اور آسمان کو چھت (کی طرح) بنایا، تمھاری کیسی اچھی صورتیں بنائیں اور طیب (پاک اور غیر مضر) چیزیں کھانے کو دیں" وہ زندہ رہنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس خالص اعتقاد کے ساتھ (اس کے ہو کر) اس کو پکارو، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے" (آیت ۶۵)۔ وہی نیست سے ہست میں لاتا ہے" وہی جلاتا مارتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے پس اس کی نسبت یہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتا ہے" (آیت ۶۸)۔

ان تمام نشانیوں کے باوجود منکرین کج بحثی کرتے ہیں اور قرآن کو جھٹلاتے ہیں تو وہ جہنم میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں گے "پس (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر کیجیے۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے ....." (آیت ۷۷)۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اللہ پاک نے اس پر کیسے کیسے احسانات کیے ہیں۔ لیکن اس نے انکار کیا اور جب اس پر عذاب نازل ہوا تو اللہ پر ایمان لانا چاہا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

سورۃ حٰم السّجدہ

حٰم (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن کو جو عربی میں ہے اور سمجھدار لوگوں کے لیے ہے منکرین نہیں مانتے اور) "کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں (پردے میں لپٹے ہوئے ہیں) اس بات سے جس کی طرف آپ بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے (یعنی آپ کی بات نہیں سننا چاہتے) ....." (آیت ۵)۔

اللہ پاک نے پھر ان منکرین کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بتایا ہے کہ کس طرح زمین کی تخلیق ہوئی، پہاڑ رکھے گئے، سامان معیشت مہیا کیا گیا (جو سب کے لیے یکساں طور پر حاصل ہو سکتا ہے)، پھر زمین و آسمان کا نظام بنایا گیا" پھر دو دن میں سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان کے احکام اس میں بھیج دیے اور آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے رونق بخشی اور اس کو محفوظ (بھی) کر دیا۔ یہ انتظام ہے زبردست علم والے (پروردگار) کا" (آیت ۱۲)۔

لیکن منکرین پہلے بھی روگردانی کرتے رہتے تھے، عاد قوم بھی مغرور اور سرکش تھی، قوم ثمود بھی اسی طرح تھی اور یہ سب ایک ذلت کے عذاب میں ڈالے گئے۔ ایسے لوگ جب جہنم کے قریب پہنچائے جائیں گے تو اُن کے اعضاء بھی اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے اور

ان کاٹھکانا دوزخ ہوگا۔" اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنا ہی مت کرو اور (جب یہ پڑھا جائے تو) اس کے درمیان شور و غل مچایا کرو شاید اس طرح تم غالب رہو (لوگ نہ سن سکیں)" (آیت ۲۶) ۔ لیکن ایسے کافروں کو عذابِ شدید کا مزہ چکھایا جائے گا۔ اور یہ لوگ قیامت کے دن ایسے جن اور انسان کو اپنے پیروں کے نیچے روندنا چاہیں گے جنھوں نے دنیا میں انھیں گمراہ کیا تھا۔ پھر مسلمانوں کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ پھر (اس پر) قائم رہے (تو) ان پر فرشتے اُترتے ہیں (جو کہتے ہیں کہ) مت ڈرو اور غم نہ کھاؤ اور تم جنّت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا (اور اللہ فرماتا ہے)" اور ہم تمھارے دنیا میں رفیق ہیں اور آخرت میں (بھی) اور تمھارے لیے وہاں وہ سب موجود ہے جو تمھارا جی چاہے اور تمھارے لیے وہ سب جو تم مانگو موجود ہے۔" (آیت ۳۰-۳۱) ۔

"اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہو سکتی ۔ آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجیے تو (آپ دیکھیں گے کہ) جس شخص میں اور آپ میں دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ایک دلی دوست اور یہ بات اُنھی کو حاصل ہوتی ہے جو تحمّل سے کام لیتے ہیں اور یہ بات انھی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔" (آیت ۳۵/۳۶)

اللہ پاک کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات، دن، چاند، سورج ہیں اور فرشتے رات دن اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے ۔ وہ اللہ جو مُردہ زمین کو شاداب و زرخیز بنا دیتا ہے وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور جو لوگ قرآن پاک کی آیتوں کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں تو ایسا منکرین پہلے بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ کج بحثی کرتے ہیں کہ قرآن، غیر عربی زبان میں کیوں نہ نازل کیا گیا۔" اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کتاب دی تھی ۔ پھر اس میں بھی اختلاف پڑے اور اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی (کہ مکمل سزا آخرت میں ملے گی) تو ان کے درمیان کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور وہ (اپنی کج فہمی کے باعث) اس (قرآن) کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہیں جو اُن کو چین لینے نہیں دیتا۔" (آیت ۴۵) ۔

نیکی اور بدی کا انجام آخرت میں نظر آئے گا اور آپ کا اللہ ایسا نہیں جو اپنے بندوں پر ظلم کرے۔

پچیسواں پارہ شروع ہوتا ہے :۔

لوگ قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی ۔ اللہ پاک ہی کو علم ہے اور وہ ہر چیز کا خالق بھی ہے اور علیم بھی ہے قیامت کے دن مشرکین کے معبود بھی اُن کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے اور کوئی اُن کا ساتھ نہ دے گا۔ واقعی اکثر انسان ناعاقبت اندیش ہیں ۔ وہ دنیوی بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتے اور تنگ دستی لاحق ہو تو نا امید ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی تکلیف کے بعد اللہ پاک کی طرف سے راحت مل جاتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہمارا حق ہے ۔ غرض جب انسان پر عنایت ہوتی ہے تو وہ اللہ پاک کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے ۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ (اے لوگو) دیکھو اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے آیا ہو پھر تم اس سے انکار کرو (تو یہ کتنی بڑی گمراہی ہے) اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اس کی مخالفت میں (حق سے) دور جا پڑے۔" (آیت ۵۲)۔" ہم عنقریب ان کو دنیا میں اور خود اُن کی ذات پر اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا

آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؟" (آیت ۵۳)۔

سورۃ الشوریٰ

یہ بھی حٰمٓ سے شروع ہے اور عٓسٓقٓ کا اضافہ ہے۔ یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب سے شروع ہوتی ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ "اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ مشرکین کے متعلق فکرمند نہ ہوں) جن لوگوں نے اللہ کے سوا (کسی اور کو) اپنا کارساز بنا رکھا ہے اللہ اُن کو دیکھ رہا ہے (اللہ اُن کو موقع دے رہا ہے) اور آپ اُن کے ذمّہ دار نہیں۔" (آیت ۶) "اور (جس طرح ہر زمانے میں حالات کے مطابق پیغمبروں ہی کی زبان میں کتابیں نازل ہوئیں) اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن عربی زبان میں نازل کیا تاکہ آپ مکہ معظمہ (جو مرجع خلائق ہے) کے لوگوں کو اور اس کے گرد کے لوگوں کو ڈرائیں اور یوم قیامت سے (بھی) ڈرائیں جس کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (اس دن) ایک گروہ جنّت میں اور ایک گروہ دوزخ میں ہوگا۔" (آیت ۷)۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پھر توحید اور قدرتِ الٰہی کی تبلیغ ہے کہ جس طرح دوسرے پیغمبروں نے ہدایت فرمائی اسی طرح آپ بھی فرماتے رہیں "پس آپ اُن کو اسی (دینِ حق) کی طرف بلاتے رہیے اور آپ اسی پر قائم رہیے جیسا کہ آپ کو حکم ملا ہے اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور فرما دیجیے کہ میں تو ہر کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے ایمان رکھتا ہوں اور مجھے اس کا حکم ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں......" (آیت ۱۵)۔ جو لوگ صرف دنیا چاہتے ہیں اُن کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا (آیت ۲۰)۔

"اور آپ دیکھیں گے کہ (قیامت کے دن) ظالم لوگ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اُن پر واقع ہو کر رہے گا اور جو لوگ ایمان لائے اور (آپ کے عمل کے مطابق) نیک عمل کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے اور وہ جو چاہیں گے اُن کے پروردگار کے پاس انھیں ملے گا۔ یہی بڑا فضل ہے" (آیت ۲۲)۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اور جو مصیبت تم پر پڑتی ہے وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کا بدلہ ہے اور اللہ بہت سے گناہ معاف بھی کر دیتا ہے۔" (آیت ۳۰)۔

اُس کی قدرت میں ہے کہ سمندروں میں جہازوں کو چلائے یا روکے رکھے یا لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اُن جہازوں کو تباہ بھی کر دے۔ پھر اللہ پر ایمان لانے والوں اور اُس پر توکّل کرنے والوں کا ذکر ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں اور بُرائیوں سے بچتے ہیں اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، اللہ کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور "جو شخص صبر کرے (اور قدرت رکھنے کے باوجود چھوڑ دے) اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔" (آیت ۴۳)۔

"پھر (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر وہ روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کا کام تو بس (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے (اِترانے لگتا ہے) اور اگر لوگوں کو ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (وہ سب نعمتیں بھول جاتا ہے) درحقیقت انسان بڑا ناشکرا ہے۔" (آیت ۴۸)۔

اللہ پاک جس کو چاہے بیٹے دے یا بیٹیاں دے یا بے اولاد رکھے۔" اور کسی بشر کی طاقت نہیں کہ اللہ اس سے (براہِ راست) بات کرے مگر ہاں وحی یا پردے کے پیچھے سے یا (اللہ) کسی فرشتے کو بھیج دے کہ اُس کے حکم سے جو اللہ چاہے وحی کرے۔ بے شک وہ بڑے مرتبے (اور) حکمت والا ہے"۔ (آیت ۵۱) "اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف ایک جانفزا حقیقت (قرآن) کو اپنے حکم سے بھیجا اور آپ (تو جمالِ الٰہی کے شیدائی تھے آپ) نہ جانتے تھے کہ کتاب (قرآن) کیا ہے اور نہ آپ کو یہ خبر تھی کہ (کمالِ) ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس (کتاب) کو نور بنا دیا ہے اور اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ آپ راہِ حق کی ہدایت کر رہے ہیں"۔ (آیت ۵۲)۔

سورۃ الزّخرف

حٰمٓ سے سورۃ شروع ہے اور قرآن کا ذکر ہے جو عربی میں ہے تاکہ "تم سمجھ سکو"۔ منکرین ہمیشہ وحی کے خلاف رہے اور پیغمبروں کے ساتھ جس طرح اُن کا برتاؤ رہا وہ خود انہی کے حق میں باعثِ ہلاکت ہُوا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پھر توحید کا پیام ہے۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، زمین کو معیشت کی جگہ بنانے والا، بارش کرنے والا کہ مردہ زمین زندہ ہو، جوڑے پیدا کرنے والا، کشتیاں، چوپائے وغیرہ سہولتیں مہیا کرنے والا وہی ہے۔ وہ لوگ کس قدر احمق ہیں جو فرشتوں کو اللہ پاک کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور اپنے باپ دادا کے دین پر چلنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کی بھی قدر نہ کی اور اب قرآن پاک کو بھی "جادو" قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ اس میں بڑی اثر آفرینی ہے۔ "اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی طریق پر ہو جائیں گے تو جو اللہ سے انکار کرتے ہیں ہم اُن کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی (چاندی کی) جن پر وہ چڑھا کرتے اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں (چاندی کے) اور سونے کے (کر دیتے) اور یہ سب سامان تو صرف دنیا کی زندگی کو برتنے کے لیے ہے اور آخرت آپ کے رب کے یہاں پرہیزگاروں کے لیے (خاص) ہے"۔ (آیت ۳۳-۳۵)۔ (اسی وجہ سے حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے کہ دنیوی اعزاز کی کوئی قدر و منزلت ہوتی تو کافروں کو نہ دیا جاتا) "اور جو رحمٰن (اللہ) کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (تو) ہم اُس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے"۔ (آیت ۳۶)۔ "اور بلاشبہ شیاطین ہی راہِ حق سے روکتے ہیں"۔ (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ بہروں کو سنائیں گے یا اندھوں کو اور اُن کو جو صریح گمراہی میں ہیں راہ دکھائیں گے"؟ (آیت ۴۰)۔

"اور بے شک یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی امّت کے لیے باعثِ نصیحت ہے (قیامت تک کے لیے امت کو شرف حاصل ہوگا) اور (لوگو!) عنقریب تم سے پوچھا جائے گا"۔ (آیت ۴۴)۔

پھر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر ہے کہ فرعونیوں نے بھی یہی کہا کہ اُن کے ساتھ فرشتے کیوں نہ اُترے؟ یہ دولت مند کیوں نہ ہوئے؟ وہ لوگ بھی اللہ کی آیات کو جھٹلاتے رہے۔ چنانچہ وہ بھی تباہ کر دیے گئے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ منکرین اپنے بتوں سے انہیں کمتر سمجھتے تھے۔ "اور وہ تو قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ پس (آپ فرما دیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت، نبوت، ولادت، اُن کا اٹھایا جانا اور قریبِ قیامت کے اُن کا نازل ہونا) اس میں شک نہ کرو

اور میری ہی پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔" (آیت ۶۱) - قیامت کے دن "سبھی (دنیوی) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔" (آیت ۶۷) - یہ پرہیزگار بلاخوف و غم جنّت میں داخل ہوں گے (اور حکم ہوگا کہ) "تم اور تمھاری بیویاں خوش خوش جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ (خدّام) ان کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لیے پھریں گے اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھ کو بھائے سب موجود ہوگا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔" (آیت ۷۰-۷۱) - پھر مجرمین کا ذکر ہے کہ وہ جہنّم میں ہمیشہ رہیں گے اور وہاں موت کے خواہش مند ہوں گے۔" آپ (احمقوں سے) فرما دیجیے کہ اگر رحمٰن (اللہ) کے اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اُس کی عبادت کرنے والا ہوں" - (آیت ۸۱) - "پس (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ انھیں لغو باتوں اور کھیلوں میں پڑا رہنے دیں یہاں تک کہ اُن کو اپنے اُس دن (قیامت) سے سابقہ پڑے جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے۔" (آیت ۸۳) - کفار ہر چند اللہ کے منکر ہیں لیکن" اور اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ اُن کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے - پھر یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں - (اپنے خالق کی عبادت کیوں نہیں کرتے ؟)" - (آیت ۸۷) - " پس آپ اُن سے درگذر کیجیے (اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیجیے) اور فرما دیجیے کہ تم پر سلام ہو (اللہ تم کو ہدایت دے) - پھر عنقریب اُن کو حقیقتِ حال معلوم ہو جائے گی۔" (آیت ۸۹)

سورۃ الدّخان

حٰمٓ - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب ہے کہ یہ روشن کتاب کو ہم نے لیلۂ مبارکہ میں نازل کیا ہے۔" اس اہم رات میں ہر اہم معاملے کا (جو ایک سال تک ہوتا رہے گا) فیصلہ کر دیا جاتا ہے (اور یہ) احکام ہماری بارگاہ سے جاری ہوتے ہیں، کیونکہ ہم ہی (قرآن صاحبِ قرآن اور فرشتوں کو) بھیجنے والے ہیں (اور یہ سب) آپ کے رب کی رحمت ہے - بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔" (آیت ۱-۶) "پس (آپ اُن منکرینِ حق سے کنارہ کش رہیے اور) اُس دن کا انتظار کیجیے جب کہ آسمان سے ایک نمایاں دھنواں ظاہر ہوگا جو لوگوں کو گھیر لے گا - یہی دردناک عذاب (کی ابتدا) ہے۔" (آیت ۱۰-۱۱)

جب تکلیف و عذاب آتا ہے تو مومن بن جاتے ہیں اور جب وہ ہٹ جائے تو وہ لوگ بھی اللہ سے ہٹ جاتے ہیں - پھر موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بتایا ہے کہ فرعون سے انہوں نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو اور اپنا بندہ اُن کو نہ بناؤ - لیکن وہ اور اس کے ساتھی ایذا دینے لگے - پھر وہ ایسے تباہ ہوئے کہ اُن کے سازو سامان کے مالک دوسرے لوگ ہوئے - لیکن جو مسلمان ہوئے تھے اُن کو اللہ پاک نے لوگوں پر فضیلت دی تھی - قوم تُبّع (یمن) قوم عاد و ثمود وغیرہ جو نافرمان تھے سب تباہ کر دیے گئے - مجرموں کے لیے دوزخ میں زقوم کھانا ہوگا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹ کو کھولا دے گا اور مغرور لوگ اس عذاب کا مزہ چکھیں گے - البتہ پرہیزگار لوگ جنّت میں ہوں گے، باریک اور دبیز ریشمی لباس، عمدہ میوے اور ہر طرح کی آسائش کی چیزیں مہیّا ہوں گی۔ "پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں آسان کو دیا ہے تاکہ وہ (آپ کے رب کو) یاد رکھیں (نصیحت حاصل کریں)" (آیت ۵۸)

سورۃ الجاثیہ

حٰمٓ - (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم آپ فرما دیجیے کہ) "اس کتاب کا نازل کیا جانا اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست

حکمت والا ہے۔" (آیت ۲)۔ کائنات کی ہر شے اُسی کی قدرت اور حکمت کا مظہر ہے۔ منکرین محض غرور اور ضد کی بنا پر اس کے کلام کو قبول نہیں کرتے اور مذاق اُڑاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ جہنم میں پھینکے جائیں گے۔" اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو تمھارے کام میں لگا دیا تاکہ اللہ کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اُس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکرادا کرتے رہو۔ اور اُس نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے حکم سے تمھارے کام پر مامور کر رکھا ہے (ہر چیز پر قبضہ کرنے کی صلاحیت تم میں ودیعت فرمائی ہے)۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔" (آیت ۱۲-۱۳) اسی آیت سے انسانی صلاحیتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ (علامہ اقبالؒ نے یہیں سے انسان کی بے پایاں صلاحیتوں کا پیام لیا ہے)۔

امتِ محمدیہ کو جب کسی اہم کمزوری سے باخبر کرنا ہوتا ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے خطاب ہوتا ہے تاکہ پوری امت ہوشیار رہے۔ آیت ۱۸ میں اسی طرح خطاب ہے کہ "پھر (بنی اسرائیل کے متعدد پیغمبروں کے بعد) ہم نے آپ کو دین کی واضح راہ پر مامور کر دیا۔ پس آپ اسی پر چلتے رہیں اور اُن لوگوں کی خواہش پر نہ چلیں (اُن کی پرواہی نہ کریں) جو دین کی سمجھ ہی نہیں رکھتے۔"

ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ نصیحت کو سنا جائے لیکن جو سُننا ہی نہ چاہے اور جو وہم کو اپنا رہبر بنالے وہ کب راہِ راست پر آسکے گا۔" اور جب ہماری واضح آیتیں انھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو اُن کی حجت یہ ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ (زندہ کرکے)۔ آپ فرمادیجیے کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہی تم (سب) کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کچھ شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔" (آیت ۲۵-۲۶)۔

قیامت میں منکرین گھٹنوں کے بل، ذلیل و خوار بیٹھے ہوں گے اور انھیں بتایا جائے گا کہ تمھیں ہماری آیتیں سُنائی گئی تھیں اور قیامت کے آنے کا وعدہ بھی سُنایا گیا تھا" اور (اُن سے) کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا کہ تم نے اِس دن کے آنے کو بُھلا رکھا تھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمھارا کوئی مددگار نہیں۔" (آیت ۳۴)۔

اللہ ہی کو تمام خوبیاں اور بزرگی زیب دیتی ہے — اُس کے مقابلے میں انسان عاجزی اور انکساری اختیار کرے تو فلاح پائے — (دین کی حلاوت فروتنی ہی میں ہے — جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے)۔ —

<u>چھبیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

سورۃ الاحقاف

حٰمٓ۔ یہاں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور کائنات کی تخلیق کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ منکرین کو توحید سمجھ میں نہیں آتی۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرمادیجیے کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو، مجھ کو یہ دکھاؤ کہ انھوں نے کونسی زمین کو پیدا کیا ہے یا وہ آسمانوں (کے بنانے میں) شریک ہیں۔ (اس بات کے ثبوت کے لیے) تم میرے پاس کسی (آسمانی) کتاب کی سند اِس (قرآن) سے پہلے کی لے آؤ۔ (یا انبیاء علیہم السلام کا) کچھ (بچا کھچا) علم ہی جو چلا آتا ہے (وہی لے آؤ) اگر تم سچے ہو۔" (آیت ۴) پھر فرمایا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہی نے یہ قرآن بنایا ہے تو" آپ فرما دیجیے کہ اگر میں نے یہ خود بنالیا

ہے تو تم اللہ کے سامنے میری کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے "۔ اور "آپ فرما دیجیے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا۔ (مجھ سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں) میں (خود بھی) نہیں جانتا کہ مجھے کن حالات سے گزرنا ہے اور تم کو کن حالات سے۔ مجھ کو تو اس وحی کی پیروی کرنی ہے جو میری طرف آتی ہے اور مجھے تو بس صریح (اور علی الاعلان) ہدایت کرنی ہے "۔ (آیت ۵)۔ عبداللہ بن سلام مشہور یہودی تھے جو قرآن کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔ اُن کے سلسلے میں فرمایا ہے "آپ فرما دیجیے کہ بھلا دیکھو تو اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے ہے اور تم اس کے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس جیسی کتاب پر گواہی دے رہا ہے (یعنی یہ گواہی دے کہ کتبِ آسمانی میں ایسی ہی کتاب کے نازل ہونے کی بشارت ہے) پھر وہ (خود) ایمان لے آئے اور تم اپنی اکڑ میں رہو۔ بے شک اللہ (ایسے) ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا "۔ (آیت ۱۰)۔

دوسرے رکوع میں ظالموں کے لیے ڈرا اور محسنین (نیکی کرنے والوں) کے لیے خوش خبری ہے۔ پھر ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کا حکم ہے اور جو نافرمان اولاد ہے اُن کے لیے وعید ہے" اور جس دن کافر لوگ دوزخ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ (تو اُن سے کہا جائے گا کہ) تم نے دنیا کی زندگی میں خوب مزے اُڑا لیے اور خوب لطف اٹھایا۔ پس آج تم کو عذاب دیا جائے گا۔ (یہ) بدلہ ہے اُس غرور کا جو تم دنیا میں ناحق کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم نافرمانی کرتے رہتے تھے "۔ (آیت ۲۰)۔

پھر قوم ہود کا بیان ہے۔ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو وحدانیت کی تلقین کی اور کفر پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ قوم ہود نے عذاب (آزمائش کے لیے) مانگا۔ وہ عذاب بادل کی شکل میں نمودار ہوا تو وہ سمجھے کہ بارش ہوگی لیکن وہ ایسی دردناک عذاب والی آندھی تھی کہ وہ لوگ تباہ ہو گئے اور اُن کے گھروں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قوم ثمود و عاد اور قوم لوطؑ کی بستیاں اسی طرح عذابِ الٰہی سے تباہ ہو گئیں۔ یہ سب واقعات مسلمانوں کی ہدایت کے لیے ہیں جس طرح کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن پاک سُنا جب کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بطن نخلہ میں نماز فجر پڑھ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی قوم کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے گئے اور انکار پر عذاب سے ڈرایا اور بتایا کہ اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہے۔ آخر میں اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ صبر فرمائیں جیسا کہ پہلے بھی اولوالعزم پیغمبروں نے اپنی قوموں کی ایذا پر کیا تھا۔

سورۃ محمدؐ

جن لوگوں نے راہِ حق سے خود کو اور دوسروں کو دور رکھا وہی گمراہ ہیں لیکن جو اللہ پر ایمان لائے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق عمل کیا اور اُن کے قرآن پر ایمان لائے تو اللہ پاک اُن کی بُرائیاں دور کر کے ان کا حال سنوار دے گا۔ پھر جنگ کے دوران مستقل مزاجی اور دلیری سے لڑنے کا حکم ہے اور شہدائے کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ اگر مسلمان، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد فرمائے گا۔ وہی اُن کا کارساز ہے اور کافروں کا کارساز کوئی نہیں۔

دوسرے رکوع میں نیکوکار مومنین کے لیے جنت کی بشارت فرمائی گئی ہے اور جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ کافروں کے لیے آخرت میں دوزخ اور اس میں عذاب کی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ نیز یہ کہ کافر دنیا میں ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایسے کھاتے ہیں جیسے

چوپائے اور یہ اپنی نفسانی خواہشوں کے تابع ہوتے ہیں۔ کافروں میں بعض منافقین ہیں جن کے دلوں پر مہر کر دی ہے پس یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگیں۔

تیسرے رکوع میں بیان فرمایا ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ایسی سورۃ کیوں نہ اُتاری گئی جس میں جہاد کا حکم ہوتا لیکن جب جہاد کی سورۃ عطا ہوئی تو وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے اُن لوگوں کی طرح دیکھتے ہیں جن پر موت سے بیہوشی چھائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں پر لعنت فرمائی ہے اور ان کو (حق کو سننے سے) بہرا کر دیا اندھا کر دیا (حق دیکھنے سے)۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں پس کیوں نہیں یہ لوگ قرآن میں غور کرتے (حق کو پہچاننے کے لیئے) یا (ان کے) دلوں پر قفل لگے ہیں (یہاں نکتہ قابلِ غور ہے کہ حق کو پہچاننے کے لیے قرآن مجید میں غور بہت اہم ہے۔ اگر دل پر قفل ہو تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے صدقے میں توبہ کر لی جائے اور غور کیا جائے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی سچا غلام مل جائے تو کام بہت سہل ہو جاتا ہے سچے غلام کی پہچان یہ ہے کہ جس کی صحبت میں رہ کر انسان بُرے کاموں سے نفرت اور نیک کام کرنے یعنی شریعت محمدیہ پر شوق سے چلنے والا بن جائے) شیطان کے فریب میں آ کر مرتد ہو جانے پر عقوبتوں کا بیان ہے۔

چوتھے رکوع میں جہاد کی آزمائش ضروری قرار پائی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم ماننے کے ساتھ ساتھ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ماننے کا حکم فرمایا ہے۔ دشمن کے مقابلے میں سستی نہ کرنے کا حکم دیا ہے جس طرح کھیل کود میں نفع نقصان یا فتح و شکست کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح دنیوی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایمان لانے اور پرہیزگاری کرنے پر ثواب عنایت فرمانے کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ (اس میں بہت سے دینی اور دنیوی فائدے مضمر ہیں سب سے اہم یہ کہ عاقبت بہتر ہو جائے گی تعمیل حکم پر آخرت میں ثواب ملے گا۔ دنیوی فائدہ یہ کہ مناسب تقسیم دولت میں مدد ملے گی اور معاشرہ خوش حال ہو گا۔ اس کی ایک مثال یوں سمجھ لیجیے کہ اگر ایک جزیرے میں ایک شخص ارب پتی اور ہزار افراد تنگدست ہوں تو کاروبار اچھا نہ ہوگا یعنی خوش حالی نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف ارب پتی کروڑ پتی بن جائیں اور ہزار افراد میں کچھ لکھ پتی اور کچھ کم دولت والے ہوں تو بفضلہٖ تعالیٰ خوشحالی ہوگی) آخر میں تنبیہہ ہے کہ اگر حکم عدولی کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم بدل دے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے یعنی حکم عدولی نہ کریں گے بلکہ تعمیل حکم کرنے والے ہوں گے۔

سورۃ الفتح

پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین فرمایا ہے جو بعد کے واقعات سے بفضلہٖ تعالیٰ صحیح ثابت ہوئی۔ نیز اگلی پچھلی لغزشیں بھی معاف فرمانے کی خوشخبری عنایت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو جنت کی خوش خبری اور کافروں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس طرح بیان فرمائی "تحقیق بھیجا ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔" حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ ان کی مدد کرو اور تعظیم کرو اللہ تعالیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کو اپنے ہی سے بیعت فرماتے ہیں۔ بیعت توڑنے والوں کو خرابی کا ڈر اور عہد پورا کرنے

والوں کو اجرِ عظیم کی خوش خبری سنائی ہے۔ دوسرے رکوع میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو واپسی پر مطلع فرمایا ہے کہ پیچھے رہنے والے دیہاتی مغفرت کے لیے عرض کریں گے نیز خیبر میں ساتھ چلنے کے لیے۔ دیہاتیوں کے لیے تنبیہہ ہے کہ انھوں نے بدگمانی کی تھی اس لیے خیبر میں ساتھ نہیں لیا جائے گا۔ البتہ ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤگے اور اگر تم اطاعت کرو گے تو اچھا اجر (جنت) ملے گا اور پھر جانے والوں کے لیے دردناک عذاب کی سزا ہوگی۔ جہاد سے رہ جانے والوں میں اندھے لنگڑے اور بیمار پر تنگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ماننے والوں کے لیے نعمتوں والی جنت کا وعدہ ہے اور پھر جانے والوں کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے۔

تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خوش ہونے کا اظہار فرماتے ہیں جبکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دست مبارک پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اس خوشی میں فتوحات اور غنیمتوں کی خوش خبریاں عطا فرمائیں نیز دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالنے کا انعام فرمایا اور صلح کی مصلحتیں بیان فرمائیں۔

چوتھے رکوع میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے سچے خواب کا سچ ہونا بیان فرمایا ہے اور اپنے پیارے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب فرمائے اور اللہ تعالیٰ کی شہادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر کافی بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں اور رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہتے ہیں۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی علامت روشن چہرے فرمائے ہیں۔ یہ نشانیاں توریت اور انجیل میں بھی بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ (اس آیت میں "معہٗ" سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ "اشداء علی الکفار" سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ "رحماء بینھم" سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور "رکعاً سجداً" سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح اسلام کے فروغ کی چار منزلوں کا ذکر ہے۔ اخرج شطئہٗ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ۔ فازرہٗ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور۔ فاستغلظ سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہد اور فاستوٰی علیٰ سوقہٖ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے)۔

سورۃ الحجرات

اس سورۃ میں ایمان والوں کو حکم ہے کہ وہ کسی معاملے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے سبقت نہ کیا کریں یعنی ان کے ارشاد سے پہلے نہ بول اٹھا کریں بلکہ اُن کے حکم کا انتظار کریں۔ دوسرے یہ کہ اپنی آواز کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی آواز سے اُونچا نہ کریں بلکہ پکار کر بھی بات نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا کرنے سے ان کے عمل ہی ضائع ہو جائیں۔ اسی طرح کسی فاسق کی بات پر یقین نہ کریں بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے تحقیق کر لیں۔ ورنہ تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا۔ اگر مسلمانوں کے دو فریق لڑ پڑیں تو اُن میں میل جول کرا دینے کا حکم ہے۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتے تو ایسے سے لڑنے کا حکم ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کا حکم مان لے۔

انصاف اور عدل کو اللہ پاک دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اگر لڑ پڑیں تو صلح کرا دو تاکہ تم پر رحمت ہو۔ دوسرے رکوع میں چند اہم منہیات ہیں :-

۱- ایک دوسرے کی تضحیک نہ کرو۔

۲- بدگمانی سے بچو۔

۳- غیبت نہ کرو۔

۴- نسب پر فخر نہ کرو (اللہ کے نزدیک وہی شخص سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

۵- ایمان لانے کا احسان نہ جتاؤ (یہ تو اللہ نے تم پر احسان کیا ہے)۔ ان منہیات کا خیال نہ رکھیں ورنہ دنیا میں ذلت اور عقبیٰ میں دردناک سزا ہو گی۔

سورۃ قٓ

ساتویں منزل شروع ہوتی ہے۔

قٓ، حروف مقطعات میں سے ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب ہے کہ وہ جب اُنہی کے خاندان اور قوم میں سے مبعوث ہوئے تو کافر کہنے لگے کہ یہ تو عجیب بات ہے۔ (کہ اللہ کا رسولؐ ہماری طرح چلتا پھرتا ہے اور مرنے کے بعد پھر زندہ کیسے جانے کی خبر دیتا ہے۔" ہم جانتے ہیں کہ زمین ان (کے جسموں) میں سے کس قدر گھٹاتی ہے (اور کیا نہیں گھٹاتی) اور ہمارے پاس تو (وہ) کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے" (آیت ۴)۔ کفار کی یہ سب باتیں اُن کے وہم و قیاس پر مبنی ہیں اور سراسر غلط ہیں۔" درحقیقت انہوں نے (دین) حق کو جب اُن کے پاس آ پہنچا، جھٹلا دیا (اس لیے) اب وہ اُلجھن میں پڑے ہیں" (آیت ۵) اب اللہ تعالیٰ کافروں کی توجہ آسمان، زمین، پہاڑ اور اناج پیدا کرنے کی طرف مبذول فرماتے ہیں تاکہ اُن کی قدرت کاملہ کا یقین ہو جائے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لائیں۔ اس کے بعد رسولوں علیہم السلام کے جھٹلانے والوں کے انجام سے ڈرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پہلی بار پیدائش کر کے تھک نہیں گئے، بلکہ کافر نئی پیدائش سے شبہ میں ہیں۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور نفس جو وسوسہ ڈالتا ہے وہ ہمیں معلوم ہے اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی قریب ہیں۔ فرشتے انسان کے اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ موت کی سختی ضرور پیش آئے گی۔ قیامت کے دن دوبارہ صور پھونکا جائے گا۔ تب کافروں سے کہا جائے گا کہ عذاب کے وعدہ کا دن یہی ہے۔ دنیا میں تو غفلت میں تھا۔ اب پردہ اُٹھ گیا سو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ اُن کا اعمال نامہ پیش ہو گا اور دوزخ کا حکم ہو گا۔ ہم نشین شیطان کہے گا کہ میں نے اسے گمراہ نہیں کیا یہ خود ہی گمراہی میں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔" جھگڑو مت۔ میں پہلے ہی کتابوں اور رسولوں علیہم السلام کے ذریعے عذاب کا وعدہ بھیج چکا تھا۔" میرے ہاں بات نہیں بدلتی اور میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔"

تیسرے رکوع میں فرماتے ہیں جس دن دوزخ سے کہا جائے گا کیا تو بھر گئی تو وہ عرض کرے گی کیا اور کچھ بھی ہے۔ جنت پرہیزگاروں

کے نزدیک کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ اُن سے جنّت میں داخل ہونے کے لیے فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کفار سے پہلے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے قوت میں زیادہ تھے اور وہ عذاب سے نہ بچ سکے بے شک اس بیان میں اس شخص کے لئے نصیحت ہے جو دل رکھتا ہو اور متوجہ ہو کر سُنے۔ فرماتے ہیں "ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو کچھ تکان نہیں ہوئی"۔ کافروں کے کہنے پر صبر کی تلقین اور ذکر اور نمازیں ادا کرنے کا حکم ہے۔ جس روز صور پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو کر حاضر ہوں گے۔ قرآن شریف سے اس شخص کو نصیحت کرنے کا حکم ہے جو وعدۂ عذاب سے ڈرتا ہے۔

سورۃ الذاریٰت

پہلے رکوع میں قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے شک جس بات کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ بالکل حق ہے اور بیشک اعمال کی جزا اور سزا ضرور ہوگی۔ بیشک تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف کے بارے میں اختلاف رکھتے ہو قرآن شریف سے وہی باز رکھا جاتا ہے جس کی قسمت میں اوندھا ہونا ہو۔ جو غفلت میں آخرت کو بھولے ہوئے ہیں۔ ان پر لعنت ہو۔ وہ بے سند باتیں کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی۔ فرماتے ہیں فرما دیجیے جس دن ان کو آگ کا عذاب ہوگا۔ اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے وہ دن جس کی تم جلدی کرتے تھے۔ پرہیزگاروں کو جنت میں نعمتیں عطا ہوں گی۔ یہ رات کو عبادت کی وجہ سے کم سوتے تھے اور بوقت سحر گناہوں کی معافی مانگا کرتے تھے۔ ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حصہ مقرر تھا۔ یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں اور خود ان میں نشانیاں موجود ہیں۔ ادھر توجہ دلائی گئی ہے۔ سب کا رزق آسمان میں موجود ہے۔ یہ حق ہے۔

دوسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعے بیان فرمائی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی نے تعجب فرمایا تو فرشتوں نے تسلی فرمائی کہ تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ وہ حکمت والا جاننے والا ہے۔

اب ستائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے:-

ابراہیم علیہ السلام فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ کس کام سے آئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مجرم قوم یعنی قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں جن پر پتھر برسانے کا عذاب ہوگا۔ سوائے مسلمانوں کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں نشانی ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بھی نشانی ہے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ عاد کے قصوں میں بھی نشانی ہے۔ آندھی کے عذاب کی صورت میں۔ ثمود کے ہاں سخت آواز کے عذاب کی نشانیاں ہیں۔ اور ان سے پہلے سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم کے بدکار لوگوں کو ہلاک کیا۔

تیسرے رکوع میں توحید کا بیان ہے۔ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کی نشانیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی ہے کہ آپ سے پہلے جو رسول علیہم السلام کافروں کے پاس آئے تو کافر ان کو جادوگر اور دیوانہ کہتے تھے جیسے کہ یہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے آئے ہیں۔ نیز یہ کہ آپ پر الزام نہیں کیونکہ آپ تبلیغ فرما چکے اور نصیحت فرمائیے کیونکہ نصیحت

مسلمانوں کو فائدہ دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن اور انسان کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور غلامی میں زندگی گزرے تو عین عبادت ہے چاہے روزی کمانا ہو یا بچوں کی پرورش وغیرہ کے کام ہوں۔ پوری زندگی کو عبادت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ اتباع کی جائے تاکہ دنیا میں پیدا کیے جانے کا مقصد حاصل ہو۔ (اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے کسی اور کے آگے جھک کر اپنی توہین نہ کرائے) "اور یقیناً اللہ ہی روزی دینے والا بڑا زور آور توانا ہے۔" (آیت ۵۸) اور ظالموں کے لیے عذاب (قیامت پر) مقرر ہے۔

سورۃ الطور

پہلے رکوع میں اللہ پاک نے مختلف چیزوں کو گواہ بنا کر فرمایا ہے کہ کائنات فنا ہوگی، قیامت آئے گی اور کافروں کو دوزخ میں عذاب ضرور ہوگا لیکن مسلمانوں کے لیے (متقیوں کے لئے) جنت ہے اور وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

دوسرے رکوع میں ہے کہ "آپ نصیحت فرماتے رہیے کیونکہ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنوں۔" (آیت ۲۹) کفار کہتے ہیں کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن خود بنا لیا ہے تو ایسا کلام کوئی بھی بنا لائے بلکہ سب انسان مل کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ دراصل کفار نہ قرآن کو مانتے ہیں اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ بلکہ اللہ کے متعلق بھی انکے خیالات مہمل ہیں۔ وہ معمولی چیزیں اللہ پاک سے اور بہترین خود سے منسوب کرتے ہیں۔ "پس آپ اُن کو (اُن کے حال پر) چھوڑ دیجیے یہاں تک کہ وہ اپنے اُس دن کو دیکھ لیں جس دن اُن کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ جس دن اُن کی چال بازی اُن کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اُن کو (کہیں سے) مدد پہنچے گی۔" (آیت ۴۵ - ۴۶) پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ "اور (ان کی گستاخانہ باتوں اور دل آزار رویہ سے آپ غمگین نہ ہوں اور) آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار فرمائیے۔ بہرحال آپ تو ہماری نظروں میں ہیں (آپ کے دین کی حفاظت ہمارا کام ہے) اور آپ تو اپنے رب کی تسبیح اور اُس کی حمد کرتے رہیے (خصوصاً جس وقت) آپ کھڑے ہوں (خواہ سو کر اُٹھیں یا نماز کے لیے تیار ہوں) اور کچھ رات میں اس کی پاکی بیان کیا کیجیے اور تاروں کے غروب ہونے کے بعد (آیت ۴۸ - ۴۹) یعنی آپ ان اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح و تحمید میں جس طرح مصروف رہا کرتے ہیں مصروف رہیں۔ یہی آپ کے قلب کی راحت ہے اور یہی اللہ کو پسند ہے

سورۃ النّجم

گذشتہ سورۃ لفظ "النجوم" پر ختم ہوئی اور یہ "النّجم" سے شروع ہوتی ہے۔ آسمانِ نبوّت پر مختلف انبیاء علیہم السلام نمودار ہوئے لیکن اب ایک نجمِ وحدت کا طلوع ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ اور ان کے دین کو کامل و مکمل کرنے والا ہے — وہ تشریف لائے اور معراج کے اُس مقام تک پہنچے جہاں جبریل علیہ السلام بھی نہ پہنچ سکتے تھے۔ خود لفظ "النّجم" سے بعض مفسّرین نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی مراد لی ہے اور ابتدائی آیتوں کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :- "قسم ہے ستارے (یعنی نورِ مبینؐ) کی جب وہ (معراج سے) اُترا۔ قسم (اس بات پر کہ اے لوگو) تمہارا رفیق (اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم) نہ

بہکا اور نہ راہ سے بے راہ ہوا (یعنی جو دیکھا وہ حق دیکھا اور جو پایا، وہ حق پایا اور جو کچھ بیان کیا اس میں سر مو فرق نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے) اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے۔ وہ تو وہی فرماتے ہیں جو (اللہ کی طرف سے) اُن پر وحی ہوتی ہے۔ (آیت ۱-۴) — اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست اور بے واسطہ تعلیم دی اور انھوں نے آسمانوں کے اوپر استویٰ فرمایا اور جبریل علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ پر رک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قرب کی نعمت سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ لطف و رحمت کے ساتھ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا اور فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا (یہ نہیں بتایا گیا کہ فاصلہ کتنا کم رہ گیا۔) وصال کی نعمتوں سے فیضیاب کیا۔ اس کے بعد معراج شریف کی بقیہ سیر کا ذکر ہے۔ قریش واقعۂ معراج کے متعلق خواہ مخواہ جھگڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ پھر ان کے بے قدرت معبودوں کی طرف توجہ مبذول فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان بتوں کے نام کافروں کے باپ دادا نے رکھ لیے جن کی کوئی سند نہیں اور کافر محض اپنے فاسد گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ دنیا اور آخرت سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمانوں میں فرشتوں کی سفارش کام نہیں آتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ سفارش کی اجازت نہ عطا فرما دیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ اُس شخص سے مُنہ موڑ لیجیے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے منہ موڑ لے اور صرف دنیا ہی کی زندگی چاہے۔ وہ گنہگار اور پرہیزگار کو خوب جانتے ہیں۔ اپنی تعریف خود نہیں کرنی چاہیے پرہیزگار کو وہ خوب جانتے ہیں۔

تیسرے رکوع میں فرماتے ہیں کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا قیامت میں کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر شخص کو اُس کی کوشش کا بدلہ ملے گا۔ نافرمان قوموں کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے اور یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگلے ڈرانے والے کی طرح ڈرانے والے ہیں۔ حضورؐ کا کہنا مانو کیونکہ قیامت قریب آ گئی۔ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔

سورۃ القمر

پہلے رکوع میں شق القمر کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہودی اور ابوجہل حاضر ہوئے۔ یہودی نے ابوجہل سے کہا کہ جادو آسمان پر نہیں چلتا اس لیے چاند کے ٹکڑے کرنے کی درخواست کریں۔ درخواست پیش کی گئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کو دو ٹکڑے فرما دیا۔ یہودی ایمان لے آیا لیکن ابوجہل نے کہا کہ میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے۔ اور لوگوں سے دریافت کیا تو جن لوگوں نے یہ معجزہ دیکھا اقرار کیا لیکن ابوجہل پھر بھی ایمان نہ لایا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ کافروں سے منہ پھیرنے کو فرمایا ہے۔ قیامت میں کافروں کو پتا چل جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا بیان نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی کے انجام کو بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کو نصیحت کے لیے آسان فرما دیا ہے کیا پس کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

دوسرے رکوع میں سیدنا صالح علیہ السلام کی قوم ثمود اور سیدنا لوط علیہ السلام کی قوموں پر نافرمانی کی وجہ سے عذاب ہونے

اور شکر گزاری کرنے والوں کو بچانے کا بیان ہے اور قرآن شریف سے نصیحت حاصل کرنے کی تلقین ہے۔
تیسرے رکوع میں فرعون کا جھٹلانے پر معذب ہونے کا بیان ہے اور مکہ معظمہ کے کافروں کو جھٹلانے پر عذاب کی تنبیہ ہے قرآن شریف سے نصیحت حاصل کرنے کی تلقین ہے۔ لوح محفوظ سب کے کل اعمال کا لکھا ہونا بیان ہے نیز پرہیز گاروں کے لیے جنت کی نعمتوں کا بیان ہے۔

سورۃ الرحمٰن

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ رحمٰن نے قرآن سکھایا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو) انسان یعنی جان انسانیت مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پیدا فرمایا۔ اس کے علاوہ دیگر مخلوقات کو پیدا فرمانے کا ذکر ہے۔ ترازو کو پیدا فرمایا تاکہ انصاف سے تولا جائے۔ زمین کو بچھانے کی نعمت کا ذکر ہے اور اس میں سے میوے، اناج اور پھولوں جیسی نعمتوں کے پیدا ہونے کا بیان فرما کر انسانوں اور جنوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت سے انکار کریں گے۔ آدمی کی اصل یعنی سیدنا آدم علیہ السلام کو خشک مٹی اور جنوں کے باپ جان کو بغیر دھوئیں والی آگ سے پیدا فرمانے کے بعد دریافت فرماتے ہیں کہ کس کس نعمت سے انکار کریں گے۔ ہمارا وجود بلکہ ایک ایک عضو نعمت ہے اور اس کا انحصار یا بنیاد سیّدنا آدم علیہ السلام اور جان کی پیدائش ہے۔ اسی طرح دوسری نعمتوں کا ذکر ہے اور ہر نعمت پر دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کس کس نعمت کو جھٹلائیں گے۔
دوسرے اور تیسرے رکوع میں بھی مختلف نعمتوں کا ذکر فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ اے انسانو اور جنو تم کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ کچھ تو فی نفسہٖ نعمت ہیں باقی نعمتیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر بن جاتی ہیں۔ جنّت کے اوصاف اور دوزخ کے عذاب بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ عذاب سے ڈریں اور جنّت کی نعمتوں کے حصول کا شوق پیدا ہو۔

سورۃ الواقعہ

یہ سورۃ مکی ہے۔ پہلے رکوع میں قیامت کی نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں اور یہ کہ جب قیامت واقع ہو جائے گی تو کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ انسانوں کی تین گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ دائیں طرف والے جنت میں داخل ہوں گے جنّت کی نعمتیں بیان فرمائی ہیں۔ بائیں طرف والے دوزخی ہوں گے۔ دوزخ کے عذاب بیان فرماتے ہیں تاکہ ڈر کر ہدایت پانے والے نیک بن جائیں۔ تیسرے جو سبقت لے گئے وہ اللہ تعالیٰ سے خاص قرب رکھنے والے ہیں۔ یہ بھی جنت کی نعمتوں کے مستحق ہوں گے بفضلہٖ تعالیٰ۔
دوسرے رکوع میں بھی توحید کی نشانیاں بیان فرما کر پرہیز گاروں کے لیے جنت کی نعمتیں بیان فرمائی ہیں اور منکروں کے لیے دوزخ کے مختلف عذاب بیان فرمائے ہیں جو نصیحت کے لیے ہیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے عظمت والے پروردگار کا نام پاکی سے بیان فرمانے کے لیے ارشاد ہے۔ تیسرے رکوع میں آسمان رسالت کے درخشاں ستاروں (انبیاء علیہم السلام)

کی قسم کھائی گئی ہے "اور بے شک یہ ایک بڑی قسم ہے اگر تم سمجھو۔" (آیت ۷۶) بلاشبہ یہ قرآن کریم ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ اسے وہی چھوتے ہیں جو مُطَهَّر کیے گئے ہیں۔" (آیت ۷۹)۔ مطہّر کا اسم فاعل اللہ ہے جس نے پاک کیا ہے یعنی جن کے قلوب (صحیح عقیدے کی وجہ سے) پاک ہیں وہی اس قرآن کو حفظ کر سکتے ہیں۔ بدعقیدہ شخص حفظ نہیں کر سکتا۔" پھر کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔" (آیت ۸۱) پھر روح کے نکلنے اور موت کے وقت مرنے والے سے اللہ تعالیٰ کا نزدیک ہونا اور عزیزوں کا بے بس ہونا بیان ہے۔ نیک روح کے لیے جنت کے عیش ہیں اور منکروں کے لیے دوزخ کے عذاب کی وعید ہے اور رکوع کے آخر میں دوسرے رکوع کی آخری آیت دہرائی گئی ہے جس سے اس کی اہمیت یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عظمت والے پروردگار کا نام پاکی سے بیان فرمانے کے لیے فرمایا ہے۔

سورة الحديد

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ مختلف قدرتوں کا بیان فرما کر آسمانوں اور زمین کا چھ دن میں بنانا اور عرش پر جلوہ افروز ہونا بیان فرمایا ہے۔ پھر مختلف قدرتوں کا بیان فرما کر اللہ تعالیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے اور ساتھ ہی فرمانبرداری پر اجر عظیم کی خوشخبری ہے۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ حالانکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو اس کی دعوت دے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ تم سے عالمِ ارواح میں پہلے ہی عہد لے چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ روشن آیات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارتا ہے تا کہ تمھیں کفر کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی کی طرف لے جائے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔ تمھیں کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالانکہ اللہ تعالیٰ کی سب میراث ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہاں سب چھوڑ جانا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر گئے تو عاقبت میں اجر عظیم ملے گا اور خرچ نہ کریں گے جب بھی مال و دولت دنیا میں چھوڑ جانی ہے اور عاقبت میں اجر عظیم سے محرومی۔ فتح مکہ معظمہ سے پہلے خرچ کرنے اور جہاد کرنے والوں کا درجہ فتح مکہ معظمہ کے بعد خرچ کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں سے بڑھا ہوا فرمایا ہے اگرچہ دونوں سے جنت کا وعدہ ہے۔

دوسرے رکوع میں مسلمان مرد اور عورتوں کا پُل صراط پر سے ایمان کی روشنی میں گزرنا اور جنت میں داخل ہونا۔ لیکن منافقوں کا نور سے محروم رہنا، پُل صراط پر سے نہ گزر سکنا اور دوزخ میں گرنا مذکور ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ ایمان والوں کے لیے وقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جائیں اور قرآن پاک کو پکڑیں۔ اور اُن جیسے نہ ہوں جن کو اُن سے پہلے آسمانی کتابیں ملیں لیکن بہت زمانہ گزرنے اور توبہ نہ کرنے سے اُن کے دل سخت ہو گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ کو خوشی سے قرض دینے والوں کے لیے (اُس کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے) اجر عظیم کی بشارت ہے اور منکرین کے لیے دوزخ کی وعید ہے۔

تیسرے رکوع میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا بیان ہے۔ "جان لو کہ دنیوی زندگی محض کھیل تماشا اور آرائش ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور کثرت سے مال اور اولاد کا حصول ہے۔ جیسے بارش کہ اُس سے کھیتی اُگتی کسانوں

کو بھلی معلوم ہوتی ہے) پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے یہاں تک کہ وہ چورہ چورہ ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیوی دولت ختم ہو جاتی ہے) اور آخرت میں (ایسے غافلوں کے لیے) سخت عذاب ہے اور (مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے۔ ورنہ دنیا کی زندگی تو دھوکا ہی دھوکا ہے۔" (آیت ۲۰)۔

"(اور اے مسلمانو، تم کو ان باتوں سے اس لیے آگاہ کر دیا گیا) تاکہ جو کچھ تم سے لے لیا گیا اس پر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ تم کو دیا گیا اُس پر اترانہ جاؤ اور اللہ کسی اترانے والے اور شیخی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔" (آیت ۲۳)۔ پھر ارشاد ہے کہ ہم نے لوہا اُتارا جس میں سخت جنگ کے سامان اور بہت فائدے ہیں۔ اللہ پاک دیکھنا چاہتا ہے کہ کون بن دیکھے ایمان لاتا ہے اور دین کی مدد کرتا ہے — بے شک اللہ پاک بڑی قوت (اور) غلبہ والا ہے۔

پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجنے اور اُن کی اولاد میں پیغمبری کا بیان ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو انجیل دی گئی اور ان کے پیروکاروں کے دلوں میں نرمی اور شفقت رکھی۔ رہبانیت انہوں نے خود ہی اختیار کر لی جس کا حق وہ ادا نہ کر سکے۔ پھر جو اُن میں سے ایمان لائے ہم نے اُن کو اجر دیا اور اُن میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔ (اس لیے کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے)۔" اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ تاکہ دُو حصے رحمت کے ملیں اور نور پیدا ہو (ایمان اور تقوٰی سے پُر نور ہو جاؤ) تم اُس کی روشنی میں چلو گے (یہاں بھی اور آخرت میں بھی) اور وہ تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۲۸)۔ اللہ کے فضل پر اہل کتاب کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ جس پر چاہے فضل کرے۔

<u>اب اٹھائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

سورۃ المجادلہ

شروع میں ظہار کا بیان ہے۔ ایک عورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ خاوند اسے ماں کہہ دے تو عام دستور کے مطابق اس سے علیحدگی ہو جاتی ہے اور بچے پریشان ہو جائیں گے اور گھر اُجڑ جائے گا۔ اللہ پاک نے اس بات (ظہار) کو لغو بات فرمایا اور ملاپ کے لیے کفارہ لازم فرمایا۔ اور یہ حکم اس لیے ہے کہ اللہ پاک اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانو۔ ورنہ اُن کی مخالفت کرنے والے ذلیل کیے گئے ہیں۔ پھر اللہ پاک کے ہر جگہ موجود ہونے کا بیان ہے۔ منافقین کے مخفی مشورے اور ان کی تمام باتیں اللہ پاک جانتا ہے۔ لوگوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف سازشیں نہ کریں اور خلافِ ادب بات نہ کریں ورنہ جہنم اُن کا ٹھکانا ہے۔ پھر مؤمنوں کو ہدایت ہے کہ اگر تم کان میں بات کرو تو وہ اچھی اور پرہیز گاری کی ہو۔ تم میں کشادہ دلی ہونی چاہیے۔ آدابِ مجلس بھی ملحوظ ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی بات چپکے سے عرض کرنی ہے تو پہلے مساکین کو نذرانہ دے دو۔ لیکن یہ حکم ایک دن یا آدھے دن کے بعد اُٹھا لیا گیا اور نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر زور دیا گیا تاکہ عاقبت سنور جائے۔

تیسرے رکوع میں کافروں سے دوستی کی ممانعت آئی ہے۔ منافقین کے لیے آخرت میں ذلت اور دوزخ کے عذاب کی وعید ہے۔ شیطان ان پر غالب آ گیا ہے اور اُن کے بُرے کام بھلے نظر آتے ہیں۔ تحقیق شیطان اور اُس کے لشکر ہی نقصان میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

اور اس کا رسولؐ غالب آئیں گے۔ فرماتے ہیں کہ کوئی قوم ایسی نہیں پاؤ گے جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہوں اور دوستی رکھیں اُن لوگوں سے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہوں چاہے وہ اُن کے باپ بیٹے، بھائی یا کنبے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے دوستی ہو تو کیا وہ لوگ ایماندار رہ سکتے ہیں۔ صرف ظاہر میں مسلمان ہو سکتے ہیں اور ان کا شمار منافقین میں ہوگا اور اُن کا حشر ویسا ہی ہوگا جیسا اس رکوع کے شروع میں بیان فرمایا گیا ہے۔ دشمنانِ اسلام نے مرتد بنانے کی بجائے آج کل کے دور میں خاص طور پر یہ ہتھکنڈا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے کہ منافق بنا کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کیا جائے تاکہ اسلام کی ترقی رُک جائے اور مسلمان دنیا بھر میں ذلیل ہو کر رہیں۔ اس شیطانی حربے کا جائزہ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کی روشنی میں لینے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہماری آخرت بہتر ہو اور دنیا میں بھی فلاح نصیب ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اس لیے بھی کہ ہماری اولادوں کو ذلت و خواری کی زندگی نہ بسر کرنی پڑے اور وہ بھی فلاحِ دارین حاصل کر سکیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے دوستی نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اُن کے دل میں ایمان نقش فرما دیتے ہیں۔ ان کو جنت کی بشارت ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہے جو فلاح پانے والی ہے۔

سورۃ الحشر

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ اس لیے سب انسانوں خاص طور پر مسلمانوں کو بھی پاکی ضرور بیان کرنی چاہیے۔ بنی نضیر کے یہود نے صلح کی عہد شکنی کی۔ ان کا خیال تھا کہ اُن کے قلعے اُن کو بچالیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور آخر ان کو نکلنا پڑا اور اپنے ہاتھوں سے اپنے مکان ویران کئے۔ یہ عبرت کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ غنیمت اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے یہ اس لیے بھی ہے تاکہ وہ مال دولت مندوں کا نہ ہو جائے۔ ایک خاص اصول وضع فرمایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں وہ نہ لو۔ نیز وہ مال ان فقیروں ہجرت کرنے والوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی وجہ سے جبراً اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے اور وہی اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ جو لوگ اُن کی طرف ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور مہاجرین کو مال دیئے جانے پر اپنے دل میں خلش نہیں پاتے اور ان کی خدمت اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں چاہے خود کتنے ضرورت مند ہوں اور اپنے نفس کو حرص سے روکتے ہیں ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ نیک لوگوں میں وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ۔ بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

دوسرے رکوع میں منافقین کا ذکر ہے جنھوں نے یہودیوں سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں اور یہودی بھی نہ لڑیں گے مگر قلعہ بند ہو کر یا دیوار کے پیچھے سے۔ اُن کو متفق بھی نہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ

اُن کے دل الگ الگ ہیں۔ ان کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ منافقین کی مثال شیطان کی سی ہے۔ جب انسان نے شیطان کے بہکانے سے کفر کیا تو خود الگ ہو گیا۔ دونوں جہنم میں جائیں گے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ڈرنے کا حکم ہے اور نافرمانی سے بچنے کا نیز اعمال کا جائزہ لینے کا کہ قیامت کے لیے کیا ذخیرہ کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کو بھول نہ بیٹھنے کا حکم ہے مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔ ورنہ بھولنے والے فاسق ہو جائیں گے۔ جنّت اور دوزخ والے برابر نہیں ہوتے۔ جنّتی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ قرآن شریف کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگر قرآن شریف پہاڑ پر اتارتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ توحید کا سبق ملتا ہے نیز اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بیان ہے۔

سورۃ الممتحنہ

پہلے رکوع کی پہلی آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستی کرنے کو منع فرمایا ہے فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ (یعنی کافروں کو) اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو چوری سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ بھیجے جانے والے خط کی اطلاع فرمائی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خط سارہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذریعے روضہ خاخ پر پکڑ منگوایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کی طرف رہنمائی فرمائی جبکہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم سے فرمایا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجتے ہو بیزار ہیں ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت ہمیشہ کے لئے ظاہر ہو گئی جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ امید دلاتے ہیں کہ کفّار کو ایمان کی ہدایت عطا فرما دیں اور اس طرح دشمن دوست بن جائیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہوا کہ کُفّار کو دعوتِ اسلام دیتے رہیں اور تبلیغی کاموں میں مصروف رہیں تاکہ جن کی قسمت میں ہدایت ہے مسلمان بن جائیں۔ اس کے بعد مسلمان مہاجر عورتوں کے امتحان اور بیعت کے لیے فرمایا گیا ہے۔ اور اُن کے مہر شوہروں کو ادا کرنے اور کافر عورتوں کے لوٹنے پر اُن کے مہر وصول کرنے کا حکم ہے۔ آخری آیت مبارکہ میں پھر فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرو کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے یعنی کفّار۔ تکرار سے اس کی اہمیت ظاہر فرمائی ہے۔

سورۃ الصف

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو ذکر کی تلقین کرنا ضروری اور اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے جو وہ کام نہیں کرتے جس کے لیے وہ کہتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دوست رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں اور پیچھے نہیں ہٹتے گویا وہ سیسہ کی دیوار ہیں۔ سیدنا موسےٰ علیہ السلام کی اپنی قوم تبلیغ فرمانے پر ایمان نہ لائی اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ستانے پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے

دل ٹیڑھے فرما دیئے یعنی ہدایت سے محروم فرما دیئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیش گوئی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روشن نشانیاں لائے تو کافروں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔ کافر چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نور (دین اسلام) کو بجھا دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ سب دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرک کتنے ہی ناخوش ہوں۔ مولانا ظفر علی خان نے کہا ہے :- ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہ تجارت بتائی ہے جس میں نفع ہی نفع ہے دردناک عذاب سے بچاتی ہے تجارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو گناہ معاف ہو جائیں گے اور جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ مزید ایک نعمت فتح کی حاصل ہوگی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا میں فتح اور آخرت میں جنت کی خوشخبری سنا دیجیے۔ مسلمانوں سے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور ایک گروہ مددگار ہو گئے تھے۔ اسی طرح دشمنوں کے مقابلے پر مدد ہوگی اور تم غالب ہو گے۔

سورۃ الجمعہ

گذشتہ سورۃ میں جہاد والی تجارت کے انداز سکھائے گئے تھے۔ اب محراب و منبر والی تجارت سکھائی جا رہی ہے تاکہ جسمانی اور روحانی روزی بھی میسر ہو۔

"جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو بادشاہ، پاک، زبردست حکمت والا ہے (اور) وہی ہے جس نے اُمیین میں اُنہی میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا جو (صرف اللہ پاک کے شاگرد ہیں) اُن کو اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ یہ لوگ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے اور (ان موجودہ لوگوں کے علاوہ) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی جو ابھی شامل نہیں ہوئے (یعنی موجودہ اور آنے والی تمام اُمتوں کے لیے وہی رسولِ برحق ہیں) اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔" (آیت ۱-۳- البقرۃ ۱۵۱- آل عمران ۱۶۴ میں بھی یہی مضمون آچکا ہے) توریت نازل کی گئی تھی لیکن اُس پر عمل نہ کرنے والے ایسے ہیں گویا گدھے کی طرح ہیں جو بہت سی کتابیں لادے پھرتا ہے۔ ع

چار پایئے بر وکتابے چند

اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ پھر یہودیوں کے لیے ارشاد ہے کہ "آپ فرما دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم کو آئے گی۔ پھر تم اُس (اللہ) کے پاس لائے جاؤ گے جو تمام چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو بتا دے گا جو تم کرتے رہتے تھے" (آیت ۸)۔ پھر انفرادی اور اجتماعی فلاح کے لیے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے لیے اذان ہوتے ہی روانہ ہو جائیں اور خرید و فروخت (تمام دنیوی مشاغل) ترک کر کے چلے جائیں۔ پھر جب نماز جمعہ ادا کر چکیں تو پھر اپنے کاموں میں لگ جائیں لیکن اللہ کو خوب یاد کریں تاکہ فلاح

حاصل ہو۔" اور (بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ) جب وہ کچھ خرید فروخت یا تماشا دیکھتے ہیں۔ تو اسکی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور (اے میرے حبیبؐ) آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ ہر تماشے اور ہر تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔" (آیت ۱۱)

سورۃ المنٰفقون

"(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔" بڑی بلیغ زبان میں اللہ پاک نے منافقوں کی تردید فرمائی ہے۔ یہ لوگ دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔" اور جب آپ اُن کو دیکھیں تو اُن کے جسم (ظاہراً) بھلے معلوم ہوں گے اور جب وہ بات کریں تو آپ اُن کی بات توجہ سے سُنیں۔ گویا وہ لوگ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئیں (یعنی محض بے جان) ہر تیز آواز کو سمجھتے ہیں کہ انہی پر آفت نازل ہوئی (ایسے بُزدل ہیں)۔ یہی دشمن ہیں اس لیے ان سے ہوشیار رہیے۔ اللہ ان کو غارت کرے (وہ حق سے) کہاں بہکے پھرتے ہیں۔" (آیت ۴)۔ یہی منافق لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں اُن پر خرچ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان ہو کر خود ہی منتشر ہو جائیں۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔ وہ لوگ (عبداللہ بن اُبی) یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم عزت والے ہیں ہم مدینہ کے ذلت والوں کو نکال باہر کریں گے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت، اللہ کے لیے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مومنین کے لیے ہے۔ پھر ایمان والوں سے خطاب ہے کہ وہ مال اور اولاد کی وجہ سے اللہ سے غافل نہ ہونے پائیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کریں قبل اس کے کہ موت آ جائے جو کبھی ٹل نہیں سکتی۔

سورۃ التغابُن

پھر اللہ پاک کی شان، اُس کی قدرت، خالقیت، علم کا ذکر ہے اور یہ کہ کتنے رسول آئے، کافروں نے انہیں جھٹلایا کہ وہ ہم جیسے بشر ہیں وہ کیا ہماری راہبری کریں گے! اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ مرنے کے بعد وہ ہرگز (دوبارہ) نہ اٹھائے جائیں گے۔ لیکن "آپ فرما دیجیے کیوں نہیں، میرے رب کی قسم، تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے" "پس (بھلائی اس میں ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اس نور (قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے" (آیت ۸)۔ اللہ پاک قیامت میں تم کو جمع کرے گا اور وہ ہار جیت کا دن ہوگا۔ جیتنے والے جنّت کی راحتیں پائیں گے اور ہارنے والے اصحاب النار ہوں گے۔ پھر مومنوں سے فرمایا ہے کہ تمھاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمھارے (دین کے) دشمن ہیں۔ وہ ایک آزمائش بھی ہیں۔ پس اللہ ہی سے ڈرو، اطاعت کرو اور (راہِ خدا میں) خرچ کرتے رہو۔ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے)۔

سورۃ الطلاق

بیویوں کی کوتاہیوں پر تحمّل سے کام لینا چاہیے (جیسا کہ گذشتہ رکوع میں بھی ذکر ہے)۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اگر حالات سے

مجبور ہو کر طلاق کی صورت پیدا ہو جائے تو عدت کا پاس رہے۔" اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ مسلمانوں سے فرما دیں کہ) جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو اُن کی عدت کے زمانے سے پہلے ان کو طلاق دو (حالتِ طہر میں) اور عدت کا حساب رکھو اور اللہ سے جو تمھارا رب ہے ڈرتے رہو (اور طلاق کے بعد عدت کے دنوں میں) اُن کو اُن کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں۔ ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو اُن کو نکال دو) اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو وہ خود اپنے حق میں ظلم کرے گا۔ (اسے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم، اللہ اس (طلاق) کے بعد (آپس میں ملاپ کی) کوئی صورت پیدا کر دے۔" (آیت ۱)۔

آیت ۲-۴-۶-۷ میں بھی طلاق کے مسائل ہیں۔

پھر وعید ہے کہ اللہ اور اُس کے پیغمبروں کی اطاعت نہ کرنے والے کس طرح تباہ کیے گئے۔ بے شک تمھارے لیے ایک کتاب نصیحت کی (قرآن) بھیجی گئی ہے اور" ایک ایسا رسولؐ جو تم کو اللہ کی روشن آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، (رسولؐ کی پیروی کریں) وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے آئے اور جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا اور نیک عمل کرتا ہے (رسول کی پیروی کرتا ہے) اللہ اُس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ نے اس (مومن) کو بہترین رزق عطا فرمایا۔" (آیت ۱۱)۔ پھر اللہ کی خالقیت اور حاکمیت کا ذکر آتا ہے۔

سورۃ التحریم

ازواجِ مطہرات کی دلجوئی کی خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض باتوں سے احتراز کرنے کی قسم کھالی تھی۔ تو اللہ پاک نے کفارہ مقرر فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسانی پیدا فرما دی۔ شروع کی چار آیتوں میں ان باتوں سے متعلق تلمیح ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ" اے ایمان والو، تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ اس (نارِ جہنم) پر بڑے سخت مزاج اور زبردست فرشتے (متعین) ہیں۔ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جائے اُسے (فوراً) بجا لاتے ہیں۔" (آیتؔ)۔

پھر ایمان والوں کو صدق دل سے توبہ کرنے کا حکم ہے جس سے تمام گناہ دور ہو جاتے ہیں اور وہ جنت کے حق دار بن جاتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق اور نرم مزاجی کی وجہ سے کفار اور منافقین سے جنگ کرنے میں سختی کریں۔ پھر نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کا ذکر ہے کہ وہ پیغمبروں کی بیویاں ہونے کے باوجود عذاب الٰہی سے نہ بچ سکیں اور فرعون کی بیوی (جو اسلام والوں کی معاون تھیں) اور حضرت مریم علیہا السلام (جو عصمت و عفت کی محافظ تھیں) اللہ پاک کے نزدیک مقبول ہوئیں۔ اور اُن کے درجات بلند ہوئے۔ گویا دین کی مخالفت سے پیغمبروں کی بیویاں بھی آگ سے نہ بچ سکیں۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور پیغمبروں کی تابعداری ہی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

انتیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

سورۃ الملک

اس سورۃ میں اللہ کی حکومت اور قدرت کا ذکر ہے تاکہ انسان محدود سے لامحدود کی طرف رجوع ہو اور آنے والی زندگی

کو یاد کرے۔ اللہ پاک اپنی قدرت کو دیکھنے کی دعوت دیتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ پھر بھی منکرین نہیں سمجھتے لیکن جب وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایک مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے پر ایمان لاتے ہیں اُن کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر ہے (آیت ۱۲) اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ کے نمونے یہ بے شمار پرندے بھی تو ہیں جن کو ہوا میں اللہ ہی تھامے ہوئے ہے (آیت ۱۹)۔

"(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان، آنکھیں اور دل دیے (لیکن) تم لوگ بہت کم احسان مانتے ہو۔ آپ فرما دیجیے کہ اُسی نے تم کو زمین میں پھیلایا اور تم اُسی کے سامنے جمع کیے جاؤ گے۔" (آیت ۲۳-۲۴)۔ خدائی کارخانہ تمہارے سامنے ہے، پھر بھی اس کارخانے کے خالق کا انکار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

سورۃ القلم

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "قسم ہے قلم کی اور قسم ہے ان کے لکھنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں (جیسا کہ کفار کہتے ہیں) اور آپ کے لیے بے شک (ایسا) اجر ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں (آپ کا فیض جاری رہے گا اور آخرت میں آپ کے بے حد بلند درجات ہوں گے) اور یقیناً آپ کا خُلق بہت ہی بڑا ہے۔" (آیت ۱-۴)۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے لیے اسم مبالغہ استعمال ہوا ہے۔ کسی اور پیغمبر کے لیے کسی صحیفے میں ایسا کلمۂ توصیف نظر نہیں آتا۔

پھر کافروں کے طعن و تشنیع اور شرارت کا ذکر ہے۔ اور پانچ بھائیوں کے ایک باغ کا ذکر ہے جو خیرات کرنے والے باپ سے ترکہ میں ملا تھا۔ ان بھائیوں نے سوچا کہ ہم محتاجوں کو کیوں دیں، علی الصباح ہی کیوں پھلوں کو نہ توڑ لیا جائے۔ لیکن منجھلے بھائی نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اللہ کی راہ میں خیرات کرنے پر زور دیا لیکن اُس کی ایک نہ چلی اور وہ باغ تباہ ہو گیا۔ گویا اللہ کو بھلا دینے سے نہ دنیا سدھر سکتی ہے اور نہ آخرت بن سکتی ہے منکرین کے انجام کا ذکر بھی ہے۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا تو اللہ پاک کی طرف سے تسلی دی گئی ہے کہ "پس آپ صبر کے ساتھ اللہ کے حکم کا انتظار کریں اور صاحبِ حوت (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب انہوں نے (اپنے رب کو) پکارا اور (حکم کا انتظار کیے بغیر روانہ ہو گئے) اس حال میں کہ وہ غم و غصہ میں گھٹ رہے تھے۔" (آیت ۴۸)۔ "اور کفار جب قرآن کو سنتے ہیں (تو آپ کو وہ گھورتے ہیں) یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو اپنی نظر سے پھسلا دیں گے (لیکن جب اُن کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوتی تو) اور کہتے ہیں کہ وہ تو مجنون ہے۔" اور یہ (قرآن) تو سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے (جس طرح آپ سب جہانوں کے لیے رحمت ہیں)۔" (آیت ۵۱-۵۲)

سورۃ الحاقہ

اس سورۃ میں کفار کے انجام کا ذکر ہے کہ دنیا میں بھی وہ لوگ (عاد و ثمود) تباہ ہوئے اور آخرت بھی اپنے لیے خراب کر لی۔ پھر قیامت کا منظر دکھایا گیا ہے اور دوزخ کی تکالیف کا ذکر وغیرہ ہے کہ منکرین وہاں جا کر اپنی حرکتوں پر کتنا افسوس کریں گے کہ "کاش

میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ جاتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش موت (ہمیشہ کے لئے) مجھے ختم کر گئی ہوتی۔ (افسوس) میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا۔ مجھ سے میری حکومت بھی جاتی رہی " (آیت ۲۵ - ۲۹) - پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ " پس میں قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے کہ یہ قرآن ، اللہ کا کلام ہے (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور ایک بزرگ لانے والے کا (یعنی جبریلؑ کا لایا ہوا) " (آیت ۳۸ - ۴۱) - کوئی یہ خیال نہ کریں کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی طرف سے کوئی بات اللہ پاک سے منسوب کر دیتے ہیں (آیت ۴۴) -" اور بے شک یہ (قرآن) تو یقینی طور پر حق ہے ۔ پس (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو اپنے رب کے نام کی تسبیح ہی کرتے رہیں جو بڑی عظمت والا ہے " (آیت ۵۱ - ۵۲) یعنی آپؐ کی بات کوئی سُنے یا نہ سُنے ، آپ اللہ کو یاد کرتے رہیں۔

سورۃ المعارج

ایک کافر کے مطالبے کا ذکر ہے کہ اُس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ سچے ہیں تو ہم پر عذاب نازل ہو جائے۔ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ " آپ (ان کے سوال سے آزردہ نہ ہوں) صبر فرمائیں صبر جمیل۔ وہ (دن) ان لوگوں کی نگاہ سے دور ہے اور ہماری نظر میں قریب ہے" (آیت ۵ - ۷) پھر اللہ کے نیک بندوں کا ذکر ہے کہ وہ نماز کے پابند ہیں۔ حق داروں کو مال دیتے ہیں۔ روزِ جزا پر یقین رکھتے ہیں ، اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں ، خود کو بچا کے رکھتے ہیں ، امانت دار اور وعدے کے سچے ، اپنی سچی گواہی پر قائم رہتے ہیں اور نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں" یہی وہ لوگ ہیں جو جنّت میں عزّت سے رہیں گے (آیت ۳۵) - یہ سب لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اور اسی اطاعت کی وجہ سے جنّتی ہیں پھر کفار کا ذکر ہے جو مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں ، آخرت میں ذلیل ہوں گے۔

سورۃ نوح

حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت دراز تک حق کی تبلیغ کی لیکن قوم تکذیب ہی کرتی رہی۔ وہ علانیہ اور چپکے چپکے بھی سمجھاتے رہے (آیت ۹) اور اللہ سے گناہ بخشوانے کے لیے ترغیب بھی دلائی (آیت ۱۰) - یہ بھی فرمایا کہ " وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا" (آیت ۱۱) -" اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے لیے باغ (بھی) بنا دے گا اور تمہارے لیے نہریں (بھی) بہا دے گا" (آیت ۱۲) - غرض کہ مختلف طریقوں سے اللہ پاک کی طرف رجوع کرانے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ نہ مانے اور غرق ہوئے -" اور نوح (علیہ السلام) نے دعا کی (کہ) اے میرے پروردگار (اب) روئے زمین پر کسی کافر کو بستا ہوا نہ چھوڑ - اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بہکاتے رہیں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار اور کافر ہی ہوگی " (آیت ۲۶ - ۲۷) - طوفان کے بعد دنیا ایک بار کفار سے پاک ہوگئی اور صرف ایک مختصر جماعت مومنین کی باقی رہ گئی - جب ایک نبی کی بددعا سے دنیا ہلاک ہو سکتی ہے تو دنیا کو عبرت حاصل کرنی چاہیے - اور سب نبیوں کے سردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے فلاح دارین حاصل کرنا چاہیے۔

سورۃ الجنّ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے دل شکستہ ہو کر واپس ہو رہے تھے تو مقام نخلہ میں نمازِ فجر جہر سے پڑھی۔ وہاں سے جنّات کا ایک گروہ گزرا تو قرآن سُن کر حیرت میں رہ گیا اور ایمان لے آیا۔ پھر اپنے لوگوں میں جا کر اس واقعے کا ذکر کیا کہ " وہ بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ پس ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہم (اب) اپنے رب کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔" (آیت ۲) ۔ اور " یہ لوگ بھی تمہاری طرح غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔" (آیت ۷)۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ " اور اگر یہ لوگ سیدھی راہ پر رہتے تو ہم ان کو بافراط پانی سے سیراب کریں گے تاکہ اس (فراخی) سے ہم ان کی آزمائش کریں اور جو کوئی اپنے رب کی یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کو وہ سخت عذاب میں داخل کرے گا۔" (آیت ۱۶-۱۷) ۔" اور جب اللہ کے پیارے رسول اور بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں (اور قرآن کی تلاوت کرتے ہیں) تو لوگ جوق در جوق ان پر ہجوم کرنے لگتے ہیں۔" (آیت ۱۹) ۔ تو " آپ فرما دیجیے کہ میں تو اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔ آپ فرما دیجیے کہ میرے اختیار میں نہ تم کو نقصان پہنچانا ہے نہ ہدایت دینا ہے (بس اللہ کے اختیار میں ہے) اور آپ (یہ بھی) فرما دیجیے کہ مجھ کو (بھی) کوئی اللہ کے ہاتھ سے نہیں بچا سکتا (اگر وہ خفا ہو جائے) اور نہ میں اُس کے سوا کہیں پناہ پا سکتا ہوں ۔ البتہ میرا کام اللہ کی طرف سے (اُس کے احکام) اور اس کے پیغام کا پہنچا دینا ہے اور جس نے اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی تو اُس کے لیے جہنّم کی آگ ہے جس میں یہ ہمیشہ رہا کریں گے۔ (آیت ۲۰-۲۳)

سورۃ المزّمّل

" اے میرے (کملی والے) کپڑوں میں لپٹنے والے (حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ رات کے تھوڑے سے حصے میں (نماز کے لیے) قیام فرمایا کیجیے (نہ کہ رات رات بھر)۔ آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم۔ یا اس سے زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر (تجوید، معرفت و توقف، فکر و ذکر کے ساتھ جیسا کہ آپ کا معمول ہے) پڑھتے رہیے ۔ بے شک ہم آپ پر عنقریب ایک بھاری کلام (پورا قرآن) نازل کریں گے ۔ بے شک رات کا اٹھنا (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور سیدھی بات نکلتی ہے (ہر بات اس وقت سیدھی اور ٹھیک ہوتی ہے) ۔ بے شک آپ کو دن میں بہت سی مشغولیت ہے (عبادت، ریاضت، تبلیغ و تسبیح) اور آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیے اور سب کو چھوڑ کر (سب سے الگ ہو کر) اُسی کے ہو جائیے۔" (آیت ۱-۸) ۔ راتوں کو جاگنے کا جو یہ حکم ہُوا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام بھی رات رات بھر جاگتے کہ کہیں ایک تہائی رات جاگنے کا جو حکم ہے اُس کی تعمیل سے محروم نہ رہیں۔ یہ معمول قریب ایک سال تک رہا ۔ پھر اللہ پاک نے آسانی پیدا فرما دی کہ "بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ قریب دو تہائی رات اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) ایک تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور اللہ ہی کو رات اور دن کا صحیح اندازہ ہے ۔ (اے لوگو) وہ جانتا ہے کہ (مختلف اسباب کی بنا پر) تم لوگ اس کو نباہ نہ سکو گے ۔ اس لیے تم پر مہربانی فرمائی (اور اس حکم میں تخفیف فرما دی) پس تم جتنا

آسانی سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو۔ اُس کو علم ہے کہ تم میں بعض بیمار ہوں گے اور بعض لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں ملک میں سفر بھی کریں گے اور بعض خدا کی راہ میں لڑیں گے۔ پس جتنا آسانی سے ہو سکے (قرآن) پڑھ لیا کرو اور (پنجگانہ) نماز (بہرحال) قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اخلاص کے ساتھ قرض دیا کرو (اس کی راہ میں خرچ کرو) اور تم جو بھی نیک عمل اپنے لیے پہلے بھیجو گے اُسے تم اللہ کے یہاں بہتر اور اجر کے لحاظ سے بڑھا ہوا پاؤ گے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہو۔ بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"۔ اس آخری آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اوصاف کے ساتھ اُن کے رفقاء کے اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔

سورۃ المدّثّر

مکی والی محبوب (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اب لحاف اوڑھنے والے (یا عالم کو درست کرنے والے) پیارے نام سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ اور امت کو آداب تبلیغ سکھائے جا رہے ہیں اور یہ کہ جو لوگ ضدی منکر ہیں ان کے متعلق تردد نہ کیا جائے۔ اُن کو دوزخ کی آگ ہی ٹھیک کرے گی۔ (اس سورۃ کی ابتدائی سات آیتیں دوسری وحی کی یادگار ہیں) "اے درست کرنے والے (عالم کے) اُٹھو۔ (گندے اعمال والوں کو) ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بزرگی کو پھیلاؤ اور پاک دامنی اختیار کرو (مخلوق پرستی کی) نجاست سے علیحدگی اختیار کرو۔ احسان اِس نیت سے نہ کرو کہ لوگوں سے اس کا فائدہ حاصل کیا جائے۔ اپنے پروردگار کے لیے رسالت کرتے ہوئے ہر ایک امتحان اور تکلیف میں استقلال رکھو"[1] حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع ہی میں عالم کے درست کرنے والے کی حیثیت سے یاد کیا جا رہا ہے اور آن کے ذریعے مخلوق پرستی کی نجاست سے اہلِ عالم کو پرہیز کرایا جا رہا ہے۔ ان آیات میں لطیف اشارہ قرآن پاک کی بے مثل فصاحت و بلاغت سے متعلق ہے یعنی ان آیات میں سے فکبر ربک بھی ہے جس میں مقلوب مستوی ہے یعنی حروف کا سلسلہ شروع سے وہی ہے جو آخر سے بھی ہے۔ جس طرح کل فی فلک وغیرہ آیتوں میں بھی آتا ہے۔

آیت ۱۱، ولید بن مغیرہ کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی جو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور دنیوی جاہ و ثروت میں "وحید" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اُس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اور آن کے قرآن کی مخالفت کی تو دنیا کی بھی ہر چیز کھو دی اور آخرت اس سے بھی زیادہ خراب کرلی۔ دوزخ کی کیفیات بھی بتائی گئی ہیں جن سے ان سب منکرین کو گزرنا ہوگا۔ آخر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر تسلی دی گئی ہے کہ "اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) وہ لوگ نصیحت تو اُسی وقت قبول کریں گے جب خدا چاہے گا (اور جب تک کوئی ہدایت نہیں چاہتا اللہ بھی اسے ہدایت کی توفیق نہیں دیتا) اُسی سے ڈرنا چاہیے اور وہی بخشنے والا ہے"۔ (آیت ۵۵ - ۵۶)

سورۃ القیٰمہ

اس سورۃ میں قیامت کا ذکر ہے جب کہ موجودہ نظام درہم برہم ہو کر ایک نیا نظام قائم ہوگا۔ شروع کی پندرہ آیتیں اسی سلسلے کی ہیں۔

---

[1] یہ ترجمہ مولانا محمد سلیمان منصور پوری نے کیا ہے۔ رحمۃ للعالمین۔ جلد اوّل "بعثت و نبوت"۔

پھر یہ ذکر ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ اُسے جلدی جلدی یاد کرنے لگتے ۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اسے جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے (نزولِ وحی کے ساتھ) اپنی زبان کو حرکت نہ دیں ۔ اس کو (آپ کے سینۂ مبارک میں) جمع کر دینا اور اس کو (اسی طرح آپ کی زبان سے) پڑھوانا (جیسا کہ لوحِ محفوظ میں ہے) ہمارا ذمہ ہے[1] پس جب ہم پڑھا کریں (یعنی جب وحی نازل ہو) تو آپ (اس کو سنا کریں اور) اس کو اسی طرح پڑھا کریں (یہاں اللہ پاک نے جبرئیل علیہ السلام کی وحی سُنانے کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے) پھر بلاشُبہ اُس کو کھول کر بیان کر دینا (یعنی آپ کے ذریعے بیان کرنا) ہمارے ہی ذمے ہے۔" (آیت ۱۶-۱۹) پھر انسان کی تخلیق، اس کی حقیقت اور اللہ پاک کی قدرت کا ذکر ہے۔

سورۃ الدھر

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا" (اُس کا نام و نشان بھی نہ تھا)۔ پانچویں آیت میں نیکو کاروں کا ذکر ہے کہ" البتہ نیکو کار ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (خاص) بندے پئیں گے (اور دوسروں کو بھی پلائیں گے اور اپنی نظرِ التفات سے) جہاں چاہیں گے اُسے بہا کر لے جائیں گے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ذکر ہے کہ اُن کے درجات کس طرح بلند ہوں گے)" (آیت ۵، ۶) - یہ ابرار کون لوگ ہیں ؟ - جو" اپنی منتوں کو پورا کرتے ہیں (یعنی عبادات کے علاوہ جو چیز اللہ کے لیے اپنے اوپر واجب کر لی ہے وہ بھی پورا کرتے ہیں) اور اس (قیامت کے) دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت پھیل پڑے گی۔ اور جو مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تین روٹیاں پکائیں اور ایک ایک روٹی ایک مسکین، یتیم اور قیدی کو دے دی اور پورا خاندان بھوکا رہا[2]) - (ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ) ہم تم کو محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ۔ ہم تو اپنے پروردگار سے اُس دن سے ڈرتے ہیں جو نہایت اداس کرنے والا اور سخت ہوگا۔ پھر اللہ ان کو اس دن کے شر سے بچا لے گا اور اُن کو شگفتگی اور سرور عطا فرمائے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا ہوگا ....." (آیت ۷-۱۲) - پھر جنت کی مزید راحتوں کا ذکر ہے ۔ ان راحتوں کے ذکر کے بعد پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور کفارِ مکہ سے اعراض کا حکم ہے (آیت ۲۴) جن کے لئے عذابِ الیم کی وعید ہے ۔

سورۃ المرسلٰت

اس سورۃ میں زیادہ تر مکذبین اور منکرین سے خطاب ہے جن کیلئے سخت عذاب ہے ۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لیے

---

[1] پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے بڑی بڑی آئتیں بلکہ سورتیں سن لیتے تھے اور جبرئیل علیہ السلام کے سامنے دُہرا دیتے تھے۔ لا یمسّہٗ الا المطہرون سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں کو اللہ پاک نے پاک کیا ہے وہی قرآن کو حفظ کر لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ حفظ نہیں کر سکتے۔

[2] یوں بھی مروی ہے کہ یہ واقعہ تین دن مسلسل ہوتا رہا۔ (ادارہ)

راحت ہی راحت ہے " بے شک متقین (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین) اُس (کی رحمت) کے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے اور (وہ) اُن میووں میں ہوں گے جو وہ پسند کریں (اُن سے کہا جائے گا کہ) اب مزے سے کھاؤ پیو اُن اعمال کے صلے میں جو تم کیا کرتے تھے (اور) ہم نیکوکاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں " (آیت ۴۱ - ۴۴) آخر میں کافروں سے کہا گیا ہے کہ اس قرآن (اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟ قرآن اور عملی قرآن (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) سے اگر کسی کو ہدایت نہ ملی تو پھر کس سے مل سکے گی؟

اب تیسواں پارہ شروع ہوتا ہے

سورۃ النبأ

جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ شروع کی تو کفار مکہ نے توحید، رسالت، نزول وحی وغیرہ سب پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اس سورۃ میں ان موضوعات اور خصوصیت کے ساتھ قیامت کا ذکر ہے جب کہ اعمال کا محاسبہ اور جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا ـــــ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے تبلیغ ہے کہ زمین کو فرش، پہاڑوں کو اوتاد، انسان کو جوڑے، نیند کو راحت، دن کو معاش کا ذریعہ سات آسمان، سورج، موسلا دھار بارش، اناج، میوہ، گھنے باغ وغیرہ سب کو بنایا تاکہ انسان ان کے ذریعے اللہ پاک کو پہچانے دوزخ سے ڈرے اور جنت کا امیدوار بنے۔ قیامت کے دن سب لوگ اور فرشتے صف بستہ اور نفس گم کردہ کھڑے ہوں گے " یہ دن حق ہے۔ پس جو چاہے اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنا لے (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے یہ قرب حاصل کرلے)" (آیت ۳۹) " بلاشبہ ہم نے تم کو عنقریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا۔ اس دن ہر شخص ان (اعمال) کو جو اس نے آگے بھیجے ہیں دیکھ لے گا اور کافر کہے گا اے کاش میں مٹی ہو جاتا (کہ اس عذاب سے بچ جاتا)۔

سورۃ النّٰزعٰت

اس سورۃ میں بھی قیامت کے آنے کا ذکر ہے اور سب روحیں اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں گی اور پھر وہ فوراً میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے ـــ پھر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ یاد دلا کر انسان کو عبرت کا سبق سمجھایا گیا ہے ـــ پھر تخلیق کائنات کی طرف متوجہ کر کے رجوع الی اللہ کا سبق بھی دیا ہے ـــ (اور جن لوگوں کو اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے فرانے پر یقین نہیں وہ کیا نصیحت حاصل کریں گے۔ البتہ) " جس دن اس (قیامت) کو دیکھ لیں گے (اُن کو) ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دنیا میں) صرف ایک شام یا صبح ہی رہے تھے "۔ (آیت ۴۶)

سورۃ عَبَس

مکہ معظمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کے چند قریش سرداروں کو جن میں ابو جہل بھی شامل تھا، دعوت اسلام دے رہے تھے

کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم جو نابینا تھے تشریف لائے اور قطع کلام کر کے خود بھی آپ کی تعلیم معلوم کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ناگوار ہوا تو اللہ پاک نے محبّت آمیز خفگی سے جس پر ہزاروں پیار نثار ہوتے ہیں اس واقعے کو اس سورۃ میں بیان فرمایا کہ "(میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بچیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (جب) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ کو کیا معلوم، شاید وہ سنور ہی جاتا۔ یا وہ غور کرتا تو (آپ کا) سمجھانا اس کے کام آتا۔ لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا تو آپ اس کی فکر میں ہیں (آپ چاہتے ہیں کہ وہ بھی ایمان لے آئے اور سب لوگ مسلمان ہو جائیں)، حالانکہ اگر وہ درست نہیں ہوتا تو آپ پر اس کا کچھ الزام نہیں" (آیت ۱-۷)

پھر قرآن کی شان بیان ہوتی ہے، انسان کی پیدائش اور موت کا ذکر ہے، اور سامان بقا بھی مذکور ہیں۔ اور آخر میں پھر قیامت کا منظر سمجھایا گیا ہے۔

سورۃ التکویر

اس سورۃ میں بتایا جا رہا ہے کہ مرنے کے بعد یہ دنیا چھوٹ جاتی ہے اور آخرت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب کہ نتائج عمل کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ تو "ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے" (آیت ۱۴) اور "بے شک یہ (قرآن یا عزّت فرشتہ کی زبانی پیغام) ہے جو بڑی قوت والا، صاحب عرش کے پاس بڑے مرتبہ والا ہے۔ سردار پھر امین بھی" (آیت ۱۹-۲۱)۔ "اور تمھارے صاحب کوئی مجنون نہیں اور بے شک انھوں نے اس کو افق منوّر پہ دیکھا ہے اور وہ غیب کی بات بتانے میں ذرا بخل نہیں کرتے"۔ (آیت ۲۲-۲۴)۔

سورۃ الانفطار

اس سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے اور ڈرایا جا رہا ہے کہ کراماً کاتبین (آیت ۱۱) بھی تمہارے اعمال لکھنے میں مصروف ہیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے جو غلام ہیں "بلاشبہ وہ نیک لوگ بہشت میں ہوں گے"۔ (آیت ۱۳) اس سورۃ میں عقائد کی بنا پر سزا و جزا کا ذکر ہے اور آئندہ سورۃ میں معاشرتی زندگی کی اہمیت اور اس سے پیدا شدہ نتائج اور انجام کا ذکر ہے۔

سورۃ المطفّفین

"خرابی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لیے۔ جب لوگوں سے وہ ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیا کرتے ہیں تو ان کو نقصان میں ڈال دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ ان کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے"۔ (آیت ۱-۴)۔ پھر سزا اور جزا والوں کا ذکر آتا ہے۔

سورۃ الانشقاق

اس سورۃ میں بھی آخرت کا مضمون جاری ہے "پس جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس سے حساب

آسانی سے لیا جائے گا اور یہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش واپس آئے گا (خود بھی خوش ہوگا اور اس کے گھر والے بھی خوش ہوں گے) اور جس کو اس کا نامۂ اعمال، پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا (لیکن وہ نہ آئے گی) اور وہ دوزخ میں پڑے گا" (آیت ۷-۱۲)۔ آخر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں اور حضورؐ کی پیروی میں عمل کرنے والوں کے لیے اجرِ لا متناہی کا ذکر ہے۔

سورۃ البروج

عیسیٰ علیہ السلام کے سچے اُمتیوں کو جلا دینے کے لیے ایک یہودی بادشاہ نے آگ کی خندق کھودی تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں کو بھی آگ پر لوٹنا پڑا لیکن اَحَد اَحَد کی آواز آخر دم تک ان کے لبوں پر رہی۔ "بلاشبہ جن لوگوں نے مسلمان مرد اور عورتوں کو اذیت پہنچائی، پھر توبہ نہ کی تو اُن کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور اُن کے لیے جلنے کا عذاب (بھی)" (آیت ۱۰)۔ اذیت پہنچانے والوں کے لیے پھر بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ نافرمانوں (فرعون اور ثمود وغیرہ) کے لیے بھاگنے کی جگہ نہیں ہے" اور اللہ اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے" (آیت ۲۰) "دراصل یہ قرآن (جو آپ پر نازل ہوا ہے) بڑی عظمت والا ہے اور لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے" (آیت ۲۱-۲۲)۔

سورۃ الطّارق

طارق کا مطلب ستارہ بھی ہے اور آسمان پر پہنچنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ انسان کو اس کی بے مایہ حقیقت سے پھر خبردار کیا گیا ہے اور "بے شک یہ (قرآن) ایک فیصلہ کُن کلام ہے اور یہ کوئی مذاق کی چیز نہیں (جو اسے چھپانا چاہتے ہیں) وہ لوگ اپنی اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں۔ اب (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کافروں کو آپ (تھوڑی اور) مہلت دیجیے بس کچھ دنوں اور چھوڑ دیجیے"۔ (پھر اللہ خود ہی اُن کو دیکھ لے گا)۔ (آیت ۱۳-۱۷)

سورۃ الاعلیٰ

گزشتہ سورۃ میں قرآن کے قولِ فیصل ہونے کا ذکر تھا۔ اب اللہ پاک اپنی شانِ کبریائی بیان کرتا ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے پروردگار کے نام کی پاکیزگی بیان کیجیے جو بہت اعلیٰ ہے۔ جس نے (ہر شے کو عین حکمت کے مطابق) پیدا کیا پھر (اس کو موزونیت اور تناسب کے ساتھ) درست کیا......" (آیت ۱-۲)۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب ہے کہ "عنقریب ہم آپ کو پڑھا دیں گے۔ پھر آپ (اسے) نہ بھولیں گے" (آیت ۶)۔ "پس آپ نصیحت کرتے رہیے جہاں تک نصیحت کارگر ہو۔ (البتہ) جس کو خوفِ خدا ہوگا وہی نصیحت کو قبول کرے گا اور اس سے وہی بدنصیب دور رہے گا جو (بالآخر دوزخ کی) بڑی آگ میں پڑے گا، پھر وہاں نہ وہ مرے گا، نہ جیے گا" (آیت ۹-۱۳)۔ پھر قلب کو پاک کرنا، اس کو اللہ کی یاد سے معمور کرنا، اللہ کے آگے جھکنا، اور اس کی کبریائی

کو بیان کرنا وغیرہ احکام ہیں جو صحفِ سابقین میں بھی مذکور تھے۔ (آیت ۱۴ - ۱۹)۔

سورۃ الغاشیہ

گذشتہ سورۃ میں اللہ کی حمد و ثنا اور شریعتِ محمدیؐ کی پیروی کا ذکر تھا جس کی بنیاد وہی ہے جو صحفِ سابقین کی تعلیمات کی بنیاد رہی ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ خود انسانی زندگی کے لیے شریعت ہر طرح مفید ہے۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ اُس کو کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور وہ کیسی گھڑی ہوگی۔ دوزخیوں اور جنتیوں کے انجام کا ذکر ہے۔ پھر اونٹ جیسے جانور کو دیکھو کہ ایک بچہ نکیل پکڑ لیتا ہے تو وہ اسی کی اتباع کرنے لگتا ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ وغیرہ سب کے سب اللہ پاک کی قدرت کا سبق دیتے ہیں ۔" پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو ان کو سمجھاتے ہی رہیے۔ آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو زبردستی منوانے والے تو نہیں ہیں (آپ مختار نہیں ہیں)۔ مگر جس نے (آپ کی اطاعت سے) روگردانی کی اور انکار کیا تو اللہ اُس کو سخت عذاب دے گا۔ بلاشبہ ان (کافروں) کو ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہوگا۔ پھر یقیناً ہمارے ہی ذمے اُن کا حساب لینا ہوگا۔" (آیت ۲۱-۲۶)

سورۃ الفجر

اس سورۃ میں مختلف فطرتوں کی قسم کھائی گئی ہے اُن حقائق کو واضح کرنے کے لیے جو مختلف لوگوں کے لیے مقدر ہیں۔ پہلے منکروں کا بیان ہے جن کو اللہ سے دوری ہے، پھر وہ لوگ جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہو گیا ہے اُن کی جزا کا ذکر ہے۔ اُن کو حکم ہوگا کہ "اے وہ نفس جس نے اطمینان حاصل کر لیا، تو اپنے رب کی طرف رجوع کر اس طرح کہ تو اُس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، پھر تو ہمارے (برگزیدہ) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشتِ نعیم میں داخل ہو جا۔" (آیت ۲۷ - ۳۰)

سورۃ البلد

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مکہ اور آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کی شہادت دے کر بتایا گیا ہے کہ "بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں (زندگی بسر کرنے کے لیے) پیدا کیا ہے۔ ہر عمل کا دیکھنے والا اللہ پاک ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کی دشمنی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت پر اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے تو اُسے اُس کا انجام دیکھنا ہوگا۔" پھر وہ (خیر کی) گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا اور آپ سمجھے کہ (یہ) گھاٹی کیا ہے (یعنی) کسی گردن کا چھڑانا، یا بھوک (قحط) کے دن کھانا کھلانا، یتیم کو جو قرابت دار ہے یا مسکین کو جو خاک نشین ہے۔ (لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نیکی کرنے والا صاحبِ ایمان ہو یعنی)۔ پھر وہ ایمان والوں میں سے ہو اور (ایسے لوگوں کی خوبی یہ ہے کہ) وہ ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ اصحاب یمین ہیں اور جو ہماری آیتوں سے منکر ہوئے وہی بائیں ہاتھ والے ہیں (بدنصیب ہیں) یہ لوگ آگ میں بند کر دیے جائیں گے۔" (آیت ۱۱ - ۲۰)۔

سورۃ الشمس

اس سورۃ میں اللہ پاک نے سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین اور خود انسان کی شہادت سے متوجہ فرمایا ہے کہ یہ ادرکائنات کی تمام چیزیں جو اللہ پاک کے انعامات ہیں انسان کی فلاح کے لیے ہیں۔ اور انسان کے اندر فسق و فجور اور تقویٰ کی بھی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اب اُسے سمجھنا ہے کہ اپنی زندگی کو کس رُخ پر لے جائے۔ قوم ثمود اور صالح علیہ السلام کا واقعہ بھی بتایا ہے کہ اس قوم نے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا تو وہ تباہ ہوئی۔ اب بھی اگر اپنی زندگی کو تقویٰ (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی) پر چلایا جائے گا تو فلاح حاصل ہوگی ورنہ تباہی ہوگی۔

سورۃ الّیل

اس سورۃ میں بھی اللہ پاک نے رات، دن اور نسلوں کو گواہ کر کے فرمایا ہے کہ انسان خوب سمجھ لے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ اشقیٰ یعنی اُمیّہ بن خلف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر اُن کو گرم زمین پر ڈال کر اُن کے سینے پر تپتے ہوئے پتھر رکھے اور اتقیٰ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سختیوں کو دیکھ کر حضرت بلالؓ کو بہت گراں قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ اشقیٰ کا انجام جہنّم ہے اور اتقیٰ کی جزا جنّت الفردوس ہے جو صرف اللہ کی رضا چاہتے تھے۔ اور یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیارے تھے۔

سورۃ الضحیٰ

چند روز وحی نازل نہ ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم بے قرار ہوئے اور کفّار کو طعن کا موقع ملا کہ گویا اب وحی منقطع ہو گئی ہے۔ اللہ پاک کی رحمت کو جوش آیا اور فرمایا کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) قسم ہے دن چڑھے کی (یعنی حضورؐ کے عروج کی) اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے (یعنی اُس حجابِ ذات کی جو نورِ ظہور پر چھایا ہوا تھا) نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے ناراض ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی آخرت اس پہلی سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کو آپ کا رب وہ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے (آپ کی رضا اللہ کو منظور ہے)" (آیت ۱-۵)۔ پھر اللہ پاک طرح طرح سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی دلجوئی کرتا ہے اور بڑی پیاری پیاری باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہ پایا۔ پھر جگہ دی اور آپ کو اپنی محبّت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی (سُکر سے صحو کی طرف لایا) اور آپ کو حاجتمند پایا (طلبِ صادق آپ ہی میں پائی تو عطائے خاص سے نوازا) پھر سب سے بے پروا کر دیا۔ (پس آپ کا سہارا آپ کا رب ہے اور سارے جہان کا سہارا آپ ہیں۔ اس لیے ہر یتیم اور ہر سائل کو آپ کی ضرورت ہے)۔ پس جو یتیم ہو اُس پر دباؤ نہ ڈالو (اہلِ جاہلیت کا شیوہ تھا کہ یتیموں پر بہت دباؤ ڈالتے تھے) اور جو مانگنے آئے (اگر نہ دے سکو) تو اس کو مت جھڑکو۔ اور آپ کے پروردگار نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اُس کا بیان کرتے رہیے۔" (آیت ۶-۱۱)۔

سورۃ الانشراح

یہ سورۃ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔

"کیا ہم نے آپ کا سینہ کشادہ نہ کیا (ہدایت و معرفت اور ہر عظمت و نبوت کے لیے کہ عالمِ غیب و شہادت اس کی وسعت میں سما گئے۔ ظاہری شرحِ صدر بھی بار بار ہوا۔ ابتدائی عمر میں، نزولِ وحی کے پہلے موقع پر اور شبِ معراج میں) اور (ہر وہ چیز جو آپ کے قلبِ مبارک پر احساسِ ذمہ داری کے باعث بوجھ بنی ہوئی تھی، انشراحِ صدر سے) ہم نے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جو آپ کی پیٹھ کو توڑے ڈالتا تھا اور (اسی لیے) ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا (کلمہ، اذان، خطبہ، نماز، دعا، درود و سلام وغیرہ ہر جگہ اللہ کے ساتھ رسول کا نام بھی ہے) پس بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ مکی زندگی میں بھی اور مدنی زندگی میں بھی بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے پس (آپ اپنا معمول جاری رکھیں) جب آپ کو (فرائضِ نبوت سے ذرا) فراغت ملے تو آپ ریاضت میں لگ جایئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جایئے۔" (آیت ۱ - ۸)

سورۃ التّین

"تین (انجیر) کی قسم اور زیتون (کی قسم) اور طورِ سینا (کی قسم) اور (میرے پیارے امین صلی اللہ علیہ وسلم کے) امن والے شہر کی قسم، بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین تناسب پر بنایا ہے پھر ہم نے اُسے پست ترین حالت میں ڈال دیا۔" (آیت ۱ - ۵) تین (انجیر) اور زیتون کے ساتھ طورِ سینا اور شہرِ امین کا ذکر غالباً اس لیے ہے کہ تین (انجیر) اور زیتون کے استعمال سے جسمانی صحت لیکن مقامِ موسویؑ اور مقامِ محمدیؐ سے روحانی صحت ایک انسان کو حاصل ہو جائے تو وہ صحیح معنی میں احسن التقویم پہ پہنچ سکتا ہے۔ ورنہ اسفل سافلین میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس اسفل سافلین والے زوال سے پھر بھی وہ بچ سکتا ہے اگر ایمان اور عملِ صالح (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی) کرے جس کا اجر کبھی کم نہ ہوگا۔ پھر بھی کوئی دین (یا آخرت) کی عظمت کو نہ سمجھے تو افسوس ہے۔ کیا اللہ احکم الحاکمین نہیں ؟ — یعنی اُس کے حکم سے کیا نہیں ہو سکتا!

سورۃ العلق

شروع کی پانچ آیتیں (مالم یعلم تک) سب سے پہلی وحی ہے جو غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ (اسی لیے قراءت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے) جس نے (سب کو) پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے اور آپ کا رب بڑی عظمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے (عام لوگوں کو) قلم سے علم سکھایا — اُسی نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔" (آیت ۱ - ۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست اللہ پاک کی طرف سے پڑھایا جا رہا ہے اور اُن کے ذریعے انسان کو وہ سب کچھ دیا جا رہا ہے جو وہ نہ جانتا تھا۔ آیت ۹ (اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی) ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی تھی کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکتا تھا۔ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ارادہ فاسدہ سے

آیا تو اُلٹے پانوٗ بھاگا۔ کہنے لگا کہ میرے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے درمیان ایک خندق ہے جس میں آگ بھری ہوئی ہے اور دہشت ناک پرندے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک نے ابوجہل کو پھر ذلیل کر دیا۔

سورۃ القدر

لوحِ محفوظ سے پورا قرآن، شبِ قدر میں آسمانِ دنیا پر نازل ہوا اور پھر ۲۳ سال میں حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ شبِ قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے (یہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک آسانی پیدا فرمادی ہے تاکہ وہ ان طاق راتوں میں سے کسی بھی رات میں شب بیداری کر کے مستفیض ہو سکیں عموماً ۲۶ ؍ رمضان کی شب کو شبِ قدر کہا گیا ہے۔ اسی لیے سورۃ القدر سے پہلے پورا قرآن بیس بیس رکعاتِ تراویح کے ساتھ ستائیسویں شب میں ۲۰ × ۲۷ یعنی ۵۴۰ رکوعات میں پورا ہوتا ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر میں ۹ حروف ہیں اور یہ لفظ اس سورۃ میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے اس لیے ۹ × ۳ ۔ سے ستائیسویں شب کا اشارہ ملتا ہے) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُممِ سابقہ کے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو تمام رات عبادت کرتا تھا اور تمام دن جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اُس نے ہزار مہینے گزارے تھے۔ مسلمانوں کو اس سے تعجب اور رشک ہوا تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے صدقے میں یہ شبِ قدر ہزار مہینوں کی متواتر عبادت اور نیکی سے بھی زیادہ بہتر قرار دی گئی (آیت ۳)۔ پھر یہ بھی فضیلت دی کہ اس رات جو طلوعِ فجر تک ہے، جبرئیل علیہ السلام اور فرشتے امرِ خیر کے لیے آتے رہتے ہیں۔

سورۃ البیّنۃ

"اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اور مشرکین (کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس ایک روشن دلیل نہ آتی (یعنی) اللہ کا ایک رسولؐ جو انھیں (قرآن کے) پاک اوراق پڑھ کر سنائے جس میں وہ احکام درج ہیں جو دین کو قائم رکھنے والے ہیں۔" (آیت ۱-۳) لیکن ان اہلِ کتاب نے پھر بھی اختلاف کیا حالانکہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دلیلِ حق لا چکے ہیں۔ یعنی قرآن پاک میں بھی (کتبِ سابقہ کی طرح) اللہ کی بندگی، نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم ہے۔ بہرحال ان منکرین کے لیے ابدی جہنم اور ایمان عملِ صالح والوں کے لیے ابدی جنّت ہے۔ (قرآن ایمان سکھاتا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم عملِ صالح سکھاتے ہیں)

سورۃ الزّلزال

اس سورۃ میں قیامت کے ہولناک زلزلہ کا ذکر ہے جبکہ زمین کی دبی ہوئی چیزیں (آیت ۲) باہر آجائیں گی اور انسان اپنے چھوٹے بڑے اعمال کے نتائج دیکھ لے گا۔ ("عملِ خیر"، عاملِ خیر سے سیکھا ہوا ہی کام آئے گا)

سورۃ العٰدیٰت

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کا مضمون ایک نرالے انداز میں پیش کیا ہے اور سرفروشانِ راہِ حق کی قسم کھائی ہے کہ

انھوں نے اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے فتح و نصرت حاصل کی۔ ایک گھوڑا اپنے آقا کا اس قدر وفادار لیکن ایک انسان اپنے خالق اور اپنے آقا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کا بالکل نافرمان ہے "کیا وہ نہیں جانتا اُس وقت کو جب قبروں سے مُردے اٹھائے جائیں گے اور سینوں کے سب راز ظاہر کر دیے جائیں گے بے شک اُس دن اُن کا رب اُن کی حالت سے خوب خبردار ہو گا۔" (آیت ۹-۱۱)

سورۃ القارعہ

اس سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے جبکہ دلوں کو ہلا دینے والی آواز سنائی دے گی "جس دن لوگ پریشان پروانوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگ برنگی اون کی طرح ہو جائیں گے" (آیت ۴-۵) جن لوگوں کے عمل کا پلّہ بھاری ہوگا وہی فلاح پائیں گے۔ ورنہ سخت عذاب ہے ——

سورۃ التکاثر

"اے لوگو تم کو کثرتِ مال کی طلب نے غفلت میں ڈال دیا یہاں تک کہ تم (اپنی) قبروں میں جا پہنچے۔ (تم سمجھتے ہو کہ مال و دولت کی فراوانی کام آتی ہے) ہرگز نہیں۔ تم عنقریب جان لو گے۔" (آیت ۱-۳)

"کاش تم (اس حقیقت کا) یقینی علم رکھتے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو صحیح سمجھتے اور دنیا کے کُتّے نہ بنتے)۔ تم (اس حرصِ دنیا کو) دوزخ (کی صورت میں) دیکھ کر رہو گے . . . .

سورۃ العصر

قسم ہے زمانے کی (زمانے کی تاریخ یعنی مختلف اقوام کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ) بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن کے جو (اللہ پر) ایمان لائے اور عملِ صالح کیے (پیغمبرِ وقت کے عمل کو اپنایا) اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کی (اجتماعی زندگی بھی درست کی)۔ اس سورۃ میں انفرادی زندگی کے لیے (۱) ایمان اور (۲) عملِ صالح (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی) دو چیزیں فلاح کی بتائی گئی ہیں اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی دو چیزیں (حق اور صبر) بتائی ہیں۔ جو انسان اور انسانوں کی فلاح کے لیے بالکل کافی ہیں۔

سورۃ الھُمَزَہ

اہلِ ایمان پر طعن و تشنیع کرنا ہر زمانے کے منکرین کا شیوہ رہا ہے۔ یہ وہ حریص اور خسیس و مُتکبر ہے "جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے (اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا) وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ یقیناً حطمہ (آگ) میں ڈال دیا جائے گا۔" (آیت ۲-۴) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے اُن کا مذاق اُڑانے

والے کے لیے یہ وعید ہے ۔

سورۃ الفیل

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند روز قبل کا واقعہ ہے کہ یمن کے حاکم ابرہہ نے ایک کلیسا بنایا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ لوگ وہاں جمع ہوں لیکن عربوں نے پسند نہیں کیا تو اس نے ہاتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کر دیا ۔ عبدالمطلب اس وقت کعبہ کے متولی تھے ۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اپنا بچاؤ کر لو ۔ کعبہ جس کا ہے وہ خود اسے بچائے گا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اور اللہ پاک نے حملہ آور کی تمام تدابیر کو ناکام بنا دیا ۔" اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان پر سنگ گل (بجری ، کنکر کی پتھریاں) پھینکتے تھے ۔" (آیت ۳ - ۴) ۔

سورۃ قریش

اللہ پاک نے قریش کو خطاب کر کے اہل مکہ کو خطاب کیا ہے کہ " چونکہ قریش میں ایک میلان پیدا کر دیا ۔ ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر کا میلان دیا (جاڑے میں یمن اور گرمی میں شام کو جانے ۔ روزی اور فراغت حاصل ہوتی) پس ان کو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک (جس نے وہ روزی اور فراغت دی اس) کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے امن عطا فرمایا ۔" (آیت ۱ - ۴)

سورۃ الماعون

یتیم کو دھکے دینا ، محتاج کو اللہ کی راہ میں نہ کھلانا ، محض دکھاوے کے لیے نماز پڑھنا ، معمولی برتنے کی چیز بھی مانگنے پر نہ دینا صحیح ایمان والوں کی نشانی نہیں ہے ۔ سراپا اخلاق ، معلم آفاق صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا یہ شیوہ نہیں ۔

سورۃ الکوثر

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کا انتقال ہوا تو کفار بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب وہ منقطع النسل ہیں ۔ اللہ پاک نے اس سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا تو کیا آخرت میں کوثر (خیر کثیر اور حوض کوثر) بھی عطا کر دیا ۔ اسلام میں عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی ۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کسی صحابی کو عطا کر دی ۔ بعد میں خیال آیا کہ وہ میرے ہاتھ میں رواں تھی ۔ اگر اس کو واپس لے لوں اور اس کے بدلے میں اس سے زیادہ قیمتی تلوار ان صحابی کو دے دوں تو کیا مناسب ہوگا ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی ۔ چنانچہ حوض کوثر ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا گیا ۔ اب وہ واپس نہیں لیا جائے گا اور وہ جس کو چاہیں پلائیں گے ۔ انھیں پورا اختیار ہے ۔" یقیناً ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دیا ہے ۔ پس آپ اپنے رب کے لیے نماز (شکرانہ) پڑھیے اور قربانی دیجئے ۔ بیشک جو آپ کو کوثر عطا کر دیا ہے پس آپ اپنے رب کے لیے نماز (شکرانہ)

پڑھیے اور قربانی دیجئے ۔ بے شک جو آپ کا دشمن ہُوا وہی لاولد ہو کر رہا۔" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ معنوی سب سے زیادہ ہوئی اور ہوتی رہے گی۔

سورۃ الکٰفرون

اس سورۃ میں کفار سے دو ٹوک بات ہے کہ تمھارا معبود اور تمھارا دین ہمارے معبود اور ہمارے دین سے بالکل جُدا ہے۔ اس لیے ہماری تمھاری اس معاملے میں کوئی مناسبت نہیں ۔

سورۃ النصر

"جب اللہ کی مدد آ پہنچے اور فتح نصیب ہو اور آپ ، لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیں تو (اُس وقت) آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ (اُس کی) پاکی بیان کیجیے اور (امّت کے لیے) مغفرت طلب کیجیے ۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔" جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور مکہ فتح ہُوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ دھاڑیں مار کر رونے لگے کہ شاید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی جُدائی کا وقت قریب ہے ۔ فتح مکّہ کے بعد حجۃ الوداع میں وہ مشہور آیت (الیوم اکملت لکم دینکم ....) نازل ہوئی اور اس کے اسّی دن بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے رحلت فرمائی ۔

سورۃ اللھب

ابولہب اور اُس کی بیوی دونوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے تھے ۔" ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے (وہ خود تباہ ہُوا) اور وہ خود ٹوٹ کر رہ گیا ۔ اس کا مال اور اُس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی ۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا اور اُس کی بیوی بھی جو لکڑیوں کا بوجھ سر پہ لیے پھرتی ہے ۔ اُس کے گلے میں مونجھ کی رسّی ہے ۔" (ابولہب کی بیوی کا بیان نفرت سے کیا گیا ہے) ۔

سورۃ الاخلاص

تمام مشرکین ، کافرین اور منافقین کے رَد میں یہ سورۃ بہت بڑا (جامع ومانع) اعلان ہے ۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو معبود ٹھہراتے ، اور اس کے پیغمبروں کو اس کا بیٹا بتاتے اور دینِ حق کو چھپاتے ، اُن سب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ فرما دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے ۔ اللہ بے نیاز ہے ۔ نہ اُس کے کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں"۔

سورۃ الفلق ۔ سورۃ الناس

سورۃ الفلق میں اللہ اپنے بندوں کو (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن کے غلاموں کو) ظاہری شر سے بچنے کی اور سورۃ الناس میں

باطنی وسوسوں اور نفس کی بُرائیوں سے بچنے کی دعائیں سکھاتا ہے کیونکہ محافظت کرنے والا اور پناہ دینے والا وہی ہے۔

" آپ فرما دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے پروردگار کی ہر اُس شے کے شر سے جو اُس نے پیدا کیا اور ظلمت کے شر سے جب وہ چھا جائے اور (پناہ مانگتا ہوں) اُن کے شر سے جو گرہوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونکتی ہیں اور (میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔"

—— اور ——

" آپ فرما دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں تمام لوگوں کے رب کی۔ تمام لوگوں کے بادشاہ کی۔ تمام لوگوں کے معبود کی۔ (کس سے؟) اُس (شیطان) کے شر سے جو بہکاتا ہے (اور اللہ کا نام سنتے ہی) چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ خواہ وہ جنات میں سے (ہو) یا (بھول میں پڑے ہوئے) انسانوں میں سے" ——

الحمد للہ رب العلمین ۔ الرحمٰن الرحیم ۔ مالک یوم الدین ۔

یہ قرآن کس نے بھیجا؟ کس کو وسیلہ بنایا گیا؟ کس کے لیے بھیجا گیا؟ کیا پوری کائنات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور معنی الحسن تسبیح اور اس تبلیغ کی اہل ہے؟

هُوَ الْحَبِيبُ الَّذِي تُرْجَى شَفَاعَتُهُ ۔۔۔ لِكُلِّ هَوْلٍ مِنَ الْأَهْوَالِ مُقْتَحِمِ

دَعَا إِلَى اللهِ فَالْمُسْتَمْسِكُونَ بِهِ ۔۔۔ مُسْتَمْسِكُونَ بِحَبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمِ

دو عالم روز و شب در گفتگویش
ہمہ قرآں در شانِ محمدؐ

(جامیؒ)

نبوتِ محمدی پر قرآن میں استدلال

(چند اہم نکات)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قرآن کہتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ (العنکبوت: ۴۸ - ۴۹)

اے نبیؐ! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے آپ کے اہلِ وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔

اُمی ہونے سے نبوت پر استدلال

اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیأ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا[1] اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے

---

[1] قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپؐ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ پڑھے لکھے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیے اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔۔۔

(باقی صفحہ آئندہ)

حاصل کیا گیا ہے لیکن اُس کی اُمیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے - اب خالص ہٹ دھرمی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن یہ روایت براء بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں۔

۱- بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں قال لعلی امحہ فقال علیؓ ما انا بالذی امحاہ فمحاہ رسول اللہ بیدہ۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انھیں کاٹ دیا۔

۲- اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول اللہ قال لا واللہ لا امحوک ابداً فاخذ رسول اللہ الکتاب فکتب ھذا ما قاضی علیہ محمد بن عبد اللہ۔ پھر علیؓ سے کہا " رسول اللہ " کاٹ دو، انہوں نے کہا خدا کی قسم میں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے تحریر لے کر لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے طے کیا۔

۳- تیسری روایت انہی براء بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے؛ وکان لا یکتب فقال لعلی امح رسول اللہ فقال علیؓ واللہ لا امحاہ ابداً قال فارنیہ قال فاراہ ایاہ فمحاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ۔ حضورؐ نہ خود لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے الفاظ کاٹ دیئے۔

۴- چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکتاب ولیس یحسن یکتب فکتب ھذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ۔ پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی، درآنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے اور آپؐ نے لکھا " یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے طے کیا "۔

۵- انہی براء بن عازب سے مسلم کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کے الفاظ مٹا دیئے۔

۶- دوسری روایت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اسے مٹا کر ابن عبد اللہ لکھ دیا۔

روایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کئے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے " محمدؐ ابن عبد اللہ " کے الفاظ اپنے دست مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے " رسول اللہ " کا لفظ مٹانے سے انکار کیا تو آپؐ نے اس کی جگہ اُن سے پُوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبد اللہ " کے الفاظ لکھوا دیئے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؓ، دوسرے محمد بن مسلمہ (فتح الباری، جلد ۵، صہ ۲۱۷) اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے مجاہد سے ابن ابی شیبہ اور عمر بن شیبہ نے نقل کی ہے اس کے

(باقی صفحہ آئندہ)

کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو
ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں[1]۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کار فرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی اُن کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گرد و پیش کے جن ممالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں دُور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں[2] بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے۔ مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ	"یہ لوگ کہتے ہیں کہ" کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں
اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ	اس کے رب کی طرف سے" کہو" نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى	میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔۔۔ اور کیا ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ کتب و قرأ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے) لیکن اوّل تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں فضعیف لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی۔ بہت سے صحابہ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عون بن عبداللہ کے، جن سے مجاہد نے یہ بات سُنی، اور کوئی شخص اُسے روایت نہیں کرتا اور یہ عون بھی صحابہ نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انھیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعہ کا علم ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

[1] "نبوتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت" میں بھی یہ استدلال شامل ہے۔ مگر وہاں قرآنی استدلال کو سامنے لائے بغیر ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے (مرتب)

[2] اس موقع پر قرآن اُن معترضین کو بھی جواب دے رہا ہے جو حضورؐ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی شرط کے طور پر محیر العقول نشانی یعنی معجزہ طلب کرتے تھے۔ (نعیم صدیقی)

عَلَيْهِمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰالِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (العنکبوت : ۵۰-۵۱)

لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا۔ کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہجاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

نبوت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ (یونس - ۱۶)

"آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تم لوگوں کے درمیان گزار چکا ہوں۔"

یہ ایک زبردست دلیل ہے مشرکین قریش کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر دور کی چیز تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے آپ کا بچپن گزرا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا۔ لین دین۔ شادی بیاہ۔ غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنھیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم و تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہوگئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آرہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ

مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اِس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مُصنّف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھُپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا جس میں حجرِ اسود کو نصب کرنے کے معاملہ پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہو گا اسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے هٰذا الامین رضینا، هٰذا محمد "یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو محمدؐ ہے۔" اس طرح آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے "امین" ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور اُن کو پورے زور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔ (الشوریٰ ۔ ۵۲)	اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور علیہ السلام کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے بلکہ آپ سرے سے کتبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور تھا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوّت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا ذکر سُنا ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۔ (القصص ۔ ۸۶)	تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل) ہوئی ہے پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔

یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انھیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان

مشن پر وہ مامور کئے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیہ خیال میں بھی پاس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی۔ بس یکایک راہ چلتے انھیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی۔ آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں یہ پوری زندگی صداقت۔ دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے کسی نے ان مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔ کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اجتماعی مسائل کے حل یا مذہبی اصلاح یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے۔ مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رونما نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہر حال تاریخی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز گزارتا ہو، اگر آنحضرت کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کئے۔ مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپ خود بھی نبوت کے خواہشمند یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آگیا، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۃ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپ غارِ حرا سے کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ وہ فوراً جواب دیتی ہیں "ہرگز نہیں۔ آپ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں"۔ پھر وہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے

پاس جاتی ہیں جو ان کے چچا زاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راست باز آدمی تھے۔ وہ آپ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تامل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپ کے پاس آیا ہے وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰ کے پاس آتا تھا، کاش، میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی"۔ آپ پوچھتے ہیں "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں"۔

یہ پورا واقعہ اُس حالت کی تصویر کشی کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آجانے سے کسی سیدھے سادے انسان پر طاری ہو سکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دَم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی اُمیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی۔ چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضور کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنع سے ممیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو موسیٰ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے اور اچانک وہ پورے ہوش وحواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامل اِس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بین ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (آیت : ۱۶)

اے نبیؐ ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمھیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔

اور شوریٰ میں فرمایا:۔

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (آیت : ۵۲)

اے نبیؐ تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۱، جلد سوم عنکبوت، ۸۸ تا ۹۲، جلد چہارم الشوریٰ حاشیہ ۸۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور صحابۂ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کی طرف سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البینہ : ۲-۳)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود ایک دلیل روشن کہا گیا ہے اس لیے کہ آپ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپ کا اُمی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے ایمان لانے والوں کی زندگی میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپ کا بالکل معقول عقائد، نہایت ستھری عبادات، کمال درجہ کے پاکیزہ اخلاق اور انسانی زندگی کے لئے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا۔ اور آپ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوت کی دلیل ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ

اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (السجدہ: ۱-۲) نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لاریب فیہ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزول قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکہ معظمہ کے باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی زندگی بھی اور اس کے بعد کی بھی وہ اس کتاب کی زبان اور طرز بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرز بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہتہً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ[1] ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہل زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب و شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں پیش کئے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انھیں اس کتاب میں اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دور دور بھی اس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خورد بین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم یا قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا۔ کہ اس کتاب کا رب العلمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

---

[1] قرآن کو جس چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے (فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ) وہ اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس چیلنج کے جواب میں عاجز رہ کر مخالفین نے بہ زبان سکوت یہ اعتراف کر لیا کہ یہ کلام انسانی کاوشوں کا ماحصل نہیں ہے۔ قرآن کی اس معجزانہ اور فوق الانسانی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے حضور کی نبوت کی دلیل قرار دیا ہے (نعیم صدیقی)

پیغمبرِ انسانیت خدا کی نظر میں

قاری محمد عبد اللہ سلیم

خدا کے مقبول بندوں میں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے خواہ وہ پیغمبر ہوں یا اولیا اللہ۔ البتہ اولیا اللہ میں یہ شان صدقہ ہوتی ہے پیغمبروں کے ساتھ قرب ونسبت کا۔ اور دُنیا میں یہ محبوبیت پرتو ہوتی ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک ان کے محبوب و برگزیدہ ہونے کا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ارشادِ نبویؐ ہے:

"جب خداوند تعالیٰ کسی بندے کو اپنا مقبول بناتے ہیں تو ملاءِ اعلیٰ کے قلوب میں اسی بندے کی محبت القا فرما دیتے ہیں، اور پھر وہ آسمانوں میں بسنے والوں کے دلوں میں الہامِ محبت کرتے ہیں اور وہاں سے پھر زمین والوں کے دماغوں میں اسی کی محبت اتار دی جاتی ہے۔"

ہر پیغمبر بہ نفسِ نفیس اسی محبوبیت کا حامل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

والقيت عليك محبة مني ولتصنع	اور میں نے ڈال دی تجھ پر محبت اپنی طرف سے
علیٰ عيني۔	اور تاکہ تیری پرورش میری نگرانی میں ہو۔
وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي۔ (سورہ طٰہٰ)	اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے۔

اسی محبوبیتِ موسوی کا یہ کرشمہ تھا کہ جس کو نیست و نابود کر دینے کی خاطر ہزاروں اور لاکھوں اسرائیلی بچّے فرعونی ظلم وستم کا شکار ہو کر بے گناہ مارے جا رہے تھے۔ اس کو ہی جب فرعونی گھرانے نے تابوت میں دیکھا تو دل محبت سے تڑپ گئے، اور بے اختیار ہو ہو کر اس کی پرورش و پرداخت کا بندوبست کرنے لگے۔ اور آخر کار ریلیوں سے ہی دُودھ کی رکھوالی کرائی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام پیغمبروں میں منفرد خصوصیت جس سے ان کی محبوبیت عظیمہ کا بھی پتا چلتا ہے قرآن حکیم نے یہ بتلائی:

انما المسيح عيسیٰ ابن مريم رسول	بلاشبہ مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے اللہ کے
الله وكلمته القاها الیٰ مريم وروحٌ	رسول اور اسی کا کلمہ ہیں کہ جس کا اِلقاء
منه۔	مریم کی طرف اللہ نے کیا اور روح ہے
(سورۃ نسا)	اس کی طرف سے۔

بلاشبہ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر کی یہ اتنی بڑی خصوصیت ہے کہ جس نے ان کو سارے پیغمبروں سے منفرد و ممتاز

کر دیا، اور اسی لیے نا تربیت یافتہ دماغوں نے ٹھوکر کھائی اور ان کو خدا کا بیٹا تصور کر لیا، اور یہ سمجھا کہ رُوح کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے اس لیے جزئیت ثابت ہوگئی۔ اس لیے حضرت مسیح خدائی میں بھی شریک ہوئے (نعوذ باللہ منہ)، حالانکہ لفظ "منه" سے جزئیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی، ورنہ بقول ایک بزرگ کے آیت قرآنی و سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعًا منه میں بھی آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہر چیز کے لیے جزئیت خداوندی ماننی ہوگی اور ظاہر ہے کہ نہ اس کو مانتا ہے اور نہ مان سکتا ہے، ——— معلوم نہیں "روح اللہ" یا روحٌ من اللہ میں خدا کے ساتھ نسبت کی حقیقت صرف یہ کیوں نہ سمجھی گئی، جیسے بیت اللہ اور کتاب اللہ میں ہے۔

اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے "کلمته" فرمانا بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کی پیدائش صرف خداوند تعالیٰ کے ارشاد "کُن" سے ہوئی جبکہ تمام انسانوں کی پیدائش میں اس کلمہ کے علاوہ نطفہ کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ پاک میں یہ فرمایا گیا:

وعلّمنٰه صنعة لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم۔	اور ہم نے اس (داؤدؑ) کو لباس (زرہ) کی صنعت کی تمھارے لیے تعلیم دی تاکہ جنگ میں وہ لباس تمھاری حفاظت کر سکے۔

اس آیت میں حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کی صنعت سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا، یعنی براہِ راست ہم نے یہ صنعت سکھلائی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ فنِ زرہ سازی میں اللہ تعالیٰ معلم ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بڑی زبردست خصوصیت ہے، جس سے آپ کی عظیم الشان محبوبیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السّلام کی ایک دُعا کا قرآن پاک میں تذکرہ ہے:

ربّ هب لی ملکًا لا ینبغی لاحد من بعدی۔	پروردگار! مجھ کو ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو بھی میسّر نہ ہو۔

اور پھر اس دعا کی قبولیت کی خبر بایں طور دی گئی کہ ہم نے سلیمانؑ کے لیے ہوائیں اور جنّات مسخر کر دیے۔ بلا شبہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبردست مقبولیت و محبوبیت کی علامت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے لیے قرآنِ حکیم میں یہ صراحۃً موجود ہے کہ ان کی تخلیق ہم نے اپنے ہاتھوں سے کی اور یہ بات ان کی خصوصی عظمت و محبوبیت کی بیّن دلیل ہے۔

لیکن ان برگزیدہ ہستیوں کی محبوبیت کے ان آثار و شواہد کے بعد اب یہ ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو:

قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایسی شانِ محبوبیت کی خبر دی گئی ہے کہ جس سے بڑی شانِ محبوبیت دوسری نہ ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ یہ وہ شان ہے جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بجا طور پر "رحمۃ للعالمین" بھی فرمایا گیا اور "محبوب رب العالمین" بھی باور کیا گیا۔

اگر کسی جگہ یوں فرما دیا جاتا کہ اے پیغمبر! آپ ہمارے محبوب ہیں۔ تو اس میں وہ بات اور وہ خوبی نہیں ہوسکتی تھی جو اس آیت میں ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ تو محبوبِ خدا ہیں ہی، ہم تو آپ کے صدقہ میں آپ کے ہر پیروکار کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ بھلا دیکھیے تو آپ کی شانِ محبوبیت کہ آپ کے طفیل سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ اربوں کھربوں اور دُوہ بھی قیامت تک آنے والے اطاعت شعار اُمتی محبوبِ خدا بن گئے، ——— کتنی بڑی شان ہے سیدالانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا کے نزدیک۔

قرآن کریم میں حضرت ادریس علیہ السلام کے لیے ارشاد ہے:

ورفعناہ مکاناً علیّاً۔	اور ہم نے اس کو بلند جگہ پر اٹھا لیا۔

یہاں خواہ مرتبہ کی رفعت مراد ہو کہ نبوت و پیغمبری کی راہ سے بلند رتبہ عطا ہوا، یا اسرائیلی روایات کے مطابق رفع آسمانی مقصود ہو۔

اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے ارشاد فرمایا گیا:

یا عیسٰی اِنّی متوفّیک و رافعک الیّ ومطھرک من الذین کفروا۔ (آل عمران)	اے عیسٰی! تم کو (وقت مقررہ پر ہی) وفات دینے والا ہوں اور (اسی وجہ سے دشمنوں سے حفاظت کی یہ صورت ہوگی کہ) اپنی طرف تم کو اٹھانے والا ہوں، اور تم کو پاک کرنے والا ہوں کافروں (کی تہمت) سے۔

اس آیت میں دو باتوں کا تذکرہ ہے ایک رفع آسمانی، اور دُوسرے کافروں کی تہمتوں سے پاک رکھنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں نہایت ہی بلندئ رتبہ کی دلیل ہیں۔ لیکن ایک رفعتِ مکانی اور رفعتِ آسمانی ان دو جلیل القدر پیغمبروں کی ہے، اور ایک رفعتِ ذکری سیدالانبیا کی ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ مثال۔ فرمایا گیا:

ورفعنالک ذکرک۔	اور ہم نے بلند کردیا تیری خاطر تیرا ذکر۔

اور یہ اس طرح ہوا کہ ہر اہم موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کو شامل فرما دیا۔ چنانچہ جس کلمہ کے بغیر کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا اس میں بھی اللہ کے نام کے ساتھ پیغمبر کا نام ہے لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ۔ اگر آپؐ کا نام نہیں لیا جائے گا تو کلمہ ہی پُورا نہ ہوگا اور اس کلمہ کے دُوسرے جزو کو چھوڑ کر

محض پہلے کلمہ پر اعتقاداً قناعت کرلینے والا اس کو کتنی بار بھی رٹتا رہے وہ کسی بھی طرح نہ رحمت کا مستحق ہوگا اور نہ مغفرت کا۔ اسی طرح مسجدوں میں پانچ وقت اذان و اقامت کہی جاتی ہے ساری دُنیا ان کو سُنتی ہے اور روزِ قیامت زمین و فضا کی ہر چیز اس اذان پنجگانہ کی مؤذن کے حق میں شہادت دے گی[1] تو اسی اذان میں بھی جہاں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ہے وہیں اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ بھی ہے۔ ایسے ہی نماز جو اسلام میں سب سے اہم عبادت ہے اور جو از روئے اسلام کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل ہے اور اسی وجہ سے ایک مسلمان کے اسلام کا تعارف بھی ہے اور ثبوت بھی۔ اس میں بھی بوقت التحیات اللہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا جاتا ہے:

السلام علیك ایھا النبی اور اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ اور اس کے بعد درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے۔

مسلمان اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے خدا سے دُعائیں کرنے کا پابند ہے۔ لیکن دُعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ تعلیماتِ اسلامی میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اول و آخر درود شریف پڑھا جائے۔

جبکہ درود شریف کی بھی یہ زبردست خصوصیت ہے کہ قرآن پاک میں اسی کی ہدایت کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا:

ان اللّٰہ و ملٰئکتہٗ یصلّون علی النبی	حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود
یاایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا	بھیجتے ہیں پیغمبر پر۔ اے ایمان والو! تم بھی درود
تسلیماً۔	سلام بھیجو آپؐ پر۔

معلوم ہوا کہ جس کام کو خود اللہ اور اس کے مقرب فرشتے کر رہے ہیں اسی کام کے کرنے کی ہدایت مومن بندوں کو دے کر گویا اپنے کام میں شریک کرنے کی زبردست سعادت بخش دی۔ اور یہ صدقہ ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے بھی آپ کے رتبۂ بلند کا پتا چلتا ہے۔

پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کے لیے الفاظ یہ ہیں:

و رافعك الیّ۔	ہم اٹھانے والے ہیں تم کو اپنی طرف۔

اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے پاس اٹھا لینے کی خبر دی ہے، جو بلا شبہ عظمت عیسوی کی کھلی دلیل ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ کتنا قُرب و نزدیکی سے نوازا جائے گا۔ لیکن سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بسلسلۂ معراج جو فرمایا گیا اس کے انداز پر بھی غور کیا جائے۔

علّمہ شدید القوٰی	اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے،

---

[1] اور یہی وجہ ہے کہ از روئے حدیث اذان کے وقت شیطان بھاگتا ہے کیونکہ وہ ایسے کام میں خود کو انسان کا گواہ بنانے کے لیے تیار نہیں جس میں اس کا زبردست اُخروی فائدہ ہوتا ہو۔

ذومرّۃ فاستوٰی وھو بالافق الاعلیٰ ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین اَو ادنیٰ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ۔

(سورۃ نجم)

زور آور نے، پھر سیدھا بیٹھا، اور وہ تھا اونچے کنارے پر آسمان کے، پھر نزدیک ہوا، اور لٹک آیا، پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندے پر جو بھیجا۔

ان آیاتِ معراج سے وابستہ قرار دینے والی تفسیروں کے مطابق انتہائی رفعت اور بے انتہا قرب کی تصریح کے ساتھ مجبانہ جملہ ارشاد فرمایا گیا: فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ ۔ پس اللہ دے اور بندہ لے کا مضمون تھا ۔ بھلا کیا موازنہ ہے اس رفعت و قرب کا کسی اور قرب و رفعت سے۔

محبتِ صادق مولائے کائنات نے محبوبِ صادق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف بایں الفاظ فرمائی ہے:

انّک لعلیٰ خلقٍ عظیم۔

(سورۃ القلم)

بلاشبہ آپ اخلاق کے بلند معیار پر ہیں۔

یہ بات سوائے آپؐ کے کسی بندہ بشر کے لیے نہیں فرمائی گئی اس لیے اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اخلاقی اعتبار سے آپؐ خدا کے نزدیک نہایت بلند رتبہ ہیں، اور نہ صرف یہی بلکہ آپؐ نے اپنے بارے میں خود فرمایا:

بعثت لاتمم مکادم الاخلاق۔

میں اس لیے بھیجا گیا تاکہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ محض اتفاقی طور پر ہی بااخلاق نہیں تھے بلکہ اُصولِ اخلاق کی وضع و تکمیل کے لیے آپؐ کی ذاتِ گرامی ہی معیار بنی۔ اور چونکہ از روئے حدیث آپؐ کی عادات قرآنی ہدایات کے عین مطابق تھیں۔ اس لیے آج قرآن پاک ہی آئینہ ہے اخلاقِ محمدیؐ کا ——— لیکن اس ربانی شہادت کے باوجود کچھ لوگ آپؐ کے قرآنی اخلاق کو بلند رتبہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ مسیحی ہونے کے مدعی ہیں اسی لیے مقابلہ میں انجیل کی یہ اخلاقی تعلیم پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دُوسرا رخسار پیش کر دیا جائے۔ اب چونکہ انجیل خدا کے نزدیک منسوخ ہے اس لیے ہم بھی اس مقابلہ کا جواب دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ انجیل کی اسی اخلاقی ہدایت کا کیا اس، قرآنی ہدایت سے مقابلہ ہو سکتا ہے، فرمایا گیا:

جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا فمن عفا و اصلح فاجرہٗ علی اللہ۔

بُرائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی سے ہے۔ لیکن جو معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

ظالم اور جفا کار کو نادم و شرمندہ کرنے کے لیے یقیناً ایک اخلاقی بات ہے، لیکن ظلم و زیادتی کو معاف کرتے ہوئے پھر اس خطاکار کی اصلاح و تربیت کی طرف متوجہ ہونا، یہ کتنا بڑا اخلاقی کارنامہ ہے۔ اس سے تو کوئی بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا، ہاں انصاف جو برابری حقوق کی پاسداری کا ضامن ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر مساوی درجہ میں بدلہ لینے کی قانونی اجازت بھی دے دی گئی، مگر تعریف و مدح عفو و اصلاح کی ہی فرمائی گئی، جو ظاہر ہے قانون نہیں ہو سکتا بلکہ درجۂ فضیلت ہی قرار پا سکتا ہے، سو ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن انجیل کی ہدایت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ قانون ہے یا درجۂ فضیلت۔ اگر قانون ہے تو ہرگز اس کے مناسب نہیں ہے۔ اگر فضیلت ہے تو مذکورہ اسلامی فضیلت سے فروتر ہے۔

ہر مخلوق کے اندر خاص نوعی اور صنفی اوصاف و خصائل ہوتے ہیں جو اس کے مقصدِ تخلیق کے عین مناسب ہوتے ہیں۔ وہ خصوصی اوصاف جس فرد میں نمایاں اور کامل درجہ میں ہوں گے وہی فردِ باکمال مانا جاتا ہے۔ مثلاً شیر میں شجاعت اور سفاکی اس کے خاص نوعی اوصاف ہیں۔ یہ خصلتیں جس شیر کے اندر جس درجۂ کمال کے ساتھ ہوں گی اسی درجہ شیر باکمال ہوگا، کیونکہ اس سے خلقی مقاصد بدرجۂ کمال پورے ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بقاعدۂ اصولیین جب کوئی نام بولا جاتا ہے تو اس سے فردِ کامل ہی مراد ہوتا ہے۔ یعنی وہی فرد مراد لیا جاتا ہے جو اپنے نوعی اور صنفی کمالات کے ساتھ بدرجۂ کمال متصف ہو۔ مثلاً کوئی شیر بولے تو اس سے کامل درجہ کی شجاعت و سفاکی سے متصف شیر ہی مراد ہوگا جو اس کا نوعی وصفِ خاص ——— اس لیے کہ اگر شیر میں اور سب کچھ ہو لیکن شجاعت و سفاکی نہ ہو تو وہ اس کے حق میں عیب ہے۔

اسی طرح انسان کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔	میں نے انسانوں اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

عبادت کا خاصّہ لازمہ ہے بندگی اور عبدیت، اس لیے عبدیت ہی انسان کے حق میں کمال ہے، جس درجہ وصفِ عبدیت کسی انسان میں ہوگی اسی درجہ وہ باکمال ہوگا۔ اگر کامل ترین عبدیت ہے تو کامل ترین انسان ہوگا۔ اس کے برعکس کسی فرد میں سب کچھ ہو مگر عبدیت نہ ہو تو وہ اس کے حق میں عیب شمار ہوگا[1]

اور یہ بات بھی واجب التسلیم ہے کہ کوئی فردِ انسانی عبدیت کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ عبد و معبود کی حقیقت سے باخبر نہ ہو جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو انسان عبدِ کامل ہے وہ لازمی طور پر کامل درجہ کا عالم و عارف ہے۔

اور قاعدۂ اصولیین بتلایا جا چکا ہے کہ جب کوئی لفظ یا نام بولا جائے تو اس سے فردِ کامل ہی مراد ہوتا ہے[2]، لہٰذا

---

[1] چونکہ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے دُنیا میں خواہ کچھ بھی سمجھا جائے عالمِ آخرت میں جہاں حقائق اصل روپ کے اندر ہوں گی وہاں یہی اصول کارفرما ہوگا اور اسی بات کو پرکھا جائے گا کہ عبدیت کس درجہ کی ہے۔

[2] اصول کی عربی کتابوں میں ہے المطلق اذا اطلق فالمراد بہ الفرد الکامل۔

جب کسی انسان کے لیے لفظ "عبد" بولا جائے تو حقیقت کے اعتبار سے وہی فردِ کامل مراد ہو گا جس میں عبدیتِ کاملہ مع اپنے لازمہ وخاصہ کے موجود ہو۔ اور یہ عبد ہونا اور اس کے لیے لفظ عبد کا بولا جانا ساری تعریفوں سے بڑھ کر تعریف ہو گی۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ انسان میں دُوسری کوئی بھی بات خواہ کچھ بھی ہو اور کیسی بھی ہو تعریف کے قابل ہو سکتی ہے اور وُہ اس کے حق میں خُوبی اور اچھائی ہی ہو گی لیکن "عبد" ہونے کے مقابلہ میں کسی بات کو فوقیت و برتری حاصل نہ ہو گی۔

اسی تمہید و تفصیل کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن پاک میں لفظ عبد بولا ہے۔ فرمایا گیا:

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً۔ — پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات لے چلی اپنے بندے کو۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تمام اوصافِ انسانی میں عبدیت سب سے اعلیٰ وصف ہے اس لیے تاریخ انسانی کے اس عظیم ترین واقعہ، اور زبردست معجزے کے تذکرے کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی وصفِ خاص یعنی عبدیت کے ساتھ ذکر فرمایا گیا جو تمام اوصافِ بشری وپیغمبری میں سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔

اور چونکہ انسان بحیثیت مجموعی ساری کائنات سے افضل و برتر ہے اور ہر چیز اسی کے لیے مسخر ہے، تو انسانوں میں بھی جو فرد کامل ہو گا، اس کی بلا استثناء و بلا تاویل کائنات کی ہر جنس و نوع اور ہر صنف کے آحاد و افراد تک سے فضیلت مسلّم ہو گی، اسی لیے آنحضرتؐ کے لیے یہ مضمون برحق ہے:

لولاك لما خلقت الافلاك۔ — اے پیغمبر! اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات پیدا نہ کی جاتی۔

اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ روضۂ مطہرہ کے جس حصۂ زمین سے آپ کا جسدِ اطہر مس کیے ہوئے ہے وہ عرش کرسی تک سے افضل ہے، یہ درست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی لفظ عبد قرآن پاک میں بولا گیا۔ مگر ایک تو صرف اس وجہ سے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے اُن کی اُمت میں یہ غلط نظریہ عام ہو گیا کہ آپ خدا کے بیٹے تھے، اس لیے ان کے واسطے بھی لفظ "عبد" لایا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جب وہ عبد ہیں تو معبود کے بیٹے کیسے ہوئے۔ اگر ایسا ہوتا تو معبودیت کی کچھ تو شان ہوتی۔

مگر پھر بھی اس نکتہ کی طرف سے ذہن غافل نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ "عبد" لایا گیا تو ان کے قول کی حکایت کے طور پر لایا گیا۔ ارشاد ہے:

قال انی عبد اللہ۔ — حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود 'عبد' فرمایا اور وُہ بھی اپنے لیے ضمیر لا کر اس کی طرف عبد کی اضافت فرما دی جس سے مزید قرب وخصوصیت اور اپنائیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی لذت کو وہی شخص

جانتا ہے جو عربیت سے واقف ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ عبد کامل کے لیے علم و معرفت کاملہ لازم ہے، اس لیے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت میں بے مثال ہیں۔ اسی طرح علمِ حقیقی اور معرفتِ رب میں آپ کا کوئی نظیر نہیں ہے، اسی لیے آپ کو قرآن پاک دیا گیا جو کلامِ ربانی ہونے کی حیثیت سے علمی معجزہ ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ جس طرح عملی معجزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسا عمل ہو جس کے کرنے سے دُوسرے عاجز ہوں، اسی طرح علمی معجزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسے علوم و معارف کا اظہار ہو جس کے اظہار سے دُوسرے عاجز ہوں۔ اسی لیے خود آپؐ نے اپنے لیے ارشاد فرمایا:

اُوتیت علم الاولین والاٰخرین۔ میں اوّلین و آخرین کا علم دیا گیا ہُوں۔

اور جب یہ سب کچھ ہے تو آپ ہی اس کے حقدار تھے کہ خاتم النبیین بنائے جائیں، اور وُہ بھی اس طرح کہ وجودِ نبوت کے اعتبار سے سب پیغمبروں سے مقدم، لیکن ظہور کے اعتبار سے سب سے مؤخر، اس لیے کہ نورِ نبوت کا تمام سلسلہ آپ ہی پر جاکر مختتم ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ روشنی خواہ ستاروں کی ہو یا چاندکی یہ سب بواسطۂ سورج ان کو عطا ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ سورج کی روشنی مقدم ہے انجم و قمر کی روشنی سے، لیکن رات جو دن سے پہلے آتی ہے اس میں ظہور پہلے چاند ستاروں کی روشنی کا ہوتا ہے اور اس کے بعد سورج ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر اسی وقت سب کی روشنیاں غیر مؤثر ہو جاتی ہیں۔

یہی مثال آپؐ کی نبوت کی ہے اور اس لیے آپؐ مرتبہ کے اعتبار سے بھی خاتم النبیین ہیں کہ سارے پیغمبروں کی نبوت آپؐ ہی کا فیض ہے اور آپؐ زماناً بھی خاتم النبیین ہیں کہ سب سے آخر میں آپؐ کا ظہور رہا۔ اور آپؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت نہ ہوگی۔ قرآن پاک میں آپؐ کو خاتم النبیین اسی معنیٰ میں فرمایا گیا ہے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

یاایھا النبی انا ارسلناك شاھدًا و مبشرًا و نذیرا۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو بھیجا ہے شاہد اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔

اس آیت میں آپؐ کے ایک ایسے منصب کی خبر دی گئی ہے جس میں آپؐ اوّلین و آخرین میں ممتاز ہوں گے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یومِ آخرت کی عدالتِ عالیہ میں جب نوعِ انسانی اپنی زندگی کا حساب و کتاب دے گی، تو انبیاً علیہم السلام ان قوموں کے بارے میں دعویدار ہوں گے جن کی طرف وہ مبعوث کیے گئے کہ ہم نے تبلیغ دین کی لیکن اُنھوں نے جھٹلایا اور تمام ہی پیغمبر اپنی گواہی میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی پیش کریں گے۔ اور آپؐ جو شہادت دیں گے اسی کے مطابق ساری اُمتوں کے لیے فیصلہ ہو جائے گا، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر پیغمبر سے ثبوت مطلوب ہوگا، لیکن آپؐ ایسے

مقام پر ہوں گے کہ آپؐ سے ثبوت کا مطالبہ نہ ہو گا۔ اسی کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا گیا:

فکیف اذا جئنا من کل اُمّۃٍ بشہید و جئنا بك علیٰ هٰؤلاء شہیداً۔ (نساء)	پھر کیسے ہو گا جب ہم لائیں گے ہر امت کا شہید اور آپؐ کو ان سب پر شہید بنا کر لائیں گے۔

اور یہی وہ آپؐ کی خصوصیات و مناقب ہیں جن کا لحاظ بارگاہِ خداوندی سے اس طرح کیا گیا کہ قرآن پاک میں ہر پیغمبر کو اس کے نام کے ساتھ خطاب کیا گیا۔ مثلاً یا آدم، یا ابراھیم، یا موسٰی، یا عیسٰی، یا داؤد۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بھی جگہ نام لے کر مخاطب نہیں فرمایا گیا بلکہ یاایھا النبی اور یاایھا الرسول کے الفاظ سے خطاب کیا۔ حسبِ تصریح علماءؒ اس سے عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

ہاں قرآن پاک میں چار جگہ آپؐ کا نام نامی ضرور آیا ہے مگر وہ خطاب کے طور پر نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ نام لانے ہی سے مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر بات پوری نہیں ہوتی، وہ چار جگہیں یہ ہیں:

۱۔ وما محمدٌ الا رسول قد خلت من قبله الرسل۔ (آل عمران)	اور محمدؐ صرف ایک پیغمبر ہیں، آپ سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں (اس لیے آپ بھی ہمیشہ دنیا میں نہ رہیں گے)
۲۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیّن۔ (احزاب)	نہیں ہیں محمد باپ تمھارے مردوں میں سے کسی کے اور لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔
۳۔ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات و اٰمنوا بما نزّل علیٰ محمد وھو الحق من ربھم۔ (محمد)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی حق بھی ہیں اُن کے رب کی طرف سے۔
۴۔ محمد رسول الله والذین معهٗ اشدّآء علی الکفار رحماء بینھم۔ (فتح)	محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو ان کے ساتھ ہیں نہایت سخت ہیں کفار پر اور بہت مہربان ہیں آپس میں۔

قرآن سے مظہرِ نبوت کی تشریح

مولانا محمد حنیف ندوی

تاریخی لحاظ سے عالم انسانیت کے تہذیبی ارتقا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی تمام تر تگ و دَو اور کامرانیوں کا حاصل ہمیشہ دو چیزیں رہی ہیں۔ ایک وہ کوششیں جو تلاشِ حقیقت کے سلسلے میں عقل و خرد کے بل بوتے پر اس نے از خود انجام دیں اور اس کے نتیجے میں فطرت کے رازہائے درون پردہ کا انکشاف ہوا۔ دوسرے فیضانِ ربوبیت کا وہ کرشمہ جس نے ہر ہر دَور میں اس کی روحانی و اخلاقی سطح کو رفعتیں عطا کیں۔ یعنی دریافت (DISCOVERY) کی برکتیں اور وحی و الہام کی دست گیری۔ یہی وہ دو محور ہیں جن کے گرد ہزاروں برس ارتقا کا عملیہ گھومتا رہا اور یہی وہ دو روشنی کے مینار ہیں، زندگی کے بحرِ بے کراں میں جن کی تابش و ضو سے تہذیب و تمدن کے سفینے رواں دواں رہے ہیں۔ طائفہ فکر و دانش کے گل سر سبد، جنھوں نے ماضی میں حقیقت کو پا لینے کی سعی کی کنفیوشس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ گروہِ پاک جس نے انسانیت کو تزکیہ و تحلیہ کی راہ دکھائی۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ (صلوات اللہ علیہم اجمعین) کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

تاریخ کے اس تجزیہ سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی سعیِ فکر و تعمق اور آسمانی فیوض و ہدایت سے بہرہ مندی کی راہیں جدا جدا اور مختلف ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تجزیہ سراسر وہم و خیال کی فسوں سازی ہے ورنہ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پرتو اور انعکاس ہیں۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ علم و حکمت نے اپنے اظہار کے لیے تکوین و تشریع کی دو سطحیں پسند کیں۔ تکوینی سطح پر تو اس نے چاہا کہ انسان اپنی فکری و عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے بالاتر حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور تشریعی سطح پر اس کے فیضِ ربوبیت نے یہ چاہا کہ ایسے انبیا و رسل کو دنیا میں مبعوث فرمائے جو اپنی تعلیمات و عمل سے انسان کو رشد و ہدایت کی راہ دکھائیں، اور اس کے اندر کے اس خالق تر انسان کو نکھاریں جو خدا سے ڈرتا ہے، خدا سے محبت رکھتا ہے اور اس حقیقت سے آشنا ہے کہ تسخیرِ کائنات کا راز کیا ہے؟ مزید برآں جو اس فلسفہ سے آگاہ ہے کہ انسانی رشتوں کو کیونکر عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرنا ممکن ہے۔

وحی و تنزیل اور دریافت و یافت کی فکری و عملی کوششوں میں کہیں تضاد یا تناقض نہیں پایا جاتا۔ دونوں میں ہم آہنگی اور اتحاد ہے، دونوں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں، اور دونوں ہی کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کسی نہ کسی طرح انسان کی تکمیل کی جائے اور اس کو فطرت کا راز داں بنایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں، عقل و خرد کے تقاضے اور مذہب و دین کے واجبات، درتناقض پہلو ہونے کے بجائے اس کے تکمیلی اجزا ہیں جو انسانی فطرت کو اور جلا بخشتے ہیں اور اس کے مضمرات ارتقا کو ابھارتے

ہیں، چاہے ان کا تعلق اس کی سیرت و کردار کے معجزات سے ہو اور چاہے ذہن و عقل کے خوارق سے۔ غرض و مقصد کے اتحاد سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کے جوہر و مزاج میں ہی اتحاد و یگانگت پائی جاتی ہے۔ وحی و تنزیل کے داعیے اپنی آغوش میں عقل و خرد کے وہ تمام آفتاب چھپائے ہوئے ہیں۔ جن کی روشنی میں تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے قدم بڑھانا ہے اور اسی طرح عقل و خرد کے عملیہ میں وحی و الہام کے تقاضوں کا بھی دخل ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب تشریع اور تکوین کے دائروں کو آپس میں بہرحال ملنا اور متحد ہونا ہے اور جب آسمانی اور زمینی کوششوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھلنا اور ظہور پذیر ہونا ہے۔

سمسرکے نقطۂ نظر کی غلطی

نبوت کے بارے میں ہم سمسر کی اس تقسیم کو صحیح نہیں مانتے کہ اس کا تعلق کہانت اور اظہارِ حقیقت کے ان خانوں سے ہے جس میں خواب و بیداری میں بربنائے حدس آئندہ واقعات کی غیر واضح جھلک دیکھ لینا اور اس کے بل پر پیش گوئی کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک نبوت اور کہانت وغیرہ میں رشتہ و تعلق کی نوعیت یہ نہیں کہ یہ کہانت کی ارتقائی شکل ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کے فیوضِ ربوبیت کا ایک مستقل بالذات مظہر ہے۔ اس کا تعلق تدبیرِ الٰہی کے کرشموں سے ہے اور اصلاح و تعمیر کے اس باقاعدہ نظام سے ہے جس کا منتہائے مقصود نوعِ انسان کو زندگی کی ضروری اقدار سے روشناس کرنا اور اس کی فکری و عملی صلاحیتوں کو چمکانا اور سنوارنا ہے۔ یہ مظہر نہ تو بخت و اتفاق کی اعجوبہ کاریوں کا مرہونِ منت ہے اور نہ کسی غیر منطقی اور بے ڈھب مظہرِ فطرت کی ارتقائی شکل۔ اس کا تعلق عقیدہ و فکر کے ان تین اصولوں سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ زندہ، قیوم اور رحمت و شفقت کی ارزانیوں کا سرچشمہ اور مصدر ہے۔ اس کا اپنے بندوں سے تعلق بیگانگی اور اجنبیت کا نہیں پیار اور محبت کا ہے۔ جس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ دنیا میں انسان کی اصلاح و تدبیر کا اہتمام کرے اور تاریخ کے ہر مناسب موڑ پر اس کی رہنمائی کرے، اس کو روشنی عطا کرے اور اس قابل ٹھہرائے کہ یہ اس کی صفات کا صحیح معنوں میں ترجمان ثابت ہو۔

۲۔ یہ ذاتِ حق اصلاح و تدبیر کے لیے ایسے نفوسِ قدسیہ کو چنے جو فکر و عمل کے لحاظ سے بالاتر اور فائق تر صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں، جو اپنے مخاطبین سے بہرحال اونچے ہوں اور شخصیت و کردار کے اعتبار سے اس لائق ہوں کہ ان سے ایمان و عقیدت کے رشتوں کو استوار کیا جا سکے۔

۳۔ جس ماحول میں یہ حضرات تشریف لائیں اس میں ایسے حل طلب اجتماعی و انفرادی مسائل و مشکلات کا ہونا ضروری ہے جن کو یہ سلجھائیں اور ان کے جواب میں ایسی روش اختیار کریں، جو معقول اور سمجھ میں آنے والی ہو۔

مظہرِ نبوت کی تشریح

مظہرِ نبوت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان سہ گونہ مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے، فعال و کریم ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ جس سے اس کو جسم و جان کی شادمانیاں حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی اس خصوصیت کو ہم "صفتِ ربوبیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا

ہے کہ یہ صدیوں زندگی کے تضادات سے نبرد آزما ہوتا رہے اور بغیر کسی ہدایت اور زندگی کے واضح نقشے کے ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے اور خود اپنی محنت، تجربہ اور عقل و خرد کی کاوشوں سے اپنے لیے راہِ عمل دریافت کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ انسان آج بھی غاروں، جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا اور تہذیب و تمدن کی شمیم آرائیوں سے قطعی محروم رہتا۔ یہ اس کا کرم بے پایاں اور عنایت فزوں تر کا فیض ہے کہ اس نے تہذیب و ترقی اور اصلاح و تعمیر کے عملیہ کو انبیاء و رسل کے ذریعہ تیز تر کر دیا اور فکر و عمل کی ان تمام گمراہیوں سے انسان کو بچا لیا جو ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوتیں اور بجائے اس کے انسان اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھتا، ان سے اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے نوعِ انسانی کی ہلاکت کا باعث بنتا۔

ہم جب نبوت و وحی کے سرچشمہ کی تعیین کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت و عنایت کا ذکر کرتے ہیں، تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے انسان کی طرف سے نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور حالات و واقعات کی کروٹیں یا انسانی جذبۂ تحقیق و جستجو اور مجاہدہ و ریاضت کی کوششیں اس کو جنم نہیں دیتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخششیں اور محبت اس کو بروئے کار لانے کی ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم پیغمبر کی اپنی عظیم تر ذہنی و عملی صلاحیتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے قلب و ذہن میں تحقیقِ حق اور سچائی کو ماننے کا جو بے پناہ جذبہ موجزن ہوتا ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور پیغمبر کو محض ایک غیر فعال، غیر متحرک اور ایسا آلہ تسلیم کرتے ہیں جو وحی و الہام کی موجوں کو وصول کرتا اور انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہم پیغمبر کی ذاتی خوبیوں اور اس کی ذہنی و فکری بلندیوں کو مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالات و مسائل کے مطالعہ سے خود اس کے دل میں بھی حق جوئی کے ولولے پیدا ہوتے ہیں اور شدت و اشتیاق میں اس درجہ بڑھ جاتے ہیں کہ آخر الامر یہی جستجو، ولولہ اور طلب و تلاش کی کوششیں اس کے اندر ان ذہنی صلاحیتوں کو چمکانے کا سبب بنتی ہیں، جن کی بدولت یہ اس لائق ٹھہرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ اس منصب کو قبول کر سکے اور وحی و الہام کی روشنی میں بنی نوع انسان کی اصلاح و تعمیر کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اس اہم اور بدرجہ غایت توجہ طلب موضوع سے ناانصافی ہوگی اگر ہم بحث کے اس مرحلے میں یہ نہ بتائیں کہ نبوت کی تشریح فارابی کے نظریۂ تخیل اور صوفیہ کی بولی میں مجاہدہ و ریاضت کی طرفہ طرازیوں سے کیوں نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ وحی تخیل و کشف کے نتائج اور ان کی فطرت اور اسلوب سے بالکل مختلف شے ہے۔ دونوں میں اصولی اور بنیادی فرق یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں معروضیت سے بڑی حد تک ہٹی ہیں۔ دونوں کا تانا بانا متعین تعلیم اور مخصوص عقائد و نظریات کی کارفرمائیوں سے تیار ہوتا ہے۔ جب کہ وحی و تنزیل یکسر معروضی حقائق کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں معاشرہ کے مادی تقاضوں، اجتماعی مشکلات اور تضادات کا حل تو موجود ہوتا ہے مگر اس کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ اپنے دور کے حالات و کوائف کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے۔ یہ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک مستقل بالذات حقیقت ہے جس کا سرچشمہ عنایت الٰہی کا فیض گسترانہ فعل و عمل ہے۔

ان میں اور وحی الٰہی میں دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ تخیل و کشف کی بلند پروازیوں کا بالعموم تعلق چونکہ موضوعیت سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے حاصل کردہ نتائج کی حیثیت ایک فرد یا شخص کے اپنے تجربات و احوال اور اپنے حدودِ ذہنی کے تطابق سے زیادہ نہیں ہوتی، اس میں وہ جامعیت اور انسانی زندگی کے جملہ اصلاح طلب پہلوؤں کا استیعاب نہیں ہو پاتا جس کو وحی اپنے آغوش میں سمو لیتی

ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وحی اپنے غلبہ کے اعتبار سے ہمیشہ کلیت کی حامل ہوتی ہے اور کشف و تخیل کے نتائج جزئیات کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

وحی و تنزیل اور تخیل و کشف کے نتائج میں تیسرا فرق حجت و استناد کا ہے۔ وحی اس لئے حجت و مستند ہے کہ اس میں خطا و لغزش کا احتمال نہیں ہوتا اور کشف و تخیل اس وجہ سے حجیت و استناد سے عاری ہیں کہ خطا و لغزش کا ہدف و نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو تقابل کی صورت یہ تھی کہ ہم نے تخیل و کشف کے نتائج پر ایک ساتھ غور کیا لیکن اگر مقابلہ صرف کشف اور وحی و تنزیل کے درمیان ہو تو ان میں چوتھا فرق جو ابھر کر نظر و فکر کے سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ کشف کی ترکیب و ساخت میں چونکہ موضوعیت و معروضیت کے دو گونہ عناصر ملے جُلے رہتے ہیں اور اظہار کا طریق رمز پر مبنی ہوتا ہے، اس بنا پر اس کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں اور وحی کے معاملے میں یہ نہیں ہوتا۔ وحی ہمیشہ صاف، واضح اور متعین زبان و تعبیر کی حامل ہوتی ہے جس میں الجھاؤ، تضاد اور تعبیر کی کثرت و بوقلمونی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک وحی کے متعلق دوسرے اور تیسرے اصول کا تعلق ہے، اس کے لیے دلیل آرائی کی قطعی ضرورت نہیں، ان کی وضاحت و تشریح ہی ان کی حقانیت پر دلالت کناں ہے۔ مزید برآں ایسا ہوتا ہے کہ بسا اوقات سچائیاں اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود حجت و استناد کے ایسے معیار قائم کر لیتی ہیں کہ جن سے انحراف ممکن نہیں رہتا۔ بیکن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ حقیقت کا اثبات ضروری نہیں کہ منطقی صغریٰ کبریٰ کی ترکیب و ساخت ہی کا مرہونِ منت ہو۔ تجربہ اور نتائج کی استواری و صحت بھی بسا اوقات اثباتِ مدعا کا کام دے جاتی ہے۔ اگر انبیاؑ کی ذہنی سطح اپنے ہمعصروں سے اونچی نہ ہوتی، اگر ان کے کردار میں اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اور بلندی نہ پائی جاتی اور اگر وہ پیش آمدہ مسائل کا صحیح صحیح حل پیش نہ کر پاتے تو نوعِ انسانی کی کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکتے اور اپنے ہم زمانہ لوگوں میں اپنے لئے محبوبیت و پذیرائی کا وہ مقام ہرگز حاصل نہ کر پاتے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے نقوشِ قدم کی پیروی و اطاعت صدیاں بیت جانے کے بعد بھی انسانی سعادت کی معراج قرار پاتی۔ تاریخ نے اگر کچھ ناموں، شخصیتوں اور فکر و کردار کے سانچوں کو محفوظ رکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں فکر و تصور کی بلندی اور کردار و سیرت کی استواری و پاکیزگی کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں اور انسانی معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ تاریخ باوجود اپنی سرد مہریوں کے ان کو بھلا نہیں سکی اور یہی صورتِ حال مظہرِ نبوت کی تحقیق و اثبات کا قابلِ اعتماد پیمانہ بھی ہے۔ عنایتِ الٰہی کی ان ارزانیوں سے جو نبوت و رسالت کی اصطلاحوں سے تعبیر ہیں، انسان کی ذہنی و فکری شادمانیوں کا اگر اہتمام ہوا ہے اور ہر ہر دور کے مسائل کی گتھیاں اگر انہوں نے سلجھائی ہیں اور تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے بڑھایا ہے تو اپنے دعووں میں بلا شبہ یہ حضرات صادق تھے۔ ان کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے کسی مصنوعی تفلسف، منطق آرائی اور علم الکلام کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیغام کی کامیابی، ان کی ذہنی و فکری بلندی اور کردار و سیرت کا غیر معمولی تفوق ہی وہ حقائق ہیں جو ان کو صداقت شعار قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

تصورِ نبوت کے بارے میں ڈاکٹر صبحی صالح کی حرفیت پسندی

جس طرح ہم نے تصورِ نبوت کے بارے میں سسرو کے اس نظریہ سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ کہانت اور وحی دو خانوں میں تقسیم پذیر ہے، اور یہ بتایا ہے کہ نبوت کا اطلاق صرف ایک ہی متعین و مخصوص مظہر پر ہوتا ہے اور وہ مظہر وہ ہے جس کا تعلق عنایاتِ الٰہی کی فیض رسانیوں سے ہے، اسی طرح ہمیں اجازت دیجیے کہ ڈاکٹر صبحی صالح کے اس عجیب و غریب نظریہ کی تردید کریں کہ پیغمبر کی ذات دو مختلف عناصر سے تعبیر ہے۔ ایک عنصر وہ ہے جو وحی و تنزیل کے اشارات کو قبول کرتا اور لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ایک وہ ہے جس کا تعلق پیغمبر کی بشریت سے ہے۔ جہاں تک پیغمبر کی اس حیثیت کا تعلق ہے جو وحی و تنزیل کا محل و گہوارہ ہے، اس میں بلاشبہ لغزش و خطا کا کوئی احتمال نہیں لیکن بشری تقاضے ان کو نہ صرف لغزش و خطا کا ہدف ہی قرار دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی گناہ اور ذنب کے ارتکاب پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔

انھیں تعجب ہے کہ رازی اور رشید رضا نے قرآنِ حکیم کے ان مقامات کی تاویل کیوں کی، جہاں پیغمبر کے لیے "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جہاں بعض امور پر اس کو ٹوکا اور متنبہ کیا گیا ہے، اور کھلے اور واضح الفاظ میں اس کے طرزِ عمل پر عتاب و سرزنش کا اظہار کیا گیا ہے اور طلبِ مغفرت کی تلقین کی گئی ہے۔[1]

رازی اور رشید رضا کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم کے اس اسلوبِ بیان اور ان مقامات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، جہاں پیغمبر کے لیے "ذنب" کا لفظ بولا گیا ہے، جہاں اس کو ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرنے پر زجر و توبیخ کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام مقامات تاویل طلب ہیں اور سیاق و سباق کی رعایت، لغت و ادب کے صحیح مفہوم اور منصبِ نبوت کی عظمت و توقیر کی روشنی میں ان تمام آیات کی ایسی مناسب اور شایانِ شان تشریح ممکن ہے جس سے کہ پیغمبر کی عصمتِ کردار پر حرف نہ آنے پائے اور ذاتِ پیغمبر بدستور انسانی ہدایت و رہنمائی کا مینارہ بنی رہے۔ ہمیں رشید رضا اور رازی کے مؤقف سے پورا پورا اتفاق ہے۔

ہمارے نزدیک صبحی صالح نے نبوت کے بارے میں جس طریقِ استدلال کا سہارا لیا ہے وہ کھری حرفیت پسندی پر مبنی ہے اور اس بصیرت، عمق اور منطق سے قطعی محروم ہے جس سے نبوت کے فہم و ادراک میں مدد لینا چاہیے۔ قرآن حکیم کی رُو سے نبوت کیا ہے؟ کن کن ذہنی و فکری خوبیوں اور بلندیوں سے آراستہ ہے اور نبی وحی و تنزیل کے کون کون خزائن، اللہ کے بندوں تک پہنچانے پر مامور ہے؟ اس سے قطع نظر کہ خود ان باتوں سے بھی اس کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے، اس کی ذات پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ میں اس کا کردار کیا ہے۔ کیا اس کو لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نہیں بھیجا جاتا؟ کیا اس کی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل نہیں کہ یہ فرد و معاشرہ کو گناہ و معصیت کی راہ سے ہٹا کر صحت و صواب اور تزکیہ و تخلیہ کی راہ پر ڈالنے کی سعیِ بلیغ فرمائے؟ ان میں شر اور بغاوت کے جذبات کو فرو کرنے کی کوشش کرے اور اطاعت و پیروی کی روح پھونکے؟ ان کو فکر و عمل کی پاکیزگی بخشے اور اس لائق ٹھہرائے کہ اس عالمِ شر و فساد میں نیکی کا پرچم اونچا رکھیں۔

---

[1] مباحث فی علوم القرآن طبع سادس۔ بیروت ص ۲۰

اگر ہمارا یہ تجزیہ صحیح ہے اور پیغمبر کا اجتماعی کردار ان تمام تقاضوں کو امکان کی حد تک پورا کرنے کا ذمہ دار ہے تو پھر اس کی حیثیت یہ تو ہرگز نہ ہونی چاہیے کہ یہ گناہ اور معصیت کے اثرات سے اپنا ہی دامن بچا نہ سکے اور احکام الٰہی یا منشائے الٰہی کا چلتا پھرتا نمونہ اور ترجمان بننے کے بجائے اور اگر خود بھی ادنیٰ خواہشات کے گڑھے میں کو دجائے پیغمبر کے بارے میں یہ بدگمانی، بدذوقی اور ذات پیغمبر سے بیگانگی پر مبنی ہے پیغمبر کا وجود کسی نوع کی ثنویت کا متحمل نہیں ہوتا۔

اس حرفیت پسندی کے علاوہ جس نے نبوت کی وحدت کو دو خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے، ڈاکٹر صبیحی صالح کے طرز استدلال میں خامی دو وجہ سے ابھری ہے۔ ایک تو انھیں یہ معلوم نہیں کہ بشریت کے حدود وارتقا کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں، اور دوسرے ان کی نظر وحی کی منوفشانیوں سے ناآشنا ہے۔ جہاں تک انبیا کی بشریت کا تعلق ہے اہل علم کے حلقوں میں اس میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ قرآن حکیم نے بار بار ان کی بشریت کا اقرار کیا ہے۔ اقرار ہی نہیں کیا، اس پر زور دیا ہے اور اس کو ایک مسلمہ عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور مشرکین مکہ کے اس استعجاب و انکار پر کہ کیا بشر رسول ہو سکتا ہے، یہ بتایا ہے کہ بشر ہی کو یہ زیبا ہے کہ وہ منصب نبوت پر فائز ہو سکے۔ کیونکہ بصورت دیگر اس کی زندگی عالم بشری کے لئے نمونہ واسوہ کیونکر قرار پا سکتی ہے؟

نقطۂ اختلاف یہ امر ہے کہ بشریت کے مضمرات ارتقا متعین اور محدود ہیں اور کیا بشر کے معنی صرف اکل و شرب کے عادی اور انسانی کمزوریوں کی حامل مخلوق ہی کے ہیں، یا رشد و اصلاح اور تعلیم و تزکیہ اور مجاہدہ و ریاضت کی خوبیوں سے اس مقام تک بھی اس کی رسائی ممکن ہے کہ جہاں یہ بشر ہوتے ہوئے بھی گناہوں سے اپنا دامن عمل بچا لینے پر قدرت حاصل کر سکے۔ یہی نہیں، جہاں اس کی حرکت و عمل کا محور صرف گناہوں سے باز رہنا اور مجتنب رہنا ہی نہ ہو بلکہ اس کی تلاش و جستجو اور دوڑ دھوپ کا مرکز یہ سوال قرار پائے کہ یہ کس حد تک خوب سے خوب تر کی طرف بڑھ سکتا ہے، کس حد تک حسن سے احسن تک ترقی کر سکتا ہے اور کس حد تک یہ اپنی اخلاقی و روحانی سطح کو بلند سے بلند تر فرازنے تک اچھال دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارے نزدیک بشریت اپنے فکری و عملی ارتقا کے اعتبار سے کلی مشکک ہے، جس کے اوائل کا تعین تو ممکن و معلوم ہے، انتہا کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ہم نہیں بتا سکتے کہ اس کے فکر کی پرواز کن کن معجزات عقلی کا احاطہ کرے گی اور اس کی محبت خیر و حق اس کو کردار و عمل کے کن نئے نئے آفاق سے روشناس کرائے گی۔ انبیاؑ کی نسبت سے عصمت عمل و کردار کا تصور بشریت کے معمولی اور ابتدائی درجے کی غمازی کرتا ہے جس پر بہت سے حکیم اور صوفی فائز رہے ہیں۔ انبیاؑ کا وصف اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ نہ صرف خود کامل و معصوم ہوں بلکہ انسانوں کو کمال و خیر کی راہ دکھائیں۔ چنانچہ یہ حضرات صرف معصوم ہی نہیں ہوتے، خیر کا پیکر فعال بھی ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایسے سرچشمۂ فیض کی ہوتی ہے جس سے ہمیشہ نیکی، سچائی اور خیر کی لہریں اٹھتی اور چھلکتی رہتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر سے بھی سہو و نسیان اور لغزش فکر کا صدور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس لغزش فکر کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ گناہ اور نیکی میں سے اپنے لئے بہ تقاضائے بشری کوئی گناہ پسند کر لیتا ہے، اور اس طرح اپنے منصب کو پورے طور سے ادا کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ پیغمبر اور گناہ کا ارتکاب منطق کی اصطلاح میں متناقض بنفسہ کے مترادف ہے، کیونکہ پیغمبر اگر عام انسانوں کی طرح گناہ گار ہو تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے پیغمبر نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر کی غلطی کس نہج کی ہوتی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک سائنٹسٹ، ایک طبیب اور ایک فقیہ کی مثال فکر و نظر کے سامنے لائیے۔ فرض کیجیے، ایک سائنٹسٹ اپنے معمل میں طبیعیات کے بعض قوانین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بسا اوقات بعض ایسے مفروضے اور مقدمات فرض کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو نتائج کے اعتبار سے صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے فکر و فہم کی یہ غلطی اس کے جذبۂ تحقیق کو روک دینے کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس جذبے کے لیے مہمیز ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح طبیب مریض کے علاج کے سلسلے میں مختلف دواؤں کو آزماتا ہے اور آخر کار ناکامی کی صورت میں مایوس نہیں ہو جاتا بلکہ صحیح نسخہ دریافت کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال فقیہ کا ہے، وہ بھی جزئیات و مسائل کے حل و کشود کے لیے مختلف اصول جانچتا پرکھتا ہے، مختلف آیات و احادیث پر نظر دوڑاتا ہے اور تطبیق و اطلاق کے ضمن میں بعض اوقات اجتہاد و فکر کی بے راہ روی کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔ ان میں کسی کی غلطی بھی ایسی نہیں جو جرم، گناہ اور فن و منصب سے غداری کہلائے۔ کیوں کہ فکر و عمل اور سعی و طلب کے عمل کا یہ خاصہ ہے کہ صحت و صواب کی تلاش میں انسان لغزش کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں بلاشبہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سے ایک سائنٹسٹ، ایک طبیب اور فقیہ مختلف زاویہ ہائے نظر سے دوچار ہوتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے کہ حصول مقصد کی خاطر یہ کس اصول کا اطلاق کرے اور معاملہ زیر بحث کو کس زاویۂ نظر سے دیکھے اور جانچے۔ اور پھر جب اس بارے میں ان سے کسی لغزش کا صدور ہو جاتا ہے جو بتقاضائے بشری ہونا چاہیے، تو یہ لغزش ایک اناڑی، جاہل اور راحدی انسان کی لغزش نہیں ہوتی کہ اس پر مورد عتاب ٹھہرے۔ یہ لغزش ایک بیدار عقل، ایک بے قرار جستجو اور عالم و فقیہ کی لغزش ہوتی ہے جو آئندہ کامیابیوں کی تمہید بن جاتی ہے یہی حال پیغمبر کی سعی خیر و جمال کا ہے۔

یعنی ایک پیغمبر معاشرے کی اصلاح یا اپنی روحانی تکمیل وارتقا کے سلسلے میں جب خوب سے خوب تر کی تلاش میں فکر و اجتہاد کی کوششوں کا آغاز کرتا ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خوب تر کی بجائے خوب پر قناعت کر بیٹھے اور اولیٰ و افضل کو اختیار کرنے کے عوض مباحات ہی کو اپنا لینے میں مصلحت سمجھے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی یہ لغزش اجتہاد و فکر جو فی نفسہٖ خیر اور بہت بڑی نیکی ہے، گناہ اور معصیت سمجھی جائے یا پیغمبر کے اس اختیار کو خواہشات نفس کی پیروی پر مبنی مانا جائے۔ پیغمبر نہ تو کبھی نفس کی سطح سے بولتا ہے اور نہ نفس کی سطح سے متاثر ہو کر کوئی قدم ہی اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے عمل و کردار کے لئے جس قندیل سے روشنی حاصل کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور احکام الٰہی کی قندیل ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہونے پاتی:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم: ۳، ۴)

ترجمہ: اور وہ خواہش نفس سے منہ سے نہیں بولتا۔ یہ قرآن تو وحی خداوندی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

وحی کا مفہوم

وحی سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اس کو منصب نبوت سے بہرہ مند کرے تو اس کے قلب و ضمیر اور وجدان و فکر کو وحی و تنزیل کے نور سے روشن کر دیتا ہے اور یہ وحی چونکہ زندگی کے بارے میں رشد و ہدایت کی حامل ہوتی ہے اور ان نکات و معارف کی ترجمانی کرتی ہے جن سے خیر و شر میں فرق و امتیاز کے خطوط ابھرتے ہیں، جن سے انسان میں ایک خاص طرز عمل

اور متعین اسلوب اور فکر کی تخلیق ہوتی ہے اور کردار و بصیرت اخلاق کے پاکیزہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ اس بنا پر وحی کے اس عمل کو ہم محض میکانکی عمل قرار نہیں دے سکتے کہ جس سے اصلاح، تعمیر اور روحانی ارتقا کا کام نہیں لیا جاتا۔ پیغمبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وحی و الہام کی روشنی سے یہ خود بیگانہ رہتا ہے یا اس منصب سے اس کی اپنی زندگی متاثر نہیں ہو پاتی۔ وحی تعلیم ہی نہیں تربیت بھی ہے، ابلاغ ہی نہیں عمل بھی ہے۔ اسی طرح اس کو صرف پیغام ہی نہیں کہہ سکتے، اس کو خیر و جمال کی اداؤں کی دل نوازی عطا کرنے والی ایک ہمہ جہت قوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے صرف پیغمبر کا نہاں خانۂ عمل ہی متنیر نہیں ہوتا، اس کے ساتھ سیرت اور روزمرہ معمولات کا ہر ہر گوشہ بھی جگمگا اٹھتا ہے، اس سے پیغمبر روشنی اور زندگی کے حقیقی راز سے آشنائی حاصل کرتا ہے اور اس نکتہ سے آگاہ ہوتا ہے کہ ایک کمزور اور ضعیف و ناتواں انسان توفیق الٰہی کی دست گیری سے کیونکر گناہ، شر اور برائی پر فتح حاصل کر سکتا ہے اور ایک گناہ گار اور مجرم معاشرے کو کس طرح تقویٰ اور پاکبازی کی راہ پر ڈال دینے کی استطاعت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

یہاں تک تصورِ نبوت و وحی کے منطقی لوازم کا تذکرہ تھا اور بحث و نظر کا اسلوب عموم و اجمال لیے ہوئے تھا۔ اب ہمیں ذرا تفصیلات سے تعرض کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اہل کتاب نے وحی و نبوت کے ظہور کو کس نظریے سے دیکھا اور اسلام نے اس کو کیونکر نکھارا اور واضح کیا۔ اس کے بارے میں کس کس غلط فہمی کو دور کیا اور کیوں کر خیوضِ ربوبیت کی اس روشنی میں اس کو تکمیل و اتمام کی منزلوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وحی و نبوت کے مسئلے میں اختلاف کے کئی پہلو ہیں، اور اس کے باوجود یہودی، عیسائی اور مسلمان بظاہر سب انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصورِ نبوت مشترکہ مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ ذوق و ادراک کے فرق، اغراض و مقاصد کی بوقلمونی اور تاریخ کی ستم ظریفیوں نے اس اشتراک میں متعدد رخنے ڈال رکھے ہیں۔

سب سے پہلے انبیاء کی فہرست ہی پر نظر ڈالیے، اس میں ایسے نام نظر آئیں گے جو ایک گروہ کے ہاں خاصے جانے بوجھے اور معروف ہیں تو دوسرا گروہ ان سے قطعی ناآشنا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم نے حضرت ہود، صالح، شعیب اور ذوالکفل کا پیغمبر کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اسرائیلی ادبیات میں ان اسما سے وقوف و شناسائی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اسی طرح عہد نامہ قدیم میں اشعیا کا نام آتا ہے، جس نے ۷۶۹ - ۶۹۳ ق م اپنے کو پیغمبر کے نام سے پیش کیا۔ سارمیا کا ذکر ہوا ہے جس نے شاہ یوشی یاہ کے عہد میں فرائضِ نبوت انجام دیے اور بارُوک نامی شخص کی تعلیمات جزو کتاب بنی ہیں، جو پہلے ارمیا کا کاتب تھا اور پھر منصب نبوت کا اہل سمجھا گیا۔ یہ اور اس نوع کے کئی نام اور ہیں جن سے اسلامی روایات کوئی جان پہچان نہیں رکھتیں۔ ناموں کے اختلاف کے علاوہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت و جوہر سے متعلق بھی فکر و عقیدہ کا انداز ایک سا نہیں ہے تو اس سے اس مظہر اصلاح و ہدایت کے لئے کوئی مشترکہ اساس رشتہ اور خصوصیت کا تعین از حد دشوار ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کے حدود کو وسیع تر کرنے میں بنی اسرائیل کی اس بدقسمتی کو بڑا دخل ہے کہ ان کے ہاں شروع ہی سے وحی و نبوت کی پہچان اور تصدیق کے لئے کوئی واضح اور اونچا داخلی یا خارجی پیمانہ پایا نہیں جاتا، جس کی وجہ سے اس عظیم منصب کے تقدس کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔

ہوا یہ کہ سقوطِ فلسطین کے بعد یہودیوں کے نقطۂ نظر میں ایک خوفناک تبدیلی نے کروٹ لی۔ جب اس پر اجنبی اقتدار کی گرفت سخت ہو گئی اور ان کو اپنے قدیم ماحول اور گرد و پیش سے نکل کر دوسری قوموں اور گروہوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈالنا پڑا۔ اس سے ان کے

قومی پندار و غرور کو سخت دھچکا لگا اور ان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار پایا کہ اپنی تمام تر کوششوں کو فلسطین کی بازیابی کے مسئلے پر مرکوز کر دیں اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ نبوت و وحی کے کردار و عظمت کی سمتیں بدل گئیں۔

جہاں ابراہیم، داؤد اور حضرت موسیٰ ایسی بلند پایہ شخصیتیں اپنی غیر معمولی بصیرت و ادراک، اپنے سیاسی تدبر و شکوہ اور اپنے پیغام کی رفعتوں کی بدولت پیغمبر کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں، وہاں ایسے لوگوں کو بھی اقلیم نبوت میں در آنے کا موقع ملا جن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے اسرائیل کے قومی پندار کو اجاگر کیا، حادثہ فلسطین پر نوحے ترتیب دیے اور فلسطین کے اقتدار کو بحال کرنے کی پیش گوئیاں کیں۔ فلسطین کی شکست اور اجنبی اقتدار و تسلط کے مسئلے نے یہودیوں کو اس درجہ دیوانہ کر دیا کہ یہ مذہب کی روح کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور مخالفین کے خلاف معاندانہ جذبات نے ان سے دینی بصیرت کو اس حد تک چھین لیا کہ جس نے بھی ان کی قومیت کو ابھارا اور فتح و نصرت کے وعدوں کا اعادہ کیا، فلسطین پر دوبارہ قبضے کی پیش گوئی کی، بغیر سوچے سمجھے اس کو نبوت کی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ چاہے اس کے نوحوں، نعروں اور وعدوں میں کوئی جان نہ ہو، کوئی روحانی پیغام نہ ہو اور کسی معاشرتی مسئلے کا حل نہ پایا جائے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے اس کے کردار و عمل کے دامن پر فسق و فجور کے شرمناک چھینٹے نمایاں ہوں۔ یہودیوں میں یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ انبیاء کی فہرست میں چار سو حضرات ایسے پائے گئے ہیں جن کی پیش گوئیاں پوری نہ ہوئیں اور اس بنا پر انھیں جھوٹے نبی کے نام سے پکارا گیا۔

نبوت کے اس غلط تصور سے دو واضح نقصان پہنچے، ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے مکالمہ و مخاطبہ کا یہ اسلوب و منہاج بدنام ہوا اور نبوت، وحی و تنزیل کی بلندیوں سے گر کر کہانت کی سطحوں تک آپہنچی۔ دوسرے یہودیت ایک عالم گیر اور روحانی و اخلاقی دعوت و پیغام ہونے کے بجائے تنگ نظرانہ قومیت کی علم بردار بن گئی، اور لطف یہ ہے کہ یہودی متکلمین اور حکما کی کوششوں کے باوجود آج بھی مذاہب عالم کی برادری میں یہودیت کا شمار ایک ایسے مذہب ہی کی حیثیت سے ہوتا ہے جس کی حدود نسل اور جغرافیہ کے تقاضوں سے آگے نہیں بڑھ پائیں۔

نبوّت کی اس روایت سے کلیسا کا انحراف

غالباً تصور کی اس پستی کا یہ ردعمل تھا کہ کلیسا نے مسیح کو خدا یا لاہوت کے ایک اقنوم کی شکل میں پیش کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہودی روایات میں نبوت کا منصب حد درجہ پستی لیے ہوئے ہے تو اسے یہ شایانِ شان نہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب پیر و مرشد کو پیغمبر کے روپ میں دکھائے۔ اس نے اس طرح ہزاروں برس اس رچی جمی روایت سے انحراف اختیار کیا۔ اول اول اس تصور کی تخم ریزی یوحنا کی انجیل نے کی، پال نے فلو (PHILO) کے رنگ میں اسے فلسفہ کا رنگ دیا اور کلیسا نے اس مصرع طرح پہ تثلیث کی پوری غزل کہہ دی اور کہا کہ جب خداوند خدا نے دیکھا کہ اس مظہر خاص سے جسے منصب نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کی اصلاح و تکمیل کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ یعنی گلستانِ انسانیت کی دیکھ بھال کا کام پوری طرح نہیں ہو پاتا تو خداوند مسیح کی صورت میں جلوہ گر ہوا تاکہ اس گلستان کی خود حفاظت و نگرانی کر سکے۔

یہ انجیل کے رنگ میں ایک تمثیل اور پیرایۂ بیان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ پیغمبر بھیجنے کی جو رسم ہزاروں برس سے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر چلی آ رہی تھی، نتائج کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی، اس لیے اب اسے نئے تجربے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ذاتِ گرامی جس نے پیغمبر اور نبی بھیجے تھے بنفسِ نفیس انسان کے روپ میں خود دنیا میں آئے اور انسانی مصائب آلام

کا مداوا کرے۔

بحث و تحقیق کے اس موڑ پر ہم یہ سوال پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ کیا اس عجیب و غریب تجربے کی ناکامی کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا اور کیا اظہارِ ذات کے اس تجربے سے انسان کے شخصی و اجتماعی آلام کا قطعی خاتمہ ہو گیا ہے اور انسان نے تمام انواع کے دکھ درد سے نجات پالی ہے؟ کلیسا کے اس تصور کو اظہارِ ذات (SELF DISCLOSURE) یا تجسیم (INCARNATION) کے الفاظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے لاہوت تین اقانیم پر مشتمل ایک حقیقت کا نام ہے، جو باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں اور ان میں رابطہ و تعلق کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ تین ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں اور ایک ہوتے ہوئے بھی تین ہیں۔ ہم تثلیث کی منطق کو چیلنج کیے بغیر یہ کہیں گے کہ عقائد کا یہ اسلوب کلیسا کے حلقوں میں تو بلاشبہ سندِ قبول حاصل کر سکتا ہے کہ یہاں اس کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی انوکھی باتیں ہیں جنھیں باور کیا جاتا ہے، مگر جہاں تک مسیح کے ان مخاطبین کا تعلق ہے جن کی اصلاح و ہدایت کے لیے یہ مبعوث ہوئے ان میں اتنی استعداد ہرگز نہ تھی کہ وہ اس مابعد الطبیعی گورکھ دھندے کو سمجھ سکیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ آج کا پختہ اور سائنسی شعور و ادراک بھی اس گورکھ دھندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے عیسائی دانشوروں نے اس کی ایسی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو قابلِ فہم ہوں۔ ایل ہاڈگاسن (L.H ODGOSON) کا کہنا ہے کہ مسیح کی تجسیم یا الوہیت کے پیکرِ بشری میں ظہور کی تین صورتیں عقل و خرد کی گرفت میں آسکتی ہیں:

۱- یہ کہ انسان نے اللہ کے علمِ کل میں مسلسل مشارکت کی ہو۔ تعبیر کے اس انداز کو اختیار کرنے میں یہ احتمال پنہاں ہے کہ شاید اس کو عیسائیوں کا کوئی بھی مدرسۂ فکر قبول نہ کر سکے، کیونکہ یہ اس عقیدے کے خلاف ہے جو لوقا کی انجیل میں درج ہے کہ ہمارا لارڈ صحیح معنوں میں انسان یا بشر کامل تھا۔

۲- یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا لارڈ (ناقابلِ فہم طریق سے) علم کی اس نوعیت سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن انسان کے روپ میں جلوہ گر ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح علم کی اس نوعیت کا اظہار نہ کر سکا۔ یہ دراصل اناجیل میں ان مختلف فقرات کی تطبیق و توافق کی ایک شکل ہے، جن سے کہیں اس کی الوہیت کی طرف اشارہ ہے اور کہیں اس کی بشریت کی طرف۔

۳- یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حدودِ تجسیم میں داخل ہونے کے معنی بشری تجربے سے دوچار ہونے کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح جب تک بشری روپ میں ہے اس وقت تک وہ جسم و روح اور فکر و نفسیات کے اعتبار سے بشر ہی ہے[1]۔

یہ اندازِ فکر تو اس دَور کے عیسائی متکلمین کا ہے۔ خود قدیم عیسائی متکلمین بھی تجسیم اور تثلیث کو مان کر مسیح کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ عالمِ لاہوت میں ان کا مقام کیا ہے اور تجسیم اپنے جلو میں خدائی کے کن پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے۔ جسٹن (JUSTIN.) کی یہ رائے ہے کہ تجسیم کے یہ معنی ہیں کہ مسیح کی ذات میں عقل و خرد مرکوز ہو گئی ہے، اور اس میں وہ مسیح کو منفرد نہیں مانتا بلکہ عقل و خرد

---

[1] اے نیو کومینٹری آن ہولی سکرپچر مطبوعہ لندن حصہ دوم صفحہ ۳۰۔

کے اس ارتکاز کو سقراط، افلاطون اور ہیراکلیٹس میں بھی تسلیم کرتا ہے کیونکہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ کلمہ (LOGOS) کا مسکن و محل بلفرق مراتب ہر شخص کا ذہن ہے۔

اسکندریہ کے مدرسۂ فکر کے بہت بڑے نقیب کلیمنٹ (CLEMENT) کا کہنا ہے کہ مبدأ اوّل زمان و مکاں سے بالا و منزہ ہے اس کا کوئی حقیقی نام نہیں، یہ تعداد و عدد سے بھی پاک ہے۔ انسان اپنی نیکی کی وجہ سے بیٹے (یعنی مسیح) کی طرح ہو سکتا ہے لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ کلیمنٹ کے نزدیک بیٹے اور باپ میں فرق ہے، بیٹا کلمہ کی تجسیم ہے اور باپ بیٹے سے بہر حال بڑا ہے۔ اسی اسکندری فلسفہ کے دوسرے عظیم شارح آریگن (ORIGEN) ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ سرچشمہ وجود اور خالص روح ہے اور بیٹا اگرچہ خدائی صفات بھی رکھتا ہے مگر خدا ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ براہِ راست مسیح کے آگے دستِ دعا دراز کیا جائے۔ دعا اس کے نزدیک صرف خدا سے ہی مانگنی چاہیے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یوحنا کے ابہام اور پال کی تصریحات سے کلیسا نے جو مسیح کی الوہیت کا عقیدہ گھڑا وہ محض علم و فضل کا تصنع ہے، ورنہ کلمہ، روح اور بیٹے کا لفظ محض تعبیر و تشریح کا ایک انداز ہے جس میں اس دور کے ذہنی و فکری پس منظر کی جھلک نمایاں ہے اور اس پس منظر کا تانا بانا کئی عوامل سے تیار ہوا ہے، جن میں ایک عیسائیت کا رومی علم الاصنام سے آشنا ہونا ہے اور دوسرا اس میں ان پڑھے لکھے یہودیوں کا داخلہ ہے جو (PHILO) کے حکیمانہ افکار سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عیسائیت کی تعبیر ان افکار کی روشنی میں کی جائے۔ تیسرا عامل بائیبل کی ذو معنی زبان اور محاورات ہیں، ان سب عوامل نے مل جل کر تثلیث و تجسیم کا مرقع تیار کیا اور ماحول کی مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر اگر ان تصورات کا تجزیہ کیا جائے جو کلیسا کی روایتی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہیں تو اس کا مطلب اس سے زیادہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مسیحؑ کے عقیدت مند ان کو بائیبل میں مذکورہ انبیاءؑ کے مقابلے میں زیادہ اونچا، زیادہ بلند اور کامل دیکھنے کے آرزومند ہیں اور کیوں نہ ہو جب یہودی روایات میں نبوت و رسالت کا منصبِ عظیم محض قومی تنگ نظری کا مظہر بن جائے اور پیغمبر کا مصرف صرف یہ رہ جائے کہ فلسطین کی بازیابی کی پیش گوئی کرے تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے ایسے اطلاق کی تلاش کی جائے جو نسبتاً وسیع اور عالمگیر ہو اور اس لائق ہو کہ انسانیت اس سے سکون حاصل کر سکے۔

سیرتِ رسولؐ قرآن کی روشنی میں

مولانا عبدالماجد دریابادی

ظہور کی پیش خبریاں

ظہورِ مبارک کا واقعہ دنیا کے لیے بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر نہیں پیش آگیا۔ اہلِ کتاب یعنی یہود اور نصرانی دونوں ایک موعود کے انتظار میں صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ اور قرآن مجید نے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے تو اس ظہورِ مبارک کے لیے دعا صراحت سے نقل کی ہے۔ یہ دعا تنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نہ تھی، ایک مبارک وقت جگہ دو مقدس بندوں کی زبان سے مل کر نکلی تھی اور اس میں حضرت ابراہیمؑ کے شریک ان کے فرزند حضرت اسماعیل بھی تھے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ اٹھا رہے تھے دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسماعیل بھی۔

مقام اتنا مقدس کہ خانہ کعبہ کا فرش وقت اتنا مبارک، کہ عین تعمیر خانہ کعبہ کا زمانہ اور دعا کرنے والے (اللہ کے دو مقبول ترین اور انتہائی برگزیدہ بندے) دعا سب سے پہلے اس کی کہ ہماری یہ خدمت قبول ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم سے ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک تو تو خوب سننے والا۔ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس تمہید کے بعد عرضِ حال میں پہلی گذارش تو یہ تھی کہ ہمیں اور زیادہ توفیق طاعت و اطاعت ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم سے ہماری خدمت فرمانبردار بنالے۔

اور پھر معاً بعد یہ آرزو کہ ہماری نسل سے ایک امتِ مسلمہ، ایک فرمانبردار قوم،

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اور ہماری نسل سے ایک امت بھی پیدا کر جو تیری فرماں بردار ہو۔

خیال کر کے سنیئے کہ قید "ہماری نسل" کی لگائی جا رہی ہے یعنی وہ نسل ابراہیمیؑ جو حضرت اسمٰعیلؑ کے واسطہ سے ہو۔ قید لگتے ہی بنی اسحٰق سب نکل گئے اور امتِ مسلمہ بنی اسمٰعیل میں محدود ہوگئی یہ تو ہوئی امت اور اس کا رسول کون اور کیسا ہو؟ سماعت فرمائیے:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔
(البقرة، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! انھیں لوگوں یعنی بنی اسمٰعیل کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں انھیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب (الٰہی) اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی اصلاح نفس کرے، بے شک غالب اور حکمت والا تو تُو ہی ہے۔

اور پھر اپنے وقت پر جب یہ رسُول ظاہر ہو چکا تو اس کا وصف اُس کے دوسرے اوصاف کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا کہ اس کا ظہور مکہ والوں کے درمیان ہُوا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔
(الجمعة، ع ۱)

وُہ اللہ وہی ہے جس نے اُمّ القریٰ کے رہنے والوں کے درمیان ایک رسول اٹھایا جو انھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی اصلاح نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب (الٰہی) اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کی دُعاؤں کا ذکر ہو چکا، قرآن مجید سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ اس ظہور اقدس و مطہر کی پیش خبریاں اگلے آسمانی صحیفوں میں آچکی ہیں یہ ذکر قرآن نے کہیں تو ضمناً اور بالواسطہ کیا ہے۔ یعنی صرف کتاب کا ذکر کر کے اشارہ کتاب لانے والے کی طرف بھی کر دیا مثلاً:

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ۔
(الشعراء، ع ۱۱)

اس کا ذکر یا اس کی خبر اگلے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

اور کہیں یہ ذکر براہِ راست اور مستقلاً کیا ہے۔ اور ایسے موقع پر رسُولؐ کے اوصاف امتیاز خصوصی کو بھی گنا دیا ہے۔ مثلاً:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
(الاعراف۔ ع ۲۰)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں۔ اُس اُمّی رسولؐ ونبی کی جس کو (یعنی جس کے وصف کو) وہ لکھا ہُوا پاتے ہیں، اپنے ہاں توریت اور انجیل میں وہ حکم دیتا ہے اُنھیں نیک کرداری کا اور روکتا ہے اُنھیں بدکرداری سے اور پاکیزہ چیزیں اُن کے لیے جائز بناتا ہے، اور گندی چیزیں اُن پر حرام رکھتا ہے اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جواب تک تھیں اُتارتا ہے۔

يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ یعنی ان رسُولؐ کے اوصاف و علامات یہ اہل کتاب اپنے ہاں توریت و

انجیل میں درج پاتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ اعلانیہ کر دیا اور معاصر اہل کتاب میں سے کسی کو اس سے انکار کی جرأت نہ ہوئی ورنہ جہاں اور الزامات سرورِ کائنات اور آپؐ کی وحی پر رکھ رہے تھے وہاں ایک اس الزام کا بھی اضافہ کر دیتے کہ توریت و انجیل میں کہاں ایسے رسولؐ کے ظہور کا پتہ نشان ملتا ہے ؟

توریت میں جتنے تصرفات و تحریفات اب تک ہو چکے ہیں، ان کے بعد یہ دعویٰ خود اہل توریت کا بھی باقی نہیں رہا ہے کہ یہ کتاب وحی لفظی کا نمونہ ہے لیکن اتنی تصحیف و تحریف کے بعد بھی کچھ تو حوالے اس میں اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے :-

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی طرف کان دھریو" (استثنا ۱۸ - ۱۵)

"تیرے ہی بھائی" یعنی اسرائیل کے بھائی سوا بنی اسمٰعیل کے اور کون ہو سکتے ہیں! پھر ان اسمٰعیلیوں میں ایسا نبی جو "میرے ہی مانند" یعنی مشابہت حضرت موسیٰ سے رکھنے والا ہو۔ بجز ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اور کون ہوا ہے ؟

اور پھر توریت کے اس صحیفہ استثنا کی اسی فصل میں دو ہی تین آیتوں کے بعد ہے ،

"اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا۔ اچھا کیا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" (ایضاً ۱۸)

اسرائیل کے بھائیوں یعنی اسمٰعیلیوں کا ذکر اس آیت میں بھی اور "تجھ سا" یعنی موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت رکھنے والے کی تعیین یہاں بھی اور پھر آخری فقرہ کی تصریح کہ "اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالوں گا"، صاف اس کا مرادف کہ اس کا پیام وحی لفظی کا مجموعہ ہوگا اور یہ وحی لفظی کا دعوےٰ بجز قرآن مجید کے روئے زمین پر آج کس کتاب اور کس پیام کے لیے ہے ؟

توریت کے بعد اب انجیل پر آیئے۔ اس میں "ترجمہ اور ترجمہ" در ترجمہ کی بناء پر اصلاح ترمیم اور تبدیلی کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور وہ بھی چرا کر چھپا کر نہیں بلکہ علانیہ و فخریہ لیکن اس سارے کاروبار کے باوجود اس میں بھی یہ لفظ آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔ یہ حضرت مسیح اسرائیلیوں سے فرما رہے ہیں :-

"یسوع نے ان سے کہا۔ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے، اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے، مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا" (متی - ۲۱ : ۴۲ - ۴۴)

"کتاب مقدس کا" جو فقرہ یہاں نقل ہوا ہے اور انجیل مرقس ۱۲ : ۱۰-۱۱ اور انجیل، لوقا ۲۰ : ۱۸ میں بھی وہ دراصل داؤدنبی کی کتاب زبور کا ۱۱۸ : ۲۲۱ کا ہے معماروں یعنی اسرائیلیوں نے جس پتھر کو ہمیشہ رد کیا تھا وہ اسمٰعیلی ہی تھے کونے کے سرے کا جو پتھر ہوا۔ یعنی نبوت جس کو سب سے آخر زمانہ میں ملی وہ بنی اسماعیل ہی کا ایک فرد تھا اور یہود و نصرانی جو بھی اس سے ٹکرائے ۔ وہ پاش پاش ہو کر رہ گئے یا پس کر رہ گئے۔

توریت اور انجیل میں حوالے اور بھی ملتے ہیں ان سب کی یہاں سماعت فرمانے کے بجائے انھیں تفسیر ماجدی میں ملاحظہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔ قرآن مجید نے حضرت مسیح کی زبان سے ایک اور پیش خبری کا حوالہ صراحت کے ساتھ دیا ہے اس لیے اسے تو ہر حال سُنتے چلیے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (الصف ، ع ۱)

اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے اسرائیلیو! میں تمہارے پاس اللہ کا پیمبر آیا ہوں ۔ تصدیق کرنے والا توریت کی، جو مجھ سے پیشتر سے ہے ۔ اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمدؐ ہوگا، پھر جب وہ ان کے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے تو یہ بولے کہ یہ تو صریح جادو ہے ۔

قرآن مجید نے جس قول کی جانب اشارہ کیا ہے وہ موجودہ محرف انجیل سے بھی تمام تر محو نہ ہو سکا ، بلکہ اس کے حوالے ایک نہیں تین تین جگہ آج تک موجود ہیں ملاحظہ ہوں ۔

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار (یا وکیل یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے"

(یوحنا ، ۱۴ : ۱۶)

"جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا" میں صاف اشارہ موجود ہے ۔ اس کی شریعت دائمی ہوگی دوسری جگہ ہے ۔

" جب وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا ، یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا ، ۱۵ : ۲۶)

اور تیسری مرتبہ :

"اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارہ میں قصور وار ٹھہرائے گا " (یوحنا ۔ ۱۶ : ۷، ۸)

یہ عبارتیں جو پڑھ کر سنائی گئیں۔ اردو بائبل کی تھیں اور بائبل کے اُردو مترجمین نے متن میں لفظ مددگار اور حاشیہ پر "وکیل" اور "شفیع" دیئے ہیں اور انگریزی بائبل میں جو پروٹسٹنٹ فرقہ کی ترجمان ہے اس کے لیے

لفظ COMFATEN آیا ہے یعنی تسلی دہندہ اور جو انگریزی بائبل عقیدہ کیتھولک کے مطابق ہے اس میں ان مرقوں پر لفظ PANACLELE درج ہے۔ ہمارے یہاں کے فاضلوں کا بیان ہے کہ جس یونانی لفظ کے لیے "مددگار" لاتے ہیں کبھی "وکیل" کبھی "شفیع" کبھی "تسلی دہندہ" اور کبھی PRAELETE وہ اصل میں PERICLYTS ہے جو صحیح ترجمہ لفظ احمد، یعنی محمود (ستودہ) کا ہے۔

غرض یہ کہ جو توحیدی قومیں آغاز اسلام کے وقت دنیا میں موجود تھیں اور جو سلسلہ نبوت و وحی کی قائل تھیں ان کے مقدس، نوشتوں میں پیش خبریاں شروع ہی سے ایک اسماعیلی نبی کی چلی آ رہی تھیں۔ جس کی شریعت دائمی ہو گی یعنی وہ سلسلہ انبیاءٔ کا خاتم بھی ہو گا۔

فضائل، خصائص، مشاغل

قرآن مجید سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ مصطفےٰ صلعم کوئی فوق البشر یا فرشتہ وغیرہ نہ تھے، بلکہ محض بشر تھے، جیسے دنیا میں بشر ہوا کرتے ہیں اور خود آپؐ کی زبان سے دو دو بار کہلایا گیا ہے کہ:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ — آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تو محض ایک بشر ہوں تم ہی جیسا

ایک بار سورۃ الکہف کے رکوع ۱۲ میں اور دوسری بار سورۂ حم السجدہ کے رکوع اول میں اور یہ بھی کہ آپؐ کوئی انوکھے پیغمبر ہو کر دنیا میں نہیں آئے تھے، بلکہ آپؐ سے پیشتر بہت سے انبیاء و مرسلین آچکے تھے اور آپ بس انھیں میں کے ایک فرد تھے۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ (البقرۃ، ع ۳۳) — بے شک ان بھیجے ہوؤں میں سے ایک آپؐ ہیں۔

فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ (النمل، ع ۷) — آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تو بس ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ (آل عمران، ع ۱۵) — محمدؐ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک رسولؐ ہیں اور ان کے قبل بہت سے رسولؐ گذر ہی چکے ہیں۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (یونس، ع ۱) — کیا لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک آدمی پر وحی بھیج دی کہ لوگوں کو ڈرائیے بھی (ہمارے عذاب سے) اور مومنوں کو خوشخبری بھی پہنچائیے۔

اور خود آپؐ کی زبان سے یہ کہلایا گیا:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ۔ (الاحقاف، ع ۱) — آپؐ کہہ دیجئے کہ رسولوں میں میں کوئی انوکھا رسولؐ تو نہیں ہوا۔

اور ساتھ ہی آپؐ کی بے اختیاری بھی ان الفاظ میں کہلا دی گئی۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ (الاحقاف، ع: ۱)

میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کیا معاملہ میرے ساتھ پیش آئے گا اور کیا تمہارے ساتھ۔

بلکہ یہاں تک بھی، کہ

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ (یونس، ع ۵)

آپؐ کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے تو کسی ضرر اور کسی نفع کا اختیار ہی نہیں رکھتا، مگر جتنا اللہ کو منظور ہو۔

اور آیت کا یہی ٹکڑا ایک برائے نام لفظی اختلاف کے ساتھ سورۂ الاعراف رکوع ۲۳ میں بھی ملتا ہے۔

اور وقت قیامت کے علم کی بھی نفی آپؐ کی ذات سے کرائی گئی ہے باوجود اس کے کہ وقوع قیامت کا ذکر بڑی شدومد کے ساتھ آپؐ کی زبان سے سنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ۔ (الاعراف، ع: ۲۳)

یہ لوگ آپؐ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کب واقع ہوگی۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ اس کا علم صرف میرے پروردگار ہی کے پاس ہے اس کے وقت پر سوا اللہ کے کوئی اس کو ظاہر نہ کرے گا۔

بلکہ آپؐ کی غیب دانی اور آپؐ کی مالکیت خزائن الٰہی اور آپؐ کی ملکیت اس سب کی نفی پر تصریح آپؐ کی زبان سے کرادی گئی۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ (الانعام، ع ۵)

آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ (کی سرکار) کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ اور نہ یہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اسی حکم پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ دنیوی علوم و معارف سے بھی یکسر آپؐ کی ناشناسی ظاہر کر دی گئی۔ حالانکہ جس عہد میں آپؐ کا ظہور ہوا تھا اس وقت تک بابل، چین، ایران، مصر، ہندوستان، یونان، روما، سب کہیں علوم و فنون خوب اپنا زور دکھا چکے تھے، اور بڑے بڑے شاعر اور ادیب، مؤرخ اور مہندس، حکیم اور فلسفی، کرۂ ارض کے طول و عرض میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے، اور علوم و فنون الگ رہے۔ قرآن مجید نے تو آپؐ کی اُمیّت یا حرف ناشناسی کی بھی صاف و صریح گواہی دی ہے۔

وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ۔ (عنکبوت، ع: ۵)

اور اس قرآن کے نزول سے پہلے آپؐ نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھ سکتے تھے۔

اور پھر کہا ہے :

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (الجمعہ، ع ۱:)

وہ اللہ وہی ہے جس نے اُمّیوں کے درمیان انھیں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔

اور پھر سورۂ الاعراف میں قریب ہی قریب دو دو جگہ آپؐ کے نبی اُمّیؐ ہونے کا اعلان اسی طرح ہے کہ گویا النبی الامی آپؐ کا علم ہے۔

رکوع ۱۸ میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ۔

جو لوگ پیروی کرتے ہیں رسُول نبی اُمّی کی۔

اور ساتھ ہی ساتھ جا بجا تنبیہیں بھی ہیں۔ جیسی کہ خالق اپنی محبوب ترین و مکرم ترین مخلوق سے ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ موقع جہاد پر بعض صحابیوں کے پیچھے رہ جانے کے سیاق میں ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا۔ (التوبہ۔ ع ۷:)

اللہ آپ کو معاف کرے۔ آپؐ نے اُنھیں کیوں اجازت دے دی۔ آپ کو رُکنا تھا جب تک اُن لوگوں کا سچا ہونا آپ کو معلوم ہو جاتا۔

اسی طرح ایک واقعہ خیانت کے سلسلہ میں۔

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ۔ (النساء، ع ۱۶:)

اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں اور اللہ سے استغفار کریں۔

اور اسی کے بعد۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔

آپ ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کیجیے جو اپنی جانوں میں خیانت کرتے ہیں۔

یا ایک مرتبہ جنگ کے قیدیوں کے باب میں۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ۔ (الانفال، ع ۱۹:)

نبی کی شان کے لائق نہ تھا کہ ان کے پاس قیدی رہتے جب تک کہ وہ نبی زمین پر اچھی خونریزی نہ کر لیتے۔

یا بعض مشرکوں کے لیے استغفار کے سلسلہ میں:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔ (التوبہ۔ ع ۱۴:)

نبی اور مومنین کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ مشرکوں کی مغفرت کی دُعا کرتے خواہ وہ اُن کے قرابت دار ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ جب کہ اُن پر ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ لوگ دوزخی ہیں۔

یا پھر اسی طرح ایک محبوب و مقبول صحابی حضرت زید کی مطلقہ بیوی کے بیان میں۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ۔ (الاحزاب ع ۵)

اور اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف سے اندیشہ کرتے تھے درآنحالیکہ اللہ ہی اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔

یا ایک اور سلسلہ میں جب کہ آپ نے ایک نابینا صحابی پر توجہ کرنے کے بجائے فوری توجہ اشراف قریش کی طرف کردی تھی جن پر آپ تبلیغ دین کر رہے تھے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى (عبس)

پیمبر چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا اس بات پر کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور ہی جاتا۔

تو یہ چند مقامات تھے جہاں کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو ۲۳ سال کی نہایت درجہ مصروف و مشغول پیمبرانہ زندگی میں تنبیہات بھی ملی ہیں لیکن دوسری طرف فضائل اسی کثرت سے وارد ہوئے ہیں اور آپ کے پیمبرانہ خصائص و فرائض کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان پر حیرت ہی ہو کر رہتی ہے اور قرآن کا ہر بے تعصب اور انصاف پسند طالب علم یہ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ ایسی پاکیزہ، بے نفس اور جامع اخلاق زندگی بے شک اس قابل تھی کہ اسے ساری نوع انسانی کے سامنے بطور نمونہ و نظیر کے پیش کیا جائے۔

اس سلسلہ بیان کو شروع اس جامع آیت سے کیجئے جس میں خطاب یا تو عام نوع بشر سے اور یا قوم عرب سے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ، ع ۱۶)

بے شک آگئے ہیں تمہارے پاس ایک پیغمبر تمہیں میں سے گراں گزرتی ان پر ہر چیز جس سے تم تکلیف پاؤ، وہ حریص ہیں تمہارے اوپر اور ایمان والوں پر تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔

آیت میں اگر جمہور کی قرأت سے ساتھ اَنْفُسِكُمْ پڑھئے تو مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ وہ کوئی اجنبی نہیں کسی غیر جنس کی مخلوق نہیں تمہارے آپس کے ہیں اور تم ہی جیسے ہیں۔ ان سے مغایرت اور نامانوسیت کا کوئی محل نہیں۔

اور اگر اَنْفَسِكُمْ (بہ فتحہ فا) پڑھا جائے کہ وہ بھی ایک قرأت متواترہ ہے تو معنی یہ نکلیں گے کہ وہ تمہارے بہترین اور نفیس ترین میں سے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر انسانی تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے وہ اس سے انسان کو رہائی دلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انسانوں کے حق میں اپنی فرط شفقت سے حریص ہیں۔ اپنی اُمت کے حق میں وہ تو ان دو صفات کے مالک ہیں جو اللہ اپنے بندوں سے متعلق رکھتا ہے یعنی رافت و رحمت اور اُمت کے حق میں اُن کی شفقت و دلسوزی بے پایاں ہے۔

آپ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا ایک احسانِ عظیم ہے اور آپ کے فرائض و مشاغل خود اس پر دلیل کا کام دیتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (آلِ عمران، ع : ۱۷)

اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا ہے جو ان کے درمیان ایک رسولؐ بھیجا انھیں میں سے، جو، انھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی اور گو وہ اس سے قبل صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

آیت سے جہاں ایک طرف رسولؐ کا درجہ و مرتبہ عنداللہ معلوم ہوا کہ اللہ نے آپؐ کی بعثت کو اپنے احسان سے تعبیر کیا ہے وہیں آپؐ کے روزانہ مشاغل پر بھی اس سے روشنی پڑگئی اور یہ معلوم ہوگیا کہ آپؐ اُمّت تک قرآن مجید نہ صرف پہنچاتے تھے بلکہ اس کی تعلیم دیتے اور شرح کرتے رہتے اور تزکیہ نفس کے کام میں لگے رہتے یعنی اصلاح ظاہری اصلاح باطنی دونوں میں۔

اس سے ملتا ہوا مضمون ایک دوسری آیت کا بھی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الجمعۃ، ع : ۱)

وہ اللہ وہی ہے جس نے اُمیّوں کے درمیان ایک رسول بھیجا انھیں میں سے جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں سنوارتا ہے اور اُنھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ (لوگ) اس سے قبل صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

مشاغل روزانہ اور فرائض نبوی کا عکس اس آیت میں بھی نظر آجاتا ہے۔

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ، ع : ۱۵)

جیسا کہ ہم نے بھیجا تمھارے درمیان ایک رسول تمھیں میں سے جو تمھیں پڑھ کر سناتا ہے، ہماری آیتیں، اور تمھیں سنوارتا ہے اور تمھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی اور وہ سکھاتا ہے۔ وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔

قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کا ذکر تو مستقلاً آ ہی چکا۔ آیاتِ قرآنی نے تصریح کر دی کہ اس کے اور تزکیہ نفوس کے علاوہ آپ حکمت اور ایسی باتوں کی بھی تعلیم دیتے تھے جو اس وقت تک اُمت کے دائرہ علم میں نہ تھیں اور اس سے یہ صاف معلوم ہوگیا کہ آپ الفاظ قرآنی سے قطع نظر خود بھی تعلیم و تربیت فرمایا کرتے تھے اور نظری و عملی حیثیت سے وہ رہنمائی اپنی قوم کی کرتے جو اب تک اس کی دماغ کی رسائی سے باہر تھی۔

اور آپ کی بعثت کی غرض و غایت تو بہت صاف ارشاد ہوگئی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء، ع : ۷) ہم نے آپ کو بھیجا ہی ہے رحمت بنا کر جہانوں کے لیے۔

یعنی آپ تو سبب رحمت ہی ہیں۔ کُل جہان والوں کے لیے۔

آپؐ کی اطاعت مخلوق پر واجب ہی نہیں بلکہ مرادف ہے اطاعت الٰہی کے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء، ع : ۱۱)

جس نے اطاعت کی رسولؐ کی اس نے عین اطاعت کی اللہ کی۔

اور یہ جب ہی ممکن ہے جب آپ کا ہر خطا و لغزش سے معصوم و ماوراء ہونا پہلے تسلیم کر لیا جائے۔ ورنہ غیر معصوم سے تو ہمیشہ احتمال رہے گا کہ فلاں معاملہ میں اس سے لغزش مرضیات حق کی ترجمانی میں ہو گئی ہو اور اطاعت رسول کی تاکید کرنے والی آیتیں ایک نہیں متعدد ہیں بعض بالواسطہ اور اکثر براہِ راست۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (الحشر، ع : ۲)

اور رسول جو کچھ تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمھیں روک دیں اس سے رُک جاؤ۔

اور اس اخذ و منع میں رسولؐ کے سارے احکام مثبت و منفی آ گئے۔ ساتھ ہی کلی اور مجموعی طور پر یہ بھی بتا دیا گیا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب، ع : ۳)

بے شک تمھارے لیے رسول اللہؐ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے۔

اس لیے قدرتاً آپ کا ہر قول و عمل اُمت کے لیے واجب التقلید ہے، تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی تصریح نہ ہو۔ اب وہ آیتیں بھی ملاحظہ ہوں جن میں اطاعتِ رسولؐ کا حکم براہِ راست موجود ہے۔ اطاعتِ الٰہی پر عطف ہو کر سورۂ آل عمران ع ۴ میں ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔

آپ کہہ دیجیے کہ اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی۔

اور اسی سورت کے رکوع ۱۴ میں لفظ قُلْ حذف کر کے ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

اور اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی۔

سورۃ النساء، رکوع ۸ میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔

اسی کے متصل اطاعت اولوالامر کا بھی حکم ہے۔ لیکن معاً بعد یہ بھی ارشاد ہو گیا ہے کہ:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اگر تمھارے آپس میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو حوالہ کر دیا کرو اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف

خوب خیال کر لیا جائے۔ اپیل کی عدالت صرف بارگاہِ خداوندی نہیں دربارِ رسولؐ بھی ہے اور اس سے بڑھ کر

کسی مخلوق کا اعزاز خالق کے یہاں کس طریقہ پر ظاہر کیا جا سکتا ہے ؟ اور اطاعت رسول والے وہی الفاظ جو ایک منٹ قبل سورۃ النسآء سے نقل کئے جا چکے ہیں۔ ایک بار پھر سورہ محمدؐ رکوع ۴ میں دہرائے ہوئے ملتے ہیں۔

سورۃ المائدہ کے رکوع ۱۲ میں پہنچئے تو پھر یہی تاکید ملتی ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور اطاعت کرتے رہو رسولؐ کی۔

اور انھیں الفاظ کی تکرار سورۃ التغابن کے رکوع ۲ میں واقع ہوئی ہے۔

سورۃ الانفال کھولئے تو اس کے شروع یعنی پہلے ہی رکوع میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ اطاعت کرتے رہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی، اگر تم ایمان والے ہو۔

اور سورۃ کے تیسرے رکوع کا آغاز ہی اس آیت سے ہوتا ہے :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ اے ایمان والو! اطاعت کرتے رہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔

سورۃ میں تیسری بار پھر یہی حکم ملتا ہے اور رکوع ۶ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ اطاعت کرتے رہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔

اور انھیں الفاظ کا اعادہ سورۃ المجادلہ، رکوع ۲ میں ہوا ہے، پھر سورۃ النور کے رکوع ۷ میں پہلے تو یہ ہے کہ:-

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ آپ کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔

اور پھر اسی رکوع میں اور آگے بڑھ کر ہے کہ :-

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔

اتنی جگہ صریح حکم اطاعت رسولؐ کا، صیغہ امر میں اور وہ بھی اکثر اطاعت الٰہی پر عطف کرکے قطعاً کسی اور مخلوق کے حق میں وارد نہیں ہوا ہے اور یہ نظائر تو حکم اطاعت بہ صیغہ امر کے ہوئے، باقی دوسرے طریقوں سے اسی مفہوم کی جو تبلیغ و تلقین اور تاکید ہوئی ہے وہ بھی کچھ کم مؤثر اور پُر زور نہیں۔

سورۃ النسآء، رکوع ۱۱ کی ایک آیت وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ کچھ دیر قبل نقل ہو چکی ہے۔ اسی سورۃ کے رکوع ۹ میں انعام یافتہ بندوں کی معیت کے سلسلہ میں یہ آچکا ہے کہ :-

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ (یہ وہ ہیں) جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔

اور اس سے بھی قبل اسی سورۃ کے رکوع ۲ میں جہاں اہل جنّت کا ذکر ہے وہاں بھی ٹھیک یہی الفاظ موجود ہیں۔

اور آیت کا یہی ٹکڑا لوٹ لوٹ کر سورۃ النور رکوع ۷ اور سورۃ الاعراف رکوع ۱۹ اور سورۃ الفتح رکوع ۲ میں بھی آیا ہے۔

حکم کی یہ سب تاکیدیں لفظ اطاعت کی صراحت کے ساتھ تھیں ایک جگہ مصدر اتباع آیا ہے وہ بھی اس شان کے ساتھ اتباع رسولؐ کو عین زینۂ اللہ کے ہاں محبوبیت کا قرار دے دیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران، ع ۴:) — آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اور اس مثبت و ایجابی پہلو کے علاوہ یہی مضمون متعدد منفی اور سلبی پہلوؤں سے بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ ، اور اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ — اور جو نافرمانی کرے گا اللہ اور اس کے رسولؐ کی، اور جو کوئی عداوت رکھے گا، اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور جو کوئی دکھ پہنچائے گا رسولؐ کو اور جو لوگ دشمنی رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔

اور اسی قبیل کی دوسری آیتیں اور وہ آیتیں جن میں ذکر رسولؐ سے نافرمانی کرنے یا معصیت الرسول کا ذکر آیا ہے۔ اگر یہ سب استدلال و استشہاد کی غرض سے نقل ہونے لگیں تو یہ محدود وقت گنجائش رکھنے والے لیکچر اپنے حدود سے بڑھ اور بہت بڑھ جائیں اس لیے سامعین کو اس خاص سلسلہ میں قناعت اتنے ہی پر کرنا ہو گی۔

لیکن ابھی دو چار نہیں بیسیوں آیتیں اور ہیں جن میں رسولؐ کے فرائض اور فضائل اور خصائص تینوں کا بیان موجود ہے، ان سب سے قطع نظر کیونکر ممکن ہے؟ اور اگر انھیں چھوڑ دیا جائے تو سیرۃ نبویؐ کا قرآنی خاکہ بالکل ہی ناتمام رہ جائے گا۔ اور اتنی اختصار پسندی اصل موضوع کے ساتھ ایک طرح کی خیانت ہی ہو گی۔

رسولؐ کے فرائض کا جہاں تک تعلق ہے (اور ضمناً فضائل بھی اس میں آ گئے) یہ آیت اس آیت میں بہت صاف واضح ہے۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (الاحزاب، ع ۷:) — اے پیمبر، ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا اور اللہ کی طرف اسی کے حکم سے بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

شاھد کی تفسیر یہ ہے کہ آپؐ سب پر گواہی دیں گے اور اس صفت کا ظہور حشر میں ہو گا۔ مبشر و نذیر کے معنی صاف ہیں۔ انھیوں کو صلۂ نیک کی خوشخبری سنانے والے اور بدوں کو ان کے انجام سے ڈرانے والے اور اللہ کی طرف سے اسی کے حکم و رضا سے دعوت دینے والے اور ایک روشن چراغ یعنی نمونہ ہدایت۔ کہ آپ ہی کے چراغ سے خدا معلوم کتنے اولیاء و صادقین کے چراغ آج تک روشن ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی روشن ہوتے رہیں گے اور یہ مضمون قرآن میں جابجا آیا ہے اور اسی سراج منیر کی آیت سے استنباط کر کے جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ — لوگو! تمھارے پاس آ گیا ہے اللہ کے یہاں سے ایک نور اور ایک کتاب واضح بھی۔

وہاں نُور سے اشارہ ذات رسالتؐ کی جانب ہے تو انھوں نے کچھ بے جا تفسیر و تاویل نہیں کی ہے۔

آپؐ کے فضائل کی ایک جامع سورۃ الانشراح ہے جہاں یہ ارشاد ہو گیا ہے کہ :۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ کیا ہم نے آپؐ کا سینہ نہیں کھول دیا ہے اور آپؐ سے آپؐ کا وُہ بار اُتار دیا جو آپؐ کی پشت توڑے دیتا تھا۔

یعنی آپؐ کا شرح صدر کرکے آپؐ کے قلب و رُوح کو علوم و معارف ربانی سے بھر دیا اور ہدایت خلق کی فکریں جو آپ گھلے جا رہے تھے اس بار کو آپؐ کے لیے ہلکا کر دیا۔

اس سے آپؐ کی اس عادت مبارک پر بھی روشنی خود بخود پڑ گئی کہ ہدایت خلق کی فکر آپ کو کتنی مشقت و تعب میں ڈالے ہوئے تھی اور اس کے معاً بعد یہ مژدہ بھی ہے کہ :۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ ہم نے آپؐ کے لیے آپ کا آوازہ بلند کر دیا۔

آج دنیا میں کون بشر ہے جو پیغمبر اسلام کے آوازہ کی بلندی میں کلام کر سکتا ہے ؟ کوئی شخص کسی بھی عقیدہ اور مذہب کا ہو آخر آج اس سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ دنیا کی بشری آبادی میں صرف ایک ہی ذات ایسی ہے جس کا نام خدائے واحد کے نام کے ساتھ ساتھ ، دنیا کے ایک ایک گوشہ سے ہر روز پانچ پانچ مرتبہ پکارا جاتا ہے۔

اور اس دلسوزی اور پشت توڑ دینے والی ہمدردی نوع انسانی کا بیان اسی آیت تک محدود نہیں ۔ دوسری آیتوں میں اس جذبہ رفاہ خلق کی تصریح در تصریح موجود ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ ہے کہ منکروں کے فلاں فلاں قول سے۔

وَضَائِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ (ہود ۔ ع : ۲) آپؐ کا سینہ تنگ ہوا جاتا ہے ۔

ایک جگہ اس سے بھی زیادہ فاش و برملا ہے مسیحیوں کی شدید گمراہی اور مسیح پرستی کے شرک کے سیاق میں ۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکہف ع ۱) تو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون پر ایمان نہ لائے تو اپنی جان دے دیں گے ۔

یہ غمگینی اور دلسوزی جب غیروں کے واسطے تھی تو اپنی اُمّت کے حق میں اس کا جو درجہ ہوگا ، ظاہر ہی ہے ۔ دوسری جگہ بھی منکروں ہی کے سلسلہ میں بیان کی ہے ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (الشعراء ع : ۱) شاید ان کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنی جان ہی دے دیں گے ۔

جو عالم انسانی کے لیے ایسے ہی غم جانگداز میں گھلتا رہتا ہو ۔ حقیقتہً اسی کو حق بھی سارے عالم کی رہبری اور انبیاء و مرسلین کی سروری کا ہے۔

اور جب مقتدائی میں آپ کا یہ مرتبہ تھا ، جبھی تو یہ قرار پایا کہ اللہ کے یہاں مقبول محمود و محبوب ہونے کا نسخہ یہ ہے کہ اس کامل ہستی کے نقشِ قدم پر چلا جائے ۔

خود آپ کی زبان سے اعلان کرایا گیا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران، ع ۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو بس میری راہ پر چلو اللہ تم سے محبت رکھنے لگے گا۔

رسولؐ کے فرائض میں نمایاں طور پر یہ بات داخل تھی کہ آسمانی کتابوں کو ماننے والی پرانی قومیں اپنے ہاتھوں تقلید انسانی اور اوہام پرستی کے جن عذابوں میں مبتلا تھیں انھیں ان قیدوں اور سختیوں سے نجات دلائیں اور انھیں دین کا سیدھا ہموار راستہ دکھائیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ پیمبر جن کا تذکرہ توریت و انجیل میں آچکا ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف، ع ۱۹)

انھیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو ان سے دور کرتے ہیں۔

اور اتنا ہی نہیں بلکہ اہل کتاب کے مقتداؤں نے تحریفات و تلبیسات و تصرفات کا انبار جو اپنی آسمانی کتابوں میں لگا دیا تھا اُسے بھی یہ صاف کرتے ہیں اور ان مجرموں کی بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتے ہیں۔ ارشاد اہل کتاب کو مخاطب کر کے ہوتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ۔ (المائدہ، ع ۳)

اے اہل کتاب! تمھارے پاس ہمارے یہ رسولؐ آئے ہیں کتاب میں سے جن امور کو تم چھپاتے رہے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو تمھارے سامنے کھول دیتے ہیں اور (تمھاری) بہت سی باتوں سے چشم پوشی بھی کر جاتے ہیں۔

آپ کی راہ میں مشکلات اتنی حائل ہوگئی تھیں اور تبلیغ رسالتؐ کے لیے مواقع اتنے سخت پیش آگئے تھے کہ ان حالات میں ثابت قدم رہ جانا معمولی ہمت والے انسان کا کام نہ تھا۔ آپؐ کو استقامت اور ثبات قلب و ثبات قدم کی طاقت بھی اسی لیے غیر معمولی عطا کی گئی۔

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا۔ (بنی اسرائیل، ع ۸)

اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ کچھ تو ان لوگوں کی طرف جھک جاتے۔

یہ بیان فطرت بشری کا ہوا۔ بشریت کا عین مقتضیٰ یہ تھا کہ آپؐ ان منکرین سے کسی قدر کوئی صورت مصالحت و مفاہمت کی نکال لیتے۔ لیکن امداد غیبی آڑے آئی اور اس نے درجہ ادنیٰ میں آپؐ کو اپنی جگہ سے جنبش نہ ہونے دی۔

منکرین معاندین کے شدید مخالفانہ رویہ سے آپ کو اذیت قلب محسوس ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس پر آپ کو علانیہ تسکین دی گئی کہ یہ کوئی آپؐ کی ذاتی حیثیت سے تکذیب تھوڑی ہی ہوئی یہ تکذیب تو عین آیات و دلائل الٰہی اور آپؐ کے

پیام کی ہے تو آپؐ اس سے اپنی ذات پر اتنا اثر کیوں لیں۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔ (الانعام، ع: ۴)

ہم خوب جانتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں آپ کو رنج دلاتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ تکذیب آپ کی نہیں کرتے، بلکہ آیاتِ الٰہی کے منکر ہٹ دھرمی سے ہو رہے ہیں۔

ورنہ ذاتی حیثیت سے تو آپؐ کی سیرت اتنی ممتاز اور آپؐ کا پایۂ اخلاق اتنا بلند تھا کہ بڑے بڑے منکر و معاندوں کو بھی گرفت کی گنجائش نہ تھی، آپؐ کی زندگی اتنی بے لوث، بے داغ رہی تھی کہ خود اسی کو حجت بنا کر منکروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان سے سوال کرایا گیا کہ میں تو تمھارے ہی اندر رہا سہا ہوں، تمھارے ہی اندر اتنی عمر گزاری ہے۔ تمھیں بتاؤ کہ اس سے قبل تمھیں کوئی بدگمانی کا موقع ملا ہے؟

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (یونس، ع: ۲)

میں تمھارے ہی درمیان اس (دعوئ نبوت) سے قبل ایک عمر گذار چکا ہوں۔ سو تم لوگ کیوں عقل سے کام نہیں لیتے؟

اور یہ بھی کہلایا گیا ہے کہ اگر میں ارادۃً غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہوں تو تمھاری تشخیص کے مطابق لازمی ہے کہ مجھے کوئی دماغی بیماری ہو کہ اس میں پڑ کر میں اس وہم میں مبتلا ہو گیا ہوں تو اس مفروضہ کو بھی تم اپنی علم و واقفیت کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لو۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ (السبا، ع: ۶)

آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو، دو ایک ایک، پھر سوچو کہ تمھارے (ان) ساتھی کو کہیں جنون تو نہیں ہے۔

اور پھر اسی کو مختصراً دہرایا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ۔

یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے ان کے ساتھی کو کوئی شائبہ جنون کا ہے نہیں۔

پھر لے دے کے ایک احتمال یہ ہو سکتا تھا کہ شاید کوئی طمع دنیوی آپ کو اس منزل پر لائی ہو۔ قرآن مجید نے اس احتمال کی بھی جڑ کاٹ دی۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ۔ (السبا، ع: ۶)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے (اس تبلیغ رسالت) کا کوئی معاوضہ مانگا ہو تو لیں وہ تمھارا ہی رہا۔ میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

اور اسی کے ہم مضمون فقرے حضرت نوحؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت لوطؑ وغیرہم کی زبان سے ادا کر کے رسول اللہ صلعم کے اس جواب کو اور زیادہ قوی و موکد کر دیا ہے۔

قرآن مجید آپ کو اعزاز و احترام کے جس مرتبہ پر رکھنا چاہ رہا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کلام مبین میں قسم آپ کی عمر کی دلائی گئی ہے۔ قوم لوط کی بدکرداریوں اور بدمستیوں کے سلسلہ میں ہے کہ :-

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ قسم ہے آپ کی جان کی، وہ لوگ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

(الحجر، ع : ۵)

اور قسم کا استعمال اگر عربی میں شہادت کے مفہوم میں ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی کو صداقت کی نظیر کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور آپ کی مرتبت عالی پر روشنی اس حقیقت سے کچھ نہ کچھ پڑجاتی ہے کہ جہاں اور رسم منصب حضرات کا ذکر صیغۂ بین نام کے ساتھ آیا ہے یا آدمؑ یا ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا داؤد وغیرہم۔ وہاں آپ کا ذکر قرآن مجید بھر میں مخاطبت کے وقت نام کے ساتھ نہیں، بلکہ صفات کمال جمال میں سے کسی نہ کسی صفت ہی کے ساتھ آیا ہے، مثلاً یاایھا النبی یاایھا الرسول یا یاایھا المزمل یا یاایھا المدثر وغیرہ اور صیغۂ غائب میں مطلق لفظ عبد سے اشارہ آپ ہی کی طرف کیا گیا ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوئے کہ عبدیت اپنی کامل ترین یا اکمل صورت میں جلوہ گر آپؐ ہی کی ذات میں ہوتی ہے۔

اسی قسم ہی کے سلسلہ میں یہ بات بھی سن رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں قسم ایک شہر کی بھی مذکور ہے۔

لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ - (البلد) میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔

لیکن معاً بعد تو رسولؐ کو مخاطب کر کے ہے۔

وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ اور آپؐ اس شہر میں اترے ہوئے ہیں۔

یا کہ آپؐ کے لیے اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے۔

ان دونوں تفسیروں میں سے جو بھی اختیار کی جائے۔ بہرحال اتنا جز وصاف ہے کہ اس مکان کو جو شرف و عظمت حاصل ہے وہ اس مکین کی نسبت سے ہے آپ اس شہر میں مقیم فرض کئے جائیں یا آپ کے لیے اس حرم محترم میں جنگ جائز ہو رہی ہو۔ ہر صورت میں آپؐ کی نسبت ہی باعث احترام ہوئی۔

مشہور واقعہ معراج کی تفصیلی کیفیات جو کچھ بھی ہوں بہرحال قرآن مجید اس کی گواہی تو دے ہی رہا ہے کہ وہ ایک واقعہ عظیم و نادر تھا جس سے آپؐ کی یکتائی ظاہر ہو رہی ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا۔

(بنی اسرائیل، ع : ۱)

وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو لے گیا راتی رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھ دی ہیں تاکہ ہم انھیں اپنے کچھ نشانات دکھا دیں۔

اور اسی طرح دوسری جگہ رسولؐ کی جس سیر آسمانی کا ذکر کیا گیا ہے اور جس طرح آپ کی روحانیت کے مرتبے دکھائے گئے ہیں، وہ آپ کو نہ صرف عام نوع بشری میں بلکہ صف انبیاء و مرسلین میں بھی کتنا ممتاز کرنے والا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ (النجم، ع: ۱)

یہ تمہارے ساتھی (اس عالم میں بھی) نہ راہ سے بھٹکے نہ غلط راستہ پر پڑ لئے۔

بلکہ آپ کا مرتبہ تو یہ ہے کہ آپؐ جو چیزیں پیش کر رہے ہیں وہ کوئی بھی اپنی خواہش نفس سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی ہی کے ماتحت ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

اور آپ اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں بناتے بلکہ ان کا ارشاد وہی ہوتا ہے جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔

اور اس خاص موقع پر

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔

اللہ نے اپنے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی اور (آپ کے) قلب نے کوئی غلطی دیکھی ہوئی چیز میں نہیں کی،

اور ملائکہ نورانی کی دید اور ودمسرت تجلیات ربانی کے مشاہدہ کی جن منزلوں سے اور جس طرح گزرے اس کی روداد بھی اجمالی سہی، لیکن بڑی پختگی کے ساتھ قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ (النجم، ع: ۱)

اور ان پیمبر نے اس فرشتہ کو ایک بار اور بھی دیکھا (سدرۃ المنتہیٰ) کے قریب.... جبکہ (سدرۃ المنتہیٰ) کو لپیٹ رہی تھیں جو چیزیں کہ لپیٹ رہی تھیں (ان پیمبر کی) نگاہ نہ ہٹی نہ بڑھی انھوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھ لیے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وحی کا آنا کسی حکمت و مصلحت سے کچھ روز کے لیے بند ہو گیا اور اس پر معاندین کو خوب شادیانے بجانے کا موقع مل گیا۔ ان کے خیالات خام کے رد و ابطال میں رسولؐ ہی کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ (الضحیٰ)

آپؐ کو آپؐ کے پروردگار نے نہ چھوڑا، نہ وہ بیزار ہوا۔

اور دست برداری و بیزاری کا کیا ذکر ہے آپ کا مستقبل آپ کے ماضی سے آپ کا انجام آپ کے آغاز سے بھی کہیں زیادہ عالیشان و تابدار رکھ دیا گیا ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ (الضحیٰ)

آخرت آپ کے لیے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔

اتنا ہی نہیں آپ کی رضا خود آپ کے خالق کو کس درجہ مدنظر ہے

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ (الضحیٰ)

عنقریب اللہ آپ کو اتنا کچھ دے گا کہ آپ اُس سے خوش ہو جائیں گے۔

اور اس عطا اور بخشش ہی کے سلسلہ میں وہ لفظاً چھوٹی اور معناً بڑی آیت بھی پڑھ لینے کے قابل ہے۔

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ (الکوثر) بے شک ہم نے آپ کو عطا کر دی کوثر۔

اور اب کوثر کو خواہ جنّت کی حوض و نہر کے معنی میں لیا جائے خواہ خیر کثیر کا مرادف سمجھا جائے یہ ہے وہ بشارت عظیم جو آپ کے سوا مخلوق میں اور کسی کو بھی نہیں ملی۔

اور اسی معنی کی تائید، تاکید و تقویت میں یہ آیت بھی ہے۔

وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ۔ (القلم ع ۱) اور آپ کے لیے بیشک ہے اجر غیر منقطع۔

قرآن کی زبان جس اجر کو غیر منقطع بتائے اس کی حد و نہایت کا کون حساب لگا سکتا ہے۔

ایک جگہ قرآن نے آپ کے ایک ایسے وصف جامع کا ذکر کر دیا ہے جس کے اندر سارے ہی اوصاف آ سکتے اور آجاتے ہیں اور اس کی شرح و تفصیل جتنی بھی کی جا سکے۔ وہ وصف اتنا جامع ہے کہ اس پر کسی اضافہ کا امکان نہیں ارشاد ہوا ہے کہ:

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم، ع: ۱) اے پیغمبر! آپ اخلاق کے عظیم پیمانہ پر ہیں،

خلق صیغۂ جمع میں ہے اور اس کے اندر اخلاق حسنہ کے سارے ہی اصناف و افراد آ گئے، پھر جب قرآن نے جو مبالغہ کی زبان سے نا آشنائے محض ہے اس کے ساتھ صفت عظیم کی لگا دی تو اب یہ صفت اس وسعت و بلندی کو پہنچ گئی جو بندوں کے ادراک کی رسائی کی منتہا ہے۔

کہیں کہیں قرآن اخلاق حسنہ کی اس جامعیت کی کچھ تفصیل و تصریح کرتا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ناموافق ماحول کے سیاق میں ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔

اللہ کی رحمت ہی سے ہے کہ آپ ان لوگوں کے حق میں نرم رہے، اور اگر آپ کہیں تند خو سخت طبیعت والے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے، سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے استغفار کر دیجئے۔ (آل عمران ع ۱۷)

اس سے ہر قسم کی سخت مزاجی کی نفی اور نرم خوئی کا اثبات پوری طرح ہو گیا اور کہیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے ہاں سے جو باتیں آپ کی معلوم ہوتی رہتی ہیں ان کو پھیلانے بتلانے میں آپ ذرا بھی بخل کو کام میں نہیں لاتے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (التکویر) اور یہ رسول غیب کے بتانے میں ذرا بھی بخیل نہیں۔

تحریک شفقت کی نہیں۔ افراط شفقت و دلسوزی سے آپ کو منع کرنے کی ضرورت تھی۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ۔ ان لوگوں کے حال پر غم کر کے کہیں آپ جان نہ دے بیٹھیں۔ (الفاطر، ع: ۳)

عبادات خصوصاً عبادات شبینہ کے آپ بہت عادی تھے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ آپ کے پروردگار کو اس کا علم ہے کہ آپ رات کی دو تہائی

وَنِصْفَہٗ وَثُلُثَہٗ۔ رات کے قریب اور آدھی آدھی رات اور تہائی رات کھڑے رہتے ہیں۔ (المزمل : ع ۲:)

ان مجاہدات شاقہ سے قرآن مجید کو آپ کو روکنے کی ضرورت پڑی اور غایت شفقت و کرم سے ارشاد ہوا۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی۔ ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ (طٰہٰ ع ۱)

معاندین کی مسلسل شرارتوں پر تسکین آپ کو بار بار دی گئی ہے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ قابل ملامت قابل الزام کسی طرح بھی نہیں۔

فَتَوَلَّ عَنْھُمْ فَمَا اَنْتَ بِمَلُوْمٍ۔ آپ لوگوں کی طرف التفات نہ کیجئے، اور آپ پر کوئی ملامت نہیں۔ (الذاریات، ع ۳:)

اور ایک جگہ تسلّی کے لیے شفقت خاصہ اور عنایت خصوصی کے الفاظ یوں وارد ہوئے ہیں کہ آپ تو ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا۔ آپ اپنے پروردگار کی تجویز پر صبر کیے رہیے آپ تو خاص ہماری حفاظت میں ہیں۔ (الطور، ع ۲:)

منکرین و معاندین کے پاس بڑا حربہ طنز و استہزاء کا تھا قرآن مجید نے تسکین اس پہلو سے بھی دی۔

اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ ۔ (الحجر، ع ۶:) (ان) استہزاء کرنے والوں سے ہم آپ کے لیے کافی ہیں۔

اس سے نفس استہزاء کا وجود تو ثابت ہی ہو گیا۔

مخالفین و معاندین کثرت سے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے متعدد اشاروں سے معلوم ہوتا ہے تصریح کے ساتھ ذکر ابولہب کا اور اس کی بیوی کا آتا ہے۔ ابولہب کا نام تاریخ میں عبدالعزیٰ آیا ہے اور سیرت کی کتابوں میں آیا ہے کہ وہ علاوہ آپ کا عزیز قریب یعنی چچا ہونے کے پڑوسی بھی تھا یہ خود اور اس کی بیوی جو اموی خاندان کی تھی دونوں اذیت رسانی میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور پڑوس کی بنا پر انھیں اس کے موقعے بھی زیادہ تھے۔ قرآن مجید نے اس الد الخصام کے تذکرہ میں کہا ہے

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ۔ (لہب) ٹوٹ گئے دونوں ہاتھ ابولہب کے (یعنی اس کی ساری کوششیں اور تدبیریں ضائع گئیں) اور وہ ہلاک ہو گیا۔ کچھ کام اس کے نہ آیا نہ اس کا مال نہ اس کی کمائی۔

بڑا غرہ معلوم ہوتا ہے اسے اپنے مال و دولت پر تھا۔ اور جو انجام اس کا ہوا، ایسا ہی کہنا چاہیے کہ دشمنان رسول ؐ کے جتنے سرخیل تھے سب کا ہوا پیش خبری واضح لفظوں میں کر بھی دی گئی تھی۔

اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔ (الکوثر) جو آپ کا دشمن ہے بے شک وہی بے نام و نشان

(رہ جانے والا) ہے۔

اور زیادہ عام اور وسیع الفاظ یہ آئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (التوبۃ، ع: ۸) جو لوگ رسول اللہؐ کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں ان کے لیے عذاب دردناک ہے۔

اور صرف رسولؐ ہی نہ تھے۔ یعنی سلسلہ انبیاء میں سے ایک بلکہ اس سلسلہ کے خاتم اور آخری نبی بھی تھے۔ آپؐ کے نام کی تصریح کے ساتھ آیا ہے کہ:۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (الاحزاب، ع: ۵) محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، اور انبیاء کے خاتم (بھی)

آپ کی اگلی اور پچھلی تقصیریں۔ اگر کچھ تھیں سب معاف ہو چکی تھیں۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ (الفتح، ع: ۱) تاکہ اللہ آپؐ کے وہ گناہ جو پہلے ہوئے اور جو پیچھے ہوئے وہ سب بخش دے۔ (تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے) ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی

اور بات اپنی جگہ دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ پیمبروں کے سلسلہ میں جب ذنب وعصیان کا استعمال ہو گا تو وہ انہی کی شان و مرتبہ کے مطابق ہو گا۔ عام بشری معیار سے الگ۔ آپؐ کا استغفار، مومنین صادقین تو الگ رہے۔ ظالموں فاسقوں تک کے حق میں مقبول و مؤثر تھا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (النساء، ع: ۹) اور اے پیمبر جب ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر آپؐ کے پاس آ جاتے پھر اللہ سے استغفار کرتے اور رسولؐ بھی اُن کے حق میں استغفار کرتے تو یہ ضرور پاتے اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

دُنیا میں رسولؐ کی موجودگی نزولِ عذابِ الٰہی سے روک بنی ہوئی تھی۔ صاف ارشاد ہُوا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ (الانفال، ع: ۴) اور اللہ ایسا نہ کرے گا کہ آپؐ ان کے درمیان موجود ہوں اور وہ (اس حال میں) انھیں عذاب دے۔

رسولؐ سے بیعت اللہ سے بیعت کے مرادف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ (الفتح، ع: ۱) بے شک جو لوگ آپؐ سے بیعت کرتے ہیں، وہ (درحقیقت) اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

ایمان کا معیار ہی یہ رکھ دیا گیا ہے کہ معاملات میں حکم پیمبر کو بنایا جائے اور اُن کے ہر فیصلہ کو بلا کراہت قبول کر لیا جائے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا - (النساء، ع ۹)

تو قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ اُنھیں ایمان نصیب نہ ہوگا جب تک یہ نہ ہو کہ، اُن کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ فیصلہ آپ سے کرائیں اور آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں تنگی (بھی) نہ پائیں اور اُسے پوری طرح تسلیم کرلیں۔

اور اس کی تصریح بار بار آئی ہے کہ آپ خصوصی فضل و رحمت الٰہی کے مَورد تھے۔ مثلاً :

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا - (النساء، ع : ۱۷)

اللہ نے آپ کو وہ سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل رہا ہے۔

یا اور اسی طرح براہِ راست۔

اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا - (بنی اسرائیل، ع ۱۰)

بے شک آپ پر اللہ کا فضل بڑا ہے۔

یا پھر اسی طرح بالواسطہ۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ - (القصص، ع : ۹)

اور آپ کو تو یہ اُمید ہی نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل ہوگی۔ لیکن آپ کے پروردگار کی رحمت سے اس کا نزول ہُوا۔

ایسے سرورِ سروار کی خانگی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کے لیے کچھ خصوصی آداب بھی مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ ہے مثلاً ایک ادب یہ تھا کہ آپ کو اگر پکارا جائے تو اسی طرح نہیں جیسے لوگ ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا - (النور، ع : ۹)

لوگو! اپنے درمیان رسولؐ کو اس طرح نہ پکارا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

آپ کی محفل سے بلا اجازت اُٹھ جانا ممنوع ہُوا۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ - (النور، ع : ۹)

(مومنین) رسولؐ کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لیے مجمع کیا گیا ہے۔ تو جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، نہیں جاتے۔

آپ کا حق مومنین پر اُن کی جانوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ - (الاحزاب، ع : ۱)

نبی مومنین کے ساتھ خود اُن کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کی ازواجِ مطہرات اُمّت کی مائیں ہیں۔

وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ - (الاحزاب، ع : ۱)

اور نبی کی بیبیاں مومنین کی مائیں ہیں۔

اور جب یہ ہوا تو اس اصل کی ایک فرع قدرۃً یہ نکلی کہ ان ماؤں کے ساتھ اُمّت کے کسی فرد کا نکاح ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار پاگیا۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا۔ (الاحزاب، ع ۷) — مسلمانوں تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم آپؐ کے بعد آپؐ کی بیبیوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔

یہ بیبیاں عام عورتوں سے ایک ممتاز و بلند حیثیت رکھتی تھیں۔

یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ۔ (الاحزاب، ع ۴) — اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کیے ہو۔

ان بی بی صاحبوں سے کوئی چیز مانگنا ہو تو اُمّت کو ہدایت تھی کہ پردہ کے باہر سے مانگا کریں۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ (الاحزاب، ع ۷) — اور جب تم کو ان بیبیوں سے کوئی چیز مانگنا ہو تو پردہ کی آڑ سے مانگو۔

پیمبر کے گھر میں بے محابا۔ بلا اجازت چلے آنا، جائز نہ تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ۔ (الاحزاب، ع ۷) — اے مومنو! پیغمبر کے گھروں میں نہ داخل ہوجایا کرو، سوا اس کے کہ تمھیں اس کی اجازت دے دی جائے۔

یہ بھی اُمّت کو ہدایت ہوئی کہ پیغمبر کے ہاں اگر کھانا کھانے کا اتفاق ہو تو کھانے سے فراغت کے بعد بس اُٹھ کھڑے ہوا کرو یہ نہ ہو کہ پیمبر کے اوقات کا لحاظ کئے بغیر بےفکری سے باتوں میں لگ گئے۔

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ۔ (الاحزاب، ع ۷) — پھر جب کھانا کھاچکو تو اُٹھ کر چلے جایا کرو، اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔

رسول اللہؐ پر مروّت و حیا اس درجہ غالب تھی کہ خود اپنے کفش برداراُمتیوں سے اتنی بات بھی براہِ راست نہیں فرما سکتے تھے۔ اور قرآن مجید کو یہ ہدایت دینا پڑی۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ۔ (الاحزاب، ع ۷) — اس بات سے پیمبر کو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ صاف بات کہنے سے لحاظ نہیں کرتا۔

اور آپؐ کے ذمہ قرآن مجید کی محض تبلیغ و تعلیم ہی نہ تھی، بلکہ اس کی تبیین بھی تھی، یعنی اس کے خفی کو جلی کرنا اس کے مشکلات کو کھولنا اور واضح کرنا ارشاد ہوا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل، ع ۶) — اور ہم نے آپ پر یہ قرآن اُتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں۔ آپؐ ان کی شرح ان پر کردیں تاکہ وہ سوچیں

اور پھر اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے۔

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡـكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ‏۔

اور ہم نے تو یہ کتاب آپ پر بس اس لیے نازل کی ہے کہ آپ ان لوگوں پر وہ کھول کر ظاہر کر دیں جس بارہ میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور ایمان والوں کی ہدایت رحمت کی غرض سے۔

(النحل، رع : ۸)

غرض یہ کہ مبلغ قرآن و معلّم قرآن ہی کی طرح آپ کا شارح قرآن ہونا بھی قرآن مجید ہی سے ظاہر و ثابت ہے اور جس طرح باب کا آغاز آپؐ کے وصف بشریت سے ہوا تھا۔ اسی طرح باب کا خاتمہ بھی آپؐ کی رسالت کے اس خاص الخاص صفت کے اثبات پر ہو رہا ہے اور جب کسی نبی کے لیے قرآن نے کھُل کر کہہ دیا کہ یہ لوگوں کی پیروی کے لیے ایک اسوۂ حسنہ یا ایک بہترین نمونہ ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہوئے کہ وہ بہترین صفات و کمالات کا مجموعہ ہے کہ بغیر اس جامعیت کمالات کے وہ نمونہ کا کام دے کیونکر سکتا ہے اور اوصاف و کمالات کی تھوڑی بہت تشریح و تفصیل جو آپؐ کے سامنے آیات قرآنی سے ہو چکی۔ یقین ہے کہ اس کے بعد آپ کا دل خود دبول اُٹھے گا کہ بیشک وہی ذات مستحق تھی اس کی کہ خلق کے سامنے خالق کی طرف سے اس کی کاری گری کے شاہکار کی حیثیت سے پیش ہو۔

رسالت و بشریت

فضائل و مناقب کا مرقع آپ ملاحظہ کر چکے اور اور بھی رسولؐ کی جلالت قدر کے جلوے نظر سے گذرتے رہیں گے۔ لیکن قرآن مجید جیسی جامع، مانع اور کل مکتفی کتاب کو دوسرے سرے کی طرف سے بھی پوری احتیاط رکھنی لازمی تھی۔ پیمبروں اور رہا دیوں کی شخصیتوں پر دُنیا کی تاریخ میں برابر یہ ظلم عظیم ہوتا رہا ہے کہ جہاں ایک طرف منکروں اور معاندوں نے ان کے کمالات کی طرف سے یکسر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تکذیب و انکار کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہیں دوسری طرف ماننے والوں نے بھی عقیدت میں وہ غلو کیا کہ ایلچی کو بادشاہی اور بندہ کو خدائی ہی کے تخت بٹھا کر دم لیا۔ بندہ کو بندہ رہنے ہی نہ دیا اور حلول، اتحاد، تبنیت، ابنیت، عینیت وغیرہ طرح طرح کے عقیدے گڑھ کے رسالت کے ڈانڈے الوہیت سے جا ملائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی مثال تو کھلی ہوئی موجود ہی ہے۔ ہندوستان کے جن بزرگوں کو اوتار کہہ کر مانا جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ ان کی بھی اصلی اور ابتدائی حیثیت پیمبری ہی کی ہو۔

قرآن مجید نے اس شدید گمراہی بلکہ کہنا چاہیئے کہ گمراہیوں کی جڑ سے مسلمانوں کو بچانے کے بالواسطہ اور براہِ راست دونوں طریقے پُر زور صورت میں اختیار کئے۔

پہلے نظر طریق بالواسطہ پر کیجئے۔ قرآن مجید نے پہلے اس سلسلہ میں یہ اصل قائم کی کہ آپؐ بھی اسی طرح ایک رسولؐ ہیں، جیسے آپؐ کے قبل ہو چکے ہیں۔

اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ

ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف بھی بے شک (اسی طرح) وحی بھیجی

مِنۡ بَعۡدِہٖ ۔ (النساء، ع : ۲۳) ہے جیسی نوح اور اُن کے بعد (دوسرے) نبیوں پر بھیجی تھی۔

اور خود آپ کی زبان سے یہ کہلایا گیا۔

قُلۡ مَا كُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ ۔ (الاحقاف، ع:۱) آپ کہہ دیجئے کہ میں پیمبروں میں کوئی انوکھا تو ہوں نہیں۔

اور یہ بھی تصریح کے ساتھ ارشاد ہوگیا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ۔ (آل عمران، ع : ۱۵) محمدؐ تو بس ایک پیمبر ہی ہیں۔ بے شک ان سے پہلے بھی پیمبر ہو چکے ہیں۔

اور اس اصل کے مقرر اور متعین ہو جانے کے بعد یہ حقیقت بھی ارشاد ہوگئی کہ سارے رسول انسان ہی ہوئے ہیں، بشر ہوئے ہیں فوق البشر نہیں، نہ دیوتا، نہ اوتار، نہ ابن اللہ نہ کچھ اور فقط وحی الٰہی سے سرفراز بشر۔!

وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى ۔ (یوسف، ع : ۱۳) (اے پیمبر) ہم نے آپؐ سے پہلے جو پیمبر بھیجے وہ بستیوں کے رہنے والے بس آدمی ہی تھے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

اسی حقیقت کا اعادہ سورہ النحل ع ۶ میں ہے اور یہی مضمون سورۂ انبیاء ع ۱ میں ایک بار پھر برائے نام لفظی فرق کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔ گویا خوب وضاحت اور تکرار کے ساتھ یہ ارشاد ہوگیا کہ نبوت بشریت کے ماوراء اور اس سے مافوق کوئی چیز نہیں۔

یہ طریقہ تو بالواسطہ آپ کو بشر قرار دینے کا تھا، لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ براہ راست آپ کی بشریت کا اثبات اور وہ بھی بہ تکرار کیا ہے۔ ایک جگہ آپ ہی کی زبان سے کہلایا ہے۔

هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۔ (بنی اسرائیل، ع ۱۰) میں بجز اس کے بشر ہوں پیمبر ہوں اور کیا ہوں۔

شرک اور مشرکانہ عقاید میں ڈوبے ہوئے منکرین بار بار پیمبروں سے انکار و استعجاب کے لہجہ میں کہتے تھے۔

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۔ (بنی اسرائیل: ع ۱۱) کیا خدا نے ایک بشر کو رسولؐ بنا کر بھیجا ہے؟

یا یہ کہ :۔

اَبَشَرٌ يَّهۡدُوۡنَنَا ۔ (التغابن، ع : ۱) کیا ہماری ہدایت ایک بشر کرے گا۔

یا کبھی اپنے پیمبر ہی کو براہِ راست مخاطب کرکے کہتے :

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا (الشعراء، ع : ۸) تم اور کیا ہو کہ بجز اس کے ہم ہی جیسے ایک بشر ہو۔

اس طرح کے فقرے قرآن مجید نے ان مکذب قوموں کی زبان سے بار بار نقل کئے ہیں اور اس کے جواب میں اُن کے پیمبروں کی زبان سے اس واقعیت کو بڑی خندہ جبینی سے تسلیم کرالیا ہے۔

اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (ابراہیم، ع : ۲) بے شک ہم تو بس بشر ہی ہیں تم جیسے۔

اور اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ اس کی بھی تصریح بار بار کرادی کہ پیمبروں کا جسم بھی عام انسانوں کی طرح مادی جسم ہوتا ہے اور انھیں احتیاج بھی کھانے پینے کی رہتی ہے۔

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ۔ (الانبیاء، ع ۱) — اور ہم نے انھیں جسم بھی ایسا نہیں دیا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔

اور خود ہمارے رسولؐ سے متعلق تو مشرکینِ مکہ کا یہ مستقل طنز تھا کہ یہ کیسے رسولؐ ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں۔

قَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع: ۲) — بولے کہ ان رسولؐ کو کیا ہوا ہے کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

جواب میں آپؐ کی بشریت کی واقعیت کو تسلیم کرکے ارشاد ہوا کہ اس میں نئی بات کیا ہے۔ جتنے پیمبر پیشتر آچکے ہیں سب یہی جسم اور یہی احتیاجیں لے کر آتے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع: ۲) — اور ہم نے آپؐ سے پیشتر جتنے پیمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

اور یہی نہیں کہ پیمبران برحق کھانے پینے، چلنے پھرنے کی بشری ضرورتوں سے بے نیاز نہ تھے بلکہ بیوی بچے، شادی بیاہ اور خاندان کے معاملے میں بھی ترک و تبتل اور رہبانیت کے قائل اور عامل نہ تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً۔ (الرعد، ع ۶) — (اے پیمبر) بے شک! ہم نے آپؐ سے پیشتر پیمبر بھی بھیجے ہیں اور انھیں بیبیاں اور اولادیں بھی دی ہیں۔

اور پیمبروں میں تو اتنی قوت بھی نہیں ہوتی کہ خود اپنی طرف سے کوئی معجزہ دکھاسکیں۔ یا کوئی امر بطور خارق عادت پیش کرسکیں۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (الرعد، ع: ۶) — اور کسی رسولؐ کے بس میں نہیں کہ وہ کوئی بھی نشان لاسکے بجز اس کے کہ اللہ کے حکم سے۔

اور خود پیمبروں کی زبان سے کہلایا گیا:

وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (ابراہیم، ع: ۲) — اور ہمارے بس میں تو یہ نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی دلیل لاسکیں بجز اس کے کہ اللہ کے حکم سے۔

معبودیت کی بڑی پہچان اور مخلوقیت کی بالکل ضد دوام زیست یا ابدیت ہے۔ اس وصف کی کامل نفی پیمبروں سے قرآن نے کی ہے۔

وَمَا كَانُوا خَالِدِيْنَ۔ (الانبیاء، ع:۱) وہ ہمیشہ رہنے والے نہ تھے۔

اس قسم کی آیتوں میں تو ہمارے رسولؐ کا ذکر صرف ضمناً و استطراداً ہے۔ باقی دوسری آیتوں میں آپؐ کی وفات یا فناپذیری کا ذکر صراحتہً ہے۔ مثلاً

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ۔ (آل عمران، ع: ۱۵)

محمدؐ تو بس ایک پیغمبر ہی ہیں۔ پیغمبران سے پہلے بھی (بہت سے) گزر چکے ہیں۔ تو اگر یہ وفات پا جائیں یا ہلاک کر ڈالے جائیں تو کیا تم پچھلے پیروں واپس چلے جاؤ گے۔

اور کہیں اس قسم کے الفاظ ہیں:

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (الرعد، ع: ۶)

اور جس عذاب کا وعدہ ہم (کافروں) سے کر رہے ہیں۔ اگر اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو دکھلا دیں یا آپ کو وفات دے دیں تو آپ کے ذمہ تو صرف تبلیغ ہے اور حساب لینا ہمارا ہی کام ہے۔

اور کہیں اس سے ملتے جلتے الفاظ یوں آئے ہیں:۔

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ۔ (یونس، ع: ۵)

اور جس عذاب کا وعدہ ہم ان (کافروں) سے کر رہے ہیں، اگر اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو دکھلا دیں یا آپ کو وفات دے دیں تو ہمارے پاس تو انھیں واپس آنا ہی ہے۔

اور یہ مضمون انھیں آیتوں میں نہیں اور بھی متعدد آیتوں میں آیا ہے اور اگر تکرار سے مقصود مخاطبین کو رسول اللہؐ کی بشریت اور وفات پذیری سے خوب مانوس کر دینا ہے اور ایک جگہ تو انتہا یہ ہے کہ اس خاص وصف کے لحاظ سے رسول مقبولؐ اور کفار معاندین کو بالکل ایک ہی صف میں رکھ دیا گیا ہے۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (الزمر، ع ۳)

آپ بھی موت پانے والے ہیں اور یہ لوگ بھی موت پانے والے ہیں۔

عبدیت، قرآن نے بتایا کہ حضرات انبیاء کے لیے کوئی ننگ و عار کی چیز نہیں، فخر و مباہات کی بات ہے حضرت مسیح کا نام لے کر ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ أَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔ (النساء، ع ۲۴)

مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔

رسول برحق صلعم کی زبان سے یہاں تک کہلا دیا گیا کہ اور تو اور میں اپنی ذات کو بھی نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔ (یونس، ع : ۵)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات تک کے لیے تو نقصان و نفع کا اختیار نہیں رکھتا ہوں مگر ہاں جتنا اللہ کو منظور رہو۔

اور یہی مضمون ایک برائے نام لفظی فرق کے ساتھ سورۃ الاعراف میں ع ۲۲ میں دہرایا گیا ہے ۔

مشرکانہ مذہبوں کا ذکر نہیں مسیحیت تو اصلاً ایک توحیدی دین ہے اس تک میں شفیع مطلق حضرت مسیحؑ کو ٹھہرالیا گیا ہے، بلکہ جزء کے گویا حاکم و مالک ہی وہی ہوں گے اور جس کو چاہیں گے اپنے اختیار سے جنت دلوا دیں گے ۔ قرآن مجید نے اس کے برعکس رسولِ اسلامؐ کی زبان سے یہاں تک کہلایا ہے ۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ ۔ (الاحقاف ع ۱)

اور میں بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اور تمہارے ساتھ کیا ۔

اور خیر یہاں تو معاملہ حشر کے علم کی نفی رسولؐ کی زبان سے کرائی گئی ۔

دوسری جگہ علم غیب کی نفی کہنا چاہیے کہ مطلق صورت میں ہے ۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ (الاعراف ع ۲۳)

اگر میں غیب کا علم رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سے نفع حاصل کر لیتا اور کوئی مضرت میرے اوپر واقع نہ ہوتی ۔ میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں ۔

رسولؐ کی بشریت ایک اور لطیف و نادر طریقہ سے بھی قرآن مجید نے ظاہر کر دی ہے یعنی انجام کے ساتھ حضورؐ کے مادی اجزائے جسم، اعضاء اور شکل و شمائل کے اہم جزئیات کا بھی ذکر اپنے صفحات میں کر دیا ہے اور اس طرح کہنا چاہیے کہ سراپائے مبارک کا ایک خاکہ قرآن پاک کی مدد سے تیار ہو جاتا ہے ۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (الدخان ع ۳)

ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان سے آسان ہی کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت قبول کر لیں ۔

زبان مبارک کا تذکرہ ایک دوسرے موقع پر بھی موجود ہے ۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ (القیامۃ ع ۱)

اے پیغمبر! آپ قرآن پر زبان نہ ہلایا کیجئے کہ آپ اسے جلدی جلدی لیں ۔

زبان کے وجود کا اثبات اور وہ بھی دو دو جگہ، خواہ مخواہ اور بلا مقصد نہیں اس سے جہاں ایک طرف حضورؐ کے جسد ظاہری کا اکرام ظاہر ہوتا ہے وہاں مخاطبین کو یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ اس عبد محترم کا جسد و قالب گوشت و پوست کے انھیں لوازم کے ساتھ تھا۔ جو نوع بشری کے لیے عام ہیں۔ زبان کے ساتھ دل کا ذکر بھی آیا ہے۔ قلب اور فواد دونوں لفظوں کے ساتھ دو جگہ ۔ چنانچہ پہلی جگہ ۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی

آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبرئیل سے دشمنی رکھتا ہے تو انھیں نے تو

قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (البقرع ۱۲) — یہ قرآن آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اُتارا ہے۔

دوسری بار ایک اور سورت میں۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ۔ (الشعراء ع ۱۱) — اس قرآن کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

لفظ فؤاد کے ساتھ بسلسلہ معراج آیا ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔ (النجم ع ۱) — قلب (پیغمبر) نے دیکھنے والی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی۔

چشمان مبارک کے ذکر جمیل سے بھی یہ صحیفہ ربانی خالی نہیں۔

حضورؐ ہی کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ۔ (الحجر ع ۶) — اور آپ ہرگز آنکھیں اُٹھا کر بھی ان چیزوں کو نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان (نافرمانوں) کے مختلف گروہوں کو متمتع کر رکھا ہے۔

چشم مبارک کی بصارت کا ذکر کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ (النجم ع ۱) — نگاہ نہ تو ہٹی نہ بڑھی،

روئے مبارک کا تذکرہ تو شاید اور زیادہ ضروری تھا۔ اس سے یہ کتاب آسمانی کیسے خالی رہتی۔ حکم تحویل قبلہ کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ — ہم آپ کے چہرہ کا آسمان کی طرف بار بار اُٹھنا دیکھ رہے ہیں۔

اور پھر اسی آیت کے اندر انھیں الفاظ سے متصل۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ — بس آپ پھیر لیا کیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔

اور پھر چند سطروں بعد انھیں الفاظ کی تکرار دوسری اور تیسری بار روئے مبارک کو دین کی طرف یکسو رکھنے کا حکم سورۃ الروم میں دوبار قریب قریب ہی ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (الروم ع ۴) — سو اپنا رُخ دین کی طرف یکسو ہو کر رکھئے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ۔ (الروم ع ۴) — سو آپ اپنا رُخ اس دین راست کی طرف رکھئے۔

اور ایک جگہ حکم کی صورت میں آپ سے خطاب ہوا ہے کہ:

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ۔ — اگر یہ (مشرکین) پھر بھی آپ سے حجتیں نکالتے رہیں تو کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رُخ (خاص) اللہ کی طرف ہی کر چکا۔

ایک اور جگہ زبان مبارک سے یہ کہلایا گیا ہے کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ:

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا۔ — اپنا رُخ دین کی طرف یکساں ہو کر رکھنا۔

چشم مبارک کے علاوہ گوش مبارک کا بھی ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر صراحتہً نہیں تو دلالتہً تو بہر حال۔ منافقین مدینہ کا قول نقل ہوا ہے :۔

يَقُولُونَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ۔ (التوبہ ع ۸)
یہ کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سنتے ہیں۔ کہہ دیجیے، کہ آپ کان دے کر وہی بات سنتے ہیں، جو تمھارے حق میں بہتر ہے۔

اب سینہ مبارک کی طرف آیئے اور اس کا عکس اس آئینۂ آسمانی میں ملاحظہ فرمایئے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ (الانشرح)
کیا آپ کا سینہ ہم نے آپ کے لیے کھول نہیں دیا ہے۔

اور پشت مبارک کے ذکر کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں اسی کے متصل موجود ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔
اور آپ سے آپ کا وہ بوجھ دور کر دیا جو آپ کی پشت کو توڑے ڈالتا تھا۔

اور ان کے اعضائے جسد کے علاوہ قرآن معرض بیان میں حضورؐ کے بعض اعمال و حرکات جسمانی کو بھی لایا ہے مثلاً حضورؐ کا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور نماز اور عام عبادتیں مثلاً :

اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ (الشعرا ع ۱۱)
وہ اللہ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی نشست برخاست نمازیوں کے ساتھ۔

یا منکرین مشرکین کی زبان سے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع ۱)
ان رسولؐ کو یہ ہے کیا یہ کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں۔

یا پھر اس قسم کی آیتیں :۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (الاعراف ع ۲۴)
آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ پروردگار عالم کے لیے ہیں۔

حیات اور ممات دونوں کا ذکر اس آیت میں آگیا ایک جگہ مشرکین کو مخاطب کر کے عمر شریف کا بھی حوالہ آپ ہی کی زبان مبارک سے دیا گیا ہے :

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ (یونس ع ۲)
میں اس (دعویٰ نبوت) سے قبل بھی تو ایک عمر تک تمھارے درمیان رہ چکا ہوں۔

اسی طرح ایک جگہ اور قوم لوط کی سرمستی کو آپ کی عمر یا جان کی قسم کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔
آپ کی جان کی قسم وہ لوگ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

معاصرین

رسول اللہ صلعم کے سیرۃ نگار کے لیے بعض اہم سوالات یہ ہیں کہ آپؐ کو پیام کیا ملا تھا اور آپ پیامبر بنا کر کس طرف بھیجے گئے تھے اور وہ پیام ان لوگوں نے کس رنگ میں سُنا۔

تبلیغ کا حکم اجمالی طور پر تو ایک معنی میں آپ کو بعثت و نبوت کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ چنانچہ ایک ابتدائی سورۃ میں ہے۔

قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر ع ۱) آپ کھڑے ہو جیے اور ڈرائیے۔

لیکن یہاں یہ کچھ تصریح نہیں کہ کس کو ڈرائیے۔ انداز کا عمل کس پر کیجیے۔ اسی طرح یہ آیت بھی رتبہ تبلیغ کے باب میں مجمل ہی ہے۔

وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ (الحجر ع ۶) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اور کچھ ایسا ہی حال اس آیت کا بھی ہے۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ (الاعراف ع ۲۲) میں اور کچھ نہیں بجز اس کے کہ نذیر و بشیر ہوں۔

پھر یہ آیت بھی اسی طرح مطلق ہے اور تصریح سے خاموش۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (الاعراف ع ۲۳) غرض آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اُسے صاف صاف سُنا دیجیے اور مشرکوں کی پروا نہ کیجیے۔

اور کچھ اسی قسم کا حکم گو اور زیادہ موکد اس آیت سے بھی نکلتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ (المائدہ ع ۱۰) اے پیغمبر آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے آپ سب پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا ایک پیغام بھی نہ پہنچایا۔

اور اسی قبیل کی یہ آیت بھی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ (البقرہ ع ۱۴) بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو دین حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر۔

اور یہی آیت سورۃ الفاطر رکوع ۳ میں آئی ہے۔

اور وہیں یہ آیت بھی آئی ہے۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ۔ (الفاطر ع ۳) آپ تو بس ایک ڈرانے والے ہی ہیں۔

اور اسی مضمون کی اور لفظاً بھی اسی سے ملتی جلتی آیتیں اور بھی ہیں۔
مثلاً :

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (الفاطر ع ۳) — بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو دین حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر۔

اور

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (بنی اسرائیل ع ۱۲) — اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مبشر و نذیر بنا کر۔

اور ایسی ہی آیتیں سورہ الفتح و سورۃ الاحزاب و سورۃ الفرقان میں بھی ملتی ہیں۔

ان ساری آیتوں سے اتنا تو واضح بلکہ موکد طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کے ذمہ فریضہ تبلیغ و دعوت تھا اور آپ شروع ہی سے "بشیر" - "نذیر" "مبشر" اور "شاہد" تھے۔ یہ سب تصریحات اگر نہ ہوتیں جب بھی خود لفظ رسول ؐ کے اندر اجمالاً یہ فرائض آگئے تھے۔ رسالت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کا پیام کسی کو پہنچانا تو آپ کی پیام بری اور پیام رسانی میں تو کوئی اشتباہ اول روز ہی سے نہ تھا" گفتگو صرف اس میں ہے کہ آپ کا مخاطب کون سا گروہ کون سا طبقہ، کون سی انسانی آبادی تھی۔؟

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے سپرد تبلیغ و ہدایت سب سے پہلے آپ کے کنبہ اور برادری والوں کی ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ (الشعراء ع ۱۱) — اور اپنے قریب خاندان والوں کو ڈرا دیجئے۔

اور قدرۃً آغاز یہیں سے ہونا بھی تھا۔ اس کے بعد پھر اس قدرتی ترتیب سے دائرہ دعوت وسیع ہو کر قوم عرب یعنی نسل اسمٰعیل تک پہنچا۔ اس کی جانب رہنمائی متعدد آیات سے ہوتی ہے۔

مثلاً :

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (یٰسٓ ع ۱) — تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جس کے آباؤ اجداد ڈرائے نہیں گئے ہیں وہ اس سے بے خبری میں ہیں۔

اس "قوم" سے کھلی ہوئی مراد قوم عرب یا بنی اسمٰعیل سے ہے۔

دوسری آیت اسی تائید کی معنی میں ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ۔ (السجدہ ع ۱) — تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے قبل کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے۔

اور یہی مفاد اس قسم کی آیتوں کا بھی ہے جن میں یہ آیا ہے کہ آپ اُمیوں کے درمیان مبعوث کئے گئے ہیں اُن کی اصلاح و ہدایت کے لیے۔ مثلاً :

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ — اور اللہ وہی ہے جس نے اُمیوں کے درمیان ایک انہیں میں سے رسول ؐ

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الجمعہ ع ۱)

مبعوث کیا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں، اور انھیں پاک صاف بناتے ہیں اور انھیں کتاب و دانائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ قبل اس کے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

اُمیّوں سے کھلی ہوئی مُراد ام القریٰ یعنی مکہ معظمہ کے باشندے ہیں اور جب اس کے ساتھ وہ آیت ملائی جائے جس میں تقریباً یہی دُعا حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی ذریت کے حق میں کی ہے، یعنی :-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرہ ع ۱۵)

اے ہمارے ربّ ہماری ذریت کے درمیان ایک رسولؐ انہیں میں سے اُٹھا، جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک صاف بنائے بیشک تو ہی زبردست بھی ہے اور حکمت والا بھی۔

تو یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اُمت دعوت ساری نسل اسمٰعیل ہے۔

اب اس کے بعد دائرہ دعوت میں اور وُسعت ہوتی ہے اور خود رسُول پاک کی زبان سے یہ کہلایا جاتا ہے۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ (الانعام ع ۲)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمھیں بھی خبردار کر دوں اور جس کسی کو یہ پہنچے اس کو بھی۔

اس ایک و من بلغ کے اضافہ نے یہ صاف کر دیا کہ دعوت محمدیؐ اب اُنھیں کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں جو آپؐ کے مخاطبین اوّل تھے۔ بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر اس ساری آبادی کو بھی محیط ہو گیا ہے۔ جہاں تک قرآن پہنچ جائے اور چونکہ قرآن کے پہنچ جانے کا امکان روئے زمین کے ہر گوشہ تک ہے اس واسطے دائرہ دعوت بھی گویا اب سارے عالم تک وسیع ہو رہا ہے۔

یہ استنباط پھر بھی بالواسطہ تھا اور کچھ اسی قسم کا نتیجہ تکمیل دین والی آیت سے بھی نکالا جا سکتا تھا یعنی :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔ (المائدہ ع ۱)

آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر پوری کر دی اپنی نعمت۔

اور کہا جا سکتا تھا کہ جب دین کی تکمیل ہر پہلو سے ہو گئی اور اللہ کا انعام ہر طرح پورا ہو گیا، تو اب اولاد آدمؑ کا کوئی طبقہ اس کے فیض سے باہر کیوں رہے۔ لیکن اب اس بالواسطہ استدلال اور استنباط کی بھی ضرورت نہ رہی بلکہ صاف اور کھلے لفظوں میں ارشاد ہونے لگا کہ پیغام محمدیؐ ملک گیر نہیں بلکہ عالمگیر ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۔ (الفرقان ع : ۲)

بابرکت ہے وہ ذات جس نے فیصلہ والی کتاب اپنے بندہ (خاص) پر اُتاری تاکہ وہ سارے عالم کو خبردار کرنے والا ہے۔

اور دوسری جگہ ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام ع ۱۰) یہ (قرآن) نہیں ہے مگر نصیحت سارے عالم کے لیے۔

اور تیسری جگہ براہ راست رسول اللہؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا نِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (الاعراف ع ۱۰) آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف رسولؐ ہوں۔ اللہ کا جس کی سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے۔

چوتھی آیت بھی ایسی ہی واضح و صریح ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ (السباء ع ۳) اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو (اے پیغمبر) مگر سارے ہی انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔

غرض یہ کہ آپ کی بعثت و دعوت کا ساری نسل آدمؑ کی طرف ہونا تو ہر طرح ثابت اور یقینی ہے لیکن ظاہر ہے کہ آپ کا سابقہ بیک وقت ساری دنیا سے اور دور دراز بسنے والی قوموں سے کیونکر پڑ سکتا تھا۔ قدرتًہ براہِ راست سابقہ آپ کو انھیں لوگوں سے پیش آیا جو جغرافیائی اعتبار سے آپ سے متصل تھے یعنی عرب اور خصوصًا اس کے شہروں مکہ و مدینہ یا ان کے حوالی میں آباد تھے۔ تو اب تاریخی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان اہلِ ملک نے حضورؐ کے پیام کی پذیرائی کس حد تک اور کیونکر کی! — اور یہیں سے ایک بڑا طویل باب آپ کے معاصرین کے متعلق شروع ہوتا ہے۔

مُشرکین

ان میں سب سے پہلے نمبر مشرکین کا آتا ہے۔ ان کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مشرکین اور والذین اشرکوا کا ذکر اور شرک کے بابت احکام قرآن مجید میں صدہا آیتوں میں وارد ہوئے ہیں اور ان صریح الفاظ کے علاوہ بالواسطہ بھی جو آیات عبادت غیر اللہ کی ممانعت اور اس پر زجر و ملامت میں وارد ہوئی ہیں اُن کی تعداد تو اور بھی زائد ہے۔

محمد صلعم جو پیام لے کر آئے تھے اس کا اہم ترین جزو توحید ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یکتائی کا اثبات، ذات، صفات، افعال ہر پہلو اور ہر اعتبار سے۔ قرآن نے اسی پیام کو صدہا بار دہرایا ہے۔ مختلف پیرایوں میں اور تاکید سب سے زیادہ اسی کی رکھی ہے۔ کہیں یوں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ (النحل ع ۷) اور اللہ نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔

اور کہیں یوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَا آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس بشر ہی ہوں۔ تمھیں جیسا، اور مجھ

اِلٰهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ۔ (الکہف ع ۱۲) پر وحی یہ آئی ہے کہ تمھارا ایک ہی خدا ہے۔
(حٰمٓ السجدہ ع ۱۲)

کہیں مطلق صورت میں ارشاد ہُوا ہے کہ :-

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ۔ (البقرہ ع ۱۹) اور تمھارا خدا بس اکیلا ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

یا یوں

هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ (زمر ع ۱) وہی اللہ ایک اور زبردست ہے۔

اور کہیں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ جیسے یہی معیار اسلام یا انقیاد کا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (الانبیاء ع ۷) آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی یہ آئی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک خدائے واحد ہے تو اب تم اسلام لاتے ہو؟

اس مضمون کی آیتیں ایک دو نہیں، بیسیوں ہیں ـــ ایک جگہ ایک مختصر جامع سورۃ میں ہر قسم کی توحید کا اثبات اور ہر قسم کے شرک کی نفی کر کے لفظ بھی بجائے "واحد" کے "احد" لایا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ (الاخلاص) آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے اور (سب سے) بے نیاز ہے، نہ اس کے کوئی اولاد، نہ وہ کسی کی اولاد، اور نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے۔

اہل لغت اور علماء ادب نے لکھا ہے کہ احد، واحد کی ترقی یافتہ شکل ہے واحد جمع و تعدد کو قبول کر لیتا ہے لیکن "احد" تفرید میں کامل اور تجرید میں یکتا ہے اور اگر یہ ال کے اضافہ کے ساتھ الاحد کر کے لایا جائے تو یہ اسم ذات کی طرح مخصوص ہے اللہ تعالیٰ کے لیے اور ھو الذی لا الٰہ الا ھو اور اللّٰہ لا الٰہ الا ھو کی قسم کی تو بہ کثرت آیتیں قرآن میں ہیں جن سے خدا ؤں کے تعدد یا غیر اللہ معبود کے وجود ہی کی سرے سے نفی کی گئی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں اس قسم کے شرک جلی کی بڑی گرم بازاری تھی اور سب سے زیادہ یہی لوگ آپ کا پیام سن کر سُنی اَن سُنی کرتے تھے، اور چونکہ آپؐ مامور تھے تبلیغ پر جیسا کہ آیاتِ کریمہ :-

قُمْ فَاَنْذِرْ۔ (المدثر ع ۱) آپ کھڑے ہوجئے اور خبردار کیجئے۔

اور

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (المائدہ ع ۱۰) اے رسولؐ آپ پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر اُتارا گیا ہے۔

اور

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔ (آل عمران، ع ۲) آپ کے ذمہ تو بس پہنچا دینا ہے۔

اور

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ (النحل ع ۱) آپؐ کے ذمہ تو بس کھلم کھلا تبلیغ ہی ہے۔

اور بہت سی دوسری آیتوں سے ظاہر و ثابت ہے۔ اس لیے یہ بات ایک حد تک بالکل قدرتی تھی کہ جو لوگ اپنی وہم پرستیوں پر زیادہ راسخ اور جامد تھے۔ اُنھوں نے نئی دعوت کو سن کر اس کی مخالفت بھی شدت سے کی اور دعوت و داعیٔ دونوں کے دشمن ہو گئے۔ انھیں حیرت تھی کہ یہ نیا داعی سارے خداؤں کو چھوڑ کر خدائے واحد (یکتا) کی طرف کیسے بلا رہا ہے۔ کبھی حیرت اور غصہ کے ساتھ کہتے کہ :-

هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۔ (ص ع ۱)

یہ شخص ساحر ہے۔ کذاب ہے۔ کیا اس نے تمام خداؤں کو بس ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ بات تو بہت ہی عجیب ہے۔

اور کبھی یہ کہتے کہ :-

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۔

ہم نے تو یہ (کبھی اپنے) پچھلے مذہب میں سنا نہیں ہو تو یہ گڑھی ہوئی چیز ہے۔

اور اسی طرح قوم نوح نے بھی اپنے نبی کی دعوت توحید پر کہا تھا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ (المومنون ع ۲)

ہم نے اپنے باپ دادوں سے کبھی تو یہ سنا نہیں۔

قدرۃً رسولِ اسلام کا یہ مطالبہ مخاطبین کو بہت عجیب معلوم ہوتا اور ناگوار بھی گزرتا اور اُن کی طرف سے فرمائش طرح طرح معجزات کی ہوتی اور بار بار ہوتی کبھی کہتے ۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَا اٰيَةٌ ۔ (البقرۃ ع ۱۴)

اللہ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی معجزہ کیوں نہیں آتا۔

اور کبھی پیمبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں :-

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (الانعام ع ۱)

ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں آتا۔

یہ مضمون بیسیوں آیتوں میں دُہرایا گیا ہے اور کبھی یہ لوگ معجزات کا نام بھی متعین طور پر لے دیتے کہ اگر اپنے دعویٔ رسالت اور تعلق باللہ میں سچے ہو تو فلاں فلاں خارق عادت واقعات کر کے ہمیں دکھا دو۔ چنانچہ کہتے :

لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۔ اُن کے پاس اُنکے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں آتا۔

(ہود ع ۲)

اور کبھی یہ کہتے :

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۔ (الفرقان ع ۱)

ان پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُتار دیا گیا یا اُن کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔

اور کبھی ان فرمائشی خوارق و معجزات کی فہرست خاصی طول طویل ہوتی مثلاً یہ کہتے کہ :-

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۔ (بنی اسرائیل ع ۱۰)

ہم تجھ پر ایمان ہرگز نہ لائیں گے جب تک تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ نہ جاری کردے یا پھر تیرے لیے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو اور تو اس کے درمیان نہریں جاری کر دے یا آسمان کا کوئی ٹکڑا توڑ کر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا اللہ اور فرشتوں کو تو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے گھر سونے کا ہو جائے یا تو آسمان پر (ہماری آنکھوں کے سامنے) چڑھ جائے۔

یہ ساری آیتیں مکی ہیں اور ایسے فرمائشی معجزات کے مطالبے اہلِ مکہ خصوصاً قریش ہی کی جانب سے زیادہ پیش ہوتے رہتے تھے ——— اور ان کے شرک کے یہ معنی نہ تھے کہ یہ لوگ اللہ کے وجود کے منکر ہوں اور اس کے بجائے اور خدا تسلیم کرتے ہوں۔ نہیں یہ لوگ اللہ کے وجود کے پوری طرح قائل تھے۔ لیکن اسے خدائے واحد یکتا نہیں۔ بلکہ صرف خدائے اعظم تسلیم کرتے تھے۔ یعنی گو سب سے بڑا خدا اللہ ہے تاہم اس کے ساتھ یا شاید اس کے ماتحت اور بھی بہت سے خدا ہیں اور معبودیت و حاجت روائی میں اسی طرح ہیں، بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر اور اس لیے اس مشرکانہ منطق میں تعلق انھیں سے زیادہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس عقیدہ پر سخت جرح کی اور بار بار سوالات کر کے اہلِ جاہلیت کو ان کی جہالت پر متنبہ و آگاہ کیا۔ چنانچہ ایک جگہ یہ جرحی سوالات بہت دُور تک چلے گئے ہیں۔

ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ

(بھلا بتاؤ تو کہ) اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ آیا وہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے اس نے تمھارے لیے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے ہم نے رونق دار باغ لگائے اور تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگا سکو تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ یا وہ ذات جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے درمیان ندیاں بنائیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان حدِ فاصل بنائی تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر تو یہ سمجھتے ہی

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(النمل ع ۵)

نہیں آیا وہ جو بیقرار کی (فریاد) سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین پر صاحب تصرف بناتا ہے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ بہت ہی کم تم لوگ یاد رکھتے ہو۔ آیا وہ جو تمھیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ سجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ اللہ برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے! آیا وہ جو مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے اور پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور تمھیں رزق دیتا ہے آسمان و زمین سے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔ آپ کہیئے کہ تم اپنی دلیل لاؤ، اگر تم (دعویٰ شرک میں) سچے ہو۔

ان آیتوں میں مشرکین پر حجت قائم کی ہے کہ جب اللہ ہی خالق و فاطر، رازق و نافع اور ناظم امور ہے اور تم اسے تمام تر تسلیم بھی کرتے ہو تو آخر یہ تمھیں کیا سودا ہے کہ تم اس کے ہوتے ہوئے دوسرے خداؤں کی طرف جھکتے ہو، ان سے اپنی حاجتیں عرض کرتے ہو اور انھیں بھی درجہ معبودیت میں رکھتے ہو۔!

اور اسی طرح کی آیتیں بلکہ ان سے بھی زیادہ واضح ایک دوسری جگہ بھی وارد ہوئی ہیں۔ رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝

(المؤمنون ع ۵)

آپ کہیے کہ یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں یہ سب کس کے ہیں اگر تم کچھ خبر رکھتے ہو؟ (اس پر) وہ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ اللہ کے ہیں، ان سے کہیئے کہ پھر تم کیوں غور نہیں کرتے۔ آپ یہ بھی کہیے، کہ (ان سات) آسمانوں کا مالک اور عالی شان عرش کا مالک کون ہے؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ بھی اللہ کا ہے۔ آپ کہیے کہ پھر تم کیوں نہیں ڈرتے؟ آپ یہ بھی کہیئے کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور کوئی اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، اگر تمھیں کچھ بھی خبر ہو؟ اب بھی وہ ضرور ہی یہ کہیں گے کہ یہ سب اوصاف اللہ کے ہیں۔ آپ کہیئے کہ پھر یہ تمھیں کیا خبط ہو رہا ہے۔

اور اسی طرح ایک جگہ اور انھیں مشرکوں کی زبان سے اقرار کرایا ہے کہ خالق آسمان و زمین اللہ ہی ہے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ۔ (لقمان ع ۳)
اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ بول اُٹھیں گے کہ اللہ نے۔

چنانچہ جن آیتوں میں اثبات توحید اور ممانعت شرک پر زور دیا ہے وہاں اکثر یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ عبادت کا حقدار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

فَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ (النساء ع ۶)
عبادت اللہ کی کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

یا

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔ (الکہف ع ۱۲)
(انسان کو چاہیئے کہ) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

جن کی عبادتوں میں یہ مشرکین عرب لگے رہتے تھے اس کا وجود خارج میں سرے سے تھا ہی کہاں؟ ان لوگوں نے محض ایک خیالی اور فرضی وجود عطا کر رکھا تھا۔

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ۔ (یوسف ع ۵)
اور تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو وہ تو بس نام ہی نام ہیں۔ جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے دے رکھے ہیں۔

اس شرک کا ایک خاص مظہر بُت پرستی ہے، نام لے کر اس کی ممانعت وارد ہوئی۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ۔ (الحج ع ۴)
بتوں کی پلیدی سے بچو۔

اور یہ اوثان ہی کا لفظ پرانی مشرک قوموں یعنی قوم نوح (عنکبوت ع ۲) اور قوم ابراہیم (عنکبوت ع ۳) کے حق میں بھی وارد ہو چکا ہے یہ مورتیاں عموماً پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو جگہ جو ذکر آتش دوزخ کے سلسلہ میں انسانوں کے ساتھ پتھروں کا آیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳ میں وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اور دوسری جگہ انھیں الفاظ کے ساتھ سورۃ التحریم کے رکوع اوّل میں تو دونوں جگہ پتھر سے مُراد پتھر کی ترشی ہوئی مورتیاں ہی ہیں اور ان بڑی مورتیوں میں سے تین کا ذکر نام کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ ایک لات دوسرے عزیٰ اور تیسرے منات۔

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ۔ (النجم ع ۱)
بھلا تم نے نظر نہیں کی ہے لات پر اور عزیٰ پر اور تیسری اور منات پر۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ یہ تینوں بُت عرب کے مشہور و پرقوت قبیلوں کے تھے اور قرآن مجید نے قوم

نوحؑ کے جن دیوتاؤں کے نام سورۂ نوح ع ۲ میں گنائے ہیں۔ ود۔ سواع۔ یعوق۔ یغوث۔ نسر تاریخوں میں آتا ہے کہ یہ بت جاہلی عربوں کے بھی تھے اور عراق سے آکر ان میں بھی پوجے جانے لگے تھے۔

اہل جاہلیت کا اپنی صفائی میں کہنا یہ تھا کہ ہم ان بتوں کو کہیں خدا تھوڑے ہی سمجھ رہے ہیں۔ ہم تو انھیں بارگاہ خداوندی کے لیے محض ایک وسیلہ کر دانتے اور انھیں محض شافع اور سفارش کرنے والے مانتے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (الزمر ع ۱)

ہم تو انھیں محض اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ اللہ سے ہمیں قریب تر کر دیں۔

اللہ یا خدائے اعظم کے لفظی اعتراف و اعتقاد کے ساتھ عمل میں ان مشرکین عرب کا یہ حال تھا کہ اپنی پیداوار اور اپنے جانوروں میں جو حصے لگاتے، ان میں اللہ کے نام والے حصے تو بتوں کی طرف بے تکلف منتقل کر دیتے، لیکن یہ نہ کرتے کہ بتوں والے حصے اللہ کی طرف منتقل کر دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (الانعام ع ۱۶)

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں، اُن لوگوں نے اس میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا ہے اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبودوں کا ہے۔ پھر جو چیز اُن کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی ہے اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ اُن کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے کیا بُری تجویز ان لوگوں نے نکال رکھی ہے۔

ان مشرکانہ عقائد کا اثر ان مشرکوں کے اعمال اور ساری زندگی پر بھی پڑا تھا۔ اور یہ لوگ طرح طرح کے خرافات واوہام میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک بڑی چیز ان کی عادت اولادکشی تھی اور کھانے پینے کی چیزوں میں سے فلاں فلاں کا فلاں فلاں طبقہ کے لیے حرام کر لینا تھا۔ قرآن مجید نے اسی سورۂ انعام کی اسی آیت کے متصل ان چیزوں کو بھی ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شروع کی آیت ہے:۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ۔ (الانعام ع ۱۶)

اور اسی طرح کثرت سے مشرکین کے خیال میں اپنی اولاد کے ہلاک کر ڈالنے کو ان کے معبودوں نے اچھا بنا رکھا ہے تاکہ ان کو برباد کر دیں اور ان کے دین کو ان کی نظر میں مخبوط کر دیں۔

اور آخری آیت ہے:۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ (الانعام ع ۱۶)

یقیناً گھاٹے میں آ گئے جنھوں نے ہلاک کر ڈالا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر کسی سند کے اور اللہ نے جو کچھ کھانے پینے کو دیا تھا اسے حرام کر لیا اللہ پر جھوٹ باندھ کر بے شک یہ لوگ گمراہ ہو گئے اور راہ یاب نہ ہوئے۔

بت پرستی کے علاوہ یہ مشرکین ملائکہ پرستی میں بھی مبتلا تھے اور ملائکہ کو انھوں نے خدا کی بیٹیاں یا دیویاں ٹھہرا لیا تھا۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ۔ (الزخرف ع ۲)

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں سے خدا کا ایک جزو ٹھہرا لیا، بے شک انسان صریح ناشکرا ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں اپنے لیے لے لیں۔ اور بیٹوں سے تمھیں معزز کیا۔

اور دوسری جگہ رسولؐ سے خطاب ہے:۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ۔ (الصافات ع ۵)

ان مشرکوں سے پوچھئے کہ کیا آپ کے پروردگار کے لیے تو لڑکیاں ہیں اور ان لوگوں کے لیے لڑکے ہیں؟ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور یہ لوگ اس کے گواہ تھے۔

ملائکہ پرستی کے علاوہ جنات پرستی بھی ان کے اندر موجود تھی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ۔ (الانعام ع ۱۲)

اور مشرکوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنا لیا، حالانکہ اللہ ہی نے انھیں پیدا کیا ہے۔

جنات کو وہ اللہ کا قرابت دار سمجھتے تھے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا۔ (الصافات ع ۵)

ان مشرکوں نے اللہ اور جنات کے درمیان رشتہ داری بنا لی ہے۔

آفتاب پرستی اور ماہتاب پرستی کی جو صریح ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ۔ (حم السجدہ ع ۵)

نہ سورج کے آگے جھکو نہ چاند کے۔

اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ معاصر مشرکین عرب اجرام فلکی کی پرستش میں بھی بند نہ تھے۔

شراب، جوا، اور قمار کی مختلف قسمیں اتنی شائع تھیں کہ انھیں سختی سے روکنا پڑا۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ (المائدہ ع ۱۲)

بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بتوں کے تھان اور قرعہ کے تیر سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو۔ تاکہ فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے سو اب بھی تم ان چیزوں سے باز آؤ گے۔

اور سُود خواری کو تو جس اہتمام بلیغ سے قرآن نے منع کیا ہے وہ دس دلیلوں کی ایک دلیل ہے اس واقعہ تاریخی کی کہ مشرکین عرب کے معاشرہ میں سُود خواری خوب رچی بسی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ارشاد ہُوا۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (البقرہ ع ۳۸)

اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو لقیّہ سُود کو اگر تم (واقعی) مسلمان ہو۔

دوسری جگہ بھی اسی تاکید کے ساتھ:

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران ع ۱۴)

سود نہ کھاؤ دونا چوگنا اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

تیسری جگہ اسی شدّت کے ساتھ۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ ۔ (البقرہ ع ۳۸)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) نہیں اُٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے آسیب پہنچا کر دیوانہ بنا دیا ہو۔

اور پھر سب سے بڑھ کر۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔

اگر تم سود نہیں چھوڑتے ہو تو اشتہار جنگ سُن لو اللہ اور اس کے رسول ؐ سے۔

اولاد کُشی کا مرض بھی (کچھ آج ہی کے حالات سے ملتا ہوا) معاشی بنیادوں پر خوب پھیلا ہُوا تھا۔ اس لیے علاوہ ان آیتوں کے جو پہلے مذکور ہو چکیں۔ اس کی ممانعت اور اس پر وعید خاص طور پر نازل ہوئی۔ مثلاً:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل ع ۴)

اور اپنی اولاد کو ہلاک نہ کر ڈالا کرو، ناداری کے اندیشہ سے۔ ہی ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان مار ڈالنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

اس اولاد کُشی میں بھی خصوصیت کے ساتھ رواج دختر کُشی کا بعض قبیلوں میں تھا۔ ان کے شرمندہ کرنے کا ذکر حشر میں ان سے سوال کے وقت کا کیا گیا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۔ (التکویر)

اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے (حشر میں) سوال ہو گا کہ وہ کس جرم میں مار ڈالی گئی۔

بے حیائی۔ بے حجابی، بلکہ بے ستری کے عیب بھی عام تھے۔ چنانچہ فَاحِشَةً وَفَحْشَاء کی ممانعت بار بار آئی ہے اور اس قسم کی آیتیں جا بجا ملتی ہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۔ (الانعام ع ۱۹)

اور بے حیائیوں کے پاس نہ جاؤ۔ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔

یا مثلاً

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (الاعراف ع ۴)
آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو بس بے حیائیوں کو حرام کر دیا ہے۔ خواہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔

اور زنا کے حکم کے لیے جو ہر جاہلی تمدن کی طرح اس عرب تمدن میں عام تھا۔ یہ تہدیدی حکم نازل ہوا۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا۔ (بنی اسرائیل ع ۴)
اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ بے شک وہ بے حیائی ہے اور ایک بُری راہ بھی۔

ایک دستور یہ بھی جاری تھا کہ خوشحال لوگ اپنی باندیوں کے جسم کو کرایہ پر چلاتے تھے۔ وحی محمدیؐ اسے کیسے نظر انداز کر سکتی تھی۔ ارشاد ہوا۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ۔ (النور ع ۴)
اور اپنی باندیوں کو حرام کاری پر مجبور نہ کرو۔

کہیں کہیں عورتوں کو وراثت کا مال سمجھ کر خود ان پر قبضہ کر لیا جاتا تھا حکم آیا کہ ایسا ہرگز درست نہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا۔ (النساء ع ۳)
تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔

یہ بھی ایک دستور تھا کہ اپنی حقیقی ماں کے سوا جو عورتیں باپ کے عقد میں ہوتی تھیں۔ انھیں مال وراثت سمجھ کر اپنی بی بی بنالیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی حکماً مٹائی گئی۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا۔ (النساء ع ۳)
اور تم ان عورتوں سے عقد مت کرو جن سے تمھارے باپ عقد کر چکے ہوں۔ مگر ہاں جو ہو چکا ہو چکا۔ بیشک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور بہت بُرا طریقہ ہے۔

عورتوں۔ مردوں کا آزادانہ میل جول اور اختلاط اور لباس میں بے احتیاطی اور بد نظری۔ آج ہی کل کی تہذیب تمدن کی طرح عام تھیں۔ ان سب پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی گئیں اور حد بندیاں عائد کی گئیں۔ ارشاد ہوا۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ۔ (النور ع ۴)
اے پیمبرؐ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں کہ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے۔

اور عورتوں کے حق میں اس سے کہیں زیادہ پابندیاں بڑھا کر ارشاد ہوا کہ:

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ
اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں بجز اس کے جو اس میں سے کھلا ہوا ہے اور اپنی

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ۔ (النور ع ۴)

چادریں اپنے گریبانوں پر ڈال رکھیں، اور اپنی زینت نہ ظاہر ہونے دیں بجز اس کے کہ اپنے شوہروں پر۔

ان قریبی رشتوں کے نام بھی اس آیت میں آگے درج ہیں۔ رسالت محمدیؐ کو جو معاشرہ تیار کرنا تھا۔ اس میں یہ خلاف معاشرہ جاہلی کے یہ ساری قیدیں ضروری تھیں۔ چنانچہ آگے ارشاد ہوا ہے کہ:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۔ (النور ع ۴)

اور عورتیں زمین پر بھی اپنے پیر نہ ماریں کہ جس سے وہ زینت جسے وہ چھپاتی ہیں ظاہر ہو جائے۔

بلکہ ازواج نبی اور بنات نبی کے علاوہ عام مومنات کے لیے بھی یہ قاعدہ نافذ ہو گیا کہ:

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۔ (الاحزاب ع ۸)

اپنے اُوپر اپنی چادریں لٹکائے رہیں۔

ایک جامع آیت میں آپ کو یہ بتا دیا کہ عورتیں جب آپ کی خدمت میں بیعتِ اسلام کے لیے حاضر ہوں تو آپ اُن سے بیعت فلاں فلاں امور کے لیے لیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ ۔ (الممتحنہ ع ۲)

اے نبی جب مومنات آپ کے پاس ان امور پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کا شریک کسی شے کو نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اولاد کو ہلاک کر ڈالیں گی اور نہ اپنی بہتان کی روداد لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان بنا لائیں اور نہ مشروع باتوں میں آپ کے خلاف کریں گی تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجیے۔

اور عورت کی عام حالت اس جاہلی معاشرہ میں یہ تھی کہ لڑکی کا وجود باپ کے لیے باعث ننگ و کدورت تھا اور اس کے لیے ایسی شرم کی چیز تھی کہ وہ ہر طرف منہ چھپائے پھرتا تھا۔

قرآن مجید عربی معاشرہ کا یہ نقشہ یوں کھینچتا ہے:۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۔ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۔ (النحل ع ۷)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سُنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور غصّہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے وہ اس خبر کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ اُسے ذلت کے ساتھ قبول کرے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔

جاہلی عرب کے عقائد اور اخلاق و معاملات کی دُنیا میں تو یہ اندھیر مچا ہوا تھا ہی عبادات کے عالم میں بھی سکہ جہالت جاہلیت

ہی کا رواں تھا۔ کعبہ کو واجب التعظیم اور اس کے زائرین کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت یہ لوگ بھی اپنے لیے سمجھتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کے رکوع ۳ کی آیت اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے ظاہر ہو رہا ہے لیکن ان کی عبادت کا طریقہ کیا تھا ؟ خانہ کعبہ کے گرد سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۔ (الانفال ع ۴) ان مشرکوں نے خانہ کعبہ کا پاس نہیں کیا بجز سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے۔

بلکہ اس عبادت کے وقت تو ان جاہلیوں کو رفع برہنگی اور لباس سازی کی بھی پروا نہ تھی اور اس لیے قرآن مجید نے تاکید کی کہ :

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ۔ (الاعراف ع ۳) اے بنی آدم تم مسجد میں حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

اور مسلمانوں کی عبادت پر تو یہ لوگ اہل کتاب کے ساتھ مل کر مضحکہ و استہزا ہی کرتے رہتے۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۔ (مائدہ ع ۹) اور اے مسلمانو! جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو یہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں۔

مشرکین عرب کے بنیادی عقائد کے سلسلہ میں ان کی اعتقادی زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کی علمی، معاشرتی، اخلاقی زندگی کا بھی ذکر آگیا لیکن شرک جلی کی بھی ایک قسم ان میں رائج نہ تھی۔ بعض کے عقائد کے ڈانڈے دہریت کی سرحدوں سے چھو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۔ (الجاثیہ ع ۲) کوئی اور زندگی نہیں ہے بجز اس دنیوی زندگی کے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی نہیں مارتا ہے بجز زمانہ کے۔

یعنی کوئی خالق بالارادہ موجود نہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ مادّی حیثیت سے زمانہ ہی کے الٹ پھیر سے ہوتا رہتا ہے اور آخرت کی جزا اور سزا سے انکار تو ان کے ہاں عام تھا اور جو خدا کے کسی درجہ میں قائل بھی تھے۔ وہ بھی اس کے قائل بہر حال نہ تھے کہ موت کے بعد کسی اور عالم میں جانا اور وہاں کسی حاکم سے سابقہ پڑنا، اور کسی مالک کے حضور میں جانا ہے۔ یہ علانیہ کہتے۔

اِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۔ (الانعام ع ۳) کہ زندگی تو بس فی الحال کی ہے اور ہم بعد کو اُٹھائے جانے کے نہیں۔

انکار آخرت کے اقوال قرآن مجید نے ان لوگوں کی زبان سے اس کثرت سے نقل کئے ہیں کہ معلوم ایسا ہونے لگتا ہے کہ شاید انکار توحید سے بھی بڑھ کر یہ لوگ انکار آخرت میں سخت تھے اور یہ بات ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آرہی تھی کہ اس حیات مادّی کے بعد ایک اور عالم بھی ہے، جہاں اس زندگی کے اعمال کی پرسش ہوگی۔ ان پچاسوں بلکہ سینکڑوں اقوال سے صرف دو چار بہ طور نمونہ نقل ہو جانے کافی ہوں گے۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ۔ (النازعات ع ۱)

کہتے ہیں کہ ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہوں گے کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ پھر واپس ہوں گے کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ واپسی بڑے خسارہ کی ہوگی۔

اور جنات کی زبان سے ہے :-

اِنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ (الجن ع ۱)

اور جیسا تم جنات نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی ان انسانوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ کسی کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔

اور پھر ایک جگہ منکرین کا قول نقل کیا ہے۔

هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ م بَعِيْدٌ۔ (ق ع ۱)

یہ تو عجیب بات ہے کیا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو دوبارہ زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ زندہ ہونا تو بہت ہی بعید ہے۔

پیمبر کی اس تذکیر آخرت پر بڑی حیرت سے یہ لوگ آپس میں کہتے :-

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ۔ (السباء ع ۱)

ہم تم کو ایسا آدمی بتائیں نہ، جو تم کو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو ضرور ایک نئے جنم میں آؤ گے۔ اس شخص نے یا تو خدا پر جھوٹ باندھ لیا ہے یا اسے کسی طرح کا جنون ہے۔

اتنے ہی قول بالکل کافی ہیں۔ ورنہ اگر سارے قول منکرین آخرت کے نقل ہوں مع ان جوابات کے جو قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کی زبان سے ادا کر دیئے ہیں تو مقالہ اپنے حدود سے گزر کر ایک مستقل رسالہ کی ضخامت اختیار کر جائے۔

انھیں مشرکین میں ایک بہت بڑا فرقہ ایسا بھی تھا جو خدا، اور خدائے اعظم کا قائل کسی حد تک تھا لیکن وحی الٰہی اور نبی کے ذریعہ سلسلہ ہدایت کا یکسر منکر تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ جاتا تھا کہ خدا کے اولاد ہے یا یہ کہ خدا نخواستہ انسانی قالب اختیار کر کے دنیا میں آ گیا لیکن یہ کسی طرح بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا نے ایک بشر کو ذریعہ ہدایت بنا کر بھیجا اور اس سے مرضیات الٰہی کے تمام نکتے اور طریقے بتلا دیئے یہ لوگ بگڑ کر کہتے :-

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا۔ (التغابن ع ۱)

ہماری ہدایت کو بشر آتے ہیں۔

اور کبھی یہ کہ :

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل ع ۱۱)

کیا خدا نے رسول بنا کر بشر کو بھیجا ہے۔؟

کبھی آپس میں پیمبر کے حق میں سرگوشیوں میں کہتے :

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (انبیاء ع ۱)

یہ تو بس تم ہی جیسا ایک بشر ہے۔

اور آپؐ کے لوازم بشریت کو آپؐ کے خلاف بہ طور دلیل پیش کرتے ۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ ۔ (الفرقان ع ۱)

اس پیمبر کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا۔

اور چونکہ بشر پر وحی آنا۔ اُن لوگوں کے دماغ کوتاہ میں بشریت کے منافی تھا اس لیے یہ لوگ قدرتاً تکذیب رسولؐ پر مجبور تھے اور کبھی یہ کہتے کہ آپ مجنون ہیں ۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۔ (الحجر ع ۱)

اور ان لوگوں نے یہ کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے تم تو مجنون ہو۔

کبھی کہتے :۔

اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔ (السباء ع ۱)

انھیں کیا کچھ جنون ہے ۔

قرآن نے خود ان کے متعلق سوال کیا ہے ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (المومنون ع ۴)

کیا یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں ؟

کبھی ان کی تشخیص و تجویز میں آپؐ خیالی مضمون باندھنے والے اور مؤثر عبارت میں ادا کرنے والے شاعر ٹھہرتے اور آپ کی وحی قرآنی ایک خواب پریشان اور آپ کی گڑھی ہوئی قرار پاتی ۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔ (الانبیاء ع ۱)

بلکہ یوں کہا کہ یہ تو خیالات پریشان ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے اُسے تراش لیا ہے۔ بلکہ ایک شاعر شخص ہے ۔

دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے :

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۔ (الطور ع ۲)

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم حادثہ موت کا انتظار کر رہے ہیں ۔

اور کبھی شاعری کے ساتھ دیوانگی کا بھی اضافہ کر دیتے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۔ (الصافات، ع ۲)

اور یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے دیوتاؤں کو ایک شاعر دیوانہ کی خاطر چھوڑ دیں ۔؟

اور کبھی الفاظ بدل کر اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ۔

وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۔ (الدخان ع ۱۱)

بیشک اُن کے پاس ایک کھلا ہوا پیمبر آ چکا، پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ سکھایا ہوا ہے۔ دیوانہ ہے ۔

شاعری اور جنون کے ساتھ ایک تیسری تشخیص سحر زدگی کی بھی تھی۔

قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (الفرقان ع ۱)
یہ ظالم لوگ (آپس میں) کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔

اور یہی مضمون ایک دوسری جگہ:

اِذْ هُمْ نَجْوٰىٓ اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ع ۵)
(ہم خوب جانتے ہیں) جس وقت یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور جبکہ یہ ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔

اور کبھی آپ کی نسبت سحر و کہانت کی جانب کرتے جو ان کی دانست میں دو زبردست اور مؤثر فن، غیب سے تعلق رکھنے والے تھے۔ قرآن مجید کو اس کی صاف صاف تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ (الحاقہ ع ۱)
یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔

اور

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ (الحاقہ ع ۱)
یہ کسی کاہن کا کلام نہیں۔

یا یہ باہم خود بھی کسی ایک بات پر جمتے نہ تھے اور قرآن نے انھیں مخاطب کر کے صاف کہہ دیا کہ:

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ۔ (الذاریات ع ۱)
تم لوگ مختلف گفتگو میں (پڑے ہوئے ہو) اس سے وہی پھرتا ہے جس کو پھرنا مقدر ہوتا ہے۔

اور ان کے خرافات کے الگ الگ بھی جوابات دیئے اور ان کی ایک ایک غلط بیانی کی تردید کی مثلاً:

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (التکویر)
اور یہ تمھارے رفیق دیوانے نہیں ہیں۔

یا

وَمَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ۔ (القلم ع ۱)
آپ اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔

یا پھر

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۔ (الطور ع ۲)
تو آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہیں نہ دیوانے۔

قرآن کے اثر سے ان منکرین و معاندین کے لیے بھی انکار ممکن نہ تھا۔ مشاہدہ کی چیز تھی۔ قرآنی اثر کی گہرائی اور وسعت دونوں براہِ راست مشاہدہ ہی کرتے رہتے تھے اس لیے رائے آخر یہ ہوئی کہ ہو نہ ہو یہ قرآن انھوں نے دل سے گڑھ لیا ہے اور ان کی امداد و اعانت پر ایک پوری جماعت بھی ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِفْتَرَاهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ۔ (الفرقان ع ۱)
یہ قرآن تو نری ایک گڑھنت ہے جس کو اس شخص نے گڑھ لیا ہے اور ایک اور جماعت نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔

پھر آپ کے وصف اُمیّت سے بھی چونکہ یہ لوگ براہِ راست واقفیت رکھتے تھے اس واسطے یہ کہتے کہ یہ اگلوں کی خرافاتی حکایات اُنھوں نے کسی سے لکھوا رکھی ہیں اور وہ اُنھیں صبح و شام پڑھ کر سنا دی جاتی ہیں۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ (الفرقان ع ۱)
یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو اگلوں کے بے سند قصے ہیں۔ جو اس شخص نے (کسی سے) لکھوا لیا اور وہی اس کو صبح و شام پڑھ کر سنا دی جاتی۔

اور کبھی یہ دُور کی کوڑی لاتے کہ یہ تو فلاں شخص نے اُنھیں سکھا پڑھا رکھا ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ۔ (النحل ع ۱۴)
اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک بشر نے اُنھیں سکھا دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید ان لوگوں کے خیال میں اور آج کے بہت سے روشن خیال فرنگیوں کے خیال کے مطابق ایک گڑھا ہوا کلام تھا۔

وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى۔ (السباء ع ۵)
اور یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو بجز ایک گڑھے ہوئے بہتان کے کچھ نہیں۔

بلکہ ان مشرکوں کے ایک رئیس و سردار نے ایک بار بڑے سوچ بچار کے بعد اپنا فیصلہ یہ سُنا دیا تھا کہ :۔

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ (المدثر ع ۲)
یہ تو نرا ایک جادو ہے۔ جو قدیم سے چلا آرہا ہے اور یہ تو نرا ایک بشر کا کلام ہے۔

قرآن مجید نے شافی جواب ان میں سے ہر خرافات کا دیا ہے۔ یہاں ان جوابات سے بحث نہیں۔ یہاں تو دکھانا صرف یہ ہے کہ جس قوم کی براہِ راست اور اصالتاً اصلاح کے لیے رسُول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے۔ اس کی اعتقادی، عملی، اخلاقی زندگی کا نفسیاتی پس منظر کیا تھا اور اس نے آپ کے پیام کی پذیرائی کس طرح کی۔

شرک میں ڈوبی ہوئی قوم کی ناخوشی کی اصل بنیاد یہ تھی کہ یہ پیامبر جو کلام سُناتے ہیں اس میں ذکر سارے دیوی دیوتاؤں اور چھوٹے بڑے خداؤں کو چھوڑ کر نام صرف اللہ ہی کا کیوں لیئے جاتے ہیں اور دعوت اس اکیلے معبود کے ماننے کی کیوں دیتے ہیں قرآن مجید نے انھیں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے :۔

وَاِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔ (المومن ع ۲)
جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو تم انکار کرتے ہو اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا ہے تو تم مان لیتے ہو۔

ضد اللہ کے نام سے بہ شمول و شرکت دوسرے معبودوں کے نہ تھی۔ اصل ضد اس سے تھی کہ اس اللہ کی وحدت پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے اور پھر ارشاد ہوا ہے:۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (الزمر ع ۵)

اور جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہونے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

اور ایک جگہ پھر یہی شہادت قرآن پیش کرتا ہے۔

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ع ۵)

اور آپ جب قرآن میں صرف اپنے پروردگار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔ نفرت کرتے ہوئے۔

ایسی قوم کو داعیٔ توحید سے نفرت و عداوت ہو جانا لازمی تھا اور قرآن مجید نے امتِ محمدیؐ کو مخاطب کر کے سنا بھی دیا تھا کہ اہل کتاب کے علاوہ ان مشرکوں سے بھی تمھاری بہت کچھ دل آزاری ہونا ہے۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا۔ (آل عمران ع ۱۹)

اور تم ضرور سنو گے بہت سی دل آزاری کی باتیں، ان سے بھی جنھیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے، اور ان سے بھی، جو مشرک ہیں۔

منافقین

قرآن کی مکی سورتوں میں کثرت سے ذکر مشرکین کا آتا ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے پیام اور پیامبری کے کھلے ہوئے منکر تھے اور مکہ میں قرآن کے براہ راست مخاطب تھے۔ مدنی سورتوں میں اس کے برعکس ذکر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اور ان سے زیادہ کثرت سے ایسے طبقہ کے لوگوں کا آتا ہے جو رسول و رسالت کا کھلا ہوا منکر نہ تھا۔ بلکہ بظاہر معتقد و مطیع تھا، لیکن زبانی اقرار پر قلبی انکار غالب تھا۔ اپنے آپ کو شامل گروہ مومنین میں کرانا چاہتا تھا، لیکن عقاید مشرکین یا یہود کے رکھتا تھا اور در پردہ سازشیں اسلام اور شارح اسلام کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ لوگ منافقین کہلاتے تھے۔ اور قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے مخاطبین کے چار طبقوں میں سے ایک مستقل طبقہ ان لوگوں کا تھا۔

قرآن مجید نے اکثر تو انھیں براہ راست منافقین ہی کہہ کر یاد کیا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس گروہ میں عورتیں بھی خاصی تعداد میں شامل تھیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے منافقات کا لفظ لا کر ان کی تصریح بھی کم سے کم چار مقامات پر تو کی ہی ہے۔ اور کہیں کہیں بجائے اسم کے۔ اس طبقہ کے لیے صیغہ فعل سے جو دی ہے۔ مثلاً الَّذِيْنَ نَافَقُوْا اور کہیں اس طبقہ کے لیے

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ لایا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کے اندر روگ ہے۔ اسی طرح کل ملا کر اس طبقہ کا ذکر قرآن مجید کے مدنی حصہ میں خاصی کثرت سے ملے گا۔

ان کے ذکر کا آغاز کہنا چاہیے کہ قرآن مجید کے آغاز سے ہو جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کا دوسرا ہی رکوع ہے کہ پہلے رکوع میں مومنوں اور منکروں دونوں کے تذکرے کے بعد معاً یہ بیان سامنے آجاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ۔ (البقرۃ ع ۲)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے یہ ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روز جزا پر حالانکہ وہ ذرا بھی صاحب ایمان نہیں۔

ان کے عمق قلب میں ایمان کا ذرا بھی گزر نہ تھا۔ ان کا کاروبار تمام تر دیدہ و دانستہ دھوکے بازی اور فریب دہی کا تھا۔

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ۔ (البقرہ ع ۲)

یہ دھوکا دے رہے ہیں (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو، حالانکہ کوئی بھی ان سے دھوکا نہیں کھا رہا ہے۔ سوا ان کے اپنے نفس کے اور یہ اس کا بھی ادراک نہیں رکھتے۔

ان کے قلب کے اندر حسد و نفاق کا مرض تھا۔ اسلام کی ترقی دیکھ دیکھ کر انھیں اور جلن پیدا ہوتی تھی اور اس مرض کی آگ اور بھڑکتی رہتی تھی۔ انھیں تکذیب رسول کے علاوہ اس نفاق کی خصوصی سزا کی خبر دے دی گئی۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ۔ (ایضاً)

ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے تو اللہ نے ان کے مرض کو اور ترقی دے دی۔ انھیں عذاب دردناک ہونا ہے اپنے اس جھوٹ پر۔

ان کی اس منافقانہ زندگی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اللہ کی زمین پر بگاڑ پھیلے اور جب انھیں ان کے اس رویہ پر فہمائش کی جاتی تھی تو الٹے اس کی تردید و تکذیب کرتے اور اپنے آپ کو پاک صاف ظاہر کرتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ۔ (البقرۃ ع ۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر بگاڑ مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں واہ ہم اور بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں۔ خوب سن لو کہ مفسد یہی لوگ ہیں اور یہ اس کی بھی خبر نہیں رکھتے۔

پھر آگے ان کے اس دورُخے پن کا ذکر ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں اور جب شیطان صفت معاندین اسلام کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں تو ان کی سی کہنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کو بنا رہے تھے۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ بیچارے کسی کو کیا بنائیں گے۔ الٹے خود ہی بن رہے ہیں اور اپنے عصیان و طغیان کے دلدل میں اور پھنستے ہی جا رہے ہیں۔ اور ان کو جب عام مومنین کی طرح قبول اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑ اکڑ کر اور اترا اترا کر بولتے ہیں کہ کیا ہم بھی ان لوگوں کی طرح کچھ سادہ لوح ہیں! ــــ اس کے بعد قرآن نے ان کی تہ بہ تہ گمراہیوں اور کج رائیوں کی دو دو تمثیلیں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں اور ان کے انجام بخیر ہونے کے بجائے ان کے انجام بہ شر ہونے کی خبر دی ہے۔

ان کی ایک عادت یہ بھی کہ بے تحاشہ کلمے کفر و انکار کے بک جاتے تھے اور جب گرفت ہوتی تو جھٹ مکر جاتے، حالانکہ اس کے بعد تو وہ ظاہراً بھی اسلام سے بھی نکل جاتے۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔ (التوبۃ ع ۱۰)

یہ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی تھی حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی تھی اور اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے ایسی بات کا ارادہ کیا تھا جو ان کے ہاتھ نہ لگی۔

اس آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص مقصد ان لوگوں کے پیش نظر تھا، جو حاصل نہ ہو سکا، اور چونکہ آیت ایک غزوہ کے سیاق میں ہے اس لیے عجب نہیں کہ ان آستین کے سانپوں کا مقصد لشکر اسلام کے اندر پھوٹ ڈالنا اور رنجشیں پیدا کرا دینا ہو، جیسا کہ روایات سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ مسلمانوں کے سامنے آ آکر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اُنھیں اپنے سے راضی کر لینا اور اپنے سے پرچا لینا چاہتے تھے اور چونکہ مسلمانوں سے ملے جلے اور بظاہر انھیں کے گروہ میں شامل رہا کرتے۔ اس لیے اس کوشش میں کامیابی ان کے لیے کچھ دشوار بھی نہ تھی، حالانکہ اگر صداقت دیانت ذرا بھی ہوتی تو کوشش اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کے لیے کرتے رہتے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ۔ (التوبۃ ع ۸)

یہ لوگ تم مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم کو پرچا ئیں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول ہی اس کے حق دار ہیں۔

جھوٹی قسموں میں یہ لوگ منجھے ہوئے تھے لیکن زبان وحی بھی برابر ان کی نقاب کشی کرتی رہتی۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ۔ (التوبۃ ع ۷)

یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمھیں میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ بزدلے ہیں۔

صدق دل سے رسول اللہ پر ایمان لانا، لیکن ہاں یہ لوگ رسول کی بدگوئی کرتے رہتے اور طرح طرح آپ کی اذیت قلب کے باعث بنتے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ۔ (التوبۃ ع ۸)

انھیں میں وہ لوگ بھی ہیں۔ جو نبی کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کان کے کچے ہیں۔

یہ جھوٹ بولنے، تمسخر کرنے اور بات بنا لینے میں مشاق اور بیباک ہونے کے باوجود قرآن جو ان کی پردہ دری کرتا رہتا۔ اس سے ڈرتے رہتے اور اس کا کچھ بھی علاج ان کے بس میں نہ تھا۔ آسمانی ریکارڈ میں شہادت موجود ہے کہ:

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِئُوا

یہ لوگ اس سے اندیشہ کرتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نہ نازل ہو جائے جو ان کو ان منافقین کے مافی الضمیر پر مطلع

اِنَّ اللّٰہَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۔ (التوبۃ ع ۸)

کہ دیجئے آپ فرما دیجئے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو۔ بے شک اللہ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم اندیشہ کرتے تھے۔

جب گرفت ہوتی تو بڑا حیلہ اپنے بچاؤ کا ان کے پاس یہ تھا کہ کہیں واقعی یہ عقاید وخیالات ہمارے تھوڑے ہی ہیں۔ یہ باتیں تو محض ہم خوش طبعی کے طور پر کہہ دیتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۔ (ایضاً)

اور اگر آپ ان سے پوچھیے تو کہہ دیں گے کہ یہ تو ہم محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے ہیں۔

قرآن نے اس عجیب وغریب عذرِ گناہ کا جواب دیا۔ وہ بھی سننے کے قابل ہے۔

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۔ (التوبۃ ع ۸)

تو آپ اُن سے کہئے کہ اچھا تو تمہارا یہ استہزاء اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ تھا؛ اب کوئی عذر پیش مت کرو۔ تم تو اپنے کو مومن کہلانے کے بعد کفر کرنے لگے۔ تم میں سے ایک گروہ کو ہم چھوڑ بھی دیں تو ایک گروہ کو ہم سزا دیں ہی گے۔ اس لیے وہ لوگ مجرم تھے۔

ان کی منافقانہ کارروائیوں کا ذکر اکثر جنگ وغزوات کے سلسلہ میں آیا ہے (جیساکہ سورۃ التوبہ میں خصوصاً آیا ہے) اس سے اتنا تو بہر حال ظاہر ہوتا ہے کہ فوج میں بد دلی پھیلانا، فوج کے اندر اختلافات ونفاق پیدا کرا دینا، عین وقت پر ہتھیار رکھ دینا، دشمن سے سازباز کر لینا، اسے اپنے ہاں کے رازوں پر مطلع کر دینا اور اسی قبیل کے وہ جرائم جو فوجی قانون اور میدانِ جنگ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان کے مرتکب تو یہ ضرور ہی ہوتے ہوں گے لیکن قرآن مجید نے ان پر فردِ جرم جو لگائی ہے۔ وہ اس سے زیادہ وسعت وعموم رکھتی ہے اور منشا اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کا پھیلایا ہوا بگاڑ ساری ہی اجتماعی زندگی تک محیط ہو چکا تھا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ ۔

یہ منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہیں تعلیم دیتے ہیں بُری باتوں کی اور باز رکھتے ہیں اچھی باتوں سے اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔

یقبضون ایدیھم سے صاف اشارہ ان کی ترویج بخل کی طرف نکلتا ہے۔ اور اس کے اُوپر ذکر ان کی عام بداخلاقی وبدکاری کا ہے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ بھی قرآن نے ظاہر کر دیا ہے۔

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (التوبۃ ع ۸)

یہ اللہ کو بھلا بیٹھے تو اللہ نے بھی اُنھیں بھلا دیا۔ فاسق لوگ بھی منافق ہی تو ہیں۔

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس طبقہ کا ذکر بار بار کافروں اور مشرکوں پر عطف ہو کر آیا ہے اور ان کے انجام کا شریک ان کو بھی بتایا گیا ہے۔ مثلاً :-

وَعَدَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْکُفَّارَ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ھِیَ حَسْبُھُمْ وَلَعَنَھُمُ اللّٰہُ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ۔ (التوبۃ ع ۸)

اللہ نے عہد کر رکھا ہے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہی ان کے لیے کافی ہے اور اللہ اُن کو اپنی رحمت سے دُور رکھے گا۔ اور ان کا عذاب دائمی ہے۔

اسی طرح پیمبر کو ایک جگہ جہاں ایک ہدایت کی ہے وہاں بھی منافقوں کا عطف کافروں پر ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَدَعْ اَذٰھُمْ (الاحزاب ع ۹)

اے پیمبر کافروں اور منافقوں کا کہا نہ کیجئے اور ان کی طرف سے جو اذیت پہنچے اس پر التفات نہ کیجئے۔

وَدَعْ اَذٰھُمْ کا تعلق جتنا کافروں سے ہے اتنا ہی منافقوں سے بھی ہے گویا یہ صاف ہو گیا کہ جتنی اذیت آپ کو منافقوں یعنی ان نام کے مسلمانوں کی طرف سے پہنچتی رہتی تھی وہ اس سے کچھ کم نہ تھی جو کھلے ہوئے منکروں کی طرف سے پہنچتی رہتی تھی۔

ایک جگہ ذکر ہے کہ اللہ کے ساتھ بدگمانی رکھنے کی سزا اُن کو اور ان دونوں کو ملے گی۔ وہاں بھی منافقوں کو مشرکوں کے ساتھ عطف کر کے بیان کیا ہے۔

وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِکِیْنَ وَالْمُشْرِکٰتِ الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوْءِ۔ (الفتح ع ۱)

تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے ساتھ برے برے گمان کرتے ہیں۔

اور تقریباً یہی الفاظ ایک جگہ اور دُہرائے ہوئے ملتے ہیں۔

لِّیُعَذِّبَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِکِیْنَ وَالْمُشْرِکٰتِ۔ (الاحزاب ع ۹)

انجام یہ ہوا کہ اللہ عذاب دے گا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو۔

ان منافقین کا اصلی جرم تو ان کا یہی نفاق تھا۔ یعنی دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ دل سے خاص انکار اور زبان پر محض اقرار، قرآن مجید نے ان کی فردِ جرم میں نمبر اوّل پر اس کو رکھا ہے۔

یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِھِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ۔ (الفتح ع ۲)

اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں بالکل نہیں ہیں۔

لیکن اس بنیادی اور اعتقادی جرم کے علاوہ ان کے عملی اور اجتماعی جرائم بھی کچھ کم قابلِ مواخذہ و تعزیر نہ تھے۔ مدینہ میں رہ کر عفیف و پاک دامن مسلمان باشندگانِ شہر کی بدخواہی اور دشمنی میں لگے رہنا ان پر آج کل کی اصطلاح میں سرد جنگ جاری رکھنا۔ یعنی شہر میں وحشت انگیز افواہیں پھیلاتے رہنا ان لوگوں کا مستقل شعار بن گیا تھا۔ قرآن مجید نے اس سیاق میں ان کا ذکر کر کے اُن کے لیے سزائیں بھی انتہائی اور عبرت انگیز تجویز کر دی ہیں:۔

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَّلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ (الاحزاب ع ۸)

اگر نہ باز آئیں یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، اور مدینہ میں افواہیں اُڑاتے رہتے ہیں تو ہم آپ کو ان پر ضرور مسلط کر دیں گے۔ پھر یہ لوگ شہر میں آپ کے پاس شہر بھی نہ پائیں گے مگر یاں بہت ہی کم اور وہ بھی لعنت زدہ بس جہاں کہیں مل گئے انھیں پکڑا اور مار کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔

ان کی اخلاقی پلیدی اور روحانی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ آخرت میں ان کا انجام سب سے بدتر قرار پایا کہ ایک تو قبولِ اسلام سے انکار اور مسلکِ کفر و شرک پر جمود اور اس پر اضافہ اس ریا و مکر کا کہ ہم تو مسلم و مطیع ہیں۔ ارشاد ہوا ہے :

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا۔ (النساء ع ۲۱)

بیشک منافقین دوزخ کے سب سے بڑے طبقہ میں ہوں گے، اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔

اور ان کے جرائم کی پاداش میں ان کا انجام اخروی یاد دلا کر دُنیا میں بھی ان کے ساتھ معاملہ سختی کا رکھا گیا ہے اور انھیں کافروں ہی کی صف میں رکھ کر پیمبر کو حکم ان کے خلاف بھی "جہاد" کا ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (التحریم ع ۲)

اے نبی جہاد کافروں اور منافقوں سے کیجئے اور ان پر سختی کیجیے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑی بری چیز ہے۔

یہ آیت ابھی سورہ تحریم کی تلاوت ہوئی اور بعینہٖ یہی آیت سورۃ التوبہ رکوع ۸ میں بھی وارد ہو چکی ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ یہاں لفظ جہاد اپنے لغوی معنی میں یعنی سخت کوشش کے مرادف ہو کر آیا ہے۔ جہاد فقہی کے معنی میں نہیں جو بہت بعد کی اصطلاح ہے اور قرآن مجید میں اس کے لیے لفظ قتال ہے اور لفظ جہاد میں حضور صلعم کے لیے پوری گنجائش باقی رہی کہ آپ اپنے اجتہاد کی رُو سے جیسا مناسب سمجھیں جہادی معاملہ کافروں اور منافقوں کے ساتھ ان کے اور ان کے حسب حال رکھیں۔

مکہ میں کھلا ہوا کفر و شرک تھا۔ اس مرض نفاق کا مقابلہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہی میں آ کر کرنا پڑا، کٹر منافق یہیں آ کر ملے اور ان میں وہ چالاک اور سخن ساز طبقہ بھی تھا۔ جو حضورؐ کی نظر سے حضورؐ کے کمال فراست و دانائی کے باوجود اپنے کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ قرآن مجید نے صراحت کر دی ہے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ۔ (التوبۃ ع ۱۳)

اور مدینہ والوں میں سے نفاق کی حد کمال پر پہنچے ہوئے ہے آپ ان کو نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں۔

اور اس کے معاً بعد ان کے انجام دنیوی و اخروی سے بھی خبر دے دی گئی۔

سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ۔ (التوبۃ ع ۱۳)

ہم ان کو دو دو بار سزائیں دیں گے اور انھیں بھیجیں گے عذاب عظیم کی طرف۔

یہ منافقین شہر مدینہ کے علاوہ دیہات و حوالی مدینہ میں بھی آباد تھے۔

وَمِنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۔ (ایضاً)

اور یہ بھی تمہارے گرد و پیش دیہاتی ہیں۔ ان میں بھی کچھ منافق ہیں۔

اور دیہاتیوں کے مزاج میں یوں بھی سختی زیادہ ہوتی ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ دیہاتی کفر و نفاق دونوں میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا ۔ (التوبۃ ع ۱۲)

یہ دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

غریب و تہی دست مسلمانوں پر یہ سنگ دل مسخرے منافقین برابر طنز و مزاح کرتے رہتے تھے۔ ان مفلسوں کی طرف سے جواب خود حق تعالیٰ نے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

یہ ان (مفلس مسلمانوں) سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔ اللہ ان کے مسخرہ پن کو ان پر اُلٹ دے گا اور ان کےلیے عذاب دردناک رکھا ہوا ہے۔

ان میں کے بعض بدبخت ایسے بھی تھے جن پر یہ نفاق کی لعنت بہ طور ان کی سزا یا پاداش عمل کے مسلط کر دی گئی ہے قرآن مجید نے ان کی نفسیت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

ان میں کے کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنھوں نے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو عطا کر دیا تو ہم خوب خیر خیرات کریں گے اور خوب نیک نیک کام کریں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کر دیا تو لگے وہ اس میں بخل کرنے اور روگردانی کرنے اور وہ تھے ہی بات سے پھر جانے والے سو اللہ نے اس کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا جو اللہ کے یہاں جانے کے دن تک ان میں رکھے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی۔ اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے رہے تھے۔

انھیں بڑا ناز اپنی چالاکی اور رازداری پر تھا۔ سمجھتے تھے کہ ان کے راز چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس زعم باطل کو توڑا ہے اور انھیں یاد دلایا ہے کہ ان کا سابقہ تو خدائے دانندہ اسرار و خفایا سے ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

کیا انھیں اس کی خبر نہیں ہے کہ اللہ کو ان کے دل کا راز اور سرگوشی ان کی سب معلوم ہے اور اللہ غیب کی ساری باتوں کو جانتا ہے۔

ان کی ریاکاری و منافقت کا یہ کمال تھا کہ انھوں نے اپنی ایک مسجد کھڑی کر لی تھی۔ بہ ظاہر تمام تر عبادت و ذکرِ الٰہی کے لیے۔ لیکن دل میں مقصد یہ تھا کہ اس میں جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جائیں اور اسلام و امتِ اسلامی کی بربادی کے منصوبے تیار کیے جائیں۔ قرآن مجید نے اس کا بھی پول کھول دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف حکم دیا کہ آپؐ ہرگز اس کی طرف رُخ نہ کریں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا۔

(التوبۃ ع ۱۳)

اور وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے مسجد اس غرض سے بنا کھڑی کی ہے کہ (اس کے ذریعہ سے) ضرر پہنچائیں اور کفر پھیلائیں، اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دیں۔ اور (اس شخص کو اس میں پناہ دیں جو اس کے قبل بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑ چکا ہے اور یہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم تو بجز بھلائی اور کوئی نیت ہی نہیں رکھتے۔ اللہ گواہ ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے بھی نہ ہوں۔

اور یہ تو ان کے لیے ایک معمولی سی بات تھی کہ ایک بار جب ایک جہاد گرمیوں کے موسم میں پڑا تو یہ لوگ لگے مسلمانوں کو مشورہ دینے، کہ اس سخت موسم میں کہاں نکلو گے گویا جہاد بھی ان کے خیال میں کوئی سیر و تفریح کی چیز پکنک کے قسم کی تھی۔ قرآن نے ان کا قول نقل کر کے جواب بھی کتنا سخت دیا ہے:

قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

(التوبۃ ع ۱۱)

کہنے لگے کہ تم لوگ گرمی میں نہ نکلو۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں بڑھ کر گرم ہے۔ کاش یہ اتنا سمجھتے! یہ لوگ تھوڑے دن ہنس لیں اور بہت دن روتے رہیں اپنے کرتوتوں کے بدلے۔

پیغمبر کی سفارش اور دُعائے مغفرت جس درجہ مؤثر اور زود رو ہوتی ہے ہر مسلمان کو معلوم ہے اور قرآن مجید خود اس کی اہمیت بار بار جتا چکا ہے لیکن منافقین کے قلب چونکہ شمہ ایمان بھی نہیں رکھتے اس لیے قرآن مجید نے براہِ راست حضورؐ کو مخاطب کر کے تصریح کر دی کہ ایسوں کے حق میں آپؐ تک کی دُعائے مغفرت کام نہ دے خواہ آپؐ کتنی ہی کرتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔

(التوبۃ ع ۱۰)

آپؐ ان کے حق میں استغفار کریں یا ان کے حق میں نہ کریں۔ آپؐ ان کے حق میں استغفار اگر ستر بار بھی کریں تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ آپؐ نے اپنی نہایت رحمدلی کی بناء پر اس آیت کے باوجود ایک رئیس المنافقین کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور لفظ "ستر" کے عدد سے فائدہ اُٹھا کر یہ کہا کہ میں استغفار ستر سے زیادہ بار کروں گا (حالانکہ آپ جیسے فصیح اللسان سے بڑھ کر کون

اس نکتہ سے واقف ہو سکتا تھا کہ محاورہ زبان میں ستر سے مراد کثرت استغفار ہے نہ کہ کوئی معین عدد) اس پر یہ حکم قطعی طور پر نازل ہو گیا کہ ایسوں کی نہ کبھی نماز پڑھئے اور نہ ان کی قبر پر ہی ہو جیئے۔

لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ (التوبۃ ع ۱۱)

اور ان میں کوئی مر جاتے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہو جیئے۔

بڑی چڑھ ان لوگوں کو آیات احکام سے رہتی اور جہاد و قتال کے احکام سُن کر تو ان کی جان ہی سوکھ جاتی۔ قرآن مجید نے اس منظر کی یوں عکس کشی کی ہے:

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ۔ (محمدؐ ع ۳)

جب کوئی سورت صاف صاف نازل ہوتی ہے اور اس میں ذکر جہاد کا بھی ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے کسی پر بیہوشی طاری ہو گئی ہو عنقریب ان کی کمبختی آنے والی ہے۔

بڑے جز بز یا اس وقت ہوتے۔ جب ان کے اسرار فاش ہو جاتے تھے اور قرآن مجید خود یا رسول اللہؐ ہی کی زبان سے انھیں اس قسم کی آیتیں سنوا دیتا تھا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ۔ (ایضاً)

اللہ خوب جانتا ہے ان کی خفیہ باتوں کو۔

اور انتہائی تکلیف اور بدحواسی ان پر اس وقت طاری ہوتی جب رسولؐ ہی کی زبان سے انھیں اس قسم کے تنبیہی پروانے وصول ہوتے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ۔ (محمدؐ ع ۴)

جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور اگر ہماری مشیت یہ ہوتی تو ہم آپ کو ان کا پورا پتہ بھی بتا دیتے اور آپ ان کو ان کے حلیے سے پہچان لیتے اور آپ اُن کو طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

اپنی مادی دنیوی زندگی میں یہ کسی سے دبے ہوئے نہ تھے بلکہ ان کی معاشرت معلوم ہوتا ہے خاصی بلند و ممتاز تھی اور ان کے ظاہر میں ایک طرح کی کشش یا دلکشی بھی تھی۔ قرآن مجید کی شہادت ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ۔ (المنافقون ع ۱)

آپ ان کو دیکھیں تو اُن کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں، اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ اُن کی سننے لگیں۔

ان کی ظاہری خوشحالی اور خوش اقبالی بھی خاصی دھوکے میں ڈال لینے والی تھی۔ رسولؐ اللہ کو خاص طور پر اس خطرے سے

آگاہی دے دی گئی اور حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھا دیا گیا۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (التوبۃ ع ۱۱)

ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں۔ اللہ کو تو بس یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کے واسطے سے انھیں دنیا میں بھی مبتلائے عذاب رکھے اور ان کا دم بھی ایسی حالت میں نکلے کہ یہ کافر ہوں۔

ایک پوری سورۃ انھیں کے نام پر المنافقون پارہ ۲۸ میں موجود ہے جس کی ایک آیت چند منٹ قبل پیش ہو چکی ہے لیکن درحقیقت اس سورت میں پورا عکس اس طبقہ کی زندگی کا آگیا ہے۔ یہ لوگ رسول اللہ کے سامنے آکر اپنی اسلامیت بگھارتے اور اپنے اسپنے ایمان و اطاعت کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ جو تمام تر باطل ہوتا۔ ارشاد ہوا ہے:۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۔ (المنافقون ع ۱)

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اس کے رسولؐ ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسولؐ ہیں، لیکن اللہ اس کی بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین پکے جھوٹے ہیں۔ ان کا حاصل عمران کی ساری کمائی ان کی جھوٹی قسمیں ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (ایضاً)

ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تو یہ لوگ اللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں۔ بے شک بہت ہی بُرے ہیں ان کے اعمال جو وہ کر رہے ہیں۔

اسی سے ملتی ہوئی آیت اسی سورہ مجادلہ میں بھی آچکی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (مجادلہ ع ۳)

ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے پھر اللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں تو ان کے لیے عذاب ہے ذلّت والا۔

اس آیت سے معاً پہلے اس طبقہ کا تعارف اس کی یہود دوستی کی حیثیت سے کرکے اس کا انجام یوں پیش کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَّا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (المجادلہ ع ۳)

کیا آپ نے ایسے لوگوں پر نظر نہیں کی (یعنی انھیں منافقین پر) جو ایسی قوم سے دوستی کیے ہوئے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہے (یعنی قوم یہود سے) ایسے لوگ نہ تمھیں میں ہیں نہ انھیں میں جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں اور اسے جانتے بھی ہوتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے عذاب شدید تیار کر رکھا ہے۔ بے شک

بہت ہی بُرے ہیں جو (اعمال) وہ کیا کرتے ہیں۔

ان کی ظاہری خوشحالی اور خوش اقبالی سے دھوکا کھانے پر ایک بار پھر تنبیہ کر دی ہے۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (ایضاً)

ان کے مال اور ان کی اولاد انھیں اللہ سے ذرا نہ بچا سکیں گے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اب پھر اسی سورت منافقون کی طرف آجائیے جس کے بیان کا سلسلہ چل رہا تھا۔ انھوں نے ایمان کا اظہار کیا۔ مگر معاً کفر کو اپنے دل میں جگہ دے لی۔ اس کا وبال یہ پڑا کہ ان کے دلوں پر قبول حق کی طرف سے مہر سی لگ گئی اور سمجھ بوجھ کا گویا مادہ ہی ان سے چھن گیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ (المنافقون ع ۱)

یہ سب اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ سو ان کے دلوں پر مُہر کر دی گئی تو یہ سمجھتے بوجھتے نہیں۔

اُن کے دل چور ہیں اور بزطبیعت کے بُزدلے ہیں۔ اس لیے کہیں سے کوئی آواز بلند ہوئی اور یہ اُسے اپنے ہی اُوپر سمجھے۔ ہر غل پکار کو اپنے ہی اُوپر خیال کرتے ہیں۔

انابت و خشیت کا گذر ان کے قلب میں کہاں۔ زعم و پندار میں مبتلا یہ رسولؐ کی خدمت میں اپنے استغفار کے لیے حاضر ہونے کے بجائے اُوپر سے اکڑے اکڑے پھرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔ (المنافقون ع ۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمھارے لیے رسول اللہؐ استغفار کریں تو یہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ ان کو دیکھیں گے کہ تکبر کرتے ہوئے بے رُخی کرتے ہیں۔

یہ بھی صراحتہً بتا دیا گیا، جیسا کہ سورۃ توبہ کی ایک آیت کے ذیل میں پہلے بھی گذر چکا ہے کہ رسول اللہ صلعم جیسے زبردست مستغفر کی دُعائے مغفرت بھی ایسے شامت زدوں کے حق میں قبول نہ ہوگی۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (ایضاً)

ان کے حق میں سب برابر ہے، خواہ آپ اُن کے لیے استغفار کریں یا استغفار نہ کریں۔ اللہ ان کی ہرگز مغفرت نہ کرے گا۔

عملی حالت ان کی یہ تھی کہ خود صاحب ثروت مسلمانوں کو ترغیب دیتے رہتے تھے کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو۔ مالی امداد کی طرف سے مایوس ہو کر یہ بھیڑ خود ہی چھنٹ جائے گی۔ گویا رسولؐ دین حق کی تبلیغ کے لیے بندوں کی امداد کے تمام تر محتاج تھے۔ قرآن مجید نے ان کے اس حمق پن کی پردہ دری یوں کی ہے:-

هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ۔ (ایضاً)

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسولؐ خدا کے گرد و پیش ہیں، ان پر کچھ خرچ نہ کرو۔ یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی کے ہیں سارے خزانے آسمانوں اور زمینوں کے البتہ منافقین اسے سمجھتے نہیں۔

اور پھر منافقین کے جو یہ دم داعیے تھے کہ میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد مسلمانوں کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ ان کی اس بدفہمی کا پردہ بھی قرآن نے یوں چاک کیا ہے:۔

یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (ایضاً)

یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ واپس گئے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ حالانکہ عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسولؐ کی اور مومنین کی، البتہ منافقین اسے جانتے بوجھتے نہیں۔

سب سے بڑھ کر جامع و اکمل اور ساتھ ہی عبرت انگیز مرقع اس طبقہ کا سورۃ الحدید میں نظر آتا ہے گو ذرا طویل ہے لیکن رسول اللہ صلعم کی زندگی میں آپ کے اس حاضر طبقہ کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے سیاق یوم حشر کا ہے۔ اب آگے سنیے:۔

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰی وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِیَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۔

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے (جس وقت وہ جنت کو جا رہے ہوں گے اور ان کے اردگرد نور ہوگا) ہمارا انتظار کر لو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں انھیں جواب ملے گا کہ لوٹ جاؤ اپنے پیچھے کی طرف پھر روشنی تلاش کرو۔ اس کے بعد ان کے اور ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندرونی طرف رحمت ہوگی اور بیرونی طرف عذاب منافقین (اب) مسلمانوں کو پکاریں گے کیا ہم تمھارے ساتھ (دنیا میں) نہ تھے وہ (جواب) میں کہیں گے کہ تھے تو بیشک تم نے خود ہی اپنے کو گمراہی میں پھنسا لیا تھا اور تم منتظر رہتے تھے، اور تمھاری بیہودہ آرزوؤں نے تمھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تم پر اللہ کا حکم آ پہنچا اور تم کو اس بڑے فریبیے نے اللہ کے باب میں دھوکے میں ڈال رکھا تھا غرض

آج تم سے کوئی فدیہ نہ قبول کیا جائے گا اور نہ کافروں سے تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمھاری رفیق ہے ، اور کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

انکشافِ حقائق کے وقت کی یہ صحیح اور من وعن نقاشی کر کے دنیا میں بھی ان کی صحیح حالت کا چربا پیش کیا۔ تو یہ تھا آپ کے معاصرین کا وہ دوسرا طبقہ جس سے پیمبرِ اسلام کو سابقہ علاوہ منکرین و مشرکین ، دہریین ، ثنوئین ، یہود و نصرانیوں کے اپنی زندگی میں پڑا تھا۔

مُؤمنین

چوتھا طبقہ آپ کے ان معاصرین مخاطبین کا ہے جنھوں نے آپ کے دعوئ نبوت کی تصدیق کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیام سُن ، کلامِ الٰہی پر ایمان لائے اصطلاح میں انھیں صحابۂ رسول یا اصحابِ رسول کہتے ہیں یہ اپنے اعمال و اطوار ، اخلاق و عادات میں ، اپنے مرشدِ اعظم ہی کے ڈھرے پر چلے اور بحیثیتِ مجموعی ایسے نقل مطابقِ اصل ثابت ہوئے کہ خود دوسروں کے لیے حجت و معیار بن گئے۔ اکبرالٰہ آبادی نے یہی تاریخی حقیقت اپنی شاعرانہ زبان میں یوں ادا کی ہے : ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا!

لیکن اوّل تو سب ایک درجہ و مرتبہ کے نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ فرقِ مراتب تو لازمۂ بشریت ہے پھر جن کو جو مرتبے حاصل ہوئے وہ رفتہ رفتہ صحبت ہی کی برکت سے حاصل ہوئے۔ اوّل دن سے کوئی بھی ان میں کامل نہ تھا اور پھر بڑی بات یہ کہ عصمت کامل جس کا نام ہے۔ وہ تو صرف انبیاء کرام کا حصّہ خصوصی ہے۔ خدائی معیار سے جب گرفتیں حضرات انبیاء تک پر ہوتی رہیں اور غوی اور عصیٰ تک کے فعل بے تکلف ان کے لیے قرآن مجید میں آتے رہے تو یہ غیر معصومین کی صالح و پاک باز جماعت کب روک ٹوک کے دائرہ سے باہر رہ سکتی تھی۔ قرآن ان مخلصین پر گرفتیں جابجا کرتا گیا ہے۔ کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتہً۔

بعض نوآموزان میں ایسے تھے جو بارگاہِ نبوت کے ادب آداب سے پوری طرح واقف نہ تھے اور اپنی طبعی سادہ دلی سے کبھی کبھی حضور کے تکدر و انقباض کا باعث ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب کاشانہ مبارک پر حاضر ہوتے تو بجائے اس کے کہ حضور کے برآمد ہونے کا انتظار کریں دروازے سے ہی بے تحاشا آپ کو چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ ذکر مہذب و شائستہ سلاست کے ساتھ یوں کیا ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (الحجرات ع ۱)	جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارنے لگتے ہیں ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے ۔

لفظ حجرات بہ صیغہ جمع خود اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیان زمانہ قیام کا ہو رہا ہے بعض ایسے بھی تھے (غالباً اہل بادیہ ہوں گے) جو مجلس مبارک میں آکر چیخ چیخ کر بولتے اور فرد احترام ملحوظ نہ رکھتے۔ انھیں ادب سکھایا گیا کہ دھیمی آواز سے بولیں اور قرآن مجید نے ایسی ہدایات کو بالکل ہی نذر اجمال نہیں کیا ہے بلکہ خاصے بسط و تفصیل سے کام لیا ہے کہ آئندہ نسلوں کو بھی سمجھنے میں کوئی الجھاؤ نہ باقی رہ جائے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (الحجرات ع ۱)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیمبر کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ اُن سے ایسے کھل کر بولو، جیسا آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولتے ہو کہیں تمھارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ ہدایت خاص مومنین کو کی جا رہی ہے جن کے ذہن میں رسول اللہؐ کی ارادی بے حرمتی کا شائبہ تک نہیں آسکتا تھا۔ اب اس نفی کے ساتھ اثبات کا سلب کے ساتھ ایجاب کا اور نہی کے ساتھ امر کا پہلو بھی ملاحظہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (الحجرات۔ ع ۱)

بے شک جو لوگ پست رکھتے ہیں اپنی آوازوں کو رسول اللہ کے سامنے تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے خاص کر دیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم۔

یہ تو آداب مجلسی و معاشری پر توجہ دہانی کی ایک مثال ہوئی اسی طرح کوتاہیاں کبھی عبادات کے دائرہ میں ہو جاتی تھیں، چنانچہ ایک بار حضورؐ خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ مسجد کے باہر سے کسی تجارتی قافلہ یا تماشہ کے گزرنے کی آواز آئی اور سامعین خطبہ چھوڑ ادھر لپک گئے۔ اس پر بھی صراحت کے ساتھ ٹوکا گیا۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ۔ (الجمعۃ ع ۲)

اور یہ جب تجارت یا تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ادھر لپک جاتے ہیں اور آپ کو (خطبہ میں) کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ اللہ کے ہاں جو (اجر) ہے وہ تماشہ اور تجارت سے بڑھ کر ہے۔

کوئی کوئی ان میں سے ایسے بھی نکلے جو جہاد کے موقع پر کچھ پیچھے رہ گئے لیکن اپنی وقتی غفلت کا کفارہ انھوں نے جان و دل سے ادا کیا اور اللہ تعالیٰ کو آخر رضامند بھی کر لیا۔ قرآن مجید نے ایسوں کی تعداد کل تین بتائی ہے اور ان کا تذکرہ خود پیمبر اور اصحاب مہاجرین و انصار کے مدحیہ تذکرہ پر عطف کر کے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ

اور اللہ نے ان تینوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین جب باوجود اپنی فراخی کے

ہیں لیکن اشارہ خصوصی اسی جماعت صحابہ کی جانب ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات ع ۱)

یہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیوی زندگی میں) بڑے نیک کار تھے۔ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق تھا۔

ان کی عبادتی شب بیداریوں اور استغفاری سحر خیزیوں کی شہادت ایک اور سلسلہ میں بھی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ۔ (المزمل ع ۲)

آپ کا پروردگار واقف ہے (اے پیغمبر) کہ آپ رات میں کھڑے رہتے ہیں قریب دو تہائی یا آدھی رات یا تہائی رات کے اور آپ کے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی۔

رفاقت معیت اور صحابیت کے معنی بھی یہی تھے کہ عبادتوں، ریاضتوں اور مشقتوں میں بھی اپنے آقا یا "صاحب" کے نقش قدم پر چلا جائے۔

اور ایک نقشہ بھی انھیں پاکبازوں کی روزانہ زندگی کا قرآن مجید نے پیش کیا ہے (گو الفاظ یہاں عام و وسیع ہیں) جس میں ان کے معمولات، اخلاق عبادات، معاملات سب کے خط و خال صاف نظر آسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ (الفرقان ع ۶)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر مسکنت کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب اُن سے جاہل لوگ بات کرتے ہیں تو رفع شر کی بات کہہ دیتے ہیں۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں اور جو دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذاب جہنم کو دُور رکھ بیشک جہنم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے قابل مرحمت رکھا ہے اُسے ہلاک نہیں کرتے، مگر ہاں حق پر اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا اُسے سابقہ سزا سے پڑے گا۔

صحابہ کے معتبر حالات میں کتابیں اُردو میں بھی حدیث و سیر سے ماخوذ ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور عربی میں تو خیر موجود ہی

ہیں لیکن اشارہ خصوصی اسی جماعت صحابہ کی جانب ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ (الذاریات ع ۱)

یہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیوی زندگی میں) بڑے نیک کار تھے۔ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق تھا۔

ان کی عبادتی شب بیداریوں اور استغفاری سحر خیزیوں کی شہادت ایک اور سلسلہ میں بھی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۔ (المزمل ع ۲)

آپ کا پروردگار واقف ہے (اے پیغمبر) کہ آپ رات میں کھڑے رہتے ہیں قریب دو تہائی یا آدھی رات یا تہائی رات کے اور آپ کے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی۔

رفاقت معیت اور صحابیت کے معنی بھی یہی تھے کہ عبادتوں، ریاضتوں اور مشقتوں میں بھی اپنے آقا یا "صاحب" کے نقش قدم پر چلا جائے۔

اور ایک نقشہ بھی انھیں پاکبازوں کی روزانہ زندگی کا قرآن مجید نے پیش کیا ہے (گو الفاظ یہاں عام و وسیع ہیں) جس میں ان کے معمولات، اخلاق عبادات، معاملات سب کے خط و خال صاف نظر آسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۔ (الفرقان ع ۶)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر مسکنت کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب ان سے جاہل لوگ بات کرتے ہیں تو رفع شر کی بات کہہ دیتے ہیں۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذاب جہنم کو دور رکھ بیشک جہنم برا ٹھکانا اور برا مقام ہے اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے قابل حرمت رکھا ہے اُسے ہلاک نہیں کرتے، مگر ہاں حق پر اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا اُسے سابقہ سزا سے پڑے گا۔

صحابہ کے معتبر حالات میں کتابیں اُردو میں بھی حدیث و سیر سے ماخوذ ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور عربی میں تو خیر موجود ہی

ہیں۔ ان کی دی ہوئی تفصیلات کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ قرآن مجید نے کس اعجاز کے ساتھ ان کی تصویر کشی کر دی ہے۔ (قرآنی بیان ابھی ختم نہیں ہوا۔ اسی رکوع کی چند اور سطریں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔

(الفرقان رع ۶)

اور یہ لوگ ناجائز مجمعوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر بے ہودہ مشغلوں کے پاس سے گذرتے بھی ہیں تو سلامت روی کے ساتھ گذر جاتے ہیں اور جب انھیں نصیحت کی جاتی ہے، ان کے پروردگار کے احکام کے ذریعہ سے تو یہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے اور یہ لوگ دعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دے ایسوں کو بالاخانے عطا ہوں گے۔ بہ سبب ان کے ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس میں دعا اور سلام ملے گا۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے۔

قدسیوں کی جماعت کا اطلاق اگر اس جماعت پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔ اللہ کے ہاں اس جماعت کے شرف عظمت کا اندازہ اس سے فرمائیے کہ جس طرح حضور انورؐ کی آمد و ظہور کی پیش خبریاں اگلی آسمانی کتابوں میں درج تھیں اسی طرح اس جماعت کا نقشہ بھی توریت اور انجیل جیسے گرامی صحیفوں میں درج رہ چکا ہے۔

سورۃ الفتح کی ایک آیت ابھی کچھ ہی دیر ہوئی آپ کے سامنے پیش ہو چکی ہے۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ الخ اس سے متصل اور اس کے معاً بعد قرآن مجید ہی میں ہے:۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ۔ ان کے اوصاف توریت میں درج ہیں۔

اعجاز قرآنی کا کرشمہ ملاحظہ ہو کہ بے شمار تحریفات و تصرفات کے بعد بھی توریت موجودہ میں یہ الفاظ آج تک لکھے چلے آ رہے ہیں۔

"فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔" (استثناء ۔ ۳۳ : ۲)

اور یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ فاران مکہ معظمہ ہی کی ایک پہاڑی کا نام ہے اور پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے بعد جتنے صحابیوں یا "قدسیوں" کا ساتھ ہوا تھا ان کی تعداد بھی دس ہی ہزار تھی۔

توریت میں اس کے بعد ہے۔

"اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشین شریعت ان کے لیے تھی"

قرآن مجید کے الفاظ اشداء علی الکفار آپ سن چکے ہیں۔ اس کی مطابقت "آتشین شریعت" سے دیکھئے

دشواری کسی کو نہیں پیش آسکتی۔ آگے توریت میں ہے :۔

"ہاں وہ اپنی قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔"

قرآن مجید کے الفاظ رحماء بینھم ابھی آپ کے کان میں گونج ہی رہے ہوں گے اور ان کی کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے اور آخر میں توریت میں اس سلسلے میں ہے۔

"اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔"

اسے پڑھ کر قرآن مجید کے بھی یہ الفاظ اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے رکعا سجدا یبتغون فضل من اللہ و رضوانا توریت کا بیان آپ نے سن لیا۔ اب انجیلی مدح صحابہ بھی سماعت فرمائیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے توریت کے معاً بعد انجیل کا نام بھی لیا ہے اور کہا ہے :۔

وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ۔ (الفرقان ع ۲)

اور انجیل میں ان کا وصف یہ ہے کہ وہ جیسے کھیتی ہیں کہ اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔

موجودہ محرف انجیلوں سے بھلا اس عبارت کی کسی درجہ میں بھی تصدیق و توثیق کی امید ہوسکتی تھی؟ لیکن نہیں۔ مماثل عبارتیں اب بھی انجیلوں میں باقی رہ گئی ہیں۔ انجیل متی باب ۱۳ کی آیات ۳۱، ۳۲ جب چاہے پڑھ کر دیکھ لیجئے اور اس وقت تو سن لیجئے :

"آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر آکر بسیرا لیتے ہیں۔"

اور آپ چاہیں تو ایسی ہی عبارتیں انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳۰ تا ۳۲ میں نیز انجیل لوقا باب ۱۳ آیات ۱۸، ۱۹ میں نکال کر پڑھ سکتے ہیں۔

ان مخلص شاگردوں اور جانباز رفیقوں نے رسولؐ کا ساتھ ہجرت و ترک وطن میں دیا۔ جہاد و قتال میں دیا، اور رسولؐ کے دین کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ صحیفۂ ربانی اپنے کمال ذرہ نوازی، اور بندہ پروری سے اپنے ان بندوں کی روداد اخلاص اپنے اوراق میں برابر درج کرتا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ہے :۔

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ

لیکن رسولؐ اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ (رہ کر) ایمان لائے،

جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (توبہ ع ۱۱)

انہوں نے جہاد کیا اور اپنی جان سے اور اپنے مال سے انھیں کے لیے تو بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ تو فلاح یاب ہیں۔

رضائے الٰہی کے اس معزز تمغہ کے بعد اگر اس طبقہ کے ہر فرد کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنے اور لکھنے کا دستور ہم مسلمانوں میں پڑ گیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات ہی نہیں ـــــــ ایک دوسرا پروانہ مغفرت و مغفوریت ان باعمل پیروانِ رسولؐ کے حق میں اور ملاحظہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (انفال ع ۱۰)

اور جب ایمان لائے اور اُنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا نیز جن لوگوں نے (اُنھیں) اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہی (سب) لوگ تو ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں۔ انھیں کے لیے مغفرت ہے اور بہترین روزی۔

صحابیانِ رسولؐ کی جو دو بڑی تقسیمیں، مہاجرین اور انصار کی ہیں قرآن مجید نے یہاں اس تقسیم کو قبول ہی نہیں کیا۔ بلکہ دونوں گروہوں کی مدح کامل اس ایک آیت کے اندر کر دی۔ ایک گروہ وہ تھا جو اپنے مقتضیات ایمان کی تکمیل کی خاطر ہر طرح کے خطرے برداشت کر کے اور کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیل کے اپنے وطن مالوف مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے اور بے خانماں ہو کر دارالہجرۃ مدینہ منورہ کو آیا تھا اور دوسرا طبقہ مدینہ ہی کے باشندوں کا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے مقتضیات ایمان ہی کی تکمیل کی خاطر ان مصیبت زدوں کی پذیرائی کی تھی۔ ان لُٹے گھروں کو نئے سرے سے گھر بار والا بنایا اور ان کی خدمت اور مہمان داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ ایمان کا حق ادا کرنے والے، قرآن یہاں صاف شہادت دیتا ہے کہ یہ دونوں ہی گروہ رہے ہیں۔ جہاں دوسری جگہ ان دونوں گروہوں کو ان کے اصطلاحی ناموں "مہاجرین و انصار" سے یاد کیا ہے اور مدح صحابہ کا قرآنی نمونہ پیش کر دیا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِىِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِىْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (توبہ ع ۱۴)

اللہ نے توجہ فرمائی پیمبر کے حال پر اور ان مہاجرین و انصار کے حال پر بھی جنھوں نے پیمبر کا ساتھ ایسی تنگی کے وقت میں دیا۔ بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل میں کچھ تزلزل پیدا ہو چلا تھا۔ پھر اللہ نے ان کے حال پر رحمت سے توجہ فرما دی۔ بیشک وہ ان پر بہت شفیق بہت مہربان ہے۔

ساعۃ العسرۃ کے لفظ میں عموم ہے۔ مہاجرین و انصار دونوں نے حضورؐ کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا لیکن اہل تفسیر و اہل تاریخ نے اشارہ خصوصی یہاں غزوہ تبوک کی جانب سمجھا ہے جس کی تیاریوں کے وقت سامنا غیر معمولی دشواریوں کا کرنا پڑا تھا۔ مبارک ہیں وہ اُمتی جن کا ذکر صحیفہ ربانی میں ذکر رسولؐ کے ساتھ ایک جگہ اور ان کی مدح و تحسین اسی طرح کھل

کرائی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ ع ۱۳)

اور جو مہاجر اور انصار سابق و مقدم ہیں نیز وہ جنھوں نے ان کی پیروی کی نیک کرداری میں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے بہت بڑی کامیابی یہ ہے۔

رضی اللہ عنھم کا فقرہ اب تو کھل کر ان قدسیوں کے حق میں وارد ہو گیا اور جبکہ یہ صحابہ مہاجرین و انصار تو ممدوح الٰہی تھے ہی آیت نے یہ بھی صاف کر دیا کہ بعد والے جو ان کی پیروی کریں گے۔ وہ بھی حق تعالیٰ کی طرف سے سزاوار مدح و ستائش ٹھہر جائیں گے اور باحسان کی قید نے ایک اور نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ یعنی تابعین کا اتباع معتبر وہی شمار کیا جائے گا جو احسان یا حسن عمل میں ہو۔ محض معاصرت یا ہم معاصرت نہیں[1]

صحابہ سب کے سب شہری ہی نہ تھے ان کا ایک حصہ دیہاتیوں پر بھی شامل تھا۔ یہ لوگ بیچارے اپنے کمال بےنفسی سے اپنا مال لیے خدمتِ دین کے لیے حاضر رہتے تھے کہ اسی ذریعہ سے انھیں قرب خداوندی اور التفات رسولؐ حاصل ہو اور کیسے قبول ان کے عقیدت کے نذرانوں کو حاصل ہوا اور کیسے نہ حاصل ہوتا ارشاد ہوا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (توبہ ع ۱۲)

دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے قرب عند اللہ کا اور رسولؐ کی دعاؤں کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بے شک ان کا یہ خرچ کرنا باعث قربت ہے۔ ضرور ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے۔

انھیں اعراب یا دیہاتیوں کے کفر و نفاق کا ذکر بھی قرآن مجید میں شد و مد سے آیا ہے۔ لیکن انھیں اہل بادیہ میں کیسے کیسے مخلصین و مقبولین بھی پیدا ہوئے۔ یہ اسی آیت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

مسجد نبویؐ میں آ کر جو صحابہ نماز پڑھا کرتے تھے ان کی پاکیزہ طینتی پاکیزہ سیرتی کی شہادت پر قرآن مجید نے اپنی مہر لول لگا دی ہے گو مقصود اس سیاق میں اصلاً صرف مسجد کی تقدیس کا اظہار تھا۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ

جس مسجد کی بُنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی (آتے)

---

[1] محققین نے خلیفہ یزید بن معاویہ کو "تابعین" کے زمرہ میں شامل کرنے سے اسی لیے احتراز کیا ہے کہ یہاں اتباع احسان میں نہ تھا۔

اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ۔ (توبہ ع ۱۳)

ہیں جو پسند کرتے ہیں اس کو کہ خوب پاک صاف رہیں اور اللہ پسند کرتا ہے خوب پاک صاف رہنے والوں کو۔

ہجرت یعنی دین کی خاطر اپنے وطن مالوف کو چھوڑ دینا بذاتِ خود ایک اتنا بڑا مجاہدہ تھا کہ اسی ایک عمل نے صحابہ مہاجرین کو بلندی مرتبہ میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۔ (النحل ع ۶)

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن چھوڑا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ ہم انھیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، کاش کہ وہ یہ جانتے۔

انھیں مہاجرین مظلوم اور مجاہدین صحابہ کی داد ایک جگہ یوں آئی ہے کہ ان کے ہاتھ اگر حکومت آ گئی تو یہ ملک کو فسق فجور سے نہیں، ظلم و ستم سے نہیں، عدل سے بھر دیں گے اور سکہ شراب، زنا کا نہیں، سود و قمار کا نہیں۔ خیر و صلاح تقویٰ و طاعت کا چلا دیں گے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج ع ۶)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت دے دیں، تو یہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ حکم نیک کرداری کا دیں اور روک تھام بدکرداری کی کر دیں۔

قرآن مجید کی اس سچی پیش خبری کی تصدیق دورِ خلافتِ راشدہ نے جس طرح کی اس کی روئداد تاریخ کی زبان سے جب چاہے سُن لیجئے اور آخر یہی تو تاریخ کا وہ مثالی دور ہے جسے گاندھی جی ہمارے اپنے زمانے تک بطور مثالی حکومت کے پیش کرتے رہے ہیں۔

جنگ احزاب کا دن مدینہ کے دس سالہ دورِ محمدیؐ میں ایک سخت ترین دن ہوا ہے۔ قریش خود ہی کیا کم تھے کہ اس روز اپنے ساتھ ملک کے سارے پرقوت قبیلوں کو مدینہ پر چڑھا لائے تھے تاکہ ہر طرف سے گھیر کے اور دھاوا بول کے اس مٹھی بھر مسلم آبادی کا خاتمہ ہی کر دیں اور ظاہری سامان اور مادی آثار سب اسی کے نظر بھی آ رہے تھے۔ لیکن مخلصین کی یہ جماعت اس ہولناک صورتِ حال اور مخالف ماحول سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ نہ بددل ہوئی نہ ہراساں بلکہ سکونِ قلب و انشراحِ خاطر کے ساتھ ثابت قدمی و جانبازی کا ثبوت دیتی رہی، کلام پاک کی شہادت ملاحظہ ہو۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ؗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۔ (الاحزاب ع ۳)

اور جب مومنین (صادقین) نے احزاب کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور اس کے رسولؐ خبر دے چکے تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ ہی فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان و اطاعت میں اور ترقی ہی ہوئی۔

احزاب ہی کی طرح ایک دوسرے اہم و نازک موقعہ صلح حدیبیہ کے سلسلے میں بھی دین داروں کی اس جماعت کی مدح

تصریح کے ساتھ آئی ہے۔ حالت اندیشہ ناک ہو چکی تھی اور نظر آ رہا تھا کہ جنگ (جس کے لیے مسلمان تیار ہو کر بالکل ہی نہیں آئے تھے) اب چھڑی اور جب چھڑی عین اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ان جاں نثاروں نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت آخر دم تک لڑنے مرنے کی کی تھی اصل عبارت ملاحظہ ہو، خطاب رسولِ کریمؐ سے ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا۔ (الفتح ع ۳)

یقیناً اللہ ان مومنین سے خوش ہو گیا جب کہ یہ لوگ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ اللہ کو بھی معلوم تھا اور اس نے ان کو قریب ہی میں ایک فتح دے دی اور بہت سی غنیمتیں بھی جنھیں وہ لے رہے ہیں۔

آیت میں ان کو نوید آجل یا مژدہ اخروی کے ساتھ ایک بشارت عاجل فتح قریب کی بھی مل گئی اور اس سے متصل اور بھی بشارتیں ہیں مستقبل قریب ہی سے متعلق۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ (الفتح ع ۳)

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے، سو سر دست یہ تم کو دے ہی دی ہے اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک رکھے، تاکہ یہ مومنین کے لیے ایک نمونہ ہو جائے اور تاکہ تم کو ایک سیدھی سڑک پر ڈال دے اور ایک فتح اور بھی ہے جو تمھارے قابو میں ابھی نہیں آئی ہے اور اللہ اس کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے اور اللہ اس پر قادر ہے۔

یہ حضرات صحابہ اخلاق و روحانیت کی جن بلندیوں تک پہنچ چکے تھے، اُس کا تذکرہ قرآن مجید نے بکمال اعجاز خود اپنے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے جیسا کہ آپ اب تک سن بھی چکے ہیں۔ حدیث، سیرت اور طبقات کے مجلدات میں فضائل صحابہ کی جو طویل و ضخیم روداد نظر آتی ہے وہ سب اسی متن قرآنی کی شرح و تفسیر ہے۔

یعنی کافروں سے جو مال بلا لڑے بھڑے وصول ہو جائے اس کا مصرف مہاجرین و انصار دونوں کے مرتبہ و منزلت پر اپنے بیان کی سطور و بین السطور دونوں سے روشنی ڈالنا گیا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحشر ع ۱)

حق ہے ان حاجت مندوں کا جو اپنے گھروں اور اپنے مال سے بے دخل کر دیئے گئے۔ وہ تلاش میں لگے رہتے ہیں، اللہ کے فضل و خوشنودی کے اور نصرت کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی یہی لوگ تو ہیں راست باز۔

یہ نقشہ تو مہاجرین کا ہوا، انصار کے جوہر جو اللہ کی نظر میں تھے، ان کے لیے اسی آیت سے متصل دوسری آیت تلاوت فرمائیے:۔

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔

(ایضاً)

(اور یہ لے) ان لوگوں کا بھی حق ہے جو دارالاسلام میں اور ایمان میں اُن سے قبل ہی قرار پکڑے ہوئے ہیں، محبت کرتے ہیں۔ اس سے جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (انھیں) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ (خود) ان پر فاقہ ہوا، اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہوگیا تو بس یہی ہیں فلاح یاب۔

طبعی بخل نفس پر فتح پالینے کے بعد بندوں کے معاملات میں پھر کون سا درجہ مجاہدہ باقی بھی رہ جاتا ہے؟ فرق مراتب سے کوئی طبقہ خالی نہیں ہو سکتا۔ انصار۔ مہاجرین سارے طبقات صحابہ ظاہر ہے کہ افراد کے لحاظ سے ایک سطح پر نہ تھے نہ ہو سکتے تھے کوئی کامل تھا، کوئی کامل تر۔ لیکن بہرحال مرتبہ اور درجہ مقبولیت پر فائز سب ہی تھے۔ قرآن مجید نے کتنا صحیح فیصلہ اور وہ بھی خود کر دہ صحابہ ہی کو مخاطب کرکے اس باب میں سُنا دیا گیا۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۔

(الحدید ع ۱)

تم میں سے جو لوگ فتح (مکہ) سے قبل مال خود خرچ کر چکے اور قتال کر چکے وہ برابر نہیں وہ مرتبہ میں ان لوگوں سے بڑھ کر ہیں جنھوں نے خرچ اور قتال بعد میں کیا اور اللہ نے بھلائی کا وعدہ (ان) سب ہی سے کر رکھا ہے اور اللہ کو تمھارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

انبیاء سابقین کے رفیقوں، مریدوں، شاگردوں کے حالات تفصیل کے ساتھ تو معلوم نہیں لیکن حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے صحابیوں کے جتنے بھی حالات قرآن مجید و توریت و انجیل میں درج ملتے ہیں، ان کا مقابلہ ذرا قرآن ہی کی روشنی میں ہمارے رسولِ اکرمؐ کے جاں نثار صحابیوں سے کرکے دیکھئے تو ایک قدرت خدا نظر آتی ہے اور بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ آنحضورؐ کی شخصیت جس طرح اپنے ذاتی فضائل و کمالات کے ساتھ نوع بشری میں مثالی ہوئی ہے اسی طرح اپنے صحابیوں کے اخلاص ایثار اور فدائیت کے لحاظ سے تاریخ عالم میں ایک بالکل امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآنِ حکیم اور اطاعتِ رسولؐ

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں تشریع وقانون کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان تمام بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل : ۸۹)

اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر شے کی وضاحت ہے ۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ (الانعام : ۱۱۴)

حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی ۔

الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ہود : ۱، ۲)

الرا ۔ یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کردی گئی ہیں ۔

آیئے ! ان آیات کی رو سے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کس درجہ ضروری ہے اور آپؐ کے منصب یا فرائض کار میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں تاکہ ہر مسلمان صحیح خطوط پر اپنی دینی زندگی کے نقشے کو ترتیب دے سکے، قرآن حکیم کے مطالب ومعانی کو سمجھ سکے اور ان کو اپنی عملی زندگی میں سمو سکے ۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں دو انداز اختیار کیے ہیں ۔ اکثر تو اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو بھی ضروری ٹھہرایا ہے اور کہیں صرف رسول کی اطاعت و پیروی ہی کا ذکر ہے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی نقطہ نظر سے قرآن کے پہلو بہ پہلو ، اسلام اور فقہ وتقنین کا دوسرا سرچشمہ یا مصدر ثانی جس سے ایمان وعمل کے تقاضے مکمل ہوتے ہیں ، سنتِ رسولؐ ہے :

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران : ۳۲)

کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو ، اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا ۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (آل عمران : ۱۳۲)

اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو ، تاکہ تم پر رحمت کی جاسکے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

مومنو! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو ، اور اگر کسی بات میں اختلاف پیدا ہو تو اگر خدا اور آخرت

فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء: ۵۹)

پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول اور اپنے اولی الامر کے حکم کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۱)

اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۰)

ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو، اور تم سن رہے ہو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (الانفال: ۴۶)

اور خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا، ایسا کرو گے تو بزدل ہو جاؤ گے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (النور: ۵۴)

کہہ دیجیے کہ خدا کی فرمابرداری کرو اور رسول خدا کے حکم پر چلو، اگر منہ موڑو گے تو رسول پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو ان کے ذمہ ہے اور تم پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو تمہارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا راستہ پالو گے اور رسول کے ذمے تو صاف صاف احکام خدا کا پہنچا دینا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد: ۳۳)

مومنو! خدا کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ ہونے دو۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (مجادلہ: ۱۳)

اور خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، خدا اس سے باخبر ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (التغابن: ۱۲)

اور خدا کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کھول کر پہنچا دینا ہے۔

یہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں دونوں کی اطاعت و پیروی کو یکساں طور سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے یعنی جو اسلوب، انداز اور پیرایۂ اظہار اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اختیار کیا گیا ہے، بعینہٖ وہی نہج اور طریق اطاعتِ رسول کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب ان آیات پر ایک نظر ڈالتے چلیے

جن میں اطاعتِ رسولؐ کو مستقل بالذات اور منفرد دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا گیا ہے:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ج (النساء: ۸۰)

جو شخص رسول کی پیروی کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی پیروی کی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ط (النساء: ۶۴)

اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ٥ (آل عمران: ۳۱)

لوگوں سے کہہ دیجیے اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تمھیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ (النور: ۶۳)

تو جو لوگ آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو ان پر کوئی آفت آپڑے یا تکلیف والا عذاب نازل ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥ (النساء: ۶۵)

آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو آپ فیصلہ کردیں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے تسلیم کریں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

یہ آیات اپنے مفہوم و معنی میں اس درجہ واضح ہیں کہ ہم نے ان کی تشریح و تفسیر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، البتہ ان آیات سے جو نکات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آتے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔

۱۔ اطاعتِ رسولؐ، دین کی اتنی اہم اساس ہے کہ اس سے انکار کفر کا مستوجب ہے۔

۲۔ اللہ کے رسول کی اطاعت رحمتِ الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

۳۔ کسی بھی فقہی و دینی مسئلے میں اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیغام پر ایمان کے تقاضے اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں، جبکہ حضورؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو حرزِ جان بنایا جائے۔

۵۔ اطاعتِ رسولؐ کی روگردانی سے حبطِ مال کا اندیشہ ہے۔

۶۔ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے۔

۷۔ ہر پیغمبر اسی لیے مبعوث ہوا ہے کہ لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔

۸۔ محبتِ الٰہی صرف ایسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات و اعمال کی پیروی کی جائے۔

۹۔ جو لوگ آپ کی تعلیمات کی مخالفت میں سرگرم ہیں، ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔
۱۰۔ ایمان اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا جب تک آنحضرتؐ کے احکام و اوامر کو پورے اخلاص سے تسلیم نہ کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے نامناسب نہ ہوگا کہ پہلے تصورِ نبوت سے متعلق ان خیالات و افکار کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے۔ جو یکسر ملحدانہ اور غلط ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس موضوع میں اصل اشکال یہ ہے کہ نبوت کا مسئلہ خالص دینی ہے اور جب اس کو حل کرنے کے لئے عقل و خرد کی وا ماندگی پر اعتماد کیا جائے گا تو اس سے لازماً نبوّت کی عظمت و حقیقت پر روشنی نہ پڑ سکے گی اور نہ یہ بات واضح ہو سکے گی کہ انبیا کی تعلیمات میں جو ایک طرح کا توافق اور ارتقا و تسلسل پایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ جس طرح سائنس کے مسائل کو غیر سائنسی اصولوں کی روشنی میں حل نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح وہ مسائل جن کا تعلق خالصتاً دین سے ہے، ان کو غیر دینی وسائل و ذرائع کے بل بوتے پر حل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجیئے، بعض لوگوں نے اس کے باوجود اسرارِ نبوت تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اسے کہانت کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا، حالانکہ نبوت اور کہانت میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ جن لوگوں نے عربی ادبیات میں کاہنوں سے منقولہ اقوال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں ارشاداتِ انبیا حکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے موتی ضوفگن ہیں۔ گہرائی اور عمق ہے، وہاں کہانت میں ڈھلے ڈھلائے، بے معنی اور سطحی جملوں کے سوا کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ کاہن کو انبیا و رسل سے وہی نسبت حاصل ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ——— ان کے اقوال میں نہ صحت و بصیرت کی کوئی جھلک ہے، نہ زندگی کے مسائل سے متعلق کوئی پیغام و دعوت کا نظام پایا جاتا ہے، نہ اخلاق کو سنوارنے کی تعلیم ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا کوئی طریق مذکور، کیونکہ یہ ساری چیزیں انبیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ نبوت اس شدید احساس و تاثر کا نتیجہ ہے جو معاشرے میں فکر و نظر کی گمراہیوں کو دیکھ کر ایک ذہین اور حساس مصلح انسان کے دل میں ابھرتا ہے۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاشرے میں مروجہ برائیوں کے خلاف اصلاح کا جذبہ بعض حضرات کو اس حد تک مجبور کر دے کہ وہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو فرستادہ تصور کرنے لگیں اور اپنے خیالات و افکار کو وحی و تنزیل کا نتیجہ قرار دیں۔

نبوت کی ایک توجیہ نفسیات کے ماہرین نے یہ بیان کی ہے کہ یہ ایک نوع کی ذہنی بیماری ہے اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو ذہنی و فکری لحاظ سے عدم توازن کا شکار ہے، متوازن و معقول اور قابلِ عمل نظامِ حیات پیش کر سکے، اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کو پیش کر سکے، تہذیب و تمدن کے سانچوں کو ترتیب دے سکے اور ان تمام گتھیوں کو سلجھا سکے، جن سے معاشرہ دوچار ہے۔ یہی نہیں، خود بھی ایسی پاکیزہ اور بلند زندگی بسر کر سکے، جو دوسروں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہو نبوت کے بارے میں یہ ان لوگوں کی توجیہات تھیں جو ادیان کی صداقت اور سچائی پر یقین نہیں رکھتے اور محض ظن و تخمین کی بنا پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے دیکھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینی ذہن رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوصف انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور اس مسئلے کی تہ تک نہیں پہنچ پائے۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ نبوت ولایت ہی کے اس مقام

سے متعلق ایک حقیقت ہے جہاں پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت سے سالک کا قلب اس لائق ہوجاتا ہے کہ اس پہ وحی و تنزیل کی تجلیات کا انعکاس ہونا شروع ہوجاتا ہے دوسرے لفظوں میں نبوت اور ولایت میں جو فرق ہے وہ نوعیت کا نہیں درجے کا ہے۔

ہمارے نزدیک نبوت کی متصوفانہ تعبیر اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کریم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوپاتا کہ منصب نبوت سے بہرہ مند ہونے سے پہلے ہر نبی نے سلوک و معرفت کی وہ تمام منزلیں طے کی ہوں، جن کی صوفیہ نے نشان وہی کی ہے۔ مزید برآں اس سے عقیدہ ختم نبوت کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کسبی ہے وہبی نہیں۔ یعنی اگر آج بھی کوئی شخص تعلق باللہ کی اس منزل تک رسائی حاصل کرے جس کو معرفت و سلوک کی اصطلاح میں آخری منزل کہا جاسکتا ہے تو وہ نبوت و رسالت کے عہدۂ جلیلہ پہ فائز ہوسکتا ہے حالانکہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس کا قائل نہیں۔ نبوت و ولایت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی وحی و تنزیل کے ذریعے جن حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ تمام تر معروضی ہوتے ہیں اور ولی کے قلب و ذہن پہ جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ موضوعی ہوتے ہیں' اور ان کا تانا بانا ،معاشرے کے حالات ، اقدار و تعلیم و تربیت کے اسلوب و نہج سے تیار ہوتا ہے ،اور ان میں جو تھوڑی بہت معروضیت پائی جاتی ہے ، وہ بھی صاف اور واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر طلب ہوتی ہے ۔ ان نقوش و تاثرات کو ہم کشوف تو کہہ سکتے ہیں ، وحی نہیں، کشوف کی شرعی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ سالک کے ذاتی تجربات ہیں۔ لہٰذا ہر حال میں ان کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آیا یہ کتاب اللہ اور سنت رسول ؐ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ جس طرح ایک مجتہد کا استدلال و استنباط صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی ، اسی طرح کشوف میں بھی خطا و صواب دونوں کا امکان موجود ہے ، بلکہ علامہ ابن تیمیہ کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ کشف بھی ایک طرح کے اجتہاد ہی سے تعبیر ہے۔

دینی حلقوں میں ایک نہایت محدود اور بے خود غلط حلقہ ایسا بھی ہے جو نبوت و وحی کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی تنزیل کے لئے کسی شخص کو منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کتاب کے متن اور الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے۔ لیکن اس کے اقوال و تشریحات اور عمل و کردار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بھی وحی و تنزیل کا نتیجہ ہوں، لہٰذا حجت و استدلال کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سرچشمہ صرف وہ کتاب ہوگی جو اس پہ نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر کا عمل اور ارشادات نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے پیغمبر کی حیثیت محض مبلغ اور شارح کی ہے، شارع کی نہیں۔ ان کے ہاں ہر دور کے اہل علم کو یہ حق ہے کہ وہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے طور پہ کتاب اللہ کی تشریح کریں' تشریع و تقنین کے سانچوں کو ڈھالیں، دین کی جزئیات اور تفصیلات کو متعین کریں اور لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔

نبوت و رسالت کا یہ گمراہ کن تصور دراصل اس مفروضے پہ مبنی ہے کہ وحی الٰہی کا دائرہ صرف کتاب اللہ تک سمٹا ہوا ہے اور اس کی وسعتیں اور ضوفشانیاں نبی کے اعمال اور ارشادات کو متاثر نہیں کرپاتیں۔ حالانکہ وحی ایسا عمل ہے جو پیغمبر کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس لیے پیغمبر دینی حقائق کی تبیین و تشریح کے ضمن میں جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس سے منشائے الٰہی کی پوری پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی ۝ (النجم: ۳، ۴)
اور وہ کوئی بات خواہشِ نفس سے منہ سے نہیں نکالتا، وہ تو وحی الٰہی ہے، جو انکی طرف بھیجی جاتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۝ (احزاب: ۲۱)
تمہارے لئے پیغمبرِ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے

اللہ کی اطاعت اور رسول کی متابعت کو دو مختلف اور متضاد خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف اظہار یا پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کتب و صحائف کے ذریعے معاشرے کے مسائل کا حل نازل فرماتا ہے اور رسول اپنے عمل کردار اور تشریحات سے وحی و تنزیل ہی کی روشنی میں ان کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ براہ راست وحی کو علما کی اصطلاح میں وحی جلی کہا جاتا ہے اور اسی کی روشنی اور تاثیر کو وحی خفی — اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبر تو بھیجا گیا ہے مگر اس پر کوئی متعین کتاب نہیں نازل کی گئی، لیکن اس کے باوجود اس کی پیروی کو ضروری ٹھہرایا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر کی ذات بجائے خود حجت و دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنے دور میں کتاب اللہ کی پیروی کے پہلو بہ پہلو اپنی پیروی کی بھی دعوت دی اور لوگوں سے کہا کہ اگر تم نجاتِ اخروی کے طالب ہو تو ہمارے نقشِ قدم پر چلو

حضرت نوحؑ نے فرمایا:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۰۹، ۱۱۰)
میرا صلہ تو خدائے رب العٰلمین ہی پر ہے، تو خدا سے ڈرو، اور میرے کہنے پر چلو۔

حضرت ہودؑ نے کہا:

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۲۶)
میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت صالحؑ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۴۴)
سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت لوطؑ کا کہنا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۶۲)
سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت شعیبؑ نے اسی پیرایہ بیان میں بن کے رہنے والوں سے فرمایا:

اِنِّی لکم رسول امین ۝ فاتقوا اللّٰہ واطیعون ۝ (الشعراء: ۱۷۸، ۱۷۹)
میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں سو خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضرت مسیحؑ نے ان الفاظ میں بنی اسرائیل کو اپنی بعثت کے مقصد سے آگاہ کیا:

قد جئتکم بالحکمۃ ولابیّن لکم بعض
میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں. نیز اس لیے کہ

الذی تختلفون فیہ ج فاتقوا اللہ و اطیعون ۝ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، تم کو سمجھا دوں۔

(الزخرف: ۶۳)

آیئے اب یہ دیکھیں کہ ان توجیہات و تصورات کے مقابلے میں قرآن حکیم نے نبوت کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے واضح اور غیر مبہم انداز میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق یکسر فیضانِ ربوبیت سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ عقل و خرد کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے، پھر انبیا و رسل کو بھیج کر اس کی رہنمائی کی ہے:

قال ربنا الذی اعطی کل شیءٍ خلقہٗ ثم ھدی ۝ (طٰہٰ: ۵) (موسیٰ نے) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

اس لیے کہ انسانی عقل و تجربہ بہر حال محدود و ناقص ہے۔ اس میں یہ استعداد نہیں پائی جاتی کہ وحی و تنزیل کی روشنی سے بے نیاز رہ کر تہذیب و تمدن کی گتھیوں کو کامیابی سے سلجھا سکے اور اپنے لیے ایسی راہِ عمل کا تعین کر سکے جس پر گام فرسا ہو کر یہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق رہا ہے کہ ہر دور میں تسلسل کے ساتھ ایسے اشخاص منتخب کر کے مبعوث فرمائے، جو ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور سے اس طرح کامل ہوں اور اس لائق ہوں کہ انسان کو ضلالت اور گمراہی کی پستیوں سے نکال کر رشد و ہدایت کے فرازوں تک پہنچا سکیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ ۝ (الانعام: ۱۲۴) اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کسے منصبِ نبوت سے نوازے۔

نبوت و رسالت کی ذمے داریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ خیر و خوبی کے قافلوں کو آگے بڑھا سکیں اور شر و برائی کے قلع قمع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ اس مضمون کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، جس سے یہ بات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق اللہ کی تدبیر اور نظامِ ربوبیت سے ہے۔ انسانی ماحول، معاشرے، استعداد، یا مجاہدہ و ریاضت سے نہیں:

کان الناس امۃً واحدۃً قف فبعث اللہ النبیّن مبشرین ومنذرین ۝ (البقرہ: ۲۱۳) پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے تو خدا نے اُن کی طرف بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم (آل عمران ۱۶۴) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔

اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے انبیا کے لیے رسل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:

لقد اخذنا میثاق بنی اسرآءیل ہم نے بنی اسرائیل سے عہد بھی لیا اور ان کی

وارسلنا الیھم رسلا ط (المائدۃ : ۷۰) طرف پیغمبر ارسال کئے۔

آنحضرت کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا:

ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ و کفیٰ باللّٰہ شھیدا ؕ (الفتح - ۲۸)

وہی ذات تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے۔

اسی نظامِ ربوبیت کی آخری کڑی آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کے فرائض کار میں تین چیزیں داخل ہیں۔

۱۔ تعلیم و تبلیغ

۲۔ تزکیہ

۳۔ تبیین

جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہ یک وقت معلم و مبلغ بھی ہیں، اور کتاب اللہ کے شارح اور مفسر بھی تعلیم و تبلیغ سے مراد یہ ہے کہ آپؐ اُمّت کو دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ کریں، اس کے ذہنی افق کو بلند کریں اور فکر و نظر کی صلاحیتوں کو اس طرح جلا دیں کہ خدا کی کائنات اور انسان سے متعلق امت ان تمام معلومات سے بہرہ مند ہو سکے، جس پر کہ تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور تعمیر منحصر ہے۔

تزکیہ سے یہ مقصود ہے کہ آپؐ اپنے روحانی فیوض اور اسوۂ حسنہ سے امت کے اخلاق و کردار کو سنواریں، ان میں انسانی فرائض کا احساس پیدا کریں۔ ہمدردی، محبت اور تعاون و خیر سگالی کے جذبات کی پرورش کریں اور یہ بتائیں کہ انفرادی و اجتماعی سطح پر تقویٰ، پرہیزگاری اور تعلق باللہ کی منزلوں کو کیوں کر کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے۔

تبیین کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم میں فرائض و اعمال کے بارے میں جو کچھ بھی مذکور ہے اس کی وضاحت اپنے قول و عمل سے کریں اور جہاں جہاں بھی تشریح طلب امور و احکام مذکور ہیں وہاں ان کی تشریح کریں اور امت کو پوری پوری تفصیلات سے آگاہ فرمائیں مثلاً یہ کہ مسلمان پر شب و روز میں کتنی نمازیں فرض ہیں، قیام، رکوع اور سجود میں کیا پڑھنا چاہیے، مناسکِ حج کیا کیا ہیں نکاح، طلاق اور بیوع یا معاملات سے متعلقہ آیات کا کیا مفہوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں ہم نے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے:

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم اٰیٰتنا و یُزکیکم و یعلمکم الکتٰب والحکمۃ و یعلمکم ما لم تکونوا تعلمون ؕ (البقرۃ: ۱۵۱)

منجملہ اور نعمتوں کے جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمھیں پاک بناتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔

یٰایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک ؕ (المائدۃ : ٦٧)

اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے سب کا سب پہنچا دیجیے۔

یٰاَھلَ الکتٰب قد جاءکم رسولنا یبیّن لکم کثیرًا مما کنتم تخفون من الکتٰب (المائدہ: ۱۵)

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب الٰہی میں سے چھپایا کرتے تھے۔ وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کر بتا دیتے ہیں۔

وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون ० (النحل: ۴۴)

اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر کھول کر بیان کر دیں اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

ثم ان علینا بیانہٗ ० (القیمۃ: ۱۹)

پھر اس کے (یعنی قرآن کے) معانی کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔

قرآنِ حکیم نے جس طرح تصورِ نبوت و رسالت کو نکھارا اور بیان کیا اور جس انداز سے آنحضرتؐ کی اطاعت و اتباع کو ضروری ٹھہرایا، اسی کا یہ نتیجہ اور فیض تھا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں نہ صرف آپؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کی سعادت حاصل کی بلکہ ان نقوش کو اُجاگر بھی کیا اور اُن کی حفاظت و صیانت کا اہتمام بھی کیا۔

نبی کریمؐ کا مقصدِ بعثت (قرآنِ حکیم کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

ہمارا ایمان ہے کہ سیّدِ وُلدِ آدم حضرت **محمد** صلی اللہ علیہ وسلّم صرف ایک نبی ہی نہیں "خاتَمُ النّبیّین" ہیں اور صرف ایک رسُول ہی نہیں "آخِرُ الرُّسل" ہیں اور آپ پر نبوّت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہُوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد جملہ انبیاؑ و رُسل کے مقصدِ بعثت سے مختلف نہیں ہوسکتا وہاں یہ بھی لازمی و لابدی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے مقصد میں ایک اتمامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو جس سے نبیوں اور رسُولوں کی مقدّس جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

گویا آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ از روئے قرآنِ حکیم بعثتِ انبیاء و رُسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بحیثیت خاتم النبیّین آخر المرسلین آپؐ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

بعثتِ انبیاء کی اساسی غرض و غایت

ایمانیاتِ ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں یعنی توحید[1]، معاد[2] اور رسالت[3] یا ایمان باللہ[1]، ایمان بالآخرت[2] اور ایمان بالرّسالت[3]۔ لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجّہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلّق کی نوعیت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلمانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالمِ وجود اور سلسلۂ کون و مکان جو تا حدِّ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہُوا ہے نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا بلکہ حادث بھی ہے اور ہالک[1] و فانی[2] بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اسے اللہ کہہ لیا جائے یا رحمٰن، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا[3]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور تمام صفاتِ کمال سے بتمام و کمال

---

[1] كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ٭ گرنہ ای ور وجہ او ہستی مجو۔ [2] كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (سورہ رحمٰن) [3] قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ۖ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ج (بنی اسرائیل ۱۱۰)

متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا ہے چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں اور نہ اختیارات میں[1]

اس نے اس کائنات کو "بِالْحَقِّ" اور "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلہ تخلیق کا مرتبۂ کمال ہے انسان، جسے اس نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا[2]۔ پھر اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرما دیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جملہ مراتب تنزل کا حاصل بھی قرار دیا جا سکتا ہے بقول حضرت بیدلؒ

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

— اور ایک دوسرے پہلو سے پورے سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ عروج بھی!

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝	ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلوں میں سب سے نچلا۔

ایمان بالمعاد کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کل زندگی نہیں بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس کی کتابِ حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدمہ یا اس کے سفرِ حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ[3] بقول علامہ اقبال مرحوم

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ	جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب	اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کو نقل مکانی کا نام ہے جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالمِ برزخ جس کا آغاز موت کے فوراً بعد ہو جاتا ہے اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالمِ آخرت جس کا آغاز یومِ قیامت سے ہوگا۔ بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ سب اسی ایمان بالمعاد

---

[1] قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۂ اخلاص) ۲۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آخری آیت)

[2] خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (الحدیث شیخین عن ابی ہریرہؓ) — اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔

[3] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۂ ملک) — پیدا کیا سلسلۂ موت و حیات تاکہ جانچے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے سب سے اچھے عمل کرنے والا۔

کی تنا صیل ہیں بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم :

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا ۔

(ماخوذ از خطبات نبویؐ)

(ترجمہ) خدا کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو۔ پھر تمہیں لازماً اٹھا لیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو۔ پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر بدلہ مل کر رہے گا۔ بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا۔ اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم مل کر مبدا و معاد یا حیات انسانی کی ابتدا و انتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان سے سفر حیات کے آغاز و انجام کا تعین ہو جاتا ہے بقول الفاظ قرآنی " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ " (ترجمہ) ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے واقعہ یہ ہے کہ مبداء و معاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اس کے سفر کی منزل کونسی ہے گویا بقول فانی :

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا بقولِ غالبؔ ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعین کے محض بطن و فرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بتا دیتا ہے۔ مطابق تمثیلِ قرآنی :

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(سورۂ ملک - ۲۲)

بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یا پھر اس کی کیفیت اس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے رحم و کرم پر ہو کہ جہاں چاہے اسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی :

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (سورہ حج : ۳۱)	تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے، پھر اچک لیتے ہیں اسے (مردار خور) پرندے یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر۔

اور اس ع "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے گویا لاادریت AGNOSTICISM اور ارتیابیت (SKEPTICISM) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جائے گویا :

ع "رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!"[1]

ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمان بالرسالت کے صحیح منطقی ربط کے فہم و ادراک کا دارومدار ہے یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جائے گا یا بالفاظِ دیگر محاسبۂ اُخروی کی اساسات کیا ہیں ؟

مطالعۂ قرآن حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اسے ایک جملہ میں تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے :

انسان اوّلاً اور اصلاً تو مسئول ہے ان استعدادات فطریہ یا لطائف اصلیہ کی بنیاد پر جو ہر انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں جیسے سمع و بصر، عقل و شعور اور تفکر و اعتبار یا لطیفۂ نفس، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح ـــ اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان پر اتمامِ حجت کا اہتمام کیا ہے بذریعہ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثت انبیا و ارسال رسل

ـــ لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔

لطیفۂ نفس

انسان کے مذکرہ بالا لطائف ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین ہے لطیفۂ نفس جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس کا رجحان اصلی عالم اسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعتہً "اَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" ہی کا طوفان موجزن ہے جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا مارکس نے، دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا اڈلر نے۔ اور یہی ہے

---

[1] شاد عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی ۔۔۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے فانی بدایونی نے اپنی منطقی انتہا تک یوں پہنچا یا کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم! ۔۔۔ رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفۂ روح

اور بالکل دُوسری انتہا پر ہے لطیفۂ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب (وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) اور جس کا تعلق ہے کلیتۂً عالمِ امر سے (قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ) اور جس کا اصل رُخ ہے ع "اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن!" کے مصداق عالمِ بالا کی جانب، چنانچہ اس میں محبتِ الٰہی کا ایک جذبہ اور "لقائے رَبّ" کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سُلگتا ہے بقول اقبال مرحوم ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

— البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے تعبیر کیا ہے بعض اربابِ دانش نے شعلۂ ملکوتی سے۔

خیر و شر کا داخلی معرکہ

گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ "انسان عالمِ اصغر ہے" اور واقعتہً انسان کے باطن میں سب کچھ ہی موجود ہے چنانچہ بدی کے پست ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی اور ان ہی کے مابین ایک شدید کش مکش اور مستقل جنگ جاری ہے۔ انسان کی باطنی شخصیت کے وسیع و عریض میدانِ کارزار میں!

مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ

لیکن اس معرکۂ خیر و شر میں خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تفنگ نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نواز کر اور بہت سی قوتوں سے مسلّح کر کے بھیجا ہے، چنانچہ اس کی شخصیت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفۂ نفس' بھی ایک جانب مسلّح ہے استعداداتِ سماعت و بصارت سے اور قوائے تعقل و تفکر سے اور دوسری جانب مسلّح ہے ایک اخلاقی حِس سے جو تمیز کرتی ہے خیر و شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو بنا بریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورتِ نفسِ لوّامہ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ○ — ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جُلے نطفہ سے تاکہ آزمائیں اسے چنانچہ بنا دیا ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا!

(سورۂ دہر آیت ۲)

۲۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ — اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کہ اسے بنایا ٹھیک ٹھیک، پھر ودیعت کر دی اس میں سوجھ بدی اور نیکی کی۔

(سورۂ شمس ۷، ۸ آیات)

۳۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ (سورۂ قیامہ۔ آیات ۲،۱)

نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں (بلکہ) قسم کھاتا ہوں میں نفسِ ملامت گر کی!

۴۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (سورۂ قیامہ آیات ۱۴-۱۵)

بلکہ انسان خود ہی گواہ ہے اپنے نفس پر، خواہ بڑا بنائے بہانے!

بنا بریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کا قابل و مستحق! یہاں تک کہ عدالت اُخروی میں ہر نفس کو اپنی جوابدہی خود ہی کرنی ہوگی اور اپنا محاسبہ خود ہی بھگتنا کرنا ہوگا۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (سورۂ نحل۔ آیت ۱۱۱)

جس دن آئے گا ہر نفس مدافعت کرتے ہوئے اپنی جانب سے — اور پورا پورا صلہ مل جائے گا ہر نفس کو اپنے کیے کا!

اور نہ کوئی نفس دوسرے نفس کے کام آسکے گا، نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش یا فدیہ قبول ہوگا، نہ اسے کسی طرف سے مدد ہی مل سکے گی۔ بفحوائے الفاظ قرآنی۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۸)

اور ڈرو اس دن سے جب نہ کام آسکے گا کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کچھ بھی — اور نہ قبول کی جائیگی اسکی جانب سے کوئی سفارش، اور نہ قبول ہوگا کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہوگی!

لطیفۂ قلب

اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انسان میں ایک اور جوہرِ نایاب ودیعت فرما دیا جس میں معرفتِ ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور جملہ حقائق کونیہ بھی منعکس ہیں ہماری مراد ہے لطیفۂ قلب سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے مانند جس میں عالمِ اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے گویا اگر لطیفۂ نفس قوائے سمع و بصر اور تعقل و تفکر سے مسلح ہے جو اساس ہیں جملہ علومِ مادی و نظری کی تو لطیفۂ قلب مسلح ہے ان قوائے تفہم و تفقہ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائقِ کونیہ اور معارف لدنیہ کا۔ بقول شاعر:

بینی اندر دل علومِ انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا!

اور
صد کتاب و صد ورق در نار کن
روئے دل را جانبِ دلدار کن!

اور
در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدا را
در آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست [۱]

---

[۱] اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ خود کلامِ نبوت میں قلب کے لیے اسی قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں مثلاً اس مشہور حدیث میں جس کے رو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الغرض لطیفۂ قلب کے ودیعت کئے جانے کے بعد انسان کی مسئولیت پر آخری مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔

بمصداق الفاظِ قرآنی :-

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ — یقیناً کان، آنکھ اور دل ہر ایک کے بارے میں پرسش ہو کر رہے گی

(سورۂ بنی اسرائیل) آیت ۳۶

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان فطری استعدادات کو بیکار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کر لیں :

زبروئے الفاظِ قرآنی :

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ — ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

(سورۂ اعراف) آیت ۱۷۹

خیر و شر کے خارجی داعیات

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیت کے باطنی میدان کارزار میں جاری ہے، اس کو تقویت پہنچانے والے کچھ داعیات خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم :

دُنیا کو ہے پھر معرکہ رُوح و بدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیت داخلی کشاکش ہی کی ہے، خارجی داعیات محض تقویت کے موجب ہو سکتے ہیں خواہ وہ خیر کی جانب تشویق و ترغیب پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تحریص و تحریض پر۔ چنانچہ نہ کسی داعیٔ شر

(حاشیہ پچھلے صفحے کا)

اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ! — یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آ جاتا ہے!

جس پر صحابۂ کرام نے بالکل صحیح سوال کیا کہ :

فَمَا جِلَاؤُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ — حضورؐ! پھر انھیں صیقل کیسے کیا جائے؟

جواباً ارشاد ہوا :-

كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ! — موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت!

حتیٰ کہ ابلیس لعین و شیطانِ رجیم تک کو یہ قوت و اختیار ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر برائی پر مائل کر سکے۔

بفحوائے الفاظِ قرآنی :

۱- اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ (سورۂ حجر آیت ۴۲)

جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ زور نہیں اسوائے اس کے جس نے خود ہی تیری پیروی کی بھٹکے ہوؤں میں سے۔

۲- اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ (سورۂ نحل آیت ۹۹)

اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں!

اور نہ ہی کسی داعیٔ خیر حتیٰ کہ سیّد الاوّلین والآخرین خاتم النبیین و آخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے۔

از روئے الفاظِ قرآنی :

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (سورۂ قصص آیت ۵۶)

(اے نبیؐ!) تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے چاہے بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں یعنی ابلیس اور اس کی صلبی و معنوی ذرّیت انسانوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے کہ :-

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۲۷)

وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو اور اس کے ہم جنس بھی۔ جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔

اور حدیث نبوی میں تصریح بھی ہے کہ "اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ"[1] یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دوران اصحابِ خیر اور اہلِ حق کے لیے تقویت و تثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں اور جس طرح شیاطین جنّ و انس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک و اشتعال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی رُوح ملکوتی میں نشاط و اہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکۂ حق و باطل کے دوران اہلِ حق کے قلبی سکون و اطمینان اور عملی ثبات و استقلال کا سبب بنتے ہیں۔

بفحوائے آیاتِ قرآنی :

۱- هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (سورۂ احزاب، آیت ۴۳)

وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اجالے میں

---

[1] صحیح بخاری

۲۔ اِذْ يُوحِي رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

(سورۂ انفال آیت ۱۲)

جب وحی (کے ذریعے حکم) فرما رہا تھا تیرا رب فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس دلوں کو جمائے رکھو اہلِ ایمان کے۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔

(حٰم السجدہ ۳۰۔۳۱)

بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے۔ ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ خائف ہو نہ غمگین اور خوشخبری حاصل کرو اسی جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اتمامِ حجت اور قطعِ عذر

اب ہم آ پہنچے موضوع زیر بحث کی بحث اوّل کے آخری نقطے تک۔ وَهُوَ هٰذا۔ کہ جس طرح انسان کے اصل داخلی داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائف نفس و روح لیکن اصل حجت داخلی بنتی ہیں استعداداتِ سمع و بصر و تعقل و تفکر اور حسِ اخلاقی اور تفقہ قلبی جنھیں انسان کی مسئولیت کی اساسِ اصلیہ کہا جا سکتا ہے، اسی طرح اصل خارجی داعیانِ خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس اور اس کی ذریت صلبی و معنوی لیکن اس ضمن میں اتمامِ حجت ہوتا ہے۔ اجرائے وحی، تنزیل کتب، بعثتِ انبیاء اور ارسال رسل سے جن کی حیثیت ہے حجتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرسالت!

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

۱۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○

(سورۂ نساء آیت ۱۶۵)

(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے تاکہ نہ رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں۔ اور اللہ تعالیٰ ہے ہی زبردست اور (کمال) حکمت والا۔

۲۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۹)

اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آگیا ہے ہمارا رسول جو واضح کر رہا ہے تم پر (ہماری ہدایت) اس کے باوجود کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا سلسلۂ رسالت مبادا تم کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی!

گویا بعثت انبیاء اور ارسال رسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمام حجت اور قطع عذر، تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔ یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و تحریص اور تحریک و تشویق کی ہے اسی طرح نبوت و رسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت و تبلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاحیں مبشرین و منذرین ہی کی ہیں جیسے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (سورۂ کہف آیت ۵۶) اور وحی و کتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ، ذکر، ذکری اور تذکرہ کے ہیں جیسے :-

۱۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر-۹)
یقیناً ہم ہی نے اتارا یہ ذکر (یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے محافظ و نگہبان۔

۲۔ طٰهٰ ۞ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۞ إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ۞ (طٰہٰ-۱-۲-۳)
(اے نبی) ہم نے تم پر قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ بلکہ (اتارا اسے) صرف یاد دہانی کے طور پر ان کے لیے جو ڈرتے ہوں۔

۳۔ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۞ (سورۂ عبس-۱۱)
نہیں! یہ ایک یاد دہانی ہے۔

۴۔ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ (سورۂ ق-آیت ۸)
سجھانے اور یاد دلانے کو، اس بندے کے لیے جو رجوع کرے!

۵۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ (سورۂ ق آیت ۳۷)
اس میں یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس دل (زندہ و بیدار) ہو یا کان لگا کر سنے پوری توجہ کے ساتھ

۶۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۞ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۞ (سورہ غاشیہ آیات ۲۱، ۲۲)
تو (اے نبی) تم یاد دہانی کراتے جاؤ۔ تمہارا کام تو بس یاد دہانی کرانا ہی ہے۔ ان پر داروغہ تو ہو نہیں (کہ ضرور ہدایت پہ لے آؤ!)

اگرچہ ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کیلئے سب سے زیادہ جامع اصطلاح 'شہادت' کی ہے اور فریضۂ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی الناس ہی ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بفحوائے الفاظ قرآنی :

۱۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۞
ہم نے بھیج دیا ہے (اے بنی اسمٰعیل) تمہارے پاس ایک رسول گواہ بنا کر تم پر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک

رسُول فرعون کی جانب۔

(سورۂ مزمّل - آیت ۱۵)

۲ - لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج - آخری آیت)

تاکہ ہوجائیں رسُولؐ گواہ تم پر۔ اور ہوجاؤ تم گواہ پُوری نوعِ انسانی پر!

۳ - فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (سورۂ نساء - آیت ۴۱)

تو کیا ہوگا اس وقت جبکہ ہم بُلائیں گے ہر گروہ میں سے ایک گواہ ۔ اور بُلائیں گے آپ کو (اے نبیؐ) بطور گواہ ان کے خلاف!

حاصل کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرضِ اصلی اور ارسالِ رُسل کا مقصدِ عمومی ہے۔ انسانوں پر اتمامِ حجت اور قطعِ عذر بذریعہ تبلیغ و دعوت، تلقین و نصیحت، وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر جن کا مجموعی حاصل ہے "شہادت علی النّاس"!

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصدِ اوّلین بفحوائے الفاظِ قرآنی :-

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

(سورۂ احزاب آیات ۴۵-۴۶)

اے نبیؐ! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا کر گواہ اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا اور بُلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن چراغ (ہدایت)

گویا معلّم و مبلّغ، مربّی و مزکّی، مُبشّر و منذر اور داعی و شاہد کی جُملہ حیثیتیں مشترک ہیں۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور جُملہ انبیاء و رسل علیہم السّلام میں، اگرچہ ان اعتبارات سے بھی ع

ہر گُلے را رنگ و بُوئے دیگر است!

کے مصداق ہر نبی اور ہر رسُول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند و بالا مقام ہے سیّد الاوّلین والآخرین کا صلّی اللہ علیہ وسلّم! تاہم بحیثیت خاتم النبیین و آخر المرسلین جن پر نبوّت و رسالت کا اختتام ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ آپؐ کی مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کچھ اور رہی ہے۔ وَھُوَھٰذَا :

بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی اتمامی اور تکمیلی شان

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :-

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ جبکہ یہ الفاظ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے

کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں[۵] ہے، وہاں پورے قرآن مجید میں اس کے لگ بھگ مفہوم کے حامل الفاظ بھی کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور تالیف "اِزَالَۃُ الْخِفَاعَنْ خِلَافَۃِ الْخُلَفَا" میں مفصل کلام کیا ہے اور انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہر نوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبر لازمی و لابدی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا، ایک "الھدیٰ" اور دوسرے "دینِ حق"

"اَلْھُدٰی"

"الھدیٰ" کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی لیکن نظائرِ قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے "قرآن حکیم"۔ اس لیے کہ وہی "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ"[۳] بھی ہے اور "ھُدًی لِّلنَّاسِ"[۴] بھی اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"[۵] اور یہ بھی کہ "اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ"[۶] اور وہی ہے کہ جسے جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اٹھے کہ "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ"[۷]

مزید برآں سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں "ارسالِ رسل" کے ضمن میں فرمایا کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ	ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان۔

ظاہر ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں جس طرح "اَلْمِیْزَان" کو "دِیْنِ الْحَقّ" کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح "اَلْکِتٰب" ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیرِ بحث میں "اَلْھُدٰی" کا لفظ آیا ہے گویا "اَلْھُدٰی" سے مراد

---

[۳] سورۂ بقرہ: آیت ۲ "ہدایت پرہیزگاروں کے لیے۔"

[۴] سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵ "ہدایت پوری نوع انسانی کے لیے۔"

[۵] سورۂ شوریٰ: آیت ۵۲ "لیکن بنا دیا ہم نے اسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے۔"

[۶] سورۂ اسراء: آیت ۹ "یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے!"

[۷] سورۂ جن: آیت ۱: ۲ "ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف تو ہم ایمان لے آئے اس پر۔"

[۱] سورۂ توبہ: آیت ۳۳، سورۂ فتح: آیت ۲۸، سورۂ صف: آیت ۹۔

بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے "اَلقُرآن" کے اور کچھ نہیں (واضح رہے کہ سورۃ حدید "اُمّ المُسبّحات" ہے اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سُورۃ صف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیرِ بحث الفاظ مبارکہ وارد ہُوئے ہیں)

"دِیْنِ الحقّ" اسی طرح "دین الحق" کو بھی خواہ ظاہری ترکیبِ اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اُسے ترکیبِ توصیفی بشکل ترکیبِ اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے "سچا دین" (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہرصورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری سُبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے الفاظِ قرآنی :-

۱ - ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ۔ یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے "حق"

(سورۂ حج - آیات ۶، ۶۲)

۲ - وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کُھلا "حق"

(سورۂ نور - آیت ۲۵)

گویا "دِین الحقّ" بالکل مساوی و مترادف ہے "دین اللہ" کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیتِ زیرِ بحث کے ضمن میں دین الحق کی ترکیب استعمال ہُوئی ہے اور پُورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ دین اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں[1]) لفظِ "دین" پر توجہ کو مرکوز کیجیے تو عربی لُغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ "اَساسُ القرآن" یعنی سورۂ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ[2] (جو لامحالہ نیکی کا جزاء کی صورت میں ہو گا اور بدی کا سزا کی شکل میں[3])

چُنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزا و سزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے :-

---

[1] سُورۂ آلِ عمران : آیت ۸۳، سُورۂ نور : آیت ۲، سُورۃ نصر : آیت ۲

[2] یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوانِ حماسہ کے مشہور مصرعہ کے الفاظ "دِنَّاهُمْ کَمَا دَانُوا (ہم نے اُن کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کر لیں اور اسے بھی کہ عربی میں دَین کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

[3] بقول آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم "ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْءًا" (پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور بُرائی کا بُرا!)

۱۔ أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ○ (الماعون : ۱)
تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا و سزا کو؟

۲۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ○ (سورۃ التین : ۷)
تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزا و سزا کے جھٹلانے پر؟

۳۔ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ○ (الانفطار : ۹)
کوئی نہیں، بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و سزا کو!

اور سورۂ فاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ "یوم" کی اضافت کے ساتھ یوم قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزا و سزا کا دن۔

پھر چونکہ بدلے اور جزا و سزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی اطاعت و متابعت کے تصور کو، لہٰذا لفظ دین نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اُٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اوّلاً 'اطاعت' کا مفہوم پیدا ہوا (چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ" اور ایک بار "مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي" اور چھ مرتبہ "مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں۔ جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے "حنیفاً" یا "حُنَفَاءَ" کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ کا کہ: "أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" (الزمر: ۳) اور "وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا" (النحل - ۵۲) اور بالآخر اس نے 'نظامِ اطاعت' کی صورت اختیار کر لی جس کی اضافت حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاعِ مان کر نظامِ زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو جیسے سورۂ یوسف میں فرمایا :۔

كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ ۔ (آیت : ۷۶)
(ترجمہ) اس طرح ہم نے تدبیر کر دی یوسفؑ کے لیے ورنہ بادشاہ کے قانون کی رُو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے بھائی کو روک سکتے۔

گویا مصر کے اس دور کے رائج الوقت نظامِ ملوکیت کو جس میں مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہ یا 'ملک' کو حاصل تھی۔ قرآن حکیم "دین الملک" سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم (SENSE) میں قرآن مجید میں استعمال کیے ہیں "دین اللہ" کے الفاظ سورۂ نصر میں :

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا
(ترجمہ) جب آگئی اللہ کی مدد اور فتح اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدّ و جہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ

اللہ ہی کو مطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے تعبیر کیا قرآن مجید نے "دِینِ اللّٰہِ" کے الفاظ سے! — (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو، جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر[1] حاکمیت کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں جمہور تعبیر کیا جائے "دِیْنُ الجمہور" کے الفاظ سے!)

البتہ قرآن حکیم میں 'دین' کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافتِ مجازی قرار دیا جانا چاہئے جیسے "دِیْنِی" یا "دِیْنُکُمْ" یا "دِیْنَھُمْ"۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا 'اُس کا دین' بن گیا (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دُعا کے الفاظ میں: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ . . . . الخ اسلام اصلاً تو 'دِیْنُ اللّٰہِ' ہے لیکن مجازاً 'دینِ مُحَمَّدٍ' بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فِدَاہُ اٰبَآءُنَا وَاُمَّھَاتُنَا)

حاصل کلام یہ کہ "دِیْنُ الْحَقّ" سے مراد ہے "دِیْنُ اللّٰہِ" یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ دراصل خاتم النبیین و آخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس 'المیزان' کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر تدریجاً مختلف ارتقائی صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ! — اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے "تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر"[2]

آخری بعثت کیلئے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے۔ اس کے جانب بھی ہمیں دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے اس لیے کہ بعثتِ محمدی عَلٰی صَاحِبِھَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا زمانہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی۔

۱۔ ایک اس اعتبار سے کہ عقلِ انسانی اپنی پوری پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یُوں کہہ لیں کہ نسلِ انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مُدّظلّہٗ جنہوں نے

---

[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

[2] لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید: ۲۵)

مذاہبِ عالم، فلسفہ، تصوّف اور علمِ کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا ہے، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیح تک کا عرصہ فکرِ انسانی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہبِ عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتبِ فلسفہ بھی وجود میں آچکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ظرف ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ واقعتہً نہ کوئی نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقتہً جدید مکتبِ فکر یا مدرسۂ فلسفہ، اور "فلسفۂ جدید" کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتبِ فکر سامنے آئے ہیں اُن کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں! —— اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزون و مناسب تھی اس کے لیے کہ ع "نوعِ انساں را پیامِ آخریں" یعنی قرآن حکیم "اَلْھُدٰی" بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا تاکہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ :-

١- اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (الاسراء : ۹)	یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔
٢- وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط (الاسرا : ۱۰۵)	اور اس قرآن کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔
٣- قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (الاسراء : ۸۸)	کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔

اور اس نے پوری نوعِ انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ :

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (البقرہ : ۲۳)	اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورت!

افسوس کہ تا حال قرآن حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت، تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا ہے اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اُس کے قدموں میں ڈال دی گئیں۔ درآنحالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً "اَلْھُدٰی" ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی 'فکری و عملی رہنمائی' ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکرِ انسانی بطورِ خود (AS SUCH) اپنی آخری بلندیوں کو چھُو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے 'بالغ' ہو گیا تھا۔

۲۔ آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئت اجتماعیہ بھی ارتقاء کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی چنانچہ انسان اوّلاً قبائلی زندگی اور اس کے بعد شہری ریاستوں (STATES CITY) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوری شدت کو پہنچ چکی تھی اور انسان کو تمدن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں فرد بمقابلہ جماعت، مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالمِ انسانیت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور کی سی اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا ___ لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی عطا کر دیا جائے جو واقعتہً "اَلْمِیْزَان" کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وَسَط کا تعین کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کو پوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال کا اور نہ سیاسی جبر کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیشِ نظر تھا یعنی "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"۔ وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے پورا ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۝ (المائدہ ۵: ۳)	آج کے دن میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو۔

لِیُظْھِرَہٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور "لِیُظْھِرَہٗ" پر غور فرمایئے تو بحمد اللہ یہاں 'اظہار' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی 'غالب کر دینا' البتہ فعل اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں

لے ظَھر کہتے ہیں پیٹھ کو ___ اور 'ظاہر' استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے قرآن مجید میں سورۂ صف کے آخر میں فَاَصْبَحُوْا ظَاھِرِیْنَ" (بس وہی ہوئے غالب) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے!___ اِظْھَار 'باب افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعل متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

موجود ہیں اگرچہ اُن سے مُراد و معنیٰ میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ فعلِ اظہار کا فاعل وہی ذات ہے جو فعلِ ارسال کا یعنی اللہ اور دوسری رائے یہ ہے کہ " لِيُظْهِرَهٗ " میں ضمیرِ فاعلی رسُول کے جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دُور جانا صحیح نہیں اِلّا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالمِ واقعہ میں قرآن مجید کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہارِ دینِ حق کے لیے عالمِ واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شدید محنت و مشقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی۔ اگرچہ فاعلِ حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ (الانفال : ۱۷)	تو انہیں (کُفّارِ قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا اور (اے نبیؐ) جب تم نے اُن پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ مُشتِ خاک) بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصوّر ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعمِ خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دینِ حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیتِ مذکرہ بالا نازل ہُوئی۔ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہرِ الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی و جہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رُخ بہتا؟ اور آیا اس صُورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہیئے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آگئے؟ اور صورتِ حال وہ تو نہیں جو "خُوئے بد را بہانہ بسیار" کی کہاوت میں بیان ہُوئی یا جگر مُرادآبادی کے اس شعر میں کہ :

تپتی راہیں مجھ کو پُکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سُورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف جن میں آیت زیرِ بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۂ صف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیۂ مبارکہ کے فوراً بعد کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں؟ اور پھر صاف صاف سُنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُر صعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (الصّف : ۱۰، ۱۱)	اے اہلِ ایمان! کیا میں رہنمائی کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب سے، ایمان (محکم) رکھو اللہ پر اور اس کے رسُول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔

اگر اس راہ کو اختیار کرنے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی، اُخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دُنیا میں تائیداور فتح و نصرت کا بھی اور سب سے بڑھ کر یہ نصرتِ خُدا و رسُول کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبُوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی ــــ بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث میں ہی عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں اُن کے خلوص اخلاص کا اصل ٹسٹ یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسُول دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!

چُنانچہ سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرما دی:

وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ط	اور تا کہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے۔

اور سورۂ صف کا اختتام بھی ہوا اس آیۂ مبارکہ پر:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ط	اے اہلِ ایمان! بنو مددگار اللہ کے جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف۔

اس کے بعد پھر بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اُسے اختیارِ کُلّی حاصل ہے۔

لِیُظْهِرَهٗ کی ضمیرِ مفعولی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مرجع ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسُول کی جانب ــــ اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسُول کے غلبے کا مطلب بھی اُن کی ذات یا اُن کے کُنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دینِ حق ہی کا غلبہ ہے!

عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

'عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ' کا ترجمہ عموماً 'تمام ادیان' کر دیا جاتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس سے مُراد لے لیے جاتے ہیں 'تمام مذاہب'۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مغالطہ در مغالطہ ہے

اور اس ٹکڑے کا محتاط ترین ترجمہ تو وہ ہے جو بعض مترجمین نے "سب دین پر" کے الفاظ میں کیا اور مزید وضاحت مطلوب ہو تو صحیح ترین ترجمانی ہوگی "پورے دین پر" یا "سارے دین پر" یا "پورے جنس دین پر" کے الفاظ سے! ظاہر ہے کہ "کُلِّہٖ" یہاں "الدّین" کا بدل ہے اور "الدین" میں لامِ تعریف کے جس قدر لامِ حصر ہونے کا امکان ہے اتنا ہی لامِ جنس ہونے کا بھی ہے۔ مزید براں پورے قرآنِ حکیم میں نہ کہیں لفظِ 'ادیان' استعمال ہوا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں "الدین" کا ترجمہ "تمام ادیان" کرنا ممکن ہو۔ اور ان سب پر مستزاد اس مسئلے میں نصِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (انفال : ۳۸)

اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

واضح رہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ جن پر "عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کے زیرِ بحث الفاظ وارد ہوئے ہیں پورے قرآن حکیم میں یہ واحد مقام ہے جہاں "الدین" کے ساتھ "کُلُّہٗ" بطور بدل آیا ہے اور یہاں ترجمہ "سارے ادیان" کرنا ممکن ہی نہیں صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی "پورے کا پورا دین" یا "سارے کا سارا دین" اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے (جیسا کہ اس سے قبل "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" اور "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" اور "لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا" کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے)

اب "الدین" کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کا ترجمہ کیجئے تو وہ یوں ہوگا :

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الہدیٰ' (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کلّی کے اصول پر مبنی نظامِ زندگی) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے وہ (یعنی رسولؐ) اُسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظامِ اطاعت یا نظامِ زندگی) پر!"

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ 'اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ' کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ 'اظہارِ دینِ حق' دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لابدی تھا :

۱۔ ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنیٰ ہو جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گذارہ کر سکتا ہے جس طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت یا بدھ مت اور ہندو مت

ایسے مذاہب "یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ"[1] کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا[2] — جب کہ دین ایک کلّی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت و آمریت یا کیپٹلزم اور کمیونزم و سوشلزم کسی خطۂ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دو دین بھی کسی جگہ ہم سر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے اور ان کے مابین مفاہمت پُر امن بقائے باہمی کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر مذہب کی حیثیت اختیار کرے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے۔[3]

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں :-

ایک یہ کہ لفظِ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیثِ نبویؐ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے جیسے مذہبِ حنفی، مذہب مالکی، مذہبِ شافعی، مذہبِ حنبلی اور مذہبِ اہلِ حدیث جن کی حیثیت دینِ اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضورؐ جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی تھا، بفحوائے آیاتِ قرآنی :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى۔ (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۱۳)	مقرر کیا اُس (اللہ نے) تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو۔

۲۔ اور دوسرے اس لیے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے

---

[1] التوبۃ : ۲۹ "دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!"

[2] جس کی صحیح ترین تصویر ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

[3] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب ۔۔۔ اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی! (اقبالؒ)

[4] اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۂ توبہ کی محولا بالا آیت کے الفاظ "وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے!

نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے اور رسالتِ محمدیؐ کی جانب سے نوعِ انسانی پر "شہادت" اور "اتمامِ حجت اور قطعِ عذر" (جو سلسلۂ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ آپؐ اس دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے "غلبۂ دینِ حق" کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی، بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا جو بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ "معجزات" عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ "انسانی حریت، اخوت اور مساوات" صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور روپ کا واقعہ بھی دھار سکتے ہیں[1] اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیِ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کئے جا سکتے ہیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے — تو اس دور کے انسان پر "دینِ حق" کی جانب سے اتمامِ حجت کیسے ہو سکتا ہے جس کے فاتح ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام و کمال اور بغایتِ توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بالکل یہ محسوس ہو کر نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدیؐ تک رسائی کی سعی و کوشش ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

---

[1] ایچ۔جی۔ویلز (H.G. WELLS) کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بغض و عناد و عداوت ہے وہ اُن رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اُس نے آنحضورؐ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کئے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A CONCISE HISTORY OF THE WORLD) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ "انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے۔ چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمدؐ نے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی: "الفضل ما شهدت به الأعداء" (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے!

[2] چنانچہ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ رامائن اور مہابھارت یا بکرماجیت یا چندر گپت موریہ کا!)

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عینِ اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دین اور ختم و اکمالِ نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپ انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم، ہجرت، جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدّوجہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپ انبیاء و رسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں جس میں کوئی دوسرا نبی یا رسول آپ کا شریک نہیں ہے۔

داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو داعیٔ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ داعیٔ انقلاب کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور ان سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہوئی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئتِ حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جدّوجہد

رہی آپ کی انقلابی جدّوجہد، تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کش مکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت جہاد و قتال کی تمام منازل سے گذار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو اور یہ نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کُل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری!) کی مختصر سی مدت میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلی اللہ علیہ وسلم وفداہ ابآءنا و اُمّھاتنا!

نبوی طریق کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور انقلابِ محمدی کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپ کی انقلابی

جدو جہد کن کن مراحل سے گزری ؟ تو یہ سچائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہو گی۔

سر دست موضوع زیر بحث کی مناسبت سے دو مزید اُمور کی نشاندہی مطلوب ہے۔

۱۔ مغربی مفکرین کی ناسمجھی ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے فہم میں مغربی مفکرین یا مستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رُسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے، چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلّغ بھی، معلّم بھی ہوتے ہیں اور مربّی و مزکّی بھی، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی، واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی، ریفارمر (REFORMAR) بھی ہوتے ہیں اور مُصلح بھی لیکن چونکہ ان پر ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ عَلَم بھی، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبّر و سیاست دان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضور صلعم کی شخصیتِ مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے کوئی تو آپ کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپ کی عظمت صرف بطورِ انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے[1]۔ کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ "محمد (م) بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے۔ البتہ بحیثیت مُدبّر و سیاستدان کامیاب ہو گئے[2]" اور کوئی آپ کی شخصیت کو دو مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے چنانچہ اُسے "مکّے والا محمدؐ" اور نظر آتا ہے اور "مدینے والا" اور[3]! فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْجَاهِلِيْنَ!

۲۔ اُمّت کا فرضِ منصبی اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ہو چکی یا وہ ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

وقتِ فرصت ہی کہاں کام ابھی باقی ہے — نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

تو کیا اُمت صرف عید میلاد النبی منا کر، یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے لیکن ؎

---

[1] جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ :

"ONE OF GREATEST SONS OF ADAM"

[2] جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا :

"MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET

BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN!"

[3] جو ابہام پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک MOHAMMAD

"MOHAMMAD AT MEDINA" اور دوسری AT MECCA

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاہم ؎

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک   اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

کے مصداق گذارش ہے کہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ختمِ نبوّت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قبل انبیاء و رُسل کیا کرتے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمت کے ذمّے ہیں گویا خواہ دعوت و تبلیغ انذار و تبشیر، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ پر مشتمل فریضۂ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء و رُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے خواہ اعلاءِ کلمۃُ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلّہ پر مشتمل بعثتِ محمدیؐ کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو، جملہ اہلِ ارض اور جمیع کرّۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عاید ہوتے ہیں جو آنحضورؐ کے نام لیوا ہیں اور آپؐ کے نامِ نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپؐ کی اُمت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ چونکہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا لہٰذا آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسرے تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب چنانچہ سورۂ جمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپؐ "اُمیّین" کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور "آخرین" کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضورؐ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس میں بھی آپؐ نے فرمایا :۔

اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّ   میں یقیناً اللہ کا فرستادہ ہوں تمھاری طرف خصوصاً

اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً ط   اور پوری نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!

ان میں سے "بعثتِ اُولیٰ" کے جملہ فرائض "شہادت علی النّاس" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہ" دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفسِ نفیس اوا فرما دیئے خواہ اس میں مخالفت ہُوئی یا مزاحمت، تمسخر ہوا یا استہزاء، ذہنی کوفت کا سامنا ہُوا یا جسمانی اذیّت کا، مصیبتیں آئیں یا مشکلات، محنت کرنی پڑی یا مشقّت، پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دور آیا یا یومِ طائف اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابنِ مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ ابنِ عبدالمطلب کا اعضا بُریدہ لاشہ، خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حُنین کا اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی، آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور ؎

یا تن رسد بہ جاناں   یا جاں زتن برآید!

کے مصداق آپؐ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتیٰ کہ تئیس برس کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتہً بالا ہو گیا۔ کلمۂ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا۔ اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا تا آنکہ حجّۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکنافِ عرب سے

آئے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے مجمع سے " اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟ " کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ " نَشْھَدُ اِنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ ! " آپ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

آپ کے بعد، آپ کی بعثت عامہ کی جملہ ذمہ داریاں اُمت کے کاندھوں پر آ گئیں بفحوائے الفاظِ قرآنی : لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپ کے حقیقی جانشین تھے، خلافتِ راشدہ کے دوران جو واقعتہً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ آپ کی جانب سے تبلیغ دین و شہادت علی الناس، اقامت دین، اور اظہار دین حق علی الدین کلہ " کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دینِ حق جو پورے روئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا " غریبُ الغربا " بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ۔۔۔ اُمت پہ تری آ کے عجب وقت آ پڑا ہے

وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریبُ الغربا ہے

اور

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

الغرض آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے فرضِ منصبی کو پہچانے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عزمِ نو کے ساتھ کمربستہ ہو جائے تاکہ بعثتِ محمدی کا مقصد بتمام و کمال پورا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر دینِ محمد کا پرچم لہرا اُٹھے ؎

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ

اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ !

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہِ الصّلوٰۃ والسّلام کا اساسی منہاج

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ :-

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دُنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو داعیِ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپؐ کی تحقیر و توہین ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ "داعیِ انقلاب" کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بہ تمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران اور بھی جتنے انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلاب روس سب کے سب جُزوی تھے اور ان کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک ہی گوشے میں تبدیلی رُونما ہُوئی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاست و حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرمؐ نے جو انقلابِ عظیم دُنیا میں برپا کیا اس سے پُوری انسانی زندگی میں تبدیلی رُونما ہُوئی اور عقاید و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

مزید برآں اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پُوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی خود ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدّوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جُملہ مراحل سے گذار کر خود ہی کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ انقلابِ فرانس اُس فکر کے نتیجے میں رُونما ہُوا جو والٹیر اور روسو ایسے بیسیوں مصنّفوں کی تالیفات کے ذریعے تخلیق پایا اور پھیلا لیکن انقلاب عملاً کچھ اور ہی لوگوں کے ہاتھوں برپا ہُوا اور اس کی بالفعل رہنمائی میں ان مفکرّین کا کوئی حصّہ نہیں۔ اسی طرح انقلابِ روس کی اساس اس فکر پر قائم ہُوئی جو مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "داس کیپیٹل" کے ذریعے پیش کیا لیکن خود مارکس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان پیدا نہ ہو سکا۔ اگرچہ بعد میں ایک فعّال شخص لینن نے اس فکر کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا ـــــ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حدِ درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرمؐ کا کہ آپ نے ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس میں اور وہ بھی شمسی نہیں قمری، انقلاب اسلامی کی تکمیل فرما دی اور ایک وسیع و عریض خطّے پر دینِ حق کو اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔ فَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا فِدَاہُ اٰبَاءُنَا وَاُمَّھَاتُنَا !

ایک فردِ واحد کی مختصر سی زندگی کے بائیس سالوں میں تاریخِ انسانی کے عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب کے از ابتداء تا انتہا جملہ مراحل طے پا جانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آنحضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی تیز اور انقلابی عمل کا زور (TEMPO) اتنا شدید نظر آتا ہے کہ سیرتِ مُطہّرہ کے مطالعہ میں بالعموم نگاہیں صرف تصادم و کشمکش کے مختلف مراحل و مظاہر میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں اور جس طرح کسی زور و شور سے بہنے والی پہاڑی ندی کو دیکھتے ہوئے انسان بالعموم اس کی سطح کے ہیجان و اضطراب

ہی سے مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی گہرائی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی اسے نہیں ملتا۔ اسی طرح انقلاب نبوی کا اساسی منہاج بھی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ چنانچہ اول اول تو سیرت مطہرہ سے متعلق جو مواد جمع ہوا تھا، وہ تقریباً سارے کا سارا مغازی پر مشتمل۔ تاحال بھی سیرت مبارکہ کے مطالعے میں اصل توجہ مرتکز رہتی ہے ہجرت سے پہلے کی PASSIVE RESISTANCE پر جس کے اہم نقوش ہیں تمام مسلمانوں پر بالعموم اور غلاموں پر بالخصوص شدید بہیمانہ تشدد (PERSECUTION) ہجرت حبشہ، شعب بنی ہاشم، یوم طائف، فیصلۂ قتلِ نبوی، محاصرۂ کاشانۂ نبوت، غار ثور اور تعاقب سراقہ ابن مالک — اور ہجرت کے بعد کے اقدام اور ACTIVE RESISTANCE) پر جس کے اہم اور نمایاں نشانات ہیں قریش کی معاشی ناکہ بندی، بدر، احد اور احزاب کا مسلح تصادم جس میں عارضی سا وقفہ ہوا صلح حدیبیہ سے جس کے ختم ہوتے ہی تصادم دوگونہ ہوگیا۔ یعنی اندرون عرب بھی جس کے اہم نقوش ہیں۔ فتح خیبر، فتح مکہ اور غزوۂ حنین اور بیرون عرب بھی جس کے نمایاں نشانات ہیں غزوہ موتہ اور سفر تبوک۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اس حد درجہ سلیس لیکن نہایت پرمعنی شعر کے مصداق کہ ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے؟
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

غور کرنا چاہیئے کہ آنحضورؐ کی عظیم انقلابی جدوجہد کی تہہ میں کارفرما وہ اصل طریق کار اور اساسی منہج عمل کیا تھا جس کے ذریعے وہ مردان کار فراہم ہوئے جنھوں نے آیۂ قرآنی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(الاحزاب : ۲۳)

"اہل ایمان میں وہ جواں مرد ہیں جنھوں نے پورا کر دکھایا وہ عہد جو انھوں نے اللہ سے کیا تھا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کرکے مرحوم ہو چکے اور وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں کہ کب باری آئے اور وہ بھی اللہ کی راہ میں سر کٹا کر سبکدوش ہو جائیں۔ بہرصورت انہوں نے اپنے موقف سے سر مو تبدیلی نہیں کی۔"

— کے مصداق انقلابِ نبویؐ کے شجرۂ طیبہ کو اپنے خون سے سینچا اور اپنی ہڈیوں اور گوشت پوست کی کھاد سے پروان چڑھایا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

قرآن حکیم کی چار اہم اصطلاحات

اس مسئلے کے حل کیلئے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دُہرایا کہ :-

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ط
(سُورۂ توبہ، سورۂ فتح، سورۂ صف)

یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسُول کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُس کو پُورے کے پُورے دین پر!

تو انقلابِ نبوی کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے بھی چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پُورے چار بار دہرایا۔ یعنی :

۱۔ تلاوت آیات ۲۔ تزکیۂ نفس ۳۔ تعلیم کتاب اور ۴۔ تعلیم حکمت

۱۔ چنانچہ سب سے پہلے سورۂ بقرہ کے پندرھویں رکوع کے آخر میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی دُعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ط وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○
(البقرہ : ۱۲۷، ۱۲۸)

اے رب ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت برپا کیجو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے طور طریقے۔ اور قبول فرما ہماری توبہ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب ہمارے تو مبعوث فرما تو ان میں ۔ ان ہی میں سے ایک رسُول جو اُن کو سُنائے تیری آیتیں اور انھیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی ۔ اور تزکیہ کرے اُن کا بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا ۔

۲۔ پھر تین ہی رکوعوں کے بعد اٹھارویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضورؐ کی بعثت دراصل اسی دُعائے ابراہیم و اسمٰعیل عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْهِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا ظہور ہے ، ان ہی اصطلاحاتِ اربعہ کو دُہرایا گیا :

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○
(البقرہ : ۱۵۱)

چنانچہ بھیج دیا ہے ہم نے تم میں ایک رسُول تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمھیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمھارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمھیں ان چیزوں کی جنھیں تم نہیں جانتے تھے۔

۳۔ اگلی سورت یعنی سورۂ آلِ عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے :۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ

اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ اٹھایا ان میں ایک رسُول ان ہی میں کا جو سُناتا ہے اُنھیں اس کی

اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ۚ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ○ (آل عمران: ۱۶۴)

آیات اور تزکیہ کرتاہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انھیں کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں

۴۔ آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۂ جمعہ میں آتا ہے :

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ○ (الجمعۃ : ۲)

وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا اُمیوں میں ایک رسُول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انھیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!

اور یہاں اس کی اہمیت اِس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۂ جُمعہ سے متصلاً قبل ہے۔ سورۂ صف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ اَعنی :

" هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ط"

گویا آنحضورؐ کا مقصدِ بعثت ہے : "اظہارِ دینِ حق علی الدین کُلّہٖ" اور اس کے لیئے آپ کا طریقِ کار اور منہجِ عمل ہے : تلاوت آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت !

مقصد اور طریق کار

اس مقام پر ذرا توقف کر کے ایک اہم حقیقت پر غور کر لینا چاہئیے اور وہ یہ کہ کسی بھی اہم کام کے لیے مقصد اور طریق کار دونوں نہایت اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں آخری منزل پیشِ نظر رہتی ہے اور طریق کار میں ہر ہر مرحلے کے لوازم پر توجہ دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کا توازن ہی کسی کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن بن سکتا ہے اور جو شخص یا گروہ بیک وقت ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ وہ اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور خود ہمارے گرد و پیش بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت یا جماعت اپنے پیشِ نظر مقصود کے حصُول کی عجلت میں درمیانی مراحل کو پھلانگ جانا چاہتی ہے اور کسی راہِ تقصیر (SHORT CUT) کی دلدل میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اُس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا اور وہ راہِ تقصیر اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ گویا وہ کمبل کو چھوڑنا چاہے بھی تو کمبل اُسے نہیں چھوڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے اپنے متوسلین کی ہمت یہ کہہ کر بندھائی جاتی رہے کہ : ع

" اس موڑ سے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو بڑھتا جا !"

اور کبھی برعکس اس کے یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ذریعے ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے اور راستے ہی کو منزل قرار دے لیتا ہے نتیجۃً ساری توانائیاں ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اہلِ قافلہ وَ هُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ط کے مصداق صرف حرکت اور اس کی تیز رفتاری ہی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

اب اگر اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب طریق ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کارموزوں نہیں ہوتا تو جو لوگ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے خواہش مند ہوں اُن کے لیے لازمی و لابدی ہے کہ وہ غور کریں کہ آنحضورؐ کا اصل منہج عمل کیا تھا۔ مبادا وہ بھی مذکرہ بالا افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

اس ضمن میں کتنی اچھی ہے وہ بات جو امام مالکؒ نے فرمائی کہ :

لَا یُصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ؛ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی کایا پلٹ ہوئی تھی۔"

اور کتنی حیرتناک ہے یہ حقیقت کہ دورِ نبویؐ سے اس قدر قرب کے باوصف ائمہ دین کو کتنی فکر تھی اس آخری دور کی جس میں ہم جی رہے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ قرآن حکیم انقلابِ اسلامی کے لیے کسی منہج عمل کی جانب رہنمائی نہیں کرتا تو اسے محسوس کرنا چاہیئے کہ یہ قرآن مجید پر بھی ایک سنگین طعن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی حد درجہ ناروا سوءِ ظن۔ اس لیے کہ مسلمانوں پر "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے قیام کی سعی کو مستقلاً فرض اور واجب کر دینا لیکن اس کے لیے کسی واضح طریق کار کی نشاندہی نہ کرنا صریح ظلم قرار پائے گا۔ فَسُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ! —

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو بفحوائے الفاظِ قرآنی : وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ "۔ اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت کو پہچانا، نہ بفحوائے الفاظِ مبارکہ : " اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا [1] " قرآن حکیم ہی پر غور کیا بلکہ اسے : نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ " کے مصداق پس پشت ڈال دیا اور صرف حصولِ برکت و ایصالِ ثواب کا آلہ بنا کر رکھ دیا ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

مرکز و محور - قرآن حکیم

اب ذرا ان چار اصطلاحات پر توجہ مرکوز فرمائیے جن میں نبی اکرمؐ کے اساسی منہج عمل کا بیان ہوا ہے تو سب سے نمایاں حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کا مرکز و محور خود قرآن حکیم ہے! اس لیے کہ ان میں سے پہلی اور تیسری یعنی تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب تو بالبداہت قرآن مجید ہی سے متعلق ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور چوتھی کا مدار بھی قرآن ہی پر ہے اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی : قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ [2] " (لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراضِ قلبی کی شفا بھی) تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تخلیۂ باطن درحقیقت ثمرہ ہے تلاوتِ آیاتِ قرآنی اور بفحوائے الفاظِ قرآنی : " ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ [3] " (یہ ہے وہ حکمت جو تیرے رب نے تجھ پر وحی فرمائی)

---

[1] یونس : ۵۷ [2] بنی اسرائیل : ۳۹

حکمت بھی جزو لاینفک ہے قرآن حکیم کا! گویا انقلابِ نبویؐ کا اساسی منبع عمل پورے کا پورا گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد، یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ

آنحضورؐ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم!

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں تو بیان کیا مولانا حالی نے کہ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور حد درجہ پُر شکوہ الفاظ میں بیان فرمایا علامہ اقبال نے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست اُو زندہ و پائندہ و گویا ست اُو
چُوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چُوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

گویا آنحضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ یہ تھا کہ قرآن حکیم "چوں بجاں در رفت" کے مصداق صحابہ کرامؓ کے باطن میں سرایت کر گیا اور اُن کے اذہان و قلوب اُس کے نور سے منور ہو گئے نتیجتہً اُن کی زندگیوں میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ اُن کی سوچ بدل گئی اُن کا فکر بدل گیا، اُن کے عقاید بدل گئے، اُن کی اقدار بدل گئیں، اُن کے عزائم بدل گئے، اُن کے مقاصد بدل گئے، اُن کی آرزوئیں بدل گئیں اُن کی تمنائیں بدل گئیں، اُن کے دن بدل گئے، ان کی راتیں بدل گئیں، ان کی صبحیں بدل گئیں، ان کی شامیں بدل گئیں، اُن کی زمین بدل گئی، اُن کا آسمان بدل گیا، یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی! اور یہ ساری تبدیلی ثمرہ تھی ایک کتاب اور اس کے علم و حکمت اور اُس کے معلّم اور اس کی تعلیم و تربیت کا ——— فصلی اللہ علیہ وسلم! اسی لیے فرمایا آنحضورؐ نے کہ "انما بعثت معلمًا" (میں تو صرف معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں[1])۔ واضح رہنا چاہیے کہ آنحضورؐ کا اصل ایجابی اور مثبت عمل صرف اور صرف تلاوتِ آیات و تزکیہ اور تعلیمِ کتاب و حکمت تھا۔ تصادم اور کشمکش کی وہ ساری صورتیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اصلاً مظہر ہیں اُس ردِ عمل کا جو ایک غلط نظامِ فکر و عمل کی جانب سے دعوتِ حق کے جواب میں پیش آنا لازمی و ابدی ہے۔ تاہم اصل عمل اور ردِ عمل کے تدارک کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کے مابین فرق و امتیاز نہ کرنا بڑی ناسمجھی ہے!

کتابِ الٰہی اور اُس کے معلّم کی ذاتِ اقدس کی عظمت تو ظاہر ہے کہ بیان تو کجا تخیل و ادراک کی گرفت میں بھی نہیں آسکتی موجودہ دور میں تو ایک عام انسان کی تصنیف کا یہ اعجاز نگاہوں کے سامنے ہے کہ روئے زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر جو نظام قائم ہے وہ سب اُس کے ظہور و بروز کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً اسی لیے کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے مارکس کے بارے میں کہ ع "نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!"

[1] سنن ابنِ ماجہ رح

تلاوتِ آیات

اس اجمال کی تفصیل قرآن حکیم کے طول و عرض میں تانے بانے کے مانند بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کارِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور فرائضِ دعوت و تبلیغ کے جتنے پہلو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن سب کا مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور خود قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں طوالت کے خوف کے باوجود چند اشارات ضروری ہیں :-

۱۔ قرآن حکیم کی رُو سے انبیاء و رُسل کے فرائض میں سب سے زیادہ اساسی فریضہ انذار و تبشیر کا ہے۔ چنانچہ سورۃ نساء میں بہت سے انبیاء و رُسل کا ذکر کرکے فرمایا گیا :

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (النساء : ۱۶۵)

(یہ حضرات) رسول بنا کر بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے تاکہ ان (کی بعثت) کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے سامنے کوئی دلیل (عذر) نہ رہ سکے!

سورۃ کہف میں بطورِ کلیہ ارشاد فرمایا :-

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۝ (آیت : ۵۶)

اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر صرف مُبشّر اور نذیر بنا کر!

اور سورۃ بنی اسرائیل میں تعیّن کے ساتھ آنحضورؐ کو خطاب کرکے فرمایا :

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ (آیت : ۱۰۵)

اور نہیں بھیجا (اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ کو مگر صرف مُبشّر اور نذیر بنا کر۔

اب دیکھئے کہ از روئے قرآن اس انذار و تبشیر کا مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہی ہے :

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا :

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ۝ وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (بنی اسرائیل ۹-۱۰)

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے!

سورۃ کہف کا آغاز ان مبارک الفاظ سے ہوا :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا (کہف ۱-۲)

شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری اور اس میں اُس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار، تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے

والوں کو جو نیک اعمال کر رہے ہیں، اس بات کی خوشخبری سُنا دے کہ اُن کے لیے بہت اچھا اجر ہے۔"

اور سورۂ مریم کے اختتام پر فرمایا:

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (۹۷ - مریم)

پس ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لیے سہل و ساز گار بنایا کہ تم اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو۔

سورۂ انعام میں فرمایا:

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۝ (آیت: ۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعے سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔

۲۔ فرائض نبوت کے ضمن میں قرآن حکیم کی دوسری اہم اصطلاح "تذکیر" ہے۔ اس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ قرآن خود اپنے آپ کو جا بجا الذِّکر، ذِکریٰ اور تذکرۃ قرار دیتا ہے۔

سورۂ قٓ کے آخر میں یہ صریح حکم بھی دے دیا گیا کہ:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝

یعنی تذکیر کرو بذریعہ قرآن حکیم

۳۔ اسی طرح فرائض رسالت کے ذیل میں قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح "تبلیغ" ہے چنانچہ اس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے تو اپنے نبی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ط"[1] (پہنچا دو جو کچھ نازل کیا گیا تم پر تمہارے رب کی جانب سے) اور آنحضورؐ نے اُمت کو حکم دیا کہ "بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً ط" (پہنچا دو میری جانب سے خواہ قرآن کی ایک ہی آیت ہو!) گویا تبلیغ کا اصل موضوع قرآن مجید اور اُس کی آیاتِ بیّنات کے سوا اور کچھ نہیں!

۴۔ غالباً اس سلسلے کی سب سے جامع اصطلاح "دعوت" ہے جس کے ضمن میں سورۂ نحل میں یہ جامع و مانع ہدایت دی گئی کہ:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط (آیت: ۱۲۵)

بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ سے اور بحث و جدال کرو اس طور سے جو نہایت عمدہ ہو۔

اب غور فرمائیے کہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے حکمت بھی قرآن حکیم ہی کا ایک جزوِ لاینفک ہے اور موعظۂ حسنہ کا مصداقِ کامل بھی خود قرآن مجید ہی ہے اور خواہ ملحدین ہوں یا مشرکین، یہود ہوں یا نصاریٰ، منکرین قیامت ہوں یا مکذّبین رسالت، کافر ہوں یا منافق ان سب کے ساتھ مفصل مباحثہ و مجادلہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ گویا دعوت الی اللہ یا دعوتِ الیٰ سبیل ربّ کا اصل مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہے۔

گویا یہ تفصیل و تشریح ہوئی "تلاوتِ آیات" کی کہ انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر اور مباحثہ ہو یا مجادلہ

---

[1] سورہ مائدہ - آیت ۶۷

دعوتِ نبوی کا مرکز و محور رہیں آیاتِ قرآنی ۔

تزکیہ

اب آئیے عملِ تزکیہ کی جانب جس کے ضمن میں افسوس ہے کہ قرآن کی ناقدری کا معاملہ اُمتِ مسلمہ نے آخری حد تک پہنچا دیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت مجموعہ ہے فکر و عمل کا اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بایں معنی کہ "گندم از گندم بروید، جو زجو" کے مصداق غلط فکر، غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لیے تصحیحِ فکر لازمی و لابدی ہے گویا اگر کسی انسان کے فکر کی تطہیر ہو جائے اور فاسد خیالات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے تو غیر صالح اعمال اور ناقص عادات و اطوار آپ سے آپ پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے اور اگر صحیح فکر کی جڑیں ذہنِ انسانی میں راسخ ہو جائیں تو اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے ـــ اسی عمل (PHENOMENON) کو قرآن حکیم "يُكَفِّرْ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ" بھی قرار دیتا ہے اور "يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ" بھی۔ اور یہی قرآن حکیم کا اصل فلسفۂ تزکیہ ہے یعنی یہ کہ تزکیۂ نفس کیلئے اضافی اور مصنوعی تدابیر نہ ضروری ہیں نہ مفیدِ مطلب۔ بلکہ تزکیۂ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیرِ فکر کا اور وہ فطری ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ ابراہیم و اسمٰعیل علیٰ نبیّنا وعلیہما الصلوٰۃ والسّلام نے تو اصطلاحاتِ اربعہ میں تزکیہ کا ذکر آخر میں کیا تھا لیکن قرآن مجید میں بقیہ تینوں مقامات پر اس کا ذکر تلاوتِ آیات کے فوراً و معاً بعد ہوا ہے۔

تزکیۂ نفس کے ضمن میں ایک دوسری حقیقت بلاشبہ یہ بھی ہے کہ انسانی شخصیت میں فکر اور عمل کے مابین ایک اور عنصر جذبات کا بھی ہے اور ویسے تو ان کی اہمیت ہر انسان کی زندگی میں مسلّم ہے لیکن خصوصاً وہ لوگ جن کا شعور پختہ نہیں ہوتا یا جو عقلاً بالغ نہیں ہوتے اُن کی زندگیوں میں تو فیصلہ کُن اہمیت ان ہی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن **دعوت** کی اساس صرف **حکمت** ہی پر نہیں رکھتا **موعظت** پر بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو **موعظۂ حسنہ** بھی قرار دیتا ہے اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی!۔

اس پس منظر میں دیکھئے کہ کس قدر افسوس ناک ہے وہ صورتِ حال جس کا نقشہ علّامہ اقبال نے ان اشعار میں کھینچا ہے کہ :-

صُوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست از شرابِ نغمۂ قوّال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش در نمی سازد بقرآں محفلش

حالانکہ اگر جذبات کی جِلا اور سوز و گداز و کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اُن کا بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن مجید ہی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے اپنے حواشیٔ ترجمۂ قرآن میں اپنے والدِ مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُر تاثیر اشعار نقل کئے ہیں :-

سُنتے سُنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سُنو ایں تمھیں وہ نغمۂ مشروع بھی کہ جس سے خاشعاً متصدّعاً ہونے کو ہے

اس ضمن میں ذرا غور فرمائیے اور داد دیجئے اس پر کہ نفسِ امّارہ کی طوفاں خیزیوں، اور ابلیس لعین کی وسوسہ اندازیوں سے بچنے کے لیے کس قدر صحیح مشورہ دیا ہے علّامہ اقبال مرحوم نے کہ :

کُشتنِ ابلیس کارے مُشکل است زانکہ اُو گُم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مُسلمانش کُنی کُشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی

تعلیمِ کتاب

آنحضورؐ کے طریقِ انقلاب میں تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد نمبر آتا ہے "تعلیمِ کتاب" کا جو اصلاً عبارت ہے شریعتِ اسلامی کے اوامر و نواہی کی تعلیم اور احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ سے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں لفظ کتاب کا اطلاق بالعموم شریعت کے قواعد و ضوابط پر ہوا ہے جیسے "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" ط ہیں، یا "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَہٗ" ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں کسی شے کی فرضیت و منشروعیت کے بھی "کُتِبَ" کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے: "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" — "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ" — "کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا ﹰنِ الْوَصِیَّۃُ" — "رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ" — وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ"

واضح رہنا چاہیئے کہ تلاوتِ آیات اور تزکیے کے مراحل طے ہو جانے کے بعد ہی انسانی شخصیت کی زمین پورے طور پر تیار ہوتی ہے کہ اس میں شریعت کے اوامر و نواہی اور احکامِ الٰہی کے بیج بوئے جائیں اور وہ برّ و تقویٰ کی ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی کی صورت اختیار کرلے۔ بصورتِ دیگر فصل کا حصول درکنار، بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن مجید کا "کتاب" والا حصہ یعنی اس کی وہ آیات و سُور جن میں حلال و حرام کے تفصیلی احکام بیان ہوتے ہیں۔ اس وقت نازل ہوا جب پُورے پندرہ سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں جس میں تمام تر توجہات تلاوتِ آیات اور تزکیئے پر مرتکز رہی تھیں، ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جو ان احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب تھا! اس کی سب سے نمایاں اور درخشاں مثال حرمتِ شراب کے معاملے میں ملتی ہے کہ اُدھر حکم نازل ہوا ادھر شراب کے برتن توڑ ڈالے گئے اور پھر ان لوگوں نے کبھی شراب کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جن کی گھُٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور پوری پُوری عمریں پینے اور پلانے میں گذری تھیں اور اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوا اس دَور میں امریکہ ایسے تعلیم یافتہ اور مہذب و متمدن ملک میں جہاں ——— PROHIBITION ACT کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں اور ع

"چھُٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہُوئی"

کے آگے تمام سائنسی حقائق اور اعداد و شمار دھرے کے دھرے رہ گئے!

تعلیمِ حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے "تعلیمِ حکمت" ——— حکمت اصلاً عبارت ہے انسانی عقل اور شعور کی پختگی کی اُس سطح سے جہاں پہنچ کر احکامِ شریعت کے اسرار و رموز واضح ہو جاتے ہیں اور اُن کی حکیمانہ غرض و غایت منکشف ہو جاتی ہے۔ گویا احکام بے جان اور زبردستی کے ساتھ ٹھونسے ہوتے اوامر و نواہی نہیں رہتے بلکہ فکر و عمل کے ایک حد درجہ حکیمانہ نظام کے ایسے باہم دگر منظم و مربوط اجزا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن میں نہایت حسین توازن و توافق موجود ہو۔ یاد ہوگا، یہی اصل موضوع ہے۔ خاتم دَورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا اور یہی ہے وہ جنسِ کمیاب جسے قرآن حکیم "خیرِ کثیر" قرار دیتا ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ

فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط سورۂ بقرہ - آیت ۲۶۹)

(اور یہ بات بھی محض اتفاقی نہیں کہ "خیر کثیر" بھی نام ہے حضرت شاہ صاحب کی ایک صدر درجہ پُر از حکمت تصنیف کا!) گویا حکمت کی تحصیل ہر انسان کے بس کا روگ نہیں، بلکہ یہ تعلیم و تربیتِ نبوی کا وہ "درجۂ تخصص" ہے جس سے فیض یاب صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کے نفوس میں علم کی ایک پیاس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے لیے ظواہر پر اکتفا ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ حقائقِ باطنی کی تحقیق و تفتیش پر اسی طرح مجبور و مضطر ہو جاتے ہیں جس طرح بھوکا تحصیلِ غذا پر اور پیاسا تلاشِ ماء پر ——— وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ!! اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں!

اس ضمن میں بھی اس خیال سے کہ حکمت سے لازماً قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مراد ہے قرآن حکیم کے ساتھ ایک نادانستہ اور غیر شعوری سوءِ ظن کا امکان پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ حکمت تو قرآن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے' اس لیے بھی کہ اس کی ایک مستقل صفت ہی "حکیم" ہے اور اس لیے بھی کہ اُس کی شان یہ ہے کہ:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ (سورہ ہود - آیت ۱)

مزید برآں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں صراحتہً بھی مذکور ہے کہ:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط

اور اس سلسلے میں بھی حظ اُٹھایئے اور وجد میں آیئے علامہ اقبال کے ان اشعار پر: ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم! تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کُن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کُن

افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ علم و فضل نے بہت کم توجہ دی قرآن حکیم کی ان اصطلاحاتِ اربعہ پر جو قرآن مجید میں ایک نہ دو، پورے چار مرتبہ دہرائی گئیں، حالانکہ بلا سبب تکرار بظاہر کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور نہ قرآنِ عظیم کے مصنف و مؤلف تبارک و تعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی تھی نہ عربی زبان کا دامن ہی اتنا تنگ تھا کہ ہر بار مختلف الفاظ نہ لائے جا سکتے۔ اس اعادہ و تکرار کا سبب ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اگرچہ ویسے تو قرآن مجید کا ہر ہر لفظ غالب کے اس شعر کا مصداقِ کامل و اتم ہے کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لیکن اِن اصطلاحاتِ اربعہ کی حیثیت تو بالخصوص ایسی ہے کہ ان پر توجہات کو بالکل ع "زیرِ ہر ہر لفظ غالب چیدہ ام میخانۂ!" کے مصداق مرتکز کر دیا جائے' اور اس کی ایک سعیٔ بلیغ میری محدود معلومات کی حد تک' کم از کم دورِ حاضر اور ماضیٔ قریب میں صرف مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی ایک تالیف "مبادیٔ تدبرِ قرآن" میں کی ہے۔

الغرض! انقلابِ نبویؐ کے تکمیلی مراحل تو وہی ہیں جو ہر انقلاب میں پائے جانے لازمی ہیں یعنی دعوت و تنظیم، تصادم و کشمکش، ہجرت و انقطاع اور جہاد و قتال ——— لیکن اس کا اساسی منہاج مشتمل ہے تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت پر، جس کا مرکز و محور ہے قرآن حکیم!

انفرادی تبدیلی

اگر آپ کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی یہ "انقلاب" لانا چاہیں تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے آپ اس کے فکر کا جائزہ لیں اور تلاوتِ آیات کے ذریعے اس کے ذہن کو فاسد خیالات اور غلط نظریات سے اور اس کے قلب کو فاسد ارادوں اور غلط اُمنگوں اور خواہشات سے پاک کریں۔ اُس کے فکر کی ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی محکم اساسات پر از سرِ نو تعمیر کریں اور اس کے قلب کو نورِ ایمان سے منور کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر صالح اعمال اور غلط عادات و اطوار بت جھڑ کے پتوں کی طرح خود بخود جھڑ جائیں گے اور تب موزوں وقت آئے گا اس کا کہ شریعت کے اوامر و نواہی کی تلقین اسے کی جائے۔ گویا اس کے وجود پر شریعت کا نفاذ عمل میں آ جائے۔ پھر اگر وہ صاحبِ استعداد ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر حکمت کی تحصیل کرے جس سے اصل انشراحِ صدر اور اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائے گا — اور اُس کی شخصیت میں اس انقلاب کو تمکن و استقلال بھی حاصل ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ہے وہ محنت و مشقت جس کا ثمرہ بیان ہوا آنحضورؐ کے اُس حکیمانہ قول میں جو آپ نے حضرت علیؓ سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ "لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ" (اے علیؓ اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے) اور اگر آپ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ کی حالت وہی ہوتی جو ہمارے معاشرے میں ان بہت سے بڑے بوڑھوں کی ہوتی ہے جنھوں نے اپنی نوجوان نسل کو حوالے تو اُس نظامِ تعلیم کے کیا ہے جس کے بارے میں غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ؎

> یُوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
> افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی!

اور ؎

> گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
> کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نتیجتہً کسی کے ذہن پر رسّل سوار ہے اور کسی کے ساعت، کوئی فرائڈ کا شیدائی ہے اور کوئی یونگ یا ایڈلر یا میکڈوگل کا۔ کسی پر ڈارون کا جادو چلا ہُوا ہے اور کسی پر ہیگل اور مارکس کا — چنانچہ خدا و آخرت اور وحی و رسالت پر ایمان و یقین کے آثار کا کوسوں پتہ نہیں لیکن تلقین ہو رہی ہے نماز اور روزے کی اور فرمائش و فہمائش ہو رہی ہے شعائرِ دینی کے احترام کے بارے میں۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ نوجوان اگر نسبتاً شریف اور سعادت مند ہے تو نگاہیں نیچی کر لے اور آپ کی موجودگی میں احتراماً آپ کی خواہش بھی پُوری کر دے لیکن اگر ذرا بیباک اور جری ہو تو صاف کہہ دے کہ "چھوڑیئے ابّا جان! یہ سب ڈھکوسلے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

اجتماعی انقلاب

اس معاملے میں انسانی معاشرہ یا انسانی ہیئت اجتماعیہ بھی بالکل ایک فردِ واحد کے مانند BEHAVE کرتا ہے۔ ہر معاشرے میں قوم کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جسے بالعموم ذہین اقلیت

یعنی ۔ INTELLECTUAL MINORITY یا INTELLIGENTSIA یا —— BRAIN TRUST قرار دیا جاتا ہے اور جس کی حیثیت جسدِ اجتماعی میں بالکل وہی ہوتی ہے جو فردِ واحد کے جسم میں اس کے دماغ کی۔ اگر کسی معاشرے میں اسلامی انقلاب لانا مطلوب ہو تو اولاً اس کے اس طبقے کو APPEAL کرنا۔ اور اُس کے قلوب و اذہان کو نُورِ ایمانی سے منور کرنا، گویا اسے اسلام کے حق میں بالفعل CONVERT کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے یا قوم کے دوسرے طبقات کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے جو قلب و ذہن کے بے دام غلام ہوتے ہیں اور ان سے صادر ہونے والے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرتے ہیں جو لوگ کسی معاشرے یا قوم کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کیے بغیر خواہش مند ہوں کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی اسلام کو عملاً قبول کر لے، اُن کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ اور نیک خواہشات اور تمنائیں اپنے مقام پر، لیکن امرِ واقعہ کے اعتبار سے اُن کی حالت بھی ان نیک مگر سادہ دل لوگوں سے کسی طرح مختلف نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کتاب اللہ ــــ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ

تمنا عمادی

انسان کی پیدائش پر غور کیجیے۔ اس کی تقویم اور پھر تخلیق پر غور کیجیے۔ صُلب پدر سے بطنِ مادر میں جلوس کرنے سے قبل اس کے عناصر بکھرے پڑے تھے۔ انسان نے اس دنیا میں آکر ہوا، پانی، پھل، پھول، اناج سے تمتع کیا اور وہ اس کے جزوِ بدن بنے، جو تخلیق دگر کے لیے کام میں آئے۔ فطرتاً ہر مخلوق کے وظائف و فرائض معیّن کر دیے گئے ہیں ان میں ایک تو وہ ہیں جو اسے اس منزل میں کام آتے ہیں، جس میں وہ ہے۔ دُوسرے اُس وقت کے لیے ہیں جب وہ اگلی منزل میں قدم رکھے گا۔ انسان کو قرآن نے یاد دلایا ہے کہ کیا تم نے اپنی پہلی اُٹھان (نشأۃ الاولیٰ) کو نہیں سمجھ لیا ہے۔ پھر اس سے درسِ نصیحت کیوں حاصل نہیں کرتے؟ مقصود یہ بتانا ہے کہ کارخانہ قدرت میں ہر مخلوق کے وظائف و فرائض ہیں اور انسان بھی ان منازل سے گزرا ہے۔ پہلی منزل بطنِ مادر میں اسے وہ تمام چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں، جس کی اسے وہاں ضرورت ہوسکتی ہے۔ جب یہ منزل گزر گئی اور وہ پیدا ہوگیا تو یہ تمام چیزیں پیدائش کے فوراً بعد اس سے لے لی گئیں۔ مگر اس دنیا میں آنے کے بعد اس کے لیے جو چیزیں ضروری ہوسکتی ہیں، وہ سب وہیں دے دی گئی تھیں۔ آنکھ، ناک، کان، منہ، اعضاء و جوارح مگر عقل و شعور ابھی بالکل خام حالت میں ہیں۔ اس نکتہ پر تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس دنیا میں آنے سے پہلے تک خواہش و ارادہ و حرکت کی صلاحیت بچے میں نہیں آتی۔ مگر کہا جا سکتا ہے، ولادت سے کچھ پہلے بطنِ مادر ہی میں یہ تینوں باتیں بچے میں فی الجملہ آجاتی ہیں۔ بچہ پیٹ میں حرکت کرتا ہے اور پیدا ہونے کے وقت خود بچے کا ارادہ بھی بڑی حد تک کام کرتا ہے اور ارادہ بغیر خواہش کے نہیں ہوتا۔ بہر حال اس کو یوں سمجھیے کہ جس طرح بچے کو رُوئے زمین پر کام آنے والے سامان، آنکھیں، کان، ناک، منہ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ بطنِ مادر ہی میں ملے، اسی طرح پیدائش کا زمانہ قریب آگیا تو اصل کام آنے والی صفتیں یعنی خواہش، ارادہ اور حرکت بھی اس کو وہیں دے دی گئیں تاکہ وہ دنیا میں انھیں صفتوں کے ذریعہ اپنے اعضاء سے کام لے سکے اور یہی صفتیں بچے میں ذمہ داری پیدا کرنے والی ہیں اور اب اس دنیا میں اس کو ذمہ دار ہی زندگی بسر کرنا ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کو غذا خود بخود مل رہی تھی، فطرت پہنچا رہی تھی مگر پیدائش کے بعد صرف فطرت کی مدد کافی نہیں رہی۔ بچہ جب تک اپنی خواہش، اپنے ارادے اور اپنی حرکت سے کام نہ لے، اس کو غذا نہیں مل سکتی۔ ماں اسی قدر کرسکتی ہے کہ بچے کو اپنا دُودھ پلا دے۔ بچہ جب تک اپنی خواہش، اپنے ارادے، اپنے لبوں کی اور اپنے کام و زبان کی ایک خاص حرکت سے کام نہ لے، جس کو چُوسنا کہتے ہیں، اس وقت تک اس کے معدے میں غذا نہیں پہنچ سکتی۔

جیسے جیسے بچہ سیانا ہوتا جاتا ہے اس کی ذمہ داری بھی بڑھتی جاتی ہے اور ماں باپ اور گھر کے دُوسرے لوگوں سے وُہ مستغنی اور خود کفیل ہوتا جاتا ہے اور اپنی ضرورتیں خود پُوری کرنے کا ڈھنگ سیکھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ بالغ اور جوان ہو کر ایک مکمل حیوان ہو جاتا ہے، مگر صاحبِ عقل حیوان۔ حیوانی زندگی اسی قدر ہے کہ کھاؤ، پیو، اپنی خواہشیں پُوری کرو، اپنے جوڑے کے ساتھ، اپنے بال بچّوں کے ساتھ اور کسی حد تک اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو، دوستوں سے اپنی غرض کے ماتحت دوستی رکھو، غیروں سے مغایرت برتو، دشمنوں کے ساتھ قوت ہو تو کسی قسم کی کوئی رعایت نہ کرو۔ اپنی غرض، اپنا مفاد اگر صلح میں ہو تو غیروں سے بلکہ دشمنوں سے بھی صلح کر لو۔ وہ غرض و مفاد باقی نہ رہے تو صلح کو بالائے طاق رکھ کر جنگ چھیڑ دو۔ آپ پالتو حیوانوں کو نہ دیکھیں، ان کی اپنی فطرت آپ کے طریقِ پرورش اور آپ کے ساتھ رہنے سہنے کے باعث بہت حد تک بدل چکی ہے۔ جنگلوں میں جس طرح ہر حیوان اپنی جنس کے ساتھ آزاد زندگی بسر کرتا ہے، اس کو دیکھیں کہ وہ حقوقِ نفس، حقوقِ اہل و عیال اور حقوقِ ہم جنس کی کس طرح نگہداشت کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ عقل سے محروم ہیں۔ انسان بھی ایک حیوان ہی ہے مگر اس کو عقل دی گئی ہے اور عقل کی بدولت ساری کائنات پر اس کو تسلّط قایم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہٗ ظاھرۃ و باطنۃ ؕ

[کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے ان سب چیزوں کو جو بلندیوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی بہت سی ظاہری و باطنی نعمتیں انڈیل دی ہیں]

اور یہ تسخیر صرف عقل ہی کی بدولت ہے۔ عقل ہی میں اللہ نے قوّتِ تسخیر بخشی ہے۔ انسان اپنی عقل کی قوّت سے بڑی سے بڑی چیزوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، اُونٹ، بڑے بڑے اژدہے، زہریلے سے زہریلے سانپ، اور بڑے بڑے شیروں کو غلام بنائے رکھتا ہے اور اب تو چاند اور مریخ بھی اس کی زد میں آنے والے ہیں، جس سے "تسخیرِ سماوات" کی تفسیر اور بھی واضح ہو جائے گی، مگر یہ ساری تگ و دَو حیوانی ہی ہے۔ آج سائنس کی ساری ترقیاں عقلِ حیوانی کے کارنامے ہی ہیں یعنی انسان کی عقل اپنی حیوانیت میں، درندگی میں، خُونریزی میں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسروں پر زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے میں زیادہ سے زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ انسانی فرائض کیا ہیں! اس کو کوئی جانتا بھی نہیں اور نہ بطورِ خود جان سکتا ہے۔

دنیا کی ساری چیزیں اللہ نے انسان کے لیے بنائیں : خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔ مگر انسانوں کو صرف دُنیاوی زندگی میں حیوانوں کی طرح منہمک رہ کر مر جانے اور مٹ جانے کے لیے بھی نہیں پیدا کیا۔ اس کے ذمّے سب سے بڑا فریضہ بندگی (عبادت) کا رکھا ہے :

ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔

[میں نے جن و انس کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت، میری بندگی کا حق ادا کریں]

یہ مسئلہ کا دوسرا پہلو ہے مگر مادی پہلو سے فروتر نہیں کیونکہ انسان صرف مادہ کا ہی ظہور ترتیب نہیں ہے بلکہ روح و نفس بھی اس کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور سہیم اولیٰ ہیں۔

عام حیوانوں کے پاس عقلِ سلیم نہیں ہے اس لیے ان کو ذمہ دار زندگی نہیں دی گئی۔ فطری بندگی یعنی اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت و قانونِ فطرت کی اطاعت پر تو ہر چیز مجبور ہے اور اس اطاعت فطری کے ماتحت ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بزبانِ حال کر رہی ہے:

و ان من شئ الا یسبح بحمدہٖ۔

[ہر چیز اللہ کی حمد و تسبیح کر رہی ہے]

وان من شئ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔

[ہر چیز اپنی عبادت اور اپنی تسبیح کو جانتی ہے (اور ادا کر رہی ہے) لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے]

غرض عام جمادات و نباتات کی طرح عام حیوانوں کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ انسانوں کے لیے آخرت کی زندگی ہے۔ انسان بطنِ مادر میں مقامی سامان سے زیادہ دُنیا میں کام آنے والے سامان فطرت کی مدد سے مہیا کرتا رہا اور وہاں سے آنکھیں، کان، ناک، منہ، زبان اور ہاتھ پاؤں اور ان کے ساتھ خواہش، ارادہ اور قوتِ حرکت، عقل ساتھ لایا۔ مگر اس مرحلہ پر تنہا فطرت کی مدد کا وقت ختم ہو گیا۔ اب ذمہ دار زندگی ملی تو پہلے مقامی ضروریات کی فراہمی کی صلاحیت پیدا کرنے اور حیوانی فرائض انجام دینے کا وقت، بلوغ سے قبل تک کا کافی وقت ملا۔ بلوغ کے بعد آنے والی منزل کے لیے فراہمی اسباب مفاد کی ذمہ داری بھی اب انسان کے سر آگئی اور آنے والی منزل آخرت کے نقصانوں سے بچنے اور منافع کے حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی خود انسان ہی پر عاید ہے۔ مقامی یعنی دنیاوی فرائض کی انجام دہی، باوجود اس کے کہ وُہ اپنی عقل اور خواہش و ارادہ سے کرتا رہا، مگر فطرتِ انسانی اس میں برابر اس کی مدد کرتی رہی۔ فطرت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ فطرت کے خلاف جہاں اس نے کوئی کام اپنی غلط خواہش اور بے جا ارادے سے کیا، ٹھوکر کھائی اور اس سے نقصان اٹھایا۔ یہ ہمارا ہر وقت کا مشاہدہ ہے۔ مگر مقامی دنیاوی نفع و ضرر کو تو وہ خود اپنے اور دوسروں کے تجربے سے سمجھتا رہا۔ دُوسروں سے پُوچھ کر، دُوسروں کو دیکھ کر جانتا اور سیکھتا بھی رہا۔ آنے والی منزل کے نفع و ضرر کے سمجھنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جو شخص مر کر اس آنے والی منزل میں پہنچتا ہے، پھر واپس نہیں آتا کہ اس سے وہاں کا کچھ حال معلوم ہو۔ نہ وہ وہاں سے اپنی یا وہاں کی کچھ خبر کسی ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اس لیے ناممکن ہے کہ کوئی انسان بطورِ خود آخرت کی آنے والی منزل کے نفع و ضرر کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کر سکے۔

اب یہ بات انسانوں کے خالق ہی کے ذمے تھی کہ جس طرح انسان کی ذمہ دار زندگی سے پہلے انسان ہی کی ذات کے اندر فی انفسھم ایک ہادی و رہنما انسانی فطرت رکھ دی تھی، جو بطنِ مادر میں اس کی رہبری اور مدد کرتی رہی۔ اسی طرح اب

جب کہ انسانی عقل آنے والی منزل آخرت کے نفع ونقصان کے سمجھنے سے عاجز ہے، تو وہی خالق ایک رہبر و ہادی، مددگار اپنی طرف سے انسانوں کو دے دے، جو منزل آخرت کے نفع ونقصان کو قطعی و یقینی طور سے انسانوں کو بتائے اور صحیح بالکل صحیح رہنمائی کرے۔

بطنِ مادر میں دنیاوی مفاد کی رہنمائی کے لیے فی انفسہم خود انھیں کی ذات میں فطرت انسانی ملی تھی۔ یہاں عالمِ آخرت کی رہنمائی کے لیے من انفسہم ان میں سے ایک فرد کو نبی و رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور ان پر وحی نازل فرمائی، وحی بھی صرف صوفیانہ مکاشفات یا اشراقین یا جوگیوں اور راہبوں کے ریاضات و مجاہدات کے وجدان کی طرح محض وہمی ہی نہیں بلکہ وہ نبی و رسول ایک فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، اپنے کانوں سے اس کی بات سُنے، ایک بار نہیں بار بار کہ خود اس کو آنکھوں دیکھے کا یقین حاصل ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور جو کچھ یہ ہم سے کہہ رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی ہے اور وہ وحی رفتہ رفتہ ایک پوری کتاب بن جاتی ہے، کتاب بھی ایسی جو قیامت تک سارے انسانوں کا دستور العمل بن سکے جو انسانوں کو دنیا میں محض حیوانی زندگی بسر کرنے سے بچا کر انسانی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بھی سکھا سکے اور عالمِ آخرت کے نفع و ضرر کو پوری طرح بتا سکے۔ دنیا میں ایسی زندگی بسر کرنے کا ایک شارع عام قایم کر دے جس پر چل کر انسان دنیا میں بھی بہتر سے بہتر طریقے سے انسانی زندگی بسر کر سکے اور پھر مرنے کے بعد آخرت میں بھی اس کو نہایت کامیاب فرخ بخش دائمی زندگی ملے۔ رسولؐ کو حکم ہوا کہ تم اسی کتاب قرآن مجید ہی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرو؛ فذکر بالقراٰن من یخاف وعید۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام پر خود عمل کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس قرآن کے مطابق تعلیم فرمائی اور ایک سیدھا قابلِ عمل طریقہ بنا دیا، راستہ قایم کر دیا، جس پر زندگی بھر خود چلتے رہے اور دن رات اپنے پیچھے پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی چلاتے رہے، یہاں تک کہ جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو وہ چلتا ہوا راستہ جس پر خود چلتے رہے اور صحابہ کو چلاتے رہے، اسی طرح چھوڑ کے تشریف لے گئے، جس پر صحابہ اور پھر اکابر تابعین و تبع تابعین صدیوں تک چلتے رہے، اس راستے کو قرآن مجید سبیل المؤمنین کہتا ہے، یعنی "ایمان والوں کا راستہ" اور اس کو حدیث میں سنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین فرمایا گیا ہے۔ سُنّۃ ہی کو فارسی میں "جادہ" اور ہندی میں "پگ ڈنڈی" کہتے ہیں۔ لوگوں کے چلتے چلتے جو قدموں کے نشانوں سے میدانوں میں راستہ بن جاتا ہے۔ غرض سبیل المومنین اور سُنّۃ نبوی ایک ہی چیز ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ۔

[(اے مسلمانو! تمھارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے]

یعنی چاہے جس طبقے کا انسان ہو، اگر وہ فقیر و مسکین ہے، تو بھی اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں فقر و

مسکینیت کا بھی ایک دَور ملے گا اور آپؐ کے اس دَور کی زندگی کے حالات سے وہ سبق لے سکتا ہے کہ فقیری و مسکینی میں کس طرح صبر و شکر اور سیر چشمی سے زندگی آپؐ نے بسر فرمائی تھی۔ اگر کوئی مزدور ہے تو آپؐ نے مزدوری بھی کی ہے۔ ایک مزدور کو کس طرح اپنے مفوضہ فرائض انجام دینا چاہئیں۔ کام سے جی چُرانا، وقت کو برباد کرنا اور مزدوری پُوری لینا ایک مسلمان مزدور کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مزدوروں سے کام لے رہے ہیں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مزدوروں کو ان کا پسینہ سُوکھنے سے پہلے ان کی مزدوری دے دو۔ یعنی ادائیگی میں دیر نہ کرو۔ ان کو جلد رخصت کر دو کہ وہ گھر جا کر آرام کر سکیں۔ اگر آپ حکمران ہیں تو آپ کو کس طرح عدل و انصاف کرنا چاہیے، رسولؐ کی زندگی سے اس کو سیکھیے۔ غور کیجیے جنگِ بدر میں فتح کے بعد ستر مشرکینِ مکہ قید ہوئے، سب کی مُشکیں کسی گئیں۔ رات بھر سب اسی طرح مشک بند رہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہُوئی تھی کہ ایک قیدی کے کراہنے کی آواز آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز سے پہچان لیا کہ وہ آپ کے چچا عباسؓ تھے۔ آپؐ نے پُوچھا کہ کیا عباس کراہ رہے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ آپؐ چُپ رہے۔ صحابہ نے اس کو محسوس کیا کہ وہ آپؐ کے چچا ہیں، اس لیے اُن کی کراہ سُن کر آپؐ کا قلب مبارک بے چین ہو گیا ہے۔ اس لیے لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ حکم دیں تو ان کی مُشکیں ڈھیلی کر دی جائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب قیدیوں کی مُشکیں ڈھیلی کر دی جائیں۔ یہ تھا نبویؐ عدل و انصاف کبھی آپؐ نے کوئی خاص رعایت کسی عزیز و قریب کے لیے روا نہیں رکھی۔ رعایت کا وقت آیا تو سب کے ساتھ بلا تخصیص و امتیاز کی۔

تعلیمِ رسولؐ

سارے انبیا و مرسلین کی ایک ہی تعلیم رہی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابتدائی دور میں، جیسے "مڈل" تک کی تعلیم تھی۔ جس طرح مڈل سکول ہر بستی میں ہوتا ہے اور ہر سکول میں کچھ طلبہ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بعض بعض سکولوں میں ماحولی خصوصیات کے ماتحت دوسرے سکولوں سے کچھ جزئی فرق بھی رہتا ہے۔ مگر ان میں اصولی اختلاف نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر قوم میں، ہر ملک میں ایک رسول بھیجا گیا اور ہر رسول اپنے حلقے میں اپنی اُمت کی تعلیم کرتے رہے۔ بیک وقت متعدد رسول بھی مبعوث ہوتے رہے، کیونکہ وہ تخلیقِ انسانی کا ابتدائی یا وسطانی دور تھا۔ جس طرح ابتدائی درجہ کے طلبہ میں شرارتیں زیادہ ہوتی ہیں اور کھیل کُود میں جی لگانے کی عمر بھی وہی ہوتی ہے۔ علم کو علم سمجھ کر نہیں حاصل کرتے بلکہ والدین اور گارجین کے دباؤ سے پڑھتے ہیں۔ اس وقت ان پر دباؤ رکھنے کے لیے طلبہ کی گوشمالیاں اور مناسب سزائیں گھر پر بھی اور سکولوں میں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح اس وقت مناسب یہی تھا کہ شریر اور سرکش قوموں پر عذاب آیا کرے تاکہ دُوسری قوموں کے لیے باعثِ عبرت ہو۔ یہ فلسفہ تادیب ہے۔

حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی حیثیت "یونیورسٹی" کی تعلیم کی سی ہے۔ انسانی ذہن اب اس قدر تیار ہو چکا ہے کہ وہ دُنیا اور دین دونوں کے مفاد کو سمجھ سکے گا۔ اب ونفس وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۝ قد افلح من زکّٰھا ۝ وقد خاب من دسّٰھا ۝ کا وقت آگیا ہے۔ یعنی اب نفس نوعِ انسانی کی تربیت مکمل ہو چکی ہے۔

اس کو بتا دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ بدکاری یعنی مالک سے سرکشی کی راہ کیا ہے اور اپنے خالق و مالک کی بازپرس سے ڈرتے ہوئے بدکاریوں سے بچنے کی راہ کیا ہے۔ تو جس نے بدکاریوں اور سرکشیوں سے بچ کر اپنے نفس کو ہوا و ہوس کی گندگیوں سے پاک کر لیا تو بس وہی کامیاب رہا (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) اور جس نے اپنے نفس کو (ہوا و ہوس کی گندگیوں سے آلودہ رکھ کر) خراب کر دیا وہ ناکام رہا۔

سورۂ حدید کے تیسرے رکوع کے آخر میں ارشاد ہے:

لقد ارسلنا بالبینٰت و انزلنا معھم الکتٰب و المیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیه بأس شدید و منافع للناس۔

[ہم نے کھلی کھلی دلیلوں کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری۔ اور (حق و باطل، عدل و ظلم کو تولنے پرکھنے کی) ترازو (یعنی عقل و ہوش کی ترازو انسانوں کو دی) اور لوہا (پیدا کیا) جس میں سخت جنگی قوتیں ہیں اور لوگوں کے لیے (طرح طرح کے) منافع ہیں]

اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ ان دلیلوں سے رسول تسلیم کیے جائیں۔ پھر ان پر کتاب اتاری تاکہ اس کتاب کے مطابق وہ لوگوں کو تعلیم دیں، زبانی بھی اور عملی بھی۔ اور ہر شخص کو حق و باطل کی تمیز دی اور عدل و انصاف اور ظلم و جور کا فرق سمجھنے کی عقل دی اور پھر ایسے ظالم و سرکش جو بات سے کسی طرح بھی نہ مانیں اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان کو ظلم و ستم اور سرکشی و بغاوت سے باز نہ رکھا جا سکے، ان کے لیے لوہا بھی پیدا کر دیا کہ اس سے آلاتِ جنگ تیار کریں اور سرکشوں کو، نافرمانوں کو ان کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جا سکے مگر بہ نیتِ اصلاح محض جذبۂ انتقام میں حربے سے کام لینے کی اجازت نہیں۔ حتیٰ تفیئ الی امر اللہ یہاں تک کہ وہ سرکش و نافرمان باغی جماعت اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے یعنی اطاعتِ حق پر آمادہ ہو جائے۔ فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ الفتنة اشد من القتل۔ چند فتنہ پردازوں کے قتل سے پورے ملک میں فتنہ و فساد کا پھیلتے رہنا زیادہ سخت بات ہے۔ اس لیے ملک کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لیے چند فتنہ پردازوں کا قتل بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔ دشمن اگر ملک پر حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت بھی ایک فریضہ ہی ہے اور مدافعت بغیر آلاتِ حرب کے ممکن نہیں۔ اسی لیے حکم ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوة و من رباط الخیل ترھبون به عدو اللہ وعدوکم و اخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم ط و ما تنفقوا من شیئ فی سبیل اللہ یوف الیکم و انتم لا تظلمون ۝

[(اے مسلمانو!) اور تم ان (دشمنوں، حملہ آوروں کے مقابلے اور مدافعت) کے لیے جو قوت بھی تم مہیا کر سکو (آلاتِ حرب کی قوت) اور اصطبل کے پلے ہوئے گھوڑوں سے

(اپنے کولیس رکھو) جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو مرعوب رکھ سکو اور ان (چھپے ہوئے دشمنوں) کے علاوہ دوسروں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو (خوب) جانتا ہے (یعنی منافقین کو) اور تم جو کچھ سامانِ مدافعت مہیا کرنے میں خرچ کرو گے، وہ پورا پورا تمھیں (اللہ کی طرف سے) ادا کر دیا جائے گا۔ تم کو (نقصان پہنچا کر تم پر) ظلم نہیں کیا جائے گا]

سامانِ ہدایت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے انسانی زندگی بسر کرنے کے لیے سب سے پہلے تو رسول مبعوث فرمایا جو زبانی و عملی تعلیم لوگوں کو دیں، پھر ان پر اپنی کتاب اتار دی تاکہ وہ اسی کتاب کے مطابق تعلیم دیں اور دوسرے لوگ رسول سے کتاب اللہ پڑھ کر کتاب اللہ کی ہدایت اور رسول اللہ کی تعلیم کے مطابق انسانی زندگی بسر کر سکیں۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے تو تمام انسانوں کے لیے ایک ہادی و رہنما اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گئے۔ اُن پر کتاب اللہ اتاری گئی تاکہ یہ ہدایت نامہ رسولؐ کی زندگی میں اور رسولؐ کی وفات کے بعد بھی قیامت تک انسانوں کے لیے دستاویزِ ہدایت رہے۔ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اس رسولؐ اور اس کتاب پر ایمان لا کر اس کتاب کی ہدایت اور اس رسولؐ کی تعلیم کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کریں اور انسانیت کے فرائض ادا کر کے آخرت کی بہتر سے بہتر زندگی حاصل کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال بعثت کے بعد سے ہجرت تک مکے میں رہ کر ایک نہایت پختہ ایمان والے مہاجرین کی معقول جماعت تیار کر دی تھی۔ قرآن مجید میں جن کی تعریف آئی ہے:

والذین اتبعوہ فی ساعۃ العُسرۃ۔

[وہ لوگ رسول اللہ کے ساتھ لگے رہے تنگی اور دشواری کے زمانے میں]

ہجرت کے بعد بھی غزوۂ خندق تک کا زمانہ دشواریوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے انصار میں بھی ایک کافی تعداد اس آیت کے مصداق ہو سکتی ہے۔ مگر مہاجرین تو اس میں بھی شریک رہے۔ اس لیے مہاجرین کا رتبہ اس اعتبار سے ضرور فضیلتِ خاص رکھتا ہے۔ جس طرح انصار نے، جو ایثار مہاجرین کے لیے کیا اور جس طرح ان کو اپنے شہر بلکہ اپنے گھروں میں رہنے سہنے کا موقع دیا، یہاں تک کہ مال بھی مواخات کے بعد آدھا آدھا تقسیم کر دیا، خصوصی فضیلت اللہ تعالیٰ نے انصاریوں ہی کے لیے رکھی تھی۔

ہجرت کے بعد انصار نے بھی مہاجرین کی طرح صحبتِ نبویؐ سے، بالمشافہ تعلیم نبویؐ سے اور پھر مہاجرین کی روش دیکھ دیکھ کر دینِ اسلام یعنی انسانیت کی پوری تعلیم حاصل کر لی اور سارے مہاجرین و انصار جو و الّذین معہٗ تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہر دینی کام میں ساتھ ساتھ رہے۔ خصوصاً وہ، جو ابتدائے بعثت سے یا اس کے کچھ بعد سے مگر ہجرت کے قبل سے آپؐ کے رفیقِ راہ رہے اور ہر دینی کام میں شریک رہے اور وہ انصار جو ہجرت سے پہلے ہی ایمان لے آئے تھے یا ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں ہی ایمان لائے، جن کو السّابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار فرمایا گیا ہے۔ جن کا یہ

درجہ ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ ان کی پیروی کرنے والے بھی ایسے تھے جنھیں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے راضی ہیں) کہا گیا۔ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا بزرگ، کیسا ہی عابد و زاہد ہو، ان "سابقون الاوّلون" مہاجرین و انصار کی پیروی کے بغیر اللہ کی رضامندی کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی اگلے مہاجرین و انصار اور پھر ان کے بعد جو لوگ ایمان لا لا کر صحابۂ رسول کی جماعت میں شامل ہونے لگے، یہ سب بغیر کسی باہمی اختلافِ عقاید و عبادات کے ایک ہی طریقے، ایک ہی راستے پر پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اسی طریقے، اسی راستے اور اسی روش کا نام صراطِ مستقیم بتایا گیا ہے، اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سُنّتی" فرمایا اور اس کو قرآن مجید نے سبیل المؤمنین کہا اور صاف اور کھل کر کہہ دیا کہ:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّه ما تولّیٰ ونصله جهنم وسآءت مصیرا ۝

[ہدایت کی راہ جس پر واضح ہو چکی، اس کے بعد بھی اگر اس نے اس رسول کی مخالفت کی اور سبیل المومنین (ان مومنین یعنی مہاجرین و انصار کی راہ) کے سوا (کسی دوسری راہ) کا اتباع کیا، تو پھر جدھر اس نے رُخ کیا ہے، ہم اس کو اُسی طرف جانے دیں گے۔ پھر (جزا و سزا کے وقت) اس کو جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت بُری جگہ ہے پہنچنے کی]

اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ و الذین معہٗ یہی تین ذریعے ہیں ہدایت کے۔ یہ تینوں ایک دُوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نہ کوئی ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ کر راہِ ہدایت پا سکتا ہے۔

کتاب اللہ ہر سچے مسلم کے گھر میں موجود ہے۔ محمد رسول اللہ کی سیرت پر چھوٹی بڑی کتابیں اکثر زبانوں میں موجود ہیں مگر جو شخص قرآن مجید سمجھ کر تلاوت کرتا رہتا ہے، وہ مورخین کی لکھی ہوئی سیرتِ نبوی سے زیادہ صحیح اور سچی سیرتِ نبوی خود قرآن مجید سے ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح والذین معہٗ یعنی صحابہ کرام خصوصاً مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت بھی تاریخ کی کتابوں میں نہ دیکھیے۔ یعنی ان کے متعلق تاریخی روایات پر بھی اتنا تکیہ نہ کیجیے کیونکہ مورخین نے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کے ماتحت بہت سی تہمتیں بعض صحابہ کرام پر لگائی ہیں۔ صحابہ کی سیرت بھی آپ قرآنِ مبین ہی میں دیکھیے۔ سورۂ حجرات کی ساتویں آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینه فی قلوبکم وکرّه الیکم الکفر والفسوق والعصیان ط اولٰئك هم الراشدون ۝

[(اے صحابہ!) لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنا دیا ہے اور اس کو تمھارے دلوں میں (نگینے کی طرح) جڑ دیا ہے اور کفر سے، بدکاری سے اور نافرمانی سے نفرت (تمھارے دلوں میں) ڈال دی ہے اور ایسے ہی لوگ راہِ راست پر ہوتے ہیں]

بتائیے جن لوگوں کی یہ شان قرآن مجید میں مذکور ہو، اللہ تعالیٰ نے جن کی پاک نفسی کی شہادت خود دی ہو ان کے اخلاق پر

کون انگشت نما ہوسکتا ہے؟ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو آپ کے آخر وقت میں ایمان لائے تھے اور پھر بعد والوں کے لیے فرمایا تھا کہ:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔

یعنی میرے صحابہ (مہاجرین و انصار) ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے تم جن کا بھی اتباع کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔

آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے ایک فرقہ نجات یافتہ ہو جائے گا اور باقی سب گمراہ ہوں گے اور جہنّم میں جائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: وہ ایک فرقہ نجات پانے والا کون ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

"ما انا علیہ و اصحابی"

[جو اس طریقے پر ہوگا جس طریقے پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں]

اور اسی طریقے کو آپؐ نے "سُنّتی" فرمایا، اور قرآن مجید میں "سبیل المؤمنین" فرمایا گیا ہے جس میں نہ کسی طرح کی فرقہ بندی تھی، نہ ان میں باہم عقاید و عبادات کا کوئی اختلاف تھا۔ سب کے سب صرف مسلم تھے، سب کا دین صرف اسلام تھا، سب کے سب قرآن مجید اور سنّتِ نبویؐ کا اتباع کر رہے تھے اور سب کے سب ایک طرح کے سبیل المومنین کے صراطِ مستقیم پر چل رہے تھے۔

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ

یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوّت و رسالت کے سوا کسی اہم دینی و انسانی شرف کو کسی خاص زمانے یا خاندان یا ملک کے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں فرمایا۔ ہر زمانے والوں کو، ہر خاندان والوں کو اور ہر شہر، ہر ملک والوں کو اس کا موقع دیا ہے کہ:

فمن شاء اتخذ الیٰ ربہٖ سبیلاً۔

[جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پہنچنے کی راہ اختیار کرلے]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی معیّت زمانی اور مکانی تو بعض کفار و منافقین کو بھی حاصل تھی، اس لیے صرف زمانی و مکانی معیّت کی تو ظاہر ہے کوئی اہمیت نہیں، اصل معیّت تو ایمانی معیت ہے، جس کو آج ہم آپ اور ہر شخص حاصل کرسکتا ہے۔ صحابہؓ کو یہ شرف ضرور حاصل تھا کہ وہ ایمانی معیت کے ساتھ زمانی و مکانی معیت بھی رکھتے تھے مگر اصل سونا تو ایمانی معیت ہے، زمانی و مکانی معیت سُہاگا بن گیا۔ مگر ہم لوگ سہاگا حاصل نہیں کرسکتے، لیکن سونا تو حاصل کرسکتے ہیں، ما انا علیہ و اصحابی والے سبیل المومنین کا اتباع کرکے۔ مگر فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ سبیل المومنین کا اتباع ناممکن ہے۔ ہر مسلم کا نصب العین صرف اتباعِ رسولؐ ہونا چاہیے۔ سبیل المومنین کا اتباع ایک واحد ذریعہ ہے اتباعِ رسولؐ کا۔ جس طرح اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا

واحد ذریعہ ہے اطاعتِ رسولؐ۔ ہم اطاعتِ رسولؐ کرکے ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اتباعِ صحابہ کرکے ہی اتباعِ رسولؐ کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی خاص شخص سے یا کسی خاص خاندان یا کسی خاص طبقے کے ساتھ دینی وابستگی پیدا کرکے اسی کا ہو رہنا اور دینی معیار کسی طبقے کو اپنے لیے بنا لینا فرقہ پرستی کی جڑ ہے اور اس سے انسان سبیل المومنین سے دُور جا پڑتا ہے اور پھر اسلام جو در اصل کل انسانیت کی تعلیم کے لیے آیا مگر افسوس اس منشائے الٰہی، اس نصب العینِ اسلام سے ہم ہی زیادہ دُور چلے گئے۔

فرائض انسانی

خالقِ کائنات نے انسانوں کو عقل دے کر پیدا کیا اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بخشی تو ان کے ذمے کچھ تو اپنے حقوق رکھے اور ہر شخص پر خود اس کے اپنے نفس کے حقوق عاید کیے اور کچھ ان کے آپس میں، بعض کے حقوق بعض پر رکھے اور پھر عام مخلوقات کے حقوق بھی ان پر رکھے۔ اب اس نکتہ پر غور کیجیے۔

حقوق اللہ

اللہ تعالیٰ کا پہلا حق یہ ہے کہ لا تشرک باللہ ط ان الشرک لظلم عظیم ط اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی قدرت و اختیار میں، اس کی عبادت میں کسی دُوسرے کو اس کا شریک نہ بناؤ، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے، جو انسان اپنے آپ پر کرتا ہے۔ شرک کو ظلمِ عظیم کہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر مجرم اپنے کو مجرم سمجھتا ہے، ہر کافر خوب سمجھتا ہے کہ ہم اللہ کا یا رسالتِ محمدیؐ کا یا قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ مگر دنیا میں کوئی مشرک اپنے کو مشرک نہیں کہتا۔ سورج، آگ اور بعض جانوروں تک پُوجنے والے اپنے کو موحد ہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے کو مشرک نہیں سمجھتے۔ ہر مشرک اپنے شرک کی کچھ نہ کچھ تاویل کرکے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں یا بول رہا ہوں شرک نہیں ہے۔ تو جس جُرم کو مجرم جُرم ہی نہیں سمجھتا، وہ اس سے اس وقت تک باز نہیں آنے کا، جب تک اس پر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یا عقیدہ رکھتے ہیں یہ شرک ہے اور چونکہ وہ تاویل کر کرکے اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے، اس لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے شرک سے باز آ جائے، بخلاف ایک منکر کے کہ خدا کا منکر، رسالت کا منکر، اگر بطور خود بھی کچھ ٹھنڈے دل سے غور کرے تو اس کے ذہن میں خود بخود اللہ کے وجود اور ضرورت نبوت و رسالت کے دلائل آنے لگیں گے اور پھر اگر کسی مخلص کے سمجھانے سے سمجھ جائے گا تو بآسانی اپنے انکار سے رجوع بھی کرے گا۔

عبادت

عبادت محض اعمال سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ درحقیقت قلبی چیز ہے۔ عبادت ایک جذبہ کا نام ہے جو دل میں پیدا

ہوتا ہے اور قایم رہتا ہے۔ اس میں کمی بیشی، سکون اور جوش پیدا ہوتا رہتا ہے مگر ایک مسلم کا دل جذبۂ عبادت سے کبھی خالی نہیں رہتا۔

جذبۂ عبادت درحقیقت کئی جذبوں کا ایک مجموعہ ہے۔ والہانہ شیفتگی، عاجزانہ فروتنی، فدویانہ گرویدگی، غلامانہ تندہی، بے عذر بندگی، مخلصانہ حاضر باشی اور وفادارانہ جاں نثاری۔ ان سات جذبوں کے مجموعے کا نام ذوقِ عبادت ہے۔ چھ جذبے تو واضح ہیں "مخلصانہ حاضر باشی" کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود سمجھنے والا اپنے کو بارگاہِ الٰہی کی حاضری کے لیے مخلصانہ اشتیاق کے ساتھ ہر وقت تیار رکھے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، وہ تو کفار و مشرکین سے بھی ان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے انسان جتنا اللہ تعالیٰ سے غافل رہتا ہے اُتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دُور رہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے دُوری کا اصل باعث غفلت ہے۔

ان جذباتِ عبادت کے اظہار کے لیے کچھ اعمال بتا دیے گئے ہیں۔ ان اعمال کو مجازاً "عبادت" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اظہار جذبۂ عبادت کے طریقے ہیں، جو بتا دیے گئے۔ ان بتائے ہوئے طریقوں کے سوا کسی اور طریقے سے عبادت جائز نہیں اور ہر عبادت میں کسی نہ کسی چیز کا ایثار ہے۔ مثلاً نمازوں میں وقت کا، اپنی ذاتی مصروفیتوں اور نیند کا ایثار ہے۔ روزوں میں خواہشِ نفس کا اور زکوٰۃ میں مال کا ایثار ہے اور حج میں مال کا بھی اور "عقل" کا بھی ایثار ہے۔ یہ عالم ہی دوسرا ہے۔ اللہ کی خاطر از خود رفتگی کا عالم۔ دیوانہ وار بے سلے کپڑے پہنے ایک میدان میں پڑے رہو۔ ایک مکان کے گرد گھومتے رہو۔ دو ٹیلوں کے درمیان دوڑو، کنکریاں چُنو اور پتھر پر مارو۔ کیوں؟ یہ نہ پُوچھو، مالک کا حکم ہے، بجا لاؤ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (اقبال)

اور یہی مطلب ہے "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" کا، مگر یہ منصب رسول کے سوا اور کسی کا نہیں ہوتا، یہاں تک کہ "سابقون الاوّلون" مہاجرین و انصار میں بھی کسی کا یہ منصب نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات وحی سے فرماتے تھے، صحابہ بلاچون وچرا سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے ورنہ پُوچھتے تھے کہ حضورؐ یہ بات وحی سے فرما رہے ہیں یا محض بشری حیثیت سے۔ جو بات وحی سے نہیں ہوتی تھی ان میں آپؐ لوگوں کو اطاعت و اتباع پر مجبور نہیں فرماتے تھے۔

تو جس عبادت کا وقت آجائے، اشتیاق کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے لیے تیار ہو جانا۔ اس "مخلصانہ حاضر باشی" سے مراد ہے گویا ایک مسلم اپنے کو ہر وقت حاضرِ دربار سمجھے۔ جس وقت پکارو فوراً موجود ہو جائے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۙ
يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ۙ

[ایسے لوگ جن کو ان کی تجارت، ان کے خرید و فروخت کا کاروبار ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر دیتا، نہ نماز سے، نہ ادائے زکوٰۃ سے (وہ غافل رہتے ہیں) وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن (لوگوں کے) دل اُلٹ جاتے ہیں اور آنکھیں اُلٹ جاتی ہیں۔ یعنی مرنے کا

وقت۔ (میں یہی سمجھا ہوں، عام طور سے لوگ قیامت کا دن بھی مراد لیتے ہیں اور دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں الٹ جائیں گی، ترجمہ کرتے ہیں، وہ بھی صحیح ہے)]

یہ جذبۂ عبادت جو سات جذبوں کا مجموعہ ہے، صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ان میں سے کسی جذبے کو بھی غیر اللہ کے لئے پیدا کرنا مستقل شرک نہیں تو قریب شرک ضرور ہو جائے گا اور کسی وفات یافتہ بزرگ کے ساتھ ان میں سے کسی جذبہ کا رکھنا تو یقیناً مستقل شرک ہے۔

حقوقِ نفس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ لنفسك عليك حق۔

[تمھارے نفس کا بھی تم پر ایک حق ہے]

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یآیھا الذین امنوا علیکم انفسکم۔

[اے مومنو! تم ذمہ دار اپنی جانوں کے ہو]

اسی لیے خود کشی حرام ہے۔ روزوں میں سحر کھانے کی تاکید اسی لیے ہے کہ بھوک پیاس کی شدت ناقابلِ برداشت نہ ہو جائے۔ اپنے جسم کو ریاضات ومجاہدات کے ذریعے تکلیف دینا کوئی کارِ ثواب نہیں۔ نہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کا یہ ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مالی صلاحیت رکھتے ہوئے پھٹے پرانے کپڑے یا محض معمولی حقیر کپڑے پہننا یا ستو پینا اور حقیر کھانے کھانا وہ بھی بلا وجہ اور اس کو رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ قرآن میں فرمایا ہے:

قل من حرّم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیّبات من الرزق۔

[کہہ دو (اے رسول!) اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو زیب وزینت کی چیزیں اور پاکیزہ غذائیں پیدا کی ہیں ان کو کس نے حرام کیا ہے؟]

غرض اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی جائز وحلال نعمتوں سے جو جائز طریقوں سے حاصل کی جائیں، بلا وجہ باوجود مواقع میسر ہونے کے اپنے آپ کو ان سے محروم رکھنا دینِ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسی طرح دینی دوسرے فرائض سے اپنے کو غافل رکھ کر یا شرک و بدعت میں مبتلا ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنا تو سب سے زیادہ اپنے نفس کے حق کو پامال کرنا ہے۔

اپنے نفس کے حقوق کے مطابق فرائض بھی ہر شخص پر عاید ہیں۔ شرک و بدعت سے محفوظ رہنا۔ اور ہر گناہ کبیرہ سے خصوصاً اور عام گناہوں سے عموماً بچے رہنا، اپنے میں صفاتِ حمیدہ پیدا کرنا، برے خصائل سے اپنے کو پاک رکھنا، بدنامیوں سے بچنا، نیک کاری و نیک کرداری کے ذریعے نیک نامی حاصل کرنا، مگر صرف نیک نامی ہی کے لیے نیک کاری اختیار کرنا درحقیقت شرک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ و یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا کا مصداق نہ بنے۔ یعنی جس نیکی کو وہ

کرتا نہیں ہے مگر چاہتا ہے کہ یہ نیکی اس کی طرف منسوب ہو اور لوگ اس کو نیکی کی رُو سے ممدوح سمجھیں ۔ جیسے بعض لوگ حاجی نہیں ہیں مگر اپنے کو حاجی مشہور کیے ہوئے ہیں ۔ غرض نیکی وہی ہے جو محض اللہ کے لیے ہو۔

آپس کے حقوق وفرائض

ماں باپ کے حقوق کا ذکر قرآن میں صاف طور سے موجود ہے۔ ان کی بات ماننے کا حکم ہے ۔ ان کی نافرمانی سے، ان کو دُکھ پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ کسی گناہ کی بات کا وہ حکم دیں تو ان کی وُہ بات نہیں ماننی چاہیے ۔ ان کے ساتھ احسان و حُسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس لیے ان کے حقوق کی نگہداشت فرض ہے۔

زن وشوہر کے باہمی حقوق

زن وشوہر میں ایک کا حق دوسرے پر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

ولہن مثل الذی علیہن عورتوں کا حق بھی مردوں پر اس کے مانند ہے جیسا کہ مردوں کا حق عورتوں پر ہے ۔ وللرجال علیہن درجۃ ۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے ۔ مرد مہر ادا کرتا ہے ، نان ونفقہ کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اس لیے اس کو ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے ۔ حقوق کی مماثلت سے مراد مساوات نہیں ہے کہ مرد عورت کا مہر ادا کرے ، تو عورت بھی مرد کا مہر ادا کرے ۔ یہ مطلب نہیں ہے ۔ اگرچہ آج کل بہت جگہ یہی ہو رہا ہے بلکہ عورت کا مہر تو محض زبانی ہوتا ہے ۔ خدا جانے ادا ہوگا یا نہ ہوگا ، مگر مرد نکاح کے وقت لڑکی والوں سے اپنے مطالبے رکھوا لیتا ہے ۔ یہ ہندوؤں کے تلک والی رسم مسلمانوں کے بعض طبقوں میں ایک لعنت کی طرح اکثر نوجوانوں پر مسلط رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لعنت سے بچنے کی ہر مسلم نوجوان کو توفیق دے ۔ آمین ثم آمین

زن وشوہر کے درمیان حُسنِ معاشرت قایم رکھنے کی دونوں کو تاکید ہے ۔ مردوں کو خصوصیت کے ساتھ اس کی تاکید ہے :

وعاشروھن بالمعروف۔

[ان کے ساتھ بہتر طریقے سے بسر کرو]

حدیث میں ارشاد ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَشَرُّكُمْ شَرُّكُمْ لِاَهْلِهٖ ۔

[تم میں بہتر وہی شخص ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہو اور تم میں بُرا وُہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بُرا ہو]

اہلِ قرابت کے حقوق

قرآن مجید میں ہے:

وآتِ ذاالقربیٰ حقہٗ۔

[اہلِ قرابت کو ان کا حق ادا کرو]

اہلِ قرابت کا یہی حق نہیں ہے کہ وہ اگر محتاج ہوں، تو ان کی کچھ مالی مدد کرو بلکہ ان سے محبت کی رسم و راہ قایم رکھنا، بھلے بُرے میں ان کی خبر گیری کرتے رہنا، شادی غمی کے موقعہ پر ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا، وہ جس قسم کی مدد کے حاجتمند ہوں حتی الوسع ان کی اسی طرح کی مدد کرنا، ان کو بُرے کاموں سے روکنا، نیک کاری و نیک کرداری کی طرف ان کو مائل کرنا۔ (اس آیت کی تفسیر جو روایات کی بنا پر کی جاتی ہے میرے نزدیک وہ روایات محلِ نظر ہیں۔ اس لیے میں نے اس آیت کا وہی مفہوم لکھا ہے، جو الفاظ آیت سے ظاہر ہو رہے ہیں)

اقربا پروری

بہت اچھی صفت ہے بلکہ فرائض میں داخل ہے، اگر اپنے ذاتی مال سے کی جائے، اپنے ذاتی کاروبار میں غیروں کی جگہ اپنے اقربا کو ملازمت دی جائے۔ مگر دوسروں کے مال سے یا حکومت کے عہدہ دار اگر حکومت کے خزانے سے اقربا پروری کرنا چاہیں تو یہ صاف خیانت ہوگی۔ اگر آپ کے ہاتھ میں عہدوں کا تقرر ہے تو اگر امیدواروں میں آپ کا کوئی قرابت مند بھی ہے اور دُوسرے لوگ بھی، تو ایسی حالت میں آپ بہتر اور لائق امیدواروں کا انتخاب کریں، صرف اپنی قرابت کی وجہ سے اپنے قرابت دار کا انتخاب نہ کریں اور اگر آپ کا وہ قرابت دار ہی سب امیدواروں سے زیادہ لائق ہے، تو صرف اس لیے کہ وہ آپ کا قرابت دار ہے اس کو نظر انداز کر کے اس سے ادنیٰ درجے کے امیدوار کو بحال کرنا صرف لوگوں کے طعنہ، اقرباپروری کے خوف سے ہوگا، اور یہ بھی درحقیقت ظلم ہی کی ایک شکل ہے۔ ایک سچے مسلم کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ لا یخافون لومۃ لائم یعنی ایک مسلمان کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع سے نہیں ڈرتا۔ مسلمان صرف اللہ تعالیٰ سے، قیامت کی بازپُرسی سے ڈرتا ہے۔ ایک مسلمان اپنے ہر کام کے وقت یہ سوچ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے متعلق ہم سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بازپرس کرے گا۔ آپ کا ضمیر، آپ کی دیانت اگر آپ کو ملامت کر رہی ہے تو کسی دوسرے کی ملامت کی پروا نہ کیجیے اور جو حق سمجھتے ہیں وہی کیجیے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیے، قیامت کی بازپرس اور دار و گیر سے لرزتے رہیے۔

پڑوسیوں کے حقوق

قرآن مجید میں ہے: واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہٖ شیئاً و بالوالدین احسانا و بذی

القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم ط ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً ۵ (نساء - ۳۶)

[اللہ کی عبادت میں لگے رہو۔ کسی کو کسی بات میں ذرا بھی اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھی احسان کرتے رہو اور قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، قرابت دار پڑوسی کے ساتھ، اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور ہمنشینوں کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ (اب لونڈی غلام کا زمانہ نہیں ہے، تو ان کی جگہ نوکر چاکر ماما کو سمجھیے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اِترانے والوں، شیخی بگھارنے والوں کو پسند نہیں کرتا]

اس آیت کریمہ میں پڑوسیوں کے علاوہ ماں باپ، اہلِ قرابت اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور لونڈی غلام یا نوکر چاکر، دائی، ماما کے حقوق بھی بیان فرما دیے اور ان سب کے ساتھ احسان یعنی حُسنِ سلوک کا حکم دے کر ان سب کے حقوق ادا کرنے کو اسلامی و انسانی فرائض میں داخل فرما دیا ہے۔ مگر شروع آیت میں جو فرمایا ؛ اللہ کی عبادت میں لگے رہو اور کسی کو کسی بات میں بھی اس کا شریک نہ بناؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم جس کے ساتھ بھی احسان کرو، یہ سمجھ کر احسان کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حق میرے ذمہ رکھ دیا ہے ان کے حقوق کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ میں ان میں سے جس کے ساتھ بھی احسان کر رہا ہوں، تو ان کا حق اور اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اس لیے ان پر کبھی احسان جتانے کا خیال بھی دل میں نہ آئے اور نہ ریاکاری کی نیت سے دوسروں کو دکھانے کے لیے کسی پر احسان کرو، کیونکہ حقیقت میں یہ شرک ہے۔ جن کاموں سے اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا تھا، تم ان کاموں کو اس لیے کر رہے ہو کہ دیکھنے والے تم سے راضی اور خوش رہیں، نیکی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور تم نیکی کر رہے ہو مخلوق میں نیک نامی اور اپنی نیک کرداری کی شہرت کے لیے اور پھر اپنی نیک نامی کی شہرت پر اِتراتے رہتے ہو کہ دس جگہ تمھاری نیک کرداریوں کے چرچے ہوتے رہیں۔ یا تم خود شیخی بگھارا کرتے ہو کہ ہم نے فلاں کے ساتھ یہ کیا اور فلاں کے ساتھ یہ کر رہے ہیں، تو یاد رکھو کہ ایسے اِترانے والے، شیخی بگھارنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ لوگ ہیں۔

حدیثوں میں پڑوسیوں کے حقوق کے متعلق بہت کچھ ہے اور اہلِ جنّت کی نشانی بتائی گئی ہے پڑوسیوں کا خوش اور راضی رہنا۔ اور اہلِ دوزخ کی نشانی بتائی گئی ہے کہ پڑوسی ان سے ناخوش اور نالاں رہتے ہیں۔

عام مسلمانوں کے حقوق

فرمایا گیا : انما المؤمنون اخوۃٌ۔

سارے مسلمان (بلا امتیاز ذات پات اور بلا تفریق قوم و ملک سب کے سب) آپس میں بھائی بھائی ہیں،

چاہے وہ مختلف ملکوں کے، مختلف قبیلوں کے باعتبارِ سکونت یا باعتبارِ نسل و رنگ مختلف قوموں ہی کے کیوں نہ ہوں، مگر اسلام کے شیرازے سے سب کے سب منسلک ہیں، تو سب کے سب آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان رکھنے والے، ایک قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے والے اسی طرح بھائی بھائی ہیں جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اس لیے ذوی القربیٰ میں سب داخل ہیں البتہ الاقرب فالاقرب کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔

جو جتنا قریب تر ہے اُسی قدر اس کا حق پہلے ادا کرنا فرض ہوگا۔ اپنا بھائی چچیرے بھائی پر مقدم ہوگا۔ قرابت مند پڑوسی اجنبی پڑوسی پر مقدم ہوگا۔ مگر پھر بھی جو زیادہ تر اداۓ حق کا محتاج ہو، وہ اس سے مقدم رکھا جائے گا، جو اس سے کم محتاج ہے۔ ایک اجنبی مسلمان اگر زیادہ محتاج قرابت مند سے ہو، تو اس اجنبی کا حق مقدم رکھنا چاہیے۔

ذمی کفّار و مشرکین کے حقوق

اسلامی مملکت میں جو کفّار و مشرکین حکومت اسلامیہ کے وفادار بن کر آباد ہوں، ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ اعلان فرمانے کا حکم دیا تھا کہ:

انبأهم بان لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين۔

ذمی کفار کو مطلع کر دو کہ شہری حقوق ان کے لیے بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے لیے ہیں اور شہری ذمہ داریاں بھی ان پر وہی عاید ہیں جو سب مسلمانوں پر عاید ہیں۔ شہری حقوق میں ان کے ساتھ مسلمانوں کے برابر برتاؤ ملحوظ رہے گا، کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ وہ پورے امن و امان کے ساتھ اسلامی ملک میں اپنا کاروبار کر سکتے ہیں۔ اپنی مذہبی عبادتیں ادا کر سکتے ہیں۔ مگر ایسی رسمیں جو دُوسروں کے دل آزار اور مضرت رساں نہ ہوں۔

حربی دشمن کفّار کے حقوق

دشمنوں سے مدافعانہ جنگ کی اجازت ہی نہیں بلکہ حملہ آوروں کی مدافعت کا حکم ہے اور اس کے لیے ہمیشہ تیار رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مگر دشمن اگر صلح کی درخواست کرے، تو اس کی درخواست قبول کر لینے کا حکم ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لها اگر دشمن کفار صلح پر مائل ہو جائیں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ مگر خود سے پیغام صلح کرنے میں پیش قدمی سے منع فرمایا گیا ہے۔ سورہ محمدؐ کی آیت ۳۵ میں ہے:

فلا تهنوا وتدعوا الى السلم۔

تم کمزوری نہ دکھاؤ اور صلح کی درخواست نہ کرو، دشمن سے انتقام لو، تو برابر کا انتقام لو، انتقام میں زیادتی نہ کرو۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ط ان الله لا يحب

المعتدین ۰

[جو لوگ تم سے مارکاٹ کر رہے ہیں، تم بھی ان سے مارکاٹ کرو مگر اللہ کی راہ میں (یعنی محض جذبۂ انتقام میں نہیں) اور (مارکاٹ میں) حدِ انصاف سے آگے نہ بڑھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا]

اور سورہ بقرہ کی آیت: ۱۹۴ میں ہے:

فمن اعتدٰی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدٰی علیکم۔

جو شخص تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر زیادتی کرو (مگر) جیسی زیادتی اس نے کی ہے یعنی دشمن کی زیادتی سے تمھاری زیادتی بڑھ نہ جائے۔

غور فرمائیے جو دین دشمنوں کے حقوق کی نگہداشت کی تعلیم دیتا ہو، اس دین سے بڑھ کر انسانیت کی تکمیل کون سا دین کر سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر تکمیل انسانیت کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمن اگر حالتِ جنگ میں مقابلے کی تاب نہ لا کر صلح کا پیغام دے تو قبول کر لو۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر زوردار حملہ کر دینے کا حکم نہ ہوا۔ اگر دشمن نے کوئی زیادتی کی ہے تو بدلہ لینے کی اجازت تو دی گئی مگر برابر کے بدلے کی۔ جس قسم کی اور جیسی زیادتی دشمن نے کی ہے، بس ویسی ہی زیادتی تک کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔ یہ ہے تکمیلِ انسانیت، اور یہ ہے فرائض انسانیت کی تعلیم، اور یہ ہے حقوقِ انسانیت کی نگہداشت۔

باہمی تعاون

آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم ہے مگر کس طرح؟ ارشاد ہے:

تعاونوا علی البرّ والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو مگر نیکو کاری کی باتوں میں اور اللہ تعالیٰ کا ڈر یا دولا کر۔ گناہ و سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک بار فرمایا:

اعینوا اخاکم ظالماً او مظلوماً۔

یعنی اپنے بھائی کی مدد کیا کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مظلوم کی مدد کو تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی مدد کر کے ہم اس کو ظلم سے بچائیں گے، مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکو، سمجھاؤ، اللہ سے، قیامت کی بازپرس سے ڈراؤ، نہ مانے تو اپنے ہاتھ پاؤں سے اس کو ظلم کرنے سے باز رکھو۔ یہ حدیث اسی آیت کی تفسیر ہے۔ مظلوم کی مدد تو تعاونوا علی البر ہے، اور ظالم کی مدد اس کو ظلم سے باز رکھ کر تعاون علی التقویٰ ہے۔ اس لیے کسی مجرم کی مدد کرنا، چاہے وہ مجرم اپنا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، اسلام نے

جائز نہیں رکھی ۔ اپنا کوئی عزیز کوئی جُرم کر بیٹھے، تو اس کو سزا سے بچانے کی جدّوجہد اور مقدمات کی پیروی وغیرہ اسلام نے قطعاً حرام قرار دی ہے ۔ یہاں تک کہ کسی مقدمے میں گواہی دینے سے انکار کرنا یا چھُپ جانا محض اس لیے کہ وہ گواہی اپنے کسی عزیز کے خلاف ہوگی اور اس کی گواہی سے اس عزیز کا نقصان ہوگا، یا خود اپنا نقصان ہوگا ، جائز نہیں ۔ چنانچہ حکم ہے :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (نسأ ، رکوع ۲۰ کا آغاز)

[اے ایمان والو ! تم انصاف پر پُوری طرح قایم رہو ۔ اللہ کے گواہ رہو (" اللہ کے گواہ" رہنے کا مطلب اس طرح سمجھیے : یا تو مجرم نے جُرم اللہ کے سامنے کیا ہے یا پھر کوئی معاملہ ہے دو افراد کے درمیان ، سو وُہ بھی اللہ کے روبرو ہوا ہے ، پس جب تم ان افراد پر گواہی دو تو یہ سمجھ کر دو کہ تم جس امر کی شہادت دے رہے ہو اس کا علیم و بصیر اللہ ہی ہے یعنی خود اللہ تعالیٰ اس کا گواہ ہے اور تمھاری گواہی بھی وہی دیکھ رہا ہے ، سُن رہا ہے ، لہٰذا گواہی دیتے وقت یہ باتیں اپنے ذہن میں رکھو ، تب کوئی شہادت دو) اگرچہ گواہی خود تمھارے ہی خلاف ہو یا تمھارے ماں باپ کے خلاف ہو یا قرابت مندوں کے خلاف ہو ۔ اگر وہ مالدار ہو یا فقیر ہو (تو تم نہ مالدار کی پاسداری کرو ، نہ فقیر پر ترس کھاؤ) اللہ ان دونوں کا سب سے زیادہ کارساز ہے ۔ تم ہوائے نفس کا اتباع نہ کرو کر (گواہی سے) رُوگردانی کرو اور اگر تم نے گول مول بات کہی (جس سے حقیقتِ حال چھپی رہے) یا (گواہی سے) پہلوتہی کی تو (یاد رکھو) تم جو کچھ کرو گے اللہ اس سے باخبر رہے گا]

اس تعلیم کا نام عدل و انصاف اور تکمیلِ انسانیت کی تعلیم ہے اور یہ انسانی فرائض ہیں ، جن کی تعلیم کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور جس کی ہدایت کے لیے قرآن مجید اُترا ۔ جس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرام کو انسان کامل کا نمونہ بنا کر دُنیا سے آخرت کی طرف کُوچ فرمایا تاکہ بعد میں آنے والے ان آسمانِ ہدایت کے چمکتے ستاروں سے ہدایت حاصل کریں اور انسان بننا سیکھیں ۔ چنانچہ کئی لاکھ تابعین نے آسمانِ ہدایت کے ان روشن نجوم سے انسانیت کی تعلیم حاصل کی ۔ سچ فرمایا تمھارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ : بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ، میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی بزرگیوں کو انتہا تک پہنچا دُوں ۔ چنانچہ آپؐ نے ساری اخلاقی بزرگیوں کو زبانی تعلیم اور عملی تعلیم کے ذریعے دکھا دیا اور اسی کا نام تکمیلِ انسانیت ہے ۔

عہد نبوی میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین

سید بدرالدین علوی

قرآن مجید کا پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا اور اس کی ہدایت اور اس کے احکام کا بغیر حذف و کمی اور بغیر تغیر و تبدل ہمیشہ قایم رہنا لازمی طور پر اس کا مقتضی تھا کہ وہ عہد نبوت ہی میں مرتب کتابی صورت میں آ جائے تاکہ اصلی معنوں میں محفوظ ہو جائے اور حذف و ترمیم اور تغیر و تبدل کا شبہ ہی مٹ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تیار ہو گیا تھا اور اس کی مکمل کتابت ہو چکی تھی، جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات اس امر کے لیے ناقابل تردید دلائل ہیں:

۱۔ قرآن مجید خود اپنے آپ کو بہت سے مقامات پر حتیٰ کہ مکی سورتوں میں بھی کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ کتاب فصلت آیاتہ۔ (مکی) — یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں واضح کر دی گئی ہیں۔

۲۔ الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب۔ (مکی) — یعنی سب تعریفیں خدا ہی کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔

۳۔ ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ۔ (مدنی) — یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

۴۔ یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (مدنی) — یعنی پیغمبر لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔

وغیرہ وغیرہ۔

لفظ کتاب کا استعمال مکی سورتوں میں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن مجید آغاز ہی میں کتابی صورت میں مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ قرآن مجید نے جہاں اپنے خلاف کفار کے اعتراضات کو بیان فرمایا ہے، ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ:

قالوا اساطیر الاولین اکتتبھا۔ (فرقان - ۵) — یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن پچھلے لوگوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کو پیغمبر نے لکھا دیا ہے۔

یہ اعتراض بزمانہ نزول صرف اسی وقت درست ہو سکتا ہے، جب کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ترتیب پا کر لکھا جاتا تھا۔

احادیث و سیر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن مجید کی تحریر و ترتیب عہد نبوی میں شروع ہو گئی تھی اور وہ اسی زمانہ میں مرتب ہو گیا تھا۔ مثلاً:

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں سے بہت سے لوگوں کو کتابت وحی کے کام پر مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے اڑتیس صحابہ کرام کی فہرست محدث ابن سید الناس (المتوفی ۷۳۴ھ) نے اپنی کتاب مسمّٰی "عیون الاثر" جلد دوم ص ۳۱۵، ۳۱۶ پر

دی ہے ، جو قرآن لکھا کرتے تھے "السیرۃ الحلبیہ" کی جلد دوم ص ۴۲۶ پر بھی کاتبین وحی کے نام درج ہیں ۔ ان ناموں کو مصنف نے ایک روایت کی رو سے چھبیس اور ایک روایت کی رُو سے بیالیس کاتبین کے ناموں میں سے انتخاب کیا ہے ۔ اس فہرست میں خلفاء اربعہؓ ، حضرت معاویہؓ ، عبداللہ بن مسعودؓ ، زید بن ثابتؓ وغیرہ شامل ہیں حضرت معاویہؓ کا کاتبینِ وحی میں ہونا" مجمع الزوائد" جلد اول ص ۶۰ ، ۶۱ اور صحیح مسلم مصری جلد دوم ص ۲۹۴ سے بھی ثابت ہے ، جہاں یہ مذکور ہے کہ ان کے والد ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان سے کتابت کا کام لیا جائے ، چنانچہ حضورؐ نے اس کو منظور فرما لیا تھا ۔

۴ ۔ جب کوئی وحی نازل ہوتی تھی ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبینِ وحی کو منفرداً یا مجتمعاً جیسی صورت ہوتی ، طلب فرماتے اور خود بول کر ان کو وحی لکھوا دیتے ۔ ان واقعات کا ثبوت یہ ہے :

ا ۔ قال عثمان کان اذا انزل علیہ الشئ دعا بعض من یکتبہ ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۴۳ مطبوعہ دہلی)	یعنی جب وحی نازل ہوتی ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبوں میں سے کسی کو لکھنے کے لیے بلاتے ۔
ب ۔ عن البراء لما نزل لا یستوی القاعدون الخ دعا رسول اللہ زیداً فکتبہا ۔ (صحیح بخاری مصری ج ۳ ص ۷۶)	یعنی حضرت براء کہتے ہیں کہ جب آیت لا یستوی القاعدون الخ نازل ہوئی تو آنحضرت صلعم نے زید کو بلایا اور انہوں نے اس آیت کو لکھ لیا ۔
ج ۔ عن زید بن ثابت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم املی علیہ لا یستوی القاعدون ۔	یعنی خود زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لا یستوی القاعدون مجھے بول کر لکھائی ۔
د ۔ عن عبد اللہ ابن عمرو اذ نحن عند رسول اللہ نکتب ۔ الخ (سنن دارمی ص ۶۸)	یعنی عبداللہ بن عمروؓ (جو کہ کاتبین وحی میں بھی تھے) فرماتے ہیں کہ در آنحالیکہ ہم لوگ (جماعت کاتبین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد کتابت میں مصروف تھے ۔

۵ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید لکھوانے کے بعد فرماتے تھے کہ آپ کو پڑھ کر سنایا جائے "تاکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کو درست کرا دیں ۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے :

فاذا فرغت قال اقراء فاقراہ فان کان فیہ سقط قامہ ۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ، ص ۶۰)	یعنی جب میں لکھ چکتا ، تو حضرت فرماتے کہ پڑھو ۔ میں پڑھتا ، اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو آپ اس کو درست فرما دیتے ۔

۶ ۔ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی کو قرآن مجید لکھواتے ، تو یہ بھی ہدایت فرماتے کہ آپ کی بتلائی ہوئی ترتیب پر لکھیں ۔

ا ۔ ترتیب آیات کے متعلق یہ ارشاد وضاحت کے ساتھ احادیث میں مذکور ہے ۔ چنانچہ ترمذی میں ہے :

فیقول ضعوا هذا الآیات فی السورة التی یذکر فیها کذا و کذا۔	یعنی ان آیتوں کو اس سورت میں لکھو، جس میں فلاں فلاں باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(ترمذی ج ۲، ص ۱۳۴)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سورت جُدا جُدا لکھی جاتی تھی۔

ب۔ سنن ابی داؤد کی حسب ذیل حدیث اس کا ثبوت ہے کہ سورتوں کی ترتیب عہد نبویؐ میں ہو چکی تھی:

عن حذیفة انه رای النبی صلی الله علیه وسلم من اللیل۔۔۔۔ فصلّی اربع رکعاتٍ نقرءِ فیهن البقرة و آل عمران والنساء والمائدة والانعام۔ (ملخصاً)	یعنی حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کو رات کو چار رکعت نماز پڑھتے ہُوئے دیکھا اور آپ نے ان میں سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ اور انعام پڑھیں۔

(سنن ابی داؤد ج ۱، ص ۱۲۸، مطبوعہ نولکشور)

اس حدیث میں ان سور قرآنی کی ترتیب وہی ہے، جو موجودہ قرآن مجید میں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بقیہ سورتوں کی ترتیب بھی یقیناً عہد نبویؐ میں ہوئی ہوگی! اس حدیث کے علاوہ عہد نبویؐ میں قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے مرتب ہو جانے کی شہادت دوسری احادیث سے بھی ملتی ہے:

ا۔ ترمذی میں ہے:

۱۔ عن ابن عباس قال قال رجل یا رسول الله ایّ العمل احب الی الله قال الحال والمرتحل۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸ و ۱۱۹)	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پُوچھا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا: سفر سے اترنا اور سفر کرنا۔

دارمی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے:

قیل ما الحال والمرتحل قال صاحب القرآن یضرب من اوّل القرآن الی آخره و من آخره الی اوله کلما حل ارتحل۔ (دارمی ص ۴۴۱)	یعنی پوچھا گیا کہ سفر سے اترنے اور پھر سفر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والا جو اوّل سے آخر تک تلاوت کرتا ہے اور ختم کر لیتا ہے، تو دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ گویا جیسے ہی تلاوت کا سفر ختم کرتا ہے، ویسے ہی دوسرا سفر تلاوت کا شروع کر دیتا ہے۔

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شروع اور ختم جب ہی ہو سکتا ہے، جب پورا قرآن مجید مرتب ہو۔

۲۔ صحابہ کرامؓ کے اس استفسار پر کہ قرآن مجید کو کتنے دنوں میں ختم کرنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف تحدیدیں بیان

فرمائی ہیں، جو پانچ دن سے لے کر چالیس دن تک ہیں۔ ترمذی میں ہے:

عن عبد اللہ ابن عمر قال قلت یا رسول اللہ فی کم اقراء القرآن قال اختمہ فی شہر قلت انی اطیق افضل ذالک قال اختمہ فی عشرین.... اختمہ فی خمس قلت انی اطیق افضل من ذالک فما رخص لی۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸)

یعنی عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں کتنے دنوں میں قرآن ختم کروں۔ آپ نے فرمایا: ایک مہینے میں۔ میں نے پھر عرض کیا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ بیس دن میں، (بالآخر یہ فرمایا) کہ پانچ دن میں ختم کرو۔ میں نے پھر عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں مگر آپ نے اور کمی کی اجازت نہیں دی۔

ایک اور روایت انہی عبداللہ بن عمرؓ سے ترمذی کے اسی صفحہ پر مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ اقرء القرآن فی اربعین۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چالیس دن میں قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

یہ تمام حدیثیں، جو ختم کے متعلق ہیں، اس عہد میں قرآن مجید کے مرتب ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ بغیر ترتیب نہ ابتداء ہو سکتی ہے، نہ اختتام۔ غرض اس طریقہ پر کاتبین وحی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے عہد نبویؐ ہی میں وجود میں آچکے تھے، جن میں اس وقت تک کی نازل شدہ آیات و سورتیں مرتب تھیں اور آگے اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چار صحابہ کرامؓ کے مرتب کردہ چار نسخوں کا ثبوت صحیح بخاری مصری جلد سوم صفحہ ۱۴۳ و صحیح مسلم مصری جلد سوم صفحہ ۲۵۱ سے ملتا ہے۔ یہ نسخے حضرت معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور ابو زیدؓ کے تھے۔ اس عہد کے ان چار مرتب نسخوں پر دو نسخوں کا اضافہ رجال و طبقات کی کتابوں کے بیان سے ہوتا ہے۔ ایک تہذیب التہذیب جلد ہفتم صفحہ ۲۴۳ کی سند سے، جو حضرت عقبہؓ ابن عامر الجہنی کا تھا اور دوسرا حضرت سعد بن عبیدؓ کا، جس کا ذکر استیعاب جلد دوم صفحہ ۵۶۵ پر ہے۔

ان اقتباسات کی بنیاد پر چھ نسخوں کا وجود عہد نبویؐ میں ثابت ہوتا ہے۔

طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۱۲ میں اس عنوان کے تحت کہ "ان لوگوں کا ذکر، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا" مکررات کو چھوڑ کر تین روایتوں میں دس صحابہؓ کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں چار تو وہی ہیں جو اوپر صحیح بخاری و صحیح مسلم کے حوالہ سے بیان ہوتے۔ پانچواں نام سعد بن عبیدؓ کا ہے، جو استیعاب میں مذکور ہے۔ اس کے بعد پانچ دوسرے نام یہ ہیں: حضرت ابو الدرداءؓ، خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ، تمیم داریؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور ابو ایوب انصاریؓ، خلیفہ چہارم حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ بھی جامعین عہد نبویؐ میں ہیں، چنانچہ استیعاب میں ہے:

روی ربیعۃ بن عثمان عن محمد بن کعب القرظی قال کان ممن جمع القرآن علی

یعنی ربیعہ بن عثمان نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے عہد نبویؐ میں جب کہ آنحضرت

عہد رسول اللہ وھو حیؐ عثمان ابن عفان وعلی ابن ابی طالب وعبد اللہ ابن مسعود من المہاجرین و سالم مولی ابی حذیفۃ۔ (استیعاب جلد ۲ ص ۴۸۵)

صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے، قرآن اکٹھا کیا، ان میں سے عثمانؓ بن عفان، علیؓ بن ابی طالب، عبد اللہؓ ابن مسعود اور سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ بھی شامل ہیں۔

اس طور پر جملہ میزان مرتب نسخوں کی تیرہ ہوجاتی ہے۔ اس فہرست میں مجھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام نہیں ملے۔ لیکن چونکہ یہ حضرات بلاشبہ کاتبین وحی میں داخل ہیں، اس لیے اس کا یقین کامل ہے کہ انھوں نے بھی نسخے تیار کیے ہوں گے۔ گو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جتنی تعداد کاتبین وحی کی تھی، اتنے ہی نسخے قرآن مجید کے مرتب ہوئے ہوں گے۔ لیکن باوجود اس یقین کے میں ان کو شمار نہیں کرتا۔ مگر ذیل میں بعض ایسے واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے مرتب نسخے عہد عہد نبویؐ میں موجود تھے، جن کو آنحضرتؐ نے بعد وفات چھوڑا۔

۱۔ صحیح مسلم میں ہے:

نہی رسول اللہ ان یسافر بالقرآن الی ارض العدو۔ (مسلم ج ۲ ص ۹۲)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قرآن مجید کے نسخوں کو غنیم کے ملک میں لے جانے سے منع فرمایا۔

۲۔ موطا امام مالک کے باب الامر بالوضوء لمن مس القرآن میں ہے:

مالک عن عبد اللہ ابن ابی بکر ابن حزم ان فی الکتاب الذی کتبہ رسول اللہ لعمرو ابن حزم ان لا یمس القرآن الا طاھر۔

(موطا امام مالک ص ۸۵، مطبوعہ مصر)

یعنی جو شخص قرآن چھونا چاہے، اس کے لیے وضو کا حکم ہے۔ امام مالک عبد اللہ ابن ابی بکر بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ ان ہدایات میں جو آنحضرت صلعم نے ابن حزم کے لیے تحریر فرمائیں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص قرآن مجید کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگائے۔

۳۔ کنز العمال میں ہے:

لا تغرنکم ھذہ المصاحف المعلقۃ۔

(کتاب مذکور جلد اول ص ۲۴۴)

(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ قرآن مجید کے نسخے لٹکے ہوئے دیکھے اور فرمایا) کہ اے لوگو! تم ان سے دھوکہ میں نہ پڑجانا یعنی ان کا پڑھنا ہی کافی نہیں، عمل کی بھی ضرورت ہے۔

۴۔ سنن ابی داؤد میں ہے:

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ کتاب اللہ۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے اندر ایک ایسی چیز (قرآن) چھوڑے جاتا ہوں جس کے

بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے ، اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو ۔ (سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲۷۰ مطبوعہ نولکشور)

یہ فرمانا اسی وقت درست ہوسکتا ہے کہ جب قرآن مجید کتابی صورت میں ہر چیز کی دسترس کے اندر ہو ۔

۵۔ صحیح بخاری میں ہے :

عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا و شداد بن معقل علی ابن عباس فقال لهٗ شداد بن معقلٍ اترك النبی من شئ قال ما ترك الا ما بین الدفتین قال ودخلنا علی محمد بن الحنفیة و سالناہ فقال ما ترك الا ما بین الدفتین۔

(بخاری جلد ۲ ، ص ۷۵۲)

یعنی عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد ابن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے پُوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز ترکہ میں چھوڑی ہے ۔ انھوں نے جواب دیا نہیں، بجز اس کے کہ جو دو پٹھوں کے درمیان ہے ۔ پھر ہم محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور یہی سوال کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز نہیں چھوڑی بجز اس کے جو دو پٹھوں کے درمیان ہے ۔

ان دونوں جوابوں سے علاوہ قرآن مجید بصورت کتاب لکھے ہونے کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جلد بندی کا دستور ہو چکا تھا ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ :

ا ۔ کیا فنِ تحریر اس زمانہ میں ایسا عام ہو چکا تھا کہ قرآن مجید کے مکتوبہ نسخوں کا بکثرت پا یا جانا فرض کیا جا سکتا ہے ؟

ب ۔ اور اس مقصد کے لیے کاغذ دستیاب ہوتا تھا ؟ خود قرآن مجید ہی سے ان کا جواب مل جاتا ہے ۔

ا ۔ ایک مقام پر حکم خداوندی ہے :

یٰایها الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجلٍ مسمی فاکتبوہ ۔ (البقرہ ۔ ۲۸۲)

یعنی اے ایمان والو ! جب تم کوئی قرض کا معاملہ کرو ، جو مدت معینہ کے لیے ہو تو لکھ لیا کرو ۔

اس عام حکم سے بہت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ فنِ تحریر اتنا عام تھا کہ ہر شخص ہر وقت اس کا انتظام کر سکتا تھا ۔

اس فن کے مروّج ہونے کا مزید ثبوت حسب ذیل امور سے بھی ملتا ہے :

ا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے تھے ۔ صحیح مسلم میں ہے :

لما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قالوا انهم

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا ، تو لوگوں نے بتایا کہ وُہ لوگ

لا یقرؤن کتاباً الا مختوماً فال فاتخذ رسول اللہ خاتماً من فضة۔ (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۵۸) خط کو اس وقت تک نہیں پڑھتے، جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو، چنانچہ اس مقصد کے لیے حضورؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کرائی۔

۲۔ حدیبیہ کے صلح نامہ کی کتابت اتنی ثابت شدہ ہے کہ اس کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں۔

۳۔ صحیح مسلم میں ہے کہ:

لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ (جلد ۲، ص ۴۹۳) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بجز قرآن کے مجھ سے اور کوئی چیز نہ لکھو۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ لکھنا عام تھا اور بہت سے لوگ اس کو جانتے تھے۔ دُوسرے یہ کہ ایک طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ لوگ قرآن مجید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بولنے پر لکھا کرتے تھے۔

۴۔ صحیح بخاری میں ہے:

اکتبوا الی من تلفظ بالاسلام۔ (جلد ۲، ص ۱۱۲) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے واسطے ان لوگوں کے نام لکھ دو، جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

۵۔ تاریخی واقعہ مندرجہ طبقات ابن سعد جلد دوم صفحہ ۱۴ کہ اسیرانِ بدر جو فدیہ نہ دے سکتے تھے، ان کی رہائی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ ان میں کا ہر شخص مسلمانوں کے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھا دے۔

۶۔ فقال الا تعلمین ھٰذہ رقیة النملة کما علمتها الکتابة۔ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاء بنت عبداللہ سے) فرمایا کہ تُو نے حفصہؓ کو چیونٹیوں کے کاٹنے کا جھاڑنا کیوں نہیں بتلایا، جیسا کہ تُو ان کو لکھنا سکھا چکی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں۔

ب۔ اس دور میں کاغذ کی دستیابی خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ارشاد ہے:

ولو نزلنا علیك کتابا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھٰذا الا سحرٌ مبین۔ (الانعام۔ ۷) یعنی اگر ہم آپ کے اُوپر کوئی کتاب کاغذ پر لکھی ہوئی نازل کرتے اور لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چُھوتے تو کفار یہ کہہ دیتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض کاغذ کی دستیابی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کاغذ عام طور پر دستیاب نہ ہوتا رہا ہو۔ لیکن اس کی قائم مقام کوئی اور چیز مثلاً چمڑا یا اُونٹ کی ہڈی وغیرہ آسانی سے مل جاتی تھی۔ چنانچہ چمڑے کا استعمال زمانہ جاہلیت کی

شاعری میں مذکور ہے۔ جیسا کہ مرقش اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے: ؎

الدار قفروا للرسوم کما
رقش فی ظهر لا ذیم قلم

(یعنی معشوقہ کا مکان ویران پڑا ہے، لیکن نشانات ایسے نمایاں ہیں، جیسے چمڑے پر قلم نقش بناتا ہے)

غرض یہ شبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ قرآن مجید کتابی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب ہو کر لوگوں میں رائج ہو چکا تھا۔ البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا موجودہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب وہی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرار دی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں ہے اور اس کے حسب ذیل چار دلائل ہیں:

۱۔ سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مضبوط یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید کی نقل بذریعہ تواتر ہے۔ یعنی ہر زمانہ میں ایک ایسی بڑی جماعت نے اپنے بعد والوں کو قرآن مجید پہنچایا ہے، جس کے افراد مختلف نسلوں اور مختلف جگہوں کے لوگ تھے جو ایک دوسرے سے طویل مسافت پر بستے تھے اور پھر مختلف زمانوں میں تھے اور عقل کے نزدیک غیر ممکن ہے کہ اس اختلاف نسل اور اختلاف زمان و مکان کے باوجود سب لوگ کسی جھوٹ کو پھیلانے پر متفق ہو جائیں۔ تواتر کو قرآن مجید کے ساتھ اتنا ربط ہے کہ قرآن مجید کی تعریف ہی بلا استثناء تمام اسلامی فرقوں میں یہ قرار پائی ہے، کہ قرآن اس کتاب کا نام ہے، جو دو دفتیوں کے اندر بنقل تواتر چلی آ رہی ہے۔ علم اصول فقہ کی رُو سے تواتر کو وہ قوت حاصل ہے کہ جو خبر احاد سے ہرگز متزلزل نہیں ہو سکتی۔ (خبر احاد تواتر کا مقابل ہے، جس کے معنی انفرادی طور پر نقل کے ہیں) چاہے اس خبر احاد کو کتنی ہی بڑی طاقت و اعتبار حاصل ہو۔

قرآن مجید کے ذریعے تواتر نقل کا بیان درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تنہا بلا شرکت غیر نازل فرمایا تھا، اس لیے تنہا آپ ہی کو اس کا حق تھا کہ خود زبان مبارک سے بول کر ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اس کو جمع کریں اور لکھوائیں۔ اور آپ نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح مومنین کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کا حق بھی اپنی دی ہوئی ترتیب کے ساتھ تنہا آپ ہی کو تھا۔ چنانچہ آپ لوگوں کو اس کے پڑھنے اور یاد کرنے کی ترغیب دلاتے تھے جس کی بکثرت حدیثیں موجود ہیں۔ مگر بنظر اختصار یہاں صرف ایک حدیث کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

مثل الذی یقرء القرآن و هو حافظ له مع السفرة الکرام۔

(صحیح بخاری، ج ۳، ص ۱۳۲)

یعنی جو شخص قرآن کو پڑھتا ہے ایسی صورت میں کہ اس کا حافظ بھی ہے، تو ایسا شخص باعظمت فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔

ان ترغیبات کے سوا ایک اور بڑی وجہ قرآن مجید کے یاد کرنے اور پڑھنے کی یہ ہے کہ پنج وقتہ نماز میں اس کی تلاوت فرض ہے اور عہد رسالت میں ہر مومن کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے سینہ میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کو محفوظ رکھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ترتیب پر ہو۔ چنانچہ ہر مسلمان اس بات کی انتہائی کوشش کرتا تھا کہ وہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے قرآن کو حاصل کرے۔ اگر کتابت نہ جانتا ہو، تو محض حفظ کے لیے ورنہ حفظ و تحریر دونوں کے لیے۔ رسول اللہؐ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے بعد ان سے فرمایش کرتے تھے کہ وہ آپؐ کے سامنے اُس کو پڑھیں اور جب لوگ پڑھتے تو آپ اس کو سُنتے۔

یہ تو خود قرآن سے ثابت ہے کہ لوگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہے:

یعلمھم الکتاب و الحکمۃ۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

لقد اخذت من فی رسول اللہ بضعاً و سبعین سورۃ۔ (جلد دوم ص ۱۴۱)

یعنی میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے تقریباً اناسی سورتیں یاد کیں۔

اس حدیث میں پُورے قرآن کی تفصیل مذکور نہیں۔ لیکن ابن مسعودؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُورا قرآن حاصل کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی یہ ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمِ قرآن مقرر فرمایا اور ان کا نام سب سے پہلے رکھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایش کرکے ان سے قرآن سُنتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:

قال لی رسول اللہ اقراء علی القرآن فقلت اا قراء علیك و علیك انزل قال انی اشتھی ان اسمعه من غیری فقرات النساء۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۱)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سُناؤ۔ میں نے کہا کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں درآنحالیکہ وہ آپ ہی پر نازل ہُوا ہے، تو آپ نے فرمایا میں دوسرے لوگوں سے سُننے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس پر میں نے سورۂ نسأ تلاوت کی۔

اس طریقہ پر صحابہ کی اکثریت قرآن مجید کی حفظ و تعلیم میں مشغول تھی، جن میں خلفاے اربعہ تقدم کا حق رکھتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات کو ہر اس چیز کے ساتھ غایت درجہ کا شوق اور غیر معمولی توغل تھا، جو دین سے تعلق رکھتی تھی۔ مندرجہ ذیل واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں:

ا ——— (ل) حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہُوئی: "من یعمل سوء یجز به" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ! جو آیت نازل ہُوئی ہے، کیا وُہ تمھیں نہ پڑھاؤں۔ میں نے کہا، ہاں۔ تو وہ آپ نے مجھے پڑھائی۔

(ترمذی جلد دوم، صفحہ ۱۲۹)

(ب) استدل الامام ابوالحسن الاشعری (المتوفی ۳۲۴ھ) علی حفظه القرآن بدلیل لا یرد وھو انه قال یوم القوم اقراھم الکتاب و اکثرھم قرآنا و تواتو عنه انه قدمه

یعنی امام ابوالحسن اشعری نے حضرت ابوبکرؓ کے حافظ قرآن ہونے پر ایک ایسی دلیل پیش کی ہے، جو کہ رد نہیں کی جاسکتی اور وُہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ لوگوں کی امامت ایسے شخص کو کرنی چاہیے، جو قرآن کا قاری ہونے کے اعتبار سے

الامامة - (اتقان، ص ۱۸۱) ان سب میں بہتر ہو اور جس کے سینے میں قرآن سب سے زیادہ ہو۔

یہ ہدایت اور اس کے بعد آپ کا فعل، جو بذریعہ تواتر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ ایک بہت مضبوط دلیل ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قال ابوالعالیة قرأت القرآن علیٰ عمر اربع مرات۔ (مفتاح السعادہ ج ا ص ۳۵۶)

یعنی ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا دور حضرت عمرؓ کے روبرو چار مرتبہ کیا۔

۳۔ کان (عثمان) یختم القرآن فی رکعة واحدة۔ (استیعاب جلد ۱، ص ۴۴۱)

یعنی حضرت عثمانؓ ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

۴۔ عن ابی عبدالرحمٰن السلمی قال ما رأیت اقرأ من علی۔

یعنی ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے بڑھ کر کوئی قرآن کا قاری نہیں دیکھا۔

(استیعاب جلد ۲ ص ۴۷۶)

بہر حال سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے قرآن مجید کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا، جن میں بہت سارے ایسے حضرات ہیں، جو خصوصیت کے ساتھ اس میں شغف رکھتے تھے اور یہ لوگ بطور معلم لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے مقرر ہوئے۔ ان میں سے چار معلموں کا تقرر صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۸۱ اور صحیح مسلم جلد دوم ص ۲۹۳ اور ترمذی جلد دوم ص ۲۲۲ سے ثابت ہے۔ ان سب کتابوں میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن مسعودؓ، سالمؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابن ابی کعبؓ کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے مقرر فرمایا۔ ان چاروں اصحاب نے بعض دوسرے صحابہ کے ساتھ، جو اس تعلیم کے لیے مقرر ہوئے تھے (کیونکہ چار کی تعداد ناکافی ہے) بے شمار اشخاص کو عہد نبویؐ میں اور آپ کے بعد مختلف مقامات پر قرآن مجید کی تعلیم دی۔ یہ امر حسب ذیل واقعات سے واضح ہوتے ہیں:

۱۔ عبادة ابن الصامت کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یشغل فاذا قدم الرجل مهاجراً دفعه الی رجل منا یعلّمه القرآن۔ (کنز العمال جلد ا صفحہ ۲۲۱)

یعنی عبادہ بن الصامتؓ کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہؐ مشغول ہوتے اور کوئی آدمی ہجرت کر کے آتا، تو آپ اس کو ہم انصاریوں سے کسی کے سپرد کر دیتے کہ اس کو قرآن پڑھا دے۔

۲۔ استیعاب جلد اول صفحہ ۲۶۹ میں ہے کہ آپ نے قبائل قارہ اور عضل کو قرآن پڑھانے کے لیے چھ اصحاب مقرر فرمائے۔

اصل عبارت یہ ہے:

"النفر الستة الذین بعثهم رسول اللہ الی رهط من عضل والقارة فی سنة ثلاث من الهجرة لیفقهوهم فی الدین ویعلموهم القرآن وهم عاصم ابن ثابت ومرثد ابن ابی مرثد وخبیب ابن عدی وخالد ابن البکیر وزید ابن الدثنه وعبداللہ

ابن طارقؓ

۳۔ ۱۰ھ ہجری میں قبیلہ بنی الحارث کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے واسطے خالد بن ولیدؓ کو مقرر فرمایا۔ بعث فیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالد ابن الولید الی بنی الحارث ..... علمھم الکتاب اللہ۔

(طبری جلد سوم ص ۱۵۶، مطبوعہ مصر)

۴۔ یزید بن ابی سفیان کی درخواست پر، جو عہد فاروقی میں شام کے گورنر تھے، حضرت عمرؓ نے معاذؓ، عبادہؓ اور ابو درداءؓ کو حمص، دمشق اور فلسطین میں قرآن شریف کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا۔ اس قسم کے تقررات کی شہادت اور روایتوں سے بھی ملتی ہے جن کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی۔

۵۔ طبقات القراء ذہبی میں ہے:

قال سوید ابن عبد العزیز کان ابو الدرداٗ اذا صلی الغداۃ فی جامع دمشق اجتمع الناس للقرأۃ علیہ فکان یجعلھم عشرۃ عشرۃ وعن مسلم بن مشکم قال قال لی ابو الدرداء اعدد من یقرء عندی القرآن فعددتھم الفا وستمائۃ ونیفاً۔

یعنی حضرت ابو درداءؓ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو دس دس آدمیوں کی جدا جدا جماعت قایم کرتے۔ ایک بار تمام طلبہ کو شمار کرانے پر معلوم ہُوا کہ بہ یک وقت ایک ہزار چھ سو سے زاید طلبہ تھے۔

(طبقات القراء، ص ۶۰۶)

ان معلمین نے خود تعلیم دینے کے بعد اپنے قایم مقاموں کو مقرر کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ چنانچہ اپنے شاگردوں میں سے چند ممتاز لوگوں کو معلمی کی خدمت پر مامور کر دیتے تھے، جو نہایت توجہ سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔ پھر ان شاگردوں نے اپنے شاگردوں میں سے مستحق طلبہ کو اپنا قایم مقام بنایا۔ اس طرح یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا، جو اب تک جاری ہے۔ اس طریقہ سے بے شمار اشخاص کے ذریعہ سے، جو مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں کے سیکڑوں برس کے اندر دُنیا کے دُور و دراز مقامات میں گزرے ہیں، قرآن مجید کی روایت ہوتی چلی آتی ہے اور اسی کا نام تواتر ہے۔

قرآن مجید کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے املا اور ترتیب پر تیار ہُوئے تھے، وہ تحریر اور زبانی قرأت دونوں میں باہم مطابق تھے۔ اس لیے کہ دونوں کاموں میں خود رسُول اللہؐ کا دستِ مبارک شامل تھا اور زبانی قرأت میں اکثر تحریری نسخوں کے ساتھ مقابلہ ضروری تھا۔ بالخصوص ایسے مواقع پر جہاں تشابہ لگ جائے۔ ان میں اختلاف نہ ہونے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ وعدۂ الٰہی ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون۔ یعنی ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

اگر اختلاف ہوگیا، تو پھر حفاظت کیا ہوئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اس کی اہمیت سے پُوری طرح واقف تھے کہ

قرآن مجید کے ہر معاملہ میں توافق اور تطابق ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان کو بتلایا تھا:

لوکان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔	یعنی اگر قرآن مجید غیر خدا کی جانب سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لیے جب خدا کی جانب سے اختلاف غیر ممکن تھا، تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انسانوں کی جانب سے اس میں اختلاف پیدا کر دیا جاتا۔

۲۔ عہد نبویؐ کی ترتیب اور موجودہ مصحف کی ترتیب میں مطابقت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے۔ اس دورے میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کی تکرار ترتیب کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی، اس سال قرآن مجید کا دور دوبار ہُوا۔ دور اوّل کا واقعہ صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۴۱ میں مذکور ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دورہ غیر مرتب صورت میں نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ترتیب آیات اور ترتیب سور ضروری ہے؛ جو بتوفیق الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اسی ترتیب کے ساتھ آپ نے قرآن مجید اُمت کو اشاعت کے لیے دیا۔ اس لئے یہ ہرگز بھی خیال نہیں کیا جاسکتا کہ اس ترتیب میں، جو بتوفیق الٰہی ہوچکی تھی کوئی تغیر و تبدل کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کی روایتیں موجود ہیں؛ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس ترتیب میں تغیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً:

ا۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

ان الحجاج خطب فقال ان ابن الزبیر بدل کلام اللہ فقام ابن عمر فقال کذب لم یکن ابن الزبیر لیستطیع ان یبدل کلام اللہ و لا انت۔ (جلد اوّل ص ۳۷)	یعنی حجاج نے خطبہ دیا اور کہا کہ ابن زبیرؓ نے کلام خدا کو بدل دیا۔ ابن عمرؓ کھڑے ہُوئے اور کہا کہ جھوٹ ہے۔ نہ ابن زبیرؓ کو یہ طاقت تھی کہ وہ کلام اللہ کو بدل سکتے اور نہ تجھ کو یہ مقدور ہے۔

ب۔ صحیح بخاری میں ہے:

قال ابن الزبیر لعثمان ابن عفان والذین یتوفون منکم الخ قال قد نسختہا الآیۃ الاخرٰی فلم تکتبہا او تدعہا قال یا ابن اخی لا اغیر شیئاً منہ من مکانہ۔ (صحیح بخاری جلد ۳ ص ۶۷)	یعنی ابن زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آیت والذین یتوفون منکم الخ ایک دوسری آیت سے منسوخ ہوچکی ہے تو آپ اس آیت کو نہ لکھتے۔ یا یہ کہا کہ اس کو چھوڑ دیتے۔ اس پر عثمان نے کہا کہ اے میرے بھتیجے! میں قرآن کی کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

الغرض جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھوں میں بذریعہ تواتر موجود ہے، وہ یقیناً اسی ترتیب کے مطابق ہے، جس پر

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سالانہ ہوا کرتا تھا۔

۳۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت کو ہفتہ پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ہر روز کے لیے ایک مقدار معین فرمالی تھی اس مقدار کا نام حزب ہے۔ حزب کی جو تفصیل حدیث میں آئی ہے، وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب سور عہد نبویؐ میں بالکل وہی تھی جو آج ہے۔ اس کی شہادت کے لیے احادیث ذیل ملاحظہ ہوں:

ا۔ عن اوس ابن حذیفة الثقفی قال کنت فی الوفدین الذین اسلموا من ثقیف ..... فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم طراء علی حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتی اقضیه فسألنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم و قلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلث سور و خمس سور و تسع سور و احدیٰ عشرة سورة و ثلث عشرة سورة و حزب المفصل من قٓ حتی یختم۔ (مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۹ (۳۴۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا معمول آج قرآن مجید پڑھنے سے رہ گیا تھا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب اس مقدار معین کو ادا کر لوں، اس وقت باہر نکلوں ...... اس بات پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کا حزب کس طریقہ سے مقرر کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دُوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا نو سورتوں کا، چوتھا گیارہ سُورتوں کا، پانچواں تیرہ سورتوں کا اور چھٹا آخری مفصل کا جو سورہ قٓ سے ختم قرآن تک ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترتیب سور اس وقت ہے، وہی اُس وقت بھی تھی۔

ب۔ عن واثلة ابن الاسقع قال رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم اعطیت مکان التوراة السبع الطوال و اعطیت مکان الزبور المئین و اعطیت مکان الانجیل السبع المثانی و فضلت بالمفصل۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۰۷)

یعنی مجھ کو تورات کے بدلہ میں قرآن کی سات بڑی سورتیں عطا ہوئی ہیں اور زبور کے بدلہ میں دو سو آیتوں والی سُورتیں اور انجیل کے بدلہ میں سورہ فاتحہ اور مجھ کو مفصل سورتیں عطا فرما کر فضیلت دی گئی ہے۔

عہد نبویؐ کی ترتیب سے موجودہ قرآن کی ترتیب کی مطابقت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اکابر علماے اسلام، جو مختلف قوموں اور فرقوں اور زمانوں میں گزرے ہیں، شروع سے آخر تک اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن المجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جمع ہو چکا تھا اور اس کی آیتیں اور سُورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائی تھیں اور پھر اسی ترتیب

کے ساتھ وہی مجموعہ بذریعہ تواتر مسلمانوں میں برابر چلا آرہا ہے۔ ان میں سے بعض علماء کی رائیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) سے جو قدیم ترین علماء میں ہیں، اتقان میں منقول ہے:

عن ابی وھبٍ سمعت مالکًا یقول انّما الّف القرآن علی ما کانوا سمعوا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اتقان صفحہ ۱۴۴)

یعنی قرآن کی تالیف اسی طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقہ پر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔

۲۔ امام بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) کا یہ قول بھی اتقان میں ہے:

قال البغوی فی شرح السنۃ الصحابۃ جمعوا بین الدفتین القرآن الذی انزلہ اللہ علی رسولہ فکتبوہ کما سمعوہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غیر ان قدموا شیئًا اواخروا او وضعوا لہ ترتیبًا لم یاخذوہ من رسول اللہ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلقن اصحابہ و یعلمھم ما نزل علیہ من القرآن علی الترتیب الذی ھوالاٰن فی مصاحفنا بتوقیت جبریل ایاہ علی ذٰلک واعلامہ عند نزول کل آیۃ ان ھٰذہ الاٰیۃ تکتب عقب اٰیۃ کذا فی سورۃ کذا۔ (اتقان ص ۱۴۴، ۱۴۵)

یعنی امام بغوی نے اپنی کتاب شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ صحابہ نے دو پٹھوں کے اندر اسی قرآن کو لکھا، جس کو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا۔ جیسا انھوں نے سُنا، ویسا ہی لکھ لیا۔ نہ اس میں کسی چیز کو آگے رکھا اور نہ کسی چیز کو پیچھے کیا، اور نہ کوئی ایسی ترتیب دی کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہ کیا ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو قرآن اسی ترتیب پر تلقین کر دیتے تھے، جو اس وقت ہمارے نسخوں میں ہے اور یہ اس طور پر تھا کہ جبریلؑ بوقتِ نزول آپؐ کو بتلا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد فلاں سورہ میں لکھی جائے۔

۳۔ ابن الحصار فرماتے ہیں:

ترتیب السور و وضع الاٰیات مواضعھا انما کان بالوحی وکان رسول اللہ یقول ضعوا آیۃ کذا فی موضع کذا فقد حصل الیقین من النقل المتواتر بھذا الترتیب من تلاوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومما اجمع الصحابۃ علی وضعہ۔ (اتقان ص ۱۴۵)

یعنی ابن الحصار کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کی جگہیں وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ پر لکھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور صحابہؓ کے اجماع سے جو بہ نقل متواتر ہے یہ بات بالکل یقینی ہے۔

۴۔ ابوبکر ابن انباری (متوفی ۳۲۸ھ) کا بیان ہے:

انزل اللہ القرآن کلہ الی سماء الدنیا ثم فرقہ فی بضع وعشرین سنۃ فکانت السورۃ تنزل لامر یحدث والآیۃ جواباً لمستخبر فیوقف جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم علی موضع الآیۃ والسورۃ فاتساق السور کاتساق الآیات والحروف کلہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فمن قدم سورۃً او اخرھا فقد افسد نظم القرآن۔ (اتقان، ص ۱۴۵، ۱۴۶)

ابوبکر بن الانباری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن سارے کا سارا سماء دنیا پر نازل فرما دیا پھر بیس سال سے کچھ زیادہ میں اس کو بانٹ دیا۔ چنانچہ سورۃ کسی پیش آمدہ واقعہ کے لیے اور آیت سائل کے سوال کے جواب میں اترتی تھی۔ تو جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت اور سورۃ کی جگہ بتلا دیتے تھے۔ اس لیے سورتوں کی ترتیب بھی مثل آیتوں کی ترتیب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرتب کردہ ہے اور اگر کوئی شخص کسی سورت کو مقدم یا مؤخر کرے گا، تو وہ نظم قرآنی کو بگاڑ دے گا۔

۵۔ برہان الدین ابوالقاسم محمود بن حمزہ ابن نصر الکرمانی المقری الشافعی (صاحب کتاب البرہان فی توجیہ متشابہ القرآن) (متوفی بعد ۵۰۰ھ) کذا فی الکشف فرماتے ہیں:

ترتیب السور ھکذا ھو عند اللہ فی اللوح المحفوظ علی ھذا الترتیب وعلیہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعرض علی جبریل کل سنۃ ما کان یجتمع عندہ فیہ وعرضہ علیہ فی السنۃ التی توفی فیہا مرتین۔ (اتقان، ص ۱۴۶)

کرمانی نے اپنی کتاب برہان میں لکھا ہے کہ سورتوں کی ترتیب اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبریلؑ سے جمع شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے، جو آپ پر اس وقت نازل ہو چکا ہوتا تھا، سالِ وفات میں دو بار حضرت جبریلؑ کے ساتھ دورہ ہوا۔

۶۔ طیبی (متوفی ۷۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ:

قال الطیبی انزل القرآن اولاً جملۃ واحدۃ من اللوح المحفوظ الی السماء الدنیا ثم نزل علی حسب المصالح ثم اثبت فی المصاحف علی التالیف والنظم المثبت فی اللوح المحفوظ۔ (اتقان، ص ۱۴۶)

یعنی طیبی کہتے ہیں کہ قرآن پہلے مجموعی طور پر لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا۔ پھر ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ پھر اسی ترتیب کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں ہے، مصاحف میں لکھا گیا۔

۷۔ احمد ابن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (متوفی ۷۰۸ھ) فرماتے ہیں کہ:

قال ابو جعفر ابن الزبیر الآثار تشهد بذلك كقوله اقرؤا الزهراوين البقرة وآل عمران رواه مسلم وكحديث سعيد ابن خالد صلى رسول الله بالسبع الطوال فى ركعة رواه ابن ابى شيبة فى مصنفه وفيه انه كان يجمع المفصل فى ركعة وروى البخارى عن ابن مسعود انه قال فى بنى اسرائيل والكهف ومريم وطه والانبياء انهن من العتاق الاول وهن من تلادى وذكرها نسقا كما استقر ترتيبها وفى البخارى انه عليه السلام كان اذا أوى الى فراشه كل ليلة جمع كفيه ثم نفث فيهما يقراء قل هو الله احد والمعوذتين۔ (اتقان ص ۱۴۷)

یعنی ابوجعفر ابن زبیر کہتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ترتیب کی شہادت دیتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چمکتی ہوئی سورتیں بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح سعید ابن خالد کی یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات بڑی بڑی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنفہ میں روایت کیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور بھی حدیث ہے کہ آنحضرتؐ مفصل سورتوں کو ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالتے تھے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ سب کی سب اعلیٰ درجہ کی سورتیں ہیں۔ اور یہ میرا مال موروثی ہیں۔ اس طرح ان سورتوں کا ذکر اسی ترتیب سے فرمایا، جس ترتیب کے ساتھ آج وہ ہیں۔ بخاری میں بھی یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تھے تو اپنی ہتھیلیوں کو ملا کر قل ہو اللہ اور معوذتین پڑھ کر پھونکتے تھے۔

۸۔ ابوجعفر النحاس (متوفی ۳۳۸ھ) فرماتے ہیں:

قال ابوجعفر النحاس المختار ان تاليف السور على هذا الترتيب من رسول الله لحديث واثلة اعطيت مكان التوراة السبع الطوال لحديث قال فهذا الحديث يدل على ان تاليف القران ماخوذ عن النبى صلى الله عليه وسلم وانه من ذلك الوقت، وانما جمع فى المصحف على شئ

یعنی ابوجعفر النحاس کہتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی یہی ترتیب رسول اللہؐ کی دی ہوئی ہے جیسا کہ حدیث واثلہ سے معلوم ہوتا ہے (یہ حدیث پہلے ذکر کی جا چکی ہے)، یہ حدیث صاف بتلاتی ہے کہ قرآن کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اسی وقت کی ہے اور اس وقت کا قرآن اُسی ترتیب پر ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث ترتیب قرآن

واحدا لانه قد جاء هذا الحديث بلفظ رسول الله على تاليف القرآن قال ومما يدل على ان ترتيبها توقيفي ما اخرجه احمد وابوداؤد عن اوس ابن ابی اوس حذيفة الثقفی قال كنت فی الوفد الذين اسلموا من ثقيف الخ قال فهذا يدل على ان ترتيب السور على ما هو فی المصحف الآن كان على عهد رسول الله قلت ومما يدل على انه توقيفی كون الحواميم رتبت ولاءً وكذا الطواسين ولم يرتب مسبحات ولاء بل فصل بين سورها وفصل بين طسم الشعراء وطسم القصص بطس مع انها اقصر منها ولو كان الترتيب اجتهاد يا الذكرت المسبحات ولاءً واخرت طس عن القصص۔ (اتقان ص ۱۴۷، ۱۴۸)

کے متعلق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں ہے۔ ابوجعفر یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے پر اوس ابن ابی اوس کی روایت بھی دلالت کرتی ہے (یہ روایت بھی اوپر گزر چکی ہے) علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حٰم سے شروع ہونے والی سورتیں مرتب لائی گئی ہیں اور اسی طرح سے طٰس والی بھی، لیکن یسبح یا سبح سے شروع ہونے والی سورتیں ترتیب دار نہیں بلکہ ان کے اندر فصل واقع ہے۔ اسی طرح طٰسم، سورہ شعرا، وطٰسم، سورہ قصص کے بیچ میں طٰس ہے۔ حالانکہ وہ ان دونوں سے چھوٹی ہے۔ اس لیے اگر ترتیب اجتہادی ہوتی تو مسبحات ترتیب دار لائی جاتیں اور طٰس سورہ قصص سے پیچھے لائی جاتی۔

۹۔ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) کا بیان ہے:

والقول بان تقسيم آيات القرآن وترتيب مواضع سورة شئ فعله الناس ليس هو من امر رسول الله فقد كذب هذا الجاهل وافك اتراه ما سمع قول الله تعالىٰ ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها او مثلها وقول رسول الله فی آية الكرسی وآية الكلالة والخبر انه كان يامر اذا نزلت الآية ان تجعل فی سورة فی موضع كذا ولو ان الناس رتبوا سورة لما تعدوا احد وجوه ثلثة اما يرتبوها على الاول

یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ آیات قرآنی اور اس کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور نہ اس کے رسولؐ کے حکم سے، ایسا شخص جاہل اور بہتان باندھنے والا ہے۔ کیا اس شخص نے یہ آیت نہیں سنی (جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کے عوض اس سے بہتر یا اس جیسی لا دیتے ہیں) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی اور آیۃ الکلالہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ اس کے علم میں نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے، یہ آیت فلاں سورت میں فلاں

فالاوّل نزولاً او الاطول فما دونه اوالاقصر فما فوقه فاذا ليس كذلك ، فقد صح انه امر رسول الله لا يعارض عن الله عزّ وجلّ لا يجوز غير ذالك اصلاً ۔

(کتاب الفصل جلد ۴، ص ۲۲۱)

جگہ لکھ دی جائے اگر لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا ہوتا تو وہ اس کے تین ہی طریقے اختیار کرتے یا بترتیب نزول مرتب کرتے ، یا پہلے بڑی سورتیں رکھتے، اس کے بعد چھوٹی یا پہلے چھوٹی رکھتے ، اس کے بعد بڑی لیکن جب یہ صورت نہیں ہے تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے مرتب ہونا ثابت ہے اور یہ چیز خدا کی جانب سے ہونے کے معارض نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہرگز صحیح نہیں ہے ۔

یہی ابن حزم قرآن مجید کے نسخوں کے متعلق رقمطراز ہیں :

مات رسول الله صلى الله عليه وسلم والاسلام قد انتشر و ظهر فى جميع جزيرة العرب من منقطع البحر المعروف ببحر القلزم ماراً الى سواحل اليمن كلها الى بحر فارس الى منقطعه ماراً الى الفرات ثم الى ضفة الفرات الى منقطع الشام الى بحر القلزم وفى هذه الجزيرة من المدن و القرى ما لا يعرف عدده الا الله كاليمن والبحرين وعمان و نجد وجبل طى و بلاد مضر وربيعة وقضاعة والطائف و مكة كلهم قد اسلم وبنوا المساجد ليس فيها مدينة و لا قرية ولا حلّة لاعراب الا وقد قرى فيها القرآن فى الصلٰوة وعلّمه الصبيان والرجال و النساء وكتب ثم ولى ابوبكر سنتين و ستة شهر فغزا فارس والروم وفتح اليمامه وزادت قراة الناس للقرآن ولم يبق بلد الا وفيه المصاحف ثم مات ابوبكر وولى عمر ففتحت بلاد الفرس

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، تو اسلام سارے جزیرۂ عرب میں پھیل چکا تھا۔ بحرِ قلزم سے لے کر ساحلِ یمن تک اور بحر فارس سے فرات تک اور اس جزیرہ میں بے شمار شہر اور گاؤں بسے ہوئے تھے مثلاً یمن بحرین وغیرہ جہاں کے تمام باشندے اسلام لا چکے تھے ، جنھوں نے مسجدیں بنا لی تھیں اور کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں نمازوں میں قرآن نہ پڑھا جاتا ہو ، بچے ، مرد اور عورتیں سب ہی اس کو حاصل کرتے تھے اور وہ لکھا بھی جاتا تھا، پھر حضرت ابوبکرؓ ڈھائی برس خلیفہ رہے ، انہوں نے فارس و یمن پہ حملے کئے ، یمامہ فتح کیا اور قرآن کی قراۃ لوگوں میں زیادہ پھیلی ۔ کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں قرآن کے نسخے نہ ہوں ۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ایران کے طول وعرض اور پورے شام و مصر کو فتح کیا ۔ ان ملکوں میں بھی کوئی شہر ایسا نہ تھا، جہاں مسجدیں نہ بنی ہوں اور قرآن مجید کے نسخے نہ لکھے گئے ہوں ۔ مساجد کے

طولاً وعرضاً وفتحت الشام کلها والجزیرۃ ومصر کلها ولم یبق بلد الا وبنیت فیه المساجد ونسخت فیه المصاحف وقراء الائمۃ القرآن وعلمہ الصبیان فی المکاتب شرقاً وغرباً وبقی کذلک عشرۃ عوام واشهراً .... وان لم یکن عند المسلمین اذ مات عمراً مائۃ الف مصحف من مصر الی العراق الی الشام الی الیمن فما بین ذٰلک فلم یکن اقل۔

(کتاب الفصل جلد ۲ ص ۷۸)

امام قرآن پڑھتے تھے۔ لڑکے مکتبوں میں شرق سے غرب تک قرآن حاصل کرتے تھے۔ یہ حالت دس برس اور چند ماہ رہی اور جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا ہے، اس وقت مصر سے لے کر عراق و شام و یمن وغیرہ میں قرآن مجید کے کم سے کم ایک لاکھ نسخے رہے ہوں گے۔

۱۰۔ ملا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلّم الثبوت میں لکھتے ہیں:

اجمع اھل الحق علی ان ترتیب آی کل سورۃ توقیفی بامر اللہ وبامر رسول .... والمحققون علی ان ترتیب السور من امر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔

(کتاب مذکور جلد ۲ ص ۱۱ و ۱۲)

اہل حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہے اور محققین کا مذہب یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔

۱۱۔ مولوی سید محمد صاحب مجتہد شیعی تنزیہہ الفرقان میں مولوی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے نقل کرتے ہیں:

ان القرآن کان علی عھد رسول اللہ مجموعاً مولفاً علی ما ھو علیه الآن۔

یعنی قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طرح مرتب اور لکھا ہوا تھا، جیسا کہ وہ آج ہے۔

(ملاحظہ ہو تاریخ القرآن مولفہ مفتی عبد اللطیف صاحب ص ۱۰۱ مطبوعہ رحمانیہ مونگیر)

۱۲۔ محمد بن الحسن حر عاملی شیعی لکھتے ہیں:

"ہر کسے کہ تتبع اخبار و تفحص تواریخ و آثار نمودہ بعلم یقینی میداند کہ قرآن درغایت و اعلیٰ درجہ تواتر بودہ و آلات صحابہ بحفظ و نقل می کردند، آں در عہد رسولِ خدا مجموع و مولف بود۔

("تاریخ القرآن ص ۱۰۴)

یعنی جس کسی نے بھی تاریخ و احادیث پر غور کیا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ قرآن تواتر کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔ ہزاروں صحابی اس کو یاد بھی کرتے تھے اور دوسروں تک پہنچاتے بھی تھے اور یہ کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب طور پر لکھا ہوا تھا۔

غرض عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب اور اس کی کتابی تدوین ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن تین روایتیں ایسی ملتی ہیں، جن سے اس بارہ میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے آیندہ سطور میں

اس پر بحث کرکے ان کی حقیقت ظاہر کی جائے گی۔

۱۔ پہلی روایت ابن شہاب زہری سے مروی ہے، جو صحیح بخاری میں تین جگہ آئی ہے۔ تفسیر سورہ توبہ میں فضائل قرآن کے باب جمع القرآن میں اور کتاب الاحکام کے باب یستحب للکاتب ان یکون امیناً عاقلاً میں صحیح بخاری کے علاوہ جامع ترمذی تفسیر سورہ توبہ میں بھی یہ روایت ہے۔ لیکن صحیح بخاری کی تینوں روایتیں اور ترمذی کی روایت سب کی سب ابن شہاب زہری عن عبید بن السباق سے مروی ہیں۔ بخاری کی سند میں زہری تک دو دو واسطے ہیں۔ پہلی عن ابی الیمان عن شعیب، دوسری عن موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراہیم ابن سعد تیسری عن محمد بن عبید اللہ ابی ثابت عن ابراہیم بن سعد۔ ترمذی کی روایت میں زہری تک تین واسطے ہیں۔ عن محمد ابن بشار عن عبدالرحمٰن بن مہدی عن ابراہیم بن سعد، غرض تمام طرق کا مدار زہری پر ہے، جو عبید بن السباق سے اس کو روایت کرتے ہیں۔ محدثین نے کسی روایت کو جانچنے کے دو قاعدے مقرر کیے ہیں۔ پہلا باعتبار سند، دوسرا باعتبار درایت و عقل۔ اس لیے ان روایتوں کا متن نقل کرکے انہی کے قواعد کی روشنی میں ان پر بحث کی جائے گی۔ روایت یہ ہے:

عن زید ابن ثابت قال بعث الی ابوبکر لمقتل اھل الیمامة وعندہ عمر فقال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القرآن وانی اخشی ان یستحر القتل بقراء القرآن فی المواطن کلھا فیذھب قرآن کثیر وانی اری ان تامر بجمع القرآن فقلت کیف افعل شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عمر ھو واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی فی ذٰلک حتّٰی شرح اللہ صدری للذی شرح لہ صدر عمر و رأیت فی ذٰلک الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر وانک رجل شاب عاقل لانتھمک قد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القرآن فاجمعہ قال زید فواللہ لو کلفنی نقل جبل من الجبال ماکان باثقل علی مما کلفنی من	یعنی زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یمامہ میں قتل کے واقعہ کے بعد مجھ کو حضرت ابوبکرؓ نے بلا بھیجا۔ حضرت عمرؓ بھی ان کے پاس تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ نے آکر مجھ سے کہا کہ یمامہ میں قرآن کے قاری بہت قتل ہو گئے ہیں۔ اگر لڑائیوں میں قرآن کے قاری اس طرح زیادہ قتل ہوتے رہے، تو بہت سا قرآن ضایع ہو جائے گا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: میں کیسے وہ کام کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے۔ عمرؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے۔ عمرؓ مجھ سے اس بارے میں برابر گفتگو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لیے کھول دیا، جس کے لیے عمرؓ کا سینہ کھولا تھا اور عمرؓ کی طرح میری سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ زیدؓ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم جوان عقلمند ہو اور تمہارا دامن بھی اتہام سے پاک ہے۔ تم

جمع القرآن قلت کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول الله قال ابوبکر هو و الله خیر فلم یزل یحث مراجعتی حتی شرح الله صدری للذی شرح الله صدر ابی بکر و عمر و رأیت فی ذٰلك الذی رآیا فتتبعت القرآن اجمعه من العسب والرقاع و اللخاف و صدور الرجال فوجدت اٰخر سورة التوبه "لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ" مع خزیمة او ابی خزیمة

(صحیح بخاری جلد ۳ ص ۹ ۱۴،۱۵۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی تھے۔ اس لیے قرآن تلاش کرکے جمع کرو۔ زید کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کو ہٹانے پر بھی وُہ مامور کرتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ گزرتا، جتنا قرآن کا جمع کرنا میرے لیے گراں تھا۔ میں نے کہا آپ دونوں ایسا کام کرنا چاہتے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے، اور برابر اس بارے میں مجھ سے گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لیے کھول دیا، جس کے لیے ابوبکرؓ و عمرؓ کا کھولا تھا اور میں نے بھی وہی سمجھ لیا، جو انہوں نے سمجھا تھا، چنانچہ میں نے کھجور کی چھالوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں نیز اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کی تلاش شروع کر دی تو سورۂ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملیں۔

صحیح بخاری کی اس روایت میں، جو تین جدا جدا مقامات پر آئی ہے، الفاظ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے، جس کو اصطلاحِ محدثین میں اضطراب کہتے ہیں۔ اضطراب کی وجہ سے حدیث کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ وہ اختلاف یہ ہے:

بخاری کی روایت ابراہیم سے	بخاری کی روایت شعیب سے	ترمذی کی روایت
۱۔ قد استحر یوم الیمامه بقراء القرآن	۱۔ قد استحر یوم الیمامه بالناس	۱۔ قد استحر بقراء القرآن یوم الیمامه
۲۔ من العسب والرقاع واللخاف و صدور الرجال	۲۔ من الرقاع والاکتاف والعسب و صدور الرجال	۲۔ من الرقاع والعسب واللخاف و صدور الرجال
۳۔ فوجدت اٰخر سورة التوبه مع خزیمة او ابی خزیمة	۳۔ حتی وجدت من سورة التوبة اٰیتین مع خزیمة الانصاری	۳۔ مع خزیمة بن ثابت

۴۔ فالحقتها فی سورتها	۴۔ شعیب کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں	۴۔ ترمذی میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں۔

یہ اضطراب متن کا ہے، سندیں دیکھا جائے تو حسب ذیل امور قابل بحث ہیں:

۱۔ زہری کے متعلق میزان الاعتدال جلد سوم ص ۱۲۶ میں ہے:

کان یدلس فی النادر۔ کبھی کبھی وہ تدلیس کر جاتے تھے۔

یعنی کسی معاصر سے بغیر سُنے ہُوئے اس طور پر روایت کرنا کہ سُنا ہوا ہونا معلوم ہو یا سُنی ہُوئی بات اس طرح بیان کرنا کہ اسناد کی شناخت نہ ہو سکے۔

اور تہذیب التہذیب جلد نہم ص ۴۴۷ پر ہے:

وقد رأیتین من حدیثه عن غیر الثقات و اما ما اختلفوا فیه فلا یکون خمسین حدیثاً والاختلاف عندنا ما تفردوا به قوم فی شئ۔

یعنی دو سو حدیثیں زہری کی غیر ثقہ لوگوں سے مروی ہیں اور وہ حدیثیں جن میں محدثین نے اختلاف کیا ہے پوری پچاس نہ ہوں گی۔ اور اختلاف کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ جس کو کسی جماعت نے منفرد ہو کر روایت کیا ہو۔

۲۔ زہری کی عادت ادراج، یعنی حدیث میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھا دینے کی بھی تھی۔ چنانچہ آغازِ وحی والی حدیث میں "تحنث" کے بعد" وہو التعبد" ان کا ادراج ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جلد اوّل ص ۱۲ اور تدریب الراوی ص ۹۶)

توجیہہ النظر ص ۱۷۲ پر ہے:

والادراج بجمیع اقسامه محذوراً قال السمعانی من تعمد الادراج فهو ساقط العدالة وقد استثنٰی بعضهم من ذٰلك ما ادرج لتفسیر غریب و قد فعله الزهری۔

یعنی ادراج کی تمام قسمیں منع ہیں۔ سمعانی کہتے ہیں جو شخص قصداً ادراج کرے، اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اس ادراج کو مستثنیٰ کیا ہے، جو کسی نادر لفظ کی تشریح کے لیے ہو اور ایسا ادراج زہری نے کیا ہے۔

۳۔ زہری اس روایت میں منفرد ہیں۔ کیونکہ اور کسی نے اس واقعہ کو روایت نہیں کیا ہے۔ تفرد بھی ضعف کا باعث ہے اور زہری کی اس روایت میں ادراج اور تدلیس اور تفرد یہ سب باتیں موجود ہیں، جس سے یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

۴۔ دُوسرے راوی ابراہیم بن سعد کی بابت میزان الاعتدال جلد اوّل ص ۱۷ پر ہے:

ذکر عند یحیٰی ابن سعید عقیل و ابراهیم فجعل کانه یضعفهما۔

یعنی یحییٰ بن سعید کے سامنے عقیل اور ابراہیم کا ذکر ہُوا تو انہوں نے ان دونوں کو ضعیف بتلایا۔

۵۔ عبید بن السباق، جو اس واقعہ کو زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں، ان کے نہ سنہ ولادت کا پتا چلتا ہے اور نہ سنہ وفات کا۔ تہذیب التہذیب، جو اسماء الرجال کی سب سے بڑی کتاب ہے، اس میں ان کا ذکر صرف چند سطروں میں ہے اور وہ بھی اس طور پر کہ جن لوگوں سے انہوں نے روایت کی اور جن لوگوں نے ان سے روایت کی، ان کے نام لکھ دیے ہیں، خود ان کی ذات کے متعلق صرف دو لفظ لکھے ہیں:

الثقفی المدنی۔ یعنی قبیلہ ثقیف کے اور مدینہ کے رہنے والے ہیں۔

۶۔ سورہ توبہ کی آخری آیتوں کا خزیمہ یا ابو خزیمہ سے ملنے کا بیان بھی شک کے ساتھ ہے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ اور شک موجب ضعف ہے۔ یہ تو اس روایت کی روایتی حیثیت ہے۔ درایتی حیثیت یہ ہے کہ:

۱۔ تفرد اور خبر احاد ہونے کی وجہ سے تواتر کے مقابلہ میں ناقابل قبول ہے کیونکہ تواتر سے یہ ثابت ہے کہ عہد نبویؐ ہی سے پورا قرآن مرتب ہو کر بذریعہ تواتر نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لیے اس تواتر کے مقابلہ میں یہ روایت اگر قوی بھی ہوتی، تو بھی معتبر نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ کہ اس میں مذکورہ بالا کمزوریاں بھی موجود ہیں، اس حالت میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ یہ روایت خود زہری کی بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ زید بن ثابتؓ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کیا تھا۔

۳۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی متفرق آیتیں پتھر کے ٹکڑوں، پتوں اور کھجور کی چھال پر لکھی ہوئی تھیں جن کی حفاظت بحیثیت مجموعی غیر ممکن ہے اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ قرآن جیسی اہم چیز اس طرح پراگندہ پڑی ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا ہو۔ یہ چیز بلّغ ما انزل الیک کے بھی خلاف ہے، کیونکہ تبلیغ کامل کی صورت صرف یہی ہے کہ کلام مجید کو مرتب اور محفوظ صورت میں لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ کسی غلل کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ پتوں وغیرہ پر لکھے ہونے کی حالت میں ترتیب سور کا کیا ذکر، ترتیب آیات بھی قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ حالانکہ عہد نبویؐ میں آیات کی ترتیب روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن کی تعلیم کا مکمل انتظام ہونا ثابت ہے اور پراگندہ حالت میں جب کہ پتھر کے ٹکڑوں اور پتوں پر لکھا ہوا تھا اس کی تعلیم کس طرح ممکن ہوتی۔

۴۔ حضرت ابوبکرؓ ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ ہوتے۔ آپ کی مدت خلافت دو برس تین ماہ گیارہ یوم ہے۔ جنگ یمامہ ۱۱ھ کے آخر میں ہوئی ہے۔ اگر زید بن ثابتؓ نے اس جنگ کے بعد قرآن کو جمع کیا اور جیسا کہ اس روایت سے ثابت ہے حضرت ابوبکرؓ ہی کے زمانہ میں اس کو مکمل بھی کر لیا، تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ تقریباً ڈیڑھ سال میں انہوں نے تنہا یہ عظیم الشان کام پورا کر لیا، جو بالکل خلاف عقل ہے کہ تنہا ایک شخص اتنے بڑے کام کو جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے بھی زیادہ سخت ہے، اتنی تھوڑی سی مدت میں مکمل کر لیا۔ اس کام کی دشواری کا بیان خود روایت میں بھی موجود ہے۔

۵۔ عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے اہم اور مشکل کام کو تنہا ایک شخص کی سپردگی میں دیا ہوگا، جب کہ قرآن کے

شغف رکھنے والے اور بہت سے صحابہ بلکہ ان سے بہتر زندہ موجود تھے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوالدرداؓ وغیرہما، جن کے اسماء اُوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام حفاظ اور کتابِ صحابہ کی پُوری جماعت کے سپرد کیا جاتا، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے کہیں کم اہم یعنی نقلِ مصاحف کا کام ایک جماعت کے سپرد کیا تھا۔

۶۔ اس روایت کا یہ بیان بھی کہ جنگِ یمامہ میں بکثرت قاری شہید ہُوئے، واقعہ کے خلاف ہے۔ یوں تو اس زمانہ میں ہر مسلمان قاری و حافظ تھا، اس لیے جتنے بھی مسلمان شہید ہُوئے، سب قاری اور حافظ رہے ہوں گے، لیکن یہ لوگ اس پایہ کے نہ تھے کہ ان کی شہادت سے قرآن کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ ان میں کم تھے۔ مشہور قراء میں سے سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہ اس جنگ میں شہید ہُوئے اس لیے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا سبب قراء کی شہادت کو قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

۷۔ قرآن مجید کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتے، جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تھا، تو آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ اور خلفاء کا اوّلین فرض یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ اس کے کہ کسی جنگ میں قراء شہید ہُوئے ہوں یا نہ ہُوئے ہوں، قرآن کی جمع و ترتیب کا فرض انجام دیتے۔ کیونکہ قراء کی شہادت اگر نہ بھی ہوتی تو بھی موت سے کس کو مفر ہے۔ ایسی حالت میں صرف حفاظِ قرآن کی موت ہی کے اندیشہ سے یہ فرض تھا کہ صحابہ اس کو جمع و مرتب کر کے اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دیتے، جس طرح حفاظِ قرآن کو خلفاء نے جا بجا بھیجا تھا۔

۸۔ جمع و ترتیب قرآن مجید کے بارہ میں اگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور زیدؓ بن ثابت کی یہ ردوکد صحیح مان لی جاتے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب سے بے خبر تھے۔ حالانکہ خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ متعدد صحابہ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کر لیا تھا اور عقل اس کو باور نہیں کرسکتی کہ قرآن جمع ہوگیا ہوتا، اور یہ حضرات بے خبر رہتے۔

۹۔ سورۂ براۃ کی آخری آیتوں کا صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملنا خود صحیح بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ:

عن البراء قال اخر سورة نزلت كاملة براۃ۔" (بخاری جلد۲ ص ۹۴ و جلد۳ ص ۴۸) — یعنی قرآن کی آخری سورہ، جو مکمل نازل ہُوئی، سورۂ براۃ ہے۔

اور جب یہ سورۃ پوری نازل ہُوئی، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آخری آیتیں گم ہو گئی ہوں اور محض ایک شخص کے پاس ملی ہوں، اور تاریخی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حجاج کے مجمع میں پوری سورۂ براۃ پڑھ کر سُنائی تھی۔ (صحیح بخاری جلد سوم ص ۸۴، ۸۵)

اب اس سلسلہ کی دوسری روایت کو، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب سور میں صحابہ کا ہاتھ تھا، بہ نظر نقد دیکھنا چاہیے۔ یہ روایت ترمذی میں ہے:

حدثنا محمد ابن بشار نا یحیٰی ابن سعید و محمد ابن جعفر و ابن ابی عدی و سھل ابن یوسف — یعنی حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورہ انفال کو جو مثانی سے ہے

قالوا نا عوف ابن ابی جمیلة ثنی یزید الفارسی عن ابن عباس قال قلت لعثمان ابن عفان ما حملکم ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی والی براۃ وھی من المئین فقرنتم بینھما ولم تکتبوا بینھما سطر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ووضعتموھا فی السبع الطوال ما حملکم علیٰ ذٰلک فقال عثمان کانت الانفال من اوائل ما نزلت بالمدینة وکانت براۃ من آخر القرآن وکانت قصتھا شبیھة بقصتھا فظننت انھا منھا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا انھا منھا فمن اجل ذٰلک قرنت بینھما فلم اکتب بینھما سطر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و وضعتھا فی السبع الطوال۔

اور سورۂ براۃ کو جو مئین سے ہے، کیوں ملا دیا۔ اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ سورۂ انفال مدینہ میں پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں ہے اور سورۂ براۃ آخر میں نازل ہوئی اور دونوں کا مضمون ملتا جلتا ہے، اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ دونوں ایک ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا اور آپ نے یہ نہیں تبلایا کہ براۃ انفال کا جزء ہے۔ اس لیے میں نے دونوں کو ملا دیا۔ اور بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔

(ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۴)

اس روایت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ نے دی مگر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل صحابہ کا تھا جب ہی حضرت عثمانؓ نے سورۂ انفال اور براۃ کو ملا دیا۔

اس روایت کی تنقید بھی سنداً اور درایتاً دونوں کے اعتبار سے ضروری ہے۔ سند کے اعتبار سے اس میں یہ خرابی ہے کہ تمام طرق عوف ابن ابی جمیلہ سے چلتے ہیں۔ عوف کے علاوہ کسی اور راوی نے اس کو روایت نہیں کیا۔ اور اس کا یہ حال ہے کہ ابن مبارک نے اس کو قدری شیعی کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ہشتم ص ۱۶۷)

پھر اسی کتاب میں اسی صفحہ پر میزان الاعتدال کے حوالہ سے اس کو رافضی لکھا ہے ایک اور خرابی اس روایت میں یہ ہے کہ یزید الفارسی مجہول شخص ہے چنانچہ تہذیب التہذیب جلد یازدہم صفحہ ۳۷۴ میں ہے کہ:

یحییٰ ابن سعید لم یعرفہ۔

یعنی یحییٰ بن سعید جیسا فن رجال کا ماہر شخص اس یزید فارسی کو نہیں جانتا۔

درایت کے اعتبار سے حسب ذیل امور اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں:

پہلی تو یہی بات ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی بذریعہ تواتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ روایت اس کے خلاف ہے۔

دُوسرے یہ کہ قرآن مجید، جس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا تعالیٰ نے بڑی شد و مد سے فرمایا، کیا وُہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک اسی طرح چلتا رہا کہ لوگوں کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ سورۂ انفال اور سورۂ براۃ دو ہیں یا ایک؟ عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ اتنے زمانہ تک مسلمان اس سے ناواقف رہے ہوں۔ حالانکہ دوسری صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ دونوں جداگانہ سورتیں ہیں۔ سورۂ براۃ کے تمام و کمال ایک ساتھ نازل ہونے اور مجمع حجاج میں اس کی تلاوت کی روایت صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب دونوں سُورتیں جُداگانہ ہیں تو ان کے بیچ میں دُو سورتوں کی طرح بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دُو سورتوں کے بیچ میں بسم اللہ کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور بحکمِ الٰہی ترتیب دینے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کسی تیسرے کو اس میں دخل نہیں ہے ایسی حالت میں کوئی شخص اس کا سبب نہیں جان سکتا اور یہ معاملہ بھی حروف مقطعات کی طرح رموز قرآنی میں ہے۔

تیسری روایت حضرت حذیفہؓ کی ہے، جس سے چند امور خلافِ تواتر ظاہر ہوتے ہیں۔ وُہ روایت یہ ہے:

حدثنا موسٰی حدثنا ابراهیم حدثنا ابن شهاب ان انس ابن مالك حدثه ان حذیفة ابن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اهل الشام فی فتح آرمینیة اذربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القرأة وقال حذیفة لعثمان یاامیرالمؤمنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصارٰی فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیك فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید ابن ثابت وعبداللہ ابن الزبیر وسعید ابن العاص وعبدالرحمن ابن الحارث ابن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان لرهط القرشیین الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزید ابن ثابت فی شیء من القرآن فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق قال	یعنی زہری انس سے روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمان جو فتح آرمینیا اور آذربائیجان میں شامل تھے قرآن کی قرأت میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے اور واپس ہو کر حضرت عثمانؓ سے کہا امیرالمؤمنین قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے اندر بھی ویسا ہی اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ یہود و نصارٰی کے درمیان ہے۔ اس امت کی خبر لیجیے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے صحیفے منگوائے (یعنی زید بن ثابتؓ کا جمع کیا ہوا قرآن بزمانہ حضرت ابوبکرؓ) اور کہلا بھیجا کہ اس کی نقلیں لے کر واپس کر دیں گے۔ اور ایک مجلس زید بن ثابت اور تین قریشی صحابہ کی مرتب کر کے نقل کا کام ان لوگوں کے سپرد کر دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ جہاں کہیں انصاری اور قریشیوں میں اختلاف ہو، تو قریش کے محاورہ کو ترجیح دی جائے۔ ان حضرات نے نقلیں کریں اور حضرت عثمانؓ نے اصل حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا اور نقلوں میں سے ایک ایک نسخہ ہر ملک میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ قرآن کے دُوسرے نسخے جلا دیئے جائیں ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ سے زید بن ثابت کے بیٹے

ابن شہاب واخبرنی خارجۃ ابن زید ابن ثابت سمع زید ابن ثابت قال فقد اٰیۃ من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقراء بہا فالتمسناھا فوجدناھا مع خزیمۃ الانصاری من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فالحقناھا فی سورتہا فی المصحف ۔ (بخاری جلد ۲ ص ۷۴۰)

خارجہ نے بیان کیا کہ اُن کے والد کہتے تھے کہ نقل کرتے وقت سورہ احزاب کی آیت من المومنین رجال الخ مجھ کو نہیں ملی۔ حالانکہ میں یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا۔ جب ہم نے اس کو تلاش کیا، تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری رضؓ کے پاس ملی اور ہم نے اس کو اس کی سورت میں شامل کر دیا۔

اس روایت سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن مجید کی قرأۃ میں دور دراز کے ممالک میں اس قدر اختلاف پیدا ہوگیا تھا، جس کو دیکھ کر حضرت حذیفہ سخت پریشان ہوگئے تھے اور حضرت عثمانؓ کو اس کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی اور یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا، تو قرآن میں بھی یہود و نصاریٰ کی کتب سماویہ کی طرح اختلاف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

دُوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا تدارک حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے والے قرآن کی نقلیں کرا کے دور دراز ممالک میں بھیج دیں اور اس نقل میں اختلاف کو اس طرح رفع کیا کہ صرف قریش کے محاورہ پر نقل کی بنیاد رکھی۔

تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے والے مصحف میں ایک آیت سورۂ احزاب کی درج نہ تھی، جس کا احساس زیدؓ بن ثابت کو عہد صدیقی میں نہ ہوا تھا اور عہد عثمانی میں نقل کے وقت اس کا احساس ہُوا۔ مجلس ناقلین میں سے اس احساس میں وہ منفرد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اور ان کے ساتھ دوسرے ناقلین نے اس آیت کی تلاش شروع کی اور آخر کار خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس وُہ آیت ملی اور اس کو قرآن مجید میں اس کی جگہ شامل کر دیا گیا۔

اس روایت پر بھی سنداً اور درایۃً تنقید ضروری ہے۔ اس کی روایتی حیثیت یہ ہے کہ اس کے راوی بھی ابراہیم اور ابن شہاب زہری ہیں، جن کے متعلق تفصیل کے ساتھ اوپر بحث ہو چکی ہے۔ اور اس تنقید میں ان تمام امور پر نظر ڈالنی ضروری ہے، جو اس روایت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی بات قرآن مجید میں عظیم الشان اختلاف کا پایا جانا ہے حالانکہ عہد رسالت سے لے کر عہد عثمانی اور اس کے بعد کے تمام زمانوں میں قرآن مجید کی جمع و تدوین اور تعلیم و اشاعت میں جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا اور جس تواتر سے وہ نقل ہوتا چلا آیا تھا اس کے بعد کسی ایسے بڑے اختلاف کا پایا جانا غیر ممکن ہے، جسے دیکھ کر حضرت حذیفہؓ گھبرا جائیں اور جس سے یہود و نصاریٰ کے سے اختلاف کا ان کو اندیشہ ہو۔

دوسرے قرآن تو قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہی ہُوا تھا اور اس کے تحفظ اور اسی شکل میں اس کو مسلمانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اور اس کو بغیر کسی تغیر کے قایم رکھنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر تھی۔ اس لیے اس کو بدلنے کی جرأت کون کر سکتا تھا۔

تیسری بات یعنی سورۂ احزاب کی ایک آیت کا نقل کے وقت پہلے نسخہ میں نہ ملنا سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جمع قرآن والی روایت میں بھی اسس کا ذکر ہے کہ چند آیتیں جو کہیں مل نہیں رہی تھیں، بمشکل ملیں، وہ سورہ براۃ کی آخری آیتیں تھیں۔ اور اس روایت میں بتلایا گیا ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت نقل کے وقت نہیں مل رہی تھی۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ پہلے بھی انھیں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع و کتابت کا کام کیا تھا، اس وقت سورۂ براۃ کی آخری آیتیں نہیں مل رہی تھیں اور سورہ احزاب والی آیت یا تو اس وقت گم نہ تھی یا ان کو اس وقت اس کا احساس نہیں ہوا۔ اگر گم نہ تھی تو بعد میں کیسے اس صحیفہ سے گم ہو سکتی تھی، جو خود انہی کا ترتیب دیا ہوا اور انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا حفاظت کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس آیت کے گم ہونے کا ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ترتیب دیتے وقت احساس نہیں ہوا، تو یہ بھی غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسا حافظ سورۂ احزاب کی اس آیت سے پہلی دفعہ غافل ہو اور پہلی ترتیب کے سالہا سال بعد پھر جب نسخہ ان کے سامنے لایا جائے تو اس وقت احساس ہو اس لیے عقلاً اس روایت کا یہ ٹکڑا محال معلوم ہوتا ہے اور اگر ان روایتوں کو جو تواتر کے خلاف ہیں، صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو قرآن پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اب بھی اس میں سے کچھ غائب ہو، جو وعدۂ الٰہی انا لہٗ لحافظون کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ان روایتوں کا مضمون اہل السنۃ والجماعۃ کے عقاید کے خلاف ہے۔ اس لیے قرآن کے تواتر کے مقابلہ میں یہ روایتیں نا قابل اعتبار ہیں اور روایت و درایت کے رو سے بھی غیر معتبر ہیں۔ ان تین روایتوں کے علاوہ بعض اور روایتیں بھی اختلاف قراۃ اور اختلاف ترتیب کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سب کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وہ اخبار احاد ہیں، جو تواتر کے مقابلہ میں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ اگر خدا کو منظور رہے تو پھر کسی وقت ان روایتوں کی بھی تنقید پیش کی جائے گی۔

واللہ ھو الموفق للصواب والیہ المرجع والمآب اللّٰھم احفظنا من العقاید الباطلۃ و آراء اھل الاھواء الفاسدۃ۔

پہلے سیرت نگار ــــ حضرت عروہ بن الزبیر

تحریر : خلیل ابراھیم　　ترجمہ : محمد اجمل اصلاحی

حضرت عروہ بن الزبیر کا شمار مدینہ کے مشہور فقہاء اور سیرت و مغازی کے اولین مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کے جو آثار ہم تک پہنچے ہیں وہ قدیم ترین اور مستند ترین تاریخی تحریروں کا نمونہ ہیں۔ جس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ان کے خاندان کو معاشرہ میں جو ممتاز مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے عہد رسالت اور صدر اسلام کے بہت سے واقعات سے قریبی واقفیت کا انھیں موقع ملا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی تعلیم و تعلم کے لیے وقف کر دی تھی اور اس علمی زندگی پر نہ صرف یہ کہ قانع تھے بلکہ اسی کے آرزو مند بھی تھے۔ گویا اس وقت ہمارا تعارف علم کے ایک شیدائی سے ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مقالہ کی روشنی میں حضرت عروہ کی شخصیت عربوں کے یہاں، خصوصاً سیرت اور مغازی کے میدان میں، باقاعدہ تاریخ نگاری کے ایک بانی اور پیش رو کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔

حالاتِ زندگی

حضرت عروہ کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ سنہ ۲۲ھ، سنہ ۲۶ھ اور سنہ ۲۹ھ کی روایتیں ہیں[1] ایک اور روایت سنہ ۲۳ھ کی ہے[2] عبدالعزیز دوری[3] نے ان تمام روایتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد موخر الذکر کو ترجیح دی ہے۔ دلیل میں وہ روایت پیش کی ہے جس کے مطابق جنگِ جمل (سنہ ۳۶ھ) کے روز حضرت عروہ کی عمر تیرہ سال تھی۔ مجھے عبدالعزیز دوری کی رائے سے اتفاق ہے اور میرے نزدیک خلیفہ بن خیاط[4] نے درست لکھا ہے کہ حضرت عروہ سنہ ۲۳ھ یعنی عہد فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔

حضرت عروہ کا نسب یہ ہے: عروۃ بن الزبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب القرشی الاسدی[5]
عروہ کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں اپنے نسب پر فخر تھا[6]

حضرت عروہ کے نشوونما اور ان کی سیرت کی تعمیر میں ان کی عالی نسبی اور ماحول کا بڑا دخل معلوم ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت فہم دین اور روایت حدیث میں انھیں وہ رتبۂ بلند ملا کہ مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں ان کا شمار ہوا[7] یہی نہیں بلکہ سیرت نبوی، غزوات اور خلفائے راشدین کے دور سے متعلق واقعات کا ایک بڑا سرمایہ انھیں کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے۔

حضرت عروہ کی پیدائش جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مدینہ میں ہوئی۔ یہیں وہ پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ پھر مصر کا سفر کیا اور وہاں کی خود علمی کی ایک خاتون سے شادی کی سات سال تک مصر میں مقیم رہے[۸] کئی بار دمشق بھی گئے۔ عبد الملک بن مروان اور ولید بن عبد الملک کے دربار میں بھی تشریف لے گئے۔ ولید ہی کی مجلس میں آکلہ کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا[۹]

حضرت عروہ کی تمام تر توجہ علم اور دین پر مرکوز تھی اور انھیں دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر تھی۔ اسی وجہ سے اپنے والد حضرت زبیر اور دونوں بھائیوں حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حضرت مصعب بن الزبیر کے برعکس ان کا کوئی سیاسی نصب العین نہیں تھا۔ اس کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو متعدد مورخین نے نقل کی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار حضرات عروہ، ابن عمرؓ، مصعب اور عبدالملک بن مروان جمع تھے، اس مجلس میں تمام حاضرین نے اپنی اپنی آرزوئیں بیان کیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے جنت کی تمنا کی۔ حضرت مصعبؓ نے عراق کی حکومت اور سکینہ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہ سے شادی کا ارمان ظاہر کیا۔ حضرت عروہ نے فرمایا کہ میری تمنا تو یہ ہے کہ دنیا میں زہد کی زندگی گزاروں اور آخرت میں جنت نصیب ہو نیز میرا شمار ان لوگوں میں ہو جن سے علم کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ عبدالملک نے خلافت کی آرزو کی[۱۰]

حضرت عروہ کی تمنا پوری ہوئی اور ان کا شمار ممتاز فقہا اور محدثین میں ہوا۔ امام بخاری نے انھیں "بحر لا ینزف"[۱۱] اور ابن حجر نے ثقہ اور کثیر الحدیث لکھا ہے[۱۲]

جب ان کا پاؤں کاٹا گیا تو کسی نے کہا، بخدا ہم نے تم کو کشتی لڑنے یا دوڑ لگانے کے لئے تیار نہیں کیا۔ ہمیں تم سے جو چیز مطلوب ہے اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا ہے یعنی تمہارا تدبر اور علم[۱۳]

اسی علمی شغف کی وجہ سے عروہ نے فقہ کی کئی کتابیں مرتب کی تھیں لیکن انھیں جلا دیا۔ ان کے بیٹے ہشام کا بیان ہے کہ واقعہ حرہ کے روز ان کے والد نے اپنے فقہی مجموعے نذر آتش کر دیے۔ بعد میں وہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے تھے[۱۴]

علم کی اہمیت اور قدر و قیمت کا یہی احساس تھا جس کی بنا پر اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: علم حاصل کرو کیونکہ اگر کچھ لوگوں میں تم خورد ہوگے تو دوسروں میں تمہیں برتری بھی حاصل ہو سکتی ہے[۱۵]

عروہ کے سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ مورخین نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ ابن خیاط نے ۹۳ھ لکھا ہے[۱۶] ابن قتیبہ اور ابن خلکان کے نزدیک ۹۳ھ اور ۹۴ھ دونوں کا احتمال ہے[۱۷] ابن حجر نے ۹۴ھ کو راجح قرار دیا ہے[۱۸] عبدالعزیز دوری نے لکھا ہے کہ سب سے قدیم اور مستند روایت ۹۴ھ کی ہے[۱۹] لیکن میرے نزدیک روایت کی قدامت اس کی صحت کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہو سکتی۔ دوری نے مذکورہ روایت کی ثقاہت کا ماخذ بھی نہیں لکھا۔ بہرحال ۹۳ھ اور ۹۴ھ دونوں روایتیں ہیں۔ کسی ایک کو راجح قرار دینے کے لیے میری نظر میں کوئی مثبت دلیل موجود نہیں ہے۔

بنو امیہ سے عروہ کے روابط

اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عروہ اپنے والد اور دونوں بھائیوں کے برخلاف سیاسی مقاصد نہیں رکھتے تھے۔ نیز عبدالملک بن مروان سے مدینہ میں ان کا تعلق تھا اور ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے اموی دربار سے اگر ان کے روابط قائم ہوئے تو کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے ماٰخذ میں ان کے سفر دمشق کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایک بار اپنے بھائی عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس ملاقات کا حال ابوالفرج اصفہانی نے ہشام بن عروہ کی زبانی نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ "عروہ جب عبدالملک کے دربار میں پہنچے تو عبدالملک نے انھیں تخت پر بٹھایا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ آئے اور عبداللہ بن الزبیر کو برا بھلا کہنے لگے۔ اس پر عروہ دربان سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے کہ عبداللہ میرے حقیقی بھائی ہیں۔ جب تمہیں ان کا ذکر بد کرنا ہو تو مجھے داخل ہونے کی اجازت نہ دو۔ عبدالملک کو معلوم ہوا تو اس نے عروہ سے کہا: ہم نے آپ کے بھائی کو عداوت کی بنا پر قتل نہیں کیا۔ بلکہ اس نے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہم نے بھی کی۔ اس میں وہ مارا گیا[۱۹] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالملک نے عروہ سے اچھا سلوک کیا اور احترام سے پیش آیا۔ عروہ کی خفگی اہل شام پر تھی اس لئے خلیفہ نے ان سے کہا: "اہل شام کا وطیرہ یہ ہے کہ جب بھی کسی کو قتل کرتے ہیں تو اسے گالیاں دیتے ہیں۔"[۲۰] بلاذری نے لکھا ہے کہ عروہ سے عبدالملک کی عہد پارسائی کی دیرینہ دوستی اور مسجد نبوی کی صحبتوں ہی کا نتیجہ تھا کہ خلیفہ نے انھیں (عروہ) حجاج کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلہ میں احکامات جاری کرنے سے منع کیا۔ اس طرح حکم دیا کہ عبداللہ بن الزبیر کو تختۂ دار سے اتار کر ان کے خاندان کے حوالے کر دے تاکہ وہ ان کی تدفین کر سکیں۔ چنانچہ لاش اتاری گئی اور عروہ نے نماز جنازہ پڑھائی[۲۱]

اسی طرح ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں بھی عروہ کے ایک سفر دمشق کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی سفر میں ان کے بیٹے محمد بن عروہ کی موت کا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ محمد شاہی اصطبل کی چھت سے گر پڑے اور گھوڑوں نے دولتیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔[۲۲] اسی سفر میں عروہ کے پاؤں میں آکلہ ہوا اور کٹوانا پڑا جیسا کہ گذر چکا۔

عروہ کے تاریخی آثار پر جب ہم گفتگو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دربار اموی نے سیرت نبویؐ سے متعلق کئی واقعات کے بارے میں ان سے استفسار کیا اور انھوں نے جواب دیا۔

اگرچہ عروہ بنو امیہ کے مخالف تھے۔ لیکن اس مخالفت کا انھوں نے برملا اظہار نہیں کیا۔ البتہ وہ ظالموں سے دور رہنے کے حق میں تھے۔ اس کا ثبوت بنو امیہ کے مظالم کے بارے میں عروہ اور علی بن حسین بن علی کی وہ گفتگو ہے جو مسجد نبوی میں ہوئی[۲۳] جوزف ہورووٹس نے عروہ کے اس موقف کی توجیہہ یہ کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی آگ بھڑکانے سے بچتے تھے[۲۴]

عروہ کے راوی

عروہ کے حالات زندگی میں آپ نے دیکھا کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مدینہ میں گزرا۔ اسی وجہ سے صحابہ اور ابنائے صحابہ سے ان کا براہِ راست رابطہ تھا۔ اور انھیں سے عروہ کو تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد خصوصاً سیرت نبوی کے واقعات معلوم ہوئے اسی طرح عروہ کے نسب سے ظاہر ہوا کہ وہ جس گھرانے کے چشم و چراغ تھے اس کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت گہرا تھا۔ اسی ماحول اور اسی خاندانی وجاہت نے انھیں شہرت عطا کی اور علم و فضل کے بلند مقام پر سرفراز کیا۔

جن حضرات سے عروہ نے روایت کی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ذیل میں ہم صرف وہ نام درج کرتے ہیں جو ان کی روایتوں میں بار بار آتے ہیں:

والد: زبیرؓ، بھائی: عبداللہ بن الزبیرؓ، والدہ: اسماء بنت ابی بکرؓ، خالہ: عائشہؓ، علیؓ بن ابی طالب، سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل، زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن جعفر، عبداللہؓ بن عباس، عبداللہؓ بن عمر، اسامہؓ بن زید، ابو ایوبؓ، ابوہریرہ، ام سلمہؓ ام المومنین[۲۶]۔

ان رواۃ کی فہرست پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں صحابہ اور ابنائے صحابہ میں سے وہ حضرات شامل ہیں جنھیں تاریخ اسلام میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی بیحد قدر و منزلت تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان حضرات سے عروہ کا گہرا ربط اور شناسائی رہی ہو۔ ان تمام باتوں سے عروہ کی مرویات کی تاریخی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے تاریخی آثار کا شمار جو تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متفرق طور پر ہمیں ملتے ہیں قدیم ترین اور مستند ترین روایات میں ہوتا ہے۔

عروہ کے تاریخی آثار

عروہ کے آثار صرف زبانی روایات ہی پر مشتمل نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی مآخذ میں مدوّن طور پر بھی ملتے ہیں۔ اس طرح کے آثار کا ایک حصہ ان مراسلوں سے عبارت ہے جو دربار اموی کے استفسار پر جواباً تحریر کئے گئے[۲۷]۔

ذیل میں ہم کوشش کریں گے کہ عروہ کے تاریخی آثار کا ایک اجمالی خاکہ آپ کے سامنے آجائے[۲۸]:

۱۔ بعثت، آپ کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی[۲۹] نبوت کی اولیات میں رویائے صادقہ، خلوت[۳۰]، نزول وحی، نزول وحی کے آثار[۳۱]، غار حرا میں عبادت اور آیت "اقرأ باسم ربک ..." الخ (العلق: ۱) کا نزول، رسول اکرمؐ کی گھبراہٹ اور حضرت خدیجہ کا ورقہ بن نوفل کے پاس جانا[۳۲]۔

۲۔ اسلام کی جانب آپ کی خفیہ اور علانیہ دعوت، بت پرستی چھوڑنے کی دعوت، کچھ مردوں اور عورتوں کا قبول اسلام، مسلمانوں پر قریش کی خفگی، اُن کی ایذا رسانی، آنحضرتؐ کا قول: "دنیا میں منتشر ہو جاؤ"۔ مسلمانوں نے دریافت کیا: ہم کہاں جائیں....

اور آپ نے حبشہ کی جانب اشارہ کیا[۳۲] پھر عروہ نے ان اسباب کی جانب اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے آپ نے ملک حبشہ کا انتخاب کیا[۳۳]

۳۔ قریش کی مسلسل مزاحمت۔ عروہ بیان کرتے ہیں کہ قریش نے آں حضرتؐ کے گھر میں گندگی پھینکی[۳۴] اشراف قریش ایک روز جمع ہوئے اور کہا:

"ہم نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے تو ہمیں بے وقوف قرار دیا۔ ہمارے آباؤ اجداد کو گالیاں دیں۔ ہمارے دین پر نکتہ چینی، ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی اور ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہا، ہم تو اس کی وجہ سے عجیب مخمصہ میں پڑ گئے"[۳۵]

ابوطالب کی وفات کے بعد مشرکین کی دلیری اور ایذا رسانی[۳۶]

۴۔ رسول اکرمؐ کی مدینہ ہجرت، وہ حالات جن میں ہجرت پیش آئی[۳۷] مہاجرین کی حالت اور مدینہ میں امراض کا شکار ہونا[۳۸]

۵۔ غزوہ بدر، غزوہ کے اسباب۔ جو مہاجرین و انصار بدر میں شریک ہوئے اور جو مشرکین اس میں مارے گئے ان کی فہرست[۳۹] آنحضرتؐ نے جب مشرکین کا لشکر بڑھتے ہوئے دیکھا تو دعا فرمائی: "اے اللہ تو نے مجھ پر کتاب نازل کی اور مجھ سے دونوں جماعتوں میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کیا اور تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اے اللہ یہ قریش تیری مخالفت اور تیرے رسول کی تکذیب میں بڑے طنطنہ اور غرور سے نکلے ہیں۔ اے اللہ تیری نصرت کا خواستگار ہوں جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا۔ اے اللہ صبح ہوتے انھیں ہلاک کر"[۴۰]

۶۔ غزوہ قینقاع، آیت کریمہ" وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ " (الانفال: ۵۸) کا نزول اور آنحضرتؐ کا یہ آیت لے کر ان کے پاس جانا[۴۱]

۷۔ غزوہ احد، عروہ نے اس غزوہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے[۴۲]۔ غزوہ الرجیع، عروہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب رجیع کو جاسوسی کے لئے مکہ بھیجا تاکہ قریش کے متعلق آپ کو خبر دیں، وہ نجدیہ کے راستہ سے چلے۔ جب رجیع پہنچے تو وہاں بنولحیان سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی[۴۳]

۸۔ بنونضیر کے بارے میں جو آیات نازل ہوئیں، غزوہ مریسیع کی جانب اشارہ۔[۴۴]

۹۔ غزوہ خندق۔ رسول اللہؐ کے بارے میں یہود کا موقف، قریش کی چڑھائی۔ خندق کی کھدائی[۴۵]

۱۰۔ غزوہ بنوقریظہ۔ سعد بن معاذ کا فیصلہ کہ لڑنے والوں کو قتل کیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قید کیا جائے اور ان کے مال و اسباب کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر رسول اللہؐ کا ارشاد کہ تم نے ان کے بارے میں خدائی فیصلہ کیا[۴۶]

۱۱۔ غزوہ بنی المصطلق۔ واقعہ افک کی ایک روایت عروہ سے طبری میں منقول ہے[۴۷]

۱۲۔ صلح حدیبیہ: حج کے لیے آنحضرتؐ کی روانگی، حدیبیہ میں پڑاؤ، صلح کی پیشکش، صلح کی مدت اور اس کی شرطیں۔[۴۸]

۱۳۔ غزوہ موتہ۔ عروہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جمادی الاول ۸ھ میں ایک لشکر موتہ بھیجا اور زید بن حارثہ کو

سپہ سالار مقرر کرکے فرمایا: اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سپہ سالار ہوں۔ بلقاء میں ہرقل کی فوج سے مقابلہ ہوا اور تینوں حضرات بالترتیب شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن الولید نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو دشمن کی زد سے نکال لائے۔[49]

۱۴۔ فتح مکہ، اسباب فتح۔ رسول اللہؐ کے پاس قریش کے سفیر۔ پھر خالد بن الولید کی فتح۔[50]

۱۵۔ غزوہ حنین، اس کے اسباب، حالات، آخر میں مسلمانوں کی فتح۔[51]

۱۶۔ آنحضرت کی طائف روانگی، ثقیف سے جنگ، ثقیفیوں کی آمد اور آں حضرت سے بیعت۔[52]

۱۷۔ زرعہ بن ذی یزن کے نام آنحضرتؐ کا خط "اما بعد، جب تمہارے پاس میرے قاصد معاذ بن جبل اور ان کے رفیق پہنچیں تو جو کچھ صدقہ اور جزیہ تمہارے پاس ہو اسے اٹھا کر دو۔ ...[53]"

۱۸۔ اہل ہجر کے نام آپ کا خط "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد نبی کی جانب سے اہل ہجر کے نام .... اما بعد میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہدایت پانے کے بعد گمراہ نہ ہونا ....[54]"

۱۹۔ بنو کلال، المنذر بن ساوی، اہل یمن، ثقیف، اہل ایلۃ اور خزاعۃ کے نام آپ کے خطوط۔[55]

۲۰۔ اسامہ بن زید کے حملہ کی تیاری۔ آں حضرت کا مرض الموت، وفات، آپ کی عمر۔[56]

تاریخ و حدیث کی کتابوں میں عروہ کی جو روایات منتشر صورت میں ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ کی خصوصی توجہ سیرت نبوی اور مغازی پر تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد کے بارے میں وہ خاموش رہے، اس دور کے جو واقعات عروہ کی زبانی منقول ہیں ان میں بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

عروہ نے ردّہ کی جنگوں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ اسی طرح عہد صدیقی کے متعدد واقعات کی جانب اشارہ کیا ہے۔[57] جنگ یرموک اور جنگ قادسیہ کے بارے میں بھی بعض معلومات ملتی ہیں۔[58] حضرت عمرؓ کے حالات[59]، حضرت عثمانؓ اور ان کی شہادت کا واقعہ[60] اور جنگ جمل کے بارے میں بھی ایک روایت اُن سے منقول ہے۔[61]

عروہ کی ان روایات کی حیثیت ابتدائی خطوط کی سی ہے جو تفصیل و اجمال میں باہم ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں بعض روایات سرسری اشاروں سے عبارت ہیں، جبکہ بعض دوسری روایات بہت مفصل اور مربوط ہیں شلاً غزوۂ بدر، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کی روایتیں غزوہ احد کے بارے میں کوئی قابل ذکر روایت ان سے منقول نہیں ہے۔[62] عبدالعزیز دوری نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ تاریخ طبری میں غزوہ احد سے متعلق ایک اشارہ عروہ سے منقول ہے راقم سطور عرض کرتا ہے کہ واقدی کی مغازی میں بھی اس غزوہ کی جانب خفیف اشارہ عروہ سے نقل کیا گیا ہے۔[63]

عروہ کے تاریخی آثار پر غور کرنے سے چند نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

۱۔ کسی موضوع پر عروہ کی توجہ اور دلچسپی اس کی اہمیت کے اعتبار سے نہیں ہوتی چنانچہ ایک طرف غزوہ بدر اور صلح حدیبیہ کے بارے میں جو تاریخ اسلام کے مہتم بالشان واقعات ہیں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری طرف

غزوۂ احد کے سلسلہ میں جو مقدم الذکر واقعات سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا اجمال اور اختصار سے کام لیتے ہیں اسی طرح قادسیہ اور یرموک کے بارے میں وہ اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲۔ عروہ کی توجہ اصلاً سیرت رسولؐ اور مغازی پر مرکوز رہی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ان کی روایات کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بنو امیہ کے عہد میں یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ عروہ کی توجہ تاریخ سے زیادہ فقہ و حدیث کی جانب مبذول ہو گئی۔

۳۔ عروہ کے سب سے اہم آثار جو ہم تک پہنچے ہیں وہ رسائل ہیں جو عروہ نے عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک اور ولید کے کاتب ہنید کے استفسارات کے جواب میں تحریر کئے تھے۔

عروہ کا طرزِ تحریر

۱۔ اسناد:

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اسناد تحریر کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔ یا کم از کم اس سے تحریر کو علمی رنگ اور عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن پہلی صدی ہجری میں غالباً اسے نہ وہ اہمیت حاصل تھی اور نہ وہ معیار مقرر ہوا تھا جو بعد کی صدیوں میں ہوا۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ تاریخی واقعات پر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اور بہت سے صحابہ اور ان واقعات کے عینی شاہد اور شریک زندہ تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ عروہ کچھ روایات میں تو سند کا ذکر کرتے ہیں[۶۴] مگر بعض روایات میں نظر انداز کر جاتے ہیں[۶۵]۔ ہورووٹس کا خیال ہے کہ "عروہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عائشہؓ سے اخذ کئے ہیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا غلط ہوگا کہ عروہ اسناد کے خلاف تھے۔ اگرچہ ایسی روایات موجود ہیں جن کے راویوں کا ذکر عروہ نہیں کرتے لیکن سند اس دور میں ناگزیر نہیں تھی"[۶۶]۔

۲۔ تحریری دستاویزوں سے دلچسپی:

حضرت عروہ نے تحریری دستاویزوں پر توجہ دی اور ان سے استفادہ کیا۔ مثلاً آنحضرتؐ کے خطوط جو آپ نے حارث بن عبد کلال، شریح بن عبد کلال اور نعیم بن عبد کلال نیز خزاعہ اور زرعہ بن ذی یزن کو تحریر فرمائے[۶۷]۔ ان دوسرے مراسلوں کا بھی اضافہ کر لیجئے جن کا تذکرہ ہم نے عروہ کے تاریخی آثار کے ضمن میں کیا ہے۔ تاریخ نگاری میں آج بھی اس طرز کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔ قرآنی آیات اور اشعار سے استشہاد:

عروہ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جب عہد نبویؐ کے واقعات بیان کرتے تو قرآنی آیات سے استشہاد کرتے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کو قریشی جو اذیتیں پہنچاتے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

"أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ" (غافر: ۲۸)

اسی طرح آیت کریمہ :

"ولتجدنّ أقربهم مودّة للذين آمنوا الذين قالوا إنّا نصارى (المائدہ : ۸۲) کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہیں[۴۸] غزوہ بنی قینقاع کا تذکرہ کرتے ہیں تو آیت "وإمّا تخافنّ من قوم خيانة ..... " (الانفال : ۵۸)
کی تلاوت کرتے ہیں[۴۹] ولید بن عبدالملک کا کاتب ہنید جب ارشاد باری :

"يا أيّها الذين آمنوا إذا جاءكم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهنّ" (الممتحنہ : ۱۰) کا مفہوم دریافت
کرتا ہے تو عروہ ان حالات پر روشنی ڈالتے ہیں جن میں آیت کا نزول ہوا۔ اس کے بعد آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں[۵۰]
جہاں تک اشعار سے استشہاد کا تعلق ہے تو ان کی روایات میں یہ اشعار کبھی تو خود ان کی زبان پر جاری ہوتے
ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حجاج کی جنگ پر عروہ نے یہ رجز پڑھا[۵۱]

أبى الحواريون إلّا محمدًا ..... من يقتل اليوم يلاق رشدا[۵۲]

اور کبھی واقعات میں شریک افراد سے منقول ہوتے ہیں مثلاً مدینہ ہجرت کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت
بلالؓ جب سخت بیمار ہوئے تو عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی زبان پر یہ رجز تھا[۵۳]

كلّ امرئ مصبّح في أهله ..... والموت أدنى من شراك نعله

اور حضرت بلالؓ یہ شعر پڑھ رہے تھے[۵۴]:

ألا ليت شعري هل أبيتنّ ليلة ..... بفخ وحولي إذخر وجليل

وهل أردن يومًا مياه مجنّة ..... وهل يبدون لي شامة وطفيل[۵۵]

عبدالعزیز دوری لکھتے ہیں کہ مدینہ کے ماحول میں جہاں شاعری کو تہذیب و ثقافت اور واقعات و اخبار میں
بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ اسلوب بالکل فطری اور قدرتی تھا[۵۶]

۴۔ تاریخ نگاری میں عروہ کا نہج :

تاریخی واقعات کو پیش کرنے میں عروہ کا انداز معلوم کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس مراسلہ کے بعض اقتباسات
درج کر دیے جائیں جو عروہ نے غزوہ بدر کے متعلق عبدالملک بن مروان کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا[۵۷]

"أمّا بعد فإنّك كتبت إليّ في أبي سفيان ومخرجه تسألني كيف كان شأنه؟ إنّ أبا سفيان بن
حرب أقبل من الشام في قريب من سبعين راكبًا من قبائل قريش كلّها كانوا تجارًا بالشام
فأقبلوا جميعًا معهم أموالهم وتجارتهم فذكروا لرسول الله صلّى الله عليه وسلّم وأصحابه

وقد كانت الحرب بينهم قبل ذلك ..... فلمّا سمع بهم ندب أصحابه وحدّثهم بما معهم من الأموال
وبقلّة عددهم فخرجوا لا يريدون إلّا أبا سفيان والركب معه لا يرونها إلّا غنيمة لهم لا يظنّون
أن يكون كبير قتال إذا لقوهم، وهي التي أنزل الله عزّ وجلّ فيها (وتودّون أنّ غير ذات الشوكة تكون لكم)
(الانفال : ۷)

فلما سمع ابوسفیان أنّ أصحابَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم معترضون له بعث إلی قریش....
فلما أتی قریش الخبر...... (غزوہ جنگ کے لیے قریش کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں)
ولم یسمع بنفرة قریش رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولا أصحابه حتی قدم النبی صلی اللّٰه علیه وسلم
بدرًا...... (پھران کی تعداد ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں) فزعموا أنّ النبی قال: القوم ما بین التسعمائة
الی الألف...... فالتقوا هم والنبی ففتح اللّٰه علی رسوله وأخزی ائمة الکفر وشفی صدور المسلمین منهم۔

اس مراسلہ کا جائزہ لیجئے تو عروہ کے اسلوب تحریر کے بارے میں درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ عروہ نے جواب کے آغاز ہی میں پہلے سائل کا سوال ذکر کیا اس کے بعد جواب دیا۔
۲۔ عروہ کا اسلوب سادہ، بے تکلف اور سجع اور غریب و نامانوس الفاظ سے پاک ہے۔
۳۔ تمہیدی باتیں بھی بیان کی ہیں۔ چنانچہ غزوہ بدر اور اس سے پہلے کے واقعات میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے: "وقد کانت الحرب بینهم قبل ذلک"
۴۔ غزوہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آیات سے استدلال کیا ہے۔ اس نکتہ کی جانب گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔
۵۔ جب کسی بات میں شک ہوتا ہے یا مطمئن نہیں ہوتے تو "زعموا" کے لفظ سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ جنگ بدر میں قریش کی تعداد کے تذکرہ میں آپ نے دیکھا۔

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان: ج ۲ قاہرہ، ۱۹۴۸ء ص ۱۱۱
۲۔ العسقلانی، ابن حجر، تہذیب التہذیب، ج ۲ حیدرآباد ۱۳۲۶ھ ص ۱۸۳
۳۔ الدوری، عبدالعزیز، نشأة علم التاریخ عند العرب بیروت ۱۹۶۰ء ص ۶۲
۴۔ ابن خیاط، خلیفہ، التاریخ، ج ۱ دمشق ۱۹۶۷ء ص ۱۵۹
۵۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۵ بیروت ۱۹۵۷ء ص ۱۷۸
۶۔ الجاحظ، عمرو بن بحر، البیان والتبیین، ج ۱، ص ۱۸۰، البلاذری، انساب الاشراف، ج ۵ القدس ۱۹۳۶ء ص ۳۷۱
۷۔ الاصفہانی، ابوالفرج، الاغانی، ج ۸ قاہرہ، طبقہ ساسی ۸۹ و ۹۳
۸۔ البلاذری، فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۷ء ص ۳۰۵
۹۔ ابن قتیبہ، المعارف، گوتنجن ۱۸۵۰ء ص ۱۱۴۔ ابن خلکان، ماخذ سابق، ص ۴۱۸
۱۰۔ البلاذری: الانساب، ص ۱۸۵، ابن خلکان، ماخذ سابق، ص ۲۱

۶۵۔ الواقدی، مرجع سابق، ص ۱۵۲، ابن خیاط، مرجع سابق، ص ۵۶، بلاذری، الفتوح، ص ۲۰، ۱۰۹، ابن عبدالبر، مرجع سابق، ص ۲۳، ۵۰۔

۶۶۔ ہوروویٹس، مرجع سابق، ص ۲۳۔

۶۷۔ ابن سلام، مرجع سابق ص ۱۳، ۲۰، ۲۱۔

۶۸۔ ابن عبدالبر، مرجع سابق، ص ۱۴۲۔

۶۹۔ الواقدی، مرجع سابق، ص ۱۷۷۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۶۲۱

۷۱۔ البلاذری، الانساب، ص ۳۷۵۔

۷۲۔ رجز شعر کا ترجمہ:

حامیانِ زبیر مجد و شرف حاصل کر کے رہیں گے
آج جو شخص قتل ہوگا فلاح یاب ہوگا

۷۳۔ عام خیال یہ ہے کہ "مصبح" کے معنی "مصاب بالموت صباحاً" (فتح الباری، ۱۸۶/۷ مطبع خیریہ ۱۳۲۵ھ) ہے۔ لسان العرب میں شرح کی ہے۔ "ای ماتی بالموت صباحاً لکونہ فیہ وقت شد" (صبح) اس تشریح کی رو سے ترجمہ یوں ہوگا۔

ہر شخص کو صبح جب وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہوگا موت آنے والی ہے
اور موت اس سے جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے

علامہ ابن حجر نے ایک اور تشریح "قیل" کے لفظ سے نقل کی ہے: "وقیل المراد انہ یقال لہ وھو مقیم باھلہ صبحک اللہ بالخیر وقد یفجأہ الموت فی بقیۃ النہار"۔

میرے خیال میں یہ تشریح زیادہ مناسب ہے اور دونوں مصرعوں میں ربط گہرا ہو جاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا:۔

(ہر شخص کو جب وہ اپنے گھر کے لوگوں میں ہوتا ہے صبح بخیر کہا جاتا ہے حالانکہ موت جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہوتی ہے)

سیرت ابن ہشام کے انگریز مترجم A. guillaume سے رجز کے ترجمہ میں تسامح ہوا ہے ملاحظہ ہو: The life of Muhammad ص ۲۸۰ (آکسفورڈ پریس ۱۹۵۵ء) مترجم۔

۷۴۔ شعروں کا ترجمہ:

(۱) اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کیا میں ایک شب مقام فخ میں گذار سکوں گا۔ جہاں میرے ارد گرد اذخر اور جلیل ہوں گے۔

(۲) اور کیا مجنہ کے چشموں پر کبھی جا سکوں گا اور شامہ و طفیل میری نظروں کے سامنے ہوں گے!

ان شعروں میں شاعر اپنے وطن مکہ کے لیے بے قراری کا اظہار کر رہا ہے اس لئے وہیں کے مقامات اور پودوں کا ذکر کیا ہے۔ شامہ و طفیل کے بارے میں ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ پہاڑیاں ہیں مگر خطابی کا قول ہے کہ دو چشمے ہیں (الروض الانف ۵۳/۲، مطبعۃ جمالیہ، مصر، ۱۳۲۲ھ، معجم البلدان۔ شامہ، طفیل۔) مترجم

۷۵ - ابن ہشام، ماخذ سابق ص ۵۸۸/۹ ، بلاذری، الفتوح، ص ۱۹ -

۷۶ - الدوری، ماخذ سابق ص ۷۵ -

۷۷ - الطبری، ماخذ سابق - ص ۱۲۸۴ - ۱۲۸۸ -

۷۸ - ترجمہ :

"اما بعد، آپ نے مجھ سے ابوسفیان اور اس کی روانگی کے بارے میں دریافت کیا ہے تو واقعہ یہ تھا کہ ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سواروں کے ساتھ شام سے آرہا تھا۔ ان سواروں کا تعلق قریش کی تمام شاخوں سے تھا اور یہ لوگ شام میں تجارت کرتے تھے۔ یہ قافلہ جب اپنے مال تجارت اور ساز و سامان کے ساتھ آرہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے اس کا تذکرہ ہوا۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ..... جب آپ نے ان کی آمد کی خبر سنی تو صحابہ کو بلایا۔ اور قریش کے مال و اسباب اور ان کی قلت تعداد کے بارے میں گفتگو کی ..... چنانچہ صحابہ نکلے اور ان کا نشانہ صرف ابوسفیان اور اس کا قافلہ تھا۔ وہ اسے مال غنیمت خیال کرتے تھے اور انھیں گمان تک نہیں تھا کہ تصادم کی صورت میں بھی کوئی بڑی جنگ ہوگی۔ اسی قافلہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"وتودون أن غير ذات الشوكة تكون لكم" (الانفال: ۷)

(اور تم چاہتے تھے کہ جو طاقت والا گروہ نہیں ہے وہ تمہارے ہاتھ لگے)

ابوسفیان کو جب پتہ چلا کہ صحابہ مزاحم ہوں گے تو اس نے قریش کو کہلا بھیجا ..... جب قریش کو خبر ملی تو .... (عروہ جنگ کے لیے قریش کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو قریش کی چڑھائی کا علم نہ ہو سکا یہاں تک کہ آپ بدر پہنچ گئے ...... لوگوں کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش کی تعداد نو سو سے ہزار تک ہے ...... پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فتح بخشی، ائمہ کفر کو رسوا کیا اور مسلمانوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔"

ابنِ اسحٰق اور "سیرۃ الرسول اللہ"

الفریڈ گیوم / تحسین فراقی

الفریڈ گیوم ــــــ مختصر تعارف

الفریڈ گیوم سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں شرقِ قریب اور شرقِ اوسط کے شعبے کے صدر تھے۔ وہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے اور بعد ازاں پرسٹن یونیورسٹی، نیوجرسی میں عربی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دینیات اور مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی زبان سیکھی۔ پہلی عالمی جنگ میں انھوں نے پہلے فرانس میں اپنی خدمات انجام دیں اور بعد ازاں قاہرہ کے عرب بیورو میں۔ جب وہ انگلستان واپس آئے تو انھیں پادری بنا دیا گیا۔ مسلم دنیا میں وہ "وراثتِ اسلام" کے ایڈیٹر کے طور پر معروف تھے۔ اس کتاب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس طرح اُنھوں نے ابنِ اسحٰق کی "سیرتِ رسول اللہ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کے آغاز میں ابنِ اسحٰق کی سیرت نگاری اور ان کے متقدمین کی سیرت نگاری پر بڑی مبسوط بحث کی۔ دُوسری عالمی جنگ کے دوران انھیں امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر مدعو کیا گیا۔ یہاں اُنھوں نے اپنے مسلمان دوستوں کا حلقہ بہت وسیع کر لیا۔ دمشق کی عرب اکیڈمی اور بغداد کی رائل اکیڈمی نے انھیں اپنا رکن منتخب کر لیا۔ استنبول یونیورسٹی نے انھیں عیسوی اور اسلامی دینیات کا پہلا غیر ملکی لیکچرر مقرر کیا۔ گیوم کی کتاب "HEBREW AND ARABIC LEXICOGRAPHY" بھی بہت اہم ہے۔ یہ کتاب LEIDEN سے ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ اس کتاب میں گیوم نے عربی کے وسیع منابع کے عبرانی علم اللغات سے تعلق کی وضاحت کی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے اس لغاتیاتی تقابلی مطالعے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا سراغ کو ہلر کی کاوش میں نہیں ملتا۔ اسی طرح اُنھوں نے حدیثی ادب کا ایک تعارفی مطالعہ "روایاتِ اسلام" کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب پاکستان میں ۱۹۷۷ء میں چھپی۔ گیوم کا ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔ گیوم نے سیرت ابنِ اسحٰق کے انگریزی ترجمے کی ابتدا میں جو مفصل دیباچہ لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ترجمے میں جہاں "سیرت" کا لفظ واوین میں آیا ہے اس سے مراد ابنِ اسحٰق کی "سیرت الرسول اللہ" ہے۔

ابنِ اسحٰق ــــــ تعارف

محمد ابن اسحٰق ابن یسار قریباً ۸۵ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱ ہجری میں بغداد میں وفات پائی۔ ان کے

دادا یسار اس وقت حضرتِ خالدؓ بن ولید کے ہاتھ آ گئے جب اُنھوں نے ۱۲ ہجری میں عین التمر کو فتح کیا۔ یسار کو شاہِ ایران کے وہاں قید کر رکھا تھا۔ خالدؓ نے انھیں متعدد دیگر قیدیوں کے ساتھ حضرتِ ابو بکرؓ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ وہاں انھیں بحیثیت غلام کے قیس بن مخرمہ بن عبد المطلب بن عبد مناف کے سپرد کیا گیا اور اسلام قبول کر لینے کے بعد آزاد کر دیا گیا۔ ان کے خاندان نے اپنے ورثا کے خاندانی نام کو اختیار کر لیا۔ ان کے بیٹے اسحٰق کی ولادت قریباً ۵۰ ہجری میں ہوئی۔ ان کی والدہ ایک اور آزاد کردہ غلام کی بیٹی تھیں۔ وہ اور ان کے بھائی موسیٰ معروف راوی تھے۔ چنانچہ ابنِ اسحٰق کا رستہ عنفوانِ شباب کو پہنچنے سے پہلے ہی متعین ہو چکا تھا۔

ان کا تعلق راویوں کی اس دوسری نسل سے بنتا ہے جن میں الزُہری، عاصم بن عمر بن قتادہ اور عبداللہ بن ابوبکر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُنھوں نے عُنفوانِ شباب ہی سے خود کو روایتِ نبوی کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا ہوگا، کیونکہ تیس سال کی عمر میں وہ یزید بن ابو حبیب سے کسبِ فیض کرنے کے لیے مصر چلے گئے۔ وہاں انھیں سند کا درجہ حاصل ہو گیا کیونکہ بعدہٗ یہی یزید حدیث کے سلسلے میں ابنِ اسحٰق سے استناد کرنے لگا۔ مدینہ واپسی کے بعد اُنھوں نے اس تمام لوازمے کی ترتیب و تدوین کے کام کا آغاز کیا جو وہ اکٹھا کر چکے تھے۔ الزہری سے، جو ۱۲۳ھ میں مدینہ میں تھے، مروی ہے کہ مدینہ میں "علم" کبھی کم نہ ہوگا جب تک ابنِ اسحٰق کا دم سلامت ہے اور اُنھوں نے ابنِ اسحٰق سے رسولؐ اللہ کے مغازی کی تفاصیل بڑے ذوق شوق سے اکٹھی کیں۔ بدقسمتی سے ابنِ اسحٰق، مالک بن انس کی دشمنی مول لے بیٹھے،[1] جن کے علمی کام سے انھیں تنفر تھا۔ اور یُوں جلد ہی ابنِ اسحٰق کی تحریروں اور خود ان کی استقامت پر سوال اُٹھنے لگے۔ اغلب ہے کہ سُنن پہ ابن اسحٰق کی گم شدہ کتاب مالک کے غیظ کا سبب بنی کیونکہ یہ فقہ کے میدان میں حضورِ اکرمؐ کے معمولات و سنن پہ مبنی ہوگی اور اسی لیے اختلافات بہت شدّت سے محسوس کیے گئے ہوں گے۔ ان پہ شیعی اور قدری ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ایک اور صاحب نے ان کی صداقت پہ حرف گیری کی (تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ) ابنِ اسحٰق اکثر فاطمہ زوجہ ہشام بن عروہ کو بعض احادیث کے سلسلے میں سند کے طور پہ پیش کرتے تھے۔ فاطمہ کا خاوند غصّے کے عالم میں کہا کرتا تھا کہ وہ تو کبھی اس کی بیوی سے ملا ہی نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ چونکہ فاطمہ عمر میں ابنِ اسحٰق سے چالیس سال بڑی تھی اس لیے اس بات پہ آسانی سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ ..... اکثر ایک دُوسرے سے ملتے رہے۔ یہ بات معلوم نہیں کہ ابن اسحٰق کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا یا وہ اپنی مرضی سے ہجرت کر گئے۔ اتنی بات البتہ واضح ہے کہ ایک ایسی جگہ پہ ان کی وہ حیثیت کیسے ہو سکتی تھی جہاں ان کے جاسوسوں کو مقامِ محفوظ ملا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ مشرق کی جانب چل کھڑے ہوئے اور کوفہ، کنارِ دجلہ پہ آباد الجزیرہ اور رَے میں قدرے توقف کرنے کے بعد بغداد میں مقیم ہو گئے۔ جب منصور ہاشمیہ میں تھا تو وہ اس کے متوسلین میں شامل ہو گئے اور انھیں اپنی مدوّنہ احادیث کا ایک نسخہ بخشش کی امید پہ پیش کیا۔ وہاں سے وہ رَے کی جانب روانہ ہُوئے اور وہاں سے سلطنت کے نئے دار الحکومت کی جانب۔ وہ ۱۵۰ھ (یا شاید ۱۵۱ھ) میں فوت ہُوئے اور انھیں خیزُران کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

"سیرت"

"سیرت" کے پیشرو

یہ بات یقینی ہے کہ ابن اسحٰق کی "سیرۃ الرسول اللہ" کا صحیح معنوں میں کوئی بھی حریف نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے متعدد کتب مغازی موجود تھیں۔ ہم نہیں جانتے وہ پہلے پہل کب لکھی گئیں، اگرچہ ہمیں پہلی صدی ہجری کے ان متعدد علماء کے نام معلوم ہیں جنھوں نے اہم نکات تحریر کر لیے تھے اور آنے والی نسل تک اپنا علم منتقل کر دیا تھا۔ ان میں پہلی شخصیت کا نام ابان تھا جو خلیفہ عثمانؓ کے صاحبزادے تھے[۱] وہ قریباً ۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے اپنے والد مکرم کے قاتلوں کے خلاف حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی مہم میں حصّہ لیا۔ وہ قریباً ۱۰۰ھ میں فوت ہوئے۔ ابن المغیرہ کے باب میں واقدی نے جو زبان استعمال کی ہے، یعنی یہ کہ "اس نے حدیث کے سلسلے میں سوائے مغازیِ رسولؐ کے اور کچھ نہیں لکھا تھا، جس کی تفصیل اسے ابان سے ملی تھی"، سے یقیناً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن المغیرہ نے وہی کچھ لکھا جو ابان نے اسے بتایا۔ تعجب اس بات پہ ہے کہ نہ تو ابنِ اسحٰق نے اور نہ ہی الواقدی نے اس شخص کا حوالہ دیا ہے جو بعض ان معاملات کے اندرون کا گہرا علم رکھتا تھا جن کا عامتہ الناس کو کچھ علم نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے پیرو ہونے کی وجہ سے امکان اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسے شخص کے بیٹے کے ذکر نہ کرنے ہی کو ترجیح دی ہو جس نے شیعانِ علیؓ کے نزدیک ناحق خلافت سنبھال لی تھی۔ بہرحال ان کا نام فقہی احادیث کے مجموعوں کی اسناد میں اکثر آیا ہے (طبری ص ۲۳۰۴ اور ابنِ سعد جلد چہارم ص ۲۹ میں اس شخصیت کا نام ابان بن عثمان البجلی آتا ہے، جن کے بارے میں قیاس ہے کہ اُنھوں نے مغازیؐ پر ایک کتاب لکھی تھی)

ایک اہم تر شخصیت عروہ بن الزبیر بن العوام (۲۳ھ - ۹۴ھ) کی تھی جو حضور اکرمؐ کے چچازاد تھے۔ عروہؓ کی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ تھیں۔ وُہ اور ان کے بھائی عبداللہ حضور اکرمؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرتِ عائشہؓ سے قریبی رابطہ رکھنے والوں میں تھے۔ وہ اسلام کے صدرِ اوّل کی تاریخ پر سند سمجھے جاتے تھے اور اموی خلیفہ عبدالملک ان سے اس باب میں وقتاً فوقتاً معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ یہ بات یقینی نہیں کہ اُنھوں نے کوئی کتاب لکھی ہو۔ لیکن ابنِ اسحٰق اور دُوسرے لکھنے والوں کے توسط سے ان کے نام کے حوالے سے جو متعدد روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کی روشنی میں اس دعوے کا جواز نکلتا ہے کہ وہ واقعی تاریخِ اسلام کے بانی تھے[۲]۔ . . . . ان کے کام کا بیشتر حصّہ ان کی خالہ حضرتِ عائشہؓ کے بیانات پر مبنی ہے۔ ابنِ اسحٰق کی طرح وہ بھی بیان کردہ روایات میں شاعری کا حوالہ دینے کے عادی تھے اور اپنی اس عادت کا جواز حضرت عائشہؓ کی مثال دے کر نکالا کرتے تھے جو ہر پیش آمدہ موضوع پر اشعار پڑھا کرتی تھیں[۳]۔ وہ رومانی شاعر عمرو بن ربیعہ کے دوست تھے لیکن ان کی نگاہ میں شاعرِ رسالتمآب حضرتِ حسّان بن ثابت کی کوئی اہمیت نہ تھی[۴]

شُرحبیل بن سعد کے بارے میں، جو ایک آزاد کردہ غلام تھے ——— غالباً جنوبی عرب کے ——— سوائے اس بات کے

اور کچھ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے ایک کتاب مغازی پر تحریر کی تھی۔ ابنِ اسحٰق کے یہاں اُن کا حوالہ معدوم ہے اور دُوسرے لکھنے والوں کے یہاں بھی شاذ ہی ان کا حوالہ آیا ہے۔ ان کی وفات ۱۲۳ھ میں ہُوئی اور چونکہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کی جان پہچان تھی اس لیے وُہ یقیناً سو سال کی عمر میں فوت ہوئے ہوں گے۔ وہ حضورِ اکرمؐ کے بعض صحابہ سے روایات نقل کرتے ہیں اور موسیٰ بن عقبہؒ گواہ ہیں کہ اُنھوں نے جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے مہاجرین اور معارضین کی فہرستیں مرتب کیں ....

ایک اور اہم تابعی وہب بن منبہ (۳۴ھ - ۱۱۰ھ) تھے جو ایرانی النسل یمنی تھے۔ ان کے والد غالباً یہودی تھے۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے صحائف و روایات میں اپنی دلچسپی اور علم کے باعث اچھی شہرت کے حامل نہیں تھے، اور اگرچہ بہت سے زوائد جو ان کے بعد گھڑ لیے گئے تھے، ان کے سر منڈھ دیے گئے۔ ان کی کتاب المبتدأ بعد کے مسلمانوں کے، حیات الانبیأ اور دیگر انجیلی حکایات پر مبنی بیانات کے پس منظر میں جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں یہاں ان کی یمن کی داستانی تاریخ، ضرب الامثال، مسئلۂ قدر اور بعض دیگر مسائل پر (جو جزوی طور پر ابن ہشام کی کتاب التیجان میں محفوظ ہیں) لکھی گئی تحریروں سے سروست کوئی بحث نہیں لیکن حاجی خلیفہ کی اس روایت کی کہ وہ مغازی بھی جمع کرتے تھے، اب اس کی گم شدہ کتاب کے پاپیرس (PAPYRI) پر ۲۲۸ھ لکھے ہوئے ایک حصے کے دریافت ہو جانے سے تصدیق ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس مختصر سے حصے سے ہمیں کسی نئی بات کا پتا تو نہیں چلتا لیکن بہرحال اس کی اہمیت ان معنوں میں بے حد ہے کہ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک یا اس سے چند سال قبل تک حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے بیشتر حقایق جو ہمیں مابعد کی بیشتر کتابوں میں ملتے ہیں، تحریری شکل میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ اس سے مزید یہ پتا چلتا ہے کہ دُوسرے اوّلین راویوں کی طرح اُنھیں اسناد کی یا تو بالکل ضرورت محسوس نہ ہوئی یا پھر نہایت کم۔ مس گرترد میلا میدؒ نے مقامِ عقبہ پر اجلاس والے بیان (دیکھیے ابنِ ہشام کی سیرت کے ص ۲۹۹، ۲۹۳، ۳۰۰) کا اسی موضوع سے متعلق دوسرے مواد سے جو تقابلی مطالعہ کیا ہے اور تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس پر جو تنقید لکھی ہے اس سے وہ بعض اہم نتائج تک پہنچی ہے لیکن جس کا ہمارے موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دلچسپ تفصیل یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے عباس سے خطاب کرتے ہوئے اوس اور خزرج کو "میرے اور تمھارے ماموں" قرار دیا ہے ....

ان کے بعد عاصم بن عمر بن قتادہ الانصاری (وفات تقریباً ۱۲۰ھ) کا نام آتا ہے۔ وہ دمشق میں حضورِ اکرمؐ کے مغازی اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں پر درس دیا کرتے تھے اور غالباً وہ اپنے دروس کو تحریری شکل میں بھی لے آتے تھے۔ وُہ بھی اپنے اُستاد کے ناموں کا حوالہ دیتے ہوئے کسی توازن کا ثبوت نہیں دیتے۔ بعض اوقات وہ اسناد دیتے ہیں اور اکثر اوقات اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ وُہ مدینہ اس غرض سے واپس آئے کہ اپنے کام کو جاری رکھ سکیں اور ابن اسحٰق ان کے محاضرات میں شریک ہوئے۔ گاہے گاہے وُہ اپنی روایات میں اشعار بھی جڑا کرتے تھے اور بعض اوقات اس باب میں اپنی رائے بھی دیا کرتے تھے۔

محمد بن مسلم بن شہاب الزُّہری (۵۱ھ - ۱۲۴ھ) مکّہ کے ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ اپنے آپ کو

عبدالملک، ہشام اور یزید سے متعلق گردانتے تھے اور اُنھوں نے اپنے چند فاخر شاگردوں کے لیے کچھ روایات حوالۂ تحریر کیں۔ انھیں بعد کے محدثین کا پیشرو گردانا جا سکتا ہے کیونکہ اُنھوں نے دو نوقبیل کے اُن افراد کو کھنگالنے میں بہت کشٹ اٹھائے جن کے بارے میں امکان تھا کہ وُہ ماضی کا علم رکھتے ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنے پیچھے اپنے خاندان کی ایک تاریخ اور مغازی پر ایک کتاب یادگار چھوڑی۔ ان کی بیان کردہ روایات کا بیشتر حصّہ ان کے محاضرات کے ان اشارات کی شکل میں بچ رہا جو ان کے شاگردوں نے تحریر کر لیے اور جو ان احادیث میں محفوظ ہیں جو ان کی سند کے حوالے سے وہ ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ نوجوانی میں الزُّہری کچھ عرصہ مدینہ میں رہے ابن اسحٰق سے ان کی ملاقات اس وقت ہُوئی جب وہ حج کے لیے (جنوب میں) آئے اور انھیں اکثر سیرت کے باب میں سند کا درجہ حاصل ہے۔ اپنی نسل کے وہ سب سے اہم روایت نگار تھے اور مسلّمہ احادیث کے ہر مجموعے میں ان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں (مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے جے ہوروز کا "اسلامک کلچر" جلد دوم صفحہ ۳۳ و ببعد)

عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (وفات ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ) ابن اسحٰق کے اہم ترین خبر دہندوں میں سے تھے۔ ان کے باپ کو عمر بن عبدالعزیزؓ نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ حدیث نبویؐ کا مجموعہ مرتب کریں، خصوصیت سے وہ حدیثیں جو عمرہ بنت عبدالرحمٰن سنایا کرتی تھیں۔ عمرہ حضرت عائشہؓ کی سہیلی تھیں اور وہ ابن ابوبکر کی پھوپھی تھیں۔ ان کے بیٹے عبداللہ ہی کے زمانے سے قبل یہ تحریریں کھو چکی تھیں اگرچہ عبداللہ کی کسی کتاب کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تاہم ان کی تفصیلات کبھی غالباً ان کے بھتیجے کی جمع کردہ مغازی میں محفوظ تھیں۔ ہماری توقع کے عین مطابق عبداللہ اسناد کے معاملے میں بے پروا ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ واقعات کے بہت قریب کھڑے تھے ——— ان لوگوں کے درمیان جن میں سے بیشتر ان سے واقف تھے، سو ایسی صورت میں اپنے اسناد کا ذکر کیسا ؛ طبری (ج ا ص ۱۸۳۷) میں ایک دلچسپ اشارہ موجود ہے اس باب میں کہ ابن اسحٰق مطلوبہ معلومات کس طرح حاصل کرتے تھے: "عبداللہ نے اپنی بیوی فاطمہ سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسے (ابن اسحٰق کو) وُہ کچھ بتا دے جو وہ (عبداللہ) عمرہ کی سند کے حوالے سے جانتا تھا۔"

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) نے بھی ایک کتاب المغازی اپنی یادگار چھوڑی تھی جو عروہ کی روایت سے مماثلت تام رکھتی ہے۔[۹]

ہمارے مصنف کے، تیسری نسل کے ایک اور معاصر موسٰی بن عقبہ (قریباً ۵۵ھ - ۱۴۱ھ) تھے جو خاندان الزبیر کے آزاد کردہ تھے۔ ان کی کتاب کا ایک معمولی سا حصّہ یادگار رہ گیا ہے اور اسے ۱۹۰۴ء میں سخاؤ نے شائع کرایا[۱۰] چونکہ ایک زمانے میں یہ ابن اسحٰق کی اہم تصنیف سے لگا کھاتا تھا اور سیرت کے باب میں ہماری قدیم ترین شہادتوں میں سے ہے، سو میں نے اب تک باقی روایات کا ترجمہ فراہم کر دیا ہے[۱۱] اگرچہ مالک بن انس، الشافعی اور احمد بن حنبل ——— تینوں نہایت متاثر کن اصحاب ——— اس رائے کے حامل تھے کہ ان کی (موسٰی) کتاب نہایت اہم اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، لیکن آنے والی نسلوں نے واضح طور پر ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ورنہ ان (موسٰی) کے

کام کا بیشتر حصہ محفوظ رہ گیا ہوتا۔[۱۲] ابنِ اسحٰق کبھی ان کا ذکر نہیں کرتا . . . . الواقدی، ابنِ سعد، البلاذری، طبری اور ابنِ سیّد النّاس نے بڑی فراخ دلی سے ان کو حوالہ بنایا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ نے ان لوگوں کی فہرستیں فراہم کیں جو حبشہ گئے اور ان کی بھی جنھوں نے معرکۂ بدر میں جہاد کیا۔ وہ کبھی کبھی اسناد بھی دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہمیشہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کسی تحریری شہادت پر بھروسا کر رہے ہیں یا زبانی روایت پر۔ بہرحال کم از کم ایک بار اُنھوں نے اس کثیر لوازمے کا حوالہ دیا ہے جو ابنِ عباس نے چھوڑا (دیکھیے ابنِ سعد صفحہ ۲۱۶)۔ وہ کہیں کہیں نظموں کے حوالے بھی لاتے ہیں۔

وہب بن مُنبّہ کے اس بچ جانے والے جز (مغازی) سے قطع نظر، برلن کا مخطوطہ ——— اگر وہ مستند ہے تو پھر وہ عربی میں تاریخِ ادب کا ایک قدیم ترین موجود نسخہ ہے اور اسی ایک وجہ سے یہ گہری توجہ کا طالب ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ بخاری میں موجود بعض احادیث کے ایک صدی سے زاید پیچھے تک موجود ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔

مغازی پر مشتمل دیگر کتب دُوسری صدی میں عراق، شام اور یمن میں لکھی گئیں لیکن اس بات کا شاذ ہی امکان ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ابنِ اسحٰق کے کارنامے کو متاثر کیا ہو اور اسی وجہ سے ان کتب کو سہولت سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے جو چیز اہم ہے وُہ یہ ہے کہ اس صدی میں ہر جگہ حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں کمال دلچسپی لی گئی۔ لیکن ہمارے اور عربوں کے علم میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو جامعیت، ترتیب و تنظیم اور باضابطہ تحریر کے اعتبار سے سیرتِ ابنِ اسحٰق سے لگا کھاسکے۔ اب اس کتاب پر گفتگو ہوگی:

”سیرت“

عرب مصنّفین کے یہاں اس کتاب کے نام ——— ”کتاب المغازی“، ”کتاب المغازی والسّیَر“، ”کتاب السیرت والابتدا والمغازی“ ——— سبھی مل جاتے ہیں۔ البکّائی نے جو ابنِ اسحٰق کا ایک شاگرد تھا، تمام کتاب کی دو نقول تیار کیں جس میں سے ایک ابنِ ہشام (وفات ۲۱۸ھ) تک پہنچی ہوگی، جس کا اختصار کردہ متن، تحشیہ اور کہیں کہیں تبدیلی کے ساتھ ابنِ اسحٰق کے اصل کارنامے کے علم کے سلسلے میں ہمارا بڑا منبع ہے۔ بعض دوسرے ذرائع سے اس کا مزید حصہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔[۱۳] ابنِ ہشام کی ترمیم شدہ کتاب کے تعارف میں پس منظر میں کام کرنے والے اصولوں کا ذکر ملتا ہے۔ سخاوؔ کا خیال ہے کہ جس نقل کو طبری استعمال میں لائے وہ اس وقت تیار کی گئی تھی جب ابنِ اسحٰق رَے میں تھے۔ اسے سلامہ بن فضل الابرش الانصاری نے تیار کیا تھا، کیونکہ طبری ابنِ اسحٰق کا حوالہ فضل کی روایت کے مطابق دیتے ہیں۔ تیسری نقل یُونس بن بُکیر نے رَے میں تیار کی۔ یہی نقل ابن الاثیر نے اپنی اُسُدالغابہ میں استعمال کی۔ اس نظرِ ثانی شدہ نسخے کے ایک حصّے کی نقل قرَوِییّن کی مسجد میں بمقام فاس (FEZ) موجود ہے . . . . . چوتھی نقل شام کے ہارون بن ابو عیسیٰ کی تیار کردہ تھی۔ ان آخری دو نقول سے ابنِ سعد نے استفادہ کیا۔[۱۴] ان سب کے علاوہ فہرست میں النُّفیلی (متوفی ۲۳۴ھ) کے ایڈیشن کا ذکر بھی ملتا ہے۔

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کتاب ہمیشہ سے تین الگ الگ حصّوں میں موجود تھی۔ یعنی :

(۱) قصص قدیم
(ب) حضورؐ کی ابتدائی زندگی اور ان کا مشن۔ اور
(ج) انؐ کے مغازی

یہ تو محض کتاب کے تین حصّے ہیں جن میں ابن اسحٰق کے محاضرات موجود تھے۔

"مبتدا" (مبدا) کے لیے ہمیں طبری کی تفسیر اور تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس میں پایا جانے والا پہلا حوالہ کچھ یُوں ہے" ابنِ حمید نے کہا کہ سلامہ بن الفضل نے ہمیں بتایا کہ ابنِ اسحٰق نے یُوں کہا کہ وُہ پہلی چیز جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی نور و ظلمت تھے۔ پھر اس نے انھیں جُدا کیا اور ظلمت کو رات بنایا جس کے اندھیرے پر سیاہی بڑھی ہوئی تھی اور اس نے نور کو دن بنایا ——— روشن اور منوّر"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب کے پہلے حصّے کے عنوان کا مطلب ہے "آغازِ کائنات (GENESIS)"۔ ابنِ ہشام نے تمام درمیانی صفحات سے صرفِ نظر کیا اور حضرتِ ابراہیمؑ سے آغاز کیا جو حضورِ اکرمؐ کے جدالاجداد تھے۔ الارزقی نے اپنی "اخبارِ مکّہ" میں اس گم شدہ حصّے کے بعض اجزا کا حوالہ دیا ہے اور بعض اقتباسات المطہر بن طاہر[۱۱] نے بھی دیے ہیں۔

جہاں تک مبتدا کا تعلق ہے تو چونکہ یہ ابنِ ہشام کی نظرِ ثانی کے تحت میں نہیں آتی اس لیے سرِدست ہمارے موضوع سے خارج ہے، اگرچہ اس بات کی اُمید کی جانی چاہیے کہ کسی دن کوئی صاحبِ تحقیق ان باقی ماندہ منابع کی مدد سے اس کا متن جمع کرے گا اور اسے شائع کر دے گا تاکہ ابنِ اسحٰق کے اس کام کو اس کی پوری کلّیت کے ساتھ پڑھا جا سکے کیونکہ یہ نہایت اہم علمی کارنامہ ہے۔ اس سلسلے میں ابنِ اسحٰق نے یہودی اور عیسائی صاحبانِ نظر اور ابوعبداللہ وہب بن مُنَبّہ (۳۴ھ – ۱۱۰ یا ۱۱۴ھ) کی معروف کتاب "کتاب المبتدا" اور "اسرائیلیات" کو بنیادی ماخذ کے طور پر برتا۔ "اسرائیلیات" کا اصل نام "قصص الانبیا" تھا۔

وہب بن منبّہ سے ابنِ اسحٰق نے آدمؑ سے یسوع مسیح تک[۱۲] اور جنوبی عرب کے قصص کے سلسلے میں، جن میں سے بعض ابن ہشام کے یہاں بھی نظر آتے ہیں، بہت استفادہ کیا۔ اس شخص نے ایک کتاب المغازی بھی لکھی تھی اور اس کا کچھ حصّہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے[۱۳]۔ ابن اسحٰق نے اس کا حوالہ صرف ایک بار دیا ہے[۱۴]۔ بات سیدھی سی ہے کہ حضورِ اکرمؐ خاتم النبیین پر لکھی گئی کتاب کو ماقبل کے انبیاءؑ کے بارے میں تفصیل دینی ہی چاہیے تھی لیکن جنوبی عرب کے قصص یا تاریخ کا مسئلہ ایک الگ ہی وضاحت چاہتا ہے۔ گولڈزیہر نے کافی عرصہ قبل اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ پہلی صدی کے دُوسرے نصف میں شمال اور جنوب یعنی قریش اور انصارِ مدینہ کی مخاصمت پہلی بار تحریر میں ظاہر ہوئی۔ انصار جو اپنے جنوبی الاصل ہونے پر بھی مفتخر تھے اور اس بات پر بھی کہ اُنھوں نے حضورِ اکرمؐ کی اس وقت مدد کی جب قریشِ مکّہ ان کی جان کے درپے تھے، اپنے حکام اور شمالی الاصل لوگوں کے احساسِ تفاخر کی وجہ سے بہت کُڑھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے

غیظ و غضب کے اظہار کی ایک راہ حمیر کے عظیم ماضی کی تجلیل کی صورت میں نکالی۔ ابن اسحٰق نے کہ مدینے کی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے سرپرستوں کے جذبات کے بہرہ دار تھے، ان کے آبا و اجداد کے کمالات دُہرائے اور ابنِ ہشام نے جو خود جنوبی الاصل تھے اپنی سیرت میں ابن اسحٰق کے اصل کام کا اس قدر حصّہ محفوظ کر لیا جتنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ ابنِ ہشام کے حمیری ہونے ہی کی وجہ سے ہم قدیم جنوبی عرب کے بادشاہوں کے قصص کے بعض اقتباسات تک پہنچ پاتے ہیں ——— ابنِ ہشام نے اس موضوع پر ایک الگ رسالہ "کتاب التیجان لمعرفۃ الملوک الزمان (فی اخبارِ قحطان)" لکھا۔[19]

کتاب کا دُوسرا حصّہ جسے اکثر "المبعث" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، حضورِ اکرمؐ کی ولادت سے شروع ہوتا ہے اور ان کے مستقر ——— مدینہ ——— سے ہونے والی پہلی لڑائی پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصّے سے پڑھنے والا جو عام تاثر قبول کرتا ہے وہ دھندلی یادوں کا ہے ——— قصص میں تازگی نظر نہیں آتی اور ان میں قصص المغازی کی سی واضح اور بعض صورتوں میں ملنے والی ڈرامائی تفصیلات دکھائی نہیں دیتیں ——— خاص طور پر جیسی الواقدی کے یہاں ملتی ہیں ——— دلچسپی اور جوش سے مملو ——— سوا گر ایک طرف عہدِ مدینہ میں تفصیلات بڑی خُوبی سے ترتیب دی گئی ہیں اور اس عہد کے واقعات سن وار ترتیب سے دیے گئے ہیں تو دُوسری طرف اس قسم کی صحت ہمیں مکّی دور میں نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس عہد کی تنقیح کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں حضورِ اکرمؐ کی عمر کا کچھ پتا نہیں چلتا جب وہ بحیثیت ایک مذہبی رہنما کے سامنے آئے، بعض کے نزدیک اس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس تھی، بعض کے نزدیک آپؐ پینتالیس سال کے تھے۔ ہمیں بنو نجار کے ساتھ ان کی صحیح قرابت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ان کے لڑکپن کی غربت اس خیال سے مطابقت نہیں رکھتی تھی کہ وُہ مکّہ کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے[20]۔ ان برسوں کی کہانی معجزانہ وقوعات پر مبنی قصص و روایات سے بھری ملتی ہے جس سے آج کے جدید پڑھے لکھے شخص کا اس عہد کی تاریخ کے سلسلے میں اعتماد کلیتہً جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے[21] اس حصّے میں خصوصاً (اگرچہ صرف اسی حصے میں نہیں) ابنِ اسحٰق پیراگرافوں کے ساتھ تاریخی تعارف تحریر کرتا ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال حضورؐ کو دی جانے والی ایذا کے متعلق اس واقعے کے ابتدائیے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے جو انھیں اہلِ مکّہ کے ہاتھوں سہنا پڑی۔

"جب قریش اپنے اور حضورِ اکرمؐ (مع ان کے ایمان لانے والے ساتھیوں کے) مابین پیدا ہونے والی دشمنی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے حضورِ اکرمؐ کے خلاف ان احمق لوگوں کو ہفوات بکنے پر آمادہ کر دیا جو انھیں کاذب کہتے تھے، ان کی توہین کے مرتکب ہوتے تھے اور انھیں شاعر، کاہن، غیب دان اور آسیب زدہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ لیکن اس تمام تر صورتِ حال کے باوجود حضورِ اکرمؐ نے تبلیغ کا وہ کام جاری رکھا جس کا حکم انھیں ان کے رب کی طرف سے دیا گیا تھا ——— بغیر کچھ چُھپائے، اُن کے مذہبِ باطلہ کو ناپسند کرتے ہوئے، ان کی نفرت کو اُبھارتے ہوئے، اُن کے بُتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اور انھیں ان کی گمراہی میں مبتلا رہنے دیتے ہوئے"[22]

(ابنِ اسحٰق کا) یہ بیان کسی روایت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان احوال کا منّ وعَن ملخّص ہے جن کا ذکر اس دَور کے سلسلے میں قرآن حکیم کی مختلف آیات میں آیا ہے۔

رہا مغازی کی تاریخ کا مسئلہ تو اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کم و بیش تمام کے تمام قصص چشم دید گواہوں کے بیانات پر مبنی ہیں اور ان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خصوصیات

ابن اسحٰق کی ثقاہت کے بارے میں مسلمان نقادوں کی آرا ایک خصوصی مبحث کا تقاضا کرتی ہیں لیکن یہاں مصنف کی احتیاط اور انصاف کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔ کسی بھی بیان کے آغاز میں ایک لفظ جو بار بار آتا ہے وہ زَعَمَ یا زَعَمُوا (اس نے یا انھوں نے دعویٰ کیا) ہے۔ تو گویا یہاں مصنف نے اشارہ چھوڑ کر ذرا کھل کر بات کی ہے کہ یہ روایت غیر صحیح بھی ہو سکتی ہے، اگرچہ اس کے برعکس یہ ٹھوس اور قابلِ اعتماد بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ صرف صفحہ ۸۰ تا ۱۴۸ مصنف نے اس قسم کے چودہ یا اس سے بھی زیادہ انتباہات کیے ہیں جبکہ یہ جملہ بار بار آتا ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ فلاں بیان غلط ہے یا صحیح۔ اسی قسم کی احتیاط (اگر اسے تشکیک پر محمول نہ کیا جائے) کا ایک اور اشارہ فِیمَا ذُکِرَ لِی قسم کی تصریح میں بھی ملتا ہے، جیسا کہ اس جن کے واقعے کے سلسلے میں جو حضورؐ کی عبادت کے دوران کی جانے والی تلاوت سنا کرتا تھا، یا حضور اکرمؐ کا حضرتِ عمرؓ کو سوید کو قتل کرنے کا حکم، جبریلؑ کی حضورؐ سے ملاقات اور ایک عورتؓ کے ہاتھوں قتل ہونے والے ایک مرد کو دو شہیدوں کے برابر انعام کے سلسلے میں تصریحات کی گئی ہیں۔ اسی مفہوم کی ایک اور تصریح فِیمَا بَلَغَنِی میں موجود ہے۔

شاذ ہی ابن اسحٰق نے ان روایات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جنھیں وہ مدوّن کرتے ہیں، قطع نظر ان مندرجہ بالا تصریحات کے جن سے ان کے ذہنی تحفظات کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ واقعی اپنی کسی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو یہ بہت اہم ہوتی ہے۔ حضورِ اکرمؐ کے سفرِ معراج کے سلسلے میں یروشلم جانے اور آسمانوں کی طرف معراج کے باب میں ان کے (ابنِ اسحٰق کے) باطنی تموّجات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکایتِ سفرِ معراج کے سلسلے میں پڑھنے والے کو جا بجا ان تحفظات اور حدود کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابنِ اسحٰق اس کا آغاز ایک روایت سے کرتے ہیں جو ان تک کئی روایات کے ذریعے پہنچی (بَلَغَنِی) اور انھوں نے ان تمام روایات کو یکجا کر دیا ہے جو انھوں نے ان لوگوں سے سنیں (ذُکِرَ)۔ یہ تمام مسئلہ دراصل لوگوں کے ایمان کو پرکھنے والی کسوٹی ہے خصوصاً ان لوگوں کے ایمانوں کو جو ذہانت کا بہرۂ وافر رکھتے ہیں یہ یقیناً ایک عملِ الٰہی تھا لیکن واقعۃً ہوا کیا، ہم کچھ نہیں جانتے۔ ابنِ اسحٰق کی یہ رائے نہایت حزم و احتیاط سے ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے:

كَيْفَ شَاءَ (خدا نے جیسا چاہا، اسے دکھایا)

ابن مسعودؓ کے الفاظ فِیمَا بَلَغَنِی عَنْہُ کو ابنِ اسحٰق نے بطور آغازِ کلام کے استعمال کیا ہے۔ حکایتِ معراج سے کہیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ ایک رؤیا (خواب) تھا۔ الحسن کا بیان زیادہ واضح ہے کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب حضورِ اکرمؐ مکہ واپس تشریف لاتے، انھوں نے قریش کو بتایا کہ وہ یروشلم سے ہو کر آئے ہیں۔ سو اس بیان سے بعض "مسلمانوں" کے

یقین پر اس قدر بار پڑا کہ وہ حضورؐ کے سلسلے کے واقعاتِ وحی سے بھی منکر ہو گئے، اگرچہ حضورؐ نے یروشلم کے متعلق صحیح ترین تفصیلات اُنھیں سُنا دی تھیں۔ پس نہایت حیران کن بات یہ ہے کہ الحسن اپنی روایت کو قرآن کی ایک سورت (۱۳ : ۶۲) کے حوالے سے ختم کر دیتے ہیں "ہم نے رؤیا تخلیق کیا اور تجھے دکھایا تاکہ لوگوں کے ایمان کو پرکھا جا سکے۔" اس صورت میں الحسن کی روایت بتمام و کمال جڑ سے اُکھڑ جاتی ہے کیونکہ اگر معراج حالتِ خواب میں ہوا تو پھر اس میں ناقابلِ یقین کون سی بات تھی؛ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی روایت آتی ہے (جو ان کے والد کے خاندان کے کسی فرد کی بیان کردہ ہے) کہ شبِ معراج صرف حضورِ اکرمؐ کی رُوحِ مبارک نے علوی سفر کیا، اُن کا جسم تو من وعن مکہ ہی میں رہا۔ معاویہ بن ابوسفیان کی ایک روایت بھی اسی مفہوم کی ہے۔ اب اس امر سے کہ حضورِ اکرمؐ سے اس بارے میں سوالات کیے گئے کہ آیا ان کا یہ سفر جسمانی تھا یا روحانی، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابن اسحٰق کے دَور سے پہلے ہی اس مسئلے پر بحث چھڑی ہُوئی تھی۔ یہاں ابنِ اسحٰق ایک نہایت گہری بات کہتے ہیں جس کا فی الاصل مفہوم یہ ہے کہ یہ بات سرے سے غیر ضروری ہے کہ آیا حضورؐ کا معراج حقیقی تھا یا رؤیائی، بہر حال یہ خدا ہی کی طرف سے تھا اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خوابؑ میں ملنے والی ہدایت کے نتیجے میں اپنے بیٹے اسحٰقؑ کو ذبح کرنے کی مکمل تیاری کر لی تھی کیونکہ ان کے نزدیک رات کے وقت حالتِ نوم میں دیے جانے والے الوہی حکم اور دن کی روشنی میں حالتِ بیداری میں صادر ہونے والے حکم میں کوئی فرق نہیں تھا، اسی طرح حضورِ اکرمؐ کا خواب بھی اتنا ہی حقیقی تھا جتنا کہ حضورؐ کا واقعی جسمانی معراج! یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کیا واقعہ ہُوا۔ لیکن حضورِ اکرمؐ نے واقعۃً وہ کچھ دیکھا جس کے دیکھنے کا اُنھوں نے دعویٰ فرمایا، اور خواہ وہ حالتِ خواب میں تھے یا عالمِ بیداری میں، نتیجہ ایک ہی ہے۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ قاری پر ابنِ اسحٰق کی ذہانت اور ذہنی بصیرت کا جو تاثر مرتسم ہوتا ہے وہ اس آخری پیرے کی صورت میں بکھر جاتا ہے جو علوی سفر سے متعلق ہے اور جس نے اتفاقی طور پر طربیہ خداوندیؓ کے توسط سے یورپی ادبیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اُنھوں نے سوائے معراج جسمانی کے ہر قسم کے تجربے کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے اور اس سے پہلے کہ ابنِ اسحٰق خود اپنی آرا پیش کرتے، اسے ایک انتہاہی نوٹ کے ساتھ مدوّن ہونا چاہیے تھا۔ امکانِ غالب یہ ہے کہ اس پیرے کے بے جا ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ اُن کے خطبے کا ایک اقتباس ہے۔ بہر حال ہم کوئی بھی توجیہ کریں، واقعہ یہ ہے کہ اس سے ان کے بیانِ ثبوت کے تاثر کو ضعف پہنچتا ہے۔ؑ

یہ جملہ کہ "خدا ہی بہتر جانتا ہے" اتنا واضح ہے کہ اس پر رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ مصنف بعض اوقات یہ جملہ اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ دو متناقض روایات کو مدون کرتا ہے اور طے نہیں کر پاتا کہ ان میں کون سی درست یا نادرست ہے۔ مصنف کی غایت درجہ احتیاط پسندی کا ایک اور ثبوت اس جملے کی شکل میں ملتا ہے کہ "خدا مجھے حضورِ اکرمؐ سے ایسے الفاظ منسوب کرنے سے محفوظ رکھے جو اُنھوں نے استعمال نہ فرمائے۔" مدینہ میں حضورِ اکرمؐ کے اہلِ مدینہ سے پہلے خطاب اور اپنے صحابہ کو یہ حکم کہ وہ اپنے ساتھی کو اپنا بھائی بنا لیں، کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے آغاز میں "فِيمَا بَلَغَنِي" کا جملہ دُہرایا ہے۔

ابنِ اسحٰق اکثر و بیشتر مکّہ اور مدینے سے ملنے والی روایات کے متناقض متون نہیں دیتے۔ سو حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ دلچسپ ہے ؎ یہ بات حضورِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی دَور کے بارے میں حصولِ معلومات کے باب میں مصنّف کی تلاشِ تامہ کی وضاحت کرتی ہے۔ اُن کے نزدیک پہلا بیان مدینہ کے راویوں کے اس بیان پر مبنی ہے: جب عمرؓ کو علم ہوا کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اُنھوں نے انھیں مار اپیٹا، لیکن جب انھوں نے اپنی بہن کے رخسار پر زناٹے کا طمانچہ مارنے کے نتیجے میں خون کی لکیر دیکھی اور ساتھ ہی اس کا استقلال بھی، تو وہ بہت پشیمان اور متاثر ہُوئے، اور اُنھوں نے قرآن کے اس ورق کو دکھانے کی فرمایش کی جس کی تلاوت کی جا رہی تھی۔ اسے پڑھنے کے بعد وہ واقعی اس کے کلامِ الٰہی ہونے کے قائل ہوئے اور اسلام لانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں چلے گئے۔

عبداللہ بن ابو نجیح المکی اپنے دوساتھیوں (جن کے نام اُنھوں نے دیے ہیں) یا ایک گم نام راوی کی اسناد پر ایک دُوسرا بیان دیتے ہیں۔ ان کے بموجب حضرت عمرؓ اصل میں ایک رات خانہ کعبہ میں حضورؐ کی تلاوتِ کلامِ پاک سے متاثر ہوکر اسلام لائے تھے۔ پہلے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ اپنی بہن کی تلاوت سے متاثر ہوئے تھے اور اُنھوں نے قرآن کا وہ ورق طلب کیا تھا تاکہ خود اس کا مطالعہ کر سکیں، جبکہ دُوسرے بیان کے مطابق وہ حضورؐ کی نجی عبادت و تلاوت سے متاثر ہُوئے تھے۔ بیان کی ابتدا میں فیما بلغنی کا سابقہ ملتا ہے لیکن اس جملے کو اس واضح اور صریح بیان کی روشنی میں منسوخ سمجھنا چاہیے کہ یہ مدینہ کے لوگوں میں گردش کرتا ہُوا ایک مسلّمہ خیال تھا۔ ابنِ اسحٰق یہ بات کہہ کر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ واللہ اعلم بالصواب۔

ادبی اور تاریخی تنقید میں ایک مشکل مسئلہ ان متناقض روایات کی شکل میں سامنے آتا ہے جو طبری جیسے ان تھک شخص نے ابنِ اسحٰق کے دوشاگردوں یُونس بن بکیر اور سلامہ بن الفضل سے اکٹھی کیں جبکہ سلامہ بن الفضل کو اس باب میں ابنِ اسحٰق کے ایک اور شاگرد علی بن مجاہد سے مدد ملی تھی۔ اوّل الذکر (یونس بن بکیر) نے کوفہ کے مقام پر ان کے محاضرات میں شرکت کی تھی اور دُوسرے دو حضرات نے مقامِ رَے پر۔ تینوں حضرات کا دعویٰ ہے کہ ابنِ اسحٰق نے عفیف نامی شخص کی سند پر اُنھیں جو کچھ بتایا وہ اسے آگے پیش کر رہے ہیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

قصص الانبیا سے شدید طور پر متاثر ہونے اور شیعیت کے لیے نرم گوشہ رکھنے سے قطعِ نظر، میرا خیال ہے کہ ہر شخص اس بات کی توثیق کرے گا کہ "سیرت رسول اللہ" دیانت داری اور صداقت کے ساتھ نیز غیر جانب داری سے —— جو بالعموم ایسی تحریروں میں خال خال ہی نظر آتی ہے —— لکھی گئی ہے۔

الزبیر ہی کے قصّے کو لیجیے جسے اس کی اولاد، جائداد، جان سب بخش دی گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے

زندگی پھیکی نظر آتی تھی کیونکہ اس کے قبیلے کے بہترین لوگ مارے گئے تھے۔ اب کوئی بھی اس قصّے کو یہ تسلیم کیے بغیر نہیں پڑھ سکتا کہ یہاں ہمیں امرِ واقعہ کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی لائقِ اعتنا ہے کہ سوائے ایک غیر جانبدار مورخ کے یہ کس کا حوصلہ تھا کہ وہ اپنی کتاب میں ایسے اشعار شامل کر لیتا جن میں حجاز کے یہودیوں کی نجابت اور فیاضی کو سراہا گیا تھا۔ ابن اسحٰق کے باب میں قدماء کا شکی رویّہ مجھے مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں ابنِ اسحٰق کے مابعد کی حیات الرسولؐ پر مبنی کتب سے اس کا تقابل کر کے دیکھنا چاہیے کہ تاریخی اور مثالی پیغمبر میں کیا فرق ہے[۳۱]

شاعری

"سیرت" میں شامل نظموں کے مستند ہونے کے سلسلے میں ابنِ ہشام نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں۔ بہر حال اس طرح کی تمام شاعری کو بیک جنبشِ قلم رد کرنے کے رویّے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ جنگِ بدر کے شرکاء کی شاعری کے بارے میں (خواہ اس میں حسّان بن ثابت کے اشعار شامل ہوں یا نہ ہوں جن کے بارے میں اُنھوں نے کہا ہے کہ یہ اشعارِ (ابو اسامہ) بدر کے شرکاء کی جانب منسوب تمام شاعری سے زیادہ مستند ہیں، دیکھیے صفحہ ۵۳۴) ابنِ ہشام "سیرت" میں شامل شاعری کے معتدبہ حصّے کے بارے میں اپنے گہرے شکوک کا اظہار کرتا ہے۔ بہر کیف ابنِ اسحٰق کو اس وقت تک ایسی شاعری کے شمول کے بارے میں جس کا معتدبہ حصّہ واقعی جعلی ہے، الزام نہیں دیا جا سکتا جب تک مکمل تحقیق و تفتیش نہ کر لی جائے اور جو اب تک کی نہیں کی گئی۔ صفحہ ۲۰۴ اور صفحہ ۲۰۸، پر جن نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اُنھوں نے عاصم بن قتادہ سے حاصل کیں جبکہ صفحہ ۵۹۰، ۷۸۹، اور ۷۹۳ والی نظمیں عبد اللہ بن ابو بکر کے حوالے سے نقل کی گئیں[۳۲] ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ بھی اشعار کے حوالے دیا کرتا تھا[۳۳]

اُس شاعری کے ایک ابتدائی دور کا نقاد الجمحی (متوفی ۲۳۱ ھ) جو اگرچہ ابنِ اسحٰق پر محاکمہ کرتے ہوئے شاید قدرے یک رخا اور غیر متوازن ہو گیا ہے، بعض ایسے نتائج نکالتا ہے جو خاصا وزن رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "محمد بن اسحٰق ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے شاعری کو دھچکا لگایا، اس کا حلیہ بگاڑا اور ہر قسم کے کوڑے کرکٹ کو مدوّن کر دیا۔ وہ سیرتِ رسولؐ کے سلسلے میں سند کا درجہ رکھتا تھا اور لوگ اس کی سند سے شاعری کا حوالہ دیتے تھے۔ وہ تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتا تھا کہ وہ شاعری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے اور یہ کہ اس نے تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا کہ جو شاعری اس تک پہنچی، اسے دوسروں تک منتقل کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس نے "سیرت" میں ایسی نظمیں بھی درج کر دی ہیں جو ان مردوں اور عورتوں سے منسوب کی گئیں جنھوں نے ایک ایسی سطر بھی نہیں لکھی تھی —— بلکہ اس نے تو حد یہ کر دی کہ عاد اور ثمود کی نظمیں بھی اس میں شامل کر دیں، کیا وہ خود سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ان قوموں کو تو تباہ ہوئے ہزاروں سال کا عرصہ ہو چکا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ "اللہ نے عاد اور ثمود کو تباہ کر ڈالا اور ان کا نام و نشان تک نہ چھوڑا۔"[۳۴] اور یہ کہ عاد کے بارے میں قرآن میں آیا "کیا تمھیں ان کا نام و نشان دکھائی دیتا ہے؟"[۳۵] اور

یہ کہ "خدا ہی جانتا ہے عاد اور ثمود کے بارے میں اور ان کے بارے میں جو ان کے بعد آئے"[۳۶] سو یہ نظمیں اس تک کس ذریعہ سے پہنچیں؟ ان میں سے بعض نظموں کے طبری نے حوالے دیے ہیں[۳۷]۔

ابن الندیم[۳۸] تو اس سے بھی آگے جاتا ہے کہ ابنِ اسحٰق ان جعل سازوں کی سازباز میں شریک تھا جنھوں نے اس کے لیے شعر گھڑے اور جب اس سے ان اشعار کو اپنی کتاب میں شامل کرنے کے لیے کہا گیا، اس نے یہی کیا اور یوں ان بھاٹوں اور سخیف الکلام لوگوں کے سبب اپنی رسوائی کا موجب بھی بنا[۳۹]۔

یہ بات واضح ہے کہ اس زمانے میں "سیرت" میں شامل شاعری پر نقد و نظر صرف تاریخی یا اس سے کم تر درجے میں ادبی یا اسلوبی حوالوں ہی سے ممکن ہے۔ اس شاعری کا کچھ حصہ جو حملوں، جھڑپوں، قبائلی تفاخر اور مراثی پر مشتمل ہے۔ وہ تو معاصر منابع ہی سے آیا ہے اور کوئی بھی معقول آدمی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ مکی اور مدنی شعراء میں اس قسم کے شعری مقابلے ہُوا ہی کرتے تھے۔ قدیم عرب معاشرے کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ یہی شعری ترشحات ہی تو ہیں جیسا کہ ہوروونز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ قبل از اسلام شاعری میں اس قسم کے شعری مقابلے عام ہوا کرتے تھے اور مزید برآں یہ کہ قدیم عبرانی تاریخ کے بیانات میں شعر کو اکثر گھسیڑ دیا جاتا تھا اور اس وقت کے موجود اَبطال (HEROES) کی زبانی ان کا بیان ہوتا تھا، پس ان نظموں سے قطع نظر جو اصل میں ان متعدد مشاغل کی منطقی ضرورت کے طور پر لکھی جاتی تھیں، شاعری نسلی جمعیت کا اٹوٹ انگ تھی جسے کوئی بھی تاریخ نگار نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ ابنِ اسحٰق نے اپنی سیرت میں جو شاعری شامل کی اگر وہ تمام کی تمام اس معیار کی ہوتی جس کی توقع اس کے تمام قارئین کو عادتاً تھی، تو ان پر غالباً اس نوعیت کا کوئی الزام نہ لگایا جاسکتا لیکن جب انھوں نے اپنی "سیرت" میں ایسے اشعار بھی شامل کر لیے جو بدیہی طور پر پیش پا افتادہ تھے اور ساتھ ہی ساتھ صورتِ واقعہ کے خلاف بھی، اور بھُس اور مصنوعی بھی (جیسا کہ اکثر ہیں) تو عربوں کی ارتقا یافتہ جمالیاتی حِس نے، جو شاعری کے معاملے میں تو بے حد لطیف اور نازک واقع ہوئی ہے، اُسے رد کر دیا۔ جیسے کہ الجمحی نے کہا ہے کہ ابنِ اسحٰق نے اپنے بڑے اہم اور عمدہ کارنامے میں اس قسم کی بیہودہ شاعری کو شامل کر کے خود شاعری کو رُسوا کر دیا اور اس سے اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہ نکل سکی کیونکہ جو کچھ اچھا تھا، اس میں کہیں زیادہ وُہ کچھ ملا دیا گیا تھا جو بُرا اور ناقص تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ خود ابنِ اسحٰق کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی (مشمولہ) شاعری میں کہیں گڑبڑ ہے کیونکہ لکھنے والوں کا یہ ایک عام معمول ہے کہ کسی نازک لمحے پر آنے والے بیان میں وہ شعر داخل کر دیتے ہیں (جیسا کہ خود ابنِ اسحٰق نے بعض اوقات کیا ہے) جب کہ بدر اور اُحد کے نثری بیان کے بعد ابنِ اسحٰق نے مختلف "شعرا" کے تمام "کلام" کا یک قلم ڈھیر لگا دیا ہے گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ یہی کچھ میرے حوالے کیا گیا ہے۔ مجھے شاعری میں کوئی ذوق اور درک نہیں۔ تم اپنے لیے انتخاب خود کر لینا[۴۰]۔ بہر حال خواہ ابنِ اسحٰق کی جو بھی کوتاہیاں تھیں، یہ بات ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ ابنِ ہشام اکثر اس طرح کا انتباہ (اپنی کتاب میں) درج کرتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر جو متن ہے اس میں ایسی سطور اور الفاظ شامل ہیں جنھیں ابنِ اسحٰق کی سند حاصل نہیں ہے۔

یہ وہ موضوع ہے جس کے لیے مفصل اور محتاط ادبی تنقید کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کلیشیہ، تشبیہات اور استعارات کی تاریخ پر کوئی ایسا شخص تحقیق کرے جو ادب الجاہلیہ اور اُموی دَور کی شاعری کا پُوری طرح مزاج شناس ہو۔ جب تک یہ ابتدائی کام مکمل نہ ہو جائے "سیرت" میں شامل شاعری کے بارے میں بحیثیت مجموعی کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ قدیم شاعری نے جعل سازوں، چربہ سازوں اور ماہرینِ لغات کے ہاتھوں بہت سے دُکھ جھیلے ہیں اور مابعد کے شعرا کے دیوان جھُوٹے راوی کی دستبرد سے نہیں بچ سکے۔ شاعرِ رسالت مآبؐ حضرتِ حسّان بن ثابتؓ کے نام بہت سی منظومات منسوب ہیں جنھیں اگر وہ سُن پاتے تو خود بھی حیرت زدہ رہ جاتے۔ اور ایسے شاعر تو مقابلۃً شاذ ہی ملیں گے کہ جن کے دواوین پر تو اُنھیں کے نام درج ہیں اور ان میں ایسے الحاقی عناصر بالکل موجود نہ ہوں جو اُن کی کاوشِ فکر نہیں ہیں[۴۱]۔

جن دنوں یہ سطور لکھی جا رہی تھیں، لندن یُونیورسٹی میں دو مقالات لکھے گئے، جن میں پہلا ڈاکٹر محمد احمد عظم کا لکھا ہوا ہے جس میں "سیرت" میں موجود شاعری کے اسلوب، زبان اور اس کے مستند ہونے کے باب میں گفتگو کی گئی ہے جبکہ دُوسرا مقالہ ڈاکٹر ڈبلیو عرفت کا ہے جس میں دیوانِ حسان بن ثابت بھی شامل ہے۔ ان دونو حضرات کے نتائجِ فکر کا خلاصہ پیش کرنا شاید بے جا نہ ہوگا۔

"سیرت" میں جتنے عرصے کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے اور خود اس کتاب کے مدوّن ہونے کے درمیان دو المناک واقعات آتے ہیں۔ پہلا تو واقعۂ کربلا ہے، جب امام حسینؓ اور اہلِ بیت کو ۶۱ھ میں شہید کر دیا گیا، اور دُوسرا ۶۳ھ میں مدینے کے سلب و نہب کا واقعہ جس میں کم و بیش دس ہزار انصار کو مع حضورؐ کے اسّی کے قریب ساتھیوں کے شہید کیے جانے کے بارے میں بتایا گیا ہے "سیرت" میں شامل شاعری کے معتدبہ حصّہ کو اس مخصوص المناک پس منظر میں پڑھا جانا مقصود تھا۔ اس کا مقصد اسلام میں انصار کے مقامِ عظمت کو نہ صرف اس حیثیت سے کہ اُنھوں نے حضورِ اکرمؐ کا اس وقت ساتھ دیا جب قریش ان کی مخالفت کر رہے تھے بلکہ بحیثیت اُن افراد کے بھی متعین کرنا مقصود تھا کہ وہ بادشاہوں سے متوارث ہیں۔ حضورِ اکرمؐ حضرت عبد المطلب کے پوتے تھے جو ہاشم اور بنی النجار کی ایک خاتون کے بیٹے تھے اور اس لحاظ سے یمنی النسل تھے۔ حضرت عبد المطلب کا مرثیہ لکھتے وقت حضرتِ حسّانؓ کہتے ہیں کہ تمھاری والدہ خزاعہ کی خالص نسل سے تھی ..... سبا کے زُعما سے اس کا شجرۂ نسب ملتا ہے[۴۲]۔

حضورِ اکرمؐ کو دی جانے والی اس بڑی مدد سے قطع نظر ——— لیعنی یہ کہ انھیں اس وقت رہائش مہیا کی گئی جب قریش کے ہاتھوں انھیں ہجرت کرنا پڑی ——— انصار کافی عرصہ پہلے سے قریش کے شراکت دار تھے۔ سو کیا یہ قصیّ کا سوتیلا بھائی رضاح نہیں تھا جس نے یمن سے آنے والے قریش کے آباؤ اجداد کی مدد کی؟ اگر انصار مددگار ثابت نہ ہوتے تو اسلام کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ حضرتِ حسّان بن ثابتؓ کا خیال ہے کہ انصار کے آباؤ اجداد کی جانب سے مدد نہ ملنے کی صورت میں قریش مکہ میں رسوخ حاصل نہ کر سکتے[۴۳]۔

صفحہ ۸ اپر انصاری شیعہ پروپاگنڈا صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے " وہ شخص جسے تم نے شہید کر دیا ہم میں سے بہترین تھا۔ وہ شخص جو کبھی زندہ تھا ہمارا آقا ہے اور تم سارے بھی حاکم ہو" ——— ان جملوں سے اکثر لوگ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں اشارا امام حسینؓ کی شہادت کی جانب ہے اور حاکموں سے مراد " اُموی " ہیں۔ تبّع نے مکہ پر فوج کشی کی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اس کے تقدس اور احترام کو بھی ملحوظ رکھا جبکہ اس کے برعکس اُمویوں کے ہاتھوں اس سے ہونے والے سلوک کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے جب حجاج نے اس پر گولہ باری کی۔

اس شاعری کی زبان کا بڑے حزم و احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر عظم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ بھی عہدِ رسالت سے متعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر عرفت بھی ان اشعار کے باب میں جو حسان بن ثابتؓ سے منسوب ہیں، کم و بیش اسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یہاں صرف چند نمایاں دلائل پیش کیے جائیں گے۔ اس کا خیال ہے کہ انصار کا وہ قصیدہ (ص ۸۹۳) جو کعب بن زہیر سے منسوب ہے اسی قافیے اور بحر میں ہے جس میں الاخطل کی نظم ہے جو اس نے یزید کی تحریک پر لکھی۔ اُس نظم میں اس قسم کے جملے ملتے ہیں " انصار کے عماموں کے نیچے گھٹیا پن اور رذالت ہے۔" ان دونوں نظموں کے بعض متعلقہ حصوں کے محتاط تقابل کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ " سیرت " میں پائی جانے والی نظم " اغانی " میں پائی جانے والی نظم کا جواب ہے۔

عبداللہ بن ابو بکر سے منسوب ہے کہ اُنھوں نے کہا " غزوۂ حرّا کے زمانے تک انصار کی عزت اور ان کی دھاک دونو قائم تھے۔ اس کے بعد لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے کہ وہ ان پر حملے کریں اور یوں ان کا مقام گر گیا۔" یہی وہ حالات ہیں جن کی روشنی میں، نہ کہ ان حالات میں جب حضور اکرمؐ کے رفقاؓ روزانہ اپنے قوت و وقار میں بڑھتے چلے جاتے تھے، اس جملے کا پس منظر تلاش کرنا چاہیے: " تم دیکھو گے کہ کوئی بھی ہمیں آلۂ کار کے طور پر استعمال نہیں کرے گا سوائے اس رذیل شخص کے جو گمراہ ہو چکا ہے۔" (ص ۶۲۶)

صفحہ ۸ پر ایک نظم موجود ہے جسے ابنِ ہشام نے حضرتِ حسانؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن سے منسوب کیا ہے حالانکہ یہ نظم واضح طور پر کسی بعد کی نسل کے عہد سے متعلق ہے " میرا قبیلہ تو وُہ ہے جس نے حضور اکرمؐ کو پناہ دی اور ان پر اس وقت ایمان لائے جب سوائے چند منتخب عظاؓ کے جو نیک لوگوں کے نقیب پیش رس اور انصار کے معاونین میں سے تھے، اس سرزمین کے تمام لوگ کفار تھے۔" اس نظم کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص حضورِ اکرمؐ کے باب میں اپنی سابقہ خدمات کا ذکر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس نظم کی زبان حضرتِ حسانؓ سے منسوب کرنا عیب سا لگتا ہے۔ حضرت حسانؓ ہی تو تھے جو نئے آنے والے بے گھر اور بے ٹھکانہ لوگوں کو " جلابیب " کہا کرتے تھے اور انھیں نہ ٹلنے والی مصیبت خیال کرتے تھے۔ اُنھوں نے مہاجرین میں سے کسی شخص کو اپنے یہاں پناہ نہ دی اور نہ ہی وہ ان میں سے کسی کے برادرِ (معنوی) بنے۔ پچھلی نسل کی جانب ایک مزید واضح حوالہ صفحہ ۹۲۰ پر پایا جاتا ہے (ابنِ ہشام نے اسے بھی عبدالرحمٰن سے منسوب کیا ہے) جو یُوں ہے " وہ لوگ حضورِ اکرمؐ کے انصار تھے اور وہی میرے لوگ ہیں، جب میں اپنا حسب نسب بیان کرتا ہوں

تو میں انہی لوگوں ہی سے متعلق ٹھہرتا ہوں۔"

ڈاکٹر عرفت نے بتایا ہے کہ "سیرت" میں حضرتِ حسانؓ کی جانب ۸۰ نظمیں منسوب کی گئی ہیں۔ ان میں سے پندرہ کی صحت یا تو مکمل طور پر مشکوک ہے یا ان کی مکمل نفی کی گئی ہے۔ صفحہ ۴۰ پر پائی جانے والی نظم کا متن اپنی متبادل صورتوں میں اس طریقۂ کار کی نشان دہی کرتا ہے جس کے تحت حضرتِ حسانؓ کی جانب منسوب اشعار کا جعلی ادخال ہوا اور اضافی اشعار گھڑے گئے۔ یہاں طبری صرف پہلے پانچ اشعار کا حوالہ دیتا ہے: "دیوان" میں پہلے مصرعے کے بعد دو اشعار ملحق کیے گئے اور دو کا آخر میں اضافہ کیا گیا۔ اس کے برعکس "سیرت" میں شامل آخری تین اشعار دیگر مستند لوگوں میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتے۔ "اغانی" میں یہ نظم اور بھی طویل ہے ——— مصعب کی روایت کے مطابق مگر الزُہری کی سند کے بغیر۔

حضرت حسانؓ کی جانب منسوب جعلی شاعری کا ایک ثبوت صفحہ ۳۶۹ پر ملتا ہے جو اصل میں بعد کے شعراء کی نسل سے متعلق ہے۔ یہاں حضورؐ کی مدحت نہیں کی گئی بلکہ ان کے "گھرانے" کی: "وہ لوگ کتنے نجیب ہیں جن کے فریق پیغمبرؐ ہیں . . . . وہ زندہ لوگوں میں بہترین ہیں"۔ جب ہماری نگاہ اس غصّے کی جانب جاتی ہے جو انصار کو عموماً اور حضرتِ حسانؓ کو خصوصاً اس وقت آیا جب جنگِ حنین کے بعد مالِ غنیمت میں سے انھیں کچھ حصّہ نہ ملا تو اس صورت میں اس سطر کا کہ "ان سے جو کچھ مل جائے لے لو جب کہ وہ غصّے کے عالم میں ہوں اور جو شے وہ نہ دیں اسے خاطر میں نہ لاؤ" ذکر بے محل سا لگتا ہے۔

ایک اور نکتہ جو حضرتِ حسانؓ کی جانب منسوب نظموں کا ابطال کرتا ہے یہ ہے کہ ان میں قبیلۂ اوس کو اکثر بڑی عظمت دی گئی ہے۔ یہ بات مانی نہیں جا سکتی کہ ایک خزرجی (قبیلۂ خزرج کا فرد) اپنے قبیلے کے کارناموں کو نظر انداز کر دے یا انھیں دُوسرا درجہ دے جیسا کہ ہم صفحہ ۴۵۵ پر دیکھتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام آنے کے کافی عرصہ بعد تک ان دونو قبائل میں دشمنی قائم رہی۔ بعد کے آنے والے ایک انصاری کی کتاب کی ایک سامنے کی مثال صفحہ ۷۱۱ پر درج ہے جس میں ایک نظم کا آغاز یُوں ہوتا ہے: "اے میرے لوگو! کیا تقدیر کو ٹالا جا سکتا ہے، کیا پچھلے اچھے دن لوٹ سکتے ہیں؟" یہ رویّہ (جو اس جُملے میں ظاہر ہے) ایک مسلمان کے لیے حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں ممکن ہی نہیں۔

علاوہ ازیں جب حضرتِ حسانؓ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ "ایک ایک کرکے بہترین مسلمان رخصت ہو گئے۔ (دیکھیے صفحہ ۷۹۹) تو یہ بات یاد رکھنا کافی ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ کے تمام اہم صحابہ جنگِ اُحد میں بچے رہے لیکن جب اس غیر محتاط جعل ساز نے یہ بات لکھی تو تمام بہترین مسلمان واقعی مدّت ہوئی، اپنے خالقِ حقیقی سے مل چکے تھے۔ لیکن اس جعل ساز کا اصل مقصد جس تک ہماری رسائی ابھی نہیں ہو سکی تھی یہ تھا کہ خاندانِ ہاشم کی تجلیل کی جائے یعنی یہ کہ وہ اقرب الی اللہ ہیں۔ "اُس نے ان پر اپنی دانش نازل فرمائی اور انہی میں وہ کتاب لانے والا مقدس شخص شامل ہے۔" گویا یہاں شیعانِ علی اللہ کے دوست اور ولی ہیں اور حضورؐ بھی اس گھرانے کے ایک رکن سے ہیں۔ اس گھرانے کو دانشِ نورانی ودیعت کی گئی ہے۔

ان دو مقالات سے اس نازیبا زبان کی بھی قلعی کھل جاتی ہے جو ان میں بیشتر نظموں میں استعمال کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مشکلات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے جن کا ایک مترجم کو اس وقت سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ عربی ترکیب الکلام

اور علم ہیئتِ لسان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ قصہ مختصر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات (صاحبانِ مقالات) نے مستند دلائل کی بنیاد پر یہ بات صاف کر دی ہے کہ قدیم نقادوں خصوصاً النحمی کے فیصلے بہ تمام و کمال، جواز و انصاف پر مبنی ہیں[۴۴]

گم شدہ اصل نسخے کی جزوی تعویض (RESTORATION)

ایک وقت تھا جب ابن اسحٰق کے اصل نسخے کا متن کم از کم پندرہ روایتوں میں موجود تھا۔[۴۵]

۱۔ ابراہیم بن سعد	(۱۱۰ - ۱۸۴ھ)	مدینہ
۲۔ زیاد بن عبداللہ البکائی	(متوفی ۱۸۳ھ)	کوفہ
۳۔ عبداللہ بن ادریس الاودی	(۱۱۵ - ۱۹۲ھ)	〃
۴۔ یونس بن بکیر	(متوفی ۱۹۹ھ)	〃
۵۔ عبدہ بن سلیمان	(متوفی ۱۸۷/۱۸۸ھ)	〃
۶۔ عبداللہ بن نمیر	(۱۱۵ - ۱۹۹ھ)	〃
۷۔ یحییٰ بن سعید الاموی	(۱۱۴ - ۱۹۴ھ)	بغداد
۸۔ جریر بن حازم	(۸۵ - ۱۷۰ھ)	بصرہ
۹۔ ہارون بن ابو عیسیٰ		بصرہ؟
۱۰۔ سلمہ بن الفضل الابرش	(متوفی ۱۹۱ھ)	رَے
۱۱۔ علی بن المجاہد	(〃 ۱۸۰ھ)	〃
۱۲۔ ابراہیم بن المختار		〃
۱۳۔ سعید بن بزیع		
۱۴۔ عثمان بن ساج		
۱۵۔ محمد بن سلمہ الحرانی	(متوفی ۱۹۱ھ)	

میرا مقصد یہ رہا ہے کہ جس حد تک بھی ممکن ہو ابن اسحٰق کے اصل متن کو خواہ اس صورت میں جس صورت میں یہ ابن اسحٰق کے قلم سے نکلا، خواہ جس انداز میں اُنھوں نے اپنے سامعین کو لکھوایا، بعد کی آنے والی کتب میں شامل اقتباسات کی مدد سے اور "مبداء" والے حصّے کو نظر انداز کرتے ہوئے جیسا کہ ابن ہشام نے کیا (جن کی پیش کردہ وجوہ میں سے ایک سے مجھے کم از کم اتفاق ہے) بحال کیا جائے۔ پہلے پہل تو میں یہ سوچنے پر آمادہ ہُوا کہ اصل متن کا بہت سا حصّہ کھو چکا تھا اور ممکن ہے کہ واقعی کھو چکا ہو، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ حضور اکرمؐ کی ذات پر کیے جانے والے ناپاک حملے جن کا ذکر ابن ہشام نے اپنے ابتدائیے میں کیا ہے اور کہیں نہیں ملتے، لیکن بحیثیت مجموعی میرا خیال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ابن اسحٰق نے جو کچھ لکھا اس کا معتد بہ حصّہ

ہمارے پاس ہو۔ یہ ضرور ہے کہ حضرت علیؓ کی شان میں اور حضرتِ عباسؓ کے خلاف بہت کچھ کہا گیا لیکن اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس قسم کا لوازمہ اس دَور کے متعلق ہمارے علم میں کوئی خاص اضافہ کرسکے گا۔ امکانِ غالب ہے کہ ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث وہ مقطوعات ہیں جو پیراگراف ہیں اور جن میں وہ معلومات یکجا ہیں جو ابنِ اسحٰق نے یہود و نصاریٰ سے حاصل کیں لیکن امکانِ کُلّی ہے کہ " مبداء " میں ان کا معتدبہ حصّہ موجود تھا۔ بہرحال یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اقتباسات جو رہنے دیے گئے ہیں ان کی بنا پر اس کے بعض ابتدائی نقادوں نے غم و غصّہ کا اظہار کیا ہو ابن الکلبی کی کتاب الاصنام میں مبالغہ آمیز امید آرائی سے احتراز کی تنبیہ موجود ہے۔ یاقوت نے اپنی معجم البلدان میں اس (کتاب الاصنام) سے کثیر اقتباسات دیے ہیں جو قدیم عرب جاہلیت کے حوالے سے اتنے دلچسپ اور اہم ہیں کہ عظیم نولدیکہ نے اس امید کا اظہار کیا کہ وہ اس وقت یقیناً زندہ رہے گا جب تک گم شدہ اصل متن دریافت نہیں ہوجاتا۔ وہ واقعی زندہ رہا۔ لیکن اصل متن کے یاقوت کے محولہ اقتباسات سے تقابل کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ عملاً تمام قابلِ قدر حصّہ اپنایا جا چکا تھا اور اصل متن کی دریافت سے کسی خاص اہم بات کا علم ممکن نہیں تھا۔ البتہ " سیرت " کے موضوع کی نوعیت کے سے کام میں اس بات کا امکان غالب ہے کہ اس کا مدیر و مولّف (جیسے کہ ابنِ ہشام) بیان کو کہیں توڑ موڑ دے۔

وہ مصنفین جن کے یہاں اصل متن کے کچھ حصّے کی بازیافت ممکن ہے ، یہ ہیں :

۱ ۔ محمد بن عمر الواقدی (متوفی ۲۰۷ ھ)

۲ ۔ ابو الولید محمد بن عبداللہ الازرقی ـــــ اپنے جدِ امجد کے توسّط سے (متوفی قریباً ۲۲۰ ھ)

۳ ۔ محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ ھ)

۴ ۔ ابو عبداللہ محمد بن مُسلم بن قُتیبہ (متوفی ۲۷۰ / ۲۷۶ ھ)

۵ ۔ احمد بن یحییٰ البلاذُری (متوفی ۲۷۹ ھ)

۶ ۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ ھ)

۷ ۔ ابو سعید الحسن بن عبداللہ السیرافی (متوفی ۳۶۸ ھ)

۸ ۔ ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی (متوفی ۴۵۰ ھ)

۹ ۔ ابو الحسن علی بن الاثیر (متوفی ۶۳۰ ھ)

۱۰ ۔ یوسف بن یحییٰ التادلی المعروف بہ الزیات (متوفی ۶۲۷ ھ)

۱۱ ۔ اسماعیل بن عمر بن کثیر (متوفی ۷۷۴ ھ)

۱۲ ۔ ابو الفضل احمد بن علی ..... بن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ ھ / بمطابق ۱۴۴۹ ء)

ہمارے مقصد کے لیے مندرجہ بالا کتب میں الطبری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے جس کے متن کی بنیاد سلمہ اور یونس بن بُکیر کی روایت پر ہے . . . .

۱۔ **الواقدی :** اس کی کثیر تصانیف میں سے صرف "مغازی" بچی ہے۔ ۱۸۵۶ء میں اس کا ایک تہائی حصہ فان کریمر نے ایک کمزور مخلوطے کی بنیاد پر شائع کیا اور جب تک یہ کتاب پوری طرح مرتب نہیں ہو پاتی، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ممکن نہیں۔ ولہاوزن نے اس کا جو ملخص متن شائع کیا اس سے قاری کو تمام اہم حقایق کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے تلخیص کے اسلوب نے اسے متن میں موجود ان اشکالات سے صرفِ نظر کرنے کا موقع فراہم کر دیا جو فی الاصل تشریح طلب ہیں۔ بلاشبہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا حوالہ دینا نہیں چاہتا تھا جو مغازی پر بحیثیت ایک سند کے پہلے ہی خاصی شہرت کا حامل تھا اور یوں حوالہ دے کر وہ ظاہر کرتا کہ اس کی کتاب اپنے پیشرو کی کتاب کی ایک توسیع محض کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ اس بات کا کسی طرح بھی امکان نہیں کہ اس نے ابنِ اسحٰق کی کتاب یا روایتی قصص سے استفادہ کیا ہو کیونکہ وہ براہِ راست اپنی اسناد یعنی الزہری، معمر اور بعض دیگر راویوں کے حوالے دیتا ہے۔ اس کے برعکس اس نے ابنِ اسحٰق کی، جس کا اس نے نہایت گرمجوشی سے بحیثیت مورخ، ماہر سلسلۃ النسب اور راوی کے ذکر کیا ہے، کہیں تخفیف نہیں کی۔ جس نے شاعری منتقل کی اور جو حدیث و روایت کا انتھک متلاشی تھا اور پوری طرح قابلِ اعتماد تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ واقدی بطور خاص اس قسم کا مصنف نہیں ہے جس سے اپنے علم کی موجودہ صورتِ حال میں ہم "سیرت" کے اصل کو مدون کر سکیں لیکن چونکہ اس کا بیان اکثر و بیشتر ابنِ اسحٰق کے بیانات (کتاب) کے متوازی چلتا ہے ——— بعض اوقات اس کے قصص کی ملخص صورت میں اور بعض اوقات توسیعی انداز میں ——— تو اگر وہ اس کا واحد معاون نہیں تو کم از کم قابلِ قدر معاون ضرور ہے۔ جب تک اس کی مغازی چھپ نہیں جاتی اور اس کا مطالعہ اس طرح کر نہیں لیا جاتا جیسا اس کا حق ہے، اس وقت تک دو نو کتابوں کا تقابلی مطالعہ ممکن نہیں۔ ایک بات بہرحال بڑی واضح ہے اور وہ یہ کہ واقدی اپنی کتاب میں اکثر ایسے قصص بیان کرتا ہے جو چشم دید گواہوں سے منسوب ہیں اور ان سے ان واقعات پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو ابنِ اسحٰق کے یہاں غیر واضح ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "سیرت" بغیر واقدی کے نامکمل ہے[۴۹]۔

۲۔ **الازرقی :** الازرقی کی "اخبارِ مکہ" "آثارِ قدیمہ" کے باب میں بہت کار آمد ہے۔ اس کی سند عثمان بن ساج ہے۔

۳۔ ابن سعد کی "اخبار النبی" بھی جس طرح بھی اس نے اپنے شاگردوں کو کم و بیش منتقل کی (مفید ہے)۔ ۳۰۰ھ میں ابنِ معروف نے اسے "طبقات" میں شامل کر لیا۔ برلن ایڈیشن کی جلد اول الف، ب اور جلد دوم الف، ب انبیائے قبل از اسلام، حضورِ اکرمؐ کی ولادت، ان کے مقصدِ حیات، ان کی ہجرت، ان کے مغازی اور ان کے وصال، تدفین اور وصال پر لکھے گئے مراثی سے متعلق ہے۔ بعض معاملات کے باب میں ابن سعد کے پاس بمقابلہ ابنِ اسحٰق کہنے کو بہت کچھ ہے، مثلاً مکتوباتِ نبوی، سفرا، حضورؐ کی آخری علالت وغیرہ البتہ قبل اسلام کے عرب سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ مغازی کے سلسلے میں اس کا اہم منبع واقدی ہے۔ "طبقات" حضورؐ کے صحابہؓ اور حدیث کے راویوں بشمول تابعینؒ سے بحث کرتی ہے۔

۴۔ ابنِ قتیبہ کی کتاب "المعارف" میں بعض مختصر اور غلط اقتباسات ملتے ہیں۔

۵ ۔ البلاذری کی " فتوح البلدان " ہمارے علم میں بہت کم اضافے کا باعث بنتی ہے ۔ ڈی جوئیجے کے اشاریے میں بارہ حوالے ملتے ہیں ، ان میں پہلے دو ، جن کا تتبع نولدیکہ نے کیا اور جو بقول جوئیجے " سیرت " میں شامل نہیں ہیں ، کو وہاں کبھی جگہ نہ ملتی کیونکہ وہ ابن اسحٰق کی فقہ پر لکھی گئی ایک گم شدہ کتاب سے متعلق ہیں ۔ ان کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین پر کس قدر پانی روک سکتا ہے تا آنکہ وہ اس کے کھیت سے اُبھر کر ہمسائے کے کھیت میں چلا جائے ۔ آخری پانچ حوالے خلفا کے زمانے سے متعلق ہیں اس لیے ہمارے موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ بعض اوقات ان سے طبری کے بیان کو تقویت ملتی ہے اور کم از کم ایک حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ روایت کو زبانی طور پر محفوظ نہیں کیا گیا تھا کیونکہ مختلف فیہ قرأت میں صرف نقطے کے پہلے حرف سے دوسرے حرف پر منتقل ہو جانے اور نتیجۃً تیسرے حرف کے غلط پڑھے جانے ہی کی صورت میں وجود میں آ سکتی تھیں ۔ حوالے مختصر اور جامع ہیں اور ان سے اس صداقت کی تو کامل نشاندہی ہو جاتی ہے جس کی مصنف کو اپنے مقصد کے لیے ضرورت تھی لیکن کلی صداقت کی نہیں جو (شاید) غیر متعلق تھی ۔

۶ ۔ **طبری** : نولدیکہ نے ابن ہشام کے تصحیح شدہ نسخے میں شامل کردہ اضافات کی ایک فہرست دی ہے[۵۰] اور " سیرت " کے اصل نسخے کے ایک شاہد کے طور پر اس کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے ۔ اس کی تفسیر سے " مبدا " کے گم شدہ حصے کی بازیافت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جہاں اس کے مغایرات (VARIANTS) صرف اسلوبی ہیں اور ان سے عبارت متاثر نہیں ہوتی وہاں میں نے اُنھیں نظر انداز کر دیا ہے ۔ عملاً وہ تمام مغایرات لائیڈن ایڈیشن کے حواشی میں آپ کو مل جائیں گے ۔ طبری چار تصحیح شدہ نسخوں سے واقف تھا جو اُوپر دی گئی فہرست میں ۴ ، ۷ ، ۹ اور ۱۰ نمبر پر آتے ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ محوّلہ نسخہ یونس بن بُکیر کا ہے ۔ ایک موقعہ پر (صفحہ ۱۰۷۴ ، سطر ۱۲) وہ رائے دیتا ہے کہ ہشام بن محمد (الکلبی وفات ۲۰۴ / ۲۰۶ ھ) کی نسبت ابن اسحٰق کا بیان زیادہ اطمینان بخش ہے ۔ ابن ہشام کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور " سیرت " میں اس وقت موجود بہت سی شاعری کو حذف کر دیتا ہے ۔ کیا اس کے منتخبات میں اس کے ذوق کا دخل تھا ، کیا وہ اس میں سے کچھ کو غیر متعلق سمجھتا تھا یا کیا وہ اسے جعلی تصور کرتا تھا ۔ مجھے اس باب میں کوئی اشارہ نہیں ملا ۔ وہ اکثر ایسی اسناد دیتا ہے جو ابن اسحٰق کے یہاں نہیں ملتی (مزید دیکھیے صفحہ ۱۰۹۴ ، سطر ۱۲) کم از کم ایک موقعہ پر یوں لگتا ہے کہ بیان کو دوبارہ ڈھالا گیا ہے (دیکھیے واقدی صفحہ ۲۲۴ مع طبری صفحہ ۱۲۷۱) طبری اکثر دیگر قدما کی طرح تصلیہ اور ترضیہ حذف کر دیتا ہے[۵۲] ابن ہشام نے کعب کی نظم اور اس نظم سے پیدا شدہ اشتعال اور اس کے نتیجے میں ہونے والے قتل کے ذکر کو حذف کر دیا ہے ۔ (دیکھیے صفحہ ۶۵۱ مع طبری صفحہ ۱۴۴۵)

۷ ۔ **السیرافی** : السیرافی ، واقدی کے کام پر ایک دلچسپ اضافہ ہے ۔ (صفحہ ۸۸۲)

۸ ۔ **الماوردی** کے پاس اضافے کے لیے کوئی اہم مواد نہیں ۔

۹ ۔ **ابن الاثیر** کا میلان (اپنی " کامل " میں) اپنی اسناد کو یکجا کر دینے کی جانب ہے اور یوں وہ ان تمام سے بیانات کی کلیّت کی مدد سے اور ضمنی تفاصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہموار اور رواں بیان فراہم کرتا ہے ۔ تاہم وہ

ابنِ اسحٰق کے دس بار حوالے دیتا ہے[۵۳]

۱۰ - ابن الزیات (دیکھیے صفحہ ۶۴۰ واقدی)

۱۱ - ابن کثیر بعض اوقات ابنِ ہشام سے حرف بہ حرف متفق ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ ابنِ بکیر کا حوالہ دیتا ہے اور یوں اس کے پیش کردہ قصص وہی ہیں، صرف لفظ مختلف ہیں - میں اس روایت کا خصوصی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۲ - ابن حجر : اس کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے[۵۴]

ابنِ اسحٰق کی شہرت

ہمارا مقصد یہ تھا کہ بطور مورخ ابن اسحٰق کے مستند ہونے کے ضمن میں ان کے ہم مذہب لوگوں کی رائے درج کی جائے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان حضرات کی رائے ان کی (ابن اسحٰق کی) بعض دیگر تصانیف کے باعث بہت متاثر نظر آتی ہے جن میں سے ایک یعنی "سنن" کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کیا ہے۔ ابو یوسف (وفات ۱۸۲ھ)[۵۵] نے بکثرت اس کے حوالے دیے ہیں۔ لیکن یہ کتاب زیادہ دیر تک اپنا وجود باقی نہ رکھ سکی اور جلد ہی معدوم ہو گئی۔ اگر ہم اس کتاب کے مندرجات سے واقف ہوتے جو اپنی قدامت کے باعث مسلمانوں کی روزمرہ زندگیوں کو بے حد متاثر کر سکتی تھی بشرطیکہ اسے حضور اکرمؐ کے افعال الفاظ کے دیگر راویوں کے بیانات کو چیلنج کرنے کا موقعہ ملتا، یوں ہم کہیں زیادہ بہتر صورت میں ابنِ اسحٰق پر ہونے والی اس جرح و تنقید کی اہمیت اور مطابقت کا اندازہ لگانے کے قابل ہوتے جب یہ (تنقید) نہایت غیر مبہم طور پر مخالفانہ تھی۔ صرف اس کی کتاب "سیرت" ہی کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاتا بلکہ خود اس کی ذات کو بھی۔ اور اگر سنت پر ان کی کتاب ان فقہی مدارس کی مخالف تھی جو ابھی اپنے ارتقا کی منزل میں تھے تو ظاہر ہے کہ ابنِ اسحٰق شدید طنز و مذمت سے کہاں بچ سکتے تھے۔ اس حقیقت سے صرفِ نظر نہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ وسٹنفیلٹ نے ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس الیعمری الاندلسی (متوفی ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء) کے حوالے سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں عام نوعیت کی احادیث اور حضورؐ کی سنت سے متعلق احادیث میں نمایاں فرق و امتیاز نظر آتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بیٹا بیان کرتا تھا کہ ان کے والد نے اپنی مسند میں ابنِ اسحٰق کی روایت کردہ احادیث شامل کیں لیکن سنن پر اسے سند قرار دینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ "سیرت" میں بعض ایسی حکایات موجود ہیں جن سے بعض مسائل و معاملات میں حضورِ اکرمؐ کے معمولات کا پتا چلتا ہے اور لہٰذا مستقبل میں پیش آنے والے ایسے ہی مسائل و معاملات میں یہ دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی ایک مستند رہنما کا حکم رکھتے ہیں اور اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ایک یا دو صورتوں میں ان افعال کی تہہ میں کام کرنے والا اصول بعد کے فقہاء کے اخذ کردہ نتائج سے ٹکراتا ہے، یہ حکایات "سیرت" کا غیر اہم حصہ ہیں اور یہ بات بے کھٹکے کہی جا سکتی ہے کہ ابنِ حنبل نے ابنِ اسحٰق پر بطور سند ہونے کے جو اعتراض کیا ہے وہ تنہا ابن اسحٰق کی گم شدہ کتاب "سنن" پر ہوتا ہے۔

جیسے کہ گولڈ زیہر نے کافی عرصہ پہلے کہا تھا کہ اسلام میں روایتِ حدیث کا میدان اصل میں جنگ آزما فرقوں کا

میدان ہے جو لوگوں کے اذہان و اعمال پر غلبہ جمانے کے لیے کوشاں ہیں اور اس ذیل میں سند حضور اکرمؐ سے منسوب معروضہ یا جعلی مثال سے لیتے ہیں۔ حدیث یا مجموعہ حدیث جس قدر قدیم ہوگا اتنا ہی اس صورت میں اس قسم کے رجحان کا وجود کم نظر آئے گا لیکن ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ابن اسحٰق کبھی کبھی حضرت عباسؓ پر حضرت علیؓ کی برتری و عظمت کی ترغیب کا شکار ہو جاتے تھے۔ قاری کو یہ بات قطعاً غیر متعلق محسوس ہوگی جب وہ خود ٹھیک اس بات کا مطالعہ کر سکتا ہے کہ حضرت عباسؓ کی پوزیشن کیا تھی ——— یہ اول مخالفانہ تھی، دوم غیر جانب دارانہ' اور آخر کار جب مسئلہ بالکل صاف ہو گیا تھا، ایک پکے مسلمان تھے۔ بات صاف ہے کہ چونکہ ابن اسحٰق نے حضرت ابوبکرؓ کی شدید وفاداری اور حضرت عمرؓ کی اٹوٹ رفاقت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی، سو اس صورت میں وہ حضرت علیؓ کے دعاوی کے متعصب اور غیر متوازن حامی نہیں رہتے . . . . . ابن اسحٰق نے حضرت علیؓ کے ان دو بزرگوں (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی بے شمار خدمات کی کہیں تخفیف نہیں کی۔

خالص فن کے نقطۂ نظر سے حدیث کی تاریخ میں، یعنی حدیث کے ان جامع مجموعوں میں جنھیں تمام سُنّی العقیدہ مسلمان مستند اور مقدس خیال کرتے ہیں، ابن اسحٰق حضور اکرمؐ کے باب میں معلومہ تمام تفاصیل کے ایک دیانت دار اور صاف گو جامع ہونے کے باوجود، معمولی جگہ کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ روزمرہ کے ایسے معمولات کے باب میں ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا جن سے حدیث کی شرعی و قانونی کتب بھری پڑی ہیں، یا ان کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ اُنھوں نے اپنی "سنن" میں شامل کر دیا تھا۔ اگر وہ حضور اکرمؐ کے الفاظ نقل کرتے تو وہ ان کے بیان میں کسی واقعۂ خاص سے متعلق ہوتے ——— یعنی وہ لفظ تو اصلاً بعض حالات کے نتیجے میں صادر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ البخاری اس کے باوجود کہ وہ اکثر اپنے ابواب کے عنوانات میں ابن اسحٰق کا ذکر کرتا ہے لیکن حدیث کے باب میں شاذ ہی اس کا حوالہ دیتا ہے تا آنکہ اس حدیث کی کسی اور اسناد سے تصدیق نہ ہوتی ہو۔ مسلم جو احادیث کو صحیح، حسن اور ضعیف کے طور پر درجہ بند کرتا ہے، ابن اسحٰق کو دُوسرے درجے میں رکھتا ہے۔ جو کوئی تھوڑا بہت بھی تاریخی شعور رکھتا ہے، اس کی نظر میں یہ ایک شدید ناانصافی تھی لیکن اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ تیسری صدی کے نصف تک حدیث کی ہیئت اس کے مافیہ کے مقابلے میں زیادہ وقیع سمجھی جاتی تھی اور سلسلہ رواۃ بے عیب ہوتا تو کسی بھی بات کو ان میں شامل کیا جا سکتا تھا۔

ابن اسحٰق کے سلسلے میں مسلم کی جو رائے تھی اس کا بہترین اور جامع ملخص ابن سیدالناس نے اپنی کتاب "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" میں دیا ہے۔ اس نے ابن اسحٰق کے سلسلے میں ان تمام حوالوں کو جنھیں وہ تلاش کر سکتا تھا تلاش کیا، یہ حوالے اس کے حق میں بھی تھے اور اس کے خلاف بھی اور پھر ابن اسحٰق پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا۔ متعلقہ اقتباس تو وانفدیؒ کے یہاں ملے گا جس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہے۔ اس بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(الف) وہ لوگ جو ابن اسحٰق کے حق میں تھے:

الزُّہری: "مغازی کے ذیل میں جس شخص کے پاس بہترین معلومات ہیں وہ ابنِ اسحٰق ہیں۔ مدینہ میں اس وقت تک علم رہے گا جب تک ابنِ اسحٰق کا دم سلامت ہے۔"

شعبہ (۸۵ - ۱۶۰ھ): "حدیث میں قابلِ اعتماد۔ اپنے حافظے کے حوالے سے رواۃ کا امیر۔"

سفیان بن عُیَینہ (۱۰۷ - ۱۹۸ھ): "میں اس کی صحبت میں کم و بیش ستر سال تک بیٹھا[۵۵] اور اہلِ مدینہ میں سے کوئی بھی نہ تو اسے شک سے دیکھتا تھا نہ اس کی بُرائی کرتا تھا۔"

ابو زُرعہ (متوفی ۲۸۱ھ): پرانے علماء نے اس سے استفادہ کیا اور محدثین نے اسے آزمایا اور کھرا پایا۔ جب اس نے دُہیم کو مالک کے ابنِ اسحٰق پر عدمِ اعتماد کے بارے میں یاد دلایا تو اس نے بتایا کہ اس عدمِ اعتماد کا تعلق اس کے راوی ہونے کی صداقت سے نہیں بلکہ اس کے قدری ہونے سے متعلق ہے۔

ابو حاتم: اس کی روایات دوسرے لوگ نقل کرتے ہیں۔

ابن المدینی: حدیث اصل میں چھ افراد کا حصہ تھی۔ پھر یہ بارہ افراد کا حصہ بنی جن میں سے ایک ابنِ اسحٰق تھے۔

الشافعی: جو شخص مغازی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اسے ابنِ اسحٰق سے رجوع کرنا چاہیے۔

عاصم بن عمر بن قتادہ: جب تک ابنِ اسحٰق زندہ ہے، علم لوگوں کے درمیان رہے گا۔

ابو معاویہ: ایک عظیم دماغ، لوگ اپنی (معلوم) حدیثیں اسے سناتے تھے تاکہ اس کے قوی حافظے میں محفوظ رہ سکیں۔

البخاری: الزہری مغازی کے باب میں معلومات ابنِ اسحٰق سے لیتا تھا۔

عبداللہ بن ادریس الاودی اس کے تجربہ پر متحیر رہتا تھا اور اکثر اس کے حوالے دیا کرتا تھا۔

مصعب: جن وجوہات کی بنا پر اسے مطعون کیا جاتا تھا، ان کا حدیث سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یزید بن ہارون: اگر مجھ سے پُوچھا جائے کہ حدیث کا عظیم راوی کون تھا، تو میں کہوں گا "ابنِ اسحٰق!"

علی بن المدینی: اس کی بیان کردہ احادیث صحیح ہیں۔ مدینے میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ ہاشم بن عروہ کی جانب سے اس پر کیے جانے والے اعتراض میں کوئی جان نہیں۔ اسے موخرالذکر کی بیوی سے جوانی کے ایام میں گفتگو کا موقع ملا ہو گا احادیث کے باب میں اس کی صداقت اپنا ثبوت آپ ہے۔ میں صرف دو احادیث بتا سکتا ہوں جو عدمِ اسناد کے باعث ناقابلِ رد ہیں[۵۶]۔

العجلی: (وہ) قابلِ اعتماد (تھا)

یحیٰی بن معین: روایت کے باب میں ٹھوس اور قابلِ یقین۔

احمد بن حنبل: حدیث کے باب میں جیّد۔

(ب) اس کے بعد مصنف وُہ سب کچھ بیان کرتا چلا جاتا ہے جو ابنِ اسحٰق کے خلاف کہا گیا ہے۔ غیر اہم تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے ہمارے پاس مندرجہ ذیل اعتراضات باقی رہ جاتے ہیں جنھیں ابنِ سید الناس معرضِ بحث میں

لاتا اور اُن کی تردید کرتا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر نے کہا کہ ابنِ اسحٰق نے جب معروف لوگوں سے سُنی سُنائی باتوں کو روایت کیا تو اکثر صورتوں میں تو اس کی بیان کردہ روایات ٹھیک اور سچی تھیں لیکن بعض اوقات اس نے ایسے بے معنی اقوال بھی بیان کر دیے جن کے راوی مجہول الحال تھے۔ یحییٰ بن القطان کبھی ان کا حوالہ نہیں دیتا تھا۔ امام احمد بن حنبل ابنِ اسحٰق کو پسندیدگی سے حوالہ بناتے تھے لیکن جب یہ نکتہ اُٹھایا گیا کہ یہ قصص (بیان کردہ) کتنے حسن ہیں تو وہ حیرانی سے مسکراتے۔ ان کا بیٹا اعتراف کرتا تھا کہ اس کے باپ احمد نے اپنی "مُسند" میں ابنِ اسحٰق کی روایت کردہ بہت سی احادیث کو شامل کیا لیکن خود اُس نے (بیٹے نے) ان کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ جب اُس سے پُوچھا گیا کہ کیا اس کے والد اوامر و نواہی کے باب میں ابنِ اسحٰق کو سند سمجھتے تھے، تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ خود بھی اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتا تھا جس کی روایت صرف ابنِ اسحٰق نے کی ہو۔ وہ کوئی ایسی روایت تو بیان کرتا تھا جو اس نے متعدد لوگوں سے اکٹھی کی لیکن یہ نہیں بتاتا تھا کہ اس کے الگ الگ حصّے کس نے فراہم کیے۔ ابن المدینی کہا کرتا تھا کہ بعض اوقات تو اس کی بیان کردہ روایات بہت حسن ہوتی تھیں۔ المیمونی کی روایت تھی کہ ابن معین (۱۵۶ - ۲۳۳ھ) کہا کرتا تھا کہ وہ (ابنِ اسحٰق) ضعیف (راوی) تھا۔ لیکن بعض دُوسرے اس روایت کی نفی کیا کرتے تھے۔ الدُّوری کہا کرتا تھا کہ وہ قابلِ اعتماد تھا۔ لیکن امام مالک اور دُوسرے فقہا کی طرح اسے فقہ میں استناد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ النسائی کہا کرتا تھا کہ اس کی روایت ثقہ نہ تھی۔ الدارقطنی کہا کرتا تھا کہ اپنے باپ کے حوالے سے ابنِ اسحٰق کی بیان کردہ روایت قانونی سند کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ہاں یہ صرف اس حد تک استعمال کی جا سکتی تھی کہ اسے پہلے سے مسلّمہ بات کی تصدیق کے لیے حوالہ بنایا جا سکے۔ ابو داؤد الطیالسی (۱۳۱ - ۲۰۳ھ) کی روایت تھی کہ حماد بن سالمہ کہا کرتا تھا کہ جب تک میں بہت مجبور نہ ہو جاؤں، میں ابنِ اسحٰق کے حوالے سے کوئی حدیث روایت نہیں کروں گا۔ جب مالک بن انس نے اس کا ذکر کیا تو کہا کہ وہ تو دجّال اور کذّاب ہے۔ جب ہاشم بن عروہ کو بتایا گیا کہ اس نے (ابنِ اسحٰق نے) بعض احادیث فاطمہ کے حوالے سے روایت کی ہیں تو اس نے کہا: "بدمعاش، جُھوٹ بولتا ہے۔ وہ میری بیوی سے کب ملا؟" جب عبداللہ بن احمد نے اپنے باپ کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ یہ بات ابنِ اسحٰق کے خلاف نہیں جاتی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اس نے فاطمہ سے مکالمہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہوگی اور اسے (اس کے خاوند کو) اس بات کا علم نہ ہوگا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ مالک جُھوٹا تھا۔ ابنِ ادریس کہتا تھا کہ میں نے مالک سے مغازی کے سلسلے میں گفتگو کی اور یہ بھی بتایا کہ ابنِ اسحٰق کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کا (مغازی کا) جرّاح ہے۔ اس کے جواب میں اس نے (مالک نے) کہا "ہم نے اسے مدینہ سے نکال باہر کیا تھا۔" مکّی بن ابراہیم کہا کرتا تھا کہ اسے ابنِ اسحٰق کے محاضرات میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، وُہ اپنے بال رنگا کرتا تھا، جب اس نے صفاتِ الٰہیہ سے متعلق احادیث بیان کیں تو وہ وہاں سے اُٹھ آیا اور پھر کبھی نہ گیا۔ ایک دُوسرے موقعہ پر اس نے کہا کہ جب اس نے (ابنِ اسحٰق کے) محاضرات کو الوداع کہی وہ رَے کے مقام پر اس وقت تک اس کے بارہ محاضرات میں شریک ہو چکا تھا۔

المفضل بن غسّان کہتا تھا کہ میں اس وقت موجود تھا جب یزید بن ہارون، البکّائی کے یہاں پائی جانے والی

احادیث بیان کر رہا تھا اور بہت سے اہلِ مدینہ اسے سُن رہے تھے۔ جب اس نے ابنِ اسحٰق کا ذکر کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیئے" اس نے جو کچھ کہا اس کا ایک شمہ بھی ہمیں نہ بتاؤ، ہم خود اس سے بہتر جانتے ہیں۔" یزید ان کے درمیان (انھیں منانے) گیا لیکن وہ اس کی بات سننے ہی نہیں تھے۔ مجبوراً اسے وہاں سے جانا پڑا۔

ابو داؤد کہتے تھے کہ اُنھوں نے احمد بن حنبل کو کہتے سنا کہ ابنِ اسحٰق حدیث سے محبت کرنے والا آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے دُوسرے لوگوں کی تحریروں کو (متعلقہ بہ حدیث) بھی اپنی تحریروں میں شامل کر لیا۔ ابو عبداللہ کہتا تھا کہ وہ ابنِ اسحٰق کو مُوسٰی بن عبیدہ الربذی پر ترجیح دیتا تھا۔ احمد کہتا تھا کہ وہ درمیانی واسطوں کے بغیر احادیث اس طرح بیان کرتا تھا گویا وہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے روایت کی تھیں جبکہ ابراہیم بن سعد کی کتاب میں جہاں کہیں حدیث آتی ہے وہ کہتا تھا "الف نے مجھے بتایا"۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا "الف نے کہا"۔

ابو عبداللہ کہتا تھا کہ ابنِ اسحٰق بغداد آئے اور انھوں نے ان لوگوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جو الکلبی اور بعض دوسرں کے حوالے سے احادیث بیان کرتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا (ابنِ اسحٰق کا) کہ حدیث کے باب میں (الکلبی) سند نہیں تھا۔ الفلاس (متوفی ۲۴۹ھ) کہتا تھا کہ وہب بن جریر سے اُس ملاقات کے بعد، جس میں اس نے اس (وہب ابن جریر) کے سامنے وہ کتاب مغازی پڑھی جو ابنِ جریر کو ابنِ اسحٰق سے اپنے والد کے واسطے سے حاصل ہوئی تھی، ہم یحیٰی بن قطان سے ملے جس نے کہا کہ ہم اس سے جھُوٹ کی پوٹ لائے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول تھا کہ "مغازی" اور اسی قبیل کے دیگر معاملات میں ابنِ اسحٰق کی گفتگو ضبطِ تحریر میں لائی جا سکتی تھی لیکن فقہی معاملات میں مزید توثیق ضروری تھی۔ اگرچہ ان کی روایت کردہ احادیث کا کثیر حصّہ بغیر مناسب اسناد کے تھا لیکن وہ (احمد بن حنبل) ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس وقت تک جب تک وہ یوں بیان کر رہے ہوتے کہ "الف نے ہمیں بتایا"، "ب نے مجھے اطلاع دی" اور "میں نے سنا"۔ ابنِ معین، ابنِ اسحٰق کو فقہی معاملات میں سند کے طور پہ لانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ابو حاتم کہتا تھا کہ وہ حدیث کے معاملے میں کمزور تھے لیکن افلح بن سعید پہ قابلِ ترجیح تھے اور ان کی روایات کو ضبطِ تحریر میں لایا جا سکتا تھا۔ سلیمان التیمی انھیں جھُوٹا کہتا تھا اور یحیٰی بن قطان کہتا تھا کہ وہ اس کی بیان کردہ حدیث کا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہے، وہ جھُوٹا تھا۔ جب یحیٰی نے وہیب بن خالد سے پوچھا کہ کیا چیز اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ابنِ اسحٰق جھوٹے تھے تو اس نے بتایا کہ مالک نے قسم کھائی تھی کہ وہ جھُوٹا ہے اور اس نے اپنے اس موقف کے لیے ہاشم بن عروہ کی قسم کو بطور دلیل پیش کیا تھا۔ موخرالذکر کے اس موقف کی وجہ یہ تھی کہ ابنِ اسحٰق اس کی بیوی فاطمہ کے حوالے سے احادیث روایت کرتے تھے۔

ابو بکر الخطیب کا قول تھا کہ بعض مستند محدثین اس کی احادیث کو بطورِ قانونی شہادت کے قبول کرتے تھے جبکہ بعض دُوسرے نہیں کرتے تھے۔ اس کی سند کی تردید کی منجملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شیعی تھا، اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ انسان آزاد ارادے کا مالک ہے۔ اس کی اسناد ناقص تھیں، جہاں تک اس کی صداقت کا

تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

البخاری انھیں بطور سند حوالہ بناتے تھے اور مسلم اکثر ان کا حوالہ دیتے تھے۔ ابوالحسن بن القطان انھیں "حسن" کے درجے میں رکھتا تھا کیونکہ لوگ ان کے افکار کو متنازعہ سمجھتے تھے۔ جہاں تک فاطمہ سے روایت کا تعلق ہے الخطیب نے ہمیں ایک اسناد مہیا کی ہے جو ابن اسحٰق اور فاطمہ سے ہوتی ہوئی اسماؓ بنت ابی بکرؓ تک پہنچتی ہے "میں نے ایک عورت کو حضور اکرمؐ سے سوال کرتے اور کہتے سُنا" میری ایک سوکن ہے اور میں اسے مشتعل کرنے کے لیے جھُوٹ مُوٹ خود کو اپنے خاوند سے مطمئن ظاہر کرتی ہُوں"۔ حضورِ اکرمؐ نے فرمایا: "جو کوئی بھی اپنے آپ کو اُس سلوک پر مطمئن ظاہر کرتا ہے جو سرے سے اس سے کیا ہی نہیں گیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس نے اُوپر تلے دو جھُوٹے لباس پہن لیے ہوں"[59]۔ ابوالحسن کہتا تھا کہ فاطمہ سے یہی روایت تھی جس نے ابنِ اسحٰق کی شہرت کو نقصان پہنچایا اور جس کی بنا پر اس کے شوہر ہشام نے اسے جھوٹا قرار دیا۔ مالک نے اس کی تقلید کی اور دُوسروں نے اس کی نقل کی۔ بہرحال اس کی سند کے حوالے سے اور بھی کئی احادیث موجود ہیں۔

ابنِ سیدالناس نے مصنف "مغازی و سِیَر" کے دفاع میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی تعریف کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ وہ فوراً بات کی تہہ تک جا پہنچتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایسی باتوں میں اصلیت کا کس قدر قحط ہے۔ اگرچہ خطیبوں کی طرح وہ تنقید کرتا ہے لیکن وُہ بن کے یہ مُوقف اختیار کرتا ہے کہ اوّلیں دَور کے لکھنے والوں نے احادیث کی اسناد بھی مہیا کی ہوں گی جنھیں آنے والی نسلوں کے ان شدید مطالبات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا جن کے سامنے جعلی احادیث کا پورا سمندر موجزن تھا جو رسولِ اکرمؐ اور ان کے صحابہؓ سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ ابنِ سیدالناس کی سلامت روی اور عقلِ سلیم "تدلیس" کے اس الزام سے متفق نہ ہو سکتی تھی جس نے روایت کے سلسلے کی کسی کڑی کو حذف کر کے یا اصل راوی ہی کے بیان پر اکتفا کر کے بعد کے دَور میں خود بخود احادیث کو غیر مستند قرار دے دیا۔ اس ضمن میں اس کا خیال تھا کہ اگرچہ بعض جگہ ابن اسحٰق کی روایات میں مکمل دستاویزی شہادتوں کی کمی ہوتی ہے لیکن وہ جو مفہوم و مافیہ بیان کرتے ہیں، اس میں ان کی صداقت پر کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور جہاں تک ان کے شیعی اور ان پر قدری ہونے کے الزام کا تعلق ہے، وُہ کسی دُوسرے میدان میں تو یقیناً صحیح ہو گا لیکن "سیرت" سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مکّی بن ابراہیم ان کے محاضرات کو اس وقت چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا جب اس نے ابنِ اسحٰق سے صفاتِ الٰہیہ سے متعلقہ روایات سنیں؛ جب اس قسم کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے تو قدماء میں سے اکثر ان کا پُوری طرح ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یزید کا بیان کردہ قصہ، کہ اہلِ مدینہ ابنِ اسحٰق کی سند سے بیان کی جانے والی روایات نہیں سُنتے تھے۔ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یزید ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ آخر اہلِ مدینہ یہ روایات کیوں نہیں سُننا چاہتے تھے؛ اس صورت میں ہم صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم ایک صحیح اور سچّی حدیث پر محض اس وجہ سے اعتراض جڑ دیں کہ ہمارے نزدیک اس میں نقص ہے۔ ہم پہلے ہی اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یحییٰ القطان ان کی کسی حدیث کا حوالہ

نہیں دیتا تھا اور وُہیب کی سند (بتوسط مالک) پر اُنھیں کاذب قرار دیتا تھا اور یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ اہلِ مدینہ کے اس رویئے کا باعث، جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، یہی شخص تھا۔ احمد بن حنبل اور ابن المدینی نے ہشام کے اعتراضات کا شافی جواب دیا ہے۔

جہاں تک نُمیر کے الزام کا تعلق ہے کہ ابنِ اسحٰق مجہول الحال لوگوں کی سند کے حوالے سے احادیث روایت کرتے تھے تو ایسی صورت میں اگر ان کا اعتبار اور دیانت روایت کے لائق نہ بھی ہوں تب بھی شک ان اور ان کے اطلاع دینے والوں میں منقسم ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ہم جانتے ہیں کہ وُہ قابلِ اعتماد ہیں تو ایسی صورت میں الزام ان مجہول الحال لوگوں پر آتا ہے نہ کہ اُن پر۔ اسی قسم کے اعتراضات سفیان ثوری اور دیگر راویانِ حدیث پر کیے گئے ہیں جن کی حدیثیں اسی طرح باہم متخالف ہیں اور ان میں سے جو مجہول الحال لوگوں پر مبنی ہیں وہ تو رد کر دی جاتی ہیں اور جو معلوم الحال لوگوں سے مروی ہیں انھیں قبول کر لیا جاتا ہے۔ سُلطان بن عُیینہ نے جریر الجُوفی سے ایک ہزار سے متجاوز احادیث سُننے کے بعد اسے ترک کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود وُہ اس کی سند اور حوالے سے احادیث روایت کرتا تھا۔ شعبہ کئی روایات اس کے اور دیگر راویوں کے حوالے سے بیان کرتا ہے جن کو "ضعیف" کا طعن دیا جاتا تھا۔

جہاں تک احمد کی اس شکایت کا تعلق ہے کہ وُہ احادیث کو ان میں شامل لوازمے کے فراہم کنندگان کے نام لیے بغیر مرکب صُورت میں ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان راویوں کے الفاظ اگرچہ متعدد ہوتے تھے لیکن متفق علیہ ہوتے تھے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ان کے معانی ملتے جلتے ہوتے۔ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ واثلہ بن اسقع نے کہا "اگر میں تمھیں کسی حدیث کا مفہوم بیان کر دُوں (من و عن ان الفاظ میں نہیں جو بیان کیے گئے تھے) تو تمھارے لیے یہ کافی ہے۔" علاوہ ازیں محمد بن سیرین کہتا تھا کہ وہ دس مختلف محدثین سے احادیث سُنتا تھا جو دس مختلف الفاظ میں ہوتی تھیں لیکن ان کے معانی ایک ہی ہوتے تھے۔ احمد کی یہ شکایت، کہ ابنِ اسحٰق دُوسرے لوگوں کی تحریروں کو اپنے بیانات میں شامل کر لیتے تھے، اس قابل نہیں کہ اسے سنجیدگی سے لیا جائے تا آنکہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اُنھیں ان تحریروں کو دُہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ ہمیں اس اسلوبِ روایت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے: یعنی یہ کہ اگر الفاظ صاف طور پر زبانی روایت کے متقاضی نہ ہوں، پھر تو تدلیس کا اعتراض قائم رہتا ہے[۲۵] لیکن ہمیں اس وقت تک اس الزام کو قبول نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ الفاظ کا صاف طور پر یہ مطلب نہ ہو۔ اگر وہ (ابنِ اسحٰق) واضح طور پر یہ کہیں کہ اُنھوں نے لوگوں کو فلاں بات کہتے سُنا جبکہ در اصل اُنھوں نے ایسی بات بالکل نہیں سُنی تھی تو یہ بالکل سفید جھوٹ اور صریح تدلیس ہے۔ ابنِ اسحٰق کے باب میں ایسی بات کہنا قطعاً غلط ہے تا آنکہ لفظ ہمیں ایسا سوچنے پر مجبور نہ کر دیں[۲۶]

جب ابنِ احمد نے اپنے باپ کے حوالے سے یہ بات کہی کہ وہ ابنِ اسحٰق کو فقہی معاملات میں سند نہیں مانتے تھے۔ حالانکہ وہ غیر فقہی معاملات میں اسے سند ماننے کے معاملے میں بڑے فراخدل تھے (تو واقعہ یہ ہے کہ) "مغازی" اور "سیرتِ رسول" کا بیشتر حصہ انھی غیر فقہی معاملات پر مشتمل ہے تو ایسی صورت میں اُنھوں نے اس بُری رائے کا اطلاق "سنن" کے علاوہ دیگر معاملات پر بھی کیا۔ ابنِ اسحٰق کی سچّی شہرت اس قسم کے الزام کو خارج از امکان قرار دیتی ہے۔

جہاں تک یحییٰ کی اس بات کا تعلق ہے کہ وہ قانونی معاملات میں قابلِ اعتماد تو تھے لیکن سند کا درجہ نہیں رکھتے تھے تو ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ انھیں قابلِ اعتماد تو کہا گیا ہے۔ اگر صرف العُمَری اور مالک جیسے لوگ ہی قابلِ قبول ہوتے تو ایسی صورت میں قابلِ قبول اسناد صرف گنی چُنی ہی رہ جاتیں! یحییٰ بن سعید نے غالباً آنکھیں بند کرکے مالک کی تقلید کی کیونکہ اس نے مالک سے وہ کچھ سُنا جو ہشام نے ابنِ اسحٰق کے بارے میں کہا تھا۔ قانونی معاملات میں ابنِ اسحٰق کو سند ماننے پر اس کے انکار کا جواب احمد کے باب میں دیا جا چکا ہے۔ یحییٰ نے ان روایات اور دیگر روایات میں مکمل قبول یا صریح ردّ کے سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔

ابنِ اسحٰق کی شہرت پر کیے جانے والے دیگر اعتراضات ایسے نکات کی بنا پر ہیں جو واضح نہیں کیے گئے۔ اور اکثر صورتوں میں عوامل غیر شائستہ ہیں۔ رہا فقہی معاملات کا مسئلہ تو ان میں بھی ابُوعیسیٰ الترمذی اور ابوحاتم بن حبّان (متوفی ۳۵۴ھ) نے انھیں بطور سند استعمال کیا ہے۔

اگر مستند علمأ نے ابنِ اسحٰق کے حق میں فتوے نہ دیے ہوتے تو ان کے مخالفین کی تردید ممکن ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صرف چند الزامات ہی اس کے قصص کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہوتے کیونکہ کسی ایسے شخص کی اچھی ساکھ پر چند خفی یا جلی حملے ہی کافی ہوتے ہیں کہ اس کی شہرت کو برباد کر دیں جس کے سابقہ حالات کا علم نہ ہو اور پھر جب غیر جانبدار نقاد نے اس کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو۔

ابوحاتم نے اپنی کتاب (متعلقہ بہ راویانِ ثقہ) میں کہا تھا کہ وہ دو اشخاص جنھوں نے ابنِ اسحٰق پر اعتراضات وارد کیے، ہشام اور مالک تھے۔ اوّل الذکر اس بات سے انکاری تھا کہ انھوں نے (ابنِ اسحٰق نے) فاطمہ سے روایات سنی ہیں لیکن جو کچھ اس نے کہا ہے اس سے کسی شخص کی احادیث کے ضمن میں صداقت اور ثقاہت پر اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ الاسود اور علقمہ جیسے صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ کی آواز سُنی تھی حالانکہ انھیں دیکھا نہیں تھا۔ بعینہٖ ابنِ اسحٰق فاطمہ سے روایات سُنا کرتے تھے اور پردہ درمیان میں لٹکتا رہتا تھا۔ جہاں تک مالک کا تعلق ہے سو جو کچھ اس نے کہا وہ لمحاتی اور وقتی تھا اور بعدازاں اس نے ابنِ اسحٰق سے انصاف کیا۔ حجاز میں ابنِ اسحٰق سے زیادہ کوئی شخص شجرہ ہائے نسب اور مغازی سے واقف نہیں تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ مالکؒ ابو اصباح کا آزاد کردہ غلام ہے۔ جبکہ مالک کا موقف تھا کہ وہ قبیلے کا ایک پورا اور مکمل فرد تھا۔ پس دونوں میں ٹھن گئی تھی اور جب مالک نے مؤطا مرتب کی تو ابنِ اسحٰق نے کہا "یہ کتاب میرے پاس لاؤ کہ میں اس کا جرّاح ہوں۔" یہ سُن کر مالک کا جواب تھا "وہ دجّال اور کذّاب ہے۔ وہ یہود کی سند کے حوالے سے احادیث روایت کرتا ہے۔" جھگڑا جاری رہا تاآنکہ ابنِ اسحٰق نے عراق جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بعدازاں ان میں صلح ہو گئی اور مالک نے انھیں پچاس دینار اور اپنی کھجور کی فصل کا نصف بطور الوداعی تحفے کے نذر کیا۔ مالک انھیں بطور روایت نگار کے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اسے جو بات ناپسند تھی وہ یہ کہ ابنِ اسحٰق ان یہود کا تتبع کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے نیز وہ خیبر، قریظہ، النضیر اور اسی قبیل کے دُوسرے غیر مصدقہ قصص و واقعات

ان کے آبا سے معلوم کر چکے تھے۔ اپنی "مغازی" میں ابن اسحٰق ان لوگوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان لوگوں کی روایات درست اور ثقہ ہیں ۔ مالک خود قابلِ اعتماد اور ثقہ راویوں پر انحصار کرتا تھا۔
مصنف یہ رائے دے کر اپنی بات ختم کرتا ہے کہ مالک کے عربی النسل ہونے کے دعوے کو چیلنج کرنے میں پہل کرنے والا ابنِ اسحٰق نہیں تھا کیونکہ الزہری اور دیگر کئی راوی بھی یہی بات کہہ چکے تھے۔[۶۲]

ترجمہ

میں نے انگریزی محاورے کا خون کیے بغیر متن کے اصل کو جس حد تک ممکن ہوا ، برقرار رکھا ہے ۔ شاعری کا ترجمہ کرتے وقت میں نے اس کی رُوح کو قائم رکھا ہے اور منظوم ترجمے کی کہیں کوشش نہیں کی سوائے تُک بندی اور سجع کے۔ ان دو امور میں یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ تُک بندی کو تُک بندی ہی کی شکل میں پیش کیا جائے اور کمزور قوافی کو ایسے کمزور قوافی ہی کی شکل میں پیش کیا جاتے جو ان سے گئے گزرے ہو ہی نہیں سکتے ۔ اس کوشش میں متن کی صحت تو کسی حد تک متاثر ہوئی ہے لیکن عام مفہوم اور لہجہ زیادہ دیانت اور کامیابی سے منتقل ہوا ہے ۔
کتاب بہت طویل ہے اور میں نے کہیں کہیں بغیر مفہوم خبط کیے بعض حصّے حذف کر دیے ہیں۔ مثلاً ابنِ ہشام کا بتکرار یہ عمومی بیان کہ" یہ شعر میری ایک "غزل" میں ملتا ہے"، میں نے اسے نکال دیا ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ وہ مصرعہ جو عام طور پر اس کے شواہد میں سے ایک ہے ، وُہ اپنے سہارے پر تو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح میں نے براہِ راست گفتگو میں آنے والے مکالمات کو انگریزی قواعد کے مطابق بالواسطہ طرز پر مختصر کر دیا ہے سوائے اس کے کہ جب قائل کے اپنے الفاظ ہی کی ادائیگی لازمی تھی یا وہ لفظ بذاتہٖ اہم تھے۔ آخری بات یہ ہے کہ میں نے متعلقہ افراد کے پہلی دفعہ ذکر کرنے کے بعد شجرۂ نسب کے فارمولا کو حذف کر دیا ہے ۔
میرے پیشروؤں نے "سیرت" کے ترجمہ میں بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں بھی کئی فروگزاشتوں سے بچ نہ سکا ہوں گا۔ وائل کے ترجمے کے بارے میں، جسے اب ترجمہ ہُوئے قریباً ایک صدی ہو گئی ہے[۶۳] نولدیکہ کی رائے نگاہ میں رہنی چاہیے" جی وائل کا ترجمہ (۱۸۶۴ ، سٹٹگارٹ) ٹھس اور بیہودہ ہے اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ناکافی و نامکمل۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ("سیرت") نہایت اہم ہے اس لیے اس کے ایک نئے ترجمے کا جواز بنتا ہے"، جبکہ ولہاوزن کے ترجمۂ الواقدی میں متن کی مشکلات کو خاموشی کے ساتھ نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ "سیرت" میں شامل شاعری جیسا کہ نولدیکہ نے بدر کی شاعری کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ ان کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے ، اس کے متعدد مترادفات کے سبب ، سوا ابوذر کی سرسری تشریح و تفسیر کسی صورت بھی مفید نہیں ہے۔[۶۴]

متن

میں نے صفحوں کے نمبر لگانے میں وسٹنفیلٹ کے ۱۸۵۸ - ۶۰ کے عمدہ اور مستند متن کا تتبع کیا ہے ۔ لیکن وُہ متن

جس کی میں نے فی الاصل پیروی کی ہے وہ قاہرہ ایڈیشن ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۷ء ہے جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے چار جلدوں میں مرتب کیا ہے جس کے صفحے کے حاشیے میں ابوذر اور سُہیلی کے متعدد حواشی درج کیے گئے ہیں جنھیں وسٹنفیلٹ نے اپنے قابلِ قدر ایڈیشن کی دُوسری جلد میں منتقل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس سے استفادہ کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کی عمدہ اور جلی ٹائپ آنکھوں کو سکون بخشتی ہے۔ جب مجھے متون کے مختلفات کا حوالہ دینا پڑا ہے تو اسے سی (قاہرہ ایڈیشن) اور ڈبلیو (وسٹنفیلٹ) کی مختصر شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مدیر ابنِ ہشام

عبدالمالک بن ہشام بصرہ میں پیدا ہوئے۔ بمقام فسطاط (مصر) ۲۱۸ یا ۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔ البتہ کرنکو کا خیال ہے کہ اُن کی وفات کچھ سال بعد ہوئی ہوگی[۱۵]۔ زیرِ نظر کتاب کی تدوین کے علاوہ اُنھوں نے اپنی "کتاب التیجان" کے لیے ابنِ اسحٰق کے علم سے استفادہ کیا، جو وہب بن مُنبّہ سے ماخوذ ہے۔ وہ اصول جن کے تحت اُنھوں نے اپنے پیشرو کی کتاب سے بے تکلفی برتی ہے، ان کا خاکہ اُنھوں نے اپنے ابتدائیے میں دیا ہے، سو ان کے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں وہ بطور ماہرِ لسانیات کے کسی قدر مشہور تھے اور اپنی "شواہد" میں غیر معمولی الفاظ کے معانی کی وضاحت کرکے وُہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے قابل ہو گئے تھے۔ اپنے متن سے الگ یہ سطورِ "سیرت" کے سلسلے کی شدید مشکلات میں سے چند ایک ہیں اور اب واقعتاً بہت حد تک غیر ضروری ہیں کیونکہ عربوں نے اپنی زبان کے لغت اور قاموس تیار کر لیے ہیں۔ بعض اوقات وہ نسبی تفصیلات فراہم کرکے ہمارے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن شاذ ہی ان کے پاس ابنِ اسحٰق کی کتاب میں شامل کسی سطر کی مفید وضاحت کے لیے کچھ کہنے کو ہوتا ہے۔

سُہیلی کے یہاں ہمیں بعض ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جنھیں یا تو ابنِ ہشام نے حذف کر دیا یا وُہ اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، جن کی تفصیل یُوں ہے:

واقدی ۱۸۳ = سہیلی ۱۸۳،

واقدی ۳۲۷ = سہیلی جلد دوم ص ۲ و بعد

وہ ابنِ ہشام کی یادداشتوں میں موجود ایک غلطی کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غلطی یا اُن کی ہے یا البکّائی کی، کیونکہ یونس کے یہاں متن صحیح ملتا ہے۔ امکان یہی ہے کہ غلطی ابن ہشام ہی کی تھی کیونکہ ان کی یونس کے ساتھ باقاعدہ میل ملاقات تھی جیسا کہ اُنھوں نے صفحہ ۳۰۷ پہ اعتراف کیا ہے فیما بلغنی یُونُس۔

ان کی ایک اور غلطی ان کا یہ بیان ہے جس کی رُو سے ابنِ اسحٰق نے عمرو بن اُمیّہ کی اس مہم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جسے رسولِ اکرمؐ نے ابوسفیان بن حرب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا اور یہ کہ کس طرح اُس نے خُبَیب کی لاش صلیب سے اتاری جسے باندھ دیا گیا تھا (صفحہ ۹۹۳)۔ طبری ابنِ اسحٰق کے بیان کردہ اس واقعے کو ضبطِ تحریر میں لایا ہے جو ابنِ ہشام کے

بیان کردہ اُلجھے ہُوئے واقعے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہ یُوں لگتا ہے کہ ابنِ ہشام نے ایک ایسا واقعہ ترتیب دیا ہے جس کے منابع ایک سے زیادہ ہیں اور بڑے نا ملائم طریقے سے واحد متکلم سے واحد غائب پر آجاتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق عمرو نے صلیب کو (ظاہر ہے کہ لاش ابھی اس پر ٹنگی ہوئی تھی) ایک گہری گھاٹی میں اٹھا پھینکا۔ صلیب (خَشَبَہ)[۶۶] — (ایک درخت کا موٹا تنا، جس پر ایک شخص کا جسم رکھا یا لٹکایا جا سکتا ہے) کو کوئی شخص سوائے چند گز کے، مشکل ہی آگے لے جا سکتا تھا جبکہ محافظ بھی ساتھ ہی کھڑے ہوں، چنانچہ اس باب میں ابنِ اسحٰق کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے "عمرو نے درخت سے لاش الگ کی اور تقریباً چالیس قدم چلا (کتنی واضح تفصیل ہے!) محافظوں کو اپنا پیچھا کرتے سُنا، ایک جھٹکے کے ساتھ لاش کو گرایا اور جتنی سُرعت سے بھاگ سکتا تھا بھاگ کھڑا ہوا"۔

سُہیلی جلد دوم صفحہ ۱۴۶ میں ایک دلچسپ نوٹ موجود ہے جس کے مطابق ابنِ ہشام کی اس غلط بیانی کا ابتدائی دَور ہی میں احساس کر لیا گیا تھا۔ وہ مزید یہ کہتا ہے کہ ابنِ ابو شیبہ کی مسند میں شامل قصّے میں ایک دلچسپ اضافہ موجود ہے اور وہ یہ کہ جب اُنھوں نے اسے درخت کے تنے سے کھول کر الگ کیا تو زمین اسے نگل گئی۔ ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابنِ ہشام کا بیان کردہ قصہ تو حقایق اصلیہ اور اس ناقابلِ یقین افسانے کے بین بین ہے۔ بدقسمت آدمی کی لاش جسے عمرو نے حاصل کرنے کی بہادرانہ کوشش کی تھی، اسے زمین پر بڑے بھونڈے پن سے پھینک دیا گیا۔ اگلا قدم، اس لاش کو وادی کی دیوار میں پیدا ہونے والی ایک فطری قبر میں تدفین کے رنگ میں پیش کرنا تھا۔ آخری مرحلہ ایک معجزے کے ذریعے مناسب تدفین کا مہیا کیا جانا تھا۔[۶۷]

اب جس بات کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے یہ ہے کہ ابنِ ہشام نے ایسا دعوٰی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی کہ ابنِ اسحٰق نے ابُوسفیان کے قتل اور خُبیب کی لاش کے حصول ———— دونوں ناکام کوششوں کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ اگر ابنِ اسحٰق نے ان دونوں میں سے ایک واقعہ بھی بیان نہیں کیا تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ابنِ ہشام ان دونوں واقعات کا ذکر کریں؟ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابنِ اسحٰق نے ان روایات کے حوالے سے، جو عمرو کے اپنے خاندان کے ناتے بیان کی گئی تھیں اور جو بعد کی صدیوں میں بھی زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں موجود تھیں، صورتِ واقعہ کی وضاحت کی تھی اس لیے ہم یہ شک کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابنِ ہشام نے ثبوت و شہادت میں مداخلت کی ہے۔

شاید ابنِ ہشام کی سب سے بڑی خدمت "سیرت" میں شامل شاعری کے مستند یا غیر مستند ہونے کے بارے میں تنقیدی تجزیہ ہے، اور یہ تجزیہ صرف اسی صورت میں نہیں جب وہ یہ بات ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں کہ تمام یا کچھ اسناد بعض نظموں کو کُلّیۃً مسترد کر دیتی ہیں بلکہ اس صورت میں بھی جب وہ ابنِ اسحٰق کے بیان کی تصحیح کرتے ہیں اور اشعار کے اصل خالقوں کی نشان دہی کرتے ہیں[۶۸]۔ سیوطی ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتا تھا۔ اس کی روایت ہے کہ ابو ذر نے کہا تھا کہ ابنِ ہشام نے چار میں سے ایک ایسا عظیم ملخص فراہم کر دیا جو اپنے منابع سے کہیں بہتر ہے۔[۶۹] سُہیلی بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک کتاب لکھی جس میں "سیرت" میں شامل شاعری کے مشکل لغات کی تشریح

درج کی۔ سُہیلی کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب اس نے خود نہیں دیکھی تھی۔ اگر یہ فراہم ہو سکتی تو اس سے ہم پر آسانی سے واضح ہو جاتا کہ ابنِ ہشام کی معاصر نسل کا ان نظموں کے بارے میں فی الاصل کیا موقف تھا۔

موسٰی بن عُقبہ کی گُم شدہ کتاب کا کچھ حصہ

یہ حصہ ان بیس اقتباسات پر مشتمل ہے جو مع اپنی اسناد کے مکمل ہیں۔ ان میں سے بعض اقتباسات تو بعض مواقع پر حضورِ اکرمؐ کے ارشادات ہیں اور بعض ان کی زندگی کے واقعات و قصص۔ ان اقتباسات کا جامع و واضح طور پر اس بات پر زور دیتا ہے کہ اصل کتاب تو دس حصوں پر مشتمل تھی۔ پس یہ نتیجہ کہ کتاب میں کبھی "سیرت" بہ تمام و کمال موجود تھی مبنی بر انصاف لگتا ہے۔ آخری شق جعلی لگتی ہے، کیونکہ اس میں موسٰی (متوفی ۱۴۱ھ) کی جانب سے خلاصہ نویس ابو ہریرہ بن محمد بن النقاش (متوفی ۲۸۲ھ) کے لیے ایک اجازت درج ہے۔

۱۔ شہاب نے سالم بن عبد اللہ سے اور سالم بن عبد اللہ نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سُنا "جب میں نیند میں تھا، میں نے خواب دیکھا کہ میں کعبہ کا طواف کر رہا ہوں، میں نے دو آدمی دیکھے جن میں سے ایک کھرّے سیدھے بالوں والا تھا اور اس کے سر سے پانی نچڑ رہا تھا، جب میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ تو جواب ملا "عیسٰی ابنِ مریم"۔ میں وہاں سے لوٹا تو میں نے ایک سُرخ آدمی دیکھا جس کے سر پر گھنے گھنگھریالے بال تھے، وہ کانا تھا، اُس کی آنکھ کچھ اس طرح تھی جس طرح (پانی میں) انگور تیر رہا ہو۔ میں نے استفسار کیا کہ وہ کون ہے؟ جواب ملا: "دجّال"۔ اس سے بعید مماثلت رکھنے والا شخص ابنِ قَطَن الخزاعی ہے۔

یہ حدیث البخاری (جلد دوم صفحہ ۳۶۸ سطر ۱۹ سے صفحہ ۳۶۹، سطر ۴) میں بھی انہی سے ملتے جلتے لفظوں میں آئی ہے۔ اس کا ابنِ اسحٰق ص ۲۶۹ سے بھی تقابل کرنا چاہیے۔ یہ الزہری سے بھی مروی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے عیسٰیؑ کو معراج کے دوران دیکھا ——— اس حالت میں کہ عیسٰیؑ کے چہرے پر تل یا مہاسے تھے جو یوں لگ رہے تھے جیسے پانی کے قطرے۔ یہاں جو "دو آدمیوں" کا حوالہ آیا ہے تو یہ غالباً دو مصلوب چوروں کی طرف اشارا ہے۔

۲۔ ابنِ شہاب: مسلمانوں کے لیے مدینہ میں جُمعہ کی نماز کا اہتمام کرنے والا پہلا شخص مصعب بن عُمیر تھا۔ ابن شہاب سے ہمیں ایک اور حدیث کا پتا چلتا ہے جو سراقہ سے مروی ہے اور اس واقعہ سے مختلف ہے۔

پہلا بیان ابنِ سعد (جلد سوم، حصہ اوّل، صفحہ ۸۳، سطر ۲۵) سے متفق ہے اور دوسرا بظاہر ابنِ اسحٰق صفحہ ۲۹۰ سطر ۵ اور ابنِ سعد جلد سوم حصہ اول صفحہ ۸۴ سے۔

۳۔ عبد الرحمٰن بن مالک بن جُعشم المدلجی جس نے درج ذیل روایت اپنے والد سراقہ بن جُعشم سے سنی۔ جب حضورِ اکرمؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کی تو قریش نے سَو اونٹوں کا انعام مقرر کیا اس شخص کے لیے جو انھیں واپس

لے آئے" سے الیٰ انتہا "میرا صدقہ رسولؐ کے لیے"۔

یہ اقتباس لازمی طور پر وہی ہے جو ابنِ اسحٰق کے یہاں صفحہ ۳۳۱ - ۳۳۲ پر پایا جاتا ہے اگرچہ ان میں کئی لفظی اختلافات بھی ہیں یہ امر واضح ہے کہ ابنِ اسحٰق کے بیان کو نکھارا گیا ہے اور موسیٰ روایت کو اس کی سادہ ترین شکل میں بیان کرتا ہے۔ مزید دیکھیے بخاری جلد سوم صفحہ ۳۹ - ۴۱ - ۴۰ - اور واقدی (ولہاؤزن صفحہ ۳۰۴)

۴ - ابنِ شہاب کا بیان ہے کہ عروہ بن الزبیر نے کہا کہ الزّبیر نے حضورِ اکرمؐ سے اس وقت ملاقات کی جب وہ مسلمانوں کے ایک کارواں کے ساتھ تجارت کرنے کے بعد شام سے پلٹ رہے تھے۔ اُنھوں نے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ بعض اشیاء کا تبادلہ کیا اور الزبیر نے حضورِ اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو کچھ سفید ملبوسات دیے۔

بخاری میں بھی یہی بیان ہے، دیکھیے جلد سوم صفحہ ۴۰ - ابنِ سعد کے یہاں نام مختلف ہیں، دیکھیے ابنِ سعد جلد سوم حصہ اوّل صفحہ ۱۵۲، سطر ۱۹ -

۵ - نافع بروایت عبداللہ بن عمر: بعض صحابہؓ نے رسولِ اکرمؐ سے پُوچھا: "کیا آپ مُردوں سے خطاب فرما رہے ہیں؟" اُنھوں نے فرمایا: "جو کچھ میں کہتا ہُوں تم مُردوں سے بہتر نہیں سُن سکتے۔"

بخاری میں بھی یہی بیان ہے، بخاری جلد سوم صفحہ ۰۷، سطر ۱۰، ۱۱ - اور مزید دیکھیے ابنِ اسحٰق صفحات ۴۵۳ و ببعد، جہاں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ اس امر کی تردید میں ملتے ہیں کہ مُردے سُنتے ہیں۔ وُہ جانتے ہیں لیکن وہ سُنتے نہیں۔

۶ - ابنِ شہاب بروایت انس بن مالک: بعض انصار نے حضورِ اکرمؐ سے التجا کی کہ وُہ اُن کے بھانجے عباس کا زرِ فدیہ معاف فرما دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بخدا اسے ایک پائی بھی معاف نہیں کی جائے گی۔

نیز بخاری جلد سوم صفحہ ۶۹، سطر ۱، ۲ و مزید طبری صفحہ ۱۳۴۱، ابنِ قتیبہ کی کتاب "معارف" صفحہ ۰۰۔ زخاؤ کو انصار اور عباس کے درمیان موجود رشتے پر تعجب ہُوا ہے اور وُہ بھُول گیا کہ عباس کی دادی سلمیٰ بنت عمرو الخزرجی تھی۔ مزید دیکھیے بخاری جلد دوم صفحہ ۲۰۸ سطر ۱۸ و ببعد۔

۷ - ابنِ شہاب بروایت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک السّلمی معہ دیگر روایت کنندگان: عامر بن مالک بن جعفر جو نیزہ بازی کا استاد مانا جاتا تھا حضورؐ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہُوا جب وہ مشرک تھا۔ حضورِ اکرمؐ نے اسے اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا مگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے حضورِ اکرمؐ کو ایک تحفہ دیا۔ لیکن آپؐ نے یہ کہہ کر تحفہ لینے سے انکار کر دیا کہ وہ کسی مشرک سے تحفہ قبول نہیں کر سکتے۔ عامر نے کہا: "اے نبیؐ! میرے ساتھ اپنے جو نمائندے بھیجنا چاہو بھیج دو، ان کی حفاظت میرے ذمّے ہو گی۔" سو حضورِ اکرمؐ نے مبلّغین کی ایک جماعت روانہ فرمائی جس میں المنذر بن العمرو السعیدی بھی تھا جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ قبیلۂ نجد میں جاسوسی کرتے ہوئے جلد ہی موت سے ہمکنار ہو گیا۔ جب عامر بن طفیل نے اس جماعت (کی آمد) کے متعلق سنا تو اس نے بنی عامر سے کہا کہ وہ اس جماعت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن اُنھوں نے عامر بن مالک کے وعدے کا پاس کرتے ہُوئے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے

بنی سُلیم سے درخواست کی۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیے اور انھوں نے بئرِ معونہ کے مقام پر اُنھیں شہید کر دیا سوائے عمرو بن امیہ الضمری کے جسے عامر بن طفیل نے گرفتار کر لیا اور بعد ازاں رہا کر دیا۔ جب وُہ بچ بچا کر حضورِ اکرمؐ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تم اکیلے ہی بچے ہو؟"

یہ ابنِ ہشام کے یہاں دیے جانے والے بیان (ص ۶۴۸ و بعد نیز مزید دیکھیے طبری ص ۱۴۴۳ و بعد نیز واقدی (وِلہاوُزن ص ۳۲۷) کے مقابلے میں بہت مختصر بیان ہے۔

۸۔ اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہ بروایت سالم بن عبد اللہ بروایت عبد اللہ بن عمر: بعض صحابہؓ حضرتِ اسامہؓ کی قیادت کے باب میں اُلجھ رہے تھے۔ حضورِ اکرمؐ اُٹھے اور فرمایا: "اگر تم اسامہ کے باب میں اُلجھ رہے ہو تو اسی طرح تم ان کے باپ کی قیادت کے باب میں اُلجھا کرتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ وہ قائد و سالار کے طور پر بہت موزوں تھا۔ وہ میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ایک تھا اور یہ شخص (اس کا بیٹا) اُس کے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ پس اس سے اچھا سلوک کرنا جب میں اس دنیا میں نہ رہوں کیونکہ یہ تم سب میں سے اچھا ہے۔"

مزید دیکھیے بخاری جلد دوم صفحہ ۴۴۰، جلد سوم صفحہ ۱۳۳، ۱۹۲، نیز ابنِ ہشام صفحہ ۹۹۹ سطر ۱۴، صفحہ ۱۰۰۶ سطر ۲۰ و بعد۔

۹۔ سالم بن عبد اللہ بروایت عبد اللہ بن عمر: حضورِ اکرمؐ حضرتِ فاطمہؓ کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا کرتے تھے۔ زخاؤ نے اس کی وضاحت بخاری جلد دوم صفحہ ۱۴۴ اور جلد سوم صفحہ ۱۴۵ سے کی ہے جہاں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ: "اگر فاطمہؓ (بنت محمدؐ) بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔"

۱۰۔ عبد اللہ بن فضل بروایت انس بن مالک: میں اپنے قبیلے کے ان لوگوں کا ماتم کر رہا تھا جو جنگِ حرہ میں مارے گئے تھے۔ تب زید بن ارقم (متوفیٰ ۶۸ھ) نے مجھے شدید طور پر مغموم و ملول محسوس کرتے ہوئے خط لکھا اور حضورِ اکرمؐ کے حوالے سے لکھا کہ اس نے حضورؐ کو یہ کہتے سُنا تھا: "خدایا! انصار کو معاف کر دینا اور ان کے بیٹوں کو، اور میں رحمت کی درخواست کرتا ہوں — اُن کے پوتوں کے لیے۔"

اسی سے مماثل ابنِ ہشام کی "سیرت" میں بیان صفحہ ۸۰۶، باب ۱۲ اور واقدی صفحہ ۳۸۰۔

۱۱۔ عبد اللہ بن الفضل: کچھ لوگ انسؓ کے ساتھ تھے اور انھوں نے اس سے زید بن ارقم کے بارے میں رائے طلب کی۔ اس نے کہا وہی تو ہے جس کے بارے میں رسُولِ اکرمؐ نے فرمایا: "وہی تو ہے جس پر اللہ نے کان کے رستے بہت سی رحمتیں نازل کی ہیں۔"

وہ مخبر تھا: مزید دیکھیے: ابنِ ہشام صفحہ ۷۲۶، اوفی اللہ لہٗ باُذُنہٖ کی جگہ ابنِ ہشام کے یہاں (صفحہ ۷۲۶، سطر ۱۷) اوفاءنا اللہ باذنہ ملتا ہے۔ زیادہ اغلب یہ ہے کہ اختلاف غلط خوانی کے باعث ہے نہ کہ زبانی روایت کی وجہ سے: واقدی (برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر ۱۶۱۷ الیف، ۹۵ اے) وَافَتْ اُذُنُكَ وَصَدَّقَ اللّٰهُ حَدِيثَكَ۔

۱۲۔ شہاب بروایت سعید بن المسیب بروایت عبداللہ بن کعب بن مالک: "رسولِ اکرمؐ نے اُس دن بلال سے کہا"؛ اُٹھو اور اعلان کر دو کہ صاحبِ ایمان ہی جنت میں جائے گا اور یہ کہ خدا اپنے دین کی نصرت کسی بُرے شخص کے ذریعے نہ کرے گا۔" یہ واقعہ اس وقت ہُوا جب حضورِ اکرمؐ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو اہلِ جہنم میں سے تھا۔

۱۳۔ نافع بن عبداللہ بن عمر سے روایت ہے: فتحِ خیبر کے بعد یہود نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ انھیں اس شرط پر وہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے کہ وُہ وہاں کھیتی باڑی کریں گے اور کھجور کی آدھی فصل ان کا حصّہ ہوگی رسول اللہؐ نے فرمایا:

"ہم تمھیں اس بات کی اجازت اس وقت تک دیں گے جب تک ہماری مرضی ہوگی۔"

اور وُہ وہاں رہے تا آنکہ حضرتِ عمرؓ نے انھیں وہاں سے نکال دیا (یہاں چھ یا سات لفظ غائب ہیں) ۔ یہ فرماتے ہوئے حضورِ اکرمؐ نے اپنی آخری علالت میں تین باتوں پر زور دیا: رہاویوں، داریوں، سبائیوں اور اشعریوں کو ایسی زمین ملنی چاہیے جہاں سے سو بار شتر فصل اُٹھ سکے، یہ کہ اسامہ بن زیدؓ کے مشن کو جاری رہنا چاہیے اور یہ کہ جزیرہ نمائے عرب میں دو مختلف مذاہب کو باقی نہیں رہنے دینا چاہیے۔"

عملاً ابنِ ہشام کے یہاں بھی (صفحہ ۷۷۶) یہی الفاظ آئے ہیں سوائے اس کے کہ سبائیوں کا ذکر نہیں آیا۔

۱۴۔ مندرجہ بالا شق کے سلسلے کی اسناد: حضرتِ عمرؓ، یہود، عیسائیوں اور مجوسیوں کو مدینے میں اپنا کاروبار کرنے کے لیے تین دن سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے "دو مذاہب اکٹھے نہیں رہ سکتے۔" اور اُنھوں نے یہود و نصاریٰ کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا۔

۱۵۔ ابنِ شہاب بروایت عروہ بن الزبیر بروایت مروان بن الحکم اور المسوَر بن مخرمہ: جب رسول اکرمؐ نے لوگوں کو ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت مرحمت کی تو انھوں نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے تمھیں اجازت دی ہے یا نہیں دی۔ پس واپس چلے جاؤ تا آنکہ تمھارے قائد تمھارے معاملات کے باب میں ہمیں رپورٹ مہیا کریں۔ وہ لوگ پلٹ گئے اور ان کے قائدین نے ان کی تربیت کی اور وہ رسول اللہؐ کی جانب واپس آ گئے اور انھیں بتایا کہ ان کے صحابہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اور انھیں ان کے قیدی ساتھیوں کی بازیافت کی اجازت دے دی تھی۔

حوالے کے لیے دیکھیے، ابنِ ہشام صفحہ ۸۷۷

۱۶۔ ابنِ شہاب بروایت سعید بن المسیّب اور عُروہ بن الزبیر: ہوازن کے قیدیوں کو جنھیں حضور اکرمؐ نے آزاد کر دیا تھا تعداد میں چھ ہزار تھے جن میں مرد، عورتیں اور بچّے شامل تھے۔ حضورؐ نے بعض بے سہارا عورتیں قبیلہ قریش کے بعض افراد کی تحویل میں دے دیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوف اور صفوان بن اُمیّہ شامل تھے جنھیں دو عورتوں کو جو اب لونڈیوں کی حیثیت سے تھیں، رہنے یا چلے جانے کا اختیار دے دیا تھا اور اُنھوں نے (عورتوں نے) اپنے قبیلے کو رجوع کرنے کو ترجیح دی۔

مزید دیکھیے : واقدی (و لہاوزن) صفحہ ۳۷۵

۱۷۔ اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہ اپنے چچا موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتے ہیں جو ابنِ شہاب سے روایت کرتے ہیں: حضورِ اکرمؐ نے ۱۰ھ میں حجۃ الوداع ادا کیا۔ اُنھوں نے لوگوں کو مناسک بتائے اور میدانِ عرفات میں اپنے اُونٹ الجُدعا پر بیٹھ کر انھیں خطاب کیا۔

مزید دیکھیے ابنِ ہشام صفحہ ۹۶۸ اور واقدی صفحہ ۴۳۰

۱۸۔ ابنِ شہاب بروایت عروہ بن الزبیر بروایت المسوَر بن مخرمہ بروایت عمرو بن عوف جو بنی عامر بن لوَیّ کا اتحادی تھا جو بدر میں حضورِ اکرمؐ کے ساتھ تھا ؛ حضورِ اکرمؐ نے ابوعبیدہ بن الجرّاح کو یکساں محصول لانے کے لیے بھیجا۔ اُنھوں نے بحرین کے لوگوں سے صلح کر لی تھی اور ان پر العلاٗ بن الحضرمی کو مقرر کیا تھا۔ جب ابوعبیدہ بحرین سے مذکورہ رقم لے کر لوٹے ، انصار نے ان کے آنے کی خبر سُنی اور اُن (ابوعبیدہ) کے آنے کا وقت وہی تھا جو حضورؐ کی نمازِ فجر کا وقت تھا۔ جب اُنھوں نے (انصار نے) حضورِ اکرمؐ کو دیکھا تو وُہ اُن کے رستے میں رُک گئے۔ حضورؐ نے اُنھیں دیکھ کر تبسّم فرمایا اور کہا : " میرا خیال ہے کہ تم نے ابوعبیدہ کی واپسی کی خبر سُن لی ہے اور یہ بھی کہ وُہ کچھ رقم بھی اپنے ساتھ لایا ہے ۔" جب اُنھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو آپؐ نے مزید فرمایا ؛ خوش رہو اور اس شے کی اُمید رکھو جو تمھارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔ بخدا مجھے تمھارے باب میں مفلسی کا خوف نہیں۔ مجھے خوف اس بات کا ہے کہ تمھیں اس قدر آسائشات مل جائیں گی کہ تم اپنے سے پہلے کے لوگوں کی طرح گمراہ ہو جاؤ گے ۔"

اسی سے مماثل روایت کے لیے دیکھیے بخاری جلد سوم صفحہ ۶۸ ، سطر ۱۸ و بعد ۔

۱۹۔ سعد بن ابراہیم بروایتِ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف : ایک دن عبدالرحمٰن بن عوف حضرتِ عمرؓ کی معیت میں تھے اور اُنھوں نے (عبدالرحمٰن بن عوف نے) الزبیر کی تلوار توڑ ڈالی ، لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تلوار کس نے توڑی۔ تب حضرتِ ابوبکرؓ اُٹھے اور لوگوں سے اپنے باب میں معذرت کرتے ہُوئے خطاب کیا " میں ایک لمحے کے لیے بھی امارت کا خواہاں نہیں تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اس کے لیے ظہور و خفا میں دعا کی یا اس کی خواہش کی ۔ لیکن میں انتشار سے ڈرتا تھا۔ امارت ملنے میں کوئی سُرُور نہیں۔ مجھے ایک ایسی اہم ذمہ داری سونپ دی گئی ہے جس کے لیے مجھ میں قوت نہیں۔ میں اس ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہُوں کہ خدا مجھے قوّت اور حوصلہ دے ۔ میری خواہش ہے کہ کاش کوئی ایسا شخص جس میں اس سے عُہدہ برآ ہونے کی زیادہ صلاحیت ہے ، میری جگہ ہوتا۔ مہاجرین نے ان کے طرز کو قبول کیا اور حضرتِ علیؓ اور زبیر بن العوام نے کہا " ہم تو صرف اس بات پر برہم تھے کہ ہمیں شوریٰ میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب جبکہ حضورِ اکرمؐ کا وصال ہو گیا ہے ، حضرتِ ابوبکرؓ امارتِ عظمیٰ کے موزوں ترین حقدار ہیں۔ وہ ان کے یارِ غار تھے اور ہم ان کی عظمت اور برتری کو تسلیم کرتے ہیں اور حضورِ اکرمؐ نے انھیں اس وقت امامت کی ذمہ داری سونپی جب ابھی وہ ہمارے درمیان تھے ۔

یہاں اس مختصر انتخاب میں نہایت مجمل تبصرہ بے جا نہ ہوگا۔ شق نمبر ۱۲ واضح طور پر مسلم کے مستقبل کے بارے میں پریشان کُن سوال سے متعلق ہے جبکہ شق نمبر ۱۸ بعداز واقعہ "پیش گوئی" سے متعلق ہے۔ لامحالہ یہ شقیں قاری کے ذہن میں شکوک پیدا کرتی ہیں۔

اس انتخاب میں سے بحیثیت مجموعی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جامع (ابنِ ہشام) کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں، یعنی یہ کہ حضورِ اکرمؐ اور حضرتِ ابوبکرؓ کے ساتھ الزبیر کی محبت شق نمبر ۴ سے ظاہر ہے۔ شق نمبر ۹ میں شیعانِ علیؓ کے خصوصی سوچ بچار کے متقاضی دعووں کو نپٹایا گیا ہے، جبکہ شق نمبر ۱۹ بیان کرتی ہے کہ حضرتِ علیؓ علی الاعلان حضرتِ ابوبکرؓ کو حضورِ اکرمؐ کا جانشین تسلیم کرتے تھے۔ شق نمبر ۶ سے ظاہر ہے کہ عباس کو زرِ فدیہ ادا کرنا پڑا اس کے باوجود کہ انصار نے اس کی معافی کی درخواست کی تھی۔ شق نمبر ۱۰ الحرّہ کے میدان میں اُمویوں کے ہاتھوں کام آنے والوں کے ماتم سے متعلق ہے اور اس میں حضورِ اکرمؐ کی ان شہداء اور ان کے پوتوں کے لیے مغفرت کی دُعا مندرج ہے۔

موسیٰ کی ہمدردیاں واضح طور پر خاندانِ انصار اور الزبیر کے ساتھ تھیں، صرف یہی لائق اعتماد نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس شیعانِ علیؓ کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ بین السطور میں اُمویوں کے ہاتھوں الحرّہ کے مقام پر ہونے والے سلب وقتل کی مذمت کی گئی ہے اور عباس کو رسولِ اکرمؐ کے ایک باغی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے حضورؐ کی مخالفت کی وجہ سے ایک ایک پائی ادا کرنے کا پابند کیا گیا۔

موسیٰ بن عقبہ نے انصار اور العباس کے باب میں کم و بیش وہی باتیں کہی ہیں جیسی کہ ابنِ اسحٰق نے کہیں تا آنکہ ان کی سیرت کے مدیر و مدوّن ابنِ ہشام نے ان کی کتاب کی تہذیب و تنقیح کی، اگرچہ انھوں نے شیعانِ علیؓ کے باب میں ایک مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا۔[۲۷]

حواشی

۱ - دیکھیے حاجی خلیفہ جلد دوم ص ۱۰۰۸

۲ - ای ۔ زخاؤ (سخاؤ) : ابنِ سعد (طبقات) جلد سوم، باب ۲۳ و بعد

۳ - جے ۔ فک : محمد ابنِ اسحٰق ص ۸، نوٹ ۲۷، مزید دیکھیے، جے ہورووز (اسلامک کلچر ۱۹۲۷) ص ۵۳۸

۴ - ابنِ سعد، طبری اور بخاری ان سے بے حد مستفید ہوئے ہیں۔

۵ - فشر : اسانید ص ۴۶

۶ - ہورووز : اسلامک کلچر ص ۲۵۱

۷ - ابنِ حجر : تہذیب التہذیب (۱۰) ص ۳۶۱

۸ - لی موند اورینتال، شمارہ ۲۸، ۱۹۳۴ء، ص ۱۷ - ۵۸

۹ - دیکھیے جے ۔ فک کی کتاب ص ۱۱

۱۰ - رسالے کا نام

۱۱ - اُس جگہ دیکھیے جہاں ان میں سے بعض کی ثقاہت پر کچھ شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۲ - گولڈ زیہر، MOHAMMADANISCHE STUDIEN، جلد دوم ص ۲۰۷ سے پتا چلتا ہے کہ یہ بات نویں صدی ہجری تک اسی طرح گردش میں تھی۔

۱۳ - آگے دیکھیے۔

۱۴ - طبقات جلد سوم، باب دوم، ص ۵۱، سطور ۱۷ - ۱۹

۱۵ - ترجمہ و تدوین از کلیمان ہوآر : PUBLICATIONS DE L' ÉCOLE DES LANGES ORIENTALES VIVANTESTIVI جلد ۱۶، ۱-۶، پیرس ۱۸۹۹ - ۱۹۱۹

۱۶ - ان مشمولات کے خلاصے کے لیے دیکھیے : طبری جلد اوّل

۱۷ - دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

۱۸ - دیکھیے ص ۲۰

۱۹ - حیدر آباد دکن ۱۳۴۲ھ

۲۰ - گیوم کے نزدیک بڑے یا عظیم کا تصور وہی مادی تصور ہے جو مستشرقین سے خاص ہے۔ حضور اکرمؐ کا جس "بڑے"

خاندان سے تعلق تھا۔ وہ مادی حوالے سے نہیں بلکہ اپنی بلند نسبی، شرافت، وعدہ ایفائی اور دیگر اعلیٰ انسانی اقدار کے ناتے سے بڑا تھا۔ (مترجم)

۲۱۔ کاش مستشرقین میں "مادیات" سے ماورا دیکھنے کی صلاحیت بھی ہوتی۔ یورپ میں اب معجزات کے اعتراف کی جگہ مضحکہ خیز توہمات کی تقدیس و تجلیل نے لے لی ہے۔ (مترجم)

۲۲۔ صفحہ ۱۸۲ نیز دیکھیے صفحہ ۱۸۰، ۲۳۰ و مواضع کثیرہ

۲۳۔ دیکھیے صفحہ ۲۸۱، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۰۸

۲۴۔ دیکھیے صفحہ ۲۲۲، ۲۳۵ و مواضع کثیرہ۔ حضور اکرمؐ کی ولادتِ باسعادت کے وقت بے پناہ روشنیوں کے ظہور کے سلسلے کے قصص کا بیان بڑے محتاط انداز اور انتباہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۱۰۲

۲۵۔ منام

۲۶۔ یہ عیسوی روایت ہے۔ قرآنِ حکیم میں حضرتِ اسماعیلؑ کی قربانی کا ذکر آیا ہے، حضرتِ اسحٰق کی قربانی کا نہیں۔ (مترجم)

۲۷۔ دیکھیے آسن پیلیچو اُس کی کتاب: اسلام اینڈ دی ڈوائن کامیڈی، ۱۹۱۹

۲۸۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ یہاں ابنِ ہشام نے متن میں مداخلت کی ہو؟

۲۹۔ صفحہ ۲۴۰، ۳۴۴

۳۰۔ صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۹

۳۱۔ نولدیکہ نے "اسلام" (ایڈیشن ۱۹۱۴) میں "سیرت" کے کئی واقعات و خصوصیات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جنھیں گھڑنا ممکن ہی نہ تھا اور جو حقائق کے گہرے علم کی وضاحت کرتے ہیں۔

۳۲۔ نیز دیکھیے صفحہ ۹۵۰ - ۹۵۱، مزید دیکھیے طبری میں مماثل اقتباسات، صفحہ ۱۶۳۲، ۱۶۳۵

۳۳۔ مزید دیکھیے طبقاتِ ابنِ سعد جلد سوم صفحہ ۲۸۱

۳۴۔ سورۃ ۵۳: ۵۱

۳۵۔ سورۃ ۶۹: ۸

۳۶۔ سورۃ ۱۴: ۹

۳۷۔ بحوالۂ سابقہ دیکھیے ہوروز صفحات ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۲

۳۸۔ الفہرست، قاہرہ صفحہ ۱۳۶

۳۹۔ صفحہ ۱۰۸

۴۰۔ اگر الجُمحی پر یقین کر لیا جائے تو پھر ان کا (ابنِ اسحٰق کا) رویہ کچھ ایسا ہی تھا۔

۴۱۔ میں اس حد تک تو شاید ہی جا سکوں کہ یہ دعویٰ کر دوں کہ پانچویں صدی کے عمرو بن قمیہ نے "سیرت" میں مشمولہ

شاعری پر براہِ راست اثر ڈالا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان میں مماثلت خاصی ہے۔ عربی شاعری کے موضوعات کے تسلسل کے ساتھ دُہرائے جانے کی ناگزیر روایت موجود ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ بدوی زندگی بہت کم مختلف رہی ۔ صحراؤں نے ان کے افق کا احاطہ کر رکھا تھا اور نتیجۃً اونٹ اور گھوڑے، جنگ اور اس کا اسلحہ، فیاضی اور قبائلی تفاخر ان کے گیتوں کا مستقل موضوع تھے۔ ان موضوعات کے اولیں گانے والوں کا سراغ لگانا باعثِ تضیعِ اوقات ہوگا۔

لیکن پھر بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ درج ذیل موضوعات عمرو کے یہاں بھی ملتے ہیں اور "سیرت" میں بھی: وہ فیاض شخص جو موسم سرما میں بھوکے مہمان کے لیے اونٹ ذبح کرتا ہے جبکہ اس موسم میں امرا بھی قحط کے ہاتھوں غربت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں، جب رشتہ دار بھی ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ شخص جو آڑے وقت میں ضیافت کا اہتمام کرتا ہے، جب اُونٹنیوں کے تھن خشک ہو چکے ہوتے ہیں ——— کڑاہی اونٹ کے کوہان کی چربی سے بھری ہُوئی ——— وُہ لوگ جو مہمان نوازی کے طور پر قمار بازی کرتے ہیں اور تیروں کی نشان دہی کے مطابق رقم آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ جنگ تو (شیریں) دودھ کی طرح ہے۔ جنگ تو دودھیل اونٹنی ہے۔ جنگ اس طرح خوُن بہاتی ہے جس طرح کنویں سے بالٹیاں نکالی جاتی ہیں۔ جنگ تو کنویں سے صبح کے وقت پیا جانے والا شیریں اور خنک گھونٹ ہے ——— شمشیر کے پھل کو دَرّاع نے جوہر دار کر دیا ہے، تپتی دوپہروں کا سفر جب مکڑی بھی آرام کر رہی ہوتی ہے ——— گھوڑا جو بھاگ کر جنگلی گدھے سے بھی آگے نکل جاتا ہے ——— جنگجوؤں کے خود سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے ہیں، زرہ کی کڑیاں اس طرح چمک رہی ہیں جیسے جھنور ہلکورے لیتا ہو ——— یہ تشبیہات خواہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں لیکن دوسرے شعرا کے یہاں بھی اس قسم کے پیش پا افتادہ مضامین کی موجودگی میں یہ کہنا کہ عمرو نے ("سیرت" کی شاعری) کو گہرے طور پر متاثر کیا، خطرے سے خالی نہیں۔ مزید برآں ہم جس شاعر کی بات کر رہے ہیں وُہ اُموی دور کا جعلی شاعر تھا۔ سو میرے ایک سابقہ ساتھی ڈاکٹر عبداللہ الطیب کا ایک اشارہ یاد آتا ہے جس کے مطابق "سیرت" میں شامل شاعری اور "وقعت صفّین" بہت مماثل ہیں۔ اگر اس اشارے کی روشنی میں مزید تحقیق کی جائے تو بہت سے دِل چسپ انکشافات کا امکان ہے۔ اس باب میں ابن ہشام کے حواشی بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ صفحہ ۹۰، پر وہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ "ہم نے تم سے اس کی تفسیر و تعبیر پر بھی بحث کی ہے جس طرح ہم نے اس کے منزّل من اللہ ہونے پر بحث کی" عمّار بن یاسر نے ایک اور جنگ (صفّین) کے حوالے سے کہے اور اس بات کا امکان نہیں کہ یہ بات عبداللہ بن رواحہ نے فتح مکہ کے موقع پر کہی ہو کیونکہ اہلِ مکہ تو مشرکین تھے اور ان کا قرآن پر ایمان نہیں تھا، اس لیے کسی دوسری تفسیر و تعبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۲ - صفحہ ۱۱۳

۴۳ - یُوں لگتا ہے کہ حضرتِ حسان بن ثابتؓ سے اس مفہوم کے جعلی اشعار منسوب کیے گئے ہیں۔ (مترجم)

۴۴۔ مزید دیکھیے مصنف (الفریڈ گیوم) کا مضمون "جدید تحقیقات کی روشنی میں سیرت رسول اللہ" اسلامک کوارٹرلی ریویو، ۱۹۵۴ء

۴۵۔ میں نے فک کے قابلِ تعریف مقالے میں شامل فہرست کو اپنایا ہے۔ اس کے صفحہ ۴۴ پر مکمل سوانحی تفصیلات موجود ہیں، اس مقالے میں جن قصبوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں افرادِ مذکورہ ابن اسحٰق کے محاضرات سُنتے تھے۔

۴۶۔ واضح رہے کہ "سیرت رسول اللہؐ" کا اصل متن دریافت ہو چکا ہے۔ یہ ایک خطی نسخہ ہے جسے نامور عالم ڈاکٹر حمید اللہ مرتب کر رہے ہیں۔ (مترجم)

۴۷۔ میرا ایک دوست جے۔ ایم۔ بی جونز برٹش میوزیم میں موجود دو مخطوطات کی مدد سے ایک ایڈیشن تیار کر رہا ہے۔

۴۸۔ الطبری جلد سوم صفحہ ۲۵۱۲

۴۹۔ مصیبت کے ان ایام میں میں نے ان دونوں فتوحاتِ علمی کا ساتھ ساتھ ترجمہ شائع کرنے کا اپنا اصلی منصوبہ بڑے تامل کے بعد ترک کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ متذکرہ بالا عالم اس کام کو بڑی کامیابی سے تکمیل سے ہمکنار کریں گے۔

۵۰۔ مزید دیکھیے ہوروونز (بحوالہ سابقہ) اور اوٹو لوتھ کی کتاب DAS CLASSENBUCH DES IBN SA'AD, لیپزگ ۱۸۶۹

ابنِ اسحٰق کے یہاں دیے گئے حوالوں کے لیے دیکھیے نولدیکہ کی جرمن زبان میں لکھی گئی کتاب تاریخِ قرآن یعنی GESCHICHTE DES QORANS

۵۱۔ تاریخ قرآن (نولدیکہ) جلد دوم ص ۱۲۹ و بعد

۵۲۔ مزید دیکھیے الشافعی کے کاتب کا دستخط شدہ مخطوطہ۔ جدید ایڈیشن میں ایک ہی صفحے پر دس یا اس سے بھی زیادہ دفعہ "تصلیہ" کی موجودگی سے عقیدت کی جگہ غلامی کی بو آتی ہے اور یہ ایک اختراع ہے اگرچہ اس سے مخطوطہ کی تاریخ کا پتا چلانے میں تو مدد ملتی ہے لیکن ایک جدید مطبوعہ نسخے کے قاری کے لیے تکلیف دہ آزمائش پیدا کر دیتی ہے۔

۵۳۔ تاریخ قرآن (جلد دوم) صفحہ ۱۴۳

۵۴۔ پروفیسر کرنکو نے ایک خط میں لکھا کہ الحکیم النیشاپوری کی "مستدرک" میں یونس بن بُکیر کے توسط سے "سیرت" کے اقتباسات ملتے ہیں لیکن چونکہ اس ضخیم کتاب کا اشاریہ مرتب نہیں کیا گیا اس لیے میرے لیے "سیرت" کے اقتباسات سے ان اقتباسات (مستدرک) کا تقابل ممکن نہیں تھا۔ مزید یہ دیکھیے کہ ابنِ ہشام کے تحت میں سُہیلی کی "رَوض الاُنف" میں موجود اقتباسات کے باب میں کیا کہا گیا ہے۔

۵۵۔ دیکھیے فک صفحہ ۱۸

۵۶۔ جلد دوم : ۱۰۔ ۲۳

۵۷۔ چونکہ ابنِ اسحٰق کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا اس لیے یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔

۵۸ - غالباً ان کا تعلق "سنن" سے ہے۔

۵۹ - اس کا بھی "سیرت" سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۰ - اس خاص اصطلاح کا مفہوم سیاقِ کلام سے تو واضح ہے۔ ولہاؤزن نے اس کا جو متبادل ——— FALSCHE NAMEN UNTERSCHIEBEN دیا ہے وہ کُلی طور پر صحیح نہیں ہے۔

۶۱ - ابنِ اسحٰق کی الکلبی کی بیان کردہ روایات کے باب میں ناپسندیدگی والا مبحث غیر ضروری ہے اسی لیے یہاں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

۶۲ - مزید بحث، اور زیر نظر اور مابعد کے لکھنے والوں کے متعلق جامع اور مانع حوالوں کے لیے دیکھیے : فک، باب دوم

۶۳ - تاریخ قرآن صفحہ ۱۴۰

۶۴ - رسالۂ علومِ آشوریات یعنی ——— ZEITSCHRIFT FÜR ASSYRIOLOGIE ———
: ۲۷، ص ۱۶۱

۶۵ - اسلامک کلچر جلد دوم، صفحہ ۲۳۱

۶۶ - خَشَبہ : اَلخَشَبُ موٹی لکڑی، ج - خَشَبٌ وخُشُبٌ وخُشْبٌ وخُشْبَان (مترجم)

۶۷ - تاہم اس بات کا امکان ہے کہ غَیَّبُوا اللّٰہُ عَنْھُمْ کا مطلب ایک مافوق الفطرت فعل ہو، اگرچہ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا۔

۶۸ - مثال کے طور پر دیکھیے صفحہ ۶۱۳، جہاں اُن کا یہ کہنا بجا ہے کہ ایک شعر کا خالق حُیَیرہ نہیں بلکہ جُنُوب تھا۔

۶۹ - المُظہر (قاہرہ) سے حال ہی میں شائع ہونے والا تاریخ سے معرّٰی نسخہ صفحہ ۸۰ ؎ دیکھیے زخاؤ ط۱۶ ۲۶ وبعد

۷۰ - حضورِ اکرمؐ فتنۂ دجّال سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے اعوذ بك من فتنة المسيح الدجّال - فتنۂ دجّال سے متعلق حضورؐ سے جتنی احادیث مروی ہیں ان سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ ایک بڑا فتنہ (دجّال) ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، کون ہوگا، اس باب میں ان احادیث میں کہیں صراحت نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی حضورؐ نے فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام اور عراق کے درمیان منطقے سے۔ مدینہ میں ابنِ صیّاد نامی یہودی بچہ پیدا ہوا تو آپؐ نے قیاس فرمایا کہ شاید یہی دجّال ہو۔ فلسطین کے ایک نو مسلم تمیم داری نے حضورؐ کو بتایا کہ اس نے بحیرہ عرب یا بحیرہ روم میں ایک جزیرے پر ایک شخص کو دیکھا جو خود کو دجّال کہتا تھا کہ حضورؐ نے اس بات سے بھی اختلاف نہیں فرمایا لیکن یہ ارشاد فرمایا کہ دجّال مشرق سے ظاہر ہوگا۔ حضورؐ کے ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ دجّال کے باب میں حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اتنا ہی علم دیا گیا تھا کہ دجّال ظاہر ہونے والا ہے۔ آپؐ کے باقی ارشادات بر بنائے وحی نہیں تھے، بلکہ قیاس کی بنیاد پر تھے۔ (مترجم) ؎ VIDE SUPRA (اوپر دیکھیے)

ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام

محمد اجمل اصلاحی

فہرست مشمولات

(۱)

ابنِ ہشام

۴۵۲ —— ۴۶۴

(۲)

سیرت ابنِ ہشام

۴۶۵ —— ۴۸۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام

ابنِ ھشام

علمی دنیا کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ سیرتِ نبوی کے موضوع پر سب سے پہلی مبسوط اور جامع کتاب محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) نے لکھی لیکن اسے وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اس کی اس تلخیص کو حاصل ہوئی جسے ابنِ ہشام نے تیار کیا۔ یہاں تک کہ سیرت ابن اسحٰق سیرت ابنِ ہشام کے نام سے مشہور ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ابن ہشام کے بارے میں اتنی تفصیلات بھی محفوظ نہیں ہیں جو ابنِ اسحٰق کے بارے میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔ چند سطریں ہیں جو تمام تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آ رہے ہیں اور بس۔

ابنِ ہشام کا سب سے قدیم ماخذ مورخ مصر حافظ ابن یونس (۲۸۱ — ۳۴۷) کی "تاریخ الغربا القادمین علی مصر" ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن ابن ہشام کے حالات پر ابن یونس نے جو کچھ لکھا تھا اسے قفطی نے "انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ" میں محفوظ کر لیا ہے حافظ ابن یونس کا زمانہ ابن ہشام سے بہت قریب ہے۔ اوّل الذکر کی پیدائش اور موخر الذکر کی وفات کے درمیان صرف تریسٹھ (۶۳) سال کا فاصلہ ہے۔ نیز حافظ ابن یونس خود مصری ہیں اور مصر کے علمأ پر انہوں نے دو کتابیں مرتب کیں ایک تو ان شخصیات کے بارے میں جن کا وطن اصلی مصر تھا۔ دوسری کتاب جس کا ذکر اوپر گذرا ان غیر مصری علمأ کے حالات میں تھی جنھوں نے مصر میں قیام کیا اس زمانی اور مکانی قربت کی بنأ

پر ابن یونس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ابن ہشام کے بارے میں مفصل اور مستند معلومات فراہم کریں گے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے غالباً اسی شہرت ابن ہشام کی غیر معمولی شہرت کی بنا پر۔ نہایت اختصار سے کام لیا اور تفصیل میں جانا غیر ضروری اور تحصیل حاصل خیال کیا۔
اس مضمون میں تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کے ساتھ خود ابن ہشام کی تالیفات کی مدد سے ابن ہشام کے حالات زندگی اور ان کے شیوخ و تلامذہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد سیرت ابن ہشام پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے!

حالاتِ زندگی

(۱)

ابن ہشام کا نام عبدالملک تھا اور کنیت ابو محمد۔[۲] باپ کا نام ہشام اور دادا کا ایوب۔ آگے کا سلسلۂ نسب محفوظ نہیں رہا۔ البتہ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ابن ہشام نسلاً یمنی تھا۔ تذکرہ نگار عام طور پر "الحمیری" یا "المعافری" یا "الحمیری المعافری" یا "الحمیری الاصل المعافری الیمنی" کی نسبتوں کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔
"معافری"[۳] کی نسبت ایک مشہور یمنی قبیلہ کی جانب ہے جو معافر بن یعفر کی نسل سے ہے۔[۴] اس قبیلہ کے افراد یمن کے علاوہ اندلس اور مصر میں آباد ہوئے۔ یمن کا ایک "مخلاف" (صوبہ) جہاں یہ قبیلہ آباد تھا "مخلاف المعافر" کے نام سے معروف تھا۔ اس علاقے کی چادریں مشہور تھیں۔[۵]
حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر فتح کیا تو ان کے لشکر میں اس قبیلہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد شریک تھی ۲۱ھ میں فسطاط کی آباد کاری اور محلوں کی تقسیم پر جن لوگوں کو مامور کیا گیا تھا ان میں معاویہ بن خدیج تجیبی، شریک بن سمی غطیفی اور عمرو بن مخزم خولانی کے ساتھ قبیلہ معافر کے ایک ممتاز فرد جبریل بن ناشرۃ معافری بھی تھے۔ قبیلہ معافر کا علاقہ "خطۃ المعافر" رصد سے سقایہ ابن طولون تک پھیلا ہوا تھا۔[۶]
ہمدانی، نویری اور یاقوت[۹] وغیرہ سے معافر کا جو سلسلۂ نسب لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ زید بن کہلان کی شاخ ہے۔ نویری نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں معافر کے جو لوگ آباد ہیں وہ اپنا سلسلۂ نسب یہی بتاتے ہیں![۱] اس صورت میں حمیری کے ساتھ معافری کی مطابقت مشکل ہے۔
اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ کیا معافر نام کا کوئی قبیلہ حمیر کی شاخ بھی ہے دوم یمن اور مصر کے معافری حمیر سے تعلق رکھتے ہیں یا کہلان سے۔ پہلے سوال کے جواب میں عرض یہ ہے کہ ابن ہشام نے کتاب التیجان میں جس کا موضوع شاہان حمیر کی تاریخ ہے حمیر کے ایک بادشاہ المعافر بن یعفر بن سکسک بن وائل بن حمیر" کا تذکرہ کیا ہے۔ معافر کا اصل نام نعمان تھا اور اپنے باپ یعفر کے بعد حکمران ہوا۔ اس کے بعد جب اس کے بیٹے السجم بن المعافر کو حکومت ملی تو حمیری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ حمیری اور معافری دونوں نسبتوں میں اصل و فرع کا تعلق ہے۔

اب دوسرے سوال کا جواب ملاحظہ ہو:

۱۔ ابن ہشام نے سابق الذکر معافر بن یعفر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ اسے کھڑا دفن کیا جائے پھر ادریس بن سنان سے نقل کیا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں یمن میں ایک غار کا سراغ لگا جس میں سونے، جواہرات اور اسلحہ کے ساتھ سنگ مرمر کا ایک ایستادہ ستون ملا جس کا سرا سیسے سے بند کیا گیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے ستون توڑنے کا حکم دیا۔ اس ستون کے خول میں ایک بوڑھے شخص کی کھڑی لاش ملی جس کے سر پر سونے کی ایک تختی تھی اور اس پر حمیری زبان میں

ایک رجز لکھا ہوا تھا۔[۱۲]

اس رجز کو نقل کرنے کے بعد ابن ہشام نے امام لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) کا حوالہ دیا ہے (انھیں" اہلِ مصر او ولاۃ المعافر" میں شمار کیا ہے۔ امام لیث کے نزدیک یہ رجز منحول (جعلی) ہے گویا ابن ہشام نے اس قصہ کے بارے میں جو معافر بن یعفر حمیری کے متعلق مشہور ہے امام لیث بن سعد کا حوالہ دیا جو خود معافر کے امرائیں سے تھے۔

اسی موقع پر ابن ہشام نے فتح مصر اور اس میں معافر کی شرکت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری معافر کا رشتہ اسی حمیری بادشاہ معافر بن یعفر سے ہے۔

۲۔ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں معافر کی کچھ بستیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف طور پر انھیں حمیر کی شاخ بتایا ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:[۱۳]

ساکن هذه المواضع من بطون حمیر من ولد المعافر بن جعفر

ان بستیوں میں حمیر کے بطون میں سے معافر بن یعفر کی اولاد آباد ہے۔

ابن ہشام کے یمنی ہونے پر اتفاق کے ساتھ "تقریباً" کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ حافظ ابن یونس نے انھیں "ذُہلی"[۱۴] اور ابن حجر نے "سَدوسی"[۱۵] لکھا ہے۔ سیرت ابن ہشام کے محققین مصطفی السقا وغیرہ کو نسبتوں کے اس اختلاف سے پریشانی لاحق ہوئی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"ابن ہشام کا نام عبدالملک بن ہشام بن ایوب حمیری ہے۔ بعض راوی ابن ہشام کو معافر بن یعفر کی جانب منسوب کرتے ہیں بعض ذُہل سے رشتہ جوڑتے ہیں اور بعض سدوسی بتاتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی قطعی رائے آپ کو نہیں ملے گی۔ یہ صورت حال ہر اس شخص کو پیش آتی ہے جس کے دعویدار ایک سے زیادہ شہر ہوں اور جس نے اپنے خاندانی وطن سے دور زندگی گزاری ہو خاص طور پر جبکہ اس کا خاندان نسبی لحاظ سے اس درجہ کا نہ ہو کہ لوگ اس کے نسب کے نقطِ روایت کا اہتمام کریں۔"

حمیری اور معافری کی حد تک تو بات صاف ہو چکی ہے کہ دونوں نسبتیں درحقیقت ایک ہی ہیں جہاں تک ذہلی اور سدوسی کا تعلق ہے تو یہاں بھی صورتحال مختلف نہیں ہے۔ اکثر ایک ہی نام کے بہت سے قبائل ہوتے ہیں اور ناواقف شخص کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وضاحت کے طور پر اس نسبت کا ذکر کیا جاتا ہے جو نسب کا صحیح تعین کرتی ہو۔ چنانچہ ذہل کے نام سے دو قبائل ہیں اور دونوں کا تعلق بکر بن وائل سے ہے۔ دونوں کا سلسلۂ نسب ملاحظہ ہو۔[۱۶]

۱۔ ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل۔

۲۔ ذہل بن شیبان بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل

مقدم الذکر ذہل بن ثعلبہ موخر الذکر ذہل بن شیبان بن ثعلبہ کا چچا ہوتا ہے۔ سدوس بن شیبان بن ذہل بن ثعلبہ کا تعلق مقدم الذکر سے ہے۔ ذہل بن ثعلبہ اور ذہل بن شیبان دونوں سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ذہلی کی نسبت دونوں سلسلوں میں مشترک ہے اس لئے تعین کے لئے فروعی قبیلہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ فیروز آبادی لکھتے ہیں:[۱۷]

"ذہل دو ہیں: ذہل بن شیبان اور ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ۔ حافظ یحیی اور امام احمد (راجح قول کے مطابق) کا تعلق ذہل بن شیبان سے

ہے۔البتہ قاضی ابو طاہر الذہلی سدوسی ہیں۔" مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ (۶۰ — ۱۱۷ھ) اور امام لغت ابو فید مؤرج بن عمرو (م ۱۹۵ھ) کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

اس تشریح کے بعد نسبتوں کا یہ اختلاف چار قبائل کے بجائے صرف دو میں محدود ہو جاتا ہے یعنی ایک خیال یہ ہے کہ ابن ہشام حمیری معافری یعنی قحطانی ہے جیسا کہ سہیلی اور عام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ ذہلی سدوسی یعنی عدنانی ہے جیسا کہ ابن یونس اور ابن حجر نے لکھا ہے۔ قفطی نے ابن یونس کی رائے کو ترجیح دی ہے لکھتے ہیں:

> "یہ جو سہیلی نے ذکر کیا ہے اس کی بنیاد ظن وقیاس پر ہے۔ ابن ہشام کے نسب اور وفات کے سلسلہ میں مستند بات مقدم الذکر ہے (یعنی ذہلی ہیں، سن وفات میں اختلاف کا ذکر آگے آ رہا ہے) اس لئے کہ اس کے ناقل حدیث و تاریخ میں مصر کے امام ابو سعید عبدالرحمن بن یونس مصری ہیں۔"

ابن مکتوم نے قفطی کی تردید کی ہے۔ ان کے نزدیک "سہیلی کے بارے میں قفطی کا یہ کہنا کہ ان کی رائے کی بنیاد ظن وقیاس پر ہے غلط ہے۔ سہیلی جیسا جلیل القدر عالم جب کسی شخص کی پیدائش و وفات کا ذکر کرتا ہے تو گمان کی بنیاد پر نہیں بلکہ نقل کی بنیاد پر کرتا ہے۔"[18]

ابن مکتوم کی مندرجہ بالا عبارت کے بارے میں یہ کہنا غالباً زیادتی اور خوردہ گیری کے مترادف ہوگا کہ سہیلی کی تائید میں انہوں نے صرف "پیدائش و وفات" کا ذکر کیا ہے اس لیے "نسب" پر اس کا اطلاق نہ ہوگا۔[19]

واقعہ یہ ہے کہ حافظ ابن یونس کے علمی مرتبہ، مصری ہونے کی وجہ سے تاریخ مصر میں ان کے اختصاص اور ان کی معلومات کی قدر و قیمت نیز ابن ہشام کے عہد سے انتہائی قربت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا بیان زیادہ مستنداً در راجح ہو جیسا کہ قفطی نے لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مختلف قرائن ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے نسب کے سلسلہ میں ہمارا رجحان سہیلی کی جانب ہے

۱۔ ابنِ ہشام کے سلسلۂ نسب کا اختصار جو یمنی قبائل کی عام خصوصیت ہے۔

۲۔ یمن کی تاریخ و قصص سے ابن ہشام کی دلچسپی

۳۔ فسطاط میں مستقل قیام

۴۔ حافظ ابن کثیر نے تاریخ وفات کے سلسلہ میں سہیلی پر ابن یونس کے بیان کو ترجیح دی ہے لیکن نسب کے بارے میں وہ بھی سہیلی کے ہم نوا ہیں۔

ابن یونس نے "ذہلی" کی نسبت سے اگر ابن ہشام کے اصلی نسب کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے تو ممکن ہے ذہلی سے مراد ذہلی الولاء ہو۔ انساب میں یہ طریقہ اتنا عام ہے کہ ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بصرہ میں ابن ہشام کا قیام ذہلی قبیلہ سدوس کے ساتھ رہا ہو اس وجہ سے ذہلی اور سدوسی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی قبیلہ میں آ کر قیام کرتا ہے اور اسی کی جانب منسوب ہو جاتا ہے مثلاً ابن اسحٰق نے غزوہ بدر کے شرکاء کے تذکرہ میں حضرت معاذ بن جبل کو بنو عدی بن نابی بن عمرو بن سواد بن غنم میں شمار کیا ہے لیکن ابنِ ہشام نے تصریح کی ہے کہ "معاذ بن جبل کا تعلق بنو سواد سے نہیں ہے۔ ابن اسحٰق نے ان کو بنو سواد کی جانب محض اس وجہ سے منسوب کیا ہے کہ ان کا قیام انہیں کے ساتھ تھا۔"[20] مغازی کے ابتدائی مصنفین میں ایک نام سلیمان بن طرخان تیمی ابو المعتمر بصری کا آتا ہے۔ ابن الصلاح

اور ابن حجر وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ اُن کا نسبی تعلق بنو تمیم سے نہیں تھا البتہ قیام ان کے پاس تھا۔[۲۱]

ابن ہشام کے نسب پر اس گفتگو کے آخر میں جو خاصی طویل ہو گئی یہ انکشاف دلچسپی کا باعث ہو گا کہ خود ابن ہشام نے سیرت النبی یا کتاب التیجان میں اپنے نسب کا کہیں ذکر نہیں کیا اور ہمیشہ ابو محمد عبد الملک بن ہشام یا صرف ابن ہشام یا صرف ابو محمد پر اکتفا کیا۔

(۲)

ابن ہشام کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری محدود اطلاع کے مطابق کوئی قیاس آرائی بھی اب تک نہیں کی گئی ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو چھیڑنا اور اس پیچیدگی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو خود ابن ہشام کی بعض عبارتوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابن اسحٰق نے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر سے روایت کی ہے کہ عقبہ بن ابی معیط کو عاصم بن ثابت بن ابی الافلح نے قتل کیا تھا۔ ابن ہشام نے اس پر یہ نوٹ لکھا ہے:[۲۲]

قال ابن ھشام : ویقال : قتلہ علی بن ابی طالب فیما ذکر لی ابن شھاب الزھری وغیرہ من أھل العلم۔	ابن ہشام نے کہا : ایک قول یہ ہے کہ عقبہ کو علی بن ابی طالب نے قتل کیا جیسا کہ ابن شہاب زہری اور دوسرے اہلِ علم نے مجھ سے بیان کیا۔

اس عبارت میں "لی" کے لفظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ اس سے صراحت ہوتی ہے کہ ابن ہشام نے ابن شہاب زہری سے بغیر کسی واسطہ کے استفادہ کیا تھا۔ امام زہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا اس لیے ابن ہشام کا سن پیدائش کم از کم ۱۱۲ھ کے لگ بھگ ماننا ہو گا۔ ابن ہشام کا انتقال چونکہ راجح قول کے مطابق ۲۱۸ھ میں ہوا اس لئے ان کی عمر سو سال سے زائد ہو گی۔ لیکن سیرت النبی کی مندرجہ بالا عبارت کی صحت محلِ نظر ہے اس لئے کہ پوری سیرت میں یہ واحد مقام ہے جہاں امام زہری سے براہِ راست اخذ و استفادہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے استقصار کے مطابق ابنِ ہشام کے حواشی میں امام زہری کے چودہ (۱۴) حوالے ہیں۔ ان حوالوں میں پانچ قسم کی عبارتیں استعمال کی گئی ہیں۔[۲۳]

۱۔ بلغنی عن الزھری یا بلغنا عن الزھری (۱: ۶۹، ۷۰/ ۲: ۲۵۳، ۲۸۳، ۴۲۴، ۴۲۴، ۵۲۴)
۲۔ فیما ذکر ابن شھاب الزھری (۱: ۳۲۷، ۶۸۳ (مکرر) ۲: ۳۸۸، ۴۰۰)
۳۔ ذکر ابن شھاب الزھری عن عبید اللہ بن عتبۃ عن ابن عباس (۱: ۴۱۲)
۴۔ حدثنی من أثق بہ من أھل الروایۃ فی اسنادلہ عن ابن شھاب الزھری عن عبید اللہ بن عبد اللہ عن ابن عباس ۲: ۲۱۶، ۲: ۴۹۴)
۵۔ حدثنی الثقۃ أنہ حدث عن ابن شھاب الزھری ۲: ۳۵۳)

ابتدائی تین عبارتوں سے پتہ نہیں چلتا کہ ابنِ ہشام اور زہری کے درمیان کتنے واسطے ہیں لیکن چوتھی اور پانچویں سے صاف ظاہر ہے کہ درمیان میں ایک سے زیادہ واسطے ہیں۔

امام زہری ابن اسحٰق کے شیخ ہیں جبکہ ابن ہشام نے سیرۃ النبی براہِ راست ابن اسحٰق سے بھی حاصل نہیں کی جن کا انتقال ۱۵۱ھ میں ہوا بلکہ ابن اسحٰق کے شاگرد زیاد بکائی (م ۱۸۳ھ) سے روایت کی۔ گویا ابنِ ہشام اور امام زہری کے درمیان دو واسطے پائے جاتے ہیں۔ اس وضاحت

کی روشنی میں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ عبارت میں "لی" کا لفظ غلطی سے در آیا ہے اور یہاں بھی بعض دوسرے مقامات کی طرح " فیما ذکر ابن شہاب الزہری الخ" ہے یا "لی" کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے۔ ابن ہشام کی سندوں میں یہ انداز بھی ملتا ہے مثلاً: ذکر لی عن أبی عثمان النہدی" (۱: ۴۷۷) تعجب ہے کہ سیرت کے محققین کو اس حوالہ نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ اس عبارت پر اختلاف نسخ کا کوئی حاشیہ بھی نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کے تمام نسخوں میں یہاں تک کہ وسٹنفلٹ کے ایڈیشن میں بھی یہی الفاظ ہیں یاد رہے کہ وسٹنفلٹ کے ایڈیشن کی بنیاد سُہیلی کے نسخہ پر ہے۔ جو قاضی ابوبکر ابن العربی سے منقول ہے۔ اگر اس نسخہ میں بھی عبارت اسی طرح ہے تو الروض الانف میں سُہیلی کا اس پر توجہ نہ کرنا اور بھی حیرت انگیز ہے۔

سیرت النبی کے بعد ابن ہشام کی دوسری کتاب التیجان کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی ایک روایت پر ہماری نگاہ ٹھہرتی ہے۔ یہ روایت "حدثنی" کے لفظ سے قاضی محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم انصاری[24] سے مروی ہے۔ قاضی محمد بن ابی بکر کا انتقال ۱۳۲ھ میں ہوا۔ اگر یہ سند صحیح ہے تو اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابن ہشام کا سن پیدائش کم ازکم ۱۲۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جائے لیکن کتاب التیجان کا جو ایڈیشن شائع ہوا ہے وہ بہت ناقص اور تصحیفات و تحریفات سے مملو ہے۔ نیز کتاب التیجان کی روایت میں کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(۳)

دوسری صدی ہجری کا زمانہ علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے اسلامی تاریخ کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اپنے علمی سرمایہ کا تحفظ اور اس کی تعبیر و تفسیر، دوسری زبانوں کے علمی خزانوں کو عربی میں منتقل کر کے اپنے ذخیرہ میں اضافہ اور توسیع، بیشتر علوم و فنون کی تشکیل و تدوین، تصنیف و تالیف کی گرم بازاری فقہی و ادبی دبستانوں کا قیام اور عربی و عجمی تہذیبوں کے امتزاج و تفاعل سے ایک نئے اسلامی تمدن کی داغ بیل اس عہد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اس عہد کے علمی و تہذیبی منظر نامے پر جن شہروں نے سب سے پائیدار اور تابدار نقوش ثبت کئے ہیں ان میں بصرہ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ بصرہ کی علمی فضا پر شعر و ادب کا رنگ غالب تھا۔ مربد کے سدا بہار میلوں نے اس رنگ کو اور شوخ بنا دیا تھا۔[25] گھر گھر علم و ادب کا چرچا تھا، تابعین و تبع تابعین کا چشمۂ فیض رواں تھا، تفسیر و حدیث، لغت و نحو اور انساب و اخبار کے منتخب روزگار ائمہ و اساطین جمع تھے۔ ابو عمرو بن العلاءؒ، (م ۱۵۴ھ) یحیی بن سعید قطان (م ۱۹۸ھ) سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) عبدالوارث تنوری (م ۱۸۰ھ) خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۵ھ) یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ) سیبویہ (م ۱۸۰ھ) ابو عبیدہ (م ۲۱۰ھ) اصمعی (م ۲۱۳ھ) ابوزید انصاری (م ۲۱۵ھ) موئرج سدوسی (م ۱۹۵ھ) قطرب (م ۲۰۶ھ) خلف الاحمر (م ۱۸۰ھ) نضر بن شمیل (م ۲۰۳ھ) غرض کس کس کا نام گنایئے کہ ہر شخص اپنے فن کا امام عالی مقام تھا۔

ابن ہشام نے اسی عہد اور اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، ہوش سنبھالا، شہر کے نامور علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ درس و مذاکرہ کی مجلسوں میں شریک ہوئے اور مروجہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔

کتاب التیجان کے مطالعہ سے ابن ہشام کے گھرانے کی علمی دلچسپیوں کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ ابن ہشام نے اپنے باپ اور دادا ایوب کی سندوں سے جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تاریخ و قصص سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے یہ کہنا بیجا

نہ ہوگا کہ تاریخ و قصص کا ذوق ابن ہشام کو ورثہ میں ملا تھا۔ تفسیر و حدیث اس وقت کی ثقافت کا جزو لاینفک اور سارے علوم و فنون کا ماخذ اور سرچشمہ تھے اس لئے ان سے واقفیت ناگزیر تھی۔ ان کے علاوہ جن علوم پر ابنِ ہشام نے اپنی خصوصی توجہ مرکوز کی وہ نحو، لغت، روایت شعر انساب اور مغازی ہیں۔[۲۶]

روایت اور سماع کو اس عہد کے تعلیمی نظام میں اساس اور کلید کی حیثیت حاصل تھی تشنگانِ علم دور دراز کا سفر کرتے، صعوبتیں برداشت کرتے اور ماہرین کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے۔ ابن ہشام کے تعلیمی سفروں کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ تذکرہ نگار ان کے حالات میں بصرہ کے علاوہ صرف مصر کا ذکر کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ مصر جانے سے پہلے انہوں نے دوسرے علمی مراکز کا بھی سفر کیا ہوگا، اس لیے کہ ان کے شیوخ میں کوفی اور مدنی علماء بھی ہیں۔ کوفہ بصرہ کا ہم چشم اور ہم قدم تھا، تہذیب التہذیب میں زیاد بکائی کے حالات میں تصریح ہے کہ ابن ہشام نے سیرت النبیؐ کی روایت ان سے کوفہ ہی میں کی تھی۔[۲۷]

مصر کا سفر کب پیش آیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ابن ہشام نے بصرہ کو خیر باد کہا اور مصر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی؟ ماخذ سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ کتاب التیجان میں ایک جگہ ابن ہشام نے امام مصر لیث بن سعد (۹۲-۱۷۵) سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔[۲۸] امام لیث کی وفات ۱۷۵ھ ہی میں ہوئی۔[۲۹] کتاب التیجان ہی میں ایک روایت ابنِ لَہِیعَہ (ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن لہیعہ) سے حدثنی کے لفظ سے نقل کی ہے۔[۳۰] ابن لہیعہ کا سن وفات ۱۷۰ھ اور دوسری روایت کے مطابق ۱۷۴ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابنِ ہشام اس سے پہلے مصر پہنچ چکے تھے۔

مصر میں قبیلۂ معافر کو ممتاز مقام حاصل تھا جیسا کہ پہلے گذر چکا فسطاط میں ایک مستقل محلہ "خطۃ المعافر" کے نام سے ابتدا ہی سے آباد تھا۔ ممکن ہے مصر کوچ کرنے کا ایک محرک اپنے وطن اصلی کی بظاہر بازیافت اور قدر شناسی و عزت افزائی کی توقع بھی رہی ہو۔ امام لیث بن سعد کے علاوہ جن کا شمار ابن ہشام نے "ولاۃ المعافر" میں کیا ہے کچھ مصر کے دوسرے علماء شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان سے استفادہ کیا۔

مصر میں ابنِ ہشام کی ملاقات امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴) سے ہوئی۔ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ جب امام شافعی مصر تشریف لائے تو انہوں نے ابن ہشام سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب کلام عرب سنایا۔[۳۱] امام شافعی ۱۹۹ھ اور ایک قول کے مطابق ۲۰۱ھ میں مصر پہنچے تھے اور وفات تک وہیں قیام رہا۔[۳۲] امام شافعی ابنِ ہشام سے بہت متاثر اور لغت میں ان کی مہارت کے قائل تھے۔[۳۳] سیرت النبیؐ میں ابن ہشام نے امام شافعی سے ایک روایت بھی نقل کی ہے۔[۳۴] یہ روایت اگرچہ خود ابن ہشام نے براہِ راست بھی سنی تھی لیکن امام شافعی کا واسطہ بھی ساتھ ہی نقل کیا جس سے ابن ہشام کے بیان کی تائید بھی ہوتی ہے اور امام شافعی سے تعلق کا اظہار بھی۔

مصر میں ابن ہشام نے اپنی سیرت کا درس دیا اور یہیں انھیں وہ سعادت مند شاگرد ملے جنہوں نے سیرت کی اشاعت کی اور آخر میں مصر ہی میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

شیوخ و اساتذہ

تذکروں میں زیاد بکائی کے سوا ابن ہشام کے کسی اور شیخ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن سیرت ابن ہشام اور کتاب التیجان کے مطالعہ سے جہاں

ان کے بعض اساتذہ کے نام ملتے ہیں وہیں ان کی کثرت تعداد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ابن اسحٰق نے ایک قصیدہ حضرت علی بن ابی طالب کی جانب منسوب کیا ہے اس پر نقد کرتے ہوئے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ حضرت علی کے بجائے کسی اور کا ہے جیسا کہ بعض علمائے شعر نے مجھ سے ذکر کیا۔ ماہرین شعر میں سے کسی شخص کو میں نے نہیں دیکھا جو اسے حضرت علی کا قرار دیتا ہو (لم ار احدا منهم يعرفها لعلي [۳۵]) اسی طرح بہت سے شیوخ کا ذکر کنایۃً کیا ہے مثلاً "غير واحد من اهل العلم" (ایک سے زیادہ اہل علم) "بعض اهل العلم من اهل مكة"، "بعض اهل اليمن"، "بعض بني تميم"، "رجل من قريش من اهل العلم" وغیرہ

ایک سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیاد بکائی کے علاوہ ابن اسحٰق کے دوسرے شاگردوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ (غیر زیاد) [۳۶]

ذیل میں سیرت النبی اور کتاب التیجان کی مدد سے ابن ہشام کے شیوخ و اساتذہ کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ اس فہرست میں صرف وہ نام شامل کئے گئے ہیں جن سے اخذ و استفادہ کی ابن ہشام نے تصریح کی ہے۔ "قال" اور "ذکر" کے الفاظ سے جو روایتیں منقول ہیں چونکہ ان میں واسطہ کا احتمال ہے جیسا کہ ہم سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کریں گے اس لئے انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ امام زہری کا نام بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہے اگرچہ ان سے ایک روایت "ذکر لی" (مجھ سے ذکر کیا) کے الفاظ سے ملتی ہے اس پر بحث گزر چکی ہے سیرت اور التیجان دونوں کی فہرستیں علٰحدہ ذکر کی ہیں۔

الف: زیاد بن عبد اللہ بکائی (م ۱۸۳ھ) عبد الوارث بن سعید تنوری (۱۰۲ - ۱۸۰ھ) عبد اللہ بن وہب (۱۲۵ - ۱۹۷ھ) یونس بن حبیب نحوی (۹۰ - ۱۸۲ھ) ابو زید انصاری (۱۱۹ - ۲۱۵ھ) ابو عبیدہ معمر بن المثنی (۱۱۰ - ۲۰۹ھ) خلف الاحمر (تقریباً ۱۸۰ھ) خلاد بن قرۃ بن خالد سدوسی، ابوبکر الزبیری (م ۱۸۴ھ) مسلمہ بن علقمہ مازنی، ابن عمرو بن العلاؒ (معاویہ) امام شافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) قاضی عمر بن حبیب بصری (م ۲۰۶ھ)۔

ب: ابن لہیعہ (م ۱۷۰ھ یا ۱۷۴ھ) محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم (م ۱۳۲ھ) اسد بن موسیٰ (م ۲۱۲ھ) ہیثم بن عدی (۱۳۰ - ۲۰۹ھ) انس (غالباً انس بن عیاض بن ضمرۃ لیثی مدنی م ۱۸۵ھ ہیں) حماد بن اسحٰق، ابو عبد اللہ الایلی [۳۷]، عامر بن جریر انصاری۔
اس مجمل فہرست کے بعد ابن ہشام کے چند ممتاز شیوخ کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ یونس بن حبیب نحوی (۹۰ - ۱۸۲ھ)

یونس بن حبیب [۳۸] کا شمار ان اکابر علمائے نحو میں ہوتا ہے جن کی آراء پر بصری اسکول کی بنیاد ہے۔ ابو عمرو بن العلاؒ (م ۱۵۴ھ) کے شاگرد تھے۔ بصرہ میں ان کے حلقۂ درس میں طلبہ، ادباء اور فصحائے اعراب کا زبردست ہجوم ہوتا تھا۔ ابو زید انصاری، ابو عبیدہ، سیبویہ، کسائی اور فراء جیسے علمائے عربیت نے ان سے استفادہ کیا۔ خلیل بن احمد فراہیدی کے بعد سیبویہ نے اپنی کتاب میں سب سے زیادہ اقوال جس شخص کے نقل کئے ہیں وہ یہی یونس نحوی ہیں۔ نحو کے بہت سے مسائل اور قیاسات میں یونس منفرد ہیں۔ ابو زید انصاری کا قول ہے کہ میں یونس بن حبیب کے حلقہ میں دس سال تک شریک رہا اور مجھ سے پہلے خلف الاحمر نے بیس سال تک حاضری دی۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں چالیس سال تک یونس کے پاس جاتا رہا اور روزانہ اپنی تختیاں ان کے املا سے بھر لیتا تھا [۳۹]

یونس کی ثقاہت کے بارے میں ابراہیم حربی کی یہ رائے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ بصرہ کے علمائے عربیت "اصحاب اهوا" تھے البتہ چار

شخصیتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ابو عمرو بن العلاء، خلیل بن احمد، یونس بن حبیب، اصمعی۔

یونس کی تصنیفات میں معانی القرآن، کتاب اللغات، کتاب النوادر، کتاب الامثال وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

۲۔ابو زید انصاری (۱۱۹ - ۲۱۵ھ)

سعید بن اوس بن ثابت ابو زید انصاری[۴۱] بصرہ کے مشہور اور ثقہ امام نحو و لغت تھے۔ ابو عمرو بن العلاء کے شاگرد اور ابو عبید قاسم بن سلام ابو حاتم سجستانی اور سیبویہ کے استاذ ہیں۔ شاعری، لغت اور نوادر سے خاص شغف تھا۔ نحو میں انھیں یونس سے کمتر اور اصمعی اور ابو عبیدہ سے برتر خیال کیا جاتا ہے۔ ابو زید نے لغت کے موضوعات پر جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں نحو کے جس قدر شواہد ملتے ہیں اتنے کسی اور شخص کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ بصری علمائے لغت و نحو میں ابو زید انصاری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اہلِ کوفہ سے روایت کی چنانچہ ابو زید کی کتاب النوادر کا بیشتر حصہ مفضل ضبی سے منقول ہے۔ بصرہ میں ابو زید کا مستقل حلقہ تھا جس میں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ ابو زید کی ثقاہت پر اتفاق ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ان کی روایتیں بھی نقل کی ہیں۔ خود ابو زید کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ سیبویہ اپنی کتاب میں جب اخبرنی الثقۃ، سمعت من اثق بہ، یا حدثنی من اثق بعربیتہ کہتا ہے تو اس کی مراد ابو زید سے ہوتی ہے۔

ابو زید کی کتابوں میں ایک کتاب النوادر سعید شرتونی کی کوشش سے بیروت سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ لغات القرآن، خلق الانسان، اللامات، الجمع، التثنیہ، المصادر وغیرہ کے نام سے ابو زید کے بہت سے رسائل کا ذکر ملتا ہے۔

۳۔عبدالوارث بن سعید تنوری (۱۲۰ - ۱۸۰ھ)

حافظ ابو عبیدہ عبدالوارث بن سعید تنوری[۴۱] بصرہ کے مشہور حفاظ حدیث میں سے تھے ابن سعد نے "ثقۃ حجۃ" اور امام نسائی نے "ثقۃ ثبت" لکھا ہے یحییٰ بن معین نے تنوری کو "اثبت شیوخ البصریین" میں شمار کیا ہے۔ محرم ۱۸۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

۴۔ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ (۱۱۰ - ۲۰۹ھ)

ابو عبیدہ[۴۲] بنو تیم کا مولیٰ اور جامع کمالات شخصیت کا مالک تھا۔ ابو عمرو بن العلاء اور یونس نحوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تلامذہ میں ابو عبید قاسم بن سلام، ابو حاتم سجستانی، مازنی، اثرم اور عمر بن شبہ قابلِ ذکر ہیں۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہ کا خاص میدان غریب اللغہ اور ایام و اخبار عرب کا موضوع تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں کی تاریخ، انساب اور لغت و اشعار کے بارے میں ابو عبیدہ کا علم بحر زخار کی مانند تھا۔ ان موضوعات پر ابو عبیدہ نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں جن میں مجاز القرآن اور نقائض جریر و الفرزدق شائع ہو چکی ہیں[۴۳]۔

۵۔عبداللہ بن وہب (۱۲۵ - ۱۷۰ھ)

عبداللہ بن وہب بن مسلم قرشی مصری[۴۴]۔ ابو محمد کنیت تھی۔ قریش سے ولاء کا تعلق تھا اس لئے قرشی کہلائے۔ فقہ اور حدیث کے ایسے متبحر اور باکمال عالم تھے کہ "دیوان العلم" لقب پڑ گیا۔ بیس سال تک امام مالک کی صحبت میں رہے، امام مالک عبداللہ بن وہب کے بڑے معترف تھے اور اپنے خطوط میں انھیں "مفتی اہل مصر" سے خطاب کرتے تھے۔ امام مالک کی موطا کو انہوں نے الموطأ الصغیر اور الموطأ الکبیر کے نام سے دو مجموعوں میں مدون کیا تھا۔ ہارون بن عبداللہ زہری کا بیان ہے کہ امام مالک کے کسی قول کے بارے میں اہل مدینہ کے درمیان جب اختلاف ہوتا تو وہ ابن وہب کی آمد کا انتظار کرتے اور انھیں سے دریافت کرتے۔ ابن وہب کے شیوخ میں امام مالک، امام لیث، ابن جریج، عمرو بن الحارث،

حیین بن عبداللہ معافری، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمہ شامل ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں خود ان کے شیخ امام لیث بن سعد کے علاوہ یحییٰ بن بکیر، علی بن المدینی اور یونس بن عبدالاعلی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ابوزرعہ کا قول ہے کہ میں نے ابن وہب کی تقریباً تیس ہزار حدیثوں کی تحقیق کی جو انہوں نے مصر اور غیر مصر میں بیان کیں لیکن مجھے ان میں کوئی بے اصل حدیث نہیں ملی۔ محدثین نے بالاتفاق ابن وہب کی توثیق کی ہے۔

۶۔ ابوبکر زبیری (م ۱۸۴ھ)

عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن الزبیر ابوبکر زبیری مصعبی[۴۵]۔ ابوحازم، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ کے شاگرد ہیں۔ ہارون رشید نے انھیں مدینہ اور یمن کا گورنر مقرر کیا۔ خطیب بغدادی نے ان کی جلالت قدر اور حسن کردار کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۴ھ میں انتقال کیا۔

۷۔ خلف الاحمر

ابو محرز خلف بن حیان مولیٰ بلال بن ابی بردۃ[۴۶]۔ بلند پایہ شاعر اور ماہر نقاد و سخن شناس تھا۔ شمر کا قول ہے کہ خلف الاحمر پہلا شخص ہے جس نے بصرہ میں سماع کی ابتدا کی۔ خلف الاحمر کی ثقاہت کے بارے میں ابتدا ہی سے اختلاف رہا ہے۔ اگر ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ خلف الاحمر اشعار گھڑ کر شعرائے متقدمین کی جانب منسوب کر دیتا تھا تو دوسری طرف ابن سلام کا قول ہے کہ ہمارے اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ خلف سب سے بڑا سخن شناس اور راست گو تھا۔ خلف سے جب ہم کسی واقعہ کی روایت کرتے یا وہ ہمیں کوئی شعر سناتا تو ہمیں اس کا غم نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے اسے صاحب واقعہ یا خود شاعر کی زبان سے نہیں سنا۔ یاد رہے کہ ابن سلام نے عربی شاعری میں وضع و نحل کے موضوع پر سب سے زیادہ لکھا ہے اور حماد راویہ اور ابن اسحٰق پر شدید نکتہ چینی کی ہے[۴۷]۔

۸۔ ھیثم بن عدی (۱۳۰ - ۲۰۶ھ)

ابو عبدالرحمٰن طائی ثعلی بحتری کوفی[۴۸] مشہور راوی اور اخباری تھا۔ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون رشید کا ہمنشین رہا۔ کلام عرب، ایام عرب اور تاریخ و انساب کا زبردست خزانہ اس کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ ابن الندیم نے ھیثم کی پچاس سے اوپر کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب المعمرین، کتاب بیوتات قریش، نسب طی، المثالب الکبیر، المثالب الصغیر، الوفود، خطط الکوفہ، ولاۃ الکوفہ، طبقات الفقہاء والمحدثین، النوادر، تاریخ الاشراف الکبیر، تاریخ الاشراف الصغیر وغیرہ۔

ابن ہشام کے چند شیوخ کے بارے میں جو مختصر معلومات مندرجہ بالا صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن علوم کو ابن ہشام نے اپنی صلاحیتوں کا محور بنایا تھا اُن کی تکمیل کے لئے ان علوم کے نامور اور یکتائے روزگار ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے بے کراں علم سے سیراب ہوئے۔

علمی مرتبہ

ابن ہشام نے یوں تو تمام مروجہ علوم کی تحصیل و تکمیل کی تھی لیکن تاریخ و سیرت اور علوم عربیہ میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ نحو میں ان کی مہارت کا یہ حال تھا کہ "نحوی" ان کے نام کا جزو بن گیا تھا۔ ادیب، اخباری، نسابہ (ماہر انساب) وہ صفات ہیں جو ہر تذکرہ نگار ابن ہشام کے حالات

میں ضرور لکھا ہے :

حافظ ابن کثیر (۷۰۱ - ۷۷۴ھ) نے ابن ہشام کے حالات میں امام شافعی کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے نقل کیا ہے کہ امام شافعی ابن ہشام کے بارے میں کہتے تھے :[49]

"حجة فی اللغة" لغت میں حجت ہیں

امام شافعی کا یہ ارشاد جو خود بلند پایہ ادیب شاعر تھے بہت اہمیت رکھتا ہے ابن کثیر نے ابن ہشام کے حالات میں لکھا ہے :

وکان اماما فی اللغة والنحو ابن ہشام لغت اور نحو میں امام تھے۔

البدایة والنہایة میں ایک قصیدہ مکمل نقل نہ کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے ابن کثیر نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ "یہ قصیدہ مکمل ہم نے صرف اس لئے درج نہیں کیا امام عبدالملک بن ہشام نے جو لغت کے امام تھے ذکر کیا ہے کہ اکثر علمائے شعر اس کی صحت کے منکر ہیں۔[50]"

حافظ ابن یونس نے ابن ہشام کو ثقہ قرار دیا ہے اور ہمارے محدود علم کے مطابق کسی نے تجریح و تضعیف نہیں کی بلکہ ہر تذکرہ نگار اور مورخ نے ان کا ذکر احترام اور اعتراف کے ساتھ کیا ہے۔

تلامذہ

ابن ہشام کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات میں ان کے کسی شاگرد کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ سیرت ابن ہشام کی روایت کی سندوں اور رجال کی کتابوں کے مطالعہ سے ابن ہشام کے تین تلامذہ کا پتہ چلتا ہے۔[51]

۱- محمد بن عبداللہ (م ۲۴۹ھ)

۲- احمد بن عبداللہ (م ۲۷۰ھ)

۳- عبدالرحیم بن عبداللہ (م ۲۸۶ھ)

حسن اتفاق سے یہ تینوں تلامذہ ایک دوسرے کے حقیقی بھائی ہیں اور تینوں کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ ان کے والد کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالرحیم بن سعید[52] (س، ع، ی، د) بن ابی زرعہ زہری برقی - ان کے جد امجد ابو زرعہ قبیلہ بنی زہرہ کے مولی تھے اس لئے زہری کہلائے "برقی" (بسکون راء) کی نسبت ایک مشہور علاقہ "برقہ" کی جانب ہے جو ہمدانی کے بیان کے مطابق فسطاط سے دو سو بیس (۲۲۰) فرسخ پر آباد تھا۔ حافظ ابن یونس نے احمد بن عبداللہ کا ذکر اہل برقہ اور محمد بن عبداللہ کا اہل مصر میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ محمد بن عبداللہ اور ان کے بھائی برقہ میں تجارت کرتے تھے اس لئے برقی کی نسبت سے مشہور ہوئے حالانکہ ان کا تعلق مصر سے ہے۔

۱- محمد بن عبداللہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔[53] ابن ہشام کے علاوہ عمرو بن ابی سلمہ، اسد بن موسیٰ، موسیٰ بن ہارون، یحییٰ بن حسان، حمیدی، فریابی، ابو عبدالرحمن مقری اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے روایت کی، کتاب الضعفاء کے مصنف اور اس فن میں یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے صاحبزادے عبداللہ، ابو داود، نسائی، عبید اللہ بن یحییٰ بن یحییٰ، محمد بن عبدالسلام خشنی، ابو حاتم، محمد بن معانی، عمر بن بجیر اور مطرف بن عبدالرحمن بن قیس قابل ذکر ہیں۔ ابن یونس نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ۲۴۹ھ میں انتقال کیا۔

۲۔ حافظ احمد بن عبد اللہ کی کنیت ابوبکر ہے۔[۵۴] ان کے شیوخ میں عمرو بن ابی سلمہ، سعید بن ابی مریم، اسد بن موسیٰ، ابو صالح کاتب اللیث اور اسی طبقے کے دوسرے محدثین شامل ہیں۔ امام ذہبی نے انھیں "حافظ متقن" اور سمعانی نے "ثقۃ ثبت" لکھا ہے۔ حافظ ابوبکر کے شاگردوں میں محمد بن اسمٰعیل بن الفرج المہندس اور احمد بن علی مدائنی مشہور ہیں۔ ذہبی نے صحابہ کے حالات پر حافظ ابوبکر کی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن سمعانی نے لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کتاب الصحابہ دراصل۔ ان کے بھائی محمد بن عبد اللہ کی تصنیف ہے مگر وہ مکمل نہ کر سکے تو احمد بن عبد اللہ نے اسے مکمل کیا اور اس کا درس دیا، دونوں کی سند ایک ہے۔ حافظ ابوبکر کا انتقال رمضان ۲۷۰ھ میں ہوا۔

۳۔ تیسرے بھائی عبد الرحیم بن عبد اللہ کی کنیت ابو سعید ہے۔ سیرت ابن ہشام کی روایت میں یہ بھی اپنے دونوں مقدم الذکر بھائیوں کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کے شاگردوں میں عبد اللہ بن جعفر بن الورد اور طبرانی کا ذکر ملتا ہے۔ ذی قعدہ ۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

تصنیفات

تذکرہ نگاروں نے ابن ہشام کی درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ تہذیب سیرۃ ابن اسحٰق

یہی کتاب سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا مفصل تعارف آئندہ صفحات میں آئے گا۔

۲۔ کتاب التیجان فی ملوک حمیر

مآخذ میں اس کتاب کو مختلف ناموں سے ذکر کیا گیا ہے مثلاً "انساب حمیر و ملوکہا"، "شرح انساب حمیر و ملوکہا"، "التیجان فی اخبار ملوک الزمان"[۵۵] اس کتاب کی بنیاد وہب بن منبہ کی اس کتاب پر ہے جس کا ذکر "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر و اخبارہم و قصصہم و قبورہم و اشعارہم" کے نام سے وہب بن منبہ کے حالات میں ملتا ہے۔ ناموں کے اختلاف کے باوجود کتاب ایک ہی ہے جسے ابن ہشام نے اپنے حواشی اور اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔ ابن ہشام نے اس کتاب کی روایات اسد بن موسیٰ (۱۳۲ — ۲۱۲ھ) سے کی ہے۔[۵۶] مکمل سند کتاب التیجان کے سرورق پر اس طرح ہے:۔

"اسد بن موسیٰ عن ابی ادریس بن سنان عن جدہ لامہ وہب بن منبہ" اس سند میں جو کتاب التیجان میں متعدد بار اسی طرح منقول ہے۔ دو غلطیاں ہیں:

۱۔ "ابی" اور "ادریس" کے درمیان "الیاس" چھوٹ گیا ہے۔ ابو الیاس ادریس بن سنان کی کنیت ہے۔

۲۔ ابو الیاس ادریس بن سنان اور اسد بن موسیٰ کے درمیان "عبد المنعم" کا نام چھوٹ گیا ہے جو ادریس بن سنان کے بیٹے ہیں۔[۵۷] اس لیے کہ عبد المنعم کے بارے میں ابن ابی حاتم نے اسمٰعیلؒ بن عبد الکریم سے نقل کیا ہے کہ ان کی شیر خواری کے زمانہ ہی میں ان کے والد ادریس کا انتقال ہو چکا تھا۔ عبد المنعم کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی اور ابن سعد کے مطابق تقریباً سو سال اور ابن ندیم کے بقول سو سال سے اوپر عمر پائی۔[۵۸] گویا ادریس کا انتقال ۱۳۰ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اس صورت میں اسد بن موسیٰ کی ان سے روایت کیسے ممکن ہے جبکہ اسد بن موسیٰ کی پیدائش ۱۳۲ھ میں ہوئی۔

الروض الانف میں سہیلی نے متعدد مقامات پر کتاب التیجان کے حوالے دیے ہیں[59] اور ہمدانی نے کتاب الاکلیل کے آٹھویں حصہ میں کثرت سے اقتباسات نقل کئے ہیں۔[60]

یہ کتاب آصفیہ لائبریری حیدرآباد، برٹش میوزیم لندن اور برلین کے تین مخطوطات کی بنیاد پر کرنکو اور مصححین دائرۃ المعارف العثمانیہ کی کوششوں سے ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوئی۔[61]

۴۔ شرح ماوقع فی اشعار السیر من الغریب

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ابن ہشام نے مغازی کے شعری مواد کو موضوع بنایا تھا اور اشعار کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی تھی سہیلی کے انداز بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔[62]

تذکروں میں صرف انھیں تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ ابن ہشام کی تصنیفات کی فہرست اتنی مختصر نہیں رہی ہوگی۔[63] ابن ہشام کے سب سے قدیم اور قریب العہد تذکرہ نگار حافظ ابن یونس نے تو صرف سیرۃ ابن ہشام ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ہشام کی شہرت ابتداً ہی سے ایک نحوی اور امام لغت کی حیثیت سے ہوئی۔ قفطی نے انباہ الرواۃ میں ابن ہشام کے ترجمہ کا عنوان جو غالباً ابن یونس سے منقول ہے اس طرح لکھا ہے:

"عبد الملک بن ہشام بن ایوب الذہلی النحوی"

فن نحو سے صرف "واقفیت" کی وجہ سے کوئی شخص ہرگز "نحوی" کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک کہ اس فن میں خاطر خواہ مہارت اور کوئی تصنیف نہ ہو۔ لیکن نحو پر ابن ہشام کے کسی رسالہ کا سراغ نہیں ملتا۔ بظاہر سیرت ابن ہشام کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے اُن کے تلامذہ سیرت ہی کی روایت و اشاعت میں مصروف رہے اور ابن ہشام کی دوسری کتابوں کی جانب توجہ نہیں کی اور وہ ضائع ہو گئیں۔

وفات

ابن ہشام کے سن وفات کے بارے میں دو قول ہیں: مورخ مصر حافظ ابن یونس (م ۳۴۷ھ) نے مکمل تاریخ وفات تیرہ (۱۳) ربیع الآخر ۲۱۸ھ لکھی ہے جبکہ سیرت ابن ہشام کے شارح سہیلی (م ۵۸۱ھ) نے صرف سن وفات ۲۱۳ھ ذکر کیا ہے۔

ابن ہشام کے نسب اور سن وفات کے بارے میں سہیلی کی رائے پر قفطی نے جو تنقید کی ہے اور ابن کثوم نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ ابن یونس کا زمانی و مکانی قرب بھی پیش نظر ہے اس کے بعد ابن کثیر کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو انہوں نے البدایہ والنہایۃ میں ۲۱۳ھ کے واقعات میں ابن خلکان کے حوالہ سے سہیلی کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

والصحیح أنه توفی سنة ثمان عشرة ومائتین کما نص علیه ابوسعید بن یونس فی تاریخ مصر۔	صحیح یہ ہے کہ ابن ہشام کی وفات ۲۱۸ھ میں ہوئی جیسا کہ ابوسعید بن یونس نے تاریخ مصر میں تصریح کی ہے

اسی وجہ سے ابن کثیر نے یہاں صرف اس حوالہ پر اکتفا کیا اور ابن ہشام کے حالات ۲۱۸ھ کے واقعات میں لکھے، ہمارے خیال

بین ابن یونس کے بیان کو اس لیے بھی مستند ہونا چاہیے کہ انہوں نے ابنِ ہشام کی تاریخ وفات میں سہیلی کی طرح صرف سن نہیں لکھا جو معلومات کے ناقص ہونے کی دلیل ہے بلکہ تاریخ، مہینہ اور سن سب کا ذکر کیا ہے۔ ابوالفدا (م ۷۳۲ھ) نے ۲۱۸ھ کو "قیل" سے ذکر کیا ہے جبکہ یافعی[۶۴] (م ۷۶۸ھ) سیوطی[۶۵] (م ۹۱۱ھ) اور ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ کحالہ نے معجم المؤلفین میں ۲۱۳ھ کے لیے سیر النبلاء (مخطوط، ۷ : ۲۳۶) کا حوالہ دیا ہے حالانکہ العبر میں ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ابن ہشام کے حالات ۲۱۸ھ کے ضمن میں لکھے ہیں اور ۲۱۳ھ کی جانب اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

معاصرین میں جرجی زیدان، زرکلی اور کحالہ نے سہیلی کی تقلید کی ہے جبکہ براکلمان اور استوری نے ابن یونس کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

سیرت ابن ہشام

مؤلف سیرت

سیرت ابن ہشام جس نے ابن ہشام کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا در اصل سیرت ابن اسحٰق کی تلخیص و تہذیب ہے۔

ابن اسحٰق[۶۶] کا نام محمد بن اسحٰق بن یسار تھا، قیس بن مخرمہ بن المطلب بن عبد مناف کے مولی تھے اس لئے مطلبی کہلائے۔ ابن اسحٰق کے دادا یسار ۱۲ھ میں عین التمر کی فتح میں قید ہو کر آئے تھے۔ ابن اسحاق کی پیدائش مدینہ میں ہوئی اور وفات بغداد میں سن وفات ۱۵۰ھ اور ۱۵۳ھ کے درمیان ہے۔ ابنِ خلکان نے ۱۵۱ھ کو راجح قرار دیا ہے۔

ابن اسحٰق امام زہری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں تحصیلِ علم کا ایسا شوق تھا کہ مدینہ سے نکلے اور اسکندریہ، کوفہ، جزیرہ، رے اور حیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے بغداد پہنچے۔ دار السلام راس آ گیا اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ اس طویل علمی سفر میں بے شمار شیوخ سے استفادہ کیا۔ ابن اسحٰق کی روایتوں اور کتب رجال کی روشنی میں ابن اسحٰق کے شیوخ کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) تک پہنچتی ہے[۶۷]۔

روایت حدیث میں ابنِ اسحٰق کے مرتبہ کے بارے میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ محدثین کی اکثریت انھیں ثقہ قرار دیتی ہے[۶۸]۔ امام مسلم نے "متابعات" میں ان کی روایت نقل کی ہے۔ ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی ان کی روایتیں درج کی ہیں سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید قطان جیسے ماہرین فن رجال نے ابن اسحٰق کی توثیق کی ہے اور ان کی حدیثوں سے استناد کیا ہے سب سے سخت نکتہ چینی امام مالک بن انس نے کی ہے جس کی پشت پر دونوں کی باہم چشمک کارفرما ہے ابن خلکان نے فیصلہ کن رائے دی ہے فرماتے ہیں[۶۹]:

"محمد بن اسحٰق بیشتر علماء کے نزدیک حدیث میں "ثبت" تھے، اور جہاں تک مغازی اور سیر کا تعلق ہے تو اس فن میں ان کی امامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔

ابن اسحٰق نے مغازی میں ایسا کمال پیدا کیا کہ خود ان کے شیخ امام زہری فرماتے ہیں:

من اراد المغازی فعلیہ بابن اسحٰق — جو شخص مغازی کا علم حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحٰق سے رجوع کرے

امام شافعی سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا گیا ہے[۴۱]:

من أراد أن يتبحر في المغازي فهو عيال على محمد بن اسحٰق۔ | جو شخص مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحٰق کا دستِ نگر ہے۔

سیرت و مغازی کے موضوع پر یوں تو ابنِ اسحٰق سے پہلے اور ان کے معاصرین میں متعدد علماء نے کتابیں لکھیں لیکن جو شہرت و مقبولیت مغازی ابن اسحٰق کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہو سکی۔ دوسری کتابیں یا تو ضائع ہو گئیں یا تاریخ و سیر کی کتابوں میں اقتباسات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اس کے برعکس ابن اسحٰق کی مغازی ہمارے پاس ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی شکل میں موجود ہے۔

مغازی ابن اسحٰق کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابن ہشام جیسا خادم مل گیا جس نے اس کی تہذیب و تنقیح کا کام انجام دیا اور اس پہلو سے ابنِ ہشام سیرت ابن اسحٰق کی شہرت و مقبولیت میں شریک ہی نہیں شریک غالب ہے۔

راوی سیرت

فیوک (FUCK) نے ابن اسحٰق کے پندرہ (۱۵) شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق ثابت ہے کہ انہوں نے مغازی کی روایت کی[۴۲]۔ ان میں یونس بن بکیر شیبانی (م ۱۹۹ھ) مسلمہ بن الفضل الابرش انصاری (م ۱۹۰ھ) ہارون بن ابی عیسیٰ شامی یحییٰ بن سعید بن العاص اموی (م ۱۹۴ھ) محمد بن عبداللہ بن نصیر ہمدانی ابو عبدالرحمٰن کوفی نفیلی (م ۲۳۴ھ) اور ابراہیم بن سعد بن ابراہیم زہری (م ۱۸۲ھ یا ۱۸۵ھ) کی روایتوں کے اقتباسات تاریخ و طبقات کی کتابوں میں ملتے ہیں[۴۳] لیکن ابن اسحٰق کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور اور مستند روایت زیاد بکائی کی ہے۔ ابن ہشام کی سیرت کی بنیاد اسی روایت پر ہے۔

ابو محمد زیاد بن عبداللہ بن طفیل بن عامر قیسی عامری بکائی[۴۴] کا شمار صاحب اتقان حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور کوفہ ہی میں ۱۸۳ھ میں انتقال کیا۔ ابن اسحٰق کے علاوہ عبدالملک بن عمیر، حمید الطویل، عاصم الاحول، اعمش، یزید بن ابی زیاد اور حجاج بن ارطاۃ وغیرہ سے روایت کی۔ بکائی سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابو غسان نہدی، سہل بن عثمان، یوسف بن حماد اور عبداللہ بن سعید بن ابان اموی قابلِ ذکر ہیں۔

سیرت نبوی سے بکائی کے عشق اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لئے اپنا گھربار فروخت کر کے ابن اسحٰق کے ساتھ ہو لیے اور ان کے ہمراہ گھومتے رہے تا آنکہ ان سے مغازی کی سماعت مکمل کر لی یہی نہیں بلکہ اپنی روایت کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لئے دوبارہ اس کی سماعت کی۔ اسی وجہ سے ان کی روایت کو سیرت ابنِ اسحٰق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہوئی۔

امام بخاری نے اپنی تاریخ میں بکائی کے بارے میں وکیع بن الجراح کا قول نقل کیا ہے کہ "زیاد کا مرتبہ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ حدیث میں غلط بیانی سے کام لیں" امام ترمذی سے یہ چوک ہوئی کہ انہوں نے اس جملہ کو الٹ دیا اور وکیع کی جانب یہ منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا "زیاد بن عبداللہ اپنے شرف اور بلندی کے باوجود حدیث میں غلط بیانی سے کام لیتے تھے"[۴۵] سہیلی لکھتے ہیں کہ امام ترمذی کو وہم ہوا۔ وکیع نے زیاد کے بارے میں وہی بات کہی تھی جو بخاری نے تاریخ میں نقل کی ہے ورنہ اگر وکیع ان پر کذب کا الزام لگاتے تو امام بخاری و مسلم ان سے

ایک حدیث بھی نقل نہ کرتے جس طرح کہ انہوں نے الحارث الاعور اور ابان بن عیاش کی کوئی روایت اس لئے نہیں درج کی کہ متقدم الذکر پر شعبی نے اور موخر الذکر پر شعبہ نے یہی الزام لگایا۔ بکائی کے بارے میں امام سُہیلی کا یہ قول قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے کہ "بکائی کی توثیق و تزکیہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ امام بخاری نے کتاب الجہاد اور امام مسلم نے متعدد مقامات پر ان کی روایتیں نقل کی ہیں۔"

بعض محدثین نے روایت حدیث کے سلسلہ میں انھیں ضعیف قرار دیا ہے لیکن ابن اسحٰق سے مغازی کی روایت میں ان کے ثقہ ہونے کے وہ بھی قائل ہیں اور ابن اسحٰق کے دوسرے راویوں پر انھیں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ صالح بن محمد کہتے ہیں کہ کتاب المغازی کی صحیح ترین روایت زیاد کی ہے۔ زیاد فی نفسہ ضعیف ہیں لیکن اس کتاب میں وہ سب سے زیادہ "ثبت" ہیں۔ ابن معین سے — جنھوں نے "زیاد بکائی ابن اسحٰق کے بارے میں ثقہ ہیں" کہہ کر گویا دوسرے شیوخ سے نقل و روایت میں زیاد کی تضعیف کی ہے۔ جب عثمان دارمی نے دریافت کیا کہ میں مغازی کی روایت یونس بن بکیر کے شاگردوں سے حاصل کروں یا دوسروں سے تو انہوں نے فرمایا:

أكتب عن أصحاب البكائي — بکائی کے اصحاب سے نقل کرو

ابن ادریس کا قول ہے کہ ابن اسحٰق سے روایت کرنے والوں میں ان سے زیادہ "ثبت" کوئی نہیں اس لئے کہ ابن اسحٰق نے اپنی کتاب انھیں دو بار املا کرائی تھی۔

ابن تغری بردی کے الفاظ ہیں:

وهو أتقن من روى عنه السيرة — سیرت جن لوگوں سے منقول ہے ان میں سب سے زیادہ صاحبِ اتقان زیاد بکائی ہیں۔

سخاوی نے اپنی کتاب الاعلان بالتوبیخ میں سیرت ابن اسحٰق کے راویوں میں بکائی اور یونس بن بکیر کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دونوں میں بکائی زیادہ ثقہ ہیں (اولهما أوثقهما)

یہ ابن ہشام کی بالغ نظری اور سیرت نبوی کی تدوین میں ان کی انتہائی احتیاط اور اہتمام کی دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت ابن اسحٰق کے لئے سیرت کے اس شیدائی کا انتخاب کیا جس کے بارے میں محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کی روایت مستند ترین روایت ہے۔ ابن ہشام کے نزدیک بکائی کس درجہ ثقہ اور معتبر تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق کی ان مرویات کو ابن ہشام نے سیرت سے خارج کر دیا جن کی تصدیق زیاد بکائی نے نہیں کی۔

ابن حجر کا خیال ہے کہ ابن ہشام نے زیاد بکائی سے سیرت کی روایت کوفہ میں کی۔ لیکن اس کی از سر نو تدوین اور تلخیص و تہذیب کا کام بصرہ میں شروع ہوا اور تنقیح و تحقیق کا سلسلہ مصر کے زمانۂ قیام تک جاری رہا۔

ابن ہشام کا کارنامہ

سیرت ابن ہشام کی روایت کی توثیق کے بعد آیئے ابن ہشام کے اس عظیم کارنامہ کا جائزہ لیں جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ابن اسحٰق کے کارنامہ سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

کتاب کے آغاز میں خود ابن ہشام نے اپنے کام کے بعض بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ ابن ہشام کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو (صفحہ ۴)

"میں انشاء اللہ اس کتاب کو اسمٰعیل بن ابراہیمؑ کے ذکر سے شروع کروں گا، اور اسمٰعیلؑ سے آنحضرتؐ تک اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے ان لوگوں کا ذکر ہوگا جو آپؐ کے آباؤ اجداد میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بھی لکھوں گا۔ اختصار کی وجہ سے ان کے سوا حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ اختصار ہی کے پیش نظر بعض ایسی روایات کو بھی خارج کروں گا جن کا ذکر ابن اسحاق نے اس کتاب میں کیا ہے لیکن ان میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے نہ ان کے بارے میں قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوئی۔ نیز ان سے کتاب کی کسی بحث کی توجیہہ، تشریح یا تائید بھی نہیں ہوتی۔ ان اشعار کو بھی شامل نہیں کروں گا جن کے بارے میں ان ماہرین شعر کو جن سے میری ملاقات ہوئی کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض وہ باتیں بھی قلم انداز کر دی ہیں جن کے بیان کرنے سے زبان آلودہ ہوتی ہے یا ان سے کسی کی دلآزاری ہوتی ہے یا بکائی نے ان کی روایت پر اطمینان ظاہر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے علم و روایت کی حد تک انشاء اللہ اس کا استقصا کروں گا۔"

مذکورہ بالا عبارت میں ابن ہشام نے اپنے کام کے منفی رُخ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اس لیے کہ اس کا تعلق ابن اسحٰق کی کتاب میں حذف و ترمیم سے تھا اور ابن ہشام کی وضاحت کے بغیر اس کے اسباب کا علم ممکن نہ تھا لیکن مثبت طور پر ابن ہشام نے سیرت کی جو خدمت کی ہے اس کی جانب آخر میں ایک سرسری اشارہ پر اکتفا کیا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، کتاب خود شاہد عدل ہے۔ نیز ابن ہشام کی عالی ظرفی اور خاکساری کو خودسرائی گوارا نہ ہوئی۔

تلخیص و تدوین جدید

ابن ہشام کی مذکورہ تبدیلیوں کو ہم "سیرت ابن اسحٰق کی تلخیص و تدوین جدید" کا عنوان دے سکتے ہیں جو سیرت ابن ہشام کی تیاری میں "روایت" کے بعد دوسرا قدم تھا۔ ان تبدیلیوں کی پانچ بنیادیں تھیں:

۱۔ ترکیز

ہر چند کہ ابن اسحٰق کی اصل کتاب مفقود ہے لیکن مختلف مآخذ میں اس کے جو اقتباسات ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب خاصی ضخیم تھی اور اس کے تین حصے تھے: المبتدا، المبعث، المغازی۔ پہلے حصہ "المبتدا" میں حضرت عیسیٰؑ تک رسالت کی تاریخ، عرب بائدہ اور جاہلی یمن کی تاریخ، عرب قبائل اور ان کی بُت پرستی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی آباؤ اجداد اور اہل مکہ کے رسوم و عقائد سے بحث تھی۔ یہ حصہ دراصل سیرت النبی کا مقدمہ تھا۔ کتاب کا دوسرا حصہ "المبعث" آپؐ کی ولادت باسعادت سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ میں آپؐ کی مکی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں۔ تیسرا حصہ "المغازی" مدنی زندگی کی تاریخ ہے[۹]۔ ابن ہشام نے اپنے بیان کے مطابق اس مواد میں اختصار کی غرض سے حسب ذیل تبدیلیاں کیں:

آنحضرتؐ سے قبل رسالت کی تاریخ اور عرب بائدہ کا ذکر حذف کر دیا اور سیرت کا آغاز حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا اور ان کی اولاد میں سے

بھی صرف ان لوگوں کا تذکرہ کیا جو آپ کے براہ راست اجداد میں شامل تھے۔ اسی طرح ابن اسحٰق کی کچھ روایات کو اس لئے خارج کر دیا کہ :

الف : ان روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہیں تھا۔

ب : قرآن مجید میں ان کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ج : ان سے کتاب کی کسی بحث کی توجیہہ و تعلیل نہیں ہوتی۔

د : ان سے کسی مسئلہ کی تشریح و توضیح نہیں ہوتی۔

ہ : ان سے کسی بحث کی تائید نہیں ہوتی۔

ابن ہشام نے بعض قصائد کو بھی اسی وجہ سے حذف کر دیا کہ پورے قصیدہ میں مثلاً صرف ایک شعر میں غزوہ بدر کا ذکر تھا (۲: ۳۸)

اس تبدیلی سے ابن ہشام کا مقصد ابن اسحٰق کی کتاب سے ان مباحث کو خارج کرنا تھا جن کا سیرت سے براہ راست تعلق نہیں ہے علمی و تاریخی حیثیت سے ان مباحث کی جو بھی قیمت رہی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ سیرت کے نقطۂ نظر سے یہ مباحث غیر ضروری تھے اور اصل موضوع سے ان کا رشتہ برائے نام تھا۔

۲۔ توثیق

ان مباحث کے علاوہ ابن ہشام نے وہ قصائد بھی حذف کر دیئے جن کے بارے میں سارے ناقدین اور رواۃ شعر نے لاعلمی ظاہر کی، اس طرح موضوع شاعری کا ایک بڑا حصہ سیرت سے خارج ہو گیا۔ اسی طرح ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی وہ مرویات بھی حذف کر دیں جو زیاد بکائی کے علم و روایت کی رو سے صحیح نہیں تھیں۔ اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ سیرت النبی کی یہ تدوین زیادہ سے زیادہ مستند ہو۔

۳۔ تطہیر

ابن اسحٰق کی کتاب میں حذف کی تیسری بنیاد جو ابن ہشام نے ذکر کی ہے اسے ہم تطہیر کا نام دے سکتے ہیں — ابن اسحٰق کے مروی قصائد میں بہت سے اشعار فحش ہجو اور بدزبانی و بے حیائی کا نمونہ تھے۔ ابن ہشام نے ایسے تمام اشعار سے سیرت کو پاک کیا قطع نظر اس سے کہ یہ اشعار مشرکین کے ہوں یا مسلمانوں کے[۹]

۴۔ دل آزاری کا اندیشہ

حذف کی چوتھی بنیاد اخلاقی ہے اور اگر اس کا محل متعین طور پر ایک ہی ہے جیسا کہ موجودہ دور کے محققین کا خیال ہے تو اسے ہم "سیاسی" بھی کہہ سکتے ہیں[۱۰] ابن ہشام نے اپنے بیان کے مطابق کتاب کی بعض مرویات کو اس لئے حذف کر دیا کہ ان کا ذکر دل آزاری کا موجب تھا حذف کی یہ بنیاد غیر علمی ہے اور سیرت کے بارے میں یہ شبہ پیدا کرتی ہے کہ اس طور پر ابن ہشام نے کتنی ہی معلومات حذف کر دی ہوں گی، لیکن حذف و ترمیم کے عمل میں ابن ہشام نے جس دیانت داری اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ شبہ باقی نہیں رہتا خود اس بنیاد پر سیرت میں جہاں حذف بیان کیا جاتا ہے اگر اس کا مطالعہ کریں تو ابن ہشام کا "اخفاء" "اظہار" سے کم تر نظر نہ آئے گا۔

غزوہ بدر کے قریشی قیدیوں کی جو فہرست ابن اسحٰق نے پیش کی ہے وہ خاندانوں کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے ہر خاندان کے قیدیوں کا ذکر کر کے ان کی تعداد ساتھ ہی لکھ دی ہے۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کا ذکر ہے اور ان میں صرف عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن الحارث کا نام لیا گیا ہے اور تعداد نہیں بتائی جبکہ دوسرے تمام قبائل کے ساتھ " رجلان "

(دو آدمی) "سبعۃ نفر" (۷ آدمی) وغیرہ جیسے الفاظ ہیں۔ فہرست کے آخر میں ابن اسحٰق کا یہ نوٹ بھی درج ہے کہ ہمارے علم کے مطابق ان قیدیوں کی تعداد ۴۳ ہے۔ اس نوٹ کی روشنی میں مذکور قیدیوں کو شمار کیا جائے تو ایک عدد کم ہوتا ہے اور صرف ۴۲ تعداد ہوتی ہے ابن اسحٰق کے نوٹ سے متصل ابن ہشام نے یہ وضاحت کی کہ "اس تعداد میں ایک اور شخص بھی شریک تھا جس کا نام ہم نے ذکر نہیں کیا" (۱:۷)

اتنی تصریحات کے بعد اور اس زمانے میں جب سارے لوگ اس سے واقف ہوں کہ غزوہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے ابن ہشام کو زیادہ مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۵۔ تقاضائے فن

بعض مقامات پر حذف کی بنیاد خالص ادبی اور فنی ہے۔ ابن ہشام نے اپنے مقدمہ میں اس کا ذکر ضروری نہیں سمجھا لیکن حذف کے دوسرے مواقع کی طرح یہاں بھی وضاحت کر دی ہے۔ مثلاً حسان بن ثابتؓ کے جواب میں ابو سفیان بن الحارث بن عبد المطلب کا ایک کافیہ قصیدہ ہے جس کے دس اشعار ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں:

"اس قصیدہ میں کچھ شعر باقی رہ گئے ہیں جنھیں ہم نے اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے قوافی میں تمیع اختلاف پایا جاتا ہے۔" (۲:۲۱۳)

تہذیب متن

مذکورہ بالا مواد حذف کرنے کے بعد ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی روایت کو بعینہٖ نقل نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھیں وجوہ سے بہت سے مقامات پر متن کے الفاظ میں ترمیم بھی کی خصوصاً اشعار میں ابن اسحٰق کی روایت کے بجائے معتبر اور مشہور راویان شعر کی روایت کو ترجیح دی ہے مثلاً ابن اسحٰق نے عمرو بن الحارث بن مضاض کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ قصیدہ کا بارھواں شعر ہے:

الم تنكحوا من خير شخص علمته   فأبناؤه منا ونحن الأصاهر

ابن ہشام نے مکمل قصیدہ نقل کرنے کے بعد یہ نوٹ لکھا (۱:۱۱۶)

"قولہ: "فابناؤہ منا" عن غیر ابن اسحٰق" شاعر کا قول "فابناؤہ منا" ابن اسحٰق سے مروی نہیں ہے۔

اسی طرح ابن اسحٰق نے جنگ بدر سے آنحضرتؐ کی واپسی کے حال میں لکھا ہے:

"ثم خرج حتی إذا كان بعرق الظبية قتل عقبة بن أبي معيط"

اس عبارت پر ابن ہشام کا حاشیہ ملاحظہ ہو (۱:۶۴۴)

قال ابن هشام "عرق الظبية" عن غير ابن اسحٰق"

بعض مقامات پر کسی مشرک شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ لفظ استعمال کیا تھا۔ ابن ہشام نے اس لفظ کو نکال کر اس کی جگہ کوئی مناسب لفظ رکھ دیا ہے مثلاً حارث بن ہشام بن المغیرۃ کا ایک رائیہ قصیدہ جس کے تین شعر یہ ہیں:

فيال لؤي ذبّبوا عن حريمكم   وآلهة لا تتركوها الذي الفخر

توارثها آباؤكم وورثتم   أواسيها والبيت ذا السقف والستر

فما الحلیم قد آرا دھلاک کم   فلا تعذروہ آل غالب من عذر

پورا قصیدہ نقل کرنے کے بعد ابن ہشام نے یہ صراحت کی ہے :

"اس قصیدہ کے دو لفظ جو ابن اسحٰق کی روایت میں تھے ہم نے بدل دیئے ایک شعر کے آخر میں "الفخر" اور دوسرے شعر کے شروع میں "فما الحلیم" اس لئے کہ ان الفاظ میں شاعر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔" (۱ : ۱۱)

ان مقامات پر ابن ہشام نے ان الفاظ کی نشاندہی نہیں کی۔ جو ابن اسحٰق کی روایت میں تھے اور جن کی جگہ یہ دوسرے الفاظ کا انتخاب کیا گیا۔ اسی طرح آخری صورت کے سوا دوسری جگہوں پر ترمیم کے مقصد کی بھی وضاحت نہیں کی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس ترمیم و تصرف کا مقصد متن سیرت کو خوب تر، مفید تر اور زیادہ پاکیزہ اور معتبر بنانا تھا۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

اس موقع پر ناگزیر طور پر ایک شبہ ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حذف و ترمیم کے اس طویل اور گوناگوں مراحل سے گزرنے کے بعد ابن ہشام کے واسطہ سے سیرت النبی کی جو روایت ہم تک پہنچی ہے اس میں روایت ابن اسحٰق کا حلیہ اس قدر بدل چکا ہوگا کہ اس کی شناخت ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوگی اور ابن اسحٰق کے سلسلہ میں اس روایت پر اعتماد کرنا صحیح نہ ہوگا۔

یہ شبہ یقیناً درست ہوتا اگر ابن ہشام نے اپنے قاری کو ان تبدیلیوں سے بے خبر رکھا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں ابن ہشام نے غیر معمولی احتیاط اور دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے اور پوری سیرت میں اپنی جانب سے جہاں کہیں کوئی معمولی سی ترمیم بھی کی ہے۔ اس کی جانب اشارہ ضرور کر دیا ہے تاکہ ابن اسحٰق کی روایت خلط ملط نہ ہونے پائے۔ ابن اسحٰق کے سلسلہ میں ابن ہشام کی غایت درجہ احتیاط کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو : مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت علیؓ ایک رجز پڑھ رہے تھے۔ پھر اسے حضرت عمار بن یاسرؓ پڑھنے لگے، جب یہ رجز خوانی طویل ہوئی تو ایک صحابی کو گمان گذرا کہ رجز میں ان پر تعریض کی گئی ہے۔ یہ صحابی کون تھے؟ ابن ہشام نے اُن کا نام نہیں بتایا لیکن ابن اسحٰق نے نام ذکر کیا تھا۔ ابن ہشام کی دیانت داری دیکھئے کہ صراحت کرتے ہیں (۲ : ۲۹۷)

وقد سمی ابن اسحٰق الرجل۔   ابن اسحٰق نے ان صحابی کا نام لیا تھا۔

روایت ابن اسحٰق کے بارے میں ابن ہشام نے ہمیں پوری روشنی میں رکھا ہے اور ہم نہایت آسانی سے ابن اسحٰق کے متن کو ابن ہشام کے حواشی سے علٰحدہ کر سکتے ہیں اور یہ متن یقیناً مستند ترین متن ہوگا۔ گیوم نے LIFE OF MUHAMMAD میں ایسا ہی کیا ہے۔

حواشی اور تعلیقات

سیرت ابن اسحٰق کی روایت، تلخیص اور تہذیب کے بعد ابن ہشام نے نہایت اہتمام اور تحقیق سے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھیں جن کی وجہ سے سیرت کی افادیت میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ ان حواشی کی تعداد گیوم کے مطابق (۹۱۲) نو سو بارہ اور انگریزی ترجمہ کی روشنی میں ان کا حجم کل کتاب کے تقریباً آٹھویں حصہ کے برابر ہے۔

یہ حواشی ضرورت اور موقع کے لحاظ سے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی سب سے طویل حاشیہ ازواج مطہرات پر ہے جو تقریباً چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان حواشی کے مطالعہ سے جو تحقیق و تفحص کا اعلیٰ نمونہ اور ابن ہشام کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا روشن ثبوت ہیں پتہ چلتا ہے کہ سیرت النبی کی خدمت میں ابن ہشام نے اپنی ساری صلاحیتیں نچوڑ کر رکھ دی ہیں۔

یہ حواشی سیرت کے اعلام و انساب کی تحقیق، ابن اسحٰق کے روایت کردہ شعری مواد کی چھان بین، ابن اسحٰق کی معلومات پر اضافہ و استدراک، ابن اسحٰق سے اختلاف، اوھام و اغلاط پر تنبیہ اور ان کی تصحیح، دوسری روایتوں کا ذکر یا کسی اور روایت کی ترجیح، ابن اسحٰق کے بیان کی تائید اور ان کے حق میں مزید دلائل، اجمال کی تفصیل، شبہات کا ازالہ، مشکل الفاظ کی تشریح اور دوسرے بیشمار و بیش قیمت تاریخی و ادبی افادات پر مشتمل ہیں۔

ابن ہشام نے اپنے حواشی میں ابن اسحٰق کی جن غلطیوں کی تصحیح کی ہے وہ مختلف قسم کی ہیں بعض کا تعلق اعلام کے نسب سے ہے مثلاً ابن اسحٰق نے قطبہ بن عامر کا نسب اس طرح بیان کیا:

"قطبہ بن عامر بن حدیدہ بن عمرو بن غنم بن سواد" (۱: ۴۴۳)

ابن ہشام نے حاشیہ لکھ

قال ابن هشام: عمرو بن سواد، وليس لسواد ابن يقال له غنم.	ابن ہشام نے کہا: عمرو بن سواد کا کوئی بیٹا غنم نام کا نہیں تھا۔

اسی طرح عبدالرحمٰن جحشی کا نسب ابن اسحٰق نے یہ لکھا:

"عبدالرحمٰن بن مالک بن جعشم" (۱: ۴۸۹)

ابن ہشام نے اس کی تصحیح یوں کی ہے:

قال ابن هشام: عبد الرحمٰن بن الحارث بن مالك بن جعشم۔

یعنی عبدالرحمٰن مالک کے بیٹے نہیں ہیں جیسا کہ ابن اسحٰق کے نسب سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ پوتے ہیں ان کے باپ کا نام حارث ہے۔

بعض غلطیوں کا تعلق سیرت کے واقعات سے ہے مثلاً ابن اسحٰق نے حارث بن سوید کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس نے غزوہ احد میں مجذر بن زیاد بلوی اور بنی ضبیعہ کے ایک فرد قیس بن زید کو قتل کیا تھا۔ لیکن ابن ہشام کے نزدیک صرف مجذر کو قتل کیا تھا (۱: ۵۲۰)

اسی طرح اشعار کی نسبت اور پس منظر میں ابن اسحٰق سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی تصحیح بھی ابن ہشام نے کی ہے، مثلاً ابن اسحٰق نے ابو قیس صرمۃ بن ابی انس کے ایک قصیدہ میں افنون تغلبی کا ایک شعر شامل کر دیا۔ افنون کا نام صُریم بن معشر ہے صرمہ اور صریم کی لفظی قربت کی وجہ سے غالباً اشتباہ ہوا۔ ابن ہشام نے اس کی تصحیح کی (۱: ۵۱۳)

ابن اسحٰق کی مرویات پر ابن ہشام نے جو قابل قدر اضافے کئے ہیں ان میں چند کا ذکر بطور مثال کیا جاتا ہے۔

ابن اسحٰق نے غزوہ بدر کے قیدیوں میں ۴۳ اشخاص کا ذکر کیا ہے، ابن ہشام نے اس تعداد پر ۲۳ کا اضافہ کیا ہے (۲: ۷-۸)

اسی طرح غزوہ احد میں مسلمان شہیدوں کی تعداد ابن اسحٰق نے ... بتائی ہے۔ ابن ہشام نے پانچ ناموں کا اضافہ

کیا ہے۔ (۲: ۱۲۷)

آنحضرتؐ کی وفات پر ابن اسحٰق کی روایت سے حضرت حسان بن ثابت کے اشعار ذکر کرنے سے قبل ابو زید انصاری کی روایت سے حضرت حسان ہی کے دو طویل اور مستند مرثیے نقل کئے ہیں۔ (۲: ۶۶۶ - ۶۷۰)

ابن ہشام امام لغت تھے سیرت کے اشعار میں جو مشکل اور نا مانوس الفاظ آتے ہیں ان کی تشریح سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بھی تصنیف کی تھی جیسا کہ گذر چکا۔ یہ کتاب اگرچہ ضائع ہو گئی لیکن سیرت ابن اسحق پر اس جہت سے جو کام انہوں نے کیا ہے اس کی روشنی میں مذکورہ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

مذکورہ کتاب میں ان کی کوشش صرف سیرت کے شعری مواد تک محدود تھی لیکن سیرت ابن اسحق میں اس کا خصوصی میدان قرآنی آیات ہیں الفاظ کی شرح میں ابن ہشام کا عام نہج یہ ہے کہ وہ لفظ کی تشریح میں کلام عرب سے استشہاد کرتے ہیں اور ساتھ ہی شاعر کے پورے نام اور شواہد کے مشکل الفاظ کی بھی وضاحت کرتے جاتے ہیں۔ لفظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں تو ہر معنی کے لیے شاہد پیش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تشریح میں اپنے شیوخ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ جو شعر پیش کرتے ہیں وہ اگر کسی قصیدہ کا جزء ہے تو اس کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں الفاظ کی یہ شرح کبھی کبھی طویل ہو جاتی ہے مثلاً ارشاد باری " فمنهم من قضى نحبه " میں لفظ "نحب" کی تحقیق پورے ایک صفحہ میں ہے (۲: ۲۴۸)

شعری مواد کی تحقیق و تنقید

سیرت ابن اسحق کی ایک نہایت اہم خدمت جو ابن ہشام نے کی وہ ابن اسحٰق کے روایت کردہ شعری مواد کی تحقیق و تنقید ہے[۸۲]۔

ابن اسحٰق پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے سیرت النبی میں موضوع و منحول اشعار بھر دیئے۔ اس سلسلہ میں ابن سلام نے خاص طور پر سخت نکتہ چینی کی۔ ابن اسحٰق نے اگرچہ یہ معذرت پیش کر کے اپنے کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی کہ وہ شاعری کے مرد میدان نہیں ہیں ان کے سامنے جو قصائد پیش کئے جاتے ہیں وہ انھیں نقل کر لیتے ہیں لیکن ناقدین کو ان کے اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی اس لئے کہ ابن اسحٰق نے عاد و ثمود تک کے اشعار درج کر لئے تھے جن کے بارے میں قرآن مجید کی شہادت ہے کہ وہ دنیا سے اس طرح نیست و نابود ہو گئے کہ ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا[۸۳]۔

ابن ہشام کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سیرت ابن اسحٰق کے شعری ذخیرہ کا جائزہ لیا ایک ایک قصیدہ کی تحقیق کی۔ کلام عرب کے جو معتبر راوی اور نقاد اس وقت موجود تھے ان سے استفسار کیا اور ان کے بیانات ریکارڈ کئے۔ فن کی کسوٹی پر بھی پرکھا اور ہر قصیدہ کو اس کے پایۂ استناد کے مطابق درج کیا۔ اشعار کی تحقیق میں ابن ہشام کی محنت اور کاوش کا اندازہ درج ذیل مثال سے کیا جا سکتا ہے۔

ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران حضرت علیؓ یہ رجز پڑھتے تھے:

لا یستوی من یعمر المساجدا   یدأب فیه قائما وقاعدا

ومن یری عن الغبار حائدا

ابن ہشام نے اس کی تحقیق کی کہ یہ رجز کس کا ہے۔ اس تحقیق کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں نے ایک سے زیادہ (غیر واحد) علمائے شعر سے اس رجز کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ ہم کو بس یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب نے یہ رجز پڑھا تھا، یہ معلوم نہیں کہ یہ رجز خود انھیں کا ہے یا کسی اور کا۔" (۱ : ۴۹۷)

اسی طرح ابن اسحٰق نے ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی جانب منسوب کیا ہے جس میں بنو النضیر کی جلاوطنی اور کعب بن الاشرف کے قتل کا ذکر ہے۔ اس قصیدہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کوئی عالم شعر ایسا نہیں تھا جس کے دروازے پر ابن ہشام نے دستک نہ دی ہو جیسا کہ ان کے اس نوٹ سے ظاہر ہے :

"یہ قصیدہ حضرت علی بن ابی طالب کے بجائے کسی اور مسلمان کا ہے جیسا کہ بعض علمائے شعر نے مجھ سے ذکر کیا اور علمائے شعر میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا جو اسے حضرت علی کے قصیدہ کی حیثیت سے جانتا ہو۔" (۲ : ۱۹۶)

سیرت ابن اسحٰق کے اشعار کے سلسلہ میں ابن ہشام کے نہج کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱۔ ان اشعار کی تحقیق میں انہوں نے اپنے دور کے معتبر اور معروف رواۃ شعر سے رجوع کیا اور جو قصائد کسی راوی کے علم میں نہیں تھے یا خود انھیں موضوع معلوم ہوئے انھیں حذف کر دیا۔ ان اشعار کو بھی حذف کر دیا جن میں بدکلامی یا صحابہ پر سب و شتم تھا، اس کے علاوہ فنی سقم اور طوالت کے اندیشے سے بھی اشعار خارج کیے جیسا کہ گزر چکا۔

۲۔ روایت کے اعتبار سے اشعار کا جو مرتبہ اور ان کے بارے میں معتبر راویوں کی جو رائے ہے اسے بیان کرنے کے لیے اسی طرح کے مناسب اور متعین الفاظ کا انتخاب کیا۔ یہ عبارتیں چار طرح کی ہیں جن سے اس شعری مواد کی درجہ بندی ہوتی ہے :۔

۱۔ لم أر أحدا من أهل العلم بالشعر يعرفها

۲۔ اكثر اهل العلم بالشعر ينكرها له

۳۔ اكثر أهل العلم بالشعر ينكرها له

۴۔ بعض أهل العلم بالشعر ينكر هذا الشعر له أو ينكر أكثرها

۳۔ ابن ہشام نے اشعار کے رد و قبول میں اپنی تنقیدی بصیرت بھی استعمال کی ہے اور بغیر کسی راوی کے حوالہ کے مستقل فیصلہ کن تبصرے بھی کیے ہیں مصطفیٰ السقا اور ان کے رفقاء نے سیرت ابن ہشام پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں امام شافعی اور ابن ہشام کی ملاقات پر تعجب ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ذہبی اور ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ ابن ہشام جب مصر آئے تو امام شافعی نے ان سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب کلام عرب سنایا اس روایت پر تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابن ہشام اس کتاب میں ابن اسحٰق سے ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جو واضح طور پر گھڑے ہوئے ہیں لیکن ان اشعار کے بارے میں خود کوئی قطعی رائے نہیں دیتے اور کہتے ہیں : اسی طرح علمائے شعر نے ہم سے بیان کیا، گویا ان کی رائے نقل کرتے ہیں اور ذوق کو حکم نہیں بناتے جو اس شخص کو حاصل ہونا چاہیے جس نے اشعار کا اس طرح استقصا کیا ہو۔"

قطع نظر اس سے کہ ابنِ کثیر اور ذہبی کی عبارت کو سمجھنے میں مقدمہ نگاروں سے چوک ہوئی اور صحیح صورت یہ ہے کہ امام شافعی جب مصر آئے تو انہوں نے ابن ہشام سے ملاقات کی۔ ابن ہشام پہلے سے مصر میں مقیم تھے[۸۴] سقا وغیرہ کا مذکورہ بالا تبصرہ غیر ذمہ دارانہ ہے اول تو انہوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ ابن ہشام کے دَور میں "روایت" کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ کلامِ عرب کے مستند رواۃ موجود تھے ان کی مدد سے اس کی تحقیق کی جا سکتی تھی اور ابن ہشام نے معتبر ترین علمائے شعر سے رجوع کیا۔ دوم یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ابن ہشام نے اشعار کے سلسلہ میں اپنی کوئی رائے نہیں دی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ابن اسحٰق نے تبع کا ایک شعر نقل کیا ہے اس پر ابن ہشام نے یہ حاشیہ لکھا (۱ : ۲۳)

الشعرالذی فی هذا البیت مصنوع	اس بیت میں جو شعر ہے وہ گھڑا ہوا ہے
فذلك الذی منعنا من إثباتہ	اسی وجہ سے ہم نے اس کو درج نہیں کیا ۔

ابن اسحٰق نے عکرمہ بن عامر کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ابن ہشام نے ان میں سے صرف تین شعر درج کئے اور لکھا (۱ : ۵۲)

هذا ما صحّ له منها	اس قصیدہ میں عکرمہ کے اتنے ہی اشعار ثابت ہیں ۔

بعض جگہوں پر "هذا ما صحّ له منها مما روی ابن اسحٰق منها" کے الفاظ ہیں ۔

اسی طرح بعض قصائد کے بارے میں ابن ہشام نے اپنی پسندیدگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حضرت حسان کا ایک قصیدہ غزوۂ اُحد کے متعلق نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے :

مَنَعَ النَّومَ بِالعَشَاءِ الهمومُ ۔۔۔ وخيالٌ إِذَا الغَورُ لَنُجُومُ

قصیدہ نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں (۲ : ۱۴۹)

"هذه أحسنُ ما قیل"	یہ بہترین قصیدہ ہے جو (اس موضوع پر) کہا گیا

ابن اسحٰق نے امیہ بن ابی الصلت کا ایک مرثیہ زمعہ بن الاسود اور بنو اسد کے مقتولین پر نقل کیا ہے۔ اس مرثیہ میں فنی خامیاں ہیں اور متعدد اشعار وزن سے ساقط ہو گئے ہیں۔ ابنِ ہشام نے خلف الاحمر اور دوسرے راویوں کی روایت کی مدد سے اسے از سرِ نو مرتب کیا ہے۔ ابن ہشام کا نوٹ ملاحظہ ہو :

هذه الروایة لهذا الشعر مختلطة، لیست بصحیحة البناء، ولکن الشدنی ابو محرز خلف الاحمر وغیره، روی بعض ما لم یرو بعض: (۲ : ۲۳)	اس مرثیہ کی یہ روایت گڈمڈ ہو گئی ہے۔ اس کی تالیف صحیح نہیں ہے خلف الاحمر وغیرہ نے مجھے یہ مرثیہ اس طرح سنایا۔ بعض کی روایت بعض سے مختلف ہے ۔

۴۔ اشعار کی تحقیق و تنقید کے بعد ان کے پس منظر کی وضاحت، قائل کی تلاش، اختلافِ روایت کا ذکر اور دوسرے ملاحظات اس پر مستزاد ہیں۔

حواشی کی چند نمایاں خصوصیات

ابنِ ہشام کے حواشی کے مواد پر نظر ڈالنے کے بعد ان کی چند نمایاں خصوصیات کا ذکر مناسب ہوگا جو ایک سرسری مطالعہ میں سامنے آتی ہیں :

۱۔ سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حواشی بر محل، ضرورت کے مطابق اور مرکز ہیں۔ ابن ہشام نے اس کا شدت سے التزام کیا ہے کہ قلم اصل موضوع سے دور نہ جانے پائے اور سیرت النبی غیر ضروری مباحث و مسائل میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ جنگ فجار میں آنحضرتؐ کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے اس جنگ کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہے۔ معلومات کی وسعت و دراز نفسی کی مقتضی تھی مگر سلسلۂ کلام ٹوٹ جانے کے اندیشہ سے قلم روک دیا اور لکھا:

"فجار کی داستان اس سے زیادہ طویل ہے۔ میں نے صرف اس وجہ سے اس کا استقصا نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔" (۱: ۱۸۷)

اسی طرح یوم ذی نجب اور یوم جبلہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"یوم جبلہ اور یوم ذی نجب کا قصہ اس سے زیادہ طویل ہے جتنا کہ ہم نے ذکر کیا لیکن اس کے استقصا میں وہی سبب مانع ہے جس کا ذکر میں نے یوم فجار کے واقعہ میں کیا ہے۔" (۱: ۲۰۱)

بعض مواقع پر واقعہ کو بیان کرنے کے بجائے صرف اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ مثلاً ابن اسحٰق نے عثمان بن الحویرث کا ذکر کیا ہے جو اسلام سے قبل قیصر روم کے دربار میں گئے اور عیسائی ہو گئے تھے۔ اس پر ابن ہشام لکھتے ہیں:

"قیصر کے ساتھ عثمان بن الحویرث کا ایک قصہ ہے جسے بیان کرنے میں وہی سبب مانع ہے جس کا ذکر میں نے جنگِ فجار کے واقعہ میں کیا ہے" (۱: ۲۲۴)

ابن ہشام کو نحو میں اس درجہ دخل تھا کہ ابن یونس سے لے کر آج تک تمام تذکرہ نگار انہیں "نحوی" کی نسبت سے یاد کرتے ہیں لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ سیرت میں آیات و اشعار کی غیر معمولی کثرت کے باوجود ایک جگہ بھی ان کی نحوی تشریح نہیں ملے گی۔ سیرت ابن ہشام کے مطالعہ سے مغازی، انساب اور لغت میں ابن ہشام کے تبحر کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے لیکن ان کی علمی زندگی کے اس گوشے کی جانب جسے سب سے نمایاں خیال کیا جاتا ہے گمان بھی نہیں گذرتا۔ پوری سیرت میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں "نحو" کا حوالہ ملتا ہے۔ سورۂ فیل کی آخری آیت میں "عصف ماکول" کی تشریح کرتے ہوئے ابن ہشام نے ایک رجز کا ٹکڑا نقل کیا ہے (۱: ۵۵)

فَصُيِّروا مِثْلَ كَعَصْفٍ مأكول

اس میں کاف حرف جر مثل کا مضاف الیہ واقع ہو رہا ہے جو بظاہر قابلِ اعتراض ہے۔ اس کی توجیہ و تفصیل موجب طوالت تھی اس لئے ابنِ ہشام نے صرف اس کا حوالہ دے دیا۔

قال ابنِ هشام: ولهذا البيت تفسير في النحو

ابنِ ہشام نے کہا: نحو میں اس بیت کی تشریح ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن ہشام کو اپنے رہوار قلم پر کتنا قابو ہے۔ سر مو اسے بہکنے نہیں دیتے۔

۲۔ علمی دیانت داری۔

سیرت کی روایت میں ابن ہشام کی دیانت داری پر گفتگو اوپر گذر چکی ہے۔ اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابن ہشام کے

حواشی میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۳۔ غیر جانبداری

ابن ہشام نے فحش ہجو کی وجہ سے بہت سے قصائد و اشعار حذف کر دیے جیسا کہ گذر چکا لیکن بعض اہلِ علم کا یہ دعویٰ قطعاً صحیح نہیں کہ ابن ہشام نے صرف مشرکین کے اشعار حذف کئے ہوں، اس بارے میں ابن ہشام نے اپنے اصول کی سختی سے پابندی کی ہے اور کسی طرح کے تعصب اور جانبداری سے کام نہیں لیا چنانچہ اگر امیہ بن ابی الصلت کے قصیدہ سے دو شعر اس لئے حذف کئے کہ ان میں اس نے صحابہ کی ہجو کی تھی (۲: ۳۰) تو دوسری طرف عتبہ بن ابی وقاص کی ہجو میں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کئے تھے حضرت حسان کے قصیدہ کے دو شعر بھی اس وجہ سے حذف کر دیے کہ ان میں فحش ہجو تھی (۲: ۸۱)

اسی طرح ہند بنت عتبہ جس نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا اس کے رجز کے جواب میں ہند بنت اثاثہ بن عباد بن المطلب کے رجز کی تین ابیات اسی بنیاد پر حذف کیں۔ ہند بنت عتبہ ہی کی ہجو میں حضرت حسان نے دالیہ، ذالیہ، رائیہ تین قصیدے کہے۔ ابن ہشام نے صرف موخر الذکر کا ایک شعر نقل کیا اور بقیہ دونوں قصائد مکمل حذف کر دیے اور اس کی وجہ دہی "اقذاع" یعنی فحش گوئی تھی (۲: ۹۳)

۴۔ سیرت نبوی کی عظمت

ابن ہشام کے حواشی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہشام کو سیرت نبوی سے محبت ہی نہیں تھی بلکہ انھیں اس موضوع کی عظمت اور جلالت شان کا مکمل شعور بھی تھا۔ سیرت ابن اسحٰق کی از سر نو تدوین میں انہوں نے جس اہتمام اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا منحول اشعار، بے اصل واقعات، غیر متعلق مباحث اور فحش ہجویات سے جس طرح اسے پاک کیا اور پھر جس طرح اس کی خدمت کی اس کے پیچھے درحقیقت یہی جذبہ کار فرما تھا۔

۵۔ شائستہ طرزِ تحریر

ابن ہشام کا قلم بہت شائستہ، پروقار اور ایجاز پسند واقع ہوا ہے۔ ابن اسحٰق کی کتنی ہی غلطیوں کی تصحیح کی، ان کی ناقص معلومات پر اضافہ کیا لیکن کیا مجال کہ قلم سے کوئی ایسا لفظ ٹپک جائے جس سے خود پسندی کی بو آئے" اخطأ ابن اسحٰق" کہنا بھی گوارا نہیں ہے۔ بس اپنی بات کہہ دی اور قاری کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں ابن اسحٰق کی غلطی کی تصحیح کی گئی ہے۔ اوپر کچھ مثالیں گذری ہیں ان پر دوبارہ اس پہلو سے نظر ڈال لیں کہ تصحیح میں ابن ہشام کا انداز کیا شریفانہ اور مہذب ہے۔

ابن ہشام کا اسلوب ایک علمی اسلوب ہے اور وہ تمام خوبیاں جو ایک علمی اسلوب کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہیں ابن ہشام کے یہاں موجود ہیں جیسا کہ گذشتہ مباحث سے بخوبی عیاں ہے۔

ابن ہشام کے مآخذ

ابن ہشام نے اپنی تعلیقات میں جن مآخذ سے استفادہ کیا ہے ان سب کی تعداد معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ان کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں مغازی اور روایت شعر کے جو اساطین موجود تھے ان سب سے رجوع کرنے کی انہوں نے کوشش کی تھی۔ اسی طرح جتنے مآخذ کا حوالہ

دیا ہے ان سب کا تعین بھی دشوار ہے اس لئے کہ بہت سی سندوں میں انہوں نے اپنے قریبی راوی کا حوالہ دینے کے بجائے ابتدائی مأخذ کا حوالہ دیا ہے، اور بہت سے مقامات پر اپنے راوی کے نام کی صراحت نہیں کی بلکہ اشاروں اور کنایوں کی زبان استعمال کی ہے۔ لیکن ابن ہشام کے مأخذ پر گفتگو سے پہلے مناسب ہوگا کہ اسناد میں ان کے نہج کی تحقیق کی جائے۔

اسناد میں ابن ہشام کا نہج

ابن ہشام نے اپنی سندوں میں درج ذیل الفاظ استعمال کئے ہیں:

۱۔ حدثنی ، حدثنا

۲۔ اخبرنی

۳۔ سمعت

۴۔ رواہ لی

۵۔ انشدنی

۶۔ ذکر لی ، ذکرلنا

۷۔ ذُکر لی (بصیغہ مجہول)

۸۔ عن

۹۔ ذکر

۱۰۔ قال

۱۱۔ بلغنی ، بلغنا

ابتدائی سات الفاظ واضح طور پر براہ راست استفادہ پر دلالت کرتے ہیں۔ "عن" کے لفظ سے سیرت میں جو روایتیں ہیں وہ بھی متصل ہیں۔ "بلغنی" میں واضح طور پر راوی کا ذکر نہیں ہوتا۔ البتہ قال اور ذکر کے الفاظ محل نظر ہیں، ان الفاظ کے سلسلہ میں ابن الصلاح نے لکھا ہے:[۵۵]

"یہ اور اس طرح کے الفاظ محدثین کے نزدیک سماع پر محمول ہوں گے اگر راوی کی شیخ سے ملاقات اور اس سے سماع معلوم ہو خاص طور پر اگر اس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اسی روایت میں قال فلاں کہتا ہے جو اس نے شیخ سے سنی ہو۔"

اس پہلو سے جب ہم ابن ہشام کی ان سندوں کا جائزہ لیتے ہیں جو قال اور ذکر کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں تو ان میں کچھ نام ایسے نظر آتے ہیں جن سے ابن ہشام کی ملاقات ممکن نہیں مثلاً عمر مولی غفرۃ (۲: ۸۷) زید بن اسلم (۲: ۴۹۲، ۵۶۹) اسی طرح بعض لوگوں سے دوسری روایتیں ابن ہشام نے کسی واسطہ سے نقل کی ہیں۔ مثلاً ابوعمر والمدنی سے ابن ہشام نے بعض روایتیں قال (۲: ۶۴۱) ذکر (۲: ۱۸۶)

اور زعم (۲: ۵۰۰) کے الفاظ سے درج کی ہیں اور بعض روایتیں ابو عبیدہ (۲: ۵۹) اور ابن ابی عمرو بن العلاءؒ (۱: ۵۹۲) کے واسطہ سے نقل کی ہیں۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت قال کے لفظ سے (۱: ۵۸۰) اور بعض دوسری روایتیں بعض اہلِ العلم (۱: ۴۸۶) یا بلغنی عن الحسن (۱: ۶۷۵) کے الفاظ سے منقول ہیں۔

دوسری طرف بہت سے نام ابن ہشام کے معاصرین کے ہیں اور ممکن ہے ابن ہشام نے ان سے استفادہ بھی کیا ہو لیکن اس فہرست میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس سے ابن ہشام کی ملاقات ثابت ہو یا خود ابن ہشام نے سیرت میں کسی دوسری جگہ ان سے حدثنی وغیرہ جیسے الفاظ سے روایت کی ہو مثلاً عبداللہ بن جعفر بن المسور بن المخرمۃ (م ۱۷۰ھ) وکیع بن الجراح (م ۱۹۷ھ) عبدالعزیز بن محمد دراوردی (م ۱۸۶ھ) خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۵ھ) سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) ربیع بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری مدنی، سعید بن ابی زید انصاری۔

قال اور ذکر کے الفاظ سے جو روایتیں ابن ہشام نے نقل کی ہیں ان میں بعض کے بارے میں جہاں یہ امکان ہے کہ ابن ہشام نے براہ راست سُنی ہوں وہیں گمان غالب یہ ہے کہ ابن ہشام نے کتابوں سے جو روایتیں اور اقوال اخذ کئے ہیں انہیں قال اور ذکر کے الفاظ سے درج کیا ہے۔ سورہ فیل میں لفظ سجیل کی تحقیق "ذکر بعض المفسرین" کے لفظ سے نقل کی ہے (۱: ۵۵) اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ غریب القرآن یا معانی القرآن یا تفسیر کی کسی کتاب سے یہ شرح لی گئی ہے۔ ایک روایت امام مالک بن انس سے "ذکر" ہی کے لفظ سے نقل کی ہے (۲: ۳۵۵) جو بظاہر موطا کے ان دو مجموعوں میں سے کسی سے ماخوذ ہے جو ابن ہشام کے مصری شیخ اور امام مالک کے تلامذہ عبداللہ بن وہب نے مرتب کئے تھے۔

معروف مآخذ

ابن ہشام کے متعین مآخذ جن کا ذکر انہوں نے صریح الفاظ میں کیا ہے اور ان سے براہِ راست استفادہ کیا ہے حسبِ ذیل ہیں ان کے نام کے سامنے ان سے منقول روایتوں کی تعداد بھی درج کی جاتی ہے:

۱۔ ابو عبیدہ معمر بن مثنی :	۴۵
۲۔ ابو زید انصاری :	۳۱
۳۔ یونس نحوی :	۵
۴۔ خلف الاحمر :	۵
۵۔ خلاد بن قرہ :	۵
۶۔ عبدالوارث بن سعید تنوری :	۵
۷۔ ابن ابی عمرو بن العلاءؒ :	۱
۸۔ امام شافعی :	۱
۹۔ عمرو بن حبیب :	۱
۱۰۔ عبداللہ بن وہب :	۱

۱۱۔ ابوبکر زبیری :

۱۲۔ مسلمہ بن علقمہ مازنی :

زیاد بکائی سے یوں تو سیرت ابن اسحٰق مکمل مروی ہے لیکن ایک روایت ابن ہشام نے ایسی بھی نقل کی ہے جسے بکائی نے اپنے دوسرے شیخ مسعر بن کدام سے نقل کیا ہے (۱: ۲۴۲) بکائی سے قطع نظر مندرجہ بالا فہرست میں دو شیوخ ایسے ہیں جن سے ابن ہشام نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے ایک ابوعبیدہ معمر بن المثنی دوسرے ابوزید انصاری۔ عبدالوارث تنوزی سے چار روایتیں صلوٰۃ خوف کے سلسلہ میں نقل کی ہیں اور ایک جگہ ابوالعاص بن الربیع کی امانت کے سلسلہ میں ابوعبیدہ کی روایت کی تائید میں ان کا حوالہ دیا ہے۔ ذیل میں ہم ابتدائی پانچ شیوخ کے حوالوں کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ابن ہشام نے سیرت کے تاریخی یا شعری یا لغوی مواد کی تحقیق میں کس کو زیادہ ترجیح دی ہے :

	سیرت و تاریخ	شاعری	انساب	لغت
۱۔ ابوعبیدہ	۲۰	۱۴	۳	۸
۲۔ ابوزید انصاری	۱	۲۹	—	۱
۳۔ یونس نحوی	—	۱	—	۴
۴۔ خلف الاحمر	—	۴	۱	—
۵۔ خلاد بن قرۃ	۱	۲	۲	—

تاریخ و مغازی میں ابوعبیدہ کے مقابلہ میں دوسروں کے حوالے صفر ہیں اس لئے کہ یہ ابوعبیدہ کا خاص میدان تھا۔ سیرت کے شعری مواد کی تحقیق میں سب سے زیادہ اعتماد ابوزید انصاری پر کیا گیا ہے جن کی ثقاہت پر اتفاق ہے اور جنہیں نوادر اور کلام عرب سے زیادہ شغف تھا۔ ابوزید کے بعد اس سلسلہ میں زیادہ حوالے ابوعبیدہ کے ہیں جن کی تعداد بظاہر (۱۴) ہے لیکن اس میں چار حوالے شواہد کے طور پر ہیں اس لئے سیرت کے اشعار کی تحقیق میں اصلاً دس ہی حوالے ہیں۔ کلام عرب کے راویوں میں خلف الاحمر کی شخصیت متنازع فیہ رہی ہے لیکن ابن ہشام نے خلف سے استفادہ کیا ہے۔ سیرت کے اشعار کے سلسلہ میں اصلاً خلف کے صرف تین حوالے ہیں اور ان میں بھی ایک جگہ دوسرے رواۃ شعر خلف کے ساتھ شریک ہیں۔ اس طرح تنہا خلف کے دو ہی حوالے ہوئے۔ ایک حوالہ بطور شاہد اور دوسرا نسب کے بارے میں ہے، انساب کے موضوع پر ابوعبیدہ کو بہت عبور حاصل تھا اور اس پہلو سے اس کے صرف تین حوالے کم معلوم ہوتے ہیں جبکہ انساب کے بارے میں ابن ہشام کے حواشی کی تعداد بہت ہے۔ الفاظ کی تحقیق کے سلسلہ میں زیادہ حوالے ابوعبیدہ اور یونس نحوی کے ہیں۔ ابن ہشام نے سیرت النبی کی قرآنی آیات کے الفاظ پر خاص توجہ کی ہے اور ان کی تحقیق و تشریح کی ہے چنانچہ مذکورہ حوالوں میں ابوعبیدہ کے ایک حوالہ کے سوا جو غریب الحدیث سے متعلق ہے باقی تمام غریب القرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابوعبیدہ کی تصنیفات میں غریب الحدیث کے موضوع پر بھی ایک کتاب تھی۔ غریب القرآن پر ابوعبیدہ کی کتاب مجاز القرآن چھپ چکی ہے (مگر افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے) غریب القرآن پر یونس نحوی کی بھی ایک کتاب ہے۔ یہ کتابیں ابن ہشام کی مرویات میں ضرور رہی ہونگی

اور آیات کی لغوی تشریح میں انہوں نے ان سے استفادہ کیا ہوگا۔

امام شافعی کے واسطہ سے ایک روایت "عمر بن حبیب عن ابن اسحٰق" سے نقل کی ہے جو خود ابن ہشام نے بھی براہ راست عمر بن حبیب سے سنی تھی۔ چنانچہ اس کی سند اس طرح ذکر کی ہے:

ابن ھشام عن نفسه وعن الشافعی، عن عمر بن حبیب، عن ابن اسحٰق (۲: ۶۱۲)

عمر بن حبیب بن محمد بن مجالد عدوی مامون کے عہد میں بصرہ کے قاضی تھے۔ ابن اسحٰق، ہشام بن عروہ، ابن عجلان، ابن عون، ابن جریج وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ ۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔ محدثین نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔ ابن عدی کے نزدیک "حسن الحدیث" ہیں اور "ضعف" کے باوجود ان کی حدیث درج کی جائے گی جبکہ ابن حبان کے نزدیک ان سے استدلال صحیح نہیں۔ ابن ہشام نے مغازی میں ان کا صرف یہی ایک حوالہ دیا ہے لکائی کی روایت میں جذام سے زید بن حارثہ کے غزوہ میں "ارض خشین" کا ذکر آیا ہے اس پر ابن ہشام نے عمر بن حبیب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابن اسحٰق کی جو روایت ان کے ذریعہ ملی ہے اس میں "ارض حسمی" ہے۔

ابن ہشام نے ایک مقام پر امام زہری (م ۱۲۴ھ) کا حوالہ "ذکر لی" (۱: ۶۴۴) کے لفظ سے دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن ہشام نے امام زہری سے براہ راست استفادہ کیا ہے لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہاں یا تو "لی" کا لفظ غلطی سے داخل ہوگیا ہے یا اس کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے جیسا کہ ابن ہشام کے سن پیدائش کی بحث میں گزر چکا۔

اسی طرح ایک جگہ ابن ہشام نے عبدالمطلب کے تین شعر نقل کئے ہیں، تیسرے شعر سے پہلے "زاد الواقدی" (۱: ۵۱) کے الفاظ ہیں، یعنی تیسرے شعر کا اضافہ واقدی نے کیا ہے۔

واقدی (م ۲۰۷ھ) ابن ہشام کا معاصر ہے، اس کا حوالہ بعید از قیاس نہیں ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ عبارت سیرت کے کسی راوی کا اضافہ ہے جو متن میں داخل ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ:

۱۔ اس سے پہلے "قال ابن ہشام" نہیں ہے جو ابن ہشام کے ہر حاشیہ کے شروع میں آتا ہے۔

۲۔ پوری سیرت میں واقدی کا ذکر صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔

۳۔ "زاد الواقدی" کے الفاظ صرف وسٹنفلڈ کے ایڈیشن میں ہیں۔

۴۔ واقدی کا یہ تنہا حوالہ بھی مغازی کے کسی واقعہ کے بارے میں نہیں ہے جس میں واقدی کو مہارت تھی بلکہ ایک شعر کے سلسلہ میں ہے جو تعجب خیز امر ہے۔

مذکورہ بالا مآخذ سے ابن ہشام نے براہ راست استفادہ کی تصریح کی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مآخذ کا حوالہ قال اور ذکر جیسے الفاظ سے دیا ہے۔ یہ مآخذ حسب ذیل ہیں:

ابن شہاب زہری (۱: ۶۸۳، ۲: ۱۲۷، ۳۸۸، ۴۰۰) مالک بن انس (۲: ۳۵۵) زید بن اسلم (۲: ۴۹۲، ۵۶۹) ابو عمرو مدنی (۲: ۱۸۶، ۶۴۱) عمر مولیٰ غفرۃ (۲: ۸۷) یزید بن حبیب الرحمٰن (۲: ۸۰) سفیان بن عیینہ (۲: ۲۲۷، ۳۵۹) عبدالعزیز دراوردی (۲: ۵۱۹) عبداللہ بن جعفر بن المسور بن المخرمۃ (۲: ۴۰) وکیع (۲: ۳۱۹) سعید بن ابی زید انصاری (۲: ۸۱) حسن بصری (۱: ۵۸۰) خلیل

(۱ : ۶۱۲) عبداللہ بن حسن بن حسن (۲ : ۶۳۵) ابو عمرو بن العلاء (قرأ ۲ : ۶۲۷)

بلاغات ابن ہشام میں درج ذیل ناموں کے حوالے ہیں :

ابن شہاب زہری (۱ : ۶۹، ۷۰- ۲ : ۲۵۳، ۳۸۳، ۴۲۴، ۵۲۲)

عکرمہ (۲ : ۸۶) زید بن اسلم (۲ : ۵۰۰) حسن بصری (۱ : ۶۷۵، ۲ : ۳۰۳) ابن ابی نجیح (۱ : ۵۶۲) یحییٰ بن سعید (۲ : ۴۱۶) سعید بن المسیب (۲ : ۴۰۲) مجاہد (۲ : ۳۲۱)

مجہول صیغہ "ذُکرلی" سے دو حوالے ہیں :

ابو عثمان نہدی (۱ : ۷۷۴) علی بن زید بن جدعان (۲ : ۵۱۵)

بلاغات اور "ذُکرلی" کے مجہول صیغہ سے جو روایتیں ہیں ان میں ظاہر ہے ابن ہشام نے اپنے قریبی راوی اور سند کو حذف کر دیا ہے لیکن قال او ذکر والی روایتوں کے بارے میں قیاس یہی ہے کہ وہ کتابوں سے ماخوذ ہیں جیسا کہ سند میں ابن ہشام کے نہج کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔

مجہول مآخذ

ابن ہشام کے نامعلوم مآخذ کی دو قسمیں ہیں :

(الف) وہ مآخذ جن کا تعارف کسی حوالہ سے کرایا گیا ہے اور کسی نہ کسی درجہ کا تعین ہو جاتا ہے۔ یہ حوالے کئی طرح کے ہیں :

۱۔ وطن کا حوالہ مثلاً بعض اہل الیمن (۱ : ۷)

۲۔ قبیلہ کا حوالہ مثلاً بعض بنی تمیم (۲ : ۵۶۳) رجل من الانصار او من خزاعۃ (۱ : ۴۳۸)

۳۔ تخصص علمی کا حوالہ مثلاً بعض المفسرین (۱ : ۵۵) اہل العلم بالمغازی (۱ : ۶۳۶) اہل الروایۃ (۲ : ۴۱۶) اہل العلم بالشعر (۱ : ۱۹۶) الرواۃ للشعر (۱ : ۶۱۹) اہل العلم بالروایۃ للشعر (۲ : ۴۴۹)

۴۔ وطن اور علم دونوں کا حوالہ مثلاً بعض اہل العلم من مکۃ (۱ : ۶۴۴)

۵۔ قبیلہ اور علم دونوں کا حوالہ مثلاً بعض اہل العلم بالشعر من بنی تمیم (۲ : ۵۶۵) رجل من قریش من اہل العلم (۲ : ۴۱۸)

۶۔ جرح و تعدیل کے الفاظ کا حوالہ مثلاً حدثنی الثقۃ (۲ : ۵۱۷) حدثنی من اثق بہ (۲ : ۶۰۶)

۷۔ "بعض اہل العلم" یا "غیر واحد من اہل العلم" جیسے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

۸۔ "غیر زیاد" (زیاد کے علاوہ) کے لفظ سے ابن اسحٰق کے دوسرے شاگردوں سے روایت لی ہے (۲ : ۶۴) ایک شاگرد عمر بن حبیب کا ذکر ایک جگہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ ابن اسحٰق کے کن شاگردوں سے ابن ہشام نے اخذ کیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔

(ب) مجہول مآخذ کی دوسری قسم وہ ہے جن کا کسی طرح کا تعارف نہیں تھا اور انھیں حذف کر کے صرف ابتدائی راوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلاغات، صیغہ مجہول "ذُکرلی" (مجھ سے ذکر کیا گیا) اور "قال و ذکر" والی روایتیں اسی قسم میں داخل ہیں۔

مقبولیت اور اشاعت

سیرت ابنِ اسحٰق کی تلخیص و تہذیب اور تحقیق و تنقیح کا جو کارنامہ ابن ہشام نے انجام دیا وہ اتنا بلند پایہ اور عظیم الشان تھا کہ اس نے اصل کتاب کی شہرت پر خطِ تنسیخ پھیر دیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ابن اسحٰق کی سیرت ناپید اور ابن ہشام کی تلخیص زندہ جاوید ہو گئی۔

سیوطی نے ابو ذر سے نقل کیا ہے کہ فرماتے تھے:[۸۸]

"وہ تلخیصیں جنھیں اپنی امہات پر فوقیت حاصل ہوئی چار ہیں: زبیدی کی مختصر العین، زجاجی کی مختصر الزاھر، ابن ہشام کی مختصر سیرۃ ابن اسحٰق، فضل بن سلمہ کی مختصر الواضحۃ"[۸۹]

امام سخاوی لکھتے ہیں:[۹۰]

"امام ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی کتاب کی روایت زیاد بکائی سے کی، پھر اس کی ایسی تہذیب و تنقیح کی کہ وہی مرجع بن گئی"۔

مورخ مصر حافظ ابن یونس نے جن کی پیدائش ابن ہشام کے انتقال کے صرف تریسٹھ (۶۳) سال بعد ہوئی لکھا ہے کہ "ابن ہشام نے اس سیرت میں جس کی روایت وہ ابن اسحٰق سے کرتے ہیں مختلف مقامات پر حذف و اضافہ کے ذریعہ اس کی تہذیب کی اور اب تو وہ "سیرت ابن ہشام" کے نام ہی سے جانی جاتی ہے"۔ (صارت لا نعرف إلا بسيرة ابن هشام)

ابن یونس کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہشام کی جانب سیرت کی نسبت شروع سے ہی رائج تھی۔ ابن یونس نے مزید لکھا ہے کہ "اہل مصر کو سیرت ابن ہشام سے بےحد عشق ہے (فرط غرام) اور کثرت سے اس کی روایت کرتے ہیں اور اہل مصر ہی کے ذریعہ یہ سیرت دوسرے شہروں میں پہنچی"[۹۱]

اس میں شبہ نہیں کہ مصر میں بےشمار لوگوں نے سیرت ابن ہشام کی روایت کی ہو گی لیکن سیرت کی ترویج و اشاعت کی سعادت خاص طور سے ان تین برقی بھائیوں کے حصہ میں آئی جن کے واسطہ سے یہ کتاب مشرق و مغرب کے مختلف گوشوں میں پہنچ کر عام ہو گئی۔ ابن ہشام کے ان تینوں تلامذہ کے مختصر حالات لکھے جا چکے ہیں ذیل میں ہم ان کے ان شاگردوں کا نام درج کر رہے ہیں۔ جن کے ذریعہ سیرت ابن ہشام کی روایت شائع و ذائع ہوئی:

۱۔ ابوبکر احمد بن عبداللہ[۹۲] سے سیرت کی روایت محمد بن اسمٰعیل بن الفرج المہندس نے کی۔

۲۔ ابوسعید عبدالرحیم بن عبداللہ سے ابومحمد عبداللہ بن محمد بن جعفر بن الورد بن زنجویہ بغدادی اور ابوالعباس احمد بن اسحٰق بن عتبہ رازی نے کی۔

۳۔ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ سے ابو مروان عبیداللہ بن یحییٰ، محمد بن عبدالسلام خشنی اور مطرف بن عبدالرحمٰن بن قیس نے کی۔

ابن خیر اشبیلی کو سیرت ابن ہشام ان تمام واسطوں سے پہنچی تھی۔[۹۳] سیرت کے بعض نسخوں میں محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی کے ایک شاگرد ابومحمد بن عبدالواحد کا نام بھی آیا ہے۔[۹۴]

ان برقی بھائیوں نے سیرت ابن ہشام کی محض روایت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی احادیث میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ ابن ہشام نے ایک شعر بغیر نسبت کے نقل کیا ہے (۱: ۲۰) سہیلی نے اس کے بارے میں برقی کا یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس

شعر کی نسبت اعشیٰ کی جانب کی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ شعر بنو سالم کی ایک بڑھیا کا ہے۔[۹۵]

ابن ہشام کی تلخیص کے بعد ہی سے اصل سیرت ابن اسحٰق کی ضرورت کا احساس کم ہونے لگا تھا۔ چنانچہ یعقوبی (احمد بن ابی یعقوب بن جعفر، ابن واضح اخباری) جو تیسری صدی ہجری کا مورخ ہے اپنی تاریخ کے دوسرے حصہ میں جو سیرت النبی سے شروع ہوتا ہے ابن ہشام ہی کی روایت سے استفادہ کرتا ہے۔[۹۶]

حافظ ابن عبدالبر قرطبی (۳۶۸-۴۶۳ھ) نے اپنی سیرت الدرر فی اختصار المغازی والسیر میں ابن ہشام ہی کو ماخذ بنایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:[۹۷]

"ہماری اس کتاب میں ابن اسحٰق سے جو روایت بھی منقول ہے وہ عبدالوارث بن سفیان عن قاسم بن اصبغ عن محمد بن عبدالسلام الخشنی عن محمد بن البرقی عن ابن ہشام کی سند سے ہے۔"

سیرت ابن ہشام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے جلیل القدر علماء نے اس کی تلخیص کی، شرح لکھی، حواشی اور استدراکات سے مزین کیا اور اسے نظم کا جامہ پہنایا۔ ذیل میں اس طرح کی چند کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شروح

۱- الروض الانف

سیرت ابن ہشام کی سب سے مشہور شرح امام ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد سہیلی اندلسی مالقی (۵۰۸-۵۸۱ھ) کے قلم سے ہے۔[۹۸] امام سہیلی تاریخ، لغت، ادب اور قرأت کے ماہر تھے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی اور اندلس کے دوسرے علمائے کبار سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ الروض الانف کی تالیف کا آغاز محرم ۵۶۹ھ میں مالقہ میں ہوا اور اسی سال جمادی الاولیٰ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مقدمہ میں سہیلی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا مواد ایک سو بیس (۱۲۰) سے زائد کتابوں سے جمع کیا ہے۔ الروض الانف سیرت کے بارے میں بیش قیمت معلومات اور نادر افادات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۳۲ھ میں مطبع جمالیہ مصر سے دو حصوں میں شائع ہوئی۔ ایک ایڈیشن عبدالرحمٰن وکیل کی تحقیق و تعلیق سے دارالکتب الحدیثہ قاہرہ سے تین حصوں میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء شائع ہوا۔ ایک تیسرا ایڈیشن طٰہٰ عبدالرؤف سعد کی کوشش سے ۱۹۷۲ء میں مکتبۃ الکلیات الازہریہ قاہرہ سے چار حصوں میں سیرت ابن ہشام کے ساتھ شائع ہوا۔

۲- الاملاء علی سیرۃ ابن ہشام

اندلس کے مشہور ماہر عربیت ابوذر مصعب بن محمد بن مسعود خشنی[۹۹] (۵۳۵-۶۰۶ھ) نے سیرت ابن ہشام کے مشکل الفاظ کی ایک شرح لکھی جسے مستشرق پال برونل (P. BRONNLE) نے "شرح غریب سیرۃ ابن اسحٰق" کے نام سے مطبعہ ہندیہ مصر سے ۱۳۲۹ھ میں دو حصوں میں شائع کیا۔ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ (۳۹۲) میں ابوذر خشنی کی ایک کتاب "الاملاء علی سیرۃ ابن ہشام" کا ذکر کیا ہے۔ مصطفیٰ السقا وغیرہ کے نزدیک یہ کتاب مقدم الذکر کے علاوہ ہے لیکن فی الحقیقت دونوں کا مسمیٰ ایک ہی ہے جیسا کہ اس کتاب کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۳- تنبیہات ابن الوقشی

قاضی ابو الولید ہشام بن احمد وقشی طلیطلی[۱۰۰] (۴۰۸ - ۴۸۹ھ) پانچویں صدی ہجری کے مشہور اندلسی عالم ہیں۔ حدیث و فقہ، کلام و منطق اور شعر و انساب پر زبردست عبور تھا۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ تاریخ و ادب کے کبار مصنفین پر انہوں نے جو تنبیہات و استدراکات لکھے ہیں ان سے ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ، وسعت مطالعہ اور مہارت و اتقان کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی ابو الولید نے سیرت ابن ہشام کی روایت اپنے شیخ ابو عمر احمد بن محمد طلمنکی سے کی تھی۔ ابن ہشام کے علاوہ ابو نصر کلاباذی اور دارقطنی کی کتابوں پر بھی ابن الوقشی نے تنبیہات لکھی تھیں۔

۴۔ کشف اللثام فی شرح سیرۃ ابن ہشام

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی[۱۰۱] (۷۶۲ - ۸۵۵ھ) تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور تاریخ و ادب کے بلند پایہ عالم تھے۔ صحیح بخاری کی مشہور شرح عمدۃ القاری ۲۱ جلدوں میں انہیں کے قلم سے ہے۔ سیرت ابن ہشام کی یہ شرح بھی انہیں کی تصنیف ہے۔ ۸۰۵ھ میں اس شرح سے فارغ ہوئے۔ کشف الظنون کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح مکمل نہیں تھی (۱۰۱۲)

۵۔ المبرۃ فی حل مشکل السیرۃ

یہ شرح یوسف بن عبد الہادی صالحی (۸۴۰ - ۹۰۹ھ) نے لکھی تھی۔ موصوف کی شہرت محدث، فقیہ، متکلم، نحوی اور صوفی کی حیثیت سے ہے۔ طبقات المحدثین پر ایک کتاب سات جلدوں میں لکھی تھی۔ ابن المبرد کے لقب سے مشہور رہتے۔ سیرت ابن ہشام کی اس شرح کا ذکر براکلمان نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شرح مختصر ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں محفوظ ہے (۳: ۱۴)

تلخیصات

۱۔ بلوغ المرام

سیرت ابن ہشام کی یہ تلخیص عہد ممالیک کے مشہور شاعر و ادیب ابن حجۃ حموی تقی الدین ابوبکر بن علی بن عبداللہ قادری حنفی[۱۰۳] (۷۶۷ - ۸۳۷ھ) صاحب ثمرات الاوراق کے قلم سے ہے۔ پورا نام "بلوغ المرام من سیرۃ ابن ہشام والروض الانف والاعلام" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں سیرت ابن ہشام کے ساتھ سہیلی کی دو کتابوں الروض الانف اور کتاب التعریف و الاعلام بما فی القرآن من الاسماء الاعلام کی تلخیص بھی کی گئی ہے۔ براکلمان کے مطابق اس کتاب کا ایک نسخہ بغداد کے مکتبۃ الاوقاف میں محفوظ ہے۔

۲۔ الذخیرہ فی مختصر السیرہ

یہ اختصار بعض اضافوں کے ساتھ ساتویں صدی کے شافعی عالم برہان الدین ابراہیم بن محمد بن المرحل دمشقی[۱۰۴] (م ۶۳۰ھ) نے تیار کیا اور اسے اٹھارہ مجلسوں پر مرتب کیا تھا۔ یہ اختصار ۶۱۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۳۔ مختصر سیرۃ ابن ہشام

عماد الدین احمد بن ابراہیم واسطی[۱۰۵] (۶۵۶ - ۷۱۱ھ) ساتویں صدی کے حنبلی عالم ہیں تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں، براکلمان نے ان کے قلم سے سیرت ابن ہشام کے ایک اختصار کا ذکر کیا ہے جو برلین وغیرہ میں محفوظ ہے۔ یہ تلخیص ۷۱۱ھ یعنی مؤلف کے انتقال کے سال مکمل ہوئی تھی۔

۴۔ خلاصۃ السیرۃ النبویۃ

علی بن الامام المؤید باللہ نے خلاصۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے تلخیص کی تھی جس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے[۶۱]
دورِ حاضر میں متعدد اہلِ علم نے سیرت ابن ہشام کی تہذیب و تلخیص کا کام کیا ہے جن میں سب سے نمایاں اور ممتاز کوشش عبدالسلام ہارون نے کی ہے یہ معاصر تلخیصات بھی ملاحظہ ہوں ۔

۵۔ تہذیب سیرۃ ابن ہشام

عبدالسلام ہارون کی یہ تلخیص جو عالم عرب کے مشہور محقق ہیں ۴۱۷ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں الموسستہ العربیۃ الحدیثہ قاہرہ سے شائع ہوا۔

۶۔ تقریب السیرۃ النبویہ لابن ہشام

تصنیف و شرح : محمد عبدالعزیز اسمٰعیل شیرازی، ۵۹۶ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۶۱ء میں مصطفیٰ البابی الحلبی قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۷۔ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام

تلخیص و پیشکش : عمر عبدالعزیز امین صفحات : ۱۱۹ ۔ الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر قاہرہ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ۔

۸۔ فی ظلال السیرۃ

تلخیص و پیشکش : محمد لبیب البوھی صفحات : ۱۴۰، ۱۹۷۵ء میں دار الشعب قاہرہ سے شائع ہوئی ۔

منظومات

سیرت ابن ہشام کو جن علماء اور شعراء نے نظم کا جامہ پہنایا ان میں درج ذیل ناموں کو شہرت ہوئی ۔

۱۔ ابو نصر فتح بن موسیٰ خضراوی قصری (۵۸۸ - ۶۶۳ھ)[۱۰۷]

اندلس میں پیدا ہوئے، تونس، مصر اور شام وغیرہ کا سفر کیا۔ سیوط کے قاضی مقرر ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ نظم پر زبردست قدرت تھی۔ زمخشری کی المفصل، ابن سینا کی الاشارات اور ابن ہشام کی سیرت کو نظم کیا۔ یہ منظوم سیرت رائیہ اور بارہ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔

۲۔ ابو محمد عبدالعزیز بن احمد دمیری دیرینی مصری (۶۱۲ - ۶۹۴ھ)[۱۰۸]

شیخ عز الدین بن عبدالسلام کے شاگرد اور مفسر، فقیہ، صوفی اور ادیب و شاعر تھے، تفسیر کے موضوع پر ایک طویل ارجوزہ نظم کیا تھا جو تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) ابیات پر مشتمل تھا۔ متعدد کتابیں نظم کیں جن میں سیرت ابن ہشام بھی تھی ۔

۳۔ قاضی محمد بن ابراہیم فتح الدین بن الشہید (۷۲۸ - ۷۹۳ھ)[۱۰۹]

دمشق کے کاتب السر، فن تفسیر کے ماہر اور فاضل انشا پرداز اور شاعر تھے۔ ابن تغری بردی نے لکھا ہے کہ ابن الشہید نے ابن ہشام کی سیرت نبویہ مشطور رجز میں نظم کی تھی جو پچاس ہزار ابیات پر مشتمل تھی۔ ابن قاضی شہبہ کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابن الشہید نے کئی کتابوں کو سامنے رکھ کر سیرت النبی کو تین جلدوں میں نظم کیا تھا جو ۲۵ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔ کتاب کا نام "الفتح القریب فی سیرۃ الحبیب" رکھا تھا، الروض الانف کے افادات مزید اضافوں اور اشکالات کے ساتھ اس میں شامل کیے تھے دمشق اور قاہرہ میں اس کا

درس دیا اور ایک جلد کی شرح بھی لکھی جو بارہ جلدوں پر مشتمل تھی۔

۴۔ حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسن عراقی کردی (۷۲۵-۸۰۶ھ)[110]

فقہ وقرأت اور نظم سے شغف تھا۔ مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ابن الصلاح کی علوم الحدیث بیضاوی کی المنہاج اور ایک کتاب غریب القرآن کے علاوہ سیرت ابن ہشام ایک ہزار اشعار میں نظم کی۔

تراجم

۱۔ سیرت ابن ہشام کا فارسی ترجمہ سیرالنبی کے نام سے ایک سعد بن زنگی کے حکم سے ہوا تھا جس کے نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مترجم نے جس کا نام معلوم نہیں سیرت ابن ہشام مصر میں پڑھی تھی اور ایران واپسی کے بعد بارکوہ میں اس کا ترجمہ بودلین کے مخطوطہ کے مطابق ۶۱۲ھ میں اور ایک دوسرے مخطوطہ کے مطابق ۶۲۰ھ میں شروع کیا تھا۔[111]

۲۔ اردو میں سیرت ابن ہشام کا ایک ترجمہ ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ ایک ترجمہ ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا۔[112] ایک اور اردو ترجمہ قطب الدین احمد حیدر آبادی کے قلم سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوا۔

۳۔ انگریزی ترجمہ مشہور مستشرق اور لندن یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے سابق پروفیسر گیوم A. GUILLAUME نے THE LIFE OF MUHAMMAD کے نام سے کیا۔ گیوم نے سیرت سے ابن ہشام کے حواشی علیحدہ کر کے انھیں آخر میں یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ابن اسحق پر مفصل مقدمہ ہے۔ یہ ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۴۔ لاطینی زبان میں سیرت ابن ہشام کا ترجمہ ڈ۔ پونج SONG P. DE (۱۸۳۲-۱۸۹۰ء) نے ڈ۔ خویہ GOEJE M. J. DE (۱۸۳۶ء-۱۹۰۹ء) کے تعاون سے کیا جو لائڈن سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

۵۔ جرمن زبان میں سیرت کا ترجمہ وایل WEILS. (۱۸۰۸-۱۸۸۹ء) نے کیا اور اسے حواشی و تعلیقات کے ساتھ دو جلدوں میں (۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۴ء) اسٹٹگارٹ سے شائع کیا۔

ایڈیشن

ہماری محدود اطلاع کے مطابق اب تک سیرت ابن ہشام کے مندرجہ ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں۔[113]

۱۔ سیرت ابن ہشام کا اولین ایڈیشن بولاق مصر سے ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ بولاق ہی سے دوبارہ تین حصوں میں ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں شائع ہوئی۔

۳۔ وسٹنفلڈ F. WUSTENFELD (۱۸۰۸-۱۸۹۹ء) نے تین حصوں میں جرمن زبان میں تعلیقات کے ساتھ گوٹنگن سے ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء میں شائع کیا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ لیبزیک سے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

۴۔ ۱۳۲۴ھ میں مطبعہ خیریہ مصر سے تین حصوں میں ایک ایڈیشن چھپا جس پر شیخ محمد طہطاوی کی مختصر تعلیقات تھیں۔

۵۔ شیخ طہطاوی کی تعلیقات کے ساتھ دوبارہ ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوا۔

۶۔ الروض الانف کے حاشیہ پر ۱۳۲۹ھ تا ۱۳۳۲ھ میں مطبعۃ الجمالیہ قاہرہ سے ایک ایڈیشن چھپا۔

۷۔ ایک ایڈیشن ابن قیم کی زاد المعاد کے حاشیہ پر ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا۔

۸۔ ۱۹۳۶ء میں سیرت ابن ہشام کا ایک نفیس اور تحقیقی ایڈیشن مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور احمد شلبی کی کوشش سے مطبعۃ الحلبی مصر سے ۴ حصوں میں شائع ہوا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں اسی مطبعہ سے شائع ہوا۔

۹۔ ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں محی الدین عبدالحمید کی تصحیح سے ایک ایڈیشن ۴ حصوں میں المکتبۃ التجاریہ مصر سے شائع ہوا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ ۱۹۷۱ء میں بھی چھپا۔

۱۰۔ ڈ۔ یونج نے ڈ۔ خویہ کے اشتراک سے ۱۸۶۵ء میں لائڈن سے سیرت کے لاطینی ترجمہ کے ساتھ اس کا متن بھی شائع کیا تھا۔

۱۱۔ الروض الانف کے ساتھ عبدالرحمٰن وکیل کی تحقیق و شرح سے ایک ایڈیشن دارالکتب الحدیثہ قاہرہ سے چار حصوں میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

۱۲۔ سیرت کا ایک ایڈیشن (غالباً الروض الانف کے ساتھ) چار حصوں میں طہٰ عبدالرؤف سعد کی تعلیقات کے ساتھ مکتبۃ الکلیات الازہریہ قاہرہ سے شائع ہوا (نشرۃ الابداع جولائی ۱۹۷۴ء ص ۱۲)

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ ابن ہشام کے حالات کے لئے جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :

(الف) قدیم مآخذ

- سہیلی (م ۵۸۱ھ) الروض الانف ۱ : ۵ (مطبعۃ الجمالیۃ، مصر ۱۳۳۲ھ)
- خشنی (م ۶۰۴ھ) شرح السیرۃ ۱ : ۳ (مطبعہ ہندیہ مصر ۱۳۲۹ھ)
- قفطی (م ۶۴۶ھ) انباہ الرواۃ ۲ : ۲۱۱ - ۲۱۲ (تحقیق ابو الفضل ابراہیم، دارالکتب ۱۳۷۱ھ)
- ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) ۲ : ۳۴۹ (تحقیق محی الدین عبدالحمید، مکتبۃ النہضۃ مصر)
- ابوالفداء (م ۷۳۲ھ) ۲ : ۲۹ - ۳۰
- ذہبی (م ۷۴۸ھ) العبر ۱ : ۳۷۴ (تحقیق المنجد، کویت ۱۹۶۰ء)
- یافعی (م ۷۶۸ھ) مرآۃ الجنان ۲ : ۷۷ - ۷۸ (حیدر آباد ۱۳۳۸ھ)
- ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) البدایۃ والنہایۃ ۱۰ : ۲۸۱ - ۲۸۲۔
- سیوطی (م ۹۱۱ھ) حسن المحاضرۃ ۱ : ۳۰۶ (مطبعۃ ادارۃ الوطن مصر ۱۲۹۹ھ)

- سیوطی: بغیۃ الوعاۃ : ۳۱۵ (مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۶ھ)
- ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) شذرات الذہب ۲ : ۴۵ (بیروت)

ابن ہشام کے حالات درج ذیل قدیم ماخذ میں بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں بعض غیر مطبوعہ ہیں اور بعض مطبوعہ ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے:

- ابن قاضی شہبہ (۸۵۱ھ) طبقات اللغویین والنحاۃ ۲ : ۱۱۱ – ۱۱۲
- تلخیص ابن مکتوم : ۱۲۰ – ۱۲۱
- ذہبی: سیر اعلام النبلاء ۷ : ۲۳۶
- عیون التواریخ (وفیات ۲۱۳ھ)

سیر اعلام النبلاء کا حوالہ کحالہ سے ماخوذ ہے، باقی حوالے تفطی پر ابوالفضل ابراہیم کی تعلیق سے نقل کیے گئے ہیں۔

(ب) جدید ماخذ

- زرکلی : ۴ : ۳۱۴ (طبع دوم)
- کحالہ : ۶ : ۱۹۲ (دمشق ۱۳۷۸ھ)
- براکلمان: ضمیمہ ۱ : ۲۰۶ (لائڈن ۱۹۳۷ء)
- براکلمان: اردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۷۳۰
- اسٹوری: ۲ : ۱۷۲ – ۱۷۳ (مطبوعہ لندن ۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۰ء)
- جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ ۲ : ۱۷۴ – ۱۷۵ (تعلیقات شوقی ضیف)
- مقدمہ مصطفی السقا وغیرہ ۱ : ۱۷ – ۱۸ (سیرت ابن ہشام)
- مقدمہ محی الدین عبدالحمید ۱ : ۱۲ – ۳۰ (سیرت ابن ہشام)
- مقدمہ گیوم (انگریزی ترجمہ سیرت ابن ہشام)
- ہدیۃ العارفین ۱ : ۶۲۴
- یوسف احمد مطورع، جہود علماء النحو فی القرن الثالث الہجری (مطبعہ حکومۃ الکویت ۱۳۹۶ھ)

۲۔ زرکلی نے ابن ہشام کا لقب جمال الدین لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ لقب شرح شذور الذہب کے مصنف اور مشہور امام نحو ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن احمد بن عبداللہ بن ہشام انصاری مصری (۷۰۸ – ۷۶۱ھ) کا ہے۔

۳۔ "معافری" میں میم اور عین مہملہ پر فتحہ اور فاء پر کسرہ ہے (ابن خلکان ۲ : ۳۵۰، اللباب فی تہذیب الانساب ۳ : ۱۵۴) مقریزی کی خطط میں ہر جگہ "مغافر" چھپا ہے، محی الدین عبدالحمید کے مقدمہ سیرت اور بعض دوسری کتابوں میں میم کو ضمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۴۔ قبیلہ معافر کے لیے ملاحظہ ہو: التیجان: ۵۸ – ۶۴، مقریزی ۲ : ۷۶، ۷۹، المغرب: ۴۰ – ۴۱، کندی: الولاۃ والقضاۃ ص ۴۴،

۴۵ ، ۱۱۵ ، ۲۵۵ ، ۳۵۲ ، ۲۸۱ ، نہایۃ الارب ۲ : ۳۰۳ ، الاکلیل ۱۰ : ۱-۲ تاریخ ابن خلدون ۲ : ۸۸، معجم البلدان (معافر) لسان العرب (عضر) بحوالہ معجم قبائل العرب ۳ : ۱۱۵ ، زرکلی ۸ : ۱۶۸

۵- سیرت ابن ہشام ۲ : ۵۸۹ (اس مقالہ میں سیرت کے اس ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے جو مصطفی السقا، ابیاری اور شلبی کی تحقیق سے دوسری بار ۱۳۷۵ھ میں شائع ہوا ہے) لسان العرب (عضر)

۶- خطط المقریزی ۲ : ۷۶ ، ۷۹ ، (مطبعۃ النیل مصر ۱۳۲۴ھ)

۷- (المعافر بن یعفر بن مالک بن الحارث بن مرہ بن ادد بن زید بن عمرو بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا) الاکلیل ۱۰ : ۱-۲ (تحقیق محب الدین خطیب المطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۶۸ھ)

۸- نہایۃ الارب ۲ : ۳۰۳ (دار الکتب ۱۳۴۲ھ) نہایۃ میں "عمرو بن عریب" کی جگہ "یشجب بن عریب" ہے۔

۹- معجم البلدان ۸ : ۹۲ (مطبعۃ السعادہ، مصر ۱۳۲۳ھ) یاقوت نے ادد اور زید بن کہلان کے درمیان کا سلسلۂ نسب اس طرح لکھا ہے:
ادد بن ہمیسع بن عمرو بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان۔

۱۰- "الیہ ترجع المعافر فی انسابہا"

۱۱- التیجان : ۵۶ (حیدر آباد ۱۳۴۷ھ) میں "وائل بن حمیر" سے تصحیح تاریخ ابن خلدون قسم اول ۲ : ۸۸ (دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء) سے کی گئی ہے۔

۱۲- ہمدانی نے الاکلیل ۸ : ۱۸۱ (تحقیق نبیہ امین فارس پرنسٹن ۱۹۴۰ء) میں کتاب التیجان کا یہ حصہ رجز تک نقل کیا ہے۔

۱۳- صفۃ جزیرۃ العرب : ۹۹ (لائڈن ۱۸۸۴ء) ان بستیوں کے نام یہ ہیں: حرازۃ، صحارۃ، عزازۃ، دمینہ، یزداد۔

۱۴- ملاحظہ ہو انباہ الرواۃ اور ابن خلکان وغیرہ۔

۱۵- تہذیب التہذیب ۳ : ۳۷۵

۱۶- ابن قتیبہ : المعارف : ۴۴۴ ، ۵۴۴ (تصحیح الصاوی، مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۵۳ھ) سمعانی ورق ۲۹۴ (گب میموریل، لائڈن ۱۹۱۲ء)

۱۷- القاموس ۲ : ۳۸۰ (دار المامون ۱۳۵۷ھ)

۱۸- ابن مکتوم کی عبارت ابوالفضل ابراہیم نے قفطی کے حاشیہ میں نقل کی ہے۔

۱۹- ڈاکٹر یوسف احمد مطرع : جہود علماء النحو فی القرن الثالث الہجری : "وہذا الذی عقب بہ ابن مکتوم لایتناول الا الکلام عن وفاۃ ابن ہشام لا عن نسبہ"۔

۲۰- سیرت ابن ہشام ۱ : ۶۹۹

۲۱- تہذیب التہذیب ۴ : ۲۰۱ ، مقدمہ ابن الصلاح : ۱۵۲

۲۲- سیرت ابن ہشام ۱ : ۶۴۴

۲۳- "ذکر" کے لفظ سے زہری کے حوالوں میں سے دو سندوں کے ترجمہ میں گیوم نے سخت غلطی کی ہے جو گمراہ کن ہے۔ پہلی سند کی عبارت ہے:

فیما ذکر ابن شہاب الزہری (۱: ۳۲۷) جیساکہ ابن شہاب زہری نے ذکر کیا گیوم کا ترجمہ ملاحظہ ہو (ص ۳۰۷، حاشیہ ۷۹)

ACCORDING TO WHAT AL ZUHRI TOLD ME

دیانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ ترجمہ میں" ابن شہاب" بھی ہوتا جیساکہ متن میں ہے لیکن یہ (ME) کا اضافہ تو بہت ہی افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔ دوسرے حوالے کے الفاظ ہیں:

فیما ذکر ابن شہاب وغیرہ (۲: ۴۰۰) جیساکہ ابن شہاب وغیرہ نے ذکر کیا۔
یہاں بھی گیوم نے "ذکر" کا ترجمہ TOLD ME کیا ہے (ص ۴۳، حاشیہ ۴۲۴) حالانکہ یہی حوالہ بعینہٖ انھیں الفاظ میں ایک جگہ مکرر آیا ہے (۱: ۶۸۳) اور وہاں ترجمہ (SAID) کیا ہے

اسی طرح ابن ہشام نے ایک جگہ عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے ایک روایت "ذکر" کے لفظ سے نقل کی ہے (۲: ۵۱۹) اور وہاں بھی گیوم نے ترجمہ میں یہی غلطی کی (۸۳، حاشیہ ۸۶۰) ان تمام مقامات پر گیوم کا ترجمہ اس وقت درست ہوتا جب متن میں" ذکرلی" یا "حدثنی" یا" اخبرنی" ہوتا۔

۲۴۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ۹: ۸۰

۲۵۔ مربد کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے لیے دیکھئے، سعید افغانی: اسواق العرب: ۲۹۵-۴۵۲ (دارالفکر دمشق ۱۳۷۹ھ)

۲۶۔ ہدیۃ العارفین (۱: ۶۲۴) میں ابن ہشام کے بارے میں لکھا ہے کہ" کان عالما بالسیر و النجوم" لیکن نجوم سے ابن ہشام کے تعلق کا سراغ کسی ماخذ سے نہیں ملتا نیز سیر اور نجوم کا ایک ساتھ ذکر بھی تعجب خیز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عبارت میں تحریف ہے اور (النجوم) کے بجائے (النحو) ہونا چاہیئے۔

۲۷۔ تہذیب التہذیب ۳: ۳۷۵۔

۲۸۔ الیتجان: ۶۴۔

۲۹۔ لیث بن سعد کے حالات کے مآخذ کے لئے دیکھیے: زرکلی ۶: ۱۱۵، کحالہ ۸: ۱۶۲۔

۳۰۔ الیتجان: ۱۳۵، ابن لہیعہ کے لیے دیکھئے: ابن خلکان ۲: ۲۴۲-۲۴۴، ابن خلکان نے ابن لہیعہ کی تاریخ پیدائش ۹۷ھ (سبع و تسعین) اور عمر ۸۱ سال لکھی ہے اس لحاظ سے سن وفات ۱۷۸ھ ہوتا ہے۔

۳۱۔ ابن کثیر سے سیوطی نے بھی نقل کیا ہے۔ حسن المحاضرۃ ۱: ۳۰۶،

۳۲۔ ابن خلکان ۳: ۳۰۷۔

۳۳۔ بغیۃ الوعاۃ: ۳۱۵۔

۳۴۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۶۱۲۔

۳۵۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۱۹۶۔

۳۶۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۶۴۔

۳۷ - التبیان میں ابوعبداللہ الایلی ہے تصحیح الاکلیل ۸: ۱۶۱ سے کی گئی ہے۔

۳۸ - بغیۃ الوعاۃ: ۴۲۶، نزہتہ الالباء: ۵۹، دوسرے مراجع کے لئے دیکھئے زرکلی ۹: ۴۴۳، کحالہ ۱۳: ۳۴۷۔

۳۹ - تہذیب التہذیب ۱۲: ۱۷۹۔

۴۰ - تاریخ بغداد ۹: ۷۷ - ۸۰، نزہتہ الالباء: ۱۷۳، بغیۃ الوعاۃ: ۲۵۴ فہرست ابن ندیم: ۸۱، زرکلی ۳: ۱۴۴، اردو انسائیکلوپیڈیا ۱: ۸۱۱۔

۴۱ - تذکرۃ الحفاظ ۱: ۲۵۷، تہذیب التہذیب ۶: ۱۴۴، زرکلی ۴: ۳۲۹۔

۴۲ - بغیۃ الوعاۃ: ۳۵۵، نزہتہ الالباء: ۱۳۷، فہرست ابن ندیم: ۷۹، زرکلی ۸: ۱۹۱۔

۴۳ - مجاز القرآن فواد سزکین کی تحقیق سے دو حصوں میں چھپی اور نقائض یون کی تصحیح سے لائیڈن میں ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۲ء میں چھپی۔

۴۴ - تذکرۃ الحفاظ ۱: ۳۰۵، تہذیب التہذیب ۶: ۷۱، میزان الاعتدال ۲: ۸۶، زرکلی ۴: ۲۸۹، کحالہ ۶: ۱۶۲۔

۴۵ - تاریخ بغداد ۱۰: ۱۷۳ - ۱۷۹ لسان المیزان ۳: ۳۶۱۔

۴۶ - بغیۃ الوعاۃ: ۲۴۲، نزہتہ الالباء: ۶۹، ابن ندیم: ۴۷، زرکلی ۲: ۳۵۸۔

۴۷ - طبقات ابن سلام: ۲۳، ۲۰۶ (تحقیق محمود شاکر، دار المعارف ۱۹۵۲ء)

۴۸ - ابن ندیم: ۴۵، معجم الادباء ۱۹: ۳۰۴ - ۳۱۰ (دار المامون)

۴۹ - بغیۃ الوعاۃ: ۳۱۵۔

۵۰ - البدایۃ والنہایۃ ۳: ۲۴۴۔

۵۱ - ابن ہشام کے ان برقی تلامذہ کے حالات کے لئے عمومی طور پر ملاحظہ ہو:
ابن ماکولا: الاکمال ۱: ۴۸۰ - ۴۸۱ (حیدرآباد) معجم البلدان (برقہ) سمعانی ۲: ۱۷۲ (حیدرآباد)

۵۲ - برقیین کے ان جد اعلیٰ کا صحیح نام سُعَیۡبَۃ (سَ، عُ، یَ، ہ) ہے ابن ماکولا کے مطابق اسے "بسکون المہملۃ وفتح التحتانیۃ ثم ہاء" سے ضبط کیا جائے گا۔ (۵: ۶۸) یہ نام عام طور پر مآخذ میں محرف ہے بعض میں "سعید" (معجم البلدان - برقۃ، سمعانی) اور بعض میں "سعد" (تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۴۸، فہرست ابن خیر: ۲۴۳) چھپا ہے۔

۵۳ - محمد بن عبداللہ کے لیے دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۴۸، حسن المحاضرۃ ۱: ۱۹۷ تہذیب التہذیب ۹: ۲۶۳، شذرات الذہب ۲: ۱۲۰، کحالہ ۱۰: ۲۲۴

کحالہ نے معجم المولفین میں "محمد البرقی" کا ترجمہ دو جگہوں پر لکھا ہے۔ گویا دو شخصیتیں ہیں۔ سن وفات دونوں کا ۲۴۹ھ لکھا ہے۔
ایک جگہ (۱۰: ۲۲۴) "محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم الزہری مولاہم المصری المعروف بابن البرقی" نسب ذکر کیا ہے اور تصنیفات میں کتاب الضعفاء کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ (۱۰: ۱۵۸) نسب "محمد بن عبدالرحیم بن ابی زرعۃ البرقی" ہے اور تصنیفات میں تالیف فی مختصر ابن عبدالحکم الصغیر اور کتاب فی التاریخ والطبقات کا ذکر کیا ہے اور حوالہ ابن فرحون: ۲۳۳ - ۲۳۴ کا دیا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ دو شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخصیت ہے جو ابن البرقی کے نام سے مشہور رہے۔ کحالہ کو غالباً نسب کے

اختلاف سے دھوکا ہوا۔ تذکرہ نگار اکثر نسب کو مختصر اور درمیان کی کڑیاں حذف کر دیتے ہیں، چنانچہ ابن فرحون نے بظاہر محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم بن سعید بن ابی زرعہ کے بجائے محمد بن عبدالرحیم بن ابی زرعۃ لکھ دیا ہوگا (افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس الدیباج المذہب موجود نہیں ہے) نیز ملاحظہ ہو ابن الفرضی: ۱۴-۱۵۔

اسی طرح مطبوعہ سیرت ابن ہشام کے آخر میں (۲: ۱۷۶) مخطوطہ کا ایک نوٹ درج کیا ہے اس میں بھی عبداللہ کا نام حذف کر کے محمد بن عبدالرحمٰن البرقی لکھ دیا ہے۔ اس نوٹ میں ایک اور غلطی یہ ہوگئی ہے کہ عبدالرحیم کو عبدالرحمٰن کر دیا۔

۵۴۔ تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۴۸-۱۴۹، المنتظم ۵: ۱۵۷، کحالہ ۱: ۲۸۶۔

۵۵۔ براکلمان (۱: ۲۰۷) نے "کتاب التیجان لمعرفۃ ملوک الزمان فی اخبار قحطان" لکھا ہے۔

۵۶۔ اسد بن موسیٰ کے حالات کے لئے دیکھئے تہذیب التہذیب ۱: ۲۶۰

۵۷۔ جوزف ہوروِوتس (سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین ترجمہ شاراحمد فاروقی دہلی ۱۹۷۴ء) نے وہب بن منبہ کے حالات میں (۴۳) عبدالمنعم کو وہب کا پوتا اور ادریس بن سنان کو وہب کا داماد قرار دیا ہے۔ فاروقی نے اس کی تصحیح یوں کی کہ ادریس کے باپ سنان کو وہب کا نواسا بنایا (۵۱) حالانکہ وہب کے نواسے سنان نہیں بلکہ ادریس بن سنان ہیں۔ تہذیب کی عبارت یہ ہے (۱: ۱۹۴)۔

ادریس بن سنان الیمانی ابوالیاس الصنعانی ابن بنت وھب بن منبہ والد عبد المنعم۔

اس عبارت کا ترجمہ اس طرح ہوگا:

ادریس بن سنان یمانی جن کی کنیت ابوالیاس اور نسبت صنعانی ہے وہب بن منبہ کے نواسے اور عبدالمنعم کے باپ ہیں۔

۵۸۔ لسان المیزان ۴: ۷۳۔

۵۹۔ الروض الانف ۱: ۱۲/۲: ۱۰۵، ۲۱۸۔

۶۰۔ الاکلیل ۸: ۱۰۸، ۱۴۸، ۱۶۱، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۹۹، ۲۰۴، ۲۱۱، ۲۱۶، ۲۲۰۔

۶۱۔ التیجان کے ساتھ اخبار عبید بن شریہ الجرہمی بھی چھپی۔ اسلامک کلچر حیدرآباد (اپریل ۱۹۲۸ء) میں کرنکو نے ان دونوں کتابوں پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "THE OLDESL BOOKS ON ARABIC FOLKLORE" اس مضمون میں التیجان اور اخبار عبید کے مشمولات کا جائزہ لیا گیا تھا۔

۶۲۔ الروض الانف: ۵ (فیما ذکر لی)

۶۳۔ زرکلی (۴: ۳۱۴) نے ابن ہشام کی مطبوعہ تصانیف میں ایک کتاب "القصائد الحمیریۃ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ مآخذ میں اس نام کی کوئی کتاب ابن ہشام کی جانب منسوب نہیں کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود یہ سراغ نہ لگ سکا کہ یہ کتاب کب اور کہاں چھپی۔ خیال ہوتا ہے کہ کسی نے کتاب التیجان سے حمیری قصائد علیحدہ کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیے ہوں گے۔

کرنکو اور اس کی تقلید میں نبیہ امین فارس (مقدمہ الاکلیل جزء ثامن) نے اخبار عبید بن شریہ جرہمی کے بارے میں خیال

ظاہر کیا ہے کہ اس کا جامع بھی ابنِ ہشام ہی ہے لیکن تعجب ہے کہ اخبارِ عبید میں ابن ہشام نے اپنے تصنیفی منہج کے مطابق "قال ابنِ ہشام" کہیں نہیں لکھا۔ کتاب کے شروع میں صرف "برقی" کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ برقی نے یہ کتاب ابن ہشام سے حاصل کی ہوگی۔ برقی کبیر محمد بن عبداللہ جس طرح ابن ہشام کے شاگرد ہیں اسی طرح براہِ راست اسد بن موسیٰ سے بھی انہوں نے روایت کی ہے۔

۶۴۔ یافعی (۲ : ۷۷ - ۷۸) نے وفات کا مہینہ "رجب" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۶۵۔ حسن المحاضرۃ ۱ : ۳۰۶ میں "لثلاث خلت من ربیع الآخر" چھپا ہے۔ "خلت" سے پہلے "عشرۃ" چھوٹ گیا ہے۔

۶۶۔ ابن اسحٰق کے مآخذ کے لئے ملاحظہ ہو: زرکلی ۶ : ۲۵۲، کحالہ ۹ : ۴۴ اُردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۴۲۰ - ۴۲۲، نیز دیکھئے جوزف ہورووِتس (اردو ترجمہ) ۱۰۹ - ۱۳۰۔

۶۷۔ جواد علی : تاریخ طبری کے مآخذ (ترجمہ نثار احمد فاروقی) ۱۲۵۔

۶۸۔ خطیب نے تاریخ بغداد (۱ : ۲۱۴ - ۲۳۴) اور ابن سید الناس نے عیون الاثر کے شروع میں ابن اسحٰق پر عائد کردہ تمام الزامات سے مفصل بحث کی ہے۔

۶۹۔ ابنِ خلکان ۳ : ۴۰۵۔

۷۰، ۷۱۔ سہیلی : ۵ نیز دیکھئے ابن خلکان حوالہ سابق۔

۷۲۔ ہورووِتس : ۱۲۲۔

۷۳۔ سیرت ابن اسحٰق کے مختلف نسخوں کے لئے دیکھئے: تاریخ طبری کے مآخذ : ۱۱۸۔

۷۴۔ زیاد بکائی کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ بغداد ۸ : ۴۷۶ - ۴۷۸ تہذیب التہذیب ۳ : ۳۷۵، سمعانی ورق ۸۸ (گب میموریل) ۲ : ۲۹۰ (حیدرآباد) النجوم الزاہرۃ ۲ : ۱۱۱ (طبع اول ۱۳۴۱ھ دار الکتب مصریہ) ابن خلکان ۲ : ۸۶ - ۸۷، زرکلی ۳ : ۹۲

۷۵۔ "زیاد اشرف من أن یکذب فی الحدیث"

۷۶۔ "زیاد بن عبد اللہ علی شرفہ یکذب فی الحدیث"

۷۷۔ سہیلی : ۵۔

۷۸۔ تہذیب التہذیب ۳ : ۳۷۵۔

۷۹۔ ہورووِتس : ۱۱۹ - ۱۲۱، جواد علی (۱۲۱) نے کتاب الخلفاء کو بھی سیرت کا ایک جزء قرار دیا ہے۔

۸۰۔ ہورووِتس : ۱۱۹۔

۸۱۔ مثلاً سیرت ابن ہشام ۱ : ۲۶۸، ۳۱۳، ۴۱۸ / ۲ : ۱۹، ۲۰، ۱۷۷۔

۸۲۔ سیرت ابن اسحٰق کے شعری سرمایہ پر ہورووِتس کا ایک مضمون اسلامیکا ۲ : ۳۰۸ میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور مضمون جو ڈاکٹر سامی مکی العانی کے قلم سے مجلۃ آداب المستنصریۃ کی جلد اول کے پہلے شمارہ میں ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء میں "دراسۃ فی شعر السیرۃ النبویۃ لابن اسحٰق"

کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مؤخر الذکر مضمون جس سے راقم نے استفادہ کیا ہے بہت جامع ہے۔

۸۳۔ طبقات الشعراء: ۹

۸۴۔ ابن کثیر کی عبارت جسے سیوطی نے بھی حسن المحاضرہ میں بعینہٖ نقل کیا ہے درج ذیل ہے۔

"وقد كان مقيما بمصر، واجتمع به الشافعي حين وردها وتناشدا من أشعار العرب شيئا كثيرا"

سیوطی کے یہاں "قد" نہیں ہے اور "اشیاء کثیرۃ" ہے۔

مصطفی السقا وغیرہ نے اس عبارت کے پہلے ٹکڑے پر غور نہیں کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ہشام پہلے سے مصر میں مقیم تھے ورنہ "ورد" کا فاعل امام شافعی کے بجائے ابن ہشام کو نہ قرار دیتے۔ نیز امام شافعی مصر ۱۹۹ھ اور ایک قول کے مطابق ۲۰۱ھ میں پہنچے جبکہ ابن ہشام اس سے بہت پہلے کم از کم ۱۷۵ھ سے قبل پہنچ چکے تھے۔

۸۵۔ مقدمہ ابن الصلاح: ۵۱

۸۶۔ عمر بن حبیب کا نام مصطفی السقا وغیرہ کے تحقیقی ایڈیشن میں عمرو (واو کے ساتھ) چھپا ہے۔ انڈکس (۶۹۷) میں بھی اسی طرح ہے۔ زاد المعاد کے حاشیہ پر سیرت کا جو ایڈیشن چھپا ہے اس میں بھی عمرو (واو کے ساتھ) ہے (۲: ۲۹۷) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غلطی مخطوطہ کی ہے۔

۸۷۔ تہذیب التہذیب ۷: ۴۳۱—۴۳۳۔

۸۸۔ المزھر ا: ۸۷ (تحقیق ابو الفضل ابراہیم وغیرہ طبع دوم حلبی مصر)

۸۹۔ کتاب العین خلیل نحوی کی مشہور کتاب ہے۔ محمد بن الحسن زبیدی (م ۳۷۹ھ) نے اس کی تلخیص کی۔ الزاہر فی معانی الکلام الذی یستعملہ الناس، ابوبکر محمد بن القاسم الانباری (م ۳۲۸ھ) کی تصنیف ہے جس کا اختصار عبدالرحمٰن بن اسحٰق زجاجی (م ۳۴۰ھ) نے تیار کیا۔ الواضحہ فی تجوید الفاتحہ شیخ برہان الدین ابراہیم بن عمر (م ۷۳۲ھ) کا ایک دالیہ قصیدہ ہے جو بائیس (۲۲) شعروں پر مشتمل ہے (حاشیہ المزھر)

۹۰۔ الاعلان بالتوبیخ: ۱۵۸ (تحقیق روزنتھل بغداد ۱۳۸۲ھ)

۹۱۔ انباہ الرواۃ ۲: ۲۱۲۔

۹۲۔ فہرست ابن خیر (۲۳۶) میں ابوبکر محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی الکبیر ہے جو صحیح نہیں۔ ابوبکر احمد بن عبداللہ کی کنیت تھی۔ محمد بن عبداللہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔

۹۳۔ فہرست ابن خیر: ۲۳۳—۲۳۶

۹۴۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۶۷۱

۹۵۔ الروض الانف ۱: ۲۶

۹۶۔ یعقوبی ۲: ۳ (المکتبۃ الحیدریۃ، نجف ۱۳۸۴ھ)

۹۷۔ الدرر: ۲۷۵ (تحقیق شوقی ضیف، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ ۱۳۸۶ھ)

۹۸ - سہیلی کے مآخذ کیلئے ملاحظہ ہو: کحالہ ۵ : ۱۴۷، زرکلی ۴ : ۸۶ -

۹۹ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۹۲ -

۱۰۰ - بغیۃ الوعاۃ : ۴۰۹، لسان المیزان ۶ : ۱۹۳، ابن بشکوال : ۱۴۲۷ ، زرکلی ۹ : ۸۰ ، کحالہ ۱۳ : ۱۴۷ -

۱۰۱ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۸۶، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۷۰ ، دوسرے مآخذ کے لئے دیکھئے زرکلی ۸ : ۳۸، کحالہ ۱۲ : ۱۵۰ -

۱۰۲ - کحالہ ۱۳ : ۲۸۹ -

۱۰۳ - زرکلی ۲ : ۴۳ ، اردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۴۸۴ ، براکلمان ۲ : ۱۹

۱۰۴ - کحالہ ۱ : ۱۰۷ ، ہدیۃ العارفین : ۱۵

۱۰۵ - ہدیۃ العارفین ۱ : ۱۰۴، براکلمان ۱ : ۲۰۶ ، ۱ : ۲۸۰

۱۰۶ - براکلمان ضمیمہ ۱ : ۲۰۶ -

۱۰۷ - ابن قاضی شہبۃ : طبقات الشافعیہ ۲ : ۱۸۵ (تحقیق عبدالعلیم خاں - حیدرآباد) بغیۃ الوعاۃ : ۳۷۲، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۲۴، سبکی : ۵ : ۴۱۶ (مطبعہ حسینیہ طبع اول) ذیل مرآۃ الزمان ۲ : ۳۲۷ ، ہدیۃ العارفین : ۴۱۸، کشف الظنون : ۱۰۱۲، زرکلی ۵ : ۳۲۲، کحالہ ۸ : ۵۰

۱۰۸ - ابن قاضی شہبۃ ۲ : ۲۳۳ ، سبکی ۵ : ۷۵، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۳ کشف الظنون : ۱۰۱۲، زرکلی ۴ : ۱۳۷، کحالہ ۵ : ۲۴۱ -

۱۰۹ - ابن قاضی شہبۃ ۳ : ۲۱۹ ، النجوم الزاہرۃ ۱۲ : ۱۲۵ ، الدرر الکامنۃ ۳ : ۲۹۶ ، انباء الغمر ۳ : ۹۳ ، کشف : ۱۰۱۲، زرکلی ۶ : ۱۹۰، کحالہ ۸ : ۲۱۸ -

۱۱۰ - ابن قاضی شہبہ ۴ : ۳۳ ، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۸۴ دوسرے مآخذ کے لئے ملاحظہ ہو زرکلی ۴ : ۱۱۹، کحالہ ۵ : ۲۰۴ اور ابن قاضی شہبہ کے محقق کا حاشیہ -

۱۱۱ - اس ترجمہ کے مخطوطات کے لیے ملاحظہ ہو اسٹوری C. A. STOREY کی کتاب PERSIAN LITERATURE مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۷ء ص ۱۷۲-۱۷۳ -

۱۱۲ - قاموس الکتب شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان -

۱۱۳ - سیرت ابن ہشام کے مختلف ایڈیشنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل مآخذ سے رجوع کیا گیا ہے :
براکلمان : انسائیکلوپیڈیا میں براکلمان کا مقالہ اور اس کی تاریخ ادب ۱ : ۱۴۱ (لائڈن ۱۹۴۳ء) سرکیس : معجم المطبوعات العربیۃ : ۲۷۶ (مصر ۱۳۴۶ھ) سٹوری کی مذکورہ کتاب، جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ نشرۃ الایداع کے مختلف شمارے - ڈاکٹر عالی کا مقالہ "دراستہ فی شعر السیرۃ النبویۃ لابن اسحٰق"

طبقات ابنِ سعد (سیرتِ نبوی کا قدیم ماخذ)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

محمد بن سعد بن منیع البصری الزہری (۱۶۸ھ/۷۸۴ء – ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) عام طور پر اپنے مختصر نام ابن سعد سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی کنیت ابو عبداللہ تھی[1] وہ ۱۶۸ھ/(۷۸۴ء) میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ جوانی میں تحصیلِ علم کے لیے بغداد پہنچا اور یہاں اپنے استاد محمد بن عمر الواقدی کے سکریٹری کی حیثیت سے رہا چنانچہ اُسے "کاتب الواقدی" بھی کہا جاتا ہے۔

محمد بن عمر الواقدی | ابو عبداللہ محمد بن عمر بن واقد السہمی مدنی بنو اسلم کے مولا تھے اس لئے اسلمی بھی کہلاتے ہیں۔ یہ تاریخ اسلام کے قدیم ترین مورخوں میں سے ایک ہیں۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور حفاظِ حدیث میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے متعدد شیوخ سے حدیث کی سماعت کی جن میں مالک بن انس، سفیان ثوری، معمر بن راشد بھی شامل ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ الواقدی مالک بن انس اور سفیان کی رائے کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

الواقدی کا پیشہ تجارت تھا اور یہ گندم کی خرید و فروخت کرتے تھے لیکن کسی وجہ سے اُن کی تجارت ٹھپ ہو گئی اور یہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تلاشِ معاش میں نکل پڑے انہوں نے ہارون الرشید کے زمانے میں عراق کا رُخ کیا (۱۸۰ھ) اور وہاں کسی طرح یحییٰ بن خالد برمکی کے دربار میں باریاب ہوئے اُس نے انھیں بہت فائدہ پہنچایا اور خلیفہ کے دربار تک ان کی رسائی ہو گئی اس نے الواقدی کو بغداد کی قضا کا عہدہ دیا جس پر یہ آخر عمر تک فائز رہے[3]

---

[1] الفہرست (ابن ندیم) اردو ترجمہ محمد اسحٰق بھٹی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور جون ۱۹۶۹ء۔
کتاب الاعلام جلد ۷ ص ۶ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) جلد ۱/۱۹۰

[2] ملاحظہ ہو: معجم الادباء جلد ۱۸ صفحہ ۲۷۷-۲۸۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱/۳۱۷۔
وفیات الاعیان ج ۱/۵۰۶، تاریخ بغداد ج ۳/۳-۲۱، میزان الاعتدال ج ۳/۱۱۰،
تہذیب التہذیب ج ۹/۳۶۳-۳۶۸، عیون الاثر ج ۱/۱۷،
بروکلمان ج ۱/۱۴۱ (۱۳۵) ضمیمہ ۱/۲۰۷، جرجی زیدان ۲/۱۴۷، الزرکلی ۷/۲۰۰-۲۰۱

[3] یحییٰ بن خالد سے ملاقات، دربار خلافت میں باریابی اور عہدۂ قضا پر فائز ہونے کی تفصیلی رپورٹ کے لئے دیکھئے:
[جوزف ہورووتس: سیرۃ نبویؐ کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین، مترجمہ نثار احمد فاروقی]
جو اسی جلد میں شامل ہے۔

الواقدی کی تصانیف میں جن کتابوں کے نام معلوم ہیں[1]۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ کتاب المغازی ۔ یہ متعدد بار چھپی ہے اور اس کا ایک اچھا ایڈیشن مارسیڈن جونس کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ فتح افریقیہ (دو جلدیں) مطبوعہ

۳۔ فتح العجم (مطبوعہ)

۴۔ فتح مصر والاسکندریہ (مطبوعہ)

۵۔ تفسیر القرآن الکریم (غیر مطبوعہ)

۶۔ اخبار مکہ

---

[1] ابن الندیم (الفہرست اُردو ترجمہ ص ۲۳۶-۲۳۸) کہتا ہے کہ الواقدی "نیک کردار شیعہ تھا جو تقیہ کا پابند تھا۔" اس نے الواقدی کی ۲۸ تصانیف کے نام گنائے ہیں :

۱۔ کتاب التاریخ والمغازی والمبعث
۲۔ کتاب اخبار مکہ
۳۔ کتاب الطبقات
۴۔ کتاب فتوح الشام
۵۔ کتاب فتوح العراق
۶۔ کتاب الجمل
۷۔ کتاب مقتل الحسین علیہ السلام
۸۔ کتاب السیرۃ
۹۔ کتاب ازواج النبی علیہ السلام
۱۰۔ کتاب الردۃ والدار
۱۱۔ کتاب حرب الاوس والخزرج
۱۲۔ کتاب صفین
۱۳۔ کتاب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۱۴۔ کتاب امر الحبشہ والفیل
۱۵۔ کتاب السقیفہ وبیعۃ ابی بکر
۱۶ کتاب المناکح
۱۷۔ کتاب ذکر القرآن
۱۸۔ کتاب سیرۃ ابی بکرؓ و وفاتہ
۱۹۔ کتاب مداعی قریش والانصار فی القطائع و وضع عمر الدواوین وتصنیف القبائل ومراتبہا وانسابہا
۲۰۔ کتاب الرغیب فی علم القرآن وغلط الرجال
۲۱۔ کتاب مولد الحسن والحسین ومقتل الحسین علیہ السلام
۲۲۔ کتاب ضرب الدنانیر والدراہم
۲۳۔ کتاب تاریخ الفقہاء
۲۴۔ کتاب الآداب
۲۵۔ کتاب التاریخ الکبیر
۲۶۔ کتاب غلط الحدیث
۲۷۔ کتاب السنۃ والجماعۃ وذم الہوی وترک الخوارج فی الفتن
۲۸۔ کتاب الاختلاف (اہل مدینہ و کوفہ کے فقہی اختلافات کے موضوع پر)

۷۔ کتاب الطبقات الکبیر

۸۔ فتوح العراق

۹۔ سیرۃ ابی بکرؓ و وفاتہ

۱۰۔ تاریخ الفقہاءؒ

۱۱۔ کتاب الجمل

۱۲۔ کتاب صفین

۱۳۔ مقتل الحسین

۱۴۔ضرب الدنانیر والدراھم

۱۵۔کتاب فتوح الشام (مطبوعہ) یہ بھی الواقدی سے منسوب ہے لیکن اسے الحاقی سمجھا جاتا ہے اس کا اردو ترجمہ بھی مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

مندرجہ بالا کتابوں میں سے اکثر کے لیے یہ شبہ کیا گیا ہے کہ ان کی نسبت الواقدی سے مشکوک ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مغازی اور فتوح سے متعلق روایات جمع کرنے کا الواقدی نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ خطیب بغدادی کہتا ہے :۔

كَانَ الواقدى كلّما ذكرت لهٗ وَقعةٌ	الواقدی کے سامنے جب کوئی واقعہ بیان کیا جاتا تھا تو
ذَهَبَ إلى مَكانِها فعَايَنَه وَأَشْهرُ	وہ موقع پر پہنچ کر اس جگہ کا معاینہ کرتا تھا۔ اس سے
مَنْ رَوى عَنْه كاتِبُه محمّد بن سعد	روایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور اس کا کاتب
صاحب كتاب الطّبقات الكبير[1]	محمد بن سعد مؤلف کتاب الطبقات الکبیر ہے۔

ابن الندیم نے الواقدی کی تصانیف کی ایک فہرست دی ہے اور محمد بن اسحٰق کا یہ قول نقل کیا ہے:

قَالَ محمّد بن اسحٰق: قرأتُ بخطٍّ	محمد بن اسحٰق نے کہا: میں نے پرانے خط میں لکھا ہوا
عتيقٍ قال: خَلَفَ الواقدى بعدَ وفاتِهِ	دیکھا ہے کہ الواقدی نے اپنی وفات کے بعد چھ سو صندوق
ستّمائة قمطرٍ كتبًا كلُّ قمطرٍ منها حَمْلَ	کتابوں سے بھرے ہوئے چھوڑے اور ان میں سے ہر صندوق
رَجُلَيْن وَكانَ لَه غلامان مملوكان	دو آدمی اٹھا سکتے تھے اس کے پاس دو زر خرید غلام تھے
يكتبان اللّيلَ والنّهارَ[2]	جو اس کے لیے دن رات لکھتے رہتے تھے[2]

حافظ ابوداؤد کہتے ہیں کہ الواقدی ۳۰ ہزار غریب احادیث کی روایت کرتے تھے یہ مغازی، سیر، اخبار، ایام الناس اور

---

[1] خطیب بغدادی : تاریخ بغداد ج ۳/ ۳-۲۱،

[2] ابن الندیم الفہرست ۱/ ۹۸ نیز دیکھیے ہوارٹ کلیمن: ۱۷۵ (CLEMENT HUART) اردو ترجمہ ۲۲۷

وقائع اور فقہ کے حافظ تھے۔ انہوں نے ابن جُریج، ابن عجلان، معمر بن راشد اور ثور بن یزید سے بھی ملاقات کی تھی امام ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ یہ اسلام کی تاریخ کے بارے میں "امین الناس" (لوگوں میں سب سے زیادہ ایماندار) تھے۔ امام بخاری کا قول ہے کہ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر میں اُسے ثقہ نہ سمجھتا تو ہرگز اس سے روایت نہ کرتا۔ مُصعب بن الزبیر کا کہنا ہے کہ "واللہ ہم نے الواقدی جیسا دوسرا نہیں دیکھا" اور یہ بھی کہا کہ "الواقدی ثقہ اور مأمون ہے۔"

ابراہیم حربی کہتے ہیں اگر "مالک بن انس اور ابن ابی ذوئب کے مسائل الواقدی کے سوا کسی راوی کے ذریعے سے آئیں تو اُن کی تصدیق مت کرو۔"

حافظ الدراوردی اُنھیں "امیرالمومنین فی الحدیث" کہتے ہیں۔ محمد بن سلام الجمحی کا کہنا ہے کہ "عالم دہر ہیں"۔ یزید بن ہارون نے کہا کہ الواقدی ثقہ ہے اور اس کے ثقہ ہونے کی تصدیق ابو عبید قاسم بن سلام نے بھی کی ہے لیکن محدثین جیسے ابن معین، ابو حاتم النسائی، ابن عدی، ابن راھویہ، دارقطنی سب کے سب اُسے "ضعیف" کہتے ہیں لیکن اخبار الناس" سیر، فقہ اور دوسرے سارے فنون میں اُسے ثقہ مانتے ہیں۔

ابن سعد کا قول ہے کہ الواقدی نے کہا: "ایسا کوئی نہیں ہے جس کی کتابیں اس کے حفظ سے زیادہ نہ ہوں، مگر میرا حافظہ میری تصانیف سے زیادہ ہے۔"

یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ جب جانب غربی (بغداد) سے الواقدی منتقل ہوئے تو اُن کی کتابوں کے ۱۲۰ بھاری بنڈل تھے بعض نے چھ سو قمطر مقدار بتائی ہے۔ قمطر کتابیں رکھنے کے صندوق کو کہتے ہیں۔

الواقدی نے ۷۷ سال کی عمر پائی ۲۰۷ھ / ۸۲۳ء میں بغداد میں انتقال ہوا اور مقابر خیزراں میں مدفون ہوئے۔[1]

جن راویوں نے الواقدی سے سماعت کی اُن میں سب سے پہلے ابوالقاسم الاصبغ ہیں۔

(۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے مدینہ اور کوفہ کے سفر بھی کیے تھے۔ وہاں دوسری صدی ہجری کی متعدد ممتاز علمی شخصیتوں کے علاوہ اس نے تاریخی آثار کی بھی لازماً زیارت کی ہوگی مدینہ کا سفر غالباً ۲۰۰ھ سے پہلے پیش آیا تھا اس نے وہاں بعض حضرات سے ۱۸۹ھ میں ملاقات کرنے کا تذکرہ کیا ہے اور مدینہ کے جن راویوں سے اُس نے اخذ کیا ہے وہ سب تیسری صدی ہجری کا آغاز ہونے

---

[1] ابن الندیم کہتا ہے کہ "مجھے ابو عبداللہ واقدی نے اپنی تاریخ ولادت ۱۳۰ھ بتائی۔ واقدی کی وفات ۱۱ ذی الحجہ سوموار کی شب کو ۲۰۷ھ میں ہوئی اس نے ۷۸ سال کی عمر پائی اور قبرستان خیزراں میں دفن ہوا، نماز جنازہ محمد بن سماعہ نے پڑھائی۔

(الفہرست ۲۳۷)

سے پہلے ہی رحلت کر چکے تھے۔

ابن سعد کے ایک جدّ اعلیٰ بنو ہاشم کے موالی میں سے تھے لیکن خود ابن سعد کو کسی سے نسبت ولایت نہیں تھی۔ اُسے الزُّھری کیوں کہا جاتا ہے اس کی تاویل کرنا مشکل ہے خاندانی نسبت بنو ہاشم سے بہر حال ثابت ہے مگر خود ابن سعد کو بنو زُہرہ سے ایسی کوئی نسبت حاصل تھی، اس کا ثبوت موجود نہیں ہے۔

اپنے سیر و سفر کے دوران وہ اہم علمی شخصیتوں سے ملاقات کر کے روایات حاصل کرتا رہا اور کتابیں فراہم کرتا رہا۔ انھیں سب مکتوب اور غیر مکتوب روایات سے اس نے اپنی تصانیف میں فائدہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد کا بہت بڑا عالم زبردست محدث اور "صاحب تصانیف کثیرہ تھا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب الطبقات الکبیر اس کی واحد تصنیف نہیں ہے بلکہ اور بھی کتابیں رہی ہوں گی لیکن ہمارے مآخذ اس کی صرف دو تالیفات کے نام اور بتاتے ہیں ان میں سے ایک الطبقات الصغیر ہے جو غالباً اسی الطبقات الکبیر کا خلاصہ رہا ہوگا اور دوسری کتاب اخبار النبی ہے جس کا ذکر ابن الندیم نے بھی کیا ہے[1] لیکن یہ بھی غالباً طبقات ہی کے پہلے دو اجزا کی طرف اشارہ ہے جن میں سیرۃ نبوی کی تفصیلات جمع کر دی گئی ہیں۔

ابنِ سعد کی کتاب الطبقات الکبیر کا ذکر ابن الندیم کے بعض نسخوں میں نہیں ہے لیکن فارسی ترجمہ جس نسخے پر مبنی ہے اُس میں تذکرہ موجود ہے اور اس کے لیے یہ لکھا ہے کہ الواقدی، الکلبی[2]، ہیثم بن عدی، اور المدائنی کے انداز پر لکھی ہے اور اس کا ایک جز کتاب الطبقات الصغیر ہے۔ اس کے علاوہ ایک تصنیف "کتاب الجبل" بتائی ہے[3]۔

ابن سعد کے شیوخ

ابن سعد نے اپنے عہد کے علمی مراکز کے سفر کئے تھے اور وہاں کی علمی شخصیات سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔ چنانچہ اس کے شیوخ میں یہ نام بھی ملتے ہیں:

۱۔ سُفیان بن عُیَیْنَہ

۲۔ ابو الولید الطیالسی

۳۔ ابو جعفر محمد بن سعدان الضریر الکوفی[4] (۱۶۱ھ / ۲۳۰ھ)

۴۔ وکیع بن الجراح

۵۔ سلیمان بن الحرب

---

[1] ابن الندیم: الفہرست (اردو ترجمہ) ۲۳۸

[2] محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن الحارث الکلبی نسابہ متوفی ۱۴۶ھ / ۷۶۳ء (الاعلام ۳/۷)

[3] ابن الندیم: الفہرست (فارسی ترجمہ) ۲۶۹ - ۲۷۰

[4] انہوں نے عبد اللہ بن ادریس اور ابو معاویہ الضریر سے روایت کیا ہے اور ان سے ابن سعد اور احمد بن حنبل نے روایات لی ہیں یہ نحوی اور قاری تھے اور ثقہ تھے۔ یاقوت حموی معجم الادبا جلد ۸ صفحات ۲۰۱ - ۲۰۲ (طبع دار المستشرق بیروت)

۶۔ ھُشَیم ۔

۷۔ الفضل بن دُکَین ۔

۸۔ الولید بن مسلم ۔

۹۔ معن بن عیسیٰ ۔

علمائے رجال نے ان سب شیوخ کی عدالت پر گواہی دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن سعد نے جو کچھ سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ ہر طرح لائق اعتماد اور قابل استناد ہے اس لئے زمانہ مابعد کے تقریباً سب مورخوں نے ابن سعد کو مستند مانا ہے۔ خطیب بغدادی کا قول ہے:۔

"مُحَمَّدُ بْنُ سَعْدٍ عِنْدَنَا مِنْ اَهْلِ الْعَدَالَةِ وَحَدِيْثُهُ يَدُلُّ عَلَى صِدْقِهِ فَاِنَّهُ يَتَحَرّٰى فِي كَثِيْرٍ مِنْ رِوَايَاتِهِ"[1]	محمد بن سعد ہمارے نزدیک عادل راویوں میں سے ہے اسکی روایت ہی اس کی سچائی ظاہر کر دیتی ہے کیونکہ وہ اکثر روایات میں حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ابن خلکان نے بھی اُسے "صدوق وثقہ" بتایا ہے[2] اور ابن حجر العسقلانی نے أحدُ الحفّاظِ الکبارِ الثّقاتِ المُتَحرّین (حدیث کے بڑے، ثقہ، اور تحقیق کرنے والے راویوں میں سے ایک) لکھا ہے اور اس کے علم و فضل، فہم و فراست اور شرف کو سراہا ہے بلکہ لوگوں نے اُسے اُس کے استاد الواقدی پر فضیلت دی ہے۔ السّخاوی نے تو یہ لکھا ہے کہ اگرچہ اس کے استاد ضعیف ہیں مگر یہ خود ثقہ ہے[3]

---

[1] خطیب: تاریخ بغداد جلد ۵ ص ۳۲۱

[2] ابن خلکان: وفیات الاعیان ۱/۵۰۷۔

[3] محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد شمس الدین السّخاوی (۸۳۱-۹۰۲ھ / ۱۴۲۷-۱۴۹۷ء) مستند مورخ، حدیث، تفسیر اور ادب کے جید عالم تھے ان کا خاندان مصر کے ایک گاؤں سخا سے تعلق رکھتا تھا اس لئے السخاوی کہلاتے ہیں مگر یہ خود قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں وفات پائی۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی طویل سیاحت کی تھی اور تقریباً دو سو کتابیں تالیف کیں جن میں سے چند یہ ہیں: الضوءُ اللّامع فی أعیان القرن التاسع (مطبوعہ) بارہ جلدوں میں ہے اس میں السخاوی نے خود اپنا حال بھی لکھا ہے جو تقریباً ۳۰ صفحات میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ شرح الفیہ العراقی (مطبوعہ) یہ مصطلح حدیث میں ہے۔ المقاصد الحسنہ (مطبوعہ) یہ بھی فن حدیث میں ہے۔ القول البدیع فی احکام الصلوۃ عن الحبیب الشفیع (مطبوعہ) الاعلان بالتوبیخ لمن ذمّ التاریخ (مطبوعہ) یہ فن تاریخ نویسی کے موضوع پر ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد منور کا کیا ہوا، مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ مع مقدمہ فرینز روز نتھال نے (MUSLIM HISTORIOGRAPHY) کے نام سے چھاپا ہے۔
ان کی تصانیف میں التبر المسبوک (غیر مطبوعہ) ذیل لتاریخ المقریزی (جس کا کچھ حصہ چھپا ہے) وجیز الکلام فی الذیل علی کتاب الذہبی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

ہمیں ایسی صرف چند روایات ملتی ہیں جن سے ابن سعد کا ضعف کسی درجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابن سعد کے شاگرد الحسین بن فہم مصعب الزبیری کے پاس بیٹھے تھے ادھر سے یحییٰ بن معین کا گذر ہوا تو اُن سے مصعب نے کہا: "ابوزکریا۔ ہم سے محمد بن سعد الکاتب نے ایسا بیان کیا ......"

اس پر یحییٰ نے کہا: "جھوٹ بولا"

خطیب بغدادی نے اس روایت کی تاویل یوں کی ہے کہ جس روایت کو یحییٰ بن معین نے جھوٹ بتایا وہ اُن ضعیف روایات میں سے کوئی ہوگی جنھیں الواقدی بیان کیا کرتا تھا اور اسی قصے کی بنیاد پر ابن تغری بردی نے لکھا ہے۔

"وَثَّقَہُ جَمِیعُ الحُفَّاظِ مَاعَدَا یحییٰ بن مَعِین" انھیں یحییٰ بن معین کے سوا سب محدثوں نے ثقہ مانا ہے"

دوسری روایت میں ہے کہ ابن ابی حاتم نے اپنے باپ سے ابن سعد کے بارے میں پوچھا تو انہوں کہا "ٹھیک ہے"۔ یعنی زیادہ پُرزور الفاظ میں تعریف نہیں کی اور یہ کہا کہ میں نے اُسے دیکھا تھا کہ القواریری سے احادیث پوچھ رہا ہے۔

تیسری روایت ابن طیفور کے یہاں ہے کہ جب المامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو لکھا کہ سات فقہا کو میرے پاس بھیج دو۔ تو اُس نے جن فقہا کو دربار خلافت میں روانہ کیا ان میں سے ایک محمد بن سعد بھی تھے۔ یہ لوگ آئے تو المامون نے ان کا امتحان لیا اور اُن سے مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں پوچھا۔ ان سب نے قرآن کو "مخلوق" بتایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دول الاسلام (غیر مطبوعہ) الجواھر والدُّرر فی ترجمۃ شیخ الاسلام ابن حجر العسقلانی (غیر مطبوعہ) دو جلدوں میں، الکوکب المضیٔ (غیر مطبوعہ) جس میں اپنے بعض معاصروں کے تراجم لکھے ہیں، الجواھر المجموعہ (غیر مطبوعہ) فن ادب میں، التحفۃ اللطیفہ فی اخبار المدینۃ الشریفہ (غیر مطبوعہ) یہ مدینہ کی تاریخ ہے جسے وفاء الوفاء سے زیادہ ضخیم بتایا جاتا ہے۔

بُغیۃ العلماء والرواۃ (غیر مطبوعہ) کتاب رفع الاصر عن قضاۃ مصر کا ذیل (ضمیمہ) اسی طرح "الذیل علی طبقات القراء" لابن الجزریؒ (غیر مطبوعہ) اور العنایہ فی شرح الھدایہ (غیر مطبوعہ) عمدۃ القاری والسامع (غیر مطبوعہ) فن حدیث میں۔ القول التام فی فضل الرمی بالسہام (غیر مطبوعہ) الشافی من الألم فی وفیات الأمم فی القرنین الثامن والتاسع (آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں وفات پانے والے اعیان اکابر کے تراجم) تاریخ المدینتین، التاریخ المحیط، الطبقات المالکیہ تلخیص تاریخ الیمن تلخیص طبقات القراء، الرحلۃ السکندریۃ، الرحلۃ الحلبیۃ، الرحلۃ المکیہ وغیرہ ہیں۔

حالات وتفصیلات کے لئے ملاحظ ہوں: الاعلام ۷/ ۶۷-۶۸ الضوء اللامع ۸/ ۲-۳۲ / الکواکب السائرہ ۱/ ۵۳ - شذرات الذھب ۸/ ۱۵، خطط مبارک ۱۲/ ۱۵، النور السافر ۱۶ ، ابن ایاس ۲/ ۳۲۱ ، تاریخ العراق ۳/ ۱۴ ، آداب اللغۃ ۳/ ۱۶۹، الفہرس التمہیدی ۳۸۱ ، ایضاح المکنون ۱/ ۲۷ ، ۲۳۸ ، بروکلمان ۲/ ۴۳ (۳۴) ضمیمہ ۲/ ۳۱

اگر یہ حکایت صحیح ہے تو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے اپنی شہرت سے بغداد میں کیا فائدہ اٹھایا اور دوسرے بظاہر ہے کہ طبقۂ محدثین اس سے خوش نہیں رہا ہوگا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ احمد بن حنبل جو فتنۂ خلق قرآن کے سب سے بڑے مخالف تھے، اُن سے ابن سعد کے تعلقات خوشگوار تھے کیوں کہ ایسی روایت بھی ملتی ہے کہ احمد بن حنبل ہر جمعہ کو ایک آدمی ابن سعد کے پاس بھیجا کرتے تھے جو الواقدی کے روایات کے دو جُزء لے جاتا تھا جنھیں ابن حنبل پڑھنے کے بعد اگلے جمعہ کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ اور اُن سے آگے کے اجزاء منگا لیتے تھے۔

وفات ابن سعد کے تلامذہ میں احمد بن عبید ابن ابی الدنیا، البلاذری الحارث بن أبی اُسامہ اور الحسین بن فہم وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ ابن الفہم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے ۴ جمادی الثانیہ سنہ ۲۳۰ھ کو ہفتہ کے دن بغداد میں انتقال کیا اور مقبرہ باب الشام میں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔

مگر ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ وہ ۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ الصفدی نے سال وفات ۲۲۲ھ لکھا ہے۔ لیکن ان سب میں ابن الفہم کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ابن سعد کے ان دو شاگردوں میں سے ایک ہے جنھوں نے طبقات کی روایت کی ہے اور الصفدی کی روایت کا غلط ہونا اسی سے ثابت ہے کہ طبقات میں اُن حضرات کے تراجم بھی موجود ہیں جنھوں نے ۲۲۸ھ یا ۲۲۹ھ میں وفات پائی[1] اور ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ تراجم بعد میں ناقلوں نے اضافہ کر دیے ہیں۔ ابن ابی الحاتم کی روایت میں سال وفات ہندسوں میں ملتا ہے لفظوں میں نہیں اور ہندسوں میں غلطی ہو جانا بخوبی ممکن ہے۔

(۳)

ابن سعد نے صرف حدیث، اخبار، سیرۃ اور مغازی ہی پر توجہ مبذول نہیں کی بلکہ اس نے غریب الحدیث اور فقہ کے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ نحویوں اور لغویوں سے اس کے تعلقات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس میدان میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ ابو زید الانصاری سے اس کے تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح محمد بن سعدان الضریر[2] (۱۶۱ - ۲۳۱ھ) مشہور قاری تھے اُن سے ابن سعد کا تعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس نے قرأتوں کے اختلاف کا علم بھی حاصل کیا ہوگا۔

---

[1] مثلاً: طبقات ابن سعد ج ۵/ ۳۲۶۔

[2] محمد بن سعدان کوفہ کے باشندے اور نابینا تھے یہ نحو کے علاوہ اختلاف قرأت میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اس موضوع پر اُن کی بعض تالیفات بھی ہیں جن میں الجامع اور المجرّد کے نام ہمیں معلوم ہیں۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہوں:

نکت الهمیان ۲۵۲ - بغیۃ الوعاۃ ۴۵ - غایۃ النہایۃ ۲/ ۱۴۳ - تاریخ بغداد ۵/ ۳۲۴۔

نزہۃ الالبّاء ۲۱۲، معجم الادباء ۱۸/ ۲۰۱ - ۲۰۲، الزرکلی ۷/ ۸

ابن الجزری کا بیان ہے کہ قرآن کی سات قراءات (سبعۃ اُحرُف) کی روایت ابن سعد نے الواقدی سے، اور ابن سعد سے الحارث بن ابی اُسامہ نے کی ہے۔

فنِ تراجم رجال میں ابن سعد کا وسیع علم یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ علم الانساب کا بھی ماہر رہا ہوگا چنانچہ اس نے جن رجال کے تراجم لکھے ہیں اُن کی اولاد و اعقاب کا حال بھی لکھتا ہے اور اگر وہ غیر معقب (لا ولد) رہے ہیں تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں اُس نے اپنے استاد الواقدی کے علاوہ ابن اسحٰق، ابن عُمارۃ الانصاری اور ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات بھی درج کی ہیں۔ موخر الذکر سے ابن سعد نے کتاب "جمہرۃ الانساب" کی روایت کی ہے۔

طبقات اور اُن کی تدوین

"طبقات" دراصل تراجم رجال کی تدوین کا وہ طریقہ ہے جس میں افراد کے نام اُن کی پشتوں کے یا طبقات کے لحاظ سے درج کئے جاتے ہیں۔ مثلاً طبقہ محدثین، طبقہ فقہاء، طبقہ مفسّرین وغیرہ۔ یا انھیں شہروں کی رعایت سے تقسیم کیا جاتا ہے: کوفی، بصری، شامی، مدنی وغیرہ۔ ابن سعد نے تراجم کو اصحاب اور تابعین کے طبقات میں تقسیم کیا اور پھر اُن کی ذیلی تقسیم علمی و دینی مراکز کے اعتبار سے کی ہے۔

کتاب الطبقات الکبیر یا الطبقات الکبری جسے عام طور پر "طبقات ابن سعد" کہا جاتا ہے ایک ضخیم کتاب ہے جس کا ابتدائی خاکہ پندرہ جلدوں میں تھا اور اس کا مقصد اُن رجال کے تراجم اور اُن کے بارے میں مستند روایات جمع کرنا تھا جن کے نام تاریخ اسلام میں آتے ہیں یا جنھوں نے ابتدائی مغازی میں شرکت کی تھی یا جن کے وسیلے سے علوم اسلامیہ کی اشاعت ہوئی یا جو لوگ ابن سعد کے زمانے تک مختلف میدانوں میں سرگرم عمل تھے۔

اس کتاب کو اس نے اپنے استاد الواقدی کی "کتاب الطبقات" کے نمونے پر ترتیب دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الواقدی کی کتاب کا بڑا حصہ بھی طبقات ابن سعد میں آ گیا ہے اور اس پر اُن روایات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ابن سعد نے بطور خود دوسرے شیوخ سے یا کتابی مآخذ سے فراہم کی ہوں گی۔ اس طرح ابن سعد کی کتاب الطبقات اتنی جامع ہو گئی ہے کہ پہلی دو صدیوں میں اصحاب رسولؐ، تابعین اور تبع تابعین کی تمام علمی و سیاسی اور دینی سرگرمیوں کے بارے میں اس سے زیادہ مستند معلومات کا دوسرا کوئی ذخیرہ نہیں ہے اور مختلف روایات کے اندر ایسی ضمنی اور جزوی تفصیلات آ گئی ہیں جنھیں باہم جوڑ کر ہم اس عہد کے اسلامی معاشرہ کی ایک واضح تصویر تیار کر سکتے ہیں۔

الواقدی کی توجہ صرف معلومات کی کثرت کی طرف رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ روایات جمع کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے جرح و تعدیل رُواۃ کے جو اُصول بنائے ہوں گے اُن میں لچک پیدا کرنا ضروری تھا۔ اسی لئے اس نے ایسی روایات بھی اخذ کر لی ہیں جن کی موجودگی میں بعض حضرات نے اس شُبہ کا اظہار کیا ہے کہ وہ مسلکاً شیعی

تھالے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب میں رطب و یابس سبھی وافر مقدار میں بھرا ہوا ہے۔ الواقدی کی بہ نسبت ابن سعد کا رجحان جزئیات، توسّع اور تنوع کی طرف ہے اسی لئے اُس کی کتاب میں بعض ایسے ابواب ملیں گے جو اتنی تفصیل اور کثرت روایات کے باوجود الواقدی کے یہاں بھی نہیں ہیں مثلاً:

ذکر کُنیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ ذکر ما کانَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یعوذبہ ویعوذبہ جبریل[۲] وغیرہ

الواقدی نے عہدِ جاہلیت کی تاریخ کی طرف بھی بہت کم التفات کیا ہے۔ اسی لئے قدیم انساب اور تاریخ انبیاء کے ابواب میں ابن سعد کے ہاں ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات غالب ہیں۔ اور جن روایتوں میں الواقدی کا نام نہیں آیا ہے وہ غالباً ابن سعد کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

الواقدی کی روایات کی کثرت کو دیکھتے ہوئے ابن الندیم کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے الواقدی کی تصانیف سے اپنی کتابیں مرتب کی ہیں۔ چنانچہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم[۳] کی خدمت میں قبائل عرب کے وفود کی آمد کا حال اور تفاصیل درج ہیں وہاں اکثر الواقدی اور الکلبی کی روایات بھی ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

ابنِ سعد کے دوسرے مآخذ

الواقدی کی کتاب الطبقات کے علاوہ ابنِ سعد نے دوسرے مصادر سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے ان میں:

۱۔ کتاب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۲۔ کتاب وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ کتاب اخبار مکّہ
۴۔ کتاب السیرہ
۵۔ کتاب طعم النبی
۶۔ کتاب المغازی

خاص طور سے نمایاں ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب المغازی کا تو بڑا حصہ طبقات ابنِ سعد میں ضم ہو گیا ہے لیکن ابنِ سعد نے صرف اسی پر

---

[۱] اس کی بحث ہم نے دوسرے موقع پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو" سیرۃ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین" میں الواقدی کا ترجمہ اور اس پر ہمارا حاشیہ۔

[۲] طبقات ابنِ سعد ۱-۱ : ۶۶۔

[۳] طبقات ابن سعد ۲-۱ / ۱۴۔

اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مصادر سے حاصل ہونے والی معلومات اس پر اضافہ کر دی ہیں ان میں رُوَیم بن یزید المُقری سے مغازی ابن اسحق کی روایات اخذ کی ہیں۔[1]

بعض دوسری روایات ابو معشر السندی کی کتاب المغازی پر منتہی ہوتی ہیں۔

تیسرا راوی اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی اُویس مدنی ہے جس نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کو روایت کیا ہے۔

اس طرح سیرۃ نبوی والا حصہ گویا مغازی کے موضوع پر لکھی جانے والی چار اولیں کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوسری متفرق روایات اور دوسری تالیفات کے اقتباسات طبقات ابن سعد میں کثرت سے آئے ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحق دونوں الزھری کے شاگرد ہیں اور الواقدی کی روایات میں سے ایک کا اتصال الزُھری تک بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ الواقدی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحق کی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے کہیں ان کا نام لیا ہے اور کہیں نہیں لیا۔ اس طرح ابن سعد کی بہت سی روایتوں کا بنیادی مصدر ایک ہی ہو جاتا ہے۔

---

[1] محمد بن اسحق بن یسار (وفات ۱۵۰ یا ۱۵۱ یا ۱۵۲ھ) مقابر خیزران (بغداد) میں ابو حنیفہ کی قبر کے پاس مدفون ہیں انہوں نے سب سے پہلے سیرۃ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مغازی کی تالیف کی۔ یہ عاصم بن عمر بن قتادہ، یزید بن رومان، محمد بن ابراہیم، ابن شہاب الزھری، الاعمش، فاطمہ بنت المنذر بن الزبیر (زوجہ ہشام بن عروہ) وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ مدینہ چلے گئے تو ابراہیم ابن سعد کے سوا کوئی ان سے روایت نہ کرتا تھا پھر العباس بن محمد کے ساتھ الجزیرہ (عراق) آئے اور یہاں کے لوگوں نے ان سے مغازی کی سماعت کی پھر رَے میں گئے تو یہاں کے راویوں نے ان سے خوب روایات اخذ کیں۔ پھر بغداد میں آکر مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ان پر قدری اور شیعہ ہونے کا الزام بھی ہے۔ احمد بن یونس کا قول ہے کہ اصحاب مغازی سب شیعہ میلانات کے ہیں جیسے ابن اسحق، ابو معشر، یحییٰ بن سعید اُموی وغیرہ اسی طرح اصحاب تفسیر جیسے السدی اور الکلبی۔ یاقوت حموی کہتا ہے کہ محمد بن اسحق کے لیے اشعار گھڑے جاتے تھے جنھیں وہ موقع بموقع اپنی کتب مغازی میں ٹانک دیتا تھا اس سے راویوں میں وہ نکو بن گیا۔ اس نے انساب کے اندراج میں بھی اکثر غلطی کی ہے اور وہ یہود و نصاریٰ کی روایات بھی بے تکلف قبول کر لیتا تھا اور ان لوگوں کو اپنی کتاب میں "اہل العلم الاول" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ اصحاب حدیث اُسے ضعیف سمجھتے ہیں اور اس پر یہ اتہام لگانے میں۔ اس کی کتاب الخلفاء الاموی نے روایت کی ہے اور کتاب المبتدا، ابراہیم بن سعد اور محمد بن عبداللہ بن نُمیر النفیلی (ف ۲۳۴ھ) نے۔ (ملاحظہ ہو معجم الادباء جلد ۱۸ ص ۵-۸ طبع بیروت)

شجرۂ روایت
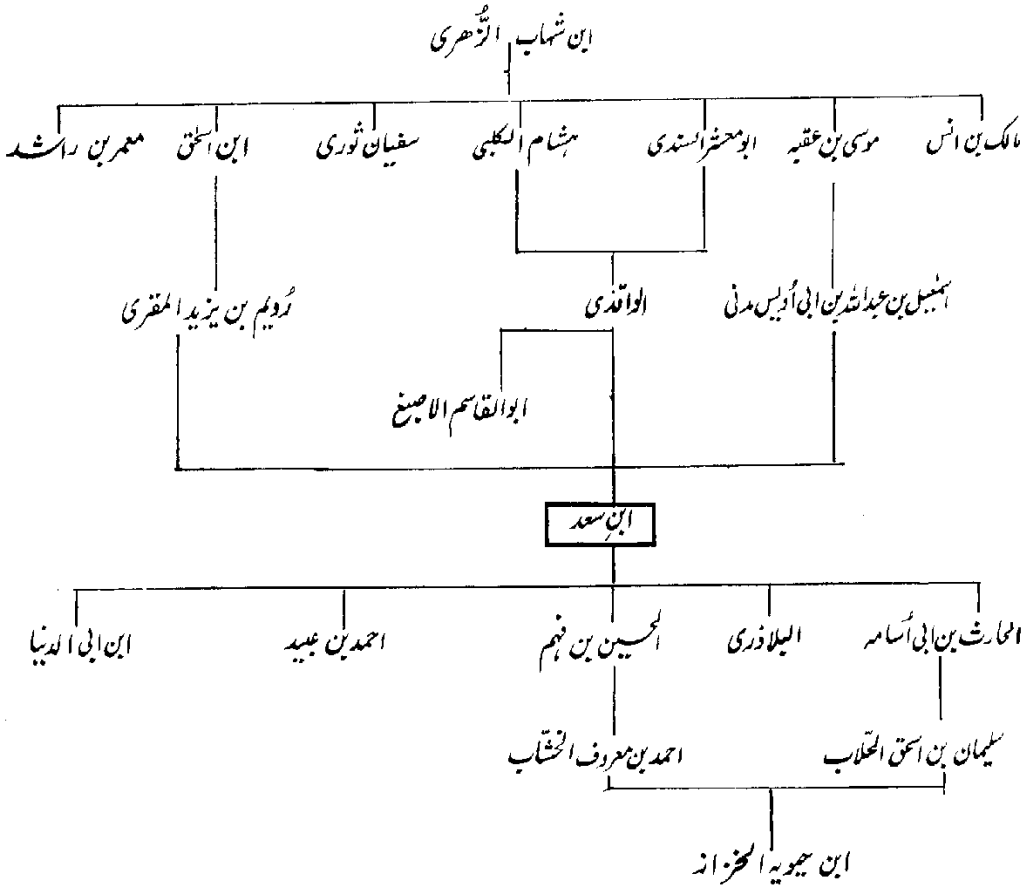
اس سے ظاہر ہے کہ ابن سعد کے رُواۃ میں کم از کم تین راوی ایسے ہیں جنھیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے یعنی: ہشام بن محمد بن السائب الکلبی، الواقدی اور ابو معشر السندی۔ ہشام الکلبی کے بارے میں محدثین کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے باپ محمد بن السائب الکلبی سے زیادہ ثقہ ہے اگرچہ وہ اپنے باپ ہی کی روایات نقل کرتا ہے۔

الواقدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً بیس ہزار غریب احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی ہیں اور دوسری بے سروپا باتوں کی روایت بھی کرتا ہے۔ ابو معشر کے بارے میں خود ابن سعد نے لکھا ہے " کان کثیر الحدیث ضعیفاً" (وہ حدیث کی بہت زیادہ روایت کرنے والا، مگر ضعیف تھا) اس کے باوجود سب نے اُسے مغازی میں ثقہ مانا ہے۔

فن حدیث میں علمائے سیرۃ و اخبار کی حیثیت پر جرح و تعدیل کرتے ہوئے محدثین نے اپنے خاص اصولوں کی پابندی کی ہے اور کہیں کہیں وہ زیادہ سخت گیر بھی ہو گئے ہیں خود الواقدی کو ایک جماعت نے قابلِ اعتماد مانا ہے اور اس کے علم و فضل کا بھی سب نے اعتراف کیا ہے۔ ابن سلام الجمحی کا قول لکھا ہے کہ :

" محمد بن عمر الواقدی عالم دھرہ " محمد بن عمر الواقدی اپنے زمانے کا جید عالم تھا "

امام مالک کو جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ الواقدی سے سوال کیا کرتے تھے۔ الدّراوردی نے اُسے" امیر المومنین فی الحدیث" کہا ہے۔ مصعب زبیری کا قول ہے کہ ہم نے اُس کا ثانی نہیں دیکھا ۔" واللہ ما رأینا مثلہ قط"

ایک مورخ کی حیثیت سے الواقدی کو اپنے منصب اور ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اُس نے اُن تمام مقامات کی زیارت کی اور ہر جگہ کو بچشم خود وہاں جا کر دیکھا، جن مقامات کا مغازی کی روایتوں میں نام آتا ہے۔ بعض لوگوں نے شہادت دی ہے کہ ہم نے اُسے "حنین" کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا جہاں وہ میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھنے گیا تھا۔

محدثین نے جس کوتاہی کے لیے الواقدی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہ عیب اُس کے شاگرد ابن سعد کے ہاں بھی موجود ہے یعنی وہ بہت سی سندوں کو یک جا کر کے سب کی روایتوں سے ایک مجموعی روایت بنا لیتا ہے اور ایک راوی کے بیان میں دوسرے کا بیان شامل کر دیتا ہے اس کا مقصد بظاہر کثرتِ روایات کی وجہ سے ایجاز و اختصار کی راہ اختیار کرنا ہے یعنی کچھ عبارتیں اور واقعات متعدد روایتوں میں مشترک ہوتے ہیں اُن کا بار بار دُہرانا لاحاصل ہے۔ کچھ جزئیات ایک روایت میں ہوتی ہیں دوسری میں نہیں ہوتیں، اس لیے وہ تمام روایتوں کا مشترک حصّہ یک جا کر دیتا ہے اور اس میں ہر روایت کی انفرادی اطلاع کو سمو دیتا ہے اور سب کی سندیں یک جا کر دیتا ہے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے اوّلین راوی جن سے میں نے اخذ کیا ہے یہ لوگ ہیں اور وہ رُواۃ زیادہ تر معروف اشخاص ہوتے ہیں۔ ابن سعد کے زمانے تک علمائ بہ آسانی یہ امتیاز کر لیتے ہوں گے کہ کون سی روایت اور کون سی تفصیل کس راوی نے بیان کی ہو گی اور اسی واقعہ سے متعلق، دوسرے راوی کے بیان میں کیا کمی بیشی پائی جاتی ہے لیکن آج ہمارے لیے یہ امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ طریقہ سند نہ ہونے کی برابر ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے راوی کی ذمہ داری متعین نہیں ہو پاتی ۔

لہ محمد بن سلام (بہ تشدید لام) (۱۵۰ - ۲۳۲ھ / ۷۶۷ - ۸۴۶ء) بن عبید اللہ الجمحی (بہ نسبت ولایت) ابو عبد اللہ، فن ادب میں امام عصر مانا جاتا ہے یہ بصرہ کا باشندہ تھا۔ بغداد میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے جن میں طبقات الشعرا الجاہلیین والاسلامیین، بیوتات العرب، غریب القرآن بھی ہیں۔ یہ عقیدے کے اعتبار سے قدری تھا اس لئے محدثین نے کہا کہ اس سے اشعار کی روایت کرو۔ حدیث کی نہیں۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو: ارشاد الاریب ۷/۱۳ ابن الندیم ۱۱۳، میزان الاعتدال ۳/۶۶ لسان المیزان ۵/۱۸۲، تاریخ بغداد ۵/۳۲۷، طبقات النحویین ۱۹۷، بغیۃ الوعاۃ ۴۷ الوافی بالوفیات ۳/۱۱۴ نزہۃ الالبا ۲۱۶، کتاب اللباب ۱/۲۳۶، طبقات فحول الشعرا، کتاب الاعلام ۷/۱۶ ۔

الواقدی خود مدینہ کا باشندہ ہے۔ اسی طرح موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحٰق اور ابومعشر بھی "مدینہ اسکول" کے راوی ہیں اس لیے ابن سعد کو بھی اسی دبستانِ روایت کا نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔

الواقدی کے بغداد میں قیام پذیر ہوجانے سے سیرۃ نگاری کا مدنی دبستان بھی بغداد کو منتقل ہوگیا تھا۔ ابن اسحٰق اور ابومعشر بھی وہیں رہے پھر ابن سعد نے الواقدی کا علم حاصل کیا۔ ان شیوخ میں سے تقریباً سبھی کسی نہ کسی حیثیت میں عباسی دربار خلافت سے متمتع ہو رہے تھے۔ ابن سعد اور ابومعشر نے تو عباسیوں سے نسبتِ ولاء قائم کر لی تھی اور ابن اسحٰق اور الواقدی کو دربار سے مدد معاش ملتی تھی۔

دراصل بعض ابتدائی کوششوں یا استثنائی صورت حال کو چھوڑ کر۔ امویوں کے زمانے میں سیرۃ و مغازی کی تدوین کا زیادہ اہتمام بھی نہیں ہوا۔ ڈی ایس مرجولیث (D. S. MARGOLIOUTH) کا خیال ہے کہ سیرۃ کی تدوین اُمویوں کے سیاسی مقاصد کے خلاف ہوتی کیوں کہ اس میں خاندان بنوہاشم اور حضرت علی کی خدمات اور فضائل و مناقب کا بیان ہونا ناگزیر تھا، اسی لئے اُمویوں نے دورِ جاہلی کے ادب و شعر اور ملوک عجم کے قصص و سیر پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی اور مغازی و سیرۃ کی تدوین کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ تاریخ صدر اسلام کی کوئی کتاب سرکاری سطح پر مدون نہیں ہوئی لیکن ان مورخوں کو عباسی خلفاء کے زمانے میں شاہی سرپرستی اور اقتصادی امداد برابر ملتی رہی۔

(۴)

تقسیم طبقات

ابن سعد نے اپنی کتاب کی پہلی دو جلدوں کو سیرۃ نبوی کے لئے وقف کیا ہے اس کے بعد اُن حضرات کا بیان ہے جو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ میں فتوی دیتے تھے۔ پھر اصحاب رسول اور تابعین کے تراجم ہیں اور یہ اس کتاب کے باقی تمام اجزاء پر پھیلے ہوئے ہیں آخری جلد صرف خواتین کے حالات پر مشتمل ہے۔

طبقات کی تقسیم دو طرح پر ہوئی ہے۔

۱۔ زمانی تقسیم ۲۔ مکانی تقسیم

رعایت زمانی (CHRONOLOGICAL ORDER) تو اِن تراجم میں شروع سے آخر تک ملحوظ رہی ہے، اس میں سب سے پہلے اُن صحابہ کے حالات ہیں جنھیں اسلام لانے کا شرف پہلے نصیب ہوا اور جو "السابقون الاوّلون" کہلاتے ہیں یہ وہ اصحاب ہیں جنھوں نے ہجرت حبشہ میں حصہ لیا یا فتح مکہ سے قبل اسلام لائے وغیرہ۔

اسی طرح مہاجرین و انصار میں سب سے پہلے بدری اصحاب کو لیا ہے کیونکہ بدر میں حصہ لینے والوں کی فضیلت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

طبقات کی ایسی تقسیم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دواوین کی تیاری میں کیا تھا۔

اس زمانی تقسیم کے بعد مکانی تقسیم ہے اس میں اصحاب و تابعین کا تذکرہ اُن کے شہروں کے لحاظ سے کیا گیا ہے مثلاً مکہ، مدینہ، طائف، یمن، یمامہ، کوفہ، بصرہ، دمشق اور مصر وغیرہ۔ اس مکانی ترتیب میں بھی زمانی درجہ بندی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک طبقہ میں عموماً ایک نسل یا دس بیس سال کی مدت حاوی ہوتی ہے۔ ابن سعد کے ہاں دو طبقوں کے درمیان اوسطاً بیس سال کا زمانی بُعد پایا جاتا ہے مثلاً تیسرا طبقہ ۱۰۱ھ سے ۱۱۳ھ تک پھیلا ہوا ہے اور چوتھے طبقے میں ۱۲۶ھ سے ۱۳۲ھ تک کے تراجم درج ہوئے ہیں۔

اس تقسیم میں ایک عیب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کا حال متعدد مقامات پر آ سکتا ہے مثلاً کوئی صحابی بدری تھے، ایام رسولؐ میں فتوی دیتے تھے اور پھر کسی دوسرے شہر میں جا کر بس گئے تھے، اس صورت میں لامحالہ اُن کا ترجمہ تینوں طبقات میں درج ہو گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد کو بھی اس دشواری کا احساس تھا اور اس کا علاج اُس نے یہ سوچا کہ ایسی شخصیت کا ترجمہ ایک طبقہ میں تفصیل سے درج کر دیتا ہے اور دوسرے طبقات میں صرف چند امور کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔

روایات کے حصول میں ابن سعد نے خود کو اتنا منہمک رکھا ہے کہ صحابہ کے حالات وہ خاصی تفصیل سے قلمبند کرتا ہے اور ہر صحابی کے بارے میں متعدد روایات یک جا کر دیتا ہے مگر جیسے جیسے وہ اپنے زمانے سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، تراجم میں تفصیلات کا رجحان بھی کم تر ہوتا چلا گیا ہے حالانکہ اُسے اپنے معاصرین کے حالات لکھنے میں سب سے زیادہ تفصیل کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔

خود ابن سعد کی شخصیت اِن روایات میں کہیں نمایاں نہیں ہوتی اُس نے اپنی ذات کو سندوں کے پیچھے چھپا دیا ہے بلکہ اکثر عبارت پڑھتے ہوئے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اس کا راوی محمد بن سعد ہے یا اس کا کوئی شاگرد (مثلاً الحارث بن ابی اُسامہ) روایت کر رہا ہے۔ ایسے مواقع پر سند اس طرح آتی ہے۔" حدثنا محمد بن سعد . . . ." گویا اصل راوی وہ نہیں بلکہ اس کا شاگرد ہو گیا ہے۔

اس کتاب میں بہت سی موضوع روایات بھی داخل ہو گئی ہیں اور ایسا ہر اُس کتاب میں ہونا بالکل فطری بات ہے جس کی بنیاد زبانی روایات پر رکھی گئی ہو۔

اکثر روایات پر ابن سعد نے تعلیقات یا (NOTES) نہیں لکھے ہیں مگر کہیں کہیں وہ محاکمہ کرتا ہوا ملتا ہے اور اگر دو روایتیں معارض ہوتی ہیں تو اپنی رائے یا ترجیح کا اظہار کر دیتا ہے مثلاً معد بن عدنان کے نسب میں علماً کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اس پر ابن سعد نے حاشیہ دیا ہے۔

ولم أر بينهم إختلافاً [1]

اسی طرح وہ ہشام الکلبی سے روایت لیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا جب انتقال ہوا تو حضور کی عمر ۲۸ ماہ تھی۔ بعض نے سات ماہ بیان کی ہے مگر ابن سعد کہتا ہے:

"والأول أثبت أنه توفي ورسول الله صلى الله عليه وسلم حمل" [2]

اور پہلی روایت زیادہ ثابت ہے کہ جب والد ماجد کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطن مادر میں تھے۔

---

[1] الطبقات ۱-۱/ ۲۹، ۶۲، ۶۴، ۷ ، [2] الطبقات ۱-۱/ ۶۲ -

اسی طرح ایک روایت آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لے گئے اور وہاں روئے ۔ ابن سعد کہتا ہے کہ یہ غلط ہے :

لیس قبرھا بمکۃ وقبرھا بالابواء[1] — اُن کی قبر مکہ میں نہیں بلکہ ابواء میں ہے ۔

یا مثلاً حمید بن عبدالرحمٰن کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ انہوں نے ۱۰۵ھ میں انتقال کیا مگر یہ غلط ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔ ۹۵ھ صحت سے زیادہ قریب ہے ۔[2]

وہ ہشام الکلبی سے نقل کرتا ہے کہ جنگ بدر میں السائب بن مظعون شریک تھے عثمان بن مظعون نہیں ۔ اُس پر یہ نوٹ دیتا ہے :

وذلک عندنا منه وھل لأن اصحاب	اور ہماری رائے میں یہ اُس سے چُوک ہوئی ہے اس
السیرۃ ومن یعلم المغازی یثبتون	لیے کہ سیرۃ نگار اور جو لوگ مغازی کا علم رکھنے والے ہیں
السائب بن عثمان بن مظعون فیمن	وہ سب السائب بن عثمان بن مظعون کا نام اُن لوگوں
شھد بدرًا وشھد أحدًا والخندق	کی فہرست میں درج کرتے ہیں جنھوں نے بدر، احد، خندق
والمشاھد کلھا[3]	اور دوسرے تمام مشاہد میں حصہ لیا تھا ۔

ابن سعد اپنی روایات میں اشعار کا استعمال بھی خاصی مقدار میں کرتا ہے مگر یہ بہر حال ابن اسحٰق سے بہت کم ہیں جس کی کتاب المغازی کا پانچواں حصہ شاعری پر مشتمل ہے اور یقیناً اس نے الواقدی کی بہ نسبت بھی اشعار کم استعمال کئے ہیں ۔

طبقات کی اہمیت

ابن سعد کی اس تالیف کتاب الطبقات الکبیر کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اس سے پہلے طبقات کے موضوع پر الواقدی کی تالیف کے سوا اور کسی کتاب کا نام ہمیں نہیں ملتا ہے اور الواقدی کی یہ تالیف ناپید ہو چکی ہے ۔ اس حیثیت سے یہ سب سے قدیم ماخذ اور تاریخ اسلامی کے مصادر میں نہایت قیمتی حوالے کی کتاب ہے اس کے بعد تو اسماء الرجال کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن ابن سعد کے سامنے الواقدی کی تصنیف کے سوا دوسرا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا ۔

طبقات کی تقسیم کے انداز پر جو کتابیں بعد کو لکھی گئیں، ابن سعد اُن سب کے لئے نمونہ بنا رہا اور تقریباً سب مؤلفین نے ابن سعد سے خوشہ چینی کی ہے خواہ اس کا حوالہ انہوں نے دیا ہو یا نہ دیا ہو ۔

البلاذری (صاحب فتوح البلدان) کے ابن سعد سے گہرے مراسم تھے چنانچہ 'انساب الاشراف' اور 'فتوح البلدان' دونوں

---

[1] الطبقات ۱-۱/۷۴، معجم البلدان ۱/۷۹ ۔

[2] الطبقات جلد ۵/۱۱۵ ۔

[3] الطبقات ۳-۱/۲۹۲ ۔

پر ابن سعد کا واضح اثر موجود ہے۔
سیرۃ میں بھی ابن سعد نے جو فصول قائم کی ہیں اور جس طرح کے ابواب میں سیرۃ کے مواد کو تقسیم کیا ہے، بعد میں آنے والے سیرۃ نگاروں نے اسی انداز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں مثلاً ابو نعیم اور البیہقی وغیرہ
ابو نعیم الاصبہانی کی کتاب 'حلیۃ الاولیا' کا انداز (PATTERN) وہی ابن سعد والا ہے اور اسناد کا بھی وہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے جو ہمیں ابن سعد کے ہاں ملتا ہے۔
مگر اس پہ حیرت ہے کہ ابن عبد البرّ القرطبی نے الاستیعاب میں طبقات ابن سعد سے استفادہ کا اعتراف نہیں کیا بلکہ وہ کہتا ہے میں نے طبقات الواقدی سے فائدہ اُٹھایا ہے جسے محمد بن سعد نے اور اُن سے ابراہیم بن موسیٰ بن جمیل نے روایت کیا ہے۔ مؤخر الذکر راوی اندلس کا باشندہ ہے یہ مشرق کی طرف ہجرت کر گیا تھا وہاں احمد بن حنبل، ابن ابی الدنیا، ابن قتیبہ اور ابن سعد سے سماعت کی تھی اندلسیوں میں ابن سعد کی شہرت زیادہ نہیں تھی بلکہ طبقات الواقدی سے علماء زیادہ واقف تھے چنانچہ الکلاعی البلنسی نے اپنی کتاب الاکتفاء میں ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ، الواقدی اور مصعب الزبیری کے حوالے تو دیے ہیں مگر ابن سعد اور اس کی طبقا کا کہیں نام تک نہیں لیا۔ البتہ دوسرے اندلسی عالم ابن ابی بکر (متوفی ۷۴۱ھ) نے اپنی کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان میں ابن سعد سے نقل کیا ہے یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے[1]
ابن الاثیر مؤلف 'اُسد الغابہ' نے اپنی کتاب میں ابن مندہ، ابو نعیم ابن عبد البرّ اور حافظ ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر بن ابی عیسیٰ الاصبہانی کی تالیفات سے اخذ کیا ہے۔ گویا ابن سعد کی کتاب سے بالواسطہ فائدہ اٹھایا ہے مگر اس کا نام نہیں لیا یہ تجاہل معنی خیز ہے۔
ابن عساکر کی تاریخ دمشق، الذہبی کی تاریخ الاسلام اور تجرید اسماء الصحابہ و سیر اعلام النبلاء اور الاصابہ، تہذیب التہذیب وغیرہ کے اہم ترین مصادر میں سے ایک طبقات ابن سعد بھی ہے ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں بھی اس سے اقتباسات لئے ہیں۔ ابن تغری بردی نے اعتراف کیا ہے کہ النجوم الزاہرۃ میں ہم نے طبقات سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح المقریزی کی کتاب امتاع السماع اور دوسری کتب رجال کا حال ہے کہ ان سب نے طبقات ابن سعد سے خوب استفادہ کیا ہے۔
ابن سعد کی کتاب کا کچھ حصہ ہمیں الحارث بن ابی اُسامہ کی روایت سے ملا ہے اور کچھ الحسین بن فہم سے پہنچا ہے یہ دونوں ابن سعد سے روایت کرتے ہیں اور الحارث نے براہ راست الواقدی سے بھی روایت کی ہے الحارث سے ابو ایوب سلیمان بن اسحٰق الجلاب نے اور ابن فہم سے ابو الحسن احمد بن معروف الخشاب نے روایت کی ہے۔ یہ دونوں روایتیں ابو الحسن ابن حیویہ الخزاز کے پاس جمع ہو گئیں اور پھر متعدد راویوں نے ان کو پھیلایا حتیٰ کہ محدث شام شمس الدین ابو الحجاج یوسف بن خلیل دمشقی سے شرف الدین محمد بن عبد المومن الدمیاطی تک سلسلہ مل گیا۔

---

[1] اس مطالعہ کے اس حصہ میں، اور بعض دوسرے مواقع پر بھی ہم نے مارسیدن جونس کے مقدمہ کتاب المغازی اور الطبقات الکبیر (طبع بیروت) کے مقدمہ سے استفادہ کیا ہے۔

کتاب الطبقات الکبیر پچھلی صدی تک غیر مطبوعہ تھی اور بہت سے علماء کی اس تک رسائی نہیں تھی۔ ۱۹۰۳ء میں جرمن مستشرقین کی ایک جماعت نے طبقات کی ترتیب و تحقیق متن کا کام شروع کیا یہ ایڈورڈ زخاؤ[1] (E. SACHAU) کی نگرانی میں ہوا مختلف جلدوں کی ترتیب میں جن علماء نے اعانت کی ان میں جوزف ہورووٹس (JOSEPH HOROVITZ)، متوح بروکلمان (KARL BROCKLEMANN) شوالے (SCHWALLEY) لیبرٹ (LEBRET) میسنر، استرستین[2] KARL VILHELM ZETTERSTEEN وغیرہ شامل ہیں۔ ان حضرات کے سامنے طبقات کے پانچ مخطوطات رہے جن کی تفصیل طبقات کے مقدمہ (جرمنی) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

---

[1] کارل ایڈورڈ زخاؤ (KARL EDWARD SACHAU) [۱۸۴۵-۱۹۳۰ء] جرمن مستشرق، ۱۸۶۹ء میں جامعہ ویانا میں سامی زبانوں کا استاد مقرر ہوا اور ۱۸۷۶ء میں برلن یونیورسٹی میں مشرقی لغات کا، شام اور عراق میں طویل سفر کئے اور جرمن میں ایک سفر نامہ لکھا۔ برلین میں مدرسہ شرقیہ قائم کیا۔ البیرونی کی الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ شائع کی اور ماللہند من مقالہ بھی۔ طبقات ابن سعد کی چار جلدیں اس نے مرتب کیں بعد میں دوسروں نے اس کام کی تکمیل کی۔ اسی طرح الجوالیقی کی المعرب من الکلام الاعجمی بھی ایڈٹ کی۔

الاعلام ۶/۶۴ المستشرقون ۱۱۸

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (۱۹۲۹ء)

معجم المطبوعات ۱۰۱۵

[2] کارل ولہلم استرسٹین (KARL VILHELM ZETTERSTEEN) (۱۸۶۶-۱۹۵۳ء) مشہور مستشرق، سویڈن کے شہر اورسا (ORSA) میں پیدا ہوا اور اپسالہ یونیورسٹی OPSALA سے پی ایچ ڈی کیا (۱۸۹۵ء) اور وہیں سامی زبانوں کا استاد مقرر ہو گیا۔ اس نے مصر، شام، تیونس وغیرہ ممالک اسلامیہ کی خوب سیاحت کی۔ ایک مجلہ بھی العالم الشرقی کے نام سے نکالا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں متعدد آرٹیکل لکھے، سویدی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا (۱۹۱۷ء) ایک کتاب سویدی زبان میں مشرقی زبانوں کے موضوع پر لکھی۔ ایک کتاب سیرۃ کے موضوع پر ہے۔ ایران کا سفرنامہ بھی شائع کیا۔ اس نے متعدد اہم متون ایڈٹ کئے۔ سب سے اہم تہذیب اللغۃ للازھری ہے طبقات ابن سعد کی پانچویں اور چھٹی جلد کی تحقیق و ترتیب بھی اسی کا کارنامہ ہے نیز طرفۃ الاصحاب للاشرف الرسولی، شمس العلوم لنشوان حمیری، (اس کے دو جز ایڈٹ کئے اور باقی کام پروفیسر س۔ ڈیڈرینگ کے سپرد کر دیا تھا) تاریخ سلاطین مصر والشام (مجہول المصنف) معارج الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ، آکفیہ ابن معط الزوادی فی النحو وغیرہ۔ یہ کبھی اپنے مقالات عبدالرحمٰن کے قلمی نام سے بھی لکھتا تھا یا حروف ثلاثہ ز. K.V کا استعمال کرتا تھا۔ اس کے باپ کا نام الکزنڈر موریس استرسٹن A.M.ZETTERSTEEN تھا۔ مجلہ مجمع العلمی العربی ج ۳۳۰/۷-۳۳۴ میں اس نے اپنے خود نوشت حالات لکھے ہیں اور اسی مجلہ میں ایک مضمون ڈیڈرنگ S. DEDRANG کے قلم سے جلد ۲۹ (صفحات ۱۴۰-۱۴۳) شائع ہوا تھا۔ الاعلام ج ۶/۶۴

(۵)

طبقاتِ ابن سعد میں سیرۃ کا مواد

کائنات کی تخلیق کا بیان سیرۃ نبوی کا دیباچہ ہے اس میں آفرینش عالم کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ قرآن نے اس موضوع پر صرف چند اشارے کئے ہیں اور اُن میں خرافی عنصر MYTHOLOGICAL ELEMENT اگر ہے بھی تو برائے نام۔ البتہ آفرینش جسے سیرۃ نگاروں کی اصطلاح میں مبتدأ، مبتدأ الخلق، مبدأ وغیرہ بھی کہا جاتا ہے اس کی تفصیلات کا ماخذ عموماً توراۃ ہے یا پھر تالمود TALMUD اور دوسری یہودی روایات جنھیں ہمارے علما "اسرائیلیات" کہتے ہیں۔ ابن سعد نے اس حصے کو تقریباً نظرانداز کر دیا ہے پھر بھی اس نے ابتدائی حصے میں خلق آدم اور نفخ روح وغیرہ کا بیان کیا ہے۔

کائنات کی آفرینش کے بعد آدم اور حوّا کی تخلیق، جنت میں اُن کا قیام اور وہاں سے ہبوط کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس میں سیرۃ نگار صرف اسی تفصیل پر قناعت نہیں کرتے جو قرآن نے بیان کی ہے بلکہ توراۃ کی روایات اور اسرائیلی حکایات کی آمیزش کر کے اُسے خاصا مفصل بنا دیتے ہیں۔ آدم و حوّا کا بیان گویا تاریخ نبوّت کا آغاز ہے چونکہ مسلم مورخین کا نظریہ یہ رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اتفاق سے مبعوث نہیں ہو گئے تھے بلکہ آپ پوری تاریخ نبوّت و رسالت کا آخری باب تھے خاتم الانبیاءؑ تھے اور وہی دعوت لے کر آئے تھے جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاءؑ نے پیش کی تھی جس کے حوالے جابجا قرآن میں ملتے ہیں اور جسے مفسّروں نے دوسرے مصادر کی مدد سے خاصا واضح کر کے پیش کیا ہے اس لیے قصص الانبیاءؑ کا یہ حصّہ گویا سیرۃ کا دوسرا تمہیدی باب بن جاتا ہے جس میں آدم کے زمین پر آنے سے لے کر حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا زمانہ فترۃ کہلاتا ہے جس میں کوئی دوسرا نبی مبعوث نہیں ہُوا۔

اسی ذیل میں اُن اقوام کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے جن کے درمیان یہ انبیاءؑ ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنھوں نے اپنے پیغمبر کی دعوت پر لبیک نہیں کہا۔ اس لیے قہر الٰہی کا شکار ہو گئیں۔

ابن سعد نے حضرت حوّا اور حضرت ادریس کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ پیغمبر نوح کے بارے میں اُن کے سفینے اور طوفان کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے بارے میں کچھ روایات بیان کر کے دوسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ حضرت آدم اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کتنا عرصہ گذرا ہے دنیا کی عمر شمار کرنے کا یہ طریقہ بائبل کے اثر سے اسلامی کتابوں میں بھی آ گیا ہے۔

قصص الانبیاءؑ کے ان حصوں میں ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات کثرت سے لی گئی ہیں اور ان میں انبیاء کے نسب بھی بیان ہوئے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پدری اور مادری سلسلہ نسب بھی الکلبی کی روایت سے بیان ہوا ہے حضور کی اناؤں اور کھلائیوں کے بارے میں بھی معلومات جمع کی ہیں پھر قصی بن کلاب اور قریش کی دوسری اہم شخصیتوں کے حالات ہیں جو حضور کی بعثت سے پہلے سربرآوردہ مانے جاتے تھے۔ اس کے بعد عبدالمطلب بن ہاشم اور عبداللہ بن عبدالمطلب کا حال ہے

ان کے آخری سفر شام، بیماری اور وفات اور مدفن کی تفصیلات بیان کی ہیں[1] ایک روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ سے کیا کیا ترکہ میں ملا تھا[2]

پھر حضورؐ کی ولادت سے متعلق روایات ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ ربیع الاول کو دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے تھے اور یمن کے حبشی گورنر ابرھہ نے جو ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ پر چڑھائی کی تھی جس کا حوالہ سورہ "الم ترکیف" میں ہے، اُس واقعہ کو رسول اللہؐ کی ولادت کے وقت ۵۵ راتیں گذری تھیں۔ ابو معشر سندی کا قول ہے کہ آپ کی ولادت ۲ ربیع الاول کو ہوئی۔ ماہ و تاریخ کے بیان میں روایات کا یہ اختلاف تقویم کی تبدیلیوں کے باعث ہے۔ تمام روایات میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ ولادت باسعادت پیر کے دن ہوئی اور عام الفیل میں ہوئی۔

ولادت سے پہلے حضرتؐ کی والدہ ماجدہ نے بشارت آمیز خواب دیکھے تھے بعض روایتوں میں وہ خواب بیان ہوئے ہیں۔ کچھ روایات یہ بتاتی ہیں کہ حضورؐ مختون پیدا ہوئے تھے اور آپ کی نال بھی قدرتی طور پر کٹی ہوئی تھی[3]

حضرت آمنہ کا انتقال ابواء میں ہوا اور وہیں آپ کی قبر ہے[4] عمرہ حدیبیہ کے موقع پر حضور کا گذر ابواء سے ہوا تو آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی بھی زیارت کی، اس کی مرمت کرائی اور اس کے پاس بیٹھ کر روئے یہاں تک کہ جتنے صحابی موجود تھے وہ بھی سب رونے لگے۔[5]

حضور کے دادا عبدالمطلب کی وفات ۸۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ دوسری روایات میں اُن کی عمر ایک سو دس سال اور ایک سو بیس سال بھی بیان کی گئی ہے اس وقت رسول اللہ کا سن شریف آٹھ سال تھا۔ وہ حجون کے[6] مقام پر دفن ہیں اُم ایمن نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہؐ کو عبدالمطلب کی قبر کے سرہانے روتے ہوئے دیکھا تھا[7]

رسول اللہؐ جب تجارتی سفر پر شام کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو وہاں بعض عیسائی راہبوں سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی تھی[8] آپ کے چچا ابو طالب بھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ابو طالب کا انتقال ۱۵ شوال کو بعثت کے دسویں سال میں ہوا[9]

---

[1] الطبقات ج ۱ : ۹۹ -
[2] ایضاً ۱ : ۱۰۰
[3] الطبقات ج ۱ : ۱۰۳ -
[4] الطبقات ۱/۱۱۶ ، معجم البلدان ۱/۷۹ -
[5] ایضاً ۱/۱۱۶
[6] معجم البلدان ۲/۲۲۵ -
[7] الطبقات ۱/۱۱۹ -
[8] ایضاً ۱/۱۲۱ ، ۱/۱۵۴ ، ۱/۱۵۶ ،
[9] الطبقات ۱/۱۲۵ -

اُن کی وفات سے ایک ماہ پانچ دن کے بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی ۶۵ سال کی عمر پاکر انتقال فرمایا[۱]

بعثت سے قبل کے واقعات حکیم بن حزام کی روایت سے آتے ہیں۔ انہوں نے طویل عمر پائی تھی۔ چنانچہ حرب الفجار اور حرب الفضول میں رسول اللہؐ کی شرکت کا حال انھیں کے حوالے سے بیان ہوا ہے[۲]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے نکاح کی روایت نفیسہ بنت منیہ کے حوالے سے آئی ہے۔ حضور کی اولاد میں حضرت ابراہیم کے سوا سب صاحبزادے اور صاحبزادیاں حضرت خدیجہ ہی کے بطن سے تھیں اس لیے مشہور شیعی مؤرخ اور نسابہ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کے حوالے سے آپؐ کی اولاد کا بیان ایک علٰحدہ باب میں ہوا ہے اور حضرت ابراہیم کے لئے علٰحدہ باب مختص کیا گیا ہے[۳]

مصر کے بادشاہ مقوقس نے حضور کی خدمت میں دو قبطی کنیزیں حضرت ماریہ قبطیہ اور سیرین، ایک خچر (یعفور) اور ایک گھوڑی (دُلدل) ہدیہ کے طور پر بھیجی تھیں۔ حضورؐ نے سیرین کو حضرت حسان بن ثابتؓ کی تحویل میں دے دیا اور حضرت ماریہ قبطیہ کو اپنی ملک ہونے کا شرف بخشا تھا۔ انھیں کے بطن سے حضرت ابراہیم ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ماریہؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی جاگیر العالیہ میں رکھا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جو اموال بنی نضیر میں سے آں حضرت کے حصے میں آئی تھی[۴] حضرت ابراہیم کی ولادت سے حضرت ماریہؓ آزاد کردی گئی تھیں اور حضور نے فرمایا تھا۔

أعتق أمَّ ابراهيمَ وَلَدُها[۵] — ابراہیم کی ماں کو اس کے بیٹے نے آزاد کر دیا

جناب ابراہیم کا انتقال ۱۶ ماہ کی عمر میں سہ شنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ کو ہوا اور آں حضرت نے اُن کے انتقال پر حزن و ماتم کا اظہار فرمایا تھا[۶] ان کی قبر پر حضور نے پتھر رکھنے کا حکم دیا اور قبر پر پانی سے چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔

قدیم آسمانی صحیفوں میں آں حضرت کی آمد کی بشارتیں اور نبوت کی علامتیں نیز اس دور کے عرب میں یہود و نصاریٰ کے علماء کی آراء اور پیش گوئیوں کا بیان کرنے کے بعد ایک علٰحدہ باب میں "مبعث" کا حال لکھا گیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ عبدالملک ابوسلیمان نے ابوجعفر سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

بُعِثْتُ إلى الأحمرِ والأسودِ — میں سرخ اور سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

اور اس کی تشریح بھی خود عبدالملک نے کی ہے کہ

الأحمرُ الناسُ والأسودُ الجِنُّ — سرخ سے مراد انسان ہیں اور سیاہ سے مراد جنات ہیں

لیکن خالد بن معدان کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"میں تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، اگر وہ لبیک نہ کہیں تو عرب کی طرف، اور وہ بھی نہ مانیں تو قریش کی طرف اور وہ

---

[۱] الطبقات ۱/۱۲۵ – [۲] الطبقات ۱/۱۲۶ – [۳] الطبقات ۱/۱۳۴ –
[۴] الطبقات ۱/۱۳۴ – [۵] الطبقات ۱/۱۳۴ – [۶] الطبقات ۱/۱۳۶ –
[۷] الطبقات ۱/۱۴۶ –

بھی اعراض کریں تو بنو ہاشم کی طرف، اور وہ بھی تسلیم نہ کریں تو تنہا اپنے لئے۔"

بعثت اور ختم نبوت کے سلسلے کی دوسری روایات و احادیث بھی ہیں لیکن احمر اور اسود کی جو تشریح عبدالملک نے کی ہے اُن روایات کی روشنی میں اس کا مفہوم یہی لینا چاہیے کہ آں حضرت کالی اور گوری تمام نسلوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

ابن سعد نے بعثت (اعلان نبوت) کی تاریخ ۱۷ رمضان ۴۰ھ ولادت نبوی بتائی ہے[1]۔ پھر نزول وحی کے آغاز، اولین آیات قرآنی، اور وحی نازل ہونے کے وقت آں حضرت کی کیفیات کا بیان ہوا ہے۔

اس کے بعد دعوت اسلام اور ہجرت حبشہ کا ذکر آتا ہے[2] یہ ہجرت ماہ رجب ۵ھ بعثت میں ہوئی تھی۔ ابن سعد نے مہاجرین حبشہ کی فہرست بھی دی ہے[3]

حبشہ کی طرف دوسری ہجرت میں ۸۳ مرد اور ۱۱ عورتیں قریش کی شامل تھیں سات افراد دوسرے قبائل کے تھے[4] وہاں ان مہاجرین نے آں حضرت کے مدینہ کو ہجرت فرمانے کی خبر سنی تو ۳۳ مرد اور ۸ عورتیں حبشہ سے واپس آ گئی تھیں ان میں سے دو مرد مکہ میں انتقال کر گئے اور سات کو اہلِ مکہ نے نظر بند کر دیا تھا باقی نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے ۲۴ افراد بدر میں شریک ہوئے[5]

ربیع الاول ۶ھ میں رسول اللہؐ نے نجاشی کو خط لکھا اور اسلام لانے کی دعوت دی یہ خط لے کر عمرو بن امیہ الضمری گئے تھے۔ ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے شوہر عبیداللہ بن جحش نے بھی حبشہ کو ہجرت کی تھی اور وہاں وہ عیسائی ہو گیا تھا اسی حال میں انتقال ہوا۔ تب رسول اللہؐ نے نجاشی کو خط لکھ کر ام حبیبہؓ سے اپنا نکاح کیا تھا[6]

رسول اللہؐ کے سفر طائف کا حال علیحدہ باب میں ہے۔ یہاں آپ نے دس دن قیام فرمایا تھا[7] ہجرت سے ۱۸ ماہ قبل ہفتہ کی شب میں ۱۷ رمضان کو واقعہ معراج پیش آیا تھا[8] یہ الواقدی کی روایت ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرۃ وغیرہ سے ہے مگر عروہؓ، عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایات میں یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل ۱۷ ربیع الاول کا بتایا گیا ہے[9]

بیعت عقبہ اولیٰ میں جن بارہ افراد نے شرکت کی تھی اُن کے نام دیے ہیں اس کے بعد ہی مصعب بن عُمیر کو قبائل اوس و خزرج میں تعلیم قرآن کے لئے مامور کیا گیا تھا[10]

اس کے بعد بیعت عقبہ ثانیہ کا حال آتا ہے[11]۔

---

[1] الطبقات ۱/۱۹۴ -
[2] الطبقات ۱/۲۰۳ -
[3] الطبقات ۱/۲۰۴ -
[4] الطبقات ۱/۲۰۷ -
[5] الطبقات ۱/۲۰۷ -
[6] الطبقات ۱/۲۰۸ -
[7] الطبقات ۱/۲۱۲ -
[8] الطبقات ۱/۲۱۳ -
[9] الطبقات ۱/۲۱۴ -
[10] الطبقات ۱/۲۲۰ -
[11] الطبقات ۱/۲۲۱

مدینہ کو آں حضرت کی ہجرت کے سلسلے میں ابن سعد نے تفصیلی روایات درج کی ہیں اور ان روایات کو معمر بن راشد[۱]، ابن شہاب الزہری، عروۃ ابن الزبیر اور حضرت عائشہ کے ذریعے سے اخذ کیا ہے[۲]۔ اس سفر کی مختلف منزلیں اور راستے کی روداد بیان ہوئی ہے مدینہ میں نزول کی تاریخ دو شنبہ ۲ ربیع الاول بتائی ہے۔ دوسری روایت میں تاریخ ۱۲ ربیع الاول آئی ہے۔ یہ ہجرت شدید گرمی کے موسم میں ہوئی تھی چنانچہ جو مہاجر پہلے سے مدینہ پہنچ چکے تھے اور وہاں رسول اللہ کی تشریف آوری کے منتظر تھے دو پہر میں کھڑے ہو کر آپ کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب دھوپ ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی تو اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف واپس ہو جاتے تھے۔

کان المهاجرون قد استبطأوا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم في القدوم عليهم فكانوا يغدون مع الانصار الى ظهر حرة العصبة فيتحينون قدومه في اوّل النهار فاذا احرقتهم الشمس رجعوا الى منازلهم[۳]

مہاجرین یہ خیال کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے میں دیر ہو گئی ہے وہ روز صبح کو انصار کے ساتھ شدید دھوپ میں کھڑے ہو کر دن کے اول حصے میں رسول اللہ کی تشریف آوری کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب دھوپ انھیں جھلسنے لگتی تھی تو اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان رسول اللہ نے مواخاۃ کا رشتہ قائم فرما دیا تھا۔ ابن سعد نے صحابہ کے تراجم میں حتی الوسع ایسی سب روایات جمع کر دی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کس کے درمیان یہ رشتہ قائم ہوا تھا۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے بیان میں الزہری کی روایت یہ ہے کہ آں حضرت کی اونٹنی نے اسی جگہ قیام کیا تھا جہاں مسجد نبوی واقع ہے یہ زمین سہل اور سہیل نامی دو یتیم انصاری لڑکوں کی ملکیت تھی جسے آں حضرت نے دس دینار میں خریدا تھا اور سعد بن زرارۃ نے مسجد تعمیر کی تھی۔ اس کی بنیاد تقریباً ۳ گز گہری تھی اور پتھر سے اٹھائی گئی تھی پھر اینٹیں استعمال ہوئی تھیں۔ اس زمین میں عہدِ جاہلیت کی کچھ قبریں بھی تھیں جنھیں مسمار کر دیا گیا تھا اور ان میں سے جو ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں انھیں چھپا دیا گیا تھا[۴] اس مسجد کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا اور اس کے تین دروازے تھے[۵]

تحول قبلہ کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ابن عباس کا قول ہے کہ ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی گئی اسی لیے یہ مسجد القبلتین کہلاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تحول قبلہ دو شنبہ ۱۵ رجب کو ۱۷ ماہ بعد ہجرت ہوا اور ہجرت کے

---

[۱] معمر بن راشد (۹۵-۱۵۳ھ/۷۱۳-۷۷۰ء) ابن ابی عمرو الازدی الحدانی ابوعروۃ، فقیہ، حافظ حدیث، متقن، ثقہ، اہل بصرہ میں سے تھے وہیں پیدا ہوئے اور شہرت پائی پھر یمن چلے گئے تھے وہاں سے واپس آنا چاہا تو اہل یمن نے آنے نہ دیا اور وہاں ان کی شادی کر دی۔ یہ ان تعین رجال حدیث میں سے ہیں اور یمن میں پہلے تصنیف کرنے والے ہیں تفصیل دیکھو تہذیب التہذیب ۱۰/۲۴۳ میزان الاعتدال ۳/۱۸۸، تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۷۸، شرح الفیہ العراقی ۱/۳۳، الجرح والتعدیل ۴-۱/۲۵۵، ابن الندیم (فلوجل) ۹۴ میں انھیں کوفی لکھا گیا ہے۔

[۲] الطبقات ۱/۲۳۳، [۳] الطبقات ۱/۲۳۳، [۴] الطبقات ۱/۲۲۹، [۵] الطبقات ۱/۲۴۰ -

اٹھارویں مہینے میں روزے فرض ہوئے[1]

اس کے بعد مسجد قباء کا بیان ہے[2]۔ ہشام بن عروۃ اور دوسرے محدثین کا قول ہے کہ قرآن میں اسی کو (أُسِّسَ علی التقوی) کہا گیا ہے۔ پھر وہ روایات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کے لیے آں حضرتؐ کبھی پیادہ اور کبھی سوار ہو کر تشریف لے جاتے تھے اسی لئے حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اگر مسجد قباء آفاق کے اُس سرے پر بھی ہوتی تو ہم اُس کی زیارت کرنے کے لئے اونٹوں کو تھکا دیا کرتے[3]۔ اس کے بعد اذان کا بیان ہے۔ یزید بن رومان نے عروۃ بن الزبیر سے اور ابن شہاب الزہری نے سعید بن المسیّب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں اذان نہیں تھی۔ پکارنے والے گلی کوچوں میں جا کر ندا دے آتے تھے " الصّلوٰۃ جامعۃ "۔ جب قبلہ تبدیل ہوا تو آں حضرتؐ کو اذان کا خیال آیا کسی نے ناقوس تجویز کیا، کسی نے بھونپو۔ ابھی یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ مسلمانوں کو اقامتِ نماز کی اطلاع دینے کا کیا ذریعہ اختیار کیا جائے کہ عبد اللہ بن زید الخزرجی نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سبز لباس پہنے اور ہاتھ میں ناقوس لیے جا رہا ہے، اُنہوں نے پوچھا " کیا یہ ناقوس بیچتے ہو؟"

اُس نے کہا: " تم اس کا کیا کرو گے؟"

انہوں نے کہا: " اسے بجا کر لوگوں کو نماز کی اطلاع دیا کروں گا "

اُس شخص نے کہا کہ میں اس سے بہتر چیز تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ پھر اذان کے کلمات تعلیم کیے۔ جب انہوں نے یہ خواب آں حضرتؐ سے بیان کیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ بلالؓ کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ الفاظ انھیں یاد کرا دو۔ اتنے میں حضرت عمر فاروقؓ آئے اور اُنہوں نے بھی ایسا ہی خواب بیان کیا[4]۔ فجر کی اذان میں " الصلوٰۃ خیر من النوم " کا اضافہ حضرت بلالؓ نے کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے باقی رکھا[5]۔

ایک باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور اُستنِ حنّانہ کا بیان ہے[6]۔ پھر صفہ اور اصحاب صفہ ہیں۔ واثلہ بن الاسقع نے ان کی تعداد (۳۰) بتائی ہے ان میں حضرت ابو ھریرہؓ اور حضرت ابو ذر غفاریؓ بھی شامل تھے۔

مکتوبات و فرامین

اس حصے کا سب سے اہم اور قابلِ قدر باب وہ ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و فرامین کا بیان ہوا ہے، جو آپ نے ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو دعوتِ اسلام کے سلسلے میں بھیجے تھے۔ بہت سے مکتوبات کا متن بھی ابن سعد نے درج کیا ہے۔ اکثر حالات میں یہ بھی بتایا ہے کہ مکتوب مبارک کس کے ہاتھ بھیجا گیا ان مکتوبات کی روایت کرنے والوں کے نام

---

[1] الطبقات ۱/۲۴۲ نیز ۱/۲۴۸ ، [2] الطبقات ۱/۲۴۴ ۔ [3] الطبقات ۱/۱۴۵ [4] الطبقات ۱/۱۴۶

[5] الطبقات ۱/۱۴۸ ، [6] الطبقات ۱/۲۴۹ - ۲۵۴ ۔

حسبِ معمول خلط ملط کر دیے ہیں مگر اس فہرس میں معمر بن راشد، الزہری، عبید اللہ بن عتبہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جن مکتوبات کا ابن سعد نے حوالہ دیا ہے وہ صلح حدیبیہ (ذی الحجہ ۶ھ) کے بعد لکھے گئے تھے ان خطوط پر ثبت کرنے کے لیے آں حضرتؐ نے اپنی چاندی کی مہر بھی تیار کرائی تھی۔ جس کی شکل بیضوی تھی سب سے اوپر اللہ اس کے نیچے رسول اور آخری سطر میں محمد لکھا ہوا تھا۔

پہلے ہی دن (محرم ۷ھ) چھ قاصد روانہ کیے گئے تھے یہ جن لوگوں کی طرف مامور ہوئے تھے ان کی زبانوں سے واقف تھے۔

الشعبی کا بیان ہے کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطوط میں قریش کے طریقہ قدیم کے مطابق باسمک اللّٰھم لکھا کرتے تھے۔ جب یہ آیہ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا نازل ہوئی تو حضورؐ نے بسم اللہ لکھا اور جب دوسری آیۃ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوئی تو آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوانا شروع کر دیا تھا[1] آنحضرت خطوط پر کبھی گواہ کا نام بھی لکھواتے تھے۔ کبھی ایک گواہ کبھی دو کبھی زیادہ[2] کبھی گواہ نابالغ بھی ہوتے تھے جیسے حضرات الحسنؓ اور الحسینؓ کی گواہی ایک خط پر موجود ہے جو اس وقت کم سن رہے ہوں گے۔ بعض خطوط پر خدا اور اس کے رسولؐ کی گواہی کافی سمجھی گئی۔ کسی پر لکھا ہے ـ "من حضر" (جو موجود تھا)۔

یہ خطوط اکثر چمڑے پر لکھے جاتے تھے چنانچہ ایک خط کے بارے میں یہ روایت موجود ہے کہ مکتوب الیہ نے اس سے اپنے پانی بھرنے کے ڈول میں پیوند لگا لیا تھا[3] بعض روایتوں سے سرخ چمڑے پر خط لکھا ثابت ہے[4]

بعض حالتوں میں ترجمانی کی ضرورت بھی پڑتی تھی اور خود آں حضرت ہدایت فرما دیتے تھے کہ اگر وہ تم سے عجمی زبان میں بات چیت کریں تو کہہ دینا کہ ترجمہ کرو[5]

ان مکتوبات دفرامین میں سے اکثر کو الواقدی نے بچشم خود دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ابن سعد نے ایک باب میں "وفادات العرب" کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ اور ان تمام وفود اور رسالتوں کی تفصیل دی ہے جو فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمام عرب علاقوں سے آ رہے تھے۔ ابن سعد نے (۷۲) وفود کا بیان کیا ہے۔

اہلِ کتاب سے تعلقات

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے دورِ اوّل کے مسلمانوں کے تعلقات کیا رہے ہیں، اس موضوع پر بھی طبقات میں بہت سا

---

[1] الطبقات ۱/۲۶۴، [2] الطبقات ۱/۲۸۹، [3] الطبقات ۱/۲۸۱، [4] الطبقات ۱/۳۰۲۔
[5] الطبقات ۱/۲۸۲۔

مواد بکھرا ہوا ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں تین طبقوں کے پیرو شامل تھے۔ کچھ تو وہ لوگ تھے جو عرب کے عہد جاہلیت کے مذاہب پر تھے اِن کو قرآن کی اصطلاح میں مشرک کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قبیلے کا بُت علیحدہ تھا اور ہر مقصد کے لئے نیا بُت بنا لیا گیا تھا۔ دورِ جاہلیت کے بعض اصنام کا حوالہ قرآن میں بھی موجود ہے اور باقی اصنام کی تفصیل ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی کتاب الاصنام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا طبقہ یہود کا تھا۔ یہ زیادہ تر مدینہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے اور یمن میں بھی ان کی کثیر آبادی تھی۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بھی تھا۔ کتابیں بھی تصنیف کرتے تھے اور انہوں نے بائبل کی شرح میں نیز اپنے فقہی مسائل کی تفسیر میں لاکھوں روایات اور قصے بھی گھڑ لیے تھے۔ گویا اس دور کے عرب میں یہود علمی اعتبار سے ترقی یافتہ اور متمدن تھے۔

شام اور اس کے اطراف میں عیسائیوں کی کثرت تھی چنانچہ وہاں کے گرجاؤں میں کاہن اور راہب اپنی مذہبی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے ان راہبوں سے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی بعثت سے قبل ملاقات کی ہے جس کا حوالہ کتب سیرۃ کی متعدد روایات میں ملتا ہے۔

خاص مکہ اور اس کے اطراف میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو خواہ عیسائی ہوں یا یہودی یا عرب کے مقامی مذاہب کے پیرو ہوں، لیکن وہ صحف سماوی کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کی تشریح و تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔

جب اسلام کی دعوت آئی تو ان میں سے جو لوگ اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوئے اُن میں ایک تو وہ طبقہ تھا جو صدقِ دل سے مسلمان ہوا اور تعلیمات اسلامی کو اس نے مکمل طور پر قبول کر لیا اگرچہ وہ جن تہذیبی و مذہبی روایات کے زیر سایہ بچپن سے پروان چڑھے تھے ان کے اثرات کو اپنے دل و دماغ سے مکمل طور پر محو نہیں کر سکتے تھے اور اس کی جھلک اُن کے اعمال و اقوال میں برابر نظر آتی ہے دوسرا طبقہ وہ تھا جو حالات کی مجبوری اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے مسلمان ہوا۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر آخر کار اسلامی رنگ غالب آ گیا اور مورخین کی اصطلاح میں (" ثم حسن اسلامہ) پھر اُن کا اسلام اچھا ہو گیا۔ کچھ وہ بھی تھے جو اگرچہ مسلمان رہے مگر ان کے دل و دماغ پر وہی قدیم روایات غالب رہیں۔

ایک طبقہ وہ تھا جس نے اسلامی گروہ میں شامل ہو کر رخنے پیدا کرنے کے لئے اسلام قبول کیا تھا اور وہ اکثر اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

اس دور کے علمائے اہل کتاب میں عام طور پر یہ بات شائع تھی کہ عرب میں ایک نبی کا ظہور ہو گا۔ علماء اُس نبی مُنتظر کی صفات بھی بیان کیا کرتے تھے کعب الاحبار[1] مشہور تابعی ہوتے ہیں یہ پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ اسرائیلی روایات کا بہت بڑا

---

[1] کعب الاحبار کے ترجمہ اور اُن کی روایات کے لیے دیکھیے :

FARUQI (N.A.) EARLY MNSLIM HISTORIOGRPHY

(DELHI 1978) PP. 88-91

ذخیرہ ان کے ذریعے سے ہماری کتابوں میں منتقل ہوا ہے اُن سے ایک بار عبداللہ بن عباس رضؓ نے پوچھا کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال کیا ملتا ہے تو انہوں نے کہا:

نجدہ محمد بن عبد اللہ مولدہ بمکۃ ومھاجرہ الی طابۃ ویکون ملکہ بالشام لیس بفحّاش ولا بصخّاب فی الأسواق ولا یُکافیٔ بالسئیۃ ولکن یعفو ویغفر[1]

ہم (توراۃ میں) یہ پاتے ہیں کہ اُن کا نام محمد بن عبد اللہ، مولد مکہ، دار ہجرت طیبہ، ہے ان کی حکومت شام میں ہوگی۔ وہ فحاش نہیں ہیں اور نہ بازار میں زور سے بولتے ہیں نہ بُدی کا بدلہ بُدی سے دیتے ہیں بلکہ معاف کرتے ہیں اور خطاؤں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

ایسی ہی روایت عبد اللہ بن سلام سے بھی آئی ہے یہ بھی یہودیت سے اسلام کی طرف آئے تھے اور کتب یہود کا اچھا علم رکھتے تھے[2]
عیسائی علما بھی انجیل میں آں حضرت کی صفات کا مذکور ہونا بیان کیا کرتے تھے اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر کہیں ایسی عبارتیں دیکھتے تھے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ظاہر ہوتی ہوں تو اُن عبارتوں کو محو کر دیتے تھے یا چھپا دیا کرتے تھے یا اُن میں تحریف کر کے بیان کرتے تھے[3]

آں حضرت کے فضائل و اخلاق اور سیرۃ طیّبہ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محامد اخلاق و شمائل جو ابن سعد کی جمع کردہ روایات سے ظاہر ہوتے ہیں اُن کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان میں کہیں مبالغہ یا تصنّع کا شائبہ نہیں ہے۔ راویوں نے آں حضرت کی جو صفات عالیہ بیان کی ہیں وہی ہیں جو ہم آپ کے اعمال و افعال میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کے اخلاق بیان کریں تو انہوں نے فرمایا کہ "آپ کا اخلاق قرآن تھا"
یعنی جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ آں حضرتؐ کا عمل تھا۔ اس سے زیادہ مختصر اور جامع تبصرہ سیرۃ طیبہ پر شاید نہ کیا جا سکے کتب رجال سے حضرت عائشہ رضؓ کی فصاحت و بلاغت کی گواہی ملتی ہے اور سیرۃ نبوی پر اُن کا یہ تبصرہ اس کی ایک مثال ہے۔
حضرت انس رضؓ نے فرمایا کہ آں حضرتؐ تمام انسانوں میں بہترین اخلاق والے تھے کبھی سڑک پر زور سے گفتگو نہ فرماتے تھے۔ فحش کا شائبہ بھی نہ تھا، برائی کا بدلہ نہیں لیتے تھے بلکہ درگذر فرماتے تھے۔
زید بن ثابت سے سیرۃ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں آں حضرتؐ کے پڑوس میں رہتا تھا اور جب

---

[1] الطبقات ۱/ ۳۶۰۔ [2] ان کے بارے میں تفصیلات کے لئے دیکھیے:

FARUQI (N.A): EARLY MUSLIN HISTORIOGRAPHY. PP, 155-164

[3] الطبقات ۱/ ۳۶۳۔

وحی نازل ہوتی تھی تو میں ہی لکھتا تھا۔ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ کھانوں کا تذکرہ ہوتا تھا تو آں حضرتؐ بھی ہماری باتوں میں حصہ لیتے تھے، اور کیا کیا بات بتاؤں ؟

ہشام بن عروۃ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضورؐ گھر میں ہوتے تھے تو اپنے کپڑوں کو پیوند خود لگا لیتے تھے اور اپنے جوتے کی مرمت خود کر لیا کرتے تھے[۱] آں حضرتؐ نے جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی اپنے ہاتھ سے کسی مرد یا عورت کو نہیں مارا[۲]۔ جب آپ کے سامنے دو راستے ہوتے تھے تو جو آسان ہوتا اُسے اختیار فرماتے تھے۔ آپ شرم و حیا میں کنواری لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے تھے[۳]

آپ کا چہرۂ مبارک ایسا آئینہ تھا کہ جب کوئی بات ناگوار ہوتی تھی تو آپ کے چہرے پر تاثرات سے معلوم ہو جاتا تھا۔

آپ سے کبھی کسی سائل نے کوئی سوال کیا تو آپ نے اُسے "نہیں" کہہ کر نہ جانا۔ ہر ایک کا سوال پورا کرتے تھے[۴] اگر آپ کو کوئی کام نہ کرنا ہوتا تھا تو انکار نہ فرماتے تھے خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو وضو فرماتے تھے[۵]

آپ کی بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ بے پالان کے گدھے پر سواری کرتے اور غلام کے گھر دعوت ہوتی تو تشریف لے آتے[۶] کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیتے تھے[۷] اپنی بکری کو اپنے ہاتھ سے باندھتے تھے[۸] آپ کی تعلیم ترکِ دنیا کی نہیں تھی چنانچہ آپ نے فرمایا:

"میں نماز پڑھتا ہوں۔ سوتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں نکاح کرتا ہوں، جو کوئی میری سنّت سے انحراف کرے وہ میری امت میں سے نہیں ہے"[۹]

آں حضرتؐ کی مجلس میں دنیا کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ آپ کے سامنے اشعار پڑھے جاتے تھے لوگ ہنستے تو آپ بھی تبسم فرماتے تھے[۱۰] مسجد میں دورِ جاہلیت کے اشعار اور حکایات بھی سنائی جاتی تھیں آپ ان سے کبھی تنفر کا اظہار نہ فرماتے تھے[۱۱]

آں حضرتؐ کا کلام فصیح و بلیغ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے تھے جابر بن عبداللہ نے کہا کہ حضورؐ کے کلام میں "ترسیل و ترتیل" تھی[۱۲] یعنی مافی الضمیر کو پوری طرح ادا فرماتے اور الفاظ کو وضاحت سے ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ خطبہ ارشاد فرماتے وقت آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں آواز بلند ہو جاتی تھی اور اس میں زور پیدا ہو جاتا تھا[۱۳]

انس بن مالک کہتے ہیں: جب آں حضرتؐ سے کوئی شخص ملتا اور مصافحہ کرتا تھا تو جب تک وہ شخص خود اپنے ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا تھا۔

---

[۱] الطبقات ۱/۳۶۶ ۔ [۲] الطبقات ۱/۳۶۷ ۔ [۳] الطبقات ۱/۳۶۸ ۔
[۴] الطبقات ۱/۳۶۸ ۔ [۵] الطبقات ۱/۳۶۹ ۔ [۶] الطبقات ۱/۳۷۰ ۔
[۷] الطبقات ۱/۳۷۲ ۔ [۸] الطبقات ۱/۳۷۱ ۔ [۹] الطبقات ۱/۳۷۲ ۔
[۱۰] الطبقات ۱/۳۷۲ ۔ [۱۱] الطبقات ۱/۳۷۲ ۔
[۱۲] الطبقات ۱/۳۷۵ ۔
[۱۳] الطبقات ۱/۳۷۷ ۔

حضور اپنا دست مبارک نہ کھینچتے تھے اور جب وہ رخصت ہوتا تھا تو جب تک وہ منھ نہ پھیر لیتا تھا، آں حضرت اپنا روئے مبارک اُس کی طرف سے نہ پھیرتے تھے۔[۱]

راستے میں آپ تیز تیز چلتے تھے اور ادھر اُدھر نہ دیکھتے تھے[۲] حضرت ابوہریرۃ کہتے ہیں۔

ما رایتُ أحداً أسرع فی مشیتہٖ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم کأن الأرض تطوی لہ إنّا لنجھد وھو غیر مکترث[۳]	میں نے چلنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز رفتار کوئی نہیں دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے لیے زمین لپیٹی جا رہی ہے ہم کوشش کرکے بھاگتے تھے اور وہ بے تکلف چلتے تھے۔

آپ کھانا کبھی تکیہ (ٹیک) لگا کر نہ کھاتے تھے اور تین انگلیوں سے کھاتے تھے[۴] راستے میں بچوں تک کو سلام فرماتے تھے[۵] کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے کبھی سواری پر نہ جاتے تھے[۶] فرماتے تھے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہے جس میں دوام ہو۔ خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو[۷]

آپ اندھیرے مکان میں نہ بیٹھتے تھے[۸] فصل کے ابتدائی میوے آپ کی خدمت میں لائے جاتے تھے تو انھیں چومتے تھے اور آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے:

اللّٰھم کما أریتنا أوّلہ فأرنا آخرہ[۹]	یا اللہ جیسے ان کا آغاز ہمیں دکھایا ہے ایسے ہی ان کی آخری فصل بھی دکھائیو۔

ہدایا قبول فرماتے تھے مگر صدقہ ہرگز نہ لیتے تھے[۱۰] کبھی کوئی مشتبہ چیز تناول نہ فرماتے تھے[۱۱] مٹھائی اور شہد آپ کو بہت مرغوب تھا[۱۲] ہانڈی میں بھی کھا لیتے تھے[۱۳] البتہ پیاز سے آپ کو رغبت نہ تھی فرماتے تھے کہ تم لوگ کھاؤ۔ میرے پاس فرشتہ (جبریل) آتا ہے اس لئے میں پرہیز کرتا ہوں[۱۴] اسی طرح گوہ (سوسمار) کا گوشت نہیں کھاتے تھے[۱۵] مگر دوسروں کو اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا[۱۶]

دنیا کی چیزوں میں آپ کو خوشبو، ازواج مطہرات، اور کھانا پسند تھا[۱۷] آپ گھر سے باہر تشریف لاتے تو خوشبو سے راستے مہک جاتے تھے[۱۸]

---

[۱] الطبقات ۱/۳۷۸، [۲] الطبقات ۱/۳۷۹، [۳] الطبقات ۱/۳۸۰، [۴] الطبقات ۱/۳۸۱،
[۵] ″ ۱/۳۸۲، [۶] ″ ۱/۳۸۵، [۷] ″ ۱/۳۸۴، [۸] ″ ۱/۳۸۶،
[۹] ″ ۱/۳۸۷، [۱۰] ″ ۱/۳۸۸، [۱۱] ″ ۱/۳۹۱، [۱۲] ″ ۱/۳۹۲،
[۱۳] ″ ۱/۳۹۲، [۱۴] ″ ۱/۳۹۵، [۱۵] ″ ۱/۳۹۵، [۱۶] ″ ۱/۳۹۷،
[۱۷] ″ ۱/۳۹۸، [۱۸] ″ ۱/۳۹۹۔

آپؐ کو تحفہ میں عطر دیا جاتا تھا تو بہت خوشی اور رغبت سے قبول فرماتے تھے[1] آپؐ کی مجلس میں کبھی خوشبوؤں کی دھونی بھی دی جاتی تھی[2]

اس کے ساتھ ہی آپؐ کی زندگی ایسی سادہ اور کٹھن تھی کہ ابن عباس کا قول ہے کئی کئی وقت کے مسلسل فاقے ہو جاتے تھے[3] عام طور سے جَو کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ شدت گرسنگی میں پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے[4] چار چار مہینے تک گیہوں کی روٹی کھانے کا موقع نہیں ملتا تھا[5] پڑوس کے انصاری کبھی ہدیہ میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے تو اسی پہ گذر ہو جاتی تھی[6] آپؐ نے کبھی متواتر دو وقت کھانا پیٹ بھر کر نہیں کھایا[7]

آپ کا وصال ہُوا تو آپ کی چادر ایک یہودی کے پاس ایک وَسَق (وزن) جَو کے بدلے میں گروی رکھی ہوئی تھی[8] مگر یہ معاشی حالت فتح خیبر سے پہلے تھی۔ جب اموالِ خیبر آئے تو آپ کی اور اصحاب کی معاشی حالت نسبتہً بہتر ہو گئی تھی[9]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے مسجد کوفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو حضرت علی نے فرمایا:

كَانَ رسول الله صلَّى الله عليه وسلّم أَبيَضَ اللّونِ مُشرِبًا حُمرةً، أَدعَجَ العَينِ سَبِطَ الشَّعرِ، كَثَّ اللِّحيةِ، سَهلَ الخَدِّ ذا وفرةٍ، دَقيقَ المَسرُبَةِ، كأنّ عُنُقَه إبريقُ فِضّةٍ، له شعرٌ مِن لَبَّتِه إلى سُرّتِه يَجري كالقَضيبِ، لَيسَ في بَطنِه وَلَا صَدرِه شَعرٌ غَيرُه، شَثنَ الكَفِّ والقَدَمِ، إذا مَشى كأنّما يَنحَدِرُ مِن صَبَبٍ وإذا قامَ كأنّما يَنقَلِعُ مِن صَخرٍ، إذا التَفَتَ التَفَتَ جَميعًا، كأنّ عَرَقَه في وجهِه اللؤلؤ، ولَرِيحُ عَرَقِه أطيَبُ مِنَ المِسكِ الأذفَرِ، لَيسَ بالقَصيرِ ولَا بالطَّويلِ، ولَا بالعَاجِزِ، ولا اللَّئيمِ، لَم أرَ قَبلَه ولا بَعدَه مِثلَه صلّى الله عليه وسلّم[10]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ گورا سرخی مائل تھا۔ گہری سیاہ آنکھیں، ڈھیلے بال گھنی داڑھی، رخساروں پہ گوشت کم تھا، بال گھونگھر والے اور گھنے تھے سینے سے شکم مبارک تک بالوں کی باریک لکیر تھی۔ آپ کی گردن چاندی کی صراحی جیسی لگتی تھی ہنسلی سے ناف تک بال تھے اس کے سوا آپ کے سینے پر یا بدن پہ اور بال نہیں تھے۔ ہتھیلی اور پاؤں کے تلوے دبیز تھے جب آپ چلتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ کسی بلندی پہ سے اتر رہے ہیں اور کھڑے ہوتے تو پھرتی سے کھڑے ہوتے تھے۔ جب کسی طرف مڑتے تو پورے مڑ جاتے تھے۔ آپ کے چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے تھے اور آپ کے پسینے میں مشک سے زیادہ خوشبو تھی نہ آپ لمبے تھے نہ کوتاہ قامت تھے نہ آپ کے جسم میں کوئی عیب تھا نہ ڈھیلے ڈھالے تھے۔ میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کسی کو آپ

---

[1] الطبقات ۱/۳۹۹ ، [2] الطبقات ۱/۴۰۰ ، [3] الطبقات ۱/۴۰۰ ، [4] الطبقات ۱/۴۰۰
[5] " ۱/۴۰۱ ، [6] " ۱/۴۰۳ ، [7] " ۱/۴۰۴ ، [8] " ۱/۴۰۸
[9] " ۱/۴۰۹ ، [10] " ۱/۴۱۰ ۔

جیسا انہیں دیکھا صلی اللہ علیہ وسلم۔

دوسری روایات میں بھی آں حضرت کا حلیہ مبارک بیان ہوا ہے جن کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

كانَ رَسُولُ اللهِ صلّى الله عليهِ وسلّم ضَخْمَ الهَامَةِ، عَظِيمَ العَيْنَيْنِ، أهْدَبَ الأشْفارِ، مُشْرَبَ العَيْنَيْنِ حُمْرَةً، كَثَّ اللّحيةِ، أزْهَرَ اللّونِ، إذا مَشَى تكفّأ كأنّما يَمْشِي فِي صُعُدٍ، وإذا التفتَ التفتَ جَمِيعًا، شَثْنَ الكَفَّيْنِ والقَدَمَيْنِ...

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر بڑا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، پلکیں گھنی اور لمبی لمبی — آنکھوں کا رنگ سرخی مائل، داڑھی گھنی، رنگ چمکتا ہوا تھا۔ جب آپ چلتے تو ایسے جھکے ہوئے سے ہوتے جیسے بلندی پر چڑھ رہے ہیں، اور جب کسی طرف مڑتے تو پورے مڑ جاتے تھے آپ کی دونوں ہتھیلیاں اور تلوے دبیز تھے....

.....ضَخْمُ الكرادِيسِ، طويلُ المَسْرُبَةِ، إذا مشى تكفّأ تكفؤًا كأنّما يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ..... كانَ ليسَ بالذاهبِ طولًا وفوقَ الرّبعة، إذا جاءَ مع القومِ غَمَرَهُم، أبيضَ، شديدُ الوضحِ، ضخمُ الهامَةِ، أغَرُّ، أبْلَجُ، أهْدَبُ الأشفارِ، شَثْنُ الكفّينِ والقدمينِ، إذا مشى تَقَلَّعَ كأنّما ينحدرُ مِن صَبَبٍ.....

....آپ کے کندھے چوڑے تھے، سینے پر بالوں کی ایک لمبی لکیر تھی جب آپ چلتے تو اس طرح جھکتے تھے جیسے بلندی سے نیچے اتر رہے ہیں۔ آپ بہت لمبے نہ تھے بس ذرا نکلتا ہوا (میانے سے کچھ زیادہ) قد تھا۔ جب آپ لوگوں کے ساتھ آتے تو ان سب میں نمایاں ہوتے تھے خوب کھلتا ہوا گورا رنگ تھا، سر بڑا تھا پیشانی روشن تھی، بھویں علیحدہ تھیں پلکیں گھنی اور لمبی تھیں تلوے اور ہتھیلیاں دبیز تھیں جب آپ چلتے تو اس طرح آگے کو جھکتے تھے جیسے بلندی سے اُتر رہے ہیں......

.....لم يكن بالطّويلِ المُمَّغِطِ ولا بالقصيرِ المُتَرَدِّدِ، كانَ ربعةً من القوم ولم يكن بالجعدِ القَطَطِ ولا السّبطِ، كانَ جَعْدًا رَجِلًا ولم يكن بالمُطَهَّمِ ولا المُكَلْثَمِ وكانَ فِي وَجْهِهِ تَدْوِيرٌ أبْيَضُ..... جليلُ المُشَاشِ والكَتَدِ، أجْرَدُ بين كتفيه خاتمُ النبوّةِ...... وهو خاتمُ النبيّين، أجودُ النّاسِ كفًّا وأجرأ النّاسِ صدرًا وأصدقُ النّاسِ لهجةً، وأوفى النّاسِ بذمّةٍ

نہ تو آپ بہت لمبے تھے اور نہ نمایاں طور پر پستہ قد تھے بلکہ میانہ قد تھا اسی طرح نہ آپ کے بال چھوٹے گھنگریلے تھے نہ لمبی لمبی سیدھی زلفیں تھیں، بلکہ ہلکے گھونگر والے گیسو تھے اسی طرح نہ آپ موٹے تھے نہ رخسار زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ آپ کے چہرے میں ایک روشن ہالہ تھا... چہرے مہرے سے جلالت ظاہر تھی دونوں کندھوں کے درمیان بال نہیں تھے اور وہاں مہر نبوت تھی۔ آپ خاتم النبیین تھے لوگوں میں سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے تھے اور سب سے زیادہ جری اور شجاع تھے سب سے زیادہ صادق القول تھے اور اپنے وعدے کو سب سے زیادہ پورا کرنے والے تھے اور سب سے زیادہ

وألينَهُم عريكةً وأكرمُهم عِشرةً مَنْ رَآه بَديهَةً هابَه، ومن خالطَه معرفةً أحَبَّه......

نرم مزاج تھے ملنے جلنے میں سب سے زیادہ باوقار تھے جو آپ کو اچانک دیکھتا وہ مرعوب ہوتا تھا اور جو آپ سے مل کر آپ کو جان لیتا تھا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا تھا۔

.....أسْود الحدقة..... وهو إلى الطُّول أقربُ عَظيمَ المناكبِ..... مقرونَ الحاجبَيْنِ صلت الجبينِ بعيد ما بين المَنكبين.... في عَيْنيه حُمرةٌ حسن اللحية، حسنَ الفَم، تامّ الأذنيْنِ، يُقبِل جميعًا ويُدبِر جميعًا......

....آپ کی آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں آپ کا قد طول سے قریب تھا کندھے بڑے تھے بھویں ملی ہوئی تھیں، کشادہ اور ابھری ہوئی پیشانی تھی دونوں کندھوں کے درمیان خوب فاصلہ تھا (سینہ چوڑا تھا)..... آپ کی آنکھوں میں سرخی چھائی رہتی تھی داڑھی خوب صورت تھی منہ بھی حسین تھا، کان پورے اور بھرے بھرے تھے آپ پورے آگے اور پیچھے مڑتے تھے۔

مَا مَسِستُ ديباجةً ولا حريرةً ولا شيئًا قط ألين من كف رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ولا شممتُ مِسكةً ولا عنبرةً ما أطيب من ريحه..... كان ضخم القدمين كثير العرق ....شثن الذّراعين..... كأنّ الشمس تجري في جبهته....ضخم السّاقين عظيم الساعدين ضخم المنكبين بعيد ما بين المنكبين رحب الصّدر رَجِل الرأس أحسن النّاس لونا....عليه سحوليتان إزاره تحت رُكبتيه بثلاث أصابع أو أربع اذا نعطّف بردائه...... لم يُحِط به فهومتأبّطه تحت إبطه.....ضليع الفم منهوس العقب......(وجهه) مثل الشمس والقمر مستديرا...... يَبلُغ شعره شحمةَ أذنيه عليه حُلّة

میں نے کوئی ریشمی کپڑا یا دیبا یا کوئی اور چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم اور ملائم نہیں چھوئی نہ کوئی مشک یا عنبر رسول اللہ ؐ کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار سونگھا آپ کے تلوے دبیز تھے اور آپ کو پسینہ بہت آتا تھا۔ دونوں بازو لمبے چوڑے تھے.... آپ کی پیشانی میں سورج چمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا..... پنڈلیاں بھری تھیں دونوں کلائیاں چوڑی تھیں کندھے بڑے تھے دونوں کندھوں کے درمیان خوب فاصلہ تھا، سینہ چوڑا تھا، سر میں کچھ گھونگھر تھا آپ کا رنگ لوگوں میں سب سے اچھا تھا۔ آپ کے اوپر گاڑھے کی دو چادریں ہوتی تھیں اور تہ بند گھٹنوں سے تین چار انگل نیچا ہوتا تھا۔ جب آپ اپنی چادر موڑتے تھے تو وہ آپ کو لپیٹتی نہ تھی (چھوٹی ہونے کی وجہ سے) اس لیے آپ اس کا کنارا اپنی بغل میں دبا لیتے تھے۔ آپ کا منہ چوڑا تھا مگر یہ زیادہ گوشت نہیں تھا آپ کا چہرہ چاند سورج کی طرح گول تھا آپ کے بال کان کی لو تک پہنچتے تھے ـ آپ

حمراء...... حسن المضحک، أکحل
العینین جمیل دوائر الوجه قد ملأت
لحیته مالدن هذه إلى هذه وأشار
بیده إلى صدغیه حتی کادت
تملأ نحره)
إذا مشی مشی مجتمعاً لیس فیه کسل....
أبیض ملیحاً مقصداً...... ما رأیت
أحداً أجود ولا أنجد ولا أشجع ولا
أوضأ من رسول الله صلّی الله علیه
وسلّم........ کان شیبه فی
عنفقته وناصیته ولو شاء أعدّها
لعددتها...... شدید سواد الرأس
واللحیة..... کان رسول الله صلّی الله
علیه وسلّم یسلّم عن یمینه
حتی یری بیاض خدّه ثم یسلّم
عن یساره حتی یری بیاض خدّه
...... ما رأیت بطن رسول الله صلّی
الله علیه وسلّم قطّ إلّا ذکرت
القراطیس المثنّیة بعضها علی
بعض.... ما رأیت رجلاً مثله متجرّداً
کأنّه فلقة قمر...... یفترش
رجله الیسری حتّی یری ظاهرها
أسود........... شدید البطش
.... ینقص من شاربه لا یضحک
إلّا تبسّماً ولا یلتفت إلّا جمیعاً.......
.... کان حسن الوجه حسن الصّوت

سرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ باچھیں بہت خوبصورت
تھیں۔ سرمگیں آنکھیں تھیں چہرے کے نقوش بہت حسین
تھے آپ کی داڑھی یہاں سے یہاں تک بھری ہوئی تھی
(یہ کہہ کر راوی نے اپنی دونوں کنپٹیوں کی طرف اشارہ کیا
جس سے اس کا گلا ڈھک گیا)
جب آپ چلتے تو بڑے اطمینان سے چلتے تھے اور کسی
طرح کا کسل (چال میں) نہ ہوتا تھا آپ کا گورا رنگ
ملاحت لیے ہوئے تھا۔ آپ نہ موٹے تھے نہ دُبلے تھے
.... میں نے کوئی سخی کوئی دلیر، بہادر، رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کشادہ رو نہیں دیکھا..... آپ کی
داڑھی میں اور پیشانی پر سفید بال تھے اور ایسے تھے کہ
اگر میں انھیں گننا چاہتا تو گن سکتا تھا.... آپ کے
سر اور داڑھی کے بال گھنے سیاہ تھے.... جب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داہنی طرف سلام پھیرتے تھے تو
آپ کے گالوں پر (بالوں کی) سفیدی دیکھی جا سکتی تھی اور جب
بائیں جانب سلام پھیرتے تو آپ کے بائیں رخسار کی سفیدی
نظر آتی تھی.... جب کبھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا شکم مبارک دیکھا مجھے ایک دوسرے میں لپٹی ہوئی مصری
چادریں (قرطاس) یاد آ گئیں...... میں نے آپ
کے پیروں جیسے کسی کے ننگے پیر نہیں دیکھے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ دو چاند کے ٹکڑے ہیں.......
آپ اپنا بایاں پاؤں فرش پر پھیلاتے تھے (نماز کے
قعود کی حالت میں) تو اس کی پشت کی کچھ سیاہی ظاہر ہوتی
تھی۔.... آپ کی گرفت سخت تھی.... اپنی مونچھیں تراشتے
تھے کبھی (زور سے) نہ ہنستے تھے بس ہلکی مسکراہٹ ہوتی تھی۔
اور جب کسی طرف مڑتے تھے تو پورے ملتفت ہو جاتے

ولم يكن بمرجّع وكان يمدّ بعض المد...... لا يُصلّي شيئاً من صلاته وهو جالس فلما دخل في السنّ جعل يجلس حتى اذا بقي من السورة اربعون آية اوثلاثون آية قام فقرأها ثم سجد...... كان إذا سجد يُرى بياض إبطيه ..... يسجد في أعلى جبهته مع قصاص الشعر...... كان فخماً مفخماً يتلألأ وجهه تلألؤ القمر ليلة البدر أطول من المربوع وأقصر من المشذّب عظيم الهامة رجل الشعر إن انفرقت عقيصته فرق وإلّا فلا يجاوز شعره شحمة اذنيه إذا هو وفّره، أزهر اللون، واسع الجبين أزج الحواجب سوابغ في غير قرن بينهما عرق يدره الغضب أقنى العرنين- له نور تعلوه يحسبه من لم يتأمله أشمّ، كثّ اللحية، ضليع الفم، مفلّج الأسنان، دقيق المسربة كان عنقه جيد دمية في صفاء الفضة معتدل الخلق بادن متماسك سواء البطن والصدر، عريض الصدر .... انور المتجرد، موصول مابين

تھے۔ آپ کا چہرہ بہت حسین تھا، آواز بہت دلکش تھی، آپ الفاظ کو چباتے نہ تھے بلکہ الفاظ کو کسی قدر کھینچ کر ادا فرماتے تھے...... کبھی آپ نے بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی۔ مگر جب سن شریف زیادہ ہو گیا تو (نماز میں) بیٹھنے لگے تھے مگر جب سورۃ میں تیس چالیس آیات باقی رہ جاتی تھیں تو کھڑے ہو کر پڑھنے لگتے پھر سجدے میں جاتے...... جب آپ سجدے میں جاتے تھے تو دونوں بغلوں کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی - آپ اپنی پیشانی سے بالائی حصے سے سجدہ کرتے تھے جس میں تھوڑی سی بالوں کی لٹ بھی شامل ہو جاتی تھی...... آپ الفاظ کو زور دے کر ادا فرماتے...... آپ کا چہرہ ایسے چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔ آپ پستہ قد سے بلند تھے اور لمبے قد والے سے چھوٹے تھے (درمیانہ قد تھا) سر بڑا تھا بال ہلکے گھونگھر والے تھے اگر آپ کے بالوں کی لٹ کھلتی تھی تو بال نرم نظر آتے تھے ورنہ نہیں آپ کے گیسو کان کی لَووں سے نکلے ہوئے ہوتے تھے جب آپ انھیں بڑھاتے تھے۔ رنگ چمکتا ہوا تھا، کھلی ہوئی پیشانی تھی لمبی گھنی بھویں تھیں مگر ملی ہوئی نہ تھیں۔ اُن کے بیچ میں پسینہ رہتا تھا جو غصے کی حالت میں حرکت کرتا تھا ناک کا بانسہ اٹھا ہوا تھا۔

اس میں ایسی چمک تھی کہ جو اس پر غور نہ کرے وہ آپ کو مغرور سمجھے گھنی داڑھی تھی دہن کشادہ تھا دانت کھلے کھلے تھے سینے اور شکم کے درمیان بالوں کی پتلی لکیر تھی آپ کی گردن لمبی پتلی اور خوب صورت تھی اور اپنی صفا میں چاندی جیسی نظر آتی تھی۔ آپ متناسب الاعضا تھے ٹھہرا ہوا بدن تھا سینہ اور شکم برابر تھا سینہ چوڑا تھا...... آپ کا جسم اکہرا خوش نما تھا۔

اللّبة والسرة بشعر يجرى كالخط
عارى الثـديين والبطن ممّا
سوى ذلك اشعر الذّراعين و
المنكبين وأعالى الصدر، طويل
الزندين رحب الراحة، سبط القصب
......سائل الاطراف خُمصان إلّا
خمصين مسيح القدمين ينبوعنها
الماء اذا زال قلعاً، يخطو تكفوًا
ويمشى هوناً ذريع المشية
إذا مشى كانّما ينحطّ من صبب
......خافض الطرف نظره الى
الارض أطول من نظره
الى السّما يعنى جُلّ نظره
الملاحظة، يسبق اصحابه
يبدر من لقيه بالسّلام......
متواصلًا للاحزان، دائم الفكرة
ليست له راحة لايتكلّم فى
غير الحاجة طويل السّكت يفتتح الكلام
ويختمه بأشداقه ويتكلّم بجوامع
الكلام فضلٌ لافضول ولاتقصير
دمثاً ليس بالجافى ولا المهين يُعظّم
النعمة وان دقّت لايذمّ منها شيئاً
لايذم ذواقا ولا يمدحه، لاتغضبه
الدّنيا وماكان لها فاذا
تعوطى الحقّ لم يعرفه أحد
ولم يقم لغضبه شيء حتى

ہنسلی سے ناف تک بالوں کی ایک لکیر تھی اس کے سوا
چھاتیوں پر اور شکم پر بال نہیں تھے دونوں بازوؤں اور
کندھوں پر بال تھے اور سینے کے اوپری حصے پر تھے آپؐ
کے ہاتھ لمبے تھے ہتھیلی چوڑی تھی گیسو لمبے تھے
.... نگاہیں نیچی تھیں پیٹ بہت دبا ہوا تھا۔ پیروں
میں پسینہ بہت آتا تھا۔ جب آپؐ چلتے تو آگے کو
جھکے ہوتے تھے اور جما کر قدم رکھتے تھے۔ پُروقار
انداز میں چلتے تھے، رفتار میں تیزی تھی اور ایسے
چلتے تھے جیسے بلندی سے اُتر رہے ہیں .....
نگاہیں نیچی تھیں اور زمین کی طرف آپؐ کی نگاہ
اس سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی جتنی آسمان
کی طرف ہوتی تھی۔ آپؐ کی نگاہ زیادہ تر گوشۂ
چشم سے ہوتی تھی۔ آپؐ اپنے ساتھیوں سے
آگے رہتے تھے اور راستے میں جو ملتا تھا اُسے سلام کرنے میں
پہل کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ غمگین نظر آتے تھے اور فکر میں رہتے
تھے کبھی ہشاش بشاش نہ رہتے بے ضرورت گفتگو نہ فرماتے،
طویل خاموشی میں رہتے، کلام کا آغاز اور اختتام کرتے ہوئے
آپ کی باچھیں کھلی تھیں اور نہایت فصیح گفتگو فرماتے تھے
جس میں نہ کوئی لفظ فالتو ہوتا تھا نہ کوئی فضول بات ہوتی
تھی نہ کوئی کمی رہتی تھی۔ نہایت نرم خو تھے کلام میں نہ کھراپن
تھا نہ کمزوری تھی ہر نعمت کی تعظیم کرتے تھے چاہے وہ تھوڑی
ہی ہو اور کبھی ہرگز اس کی بُرائی نہ کرتے تھے۔ کسی ذائقے کی
نہ بُرائی کرتے تھے نہ تعریف کرتے تھے۔ دنیا اور اس کی چیزیں
آپ کو خشمگیں نہ کرتی تھیں جب آپ کو حق مل جاتا تھا تو کسی کو
پتا بھی نہ چلتا تھا (یعنی اترا کر اس کا تذکرہ نہ کرتے تھے) اور آپؐ
کو غصہ آتا تو کوئی شے غلبہ حاصل کرنے میں مانع نہیں ہو سکتی تھی۔

يَنتصِرُ له، لا يغضب لنفسه
وَلا يَنْتَصِرُ لها، إذا أشار
أشار بكفه كلها وإذا تعجّب
قلبها وإذا تحدّث اتّصل
بها، يضرب براحته
اليمنى باطن إبهامه اليسرى
وإذا غضب أعرض وأشاح
وإذا فرح غضّ طرفه، جُلُّ
ضحكه التبسّم ويفترُّ عن
مثل حَبِّ الغمام.........
كان دخوله لنفسه مأذوناً له في
ذلك فكان إذا أوى إلى منزله
جزّأ دخوله ثلاثة أجزاء جزءاً
لله، وجزءاً لأهله وجزءاً
لنفسه ثم جزّأ جزءه
بينه وبين الناس فيرد
ذلك على العامة بالخاصة
ولا يدّخر عنهم شيئاً وكان
من سيرته في جزء الأمّة
إيثار أهل الفضل ناديه
وقسمه على قدر فضلهم في
الدّين فمن هم ذو الحاجة
ومنهم ذو الحاجتين ومنهم
ذو الحوائج فيتشاغل بهم ويشغلهم
فيما أصلحهم والأمّة من مسألته عنهم
وإخبارهم بالذي ينبغي لهم ويقول

مگر یہ غصہ اپنے نفس کے لیے نہ تھا نہ اس میں غلبہ پانے کی
کوشش فرماتے تھے (یعنی کامل بے نفسی تھی) جب آپ اشارہ
کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے اور جب تعجب کا
اظہار فرماتے تو ہتھیلی کو اُلٹا کرتے اور جب گفتگو فرماتے
تو دونوں ہتھیلیوں کو باہم ملا اور دائیں ہتھیلی پر اپنے
بائیں انگوٹھے کا نچلا حصہ مارتے تھے اور جب غصہ ہوتے تو
اعراض کرتے اور نگاہ بچاتے تھے جب خوش ہوتے تو نگاہیں
نیچی کرلیتے۔ آپ کی ہنسی ہلکی مسکراہٹ سے زیادہ نہیں ہوتی
تھی اور دانت اولے کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ آپ
اپنی خلوت میں (اللہ کی طرف سے) اپنے اوقات کے مالک تھے مگر
جب آپ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے
(گھر میں رہنے کے اوقات کو) تین حصوں میں تقسیم
کر دیتے۔ ایک حصہ اللہ کے لیے، دوسرا اہلِ
بیت کے لیے تیسرا اپنے لیے ——— پھر اپنے
حصے کو بانٹ کر کچھ اپنے لیے اور کچھ دوسرے لوگوں
کے لیے کر دیتے اور اُسے خاص طور سے عوام پر
خرچ کرتے اور (عام لوگوں سے) کوئی چیز بچا کر
نہ رکھتے اور آپ کی سیرت یہ تھی کہ امت کے
حصے میں سے اہلِ فضل کو ترجیح دیتے تھے
اور اُن کا حصہ دین میں ان کی فضیلت کے
بقدر ملتا تھا ان میں ایک حاجت والے بھی ہوتے،
دو حاجتوں والے بھی اور زیادہ حاجتوں والے
بھی۔ آپ اُن کا درد بٹاتے اور انھیں اس کام میں
لگاتے جو اُن کے لیے اور امت کے لیے
بہتر ہوتا اور انھیں بتاتے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے
اور فرماتے کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ اُن لوگوں تک یہ بات

لِيُبَلِّغ الشاهد الغائب۔ وأبلغوني حاجةَ من لا يستطيع إبلاغي حاجته فانّه من ابلغَ سلطاناً حاجة من لا يستطيعُ إبلاغها إيّاهُ ثبّتَ الله قدميه يوم القيامة۔ لا يُذكر عنده الّا ذٰلك ولا يُقبَل من أحدٍ غيره يدخلون رُوّاداً ولا يفترقون الّا عن ذَواق و يخرجون أدلّه...... كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يخزن لسانه إلّا مِمّا يُعينهم و يؤلّفهم ولا يُفرّقهم ويكرم كريم كلّ قوم و يوليه عليهم و يحذّر النّاس ويحترس منهم من غير أن يطوي عَنْ أحدٍ بِشره ولا خُلقَه وَيَتَفقَّد أصحابه ويسأل النّاس عمّا في النّاس ويحسّن الحسَن ويقويه ويُقبّح القبيحَ وَيوهنه، معتدل الأمر غير مختلف، لا يَغفل مخافة أن يغفلوا، لكلّ حال عنده عتاد، لا يقصر عن الحقّ ولا يجوزه الّذين يلونه من النّاس خيارهم، أفضلهم عنده أعمّهم نصيحة، و أعظمهم عنده منزلة أحسنهم مواساة ومؤازرة۔

پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اور فرماتے کہ ان لوگوں کی حاجتیں میرے پاس لاؤ جو اپنی حاجت مجھ تک نہیں پہنچا سکتے اور جو شخص ایسا کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی غیر مستطیع کی حاجت بادشاہ تک پہنچاتا ہے اللہ قیامت کے دن اُسے ثابت قدم رکھے گا آپکے سامنے اس سوا اور کسی بات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا اور دوسروں سے بھی آپ اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے لوگ آپکی مجلس میں حاجتیں لیکر آتے تھے مگر جب وہاں سے اٹھتے تھے تو ایک مزہ لیکر اٹھتے تھے اور رہنما بن کر نکلتے تھے..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کلام سے) اپنی زبان کو روکتے تھے مگر جہاں اس سے لوگوں کو مدد ملے اور اُن کی دلداری ہو اور اُن میں انتشار پیدا نہ ہو (وہاں کلام فرماتے تھے)۔ آپ ہر قوم کے سردار کی عزت کرتے تھے اور اُسے اُن کا حاکم مقرر کرتے تھے آپ لوگوں سے احتیاط کرتے تھے اور چوکنا رہتے تھے مگر کوئی شخص آپ کے چہرے سے یا اخلاق سے اس احتیاط کا پتا نہیں لگا سکتا تھا۔ آپ اپنے اصحاب کے حالات کی پوچھ گچھ کرتے تھے اور لوگوں سے اُن کے معاملات کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے اچھی چیز کو پسند فرماتے بُری چیز سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے اور اسے حقیر سمجھتے تمام امور میں اعتدال برتتے اور یہ نہ تھا کہ کبھی کچھ کرتے کبھی کچھ۔ آپ اس اندیشہ سے غفلت نہ کرتے تھے کہ کہیں اور لوگ بھی غافل نہ ہو جائیں ہر حال کا سامان آپ کے پاس تھا۔ حق سے کبھی کوتاہی نہ کرتے اور کبھی دین (کا اصول) آپ سے تجاوز نہ کرتا تھا۔ آپکے پاس اچھے لوگ آتے تھے اور اُن میں سب سے افضل آپ کے نزدیک وہ ہوتا تھا جس کی خیر خواہی خلق زیادہ عام ہوتی تھی۔

......كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم لا يجلس ولا يقوم إلاّ على ذكرٍ، لا يُوطنُ الأماكن بنهى عن إيطانها وإذا انتهى إلى قوم جلس حيث انتهى به المجلس ويأمر بذلك يعطى كلّ جلسائه بنصيبه لا يحسب جليسُه أن أحداً أكرم عليه منهُ من جالسه أو فاومه في حاجةٍ صابره حتّى يكون هو المُنصرفُ ومن سأله حاجة لم يردّه إلاّ بها أو بميسور من القول، قد وسع الناس منه بسطه وخلقه فصار لهم أباً وصاروا في الحق عنده سواءً مجلسه مجلس حلم وحياء وصبر وأمانة لا تُرفعُ فيه الأصوات ولا تؤبّن فيه الحُرَم ولا تُنثى فلتاته متعادلين يتفاضلون فيه بالتقوى متواضعين يوقّرون فيه الكبير ويرحمون فيه الصغير، ويؤثرون ذا الحاجة، ويحفظون أو يحوطون الغريب۔

...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے بیٹھتے ذکر کرتے تھے کسی ممنوع جگہ پر نہ ٹھہرتے تھے جب کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے تھے اور اسی کا اپنے اصحاب کو حکم فرماتے تھے۔ اپنے تمام اہلِ مجلس کو ان کا حصہ دیتے تھے اور کوئی بیٹھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ دوسرا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سے زیادہ مکرم ہے، جو کوئی آپؐ سے ملتا تھا یا کسی حاجت میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا، آپ کو صابر پاتا تھا یہاں تک کہ وہ خود ہی پلٹ (کر چلا) جائے۔ جو کوئی آپ سے کچھ سوال کرتا تھا اُسے کبھی ردّ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ اس کی حاجت پوری کر دیں یا اُسے بہت نرم جواب دے دیں۔ لوگوں کے لیے آپ کی سادگی اور آپ کا اخلاق ایسا وسیع تھا کہ آپ اُن کے باپ کی طرح ہو گئے تھے اور وہ سب آپ کے لیے معاملۂ حق میں برابر تھے۔ آپ کی مجلس حلم و حیا اور صبر و امانت کی مجلس تھی۔ کوئی وہاں اونچی آواز سے نہ بولتا تھا نہ وہاں کسی کی عیب جوئی یا الزام تراشی کی جاتی تھی۔ نہ غیبت ہوتی تھی نہ کلام میں خوردہ گیری۔ سب انصاف پسند تھے جو تقوے سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے تھے، خاکسار تھے اپنے بزرگوں کا احترام کرتے تھے اپنے چھوٹوں پر رحم کرتے تھے حاجت مند پر ایثار کرتے تھے، مسافر کی حفاظت اور نگہبانی کرتے تھے۔

........كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم دائم البِشرِ، سهل الخُلقِ، ليّن الجانب ليس بفظ ولا غليظ ولا صخّاب ولا فحّاش ولا عيّاب، يتغافل عمّا لا يشتهي ولا يدلّس منه ولا

..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کشادہ رُو تھے، نرم اخلاق والے، ملائم پہلو والے، کھرّے اور سخت نہ تھے نہ شور مچانے والے اور فحش گو اور عیب جُو تھے جس چیز کو آپ ناپسند فرماتے اُس سے تغافل فرماتے تھے نہ اُس سے خود کو آلودہ

يجنب فيه، قد ترك نفسه من ثلاث: المراء والاكثار وممّا لا يعنيه، وترك الناس من ثلاث: كان لا يذمّ أحداً ولا يعيّره ولا يطلب عورته ولا يتكلّم إلّا فيما رجا ثوابه، إذا تكلّم أطرق جلساؤه كأنّما على رؤسهم الطير، فاذا سكت تكلّموا ولا يتنازعون عنده من تكلّم أنصتوا له حتى يفرغ حديثهم عنده، حديث أوّليتهم يضحك ممّا يضحكون منه ويتعجّب ممّا يتعجّبون منه، ويصبر للغريب على الجفوة في منطقه ومسألته حتى اذا كان أصحابه ليستجلبونهم ويقول: إذا رأيتم طالبَ الحاجة يطلبها فأرفدوه ولا يقبل الثناء إلّا من مكافئ، ولا يقطع عن أحد حديثه حتى يجوز فيقطعه بنهي أو قيام۔

......كان سكوت رسول الله صلى الله عليه وسلّم على اربع: على الحلم والحذر والتقرير والتفكر. فأمّا تقريره ففي تسوية النظر والاستماع من النّاس وأمّا تذكّره أو تفكّره ففيما يبقى ويفنى وجمعَ الحلم والصبر كان لا يُغضبه شئ ولا يستنفره، وجُمع له الحذر في

کرتے نہ اس کی طرف مائل ہوتے۔ آپؐ نے اپنے آپ کو تین باتوں سے چھڑا لیا تھا جھگڑے سے، طلب مال سے، اور بیہودہ باتوں سے۔ اور تین باتوں میں لوگوں کو چھوڑ دیا تھا: آپ کسی کی بُرائی نہ کرتے تھے نہ اس پر عیب لگاتے تھے نہ اس کی ڈھکی چھپی باتوں کو دیکھنا چاہتے تھے اور نہ کسی سے ایسی کوئی بات کرتے تھے جس میں ثواب کی امید نہ ہو جب آپؐ کلام فرماتے تو تمام اصحاب یوں سر جھکائے رہتے جیسے اُن کے سروں پہ پرندے بیٹھے ہوں جب آپ خاموش ہوتے تب وہ کلام کرتے تھے اور آپ کے سامنے جھگڑا نہیں کرتے تھے کوئی بولتا تھا تو اُسے چپ کرا دیتے تھے تاآنکہ آپ سے اُن کی بات تمام ہو جائے۔

جس بات پر سب ہنستے تھے آپ بھی ہنستے تھے اور جسے سب پسند کرتے آپ بھی کرتے تھے اگر کوئی پردیسی آنکلتا تو گفتگو میں اس کے گنوارپن کو اور اس کے سوال کو صبر سے برداشت کرتے تھے یہاں تک کہ اصحاب اُن کے لیے سبب بن جاتے تھے آپؐ فرماتے کہ جب تم کسی طالب حاجت کو دیکھو کہ وہ کچھ طلب کر رہا ہے تو اُس کے ساتھ لگ جاؤ آپ کسی سے تعریف سننا پسند نہ فرماتے مگر وہ جو بدلہ میں ایسا کرتا۔ نہ کسی کی بات کاٹتے جب تک کہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے اس وقت کسی بات سے روکنے یا کوئی حکم دینے کے لیے ایسا کرتے تھے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت چار چیزوں میں تھا حلم میں، پرہیز میں، تقریر میں، تفکر میں۔ آپ کی تقریر لوگوں کے سننے اور دیکھنے میں برابر تھی اور آپ کا تذکر و تفکر فنا و بقا میں تھا۔ آپؐ نے حلم اور صبر کو جمع کر لیا تھا اور کوئی شے آپ کو غضب ناک نہیں کر سکتی تھی نہ آپ کسی شے کی طلب کرتے تھے اور آپ کا پرہیز چار چیزوں میں جمع کر دیا گیا تھا: نیکی کا اختیار کرنا تاکہ

ارلع، أخذہ بالحسنی لیقتدی بہ و ترکہ القبیح لینتاھی عنہ، واجتہادہ الرأی فیما أصلح أمتہ والقیام فیما جمع لھم الدنیا والآخرۃ[۱]

اس کا اتباع کیا جائے اور بُرائی سے بچنا تاکہ اس سے دوسرے بھی بچیں اور آپؐ کی رائے کا اجتہاد اس چیز میں جو امّت کے لئے اصلح ہو اور اُن باتوں کا حکم جن میں دین و دنیا دونوں جمع ہوگئے ہوں۔

اسی طرح ابن سعد نے ایک فصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کاندھوں کے درمیان مہر نبوت کے بارے میں روایات دی ہیں۔ آپؐ کے بالوں کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں اُنھیں علٰحدہ جمع کر دیا ہے[۲] اور آپؐ کے سر مبارک اور ریش مقدس میں جو سفید بال تھے اُن کا وصف جداگانہ فصل میں بیان ہوا ہے[۳] بعض روایتوں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے۔ ابن سعد نے ایسی مرویات کو بھی یک جا کر دیا ہے[۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کو ابتدا ہی میں محفوظ رکھنے کا اہتمام ہوا ہے۔ عثمان بن عبداللہ بن موہب کہتے ہیں کہ ہم حضرت امّ سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایک تھیلی نکالی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے اور ان پر مہندی کا رنگ کیا ہوا تھا۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے موئے مبارک دیکھا تو وہ سرخ رنگ کا تھا اور مجھے یہ بتایا گیا کہ خوشبوؤں کے اثر سے اس کا ایسا رنگ ہوگیا ہے[۵] بالوں کے اور اُن میں خضاب کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث روایت کی گئی ہیں جن میں آپ نے فرمایا کہ یہودیوں، عیسائیوں سے اور اہلِ عجم سے مماثلت نہیں ہونی چاہیے[۶]

الفضل بن دُکین نے اپنے شیوخ سے روایت کی ہے کہ آں حضرتؐ مونچھوں کی صفائی اطراف (کناروں) سے کرتے تھے۔ یأخذ الشارب من اطرافہ[۷]

آپ کو سفید لباس پسند تھا[۸] کبھی سرخ جوڑا بھی زیب تن فرماتے تھے[۹] بعض روایات سے زعفرانی لباس پہننا بھی ثابت ہے[۱۰]

یصبغ ثیابہ کلھا بالزعفران حتی العمامہ۔

آپ اپنا سارا لباس زعفران سے رنگتے تھے حتیٰ کہ عمامہ بھی[۱۱]

حضرت اسماء بنت ابی بکر کے مولیٰ عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبّہ

---

[۱] الطبقات الکبیر ج ۱/ ۴۱۰ - ۴۲۵ ۔ [۲] ایضاً ۱/ ۴۲۷ - ۴۳۱ ۔
[۳] ایضاً ۱/ ۴۳۱ - ۴۳۶ ، [۴] ایضاً ۱/ ۴۳۷ - ۴۳۸ ۔
[۵] ابن سعد ۱/ ۴۳۷ ، [۶] ایضاً ۱/ ۴۳۹ ، [۷] ایضاً ۱/ ۴۴۹ ، [۸] ایضاً ۱/ ۴۴۹ ۔
[۹] ایضاً ۱/ ۴۵۰ ، [۱۰] ایضاً ۱/ ۴۵۱ ، [۱۱] ایضاً ۱/ ۴۵۳

محفوظ تھا۔ یہ رسول اللہؐ سے حضرت عائشہؓ کو ملا تھا اور ان سے اسمأ بنت ابی بکرؓ کو۔ اس کا دھوون بطور تبرک مریضوں کو پلایا جاتا تھا[1]۔ بعض روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ سیاہ پگڑی باندھے ہوئے تھے[2]۔ نماز میں سجدہ کرتے ہوئے آپؐ اپنی پگڑی پیشانی سے اوپر سرکا لیا کرتے تھے[3]۔ آپ کے عمامے کی چھور دونوں کندھوں کے درمیان لٹکی رہتی تھی[4]۔ عروۃ بن الزبیر کہتے ہیں کہ آپؐ کو ایک عمامہ ہدیہ میں دیا گیا جس میں کلغی لگی تھی آپ نے اسے کاٹ دیا، پھر عمامہ پہنا[5]۔ ایک بار آپؐ کو ریشمی قبا نذر کی گئی آپ نے اسے پہن کر نماز پڑھی اور (نماز سے واپس آکر) ناپسندیدگی کے ساتھ اسے بہت تیزی سے اتار کر پھینکا اور فرمایا "پرہیزگار کے لیے اس کا پہننا مناسب نہیں[6]۔"

عروۃ بن الزبیرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی چادر جسے پہن کر وفود سے ملاقات کیا کرتے تھے حضرموت کی بُنی ہوئی تھی یہ طول میں چار گز اور عرض میں دو گز ایک بالشت کی تھی۔ اسے خلفأ نے محفوظ رکھا اور وہ عیدین کے موقع پر اسے پہنا کرتے تھے۔ یہ بہت پرانی اور بوسیدہ ہو گئی تھی[7]۔

ابن عباسؓ نے ہمیں آپؐ کی قمیص کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ چھوٹی اور تنگ آستینوں کی تھی اور زیادہ لمبی نہ تھی[8]۔ آپؐ گھر میں کوئی ایسی چیز دیکھتے جس پر صلیب کا نشان ہوتا تو اسے توڑ دیتے تھے[9]۔ دنیا کے عیش و آرام سے آپؐ کو قطعاً رغبت نہیں تھی۔ فرمایا:

ما أنا والدنیا إلّا کراکبٍ	مجھے دنیا سے کیا لینا ہے، میری مثال تو اس سوار کی
استظل تحت شجرۃٍ ثم راح	سی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے سائے
وترکھا[10]	میں بیٹھ جاتا ہے پھر اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔

نافع مولی ابن عمر نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ ابتدأ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی تھی اور اس کا نگینہ آپؐ ہتھیلی کی طرف چھپا کر رکھتے تھے۔ جب اسے اپنے داہنے ہاتھ میں پہنتے تھے۔ پھر اور اصحاب نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوانی شروع کر دیں تو آپؐ نے ایک دن منبر پر بیٹھ کر وہ انگوٹھی اپنے دست مبارک سے نکال اور فرمایا کہ:

إنّی کنت ألبس ھذا الخاتم وأجعل	میں یہ انگوٹھی پہنا کرتا تھا اور اس کا نگینہ اپنی ہتھیلی کی طرف
فصّہ من باطنِ کفّی، فرمی بہ	(چھپا کر) رکھتا تھا پھر آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا:
وقال: واللہ لا ألبسہ أبداً[11]	خدا کی قسم اب اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔

---

[1] الطبقات ابن سعد ۱/۴۵۴، [2]، [3] الطبقات الکبیر ۱/۴۵۵، [4] ایضاً ۱/۴۵۶
[5] الطبقات ۱/۴۵۶، [6] ایضاً ۱/۴۵۷، [7] ایضاً ۱/۴۵۸۔
[8] ایضاً ۱/۴۵۹، [9] ایضاً ۱/۴۶۵، [10] ایضاً ۱/۴۶۷،
[11] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۰۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ آپ نے قیصر کی طرف ایک خط بھیجا جس پر مُہر نہیں لگائی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ اگر آپ کا خط مہر لگا ہُوا نہیں ہوگا تو اُسے پڑھا نہیں جائیگا۔ تب آپ نے چاندی کی ایک مہر تیار کرائی اور اس پر "محمد رسول اللہ" کندہ کرایا[1]
یہ مُہر آپ کے بعد خلفائے راشدین کے پاس رہی۔ حضرت عثمان غنی رضؓ کے ہاتھ سے بئراریس میں گر گئی۔ اُنھوں نے اس کنوئیں کی صفائی میں تین دن تک بہت مبالغہ کیا مگر وہ انگوٹھی نہ ملنی تھی نہ ملی[2] حضرت عثمان رضؓ نے اس کے بعد وہ کنواں پٹوا دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ کے لیے یہ انگوٹھی سعید بن العاص حبشہ سے لائے تھے اور انتقال کے وقت یہی انگشتری آں حضرتؐ کے دست مبارک میں موجود تھی۔ حضرت علی رضؓ نے اپنے زمانے میں اسی انداز کی اپنی انگشتری بنوائی تھی۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تاکہ وہ احکام اسلام کی تعلیم دیں تو اُن کے ہاتھ میں بھی ایک چاندی کی انگوٹھی تھی جسے وہ احکام پر لگا دیا کرتے تھے اور اس انگوٹھی پر بھی "محمد رسول اللہ" کندہ کیا ہوا تھا۔ اس پر رسول اللہ صؐ نے فرمایا تھا کہ معاذؓ کی ہر چیز ایمان لے آئی ہے حتیٰ کہ انگوٹھی بھی[3]
الفضل بن دُکین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نعل مبارک حضرت انس بن مالک کے پاس محفوظ تھے[4] دوسری روایت سے ظاہر ہے کہ ۱۱۰ھ یا ۱۱۱ھ تک یہ نعلین موجود تھے۔ یہ فاطمہ بنت عبید اللہ بن عباس کے پاس تھے[5] روایات کہتی ہیں کہ آپؐ نماز ننگے پاؤں بھی پڑھتے تھے اور جوتے پہن کر بھی پڑھتے تھے۔

کان اکثر صلوات النبی صلی اللہ علیہ وسلّم فی نعلیہ[6]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اکثر جوتے پہن کر نماز پڑھتے تھے۔

آپؐ کے پاس ایک ہاتھی دانت کی کنگھی تھی جس سے بالوں کو سنوارتے تھے[7] ابن شہاب الزہری نے عُبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت کیا کہ مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو ہدایا بھیجے تھے ان میں ایک چینی کا پیالہ بھی تھا جس میں آپ پانی پیا کرتے تھے[8] ایک پیالہ انس بن مالک کے پاس تھا جس میں کچھ چاندی تھی یا چاندی کا تار باندھا گیا تھا۔ ایک خوشبو لگانے کا پیالہ پیتل کا تھا[9]

ابن سعد نے آپؐ کی تلواروں، زرہ بکتر، ڈھال، نیزے، خنجر، گھوڑے اور اونٹوں کے لیے بھی علٰحدہ علٰحدہ باب رکھے ہیں۔

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۱۔
[2] الطبقات ۱/۴۷۳۔ اریس ایک کنوئیں کا نام ہے یہ مدینہ میں واقع تھا اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھٹے سال میں یہ انگشتری اس کنوئیں میں گری تھی۔ اریس غالباً عبرانی زبان کا لفظ ہے اور بظاہر یہ کوئی یہودی نام ہے۔ یہ کنواں حضرت عثمان کی جاگیر میں واقع تھا۔
(معجم البلدان ۱/۲۹۸)
[3] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۶، [4] ایضاً ۱/۴۷۸، [5] ایضاً ۱/۴۷۹، [6] ایضاً ۱/۴۸۰، [7] ایضاً ۱/۴۸۴۔
[8] ایضاً ۴۸۵، [9] ایضاً ۱/۴۸۵۔

وہ کہتا ہے کہ جنگ اُحد کے وقت آپؐ کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جسے مدینہ میں بنو فزارہ کے ایک شخص سے دس اوقیہ میں خریدا تھا۔ اُس اعرابی نے گھوڑے کا نام ضرس (سخت مزاج تندخو) رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام سکب (سبک روح، چُست، پھرتیلا) رکھا[1]۔ بعد کو رسول اللہؐ کے پاس جو گھوڑے اور خچر رہے اُن میں ایک کا نام لزاز تھا یہ مقوقس نے ہدیہ کیا تھا، دوسرا اللحیف تھا یہ ربیعہ بن ابی البراءؓ نے آپؐ کو نذر کیا تھا۔ تیسرا الظرب تھا یہ فروۃ بن عمیر جذامی نے آں حضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا ایک گھوڑا تمیم الداری نے بھی نذر کیا تھا اس کا نام الورد تھا یہ آں حضرتؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو عطا فرما دیا تھا۔ ایک خچر عُفیر تھا جو مقوقس نے بھیجا تھا اور ایک دُلدُل تھا یہ حضرت معاویہؓ کے زمانے تک زندہ رہا[2]۔ الزھری کا بیان ہے کہ دُلدُل فروۃ بن عمر جذامی نے نذر کیا تھا۔

ایک بار عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم کو خط لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں کے نام لکھ بھیجو۔ ابوبکر بن حزم نے اُن تمام مرد، عورتوں اور غلاموں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کر کے بھیج دی جنھیں رسول اللہؐ کی خدمت کا شرف حاصل ہوا تھا[3]۔

ابن سعد نے مختلف روایتوں سے خدام کے یہ نام دیے ہیں:

ھند، اسماء، انس بن مالک، سلمی، خضرہ، رضوی، میمونہ بنت سعد، برکۃ (امّ ایمن) زید بن حارثہ، ابوکبشہ، انسنہ، سالح شُقران، سفینہ، ثوبان، رباح، یسار، ابورافع، فضالۃ، ابومویھبہ، رافع مولی سعید بن العاص، مدعم، کرکرۃ[4]۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں اور حجروں کا بیان ہوا ہے[5]۔ آں حضرتؐ کے نو گھر اور حجرے تھے ان میں ازواج مطہرات رہتی تھیں یہ گارے اور پکی اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی گورنری کے زمانے میں مسجد نبوی کی توسیع کرنے کے لئے ان کو ڈھایا گیا تھا۔ جب یہ گرائے جا رہے تھے تو سارا مدینہ ڈھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ ان حجروں کو مسجد میں شامل کرنے کے لئے الولید بن عبدالملک نے تحریری حکم نامہ بھیجا تھا[6]۔ ان حجروں کی چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ انھیں ہاتھ سے چھوا جا سکتا تھا۔ ان کے دروازوں پر بالوں کی کملی کے پردے پڑے تھے۔

(۶)

طبقات ابن سعد میں مغازی اور مدنی زندگی کا بیان

الطبقات الکبیر کی دوسری جلد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا کا بیان ہوا ہے۔ پہلے ابن سعد نے اس سے بحث کی ہے کہ کُل مغازی کی تعداد کتنی ہے یہ ۲۴ سے ۲۷ تک بتائی گئی ہے۔ پھر ہر غزوہ اور سریہ کے نام سے بحث کی ہے، اُن کا زمانہ وقوع کیا تھا اور اس میں کیا پیش آیا۔

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۴۹۰ ، [2] الطبقات ۱/۴۹۱ ، [3] ایضاً ۱/۴۹۷-۴۹۸ ، [4] ایضاً ۱/۴۹۸ ،
[5] ایضاً ۱/۴۹۹ ۔ [6] ایضاً ۱/۴۹۹ ۔

آپؐ نے پیر کے دن ۱۲ ربیع الاوّل کو مدینہ میں نزول فرمایا تھا بعض روایات ۲ ربیع الاول بتاتی ہیں[1] آپؐ نے ہجرت کے سات ماہ کے بعد (رمضان ۱ھ) پہلا جھنڈا حمزہ بن عبدالمطلب کے لیے تیار کیا جو سفید رنگ کا تھا۔

غزوۃ ذی العشیرہ (جمادی الآخرہ ۲ھ) ہجرت سے ۱۶ ماہ بعد ہوا اس موقع پر رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب کا لقب دیا تھا۔[2]

رجب ۲ھ میں ہجرت کے ۱۷ ماہ بعد سریہ عبداللہ بن جحش الاسدی پیش آیا عبداللہ بن جحش جو مال غنیمت لے کر آئے وہ تمام اصحاب میں تقسیم ہوا اور اس میں سے خمس بھی نکالا گیا۔ یہ اسلام میں پہلا خمس تھا[3]

۲ھ ہی میں غزوہ بدرالکبریٰ پیش آیا۔ اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا جو حضرت عثمانؓ سے منسوب تھیں[4]

بدر میں جو قیدی بنائے گئے تھے اُن کے لیے رسول اللہؐ نے یہ فدیہ مقرر کیا کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس وقت اہلِ مدینہ لکھنا نہیں جانتے تھے زید بن ثابت نے اسی سلسلے میں لکھنا سیکھا تھا۔ غزوہ بدر رمضان کے مہینے میں ہوا تھا اور یہ شدید گرمی کا زمانہ تھا۔ اس میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ بھی قضا کر دیا تھا[5]

جنگ اُحد میں اُبیّ بن خلف الجمحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل ہوا[6] شہدائے اُحد کے لیے گنج شہیداں بنایا گیا۔ ایک قبر میں کئی کئی شہید مدفون ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد سے واپس ہوتے تو مدینہ میں مغرب کی نماز پڑھی۔ اس وقت انصار کی عورتیں شہدائے اُحد کا ماتم کر رہی تھیں آں حضرت نے گریہ و ماتم کی آواز سنی تو فرمایا:

"لکن حمزۃ لا بواکی لہ" مگر حمزہ بن عبدالمطلب کے لیے تو رونے والیاں بھی نہیں ہیں۔

تب انصار کی عورتیں رسول اللہؐ کے گھر آئیں اور انہوں نے حضرت حمزہ کا ماتم کیا۔ اس دن سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کسی گھر میں موت ہوتی تھی تو پہلے سیدالشہداء حضرت حمزہ کا ماتم کیا جاتا تھا، پھر اپنی میت کو روتے تھے[7]

۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اس معاہدے کی تکمیل کے بعد قربانی کی رسم ادا کی گئی تھی[8] اسی موقع پر ایک پیڑ کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں لوگ وہاں جا کر نفل نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وہ پیڑ ہی کٹوا دیا تاکہ اُس جگہ کو عبادت گاہ نہ بنا لیا جائے[9] اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ تاریخی آثار و شواہد کو محفوظ رکھنے کا جذبہ شروع ہی سے موجود تھا۔

---

[1] یہ دس دن کا فرق شمسی اور قمری تقویم کی وجہ سے ہے۔

[2] الطبقات الکبیر ۲/۱۰، [3] ایضاً ۲/۱۱، [4] ایضاً ۲/۱۲، [5] ایضاً ۲/۲۱، [6] ایضاً ۲/۴۳،
[7] الطبقات ۲/۴۴، [8] ایضاً ۲/۱۸، [9] ایضاً ۲/۱۰۰۔

غزوۂ خیبر (سنہ ۷ھ) میں ہوا، اسی موقع پر زینب بنت الحارث نے جو سلام بن مشکم کی زوجہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے دیا تھا۔ آپ کے اصحاب میں بشر بن البراء اس زہریلے کھانے کی وجہ سے انتقال بھی کر گئے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ زینب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کر دیا[1] خیبر بھی رمضان میں ہوا۔ اس میں کچھ نے روزہ رکھا تھا اور کچھ مسلمانوں نے نہیں رکھا تھا[2]

خیبر کی اراضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں ہی کو نصف بٹائی پر دے دی تھی کیونکہ آپ کے پاس زمین کی نگرانی اور کاشت کے لئے عمال نہیں تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ یہود سازشوں میں ملوث ہیں تو رسول اللہؐ کے کئے ہوئے بٹائی کے معاہدے کو منسوخ کر دیا اور یہود کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا[3]

۲۰ رمضان سنہ ۸ھ جمعہ کے دن خانہ کعبہ فتح ہوا۔ آپ نے معاذ بن جبل کو تعلیم فقہ کے لئے مکہ میں مامور فرمایا۔ اس دن آپ حرم محترم میں بغیر احرام باندھے داخل ہوئے تھے[4] فتح مکہ میں مال غنیمت کچھ نہیں ملا تھا۔

حنین کے موقع پر (سنہ ۸ھ) شدید گرمی کا موسم تھا۔ اس میں مال غنیمت بہت ہاتھ آیا تھا جس کی تفصیل ابن سعد نے دی ہے[5] تقسیم اموال کے سلسلے میں انصار میں کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خطاب فرما کر مطمئن کیا۔ یہ پوری تقریر کتاب الکامل للمبرد میں بھی موجود ہے[6]

سریہ الطفیل بن عمرو الدوسی ایک بت ذوالکفین کو مسمار کرنے کے لیے تھا یہ بت طائف میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں جس سامان حرب کا بیان ہوا ہے۔ اس میں دبابہ اور منجنیق کے نام بھی ملتے ہیں[7] غزوہ طائف (شوال سنہ ۸ھ) کے حال میں لکھا ہے:

کان معه من نسائه ام سلمة وزينب فضرب لهما قبتين وكان يصلى بين القبتين حصار الطائف كله فحاصرهم ثمانية عشر يوما ونصب عليهم المنجنيق ونثر الحسك سقبين من عيدان حول الحصن[8]	آپ کے ساتھ ازواج مطہرات میں ام سلمہ اور زینب تھیں ان دونوں کے لیے دو ڈیرے لگا دیے تھے اور آپ دونوں ڈیروں کے بیچ میں نماز پڑھتے تھے آپ نے طائف کا محاصرہ ۱۸ دن تک کیا اور ان پر دو بلیاں گاڑ کر منجنیق نصب کر دی تھی جن سے کانٹے دار گولے برسائے جاتے تھے۔

دوسری روایت میں اس محاصرہ کی مدت چالیس دن بیان ہوئی ہے۔

غزوہ تبوک (سنہ ۹ھ) کے موقع پر ۳۰ ہزار پیادے اور ۱۰ ہزار سوار تھے۔ اس معرکے کے بعد بعض مسلمانوں نے اپنے ہتھیار فروخت کرنے شروع کر دیے اور یہ کہا کہ اب جہاد ختم ہو گیا رسول اللہؐ نے فرمایا:

---

[1] الطبقات ۲/۱۰۷، [2] ایضاً ۲/۱۰۶، [3] ایضاً ۲/۱۱۴، [4] ایضاً ۲/۱۴۰، [5] ایضاً ۲/۱۵۲،
[6] ایضاً ۲/۱۵۴، [7] ابن سعد ۲/۱۵۷، [8] ابن سعد ۲/۱۵۸،

لاتزال عصابة من أمتي يجاهدون على الحق حتى يخرج الدجال[1]

میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے لیے جہاد کرتا رہے گا تا آنکہ دجال ظاہر ہو جائے۔

ذی الحجہ ۹ھ میں آپؐ نے حجۃ الوداع کی تیاری کی اور حضرت ابوبکر صدیق کو امیر حج مقرر کیا۔ مقام عرج میں حضرت علی بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔

ابن سعد نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے اور ہر عمرہ ماہ ذی قعدہ میں کیا[2] آپ نے صرف ایک ہی حج کیا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ ۲۵ ذی قعدہ کو آپ مدینہ سے برآمد ہوئے۔ تمام ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں۔ اس موقع پر آپ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا جس کا متن ابن سعد نے مختلف روایتوں سے دیا ہے۔ بیت اللہ کا طواف آپ نے اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر کیا۔ چاہ زمزم کے پاس پہنچ کر ڈول سے پانی نکالا، اُسے نوش فرمایا اور باقی پانی میں اپنا لعاب دہن شامل کر کے کنوئیں میں واپس ڈال دیا۔

صفر ۱۱ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کی قیادت میں لشکر کی تیاری کا حکم دیا اسی زمانے میں آپؐ کی آخری علالت کا آغاز ہوا۔ اس وقت آپ حضرت میمونہ کے گھر میں تھے۔ آخری زمانے میں وحی متواتر آ رہی تھی ابن سعد نے یہ روایات بھی دی ہیں کہ لبید بن الاعصم یہودی نے آپ پر جادو کر دیا تھا اور اس کی خبر آپ کو وحی کے ذریعے دی گئی تھی[3]

ایک یہودی عورت نے جو زہر آپ کو دیا تھا اس کا اثر آخری وقت تک باقی تھا[4] بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ آپ کا مرض الموت ۱۳ دن رہا۔

آخری زمانے میں آپ جنت البقیع تشریف لے گئے شہداء کی قبروں پر ... آپ کی آخری دعا یہ تھی:

رب اغفر لي والحقني بالرفيق۔ اے اللہ مجھے بخش دے اور میرے رفیق سے ملا دے۔

آپ بے چینی سے بار بار اپنے سر اور سینے کو چھوتے تھے۔ بہت تیز بخار اور شدید درد سر تھا[5] کبھی معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے تھے[6] آخری بار دو اصحاب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد نبوی میں نماز ظہر پڑھنے کے لیے تشریف لائے حضرت ابوبکرؓ امامت کر رہے تھے[7] اور آپ حضرت عباسؓ اور حضرت علی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تشریف لائے تھے۔ ابن سعد کہتا ہے کہ

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى في مرضه بصلاة أبي بكر ركعة

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ مرض میں ابوبکر کے پیچھے نماز فجر کی ایک رکعت پڑھی اور دوسری رکعت

---

[1] ابن سعد ۲/۱۶۷، [2] ایضاً ۲/۱۶۸، [3] ایضاً ۲/۱۷۰/۱۷۱

[4] ایضاً ۲/۱۶۷، [5] ایضاً ۲/۲۰۳، [6] ایضاً ۲/۲۱۰

[7] ایضاً ۲/۲۱۱، [8] ایضاً ۲/۲۱۸۔

من الصبح ثم قضى الركعة الباقيه
قال محمد بن عمر: ورأيت هذا الثبت
عند أصحابنا أن رسول الله صلى الله
عليه وسلم صلى خلف أبي بكر[1]

قضا کی۔ الواقدی کہتا ہے کہ یہ ہمارے اصحاب (راویوں) کے نزدیک مسلّمات میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی امامت میں نماز پڑھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے سترہ (۱۷) نمازوں کی امامت کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے گھر کے سوا باقی سب دروازے جو مسجد نبوی میں کھلتے تھے بند کرا دیے گئے[2] حضرت عباس بن عبدالمطلب نے عرض کیا: "یا رسول اللہ آپ نے یہ دروازے کیوں کھلوائے تھے اور اب بند کیوں کرا دیے"۔

تو آپ نے فرمایا:

یا عباس ما فتحت عن أمری ولا
سددت عن أمری[3]

اے عباس نہ میں نے اپنی مرضی سے کھولے تھے نہ اپنی مرضی سے بند کیے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہؐ تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی مگر اُسے پہلے (جنّت میں) اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے اور (زندگی اور موت کے درمیان) اختیار دے دیا جاتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا اُن کا سرِ مبارک میرے گھٹنوں پر تھا، وہ تھوڑی دیر کے لیے غش ہو گئے پھر افاقہ ہوا تو گھر کی چھت کو دیکھتے رہے اور فرمایا:

اللھم الرفیق الأعلی

اے میرے اللہ، اے رفیق اعلیٰ!

اور یہ آخری الفاظ تھے جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے[4]

جب آپ کا مرض بڑھنے لگا تھا تو ازواجِ مُطہرات سے اجازت لے کر حضرت میمونہؓ کے گھر سے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے تھے، یہاں آپ الفضل بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے تھے[5]

ہشام بن عروۃ کی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے کہ ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے زمانے میں حبشہ کے ایک چرچ کا تذکرہ کیا جو ماریہ کا چرچ کہلاتا تھا، اور کہا کہ وہ بہت خوب صورت ہے اور اس میں تصاویر بھی ہیں، ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ یہ چرچ حبشہ میں دیکھ کر آئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا "یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور اُسے تصویروں سے آراستہ کرتے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک سب سے بُرے ہیں[6]"۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاؑ کی قبور کو مساجد بنا لیا، میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اور یہ فرمایا کہ

---

[1] ابن سعد ۲/۲۲۳، [2] ایضاً ۲/۲۲۷، [3] ایضاً ۲/۲۲۸۔
[4] ایضاً ۲/۲۲۹، [5] ایضاً ۲/۲۳۲، [6] ایضاً ۲/۲۴۰۔

لا یبقین دینان بأرض العرب — عرب کی زمین پر دو مذہب نہیں رہیں گے [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اصحاب نے یہ مشورہ کیا کہ آپ کو مسجد نبوی میں دفن کیا جائے لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے بار بار نکیر فرائی ہے کہ قبور انبیاء کو مسجد نہ بنایا جائے۔ تب یہ رائے قرار پائی کہ جس حجرے میں آپ کا وصال ہوا ہے اسی میں دفن کیا جائے [۲]

ابنِ سعد نے حدیث قرطاس بھی تفصیل سے بیان کی ہے۔ ابنِ عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعرات کو بیمار ہوئے تھے۔ جب درد شدید ہوا تو آپ نے ایک دن فرمایا: میرے پاس دوات اور صحیفہ [۳] (لکھنے کا سامان) لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک خط (کتاب) لکھ دوں تو تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

ائتونی بدواۃ وصحیفۃ أکتب لکم
کتابًا لا تضلوا بعدہ أبدًا۔ [۴]

حاضر الوقت اصحاب میں سے ایک نے کہا۔ [۵]

أن نبی اللہ لیہجر! قال فقیل لہ: ألا نأتیك بما طلبت؟ قال: أو بعد ماذا؟ قال فلم یدع بہ [۶]	رسول اللہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ اُن سے کہا گیا کیا جو کچھ طلب کیا گیا ہے وہ ہم نہ لائیں؟ کہا: اور پھر کیا؟ کہا: پھر (رسول اللہؐ نے) دوبارہ طلب نہیں فرمایا۔

حضرت ابن عباس ہی کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ جب دوات اور صحیفہ طلب فرمایا تو اصحاب نے آپس میں "تنازعہ" شروع کر دیا اور ایک پیغمبر کے سامنے ایسی تکرار مناسب نہ تھی کچھ اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"دعونی، فالذی أنا فیہ خیر مما تدعونی إلیہ واوصی بثلاث قال: أخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب وأجیزوا الوفد بنحو مما کنت أجیزھم وسکت عن الثالثۃ فلا ادری قالھا فنسیتھا او سکت عنھا عمدًا [۷]	مجھے چھوڑ دو، میں جس عالم میں ہوں وہ اس سے کہیں اچھا ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ پھر تین وصیتیں فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ دوسرے یہ جس طرح وفود کو اجازت دیتا تھا اسی طرح ان کو اجازت دی جائے اور تیسری بات سے خاموش رہے۔ اب یہ پتا نہیں کہ اُنہوں نے فرمایا اور میں بھول گیا یا وہی عمداً ساکت رہے۔

---

[۱] ابنِ سعد ۲/۲۴۰، [۲] ایضاً ۲/۲۴۱،

[۳] صحیفہ سے مراد پارچہ PARCHMENT ہے۔ کاغذ اس زمانے تک عرب میں نہیں پہنچا تھا۔ [۴] ابنِ سعد ۲/۲۴۲۔

[۵] ابنِ سعد نے یا اس روایت کے راوی نے نام ظاہر نہیں کیا۔ [۶] ابنِ سعد ۲/۲۴۲۔

[۷] ابنِ سعد ۲/۲۴۲ تیسری وصیت کے بیان کو مبہم رکھنا بھی معنی خیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں عمداً سکوت اختیار کرتے؟ یہ سکوت خود راوی کا ہے۔

نعیم بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قلم دوات اور کاغذ خود حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے طلب فرمایا تھا[1]

ابن عباس کہتے ہیں کہ قلم اور کاغذ حضرت عمرؓ سے طلب کیا تھا۔ اور انہوں نے یہ کہا کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید درد میں ہیں اور تم لوگوں کے پاس قرآن موجود ہے "۔ اس پر اہل بیت میں اختلاف ہوا اور وہ تکرار کرنے لگے[2] جب یہ تکرار زیادہ ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قوموا عنّی (میرے پاس سے چلے جاؤ)

العباس بن عبدالمطلب نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے میں مرض الموت میں بنو عبدالمطلب کے چہرے خوب پہچانتا ہوں۔ چلو ہم دونوں اُن سے امر خلافت میں مشورہ کرلیں اگر وہ ہمارے بارے میں فرمائیں گے تو پتا چل جائے گا اور کسی غیر کے لیے فرمائیں گے تو ہم اُن سے اس موضوع پر گفتگو کر سکیں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا[3]

واللہ لئن سألناها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فمنعناها لا یعطیناها الناس أبداً فواللہ لا نسألہ أبداً۔	خدا کی قسم اگر ہم نے امر خلافت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا اور انہوں نے (ہمارے لیے) انکار فرما دیا تو پھر لوگ ہمیں (خلافت) ابد تک نہیں دیں گے۔ اس لیے ہم ہرگز نہیں پوچھیں گے

حضرت عائشہؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مرض الموت میں حضرت فاطمہ زہراؓ رسول اللہؐ کی سی چال چلتی ہوئی تشریف لائیں۔ آپؐ نے انھیں اپنے دائیں یا بائیں پہلو کی طرف بٹھایا اور سرگوشی میں کچھ فرمایا تو حضرت فاطمہ رونے لگیں، پھر آپ نے کچھ فرمایا تو فوراً وہ ہنسنے لگیں حضرت عائشہ نے پوچھا کہ رسول اللہ نے کیا فرمایا؟ تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ " یہ راز کی بات ہے میں نہیں بتاؤں گی "۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا " میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم مجھ سے ملو گی اور تم جنت میں تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہو "۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت فاطمہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا[4]

انس بن مالک کہتے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا تو آپ یہ الفاظ فرما رہے تھے، اس طرح کہ الفاظ سینے میں اٹک رہے تھے اور زبان سے پوری سہولت سے ادا بھی نہیں ہو رہے تھے :

الصلوۃ وما ملکت أیمانکم[5] نماز ۔ اور تمہارے غلام

ایک روایت میں یہ ہے کہ آخری وقت میں کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کو غسل کون دے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ " جو میرا زیادہ قریبی رشتہ دار ہو، پھر اُس سے قریب "۔ رجالٌ من اھلی الأدنی فالأدنی

پھر دریافت کیا، اور آپ کو کفن کیسا دیا جائے؟ فرمایا: اگر تم چاہو تو اسی لباس میں (جو پہنے ہوئے ہوں) دفن کر دینا یا پھر مصری کپڑا، یا یمانی جوڑا ٹھیک رہے گا۔ پھر پوچھا: اور نماز کون پڑھائے؟ آپ نے فرمایا مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر میرے پلنگ کو اسی حجرے میں قبر کے کنارے رکھ دینا اور سب باہر چلے جانا میری نماز سب سے پہلے جبریل پڑھیں گے پھر دوسرے فرشتے۔ پھر تم لوگ گروہ گروہ آکر نماز ادا کر لینا۔ پہلے مرد نماز پڑھیں پھر عورتیں۔ سلام بھیجنا میرے اُن اصحاب پر جو اب یہاں نہیں ہیں اور اُن پر جو قیامت تک میری پیروی کریں گے، اور میرے دین پر رہیں گے[6]

---

[1] ابن سعد ۲/۲۴۴ ، [2] ابن سعد ۲/۲۴۴ ، [3] ابن سعد ۲/۲۴۵ ، [4] ایضاً ۲/۲۴۷ ، [5] ابن سعد ۲/۲۵۳ ، [6] ابن سعد ۲/۲۵۶ ۔

سیرت کی جو تفصیلات ابن سعد نے فراہم کی ہیں وہ ایک بنیادی خاکے کی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ حتی الامکان تاریخ اور سنہ بتانے کا بھی التزام کرتا ہے اور تاریخوں کے اختلاف کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ ایک ہی واقعہ کے لیے مختلف راویوں سے ملنے والی روایات علیحدہ سلسلۂ اسناد کے ساتھ درج کرتا ہے اور کہیں کہیں محاکمہ بھی کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام، مرض، وفات، تدفین کی تفصیلات طبقات کی دوسری جلد میں بیان ہوئی ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیرۃ کا خاکہ کس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اِس فہرست سے ہو سکتا ہے:[1]

جلد اوّل

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب۔

۲۔ آں حضرتؐ کے سلسلۂ نسب میں جو انبیاء ہوئے، اُن کا بیان۔

۳۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

۴۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام

۵۔ حضرت آدم اور آں حضرت علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب میں ماؤں کا بیان ۔ یعنی ننہیالی شجرہ

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد قصی بن کلاب، عبد مناف بن قصی، ہاشم بن عبد مناف وغیرہ

۸۔ عبد المطلب بن ہاشم

۹۔ عبد المطلب نے اپنے بیٹے (عبد اللہ) کو قربان کرنے کی نذر کی تھی۔

۱۰۔ عبد اللہ بن عبد المطلب کی حضرت آمنہ بنت وہب سے شادی

۱۱۔ جن عورتوں نے عبد اللہ بن عبد المطلب کو شادی کے پیغام دیے اُن کا بیان

۱۲۔ حضرت آمنہ کا زمانۂ حمل

۱۳۔ حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی وفات (۹۹/۱)

۱۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت[2] (۱۰۰/۱)

---

[1] یہ مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ پہلی اور دوسری جلد میں سیرۃ سے متعلق جو مواد ملتا ہے اُس کا انتخاب اِس نظر سے کیا گیا ہے کہ ابن سعد کی جزئیات نگاری کا اندازہ ہو سکے

[2] پہلی روایت: ولادت پیر کے دن ۱۰ ربیع الاول کو ہوئی۔ اصحاب فیل کے واقعہ کو (جو نصف محرم میں ہوا تھا) ۵۵ راتیں گذر چکی تھیں۔

دوسری روایت:

ابو معشر نے کہا آپ پیر کے دن پیدا ہوئے، ربیع الاول کی دو راتیں گذر چکی تھیں۔ پیر کے دن پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔ اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ یہ عام الفیل تھا۔

۱۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور کنیت

۱۶- اُن کے نام جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا ، آپ کے دودھ شریک بہنوں اور بھائیوں کے نام (۱۰۸/۱)

۱۷- حضرت آمنہ کی وفات

۱۸- عبدالمطلب کا آپ کو اپنی نگرانی میں لینا۔

۱۹- عبدالمطلب کی وفات کے بعد حضرت ابوطالب[1] کا آپ کی پرورش کرنا اپنے چچا کے ساتھ پہلی بار ملک شام کا سفر اور وہاں راہب بحیرا سے ملنا۔

۲۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں بکریاں چرانا۔

۲۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حرب الفجار میں شریک ہونا (۲۰ سال کی عمر میں)

۲۲- حلف الفضول میں آپ کی شرکت (۲۰ سال کی عمر میں)

۲۳- ملک شام کی طرف آپ کا دوسرا سفر (۲۵ سال کی عمر میں) اور عیسائی راہب سے ملاقات

۲۴- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے نکاح (حضرت خدیجہؓ کی ولادت عام الفیل سے پندرہ سال قبل ، نکاح کے وقت عمر ۴۰ سال)

۲۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

۲۶- ذکر ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عمر ۱۶ ماہ)

۲۷- کعبہ کی تعمیرِ نو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت

۲۸- اعلانِ نبوت

۲۹- وحی آنے سے پہلے علاماتِ نبوت (۱۵۰/۱ تا ۱۶۹/۱)

۳۰- نزولِ وحی کے بعد علاماتِ نبوت (۱۷۰/۱)

۳۱- آپ کی بعثت[2] اور مقصد بعثت (۱۹۲/۱)

۳۲- آپ کی بعثت کا دن (بروایت ابن عباس : پیر کا دن)

(پہلی وحی ۱۷ ر رمضان پیر کے دن ۴۱ سنہ بعد ولادت مقامِ حرا میں)

---

[1] ابوطالب کی وفات نصف شوال ۱۰ سنہ بعثت نبوی میں ہوئی (۱۲۵/۱) اُن کی عمر ۸۰ سے متجاوز تھی ان سے ایک ماہ پانچ دن کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے انتقال فرمایا۔ اُن کی عمر ۶۵ سال تھی۔

[2] آپ نے فرمایا: "بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً فَاِنْ لَمْ يَسْتَجِيْبُوا لِي فَاِلَى الْعَرَبِ فَاِنْ لَمْ يَسْتَجِيْبُوا لِي فَاِلَى قُرَيْشٍ فَاِنْ لَمْ يَسْتَجِيْبُوا لِي فَاِلَى بَنِي هَاشِمٍ فَاِنْ لَمْ يَسْتَجِيْبُوا لِي فَاِلَيَّ وَحْدِي" (میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں اگر وہ لبیک نہ کہیں تو عرب کی طرف وہ بھی نہ مانیں تو قریش کی طرف ، وہ بھی ساتھ نہ دیں تو بنی ہاشم کی طرف اور وہ بھی دعوت قبول نہ کریں تو تنہا اپنی طرف۔)

۳۳۔ نزول وحی کا بیان

۳۴۔ سب سے پہلے قرآن کا کون سا حصہ نازل ہوا

۳۵۔ نزول وحی کے وقت شدت کی کیفیت

۳۶۔ عام لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا

۳۷۔ قریش کا ابو طالب سے شکایت کرنا

۳۸۔ ارض حبشہ کی طرف پہلی ہجرت (۱/۲۰۳) (یہ رجب ۵ بعثت میں ہوئی) مہاجرین کی فہرست۔

۳۹۔ ارض حبشہ سے واپسی کے اسباب (۱/۲۰۵)

۴۰۔ ارض حبشہ کی طرف دوسری ہجرت (۱/۲۰۷)

۴۱۔ قریش کا محاصرہ کرنا (۱/۲۰۶) (سنہ سال بعثت)

۴۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف کی طرف تشریف لے جانا۔
(بروایت: حکیم بن حزام) ۲۷ شوال سنہ بعثت

۴۳۔ معراج (۱۷ رمضان ہجرت سے ۱۸ ماہ قبل ہفتہ کی شب) اسی سال نماز فرض ہوئی۔

۴۴۔ شعب ابی طالب سے بیت المقدس تک اسراء (۱۷ ربیع الاول، ہجرت سے ایک سال قبل)

۴۵۔ حج کے موقع پر قبائل عرب کو دعوت اسلام

۴۶۔ اوس و خزرج کو دعوت اسلام

۴۷۔ بیعت العقبۃ الاُولیٰ (۱۲۔ اشخاص)

۴۸۔ بیعت العقبۃ الثانیہ (۷۰۔ اشخاص)

۴۹۔ مکہ میں آپؐ کا قیام۔ بعثت سے ہجرت تک

۵۰۔ مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دینا

۵۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کا ہجرت کرنا

۵۲۔ مدینہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ

۵۳۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد تعمیر کرنا (۱/۲۳۹)

۵۴۔ بیت المقدس سے کعبہ کو قبلہ تبدیل کرنا (۱/۲۴۱) ۱۶ ماہ بعد ہجرت

۵۵۔ مسجد قُبا کا بیان

۵۶۔ اذان دینے کی ابتداء

۵۷۔ صوم رمضان کا فرض ہونا (۱/۲۴۸)

۵۸۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر
۵۹۔ صفۂ رسول اور اصحاب الصفہ (۱/ ۲۵۵)
۶۰۔ وہ جگہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کی نماز ادا فرماتے تھے
۶۱۔ بادشاہوں کی طرف خطوط بھیجنا۔ اس حصے میں ابن سعد نے (۱۱۰) خطوط کا ذکر کیا ہے۔
۶۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب قبائل کے وفود (ابن سعد نے ۷۰ وفود کے آنے کا ذکر کیا ہے اور ہر وفد کی تفصیل جدا گانہ دی ہے)
۶۳۔ توراۃ و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت
۶۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا بیان (۱/ ۳۶۴)
۶۵۔ صفتِ کلام رسالت
۶۶۔ صفت قرأت و حسنِ صوت (۱/ ۳۷۵)
۶۷۔ صفت خطبۂ آں حضرت
۶۸۔ حسنِ خلق
۶۹۔ آپ کی چال کا بیان
۷۰۔ آپ کے کھانے
۷۱۔ حسنِ اخلاق
۷۲۔ آپ کی نماز
۷۳۔ قبول ہدیہ اور ترک صدقہ کے سلسلے میں آپ کا رویّہ
۷۴۔ آپ کا کھانا اور پسندیدہ غذا
۷۵۔ کھانے پینے میں آپ کا پرہیز کن چیزوں سے تھا
۷۶۔ ازواج مطہرات اور خوشبوؤں سے آپ کی رغبت
۷۷۔ آپ کی پُر مشقت زندگی
۷۸۔ آپ کا حلیۂ مبارک اور ڈیل ڈول وغیرہ (۱/ ۴۱۱)
۷۹۔ دونوں کندھوں کے درمیان مُہرِ نبوت کا بیان (۱/ ۴۲۵)
۸۰۔ آپ کے بال (۱/ ۴۲۷)
۸۱۔ آپ کے بالوں میں سفیدی (۱/ ۴۳۱)
۸۲۔ آپ نے بالوں میں خضاب کیا یا نہیں

۸۳۔ پچھنے لگوانے کا بیان (۱/ ۴۴۳)
۸۴۔ مونچھ ترشوانے کا بیان
۸۵۔ آپ کا لباس (سفید، سرخ، زعفرانی، سبز، اُونی، سیاہ)
۸۶۔ ریشمی لباس کا پہننا اور پھر ترک کرنا۔
۸۷۔ لباس کی قسمیں اور طول و عرض
۸۸۔ پاجامہ، قمیص، کرتہ وغیرہ
۸۹۔ ایک لباس میں نماز ادا کرنا۔
۹۰۔ آپ کا بستر
۹۱۔ چٹائی جس پر نماز پڑھتے تھے۔
۹۲۔ سونے کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۰)
۹۳۔ چاندی کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۱) چاندی کے پالش کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۳) نقش خاتم (۱/ ۴۷۴)
۹۴۔ آپ کی خاتم مبارک کے گم ہو جانے کا قصہ۔
۹۵۔ آپ کا نعل مبارک (۱/ ۴۷۸)
۹۶۔ آپ کے موزے، مسواک، کنگھی، سرمہ دانی، آئینہ اور پیالہ (۱/ ۴۸۲ - ۴۸۴)
۹۷۔ آپ کی تلواریں (۱/ ۴۸۵) زرہ بکتر (۱/ ۴۸۷) ڈھال (۱/ ۴۸۹) نیزے، کمانیں، گھوڑے، چوپائے، اونٹ (۱/ ۴۹۲) اونٹنیاں، بکریاں۔
۹۸۔ آپ کے خدام، موالی (۱/ ۴۹۷)
۹۹۔ آپ کے گھر اور ازواج مطہرات کے حجرے (۱/ ۴۹۹)
۱۰۰۔ آپ کے صدقات۔
۱۰۱۔ وہ کنوئیں جن کا پانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیا تھا (۱/ ۵۰۳)

طبقات : دوسری جلد

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معازی، سرایا، اُن کے نام اور تاریخیں اور یہ کہ کل کتنے مغازی اور سرایا ہیں (۲/ ۵)
(۲۷ غزوات اور ۴۷ سرایا)

ان میں سے ہر سریّہ اور ہر غزوہ کا جداگانہ بیان اور ان کی توقیت۔
۲۔ فتح مکہ

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمرہ (۲/۱۷۰)

۴۔ حجۃ الوداع (۲/۱۷۲)

۵۔ سریہ زید بن اُسامہ

۶۔ آپ کا وقتِ وفات

۷۔ آپ نے انتقال فرمانے سے پہلے جبریل علیہ السلام کے سامنے قرآن دہرایا (۲/۱۹۴)

۸۔ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا تھا۔

۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلانے کا بیان

۱۰۔ انتقال سے پہلے جنت البقیع میں تشریف لے گئے اور شہداءؓ کے لیے فاتحہ پڑھی۔

۱۱۔ مرض الموت کا آغاز، درد اور شدّتِ مرض (۲/۲۰۶)

۱۲۔ آپ کن چیزوں سے پناہ خداوندی طلب کرتے تھے۔

۱۳۔ آپ نے مرض الموت کے زمانے میں اصحاب کے ساتھ نماز پڑھی۔

۱۴۔ آپ نے حکم دیا کہ ابوبکر امامت کریں (۲/۲۱۵)

۱۵۔ مرض الموت میں ابوبکرؓ کو آپ کی وصایا۔

۱۶۔ آپ نے حکم دیا کہ حضرت ابوبکر کے سوا اور سب کے دروازے مسجد نبوی میں بند کر دیے جائیں (۲/۲۲۷)

۱۷۔ آپ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ آخری کلمات

۱۸۔ آپ نے ازواج مطہرّات سے اجازت لی کہ آخری وقت حضرت عائشہ کے حجرے میں رہیں (۲/۲۳۱)

۱۹۔ انتقال سے پہلے آپ نے مسواک کی (۲/۲۳۳)

۲۰۔ انتقال سے پہلے آپ نے چھ دینار تقسیم کیے (۲/۲۳۴)

۲۱۔ ازواج مطہرّات نے حبشہ کے ایک چرچ کی خوبصورتی کا تذکرہ کیا۔ آپ نے اپنے بارے میں ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

۲۲۔ آپ نے وصیت نامہ لکھنے کی خواہش کی (۲/۲۴۲)

۲۳۔ آپ کے مرض وفات میں جانشینی کے مسئلے پر حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت علی بن ابی طالب کا مکالمہ (۲/۲۴۵)

۲۴۔ مرض وفات میں آپ کی گفتگو حضرت فاطمہ زہرا سے۔

۲۵۔ اُسامہ بن زید سے آپ کی گفتگو۔

۲۶۔ انصار سے آپ کی گفتگو۔

۲۷۔ آپ نے کیا وصیتیں فرمائیں (۲/۲۵۳)

۲۸۔ آپ کی وفات۔

۲۹۔ آپ نے جانشینی کے لیے کوئی وصیّت نہیں کی اور انتقال کے وقت آپ کا سر مبارک حضرت عائشہ کی گود میں تھا (۲/۲۶۰)
۳۰۔ دوسری روایت :۔ آپ کا سر مبارک حضرت علی کی گود میں تھا (۲/۲۶۲)
۳۱۔ آپ پر حبرہ کی بنی ہوئی چادر ڈالی گئی ۔
۳۲۔ حضرت ابوبکر نے آپ کے جسد مبارک کو بوسہ دیا ۔
۳۳۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں ۔ آپ کی وفات کی خبر میں شک کر رہے تھے ۔ (حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا (۲/۲۶۶)
۳۴۔ اس کا بیان کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنے دن بیمار رہے اور کس دن انتقال فرمایا (۲/۲۷۲) لہ
۳۵۔ وہ قمیص جس میں آپ کو غسل دیا گیا (۲/۲۷۵) کس نے غسل دیا (۲/۲۷۷) کس نے کفن دیا (۲/۲۷۹) غسل دینے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی (۲/۲۷۸) گھر کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے ۔
۳۶۔ آپ کو تین کپڑوں کا کفن دیا گیا ، حنوط کیا گیا (۲/۲۸۸)
۳۷۔ آپ کے جنازے کی نماز میں امام کوئی نہیں تھا (۲/۲۸۸) کیونکہ آپ حیاتِ ظاہری و باطنی میں امام امّت تھے ۔
۳۸۔ قبر میں کس نے اتارا (۲/۲۹۱) العباس ، الفضل ، قثم بن عباس ، علی بن ابی طالب اور شقران ۔
۳۹۔ موضع دفن کا مشورہ حضرت ابوبکر نے دیا (۲/۲۹۲)
۴۰۔ آپ کی قبر کا بیان (۲/۲۹۴) ابوطلحہ نے لحد تیار کی (۲/۲۹۶) قبر کے او پر اینٹیں رکھی گئیں (۲/۲۹۷)
۴۱۔ قبر میں کیا رکھا گیا ۔ سرخ چادر کا ایک ٹکڑا قبر میں رکھا گیا ۔ (۲/۲۹۹)
۴۲۔ قبر میں کون اُترا (۲/۳۰۰)
۴۳۔ مغیرہ بن شعبہ آخری صحابی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قبر سے جدا ہوئے (۲/۳۰۲)
۴۴۔ آپ کی تدفین کا بیان
۴۵۔ قبر پر پانی چھڑکا گیا (۲/۳۰۶)
۴۶۔ قبر مبارک زمین سے قدرے اونچی بنائی گئی ۔
۴۷۔ اس کے اوپر سرخ کنکریاں بچھائی گئیں ۔
۴۸۔ مقبرہ کی اندرونی حالت ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس کی ایک دیوار گر گئی تھی (۲/۳۰۷)
۴۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنی عمر پائی (۲/۳۱۰) ابن عباس کی رائے میں مکی عہد پندرہ سال تھا اور آپ کی عمر ۶۵ سال)

لہ ۔ ۱۹ صفر ۱۱ھ چہار شنبہ سے مرض وفات شروع ہوا ، ۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیر کے دن انتقال فرمایا ۔
دوسری روایت :۔ ۲۹ صفر ۱۱ھ سے بیماری شروع ہوئی اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو انتقال فرمایا ۔ اگلے دن (سہ شنبہ) تدفین ہوئی ۔ ایک اور روایت بدھ کے دن تدفین ہوئی ۔

۵۰۔ آپ کی وفات کا سوگ اور ماتم۔

۵۱۔ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر زار و قطار روتے تھے (۳۱۲/۲)

۵۲۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ کو کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا (۳۱۲/۲)

۵۳۔ سب سے زیادہ صدمہ حضرت علی بن ابی طالب کو تھا (۳۱۲/۲)

۵۴۔ آپ کی میراث اور ترکہ (۳۱۴/۲) حضرت فاطمہ نے میراث طلب کی حضرت ابوبکر نے میراث دینے سے انکار کر دیا (۳۱۵/۲) حضرت فاطمہ نے تاحیات حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا۔ حضرت علی بن الحسین کا قول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت کوئی درہم و دینار یا غلام ترکہ میں نہیں چھوڑا (۳۱۷/۲)

۵۵۔ آپ کا قرض کس نے ادا کیا (۳۱۷/۲) حضرت علی ہر سال منادی کراتے تھے کہ جس کسی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ مطالبہ ہو وہ اُن سے طلب کرے پھر حضرات حسن و حسین نے بھی یہ عمل جاری رکھا (۳۱۹/۲)

۵۶۔ آپ کے مرثیے کس کس نے لکھے (۳۱۹/۲)

ابوبکر الصدیق ، عبداللہ بن انیس ، حسان بن ثابت ، ابو عمر والشیبانی ، کعب بن مالک ، اروی بنت عبدالمطلب ، عاتکہ بنت عبدالمطلب ، صفیہ بنت عبدالمطلب ، ہند بنت اثاثہ بن عباد ، عاتکہ بنت زید بن عمرو ، ام ایمن ۔ ہند بنت الحارث بن عبدالمطلب ۔

ان عنوانات سے طبقات ابن سعد میں سیرۃ کے مواد کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ بھی طبقات میں کبار صحابہ کے بارے میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں ۔ ابن سعد ہمیں بتاتا ہے کہ عہد رسالت میں افتاء کا منصب ابوبکرؓ اور عمرؓ کے پاس تھا حضرت عثمان نے منبر سے یہ اعلان کیا کہ جو حدیث ابوبکر اور عمر کے زمانے میں بیان نہیں کی گئی اس کی روایت کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے (۳۳۶/۲) حضرت علی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنایا تھا ۔ حضرت عمر اُس مشکل مسئلہ سے خدا کی پناہ طلب کرتے تھے جس میں حضرت علی کا مشورہ شامل نہ ہو (۳۳۹/۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے آخری زمانے میں قرآن اخذ کیا تھا اور ستر (۷۰) سورتیں لکھکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تھیں (۳۴۲/۲) ابو موسیٰ الاشعری بہت خوش الحان تھے اور وہ بصرہ کے لوگوں کو قرآن تعلیم کیا کرتے تھے ۔ معاذ بن جبل فقیہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم شرائع کے لئے انھیں یمن کی طرف بھیجا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصحاب رسول کی ایک شوریٰ یا مجلس قانون ساز تھی اس میں تین مہاجر اور تین انصار تھے۔ اصحاب رسول میں سے بعض نے تقریباً کل قرآن جمع کر لیا تھا ۔ مجمع بن جاریہ کے پاس ایسا ہی نسخہ تھا جس میں دو یا تین سورتیں نہیں تھیں ۔ (۳۵۵/۲) حضرت عثمان نے جمع قرآن کا کام عہد فاروقی میں شروع کیا تھا ۔ اور یزید بن ابی سفیان نے شام سے ایک خط حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بھیج کر انھیں قرآن کی جمع و تدوین کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا تھا ۔ (۳۵۶/۲) حضرت زید بن ثابت نے عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھی تھیں اس لیے کہ ان زبانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خطوط آتے تھے (۳۵۸/۲) حضرت زید علم الفرائض سے بھی خوب واقف تھے حضرت عمر

نے علمائے وقت کو فتویٰ دینے کے لیے مختلف شہروں میں روانہ کیا تھا اور انھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیں۔ زید بن ثابت کے فتاویٰ دینی کی ایسی گہری سوجھ بوجھ کا آئینہ تھے کہ مروان بن عبدالملک نے اپنے کاتبوں کو پس پردہ بٹھا کر اُن کے فتاویٰ قلمبند کرا لیے تھے۔ (۲/۳۶۱) ابن عباس کا مسلک تشریع یہ تھا کہ پہلے قرآن سے سند لیتے تھے اس میں واضح رہنمائی نہ ملے تو حدیث سے استناد کرتے تھے اور اس میں بھی سند موجود نہ ہو تو عمل شیخین (ابوبکر و عمر) کو دیکھتے تھے اور آخری درجے میں اپنے اجتہاد کو کام میں لاتے تھے (۲/۳۶۶) ان سے مسائل دین کے علاوہ ایام عرب، ذبائح، انساب اور تفسیر میں بھی سوالات کیے جاتے تھے قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح میں وہ جاہلی دور کے شعرا کے کلام سے مدد لیتے تھے (۲/۳۶۷) حضرت عمرؓ امور خلافت میں ابن عباس سے مشورہ کرتے تھے اور اُسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ ابن عباس نے الواح (تختیوں) پر احادیث نبوی لکھ رکھی تھیں (۲/۳۷۱) اور اکابر صحابہ سے مغازی کی تفصیلات معلوم کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بھی احادیث کا ایک صحیفہ مرتب کر رکھا تھا (۲/۳۷۳)

سیرۃ نبوی کی تفصیلات کے علاوہ طبقات ابن سعد میں صدر اسلام کی پوری معاشرت کے بارے میں معلومات کا ایسا عظیم الشان خزانہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ان بکھری ہوئی جزوی تفصیلات کی مدد سے ہم اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کی پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں۔

ابن سعد نے جن شیوخ سے روایات لی ہیں اُن میں موسیٰ بن عقبہ، ابومعشر، ابن اسحٰق، الواقدی، الکلبی اور عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری بھی ہیں۔ ان حضرات نے بدر و احد کے شرکا کی فہرستیں بھی تیار کر رکھی تھیں۔ انساب کے بارے میں وہ اکثر روایات الکلبی اور عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری سے اخذ کرتا ہے۔

صحابہ و تابعین کے بارے میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ جنگ احد میں کس کو کتنے زخم لگے تھے اور کون کون ایک ساتھ قبر میں دفن کیا گیا۔ مختلف قبائل کے اصنام جو کعبہ میں رکھے ہوئے تھے ان میں سے کس قبیلے کا بت کس نے توڑا؟ کس کا قاتل کون تھا اور کس کے اعقاب کہاں بسے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کی نسل منقطع ہو گئی تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ عموماً تاریخ اور سال درج کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی۔ قبر میں کس نے اتارا۔ بہت سے اصحاب رسول کا حلیہ بھی اس نے بیان کر دیا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کون کس طرح کا خضاب استعمال کرتا تھا۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ بدر و اُحد میں شرکت کرنے والے اصحاب رسول زیادہ تر چالیس سال سے کم عمر کے تھے۔ دار الارقم میں چھپ کر نماز ادا کرنے والے مسلمانوں کی فہرست اس نے یزید بن رومان کے حوالے سے درج کی ہے اور ابوبکر بن عمرو بن حزم کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ ہجرت مدینہ کے موقع پر کون مہاجر کس انصاری کا مہمان ہوا تھا۔ مدینہ میں مہاجرین کا ابتدائی احوال عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ تراجم صحابہ میں ابن سعد نے جس ترتیب کا لحاظ رکھا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ نسب

۲۔ نام

۳۔ کنیت

۴۔ زمانہ قبول اسلام

۵۔ ہجرۃ (حبشہ و مدینہ)

۶۔ مدینہ پہنچ کر کہاں اُترے

۷۔ کس کی مواخاۃ کس سے ہوئی

۸۔ کن مشاہد و غزوات و سرایا میں شرکت کی

۹۔ مناقب

۱۰۔ ازواج و اولاد

۱۱۔ ترکہ

۱۲۔ مدفن

۱۳۔ نمازِ جنازہ

۱۴۔ سنہ وفات (ماہ و یوم کے ساتھ)

۱۵۔ حلیہ

۱۶۔ اعقاب

ابن سعد نے سیرۃ اور صدرِ اسلام کے سلسلے میں بہت سے مکتوبات اور دستاویزات کا یا تذکرہ کیا ہے یا اُن کا متن درج کر دیا ہے۔

جنگ اُحد میں حضرت حمزہ کی شہادت کا حال تفصیل سے دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ عہد کیا تھا کہ حضرت حمزہ کے قصاص میں ستر مشرکین کا مُثلہ کریں گے تو یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ تب رسالت مآبؐ نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا (۳/۱۴) اُحد میں مقتولین زیادہ تھے اور کفن کا کپڑا کم تھا اس لیے ایک ایک چادر میں تین تین شہیدوں کو رکھا گیا۔ مدینہ میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ رونے والیاں پہلے حضرت حمزہ کا ماتم کرتی تھیں پھر اپنے مُردے کو روتی تھیں۔ اُحد کے شہدا کی تعداد (۷۰) تھی اور ان میں صرف چار مہاجرین تھے حضرت فاطمہ زہرا، حضرت حمزہ کی قبر پر تشریف لے جایا کرتی تھیں اور اس کی مرمّت کراتی تھیں (۳/۱۹)

ابن سعد ہمیں حضرت علی کی اولاد کے نام بھی بتاتا ہے۔ اُن کے فرزندوں میں ایک کا نام ابوبکر تھا، ایک فرزند عثمان اور ایک عمر بن علی تھے۔ کل اولاد ۱۴ لڑکے اور ۱۹ لڑکیاں تھیں (۳/۲) حضرت علی ہجرت مدینہ کے موقع پر ۱۵ ربیع الاول کو وہاں پہنچے تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تیرہ دن کے بعد اور اُن کی مواخاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہوئی تھی۔ انہوں نے غزوۂ تبوک کے سوا ہر غزوہ میں شرکت کی تھی (۳/۲۲)

ابن سعد نے حضرت علی کا حلیہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بالکل سفید، گھنی اور چوڑی ڈاڑھی تھی، فربہ جسم، کندھوں پر گوشت، بھاری پنڈلیاں، قمیص پاجامہ پہنتے اور سیاہ عمامہ باندھتے تھے۔ آپ کا کرتا گھٹنوں تک نیچا ہوتا تھا (۳/۲۷) ہاتھ میں ایک کوڑا رہتا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں انگشتری پر "محمد رسول اللہ" کندہ کیا ہوا تھا (۳/۳۰)۔ جنگ جمل میں مقتولین کی تعداد تیرہ ہزار تھی۔ حضرت علی نے چار سال ۹ ماہ خلافت کی ہفتہ کی شب میں ۱۹ رمضان سنہ ۴۰ھ کو شہید کیے گئے اور کوفہ میں جامع مسجد کے پاس میدان میں دفن ہوئے (۳/۳۸) اُن کی عمر ۶۳ سال تھی

انہوں نے ترکہ میں صرف ۷۰۰ درہم چھوڑے تھے جو ایک غلام خریدنے کے لئے رکھے تھے۔

زید الحب کو حکیم بن حزام نے سوق عکاظ میں خریدا تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا مگر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نہیں گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کو ترجیح دی۔ اُمّ المومنین زینب بنت جحش کا نکاح اول زید بن حارثہ سے ہی ہوا تھا۔ سلیمان بن یسار کی روایت ہے کہ زید بن حارثہ سب سے پہلے مسلمان تھے (۳/۴۴) انہوں نے ۵۵ سال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۸ھ میں انتقال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات پر ہچکیاں لے کر روئے تھے۔ سعد بن عُبادہ نے کہا: یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا:

هذا شوقُ الحبیبِ إلی حبیبہٖ (یہ دوست کا اپنے دوست کے لیے اظہارِ محبت ہے)

حضرت عثمان غنی خوبصورت، نازک ناک نقشے والے، درمیانہ قد، گندمی رنگ تھے طویل ڈاڑھی تھی جسے مہندی سے رنگین کرتے تھے کندھے چوڑے تھے اور سر پہ گھنے بال تھے بعض دانتوں پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا (۳/۵۸)

بیعت عثمان ۲۹ ذی الحجہ ۲۳ھ کو ہوئی تھی۔ ۲۴ھ کے امیر حج عبدالرحمٰن بن عوف تھے اور ۳۵ھ کے عبداللہ بن العباسؓ درمیان کے ہر سال خود عثمان غنی امیر حج ہوتے تھے۔ محاصرے کے دوران میں لوگ حضرت عثمان سے جا کر ملتے تھے لیکن حضرت علی کو اُن کے رشتہ داروں نے نہیں ملنے دیا (۳/۶۸) انصار نے حضرت عثمان سے کہا تھا کہ ہم جنگ کرنے کو آمادہ ہیں مگر حضرت عثمان نے قتال بین المسلمین کو پسند نہیں کیا۔ شہادت کے دن حضرت عثمان کا روزہ تھا۔ محاصرہ کرنے والے مصری، کوفی اور بصری تھے۔ اکثر اصحاب رسول یہ سمجھتے تھے کہ قتل تک نوبت نہیں پہنچے گی۔ محاصرین کو عراق سے کمک پہنچ رہی تھی۔ شہادت کے وقت محمد بن ابی بکر نے آپ کی داڑھی پکڑ لی تھی اور عمرو بن الحمق سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ قرآن کریم اس وقت حضرت عثمان کے سامنے رکھا تھا اور اس پہ بائیں طرف لہو کے چھینٹے گرے تھے۔ عمرو بن الحمق نے نیزے سے ۹ زخم لگائے تھے (۳/۷۴) حضرت عثمان صاف ستھرا لباس پہنتے تھے، خوشبو لگاتے تھے۔ ۸۲ سال عمر ہوئی۔ مدت خلافت بارہ سال میں بارہ دن کم تھے۔ نماز جنازہ جُبیر بن مطعم نے پڑھائی۔ جنازے میں کل سترہ (۱۷) افراد شریک تھے اور ابن سعد کہتا ہے کہ صرف چار آدمی تھے جلدی جلدی لاش اٹھا کر بقیع میں لے گئے اور پوشیدہ دفن کیا گیا (۳/۷۹) حضرت حسن قاتل عثمان کا نام نہیں لیتے تھے اور حضرت علی فرماتے تھے واللہِ ما قتلتُ ولا أمرتُ ولکن غُلِبتُ (خدا کی قسم نہ میں نے قتل کیا نہ اس کا حکم دیا، بلکہ مجھے مغلوب کر لیا گیا)۔ (۳/۸۳) ایک روایت یہ ہے قاتل عثمان مصری تھا۔

عتبہ بن غزوان عہد فاروقی میں بصرہ کے عامل تھے اور اس شہر کی پلاننگ اُنہوں نے ہی کی تھی۔ الزبیر بن العوام کے مدینہ میں گیارہ مکان تھے دو گھر بصرے میں، ایک کوفے میں اور ایک مصر میں تھا (۳/۱۰۸) اُن کے اموال کا مجموعی اندازہ ہشام بن عروۃ کی روایت میں ۵۱ یا ۵۲ ألف ألف (لاکھ؟) کیا گیا ہے (۳/۱۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عُمیر کو تعلیم اسلام کے لئے مدینہ بھیجا تھا وہاں انہوں نے جمعہ کے دن دار سعد بن خیثمہ میں بارہ مسلمانوں کو جمع کیا اور یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں پڑھا گیا۔ (۳/۱۱۸) مدینہ میں مسلمانوں کے گھروں کی پلاننگ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی (۳/۱۲۶)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ریشمی لباس پہنتے تھے جس کی مالیت چار پانچ سو درہم ہوتی تھی ان کا قد طویل اور باریک ناک نقشہ تھا رنگ گورا

سرخی مائل تھا۔ انہوں نے ترکہ میں سونے کی اینٹیں چھوڑی تھیں اور ایک بیوی کو ترکہ ۸۰ ہزار ملا تھا۔

حضرت سعد بن الوقاص بھی مالدار تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور صرف ایک بیٹی وارث ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دو تہائی مال کے لئے وصیت کر جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا تو کیا آدھا؟ فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا: اچھا ایک تہائی۔ فرمایا: نہیں۔

إنّك أن تترك ولدك أغنياء خير من أن تتركهم عالة يتكففون الناس۔

(تم اپنی بیٹی کو مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے اچھا ہے کہ وہ تنگدست ہو اور دوسرے لوگ اس کی کفالت کریں)

انہوں نے دو لاکھ پچاس ہزار درہم ترکہ میں چھوڑے (۱۴۹/۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود مکہ میں سب سے پہلے قرآن کو شائع کرنے والے تھے۔ مدینہ میں ان کا گھر مسجد نبوی کی پشت پر تھا اور بدر میں انہوں نے ابوجہل کو قتل کیا تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم بھی تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا تھا اور انھیں سفر میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان تبرکات میں ایک تکیہ، ایک گدا، مسواک، نعلین اور ایک لوٹا شامل تھا (۱۵۳/۳) جب رسول اللہ کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو یہ آپ کے نعلین مبارک اُٹھا کر اپنی بغل میں رکھ لیتے تھے، اور واپسی میں آپ کو پہننے کے لیے نعلین پیش کرتے تھے۔ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔ ٹانگیں پتلی پتلی تھیں، قد چھوٹا اور جسم نحیف تھا۔ عمدہ لباس پہنتے اور خوشبو لگاتے تھے (۱۵۷/۳) خضاب نہیں کرتے تھے۔ ان کے بال گندھے ہوئے تھے لٹیں کانوں پر رہتی تھیں ہاتھ میں لوہے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ انہوں نے انتقال سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھا تھا اور الزبیر بن عوام اور عبداللہ بن الزبیر کو وصیت کی تھی کہ میری لڑکیوں کی شادی اُن کی مرضی سے کی جائے۔ (۱۵۹/۳) ایک غلام کے لیے وصیت کی کہ وہ اگر پانسو درہم ادا کر دے تو آزاد ہو جائے گا۔ اپنے کفن کے لیے انہوں نے شرط لگا دی تھی کہ دو سو درہم سے زیادہ مالیت کا نہ ہو اور مجھے عثمان بن مظعون کے پاس دفن کیا جائے۔ عبداللہ بن مسعود نے ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی ۳۲ھ میں انتقال ہوا عمار بن یاسر نے نماز جنازہ پڑھائی مگر ابن سعد کہتا ہے کہ عثمان بن عفان کا نماز پڑھانا ثابت ہے۔ رات کے وقت دفن کئے گئے۔ ترکہ میں ۹۰ ہزار درہم چھوڑے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق پہلے مسلمان تھے (۱۷۱/۳) انہوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی جب مسلمان ہوئے تو ان کا اثاثہ چالیس ہزار درہم تھا۔ پانچ ہزار درہم لے کر مدینہ آئے تھے اور تجارت شروع کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پر روزانہ صبح و شام تشریف لے جایا کرتے تھے (۱۷۲/۳) یہ شام سے سفید کپڑوں کی درآمد کرتے تھے اور جب مدینہ میں داخل ہوئے تو سفید لباس پہنے ہوتے تھے مدینہ میں ان کا گھر مسجد نبوی کے پاس تھا۔ عام الفتح میں جب مسلمانوں نے پہلا حج کیا تو امیر حج ابوبکر صدیق ہی تھے (۱۷۷/۳) آں حضرت کے مرض وفات میں نماز بھی انہوں نے ہی پڑھائی تھی۔ (۱۷۸/۱)

الزھری کی روایت واقعہ قرطاس کے بارے میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے بارے میں ہی وصیت کرنا چاہتے تھے (۱۸۰/۳) حضرت عائشہؓ نے بھی ایک روایت میں یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر جانشین کرتے تو ابوبکر کو بناتے پھر عمر کو پھر ابوعبیدہ بن الجراح کو۔ حضرت عمرؓ ابوعبیدہ ہی کو امیر بنانا چاہتے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر سے پہلی بیعت بشیر بن سعد نے کی تھی۔ مسلمانوں

نے دیکھا کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت دے کر دین کا امام بنایا ہے تو انھیں دنیا کا امام بھی کیوں نہ مانا جائے۔ (۱۸۳/۳) ابن عباس کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار آدھی نماز ابو بکر نے اور آدھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی (۱۸۳/۳)

خلافت ابو بکر میں عمرؓ قاضی تھے اور ریونیو کا محکمہ ابو عبیدہ کے پاس تھا خلیفہ ہونے کے بعد بھی ابو بکر کپڑوں کی گٹھری کاندھے پر رکھ کر بازار جاتے تھے۔ ان کی بیعت ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو ہوئی تھی (۱۸۶/۳) اس وقت ان کا مکان السُّنح (SUNHA) میں مدینہ کے نواح میں تھا اور اپنی زوجہ حبیبہ بنت خارجہ کے ساتھ وہاں رہتے تھے اس مکان کی چھت اُون ڈھانپ کر بنائی تھی وہاں سے مدینے تک پیدل آیا کرتے تھے اور عشا کی نماز پڑھ کر واپس جاتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد چھ ماہ تک سُنح میں رہے۔ تجارت اور معاشی خوش حالی کو پسند کرتے تھے مگر خلافت کی ذمہ داریوں نے اس مشغلہ کو چھڑا رکھا تھا۔

حضرت ابو بکر دبلے پتلے تھے۔ جسم پر گوشت کم تھا رنگ سفید تھا آنکھیں گہری تھیں چہرہ عرق آلود رہتا تھا داڑھی کو مہندی لگاتے تھے (۱۸۸/۳)

انہوں نے وصیت کی تھی مجھے پرانے کپڑے کا کفن دیا جائے۔ ان کے انتقال پر حضرت عمر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ حضرت ابو بکر نے اپنا جانشین نامزد کرنے سے پہلے اکابر سے مشورہ کیا تھا (۱۹۹/۳) وصیت کی کتابت عثمان بن عفان نے کی تھی مگر وصیت میں حضرت عمر کا نام لکھوانے سے پہلے ہی حضرت ابو بکر بے ہوش ہو گئے تھے۔

حضرت ابو بکر نے ۷ جمادی الآخرہ کو ٹھنڈ میں غسل کر لیا تھا اس سے پندرہ دن بخار رہا۔ زمانہ علالت میں حضرت عمر نماز پڑھاتے تھے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان کے گھر آمنے سامنے تھے۔ ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ کو انتقال ہوا مدت خلافت دو سال تین ماہ اور دس دن تھی عمر ۶۳ سال ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے۔ نماز جنازہ قبر اور منبر نبوی کے درمیانی حصے میں حضرت عمر نے پڑھائی۔ عمر عثمان، طلحہ بن عبد اللہ اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر نے قبر میں اُتارا تھا۔ (۲۰۷/۳)

حضرت ابو بکر نے وصیت کی تھی کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن کیا جائے اُن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کے قریب ہے۔ قبر زیادہ اُبھری ہوئی نہیں ہے اُوپر سُرخ کنکریاں پڑی ہیں۔ روضے کا اندرونی نقشہ اس طرح ہے کہ
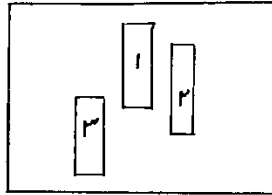
درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے اس کے بائیں جانب حضرت ابو بکر صدیق ہیں جن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک کے قریب ہے اور داہنی طرف حضرت عمر بن الخطاب ہیں جن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے قریب ہے (۲۱۰/۳) حضرت ابو بکر کی وفات کے وقت اُن کے والد ابو قحافہ حیات تھے اور اُنہوں نے میراث میں اپنا حصہ اپنے پوتوں کو دے دیا تھا چھ ماہ اور چند روز کے بعد محرم ۱۴ھ میں ابو قحافہ بھی ۹۷ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ صہیب بن سنان رومی تمام مشاہد میں شریک تھے اور مغازی بیان کیا کرتے تھے (۲۲۹/۳) انہوں نے

شوال ۳۲ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔ بلال بن رباح حضرت ابوبکرؓ کے مولیٰ تھے انہوں نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ یہ اسلام کا اظہار کرنے والے پہلے سات مسلمانوں میں سے ایک تھے مدینہ کو ہجرت کرنے کے بعد سعد بن خیثمہ کے مکان میں فروکش ہوئے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے دواوین کی ترتیب کی تو یہ شام کو ہجرت کر گئے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اذان دی تھی اور جب مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لاتے ہوئے دیکھ لیا کرتے تھے تب اقامت کہتے تھے (۲۳۴/۳) فتح مکہ کے دن انہوں نے خانہ کعبہ میں اذان دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اذان دینی چھوڑ دی تھی اور شام کی طرف چلے گئے تھے وہیں انتقال کیا (۲۰ھ) ان کا رنگ سیاہ تھا جسم نحیف اور قد لمبا، بال بہت تھے گالوں پر گوشت کم تھا۔

ارقم بن ابی الارقم کے حال میں ابن سعد ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا گھر کوہ صفا پر تھا جہاں ابتداً میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان لانے والے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہیں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ بعد میں اس کا نام دارالاسلام ہو گیا تھا اسے الارقم نے وقف کر دیا تھا اور وقف نامہ ان الفاظ میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: ھذا ما قضی الارقم فی ربعہ ما حاز الصفا انھا محرمۃ بمکانھا من الحرم لا تباع ولا تورث شھد ھشام بن العاص وفلان مولی ھشام بن العاص۔

(یہ الارقم نے اپنے اُس مکان کے بارے میں فیصلہ کیا ہے جو الصفا کے کنارے واقع ہے کہ یہ اپنی جگہ حرم کی طرح محترم ہے نہ اسے بیچا جائے گا نہ یہ وراثت میں چلے گا۔ اس پر ہشام بن العاص اور ان کے فلاں مولیٰ گواہ ہیں)

یہ مکان ابوجعفر عباسی خلیفہ کے زمانے تک محفوظ تھا اور اس نے زبردستی اسے خرید لیا تھا اور اس کا بیعنامہ ۱۷ ہزار دینار میں ہوا تھا۔ ابوجعفر نے یہ مکان خیزران کو دے دیا تھا جس نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا (۲۴۴/۳)

حضرت عمر بن الخطاب کو لقب فاروق اہل کتاب نے دیا تھا۔ تاریخ اور سنہ ہجری لکھنے کا رواج انہوں نے شروع کیا اور پہلی تاریخ ربیع الاول ۱۶ھ سے لکھی (۲۸۱/۳) سب سے پہلے قرآن بھی کتابی صورت میں انہوں نے جمع کیا۔ کوفہ اور بصرہ کی پلاننگ بھی عہد فاروقی میں ہوئی اور ان دونوں شہروں میں مختلف قبائل کے لحاظ سے بسائے گئے تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ اکابر اصحاب رسول کو گورنر نہیں بناتے تھے۔ انہوں نے مسجد نبوی میں کنکریٹ ڈلوائی تھی اور حضرت عباس بن عبدالمطلب کا گھر مسجد میں شامل کر لیا تھا دواوین کی ترتیب کے لیے انہوں نے اصحاب رسول کی فہرستیں تیار کرائی تھیں (۲۹۵/۳) اور پنشن پانے والوں کے رجسٹر بنائے تھے (محرم ۲۰ھ) اہل بدر کی اولاد کے لیے حضرت عمرؓ نے دو دو ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا تھا مگر حضرات حسن وحسین کو پانچ پانچ ہزار درہم دیے تھے (۲۹۷/۳) اس اصول کے لحاظ سے زید بن اسامہ کا وظیفہ عبداللہ بن عمر سے زیادہ تھا۔ ہر قبیلے کا رجسٹر علیحدہ تھا اور وظیفہ حضرت عمرؓ خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے تھے۔ وہ کیسا معاشی نظام چاہتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے:

عن زید بن أسلم عن أبیہ قال: سمعت عمر بن الخطاب یقول واللہ لئن بقیت الی ھذا العام المقبل لألحقن آخر الناس بأولھم ولا جعلنھم رجلاً واحداً۔

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

لئن بقیت الی الحول لالحقنّ أسفل النّاس باعلاھم۔

(خدا کی قسم اگر میں اس آنے والے سال تک زندہ رہ گیا تو آخری آدمی کو پہلے سے ملا دوں گا اور سب کو "ایک آدمی" بنا کر چھوڑ دوں گا۔

دوسری روایت: اگر سال تمام تک زندہ رہا تو سب سے نچلے آدمی کو سب سے اونچے آدمی سے ملا دوں گا) (۳/۳۰۲)

ایک راوی سائب بن یزید کا بیان ہے کہ "عام رمادہ" میں اس نے حضرت عمرؓ کو دیکھا تھا تو اُن کے پاجامے میں سولہ پیوند تھے (۳/۳۲۰) ان کا قد بلند تھا، تیز تیز چلتے تھے بڑی بڑی مونچھیں تھیں جنھیں غصّے میں تاؤ دیتے تھے۔ بالوں کو مہندی سے سرخ کرتے تھے۔ کپڑے میں چمڑے کا پیوند بھی لگا لیتے تھے (۳/۳۲۸) خلافت کے زمانے میں ان کے پاس ایک ہی پاجامہ تھا۔ آخر وقت میں انہوں نے جو وصایا کی تھیں اُن میں فرمایا تھا کہ میں کتاب اللہ کا اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں، جب تک تم اس کی پیروی کروگے گمراہ نہیں ہوسکتے اور مہاجرین سے حسن سلوک کرنا کیونکہ لوگ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ (اگر مہاجرین وہ ہیں کہ گھٹیں گے بڑھیں گے نہیں) اور انصار کا خیال رکھنا یہ وہ ہیں جن کی وادی میں اسلام نے پناہ لی تھی اور عرب کا خیال کرنا یہی تمہاری "اصل اور مادہ" ہیں اور تمہیں اہلِ ذمہ کے لیے وصیت کرتا ہوں کیونکہ ان کا ذمہ تمہارے نبی نے لیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی اقتصادی پالیسی یہ تھی کہ معاشی نابرابری کو ختم کر دینا چاہتے تھے فرمایا:

واللہ لئن سلمنی اللہ لأدعنّ أرامل اھل العراق لا یحتجن إلی احد بعدی ابداً (۳/۳۳۷)

(خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے سلامت رکھا تو عراق کی بیواؤں کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں گا کہ وہ میرے بعد ہرگز کسی کی محتاج نہ رہیں)

اُن کی شہادت ایک غلام کے ہاتھ سے ہوئی جس نے زہر میں بجھے ہوئے چاقو سے تیرہ مسلمانوں کو زخمی کیا تھا ان میں سے ۹ کا انتقال ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو دس سال پانچ ماہ گیارہ دن خلافت کرنے کے بعد انتقال کیا۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت ۳ محرم ۲۴ھ کو ہوئی (۳/۳۶۵) صہیب بن سنان نے نماز جنازہ پڑھائی۔ عثمان بن عفان، سعید بن زید، صہیب بن سنان اور عبداللہ بن عمرؓ نے قبر میں اتارا۔

ہشام بن عروۃ کا بیان ہے کہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں روضۂ نبوی کی ایک دیوار گر گئی تھی اُسے دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے بنیاد کھودی گئی تو ایک قبر میں پیر ظاہر ہوئے لوگ گھبرائے اور یہ سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم مبارک ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اُن قدموں کو پہچان سکے۔ عروۃ بن الزبیر بلائے گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم مبارک نہیں بلکہ یہ عمرؓ کے پانو ہیں (۳/۳۶۹)

عثمان بن مظعون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک لذات اور ترکِ دنیا پر وعید فرمائی۔ کثرت عبادت اور رہبانیت کی ممانعت کی (۳/۳۹۵) ان کا انتقال ہجرت سے ۳۰ ماہ بعد ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آنسوؤں سے روئے تھے (۳/۳۹۶) یہ جنت البقیع میں دفن ہونے والے پہلے مسلمان تھے ان کی قبر مرتفع تھی۔

عبیدۃ بن الجراح نے اپنی انگوٹھی پر "الخمس للہ" کندہ کرا رکھا تھا (۳/۴۱۲) سعد بن معاذ تعلیم قرآن دیا کرتے تھے اِن کے بارے میں ابراہیم النخعی نے کہا۔

"أن النبیّ علیہ السّلام مدّ علی قبر سعد ثوباً أو صدّ وھو شاھد" (۳/۴۳۱)

(نبی علیہ السلام نے سعد کی قبر پر کپڑا پھیلایا، یا وہ پھیلایا گیا اور آپ دیکھتے رہے)
لوگ ان کی قبر سے تبرک لے جاتے تھے۔

آخذ انسان قبضة من تراب قبر سعد فذهب بها ثم نظر إليها بعد ذلك فاذا هي مسک (۴۳۱/۳)
(ایک شخص سعد کی قبر کی مٹی ایک مٹھی میں بھر کرلے گیا پھر اُسے دیکھا تو وہ مشک تھا)

سعد کی عمر انتقال کے وقت ۳۷ سال تھی وہ بہت حسین وجمیل، سرخ سفید، دراز قد تھے۔ داڑھی خوبصورت آنکھیں سیاہ تھیں (۴۳۳/۳)
حضرت ابوایوب انصاری (متوفی ۵۲ھ) کے لئے ابن سعد کہتا ہے کہ ان کی نسل منقطع ہوگئی تھی۔ قد انقرض ولده فلا نعلم له عقباً (۴۸۴/۳)

نعمان بن عمرو بدری صحابی تھے معمر بن راشد کی روایت ہے کہ یہ یا ان کا لڑکا چار یا پانچ مرتبہ نبیذ پی کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ نے ہر بار کوڑے لگوائے کسی شخص نے ان پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لا تلعنه فانه یحب اللہ ورسوله (لعنت مت بھیجو کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں) (۴۹۴/۳)
حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرایا تھا تو آپ کے موئے مبارک بہت سے اصحاب نے لے لیے تھے اور انھیں محفوظ رکھا تھا۔ (۵۰۶/۳)

عبداللہ بن عمرو اور عمرو بن الجموح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبر میں دفن کرایا تھا اور یہ ایسی جگہ واقع تھی جہاں سے برسات کا پانی گزرتا تھا۔ ۴۶ سال کے بعد یہ قبر دوبارہ کھل گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ دونوں لاشیں بدستور موجود ہیں اور کفن بھی ویسا ہی ہے۔ یہاں سے ان کی لاشیں نکال کر دوسری جگہ علیحدہ علیحدہ دفن کیا گیا (۵۶۳/۳)

سعد بن عبادہ کی والدہ عمرۃ بنت مسعود نے مدینہ میں ربیع الاول ۵ھ میں انتقال کیا اس وقت رسول اللہؐ غزوۂ دومۃ الجندل پر تشریف لے گئے تھے اور سعد بن عبادہ آپ کے ساتھ تھے۔ سفر سے واپس آکر رسول اللہؐ نے ان کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھی۔ سعد کی ماں نے کوئی نذر مان رکھی تھی جسے پورا کرنے سے پہلے اُن کا انتقال ہوگیا۔ سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کی منت پوری کردو (۶۱۵/۳) سعد نے پوچھا کہ اگر میں والدہ کے انتقال کے بعد ان کے لیے کچھ صدقہ کروں تو کیا اس سے انھیں کچھ فائدہ ہوگا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر سعد بن عبادہ نے المخراف میں اپنی جائداد والدہ کے نام پر صدقہ کردی۔ دوسری روایت میں ہے کہ سعد نے اُن کے نام پر پانی پلانے کی سبیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لگوائی (۶۱۵/۳) بعد میں کسی نے الحسن سے پوچھا کہ یہ سبیل صدقہ ہے اس کا پانی پینا جائز ہے یا نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ سعد بن عبادہ کی سبیل سے ابوبکر و عمر نے بھی پانی پیا ہے۔

یہ سیرۃ، مغازی، صدر اسلام اور کبار اصحاب رسولؐ کے بارے میں ابن سعد کی دی ہوئی تفصیلات کا صرف ایک خاکہ ہے اور طبقات کی ابتدائی تین جلدوں پر مبنی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طبقات ابن سعد میں معلومات کی کیسی فراوانی ہے اور جزئیات کی فراہمی میں ابن سعد نے کتنا اہتمام کیا ہے۔

تاریخ یعقوبی ـــــ سیرت نبوی کا ایک اہم قدیم ماخذ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

تاریخی پس منظر

طلوعِ اسلام کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ان اہم ترین اور سب سے قدیم موضوعات میں غالباً سرفہرست ہے جس نے اہلِ دل اور صاحبانِ قلم دونوں کے دامانِ خیال کو کھینچا ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے علمی ظرف، ذہنی رجحان اور فنی مذاق کے مطابق پہلے تو اپنا دامنِ طلب بھرا اور پھر دوسرے مشتاقانِ پرتوِ جمالِ الٰہی و نبوی کے قلب کے سرور اور آنکھوں کے نور کا اپنے بس بھر بندوبست کیا۔ محدثینِ کرام نے اقوال و افعال و تقاریرِ نبوی کی معمولی سے معمولی جزئیات کو فنِ حدیث کے زاویۂ نگاہ سے محیط کر لیا، تو مفسرینِ عظام نے کلامِ الٰہی کے تعلق سے تعبیراتِ نبوی کو محصور کیا۔ مغازی نگاروں کو فتوحاتِ اسلامی کے خیرہ کن پس منظر میں جنگ و جدال کی دنیا پسند آئی اور انھوں نے معرکہ ہائے نبوی کو سیرت کا ایک اہم ترین پہلو بنا دیا۔ خالص سیرت نگاروں کو حیاتِ رسول کے ہر پہلو سے کام تھا اس لیے از اول لمحۂ زندگی تا دمِ واپسیں ہر جزئیہ قلم بند کیا گیا۔ نسب نگاروں نے عرب قبائلی نظام کے پس منظر میں جب اشراف کے انساب سے بحث کی تو حیاتِ رسول کو سرنامہ بنا دیا کہ مفاخرِ عرب کے تاج میں نورِ محمدی شاہ ہیرا تھا۔ عالمی تاریخ لکھنے والوں کی تصانیف میں سیرتِ مبارکہ عہدِ زریں کا درجہ حاصل کر گئی۔

سیرتِ نبوی سے دلچسپی و تعلق خاطر مسلمانوں کو پہلے دن سے رہا کیونکہ وہ کلامِ الٰہی کے بعد مذہب و قانونِ اسلام کا دوسرا منبعِ حیات و سرچشمۂ فیض ہے۔ خود عہدِ نبوی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ سے دلچسپی و عقیدت کے ساتھ ساتھ جستجو، تفحص اور روایت کے ثبوت ملتے ہیں[1]۔ عہدِ خلافت راشدہ میں دلچسپی اور روایت دونوں میں اضافہ ہوا کہ اب وہ ذاتِ بابرکات لوگوں کے درمیان موجود نہ تھی۔ جنھوں نے آپ کو دیکھنے کی سعادت نہ پائی تھی وہ بیقرار دل اور مشتاق نظروں سے ان سے پوچھتے جو صحبتِ نبوی کے شرف سے سرفراز تھے اور صحابہ کرام محبت و عقیدت کی زبان سے مگر ضبط و صبر کا دامن تھام کر اپنے حبیب مکرم کی باتیں کرتے[2]۔ عام طور پر سیرت مبارکہ کے واقعات مجالس میں، گھروں یا مسجدوں میں بیان کیے جاتے[3]۔ صحابہ کرام نے "روایت" کی جو بنیاد ڈالی اسی کو دوسری نسل کے لوگوں نے فن کا درجہ دے دیا اور رواۃ یا راویوں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا[4]۔ غیر محتاط راویوں نے ضبط و احتیاط سے کام نہ لیا تو سیرت کے واقعات میں قصے (قصص) شامل ہو گئے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ داستان گوئی یا داستان طرازی کی بہت سی غیر تاریخی چیزوں کو سیرت کا جز بنا دیا گیا حالانکہ یہ داستان گو (قاص) کے اپنے ذاتی رجحانات، سیاسی میلانات اور مذہبی خیالات کا زائیدہ تھا[5]۔ قاص کے پہلو بہ پہلو اخباری

بھی تھے جو تاریخی واقعات کو پوری احتیاط سے قلم بند کرتے تھے اور اس کے لیے اسناد کو ضروری قرار دیتے تھے تاکہ وقوعِ واقعہ کے عینی شاہدوں تک سلسلۂ کلام دراز کرکے اپنی تحریر کے لئے سندِ اعتبار فراہم کی جائے۔(۶)

سیرتِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو ——— مغازی ——— کا فن پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں ہی ضبطِ تحریر میں آنے لگا تھا۔ خلیفہ سوم کے صاحبزادے ابان بن عثمان (تقریباً ۲۰ھ/ ۶۴۱ء تا ۱۰۰ھ/ ۷۱۸ء) اب تک معلومات کے مطابق اس فن کے پہلے نقاش تھے۔ ان کے بعد ان سے اہم تر تھے۔ عروہ بن زبیر بن عوام (۲۳ھ/ ۶۴۴ء تا ۹۴ھ/ ۷۱۳ء) جن کی متعدد روایات کتب تاریخ میں ملتی ہیں اور ان کے علاوہ وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵ھ/ ۶۸۴ء تا ۸۶ھ/ ۷۰۵ء) کو تحریری یادداشتیں بھی بھیجا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ان کو بجا طور سے تاریخِ اسلام کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ شرحبیل بن سعد (متوفی ۱۲۳ھ/ ۷۴۱ء) جو غالباً ایک یمنی مولیٰ تھے اس سلسلہ کی ایک اور پرانی کڑی تھے۔ لیکن ان سے زیادہ اہم ایک یمنی تابعی وہب بن منبّہ (۳۴ھ/ ۶۵۴ء تا ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء) تھے جو غالباً یہودی خاندان کے فرد تھے۔ کچھ تو انھوں نے خود اور کچھ ان کے بعد دوسروں نے ان کے نام سے منسوب کرکے سیرتِ نبویؐ میں اسرائیلیات کو جگہ دی خاص کر سلسلۂ انبیا کے بیان میں۔ مغازی نگاروں کے اسی سلسلے میں عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (متوفی ۱۲۰ھ/ ۷۳۸ء) کے قریب تھے جو دمشق و مدینہ میں مغازی پر مجالس منعقد کرتے اور بعد میں ان کو قلم بند کر لیتے۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری (۵۱ھ/ ۶۷۱ء تا ۱۲۴ھ/ ۷۴۲ء) اگرچہ خلیفہ عبدالملک اموی کے دربار سے وابستہ تھے لیکن فنِ مغازی میں ان کی امامت پر اس وابستگی سے ذرا میل نہ آیا تھا۔ عہدِ عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ/ ۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/ ۷۱۹ء) میں عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (متوفی ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء یا ۱۳۵ھ/ ۷۵۲ء) نے مغازی پر ایک نوشتہ خلیفۂ وقت کے ملاحظہ کے لئے تیار کیا تھا۔ ان کا ایک معاصر ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء یا ۱۳۷ھ/ ۷۵۴ء) نے بھی ایک مغازی پر کتاب چھوڑی تھی۔ لیکن ان سب مغازی نگاروں میں موسیٰ بن عقبہ (تقریباً ۵۵ھ/ ۶۷۵ء تا ۱۴۱ھ/ ۷۵۸ء) کی مغازی کو جو اعتبار ملا وہ کسی کے حصّہ میں نہ آیا۔(۷) لیکن ان کی مغازی وقت کی دست برد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی اور واقدی (۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء تا ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء) اس فن کے امام بے مثال بن کر دوسری صدی ہجری میں ابھرے۔(۷ الف)

فنِ سیرت پر پہلی جامع کتاب جو ہمیں دستیاب ہے وہ محمد ابن اسحاق (۸۵ھ/ ۷۰۴ء تا ۱۵۱ھ/ ۷۶۷ء) کی سیرتِ رسول اللہ ہے جو ابنِ ہشام (متوفی ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء یا ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء) کی تہذیب السیرۃ النبویہ کی شکل میں ملتی ہے۔(۸) یہ کتاب مدتوں سیرت نگارانِ رسول کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی اور آج بھی اس کی امامت سے کسی کو انکار نہیں۔ مدتوں اس کی خیرہ کن روشنی میں کسی دوسری کتابِ سیرت کا چراغ نہ جل سکا۔ لیکن اس کے علاوہ وقتی مطالبوں اور عصری تقاضوں نے بھی علمی مذاق بدل دیا تھا۔ دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی میں اُمتِ اسلامی کی تہذیبی و تمدنی ترقی اس قدر ہو چکی تھی کہ طالبانِ علم کے لئے مختلف جولان گاہیں بن گئی تھیں۔ وہ "امت" کے گوناگوں معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے "رواۃ" اور "اخباریوں" کو تاریخ و تہذیب اسلام کے مختلف پہلوؤں سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اس صدی کے "اخباریوں" میں عوانہ بن حکم (متوفی ۱۴۷ھ/ ۷۶۴ء)، ابومخنف (متوفی ۱۵۷ھ/ ۷۷۴ء)، سیف بن عمر (متوفی ۱۸۰ھ/ ۷۹۶ء)

اور مدائنی (متوفی ۲۲۵ھ/ ۸۳۹ء) امامت و مقتدائیت کے مقام پر فائز ہیں۔[۹] تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی نے تہذیبِ اسلامی کے ایک نئے دور کا مطالعہ کیا۔ یہ زمانہ "علم کے سفر" کا تھا جس کو محدثین نے شروع کیا تھا۔ خلافتِ اسلامی کے مختلف صوبوں اور مراکز میں علم کی مسندیں بچھی تھیں۔ تشنگانِ علم ان چشم ہائے حیات سے سیراب ہونے جاتے اور اپنے ظرف بھر دامن بھر لاتے تھے۔ اسی سفرِ علمی نے وسعتِ نگاہ پیدا کی اور تیسری صدی ہجری میں تاریخ اسلامی عالمی تاریخ کا جزو بن گئی اور سیرتِ نبوی اس کا ایک درخشاں باب۔ اس صدی کے اہم ترین ستون تاریخ تھے۔ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۰ھ/ ۸۸۲ء) ابو حنیفہ دینوری (م ۲۸۲ھ/ ۸۹۷ء)، بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء)، لیعقوبی (متوفی ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کے بعد) اور طبری (متوفی ۳۱۰ھ/ ۹۲۳ء)۔ ان سب اساطین تاریخ اسلامی کا نقطۂ نظر عالمی تھا۔ اور اسی بنا پر ان کی کتبِ تاریخ حضرت آدم ابوالبشر سے شروع ہوتی ہیں اور ان کے اپنے عہد پر ختم ہوتی ہیں۔[۱۰]

مصنف: حیات و رجحانات

کسی فنی یا علمی شاہکار کا تجزیہ و تحلیل کرتے وقت اس کے فن کار یا قلم کار کی حیات و رجحانات کا جائزہ ازبس ضروری ہے کیونکہ بسا اوقات اس کی زندگی کے کوائف، خاندانی حالات، موروثی ترکۂ خیالات، مذہبی معتقدات، سماجی و معاشرتی تعلقات، سیاسی نظریات، فقہی یا مسلکی رجحانات نہ صرف اس کی نگارشات میں منعکس ہوتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کی علمی سمت بھی متعین کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے مورخ لیعقوبی کے بارے میں ہماری معلومات کافی تشنہ ہیں لیکن قدیم و جدید ماخذ میں جو کچھ ملا ہے اس کی بنیاد پر اس کی حیات کی تاریخ کو مرتّب کیا جا سکتا ہے۔

حیاتِ مورخ کے بارے میں ہمارا سب سے قدیم ماخذ ـــ اب تک کی معلومات کے مطابق ـــ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور مصنف یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۸ء) ہے جس نے اپنی معجم الادباء میں ابو عمر محمد بن یوسف بن لیعقوب مصری کندی (متوفی بعد ۳۵۵ھ/ ۹۶۶ء) کی اساس پر کہا ہے کہ لیعقوبی کا پورا نام احمد بن ابی لیعقوب اسحاق بن جعفر بن وہب بن واضح تھا مگر وُہ اپنی نسبتِ لیعقوبی کے ذریعہ زیادہ معروف ہے۔ یاقوت نے اس کو اخباری عباسی بھی گردانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ روایت میں اعلیٰ مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ خاندان عباسی سے نسبتِ شرف رکھتا تھا۔ عباسی کی توضیح یاقوت کے بیان میں نہیں ملتی تاہم وہ اس کو بنو ہاشم کا مولیٰ قرار دیتا ہے اور شاید یہی ایک سبب ہو۔ تاریخ الیعقوبی کے مخطوطے پر "الکاتب العباسی" تحریر ملتا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ غالباً کسی عباسی خلیفہ کا یا کم از کم اس کے کسی اہم متوسل کا کاتب (سیکریٹری) رہا ہوگا۔ شاید یہ عباسی ہونے کا بہتر جواز فراہم کرتا ہے۔ یاقوت نے لیعقوبی کا سنہ وفات ۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء بتایا اور کہا ہے کہ اس کی بہت سی تصانیف تھیں جن میں کتاب التاریخ، کتاب اسماء البلدان، کتاب فی اخبار الامم السالفة اور کتاب مشاكلة الناس لزمانهم اہم ترین تھیں۔ یاقوت کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابِ تاریخ کافی ضخیم تھی، کتاب البلدان ایک جلد میں تھی اور گذشتہ قوموں کے حالات پر کتاب کافی مختصر تھی۔ اس کے علاوہ

یاقوت کے یہاں خاموشی ہے۔[11]

جدید مورخین و مولفین میں اسماعیل پاشا بغدادی نے اپنی دونوں کتابوں میں یاقوت کے بیان پر کوئی اضافہ نہیں کیا[12]۔ عمر رضا کحالہ نے بھی مزید کوئی روشنی نہیں ڈالی[13]۔ خیرالدین زرکلی نے اپنی مشہور عام کتاب الاعلام میں نسبتاً کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یعقوبی ایک مورخ و جغرافیہ نویس تھا۔ وہ بغداد کا باشندہ تھا اور اس کا دادا خلیفہ عباسی ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء) کے موالی میں سے تھا۔ وہ سرد و گرم ممالک دور دراز چشیدہ تھا۔ عالم اسلامی میں خوب گھوما پھرا تھا۔ ایک مدت تک ارمینیا میں مقیم رہا۔ سرزمین پاک و ہند بھی پہونچا اور دوسرے عربی دیار بھی گیا۔ مورخوں میں اس کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ یاقوت کے علاوہ دوسروں نے ۲۸۲ھ/ ۸۹۵ء اور ۲۷۸ھ/ ۸۹۱ء یا اس کے بعد بھی بتائی ہیں۔ لیکن اب اس کی تاریخ وفات ترجیحی طور پر ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کے بعد کسی وقت تسلیم کی جاتی ہے کیونکہ اس کی کتاب البلدان میں اس کے کچھ اشعار درج ہیں جو اس نے ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کی عیدالفطر کی چاندرات کو نظم کئے تھے۔[14]

تاریخ یعقوبی کے بیروت ایڈیشن میں مورخ و صاحب کتاب پر کوئی مقدمہ نہیں ہے[15]۔ تاہم نجف کے ایڈیشن میں مرتب سید محمد صادق بحرالعلوم کا انتہائی مختصر مقدمہ ہے جس سے تشنگانِ علم کی تشنگی اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کے مقدمہ سے زرکلی کے بیان پر چند اور باتوں کا اضافہ ملتا ہے۔ مثلاً یعقوبی کا ارمینیا میں ۲۶۰ھ میں موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلامی میں اس کا سفر شام و اندلس بھی معلوم ہوتا ہے۔ جن اشعار کی طرف زرکلی کے بیان میں اشارہ گزرا وہ بقول بحرالعلوم مصر کے حاکم وقت خاندان بنو طولون کے جلالتِ شان و عیش و عشرت کے بارے میں کہے گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یعقوبی تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں موجود تھا۔ بحرالعلوم کا خیال ہے کہ یعقوبی ابوحنیفہ دینوری کا معاصر تھا[16]۔ لیکن اسے صرف دینوری ہی کی معاصرت کا شرف حاصل نہیں تھا بلکہ وہ ابن قتیبہ، بلاذری اور طبری سے بھی نسبت ہمعصری رکھتا تھا اگرچہ اس کا علم و اعتراف ہمیں ان میں سے کسی بھی مورخ کے بیان سے نہیں ملتا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز دوری کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں جعفری یا شیعی رجحانات کی عکاسی کی ہے[17]۔ اگرچہ قدیم یا متوسط ماخذ و مستند مورخین و مولفین کے یہاں اس نکتہ پر کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا ہے تاہم تاریخ یعقوبی کی داخلی شہادتیں اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان شہادتوں کا ذکر کتاب کے مندرجات کے تجزیے و تحلیل کے وقت بار بار آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مورخ جانبدار حضرت علی و حسن کے زمانۂ حکومت کو تو خلافت سے تعبیر کرتا ہے جبکہ باقی تمام خلفا ———— حضرات ابوبکر و عمر سے لے کر خلیفہ عباسی معتمد علی اللہ تک ———— کے عہود حکومت کو 'ایام' سے یاد کرتا ہے[18]۔ بظاہر یہ بڑی معصوم اور غیراہم سی ادا معلوم ہوتی ہے لیکن ان دو الفاظ کے پیچھے خلافت کے بارے میں اُمتِ مسلمہ کے دو اہم ترین فرقوں کے سیاسی اور کسی حد تک مذہبی نظریہ کی پوری تاریخ چھپی ہوئی ہے[19]۔ یعقوبی کی تاریخ میں اہلبیت یا خاندانِ علی ابن ابی طالب سے عقیدت کی قربان گاہ پر تاریخی شعور اور علمی غیر جانبداری یا فنی معروضیت کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ مورخانہ معیارِ صداقت سے کسی تاریخی تحریر کا یہ بڑا سقم ہے۔

جب ذاتی خیالات یا فرقہ وارانہ رجحانات کی کارفرمائی تاریخ اسلامی پر کسی کتاب میں اس حد تک ہو تو نہ صرف یہ کہ واقعات و حقائق کے انتخاب و انضباط میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر واقعات کو مسخ کرنے کا مکروہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مورخ اپنے من بھاتے نقطۂ نظر اور پسندیدہ نظریے کی آنکھ سے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتا ہے۔ چن چن کر وہ ان واقعات کو لیتا ہے جو اس کی رائے کے حق میں ہوتے ہیں اور ان حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے نظریہ کی کاٹ کرتے ہیں یا اس سے میل نہیں کھاتے۔ پھر عمل جانبداری اور غیر معروضی طریقہ کار کا اثر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وُہ اپنی محبوب شخصیات و افراد کو تعریف و توصیف کے فلک ہفتم پر بٹھا دیتا ہے۔ اس کے ممدوحین دوسروں یا اس کے قاریوں کو بھی اتنے ہی اونچے عظیم اور بے مثل نظر آئیں جتنا کہ وہ ان کو خود اپنی چشم تصور میں دیکھتا ہے غیر محتاط و غیر دیانتدار مورخ اس مقصد کے حصول کے لیے پھر دو مورخانہ جرم کرتا ہے:

اوّل یہ کہ وہ ان کی مدح سرائی کا لازمہ دوسروں یا مخالفین کی نکتہ چینی، تنقیص حتیٰ کہ کردار کشی میں سمجھتا ہے۔

دوم یہ کہ وہ قصیدہ نگاری کے دوسرے لوازم ——— مبالغہ، غلط تعبیر اور جعلی شواہد ——— کا سہارا لیتا ہے۔

یعقوبی کی تاریخ کے یہ مذکورہ بالا کمزور نکات اس کے سیرتِ نبوی کے باب میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ تفصیل تو اپنی جگہ پر آئے گی یہاں اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ابتدائی مسلموں کے باب میں یعقوبی نے عام مورخین اور سیرت نگاروں کی روش سے بالکل الگ طرز اپنایا ہے۔ وہ حضرت خدیجہ کو عورتوں میں اوّل مسلمان حضرت علی کو مردوں میں اول مسلم اور موخر الذکر بزرگ کے بعد حضرات زید بن حارثہ اور ابو ذر غفاری کو بالترتیب دوسرا اور تیسرا مسلم مرد قرار دیتا ہے۔ پھر محض اشک شوئی کی خاطر لفظ قِیلَ (کہا گیا) سے، جو روایت کے مرجوح یا ناقابلِ اعتبار ہونے کی عرب تاریخ نویسی میں نشانی ہے، حضرت ابوبکر کو حضرت ابو ذر غفاری سے پہلے کا مسلمان بتا دیا۔[۲۰] یعنی اب بھی یعقوبی ابن اسحاق ابن سعد، بلاذری، ابن ہشام جیسے مورخین اور ان مورخین کے تمام سلسلہ رواۃ کی ان روایتوں کو ذکر کرنے یا ان کا حوالہ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا جن کے مطابق حضرت ابوبکر پہلے مسلمان تھے۔[۲۱]

اسی طرح یعقوبی نے اموی صحابہ کرام کے ساتھ بھی ظلم روا رکھا ہے اور کہیں ان کے بارے میں حقائق چھپا لیتا ہے اور کہیں مسخ کر دیتا ہے۔ دو مثالیں حاضر ہیں۔ یعقوبی کو اس کا تو اعتراف ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار دختران نیک صفات تھیں مگر ان میں سے وہ صرف دو کی شادی کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے اور اس رشتہ کو حکم ناطق الٰہی اور فیصلۂ خداوندی قرار دیتا ہے۔[۲۲] حضرت زینب کی شادی کے سلسلے میں وہ افترا پردازی کا مرتکب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہجرت نبوی کے وقت طائف میں اپنے شوہر ابو العاص بن بشر بن عبد وُہمان ثقفی کے پاس تھیں۔[۲۳] ظاہر ہے کہ اسے اس سفید جھوٹ پر اموی دشمن رجحانات نے آمادہ کیا تھا اور اس کا قلب و دماغ و دین اس حق کے اعتراف سے باز رکھتا تھا کہ حضرت زینب خاندانِ عبدِ شمس کے ایک فرد ابو العاص بن ربیع کے نکاح میں تھیں، کسی ثقفی کے عقد میں نہیں۔[۲۴] اسی طرح وہ بدر کے بعد حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ لانے کی سعادت حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی کے نصیب میں لکھ دیتا ہے[۲۵] محض اس لیے کہ وہ اس کا شرف حضرت ابو العاص اموی کو دینا نہیں چاہتا۔[۲۶] اسی طرح حضرات رقیہ اور ام کلثوم کی یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفان اموی[۲۷] سے شادی کی طرف وہ بالکل اشارہ نہیں کرتا کہ اس سے ایک اموی فرد اور نتیجتاً پورے اموی

خانوادے کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ صہارت و ازدواج کا شرف نصیب ہو جاتا ہے جو اس کے اپنے مزعومات کے علاوہ اس کا ہم خیال و ہم نوا و ہم نظریہ مبلغوں اور مومنوں کی تبلیغ و عقیدے کی کاٹ کرتا ہے۔ لیکن جو کہا گیا ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے یا جھوٹے کو یاد نہیں رہتا وہی یعقوبی کے ساتھ ہوا کم از کم حضرت زینب کے معاملے میں۔ ۶ھ میں حضرت زید بن حارثہ کے سریہ عیص (جس کو وہ سریہ قردہ کہتا ہے) کے بیان میں یعقوبی حضرت زینب کے شوہر کا صحیح نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نکاح کی بنا پر حضرت زینب کو حضرت ابو العاص بن ربیع کے پاس لوٹا دیا تھا۔[۲۸] لیکن اسی سلسلہ میں وہ مزید گل افشانی یہ کرتا ہے کہ حضرت زید نے اس سریہ میں جن لوگوں کو قید کیا تھا ان میں معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص بھی تھے جو خلیفہ عبد الملک بن مروان کے جدّ تھے۔ اس بیان میں آخری فقرہ محض اُموی دشمن رجحان کے تقاضے کی تسکین کی خاطر بڑھایا گیا ہے پھر بہ حقیقت کے خلاف ہے۔ خلیفہ اُموی کے جد حضرت حکم بن ابی العاص تھے[۲۹] اور مذکورہ بالا قیدی اگر واقعی وہ قید بھی ہوا تھا تو خلیفہ مذکور کا چچا تھا، نیز دوسرے تمام مورخوں نے اس سریہ کے قیدیوں میں اس کا نام نہیں گنایا ہے مصعب زبیری اور بلاذری کے بیان کے مطابق معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص غزوۂ اُحد کے بعد جنگی جرم کی پاداش میں بحکم رسالت قتل کیا گیا تھا۔[۳۰] بلاذری کا بیان ہے کہ وہ عبد الملک بن مروان کی ماں عائشہ بنت معاویہ کا باپ تھا۔ یعقوبی نے اگر سچ بولا ہوتا تو وہ اپنے مخالف کے خلاف زیادہ مضبوط و محکم مقدمہ قائم کر سکتا تھا۔

یعقوبی کے اندازِ نگارش تاریخ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو مذہبی رنگ دیتا ہے اور خالص انسانی کارناموں اور کاموں کی تائید و شہادت ماورائی یا دینیاتی عناصر سے فراہم کرتا ہے اور اس معاملہ میں کبھی کبھی غلو و مبالغہ کے علاوہ من گھڑت اور اساطیری انداز کی روایات سے بھی کام لینے میں دریغ نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر یہ روایات قصاص (داستان گو) ادب کا حصہ ہیں جو خوش عقیدہ قصہ گوؤں نے اپنے ممدوحین کی جلالتِ شان اور عظمتِ مقام دکھانے اور ثابت کرنے کیلئے گھڑ کر تاریخ و سیرت کا حصہ بنا دیا ہے۔ عام طور سے اس دیومالائی روایات کی ابتدا و روشناسی کی ذمہ داری وہب بن منبّہ کے کندھوں پر ڈالی جاتی ہے۔[۳۱] لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس فنِ پُرفن کی ایجاد و اشاعت میں تمام قصاص اور غیر ذمہ دار مورخ اپنے بس بھر حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس غیر تاریخی ——— اور بلاشبہ غیر اسلامی ——— عنصر سے ابن اسحاق اور بلاذری جیسے اوّلین سیرت نگار بھی پاک نہیں ہیں۔[۳۲] یعقوبی نے اس میدان میں اختصاص و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے ذیل میں یعقوبی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اس مبارک ساعت کے اثر سے شیاطین کو رجم کیا گیا، ستارے زمین پر گر پڑے، زلزلہ آ گیا، جملہ جادوگر اور کاہن اندھے ہو گئے، ایوان کسریٰ کے تیرہ کنگورے (شرافے) گر پڑے اور صد ہزار سال سے روشن آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ کسریٰ انوشیرواں نے ان پیا پے عجائب سے خوفزدہ ہو کر نعمان بن منذر ——— حیرہ کے ماتحت و باجگذار حکمراں ——— کو حکم بھیجا کہ وہ کسی عرب کاہن سے دریافت کرے کہ عرب میں کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ محکوم باجگذار نے حکم کی تعمیل کی اور ایک عرب کاہن نے ولادتِ نبوی کو ان عجیب و غریب واقعات کا ذمہ دار قرار دیا۔ اسی طرح اہل کتاب کے ایک عالم نے آپ کی ولادت کو اہل کتاب کے لیے بربادی (ویل) اور

اہلِ عرب کے لیے سعادت کا پیش خیمہ بتایا۔ والدہ ماجدۂ رسول نے حمل و ولادت کی وہ انسانی تکلیف نہ محسوس کی جو بشریت کا تقاضا ہے اور انھوں نے اپنے بطنِ مبارک سے بلند ہونے والے نورِ محمدی میں قصورِ شام کی جھلک دیکھی اور سمجھ لیا کہ نومولود دنیا و عقبیٰ کا سید ہوگا۔[۴۳]

ایامِ رضاعت کے دوران حلیمہ سعدیہ کے گھر میں خیر و برکت کے نزول کی تفصیلات جو کافی عام ہو چکی ہیں بیان کرنے کے بعد یعقوبی نے شقِ بطن اور جسمِ اطہر سے تمام بشری اور مادی آلائش دُور کرنے کا قصہ بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی بنو سعد کے علاقے سے واپسی پر آپ کی عمر کے ضمن میں کہا ہے کہ آپ چار یا پانچ سال کی عمر میں دس سال کے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بہتر صحت کا فیض نہیں، آسمانی معجزہ تھا۔[۴۴] اسی طرح یعقوبی نے ایک روایت یہ بھی بیان کی ہے کہ عبدالمطلب جب سیف بن ذی یزن کے پاس مکہ کا ایک وفد تہنیت لے کر گئے تو یمنی حکمران نے ان سے خلوت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقبل کی عظمت کی پیشگوئی کی اور یہود سے بچانے رکھنے کو کہا کہ وہ بدبخت لوگ ولادت نبوی کے بعد سے مسلسل آپ کے بارے میں سازشی گفتگو کرتے رہتے تھے۔[۴۵] آپ کے بچپن کے ایک اور معجزہ کا یوں ذکر کیا ہے کہ —— مکہ پر کئی برس سے قحط کے بادل منڈلا رہے تھے۔ بالآخر ایک ندائے ہاتف نے آپ کے حوالے سے ایک شیخ اکبر کا حلیہ بیان کر کے بشارت دی کہ دعا کرنے سے بارش ہوگی۔ چنانچہ عبدالمطلب نے آپ کو ساتھ لے کر میدان میں خالقِ سماوات و امطار سے دعا کی جو فوراً مستجاب ہوئی۔[۴۶] یعقوبی کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضور پُرنور نے بچپن ہی میں اپنی بعثت کے متعلق خواب دیکھا تھا نیز عبدالمطلب نے بوقتِ مرگ اپنے فرزند ابوطالب کو اپنے عظیم پوتے کو نبی مبعوث بتا کر اخفائے حال کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح مورخ کا مزید اصرار ہے کہ بیس برس کی عمر میں آپ میں علاماتِ نبوت ہویدا تھیں اور اہلِ کتاب آپ کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتے، آپ کی نشانیاں بیان کرتے اور آپ کے ظہور کے قُرب کی بشارت دیتے رہتے تھے۔[۴۷]

بعثت کے باب میں بھی یعقوبی نے اسی طرح کی کئی روایات بیان کی ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتی ہیں۔ رسالت لانے سے پہلے حضرت جبریل نے پہلے کبھی سامنے آکر، کبھی چھپ کر درخت یا پہاڑ کی اوٹ سے اور کبھی آسمان کے فراز سے پکارا کہ دل مہبطِ انوارِ الٰہی بننے کے قابل ہو جائے۔ اس مقدمۂ رسالت میں فرشتۂ آسمانی نے رجس من الاوثان (بت پرستی کی آلائش) سے بچنے کی ہدایت کی۔ پھر سنیچر اور اتوار کی رات کو آپ کے سامنے آئے اور پھر بالآخر دوشنبہ، جمعرات یا جمعہ کو پیغامِ رسالت لائے تو ساتھ اپنے جنت کی قالینوں میں سے ایک قالین (درنوکاً) بھی لائے اور اس پر آپ کو بٹھا کر پہلے رسول ہونے کی بشارت دی۔ پھر "اقرا" پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق جبریل آپ کے ساتھ دس سال یا تا وم واپسیں رہے اور اسرافیل تین برس تک وکیل رہے۔ ورقہ بن نوفل نے پیشگوئی کی تھی کہ اگر آپ کے ساتھ جبریل رہے تو قتل و غلامی کے احکام لائیں گے اور اگر میکائیل رہے تو نرمی و شفقت کا سلوک تجویز کریں گے۔ گویا قضا و قدرِ الٰہی قوتِ نافذہ نہ تھی فرشتہ کی فطرت و کارِ منصبی کا عمل دخل ہونے والا تھا۔ بعثت کے وقت شیاطین پر شہابِ ثاقب کی مار پڑی اور ابلیس نے یہ نظارہ دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی عالمِ کون و مکاں سے دنیائے فانی میں وارد ہوا پورے عالم کے تمام اصنام لڑھک گئے

اور تمام نار آتشکدہائے آذری بجھ گئی۔[۳۸]

معراج کے بیان میں یعقوبی نے جبریل کے حضورِ والا کی سواری کے لیے نہ صرف براق لانے کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ خچر سے چھوٹا، گدھے سے کچھ بڑا جسم میں تھا اور اپنے کانوں کو مسلسل پھڑپھڑاتے رہتا تھا، اس کے ڈَو پر تھے اور اس کی نگاہ کے فاصلہ تک اس کے قدم پڑتے تھے اور اس پر ایک یاقوت کی چادر پڑی تھی۔[۳۹]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم کے سماجی قطع تعلق کے بیان میں یعقوبی نے یہ حاشیہ آرائی کی ہے کہ مقاطعہ کے صحیفہ کے کاتب منصور بن عکرمہ عبدری کے ہاتھ مفلوج ہو گئے اور تین سال کی مدت کے بعد جبریل نے رسول کریم کو اور آپ نے ابو طالب کو خبر دی کہ سوائے ان مقامات کے جہاں نام الٰہی درج ہے صحیفہ کے بقیہ تمام حصّوں کو دیمک چاٹ گئی۔ چنانچہ کعبہ پہنچ کر جب صحیفہ منگوایا گیا تو اس پر اسّی کی اسّی مُہریں جو مقاطعین نے روزِ اوّل سے لگا دی تھیں بدستور لگی تھیں لیکن اندر صحیفہ ندارد۔[۴۰]

حضرت خدیجہ کی وفات کے موضوع پر گفت گو کرتے ہوئے یعقوبی نے ایک عجیب و غریب داستان طرازی کی ہے۔ حضرت خدیجہ عالم نزع میں دُوسری دنیا کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں کہ رسول کریم تشریف لاتے ہیں اور تسلّی و تشفّی کے کلمات کے بعد حضرت خدیجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جنّت میں اپنی سوکنوں (ضراتك) سے آپ کا سلام پہونچا دیں۔ استفسار پر آپ وضاحت کرتے ہیں کہ "اللہ نے جنت میں میری شادی تم سے کی تھی اسی دن میری اور تین شادیاں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم اور حضرت موسیٰ کی بہن کلثوم سے بھی کر دی تھی[۴۱] ظاہر ہے کہ یہ بیان قصہ گویوں کے زرخیز دماغ کا زائیدہ ہے۔ وفاتِ خدیجہ کے بعد حضرت فاطمہ گریہ و زاری کرتی ہیں تو حضرت جبریل نازل ہوتے ہیں اور حضور پُر نور کے ذریعہ حضرت فاطمہ کو تسلّی دیتے ہیں کہ خداوندِ رحیم و کریم نے ان کی ماں کے لیے ایک شاندار محل بنا دیا ہے۔[۴۲]

یعقوبی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس قسم کے متعدد ماورائی عناصر کو تاریخی واقعات میں داخل کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں سے اس کا مقصد یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شخصیت کے ارد گرد ایک مافوق البشری ہالۂ عظمت کھینچا جائے تو دوسری طرف اہل بیت اور خاندانِ حضرت علی اور بنو ہاشم کے لیے بالخصوص اور اپنے دوسرے ممدوحین کے لیے بالعموم آسمانی عظمت کا خرق اساطیری فراہم کیا جائے۔ حالانکہ حقیقت میں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تقدس کے لیے ان داستانی کہانیوں کی ضرورت تھی نہ آپ کے اہل بیت و صحابہ کرام کی جلالتِ شان کے لیے ان کی حاجت۔ ان کی عظمت مآبی کا سب سے بڑا شاہد خود خدائے مطلق و قادر و علیم تھا اور پھر ان کے عظیم و بے مثال کارنامے۔ لیکن یعقوبی کو ان بشری کارناموں اور شہادت ربانی کے علاوہ کچھ اساطیری روایات ضروری معلوم ہوتی تھیں لہٰذا اس نے ہر موقع و محل پر اپنی محبوب شخصیات کے لیے ایسی چیزوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بنو ہاشم کی فضیلت اور بنو ہاشم کے سیاسی حامیوں کی تقدس مآبی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ میرے اللہ نے مجھ سے چار شخصوں کے بارے میں

وعدہ فرمایا ہے: میرے والد، والدہ، چچا اور ایک بھائی کے لیے جن کی موت جہالت میں ہوئی۔[۴۳] اس موضوع حدیث میں صاف اشارہ ابوطالب اور ان کے بڑے صاحبزادے طالب اور والدینِ رسول کریم کی مغفرت کی طرف ہے۔ علماء کے نزدیک یہ معاملہ بحث طلب ہے لیکن کم از کم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ابوطالب اور ان کے فرزند اکبر اسلام نہیں لائے تھے۔[۴۴]

ہجرتِ رسول کریم کے بارے میں یعقوبی کا بیان بڑا دلچسپ مگر غیر تاریخی ہے۔ چند سطروں میں رسول کریم کے حضرت ابوبکر کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لیے روانگی کا ذکر کرنے کے بعد سارا زورِ کلام شب ہجرت کے ایک "ماورائی واقعہ" پر صرف کیا گیا ہے۔ مورخ کا دعویٰ ہے کہ اس اہم رات اللہ تعالیٰ نے حضرات جبریل و میکائیل سے فرمایا کہ میں نے دونوں میں ایک کے لیے موت مقرر کر دی ہے تو کون موت اختیار کرتا ہے اور کون حیات، اور کون اپنے ساتھی کے لیے غم خواری کرتا ہے۔ مگر دونوں فرشتوں نے حیات کو موت پر ترجیح دی۔ اللہ نے سرزنش کے لہجہ میں دونوں کو وحی کی کہ کیا تم دونوں علی بن ابی طالب کی طرح نہیں بن سکتے تھے۔ میں نے محمدؐ اور علیؓ کے درمیان مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے بڑھا دی۔ علیؓ نے موت کو اختیار کیا اور محمدؐ کو بقا مل گئی۔ اور علی ان کے بستر میں سو گئے۔ لہٰذا تم دونوں اتر کر جاؤ اور ان کے دشمن سے ان کی حفاظت کرو۔ چنانچہ تعمیلِ حکمِ الٰہی میں دونوں فرشتے نازل ہوئے۔ جبریل حضرت علی کے سرہانے اور میکائیل ان کے پائنتی بیٹھ کر رات بھر دشمن کے پھینکے پتھروں کو بچاتے اور سونے والے کی حفاظت کرتے رہے۔ جبریل حضرت علی بن ابی طالب کو مخاطب کر کے آفریں بھیجتے رہے کہ "اللہ اکبر، تمھاری کیا جلالت شان ہے کہ خدا تم پر سات آسمانوں کے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔" اسی ضمن میں یعقوبی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس غار میں رسول کریم نے پناہ لی تھی اس پر کبوتری نے انڈے دیے اور دشمن جو تعاقب میں تھے اندھے ہو گئے۔[۴۵] لیکن یعقوبی نے غار کے اندر جھانک کر اس صاحبِ رسول کی عظمت کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا ہے جس کا ذکر شاندار الفاظ میں خود ذات برتر و اعلیٰ نے کیا ہے۔[۴۶]

اس قدر تفصیل سے روایت بیان کرنے کے بعد یعقوبی نے ایک اور ماورائی قصہ یوں بیان کیا ہے کہ قریش کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلِ ہجرت کی خبر اس وقت تک نہ ہوئی جب تک ندائے ہاتف نے سعدان (دو سعد) کا حوالہ اپنی خبر میں نہ دیا۔ قریش اور جز بز ہوئے کہ سعد تو کئی تھے اور ان سے مراد سعد ہذیم، سعد تمیم اور سعد بکر ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس الجھن کو ندائے غیب نے دوسری رات سعد اوس اور سعد خزرج کے واضح نام لے کر دور کر دیا اور صراحت کر دی کہ منزلِ مقصودِ ہجرت مدینہ تھا۔[۴۷] ظاہر ہے کہ یعقوبی کا مقصد انصار مدینہ بالخصوص حضرات سعد بن معاذ اوسی اور سعد بن عبادہ خزرجی کے تقدس کو ظاہر کرنا ہے ورنہ مکے کا بچہ بچہ اس وقت جانتا تھا کہ مسلمانوں کی واحد پناہ گاہ یثرب کا شہر تھا جس کو مدینۂ رسول ہونے کا شرف حاصل ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

اسی طرح حضرت علی اور حضرت فاطمہ کی شادی خانہ آبادی کے بیان میں یعقوبی نے آسمانی تائید فراہم کی ہے۔ اس کے مطابق کارِ خیر کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، خود میں نے نہیں"۔[۴۸] یعقوبی کو محض رسول کریم کے عمل کے تقدس و جلالت کا یقین نہیں تھا اس لیے اس نے اس کارِ خیر کو کارنامۂ خداوندی قرار دینا ضروری سمجھا۔

جہاد و قتال کی اجازتِ الٰہی ملنے کے بعد، یعقوبی کا بیان ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کو ایک تلوار دے کر اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ آپ اس تلوار سے اس وقت تک قتال کریں جب تک کہ قریش اور دوسرے کفار جہاں توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی کا اقرار نہ کرلیں[۴۹]۔ بظاہر اس روایت سے یعقوبی کی تشفی نہ ہوئی تو اس نے دوسری جگہ وضاحت کردی کہ وہ تلوار ذوالفقار تھی[۵۰]۔ اس پوری کد و کاوش کے پیچھے یعقوبی کی یہ آرزو کارفرما تھی کہ ذوالفقار کو تائیدِ الٰہی حاصل ہونا تسلیم کرلیا جائے۔ اور یہ مشہور ہے کہ ذوالفقار حضرت علی کے نام و نسبت سے زیادہ مشہور ہے جو دوسرے مستند مورخین کے بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے مالِ غنیمت میں بطور صفی پائی تھی اور بعد میں حضرت علی کو عنایت کردی تھی[۵۱]۔

ہمارے عوام میں غزوۂ خیبر میں حضرت علی کے عظیم الشان کارنامے کی بنا پر ان کو فاتح خیبر ہونے کی شہرت بھی حاصل ہے، اور ساتھ ہی ان سے کچھ عجیب و غریب واقعات بھی منسوب ہیں۔ یعقوبی نے آنجناب کو فاتح خیبر تو نہ کہا ہے لیکن اس ارشاد نبوی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب قلعۂ مرحب — قموص — کئی بار کی کوششوں کے بعد فتح نہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ کل میں اس شخص کو جھنڈا دوں گا جس کو اللہ اور اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔ دوسرے دن آپ نے حضرت علی کو پرچم عطا فرمایا۔ حضرت علی نے یہودیوں کے طاقتور ترین شخص مرحب کو قتل کردیا اور خیبر کے طاقتور ترین و مستحکم ترین قلعہ کے سنگین دروازے کو جس کا طول و عرض و عمق کئی کئی ہاتھ تھا اکھاڑ کر اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اسی عظیم فتح کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب حبشہ سے واپس ہوئے اور سیدھے خیبر پہونچے۔ اور یعقوبی کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے فتح خیبر سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا قدوم جعفر سے[۵۲]۔ علمائے تاریخ و دین نے دونوں واقعات و احادیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ واقدی وغیرہ قدیم مورخوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مرحب کے قاتل حضرت محمد بن مسلمہ انصاری تھے اور وہی قلعہ قموص کے فاتح[۵۳]۔

ماورائی عناصر کے ذریعے بنو ہاشم کی عظمت و تقدیس کی آخری مثال غزوہ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت کے عظیم واقعہ سے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کشفِ عالمِ امکاں میں حضرت جعفر کے سریر (تخت) کو سب سے مقدم دیکھا تو آپ نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ میں نے تو زید کو مقدم رکھا تھا۔ جبریل نے عرض کیا کہ "جعفر کو اللہ نے آپ کی قرابت کی بنا پر مقدم کردیا"[۵۴]۔ یہ اور متعدد مذکورہ بالا مثالیں یہ حقیقت بصراحت واضح کرتی ہیں کہ یعقوبی کا مذہب طرفداریٔ بنو ہاشم تھا اور وہ ان کی عظمت و تقدیس ثابت کرنے میں مافوق البشری یا ماورائی عناصر و دنیا سے تائید و توثیق فراہم کرتا ہے اور تاریخی واقعات میں مذہبی رنگ سازی کے عمل و دخل کو نہ صرف جائز سمجھتا ہے بلکہ اپنے مقصد کے حصول یا اپنے نظریے کی تائید کے لیے دُور از کار روایات، فنِ قصص کے داستان نما بیانات اور من گھڑت احادیث بھی نقل کرتا ہے۔ تاریخ نگاری میں اس قسم کا اسلوب و انداز جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اور طرفہ ستم یہ کہ مذہبِ خداوندی و دینِ رسول بھی اس قسم کی چیزوں کی تائید نہیں کرتا۔

یعقوبی کے یہاں اسرائیلیات کو بھی خاصا عمل دخل حاصل ہے۔ وہ یہود و نصاریٰ کے حوالے سے ان اسرائیلی روایتوں کو تاریخی حقائق کے روپ میں بیان کرتا ہے جس سے اس کا متعلقہ بیان مجروح ہوجاتا ہے اور دوسری طرف اس کا

تاریخی استناد کمزور ولپست ۔ اگرچہ سیرت نبوی کے حصّہ میں یعقوبی نے اسرائیلیات کو کم جگہ دی ہے تاہم دو چار مثالیں مل جاتی ہیں۔ اوپر حوالہ آچکا ہے کہ اہل کتاب نے آپ کی ولادتِ باسعادت کے وقت ہی آپ کے نبی ہونے کی شہادت دے دی تھی اور مسلسل آپ کے بارے میں سازشی گفتگو کرتے رہتے تھے ۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل کا بیان حضرات جبریل و میکائیل کی وکالت وصحبت کی فطرت کے بارے میں گزر چکا ہے لیکن ایک عجیب وغریب اسرائیلی روایت غزوۂ خندق کے ذیل میں بیان ہوئی ہے ۔ جس کے مطابق اسی غزوہ کے دوران یا متصلاً بعد یہود کی ایک جماعت ، جس میں حی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق بھی شامل تھے ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض گذار ہوئی کہ آپ پر " الـمـ " نازل ہوئی ۔ آپ نے اقرار کیا تو حی بن اخطب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر نبی کی حکومت وبادشاہت (ملك) کا اندازہ (قـدر) مقرر ومقدر فرمادیتا ہے ۔ اس لیے " الف " کا عدد ایک ، " لام " کا تیس اور " میم " کے چالیس ، کل عدد ہوا ۷۱ ۔ تو گویا ۷۱ سال آپ کی سلطنت ہو گی ۔ انھوں نے پھر پوچھا : کیا اس کے علاوہ کوئی اور عدد ہے ۔ آپ نے فرمایا : ہاں ، المص ہے ۔ یہودیوں نے اس کے حروف کی عددی قوت جوڑ کر ۱۳۱ سال بتائے پھر استفسار پر " الر " اور " المر " بتائے جن کی عددی طاقت بالترتیب ۲۳۱ اور ۲۷۱ سال ہوئی ۔ یہودیوں نے تب اعتراف کیا کہ آپ کا معاملہ وہ نہیں سمجھ سکے ۔ غالباً آپ کو " الم " ، " المص " ، " الر " اور " المر " سبھی عنایت ہوئے ہیں جس کا مطلب ہوگا کہ کل ۷۰۴ ، سال آپ کی حکومت ہوگی ۔ یعقوبی کی روایت ظاہر ہے کہ اسرائیلیات کے بھان متی کے پٹارے کا کنبہ ہے ورنہ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ صرف یہی حروف مقطعات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا نہیں ہوئے بلکہ متعدد دوسرے بھی ہیں اور جن کا مجموعہ غالباً ہزار ہا ہزار سال بنے گا ۔[۵۵]

تاریخ یعقوبی میں بعض حقائق دُوسری متداول ومشہور سیرتوں کے مقابلے میں مختلف ہیں ۔ چونکہ وہ متعدد دوسرے ماخذ کے متفقہ بیانات کی نفی کرتے ہیں اس لیے ان کی صحت پر خاصا قوی شبہ پیدا ہوتا ہے ۔ مثلاً حضور اکرم کے والد ماجد کی وفات کا وقت ، جنگ فجار میں ابتداءً ابوطالب کا شرکت سے انکار اور اس بنا پر دوسروں کا انکار ، حضور کی حضرت خدیجہ کی شادی کا پس منظر ، ابتدائی مسلمانوں کی ترتیبِ قبولِ اسلام ، ابوطالب کا ایذاءِ رسولِ کریم پر انتقام کا ارادہ اور زعماءِ قریش سے سلوک ، وغیرہ ۔ تفصیل تاریخ کے تجزیے میں آرہی ہے ۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً تاریخ یعقوبی میں سیرت نبوی پر دستیاب مواد کی تحلیل وتجزیہ کیا جائے تاکہ سیرت کے اس قدیم ماخذ سے تعارف بھی ہوجائے اور اس کی خامیوں اور خوبیوں کی پرکھ بھی کی جا سکے ۔

تاریخ یعقوبی میں سیرتِ نبوی کا مواد

یعقوبی نے اپنی تاریخ عالمی رنگ میں لکھی ہے ۔ چنانچہ حضرت آدم سے آغاز کیا ہے اور دوسرے انبیائے کرام کے تذکرہ مسعود سے گزرتے ہوئے اس نے ایران وعرب کی ماقبل اسلام تاریخ بیان کی ہے ۔ یہ جلد اول پر مشتمل ہے ۔[۵۶] جلد دوم کو ایک لحاظ سے اسلامی تاریخ کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس کا آغاز مورخ کے ایک مختصر مقدمہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے ہوتا ہے اور خلیفہ معتمد علی اللہ کے عہدِ خلافت کے آخر —— ۲۵۹ ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اہم ایڈیشن مستشرق ہوتسما (HOUTSMA) نے ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں بیروت سے دار صادر نے اپنا دیدہ زیب ایڈیشن نکالا جو دو جلدوں میں ہے۔ اس ایڈیشن میں مقدمہ، مرتب کا نام، اشارہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں مختصر تعلیقات ہیں۔ آخری اہم ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں نجف سے سید محمد صادق بحر العلوم کے ایک مختصر مقدمے، جو محض تین صفحات پر مشتمل ہے اور مختصر تعلیقات کے ساتھ تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں متنِ کتاب کے حوالے بیروت ایڈیشن کے ہیں۔(۵۷) ان کے علاوہ دو ایک اور ایڈیشن بھی نکلے۔

مورخ یعقوبی نے عرب تاریخی روایات کے مطابق اپنی معلوماتِ سیرتِ نبوی کے تمام اہم راویوں اور اخباریوں کا مختصراً ذکر مقدمہ میں کر دیا ہے۔ دوسرے عرب مورخین کے طریقے کے برعکس جو اپنی ہر ہر خبر اور روایت کی علٰحدہ علٰحدہ سند بیان کرتے ہیں یعقوبی نے اپنے مختصر مقدمے میں اپنے تمام راویوں اور شیوخ کے نام گنا دئے ہیں۔ متنِ کتاب میں سند شاذ و نادر اور مختصراً ذکر ہوئی ہیں۔ یہ غالباً اس بنا پر تھا کہ یعقوبی ایک "کتاب مختصر" تالیف کرنا چاہتا تھا۔

یعقوبی نے مقدمے میں اپنے جن راویوں کے نام لئے ہیں ان کی تعداد تیرہ ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱ - اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی (متوفی ۱۷۸ھ/ ۷۹۴ء) جو بنو ہاشم کے شیوخ میں سے ایک تھے۔(۵۸)

۲ - ابو البختری وہب بن وہب قریشی (م ۲۰۰ھ/ ۸۱۵ء) جو جعفر بن محمد (م ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) وغیرہ اپنے رجالِ سند سے بیان کرتے ہیں۔(۵۹)

۳ - ابان بن عثمان، یہ بھی جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں۔(۶۰) (۲۰ھ/ ۶۴۱ء تا ۱۰۰ھ/ ۷۲۸ء)

۴ - محمد بن عمر واقدی جو اپنی روایات موسیٰ بن عقبہ وغیرہ جیسے راویوں سے لیتے ہیں۔(۶۱)

۵ - عبد الملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء) جو زیاد بن عبد اللہ بکائی سے اور وہ محمد بن اسحاق مطلبی سے روایت کرتے ہیں۔(۶۲)

۶ - ابو حسان زیادی جو ابو المنذر کلبی وغیرہ رجال سے نقل کرتے ہیں۔(۶۳)

۷، ۸ - عیسیٰ بن یزید بن دأب (۱۷۱ھ/ ۷۸۷ء) اور ہیثم بن عدی طائی (متوفی ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء)، یہ دونوں عبد اللہ بن عباس ہمدانی سے نقل حدیث کرتے ہیں۔(۶۴)

۹ - محمد بن کثیر قریشی، ابو صالح وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔(۶۵)

۱۰ - علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف مدائنی۔(۶۶) (۱۳۵ھ/ ۷۵۲ء تا ۲۲۵ھ/ ۸۴۰ء)

۱۱ - ابو معشر مدنی (م ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء)۔(۶۶ الف)

۱۲ - محمد بن موسیٰ خوارزمی منجم۔(۶۶ ب) (متوفی بعد ۲۳۲ھ/ ۸۴۷ء) (۶۶ ب)

۱۳ - ماشاء اللہ، جو سنین اور اوقات کے صحیح حساب از روئے نجوم وہیئت دیتے ہیں۔(۶۶ ج)

یعقوبی کے تمام شیوخ اور رواۃ قابلِ اعتبار ہیں اور اپنے اپنے فن کے مردِ میدان۔ ان میں ابان بن عثمان کی موجودگی قابلِ حیرت بھی ہے اور باعثِ رشک بھی۔ اس سے یعقوبی کے معتدل و متوازن رویّہ کی نشان دہی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس کی روایتوں میں غیر جانبداری کا عنصر نسبتاً بڑھ جاتا ہے۔ یکن یعقوبی کو فنِ استناد میں جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ دو ہیئت دانوں اور منجموں ——— خوارزمی اور ماشاءاللہ ——— کی شمولیت ہے۔ تاریخ یعقوبی کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اہم ترین واقعاتِ تاریخِ اسلام کا حساب ہیئت و نجوم کے اعتبار سے بھی بالالتزام دیتا ہے اور یہ طریقہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مواد میں بھی اپنایا ہے جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔ مورخ کے اس التزام سے یہ بات کسی حد تک سہی مگر ثابت ہوتی ہے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں ہیئت و نجوم کا مطالعہ اور علم کافی ترقی کر چکا تھا، اتنا کہ اس نے غیر فنی علوم میں بھی عمل دخل حاصل کر لیا تھا۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ یعقوبی کے سلسلۂ رواۃ کے بارے میں دو اور نکات اہم ہیں۔ اول یہ کہ ان میں سے بیشتر سے یعقوبی کی ملاقات نہیں تھی یا یعقوبی نے ان کو اپنے بچپن میں دیکھا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یعقوبی نے اپنے سلسلۂ اسناد میں تسلسل و تواتر کے اصول کو نظر انداز کر دیا ہے اور اپنے معاصر و ملاقاتی شیوخ و راویوں کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان سے ایک یا کئی درجے بعد کے راویوں سے جو مشہور و امامِ فن سمجھے جاتے ہیں روایت لی ہے۔ دوم یہ کہ یعقوبی نے متن کتاب میں اپنی روایتوں کے سلسلۂ سند کو بالکل نہیں بیان کیا ہے البتہ کہیں کہیں وہ کسی مشہور راوی جیسے واقدی یا جعفر بن محمد کا نام لے لیتا ہے۔ اس لیے اس کی بیشتر روایتوں کے اصل راوی یا سلسلۂ اسناد کو جاننا ناممکن ہے۔ یہ دونوں چیزیں اصل میں استناد کے درجہ کو گراتی اور پایۂ اعتبار کو کم کرتی ہیں۔

سیرت نبوی کا بیان "مولد رسول اللہ" کی سرخی اور ولادت نبوی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ علوم ہیئت و نجوم کے اعتبار سے پہلے یعقوبی آپ کی ولادت کے وقت ستاروں کا حال اور سیاروں کی منازل بتاتا ہے۔ پھر ولادتِ نبوی کے معجزات یا عالم مکان پر اس کے اثرات کا ذکر کرتا ہے جن کا کافی بڑا حصہ اوپر مصنف کے رجحانات کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ رسول کریم کے والد ماجد عبداللہ کا اور ان کی بی بی آمنہ سے شادی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کی ولادت 'زمزم' کے کھودنے کے دس سال اور شادی کے دس ماہ یا ایک سال آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں یعقوبی' جعفر بن محمد کی سند پر مشہور و عام روایت کے برعکس بیان کرتا ہے کہ ولادتِ باسعادت کے دو ماہ بعد والدِ محترم کا انتقال ہوا تھا اور دوسری روایت کے مطابق پورے ایک سال بعد انتقال ہوا تھا۔ یعقوبی پھر بصراحت کہتا ہے کہ بعض کی روایت یہ ہے کہ آپ والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے لیکن یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آپ کے والد کی وفات آپ کی ولادت کے بعد ہوئی تھی۔[۶]

اس کے بعد یعقوبی مختصراً ثُوَیبہ (باندی ابولہب) کے دودھ پلانے، حلیمہ سعدیہ کے گھر ایّامِ رضاعت گزارنے چار یا پانچ سال کی عمر مبارک میں واپس مکّہ آنے، عمر شریف کے چھ سال اور تین ماہ بعد والدہ ماجدہ کے بعمر تیس سال ابواء میں وفات پانے اور دادا کی کفالت کا ذکر کرتا ہے۔ حسبِ دستورِ ہوا خواہانِ بنی ہاشم یعقوبی خواجہ عبدالمطلب کے موحد ہونے، منکرات و عبادت اصنام سے بچنے، صاحبِ فیل (مکّہ پر حبشی حملہ کے قائد ابرہہ) سے نہ ملنے کا ذکر کرتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور عبدالمطلب کو ابراہیم ثانی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعۂ فیل کے عذاب کی بشارت والدِ رسول لائے تھے۔ پھر

عبدالمطلب کے تمام اولادِ امجاد کو صاحبانِ شرف و عظمت بتاتا ہے۔[۶۸] یہ یعقوبی کے شرف و دیانت کی بات ہے کہ وہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد کعبہ کی تولیت اور حکومت ان کے فرزند اکبر زبیر اور سقایہ اور رسول کریم کی کفالت ابو طالب کے پاس جانے کی وصیتِ جد کا ذکر کرتا ہے۔[۶۹] لیکن یہاں وہ عبدالمطلب کی عظمت شان کو ظاہر کرنے کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کہ قیام "قیامت کے دن خداوند قدوس میرے دادا عبدالمطلب کو انبیاء کی ہیئت اور بادشاہوں کے لباس میں ایک امت کی شکل میں اٹھائے گا" بیان کرتا ہے۔[۷۰] بظاہر یہ حدیث مشتبہ ہے اور بنو ہاشم کی مبالغہ آمیز قصیدہ خوانی کی ایک اور کڑی۔ پھر وہ ابو طالب کی تنگی و عسرت کے باوجود بہترین کفالتِ رسول اور عمر شریف کے نویں سال میں بُصریٰ کے سفر اور واقعۂ راہب کو بیان کرتا ہے۔[۷۱] اس کے بعد آپ کی چچی حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم (زوجۂ ابی طالب) کی ممتا، آپ کے ساتھ محبت آمیز سلوک، ان کی وفات پر رسول کریم کی شدتِ گریہ کا ذکر کرتا ہے۔[۷۲]

"الفجار" کی سرخی کے تحت وہ قیس و کنانہ کی مشہور جنگ کا ذکر کرتا ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ یا بیس سال کی عمر میں شرکت کی تھی۔ یعقوبی کا رجحان اس روایت کو قبول کرنے کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ جنگ فجار ماہ محترم رجب میں ہو رہی تھی جبکہ از روئے قاعدۂ عرب جنگ نہیں ہونی چاہیے، اس لیے ابو طالب نے شرکت سے انکار کیا تھا اور ان کے انکار کی وجہ سے عبداللہ بن جُدعان تیمی اور حرب بن امیہ اموی نے بھی انکار کر دیا تھا مگر زبیر بن عبدالمطلب کو بجبر و اکراہ نکلنا اور شامل ہونا پڑا تھا۔ دوسری روایت کو اگرچہ یعقوبی نے بیان کیا ہے تاہم لفظ "قیل" سے شروع کر کے کہتا ہے کہ ابو طالب اور ان کے ساتھ رسول کریم جنگِ فجار میں شریک ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یعقوبی کا مقصد بڑا معصوم و نیک تھا اور وہ یہ کہ ابو طالب کو ماہِ حرام کی حرمت کی ہتک کے الزام سے بچا لے۔ لیکن دوسرے تمام مورخین و سیرت نگارانِ رسول کا اس پر اتفاق ہے کہ ابو طالب اپنے خاندان بنی ہاشم و بنی امیہ کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر اس جنگ میں شریک ہوئے تھے اور ان کے انکار کی اور کوئی روایت کہیں نہیں ملتی ہے۔[۷۳] اس ذیل میں یعقوبی کی دیانت کا ذکر کرنا اور اس کو اس کا شرف دینا چاہیے کہ اس نے جنگ فجار کے بعد شام میں حرب بن امیہ بن عبد شمس جو دوسرے مورخین کے مطابق اس جنگ میں قریشی اتحاد کے سالار اعلیٰ ——— قائد ——— تھے، کی چند ماہ بعد وفات کا ایک مختصر سے جملہ میں ذکر کیا ہے۔[۷۴]

"حلف الفضول" کی تیسری سرخی کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس معاہدۂ حق و انصاف میں بعمر زائد از بیس سال شرکت اور معاہدہ کی تعریف میں آپ کے کلام اور معاہدہ کے مقصد کا ذکر کیا ہے۔[۷۵] پھر "بنیان الکعبہ" کی سُرخی کے تحت تعمیرِ کعبہ کا واقعہ اور اس میں رسول کریم کے دست اقدس کے ذریعہ حجرِ اسود کے نصب کیے جانے کا مشہور واقعہ مختصر طور سے بیان کیا۔ یعقوبی نے یہاں ایک اہم اضافہ یہ کیا ہے کہ کعبہ میں اس وقت چھت نہیں تھی۔[۷۶] پھر "تزویج خدیجہ بنت خویلد" کے عنوان کے تحت حضرت خدیجہ سے آپ کی شادی بعمر پچیس یا تیس سال کا بیان ہے۔ لیکن یعقوبی نے یہاں حضرت خدیجہ کی عمر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔[۷۷] البتہ ان کی وفات کے بیان میں ان کا سن ۶۵ سال بتایا ہے جو عام روایت کے مطابق ہے۔[۷۸] شادی کے بیان میں البتہ یعقوبی نے ایک روایت حضرت عمار بن یاسر کی سند پر بیان کی ہے کہ ایک بار خدیجہ اور عالم

(خدیجہ کی بہن) نے آپ کو صفا و مروہ کے درمیان دیکھا اور ہالہ نے خود حضرت عمار کے ذریعہ رسول کریم کو خدیجہ کا پیغام دیا۔ رسول نے قبول کیا اور دوسرے دن آپ اپنے چچاؤں کے ساتھ خدیجہ کے گھر گئے اور ابو طالب نے نکاح پڑھا[۷۹]۔ اس روایت میں حضرت عمار والا ٹکڑا اضافِ الحاقی معلوم ہوتا ہے اور اس کا مقصد حضرت عمار کی عظمت شان ان کے سیاسی رجحان کے سبب ظاہر کرنا ہے۔ یعقوبی نے حضرت خدیجہ سے آپ کے قبل از شادی تجارتی تعلقات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے البتہ خویلد بن اسد (خدیجہ کے والد) کی اس شادی پر بحالتِ نشہ رضامندی اور بحالتِ ہوش ناراضگی کی عمومی روایت بیان کی ہے پھر ابن اسحاق کی اس روایت کا حوالہ بھی دیا ہے کہ خویلد نے خود اپنے ہاتھوں سے شادی کی تقریبات برضا و رغبت انجام دی تھیں۔ پھر ان کی موت کی تاریخ بیان کی ہے۔ یعقوبی نے یہ بھی کہا ہے کہ اس شادی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار اولادیں: ایک فرزند اور تین دختر ——— قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم ——— بعثت سے قبل اور بعثت کے بعد دو اولادیں: ایک فرزند اور ایک دختر ——— عبداللہ جو طیب اور طاہر بھی کہلاتے تھے اور فاطمہ ——— تولد ہوئی تھیں[۸۰]۔

"البعث" کی سرخی کے تحت واقعۂ بعثت اور اس کے متعلقات کا نسبتاً تفصیلی بیان ہے۔ مورخ نے پہلے آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملنے کو بیان کیا، پھر کہا ہے کہ ماہِ بعثت ایک روایت کے مطابق ربیع الاول اور دوسری کے مطابق رمضان تھا۔ عجم کے مہینوں میں سے شباط تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ شباط ربیع کے مطابق تھا یا رمضان کے۔ البتہ وہ بوقت بعثت ستاروں و سیاروں کی منازل مفصل بیان کرتا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح جبریل علیہ السلام آئے اور پیغامِ خداوندی لائے۔ جبریل و میکائیل کے معاملہ کو ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اولیں نماز جو فرض ہوئی وہ ظہر تھی، جبریل نے آپ کو وضو سکھایا، نماز پڑھائی اور آپ کو جمعہ کے دن پہلی نمازِ ظہر پڑھتے دیکھ کر امت میں پہلے خدیجہ نے پھر حضرت علی نے نماز پڑھی۔ اولین مسلمانوں کے بارے میں یعقوبی کے رجحان و نقطۂ نظر کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارہ اولیں مسلمانوں کے درمیان ساتواں نام خالد بن سعید بن العاص اموی کا بھی ہے[۸۱]۔ ایک اموی کے اس طرح اسلام لانے کا ذکر کرنے کا شرف مورخ کو ملنا چاہیے۔ پھر مکہ میں تین سال خفیہ تبلیغ، قریش کی زبانی نکتہ چینی، اظہار و اعلانِ اسلام اور نتیجہ میں قریش کا پہلے استہزا اور پھر تعذیب کا ذکر کرنے کے بعد ایذا دینے والوں میں ابولہب، حکم بن ابی العاص، عقبہ بن ابی معیط، عدی بن حمراء ثقفی، عمرو بن طلالہ خزاعی کے ناموں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد مذاق اڑانے والوں (مستھزءون) کا ذکر ہے۔ یہ سب نام دوسرے مآخذ سے ملتے جلتے ہیں[۸۲]۔ یہاں یعقوبی کے اعتدال اور دیانتِ تاریخی کی داد دینی چاہیے کہ اس نے دشمنانِ رسول میں جہاں خواہ مخواہ دوسرے اموی اشخاص کو نہیں شامل کیا ہے وہاں ایمانداری سے اعتراف کر لیا ہے کہ سب سے بڑا موذی خود آنحضرت کا چچا ابولہب ہاشمی تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس فہرست میں ابو جہل مخزومی کا نام بدنامی نہیں ہے۔ پھر رسول کریم کی ابو طالب کی حمایت و سرپرستی اور قریش سے عم کریم کی مدافعت کا واقعہ ہے۔ اس ذیل میں ابو طالب کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ دشمنوں نے ایک بار آپ پر اونٹ کی گندگی ڈال دی تو ابو طالب تلوار لے کر انتقام لینے نکلے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک انھوں نے دریدہ دہنوں کے منہ پر گندگی نہ ڈال دی[۸۳]۔ تعجب ہے کہ یعقوبی نے حضرت حمزہ کا ذکر نہیں کیا جن سے یہ واقعہ منسوب ہے اور

ان کے شرف کو ابوطالب کے حق میں کیوں لکھ دیا۔ غالباً مورخ اشارتاً و کنایتاً یہ کہنا چاہتا ہے کہ مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حامی و ناصر صرف ابوطالب اور ان کا گھرانا تھا۔ چنانچہ واقعۂ معراج کے بیان میں، جس کو وہ " الاسوا " کی سرخی کے تحت بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ آسمان کی سیر کے بعد آپ سیدھے ابوطالب کی صاحبزادی ام ہانی کے گھر اترے اور ام ہانی کو سب سے پہلے واقعہ سنایا جس پر انھوں نے آپ کو واقعہ معراج بیان کرنے سے منع کیا۔ دوسری طرف ابوطالب نے جب آپ کو گھر نہ پایا تو ان کے اوسان گم ہو گئے کہ کہیں قریش نے اغوا نہ کر لیا ہو یا قتل نہ کر دیا ہو۔ چنانچہ صبح سویرے ابوطالب، بنو عبدالمطلب کے ستر افراد کے ساتھ نکلے، ہر ایک کو ایک شفرۃ (چھری) دے کر قریش کے ہر شخص کے پاس بٹھا دیا اور ان کو ہدایت کر دی کہ اگر واپسی پر میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھو تو ان سب کا کام تمام کر دینا۔ بہر حال وہ آپ کو ام ہانی کے گھر سے ڈھونڈ لائے اور قریش کو جتا دیا کہ ناکامی کی صورت میں ان کا کیا ارادہ تھا۔ قریش نے مستقبل میں آپ کو نہ ستانے کا وعدہ کیا۔[۸۴] ظاہر ہے کہ یہ دونوں روایتیں غلط ہیں۔ ابوطالب میں مکہ میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ قریش کے خلاف ایسا کوئی جرأت مندانہ اقدام کر سکیں۔ اس سے عجیب تر ام ہانی کا معاملہ ہے۔ دوسری تمام روایات سے متفقہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ام ہانی فتح مکہ تک اسلام نہیں لائی تھیں اور وہ اپنے شوہر کی دشمنیٔ رسول میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر ان کے شوہر پکے دشمن رسول فتح مکہ تک رہے۔[۸۵] غالباً کیا، صراحتاً یہ دونوں روایتیں ام ہانی کو الزامات سے بچانے اور ان کو اور ان کے والد مکرم کی توقیر مزید بڑھانے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

"الننذارۃ" کے تحت یعقوبی نے تعمیل حکم خداوندی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علانیہ تبلیغ اسلام کے آغاز اور کوہ مروہ پر اولین خطبۂ نبوی یا اولین دعوت الی الحق کا ذکر کیا لیکن عجیب و غریب انداز سے۔ اس کا بیان ہے کہ پہلے سب بنو فہر (قریش کے تمام چھوٹے بڑے خاندان) جمع ہوئے، پھر آپ ان میں سے بنو ہاشم کی اولین شاخ سے آخری شاخ یعنی بنو فہر سے بنو عبدالمطلب کا نام لیتے گئے اور دوسرے تمام غیر ہاشمی خاندان واپس ہوتے گئے تا آنکہ صرف بنو ہاشم رہ گئے۔ ان کو آپ نے دار حارث بن عبدالمطلب میں جمع کیا۔ کل چالیس آدمی تھے۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے پیغام حق پیش کیا تو ابولہب نے سخت مخالفت کی اور آپ کو برا بھلا کہا البتہ جعفر بن ابی طالب، عبیدہ بن حارث اور بنو ہاشم میں سے خلق عظیم نے اسلام قبول کر لیا۔[۸۶] یعقوبی کا یہ بیان دوسرے سیرت نگاران رسول سے کافی مختلف ہے۔ موخر الذکر خاندان بنو ہاشم کے سامنے تبلیغ اسلام کو ایک الگ واقعہ بتاتے ہیں جو صرف آپ کے قریب ترین اعزہ (عشیرتك الاقربین) کے لیے تھا اور کوہ صفا پر دعوت حق پورے مکہ والوں کے لیے تھا۔[۸۷] ایک اعتبار سے یہ تبلیغ اسلام کے دو مرحلے تھے۔ پھر دوسرے تذکرہ نگار پہلے واقعہ میں بنو ہاشم میں سے صرف حضرت علی کے قبول اسلام کا ذکر کرتے ہیں، بنی ہاشم میں اور کسی کے اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ جہاں تک حضرات جعفر بن ابی طالب اور عبیدہ بن حارث کے اسلام لانے کا تعلق ہے تو عام سیرت نگاروں نے اول الذکر کو مہاجرین حبشہ میں اور ثانی الذکر کو بدری صحابہ میں شمار کر کے ان کے ابتدا میں مسلمان ہونے کا ذکر ضرور کیا ہے تاہم ان کے قبول اسلام کے پس منظر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔[۸۸] ابن سعد نے البتہ اپنی طبقات میں دونوں مذکورہ بالا ہاشمیوں کے اسلام لانے کا زمانہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام و تبلیغ اسلام سے پہلے کا بتایا ہے۔[۸۹] رہے خلق عظیم، تو یعقوبی نے محبت میں زیب داستان کا یہ ٹکڑا لگا دیا ہے۔ اسی مبحث میں دشمنان رسول کی سختی اور

تعذیب خاص کر کفر و رویے سہارا مسلمانوں پر بیان کیا ہے اور چند "مستضعفین" کے نام بھی گنائے ہیں اور حضرت سمیہ والدۂ حضرت عمار بن یاسر کو اسلام میں پہلی شہید قرار دیا ہے۔[۹۰] جس کی تائید بلاذری کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔[۹۱] یعقوبی کے اس پورے بیان میں بعض بڑے اور اہم ابتدائی صحابہ کرام جیسے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ متعدد حضرات کے قبول اسلام کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جبکہ حضرت عمرو بن عبسہ سُلمی کے قبولِ اسلام کی کئی سطری روایت الگ سے درج ہے۔[۹۲] کیا یہ قریش کے دوسرے قبائل کے شرفِ قبولیت اسلام میں اولیت کو چھپانے کی جانبدارانہ اور غیر دیانتدارانہ کوشش تھی ؟

"مہاجرۃ الحبشۃ" کی دوسری سُرخی کے تحت ہجرت حبشہ کی تفصیلات کے بیان میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مہاجرین کی تعداد بیاشی مرد اور ان کی ازواج و اولاد کا ذکر ایک دو جملوں میں ہے پھر سارا زورِ کلام حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر، نجاشی کے دربار میں ان کی قدر و منزلت اور ان کی بزرگی و برتری پر صرف کر دیا گیا ہے یا پھر قریشی وفد کے دو ارکان عمرو بن عاص سہمی اور عمارہ بن ولید مخزومی جو مہاجرین حبشہ کو وہاں سے واپس لانے کے لیے گیا تھا کے آپسی اختلافات خاص کر حضرت عمرو بن عاص کی مبینہ چالاک فطرت کو اجاگر کرنے میں۔ اس بیان میں سارا زور حضرت جعفر پر ہے۔ اس پورے بیان سے یعقوبی دو شکار کرتا ہے، ایک حضرت جعفر کے اعلیٰ کردار کو اجاگر کرنا اور دوسرے حضرت عمرو بن عاص کے سازشی یا ناقابلِ اعتبار رویہ کو روشنی میں لانا۔[۹۳] یہ نکتہ اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ واقعہ تحکیم کا سارا الزام ناکامی موصوف کے سر پہ ڈال دیا جاتا ہے۔

پھر "حصار قریش لرسول اللہ وخبر الصحیفہ" کے ذیل میں یعقوبی نے رسولِ کریم، ابتدائی مسلمانوں اور ان کے اخلاقی معاونین بنو ہاشم کے سماجی مقاطعے اور قریش کے صحیفۂ مقاطعہ کا ذکر کیا ہے۔[۹۴] اس بیان میں مورخ کا زور مسلمانوں اور بنو ہاشم کی تکلیف و فقر و فاقہ سے زیادہ صحیفۂ مقاطعہ کے غیبی طور سے دیمک کی نذر ہو جانے پر ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یعقوبی نے یہاں بھی اس معجزہ کے زیر اثر خلق عظیم کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے جس کی تائید کسی اور ابتدائی ماخذ سے نہیں ہوتی۔[۹۵]

ایک صفحہ کے ایک بیان میں یعقوبی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند اکبر قاسم کی چار سال کی عمر میں وفات کا اسی عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے ایک ماہ بعد آنجناب کے دوسرے شیرخوار صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا۔ حضرت خدیجہ نے حسرت سے کہا کہ کاش بچہ کا دودھ تو چھوٹ جاتا! آپ نے اس پر حضرت خدیجہ کو تسلی دی کہ ان کا دودھ چھوڑنا جنت میں ہوگا۔ لیکن اس کے بعد یعقوبی نے جو ٹکڑا جوڑا ہے وہ سراسر اسلامی شریعت کے منافی ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے بعد حضرت خدیجہ نے دریافت کیا کہ آپ سے میری جو اولاد ہوئی اور مر گئی وہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: جنت میں۔ پوچھا کہ کیا بغیر کسی عمل کے۔ فرمایا کہ اللہ کو ان کے اعمال کا بہتر علم ہے۔ پھر حضرت خدیجہ نے یہی سوال اپنی اس اولاد کے بارے میں پوچھا جو رسول کریم سے پہلے شوہروں سے ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں جہنم میں ہونے کی بشارت ملی اور دوسرے سوال کا وہی پہلا جواب ملا۔[۹۶] یعقوبی نے بڑا ستم کیا کہ اپنے ممدوحین کی توقیر و تعظیم بڑھانے کے لیے اسلام کے اصولوں کا بھی لحاظ نہ کیا۔

اس کے بعد جو سرخی یعقوبی نے لگائی اور اس کے ذیل میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ خاص اس کی تاریخ کا امتیاز ہیں۔

"ما نزل من القرآن بمکۃ" کے تحت اس نے قرآن مجید کی مکی سورتوں کو بیان کیا ہے اور محمد بن حفص کوفی اور محمد بن کثیر اور محمد بن سائب کلبی اور ان کی ابوصالح سے اور ابوصالح کی ابن عباس کی روایت کی سند پر کہا ہے کہ کل بیاسی سُورتیں مکہ میں نازل ہوئیں جن کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ سورہ الاقرا/علق	۲۔ القلم	۳۔ والضحیٰ	۴۔ المزمل	۵۔ المدثر
۶۔ الفاتحہ	۷۔ المسد یا ابی لہب	۸۔ التکویر	۹۔ الاعلیٰ	۱۰۔ اللیل
۱۱۔ الفجر	۱۲۔ الانشراح	۱۳۔ الرحمٰن	۱۴۔ العصر	۱۵۔ الکوثر
۱۶۔ التکاثر	۱۷۔ الماعون	۱۸۔ الفیل	۱۹۔ النجم	۲۰۔ عبس
۲۱۔ لیلۃ القدر	۲۲۔ والشمس	۲۳۔ البروج	۲۴۔ التین	۲۵۔ ایلاف قریش
۲۶۔ القارعہ	۲۷۔ القیامہ	۲۸۔ الہمزہ	۲۹۔ المرسلات	۳۰۔ ق
۳۱۔ البلد	۳۲۔ الطارق	۳۳۔ القمر	۳۴۔ ص	۳۵۔ الاعراف
۳۶۔ الجن	۳۷۔ یٰسٓ	۳۸۔ الفرقان	۳۹۔ الفاطر	۴۰۔ مریم
۴۱۔ طٰہٰ	۴۲۔ الشعرآ	۴۳۔ النمل	۴۴۔ القصص	۴۵۔ بنی اسرائیل
۴۶۔ یونس	۴۷۔ ہود	۴۸۔ یوسف	۴۹۔ الحجر	۵۰۔ الانعام
۵۱۔ الصافات	۵۲۔ لقمان	۵۳۔ حم والمومن	۵۴۔ حم السجدہ	۵۵۔ حم عسق
۵۶۔ الزخرف	۵۷۔ حمد سبا	۵۸۔ الزمر	۵۹۔ الدخان	۶۰۔ حم الشریعۃ
۶۱۔ الاحقاف	۶۲۔ الذاریات	۶۳۔ الغاشیہ	۶۴۔ الکہف	۶۵۔ النحل
۶۶۔ نوح	۶۷۔ ابراہیم	۶۸۔ الانبیاءٔ	۶۹۔ المومنون	۷۰۔ الرعد
۷۱۔ الطور	۷۲۔ الملک	۷۳۔ الحاقہ	۷۴۔ المعارج	۷۵۔ النبأ
۷۶۔ النازعات	۷۷۔ الانفطار	۷۸۔ الروم	۷۹۔ العنکبوت	

یعقوبی نے اوپر کہا ہے کہ کل بیاسی سُورتیں مکہ میں نازل ہوئیں لیکن اپنی فہرست میں اس نے تین کم گنائی ہیں۔ مورخ کو خود بھی اعتراف ہے کہ حضرت ابن عباس کی اس روایت سے کچھ دوسرے لوگوں کو اختلاف ہے۔ لیکن یہ اختلاف معمولی ہے اور یہ دوسری روایتوں اور موجودہ مصحف میں سورتوں کے مکی مدنی ہونے کے معاملے سے تطابق پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا تھا سورت سورت نہیں، چنانچہ جس سُورت کا اوّلیں حصہ مکہ میں نازل ہوا اس کو مورخ نے مکی ہی شمار کیا ہے چاہے اس کا باقی حصہ یا تکملہ مدینہ میں نازل ہوا ہو۔ یہی معاملہ مدنی سورتوں کا ہے۔ مورخ کے مطابق بسملہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے نزول سے سورۃ کا فصل معلوم ہوتا ہے۔ یعقوبی نے یہاں ایک اسرائیلی روایت درج کی ہے کہ تورات ۶ رمضان کو نازل ہوئی اور اس کے پندرہ سو سال بعد ۱۲ رمضان کو زبور نازل ہوئی، زبور کے ۸ سو یا ۶ سو سال

بعد ۱۸ رمضان کو انجیل کا نزول ہوا۔ بعض کا بیان ہے کہ قرآن مجید ۲۰ رمضان کو نازل ہوا۔ جعفر بن محمد کی روایت ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم میں جس چیز، فن کا غلبہ ہوتا ہے اس میں اس قوم کے نبی کو اغلب بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں سحر کا غلبہ تھا لہٰذا ان کو طلسم ساحری و فرعونی توڑنے کا فن عطا ہوا۔ حضرت داؤد کے زمانے میں صنعت و حرفت اور لہو ولعب کا زور تھا اس لیے ان کو لوہے کو نرم کرنے کا فن اور لحنِ داؤدی عطا ہوا۔ حضرت سلیمان کے زمانے میں تعمیرات و عجائبات کا غلبہ تھا اس لیے ان کو جنات پر قدرت، ہوا پر تصرف اور طیور پر حکومت ملی۔ حضرت عیسیٰ کے زمانۂ بعثت میں طب کا زور تھا لہٰذا ان کو احیاءِ موتی اور امراض لاعلاج سے شفایابی کا فن دیا گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمنت لزوم میں کلام و خطابت، سجع و قافیہ، خطابت و بلاغت کا زور تھا اس لیے آپ کو معجز کلام قرآن عطا ہوا[97]۔ یعقوبی کا یہ باب ہماری دوسری متداول سیرتوں میں نہیں ملتا اس لیے بڑا وقیع ہے کہ وہ ہمیں قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیبِ نزول کا علم دیتا ہے۔

"وفات خدیجہ و ابی طالب" کے ذیل میں یعقوبی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سب سے بڑے مونس و غمگسار کے اٹھ جانے کا ذکر کیا ہے۔ تین سال ہجرت سے قبل پہلے حضرت خدیجہ نے داغِ مفارقت دیا پھر بقول مورخ وفاتِ زوجہ محترمہ کے تیسرے دن ابوطالب نے بعمر ۸۶ یا ۹۰ سال وفات پائی۔ مورخ نے اس کے علاوہ باقی زورِ کلام رسول کریم کی "جنتی ازواج" اور وفات ابوطالب کے غم پر صرف کیا ہے[98]۔

اگلی سُرخی کے تحت مورخ نے بیان کیا ہے کہ وفاتِ ابی طالب کے بعد جب قریش کی جرأت بڑھ گئی تو آپ نے اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کیا اور ان کی نصرت و حمایت چاہی مگر کسی نے آپ کی مدد نہ کی۔ پھر آپ کے سفرِ طائف کا ذکر ہے۔ اور اس کے آخر میں یہ بھی بیان کیا ہے طائف میں عُتبہ اور شیبہ سے آپ کی ملاقات ہوئی تو ان دونوں نے اپنا نصرانی غلام عداس آپ کے پاس بھیجا اور وہ آپ سے مل کر متاثر ہوا اور مسلمان ہوا[99]۔ یعقوبی نے یہ نہیں بتایا کہ دونوں اُمویوں نے اپنے غلام کے ہاتھ آپ کے لیے انگور کا خوشہ بطور تحفہ بھیجا تھا[100]۔

عام طور پر مورخ اور سیرت نگار اوس و خزرج کے مدینہ میں باہم دست بگریباں ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی مسلسل جنگ جُوئی اور نبرد آزمائی میں بعاث کی جنگ کا حوالہ دیتے ہیں جس نے ان دونوں کی کمر توڑ دی تھی۔ یعقوبی نے ان کی ماقبل اسلام جنگوں میں سے تیرہ جنگوں کے نام گنائے ہیں اور ان کی مکہ میں آمد کے ذیل میں انصار کی کمزوری، یہود بنی نضیر و بنی قریظہ کی جرأت، قریش مکہ سے انصاریوں کی استمداد، انکار کی صورت میں طائف والوں سے معاہدہ کرنے کی ناکام کوشش، رسول کریم سے ملاقات اور انصاریوں کے چھ افراد کا قبولِ اسلام، بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ، حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ بطور معلّم و مبلغ روانگی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ آنے کی درخواست وغیرہ موضوعات کو ایک ایک دو دو جملوں میں بیان کیا ہے۔

پھر اگلے عنوان "خروج رسول اللہ من مکۃ" میں دو تین جملوں میں رسول کریم کی ہجرت کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور بیشتر بحث حضرت علی کے بستر نبوی پر سونے کے واقعہ سے ہے جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے[101]۔

"قدوم رسول اللہ المدینۃ" کے ذیل میں یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ آپ دوشنبہ ۸ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے اور دوسری

روایت کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل کو جمعرات کے دن۔ بوقتِ آمد نبوی ستاروں اور سیاروں کا حال دینے کے بعد آپ کے کلثوم بن ہدم، سعد بن خیثمہ اور حضرت ابوایوب انصاری کے گھروں میں مہمان رہنے اور پھر اپنے حجروں میں منتقل ہونے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ایک نئی یعقوبی انداز کی روایت بیان کی ہے۔ اور وہ یہ کہ شادی سے پہلے ہی حضرت علی حضرت فاطمہ کو مدینہ مکّے سے لے کر آئے۔[۱۰۲] حالانکہ دُوسرے سیرت نگاروں کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے مدینہ سے حضرت زید بن حارثہ کو زادِ راہ دے کر اپنی ازواج و اولاد کو لانے کے لئے بھیجا تھا۔[۱۰۳]

پھر اگلی سُرخی " افتراض الصوم والصلٰوۃ " کے تحت صیامِ رمضان کی فرضیت، تحویلِ قبلہ، مسجدِ نبوی کی تعمیر، حضرات بلال و ام مکتوم کے اذان دینے کے واقعات کے مختصر ذکر کے ساتھ یہ ٹکڑا بھی لگا دیا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کا غلام کلاب منارہ بھی مزدوری کرتا رہا تھا اور مزید یہ بھی کہا ہے مسجدوں میں اس زمانے میں منارے نہیں ہوتے تھے۔[۱۰۴]

پھر ایک الگ سُرخی کے تحت مدینہ میں ۳۲ سورتوں کے نازل ہونے کا اہم باب ہے۔ یعقوبی کے مطابق مدنی سورتوں کی ترتیبِ نزول یہ تھی:

۱۔ ویلٌ للمطففین	۲۔ البقرہ	۳۔ الانفال	۴۔ آل عمران	۵۔ الحشر
۶۔ الاحزاب	۷۔ النور	۸۔ الممتحنہ	۹۔ الفتح	۱۰۔ النساء
۱۱۔ الحج	۱۲۔ الحدید	۱۳۔ محمدؐ	۱۴۔ الدہر	۱۵۔ الطلاق
۱۶۔ لم یکن الذین	۱۷۔ الجمعہ	۱۸۔ تنزیل السجدہ	۱۹۔ المومن	۲۰۔ المنافقون
۲۱۔ المجادلہ	۲۲۔ الحجرات	۲۳۔ التحریم	۲۴۔ التغابن	۲۵۔ الصف
۲۶۔ المائدہ	۲۷۔ البرأۃ	۲۸۔ النصر	۲۹۔ الواقعۃ	۳۰۔ العادیات

۳۱، ۳۲۔ معوذتین (دونوں ساتھ ساتھ)

اس کے بعد یعقوبی نے سب سے آخری آیت کے بارے میں مختلف روایتیں دی ہیں۔ ان میں یعقوبی نے سورہ مائدہ کی آیت تمیؔ " الیوم اکملت لکم دینکم الخ " کو صحیح ثابت اور صریح روایت قرار دیا ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتال کی آیتِ اجازت کے نازل ہونے کے بعد قتال کی تیاری کرنے کا ذکر ہے اور تلوارِ آسمانی کے نزول کا بھی۔ پھر پہلا سریہ حضرت حمزہ کا سریہ بتایا گیا ہے۔[۱۰۵]

اس کے بعد یعقوبی نے الگ الگ عناوین کے تحت اہم غزوات کا بیان دیا ہے۔ غزوۂ بدر کے بیان میں اس کی بعض جزئیات دوسروں سے مختلف ہیں۔ مثلاً جنگ کے دن جب حضرت عباس نے کل لشکر کے لیے دس اونٹ ذبح کیے اور ان کو پکانے کے لیے دیگوں میں چڑھایا گیا تو دیگیں اُلٹ گئیں۔ ابُولہب نے خود شرکت نہ کی مگر ایک روایت کے مطابق چار ہزار درہم سے مدد کی۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو بتاتا ہے اور دُوسری روایت کے مطابق ۸۱ مہاجر اور ۲۲۲ انصار کا ذکر کرتا ہے۔ بدر کے ستّر قیدیوں میں

اڑسٹھ سے فدیہ لیا گیا۔ حضرت عباس نے اپنا فدیہ ستّر اوقیہ اور اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی ستّر اوقیہ ادا کیا (یعنی کل نو ہزار آٹھ سو درہم بحساب چالیس درہم فی اوقیہ) یعقوبی مزید کہتا ہے کہ اس فتح کے بعد عربوں نے رسول اللہ کے پاس اپنے وفود بھیجے جو قرینِ قیاس ہے۔ لیکن ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جو قطعی قرینِ قیاس نہیں ہے۔ ربیعہ نے جب کسریٰ سے ذی قار کی جنگ غزوۂ بدر کے چار پانچ ماہ بعد لڑی اور ربیعہ نے تہامی کا شعار "یا محمد یا محمد" اپنایا تو انھوں نے کسریٰ کی فوجوں کو ہرا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "یہ پہلا موقع ہے کہ عرب نے عجم سے بدلہ لیا ہے اور وہ میری وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں"۔ یعقوبی کا یہ بیان ہے کہ اسی سال آپ نے دونوں عیدیں منائیں، مصلّٰی میں نماز پڑھی۔ ایک راستے سے گئے اور دوسرے سے آئے اور عید قرباں میں ایک بکری ذبح کی۔[۱۰۶]

جنگِ اُحد کے ضمن میں یعقوبی کہتا ہے کہ ایک خواب نے آپ کو مدینہ میں رہ کر جنگ کرنے کو کہا تھا مگر انصار نے باہر نکلنے پر اصرار کیا۔ دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار و مہاجرین کے جوشیلے افراد نے جن میں تجربہ کار و نوجوان دونوں شامل تھے میدانِ جنگ میں لڑنے پر اصرار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے لیکن منافقوں اور ان کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ چھوڑنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بوقتِ شکست رسول کریم کے ساتھ صرف تین صحابہ ——— حضرات علی، زبیر اور طلحہ ——— کے رہ جانے کا ذکر کیا ہے جس کی تصدیق دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی۔[۱۰۷]

یعقوبی نے یہودیوں کے ایک قبیلہ بنو قینقاع سے رسول کریم کی جنگ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تاہم غزوہ اُحد کے بعد بنو نضیر اور غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کے خلاف رسول کریم کے اقدامات کا روایتی ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں یعقوبی بنو نضیر کی وجہ تسمیہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک پہاڑ نضیر پر مقیم ہونے کے سبب سے اس نام سے پکارے گئے۔ یہی بات وہ بنو قریظہ کے سلسلہ میں بھی کہتا ہے لیکن موخر الذکر کے بارے میں ایک اور روایت بیان کرتا ہے کہ قریظہ ان کے جد کا نام تھا۔ وہ دونوں کو عرب قبیلہ جذام کی ایک شاخ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ بنو قریظہ عادیا بن السموال کے زمانے میں یہودی ہو گئے تھے۔[۱۰۸] غزوہ بنی النضیر کے موقعہ پر سلام بن اور یامین نضری کا قبول اسلام[۱۰۹] اور تحریم شراب کا نازل ہونا بیان کرتا ہے۔ اسی طرح غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر آنحضرت کے یہودیوں کو عبدۃ الطاغوت، وجوہ القردہ والخنازیر کہنے اور بعد میں یہودیوں کے ملامت کرنے پر آپ کے حیا سے پیچھے ہٹ آنے کا ذکر ہے جو صحیح نہیں ہے۔ باقی تفصیلات دوسرے مآخذ کی طرح ہیں۔

غزوہ خندق میں یعقوبی نے مسلمانوں کی کل تعداد سات سو بتائی ہے جو غلط ہے۔[۱۱۰] باقی تفصیلات دوسروں کی طرح ہیں سوائے یہودیوں کے حروف مقطعات پر بحث کے تذکرہ کے جس پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے۔ غزوہ بنو مصطلق کے بیان میں یعقوبی کا یہ بیان کہ حضرت جویریہ بنت حارث کے باپ، چچا اور زوج مقتول ہوئے تھے صحیح نہیں ہے۔[۱۱۱] لیکن یعقوبی کی مورخانہ دیانتداری ہے کہ اس واقعہ کے بعد معاملۂ افک میں حضرت عائشہ کی برأت اور قرآن مجید میں ان کی پاکدامنی کی شہادت کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے۔ دوسرے مورخوں کی مانند یعقوبی نے بھی بنو مصطلق کے صدقات پر حضرت ولید بن عقبہ اموی کی تقرری کا مختصراً ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیت ۶ کے نزول کا بھی۔[۱۱۱ الف]

حدیبیہ کی صلح کے باب میں یعقوبی نے سب کے خلاف معاہدہ کو صرف تین سال کے لیے ہونا بتایا ہے[۱۱۲]۔ باقی تفصیلات دوسروں کی مانند ہیں۔ خیبر کے غزوہ کے ذکر میں مورخ نے کہا ہے کہ اس کے چھ قلعے (حصون) —— سلالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربطۃ —— تھے اور ان میں بیس ہزار جنگجو تھے جبکہ دوسروں کے یہاں دس ہزار کی تعداد ملتی ہے بتفصیل سے حضرت علیؓ کے مرحب کو قتل اور قلعہ کے دروازے کو اکھاڑنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت جعفر کی آمد، پہلے بنو ہاشم پھر تمام مسلمانوں میں پیداوار کی تقسیم کے بعد یعقوبی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں مکہ قحط کا شکار تھا اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ مکہ کے تین شیوخ —— ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ بن خلف اور سہیل بن عمرو —— کے پاس سامان و سونا بھیجا۔ اول الذکر نے قبول کر لیا اور فقراء قریش میں تقسیم کر دیا اور اس صلۂ رحمی پر رسول کریم کی خاص عرب لہجے میں تعریف کی مگر باقی دونوں نے انکار کر دیا۔ پھر یعقوبی کے مرحب کی بہن زینب کے زہر آلود کھانا کھلانے کا واقعہ مختصر طور سے بیان کیا ہے اور حجاج بن علاط کے سفر مکہ کا بھی۔ لیکن تعجب ہے کہ یعقوبی نے خیبر کی شرائط صلح کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ فدک، تیماء، وادی القریٰ کے متنازعہ مسائل کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا ہے[۱۱۳]۔

فتح مکہ کی تفصیلات یعقوبی کے یہاں بھی وہی ہیں جو دوسرے مآخذ میں ملتی ہیں اور تقریباً یہی معاملہ غزوۂ حنین کی جزئیات کا ہے[۱۱۴]۔ البتہ اس غزوہ میں بنو ہاشم اور خاص کر حضرت علی کی مصاحبت رسول اور جنگ میں پامردی کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ محاصرۂ طائف کے باب میں یعقوبی کا بیان ہے کہ آپ نے حضرت علی کو آگے بھیجا جبکہ دوسرے تمام مآخذ نے حضرت ابوعامر اشعری کے بھیجے جانے کا ذکر کیا ہے[۱۱۵]۔ اسی طرح محاصرۂ طائف اٹھا لینے کے بعد حضرت ابوسفیان بن حرب کو محاصرہ پر خلیفۂ رسول اور حضرت علی کو کسرِ اصنام پر مامور کرنے کا معاملہ بھی صرف یعقوبی کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے بعد غزوہ موتہ کے ذکر میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی جلالتِ شان، ان کی شہادت، ان کے گھر والوں کا نوحہ، رسول کریم کا غم، حضرت فاطمہ کا تین دن جعفری خاندان کے لیے کھانا بھیجنے کا معمول اور اس کا بنو ہاشم میں سنّت بننا زیادہ اُجاگر کیا گیا ہے[۱۱۶]۔

" الغزوات التی لم یکن فیہا قتال " کے عنوان کے تحت یعقوبی نے ان غزواتِ نبوی کا ذکر کیا ہے جن میں جنگ و جدال نہیں ہوا۔ ان میں ابواء، بواط، ذی العشیرہ، الکدر، حمراء الاسد، بدر الموعد اور آخریں کا مختصر اور روایتی ذکر ہے البتہ تبوک کا سبب یا مقصد حضرت جعفر بن ابی طالب کا قصاص لینا بتایا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ اس غزوہ میں مالدار مسلمانوں کا نفقات کثیر خرچ کرنے کا ذکر ضرور ہے لیکن ان کے نام نہیں گنائے گئے ہیں جبکہ بکائین (رونے والوں) کے نام دیے گئے ہیں[۱۱۷]۔

" الامراء علی السرایا والجیوش " کی نسبتاً مفصل بحث میں ۳۴ سرایا، ان کے امراء، ان کے منازل اور ان اسباب و نتائج کو مختصر طور سے دیا گیا ہے[۱۱۸]۔ اور اس کے معاً بعد بغیر کسی سُرخی کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنروں (امراء) اور بعض عاملین صدقات کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فہرستِ عمالِ نبوی مکمل نہیں ہے کیونکہ اس میں کل ۲۳ افراد کے نام مذکور ہیں[۱۱۹]۔ بہرحال یہ یعقوبی کے شرف و دیانت کی بات ہے کہ اس نے عہدِ نبوی کے تقریباً تمام اموی امراء کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد نبی کریم کے سفیروں اور بادشاہوں کے نامہائے مبارک کا ذکر ایک علٰحدہ عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔ کل تیرہ سفیروں اور ان کے منزلوں کے نام مذکور ہیں۔ اس ذیل میں یعقوبی نے بعض باتیں ایسی کہی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ہیں۔ اوّل یہ کہ قیصر روم کا رسول کریم کے نامۂ مبارک کے جواب میں آپ کی رسالت کا اقرار کرنا، آپ کے ذکر خیر کو انجیل میں پانے کی شہادت کا اعتراف کرنا اور آپ کے قدم مبارک دھو کر سعادت پانے کی آرزو کا اظہار کرنا۔ اس کا جواب موصول ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ جب تک میرا نامہ اس ملک میں رہے گا تب تک ان کا ملک باقی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ یعقوبی نے حضرت عمار بن یاسر کی سفارت کا ذکر کیا ہے جو ایہم بن نعمان غسانی کے دربار میں گئی تھی۔ اس کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس ذیل میں یعقوبی نے بعض انفرادی مہموں کا ذکر کیا ہے جو مشرکین اور یہود کے بعض فتنہ پرداز لوگوں کے قتل کی غرض سے بھیجی گئی تھیں۔[۱۲۰]

وفودِ عرب کے بیان میں یعقوبی نے اگرچہ صرف تیس سے کچھ زیادہ وفدوں کے آنے کا ذکر کیا ہے جو ابن سعد کے جامع بیان کے مقابلے میں کافی تشنہ ہے تاہم یعقوبی کا بیان اس لحاظ سے وقیع ہے کہ اس نے ہر وفد کے رئیس کا ذکر بالالتزام کیا ہے جو دوسروں کے بیانات پر ایک اضافہ کرتا ہے کیونکہ بشمول ابن سعد تمام مورخین اور سیرت نگار اس کا التزام نہیں رکھتے ہیں۔[۱۲۱]

کُتّاب النبی کے بیان میں یعقوبی نے صرف ۱۲ کاتبین رسول کا ذکر کیا ہے جو عہد نبوی میں وحی، خطوط اور معاہدے لکھا کرتے تھے۔ ان میں حضرات علی، عثمان، عمرو بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان، شرجیل بن حسنہ، عبداللہ بن سعد، مغیرہ بن شعبہ، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، حنظلہ بن ربیع، ابی بن کعب، جہیم بن صلت اور حصین نمیری کے نام تو موجود ہیں مگر اور دوسرے بہت سوں کے نام غائب ہیں یہ خاصی ناقص فہرست ہے۔[۱۲۲] اس کے بعد چار نامہائے مبارک بنام اہلِ یمن، ہمدان، نجران و ہجر کے متون کا ذکر ہے، اور صلح نجران کا بھی۔ یعقوبی نے اہلِ نجران سے رسول کریم کے مباہلہ کرنے کی غرض سے "پنجتن پاک" کے نکلنے اور اہلِ نجران کے انکار کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے بعد "ازواجِ رسول" کے ذیل میں تیرہ یا گیارہ ازواج مطہرات کے اسمائے گرامی بیان کیے ہیں اور تفصیل دی ہے کہ کس کس زوجہ سے آپ کا نکاح مکمل ہو گیا تھا اور کس کس سے نہیں۔ اس کی بعض تفصیلات ایسی ہیں جو قابل کلام ہیں۔[۱۲۳] اس کے بعد "مولد ابراہیم بن رسول اللہ" کی سرخی کے تحت صاحبزادۂ رسول کی ولادت، رضاعت، عمر اور وفات کا مختصر ذکر ہے لیکن اسی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر "سوتیا ڈاہ" کا الزام بھی ہے۔ بعد میں حضور کے آزاد کردہ غلاموں، باندیوں، آپ کے رایات، تلواروں، تیر کمانوں، گھوڑوں، ناقوں، خچروں وغیرہ نیز آپ کے لباس، گھر کے برتنوں، چال ڈھال، بال و حلیہ، خاتم وغیرہ کا بھی بہت مختصر ذکر ہے۔[۱۲۴]

یعقوبی نے سیرت نبوی پر اپنے باب میں سب سے زیادہ صفحات خطبات و مواعظ نبوی کے لیے وقف کیے ہیں اور تقریباً پورے بیس صفحات ہیں، ۸۹ تا ۱۰۸۔ یعقوبی نے آپ کے تمام احسن المواعظ جمع کر دیے ہیں اور اس کا یہ قول صحیح ہے کہ اخلاق شریفہ پیدا کرنے اور حُسنِ سیرت سے انسان کو متصف کرنے کے لیے ان خطبات نبوی اور مواعظ حسنہ کی مثال گوہر شب چراغ سے کسی طرح کم نہیں۔[۱۲۵]

حجۃ الوداع کے بیان میں یعقوبی نے کافی تفصیلات جن کا تعلق آپ کے خطبات، مناسک حج وغیرہ سے ہی دی ہیں اور واپسی کے سفر میں غدیر خم کا قیام بروز ۱۸ ذی الحجہ کا ذکر ضرور کیا ہے تاہم صرف حدیث نبوی فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ،

اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ [ترجمہ: میں جس کا مولیٰ/دوست ہوں علی بھی اس کے دوست ہیں، اے اللہ! جو ان سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس کا دشمن ہو جا] کے بیان کرنے پر اکتفا ہے۔(۱۲۶)

وفاتِ نبوی کے ذیل میں ۲ ربیع الاوّل تاریخ وفات بتائی ہے جو دوسری روایات سے مختلف ہے اور کہا ہے کہ عجم کے مہینوں میں اذار کا مہینہ تھا۔ عقرب کا قران تھا پھر ماشاء اللہ منجم اور خوارزمی کے حسابات کے مطابق بوقتِ وفات ستاروں و سیاروں کی منازل دی ہیں۔ اسی کے ذیل میں ایک غریب روایت یہ دی ہے کہ حضرت عمر شدتِ غم میں کہتے پھرتے تھے کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ آپ حضرت موسیٰ کی طرح غائب ہو گئے ہیں اور چالیس دن بعد لوٹیں گے اس روایت کے پیچھے امام غائب کے تصور کو سند اعتبار دلانے کی خواہش چھپی معلوم ہوتی ہے۔(۱۲۷) وفات نبوی کے بعد حضرت فاطمہ کی وفات کا ذکر ہے جو متعدد روایات کے مطابق تین راتوں، چالیس یا ستر دن یا چھ ماہ بعد ہوئی۔ تدفین میں صرف حضرات سلمان و ابوذر اور ایک روایت کے مطابق حضرت عمّار حاضر تھے۔ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح یعقوبی نے حضرت فاطمہ اور ازواج مطہرات نبوی کے درمیان مبینہ شکر رنجی کی ایک من گھڑت داستان بھی بیان کی ہے کہ بعض ازواج نے حضرت فاطمہ کے غسلِ میت میں حاضر ہو کر شرکت کی اجازت چاہی۔ حضرت فاطمہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم میرے بارے میں وہی کہنا چاہتی ہو جو تم نے ایسے موقع پر میری ماں کے بارے میں کہا تھا۔ غالباً یعقوبی کو علم نہیں تھا کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے وقت ان ازواجِ مطہرات میں سے کوئی بھی نہ رسول کریم کے نکاح میں تھی نہ جنازے کی تقریبات میں شریک۔ لیکن الزام لگانے والوں کو صحت و عدم صحت سے کیا تعلق؟

یعقوبی نے "صفۃ رسول اللہ" کے تحت آپ کا حلیہ و شمائل مبارک، "المشبھون برسول اللہ" کے ذیل میں آپ کے حلیہ کے چھ حضرات جن میں پانچ ہاشمی اور ایک نامعلوم غیر ہاشمی تھے کے نام، ایک اور سرخی کے تحت آپ کی دادیوں کے نام حضرت آدم علیہ السلام تک، بوقتِ وفات آپ کے عمّال و امراء، صوبجات و عاملین صدقات جن کی تعداد صرف ۱۶ دی گئی ہے اور تمام فاطمہ نامی والداؤں/ماؤں اور دادیوں کے نام دیے گئے۔(۱۲۸) آپ کی سیرت پر اپنی تاریخ کے ایک سو بائیس صفحات یعقوبی نے وقف کیے ہیں۔

مذکورہ بالا تحلیل و تجزیے سے تاریخ یعقوبی کی بحیثیت ماخذِ سیرت نبوی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ یعقوبی کو بحیثیت سیرتِ نگارِ رسول یہ شرف ملنا چاہیے کہ اس نے اپنی عالمی تاریخ کے ذیل میں عہد نبوی کا بڑا جامع اور مختصر بیان پیش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس "کتاب مختصر" میں اس پورے عہد کی مکمل تفصیلات کی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم یعقوبی کو اس الزام بلکہ ارتکاب جرم سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس نے بلاوجہ یا غیر تاریخی انداز سے بعض قصے سیرت نبوی میں شامل کر دیے۔ ان کے بجائے اگر وہ تاریخی واقعات پر کچھ مزید توجہ دیتا تو سیرتِ رسول کا باب اور زیادہ وقیع ہو جاتا۔ تاریخ یعقوبی میں اگر اسناد کی متن کے درمیان عدم موجودگی سے قاری کو راحت ملتی ہے اور اس کے مطالعہ میں خلل اور اس کے ذہن پر روایت پسندی کا بوجھ نہیں پڑتا تو دوسری طرف اس کے بیانات کی فنی اور تاریخی حیثیت مجروح اور پایۂ استناد کمزور ہو جاتا ہے۔ یعقوبی کی زبان پر قدرت، سلاست، دریائے آمد کی سبک خرامی اور مختصر الفاظ میں زیادہ معانی ادا کرنے کی صلاحیت اس کی تاریخ کی ایک

نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر مورخ کی طرفداریٔ بنی ہاشم و بنو طالب کو ذہن میں رکھا جائے تو قاری بہت سے غیر مورخانہ اور غیر دیانتدارانہ بیانات کی چھان پھٹک خود کر کے حقیقت اور افسانہ طرازی کو سمجھ لے گا۔ بہرحال تاریخ یعقوبی اپنی تمام خامیوں کے باوجود اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی کا ایک اہم ماخذ ہے جس سے کوئی بھی دیانتدار مورخ یا طالبِ تاریخ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

تعلیقات و حوالہ جات

(۱) حدیث نبوی پر تمام کتابیں اس واقعہ کے حوالے فراہم کرتی ہیں۔

(۲) ابنِ سعد، طبقاتِ کبریٰ، بیروت ۶۰-۱۹۵۷ء، آٹھ جلدیں۔

(۳) عبدالعزیز دوری کا مضمون "THE IRAQ SCHOOL OF HISTORY TO THE 9TH CENTURY — A SKETCH" HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST میں، لندن ۱۹۶۲ء، ص ۴۷۔

(۴) الفریڈ گلیوم (A. GUILLUME) کا مقدمہ بر ترجمہ سیرت ابن اسحاق THE LIFE OF MUHAMMAD لندن ۱۹۵۵ء ص xiv - xvii؛ نیز عبدالعزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا؛ جوزف ہوروونس کا مضمون "THE EARLIEST BIOGRAPHIES OF THE PROPHET AND THEIR AUTHORS"، ISLAMIC CULTURE، حیدرآباد، اول (۱۹۲۷ء) ص ۵۹-۵۳۵؛ جلد دوم (۱۹۲۸ء) ص ۵۰-۲۲ وغیرہ۔

(۵) عبدالعزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا

(۶) ایضاً

(۷) ان ابتدائی سیرت نگاروں کے لیے ملاحظہ ہو: گلیوم کا مقدمہ؛ جوزف ہوروونس کا مضمون؛ نثار احمد فاروقی کی کتاب EARLY MUSLIM HISTORIOGRAPHY، ادارہ ادبیات دلی ۱۹۷۹ء، باب نہم ص ۸۰-۲۱۴۔

(۷ الف) محمد بن عمر واقدی، کتاب المغازی، تحقیق مارسدن جونس، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، مرتب کا مقدمہ ص ۱۵-۵ اور ص ۳۵-۲۹۔

(۸) گلیوم کا مقدمہ؛ منٹگمری واٹ کا مضمون "THE MATERIALS USED BY IBN ISHAQ"، HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST، ص ۳۴-۲۳

(۹) عبدالعزیز دوری کا مضمون، ص ۴۸؛ نثار احمد فاروقی، ص ۸۸-۲۸۱

(۱۰) عبدالعزیز دوری ص ۵۳-۵۲

(۱۱) یاقوت حموی، معجم الادباء، مکتبہ عیسی البابی مصر (غیر مورخہ)، جلد پنجم، ص ۵۴-۱۵۳

(۱۲) اسماعیل پاشا بغدادی، کتاب ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، مکتبہ بہیہ استانبول ۱۹۴۵ء، ص ۲۱۹؛ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین وآثار المصنفین استانبول ۱۹۵۱ء، جلد اول، ص ۵۲ (ب)۔

(۱۳) عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین، دمشق، ۱۹۵۰ء، جلد اول ص ۱۶۱۔ عمر رضا کحالہ نے اپنی کتاب میں ابن حیان کی المقتبس، جلد ششم ص ۵۳۔۴۷۵ اور عاملی کی اعیان الشیعۃ، جلد دہم ص ۳۹۔۳۰۰ کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں بھی مورخ لیعقوبی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا ورنہ کحالہ نے ضرور یا قوت کے بیان پر کچھ اضافہ کیا ہوتا۔ افسوس کہ یہ دونوں مذکورہ بالا کتابیں دستیاب نہ ہوسکیں۔

(۱۴) خیر الدین زرکلی، الاعلام، مصر طبع دوم (غیر مورخہ)، جلد اوّل ص ۹۱ الف ۔ ۹۰ ب

(۱۵) تاریخ الیعقوبی، دار صادر، بیروت ۱۹۶۰ء

(۱۶) تاریخ الیعقوبی، نجف ایڈیشن ۱۹۶۵ء، مرتبہ سید محمد صادق بحر العلوم، جلد اوّل ص د ۔ ب

(۱۷) عبدالعزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا

(۱۸) تاریخ لیعقوبی کے متن کے تمام حوالے اس کے بیروت ایڈیشن کے ہیں۔ ملاحظہ ہو: جلد دوم ص ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۶۲، ۱۶۸، ۲۱۴، ۲۱۹۔ نیز صفحات مابعد۔

(۱۹) اصحاب النص والتعیین جو حضرت علی اور ان کی اولاد امجاد کی امامتِ ربانی میں یقین رکھتے ہیں وہ حضرت علی اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن کی خلافت کے سوا تمام خلفاء راشدین واموی وعباسی کی خلافت کو ناجائز، غیر دستوری اور غاصبانہ قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: آرنلڈ (T.W. ARNOLD)، THE CALIPHATE، لندن ۱۹۶۵ء ص ۱۱-۱، ہملٹن گب (H.A.R. GIBB)، STUDIES ON THE CIVILIZATION OF ISLAM، لندن ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۱ و مابعد۔

(۲۰) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۲۳

(۲۱) ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ گلیوم)؛ ص ۱۵-۱۱۴ کے نزدیک حضرت ابوبکر تیسرے مسلمان تھے؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت، ۱۹۵۷ء، جلد سوم ص ۷۲-۱۷۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، دار المعارف مصر ۱۹۵۹ء، جلد اول ص ۱۱۲ وغیرہ

(۲۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۰ اور ص ۲۱

(۲۳) ایضاً ص ۴۲

(۲۴) تفصیلات اور مآخذ کے لیے ملاحظہ کیجئے: خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ازدواجی تعلقات" برہان دہلی، مئی ۱۹۸۰ء ص ۱۴-۱۲

(۲۵) تاریخ یعقوبی، دوم ص ۱۴

(۲۶) حضرت ابوالعاص اموی اسلام لانے سے قبل جنگِ بدر میں قریشی فوج کے ساتھ تھے۔ اسی میں قید ہوئے۔ رہائی کے وقت انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ بھیج دینے کا وعدہ کیا تھا جسے انھوں نے پورا کیا۔ اس واقعہ کو ابن اسحاق، واقدی، بلاذری، ابن سعد، طبری، دوسی نے بیان کیا ہے اور بخاری نے اپنی صحیح میں باب فضائل اصحاب النبی میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون مذکورہ بالا۔

(۲۷) خاکسار کا مضمون مذکورہ ص ۱۷-۱۵

(۲۸) یعقوبی، دوم ص ۱۷

(۲۹) مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، مصر ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۹ وغیرہ

(۳۰) مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، ص ۱۷۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ۳۸-۳۲۷

(۳۱) عبدالعزیز دوری کا مضمون ص ۴۷-۴۶؛ گلیوم کا مقدمہ ص xv؛ نثار احمد فاروقی ص ۹۳-۹۲۔ نیز ملاحظہ کیجئے فرانز روزنتھال (FRANZ ROSENTHAL) کا مضمون "THE INGLUENCE OF THE BIBLICAL TRADITION ON MUSLIM HISTORIOGRAPHY" HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST، ص ۴۳-۴۱

(۳۲) ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ گلیوم) ص ۶۹-۸۰ وغیرہ؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۹۶-۹۵ وغیرہ۔

(۳۳) تاریخ یعقوبی، دوم ص ۹-۸

(۳۴) ایضاً ص ۱۰

(۳۵) ایضاً ص ۱۲

(۳۶) ایضاً ص ۱۳

(۳۷) ایضاً ص ۱۴

(۳۸) ایضاً ص ۲۳-۲۲

(۳۹) ایضاً ص ۲۶

(۴۰) ایضاً ص ۳۲-۳۱

(۴۱) ایضاً ص ۳۵

(۴۲) ایضاً ص ۳۵

(۴۳) ایضاً ص ۳۵

(۴۴) ابوطالب کے اسلام لانے کے بارے میں کسی ابتدائی مورخ یا سیرت نگار نے کچھ نہیں کہا ہے۔ صحابہ کرام کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کو اصحابِ رسول میں شمار نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ، ص ۱۹۲-۱۹۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۲۳۶، نیز ملاحظہ ہو: ابن اثیر، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ؛ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب؛ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ وغیرہ۔

(۴۵) تاریخ یعقوبی، دوم ص ۳۹

(۴۶) قرآن مجید، سورہ توبہ آیت ۹

(۴۷) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۰ (۴۸) ایضاً ص ۴۱

(۴۹) ایضاً ص ۴۴ (۵۰) ایضاً ص ۸۸

(۵۱) بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۵۴۱ کا بیان ہے کہ ذوالفقار نامی تلوار عاص بن منبہ سہمی کی تھی جو بدر میں مقتول ہوا تھا۔ اور یہی زیادہ صحیح روایت ہے۔ مگر دوسروں نے اس کو منبہ بن حجاج سہمی یا اس کے بھائی بنیہ سہمی کی تلوار بھی کہا ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے صفحات ۲۹۴، ۳۴۳، ۵۱۵ اور ۵۲۱۔

(۵۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۶

(۵۳) واقدی، کتاب المغازی، ۵۰-۶۵۵۔ واقدی نے دونوں روایتیں دی ہیں۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کے بارے میں جو روایت ہے وہ واقدی نے محمد بن فضل کی جابر سے، زکریا بن زید کی عبداللہ بن ابی سفیان سے، مجمع بن یعقوب وغیرہ کی سند پر بیان کی ہے۔

(۵۴) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۵ (۵۵) ایضاً ۱/۵

(۵۶) ایضاً، بیروت ایڈیشن ۱۹۶۰ء

(۵۷) جیمس ہیسٹنگز (مرتب) ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS ایڈنبرا ۱۹۶۴ء، جلد ہشتم ص ۳۴۶ الف کا خیال ہے کہ تاریخ لیعقوبی ۸۹۱ء میں تصنیف کی گئی تھی۔

(۵۸) خیرالدین زرکلی، الاعلام، طبع دوم، جلد اول، ص ۲۸۷ الف۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس کے پڑپوتے تھے اور عباسی حکومت کے امرا میں سے۔ عہد ہارون رشید میں ۱۷۰ھ میں مدینہ کے گورنر تھے اور اس کے بعد سندھ، مکران اور مصر کے بھی گورنر رہے۔

(۵۹) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد نہم ص ۱۵۰ ب ص ۱۵۱ الف۔ وہب بن وہب کا تعلق بنو مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ/ قریش تھا۔ ان پر احادیث گھڑنے کا الزام تھا۔ ہارون رشید کے عہد میں مدینہ سے بغداد آ گئے اور مہدیہ کے قاضی لشکر بھی رہے۔ ان کے بزرگ جعفر بن محمد حضرت حسین شہید کے پڑپوتے تھے۔ بخاری نے ان کی روایت نہیں لی۔ ملاحظہ کیجئے ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، اول ص ۱۶۶۔

(۶۰) ابن سعد، طبقات، بیروت، ۱۹۵۷ء، پنجم ص ۵۳-۱۵۱۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے صاحب علم صاحبزادے۔

(۶۱) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، اول ص ۳۴۸

(۶۲) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد چہارم ص ۳۱۴۔ مشہور سیرت نبوی السیرۃ النبویہ (ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ کے ایڈیٹر)

(۶۳) تلاش کے باوجود ان کے بارے میں تفصیل نہ مل سکی۔

(۶۴) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد پنجم ص ۲۹۸ لیثی بکری تھے، انساب و روایت کے عالم، مدینہ کے باسی خلیفہ مہدی عباسی اور اس کے

فرزند ہادی کے دربار میں معظم مگر وضع شعر و حدیث میں متہم ۔ ہیثم بن عدی طائی، کوفہ کے باسی، ادب و نسب کے عالم ۔ خلفاء عباسی منصور و مہدی و ہادی و رشید کے ندیم ۔ علماء حدیث کے نزدیک غیر ثقہ : الاعلام، نہم ص ۱۵-۱۱۴ ۔

(۶۵) غیر معروف راوی ہیں ۔ متداول کتابوں میں ان کے بارے میں کچھ نہیں ملتا ۔

(۶۶) خیر الدین زرکلی، الاعلام، جلد پنجم ص ۱۴۰ ۔ مشہور راوی اور مصنف ۔

(۶۶ الف) حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے شمس الدین ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) کی کتاب تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء اوّل ص ۳۵-۲۳۴ ۔

(۶۶ ب) خیر الدین زرکلی، الاعلام، ص ۲۳۷ ۔ مشہور ریاضی دان اور فلکیات کا عالم نیز مورخ ۔ مامون عباسی کے عہد میں خلیفہ کے کتب خانے کا نگران تھا ۔

(۶۶ ج) تراجم اور سیر کی کتابوں میں ان کے بارے میں معلومات نہیں ملتی ہیں ۔

(۶۷) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۰-۷ ۔ ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ) ص ۶۹ نے صرف ایک روایت دی ہے کہ نبی کریم بطنِ مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا ۔ بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۹۲ نے متعدد روایتیں دی ہیں : اوّل وہ ابن اسحاق کی روایت کی تائید کرتا ہے اور اسی کو ثبت (صحیح و مسلّم) قرار دیتا ہے ۔ دوسری روایت میں وہ آپ کی عمر بوقت وفات والد سات ماہ اور تیسری روایت میں بیس ماہ سے کچھ اُوپر بتاتا ہے ۔

(۶۸) تاریخ الیعقوبی، دوم، ص ۱۲-۱۰ ۔ یعقوبی نے عبد المطلب کے دس لڑکے اور چار لڑکیاں بتائی ہیں ۔ لیکن زبیری، کتاب نسب قریش ص ۲۰-۱۷ نے بارہ فرزندوں اور چھ دختروں کے نام گنائے ہیں اور ان کی تفصیلات دی ہیں ۔ جبکہ ابن حزم اندلسی، جمہرۃ انساب العرب، مصر ۱۹۴۸ء ص ۱۳ نے سات فرزندوں کے نام گنا کر کہہ دیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی فرزند تھے البتہ دختروں کے معاملے میں وہ یعقوبی کی تائید کرتے ہیں ۔ بہرکیف زبیری کا بیان زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کی تصدیق بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۹۰-۸۷ سے بھی ہوتی ہے ۔ مزید تصدیق ابن اسحاق ص ۷۰ و مابعد سے ہوتی ہے ۔

(۶۹) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۲ ۔ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۸۸-۸۷ وغیرہ سے اس کی تائید ہوتی ہے ۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیّہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر" برہان دہلی جنوری ۱۹۸۰ء ۔ یعقوبی نے عبد المطلب کی عمر ایک سو بیس یا ایک سو چالیس سال بتائی ہے لیکن بلاذری، مذکورہ بالا ص ۸۴ کا خیال ہے کہ ان کی صحیح عمر ۸۸ سال تھی ۔ ابن اسحاق کی روایت (ص ۷۰) کہ سقایہ حضرت عباس کو ملا تھا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ اس وقت بچے تھے ۔

(۷۰) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۱۴

(۷۱) ایضاً، ص ۱۴ ۔ ابن اسحاق ص ۸۲-۷۹ نے آپ کی سفرِ شام کے وقت عمر نہیں دی ہے جبکہ بلاذری، انساب اوّل

ص ۹۶ میں بارہ سال ہے۔

(۷۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۴ - نیز ملاحظہ ہو زبیری، نسب قریش ص ۴۰ جس کے مطابق جو اسلام لائیں اور ہجرت کی اور مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۶ - ۱۵ - ابن اسحاق ص ۸۲ نے تین چار سطروں میں فجار کی جنگ کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں آپ کی یا آپ کے خاندان کی شرکت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلاذری، انساب اوّل ص ۱۰۳ - ۱۰۰ نے آپ کے اپنے چچاؤں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا ذکر کیا ہے۔ بلاذری کے یہاں اس پر تو اختلاف ملتا ہے کہ آپ شریک تھے یا نہیں لیکن آپ کے چچاؤں کی شرکت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۷۴) ایضاً۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت پر۔

(۷۵) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۸ - ۱۷

(۷۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۰ - ۱۹ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۸۷ - ۸۴؛ بلاذری، انساب، اول ص ۱۰۰ - ۹۹۔

(۷۷) ایضاً ص ۲۰ نیز ابن اسحاق ص ۸۳ - ۸۲ اور بلاذری، انساب، اول ص ۹۸ -

(۷۸) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۵

(۷۹) ایضاً ص ۲۰

(۸۰) ایضاً

(۸۱) ایضاً ص ۲۴ - ۲۲ - ابن اسحاق ۷ - ۱۰۴؛ بلاذری، انساب، اوّل ص ۶ - ۱۰۳

(۸۲) ایضاً ص ۲۴ - نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۱۳۹ - ۱۱۱؛ بلاذری، اوّل ص ۲۴ - ۱۱۲ نیز ص ۹۶ - ۱۲۵ -

(۸۳) ایضاً ص ۲۵

(۸۴) تاریخ لیعقوبی ص ۲۶ - ابن اسحاق ص ۸۰ - ۱۸۱ نے کہا ہے کہ واپسی پر رسول کریم کی تصدیق کرنے کے سبب حضرت ابوبکر کو صدیق لقب ملا تھا۔

(۸۵) بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۳۶۲ کا بیان ہے کہ فتح مکّہ کے دن ام ہانی بنت ابی طالب کے شوہر کا نام ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی تھا۔ ہبیرہ نے اسلام قبول نہیں کیا اور بھاگ کر نجران چلا گیا جہاں وہ بحالتِ شرک مرگیا۔ نیز ملاحظہ ہو ص ۴۵۹ ابن سعد، طبقات، جلد ہشتم ص ۵۲ - ۱۵۱ اور ص ۴۷

(۸۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۸ - ۲۷

(۸۷) ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۲۰ - ۱۱۷؛ بلاذری، انساب، اول ص ۲۲ - ۱۱۷

(۸۸) ابن اسحاق ص ۱۴۶؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۱۹۸

(۸۹) ابن سعد، طبقات، سوم ص ۵۰ (عبیدہ بن حارث کے لئے) اور چہارم ص ۳۴ -

(۹۰) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۸

(۹۱) بلاذری، انساب، اول ص ۱۵۸

(۹۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۳

(۹۳) ایضاً ص ۳۰ - ۲۹ - ابن اسحاق ص ۵۵ - ۱۴۶ اور بلاذری، انساب اول ص ۲۲۷ - ۱۹۸ نے بہت تفصیل سے ہجرتِ حبشہ اور اس کے متعلق واقعات بیان کیے ہیں۔ اور دونوں نے حضرت عمرو بن عاص کے بارے میں اس بدنما واقعہ کا حوالہ تک نہیں دیا ہے۔ البتہ بلاذری نے دوسرے انداز سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ (ص ۲۳ - ۲۳۲)

(۹۴) ایضاً ص ۳۲ - ۳۱

(۹۵) ابن اسحاق ص ۶۱ - ۱۵۹ اور بلاذری، انساب، اوّل ص ۲۵ - ۲۲۹

(۹۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۲

(۹۷) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۵ - ۳۳

(۹۸) ایضاً، ص ۳۵ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۹۲ - ۱۹۱ اور بلاذری، انساب اوّل ص ۷ - ۲۳۶

(۹۹) ایضاً ص ۳۶

(۱۰۰) ابن اسحاق ص ۹۴ - ۱۹۳

(۱۰۱) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۰ - ۳۷ - اس کی تائید ابن اسحاق ص ۲۰۶ - ۱۹۷ اور بلاذری، انساب، اوّل ص ۵۴ - ۲۲۸ سے ہوتی ہے۔

(۱۰۲) تاریخ لیعقوبی، انساب، اوّل ۷۰ - ۲۶۹

(۱۰۳) بلاذری، انساب، اوّل ص ۷۰ - ۲۶۹

(۱۰۴) تاریخ لیعقوبی، دوم، ص ۴۲

(۱۰۵) ایضاً ص ۴۴ - ۴۳

(۱۰۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۶ - ۴۵

(۱۰۷) ایضاً ص ۴۸ - ۴۷ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۹۰ - ۲۷۰، بلاذری، انساب، اول ص ۳۸ - ۳۱۱

(۱۰۸) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۳ - ۵۰

(۱۰۹) ابن اسحاق ص ۴۱ - ۲۴۰ (عبداللہ بن سلام کے اسلام کے لیے) اور بلاذری، انساب اول ص ۲۶۶

(۱۱۰) ابن سعد، دوم ص ۶۶ نے مسلم لشکر کی تعداد تین ہزار بتائی ہے۔

(۱۱۱) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۳ - نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق ص ۹۳ - ۴۹۲؛ بلاذری، انساب، اوّل ص ۴۲ - ۳۴۱

(۱۱۱ الف) واقعۂ مصطلق کے بارے میں قرآنی آیات کے نزول پر بحث کے لیے دیکھئے خاکسار کا مضمون مجلہ تحقیقات اسلامی علیگڑھ کے جنوری کے شمارے میں۔

(۱۱۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۶ - ۵۴ - ابن اسحاق ص ۵۰۴ - ابن سعد، دوم ص ۹۷ اور واقدی ص ۶۱۱ دس سالہ معاہدہ بتاتے ہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

(۱۱۳) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۷ - ۵۶

(۱۱۴) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۱ - ۵۸ اور ص ۶۴ - ۶۲
(۱۱۵) ملاحظہ کیجئے بلاذری، انساب، اول ص ۳۶۶
(۱۱۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۶ - ۶۵
(۱۱۷) ایضاً ص ۶۸ - ۶۶ - ابن اسحاق ص ۲۰۲، ابنِ سعد، دوم ص ۱۶۵ - بلاذری، انساب اول ص ۳۶۸ وغیرہ غزوۂ تبوک کا سبب رومی یا بازنطینی حملے اور اجتماع کو قرار دیتے ہیں۔
(۱۱۸) ایضاً ص ۷۵ - ۶۹ - مکمل بحث و تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے مونٹگمری واٹ، MUHAMMAD AT MEDINA، آکسفورڈ ۱۹۵۶ء ص ۳۳۹ تا ۳۴۳، نیز خاکسار کی آنے والی کتاب ORGANISATION OF GOVT. UNDER THE PROPHET، باب سوم - نیز بلاذری، انساب اوّل ص ۳۸۲ - ۳۷۱
(۱۱۹) ایضاً ص ۷۷ - ۷۶ - نیز خاکسار کی انگریزی مذکورہ بالا کتاب کے ابواب چہارم و پنجم۔
(۱۲۰) ایضاً ص ۷۸ - ۷۷ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۶۵۹ - ۶۵۲ - بلاذری، انساب، اول ص ۵۳۱۔
(۱۲۱) ایضاً ص ۸۰ - ۷۹۔
(۱۲۲) ایضاً ص ۸۲ - ۸۰ - تفصیلات کے لیے خادم کی کتاب کا باب چہارم۔
(۱۲۳) ایضاً ص ۸۶ - ۸۴ - موازنہ کے لیے ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب اول ۴۵۴ - ۳۹۹۔
(۱۲۴) ایضاً ص ۸۸ - ۸۷
(۱۲۵) ایضاً ص ۱۰۸ - ۸۹
(۱۲۶) ایضاً ص ۱۱۲ - ۱۰۹ - موازنہ کے لیے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۶۵۲ - ۶۴۹ - ابن سعد، دوم ص ۸۹ - ۱۷۲۔
(۱۲۷) ایضاً ص ۱۱۵ - ۱۱۳ - ابن اسحاق ص ۶۸۳ - ۶۸۲؛ ابن سعد، دوم ص ۲۶۰ - ۲۵۸؛ بلاذری، انساب اول ص ۵۶۹۔
(۱۲۸) ایضاً ص ۱۲۲ - ۱۱۶۔

ابنِ حزم الاندلسی اور جوامع السیرۃ

تحریر : ڈاکٹر احسان عباس، ڈاکٹر ناصر الدین اسد

ترجمہ واضافہ : محمد اجمل اصلاحی

تقدیم وتعارف

سیرت نبوی پر علامہ ابن حزم کی کتاب 'جوامع السیرۃ' کا یہ تعارف دراصل اس مقدمہ کا اردو ترجمہ ہے جو کتاب کے محققین ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد نے شروع میں اس کتاب پر لکھا ہے۔ سیرت پر یہ گرانقدر کتاب پہلی بار دونوں صاحبان کی مشترک کوشش سے منظر عام پر آئی اور دار المعارف مصر سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد دونوں ہی عربی زبان کے معروف اور بلند پایہ ادیب نقاد محقق اور مصنف ہیں۔ ڈاکٹر احسان عباس ۱۹۲۰ء میں فلسطین میں پیدا ہوئے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری قاہرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایک عرصہ سے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف محقق اور مترجم ہیں۔ اندلس پر 'المکتبۃ الاندلسیۃ' کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور متعدد کتابیں شائع کیں۔ چند اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ الادب الاندلسی (دو حصوں میں ہے)
۲۔ تاریخ النقد الادبی عند العرب
۳۔ العرب فی صقلیۃ
۴۔ فن الشعر
۵۔ فن السیرۃ
۶۔ عبد الوہاب البیاتی

اس کے علاوہ ابن حمدیس صقلی کا دیوان اور ابن حزم کے رسائل ایڈٹ کیے، شوقی ضیف اور احمد امین کے اشتراک سے خریدۃ القصر کے دو حصوں کی تحقیق کی۔ ترجموں میں ارسطو کی کتاب الشعر اور ٹی ایس ایلیٹ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ناصر الدین اسد نے جاہلی شاعری کے مآخذ اور ان کی تاریخی قدر و قیمت پر اپنے معرکۃ الآرا مقالہ پر

قاہرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ قاہرہ اور دمشق کی اکیڈمیوں کے رکن ہیں۔ ایک مدت تک اردن یونیورسٹی کے ریکٹر اور لیبیا یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے۔

فلسطین میں جدید عربی شاعری، جدید افسانہ اور فلسطین و اردن کے جدید ادبی رجحانات پر متعدد کتابوں کے علاوہ جاہلی شاعری پر ان کی دو تصنیفات اہم ہیں۔ ایک تو ڈاکٹریٹ کا مذکورہ مقالہ جو "مصادر الشعر الجاہلی وقیمتہا التاریخیۃ" کے نام سے دار المعارف قاہرہ سے شائع ہوا۔ اس موضوع پر ایسی محققانہ کتاب اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ اس مقالہ نے بالواسطہ طور پر جاہلی شاعری کے بارے میں مارگولیتھ اور طٰہٰ حسین کے نظریات کا قلع قمع کر دیا۔ دوسری کتاب "القیان والغناء فی الشعر الجاہلی" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو جاہلی شعرا قیس بن الخطیم اور حادرہ کے دواوین بھی ایڈٹ کیے ہیں۔

"جوامع السیرۃ" کی تحقیق کا کام ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد کے اشتراک اور احمد محمد شاکر کی نظر ثانی سے انجام پایا۔ ان حضرات کے سامنے چونکہ جوامع السیرۃ کا ایک ہی مخطوطہ تھا اور اس وقت تک ابن عبد البرّ کی کتاب الدُّرَر فی اختصار المغازی والسِّیَر شائع نہیں ہوئی تھی، اس لئے بہت سی غلطیاں رہ گئیں جن کی جانب ڈاکٹر شوقی ضیف نے الدُّرَر کے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے۔ جوامع السیرۃ کے ساتھ ابن حزم کے پانچ دوسرے رسائل بھی شائع کئے جو مخطوطہ میں سیرت کے ساتھ منسلک تھے وہ رسائل یہ ہیں:

۱۔ القرآات المشہورۃ فی الامصار الآتیۃ مجیٔ التواتر

۲۔ أسماء الصحابۃ الرواۃ وما لکل واحد من العدد

۳۔ اصحاب الفتیا من الصحابۃ ومن بعدھم

۴۔ جمل فتوح الاسلام بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۵۔ أسماء الخلفاء والولاۃ وذکر مددھم

"جوامع السیرۃ" کے مقدمہ میں ابن حزم کی تاریخ نگاری اور کتاب کی خصوصیات نیز مخطوطہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی لیکن ابن حزم کے حالات زندگی سے تعرض نہیں کیا گیا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ حالات و تصنیفات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے، چنانچہ اس مضمون کا پہلا حصہ جو "مصنف" کے ذیلی عنوان سے ہے مترجم کا اضافہ ہے۔ مضمون کے بعض اجزاء اصل موضوع سے غیر متعلق تھے اس لیے انھیں حذف کر دیا گیا۔ مصنف کے حالات کے مآخذ اور حوالہ جات ظاہر ہے مترجم کے ہیں لیکن اس کے علاوہ ذیلی عناوین اور متفرق حواشی بھی مترجم کی جانب سے ہیں، ان حواشی کے بعد قوسین میں "مترجم" کا لفظ درج کر دیا گیا ہے۔

۲۷ شعبان سنہ ۱۴۰۱ھ — محمد اجمل اصلاحی، مدیر معاون مجلۃ ثقافۃ الہند

آزاد بھون، نئی دہلی ۲

مُصنّف

جوامع السیرۃ تاریخ اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیت علامہ ابنِ حزم کی تصنیف ہے علامہ کا نام اور سلسلۂ نسب یہ ہے[1]:
ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح بن خلف بن معدان بن سفیان بن یزید[1]۔ ابن حزم کے جدِ امجد یزید فارسی نژاد اور حضرت معاویہؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیان کے حلیف تھے۔ مشرق میں جب عباسیوں کا آفتاب طلوع ہوا اور بنو امیہ نے اندلس میں اپنی سلطنت قائم کی تو ابن حزم کے جدِ اعلیٰ خلف نے بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ اندلس کا رخ کیا اور لبلہ کے ایک گاؤں مُنْت لیشم میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابنِ حزم کے والد احمد بن سعید[1] صاحب علم ادیب اور انشاپرداز تھے۔ بنو امیہ سے دیرینہ روابط اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے منصور بن ابی عامر اور اس کے بعد مظفر بن منصور کے عہد میں منصبِ وزارت پر فائز ہوئے۔ رمضان ۳۸۴ھ مطابق نومبر ۹۹۴ء میں ابن حزم نے قرطبہ میں جب آنکھیں کھولیں تو عیش و عشرت کے سارے اسباب مہیا تھے۔ پھولوں کی سیج پر پروان چڑھے۔ بچپن بڑے ناز و نعم میں گذرا، تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا، ذرا ہوشیار ہوئے تو ان کے والد نے ایک مردِ صالح ابوالحسین بن علی فاسی کو ان کا اتالیق اور سرپرست مقرر کیا۔ ابوالحسین کی رہنمائی میں ابن حزم نے اپنا علمی سفر بڑی تیزگامی سے طے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، غیر معمولی ذہانت، بلا کا حافظہ اور حاضر دماغی پھر ذوق و شوق کی فراوانی اور اس کے ساتھ یکسوئی و جانفشانی اور فراغت و خوشحالی۔ غرض سارے حالات سازگار تھے۔ چنانچہ مختلف علوم و فنون میں بہت جلد حیرت انگیز مہارت پیدا کر لی۔ مگر ابن حزم نے جب اس عالم ہست و بود میں قدم رکھا تھا تو بنو امیہ کا چل چلاؤ تھا۔ ابھی ناز پروردہ ابن حزم اپنی زندگی کی چودہ بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ قرطبہ سیاسی شورشوں کی آماج گاہ بن گیا۔ ابن حزم کا خاندان قدرتی طور پر سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ان کے والد نے سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کی اور مغربی قرطبہ میں اپنے محل کو چھوڑ کر مشرقی حصہ کے قدیم مکان میں منتقل ہو گئے اور ۴۰۲ھ میں وفات پائی۔

شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ۴۰۴ھ میں ابن حزم نے مجبوراً قرطبہ کو خیر باد کہا اور مَرِیّہ چلے گئے مگر وہاں بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ مَرِیّہ کے حاکم خیران نے ان پر اموی سلطنت کے احیاء کا الزام لگایا اور ایک ماہ قید کرنے کے بعد جلا وطن کر دیا۔ یہ جلا وطنی ان کے لئے زیادہ صبر آزما ثابت نہیں ہوئی۔ بَلَنْسِیَہ میں عبدالرحمٰن بن محمد نے خلافت قائم کی تو ابن حزم اس کی تائید و حمایت کے لیے بلنسیہ پہنچے اور خلیفہ کے دستِ راست بنے رہے۔ غرناطہ کی مہم میں عبدالرحمٰن کو شکست ہوئی تو ابن حزم اس کے ساتھ تھے۔ عبدالرحمٰن کو قتل کیا گیا اور ابن حزم دشمن کے ہاتھوں قید ہوئے۔ ایک مدت تک جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد ۴۰۹ھ میں قرطبہ واپس آئے اور اپنی علمی مصروفیات میں منہمک ہو گئے۔ آلِ حمود کا زوال ہوا تو پھر بنو امیہ کا چراغ روشن ہوا اگرچہ یہ روشنی پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ ۴۱۴ھ میں اہل قرطبہ نے عبدالرحمٰن بن ہشام بن عبدالجبار المستظہر کو خلیفہ بنایا جو اپنی ناتجربہ کاری کے سبب دو ماہ کے بعد قتل کیا گیا۔ ابن حزم المستظہر کے وزیر تھے، اس کا قتل ہوا تو پھر یہ جیل پہنچے ؎

بہ ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

اس کے بعد ابن حزم۔ یاقوت کے بیان کے مطابق۔ ہشام المعتد باللہ (۴۱۸ - ۴۲۲) کے عہد میں وزیر ہے۔ المعتد باللہ آخری اموی حکمران تھا جس کی معزولی کے بعد اندلس سے اموی سلطنت کا جنازہ نکل گیا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ اب ابن حزم سیاست سے یک قلم کنارہ کش ہو کر ہمہ تن علم و تحقیق بحث و مذاکرہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

اس دور میں ان کی علمی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں۔ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے اندلس کی مختلف ریاستوں مثلاً قیروان، میورقہ، بلنسیہ اور اشبیلیہ کا سفر کیا۔ ان اسفار کے دوران افادہ و استفادہ کے علاوہ علماء سے مناظرے اور مناقشے بھی ہوئے۔ اگر ایک طرف ابن حزم کے احباب و تلامذہ کا حلقہ وسیع ہوا تو دوسری طرف ان کے مخالفین کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

ابن حزم اپنی خاندانی وجاہت، فارغ البالی، اموی سلطنت سے قدیم وابستگی، حق گوئی و بے باکی، ندرتِ فکر، وسعت نظر اور انفرادیت کی وجہ سے مالکی فقہاء اور حکام دونوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ابن حزم کا بے کراں علم تنگیٔ چشم حسود کو کیوں کر راس آسکتا تھا، چنانچہ یہ فقہاء مسلسل حکام کے کان بھرتے اور ابن حزم کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے رہے۔ ان کے ہاتھوں ابن حزم کو سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جو ظالموں نے استعمال نہ کیا ہو۔ تکفیر و تضلیل کی، بے بنیاد الزامات لگائے، بنو امیہ کی ہواخواہی کے ساتھ ناصبیت کی جھوٹی تہمت تراشی، حکام کو برانگیختہ اور عوام کو برگشتہ کیا، طلبہ کو استفادہ اور قربت سے روکا۔ اس کے نتیجہ میں حکام نے قید و بند اور جلاوطنی کی سزائیں دیں لیکن سب سے زیادہ روح فرسا اور شرمناک سانحہ اشبیلیہ کے حکمران معتضد بن عباد (۴۳۴ - ۴۶۱ھ) کے زمانہ میں پیش آیا۔ اس نے ابن حزم کی بہت سی تصنیفات کو نذر آتش کر دیا اور بر سر عام ان کی کتابیں پارہ پارہ کی گئیں ؎

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے   ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

ابن حزم کو حالات نے بہت سخت جان بنا دیا تھا۔ اس واقعہ سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے البتہ ان کے لہجہ کی تندی اور خشمناکی میں اضافہ ہو گیا۔ حریفوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فَإِنْ تَحْرِقُوا الْقِرْطَاسَ لَا تَحْرِقُوا الَّذِي
تَضَمَّنَهُ الْقِرْطَاسُ بَلْ هُوَ فِي صَدْرِي
يَسِيرُ مَعِي حَيْثُ اسْتَقَلَّتْ رَكَائِبِي
وَيَنْزِلُ إِنْ أَنْزِلْ وَيُدْفَنُ فِي قَبْرِي
دَعُونِي مِنْ إِحْرَاقِ رَقٍّ وَكَاغِدٍ
وَقُولُوا بِعِلْمٍ كَيْ يَرَى النَّاسُ مَنْ يَدْرِي
وَإِلَّا فَعُودُوا لِلْمَكَاتِبِ بَدْأَةً
فَكَمْ دُونَ مَا تَبْغُونَ لِلَّهِ مِنْ سِتْرٍ

ترجمہ : (تم کاغذ تو جلا سکتے ہو مگر اس کی تحریر جلا نہیں سکتے کہ وہ کاغذ پر نہیں میرے سینے میں محفوظ ہے۔ یہ علم سفر و حضر ہر جگہ میرے ساتھ ہوتا ہے اور میرے ساتھ ہی میری قبر میں جائے گا۔
کاغذ اور کھال جلانے کی بزدلانہ روش ترک کرو۔ علم کے میدان میں اترو اور اپنا سرمایہ پیش کرو تاکہ دنیا دیکھے کہ کون صاحب علم ہے۔ اگر یہ بس میں نہیں ہے تو پھر مکتب میں واپس جاؤ۔ ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے)

آخر کار ابن حزم لبلہ میں واقع اپنے آبائی گاؤں میں خانہ نشین ہو گئے۔ عوام و خواص کی مخالفت کے باوجود جو مخلص تشنگان علم خدمت میں حاضر ہوتے وہ ان کے علوم و معارف کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے۔ سارا وقت مطالعہ، تحقیق اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ اسی قابل رشک حالت میں ۲۸ر شعبان ۴۵۶ھ مطابق ۱۵ر اگست ۱۰۶۴ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا فرحمہ اللہ و سامحہ۔

ابن حزم کا ابتدائی رجحان اپنے ہم وطنوں کے برخلاف شافعی مسلک کی جانب تھا، بعد میں انہوں نے ظاہری مسلک اختیار کیا اور اس کی تائید و تاسیس اور نشر و اشاعت میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ظاہری مسلک کی خوش قسمتی تھی کہ جس زمانے میں قاضی ابن ابی یعلی مشرق میں فقہ ظاہری کی جگہ فقہ حنبلی کو رواج دے رہے تھے اندلس میں ابن حزم جیسا نابغہ مل گیا جو ہر میدان میں اپنے ہم عصروں سے سیکڑوں قدم آگے تھا۔

ابن حزم نے اگر ایک طرف وقت کے مشاہیر علما مثلاً ابن جسور[۵] (متوفی ۴۰۱ھ) ابن عبد البر[۶] (متوفی ۴۶۳ھ) ابن الفرضی[۷] (متوفی ۴۰۳ھ) ابو عمر طلمنکی[۸] (متوفی ۴۲۸ھ) ابو الخیار ظاہری[۹] (متوفی ۴۲۶ھ) عبد اللہ بن ربیع تمیمی[۱۰] (متوفی ۴۱۵ھ) ابو القاسم ازدی[۱۱] (متوفی ۴۱۰ھ) قاضی حمام بن احمد[۱۲] (متوفی ۴۲۱ھ) قاضی یحیی بن عبد الرحمن بن مسعود[۱۳] (متوفی ۴۰۲ھ) وغیرہ سے استفادہ کیا تھا تو دوسری طرف اندلس کے پورے علمی ذخیرہ کو ہضم کیا تھا۔ ان کی علمی شخصیت بڑی جامع کمالات اور ہمہ جہت تھی۔ تفسیر و حدیث و فقہ و اصول، تاریخ و انساب، سیاسیات و نفسیات، تاریخ مذاہب و فرق، عقائد و خلافیات ادب و شاعری سب پر یکساں عبور تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تگ و تاز کا دائرہ منطق اور فلسفہ تک وسیع تھا۔

سیاسی اور مذہبی مخالفتوں کے طوفان میں بھی تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا اور عوام و خواص کی بے اعتنائی کے باوجود مختلف علوم و فنون پر کتابوں کا انبار لگا دیا۔ یاقوت کے بقول کثرت تصانیف میں امام طبری کے سوا متقدمین میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ ابن حزم کے بیٹے ابو رافع الفضل کا بیان ہے کہ ان کے پاس ان کے والد کی کتابیں انھیں کے خط میں تقریباً چار سو جلدوں میں موجود تھیں جو تقریباً اسی ہزار اوراق پر مشتمل تھیں[۱۴]

فقہ حدیث پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "الایصال إلی فهم كتاب الخصال الجامعة المجمل شرائع الاسلام فی الواجب والحلال والحرام وسائر الاحكام على ما أوجبه القرآن والسنته والاجماع" اس کتاب میں فقہی مسائل میں صحابہ، تابعین اور بعد کے ائمہ اسلام کے اقوال، ان کے موافق و مخالف دلائل اور ان کے بارے میں تمام قوی اور ضعیف احادیث سندوں کے ساتھ ذکر کی تھیں اور پھر سب پر نقد و جرح کے بعد ان مسائل کی تحقیق و تنقیح کی تھی۔ ظاہری نظام فقہ پر ابن حزم کی تصنیف المحلی کے بارے میں شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام کا قول ہے کہ اسلام کے علمی ذخیرہ میں ابن حزم کی

'المحلیٰ' اور شیخ موفق (ابن قدامہ) کی 'المغنی' کا کوئی جواب نہیں[۱۴] 'المحلیٰ' کا پہلا ایڈیشن لائڈن سے چھپا تھا۔ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء میں زیدان ابو المکارم حسن اور حسن زیدان طلبہ کی تصحیح سے ۹ جلدوں میں قاہرہ سے ایک عمدہ ایڈیشن نکلا۔ اصولِ فقہ پر ابن حزم کی معرکتہ الآراء کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کے آٹھ حصے دو جلدوں میں شیخ احمد محمد شاکر کی تحقیق سے شائع ہوئے ہیں مذاہب و فرق پر مشہور کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل کئی بار چھپ چکی ہے اردو میں مولانا عبداللہ عمادی کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں حیدر آباد سے شائع ہوا سیرت پر ابن حزم کی کتاب 'جوامع السیر' کا تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انساب پر ایک کتاب جمہرۃ انساب العرب لیوی پرادنسال کی کوشش سے ۱۹۴۸ء میں قاہرہ سے چھپی تھی ۱۹۶۲ء میں اس کا نفیس ایڈیشن عبدالسلام ہارون کی تحقیق سے شائع ہوا۔ اخلاق و نفسیات میں ابن حزم کی بصیرت اور بالغ نظری دیکھنی ہو تو ان کے دو رسالوں مداواۃ النفوس اور طوق الحمامہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اول الذکر کا ایک تحقیقی ایڈیشن عبدالرحمٰن محمد عثمان کی تحقیق سے قاہرہ سے متعدد بار چھپ چکا ہے۔ طوق الحمامہ کا موضوع عشق و محبت ہے۔ محبت کی ماہیت، مراتب، کیفیات اور نفسیات پر بڑی دیدہ وری سے روشنی ڈالی ہے۔ اس رسالہ کے متعدد ایڈیشن عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانوں میں نکل چکے ہیں۔ ابن حزم کے شاگرد رشید حمیدی نے ان کا مجموعہ کلام بھی مرتب کیا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ ابن حزم نے تاریخی، سیاسی اور اختلافی مسائل پر بے شمار رسائل لکھے جن میں سے کچھ طبع ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر احسان عباس نے ۱۹۶۰ء میں "الرد علی ابن النغریلۃ الیہودی و رسائل اخریٰ" کے نام سے ابن حزم کے رسائل کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۰ء میں سعید الافغانی نے "المفاضلۃ بین الصحابۃ" دمشق سے شائع کیا تھا۔ "نقط العروس فی تواریخ الخلفاء" کا ایک تحقیقی ایڈیشن ڈاکٹر شوقی ضیف کی کوشش سے ۱۹۵۱ء میں طبع ہوا۔

ابن حزم کی یہ تمام کتابیں مصنف کی وسعت مطالعہ، دقت نظر، اجتہاد فکر اور زور استدلال کا شاہکار ہیں۔ ابن حزم کا اسلوب واضح اور رواں، لہجہ تند و تیز، تنقید سخت، قلم بیباک اور فیصلے بے لاگ ہوتے ہیں۔ حریفوں کو دنداں شکن جواب دینے کے قائل تھے۔ مزاج میں کچھ تو طبعی حدت تھی جو شدت احساس اور بعض امراض کا نتیجہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن حزم جن تلخ حالات سے گزرے تھے اور مخالفین نے جو اذیتیں پہنچائی تھیں ان کی وجہ سے ابن حزم کی زبان و قلم میں زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ مقلد اور تنگ نظر علماء کی تردید میں ابن حزم نے ان ائمہ مجتہدین اور علمائے متقدمین کی بہت سی رایوں پر تنقید کی جن کی رائے سے معمولی اختلاف بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ ابن حزم جیسے حکیم و مفکر اور پاک دل و پاکباز سے ہمیں توقع تھی کہ ان کی تنقید کا لہجہ بھی متوازن اور پاکیزہ ہوگا مگر ایسا نہ ہو سکا، ابن عریف ابن حزم کے قلم کو حجاج کی تلوار سے تشبیہہ دیتے تھے[۱۵] لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک ابن حزم کے ان حاسدوں اور مخالفوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے طوق الحمامہ کے مشک بیز گہربار قلم کو خونریز و شعلہ بار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس شخص کی کتابیں بر سر عام نذر آتش کی گئی ہوں اس سے شبنم مزاجی اور شیریں مقالی کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے! بہر حال فقہاء و حکام کی ساری مخالفتوں اور تکفیر و تضلیل کے

باوجود ابن حزم کو علم کے دربار میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی۔

وجہ تالیف

فرض کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جوامع السیرۃ کی تصنیف سے ابن حزم کا مقصد اپنے طلبہ کے لیے ایک ایسی جامع اور مختصر کتاب مرتب کرنا تھا جس سے استفادہ اور مراجعت آسان ہو جیسا کہ انہوں نے اپنے بہت سے تاریخی رسائل مثلاً رسالہ "نقط العروس" اور رجال قرأت، حدیث، فتوحات اور تواریخ خلفاء وغیرہ پر اپنے دوسرے رسائل میں کیا ہے۔ نیز وہ اس کتاب میں سیرت نبوی پر وہ بنیادی مواد فراہم کرنا چاہتے تھے جس سے سیرت کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے یہ تعلیمی مقصد اس سیرت کی تصنیف کا ایک قوی محرک رہا ہو جس نے ابن حزم جیسے عالم کے لیے مہمیز کا کام کیا ہو، لیکن تنہا یہی ایک محرک نہ تھا۔ جو لوگ اہل ظاہر کے یہاں عام طور پر اور ابن حزم کے یہاں خاص طور پر "نقل" — اور سیرت نقل کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور تکثیر سنن کی اہمیت سے واقف ہیں انھیں نظر آئے گا کہ ایک نئے طرز سے سیرت کا مطالعہ، اس کے مواد کی ترکیز و تلخیص اور اسے قلمبند کرنا خود ان کے مسلک کا ایک جز ہے۔ "نقل" ظاہری مسلک کی ایک اساس ہی نہیں، بلکہ ابن حزم کے نزدیک "نقل" ہی وہ خصوصیت ہے جو ملت اسلامیہ کو ساری ملتوں میں ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے مذاہب پر ابن حزم نے جو سخت تنقید کی ہے اس کی بنیاد ان کے یہاں بھی "نقل" کی کمی اور ناقلین کا ناقابلِ اعتماد ہونا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے خیال میں یہ مذاہب بے لاگ تنقید کی تاب نہیں لا سکتے۔

لیکن سیرت نبوی نقل کا صرف ایک حصہ ہی نہیں ہے بلکہ ابن حزم کی نظر میں کمال انسانی کی معراج بھی ہے۔ اس لئے سیرت اگر ان کا محبوب موضوع ہو اور وہ لوگوں کے لئے اُسے آسان، عام فہم اور واضح انداز میں پیش کرنا چاہتے ہوں تو کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ "جو شخص آخرت کی فلاح، دنیا کی دانائی، عدل و انصاف سارے محاسن اخلاق کی جامعیت اور تمام خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہتا ہو تو اسے جہاں تک ممکن ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا اور آپ کے اخلاق و کردار کو مشعل راہ بنانا چاہیے"[۱۶]۔ اس سے سیرت نبوی سے انتہائی شغف اور راز سربستہ اس کی تدوین کے اسباب و محرکات کے بارے میں زیادہ دریافت کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

معاملہ کی اہمیت میں اور اضافہ ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سیرتِ رسولؐ ابن حزم کے نزدیک آپ کی نبوت کی حقانیت کا ایک روشن اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معجزہ دلائل نبوت میں سے ہے لیکن آپ کی سیرت وہ معجزہ ہے جس کی طاقت، تاثیر اور معنویت تمام مادی معجزات سے زیادہ ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں:

> "جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بغور مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ آپ کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔ آپ کی سیرت گواہی دے گی کہ آپ حقیقت میں اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اگر اس کے سامنے آپ کی سیرت کے سوا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہو تو یہی اس کے لئے کافی ہے"[۱۷]۔

ابن حزم اپنی یہ رائے مثالوں کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"آپ کا نشو و نما - جیسا کہ ہم نے ذکر کیا — جہالت کے ماحول میں ہوا۔ آپ نہ پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے۔ دو بار کے سوا کبھی ملک کے باہر نہیں گئے : ایک بار بچپن میں چچا کے ساتھ شام کے قریبی علاقہ میں گئے ، دوسری بار بھی مہین کا سفر کیا اور زیادہ روز قیام نہیں رہا کبھی اپنی قوم سے علیحدہ نہیں رہے پھر اللہ تعالیٰ نے جب سارے عرب کو آپ کے زیر نگیں کیا تو نہ آپ کے اندر کوئی تغیر واقع ہوا۔ اور نہ آپ کے اخلاق و کردار میں کوئی فرق رونما ہوا۔ یہاں تک کہ جب انتقال ہوا تو آپ کی زرہ کنبہ کی نان جویں کے لئے چند صاع جو کے عوض رہن تھی ، کبھی آپ کے ہاتھ میں دینار و درہم رات بھر نہیں رہے۔ جو مل جاتا زمین پر بیٹھ کر کھا لیتے، اپنی جوتیاں خود سیتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے اور اپنے اوپر ہمیشہ دوسروں کو ترجیح دیتے - ایک جلیل القدر صحابی کا قتل ان کے دشمن یہودیوں کے درمیان ہوتا ہے — ایسے صحابی جن کا قتل کسی لشکر کے لئے قیامت سے کم نہیں لیکن اس کی وجہ سے دشمنوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا - اس واقعہ کے بہانے آپ نے ان کا خون نہیں بہایا کسی ایک آدمی کو بھی قتل نہیں کیا - ان کی جائداد کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا - بلکہ خود اپنی جانب سے سو اونٹنیاں خون بہا میں دیں جبکہ اس وقت آپ اپنے معاش کے لیے ایک اونٹ کے محتاج تھے . . . . [۱۸]"

اسی جذبہ بلکہ اسی اسلوب میں ابن حزم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی، اور اس کے دو مباحث علامات نبوت اور آپ کے اخلاق و عادات پر خصوصی توجہ دی - یہی دونوں موضوعات ان کی دوسری تحریروں میں بھی بار بار سامنے آتے ہیں [۱۹]۔ اس لئے کہ یہ آپ کی نبوت کے شاہد عدل ہیں نیز مؤخر الذکر کمال اخلاق کے عملی پہلو کا آئینہ دار ہے ۔

مآخذ

ابن حزم نے اپنی سیرت کے دو مآخذ کا ذکر کیا ہے - ایک تو ابوحسان زیادی کی تاریخ دوسرے خلیفہ بن خیاط کی تاریخ [۲۰]۔ یہ دونوں کتابیں نا پید ہیں - ان کے کچھ متفرق اقتباسات بعض تاریخوں میں ملتے ہیں - یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ یہ دونوں کتابیں ابن حزم کی نظر سے گذری تھیں یا انہوں نے بالواسطہ ان سے استفادہ کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ تاریخ خلیفہ بن خیاط بقی بن مخلد کی روایت سے اندلس میں بہت پہلے پہنچ چکی تھی [۲۱] اور بقی ابن حزم کے نزدیک "شیخ المفسرین والمحدثین" ہیں ۔

سیرت ابن حزم کے عمومی ڈھانچہ سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر ان کا اعتماد سیرت ابن اسحٰق پر ہے خاص طور پر جب وہ ایک ایک غزوہ پر گفتگو کرتے ہیں اور ہر غزوہ میں شریک ہونے والے مسلمان و مشرکین اور شہید ہونے والے مسلمانوں کے نام درج کرتے ہیں۔ روایت ابن اسحٰق کی اس سختی سے پیروی کرنے کے نتیجہ میں ایک عجیب صورت پیدا ہو گئی ہے ابن حزم نے اکثر اشخاص کا مکمل نسب بھی ذکر کیا ہے اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے وہ خود اس موضوع پر "الجمهرة"

جیسی کتاب کے مصنف ہیں اصل حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے انساب کے سلسلہ میں بھی ابن اسحٰق ہی کی روایت کا انتخاب کیا ہے جبکہ "جمہرۃ" میں اسے اختیار نہیں کیا، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کتابوں کے زمانہ تصنیف میں طویل فاصلہ رہا ہو یا جمہرۃ کی تصنیف کے وقت جو کتابیں پیش نظر تھیں ان میں ابن اسحٰق کی روایت شامل نہیں تھی۔

ہمیں تقریباً یقین ہے کہ ابن حزم جیسے وسیع المطالعہ اور سیرت نبوی سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے والے مؤرخ کی نگاہ سے سیرت کی بہت سی کتابیں گذری ہوں گی خاص طور پر موسیٰ بن عقبہ کی مغازی، سعید بن یحییٰ اموی کی کتاب السیر، ابوداؤد سجستانی اور ابوجعفر احمد بن قتیبہ کی اعلام النبوۃ، کیونکہ یہ تمام کتابیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی تصنیفات اس وقت تک اندلس میں پہنچ چکی تھیں اور اندلسی علماء کے درمیان ان کی روایت اور مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا۔[۲۲]

ابن حزم نے سیرت کی تصنیف میں اپنے شیخ اور معاصر ابوعمر بن عبدالبر مصنف "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" سے بھی استفادہ کیا۔ یہ کتاب اگرچہ مکمل صورت میں ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا کہ ابن حزم نے اس پر کس حد تک اعتماد کیا ہے[۲۳] لیکن اس کے کچھ اقتباسات جو ابن سیدالناس نے محفوظ کر دیے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اپنے شیخ کی کتاب سے متعدد عبارتیں معمولی تصرف سے نقل کی ہیں[۲۴] الا یہ کہ یہ فرض کیا جائے کہ دونوں مصنفین یعنی ابن عبدالبر اور ابن حزم نے کسی تیسرے ماخذ سے استفادہ کیا ہو جو ہماری دسترس میں نہیں ہے۔[۲۵]

مقبولیت و اہمیت

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن سیدالناس کے سوا سیرت ابن عبدالبر کا سراغ ان کے بعد کے دوسرے مصنفین کے یہاں نہیں ملتا جبکہ سیرت ابن حزم کو ایک قابل اعتماد ماخذ کی حیثیت حاصل ہوئی اور چھٹی صدی ہجری کے بعد سیرت کے موضوع پر قلم اٹھانے والے متعدد مصنفین نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ابن کثیر نے سیرت ابن حزم سے دو اقتباسات نقل کئے ہیں ایک البدایہ والنہایہ میں دوسرا الفصول میں۔ موخر الذکر سیرت پر ابن کثیر کی ایک مختصر کتاب ہے سب سے زیادہ اقتباسات مقریزی کے یہاں ملتے ہیں۔ مقریزی کی کتاب امتاع الاسماع کا جو حصہ چھپا ہے اس میں ابن حزم کے پندرہ اقتباسات ہیں۔ مواہب لدنیہ کے مصنف نے بھی ایک مختصر عبارت لی ہے جیسے دیار بکری نے تاریخ الخمیس میں کئی جگہ نقل کیا ہے۔

ان اقتباسات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ابن حزم نے بعض شدید اختلافی مسائل خاص طور پر واقعات کی تاریخ اور سال کے زمانۂ وقوع کے سلسلہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ بعض اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے سیرت ابن حزم کی اہمیت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہوتا ہے:

(الف) "اسی تاریخ کو (غریب) مہاجرین کی سہولت کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی جیسا کہ ابو محمد بن حزم نے ذکر کیا ہے بعض علماء کا قول ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ معلوم نہ کر سکے کہ زکوٰۃ کب فرض ہوئی۔"[۲۶]

(ب) حافظ ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم لکھتے ہیں: غزوہ بنی المصطلق سے مسلمانوں کی واپسی میں اہل افک

نے چہ میگوئیاں کیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ صحیح سندوں سے ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ اس سلسلہ میں سعد بن عبادہ کے ساتھ سعد بن معاذ کی تکرار ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ راوی کا وہم ہے۔ اس لئے کہ سعد بن معاذ کا انتقال فتح بنو قریظہ کے بعد ہو چکا تھا اس میں کوئی شک نہیں اور بنو قریظہ کا واقعہ ذیقعدہ سنہ ۴ھ کے اواخر میں ہوا جبکہ غزوہ بنی المصطلق سعد بن عبادہ کے انتقال کے ایک سال چھ مہینے بعد شعبان سنہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اور دونوں صاحبان کی تکرار غزوہ بنی المصطلق کے پچاس روز کے بعد ہوئی[۲۷]"

(ج) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی (یعنی عمرہ حدیبیہ میں مسلمانوں کی) تعداد سات سو تھی مگر ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ قطعی طور پر شدید "وہم" ہے، ان کی صحیح تعداد جس میں کوئی شک نہیں تیرہ سو سے پندرہ سو تک تھی[۲۸]

ابن حزم کی تاریخ نویسی اور جوامع السیرۃ کی خصوصیات

ان مثالوں سے۔ اور اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ جوامع السیرۃ کی انفرادیت دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے امتیازی وصف اور ابن حزم کی تاریخ نگاری کی خصوصیات پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔

نص کے تجزیہ میں یہ دقت نظر، دیدہ ریزی، غور و فکر اور موازنہ کے بعد صحیح روایت کا انتخاب ان غلط فہمیوں کی تصحیح جو عجلت یا قلت تدبر کی بنا پر سادر ہوتی ہیں ابن حزم کی تاریخ نگاری کی وہ خصوصیات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

ان خصوصیات و اوصاف کی موجودگی میں ابن حزم کا قطعی اور فیصلہ کن لہجہ جو ان کے اسلوب تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے اور "لاشک" (کوئی شک نہیں) اور "لابدّ" (لازمی طور پر) کے الفاظ کی تکرار نہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے اور نہ گراں گزرتی ہے۔ اس لیے کہ ان پر زور اور ادعائی الفاظ کا سرچشمہ وہ یقین و اعتماد ہے جس کی بنیاد غیر جانبدارانہ علمی تحقیق اور قطعی طور پر ثابت شدہ نقل پر ہوتی ہے۔

تاریخوں کی تعیین و اندراج میں سخت احتیاط، تحقیق اور باریک بینی میں ابن حزم اپنے معاصرین میں اس حد تک معروف تھے کہ ان کے شاگرد حمیدی جہاں بھی اپنے استاذ کی روایت کو دوسروں کے مخالف پاتے ہیں وہاں "ابو محمد أعلم بالتواریخ" (ابن حزم کو تاریخوں کا زیادہ علم ہے) یا اسی مفہوم کا کوئی جملہ لکھتے ہیں[۲۹]

اسی وجہ سے سیرت ابن حزم میں آپ واقعات کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک قطعی رائے پائیں گے جس میں کوئی تردد یا تذبذب نہیں ہے۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ ابن حزم ایک زبردست محقق اور نہایت محتاط مورخ ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ہجری تقویم کے بارے میں خود ان کی ایک مستقل رائے ہے۔ وہ ماہ ربیع الاول کو جس میں آنحضرت نے مدینہ ہجرت فرمائی ——— ہجری تقویم کا پہلا مہینہ قرار دیتے ہیں اور اسی سے واقعات سیرت کی تاریخ لکھتے ہیں۔ اس سے ابن حزم کی غرض اس ہجری تقویم کی مخالفت نہیں ہے جس پر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمان متفق رہے ہیں اور جب

تک خدا کو منظور ہو گا متفق رہیں گے۔ یعنی ماہ محرم کو ہجری تقویم کے نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل رہے گی۔ دراصل ان کا یہ طریقہ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے تاریخوں کے تعین میں زیادہ دقیق، موزوں اور قرین صواب ہے، خاص طور پر جبکہ مورخین نے واقدی کی طرح واقعات کی تاریخیں لکھنا چھوڑ دیا کہ فلاں واقعہ مثلاً آں حضرتؐ کی مدینہ آمد کے پندرھویں یا سولھویں مہینے کے شروع میں ہوا، اور اس کے بجائے یوں لکھنے لگے کہ فلاں واقعہ ۲ھ یا ۳ھ میں پیش آیا۔ ظاہر ہے محرم کو ہجری تقویم کا پہلا مہینہ قرار دینے کے بعد دونوں تعبیروں میں مہینوں کا فرق پڑ جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ واقعات کے زمانی تعین میں اختلافات بہت ہیں اور ابن حزم کی رائے سے ان میں مزید ایک رائے کا اضافہ ہوتا ہے لیکن ابن حزم اپنی رایوں کو جس وثوق اور اطمینان سے بیان کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہم ان کی جانب مائل ہوتے ہیں اور انھیں ترجیح دیتے ہیں۔ وہ تنہا شخص ہیں جن کے یہاں جنگ کے وقوع یا زکوٰۃ کی فرضیت کی تاریخ پر یہ وثوق ہمیں ملتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وثوق خود اعتمادی میں غلو یا محض خود رائی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد تحقیق و تدقیق پر ہے۔ گذشتہ صفحات میں آپ نے دیکھا کہ اس تحقیق اور تنقید کے نتیجہ میں کس طرح تاریخوں کے سلسلہ میں بہت سی غلطیاں درست کیں۔ مثلاً واقعہ افک میں سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کے درمیان مبینہ تکرار کا مسئلہ گذر چکا ہے۔

اس فیصلہ کن قطعیت کے ساتھ ابن حزم کے یہاں ایک اور خصوصیت پائی جاتی ہے جو دراصل ظاہری مسلک کی دین ہے اس میں شبہ نہیں کہ سیرت کے اپنے مزاج اور مطلوبہ اختصار کی وجہ سے ابن حزم کو اس کا موقع نہ مل سکا کہ اپنے مسلک کی تائید میں نصوص سے احکام کا استنباط کر سکیں اسی لئے واقعات کی تشریح میں ظاہریت کھل کر سامنے نہیں آسکی لیکن اس تنگ دائرے میں اگر ذرا گنجائش ملی ہے تو بڑی دلچسپ صورت پیدا ہوئی ہے اور وہی فیصلہ کن انداز سامنے آیا ہے جس میں ابن حزم مشہور رہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ابن حزم اپنے فریق کے مقابلہ میں نص کا سہارا لیتے ہیں۔

اس کی ایک نمایاں مثال غزوہ بنی قریظہ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہر شخص بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کرے۔ مسلمان جب چلے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ہم نماز ادا کریں گے اس لئے کہ وقت ہو جانے کے بعد تاخیر کرنے کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔ دوسروں نے کہا کہ ہم تو وہیں نماز ادا کریں گے جہاں ادا کرنے کا آپ نے حکم دیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے عصر کی نماز رات میں ادا کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو کسی فریق کو آپ نے سرزنش نہیں کی۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ابن حزم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جہاں تک سرزنش کا سوال ہے تو وہ اس شخص کو کی جاتی ہے جس نے قصداً دیدہ و دانستہ معصیت کا ارتکاب کیا ہو، لیکن جو خیر کی نیت سے اس کی تعبیر کرے تو اگرچہ اس کا عمل درست نہ ہو پھر بھی سرزنش کا مستحق نہیں ہو گا۔ خدا جانتا ہے کہ اگر وہاں ہم ہوتے تو اس روز عصر کی نماز بنو قریظہ میں ہی ادا کرتے خواہ وہاں پہنچنے میں کئی دن گذر جاتے۔ جس طرح مزدلفہ کی شب کو مغرب کی نماز آپ نے عشا کے وقت میں اور عرفہ کے روز عصر کی نماز ظہر کے وقت میں منتقل کر دی اسی طرح اس روز عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچنے تک موخر کر دی، ان صورتوں میں باہم کوئی فرق نہیں ہے اور اطاعت ضروری ہے۔

ابن حزم کے تاریخی مسلک کی صرف یہی خصوصیات نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی تندی اور سخت گیری کے باوجود وہ ایک انصاف پسند اور دیانت دار مورخ کی صفات سے بہرہ ور تھے۔ دیانتداری ان کی ایک عام خصوصیت ہے جو صرف سیرت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے سب میں یہ جلوہ گر ہے۔

ابن حزم پر یہ الزام سراسر ناانصافی پر مبنی ہے کہ وہ ابن حیان کے بقول بنوامیہ کے حامی اور دوسرے اہل قریش کے مخالف تھے[۳۱] یہ الزام اس شخص پر سخت زیادتی ہے جو زندگی بھر حق کا جویا اور شیدائی رہا۔

اگر ابن حیان کی مراد اندلس کے بنی امیہ سے ہے تو بلاشبہ وہ دولت اسلامیہ کی شیرازہ بندی اور اسلام کی راہ میں ان کے جہاد کی قدر کرتے تھے اور اس پہلو سے ان کے مداح تھے۔ لیکن اگر مشرق کے بنوامیہ مراد ہیں تو یہ سراسر غلط ہے[۳۲] ابن حزم کی تحریروں میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ وہ بنوامیہ کی بیجا حمایت اور پاسداری کرتے تھے۔ تواریخ خلفا یہ ان کے رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل تھے اور مروان بن الحکم کو باغی سمجھتے تھے ان کے نزدیک مروان کو خلافت کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا[۳۳] ایک دوسری جگہ تو وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ "امیرالمومنین حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کے خلاف خروج سے پہلے مروان پر کوئی جرح میرے علم میں نہیں ہے[۳۴]"

واقعہ حرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ واقعہ بھی اسلام کی مصیبت کبریٰ اور (اس کے آہنی قلعہ کا) سب سے بڑا شگاف تھا، اس لئے کہ اس میں باقی صحابہ، اجلہ تابعین اور مسلمانوں کی چیدہ و برگزیدہ شخصیتوں کو کھلم کھلا ناحق تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا[۳۵]"

حضرت عبداللہ بن الزبیر کے قتل کے بارے میں لکھتے ہیں: "ابن الزبیرؓ کا قتل اسلام کی ایک مصیبت اور شگاف تھا اس لئے کہ ان کو برملا ناحق قتل کرنے اور پھانسی دینے پھر حرم کی بے حرمتی کی وجہ سے سارے مسلمانوں کی تذلیل ہوئی ہے[۳۶]"

اس طرح کے الفاظ اس شخص کی زبان پر بار بار نہیں آسکتے جو بنوامیہ کا متعصب حامی ہو یا ان کے دور میں پیش آنے والے ہر واقعہ کی توجیہ اور تاویل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔

تاریخ نگاری میں ابن حزم کا غالب رجحان تلخیص کی جانب تھا، جیسا کہ انہوں نے سیرت میں کیا ہے۔ چنانچہ تمام اشعار اور قصے خارج کر دیئے۔ نقط العروس اور دوسرے رسائل بھی اسی نہج پر ہیں۔

تلخیص میں ان کے نہج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متفرق مواد کو ایک عنوان کے تحت جمع کر دیتے ہیں مثلاً ایک فصل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امراء کے نام لکھتے ہیں۔ دوسری میں سرایا درج کرتے ہیں اور تیسری میں آپ کی ازواج و اولاد کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک طرح کے مواد کو ایک عنوان کے تحت درج کرتے ہیں اور مقصد جدت و ندرت ہوتا ہے مثلاً ان لوگوں کی فہرست جو اپنے باپ کی زندگی میں خلیفہ ہوئے، خلفاء میں جن کے دو نام تھے، سب سے کمسن خلیفہ، غیر قریش میں سے جو خلیفہ ہوئے ..... الخ[۳۷] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ترکیز کی وجہ سے یہ رسائل طلبہ کے لیے بہت مفید و مددگار ثابت ہوتے ہیں اور انھیں متفرق مواد بغیر کسی کد و کاوش کے یکجا مل جاتا ہے۔

اس طریقہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن حزم مطالعہ کے دوران ہمیشہ نوٹس لیتے رہتے تھے اور اس طرح کے رسائل درحقیقت انھیں نوٹس سے مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ طرز کچھ ابن حزم کی ایجاد نہیں ہے۔ ان سے پہلے ابن قتیبہ نے کتاب المعارف اور ابن حبیب نے کتاب المحبر میں یہی طرز اختیار کیا تھا۔

سیرت ابن حزم کا نام

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ابن حزم کی ایک کتاب "السیرۃ النبویۃ" ہے[۲۸] سخاوی نے مغازی اور سیر کی کتابوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ "سیرت پر ابو محمد بن حزم کی مستقل تصنیف ہے"۔ سخاوی نے کتاب کا نام صراحت سے ذکر نہیں کیا[۲۹] ہمارے مخطوطہ کے سرورق پر "کتاب السیرۃ النبویۃ لابن حزم" درج ہے۔ پھر کتانی کی "التراتیب الاداریۃ" سے معلوم ہوا کہ کتاب التخریج کے مصنف خزاعی نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا ان میں ابن حزم کی "کتاب جوامع السیرۃ" بھی تھی[۳۰] خزاعی (۷۱۰ — ۷۸۱ھ) آٹھویں صدی میں گزرے ہیں۔ ابن حزم کی سیرت کا نام جس انداز سے لکھا ہے اس سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس میں کسی تصرف سے کام نہیں لیا ہے، کیونکہ جب "السیرۃ النبویۃ" کہنا ممکن ہے تو کتاب کے لیے ایک نیا نام اختراع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

پس یہ نام "جوامع السیرۃ" ہی اس کتاب پر چسپاں ہوتا ہے اور اس طرح کی تصنیف کے لئے یہی مناسب بھی ہے کیونکہ تاریخ نگاری میں ابن حزم کا جو نہج ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کی تعبیر کے لیے "جوامع" سے زیادہ موزوں لفظ مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے اس کتاب کو یاد کرنا ناموں کے سلسلہ میں ایک قسم کا تساہل ہے جو بہت عام ہے۔ ہم اکثر "الکامل فی التاریخ" کو تاریخ ابن الاثیر یا "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" کو سیرت ابن سید الناس کہتے ہیں جبکہ اصل نام یہ نہیں ہے۔

"جوامع السیرۃ" اپنی حقیقت اور معنویت دونوں اعتبار سے چونکہ موزوں تھا اس لئے اس کتاب کے لیے ہم نے اسی نام کا انتخاب کیا اور وہ نام مسترد کر دیا جو مخطوطہ کے سرورق پر درج ہے اور جس کا ذہبی نے ذکر کیا ہے، اس لئے کہ ممکن ہے ذہبی کی نظر سے یہی نسخہ گذرا ہو۔ الغرض نام ایک ہی ہے متعدد نہیں ہیں اور "جوامع السیرۃ" ہماری نگاہ میں زیادہ راجح اور اقرب الی الصواب ہے۔

مخطوطہ اور اسکی سند

جہاں تک اس مخطوطہ کا تعلق ہے جس کی بنیاد پر یہ متن شائع کیا جا رہا ہے تو یہ عرب لیگ کے معہد المخطوطات میں ہندوستان کے حبیب گنج کلکشن سے آیا ہے[۳۱] کاتب نے مخطوطہ کے آخر میں لکھا ہے کہ اس نے ۱۳۵۴ھ میں اس کی کتابت مکمل کی۔ گویا یہ مخطوطہ حال کا لکھا ہوا ہے۔ اصل نسخہ جس سے یہ منقول ہے مدینہ منورہ کے مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت پاشا میں موجود ہے جس کی

کتابت آٹھویں صدی ہجری میں ۷۷۶ھ میں یعنی ابوحیان نحوی کے انتقال (۷۴۵ھ) کے تقریباً تیس سال بعد ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل نسخہ کا کاتب ایک نامعلوم شخص ہے جس تک ابوحیان سے سیرت کی روایت پہنچی تھی۔

اگر اس راوی کو ہم مستثنیٰ کر دیں جس سے ابوحیان کے تعلق کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے تو ان راویوں کے سلسلہ میں جن کے نام ہمارے مخطوطہ کے دوسرے صفحہ پر مذکور ہیں متعدد ممتاز شخصیتیں نظر آتی ہیں اور ان میں سے بیشتر ابن حزم کی سیرت اور اس کے ساتھ ظاہری مسلک کے بھی وارث اور امین ہوئے :

۱۔ ابوحیان اثیر الدین محمد بن یوسف جیانی غرناطی (۶۵۴ - ۷۴۵ھ)[۴۲] مشہور ماہر نحو اور مفسر تھے، البحر المحیط انھیں کی تصنیف ہے۔ ابوحیان نے اندلس میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس سیرت کی روایت کی، اپنے تعلیمی اسفار میں ظاہریہ کے دو شیوخ سے ان کی ملاقات ہوئی : ابو العباس احمد بن علی بن خالص اشبیلی اور ابو الفضل محمد بن محمد بن سعدون فہری شنتمری۔ اپنے استاذ عبد اللہ بن محمد بن ہارون طائی سے غالباً ان کی ملاقات قرطبہ میں ہوئی جن سے انہوں نے دوسری کتابوں کے ساتھ سیرت ابن حزم کی بھی روایت کی ۶۷۹ھ میں جب ابوحیان نے مصر کیلئے رخت سفر باندھا تو وہ ابن حزم کی تمام کتابوں کی روایت کر چکے تھے چنانچہ مصر میں انکے بعض تلامذہ نے ان سے ان کتابوں کی روایت کی۔ ابوحیان اپنے استاذ کے قدیم مسلک پر قائم رہے ۔ چنانچہ انہوں نے کتاب المحلی کا اختصار "النور الاجلی فی اختصار المحلی" کے نام سے تیار کیا۔ صفدی کا خیال ہے کہ ابوحیان نے جب دیکھا کہ مصر کے لوگوں کا رجحان ظاہری مسلک کی جانب نہیں ہے تو اسے چھوڑ کر شافعی مسلک اختیار کر لیا۔ لیکن محلی سے ان کی دلچسپی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں ایک طویل عرصہ تک اپنے قدیم مسلک پر ہی قائم رہے۔ صفدی کے سوا دوسرے تذکرہ نگاروں کے نزدیک " وہ ظاہری ہی رہے " ابن حجر کے اس بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

" ابوحیان کہتے تھے کہ جس کے دل میں ظاہری مسلک جاگزیں ہو جائے تو اس کا چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں "[۴۳]

مشرق پر ابوحیان کا صرف یہی احسان نہیں ہے کہ انہوں نے ابن حزم کی کتابوں کا تعارف اہل مشرق سے کرایا بلکہ " انھیں نے لوگوں کے اندر ابن مالک کی نحوی کتابوں کے مطالعہ کا حوصلہ پیدا کیا اور ترغیب دی نیز ان کے ادق مسائل کو عام فہم بنایا اور تشریح کی " مغربی ثقافت اور علما مغرب کے تعارف اور ان کے ناموں کے صحیح تلفظ میں ابوحیان کی حیثیت ایک دیانتدار سفیر کی تھی ۔ اہل مغرب چونکہ بلاد فرنگ کے ہمسایہ ہیں اسی لئے ان کے نام اور الفاظ بھی ان کی زبان سے قریب ہیں ۔

۲۔ ابوحیان کے شیخ عبد اللہ بن محمد بن ہارون بن عبد العزیز بن اسمٰعیل طائی (۶۰۳ - ۷۰۲ھ)[۴۴] اندلسی مہاجرین میں تھے لیکن انہوں نے قیام کے لئے تونس کا انتخاب کیا ۔ اپنے دور کے مروجہ علوم مثلاً قراٰات ، لغت ، حدیث اور نحو کے عالم تھے ۔ سیرت نبوی سے خاص شغف تھا چنانچہ اپنے ایک عزیز حافظ ابو زکریا حمیری سے " الروض الانف " کی سماعت کی ۔ سیرت کی سماعت احمد بن علی الفحام نحوی سے کی ۔ اسی طرح شمائل کی سماعت ایک اور استاذ سے کی ۔ سیرت ابن حزم کی روایت اپنے شیخ ابو القاسم بن بقی سے کی ۔ موطا اور مبرد کی کامل کا درس بھی ان سے کیا ۔ ابن بقی کے آخری راوی یہی عبد اللہ بن محمد طائی ہیں ۔ مآخذ سے یہ اندازہ نہیں

ہوتا کہ وہ ظاہری تھے لیکن اس کے خلاف بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ان کے بارے میں معروف تھا کہ ان کے اندر کسی قدر تشیع اور حضرت معاویہ اور ان کے شہزادے یزید سے بیزاری پائی جاتی تھی۔ اس پہلو سے استاذ اور شاگرد (ابوحیان) کے درمیان مماثلت نظر آتی ہے۔ موخر الذکر کا میلان بھی حضرت علی کی محبت اور ان سے صف آرا ہونے والوں کی مخالفت کی جانب تھا۔[45]

۳۔ ابن ناظر (۶۰۳ – ۶۷۹)

پورا نام حسن (یا حسین) بن عبدالعزیز بن محمد بن ابی الاحوص تھا۔[46] موصوف نے بھی ابن بقی کے آگے اشبیلیہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اصلاً بلنسیہ کے باشندے تھے مگر غرناطہ میں پرورش ہوئی۔ اندلس کے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور ماہرین شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استفادہ کیا یہاں تک کہ "متعدد علوم کے حامل، حدیث و تفسیر کے حافظ اور ادب، لغت اور تاریخ کے ماہر ہوئے" روایات اور اسانید کے ضبط میں بھی مشہور تھے۔

"تدریس اور قضا کے عہدوں پر فائز رہے یہاں تک کہ غرناطہ میں انتقال کیا۔ ابوحیان نے ان کا ذکر اپنے مالقہ کے شیوخ میں کیا ہے اور لکھا ہے: ان کے اندر تھوڑا سا ترفع اور دنیا بیزاری تھی اس لیے کہ ان سے کمتر لوگوں کو دنیا نے ان سے بلند رتبہ عطا کیا۔"

۴۔ ابن بقی قرطبی (۵۳۷ – ۶۲۵)

ابوالقاسم احمد بن یزید بن بقی اموی قرطبی[47] مغرب کے قاضی القضاۃ اور اندلس کے بڑے باکمال اور جلیل القدر عالم تھے۔ اشبیلیہ میں بنی الباجی اور قرطبہ میں بنی مخیث کے سوا پورے اندلس میں ایسا علمی اور ممتاز خانوادہ نہیں گذرا۔ مراکش اور اس کے بعد اپنے شہر کے قاضی ہوئے تو فیصلے ظاہری مسلک کے مطابق کئے۔ عہدہ قضا سے علاحدہ ہوئے تو اُن سے استفادہ کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے۔ ابن بقی نے سہیل سے الروض الالف کی سماعت کی تھی اور ایک سال کی عمر میں شریح بن محمد نے انھیں روایت کی اجازت دی۔ اس اجازت میں سیرت ابن حزم بھی شامل تھی اسی لئے ابن بقی شریح سے بسند اجازت روایت کرنے والے آخری شخص سمجھے جاتے ہیں

۵۔ شریح بن محمد رعینی (۴۵۱ – ۵۲۹)

شریح بن محمد بن شریح رعینی اشبیلی[48] ابن حزم کے براہ راست شاگرد ہیں لیکن بظاہر انھیں بھی سیرت ابن حزم کی اجازت کمسنی میں ملی تھی اس لیے کہ ابن حزم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس طور پر شریح ابن حزم سے اجازت پانے والے آخری لوگوں میں ہیں۔ موصوف قاری، محدث، حافظ اور بہترین مقرر تھے۔ ابن بشکوال مصنف الصلۃ نے ان سے ملاقات کی تو شریح نے انھیں روایت کی اجازت دی۔ ابن بقی کے واسطہ سے ابن الابار سے ان کی روایت متصل ہے۔ وہ کتاب التکملہ میں اسی سند سے ابن حزم کی روایتیں نقل کرتے ہیں۔[49]

۶۔ ابن بُریال حجاری (۴۱۶ – ۵۰۲)

ابوبکر عبدالباقی بن محمد بن سعید بن بُریال[50] کی نسبت اندلس کے ایک شہر وادی الحجارۃ کی جانب ہے۔ منذر بن المنذر،

ابوالولید ہشام بن احمد کنانی، ابو محمد قاسم بن فتح، ابو عمر طلمنکی وغیرہ سے روایت کی۔ آخری عمر میں مُریّہ میں قیام کیا۔ طویل عمر پائی اور بلنسیہ میں انتقال ہوا۔

یہ وہ حضرات ہیں جن کی روایت ابن حزم کی تمام کتابوں کے سلسلہ میں عام طور پر اور سیرت کے سلسلہ میں خاص طور پر منقول ہے۔ سند کے آخری نام کے واسطہ سے یہ کتاب مشرق میں پہنچی۔ یہ تمام لوگ چونکہ ارباب علم و فضل ہیں اس لئے ان کی روایت کی بہت اہمیت ہے اور انکی سند صحت کے اعتبار سے عالی سند ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابو حیان سے منقول نسخہ کے کاتب کے پاس ایک اور نسخہ بھی تھا جو غالباً اس کے استاذ کا تھا۔ اس کے شروع میں یہ عبارت درج تھی :

"كتب إلى القاضي ابوالحسن شريح بن محمد بن شريح الرعيني من حمص الاندلس
قال أنبأنا ابومحمد علي بن احمد بن سعيد بن حزم الظاهري الحافظ، قال وقرأت
على ابي محمد بن عبد الله بن محمد بن مرزوق اليحصبي الاندلسي بمصر عن ابي بكر
عبد الباقي بن محمد بن بريال الحجاري"

یہ نسخہ اور اس کی اصل دونوں ناپید ہو چکے ہیں۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ اور اس کی اصل جو مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے دونوں بہت بعد کے ہیں بعض مخصوص حالات کی وجہ سے مدینہ منورہ کا نسخہ حاصل کرنا ممکن نہ ہوا تو مجبوراً ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے اس نسخہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ قابل اطمینان بات یہ ہے کہ اس نسخہ کے کاتب شیخ ابو عبداللہ سورتی ایک محقق اور دقیق النظر عالم ہیں اور انہوں نے جو کچھ نقل کیا ہے اس کے ضبط میں بڑی کاوش کی ہے۔ سہیلی کے حاشیہ پر مطبوعہ سیرت ابن ہشام سے مقابلہ اور خود مصنف سیرت ابن حزم کی دوسری کتاب جمہرۃ انساب العرب سے جگہ جگہ استفادہ بھی کیا ہے۔ متن کی جس عبارت میں ترمیم کی ہے اسے حاشیہ پر اور تصحیحات سیاق عبارت میں درج کی ہیں۔ کہیں کہیں متن کی عبارت کو اسی صورت میں رہنے دیا ہے اور تصحیح اس کے سامنے حاشیہ پر "صح" کی علامت سے درج کی ہے۔ اس طرح سورتی صاحب نے نقل میں غایت درجہ دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مطبوعہ سیرت ابن اسحٰق پر زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ سے بعض جگہ ان سے غلطی ہوئی ہے لیکن ترمیم شدہ عبارت کی بازیافت یا اس کی تصحیح کا کام آسان ہے اس لئے کہ جو ترمیم و اصلاح بھی انہوں نے کی ہے اس میں دیانت داری کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ شیخ ابو عبداللہ سورتی نے حاشیہ پر کچھ تعلیقات بھی لکھی ہیں ان میں جو مناسب نظر آئیں انھیں ہم نے شامل کر لیا ہے اور صراحت کر دی ہے کہ یہ مخطوطہ کے حاشیہ سے منقول ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ کے نسخہ میں جس سے ابو عبداللہ سورتی نے نقل کیا ہے بہت سے مقامات پر اضطراب اور کہیں کہیں نقص تھا، چنانچہ جہاں تک ان سے ہو سکا درست کیا اور جہاں اضافہ ضروری تھا اضافہ کیا۔ بعض ایسی غلطیاں بھی درست کی ہیں جو ابن حزم جیسے دقیق النظر عالم سے نہیں ہو سکتیں۔ اس کے باوجود کچھ مقامات ایسے رہ گئے تھے جہاں اصلاح و تصحیح کی ضرورت تھی چنانچہ ہم نے یہ خدمت انجام دی۔ متن میں اگر کوئی اضافہ کیا تو اسے بریکٹ کے درمیان درج کیا ہے۔ بعض غلطیاں جو طباعت کے بعد سامنے آئیں انھیں آخر میں اشاریہ اعلام کے حاشیہ میں درست کر دیا ہے۔

ضبط انساب کے اہتمام میں ایک دلچسپ اور اہم حقیقت کا سراغ لگاتی ہیں ۔ سے باخبر رہنا ہر اس شخص کے لیے انتہائی ضروری ہے جو انساب کی تحقیق اور اسما کو صحت کے ساتھ ضبط کرنا چاہتا ہو ۔ انساب کے مطالعہ میں چار روایتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو در اصل تاریخ انساب کے چار دھاروں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ اول واقدی کی روایت ، دوم ابن عمارہ انصاری کی روایت (خاص طور پر انصار کے نسب میں) سوم ابن اسحٰق کی روایت چہارم ابن الکلبی کی روایت ۔ ان روایتوں کے درمیان اختلاف کی بہت سی صورتیں ابن سعد نے محفوظ کر دی ہیں ۔

مزید برآں یہ بھی یاد رہے کہ ان چاروں روایتوں کے ساتھ ساتھ بعض اسما کی قرأت میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں ۔ ایک کو آپ ادبا کا مسلک اور دوسرے کو محدثین کا مسلک کہہ سکتے ہیں ، اگرچہ فریقین کے اختلاف سے متاثر ہونے والے اسما کی تعداد زیادہ نہیں ہے ۔

حواشی و حوالہ جات

لے ڈاکٹر ناصر الدین اسد اور ڈاکٹر احسان عباس نے مضمون کے شروع میں ابن حزم کے حالاتِ زندگی کے لیے درج ذیل ماخذ کا حوالہ دیا ہے :

۱۔ حمیدی : جذوۃ المقتبس ، شمارہ : ۷۰۸ (الدار المصریہ ۱۹۶۶ء)
۲۔ فتح بن خاقان : مطمح الانفس ص : ۵۵ (مطبعۃ الجوائب ۱۳۰۲ھ)
۳۔ الذخیرۃ ۱ : ۱۴۰
۴۔ المغرب ، شمارہ : ۲۵۳
۵۔ تذکرۃ الحفاظ ۳ : ۲۴۱
۶۔ لسان المیزان ۴ : ۱۹۸ - ۲۰۲
۷۔ سعید افغانی کی کتاب " ابن حزم الاندلسی و رسالتہ فی المفاضلۃ بین الصحابۃ " کا مقدمہ ۔
۸۔ ابن حزم پر Palacios Asin کی کتاب ۔

ابن حزم کے حالات کے لئے مزید ماخذ ملاحظہ ہوں :

۹۔ الضبی : بغیۃ الملتمس ، میڈرڈ ۱۸۸۵ء شمارہ : ۱۲۰۴ و ۱۲۰۴
۱۰۔ قفطی : اخبار الحکما ، طبع الخانجی ، مصر ص : ۱۵۶ ۔
۱۱۔ صاعد اندلسی : طبقات الامم ۔ بیروت ۱۹۱۲ء ص : ۷۵ - ۷۷ ۔
۱۲۔ مقری : نفح الطیب ، المطبعۃ الازہریہ ، مصر ۱۳۰۲ھ ۱ : ۳۵۸ - ۳۶۲
۱۳۔ یافعی : مرآۃ الجنان ، حیدر آباد ، ۳ : ۷۹ - ۸۱ ۔

۱۴۔ابن الخطیب : الاحاطہ فی اخبار غرناطہ مطبوعہ ۱۳۱۹ھ ۳ : ۱۴۴

۱۵۔ابن العماد : شذرات الذہب قاہرہ ۱۳۵۰ھ ۲ : ۲۹۹

۱۶۔ابن بشکوال : الصلۃ ، الدار المصریہ ۱۹۶۶ء ص : ۴۱۵ ، شمارہ : ۸۹۴

۱۷۔ابن خلکان : وفیات الاعیان، محی الدین عبدالحمید، ۱۹۴۸ء مصر ۳ : ۱۳-۱۷ ، شمارہ : ۴۲۱ -

۱۸۔یاقوت : معجم الادباء ، دارالمامون ۱۲ : ۲۳۵ - ۲۵۷ ، شمارہ : ۶۳

جدید مآخذ میں دیکھئے :

۱۹۔بروکلمان ۱ : ۳۹۹ تکملہ ۱ : ۶۹۲

۲۰۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پاکستان ۱ : ۴۸۵ - ۴۹۴

۲۱۔ابن حزم تالیف الوزہرہ، ۱۳۷۳ھ قاہرہ، اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء

قلمی مآخذ اور مستشرقین کی تحقیقات کے لئے الاعلام، معجم المؤلفین، المستشرقون از نجیب العقیقی اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی جانب رجوع کیجئے (مترجم)

[1] تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد ۱۳۷۶ھ تیسرا ایڈیشن ۳ : ۱۱۴۶ — ۱۱۵۵

[2] حمیدی ، ص : ۱۲۶ ، شمارہ ۲۱۵

[3] ایضاً ، ص : ۱۰۷ ، شمارہ ۱۸۱

[4] ایضاً ، ص : ۳۶۷ ، شمارہ ۸۷۴

[5] ایضاً ، ص : ۲۵۴ ، شمارہ ۵۳۷

[6] ایضاً ، ص : ۱۱۴ ، شمارہ ۱۸۷

[7] ایضاً ، ص : ۳۵۰ ، شمارہ ۸۱۴

[8] ایضاً ، ص : ۲۶۱ ، شمارہ ۵۵۱

[9] ابن بشکوال ، ص : ۳۵۳ ، شمارہ : ۷۵۸ -

[10] حمیدی ، ص : ۱۹۹ ، شمارہ : ۳۹۵

[11] ایضاً ص : ۳۷۷ ، شمارہ : ۸۹۸

[12] معجم الادباء ۱۲ : ۲۳۹

[13] تذکرۃ الحفاظ ص : ۱۱۵۰

[14] ایضاً

[15] رسالہ مداواۃ النفوس و تہذیب الاخلاق ، طبع محمد ادہم کتبی ، مصر ص : ۱۳ -

۱۷۔ الفصل فی الملل ۲ : ۹۰
۱۸۔ ایضاً، نیز جوامع السیرۃ : ۴۱
۱۹۔ مثال کے طور پر دیکھئے الفصل ۲ : ۸۶
۲۰۔ جوامع السیرۃ : ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۹
۲۱۔ فہرست ابن خیر ص : ۲۳۰
۲۲۔ فہرست ابن خیر ص : ۲۳۰ - ۲۲۷ -
۲۳۔ سیرت ابن عبدالبر کا نفیس ایڈیشن ڈاکٹر شوقی ضیف کی تحقیق سے المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ فاضل محقق نے اپنے مقدمہ میں الدرر سے ابن حزم کے اخذ و استفادہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ الدرر کی مدد سے جوامع السیرۃ کی متعدد غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ کا اُردو ترجمہ اسی جلد میں۔ (مترجم)
۲۴۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر ۱ : ۱۱۰
۲۵۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے اسے بعید از قیاس قرار دیا ہے (مترجم)
۲۶۔ امتاع الاسماع ص : ۵۰ جوامع السیرۃ ص : ۹۷ (مضمون نگار) یہ تحقیق حافظ ابن عبدالبر کی ہے جسے ابن حزم نے بغیر حوالہ کے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو۔ الدرر ص : ۱۰۱ (مترجم)
۲۷۔ امتاع الاسماع ص : ۲۱۵، جوامع السیرۃ ص : ۲۰۶ (مضمون نگار) یہ رائے بھی حافظ ابن عبدالبر سے ماخوذ ہے، ملاحظہ ہو الدرر ص : ۴۹ (مترجم)
۲۸۔ امتاع الاسماع ص : ۲۷۶، جوامع السیرۃ ص : ۲۰۷ -
۲۹۔ دیکھئے مثلاً جذوۃ المقتبس ص : ۲۹۳ -
۳۰۔ دیکھئے جوامع السیرۃ ص : ۱۹۲، ابن کثیر نے ابن حزم کے نقطہ نظر پر تبصرہ کیا ہے ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ۴ : ۱۸۱
۳۱۔ ابن سعید : المغرب، تحقیق شوقی ضیف، دارالمعارف، ۱ : ۳۵۵
۳۲۔ ابن بسام وغیرہ نے ابن حیان کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں مشرق اور اندلس کے تمام قدیم و جدید بنوامیہ کے حکام کی حمایت، ان کی صحت امامت کا اعتقاد، دوسرے اہل قریش سے بیزاری کا ذکر ہے۔ ابن حیان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن حزم پر ناصبیت کا الزام بھی تھا۔ اصل عبارت ابن بسام قسم اول ۱ : ۱۴۲ سے نقل کی جاتی ہے :
" وکان مما یزید فی شنآنہ تشیعہ لامراء بنی امیۃ ماضیھم و باقیھم بالمشرق والاندلس واعتقادہ لصحۃ امامتھم، وانحرافہ عمن سواھم من قریش حتی نسب إلی النصب لغیرھم "
ناصبیت کے الزام کی تحقیق کے لیے ابن حزم کا رسالہ "المفاضلہ بین الصحابہ" کا مطالعہ کرنا چاہیے ابوزہرہ نے بھی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے (مترجم)

۳۳ ملاحظہ ہو ابن حزم کا رسالۃ الخلفاء ضمیمہ جوامع السیرۃ ص: ۳۵۹-۳۶۰

۳۴ المحلی ۱ : ۲۳۶

۳۵ رسالۃ الخلفاء ص : ۳۵۷

۳۶ ایضاً ص: ۳۶۰

۳۷ ملاحظہ ہو نقط العروس، متفرق صفحات

۳۸ تذکرۃ الحفاظ؛ ابن حزم کا ترجمہ

۳۹ الاعلان بالتوبیخ ص : ۸۹

۴۰ الترتیبات الاداریۃ شیخ عبدالحی کتانی کی تصنیف ہے۔ مطبعۃ اہلیۃ رباط سے ۱۳۴۶ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ملاحظہ ہو مقدمہ ص: ۲۴

۴۱ سیرت ابن حزم کا ایک قلمی نسخہ برلین (شمارہ ۹۵۱۰ ب م ۴ ۵۹) میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو بروکلمان ضمیمہ اول ص: ۶۹۰

۴۲ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو : بلوی کا سفرنامہ تاج المفرق مخطوطہ دارالکتب المصریہ (شمارہ ۱۰۵۳ جغرافیا) ورق: ۵۲، صفدی: اعیان العصر نسخہ دارالکتب (شمارہ ۱۰۹۱، تاریخ) ج : ۷ قسم اول : ورق : ۶۷، نکت الھمیان ص : ۲۸۰، نفح الطیب ۱ : ۸۲۵ میں اعیان العصر سے نقل کیا ہے، ابن حجر : الدرر الکامنۃ شمارہ : ۸۳۲ نیز دیکھئے بغیۃ الوعاۃ ص : ۱۲۱، درۃ الحجال شمارہ : ۵۶، شذرات الذھب ۶ : ۱۴۵

۴۳ الدرر الکامنۃ ۴ : ۳۰۴

۴۴ ابن ہارون طائی کے حالات کے لئے دیکھئے : اعیان العصر ج: ۳، قسم : ۲ ورق : ۲۳۶، الدرر الکامنۃ شمارہ : ۴ ۲۲۲، درۃ الحجال شمارہ : ۹۲۵ شذرات الذھب ۶ : ۷

۴۵ الدرر الکامنۃ ۴ : ۳۰۶

۴۶ حالات کے لئے دیکھئے: بغیۃ الوعاۃ ص : ۲۳۴، النباھی : تاریخ قضاۃ الاندلس ص : ۱۲۷ الاحاطہ ۱ : ۲۹۲، مسالک الابصار ۱۱ : ۱۴۷، ابن الزبیر نے صلۃ الصلہ میں بھی ابن ناظر کے حالات لکھے ہیں۔

۴۷ حالات کے لئے دیکھئے : ابن الابار : التکملۃ، شمارہ : ۲۹۲، تاریخ قضاۃ الاندلس ص : ۱۱۷ شذرات الذھب ۶ : ۱۱۶، ابن الزبیر : صلۃ الصلۃ۔

۴۸ ابن بشکوال : الصلۃ، شمارہ : ۵۳۶۔ ۴۹ مقدمہ التکملۃ ۔

۵۰ حالات کے لئے دیکھئے : صلۃ ابن بشکوال، شمارہ : ۸۲۷، بغیۃ الملتمس شمارہ : ۱۱۲۵، معجم السلفی ورق : ۱۳۸، معجم البلدان : وادی الحجارۃ، تاج العروس (برل) صاحب قاموس نے ان کے دادا کا نام برآل (الف کے ساتھ) لکھا ہے۔ زبیدی نے اس پر تعاقب کیا کہ صحیح یا کے ساتھ ہے جیسا کہ حافظ وغیرہ نے ضبط کیا ہے۔

الدُّرر فی اختصار المغازی والسِّیَر

تحریر: ڈاکٹر شوقی ضیف / ترجمہ: محمد اجمل اصلاحی

تقدیم

[سیرت نبوی پر ابنِ عبدالبر کی کتاب "الدُّرَر فی اختصار المغازی والسِّیَر" کا یہ تعارف ڈاکٹر شوقی ضیف کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب مصر کے مشہور ادیب، مقتدر نقّاد اور مصنّف ہیں۔ موصوف نے کلیۃ الآداب قاہرہ یونیورسٹی سے "الادب ومذاہبہ فی الشعر العربی" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۹ء تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے تھے۔ ڈاکٹر شوقی ضیف ادب، تاریخ ادب اور تنقید پر کم و بیش دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

۱- تاریخ الادب العربی

۲- الفن ومذاھبہ فی النثر العربی

۳- التطور والتجدید فی الشعر الاموی

۴- دراسات فی الشعر العربی المعاصر

۵- الادب العربی المُعاصر فی مصر

۶- شوقی شاعر العصر الحدیث

۷- فی النقد الادبی

۸- البلاغۃ: تطوّر وتاریخ

۹- البحث الادبی

۱۰- مع العقّاد

ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بعض مخطوطات بھی ایڈٹ کر کے شائع کئے مثلاً "المُغرب فی حلی المَغرب" اور "الدُّرَر فی اختصار المغازی والسِّیَر"۔ موخر الذکر کتاب المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ کی جانب سے ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ڈاکٹر صاحب نے ۱۰ صفحات پر مشتمل ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کے مصنف حافظ ابن عبدا۔

کے مختصر حالات کے ساتھ "الدُّرَر" کی اہمیت درجہ استناد، خصوصیات نیز اس کے مخطوطہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سیرت ابن عبدالبر کے تعارف کے لئے اِس سے بہتر مضمون ممکن نہ تھا اِس لئے اِسی کا ترجمہ کیا گیا۔ موقع کی مناسبت سے بعض سطریں حذف کر دی گئی ہیں۔ آخر میں تمام حواشی اور حوالہ جات ایک کے سوا مترجم کے قلم سے ہیں۔] (محمد اجمل اصلاحی)

مصنف

سیرت نبویؐ کے موضوع پر اس کتاب کے مصنف امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم النمری ہیں[1]۔ ابن عبدالبر ۲۴ ربیع الاول ۳۶۸ھ بروز جمعہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی گھرانے میں پرورش ہوئی۔ ان کے والد کا شمار قرطبہ کے فقہا و محدثین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم دلائی۔ ان کا انتقال ہوا تو ابن عبدالبر کی عمر ۱۳ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد نہایت جانفشانی اور استقلال کے ساتھ تحصیل علم میں لگے رہے اور اپنے دور میں فقہ و حدیث، تاریخ و مغازی اور اخبار و انساب کے ممتاز اور جلیل القدر علما سے استفادہ کیا مثلاً ابو عمر ابن المکوی[2]، ابن الفرضی[3]، عبدالوارث بن سفیان[4]، خلف بن قاسم[5]، ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن[6]، سعید بن نصر[7]، محمد بن ابراہیم بن سعید[8]، احمد بن قاسم بن عبدالرحمن تاہرتی[9]، احمد بن محمد بن احمد ابن الجسور[10]، ابو عمر الباجی[11] وغیرہ

پانچویں صدی ہجری کے شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ابن عبدالبر کا شمار قرطبہ کے نامور علما میں ہونے لگتا ہے۔ پھر جلد ہی وہاں کے حالات خراب ہوتے ہیں۔ فتنوں کی آگ بھڑکتی ہے۔ اموی حکومت کا قصر زمین بوس ہوتا ہے اور اس کے ملبہ پر اندلس کے مشہور ملوک طوائف کی ریاستیں قائم ہوتی ہیں۔ ہر بڑا شہر ایک خود مختار حاکم کے زیر نگیں ہوتا ہے۔ قرطبہ کے مسلسل خلفشار کی وجہ سے وہاں کے بہت سے علما نے ہجرت کی اور نو وارد ان بساطِ سیاست کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس لئے کہ ہر امیر اپنے شہر اور ریاست میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں علماء، ادبا اور شعرا کو جمع کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان شدید منافست و مسابقت جاری تھی۔ قرطبہ کو خیرباد کہنے والوں میں حافظ ابن عبدالبر بھی تھے۔ وہاں سے نکل کر ابن عبدالبر نے مغربی اندلس کے شہر بطلیوس کا رُخ کیا جہاں بنوالافطس کی حکمرانی تھی۔ بنوالافطس ابن عبدالبر کے ساتھ انتہائی اعزاز و اکرام سے پیش آئے اور انھیں اپنی ریاست کے دو شہروں اشبونہ اور شنترین کا قاضی مقرر کیا۔ پھر ابن عبدالبر مشرقی اندلس چلے گئے اور بلنسیہ اور دانیہ میں قیام کیا۔ مؤخر الذکر سے دلچسپی کی وجہ غالباً وہاں کے حکمران مجاہد کی شخصیت تھی۔ مجاہد کو علوم قرآن و حدیث میں دخل تھا۔ "علما سے محبت کرتا اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا۔ علما کی قدر دانی میں اس کا شہرہ دور تک پھیل گیا تھا۔ اور ہر طرف سے لوگ اس کے شہر دانیہ کا قصد کرتے تھے۔" ابن عبدالبر کے ایک صاحبزادے بڑے ماہر انشا پرداز اور ادیب تھے[12]۔ مجاہد نے انھیں اپنے "دواوین" میں ملازمت دی اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے علی (۴۳۶ - ۴۶۸ھ) نے انھیں دواوین اور کاتبین کا صدر مقرر کیا۔ پھر ایک حادثہ پیش آیا۔ ابن عبدالبر کے صاحبزادے علی بن مجاہد کا ایک پیغام لے کر اشبیلیہ کے امیر معتضد (۴۳۶ - ۴۶۱ھ) کے پاس گئے معتضد

نے ان کا جبر مقدم کرنے کے بجائے انھیں جیل بھیج دیا۔ آخر کار ابن عبدالبر خود معتضد کے پاس اس کی شان میں قصیدہ لکھ کر لے گئے اور رحم کی درخواست کی، چنانچہ معتضد نے جلد ہی انھیں رہا کر دیا اور وہ دانیہ واپس آگئے اور ۴۵۰ھ میں انتقال کیا۔ غالباً بیٹے کے انتقال ہی کی وجہ سے ابن عبدالبر نے دانیہ سے شاطبہ کا رخ کیا اور وہیں ۹۵ سال کی عمر میں ۴۶۳ھ میں جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس عمر دراز کے سبب انھیں اپنے بیٹے اور بہت سے شاگردوں کی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا، مثلاً ابن حزم تقریباً بیس سال ان سے چھوٹے تھے اور تقریباً سات سال قبل وفات پائی۔

ابتداً میں ابن عبدالبر کا رحجان ظاہری مسلک کی جانب تھا جو فقہ و تشریع میں قیاس کو ناپسند کرتا اور ظاہر قرآن و سنت پر احکام کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اپنے بیشتر اساتذہ اور ہم وطنوں کی طرح انہوں نے بھی مالکی مسلک اختیار کر لیا۔ ابن عبدالبر کے مزاج میں اعتدال اور توازن تھا۔ اسی وجہ سے بعض مسائل میں امام شافعیؒ کی جانب میلان رکھتے تھے۔ ان کا دامن تعصب اور جانبداری سے پاک تھا۔ تحقیق کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا اسے بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیتے۔

ابن عبدالبر کے تذکرہ نگار حدیث نبویؐ پر ان کی وسعت نظر اور کثرت روایت پر متفق ہیں، چنانچہ ان کے شاگرد حمیدی فرماتے ہیں :

"فقیہ، حافظ، کثیر الروایۃ، قرأت، فقہی اختلافات، علوم حدیث اور علم رجال کے ماہر تھے، قدیم اساتذہ سے سماعت کی تھی۔ شیوخ کی تعداد بہت تھی۔"

قاضی ابوالولید باجی کے نزدیک "اندلس میں علم حدیث میں ابو عمر ابن عبدالبر کا کوئی ثانی نہ تھا۔" ابن بشکوال کی رائے ہے:

"اپنے دور کے امام اور یکتائے روزگار تھے۔ حصول علم میں بڑی جانفشانی کی اور مختلف النوع علوم حاصل کئے اور ایسی مہارت پیدا کی کہ اپنے پیشرو اندلسی علماء پر فوقیت پائی۔"

ابن سعید نے حجاری کا قول نقل کیا ہے کہ "ابن عبدالبر علم شریعت اور روایت حدیث میں بلا استثناء اندلس کے امام اور حافظ تھے۔ سب پر گوئے سبقت لے گئے۔ ان کی تصنیفات خود انکی عظمت کی گواہ ہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

بے شمار علماء نے ان سے حدیث کی سماعت اور ان کی کتابوں کی ترویج و اشاعت کی جنھیں خود مصنف کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

فقہ و حدیث پر ابن عبدالبر کی ایک کتاب "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" ہے۔ اس کے بارے میں ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ "فقہ حدیث کے موضوع پر اس جیسی کتاب میرے علم میں نہیں چہ جائیکہ اس سے بہتر ہو" دارالکتب المصریہ میں اس کتاب کا ایک ٹکڑا محفوظ ہے۔ ابن عبدالبر نے اس کا اختصار "التقصی لما فی الموطا من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے کیا تھا۔ حدیث و فقہ پر ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار مما رسمہ لامام مالک فی الموطا من الرائی والآثار" ہے جس میں انہوں نے موطا کی شرح لکھی اور اس کے ابواب کو اپنے انداز میں مرتب کیا پھر بعد میں خود ہی اس کا اختصار "الکافی فی الفقہ علی مذہب اہل المدینۃ" کے نام سے تیار کیا۔ فقہی تصانیف میں "اختلاف اصحاب مالک بن انس واختلاف روایاتہم عنہ" لکھی ہے۔

قرات اور علوم قرآن پر "البیان عن تلاوۃ القرآن"، "التجوید والمدخل الی العلم بالتجوید" اور "الاکتفا فی قراۃ نافع

وابی عمرو بن العلا' بتوجیہ ما اختلفا فیہ" قابلِ ذکر ہیں۔

ایک مشہور کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ وماینبغی فی روایتہ وحملہ" ہے۔ احمد بن عمر محمصانی بیروتی نے اس کی تلخیص ایک جلد میں کی ہے جو شائع ہوگئی ہے[۱۹]

سیرتِ نبوی پر ابن عبدالبر نے "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" لکھی جس کا تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے سوانح پر "الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ صحابہ کے حالات میں ان کی ضخیم تصنیف "الاستیعاب" ہے جو مطبوعہ ہے؛ روایات اور تاریخ میں جن صحابہ کا بھی ذکر آیا ہے سب کا استقصار کیا۔ ان کے مختصر حالات لکھے اور انھیں حروفِ معجم کے مطابق مرتب کیا۔

ابن عبدالبر کی دو کتابیں جو ایک ہی ساتھ شائع ہوئیں "القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم" اور "الانباہ علی قبائل الرواۃ" ہیں۔

ابن عبدالبر شعر و ادب کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے؛ وقتاً فوقتاً طبع آزمائی بھی کرتے۔ امیر بطلیوس مظفر بن الافطس کے لئے منتخب اشعار اور دلچسپ سبق آموز حکایتوں کا ایک مجموعہ "بہجۃ المجالس وانس المجالس"[۲۰] کے نام سے مرتب کیا تھا۔ دارالکتب المصریہ میں اس کتاب کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

ابن عبدالبر کی تصنیفات کا تذکرہ ابن بشکوال نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"تصنیف و تالیف میں خوش اوقات اور صاحبِ توفیق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصنیفات سے دنیا کو فائدہ بخشا۔ حدیث و فقہ میں گہری بصیرت کے ساتھ علم الانساب اور تاریخ میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔"

الدرر کے مآخذ

ابن عبدالبر نے الدرر کے خطبہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے بعد کے واقعات و حالات پر لکھی ہے اور موسیٰ بن عقبہ کی مغازی اور محمد بن اسحٰق کی سیرت النبیؐ کو ماخذ بنایا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں موسیٰ بن عقبہ کا انتقال ۱۴۱ھ میں ہوا جبکہ موخر الذکر کی وفات ۱۵۰ھ یا بعض روایات کے مطابق ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

ان دونوں حضرات کی کتابوں کو عرصۂ دراز تک سیرت النبیؐ کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ سیرت پر قلم اٹھانے والے سارے ہی مصنفین ان سے استفادہ کرتے تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ بہت سی قدیم کتابوں کی طرح یہ دونوں کتابیں بھی ناپید ہو گئیں۔ اب سیرت ابن اسحٰق کا صرف ایک ٹکڑا کتب خانۂ رباط میں محفوظ ہے۔ جہاں تک ابن ہشام کی روایت کا تعلق ہے تو وہ مکمل نہیں ہے بلکہ اصل کتاب کی تلخیص و تہذیب ہے اور وہ بھی ابن اسحٰق سے براہِ راست روایت نہیں ہے بلکہ ان کے شاگرد زیاد بن عبداللہ بکائی سے منقول ہے۔ سیرت ابن ہشام متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی مختصر سیرت الدرر ابن اسحٰق کی کتاب سے مرتب کی ہے جو ابن ہشام اور دوسرے

راویوں کی روایت سے ان تک پہنچی ہے۔ وہ حجۃ الوداع پر گفتگو کرتے ہوئے واضح طور پر لکھتے ہیں۔[۱۸]

"ہماری اس کتاب میں ابن اسحٰق سے جو روایتیں منقول ہیں۔ ان میں ہماری ایک سند یہ ہے:
"عن عبد الوارث بن سفیان، عن قاسم بن أصبغ، عن محمد بن عبد السلام الخشنی، عن محمد بن البرقی[۱۹]، عن ابن ھشام، عن زیاد البکائی، عن محمد بن اسحٰق۔"

دوسرا ماخذ یونس بن بکیر کی روایت ہے جو میں نے عبداللہ بن محمد بن یوسف کو پڑھ کر سنائی ہے سند یہ ہے "عبد اللہ بن محمد بن یوسف عن ابن مفرج، عن ابن الاعرابی، عن العطاردی، عن یونس بن بکیر، عن ابن اسحٰق۔"

تیسرا ماخذ ابراہیم بن سعد کا نسخہ ہے۔ یہ بھی میں نے عبدالوارث بن سفیان کو پڑھ کر سنایا ہے بسند یہ ہے
"عبد الوارث بن سفیان، عن قاسم بن أصبغ، عن عبید بن عبد الواحد البزار، عن (احمد بن) محمد بن ایوب، عن ابراھیم بن سعد، عن ابن اسحٰق۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر نے سیرت ابن اسحٰق کے سلسلہ میں صرف ابن ہشام کی روایت پر قناعت نہیں کی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یونس بن بکیر (فاس میں قرویین کے کتب خانہ میں روایت یونس بن بکیر کا ایک نسخہ محفوظ ہے) اور ابراہیم بن سعد کی روایتوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس طور پر ابن عبدالبر کے سامنے ابن اسحٰق کی کتاب کے تین نسخے تھے۔

اسی مقام پر ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب سے جو روایتیں لی ہیں ان کا ماخذ وہ نسخہ ہے جو انہوں نے عبدالوارث بن سفیان اور احمد بن محمد بن احمد بن الجسور کو پڑھ کر سنایا۔ مکمل سند یہ ہے: عن قاسم بن أصبغ عن مطرف بن عبد الرحمٰن، بن قیس عن یعقوب، عن ابن فلیح، عن موسیٰ بن عقبۃ۔" اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:[۲۰]

"اس سلسلہ میں میری کچھ اور سندیں اور روایتیں ہیں جن کا ذکر میں نے کتاب الصحابۃ کے شروع میں کیا ہے۔"

کتاب الصحابۃ سے مراد "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" ہے۔ الاستیعاب میں ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ کی روایتوں کی دو سندیں ذکر کی ہیں، ایک تو مذکورہ بالا سند۔ دوسری "عن خلف بن قاسم، عن ابی الحسن، عن ابی العباس بن محمد بن عبد الغفار المعروف با بن الون المصری، عن جعفر بن سلیمان النوفلی، عن ابراھیم بن المنذر الحزامی، عن محمد بن فلیح، عن موسیٰ بن عقبۃ۔"

اسی جگہ ابن عبدالبر بعض دوسرے ماخذ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فہرست" میں واقدی وغیرہ کی کتاب کی اپنی روایت ذکر کی ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں نظر انداز کر دیا ہے۔"

"فہرست" اس رجسٹر یا کتابچہ کو کہتے ہیں جس میں علماء اپنے شیوخ سے کتابوں کی روایت اور اس کی مختلف سندیں تفصیل

سے درج کرتے ہیں۔ ابن عبدالبر نے بھی اس طرح کی ایک "فہرست" مرتب کی تھی اس کی جانب اشارہ ہے الاستیعاب کے آغاز میں واقدی کی دونوں کتابوں طبقات اور مغازی کی سندیں نقل کی ہیں۔ طبقات کی سند یہ ہے :

" قرأته علی احمد بن قاسم التاهرتی، عن محمد بن معاویة القرشی، عن ابراهیم بن موسیٰ بن جمیل، عن محمد بن سعد کاتب الواقدی، عن الواقدی "

مغازی کی سند ملاحظہ ہو :-

" أخبرنی به خلف، عن قاسم، عن ابی الحسن، عن ابی العباس بن المون، عن جعفر بن سلیمان النوفلی، عن ابراهیم بن المنذر الحزامی، عن الواقدی "

ابن عبدالبر کتاب الدرر میں اپنے مآخذ کا ذکر مکمل کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں :

" ابوبکر بن ابی خیثمہ کی کتاب میں — یہ کتاب میں نے عبدالوارث، عن ابی القاسم سے روایت کی ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ حدیثیں ہیں "

الاستیعاب کے شروع میں ابن عبدالبر نے تصریح کی ہے کہ "میں نے ابن ابی خیثمہ کی مکمل کتاب ابوالقاسم عبدالوارث بن سفیان بن جبرون کو پڑھ کر سنائی عبدالوارث نے ابومحمد قاسم بن اصبغ بن یوسف بیانی سے اور موخرالذکر نے ابن ابی خیثمہ ابوبکر احمد بن زہیر بن حرب سے روایت کی۔"

الاستیعاب میں متعدد احادیث ابن ابی خیثمہ سے مذکورہ سند سے نقل کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ راویوں کے جرح و تعدیل کے موضوع پر تاریخ کبیر کے علاوہ سنن پر بھی ابن ابی خیثمہ کی کوئی تصنیف تھی ۔

ابن عبدالبر نے انھیں مآخذ کا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ مآخذ ہیں جن کے ذکر کا اہتمام انہوں نے نہیں کیا۔ مثلاً الدرر کی بیشتر احادیث وہ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن سے روایت کرتے ہیں۔ موصوف کے بارے میں حمیدی کا بیان ہے کہ "انہوں نے عراق وغیرہ کا سفر کیا۔ اسمٰعیل بن محمد الصفار، ابوبکر محمد بن بکر بن عبدالرزاق (جو ابن داسہ صاحب ابی داود سلیمان بن الاشعث السجستانی سے مشہور ہیں) ابوبکر احمد بن جعفر بن مالک قطیعی صاحب عبداللہ بن احمد بن حنبل، احمد بن سلیمان النجاد، محمد بن عثمان بن ثابت صیدلانی صاحب اسمٰعیل القاضی وغیرہ سے سماعت کی اور اندلس میں حدیث کا درس دیا۔ حافظ ابوعمر ابن عبدالبر نے ان سے نقل کرکے ہم سے حدیث بیان کی "

حمیدی ابن عبدالبر کے شاگرد ہیں۔ ان کی شہادت کے مطابق ابن عبدالبر کی روایت عبدالمومن سے متصل ہے۔ اور ان احادیث و اخبار کا سلسلہ جو ابن عبدالبر ان سے نقل کرتے ہیں براہ راست ابن داسہ عن ابی داود السجستانی سے مل جاتا ہے۔

ابن عبدالمؤمن کے علاوہ کچھ احادیث و اخبار ابن عبدالبر نے سعید بن نصر سے نقل کئے ہیں۔ ان کے بارے میں حمیدی رقمطراز ہیں :

"سعید نے قاسم بن اصبغ بیانی اور محمد بن معاویہ قرشی سے سماعت کی اور ان سے فقیہ حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر نے روایت کی۔"

سیرت ابن عبدالبر میں ان کی سند ان کے شیخ قاسم سے متصل ہے۔

کچھ روایتوں میں محمد بن ابراہیم کا حوالہ ملتا ہے۔ ان کے بارے میں حمیدی لکھتے ہیں:[۱۴]

"ابن ابی القرامید کے نام سے معروف ہیں۔ محمد بن معاویہ قرشی سے روایت کی ۔۔۔ ان سے روایت ابوعمر ابن عبدالبر نمری نے کی اور فرمایا: اپنی کتابوں کے ضبط اور روایتوں کے فہم میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ان کی ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے یحییٰ بن معین کے اقوال ۴۰ اجزا میں جمع کئے ہیں۔ اس کتاب کی روایت ان سے ابن عبدالبر کے ذریعہ ہم کو ملی ہے۔"

سیرت میں محمد بن ابراہیم کی سند محمد بن معاویہ قریشی سے متصل ہے۔

"سریہ بئر معونہ" میں ابن عبدالبر نے ایک حدیث احمد بن عبداللہ بن محمد بن علی یعنی ابوعمر باجی سے نقل کی ہے۔ باجی کے بارے میں حمیدی کے الفاظ یہ ہیں:

"ان سے اکابر کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ان میں فقیہ حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر سے ہماری ملاقات ہے۔"

حمیدی نے باجی کے شیوخ میں حسن بن اسمٰعیل کا ذکر کیا ہے۔[۱۵] ابن عبدالبر نے جو حدیث باجی سے نقل کی ہے اس کی سند حسن سے متصل ہے۔

بعض واقعات میں سعید بن یحییٰ اموی کا نام بھی آیا ہے۔[۱۶] بظاہر اموی کی کتاب "السیر" بھی ابن عبدالبر کا ایک ماخذ تھی۔

کہیں کہیں ابن عبدالبر حدیث کی سند مختصر کر دیتے ہیں اور اس کے راویوں کا مکمل سلسلہ درج نہیں کرتے۔ اس طرح کی عبارتوں پر اکتفا کرتے ہیں: روی عن عبادۃ بن الصامت، قال ابن شہاب الزہری، قال معمر، ذکر ابن جریج، روی سفیان الثوری، قال ابوداؤد الطیالسی، قال ربیع، قال سعید۔

استناد اور قدر و قیمت

حمیدی نے ابن عبدالبر کے حالات میں ان کی تصنیفات میں کتاب "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" کا ذکر کیا۔ ان کے بعد ایک سے زیادہ تذکرہ نگار اس کتاب کا شمار ابن عبدالبر کی تصنیفات میں کرتے رہے ہیں۔ خود کتاب کے اندرون میں اس کی قطعی شہادت موجود ہے کہ یہ ابن عبدالبر کی تالیف ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں لکھا ہے۔ ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ ابن اسحٰق اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں کے سلسلہ میں اپنی کچھ سندیں نقل کی ہیں اور مکمل سندوں کے لیے اپنی دوسری کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کا حوالہ دیا ہے جس میں زیادہ تفصیل سے سندیں بیان کی ہیں۔

کتاب الاستیعاب کا تنہا یہی ایک حوالہ نہیں ہے بلکہ جا بجا اس کتاب کے حوالے ہمیں ملتے ہیں۔ چنانچہ خلیفۃ الکتاب میں اس کا حوالہ ہے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ جو حضرات قبول اسلام میں حضرت علی کی اولیت کے قائل ہیں ان کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں[۱۷]: "اس قول کے تابعین اور آثار کا ذکر کتاب الصحابہ کے متعلقہ باب میں کیا ہے[۱۸]۔"

جو مہاجرین غزوہ بدر میں شریک ہوئے ان کی فہرست میں حضرت خباب بن الارت رضؓ کا نام درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہ قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ تمیمی ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں[۱۹]: "ان کے نسب، ولاء اور حلف کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کا ذکر کتاب الصحابہ میں ان کے نام کے باب میں کیا ہے[۲۰]۔"

غزوہ احد میں جو مہاجرین شہید ہوئے ان میں حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ بھی تھے۔ ان کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت حمزہ کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے پھر لکھتے ہیں[۲۱]: "ہم نے ان کا واقعہ کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے[۲۲]۔"

واقعہ رجیع اور اس میں حضرت خبیب بن عدی رضؓ کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲۳]:

"ہم نے ان کا واقعہ اور مکہ میں جن حالات سے وہ دوچار ہوئے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں بیان کیا ہے[۲۴]۔"

حضرت خبیب رضؓ کو جب مشرکین پھانسی دینے کے لئے لے جا رہے تھے تو انہوں نے کچھ شعر کہے تھے۔ ان میں سے دو شعر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان کے علاوہ متعدد شعر ہیں جو ہم نے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں نقل کئے ہیں۔" الاستیعاب میں ان اشعار کی تعداد دس ہے۔

فتح مکہ کے بیان میں لکھتے ہیں[۲۵]: "عمرو بن سالم نے آنحضرت کو کچھ شعر سنائے جو میں نے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں نقل کئے ہیں[۲۶]۔"

وفود کے باب میں حضرت حتات بن یزید مجاشعی کے تذکرہ میں جن کی مواخات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کے ساتھ کرائی تھی ابن عبدالبر لکھتے ہیں[۲۷]: "ان کا واقعہ کتاب الصحابہ میں ان کے حالات میں بیان کیا ہے[۲۸]۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲۹]: "آپ کے غلام شقران حاضر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ان کی درخواست کا ذکر ہم نے کتاب الصحابہ کے شروع میں کیا ہے[۳۰]۔"

الدرر میں ابن عبدالبر نے اپنی کتابوں میں صرف الاستیعاب ہی کا حوالہ نہیں دیا ہے، بلکہ کتاب "التمہید لما فی الموطأ من المعانی والاسانید" کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ کتاب کے شروع میں وحی کی صورتوں اور کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں[۳۱]: "اس موضوع پر سیر حاصل بحث ہم نے کتاب التمہید میں حضرت عائشہ رضؓ کی مذکورہ حدیث کی شرح میں کی ہے۔"

کتاب کے آخر میں آپ کے مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضؓ کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۳۲]: "مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضؓ کے ساتھ آپ کی امامت کا مفہوم، آپ دونوں میں جو آگے تھا اس کی جگہ اور اس بارے میں ہماری اپنی رائے کتاب التمہید میں ملے گی۔"

اس سیرت میں ابن عبد البر نے جن حضرات سے احادیث و روایات نقل کی ہیں اور ابن عقبہ، ابن اسحٰق اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں کی سندوں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے ان کے بارے میں تحقیق گذر چکی ہے کہ وہ تمام کے تمام ابن عبد البر کے شاگرد حمیدی کے بیان کے مطابق ان کے شیوخ ہیں جن سے انہوں نے روایت کی ہے۔

اس پوری بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عبد البر کی جانب اس سیرت کی نسبت مستند اور کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے

ابن عبد البر نے الدرر کے مقدمہ میں لکھا ہے[۴۳]:

"اس کتاب میں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، عہد رسالت کے ابتدائی حالات، غزوات اور ان میں آپ کے طریق عمل کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ اس لئے کہ آپ کی ولادت، پرورش اور اہم واقعات کا ذکر صحابہ کے حالات پر اپنی کتاب کے شروع میں کر چکا ہوں۔ یہ کتاب صرف بعثت اور اس کے بعد کے بقیہ حالات کے لئے لکھی ہے ..... اس کی ترتیب مکمل طور پر ابن اسحٰق کی طرز پر ہے۔ آپ کے غزوات اور جہاد کے ذکر میں جو بات میرے پیش نظر رہی ہے وہ یہ کہ اختصار سے کام لیا جائے۔ واقعہ آسانی سے ذہن نشین ہو جائے اور حشو و زوائد اور مختلف بحثوں کو گڈمڈ کرنے کے بجائے صرف اہم اور نمایاں باتوں کے بیان پر اکتفا کیا جائے۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ابن عبد البر کا مقصد سیرت نبویہ پر ایک مختصر تصنیف پیش کرنا ہے۔ اس مقصد کی وضاحت صرف کتاب کے مقدمہ ہی میں نہیں کی ہے بلکہ اس کے لئے جو نام تجویز کیا ہے اس سے بھی بخوبی ظاہر ہے، گویا ابن عبد البر نے جب دیکھا کہ سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں غیر ضروری اور غیر متعلق مباحث پائے جاتے ہیں تو انھیں خیال ہوا کہ وہ صرف آبدار موتیوں کو چن لیں اور ان سے ایک خوب صورت اور بیش بہا ہار تیار کریں۔ اس مختصر کتاب کا آغاز ابن عبد البر نے بعثت اور اس کے بعد کے غزوات اور واقعات سے کیا ہے۔ جہاں تک بعثت سے قبل کے حالات کا تعلق ہے مثلاً آپ کی ولادت باسعادت، سلسلۂ نسب، والدین اور جدامجد کی وفات، حضرت ابوطالب کی کفالت، آپ کا نشوونما، بعثت سے پہلے کے مراحل اور حضرت خدیجہؓ سے شادی وغیرہ تو ان کا ذکر اس سے پہلے اپنی دوسری کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کے شروع میں کر چکے تھے اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ابن عبد البر کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کی بنیاد ابن اسحٰق کے نہج پر رکھی ہے۔ مغازی کے بیان، تسلسل اور غزوات میں جو مسلمان شریک اور شہید ہوئے، اسی طرح جو مشرکین قتل یا قید کئے گئے ان کے ناموں کی فہرست میں ابن اسحٰق سے مطابقت بالکل واضح ہے لیکن کتاب کے عمومی ڈھانچہ میں اس اتفاق کے باوجود بہت سے مواقع پر جہاں انھوں نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں یا اپنے اساتذہ کی روایات سے اضافے کئے ہیں وہاں اُن کی حیثیت مستقل ہو جاتی ہے اور جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابن عبد البر کا شمار حدیث نبوی کے ان کبار حفاظ میں ہوتا تھا جو دقت نظر، تحقیق اور احتیاط میں مشہور تھے نیز علم الانساب صحابہ کے حالات اور ان کے اسماء کو صحت کے ساتھ ضبط کرنے میں مہارت رکھتے تھے تو اس سیرت کی قدر و قیمت اور واضح ہو جاتی

ہے۔ ابن عبدالبر خود بیان کرتے ہیں، کہ انہوں نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب اور سیرت ابن اسحٰق کے سلسلہ میں صرف ایک روایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کتابوں کی مختلف روایات کو سامنے رکھا اور موازنہ کیا اور ان کے ساتھ واقدی اور ابن ابی خیثمہ کی تحریر دن اور اپنے شیوخ کی روایات کا بھی اضافہ کیا اور ان سب کی روشنی میں سیرت نبویؐ پر ایک مستند کتاب مرتب کی۔

سیرت کی بعض تفصیلیں ابن عبدالبر نے بغیر سند کے شروع کی ہیں۔ اس صورت میں بظاہر طویل غور و فکر، تلاش و تفحص اور تحقیق و موازنہ کے بعد جو نتائج سامنے آتے ہیں انہیں پیش کرتے ہیں۔

سیرت کے ضمن میں ابن عبدالبر کے بعض منفرد خیالات بھی ہمیں ملتے ہیں۔ یہ خیالات چونکہ نقد و حدیث کے ایک بلند پایہ اور جلیل القدر عالم کے ہیں اس لئے عام اور مشہور رائے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان کا بڑا وزن ہے۔ مثلاً اللہ اور اس کے رسول پر اول اول ایمان لانے والوں میں ابن عبدالبر نے حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کمسن تھیں (وھی صغیرۃ[۴۴]) اس سے اس مشہور قول کی تردید ہوتی ہے جس کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں حضرت عائشہ رضؓ سے جب زفاف ہوا تو ان کی عمر نو سال تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر کے نزدیک یہ بات ثابت شدہ ہے کہ وہ اول بعثت میں یعنی ہجرت مدینہ سے تقریباً تیرہ سال قبل اسلام لائیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ بعثت کے وقت ان کی عمر کم از کم چار سال رہی ہو تا کہ قبول اسلام میں ان کی اولیت تسلیم کی جا سکے۔

اسی طرح ابن عبدالبر کے نزدیک رمضان کے روزے ہجرت کے پہلے سال میں فرض ہوئے جبکہ مشہور خیال یہ ہے کہ ہجرت کے اٹھارہویں مہینے فرض ہوئے[۴۵] خیبر کے مال غنیمت کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خیبر مکمل جنگ کے بعد فتح ہوا ہے[۴۶]۔ ابن سید الناس نے اس رائے پر تفصیل سے بحث کی ہے[۴۷]

اسی طرح بعض احادیث پر جو ثابت نہیں ہیں یا ابن عبدالبر کے نزدیک مشکوک ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے مثلاً جنوں کے اسلام لانے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو روایات منقول ہیں اور بعض میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے نبیذ سے آں حضرت کے وضو کرنے کا ذکر ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۴۸]:

"ابن مسعود سے یہ روایت مختلف سندوں سے جو سب کی سب قوی ہیں تواتر کے ساتھ وارد ہوئی ہے، بجز ابوزید کی روایت کے جس میں نبیذ سے وضو کا ذکر ہے۔ کیونکہ ابوزید مجہول شخص ہے اور ابن مسعود کے اصحاب میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ جنوں کے ذکر میں سورہ الرحمٰن اور سورہ جن (قل اوحی إلیّ انه استمع نفر من الجن) اور سورہ احقاف کی آیات (واذ صرفنا إلیک نفرا من الجن یستمعون القرآن) الخ کافی ہیں۔"

گویا اس سلسلہ میں ابن عبدالبر قرآنی نص پر بغیر کسی زیادتی کے اعتماد کرنا چاہتے ہیں۔

ابن عبدالبر کی دقت نظر اور تحقیق کا اندازہ غزوہ بنی المصطلق یا غزوہ مریسیع کے بارے میں اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے[۴۹]:

"اسی غزوہ میں اہل افک نے حضرت عائشہ رضؓ پر بہتان لگایا پس اللہ تعالیٰ نے انھیں بری قرار دیا اور ان کی برأت کے لیے قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔ یہ روایت کہ سعد بن معاذ نے اس بارے میں سعد

بن عبادہ سے تکرار کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تکرار سعد بن عبادہ نے اسید بن حضیر سے کی تھی۔ ایسا ہی ابن اسحٰق نے زہری عن عبید اللہ بن عبد اللہ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ یہی صحیح ہے اس لئے کہ سعد بن معاذ کا انتقال بنو قریظہ سے آنحضرت کی واپسی میں ہی ہو چکا تھا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں اور غزوہ مریسیع کے وقت وہ زندہ تھے اور نہ شریک ہوئے تھے۔"

گذشتہ سطور سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ یہ کتاب (جس کا تعارف ہم پیش کر رہے ہیں وہ) سیرت کے موضوع پر ایک محققانہ کتاب ہے جو صرف سیرت کی مشہور کتابوں ہی سے استفادہ نہیں کرتی بلکہ حدیث کی کتابیں اور ثقات کی روایت بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ مزید برآں اخبار و احادیث کے درمیان موازنہ، صحیح نتیجہ تک رسائی، اشخاص کے ناموں میں پوری باریک بینی توقف کی جگہ توقف اور موزوں رائے کا انتخاب، حدیث اور رجال حدیث کا وسیع علم ضعیف اور قوی کا امتیاز یہ ساری خصوصیات اس سیرت میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

اس سیرت کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اسی دور میں یہ عالم تھا کہ ابن عبدالبر کے شاگرد ابن حزم نے جب سیرت پر اپنی کتاب "جوامع السیرۃ" لکھنے کا ارادہ کیا تو "الدرر" کو مشعل راہ بنایا۔ جوامع السیرۃ کا نفیس تحقیقی ایڈیشن دارالمعارف سے شائع ہو چکا ہے[۱۵]۔ ابن حزم نے اس کتاب کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب، پیدائش، عمر، وفات، علامات نبوت، حج، عمرے، غزوات و سرایا، حلیہ، اسماء، امراء، کاتبین، محافظین، موذنین، خطباء، شعراء، سفراء، بعض بادشاہوں کو اسلام کی دعوت، ازواج و اولاد اور آپ کے اخلاق و عادات پر اختصار سے روشنی ڈالی ہے۔ اس حصہ میں ابن عبدالبر سے ان کی موافقت نہیں ہوتی اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے الاستیعاب کے آغاز میں اس بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس پر اکتفا کرتے ہوئے الدرر میں ان مسائل سے تعرض نہیں کیا ہے۔ لیکن اس حصہ کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو بیشتر صفحات میں ابن عبدالبر سے ان کی مطابقت صاف نظر آتی ہے۔ اس امر کی جانب خود سیرت ابن حزم کے ناشرین نے بھی ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے[۱۶]

"ابن حزم نے اپنی سیرت میں اپنے شیخ اور معاصر ابو عمر ابن عبدالبر مصنف "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مکمل صورت میں ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا کہ ابن حزم نے کس حد تک اس پر اعتماد کیا ہے، لیکن اس کے تھوڑے سے بہت اقتباسات جو ابن سید الناس نے محفوظ کر دیے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اپنے شیخ کی کتاب سے متعدد عبارتیں معمولی تصرف سے نقل کی ہیں۔ الا یہ کہ یہ فرض کیا جائے کہ دونوں مصنفین یعنی ابن عبدالبر اور ابن حزم نے کسی تیسرے ماخذ سے استفادہ کیا ہے جو ہماری دسترس میں نہیں ہے"

سیرت ابن حزم کے ناشرین کی نظر سے ابن عبدالبر کی کتاب کا نسخہ اگر گذرا ہوتا تو انھیں یقین ہو جاتا کہ ابن حزم نے بعثت کی بحث (ص ۴۴) سے آخر تک ابن عبدالبر کی کتاب کے اکثر صفحات جا بجا معمولی تصرف سے نقل کئے ہیں۔ یہ خیال کہ ممکن ہے دونوں کا کوئی تیسرا مشترک ماخذ رہا ہو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب کے آخذ

متعین طور پر بیان کئے ہیں۔ جبکہ ابن حزم نے ان مباحث میں جہاں وہ ابن عبدالبر کے ساتھ ہوتے ہیں کسی ماخذ کا پتہ نہیں دیا
ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزوات کی ترتیب، ان کے درمیان پیش آنے والے واقعات، ان میں شریک ہونے والے مسلمان اور مشرکین
اور جو مسلمان شہید ہوئے اور جو مشرکین ہلاک ہوئے یا قید کئے گئے ان کے ناموں کی تفصیل میں ابن حزم ابن اسحٰق کے نقش قدم پر
چلتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی وہ ابن عبدالبر کے پیرو ہیں۔ ابن عبدالبر کے خطبۃ الکتاب کا اقتباس اوپر گزر چکا ہے
ابن حزم نے اپنے شیخ کی پیروی صرف کتاب کی ترتیب، واقعات اور اشخاص کے ناموں ہی میں نہیں کی ہے بلکہ اکثر ان کی
عبارتیں بھی معمولی تصرف سے نقل کر دی ہیں اور کہیں کہیں تو بغیر کسی تصرف کے ہو بہو درج کر دی ہیں۔ اسی طرح ابن عبدالبر
کے بہت سے خیالات اور تحقیقات کی بھی خوشہ چینی کی ہے جس کی نگاہ سے ابن عبدالبر کی کتاب نہ گزری ہو وہ انھیں ابن حزم
کے فکر و اجتہاد کا نتیجہ خیال کرے گا۔ مثلاً ابن عبدالبر کے نزدیک حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مہاجرین حبشہ میں شمار کرنا صحیح نہیں
ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:[53]

"بعض روایتوں میں مذکور ہے اور بعض اہل سیر کا خیال ہے کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے
لیکن یہ صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ یمن سے مدینہ کے ارادہ سے نکلے تھے۔ یہ لوگ کشتی پر سوار
تھے۔ ہوا کا رخ ایسا ہوا کہ کشتی حبشہ کی طرف چلی گئی۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری وہاں مقیم رہے یہاں تک کہ حضرت جعفر بن
ابی طالب کے ساتھ آئے۔"

اس کا موازنہ "جوامع السیرۃ" (ص ۵۸) سے کیجئے۔

اسی طرح ابن عبدالبر کے نزدیک زکوٰۃ ہجرت اور مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کے بعد فرض ہوئی[54] موازنہ
کے لئے دیکھئے "جوامع السیرۃ" (ص ۹۷)

بدر میں شریک ہونے والے مہاجرین کی تعداد ابن عبدالبر نے چھیاسی لکھی ہے[55]۔ جبکہ ابن اسحٰق نے تراسی بیان کی ہے[56]
موازنہ کے لئے دیکھئے "جوامع السیرۃ" (ص ۱۲۲)

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ واقعۂ افک کے سلسلہ میں ابن عبدالبر سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کے درمیان جھڑپ کا انکار
کرتے ہیں کیونکہ اول الذکر کا انتقال واقعہ سے پہلے ہو چکا تھا (ص ۲۰۲) موازنہ کے لئے ملاحظہ ہو "جوامع السیرۃ" (ص ۲۰۶)

افکار و خیالات، اشخاص کی فہرست اور متن کی عبارتوں میں سیرت ابن حزم اور سیرت ابن عبدالبر میں اتنی مطابقت
ہے کہ اول الذکر کے بڑے حصہ کو ہم نے سیرت ابن عبدالبر کے دوسرے نسخہ کی حیثیت سے سامنے رکھا اور ہمارے نسخہ میں جو تصحیف
یا نقص ہے اس کی تصحیح میں اس سے فائدہ اٹھایا اور ہمیں یقین ہے کہ اگر سیرت ابن حزم کے ناشرین کے پاس ابن عبدالبر کی
کتاب کا نسخہ رہا ہوتا تو اپنے نسخہ کے متن کو بہت سے مقامات پر انہوں نے درست کیا ہوتا، بلاشبہ انہوں نے سیرت ابن
حزم کی تصحیح اور عبارتوں کے درمیان جو خلا ہیں ان کو پُر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے لیکن اب بھی کچھ مقامات ایسے رہ
گئے ہیں جن کی جانب ابن عبدالبر کی کتاب سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کہیں کسی لفظ میں تصحیف ہو گئی ہے اور کہیں بعض نام چھوٹ گئے

ہیں۔ تصحیح سے عبارت کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے مثلاً: ص ۶۹ پر ایک عبارت ہے:
"ثم قدم إلى مكة ابو الحيسر انيس بن رافع في مائة من قومه"
صحیح عبارت سیرت ابن عبدالبر (ص ۵۵-۷۰) میں ملاحظہ ہو:
"وقدم مكة ابو الحيسر انس بن رافع في فتية من قومه" نیز دیکھئے سیرت ابن ہشام ص ۶۹-۵۸ ص ۸۸:
"ثم ان ابا جهل والحارث بن هشام اتيا المدينة وكلما عياش بن ابي ربيعة وكان اخاهما لامهما وابن عمهما" سیرت ابن عبدالبر میں یہ عبارت اس طرح ہے: "وكان اخاهما لامهما وابن عمهما (ص ۷۱) سیرت ابن حزم میں "ابن عمتهما" کھلی ہوئی تصحیف ہے۔

اسی صفحہ پر ابن حزم نے حضرت عمرؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کرنے والوں کے نام ابن عبدالبر سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ اس فہرست میں مخطوطہ کے کاتب نے درج ذیل نام چھوڑ دیے ہیں:
"اياس، وعاقل، وعامر، وخالد بنو البكير الليثي حلفاء بني عدي بن كعب"
نام اکثر چھوٹ گئے ہیں ابن عبدالبر کی کتاب سے انہیں مکمل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک اور مثال اگلے صفحہ سے درج کرنا کافی ہوگا۔ عبارت یہ ہے: "ونزل حمزة بن المطلب وحليفة ابو مرثد كناز بن حصين الغنوي وزيد بن حارثة الكلبي مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم على كلثوم بن الهدم" (ص ۸۴)
صحیح عبارت ابن عبدالبر کے یہاں ملاحظہ ہو: "ونزل حمزة بن عبد المطلب وحليفاه: ابو مرثد الغنوي وابنه مرثد بن ابي مرثد وزيد بن حارثة، وأنسة، وابو كبشة موالي رسول الله صلى الله عليه وسلم على كلثوم بن الهدم" (۸۴) (ص ۸۳)
مطبوعہ سیرت ابن حزم یا زیادہ صحیح لفظوں میں سیرت ابن حزم کے اس نسخہ میں جسے شائع کیا گیا ہے اس طرح کے مسلسل

ص ۱۰۶: "سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم [يأمر] بتحويل القبلة"
"یامر" کا لفظ قوسین میں درج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ مخطوطہ میں چھوٹ گیا ہے۔ ابن عبدالبر کی کتاب میں اس کی جگہ "یخطب" ہے (ص ۱۰۹)

ص ۱۱۲: "عرض الرسول على اصحابه في وقعة بدر مصارع رؤس الكفر من قريش مصرعا مصرعا، "ليقول: هذا مصرع فلان ومصرع فلان فما عدا واحد منهم مضجعه" ابن البر کے یہاں مضجعہ کی جگہ پر "مصرعہ" ہے (ص ۱۱۳)

ص ۱۱۹: "وعامر بن فهيرة...... من مولدي الأسد"
سیرت ابن عبدالبر میں "من مولدي الأزد" ہے (ص ۱۲۳)

ص ۱۳۳: "ومن بني مرضخة وهو عمرو ابني غنم بن أمية"
صحیح عبارت "الدرر" میں ہے: "ومن بني مرضخة وهو عمرو بن غنم بن أمية" (ص ۱۲۱)
ص ۱۵۶: "اشار رسول الله صلى الله عليه وسلم أن لا يخرجوا إليهم وأن يتحصنوا بالمدينة فان

" تـدموا منها فاتلـهم على افواه الازقة "

صحیح عبارت سیرت ابن عبدالبر میں یوں ہے: " أشار رسول الله صلّی الله علیه وسلّم علی أصحابه أن لا یخرجوا إلیهم وأن یتحصنوا بالمدینة، فان نزلوا منها فاتلوهم علی أفواه الازقة " (ص-۱۵۴)

ص ۱۵۸: " وکان فی المشرکین یومئذ خمسون فارسا " (ص: ۱۵۵)

صحیح عبارت ابن عبدالبر میں ہے:

ص ۱۶۱: " وکان قد قتل اصحاب اللواء من المشرکین حتی سقط فرفعته عمرة بنت علقمة "

اب ابن عبدالبر کی عبارت ملاحظہ ہو: [۵۹]

" وقتل صاحب لواء المشرکین فسقط لواءهم فرفعته عمرة بنت علقمة " اس طرح عبارت بھی صحیح ہو جاتی ہے اور سیاق بھی درست ہو جاتا ہے۔

ص ۱۶۵: " وجد الأصیرم وبه رمق یسیر فقال بعضهم لبعض: والله إن هذا الاصیرم فأجابه لقد ترکنا و إنه لمنکر هذا الامر "

ابن عبدالبر میں " فأجابه " کے بجائے " ماجابه " ہے جس سے جملہ درست ہو جاتا ہے (ص ۱۶۱)

ص ۲۰۴: " وذلک لشر وقع لبنی جهجاه بن مسعود الغفاری أجیر عمر بن الخطاب وبین سنان بن وبرا الجهنی "

صحیح عبارت ابن عبدالبر میں یوں ہے: " ذلک لشر وقع بین بنی جهجاه " (ص ۲۰۱)

اس طور پر سیرت ابن عبدالبر کی مدد سے سیرت ابن حزم کے مطبوعہ نسخہ کی تصحیفات و تحریفات اور عبارت میں جو نقص رہ گیا ہے اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

شاید سب سے اہم شخصیت جس نے ابن عبدالبر کی سیرت سے استفادہ کیا وہ ابن سید الناس متوفی ۷۳۴ھ ہیں۔ انہوں نے اپنی طویل سیرت النبی " عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر " میں سیرت ابن عبدالبر کو بھی ایک ماخذ کے طور پر پیش نظر رکھا۔ عیون الاثر قاہرہ سے دو جلدوں میں چھپ گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ ابن عبدالبر کی سیرت سے بہت سے فقرے اور فصلیں، بیشتر ان کے نام کی صراحت کے ساتھ، نقل کرتے ہیں۔ اشخاص کے ناموں، سیرت کے واقعات اور ابن عبدالبر کی رایوں پر بہت سے مقامات پر بحث بھی کی ہے۔ ابن عبدالبر کا ذکر ہمیشہ بڑے عزت و احترام سے کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں جب اپنی سیرت کے مآخذ کی سندیں ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

" اس کتاب میں ابو عمر سے جو مواد لیا گیا ہے وہ کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر سے ماخوذ ہے۔ کتاب الدرر ان کتابوں میں ہے جنھیں میں نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، اور ان کی سند یہ ہے: عن شیخه ابی الحسین محمد بن احمد بن السراج عن خاله ابی بکر بن

خیر عن ابی الحجاج الشنتمری عن ابی علی الغسانی عن ابن عبد البر *

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سید الناس نے ابن عبد البر کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ ایک ایسے نسخہ سے ماخوذ ہیں جس کی نسبت متیقن اور سند مؤلف تک متصل ہے۔ نیز مصنف سے لے کر ابن سید الناس تک ثقہ شیوخ اس نسخہ کی روایت ایک دوسرے سے کرتے رہے ہیں۔ اس سے اس نسخہ کی قدر و قیمت اور درجۂ استناد بہت بلند ہو جاتا ہے۔

ہمارا قیاس ہے کہ جس نسخہ کو ہم شائع کر رہے ہیں وہ اسی نسخہ کی نقل ہے جو ابن سید الناس کے والد محمد بن محمد بن عبداللہ الاشبیلی مقیم قاہرہ کے ساتھ اندلس سے مصر منتقل ہوا، ممکن ہے ان کے صاحبزادے نے اپنے لیے اس کی کوئی نقل تیار کی ہو اور وہ رائج ہو گئی ہو یا خود والد ہی کا نسخہ ان کے مصری تلامذہ کے ذریعہ رائج ہوا ہو۔ اس قیاس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہمارے نسخہ کی عبارتیں۔ حتیٰ کہ جہاں بظاہر غلطی یا تصحیف بھی ہے۔ ابن سید الناس کے اقتباسات سے ملتی جلتی ہیں۔ مثال کے طور پر شعب ابی طالب میں بنی ہاشم اور بنی المطلب کے دخول اور قریش کے مقاطعہ کے سلسلہ میں ہمارے نسخہ ۶۰ اور عیون الاثر (۱/۱۲۷) میں ایک عبارت ہے:

"لیسلموا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برمتہ إلی قریش"

"الرمۃ" رسی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد عہد ہے، ممکن ہے اس لفظ میں تصحیف ہوا اور یہ صحیح لفظ "یزمتہ" ہو، اسی صفحہ پر ہمارے نسخہ اور ابن سید الناس دونوں کی عبارت ہے:

"فما لکم أن ترجعوا عما احدثتم علینا وعلی أنفسکم"

ہمارے نسخہ کے حاشیہ میں "أحدثتم" کی تصحیح "أخذتم" سے کی گئی ہے جو سیاق کے اعتبار سے زیادہ برمحل ہے معلوم ہوتا ہے یہاں بھی لفظ میں تصحیف ہو گئی ہے۔

ابن سید الناس کی سیرت میں ابن عبد البر کے اقتباسات غیر معمولی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ اقتباسات کتاب کے آغاز اور بعثت نبوی کے ذکر ہی سے ملنے لگتے ہیں۔ بعثت کے سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ابن عبد البر نے پیش کی ہیں ان میں اور کتاب کی دوسری متفرق روایات میں دونوں کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں پر جو لوگ بے محابا مظالم ڈھا رہے تھے ان کے سلسلہ میں ابن عبد البر نے جو حدیث نقل کی ہے اسے ان کے حوالہ کے ساتھ ابن سید الناس نے درج کیا ہے (۱/۱۰۲) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استہزا کرنے والوں پر جو پیراگراف ابن عبد البر نے لکھا ہے اسے نقل کیا ہے (۱/۱۱۳) ابن عبد البر آگے ہجرت حبشہ پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ ابن سید الناس عنوان میں ان کی پیروی کرتے ہیں (۱/۱۱۵) اور باب کے آغاز میں جو حدیث ابن عبد البر نے درج کی ہے وہ اور بہت سا مواد بھی نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ابن عبد البر نے ایک باب "باب فی ذکر دخول بنی هاشم بن عبد مناف وبنی عبد المطلب بن عبد مناف فی الشعب وما لقوا من سائر قریش فی ذلک" قائم کیا ہے ابن سید الناس نے یہ پورا باب نقل کیا ہے (۱/۱۲۷) چند صفحات کے بعد جنوں کے قبول اسلام اور اس بارے میں حضرت

عبداللہ بن مسعود سے مروی احادیث پر ایک فصل ہے جس کا مکمل مواد سیرت ابنِ سید الناس میں منتقل ہو گیا ہے (۱/۱۳۶)
ابن عبدالبر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قبائل عرب کو اسلام کی دعوت اور عقبہ اولی ثانیہ و ثالثہ پر گفتگو
کی ہے ابن سید الناس نے ابن عبدالبر کے ساتھ سیرت کی دوسری کتابوں کا مواد بھی شامل کیا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کی ہجرت مدینہ
پر جو پیراگراف ابن عبدالبر نے لکھا ہے اسے نقل کرتے ہیں (۱/۱۷۴) اسی طرح ہجرت سے قبل خود مہاجرین کے درمیان آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مواخات کرائی اس کا تذکرہ اور اس کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخات ہوئی اس کے
کچھ پہلو ابن عبدالبر سے نقل کئے ہیں (۱/۱۹۹) ابن عبدالبر جب مغازی کا بیان شروع کرتے ہیں تو ایک ایک غزوہ میں
ابن سید الناس ان کے قدم بہ قدم چلتے ہیں اور واقعات یا اسمائے اعلام میں اکثر ابن عبدالبر اور دوسرے سیرت نگاروں
کے درمیان موازنہ کرتے ہیں۔ ابن عبدالبر کی طرح وہ بھی سریہ عبداللہ بن جحش کے بعد ٹھہر کر تحویل قبلہ پر گفتگو کرتے ہیں
(۱/۲۳۰) اور ہجرت سے قبل مکہ میں نماز کعبہ کی جانب رخ کرکے پڑھی جاتی تھی یا بیت المقدس کی جانب اس بارے میں
جو اختلاف ہے اس سے متعلق روایات ابنِ عبدالبر کی کتاب التمہید اور کتاب الاستذکار سے نقل کرتے ہیں۔ غزوہ بدر
میں جو مسلمان شہید ہوئے اور جو کفار قریش مارے گئے یا قید کئے گئے ان سے متعلق تفصیلیں بھی ابن عبدالبر کے حوالہ سے
نقل کی ہیں (۱/۲۸۶) غزوہ بدر کے بعد ابن عبدالبر نے جو فصل لکھی ہے (ص ۱۳۹) اس کی تلخیص بھی کی ہے (۱/۲۹۲)
بعض اوقات ابن سید الناس ابن عبدالبر سے نقل تو نہیں کرتے لیکن دوسرے اصحاب سیر اور ان کے درمیان موازنہ ضرور کرتے
ہیں اور اس موازنہ اور استدراک میں ابن عبدالبر کی کتاب "الاستیعاب" ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ خیبر کی قہراً فتح اور
غنائم کی تقسیم پر جو پیراگراف ابن عبدالبر نے لکھا ہے[1] اسے نقل کرنے کے بعد ابن سید الناس نے ابن عبدالبر کی رائے
پر طویل بحث کی ہے (۲/۱۳۷)

اس کثرت سے ابن عبدالبر کے اقتباسات نقل کرنے کی وجہ سے سیرت ابن سید الناس کتاب الدرر فی اختصار
المغازی والسیر کا تقریباً ایک نسخہ بن جاتی ہے۔ ہم نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس کی مدد سے متن کی تصحیح کی ہے۔
خلا کو پُر کیا ہے اور کاتب نے بعض جگہوں پر تصحیف و تحریف کے جو گل کھلائے تھے انھیں درست کیا ہے۔

سیرت ابن عبدالبر کا مخطوطہ

ہمارے سامنے اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہے جو دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے (رقم ۵۲۳ تاریخ) یہ نسخہ مکمل ہے
اگرچہ بظاہر اس کا پہلا ورق جس پر کتاب کا نام درج تھا بہت پہلے ضائع ہو چکا تھا اور اس کی جگہ پر دوسرا ورق لگایا گیا
جس پر کتاب کا نام اس طرح درج ہے:

"کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر للحافظ ابی عمر بن عبد البر
النمری، رحمہ اللہ تعالی۔ آمین"

نام کے بائیں جانب تاج العروس فی شرح جواہر القاموس کے مصنف محمد مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) متوفی ۱۲۰۵ھ کے قلم سے یہ عبارت ہے:

"انتداه، وعلى وقفينه ألفاه، العبد لله، محمّد مرتضى الحسيني، عفى عنه حامد الله ومصليا ومسلما على نبيه ومستغفرا"

اسی صفحہ پر یہ تحریر بھی ہے:

"محصتر من جامع محرم افندی الشهير بالكردى، وأضيف فى ٥ اكتوبر سنة ١٨٨١ء"

مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ مذکورہ تاریخ میں جامع الکردی سے دار الکتب المصریہ منتقل کیا گیا، جامع کردی اس سے پہلے مدرسہ محمودیہ کے نام سے معروف تھی، جسے استاذ محمود نے باب زویلہ کے قریب شارع قصبۂ رضوان پر قائم کیا تھا۔

کتاب کے چھٹے ورق پر کاتب نے مصنف کی کنیت "ابو عمر" غلطی سے واو کے ساتھ "ابو عمرو" لکھ دی ہے۔ حاشیہ پر اس کی تصحیح یوں کی گئی ہے:

"هذه الكراريس من كتاب السيرة النبوية للحافظ أبى عمر بن عبد البر ولكن ناسخها تجعله أبا عمرو بالواو، وهو غلط، فليصلح"

زبیدی نے جن کی ملکیت میں یہ نسخہ تھا اس استدراک کے پہلو میں لکھا ہے:

"هذا خط الحافظ ابى الخير السخاوى رحمه الله، وكتبه محمّد مرتضى"

ابو الخیر سخاوی سے مراد الضوء اللامع فی القرن التاسع کے مشہور مصنف شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس مخطوطہ کی توثیق کے لئے کافی ہیں۔ سخاوی جیسے مورخ نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور زبیدی جیسے محقق کی ملکیت میں رہا ہے۔

یہ نسخہ عام قلم سے دو مختلف رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ ایک تو خط نسخ ہے جو واضح اور روشن ہے اور اس میں بعض الفاظ کو حرکتوں کے ذریعہ ضبط کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات خط ثلث میں لکھے گئے ہیں۔ دوسرا عام خط ہے، نقطے بہت کم لگے ہیں۔ الفاظ کو ضبط بھی نہیں کیا گیا ہے۔ متن کے مقابلہ میں عنوانات جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ حاشیوں پر تصحیح و استدراک ہے۔ بظاہر اس نسخہ کی کتابت آٹھویں صدی ہجری میں انجام پائی، ہمارا قیاس اُوپر گذر چکا ہے کہ ممکن ہے، یہ اس نسخہ کی نقل ہو جس سے ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر میں استفادہ کیا ہے۔

مخطوطہ میں جا بجا "قلت" کا لفظ اور اس کے بعد ابن عبد البر کے کلام پر تعلیقات و استدراکات ملتے ہیں اور "قلت" کا قائل اپنی تعلیقات میں اکثر سہیلی متوفی ۵۸۱ھ کی کتاب "الروض الانف" سے استفادہ کرتا ہے۔ جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ سہیلی کے بعد کا کوئی عالم ہے۔ ابن عبد البر کی کتاب التمہید اور کتاب الاستذکار کے حوالے بھی ان تعلیقات میں ملتے ہیں۔ کہیں کہیں "قلت" کی جگہ پر "فائدہ" یا "ھھنا لطیفۃ" کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں

تعیین سے پہلے "نلت" جیسا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ تعلیق کے الفاظ میں کوئی ایسا اشارہ بہر حال ملتا ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ اصل کتاب کی عبارت نہیں ہے۔ مثلاً ابن عبدالبر پر تنقید یا آخر میں خاتمۂ استدراک کی کوئی علامت ہوتی ہے جیسے "یرجع الکلام"۔ "عاد الکلام"۔ "واللہ اعلم"۔ "واللہ الموفق"۔ "باللہ التوفیق"۔ "والحمدللہ"۔ "والحمدللہ رب العالمین"۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ تعلیقات اصل نسخہ کے حاشیہ پر رہی ہوں اور ہمارے مخطوطہ کے کاتب نے انھیں متن کے اندر داخل کر دیا ہو، یا خود کاتب مخطوطہ کوئی عالم ہو جس نے ان تعلیقات کا اضافہ کیا ہو۔ بہر حال میں نے ان ساری تعلیقات کو اصل کتاب سے نکال کر حاشیہ میں ستارہ کے نشان سے درج کر دیا ہے تاکہ میرے نمبروار حواشی سے ممتاز رہیں، ان تعلیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا محدث ہے، سیرت اور حدیث کی مختلف کتابوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ سنی نقیہ ہے جسے فقہائے اختلافات اور ان کے طرق استنباط کا علم ہے۔ بلغت، نحو اور بعض مسائل میں سیبویہ وغیرہ کے اختلافات سے بخوبی واقف اور علم معانی و بیان کا ماہر ہے۔ ان تعلیقات و استدراکات کو متن سے محض اس لئے خارج کر دیا گیا ہے کہ سیرت ابن عبدالبر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آئے۔

حواشی

(۱) ابن عبدالبر کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو :

حمیدی : جذوۃ المقتبس، طبع قاہرہ : ۳۴۴

ابن بشکوال : الصلۃ، طبع قاہرہ : ۶۱۶

ضبی : بغیۃ الملتمس : ۴۷۴

فتح بن خاقان : مطمح الانفس : ۶۱

ابن سعید : المغرب، دار المعارف، ۲ : ۴۰۷

ابن خلکان : وفیات الاعیان (تصحیح محی الدین عبدالحمید، مکتبۃ النہضہ ۶ : ۶۹)

ابن فرحون : الدیباج

ابن العماد : شذرات الذہب، پہلا ایڈیشن، قاہرہ : ۳۵۷

ذہبی : تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدر آباد، ۳ : ۳۰۶

یافعی : مرآۃ الجنان، حیدر آباد، ۳ : ۸۹

ذہبی : العبر فی خبر من غبر، کویت، ۳ : ۲۵۵ (شوقی ضیف)

حواشی ازمترجم

(۲) فاضل مضمون نگار نے "ابوعمر المکوی" لکھا ہے جبکہ موصوف ابن المکوی سے معروف ہیں۔ حمیدی کے الفاظ ہیں: "ابوعمر احمد بن عبدالملک بن ہاشم المعروف بابن المکوی الاشبیلی" ملاحظہ ہو جذوۃ المقتبس: ۱۳۲ ۔

(۳) حالات کے لئے دیکھئے: حمیدی: ۲۵۴ ۔

(۴) حالات کے لیئے دیکھئے: حمیدی: ۲۹۵ ۔

(۵) ایضاً: ۲۱۰ ۔

(۶) " : ۲۵۲ ۔

(۷) " : ۲۳۴ ۔

(۸) ابن عبدالبر کے شیخ کا نام "محمد بن ابراہیم بن سلیمان" لکھا ہے جو غلط ہے ۔ ترجمہ میں ہم نے تصحیح کر دی ہے ۔ اصل میں ڈاکٹر شوقی ضیف سے یہاں تسامح ہو گیا ہے ۔ اس کی وضاحت حاشیہ نمبر ۲۴ میں ہم کر چکے ہیں ۔ محمد بن ابراہیم بن سعد کے حالات کے لئے دیکھئے: حمیدی: ۴۱ ۔

(۹) حالات کے لیے دیکھئے: حمیدی: ۱۴۱ ۔

(۱۰) ایضاً: ۱۰۷ ۔

(۱۱) ایضاً: ۱۲۸ ۔

(۱۲) ان کا نام ابومحمد عبداللہ بن یوسف تھا ۔ دیکھئے ابن بشکوال ۱ : ۲۷۹ ۔

(۱۳) ابن خلکان نے ان کا سن وفات ۴۰۸ھ لکھا ہے ۔ (۶ : ۶۹)

(۱۴) عام طور پر تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے مگر حمیدی نے ابوالحسن علی بن احمد عابدی سے ۴۶۰ھ نقل کیا ہے (۳۶۹)

(۱۵) بغیتہ الملتمس میں اس کتاب کا نام "التجوید والمدخل الی علم القرآن بالتجوید" لکھا ہے ۔

(۱۶) یہ اختصار مطبعۃ الموسوعات سے ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوا تھا پھر ۱۹۲۸ء میں مکمل کتاب مصر سے شائع ہوئی ۔

(۱۷) کتاب کا پورا نام "بہجۃ المجالس وانس المجالس بما یجری فی المذاکرات من غرر الابیات ونوادر الحکایات" ہے، دو جلدوں میں ہے (حمیدی: ۳۶۹) ۱۹۱۱ء میں مصر سے "جواہر الحکما" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں ابن مقفع کی الادب الکبیر کے ساتھ بہجۃ المجالس کا ایک حصہ بھی شامل تھا ۔

(۱۸) الدرر: ۲۷۵ - ۲۷۶

(۱۹) ابن ہشام کے شاگرد محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی مراد ہیں ۔

(۲۰) ملاحظہ ہو الاستیعاب ۱ : ۹

(۲۱) حمیدی : ۲۵۲ -

(۲۲) ایضاً : ۲۳۴ -

(۲۳) ایضاً : ۴۱ -

(۲۴) حاشیہ نمبر ۴ میں ہم نے لکھا ہے کہ ابن عبدالبر کے شیخ محمد بن ابراہیم بن سعید کے سلسلہ میں ڈاکٹر شوقی ضیف سے تسامح ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے ان کے جدامجد کا نام "سعید" کے بجائے "سلیمان" لکھا اور یہاں یہ غلطی ہوئی کہ "ابن ابی القرامید" کی جگہ "ابن المدماتہ" لکھ دیا۔ اصل میں جذرة المقتبس کے صفحہ ۴۱ پر محمد بن ابراہیم کے نام سے دو شخصیتوں کے حالات ہیں، ایک تو محمد بن ابراہیم بن سلیمان کا جو "ابن المدماتہ" کے نام سے مشہور تھے، ادیب و شاعر تھے۔ حمیدی نے ان کے تین شعر بھی نقل کئے ہیں۔ ان کے ترجمہ کا نمبر ۱۶ ہے ان کے بعد ہی ابن عبدالبر کے شیخ محمد بن ابراہیم بن سعید ابوعبداللہ کا تذکرہ ہے جو "ابن ابی القرامید" سے معروف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ چوک ہوئی کہ نام مقدم الذکر کا لیا اور بقیہ حالات موخرالذکر کے ترجمہ سے نقل کئے۔

(۲۵) حمیدی : ۱۲۸ و ۱۲۹-

(۲۶) الدرر : ۴۰ -

(۲۷) ایضاً -

(۲۸) الاستیعاب ۱ : ۴۷۰

(۲۹) الدرر : ۱۲۳

(۳۰) الاستیعاب ۱ : ۱۶۴

(۳۱) الدرر : ۱۶۲

(۳۲) الاستیعاب ۱ : ۳۵۲

(۳۳) الدرر : ۱۶۹

(۳۴) الاستیعاب ۱ : ۱۶۷

(۳۵) الدرر : ۲۲۵

(۳۶) الاستیعاب ۲ : ۴۵۹

(۳۷) الدرر : ۲۷۱

(۳۸) الاستیعاب ۱ : ۱۵۳

(۳۹) الدرر : ۲۸۷

(۴۰) الاستیعاب مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۸ھ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے شروع میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین

کے سلسلہ میں شقران کا کوئی ذکر نہیں ہے (۱ : ۱۹ - ۲۰) جلد دوم (مطبوعہ ۱۳۱۹ھ) میں جہاں شقران کے حالات ہیں وہاں بھی صرف آپ کے غسل کے وقت شقران کی موجودگی کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو (ص ۶۱۰) ڈاکٹر شوقی ضیف نے کتاب الدرر میں اس موقع پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔

(۴۱) الدرر : ۳۳

(۴۲) ایضاً : ۲۸۷

(۴۳) ایضاً : ۲۹

(۴۴) ایضاً : ۴۱ - ابن عبدالبر کی اس عبارت پر کتاب کے حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ یہاں حضرت عائشہؓ کا ذکر غلط فہمی پر مبنی ہے (ذکر العائشة وهم منه) اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ الاستیعاب کے شروع میں ابن عبدالبر نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "حضرت عائشہؓ سے مکہ میں حضرت سودہ سے قبل اور ایک قول کے مطابق ان کے بعد شادی کی، علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ زفاف مدینہ میں ہوا . . . . جبکہ وہ نو سال کی تھیں۔ عقد کے وقت ان کی عمر چھ سال اور ایک قول کے مطابق سات سال تھی" (۱ : ۱۹) پھر حضرت عائشہؓ کے حالات میں لکھتے ہیں: "حضرت عائشہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے دو سال قبل مکہ میں شادی کی۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ دوسروں نے تین سال قبل بیان کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال اور ایک روایت کے مطابق سات سال تھی۔ زفاف مدینہ میں ہوا اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ اس بارے میں علماء کے درمیان میرے علم کی حد تک کوئی اختلاف نہیں" (۲ : ۷۶۴) ڈاکٹر صاحب کو ابن عبدالبر کی ان عبارتوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔

(۴۵) الدرر : ۱۰۵ طبری ۲ : ۴۱۷

(۴۶) الدرر : ۲۱۴

(۴۷) ابن سیدالناس ۲ : ۱۳۷

(۴۸) الدرر : ۶۴

(۴۹) الدرر : ۲۰۲

(۵۰) یہ اس صورت میں ہوگا جب ہم یہ مانیں کہ غزوہ مریسیع، غزوہ بنو قریظہ کے بعد ہوا لیکن ابن سعد (ج ۲ ق ۱ ص ۴۵) کے نزدیک غزوہ مریسیع شعبان ۵ھ میں ہوا جبکہ غزوہ خندق اور بنو قریظہ ذیقعدہ میں ہوا۔ اس شکل میں یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے۔

(۵۱) یہ ایڈیشن ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد کی تحقیق اور شیخ احمد محمد شاکر کی نظر ثانی سے شائع ہوا ہے۔

(۵۲) مقدمہ جوامع السیرۃ : ۸

(۵۳) الدرر : ۵۴

(۵۴) الدُرر : ۱۰۱ -

(۵۵) ایضاً : ۱۲۵ -

(۵۶) سیرت ابن ہشام، تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ، طبع دوم ۱۳۷۵ھ ۱ : ۶۸۵

(۵۷) سیرت ابن عبدالبر اور سیرت ابن حزم کے اس موازنہ اور مقابلہ میں مقدم الذکر کے تمام حوالے میری جانب سے ہیں۔ شوقی ضیف نے صرف جوامع السیرۃ کے حوالے درج کیے ہیں۔ (مترجم)

(۵۸) سیرت ابن ہشام (تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ) ۱ : ۴۲۷

(۵۹) اصل مضمون میں "صاحب اللواء من المشرکین" ہے جو طباعت کی غلطی ہے (مترجم)

(۶۰) الدرر : ۵۸ -

(۶۱) ایضاً : ۲۱۴ -

قاضی عیاض

محمد عبد الحکیم شرف قادری

حافظ الحدیث امام علامہ قاضی ابو الفضل عیاض بن عمرو بن یحصبی ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء میں بمقام سبتہ پیدا ہوئے آپ کا خاندان اندلس کا رہنے والا تھا آپ کے جد امجد پہلے فاس میں اور پھر سبتہ میں رہائش پذیر ہوئے[1]

اکتساب علم

بیس سال کی عمر میں حافظ الحدیث قاضی ابو علی غسانی صدفی کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ اندلس تشریف لے گئے اور اجلۂ علماء سے اکتساب فیض کیا اور جواہر علم و حکمت کا ذخیرہ جمع کیا۔ آپ کے اساتذہ میں محمد بن حمدین، ابو علی بن سکرہ، ابو الحسین سراج، ابو محمد ابن عتاب، ہشام بن احمد اور ابو بکر بن العاص وغیرہم مشاہیر شامل ہیں، فقہ میں ابو عبداللہ محمد بن عیسٰی تمیمی اور قاضی ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ المسیل سے استفادہ کیا، علامہ ذہبی نے آپ کے اساتذہ میں ابو محمد بن عتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کے اساتذہ میں ابن رشد اور ابن الحاج کا شمار کیا ہے[2]

محمد فرید وجدی لکھتے ہیں' ابو القاسم بن بشکوال "کتاب الصلہ" میں فرماتے ہیں" قاضی عیاض طلب علم کے لئے اندلس تشریف لائے تو انہوں نے قرطبہ میں علماء کی ایک جماعت سے علم حاصل کیا اور حدیث کا بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ حدیث شریف کی طرف ان کی بڑی توجہ تھی اور حدیث کے جمع و ضبط کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ وہ علم میں حد یقین کو پہنچے ہوئے تھے۔ اعلیٰ درجہ کی ذکاوت و فطانت اور بلند فہم و فراست کے مالک تھے۔

مسائل فقہیہ میں حضرت امام مالک کے مقلد تھے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔ "القاضی عیاض بن موسٰی بن عیاض العلامۃ ابو الفضل الیحصبی السبتی المالکی الحافظ احد الاعلام"[6]

منصب قضا

ایک مدت تک سبتہ اور غرناطہ میں قاضی رہے۔ آپ کے شاگرد ابن بشکوال فرماتے ہیں قرطبہ میں تشریف لائے تو ہم نے ان سے اکتساب فیض کیا، فقیہہ محمد بن حمادہ سبتی فرماتے ہیں حضرت قاضی عیاض اٹھائیس سال کی عمر میں مناظرہ کرنے لگے اور پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں منصب قضا پر فائز ہوئے[8]۔

تلامذہ

حضرت قاضی عیاض قدس سرہ سے ان گنت علماء نے علم و فضل حاصل کیا۔ چند شاگردوں کے نام یہ ہیں، عبداللہ بن احمد العصری ۲۔ ابو جعفر بن القصیر الغرناطی ۳: ابو القاسم خلف بن بشکوال حافظ الحدیث۔ ۴ فقیہہ ابو محمد الاشیری عبداللہ بن محمد المغربی ۵۔ ابو بکر عبداللہ بن طلحہ بن احمد بن عطیۃ المحاربی الغرناطی المالکی[10]

شعر و شاعری

چونکہ حضرت قاضی عیاض، علوم حدیث، نحو، فقہ، کلام عرب اور عرب کے ایام و انساب کی معرفت میں مہارت تامہ رکھتے تھے اس لئے بڑے دلآویز شعر کہتے تھے[11]

نمونہ کلام :

أَقُوْلُ تَدْجَدَّ ارْتِحَالِیْ وَغَرَّدَتْ	میں یہ اشعار اس وقت کہہ رہا ہوں کہ جب کوچ کا عزم صمیم ہو گیا
حُدَاتِیْ وَزُمَّتْ لِلْفِرَاقِ رَکَائِبِیْ	مرے حدی خواں نغمہ سرا ہو چکے ہیں اور فراق کے لئے سواریوں کو نکیل ڈالی جا چکی ہے
وَقَدْ عَمِشَتْ مِنْ کَثْرَۃِ الدَّمْعِ مُقْلَتِیْ	میری آنکھیں کثرت گریہ کے سبب بینائی کھو چکی ہیں۔
وَصَارَتْ ھَوَاءً مِّنْ فُؤَادٍ ذِیْ تَرَائِبِیْ	اور فرط غم سے خانۂ دل اس طرح ویران ہوا کہ ساتھیوں کا خیال بھی میرے دل سے محو ہو گیا ہے
رَعَی اللّٰہُ جِیْرَانًا الْقُرْطُبَۃَ الْعُلٰی	اللہ تعالیٰ قرطبہ عالیہ کے ہمسایوں کی حفاظت فرمائے۔
وَسَقّٰی رُبَاھَا بِالْعِھَادِ السَّوَاکِبِ	اور اس کے ٹیلوں کو مسلسل بارشوں سے سیراب فرمائے۔
غَدَوْتُ بِھِمْ مِنْ بِرِّھِمْ وَاخْتِفَائِھِمْ	ان کی نیکی اور ہمدردی سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ
کَاَنِّیْ فِیْ اَھْلٍ وَّبَیْنَ اَقَارِبٍ[۱]	گویا میں اعزہ اور اقربا میں ہوں

ایک دفعہ قاضی عیاض ایک کھیت کے پاس سے گزرے جس میں گل لالہ کے چند پودے لہلہا رہے تھے انہوں نے برجستہ ایک قطعہ کہا جس میں عجیب تشبیہ بیان فرمائی :

	ترجمہ
اُنْظُرْ اِلَی الزَّرْعِ وَقَامَاتِہٖ	کھیتی اور اس کے پودوں کی قد و قامت کو دیکھو
تَحْکِیْ وَقَدْ مَاسَتْ اَمَامَ ارْتِیَاحٍ	جن کے سرخ پھول زخموں کی مانند ہیں
کَتِیْبَۃٌ خَضْرَاءُ مَھْزُوْمَۃٌ	اور جو ہواؤں کے سامنے خم کھاتے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں
شَقَائِقُ النُّعْمَانِ فِیْھَا جِرَاحٌ[۲]	جیسے سبز پوش لشکر شکست کھا کر اور زخمی ہو کر بھاگ رہا ہے۔

تصانیف فقیہہ محمد بن حمادہ سبتی فرماتے ہیں۔ حضرت قاضی عیاض کے زمانہ میں سبتہ میں اُن سے بڑھ کر کثیر التصانیف کوئی نہ تھا انہوں نے اپنے شہر میں وہ بلندی اور برتری حاصل کی جس تک اُن کے شہر والوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا، مگر اس علم و فضیلت نے اُن میں تواضع اور خشیت الٰہیہ کو زیادہ کر دیا[۳] ابن خلکان فرماتے ہیں۔ قاضی عیاض حدیث اور علوم حدیث، نحو لغت، کلام عرب اور ان کے ایام و انساب میں اپنے وقت کے امام تھے[۴]

تصانیف کے نام ۱۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ۲۔ ترتیب المدارک وتقریب المسالک فی ذکر فقہاء مذہب مالک۔ ۳۔ العقیدہ، ۴۔ شرح حدیث ام زرع (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کا نام بغیۃ الرائد لما تضمنہ حدیث ام زرع بیان کیا ہے) ۵۔ جامع تاریخ اندلس اور مغرب کے بادشاہوں کی تاریخ جس میں سبتہ کی تاریخ اور وہاں کے علما کا تذکرہ بھی ہے۔ ۶: مشارق الانوار فی اقتفاء صحیح الآثار، موطا امام مالک، بخاری شریف اور مسلم شریف کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۷۔ اکمال المعلم فی شرح مسلم، امام ابو عبداللہ محمد بن علی المازری (م ۵۳۶ھ) کی شرح مسلم : المعلم لفوائد کتاب مسلم کا تکملہ ہے۔ ۸۔ التنبیہات المستنبطہ فی شرح مشکلات المدونۃ والمختلطۃ، فوائد حدیث پر مشتمل ہے۔ اس میں امام ابو عبداللہ

عبدالرحمٰن القاسم (۱۹۱ھ) کی تصنیف المدونتہ فی فروع المالکیہ، پر معروضات بھی ہیں۔ یہ کتاب تنبیہات کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فن میں اس جیسی اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ۹۔ الاعلام بحدود قواعد الاسلام ۱۰۔ الغنیہ، اپنے مشائخ کا تذکرہ ۱۱۔ الالصیماع فی ضبط الروایہ و تقیید السماع، ۱۲۔ المعجم فی شرح ابن سکرۃ حضرت شیخ ابو علی الحسین بن محمد السرقسطی الاندلسی الصدفی (م ۵۱۴ھ) اور ان کے مشائخ کا تذکرہ، ۱۳: نظم البرھان علی صحۃ جزم الاذان ۱۴۔ مقاصد الحسان فی مایلزم الانسان، ۱۵۔ غنیتہ الکاتب و بغیتہ الطالب۔ ۱۶۔ العیون الستۃ فی اخبار سبتہ، ۱۷۔ الاجوبۃ المخیرۃ عن الاسئلۃ المحیرۃ، ۱۸۔ اخبار القرطبیین، ۱۹۔ السیف المسلول علی من سبت اصحاب الرسول، ۲۰۔ الصفا۔ تحریر الشفاء، ۲۱۔ مطامع الافہام فی شرح الاحکام، ۲۲۔ غریب الشہاب۔

وفات

حضرت امام علامہ قاضی عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندگی بھر دین اور حدیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے اور ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء میں مراکش میں وفات پا گئے۔ آپ کے فرزند ارجمند ابو عبداللہ محمد بن عیاض قاضی دانیہ کا بیان ہے کہ ان کا وصال نو جمادی الاخری بروز جمعہ نصف شب کے وقت ہوا۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انھیں ایک یہودی نے زہر دیا تھا جس کے اثر سے اُن کی وفات ہوئی۔

شفا شریف

امام علامہ قاضی عیاض قدس سرہ العزیز کی جملہ تصانیف علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں علماً و فضلاً نے انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ امام علامہ محی الدین بن شرف النووی شرح مسلم میں جگہ جگہ ان حوالہ دیتے ہیں، امام بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں اور حافظ الحدیث علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں جا بجا ان سے فوائد و نکات احادیث میں خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ شارحین حدیث جہاں "قال القاضی" کہتے ہیں وہاں "قاضی عیاض" ہی مراد ہوتے ہیں لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ان کی تصنیف الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو حاصل ہوئی محقق محدثین نے اس سے استناد کیا اور ما بعد کے سیرت نگاروں نے اسے ماخذ کی حیثیت دی۔ بلاشبہ یہ کتاب دلوں کا نور اور ایمان کی رونق ہے اور کیوں نہ ہو جب اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و فضائل صحیح اور مستند احادیث سے بیان کئے گئے ہیں۔

بارگاہ رسالت میں شفا شریف کی مقبولیت

کسی کتاب کی مقبولیت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا سند ہو سکتی ہے کہ بارگاہ رسالت میں مقبول ہو جائے۔ شفا شریف کے لئے سب سے بڑا امتیاز یہی ہے، ایک دفعہ آپ کے بھتیجے نے خواب میں دیکھا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان پر ہیبت طاری ہو گئی حضرت قاضی عیاض قدس سرہٗ نے ان کی حالت کو محسوس کر لیا اور فرمایا بھتیجے، میری کتاب شفا کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسے اپنے لئے دلیل راہ بناؤ۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے یہ منصب و کرامت اس کتاب کی بدولت ملی ہے۔

علمائے اعلام نے نظم و نثر میں اس کتاب کی توصیف کی ہے۔ شہرۂ آفاق مورخ علامہ مصطفیٰ بن عبداللہ المشہور بہ حاجی خلیفہ فرماتے ہیں:

وَھُوَ کِتَابٌ عَظِیْمُ النفع کثیر الفائدۃ لم یؤلف مثلہ فی الاسلام شکر اللہ سبحنہ وتعالیٰ سعی مؤلفہ وقابلہ برحمتہ وکرمہ۔

لسان الدین خطیب تلمسانی فرماتے ہیں:

ترجمہ

شِفَاءُ عِیَاضٍ لِلصُّدُوْرِ شِفَاءٌ
شفائے قاضی عیاض دلوں کی شفاء ہے

وَلَیْسَ لِفَضْلٍ قَدْحَوَاہُ خِفَاءٌ
اور جس فضیلت پر مشتمل ہے وہ مخفی نہیں۔

هَدِیَّةُ بِرٍّ لَمْ یَکُنْ لِجَزِیْلِهَا
یہ ایک نیک شخصیت کا ہدیہ ہے

سِوَی الْاَجْرِ وَالذِّکْرِ الْجَمِیْلِ کِفَاءٌ
جس کا بدلہ صرف ثواب اور ذکر جمیل ہے

وَفَیٰ لِنَبِیِّ اللّٰہِ حَقَّ وَفَائِهٖ
انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفا کا حق ادا کر دیا ہے۔

وَاَکْرَمُ اَوْصَافِ الْکِرَامِ وَفَاءٌ
اور کریموں کا بہترین وصف وفا ہی ہے۔

وَجَاءَ بِهٖ بَحْرًا یَفُوْقُ بِفَضْلِهٖ
وہ ایسا سمندر لائے ہیں جو اپنی برتری کے لحاظ سے

عَلَی الْبَحْرِ طَعْمٌ طَیِّبٌ وَصَفَاءٌ
پانی کے سمندر سے فائق، خوش مزہ اور صاف ہے

وَحَقَّ رَسُوْلِ اللّٰہِ بَعْدَ وَفَاتِهٖ
انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُن کے حق کی رعایت کی ہے

رَعَاہُ وَاِغْفَالُ الْحُقُوْقِ جَفَاءٌ
اور آپ کے حقوق سے غفلت جفا ہے۔

هُوَ الذُّخْرُ یُغْنِیْ فِی الْحَیَاۃِ غِنَاؤُهٗ
وہ ایسا ذخیرہ ہے جس کی دولت زندگی میں غنی کر دیتی ہے

وَیَنْزِلُ مِنْهُ لِلْبَنِیْنَ رِفَاءٌ
اور اس کی برکتیں بیٹوں کو (اولاد کو) پہنچتی ہیں

هُوَ الْاَثَرُ الْمَحْمُوْدُ لَیْسَ یَنَالُهٗ
وہ ایسی یادگار ہے جو پرانی نہیں ہوتی۔

دُثُوْرٌ وَلَا یُخْشٰی عَلَیْهِ عَفَاءٌ
اور اس کے فنا ہونے کا خوف بھی نہیں کیا جا سکتا

حَرَصْتُ عَلَی الْاِطْنَابِ فِیْ نَشْرِ فَضْلِهٖ
اگر وفا نے میری ہمنوائی کی تو میں اس کی فضیلت اور بزرگی کو بھرپور طریقہ

وَ تَمْجِیْدِهٖ لَوْسَاعَدَتْنِیْ وَفَاءٌ[۱۲۸]
پر پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں

حضرت ابو الحسین زبدی فرماتے ہیں:

(ترجمہ)

کِتَابُ الشِّفَاءِ شِفَاءُ الْقُلُوْبِ
کتاب الشفاء (بلاشبہ) دلوں کی شفاء ہے

قَدِ ائْتَلَقَتْ شَمْسُ بُرْهَانِهٖ
جس کے برہان کا سورج پوری طرح جگمگا رہا ہے

فَاَکْرِمْ بِهٖ ثُمَّ اَکْرِمْ بِهٖ
تو اس کی عزت و تکریم کرتا رہ

وَاَعْظِمْ مدی الدھر من شانہٖ
اور زندگی بھر اس کی عظمت شان بیان کرتا رہ

اِذَا طَالَعَ الْمَرْءُ مَضْمُوْنَهٗ .....
جب کوئی شخص اس کے مضمون کا مطالعہ کرتا ہے

رَسٰی فِی الْهُدٰی اَصْلُ اِیْمَانِهٖ
تو اس کے ایمان کی جڑ ہدایت میں مضبوط ہو جاتی ہے۔

وَجَاءَ بِرَوْضِ التُّقٰی نَاشِقًا
وہ تقویٰ اور نظافت کا ایسا باغ لائے۔

اَرَائِحَ اَزْهَارِ اَفْنَانِهٖ
جس کی شاخوں کے پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی ہے

وَنَالَ عُلُوْمًا تُرَقِّيْهِ فِی	انہوں نے ایسے علوم پائے جو
الثُّرَیَّا السَّمَاءِ وَکَیْوَانِہٖ	انھیں آسمان کے ثریا اور زحل تک لے جاتے ہیں
فَلِلّٰهِ دَرُّ اَبِی الْفَضْلِ اِذْ	حضرت ابی الفضل (قاضی عیاض) کی خوبی خدا کے لئے ہے
جَرٰی فِی الْوَرٰی نَیْلُ اِحْسَانِہٖ	جن کا فیض احسان تمام مخلوق میں جاری ہے
یُقَرِّرُ قَدْرَ نَبِیِّ الْھُدٰی	وہ اپنے مدلل بیان سے نبی ہدایت اور افضل الخلق ؐ
وَخَیْرِ الْاَنَامِ بِتِبْیَانِہٖ	کی عظمت شان بیان کرتے ہیں
فَجَازَاہُ رَبِّی خَیْرَ الْجَزَاءِ	میرا رب انھیں بہترین جزا دے
وَجَادَ عَلَیْهِ بِغُفْرَانِہٖ	اور انھیں اپنی مغفرت سے نوازے
وَمِنْهُ الصَّلٰوةُ عَلَی الْمُجْتَبٰی	اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ترین ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم)
وَاَصْحَابِہٖ ثُمَّ اَعْوَانِہٖ	اور آپ کے صحابہ اور معاونین پر رحمت کاملہ نازل فرمائے
مَدَی الدَّهْرِ لَا يَنْقَضِیْ دَائِمًا	جو آخر زمانہ تک ختم نہ ہو اور
وَلَا یَنْتَهِیْ طُوْلَ اَزْمَانِہٖ[29]	طویل زمانہ تک انتہا نہ ہو

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں :-

	ترجمہ
لَمَّا رَأَیْتُ کِتَابَ الشِّفَاءِ	جب میں نے منتخب ترین ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شمائل کے بیان میں
فِیْ شَمَائِلِ صَاحِبِ الْاِصْطِفَاءِ	کتاب شفا دیکھی۔
اَجْمَعَ مَا صُنِّفَ فِیْ بَابِہٖ مُجْمَلًا مِنَ الْاِسْتِیْفَاءِ	جو اس موضوع پر اجمالاً احاطہ کرنے والی کتابوں سے جامع ترین ہے
بِعَدَمِ اِمْکَانِ الْوُصُوْلِ اِلَی انْتِهَاءِ الْاِسْتِقْصَاءِ	کیونکہ کما حقہ احاطہ تک رسائی ممکن ہی نہیں۔
قَصَدْتُ اَنْ اَخْدِمَهٗ بِشَرْحٍ[30]	تو میں نے شرح کیساتھ اس کی خدمت کا ارادہ کیا۔

بعض ادبا نے کہا -

	ترجمہ
عُوِّضْتَ جَنَّاتِ عَدْنٍ یَا عِیَاضُ	اے قاضی عیاض آپ کو شفا کی
عَنِ الشِّفَاءِ الَّذِیْ اَلَّفْتَہٗ عِوَضٌ	تالیف کے عوض جنات عدن دی جائیں
جَمَعْتَ فِیْهِ اَحَادِیْثًا مُصَحَّحَةً	آپ نے اس میں صحیح حدیثیں جمع کی ہیں
فَهُوَ الشِّفَاءُ لِمَنْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ[31]	اس لئے ہر اس شخص کے لیے عین شفا ہے جس کے دل میں مرض ہے۔

علامہ یوسف ابن اسماعیل نبہانی فرماتے ہیں : ومنهم من توسط وكان مذهبه حسن الاقتصاد فمن المختصر الامام البارع القاضی عیاض رحمه بكتابه الشفاء الذی سار فی الآفاق ووقع علی قبوله الاتفاق[32]
(الانوار المحمدیہ من المواہب اللدنیہ)

بلند پایہ امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اختصار کے ساتھ سیرت پاک پر کتاب لکھی، مشہور آفاق بالاتفاق مقبول کتاب شفاء پڑھنے والے کے لیے بہت کافی ہے،

حضرت علامہ احمد شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں۔

واسمه موافق لمسماه فان السلف الصالحین قالوا انه جرب قراته لشفاء الامراض وفك عقد الشدائد وفیه امان من الغرق والحرق والطاعون ببرکته صلی الله علیه وسلم اذا صح الاعتقاد حصل المراد[۴۳]

شفاء شریف کا اسم اس کے مسمّٰی کے موافق ہے کیونکہ سلف صالحین فرماتے ہیں اس کا پڑھنا بیماریوں کی شفاء مشکلات کی گرہیں کھولنے میں مجرب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں ڈوبنے، جلنے اور طاعون کی مصیبتوں سے امان ہے اور اگر اعتقاد صحیح ہو تو مراد حاصل ہو جاتی ہے۔

شفاء شریف کا ماخذ اور جرح و تعدیل

علامہ خفاجی فرماتے ہیں کہ شفاء شریف کا ماخذ شفاء ابن سبع ہے۔ شفاء قاضی عیاض میں بھی بعض ضعیف حدیثیں آگئی ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے انھیں موضوع قرار دیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاء" میں ان تمام حدیثوں کی نشاندھی کی ہے۔ ایسے مقامات پر ہم نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کی قاری کو ضرورت ہو۔[۴۴]

مضامین شفاء

شفاء شریف چار قسموں پر مشتمل ہے:

قسم اول: اللہ تعالیٰ کی جانب سے قول و فعل کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ عظیمہ کا اظہار اس قسم میں چار باب ہیں۔ پہلا باب: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا جمیل۔ اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

دوسرا باب: اللہ تعالیٰ نے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرت کی تکمیل فرمائی اس باب میں ستائیس فصلیں ہیں۔

تیسرا باب: احادیث صحیحہ جن سے بارگاہ الٰہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کا پتہ چلتا ہے اس میں بارہ فصلیں ہیں

چوتھا باب: وہ آیات و معجزات جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دست مبارک پر ظاہر فرماتے اس میں تیس فصلیں ہیں۔

قسم ثانی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حقوق جو تمام مخلوق پر واجب ہیں اس قسم میں چار باب ہیں:

پہلا باب: حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی اطاعت فرض ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب: محبوب رب ذو الجلال صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ سے اخلاص لازم ہے اس باب میں چھ فصلیں ہیں۔

تیسرا باب: حضور سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر لازم ہے۔

چوتھا باب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کا حکم اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

قسم ثالث: سرور ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو امور جائز ہیں اور جو امور ممتنع ہیں یہ قسم کتاب کی جان اور پہلے ابواب کا نتیجہ ہے۔ پہلے ابواب تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اس قسم میں دو باب ہیں۔

پہلا باب : امور دینیہ میں، اس میں سولہ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب : امور دنیویہ میں، اس میں نو فصلیں ہیں۔

قسم رابع : سرورِ ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تنقیص کرنے یا گالی بکنے کا حکم۔ اِس قسم میں تین باب ہیں۔

پہلا باب : وہ امور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نقص اور سب (گالی) ہیں اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

دوسرا باب : بارگاہ اقدس کے گستاخ کا حکم اور اس کی سزا۔

تیسرا باب : بارگاہ الٰہی میں رسولان گرامی، ملائکہ، کتب سماویہ، اہل بیت کی شان میں گالی بکنے والے کا حکم اس باب میں پانچ فصلیں ہیں۔[۳۵]

شروح و تعلیقات

شفاء شریف کی مقبولیت عامہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ افاضل کی بہت بڑی جماعت نے اس پر شروح اور حواشی لکھے ہیں، اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں کا شمار ہی مشکل ہے۔ ذیل میں کشف الظنون کے حوالے سے چند شروح اور تلخیصات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ شیخ محمد بن احمد اسنوی شافعی (م ۷۶۳ھ) نے شفاء کی تلخیص کی۔

۲۔ شیخ استاذ ابو عبداللہ بن حسن مخلوف الراشدی المعروف بابرکان نے تین شرحیں لکھیں، بڑی شرح الغنیہ دو جلدوں میں، الغنیۃ الوسطیٰ، اور چھوٹی شرح ایک ایک جلد میں لکھی۔

۳۔ حافظ عبداللہ ابن احمد بن سعید بن یحییٰ الزموری نے شرح لکھی۔

۴۔ ابو عبداللہ محمد بن علی بن ابی الشریف الحسنی التلمسانی نے بہترین شرح، المنہل الاصفیٰ فی شرح ما تمس الحاجۃ الیہ من الفاظ الشفاء لکھی یہ شرح مذکورۃ الصدر دوسری اور تیسری سے ماخوذ تھی اور چودہ صفر، ۹۱ھ میں مکمل ہوئی۔

۵۔ شمس الدین محمد بن محمد الدلجی الشافعی العثمانی (م ۹۴۷ھ) نے الاصطفاء لبیان معانی الشفاء کے نام سے لکھی اور ۱۲ شوال ۹۳۵ھ میں مکمل کی۔

۶۔ امام ابوالحسن علی بن اقبرس الشافعی نے ۸۶۲ھ میں شرح لکھی،

۷۔ عمر العرضی نے چار جلدوں میں شرح لکھی۔

۸۔ ابوذر احمد بن ابراہیم الحلبی (م ۸۸۴ھ) نے شرح لکھی لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔

۹۔ امام ابوالمحاسن عبدالباقی الیمانی نے الاکتفاء فی شرح الفاظ الشفاء لکھی۔

۱۰۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے "مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاء" لکھی۔

۱۱۔ حافظ برہان الدین ابراہیم ابن محمد الحلبی (م ۸۴۱ھ) نے المقتفیٰ فی حل الفاظ الشفا لکھی۔

۱۲۔ علامہ تقی الدین ابوالعباس احمد بن محمد الشمنی (م ۸۷۳ھ) نے مزیل الخفاء عن الفاظ الشفاء کے نام سے حاشیہ لکھا، ۸۴۷ھ میں مکمل کیا،

۱۳۔ محمد بن خلیل بن ابوبکر ابو عبداللہ الحلبی المعروف القباقبی نے زبدۃ المقتفیٰ فی تحریر الفاظ شفاء (م ۸۱۴ھ) میں لکھی۔ نمبر ۱۲ اور

نمبر بارہ اور تیرہ دونوں شرحیں علامہ برہان الدین حلبی کی شرح سے ماخوذ ہیں۔

۱۴۔ علامہ شہاب الدین احمد بن رسلان الرملی الشافعی (م ۸۴۴ھ) نے حاشیہ لکھا۔

۱۵۔ عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن ابراہیم جماعتہ الکنانی القدسی (م ۸۶۱ھ) نے بعض الفاظ کی شرح لکھی۔

۱۶۔ سید قطب الدین عیسٰی الصفوی، ان کی شرح بطریق مزج ہے۔

۱۷۔ علامہ زین الدین بن الاشعاقی الحلبی۔

۱۸۔ علامہ رضی الدین محمد ابن ابراہیم المعروف بابن الحنبلی الحلبی نے موارد الصفار و موائد الشفار لکھی۔

۱۹۔ قطب الدین محمد بن محمد بن الحیضری (م ۸۹۴ھ) نے الصفا بتحریر الشفا لکھی۔

۲۰۔ علامہ یوسف بن ابی الفتح الدمشقی الامام السلطانی المعروف بالسقیفی (م ۱۰۵۷ھ)۔

۲۱۔ محمد بن عبدالسلام البنانی نے نداء الحیاض فی شرح الشفا للقاضی عیاض لکھی۔

۲۲۔ الحاج نجیب اینعتابی[6] مدرس مدینہ منورہ (۱۲۱۹ھ)۔

۲۳۔ الشیخ حسن العدوی الحمزاوی[7] نے المدد الفیاض لکھی۔

۲۴۔ علامہ احمد شہاب الدین الخفاجی نے نسیم الریاض فی شرح الشفار للقاضی عیاض لکھی۔

۲۵۔ علامہ علی بن سلطان محمد القاری (ملا علی قاری) نے شرح شفا لکھی۔

اس وقت آخری دو شرحیں مقبول اور متداول ہیں شرح الشفا حضرت ملا علی قاری نسیم الریاض کے حاشیہ پر چھپی ہے ہوئی چار جلدوں میں دستیاب ہے۔

شفا شریف ۱۲۷۶ھ میں مصر میں چھپی اس کے حاشیہ پر علامہ جلال الدین سیوطی کی شرح مناہل الصفا اور علامہ حسن العدوی الحمزادی کی شرح المدد الفیاض چھپی۔ ۱۲۹۰ھ میں پہلی جلد مطبع خلیل آفندی میں اور دوسری جلد ۱۳۱۲ھ میں مطبع عثمانیہ میں چھپی اور فاس میں بالترتیب ۱۳۰۵ھ اور ۱۳۱۳ھ میں چھپی اس کے بعد متعدد ایڈیشن شائع ہوئے مطبع مصطفےٰ البابی الحلبی مصر سے علامہ شمنی کے حاشیہ کے ساتھ چھپ چکی ہے پاکستان میں بھی مصری ایڈیشن کا عکس چھپ چکا ہے۔

حواشی

[1] شمس الدین ابوعبداللہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) تذکرۃ الحفاظ (حیدر آباد دکن) ج ۴ صفحہ ۹۶

[2] الذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۶

[3] الذہبی الامام۔ العبر فی من غبر (مطبوعہ کویت ۱۹۶۳ء) ج ۴ صفحہ ۱۲۲

[4] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین، صفحہ ۳۴۶

[5] محمد فرید وجدی دائرہ معارف القرن العشرین (دار المعرفۃ بیروت) ج ۶ ص ۷۹۴۔

۷؎ الذہبی العبر، ج ۴، صفحہ ۱۲۲
۸؎ الذہبی صفحہ ۱۲۳۔
۹؎ الذہبی تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ صفحہ ۹۷
۱۰؎ الذہبی صفحہ ۹۸۔
۱۱؎ الذہبی العبر صفحہ ۱۷۵
۱۲؎ الذہبی صفحہ ۳۰۳۔
۱۳؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۳۴۶
۱۴؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی صفحہ ۳۴۷۔
۱۵؎ الذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۸
۱۶؎ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۷۔
۱۷؎ ابن خلکان، (مطبوعہ دار الثقافتہ بیروت) ج ۳ صفحہ ۴۸۳
۱۸؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۴۴۔
۱۹؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین صفحہ ۳۴۵
۲۰؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۳۶۔
۲۱؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین صفحہ ۳۴۵
۲۲؎ عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین (مکتبہ المثنیٰ بیروت)
۲۲؎ اسماعیل باشا البغدادی، ہدیۃ العارفین (مکتبۃ المثنیٰ بغداد) ج ۱ ص ۸۰۵۔
۲۳؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۷
۲۴؎ مقدمہ شفا شریف مع حاشیہ علامہ شمنی، مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر بحوالہ الدیباج المذہب للعلامہ برہان الدین ابن فرحون المالکی۔
۲۵؎ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ صفحہ ۹۸۔
۲۶؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین صفحہ ۳۴۴۔
۲۷؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، مطبوعہ مکتبہ المثنیٰ، بغداد، ج ۲ صفحہ ۱۰۵۳۔
۲۸؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۳۔۳۴۲۔
۲۹؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۴۔۳۴۳۔
۳۰؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۵۵
۳۱؎ احمد شہاب الدین الخفاجی العلامہ، نسیم الریاض (مطبوعہ بیروت ج ۱ صفحہ ۵۲
۳۲؎ علی ابن سلطان محمد القاری الامام، شرح شفا، (برحاشیہ نسیم الریاض) مطبوعہ بیروت، ج ۱ ص ۵۲۔
۳۳؎ احمد شہاب الدین الخفاجی الامام العلامہ، نسیم الریاض ج ۱ صفحہ ۴۔
۳۴؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ صفحہ ۱۰۵۳
۳۵؎ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۲، ص ۵-۱۰۵۴۔
۳۶؎ اسماعیل باشا بغدادی، ایضاح المکنون علی کشف الظنون، ج ۲ صفحہ ۵۲۔
۳۷؎ یوسف الیان سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ، مکتبہ مثنیٰ، بغداد ج ۲ صفحہ ۱۳۹۷
۳۸؎ ایضاً۔

ابنِ کثیر (سیرت نگارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی

ابنِ کثیر (۷۰۱-۷۷۴ھ) آٹھویں صدی ہجری کے بڑے شامی علماء میں سے ہیں، وہ امام ابنِ تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کے عزیز ترین شاگرد، ان کے ہم مسلک اور جہادِ سیف وقلم میں کم ازکم قلم کی حد تک ان کے شریکِ کار تھے، ان کو تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ و سیرت اور تراجم کے فنون میں کامل دست گاہ حاصل تھی، جس پر ان کی چھوٹی اور بڑی متعدد تصانیف گواہ ہیں جن کی تعداد چونتیس تک پہنچتی ہے۔ ان کی تفسیری عظمت اور تاریخی شہرت ان کی "تفسیر القرآن الکریم" اور عام تاریخ "البدایۃ والنہایۃ" جیسے مفصل مبسوط عظیم علمی کارناموں کی رہینِ منت ہے۔

ان کی تصنیفات میں سیرت نبوی پر ان کی مختصر اور مطوّل دو کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے اور خود انھوں نے بھی ان دونوں کا تذکرہ حوالہ کے طور پر اپنی کتابوں میں جا بجا کیا ہے[1]۔ اور ان کے اکثر ترجمہ نگار بھی کم ازکم ان کی مختصر سیرت نبوی کو "سیرۃ صغیرۃ"[2] یا "الفصول فی سیرۃ الرسول"[3] صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے علٰحدہ کتاب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور ایک روایت کے مطابق یہ مختصر سیرت "الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول" صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مصر میں ۱۳۵۸ھ میں چھپ بھی چکی ہے[4] لیکن اس مطبوعہ مختصر سیرت تک ہماری رسائی اب تک نہیں ہوسکی ہے۔

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن الکریم، مطبعۃ الحلبی، القاہرۃ، ۱۳۷۱ھ، سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۲۶، ۴۷۸/۳، ابن کثیر، فضائل القرآن مطبعۃ الحلبی، القاہرہ، ۱۳۷۱ھ ص۱۶۱، ابنِ کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مطبعۃ السعادۃ، القاہرۃ ۱۹۵۸-۵۱ء، ۲۹۴/۱۴، ابن کثیر، مولد الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تحقیق صلاح الدین المنجد، دار الکتاب الجدید بیروت ۱۹۹۱ء ص۱۴

[2] ابن قاضی شہبہ، طبقات الشافعیۃ، تحقیق ڈاکٹر عبد العلیم خان، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ہندوستان ۱۳۹۰-۱۴۰۰ھ، ۱۱۴/۳، ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مکتبۃ القدسی، مصر، ۱۹۵۱-۵۰ء ۲۳۱/۶۔

[3] اسماعیل باشا البغدادی، ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون، وکالۃ المعارف، استنبول، ترکی ۱۹۴۷-۴۵ء، ۱۹۴/۲، اسماعیل باشا البغدادی، ہدیۃ العارفین فی أسماء المؤلفین وآثار المصنفین وکالۃ المعارف، استنبول ترکی ۱۹۵۵-۵۱ء ۲۱۵/۱، عمر رضا کحالۃ، معجم المؤلفین، مطبعۃ الترقی، دمشق، ۱۳۸۱-۷۶ھ، ۲۸۴/۲، فہرست کتب خانہ ایا صوفیا: نمبر ۳۳۴۹، ص۳۰۰۔

[4] احمد محمد شاکر، عمدۃ التفسیر عن الحافظ ابن کثیر، دار المعارف، القاہرۃ ۱۳۷۶ھ ۳۵/۱۔

ان کی مطوّل سیرت نبوی اگرچہ ان کے قدیم ترجمہ نگاروں سے مخفی رہی، لیکن ان کے جدید ترجمہ نگار اس طویل سیرت کے نام سے ناواقف نہیں ہیں[۶]۔ مگر علٰحدہ سے اس طویل سیرت کا پتہ اب تک نہیں چلایا جا سکا ہے اور مصطفیٰ عبدالواحد نے چار حصوں میں ابن کثیر کی جو "السیرۃ النبویۃ" اور اس کے ضمیمہ کے طور پر "شمائل الرسول و دلائل نبوتہ و فضائلہ و خصائصہ" علٰحدہ سے شائع کی ہے۔ وہ حقیقتاً ابن کثیر کی تاریخ "البدایۃ والنہایۃ" ہی سے من وعن ماخوذ ہے۔ کیونکہ مصطفیٰ عبدالواحد کا خیال ہے کہ یہی ابن کثیر کی وہ مطوّل سیرت نبوی ہے، جس کا حوالہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے[۷]، اور یہی راقم سطور کا بھی رجحان ہے[۸]۔ لہٰذا اس مقالہ میں ابن کثیر کے سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے مطالعہ کے لئے ہم ان کی عام تاریخ کی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں موجود طویل ترین سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو بنیاد بنائیں گے۔

یہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اسلامی تاریخ کی طویل ترین کتاب "البدایۃ والنہایۃ" کے تقریباً ایک تہائی (⅓) حصہ اور بڑی تقطیع (۸ × ۱۱) کے پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے[۹]۔ جس کی طوالت پر بجا طور سے لوگوں کی نظریں اٹھتی ہیں اور اس کو تاریخ نگاری میں دینی اہتمام کے غلبہ کا ثمرہ تصور کیا جاتا ہے[۹]۔

چنانچہ عام مسلمان مؤرخین کی عادت کے برخلاف، ابن کثیر نے اس عام تاریخی کتاب کے مفصل ترین سیرت نبوی کے حصہ میں "متعلقات سیرت" کے طور پر مزید چار اجزا "شمائل" و "دلائل" اور "فضائل" و "خصائص" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافہ کا ارادہ ظاہر کیا[۱۰]، جبکہ وہ ان موضوعات کے ساتھ ایک الگ باب میں "اسمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طبع کرنے کا تہیہ پہلے ہی سے کئے ہوئے تھے[۱۱]۔ لیکن مطبوع "البدایۃ والنہایۃ" اور اس سے ماخوذ "السیرۃ النبویۃ" اور "شمائل الرسول" میں نہ کہیں اسمائے مبارکہ کا باب ملتا ہے، اور نہ ہی علٰحدہ سے فضائل و خصائص کے ابواب

---

۵ ایضاً ۱/۳۴، اور عبدالرزاق حمزۃ، الباعث الحثیث الی معرفۃ علوم الحدیث: شرح اختصار علوم الحدیث لابن کثیر، مکتبۃ محمد علی صبیح واولادہ، مصر ۱۳۷۷ھ ص۱۷

۶ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، تحقیق و مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد، مطبعۃ الحلبی، القاہرۃ ۱۳۸۴ھ، ۱/۱۲-۱۳، اور ابن کثیر، شمائل الرسول، تحقیق و مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد، مطبعۃ الحلبی، القاہرہ ۱۳۸۶ھ، ص الف

۷ مسعود الرحمٰن خان الندوی، ابن کثیر: حیاتہ و مؤلفاتہ، مرکز الدراسات الآسیویۃ الغربیۃ، جامعۃ علی گڑھ الاسلامیۃ الہند ۱۹۰۹ء، ص۱۰۷-۱۰۸

۸ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۵۲ - ۶/۳۰۰

۹ فرانز روزنتال، علم التاریخ عند المسلمین، عربی ترجمہ ڈاکٹر صالح احمد العلی، مکتبۃ المثنی، بغداد ۱۹۶۳ء ص۲۰۳

۱۰ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۶/۱۱

۱۱ ایضاً ۲/۲۵۲، ۲۶۶

لیکن ان کی مذکورہ "سیرت" اور "شمائل" کے محقق مصطفیٰ عبدالواحد نے فضائل کے باب کی علٰحدہ سے موجودگی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[۱۲]، جس سے ہم کو اختلاف ہے[۱۳]۔ کیونکہ انہوں نے ابن کثیر کی جس وضاحت کو بنیاد بنایا ہے، اس کی مندرجہ ذیل زیر خط عبارت نا قابل اعتنا سمجھتے ہوئے نقل تک نہیں کیا ہے۔ ابن کثیر دلائل نبوت کے آخری باب " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر انبیا کرام علیہم السلام کے ہم پلہ بلکہ ان سے برتر معجزات کی دلیل " کو قائم کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے استاد ابن الزملکانی کا وہ مولد رسول اللہ علیم) دیکھا جس کو انہوں نے ابن اسحٰق وغیرہ سے خلاصہ کیا ہے۔" اور اس کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بھی بیان کئے اور اس باب میں ایک فصل قائم کی"[۱۴] لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکے۔ لہٰذا ابن کثیر دوستوں کے اصرار پہ اجر و ثواب کی امید میں اس کی تکمیل کے لیے مستعد ہوگئے۔

غالباً یہ مذکورہ معجزات ہی کی فصل تھی، لیکن مصطفیٰ عبدالواحد نے اس "فصل" کی وضاحت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور صرف "فضائل" کے لفظ میں الجھ کر ابن کثیر کی سیرت نبوی میں علٰحدہ سے فضائل کے باب کی موجودگی ثابت کرنے کے درپے ہو گئے۔ حالانکہ اس طرح تو وہ مذکورہ سیرت میں "خصائص" کے باب کی موجودگی کی اطلاع بھی ہم کو دے سکتے تھے، جس کا انہوں نے صفائی سے انکار کیا ہے[۱۵]۔ بلکہ خود ابن کثیر نے مذکورہ عبارت کے آس پاس تھوڑا اوپر اور نیچے دو بار بہت زیادہ وضاحت سے "خصائص" کے باب کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ گویا وہ اس کو لکھ چکے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ "خصائص کے باب میں ان چیزوں کا ذکر گذر چکا ہے۔ جو دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھیں" اور دوسرے صفحہ پر وہ پھر لکھتے ہیں "جیسا کہ ہم ان کے خصائص اور شمائل میں ذکر کر چکے ہیں"[۱۶]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن کثیر کے اس شک و شبہ اور ابہام و غموض سے بالاتر حوالے اور مصطفیٰ عبدالواحد کے مذکورہ مغالطے کے باوجود ابن کثیر کی سیرت نبوی میں علٰحدہ سے فضائل و خصائص کے ابواب موجود نہیں ہیں اور مصطفیٰ عبدالواحد نے جس مذکورہ آخری باب کو فضائل کا باب سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اگر اس کے عنوان اور مواد دونوں کا مقابلہ دلائل کے سابقہ مواد سے کیا جائے تو صرف یہ فرق سامنے آتا ہے کہ دلائل میں سے جو کچھ پہلے بغیر مقابلہ کے بیان کیا گیا تھا، اب اس کے متعلقہ حصہ کو اس باب میں موازنہ کے ساتھ دہرا دیا گیا ہے۔

---

[۱۲] ابن کثیر، شمائل الرسولؐ، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد۔ صد

[۱۳] مسعود الرحمٰن خان الندوی، ابن کثیر: دراسة تحليلية لكتاب البداية والنهاية، مركزا لدراسات الآسيوية الغربية، جامعة علی گڈھ الاسلامية۔ الهند۔ ۱۹۸۰ء، ص ۴۳، ۴۵

[۱۴] ابن کثیر، البداية والنهاية ۶/۲۵۸۔

[۱۵] ابن کثیر، شمائل الرسولؐ۔ مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد صد

[۱۶] ابن کثیر، البداية والنهاية ۶/۲۵۷ اور ۲۵۸

اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ فضائل کو ابن کثیر کی سیرت کا آخری حصہ قرار دینا، خود ابن کثیر کی مقرر کی ہوئی ترتیب کے خلاف ہے، جس کی انہوں نے کئی جگہ خود نشاندہی کی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سیرت کے بعد پہلے اسماء مبارکہ پھر شمائل، پھر دلائل اور پھر فضائل اور سب سے آخر میں خصائص ترتیب دینا چاہتے تھے [۱۷] لیکن وہ سیرت کے بعد اسمائے مبارکہ نہ بیان کر سکے، بلکہ اس حصہ کو شمائل سے شروع کیا، اور اس کے بعد وہ دلائل کی تقسیم در تقسیم میں ایسے الجھے کہ اپنی مقرر کردہ ترتیب بھی بھول گئے اور آخر کار رسول اللہ کی سچی پیش گوئیوں اور آپ کے معجزات کے موازنہ کے آخری دو ابواب [۱۸] پر سیرت ختم کر دی اور تاریخ خلفائے راشدین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بہر حال یہ شمائل و دلائل کا حصہ بھی خود بڑی تقطیع کے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے [۱۹]۔ حالانکہ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں یہ مواد یا حدیث کی کتابوں کے بعض ابواب یا سیرت کی ضمنی فصول کے عنوانات یا مستقل کتابوں کے موضوعات تھے اور عام تاریخ کی کتابوں سے ان کا قریب یا دور کا کوئی ربط نہ تھا بلکہ ابتدائی سیرت اور مغازی کی کتابیں بھی اس رنگ سے دور تھیں۔ ان میں آپ کی نادرۂ روزگار شخصیت اور قابلِ تقلید نمونہ ذات گرامی کو قرآنی آیت کریمہ "ھل کنتُ إلا بشرا رسولا [۲۰]" کے مصداق تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا تھا جس سے خاص کر اسلامی معاشرہ کے تشریعی مسائل میں ہمیشہ روشنی حاصل کی گئی اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی۔

لیکن بعد کے سیرت نگاروں کے نزدیک آپ کی بشریت اور رسالت کی جامع تاریخ ساز ہادی و رہبر شخصیت کلامی اور صوفیانہ اغراض و مقاصد کے سامنے دھندلانے لگتی ہے، چنانچہ ایک طرف علم کلام کے رواج اور اہل کتاب سے مناظرہ و مجادلہ کی گرم بازاری میں سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے آپ کے معجزات کے مقابلہ و موازنہ اور برتری ثابت کرنے پر زور قلم صرف ہوا، تو دوسری طرف ہمارے صوفیائے کرام کا طبقہ جس کی اپنی ذاتی بزرگی ماورائے بشری کرامات پر قائم ہے، لہذا ان کے نزدیک آپ کی عظمت تقدس کی دبیز چادر کے بغیر کیسے تصور کی جا سکتی تھی؛ خواہ اس کے لئے "موضوع احادیث، گڑھے ہوئے قصوں اور اسلام میں داخل ہونے والی غیر قوموں کی بے بنیاد کہانیوں، باطنی عقائد اور فلسفوں اور صوفیہ و زہاد اور عارفین کے خوابوں [۲۱]" کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ اسی لیے سیرت کی متاخر کتابوں میں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اولیں کتابوں میں بیان کردہ سیرت کے قریب نہیں رہ گئی، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے حدیث کا دامن تھامے رکھا تھا، کیونکہ وہ لوگ آپ کی عظمت کے احساس کے باوجود آپ کو صحیح احادیث کی روشنی ہی میں دیکھتے رہے [۲۲]"۔

---

[۱۷] ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۵۲، ۲۶۶، ۶/۱۰

[۱۸] ایضاً ۶/۱۸۲-۲۵۶، ۲۵۷ – ۳۰۰

[۱۹] ایضاً ۶/۱۱ – ۳۰۰ [۲۰] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹۳

[۲۱] محمد توفیق حسین کا مقالہ "عن سیرۃ النبی محمد"۔ کتاب ما ساھم بہ المؤرخون العرب فی المئۃ سنۃ الأخیرۃ فی دراسۃ التاریخ العربی وغیرہ۔ ھیئۃ الدراسات العربیۃ فی الجامعۃ الامیریکیۃ۔ بیروت: ۱۹۵۹ء ص ۲۸،

[۲۲] الدکتور احسان عباس، فن السیرۃ، دار بیروت، ۱۹۵۶ء ص ۱۷-۱۸

لیکن ابن کثیر جو خود بلند پایہ ناقد محدث تھے، اور سیرت میں کامیابی سے متعلقہ مواد کو صحیح احادیث کی روشنی میں پرکھ چکے تھے دلائل کے باب میں تحقیق سے زیادہ سابق مؤلفین کی طرح جمع و احاطہ اور پھر اس مواد کی تقسیم در تقسیم اور مقارنہ و موازنہ کی رو میں بہہ گئے اور یہ ان جیسی موسوعی و قاموسی (ENCYCLOPEDIC) شخصیت اور مزاج کے حامل عالم سے بعید بھی نہیں۔ ان جیسے علماً اکثر معلومات کے بحرِ زخار میں غوطے کھاتے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی میں نکلے ہیں اور بنیادی موضوع سے ہٹ کر فروعی موضوعات میں الجھے ہیں۔ ان کے ہاں زود نویسی میں احاطہ و شمول جہاں ایک قابلِ تعریف حیرتناک صفت ہے۔ وہیں اختصار نویسی میں انتخاب و اختیار کی صفت سے تہی دامنی تعجب خیز ہے۔

اسی طرح ابن کثیر بھی اس عام تاریخی کتاب کی سیرت نبوی کے حصے میں ایسے کھوئے کہ سیرت ہی کے ہو کر رہ گئے اور سیرت میں بھی شمائل و دلائل پر قلم اٹھایا تو "محدث و نقیہ کے لئے ناگزیر اہم معلومات[۲۳]" فراہم کرنے کی فکر میں ایسے ڈوبے کہ اس سے نکلنا دو بھر ہو گیا۔ اس لئے اس سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے حیرت نہ ہونا چاہیے اگر آپ ایک دم سے اپنے کو کسی خالص فقہی[۲۴] مسئلہ میں الجھا ہوا پائیں اور اصول و فروعِ فقہ کی کتابوں[۲۵] کے حوالے نظر کے سامنے سے گزرنے لگیں یا کسی حدیث کی کتاب کے مطالعہ کا شبہ ہونے لگے۔

بہرحال ابن کثیر کی یہ سیرت نبوی اپنے عظیم دائرہ کار، وسیع ذخیرۂ معلومات اور متنوع مصادرِ سیرت کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں انہوں نے تین متنوع مختلف اور مستقل موضوعات پر سابق مؤلفین کے جمع کئے ہوئے لامتناہی مواد کو سمونے کی کوشش کی ہے یعنی سیرت، شمائل اور دلائل، جس کا مختصر ترین خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ سیرت

ابن کثیر نے اس سیرت کو اپنی سہولت کی خاطر سات حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں سے ہر ایک کو "کتاب" کا نام دیا ہے۔ یعنی کتاب المبعث[۱]، کتاب المغازی[۲]، کتاب البعوث[۳]، کتاب الوفود[۴]، کتاب حجۃ الوداع[۵]، کتاب الشمائل[۶] اور کتاب الدلائل[۷]،

۲۳؎ ابنِ کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۶/۱۱۔

۲۴؎ جیسے نمازِ ظہر میں تاخیر (۳/۶۰) محرم رشتہ دار کی ملکیت اور آزادی کا حکم (۳/۲۹۶) بعد میں اسلام لانے والے شوہر کا پہلے اسلام لانے والی بیوی سے رجوع کا حق (۳/۳۲۳) جہاد میں نمازِ خوف کا حکم (۴/۸۲، ۱۱۰) بیٹے کی اپنی ماں کے دوسرے نکاح میں ولایت کا حکم (۴/۹۱) علامتِ بلوغ (۴/۱۲۵) مستطیع پر حج کا واجب ہونا (۴/۱۸۰) نکاح متعہ (۴/۱۹۳ - ۱۹۴، ۳۱۸) مسائلِ حج (۵/۱۱۰، ۱۴۲، ۱۵۸، ۱۶۴ - ۱۶۶) نماز میں بیٹھے ہوئے امام کی اقتدا (۵/۲۶۳) اختلاطِ نسب میں قیافہ کا حکم (۵/۳۱۲) خف پر مسح (۶/۲۴) وغیرہ وغیرہ۔

۲۵؎ جیسے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ (۵/۱۲۴) ابوعبید القاسم بن سلام کی کتاب الاموال (۳/۳۴۵) ابن السماک کی کتاب المناسک (۵/۱۶۳) ابن الصباغ کی کتاب المسائل (۴/۲۲۰) ابوحامد کی تعلیقۃ (۴/۲۲۰) اور امام النوادی کے فتاوی (۳/۱۱۲) وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر ہر مذکور "کتاب" کو متعدد ابواب، متنوع ضمنی فصول اور لاتعداد ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے، لیکن ان کی یہ ظاہری جامع و مانع اور شامل تقسیم ان کی سیرت کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ میں در آنے سے روک سکی ہے، اور نہ ہی اس کا مواد ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے یا تکرار سے بچ سکا ہے، جس کی بنیادی وجہ نزکیز و انتخاب کے بجائے زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے کا شوق، بلکہ ہوس، سابق سیرت و تاریخ و حدیث کی کتابوں کے ابواب سیرت کی تقلید اور قدیم طریقے کے مطابق ہجرت کے بعد کے واقعات کی سن وار ترتیب ہے، جس کے لئے وہ اپنے زمانہ کے رائج اسلوب اور ذاتی مزاج کی وجہ سے معذور رہیں۔

۱۔ سیرت یا حیات طیبہ

اس سیرت نبوی کی حیات طیبہ کے حصہ سے متعلق مواد کی ترتیب کے مختلف اسلوب کے لحاظ سے اس کی دو بڑی تقسیمیں کی جا سکتی ہیں۔ یعنی ہجرت مدینہ سے قبل کے حالات و واقعات جن کو ترتیب زمنی کا لحاظ کرتے ہوئے موضوعات (CHRONICLES) کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے، اور ہجرت مدینہ منورہ کے بعد کے حالات و حوادث، غزوات اور جنگیں اور بعض تراجم (اعیان کے حالات زندگی) جن کو سن وار (ANNALS) ترتیب کے لحاظ سے جمع کیا گیا ہے۔

الف۔ ماقبل ہجرت واقعات

فطری طور پر اس سیرت کی ابتداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب و نسب کے باب سے ہوئی ہے جس کا افتتاح اس موقعہ کے لئے مناسب ترین آیت قرآنی "اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ[۲۶]" سے کر کے روم کے بادشاہ ہرقل کے سوال کے جواب میں ابوسفیان کا حقیقت پر مبنی قول کہ "وہ ہم میں عالی نسب ہیں" اور پھر ہرقل کا تصدیقی بیان نقل کیا ہے کہ خدا کے "رسول قوم کے عالی نسب لوگوں ہی میں بھیجے جاتے ہیں"۔ اس کے بعد آپ کے بعض اسمار مبارکہ کی طرف مجملاً اشارہ کرتے ہوئے، ان کو سیرت کے آخر میں علٰحدہ سے مفصل طور پر جمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جس کو وہ مطبوع البدایۃ والنہایۃ کی حد تک پورا نہ کر سکے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر آپ کے نسب پر تاریخی روایات کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے۔ اس کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں عدنان تک ملایا ہے جہاں سے حضرت آدم علیہ السلام تک باقی نسب کی تفصیل کے لیے اپنی "تاریخ" میں حجاز کے عربوں کے بیان اور تاریخ طبری کا حوالہ دے کر آپ کے نسب کے سلسلہ میں اختلافی احادیث کا جائزہ لیا ہے اور کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

دوسرے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے دن مہینہ و سال کے تعین کے لئے احادیث و تاریخی روایات بیان کرتے ہوئے جمہور کے مسلک کی نشاندہی بھی کرتے گئے ہیں۔ ضمناً آپ کے والدین کے عقد مبارک کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اس مبارک شب میں ایک نئے دور کی آمد آمد کی خبر دینے والی نشانیوں کے تذکرہ کے بعد آپ کی دایاؤں، دودھ پلانے والیوں، خاص کر حلیمۃ السعدیہ کا پورا

---

[۲۶] سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۴

واقعہ اور ان کے ہاں آپؐ کے قیام کے دوران پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ پھر چھ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد آپؐ کے دادا عبدالمطلب اور ان کے بعد آپؐ کے چچا ابوطالب کے سایۂ عاطفت میں پرورش، سفر شام اور بحیری راہب کا مشہور قصہ، حرب فجار اور حلف الفضول میں شرکت، اُم المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے عقد مبارک اور تعمیر کعبہ کی تجدید میں شرکت کے اہم واقعات حسب توفیق تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ اور جا بجا اشعار سے استشہاد کرتے ہوئے بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد کتاب البعث کی ابتداء اہل کتاب علماء اور عرب کاہنوں کے نبی موعود کے متوقع ظہور اور جزیرہ نمائے عرب میں اس کے لئے ایک عام انتظار کی کیفیت کے تفصیلی بیان سے ہوتی ہے، جس میں تاریخی روایات کے علاوہ وسیع پیمانے پر آیات قرآنی احادیث اور سابق آسمانی کتابوں کی بشارتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چھ[۶] مستقل ابواب قائم کئے ہیں، جن میں سے پہلے[۱] باب میں جنات و شیاطین سے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کاہنوں کی آپؐ کے ظہور سے متعلق شہادتوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے[۲] باب کی ابتداء امام بخاری کی روایت کی ہوئی مشہور حدیث[۲۷] سے ہوتی ہے، جس میں پہلے سچے خواب، پھر تنہائی سے مناسبت اور غار حرا میں عبادت گزاری، فرشتہ کی آمد اور "اقرأ باسم ربك الذي خلق[۲۸] ..... الخ کے نزول کی تفصیلات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر و تاریخ، نزول وحی میں رکاوٹ، جنات و شیاطین کی آسمانی باتوں کی سن گن لگانے سے محرومی، وحی کا سلسلہ دوبارہ جاری ہونا اولین اسلام لانے والوں کا بیان الگ الگ فصلوں میں بنیادی طور پر حدیث کی کتابوں سے اور آخری فصل سیرت و تاریخ کی کتابوں سے لی گئی ہے۔ تیسرا[۳] باب پیغام خداوندی کی تبلیغ و اشاعت کے حکم سے متعلق ہے جس کی ابتداء قرآنی آیت "وأنذر عشيرتك الأقربين[۲۹] ..... الخ اور دیگر آیات قرآنی سے ہوئی ہے اور پھر اس حکم کی اطاعت میں آپؐ کا قریش کو صفا کی چوٹی پر سے دعوت دینا، ان کا ردعمل اور آپؐ کو اس دعوت سے باز رکھنے کی کوشش، آپؐ کے چچا ابوطالب سے بے نتیجہ شکایت پر قریش کا مایوسی اور جھنجھلاہٹ میں آپؐ کے دعوئ نبوت کا مذاق و استہزاء اور پھر آپؐ کا اور آپؐ کے صحابہ کرام کا اذیت رسانی کے طویل سلسلہ سے سابقہ وغیرہ واقعات سیرت و تاریخ اور احادیث کی کتابوں کی مدد سے طبع کئے گئے ہیں۔ چوتھا[۴] باب پیغام خداوندی کی حقانیت پر مشرکین سے حدیث و قرآن کی روشنی میں بحث و مباحثہ پر مشتمل ہے۔ پانچواں[۵] باب مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہے اور اسی باب میں قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی شدت میں بنی ہاشم سے مقاطعہ کا معاہدہ اور ان کا شعب ابی طالب میں حصار، پھر مذکورہ معاہدہ کا خاتمہ اور اس زمانہ میں آپؐ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرنے والی نشانیوں کا ذکر اور اسراء و معراج کا واقعہ بنیادی طور پر مؤرخین اور معجزہ شق القمر زیادہ تر محدثین کی روایات کی بنیاد پر جمع کیا گیا ہے اور اس

---

۲۷ الامام البخاری، الصحیح، المجلس الأعلی للشئون الاسلامیة، القاهرة، سنہ ۱۳۸۶ھ ۱/ ۵-۶

۲۸ سورة العلق، آیات نمبر ۱-۵

۲۹ سورة الشعراء۔ آیات نمبر ۲۱۴-۲۲۰

کے بعد آپ کے چچا ابو طالب اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات کے حادثات اور آپ کے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ام المؤمنین حضرت سودہؓ سے عقد مبارک، سفرِ طائف اور ایذا رسانی اور گستاخی کا سامنا، موسمِ حج میں عرب قبیلوں میں دعوت و تبلیغ کا کام، انصار کے وفود کی سال بہ سال آمد اور ان میں اسلام کی دعوت کی مقبولیت، عقبۂ اُولیٰ اور عقبۂ ثانیہ کی بیعت وغیرہ کے واقعات بنیادی طور پر سیرت و تاریخ کی کتابوں کے حوالوں اور حدیث کے مجموعوں کی مدد سے بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ چھٹا باب مکہ سے مدینہ ہجرت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں خود آپؐ کی حضرت ابو بکر الصدیقؓ کے ساتھ ہجرت کا واقعہ بہت تفصیل سے سیرت نگاروں، مؤرخین اور محدثین کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب المبعث کے مذکورہ ابواب میں پہلے باب کے علاوہ اشعار بہت کم نقل کئے گئے ہیں۔

ب۔ مابعدِ ہجرت واقعات

ہجرتِ مدینہ کے بعد کے واقعات "سن وار" عنوانات کے تحت سال بہ سال جیسے جیسے پیش آتے گئے بیان کئے گئے ہیں۔ سالانہ شاہ سرخی کے علاوہ سیرت کی سابق بنیادی تقسیم کتاب ضمنی فصول اور ذیلی عنوانات یہاں بھی برقرار ہیں، صرف ابواب کی تقسیم سالانہ واقعات کی ترتیب سے متاثر ہوئی ہے، لیکن یہ ابواب سیرت کے آخر اور شمائل و دلائل کے حصوں میں پھر بکثرت ملنے لگتے ہیں۔

ان سالانہ واقعات میں فطری طور پر غزوات و سرایا کا ذکر غالب ہے، اہم غزوات بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سیرت، تاریخ اور حدیث کی کتابوں کے علاوہ متعلقہ آیات قرآنی سے استدلال اور اشعار سے استشہاد میں کوتاہی نہیں کی گئی ہے۔ غزوات و سرایا میں جھنڈا جن صحابہ کرام کے ہاتھ میں دیا گیا، اُن کے نام اور جھنڈے کا رنگ بھی جہاں تک معلوم ہوا تحریر کیا گیا ہے، آپؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں آپ کے عمال کے ناموں کی نشاندہی کی فکر بھی رکھی گئی ہے اور اس سب کے ساتھ سیرتِ نبوی کے دوسرے پہلو اور دیگر واقعات بھی نظر سے بالکل اوجھل نہیں ہوتے ہیں۔ اہم وفیات اور نومولودین کا تذکرہ اکثر غزوات و واقعات کے درمیان میں آگیا ہے، بعض سالوں کے آخر میں متعلقہ سال کے "جملہ حوادث کی فصل" بھی قائم کی ہے جس میں انہوں نے اس سال ہی کے مذکورہ غزوات اور واقعات کی طرف مختصراً اشارہ اور وفیات اور نومولودین کے مختصر ترین ذکر پر اکتفا کیا ہے اور اکثر تو یہ فصل ترتیب دینے سے بھی رہ گئی ہے، کچھ غزوات و سرایا اور واقعات و وفیات وغیرہ کی تکرار بھی ملتی ہے، جس کی وجہ ان کی تاریخوں کے سلسلہ میں سابق مؤرخین و محدثین کا اختلاف ہے لیکن ابن کثیر نے جس تاریخ کو زیادہ صحیح سمجھا ہے۔ وہاں پر تفصیل بیان کی ہے اور دوسری جگہ صرف مختصر اشارہ یا حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے۔

بہرحال ہجرت کے سال اول کے واقعات کی ابتدا فطری طور پر تاریخ اسلامی کے ہجرت مدینہ سے متعین کرنے کے بیان سے ہوتی ہے، جس میں حضرت عمر الفاروقؓ کے دورِ خلافت میں اس کی ضرورت، مشورہ، اختلاف رائے اور پھر سالِ ہجرت کے ماہ محرم (جبکہ آپؐ خود مکہ میں تشریف رکھتے تھے) سے تاریخ اسلامی کی ابتدا پر اتفاق کا ذکر ہے اور پھر علیحدہ فصلوں اور ذیلی عنوانات کے تحت مسجد قبا کی تاسیس، عبداللہ بن سلام کا اسلام، مدینہ میں پہلی نماز جمعہ اور خطبہ، مسجد نبوی کی بنیاد اور اس کے فضائل، مہاجرین کی بیماری اور

مدینہ کے حق میں بیماریوں سے حفاظت کی آپؐ کی مقبول دعا، انصار و مہاجرین میں مؤاخات، مدینہ کے یہودیوں سے صلح کا معاہدہ، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی رخصتی، نماز مقیم میں اضافہ، اذان کی مشروعیت، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کے سرایا (فوجی مہمات یا جنگی دستوں) کے ذکر کے علاوہ ہجرت مدینہ کے بعد پہلے وفات پانے والے اور پہلے نومولود بچوں کا تذکرہ بھی ہے، اور سال کے آخر میں ایک علیحدہ مختصر فصل میں مذکورہ واقعات، وفیات اور نومولودین کی طرف پھر اشارہ کیا ہے۔

دوسرے سال ہجرت کی ابتدا کتاب المغازی سے ہوئی ہے، جس کو انھوں نے علمائے یہود کی اسلام اور مسلمان دشمنی، اوس و خزرج سے سازباز، اور ان میں سے بعض کے تقیہ کے طور پر اسلام لانے کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ پھر اس سال کے تمام غزوات سرایا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں خاص طور پر غزوۂ بدر کو اس کی اہمیت کے پیش نظر بنیادی طور پر ابن اسحاق کی روایت سے اور بوقت ضرورت دیگر مؤرخین و محدثین کی مدد سے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس میں طرفین کے مقتولین اور قیدیوں کی تعداد، مال غنیمت کی تقسیم، آپؐ کی کامیاب و کامران مدینہ واپسی، نجاشی کی غزوۂ بدر کے نتیجہ میں خوشی، مکہ میں غم و ماتم، فدیہ کی ادائیگی سے قریش کے قیدیوں کی رہائی کے علاوہ آخر میں بنیادی طور پر ضیاء الدین محمد المقدسی کی کتاب الاحکام الکبیر سے شرکائے بدر صحابہ کرامؓ کے ناموں کی پہلے ہجری حروف کی ترتیب سے اور پھر کنیت کی بنیاد پر مرتب کردہ فہرست اور ان کی فضیلت کی احادیث اور اس غزوہ کے بارے میں طرفین کے اشعار نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ غزوات کے ذکر کے دوران مختلف واقعات بھی بیان کئے ہیں، جن میں قابل ذکر تحویل قبلہ، ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت، النضر بن الحارث اور عقبہ بن معیط کا قتل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی ہجرت، حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے عقد مبارک اور رخصتی وغیرہ موضوعات ہیں اور آخر میں اس سال کے جملہ حوادث کی فصل ہے جس میں بعض مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ اور اس سال کی وفیات اور نومولودین کا مختصر ترین ذکر ہے۔

تیسرے سال کے غزوات و سرایا میں سب سے مفصل ذکر غزوۂ اُحد کا ہے، اور اس کے ذیل میں حضرت حمزہؓ کی شہادت کا سانحہ، ان کی نماز جنازہ، طرفین کے مقتولین کی تعداد، مشرکین کا تتبع اور طرفین کے اس غزوہ کے بارے میں اشعار کے علاوہ کعب بن الاشرف کے قتل کا قصہ، اور حرمت خمر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس سال کے آخر میں ایک مختصر فصل میں وفیات و مولودین کے علاوہ حضرت عثمانؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دوسری صاحبزادی حضرت امّ کلثومؓ سے عقد مبارک کا تذکرہ ہے۔

چوتھے سال کے غزوات و سرایا میں غزوۃ الرجیع اور بنو النضیر کی جلاوطنی کی کسی حد تک تفصیل بیان کرنے کے بعد غزوۂ بنی لحیان کے ضمن میں صلاۃ الخوف کا ذکر آیا ہے۔ اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل نسبتاً سابق سالوں کی فصلوں سے طویل ہے جس میں حسب عادت وفیات و مولودین کے ذکر کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ام المؤمنین زینب بنت خزیمہؓ اور ام المؤمنین ام سلمہؓ سے عقد مبارک اور اس ضمن میں بیٹے کی ماں کے دوسرے عقد کے موقعہ پر ولایت کی فقہی حیثیت کا مختصر ذکر بھی آگیا ہے۔

پانچویں سال کے واقعات میں غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، اس کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات، ابورافع سلام بن ابی الحقیق اور خالد بن سفیان الہذلی کے قتل، عمرو بن العاص کی نجاشی سے ملاقات اور نجاشی کی ان کو اسلام کی تلقین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ام المؤمنین اُمّ حبیبہؓ بنت ابی سفیان اور ام المؤمنین زینبؓ بنت جحش سے عقد مبارک

اور حجاب کے حکم کا نزول وغیرہ موضوعات بیان کئے ہیں، لیکن اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل موجود نہیں ہے۔

چھٹے(۶) سال کے غزوات و سرایا میں غزوۂ ذی قَرَد، اور غزوۂ بنی المصطلق کسی قدر تفصیل سے اور غزوہ (صلح) حدیبیہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد، اس سال کے دیگر سرایا علٰحدہ فصل میں واقدی (بحوالہ بیہقی) کی روایت سے ذکر کئے ہیں۔ نیز اس سال کے دیگر واقعات میں مشہور حدیث الافک (ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر بے بنیاد تہمت کا قصہ) بھی قابلِ ذکر ہے اور اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل میں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق فرضیت حج، مسلمان عورتوں کے مشرکین سے نکاح کی حرمت کے علاوہ مذکورہ غزوات میں سے بعض کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن وفیات و مولودین کا ذکر نہیں ہے۔

ساتویں(۷) سال کے غزوات میں خاص کر غزوۂ خیبر اور خیبر کے قلعوں کی فتوحات، شہداء اور اراضی کی تقسیم بہت تفصیل سے بیان کرنے کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کی حبشہ سے واپسی، عمرۃ القضاء اور اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ اور اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مبارک قابلِ ذکر موضوعات ہیں۔ لیکن سال کے آخر میں جملہ حوادث اور وفیات و مولودین کا ذکر یہاں بھی نہیں ہے۔

آٹھویں(۸) سال کی ابتداء حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت عثمان بن طلحہؓ اور انتہا حضرت کعب بن زہیرؓ کے اسلام لانے کے واقعات سے ہوئی ہے اور ان کے درمیان غزوات و سرایا کے ضمن میں غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ ہوازن (حنین) اور غزوۂ طائف اور ان کے درمیان پیش آنے والے تمام واقعات بہت تفصیل سے ترتیب دینے کے بعد عمرۃ الجعرانہ کا بیان کیا ہے، اور اسی سال فتح مکہ سے پہلے کتاب البعوث کی ابتداء ہو گئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملوکِ عالم کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے وفود اور پیغامات کی روانگی کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ اور آخر میں اس سال کے جملہ حوادث کی فصل میں مذکورہ غزوات کی طرف مختصراً اشارہ کیا ہے، لیکن اس میں وفیات کا ذکر نہیں ہے۔

نویں سال غزوۂ تبوک کے تفصیلی بیان سے شروع ہوا ہے اور آپ کے تبوک میں قیام کے دوران ہی قیصرِ روم کے پیامبر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے آمد اور ایلہ کے بادشاہ اور جرباء اور اُذرح کے لوگوں سے مصالحت، رومہ کے حاکم کی حضرت خالد بن الولیدؓ کے ہاتھوں گرفتاری اور مصالحت کے اہم واقعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان کے بعد مسجد ضرار کا واقعہ اور اس کا انہدام، غزوۂ تبوک میں شرکت سے پیچھے رہ جانے والوں کو تنبیہ، ثقیف کے وفد کی آمد اور اسلام، عبداللہ بن اُبی کی موت، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امیرِ حج کی حیثیت سے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ روانگی اور قربانی کے دن حضرت علیؓ کی زبانی مشرکین کے آئندہ سال سے حج پر پابندی، ننگے بدن بیت اللہ کے طواف کی ممانعت، اس سال آئے ہوئے مشرکین کو مکہ سے واپسی کے لیے چار ماہ کی مہلت، جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے عہد و پیمان کے علاوہ تمام دوسرے عہد و پیمانوں کے خاتمہ کے اعلان کا مفصل بیان تحریر کیا ہے اور سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل میں بعض مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ کے علاوہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کی وفات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہاں سال کے واقعات ختم کرنے کے بجائے امام بخاری کی تقلید میں کتاب الوفود قائم کیا ہے جس میں عرب قبائل کی فوج در فوج آمد اور ان کے اسلام لانے کے واقعات بہت تفصیل سے ترتیب دیے گئے ہیں۔

دسواں[۱۰] سال اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور خدا کے پیغام کو بندگانِ خدا تک پہنچانے کے لئے حضرت خالد بن الولیدؓ کو نجران اور ان کے بعد حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجنے سے شروع ہوتا ہے، جن کی مدد کے لئے بعد میں حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت علیؓ کو بھی یمن بھیجا گیا۔ اس کے فوراً بعد کتاب حجۃ الوداع کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس کی چھوٹی بڑی تمام تفصیلات جیسے مدینہ سے روانگی، قیام کی منزلیں، نماز کے مقامات، احرام (افراد، تمتع یا قران) تلبیہ، مکہ میں داخلہ طواف رمل، صفا، و مروہ کے درمیان سعی، بطحاء میں قیام، عرفہ میں وقوف، مزدلفہ میں شب گذاری، صبح سویرے منیٰ کے لیے روانگی رمی، قربانی، طواف بیت اللہ کے لئے مکہ روانگی، منیٰ واپسی، تشریف کے دوسرے دن منیٰ تاریخی خطبہ، مکہ واپسی، مدینہ سے روانگی اور راستہ میں جحفہ کے قریب غدیرِ خم نامی مقام پر مشہور خطبہ جو بعد میں حضرت علیؓ کے طرفداروں کے لئے ان کی دوسرے صحابہ کرام پر فضیلت اور فوقیت کی ایسی دلیل بنا کہ اس پر اب تک دفتر کے دفتر سیاہ کئے جا چکے ہیں، جبکہ جمہور اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک اس خطبہ سے حقیقتاً یمن کے قیام کے زمانہ میں حضرت علیؓ پر بے جا الزامات جور و جفا سے برأت اور ان شکایات کا ازالہ مقصود تھا جو بعض لوگوں کو آپ سے پیدا ہوئی تھیں۔ بہر حال حجۃ الوداع کا یہ مفصل بیان بنیادی طور پر احادیث کی روشنی میں اور بوقت ضرورت سیرت و تاریخ کی کتابوں کی مدد سے اور کہیں کہیں فقہی آراء کے حوالوں سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سال کے آخر میں بھی جملہ حوادث کی فصل اور وفیات وغیرہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔

گیارہواں[۱۱] سال ہجرت آپؐ کی حیات طیبہ کا آخری سال تھا، لہٰذا اس کا افتتاح پیغام رسالت کی تکمیل، حق کی فتح، اسلام کا غلبہ اور دیگر اشاراتِ قرآنی کی حامل آیات سے کیا ہے، لیکن سابق مؤرخین و محدثین کی نقل میں ابن کثیر سانحۂ ارتحال کے بیان سے پہلے آپ کے حج غزوات و سرایا کی تعداد، ملوکِ عالم کے نام آپ کے پیغامات اور قاصدین کے ذکر کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور پھر آیات قرآنی اور احادیث کی روشنی میں آپ کے سانحۂ وفات سے متعلق اشارات ایک مستقل فصل میں جمع کئے ہیں، جس کے بعد مرض الموت کی ابتدا، کیفیت، شدت، حضرت ابوبکر الصدیقؓ کو پنج وقتہ نمازوں کی امامت کا حکم، اور خود بعض اوقات ان کی امامت میں نماز کی ادائیگی، جان کنی اور اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے جدائی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ پھر "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور دفن سے پہلے کے اہم واقعات کی فصل" کے زیرِ عنوان حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی بیعتِ خلافت کے سلسلہ میں تصفیہ بنی ساعدۃ میں ان کو آپؐ کا جانشین مقرر کئے جانے کا مکمل واقعہ بنیادی طور پر امام احمد بن حنبل کی روایت اور دیگر محدثین و مؤرخین و سیرت نگاروں کی مدد سے بیان کر کے حضرت ابو بکر الصدیقؓ کی اقدمیت اور اسبقیت پر مہاجرین و انصار صحابہ کرام کا اجماع ثابت کیا ہے اور حضرت علیؓ کے طرفداروں کے ان کے لئے خلافت کی وصیت کے دعویٰ کو رد کرتے ہوئے ان تمام روایات اور ان کے راویوں پر بحث کی ہے جن کا ذکر اس ضمن میں آتا ہے۔ پھر آپ کی سیرت مبارکہ کی طرف لوٹتے ہوئے، وفات کا وقت اور دن اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تعین، غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور دفن کا حال، قبر مبارک کی جگہ کا تعین صحابہ کرامؓ پر اس اندوہناک صدمہ کا اثر اور تعزیت کے سلسلہ کی احادیث و روایات، اہلِ کتاب کو آپؐ کی وفات کے دن کا سابق علم اور عرب قبائل ارتداد کی وبا پھیلنے کی طرف صرف اشارہ کر کے تفصیل آئندہ تاریخی حالات کے لئے اٹھا رکھی گئی ہے۔ اور حضرت حسان بن ثابتؓ اور ابوسفیان بن الحارث کے

مرثیوں کے اشعار پر وفات کے بیان کی تکمیل ہوئی ہے۔

اس کے بعد متعدد ابواب قائم کئے ہیں جن میں سے پہلے باب میں آپؐ کے ترکہ کے بارے میں احادیث جمع کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سوائے کچھ زمین کے کوئی چیز میراث میں نہیں چھوڑی تھی اور اس زمین کو بھی اللہ کے لئے صدقہ کر دیا تھا۔ دوسرے[2] باب میں حدیث "لا نورث، ماترکنا ہ صدقۃ" پر بحث کرتے ہوئے فدک کی زمین اور آپؐ کے خیبر کے حصّہ کے بارے میں حضرت فاطمہ رضؓ اور حضرت عباسؓ کا حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ سے اختلاف اور پھر ناراضگی کا ذکر آیا ہے، جس میں ابن کثیر نے حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کے مؤقف کی تائید اور حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ سے مصالحت اور تجدید بیعت کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کے ہاتھ پر پہلی بیعت تمام صحابہ کے ساتھ ثابت ہے۔ تیسرے[3] باب میں امہات المؤمنین، آپؐ کی مخطوبات (منگیتریں) جن سے نکاح کی نوبت نہیں آئی، سراری (باندیاں) اور اولاد کا تذکرہ الگ الگ فصلوں میں کیا ہے۔ چوتھے[4] باب میں آپ کے غلام، لونڈیوں، خدمت گاروں، وحی لکھنے والے کاتبین اور اُمنائ کے حالات ابجدی حروف کی ترتیب اور بعد میں کنیت کے اعتبار سے مستقل فصلوں میں تحریر کئے ہیں اور پانچویں[5] باب میں آپ کی زندگی کی یادگار نشانیوں اور سواریوں وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے اور یہاں ابن کثیر نے سیرت کا بنیادی حصہ ختم کر کے "کتاب" کی تقسیم اور عنوان کو برقرار رکھتے ہوئے مزید چار کتابوں میں شمائل و دلائل اور فضائل و خصائص کے بیان کرنے کی وضاحت کی ہے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فضائل و خصائص کے حصّے طبع البدایۃ والنھایۃ اور اس سے ماخوذ سیرت اور شمائل میں نہیں ملتے، لہٰذا یہاں صرف شمائل اور دلائل کا خلاصہ پیش کیا جائیگا۔

۲۔ شمائل یا صفات و اخلاق مبارکہ

ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کی کتاب الشمائل کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جس کے پہلے[1] باب میں انہوں نے آپؐ کا حُسن چہرہ مہرہ، بال، مونڈھے، بازو، بغل، پاؤں، ٹخنے، قد، بدن کی خوشبو اور دونوں شانوں کے درمیان خاتم نبوت سے متعلق معلومات جمع کی ہیں۔ دوسرے[2] باب میں آپؐ کی عام صفات و کمالات کو اجاگر کرنے والے بیانات تحریر کئے ہیں اور تیسرے[3] باب میں آپؐ کے اخلاق و عادات، جود و سخا، ظرف و مزاح، زہد و عبادت اور شجاعت کے اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ یہ پوری "کتاب" بنیادی طور پر امام ترمذی کی الشمائل اور دیگر احادیث کے مجموعوں کی روشنی میں تیار کی گئی ہے، سوائے آخری ایک فصل "سابق آسمانی کتابوں میں مذکور آپؐ کی صفات" محدثین اور مؤرخین کے حوالوں سے ترتیب دی گئی ہے۔

۳۔ دلائل یا آپؐ کی زندگی کے اعجازی گوشے

اس سیرت کے آخری حصہ کے طور پر ابن کثیر نے کتاب دلائل النبوۃ ترتیب، جو اس سیرت کے طویل ترین حصوں میں سے ایک ہے۔ اس میں انہوں نے دلائل نبوت کو پہلے معنوی اور حسّی دلائل میں تقسیم کیا ہے:

معنوی دلائل میں انہوں نے قرآن[1] شریف کو بطورِ معجزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اخلاق[2] و عادات و صفات کو بھی

اپنے استاد امام ابن تیمیہ کی اتباع میں اسی ضمن میں شمار کیا ہے، اور ان ہی کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح کی متعلقہ آخری نص کو بحرفہ نقل کر دیا ہے۔

اور پھر حسی دلائل کے علٰحدہ مستقل باب کو آسمانی اور زمینی دلائل میں تقسیم کیا ہے:

آسمانی دلائل میں معجزہ[۱] شق القمر کا ذکر فطری تھا، جس کے متعلق تمام احادیث کی مختلف روایتیں جمع کرنے کے بعد اس غیر معمولی واقعہ کی عالم میں شہرت کے ضمن میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ "ایک سے زیادہ مسافروں نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا ہیکل (مجسمہ یا عمارت ؟) دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ وہ اس رات میں بنایا گیا ہے جس میں شق قمر ہوا تھا"[۳] اور اس معجزہ کے ضمن میں حضرت علیؓ کے نمازِ عصر ادا کرنے کے لئے آپ کے حکم سے "سورج کو اس کے غروب ہونے کے بعد لوٹانے والی حدیث" کے سندا و متن پر طویل بحث کرتے ہوئے، مخالف اور موافق مصنفین کی کتابوں کے حوالوں سے ان کی آراء کو پیش کیا ہے اور اس حدیث کو موضوع اور ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا۔ اس کے علاوہ آسمانی دلائل میں نماز استسقاء کے بعد آپ کی دعا[۲] کی فوری قبولیت اور اسی طرح قریش کے خلاف آپ کی بددعا[۳] کی قبولیت کو بھی شمار کیا ہے اور ان سے متعلق احادیث اور بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

اور زمینی دلائل کو علٰحدہ فصل میں جمادات وحیوانات سے متعلق دلائل میں تقسیم کیا ہے:

جمادات سے متعلق دلائل میں آپ کے ہاتھ کی انگلی کی برکت سے پانی کی زیادتی، ہنگامی ضرورت کے موقعوں پر کھانے کی چیزوں (دودھ، گھی، کھجور، آٹا، جو وغیرہ) یا مال (سونا وغیرہ) میں برکت، درخت کا آپ کے حکم کی تابعداری کرنا، کھجور کے تنے کا آپ کے فراق پر غم و گریہ، کنکریوں کا آپ کے ہاتھ میں تسبیح پڑھنا، بتوں کا آپ کے اشارے پر گر جانا وغیرہ واقعات سے متعلق احادیث اور ان کی مختلف روایتوں کا بہت تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔

اور حیوانات سے متعلق دلائل میں جنگلی اور پالتو جانوروں اور پرندوں (اونٹ، بکری، بھیڑیا، شیر، ہرنی، گوہ، گدھا اور ایک سرخ پرندہ وغیرہ) کا آپ کی تعظیم، ادب، سجدہ، رسالت کی گواہی یا مالک کی بدمعاملگی کی شکایت وغیرہ کے واقعات سے متعلق احادیث اور ان کی مختلف روایتوں کو بہ تفصیل جمع کرنے کے علاوہ، آپ کی امت کے اولیا کی بعض کرامات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر نقل کیا ہے۔ نیز بعض فوت شدہ افراد اور ایک دن کے بچہ کا آپ کی رسالت کی شہادت دینا، آپ کی دعا سے مختلف امراض سے بیماروں کی شفایابی، یا اولاد و مال کی کثرت وغیرہ غیر معمولی کرامات ظاہر کرنے والے واقعات سے متعلق مختلف روایات کا انبار جمع کر دیا ہے اور غالباً یہ ان کی سیرت کا سب سے کمزور حصہ ہے۔ جس کی طرف ان کی شمائل اور دلائل کے محقق مصطفیٰ عبدالواحد نے بھی اشارہ کیا ہے اور ثابت شدہ دلائل کی موجودگی میں ایسی کمزور، موضوع، مشکوک یا خلافِ عقل روایات کی بھر مار سے احتراز کا مناسب مشورہ دیا ہے۔[۳۱]

---

[۳۰] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ۔ ۶/۷۷۔ [۳۱] ابن کثیر، شمائل الرسولؐ، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد صفحہ ج۔ د

دلائل نبوت کی مذکورہ تقسیم در تقسیم اور اس کی غیر معمولی تفصیلی ترتیب کے بعد ابن کثیر نے تین باب اور قائم کئے ہیں - جن میں سے پہلے[1] باب میں مشرکین و یہود کے آزمائشی سوالات کے جواب میں آپ کی سابق آسمانی کتابوں کے مطابق صحیح معلومات کا تذکرہ دلائل نبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ایک مستقل فصل میں منتخب آسمانی کتابوں کے نام بنام حوالوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی بشارتیں بھی جمع کر دی ہیں ۔ دوسرے[2] باب میں بہت تفصیل سے تمام ایسی احادیث اور ان کی مختلف روایتیں ذکر کی ہیں جن کا تعلق غیبیات سے تھا اور وہ آپ کی حیات میں اور مابعد وفات آپ کی پیش گوئیوں کے مطابق صحیح ثابت ہوئیں اور تیسرے[3] باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا مقابلہ سابق انبیاء کرام علیہم السلام سے کر کے آپ کے معجزات کو ان کے معجزات کے ہم پلہ یا ان سے برتر ثابت کرتے ہوئے ایسے معجزات کا ذکر بھی کر دیا ہے جو آپ سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہو سکے اور اس آخری باب کو انہوں نے اپنے استاد ابن الزملکانی کی مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہشام بن عمار کی کتاب المبعث کی بنیاد اور دیگر احادیث کے مجموعوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے اور پھر اس سیرت نبوی کو محدث و ادیب اور نحوی جمال الدین ابو زکریا یحییٰ الصرصری (وفات ۶۵۶ھ) کے مدح نبوی کے دیوان کے چند اشعار پر ختم کیا ہے ۔

ابن کثیر کی مفصل ترین سیرت نبوی کے اس انتہائی مختصر خلاصہ کے بعد اب ہم ان کے مصادر اور مآخذ (SOURCES) کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کریں گے ۔

مصادر و مآخذ

اس سیرت نبوی کے پہلے[1] حصہ یعنی سیرت یا حیات طیبہ کی معلومات اور مواد میں فطری طور پر سیر و مغازی اور تاریخ کی مشہور و معروف کتابیں پیش پیش ہیں اور دوسرے[2] حصہ شمائل یا صفات و اخلاق مبارکہ میں شمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستقل کتابیں یا احادیث کے مجموعوں کے مستقل ابواب اصل و بنیاد ہیں اور تیسرے[3] حصے دلائل نبوت یا آپ کی زندگی کے اعجازی گوشوں میں دلائل نبوت موضوعات سے متعلق مستقل کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور ان تینوں قسم کی مستقل فنی کتابوں کے پہلو بہ پہلو ان کے بیانات کی تائید و تصحیح یا تردید و انکار کے لیے ابن کثیر نے اپنے علمی مزاج و شخصیت کے مطابق قرآنی آیات، مشہور تفاسیر، سابق آسمانی کتابوں کے علاوہ خاص طور پر حدیث شریف کے وسیع ذخیرہ صحاح و مسانید و سنن کے مجموعوں کو ایک طرح سے کھنگال ڈالا ہے، اور ان سے اور فن جرح و تعدیل اور رجال و تراجم کی کتابوں سے بڑے پیمانے پر مدد لی ہے ۔ جو مذکورہ تینوں حصوں میں مشترک ہیں، چنانچہ یہاں ہم بہ ترتیب مذکور ان کی سیرت نبوی کے مصادر کا جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

۱۔ سیر و مغازی اور تاریخ کی کتابیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں جو شروع میں "المغازی" (یعنی غزوات اور جنگوں) کے نام سے مشہور ہوئیں، "درحقیقت آپ کے عہد رسالت کی تاریخ پر مشتمل تھیں"[۳۲] اگرچہ ان میں زیادہ زور غزوات و فتوحات کی تفصیلات جمع کرنے پر دیا گیا تھا - ان کی

۳۲؎ الدکتور عبد العزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، المطبعۃ الکاثولیکیۃ، بیروت، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۰

اخلاقی و تعلیمی اور تشریعی و ادار ی فطری ضرورتوں کے علاوہ آپ کی احادیث کی تدوین و تصنیف کی طرح
جمع و ترتیب کی وجہ بھی آپ کی
قابلِ تقلید نمونہ ذاتِ والاصفات سے مسلمانوں کا غیر معمولی تعلق، اسلامی مفاخر اور روحِ جہاد کو زندہ رکھنے کے قابلِ قدر جذبات بھی تھے اور
صدرِ اول ہی سے احادیث کے مجموعی ذخیرہ کے ساتھ ساتھ سیرت کی چھوٹی بڑی تمام تفصیلات کی جمع و ترتیب اور حفاظت کی فکر اور اس کے
اہتمام کی طرف مدینہ میں مسلمان علماء کی توجہ مبذول ہونا شروع ہو گئی تھی، چنانچہ آپ کی سیرت کے ابتدائی راویوں میں مشہور صحابہ کی اولاد اور
دیگر تابعین میں ابان بن عثمانؓ بن عفان (۲۰ - ۱۰۵ھ تقریباً)، عروۃ بن الزبیر بن العوام (۲۳ - ۹۴ھ) شرجیل بن سعد (وفات ۱۲۳ھ)
اور وہب بن منبہ (وفات ۱۱۰ھ) پہلے طبقہ کے مشہور علماء ہیں اور دوسرے طبقہ کے مشہور لوگوں میں عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (وفات ۱۳۵ھ)
عاصم بن عمر بن قتادہ (وفات ۱۲۰ھ) اور محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (وفات ۱۲۴ھ) ہیں، لیکن ان دونوں طبقوں کی مدون کتابیں ہم
تک نہیں پہنچ سکیں، بلکہ ان کی روایاتِ سیرتِ نبوی ان کے بعد کے تیسرے طبقہ کے بعض اہم مؤلفین کی کتابوں میں شامل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں،
جس کے اہم ارکان موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ) معمر بن راشد (وفات ۱۵۰ھ) محمد بن اسحٰق (وفات مابین ۱۵۰ - ۱۵۳ھ) جن کی سیرت
ابو محمد عبدالملک بن ہشام الحمیری (وفات ۲۱۸ھ) نے بروایت زیاد البکائی (وفات ۱۸۳ھ) حاصل کی اور اسی طبقہ کے افراد میں محمد بن عمر
الواقدی (وفات ۲۰۷ھ) اور ان کے شاگرد محمد بن سعد (وفات ۲۳۰ھ) کا بھی شمار ہے[۳۳]
سیرت نبوی کے مذکورہ راویوں اور مؤلفین میں سے ابن کثیر نے جن حضرات کی روایات و اقوال نام کے حوالوں کے ساتھ مستقل
طور پر بیان کئے ہیں، ان کا مختصر تعارف اور ابنِ کثیر کی سیرت میں ان کی اہمیت پر کچھ روشنی مندرجہ ذیل سطور میں ڈالی جائے گی اور ان کے
علاوہ دیگر مؤرخین اور ان کی کتابوں کا بھی ذکر آئے گا جن کے حوالے مذکورہ سیرت میں ملتے ہیں۔
اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس "مدنی اسکول" کا تذکرہ ناگزیر ہے، جو یکے بعد دیگرے تین نسلوں کی مسلسل اور مربوط کوششوں
سے وجود میں آیا تھا، یعنی عروۃ بن الزبیر، ان کے شاگرد ابن شہاب الزہری اور ان کے شاگرد موسیٰ بن عقبہ جو روایات کی تنقید و تحقیق
میں قابلِ تعریف قدرت و صلاحیت کے مالک تھے۔ ان پیشرو سیرت نگاروں نے اس فن کو محدثین کے طریقۂ کار کے مطابق اسناد کی رعایت
کرتے ہوئے پروان چڑھایا اور سیرت کے خدوخال متعین کئے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات بے وزن ہو جاتی ہے جو مغازی کے اصول عوامی
قصوں میں تلاش کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ابن کثیر خود اپنے علمی ورثہ اور انداز فکر سے اس طریقہ کے حامی اور پرستار تھے، چنانچہ ان
کا اس مدرسہ فکر کے افراد سے متاثر ہونا، جا بجا تحسین کرنا، ان کی روایات کو اپنی سیرت میں اہم جگہ دینا، بلکہ ترجیح دینا قرین قیاس ہے،
چنانچہ غزوۂ بدر کے مقتول مشرکین اور قیدیوں کی تعداد کے بارے میں واقدی کے اجماع کے دعویٰ کو صرف عروۃ اور موسیٰ کے اختلاف
کی وجہ سے ابن کثیر بلاتردد یہ کہتے ہوئے رد کر دیتے ہیں کہ "وہ دونوں اس میدان کے امام ہیں اور ان کے اتفاق کے بغیر اجماع
کا دعویٰ ناممکن ہے، اگرچہ ان کا قول صحیح حدیث کے مقابلہ میں مرجوح ہی کیوں نہ ہو"[۳۴]

---

۳۳ - محمد توفیق حسین، مقالہ: "عن سیرۃ النبی محمدؐ" کتاب ما ساھم بہ المؤرخون العرب فی المئۃ سنۃ الأخیرۃ فی دراسۃ التاریخ العربی ص۲۵-۲۶ - ۳۴ - ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۳۲۸

عروۃ ابن الزبیر (۲۳-۹۴ھ)[۳۵] مشہور محدث اور فقیہ اور فنِ مغازی کے مؤسس اور اس کے "اولین مصنفین" میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی مغازی کا کچھ حصہ بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین جیسے ابن اسحٰق، واقدی، طبری، ابن سید الناس اور ابن کثیر کی کتابوں کے ذریعے اقتباسات کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی بعثت، ابتدا، دعوت، قریش کی مخاصمت، ہجرت حبشہ و مدینہ، غزوات و سرایا، ملوک عالم کے نام مراسلت اور آپؐ کی زندگی کے آخری ایام کے علاوہ خلافت راشدہ کے زمانہ جنگ جمل تک کے بعض واقعات پر مواد جمع کیا تھا[۳۶] اور ابن کثیر کی تاریخ میں اموی زمانہ کے بعض تراجم تک ان کی روایات اور اقوال ملتے ہیں اور سیرت نبوی کے حصے میں قریش کے ہاتھوں کعبہ شریف کی تجدید سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تیلیس صفحات پر ان کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ جن میں اکثر غزوات و واقعات کی تاریخیں، ان میں شریک اشخاص کے ناموں کے بارے میں ان کے اقوال و اختیارات دوسرے مؤرخین کی تصدیق یا اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں اور ان کی روایات کم نقل کی گئی ہیں اور بعض جگہ ان کے مغازی کا حوالہ بھی دیا ہے[۳۷] لیکن ظاہر ہے کہ ان کی روایات و اقوال میں ابن کثیر کا اعتماد بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین پر تھا۔

ابن شہاب الزہری (۵۸-۱۲۴ھ) بھی محدث و فقیہ ہیں، انہوں نے عروۃ بن الزبیر کے علاوہ اپنے زمانہ کے نامی گرامی محدثین سے علم حدیث حاصل کیا، مدنی روایات و احادیث کی وسیع پیمانے پر تلاش و تحقیق کی، اور قوی یادداشت کے باوجود جو کچھ سنا اس کو لکھا، انہوں نے سب سے پہلے اپنے مغازی کو نہ صرف یہ کہ "سیرۃ" کا نام دیا، بلکہ اس فن کو متعین شکل و صورت اور واضح دائرہ کار عطا کیا۔ جس کی صرف خانہ پری بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین کے ذمہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق، واقدی، طبری، بلاذری، ابن سید الناس ابن کثیر وغیرہ کی کتابوں میں ان کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس میں بعض سابق انبیاء کرام علیہم السلام سے متعلق روایات کے علاوہ رسالت سے پہلے آپؐ کی زندگی سے متعلق بعض معلومات، نسب اور بعض دلائل نبوت بیان کرنے کے بعد، ابتداء وحی، مکی زندگی کے اہم واقعات ہجرت حبشہ، قریش کا مقاطعہ، ہجرت مدینہ، غزوات و سرایا، سفارات، وفود کی آمد، آپؐ کی بیماری اور وفات سے متعلق معلومات کے ساتھ خلافت راشدہ کے زمانہ کے حالات کو عروۃ سے زیادہ تفصیل سے جمع کیا ہے اور اموی خلفاء کی عمر اور

---

[۳۵] ایضاً بحوالہ واقدی ۹/۱۰۱، السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ تحقیق و تعلیق فرانز روزنتال، عربی ترجمہ اور مقدمہ صالح احمد العلی، مطبعۃ العانی، بغداد ۱۳۸۲ھ ص ۱۵۹، حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، وکالۃ المعارف استنبول ۱۳۶۰-۱۳۶۲ھ۔ ۲/۱۷۴۷۔

[۳۶] ان کے تاریخی مقام و مرتبہ ان کی مغازی کے مکتوبات اور نمونوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری کی کتاب بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص ۲۱-۲۲ ص ۶۱-۶۷ اور ص ۱۳۷-۱۴۲۔

[۳۷] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۴۱، ۵/۲۵۴، ۲۵۵

مدت حکم کے بارے میں کچھ معلومات طبری میں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں تاریخی تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے[۵۸] بعض واقعات و غزوات کی تاریخیں بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اسناد کا التزام کیا ہے اور ایک واقعہ کے بارے میں مختلف تاریخی روایات کا احادیث سے مقابلہ کر کے ان میں توافق پیدا کرنے اور ان کو ایک سیاق میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے[۵۹]۔ اس طرح ان کا یہ کارنامہ محدثین کی احتیاطی پابندیوں اور پیش بندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ صرف ترقی کی جانب ایک قدم تھا، جس نے فن تاریخ میں واقعات نگاری کے ایک نئے اسلوب کو جنم دیا، بلکہ حقیقتاً انہوں نے مدینہ میں تاریخی اسکول کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں قائدانہ کردار انجام دیا۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی میں عروۃ کے مقابلہ میں زہری کی روایات زیادہ بیان کی گئی ہیں، چنانچہ ان کا حوالہ آپؐ کے نسب شریف سے لے کر انتہائے سیرت میں خدمت گاروں کے تذکرے تک پچپن[۶۰] صفحات پر ملتے ہیں اور یہ روایات زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور غزوات سے متعلق ہیں اور ان میں وہ روایات بھی ہیں جو سیرت ابن ہشام میں ذکر نہیں کی گئی ہیں[۶۱]، جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر سیرت نگاروں، مورخین اور محدثین سے حاصل کی گئی ہیں۔ اگرچہ ابن کثیر نے دوبار زہری کی "سیر" (سیرت) کا حوالہ دیا ہے، لیکن پہلی بار سہیلی اور دوسری بار یعقوب بن سفیان کی روایت سے[۶۲] اور دیگر روایات کے تتبع سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحٰق، امام بخاری اور بیہقی کے واسطہ سے لی گئی ہیں، اور باقی کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

موسیٰ بن عقبہ (۵۵-۱۴۱ھ) مدنی مدرسہ کے تیسرے رکن ہیں، جنہوں نے اپنے استاد زہری کے علمی ورثہ کو آگے بڑھایا اور دیانتداری اور باریک بینی سے مدنی مکتب فکر کے اسلوب کی پیروی کی، اور اپنے پیشروؤں سے زیادہ اسناد کا التزام اور واقعات کی تاریخوں کا اہتمام کیا، انہوں نے زہری کی مؤلفات کے مکتوب مواد خاص کر دستاویزی معلومات، اور زبانی روایات سے بھی استفادہ کیا، لیکن تحریری مواد تک میں کتاب کے بجائے راوی پر اعتماد کیا۔ ان کی مغازی کے اقتباسات بھی ابن اسحٰق، واقدی، طبری، ابن سید الناس اور ابن کثیر کے ہاں ملتے ہیں، جس کو ان کے بھتیجے اسمٰعیل بن ابراہیم بن عقبہ (وفات ۱۵۸ھ) نے روایت کیا[۶۲]، جس کی بعد کے علماء نے بڑی تعریف و تحسین کی[۶۳]،

۵۸؎ ان کے تاریخ مقام و مرتبہ، ان کے مغازی کے محتویات اور نمونوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری کی کتاب بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص ۲۳-۲۵، ص ۷۶-۱۰۲ اور ص ۱۴۳-۱۵۱۔

۵۹؎ الدکتور جواد علی، مقالہ "موارد تاریخ الطبری"، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱/۱ ذوالقعدۃ ۱۳۶۹ھ ص ۱۵۴ اور ۳/۱ ۱۳۷۳ھ ص ۳۹-۴۰

۶۰؎ الدکتور عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص ۱۱

۶۱؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۹۶، ۳۰۰ ۶۲؎ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۳۷۷ھ، ۵/۲۱۸

۶۳؎ ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد، ۱۳۷۱-۷۲ھ، ۱۹۵۲-۵۳ء جلد ۴ جز ۱، ص ۱۵۴، ابن حجر، تہذیب التہذیب دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۳۲۵-۲۷ھ ۱۰/۳۱۶، حاجی خلیفہ کشف الظنون ۲/۱۷۴۷، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، ص ۲۷، جواد علی، موارد تاریخ الطبری مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ۱/۳، ۱۳۷۳ھ ص ۱۴

اور کئی صدیوں تک متداول رہی، چنانچہ خود ابن کثیر کے استاد شمس الدین ابو عبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) نے اس کو "ابونصر الفارسی سے مزّہ (دمشق) میں پڑھا"[۴۴] اور عصر حاضر میں الویس سپرینگر (ALOYS SPRENGER) کے بیان کے مطابق دمشق میں ان کو اس کے مخطوطہ کی موجودگی کی اطلاع دی گئی تھی لیکن وہ اس کو دیکھ نہیں سکے[۴۵] جس کی وجہ سے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب خود ابن کثیر کی دسترس سے دور نہ رہی ہوگی۔ چنانچہ ان کی روایات و اقوال کا ابن کثیر نے ایک سو تیس صفحات پر حوالہ دیا اور عروہ اور زہری کی جا بجا بکھری ہوئی معلومات کے مقابلہ میں موسیٰ کی مغازی سے زیادہ مرتب انداز میں پابندی کے ساتھ ابن اسحٰق کی روایات کی تکمیل یا ان سے اختلاف یا زیادتی و کمی واضح کرنے کے لئے مفصل روایتیں از ابتداء تا انتہا سیرت نقل کی ہیں اور بعض جگہ تو موسیٰ کی روایات کو ابن اسحٰق پر مقدم رکھا ہے[۴۶]۔ اس طرح موسیٰ بن عقبہ کی مغازی ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل دینے والی اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔

محمد ابن اسحٰق (وفات ۱۵۱ھ) مدنی اسکول کے ایسے نمائندہ ہیں جنہوں نے محدثین اور وہب بن منبہ (۳۴-۱۱۰ھ) جیسے قصہ گو حضرات کے مواد اور اسلوب کو جمع کرنے کی پہلی کوشش کی، چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور سیرۃ میں احادیث، تاریخی روایات، اسرائیلیات، عوامی قصوں اور صحیح و موضوع شعر کو مبالغہ کے عنصر کے ساتھ جمع کیا، جس کی وجہ سے فطری طور پر مدینہ میں ان پر سخت تنقید ہوئی۔ لیکن کوفہ و بصرہ کے اخباری مدرسہ تاریخ میں اس کو وہاں کے رجحانات سے میل کھانے کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا گیا اور پھر ابن ہشام کی تہذیب و تنقیح کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے محدثین نے بھی اپنی رائے بدل دی اور اس کو نہ صرف استحسان کی نظر سے دیکھا، بلکہ اس کی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سیرت و تاریخ کی کتابوں کے بنیادی مصدر کی حیثیت سے استعمال کیا۔

ابن اسحٰق کی یہ سیرت اپنے مواد کے لحاظ سے درحقیقت ایک عام تاریخی کتاب معلوم ہوتی ہے، جس کے عام طور پر تین حصے بتائے جاتے ہیں:-

۱۔ المبتدأ:- یعنی سابق انبیاء و رسل علیہم السلام کی تاریخ از ابتداء آفرینش اور اس ضمن میں یمن کی تاریخ، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل اور دور جاہلیت کے عرب قبائل اور ان کے بتوں کے تذکرہ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد اور اہل مکہ کی دینی اور مذہبی رسوم و رواج کا بھی ذکر کیا ہے۔

۲۔ المبعث:- یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تا ہجرت مدینہ۔

۳۔ المغازی:- یعنی مدینہ میں آپ کی حیات طیبہ تا وفات جس میں آپ کے غزوات و سرایا وغیرہ کا بیان بھی ہے اور ان آخری دو حصوں میں اول اسلام لانے والے مہاجرین و انصار، شرکائے غزوات اور ان میں مقتولین اور قیدیوں کے اسماء کی فہرستیں بھی ترتیب دی گئی ہیں۔ نیز پہلے حصہ میں روایات شاذ و نادر سند سے بیان کی گئی ہیں، جبکہ دوسرے اور تیسرے حصہ میں

---

[۴۴] الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد ۱۳۳۳-۱۳۳۴ھ، ۱۴۰/۱۔

[۴۵] یوسف ہوروٹس، المغازی الاولی و مؤلفوھا، عربی ترجمہ حسین نصار، مطبعۃ الحلبی مصر ۱۳۶۹ھ، ص ۷۔

[۴۶] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/ ۴۶، ۴۸۔

سند کا اہتمام کیا گیا ہے[47]۔ اور ڈاکٹر جواد علی ان کی تاریخ الخلفاء کو بھی اسی کتاب کا آخری حصہ شمار کرتے ہیں، جو آپؐ کے بعد کے خلفاء کی تاریخ پر مشتمل تھی[48]۔

بدقسمتی سے اس کتاب کے بیشتر حصے ضائع ہو گئے، سوائے ان روایات کے جو بعد کے مفسرین و محدثین اور مؤرخین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔ خاص کر سیرت پاک کا بیشتر حصہ ابن ہشام کی مشہور سیرت میں زیاد البکائی کی روایت سے محفوظ ہوا اور طبری نے اپنی تاریخ و تفسیر میں انبیاء سے متعلق اکثر معلومات کو محفوظ کیا۔ جیسے کہ ابوالولید الازرقی نے مکہ مکرمہ سے متعلق معلومات کو محفوظ کیا اور کہا جاتا ہے کہ آخر زمانہ میں ان کی مذکورہ کتاب کا مکمل نسخہ دریافت ہوا ہے، جس کو اشاعت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے[49]۔

بہرحال جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ابن اسحٰق کی غیر محتاط روش کی وجہ سے ان کی سیرت ابتداً میں محدثین کی تنقید اور اعتراض کا نشانہ بنی لیکن بعد میں ابن ہشام کے ہاتھوں تہذیب و تنقیح کے بعد دھیرے دھیرے ان کی طرف محدثین کا رویہ نرم ہوتا گیا اور ان کی روایات کو سند کا درجہ حاصل ہوتا گیا۔ چنانچہ خود ابن کثیر جیسے محدث و ناقد سیرت نگار بھی نہ صرف اس سیرت سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ اس کو "منارۂ نور" اور قابل فخر کارنامہ" کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور اس کے مصنف کے بارے میں امام شافعیؒ کی رائے بار بار دہراتے ہیں کہ "فن مغازی میں سب لوگ ابن اسحٰق کے احسان مند ہیں[50]۔" انہوں نے ابن اسحٰق کی روایات و اقوال ما قبل اور ما بعد سیرت نبوی بھی ۱۲۴ھ تک بیان کئے ہیں لیکن ان کو حقیقی مصدر کا اولیں مقام سیرت نبوی کے حصہ میں دیا ہے، بلکہ ان سے اپنی سیرت کا خاکہ حاصل کیا۔

ان کی روایات کو دیگر سیرت نگاروں اور مؤرخین کی روایات پر ترجیح دی ہے اور اپنی سیرت کی بنیاد بنایا ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحات پر ان کے لاتعداد حوالے دیے ہیں اور بعض جگہ ان سے مکمل فصلیں کی فصلیں نقل کی ہیں اور پھر دوسرے مصادر حدیث و سیرت و تاریخ سے اس پر اضافہ کیا ہے۔

یہاں ابن اسحٰق کے مشہور شاگردوں اور ان کی سیرت کے راویوں میں زیاد بن عبداللہ البکائی (وفات ۱۸۳ھ) اور یونس بن بکیر (وفات ۱۹۹ھ) کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جن میں سے اوّل الذکر زیادہ موثوق ہیں[51] اور ان ہی کی روایت سے ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی مذکورہ سیرت کو حاصل کیا تھا۔ لیکن ان کی خود کوئی تصنیف نہ تھی، بہرحال ان کی روایات بعد کے مؤرخین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں

---

[47] ابن الندیم، الفہرست، المطبعۃ الرحمانیہ، القاہرۃ ۱۳۴۸ھ، ص ۱۳۶۔ محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمدؐ" کتاب ما ساھم بہ المؤرخون العرب فی المئۃ سنۃ الاخرۃ ص ۲۶، عبدالعزیز الدوری "بحث فی نشأۃ علم التاریخ" ص ۲۷-۳۰

[48] ڈاکٹر جواد علی "موارد تاریخ الطبری"، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ج ۱، شمارہ ۱۔ ذوالقعدۃ ۱۳۶۹ھ ص ۲۰۶۔

[49] محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمدؐ"، کتاب ما ساھم بہ المؤرخون العرب الخ ص ۲۶

[50] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ۔ ۳/۹۵، ۴/۹۳، ۱۴۹، ۱۰/۱۰۹

[51] السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ ص ۱۵

ملتی ہیں۔ جن سے خود ابن کثیر نے صرف بارہ دفعہ ان کے نام کے حوالے کے ساتھ روایات نقل کی ہیں[۵۲]۔

لیکن یونس بن بکیر جو خود صاحب مغازی تھے[۵۳]۔ اور ان کی اکثر روایات بھی ابن اسحٰق سے مروی تھیں، ابن کثیر نے ان سے اول الذکر کے مقابلہ میں بہت زیادہ اخذ کیا ہے۔ چنانچہ سیرت پاک کی ابتدا سے انتہا تک ستر صفحات پر ان کے حوالے دیئے ہیں۔ جن میں بعض جگہ ان کی مغازی یا سیرۃ ابن اسحٰق پر "زیادات[۵۴]" (اضافوں) کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لیکن ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ان کی روایات کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی روایات براہِ راست ان کی مغازی سے حاصل نہ کر سکے، چنانچہ ایک جگہ سہیلی کے حوالے کی وضاحت بھی ملتی ہے[۵۵]۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی روایات کا ماخذ بھی دیگر سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، کیونکہ مذکورہ تمام روایات سہیلی کے ہاں بھی نہیں ملتیں۔

اسی ضمن میں ابن ہشام (وفات ۲۱۸) کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ جنہوں نے ابن اسحٰق کی مذکورہ سیرت کو زیاد البکائی کی روایت سے اخذ کر کے اس کی نامناسب روایات اور غیر ثابت شدہ اشعار کو حذف کر دیا۔ فروگذاشتوں کی تصحیح کی اور نامکمل بیانات کا اضافہ کیا اور اس نئی ترتیب و تہذیب و تنقیح کے ذریعہ اس کو محدثین کے لئے قابلِ قبول بنا دیا۔ اس طرح حقیقتاً اس سیرت کو ابن اسحٰق اور ابن ہشام کی مشترکہ تصنیف کہا جا سکتا ہے، جس کو دائمی شہرت اور عام قبولیت کے ساتھ ساتھ وہ سند اعتماد و امتیاز نصیب ہوئی، جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ کبھی کم نہ ہوئی، بلکہ سیرت پاک کے قابلِ اعتبار قدیم ترین مرجع و مصدر کی حیثیت سے اس کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ یہ کتاب بار بار چھپتی رہی ہے۔ مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی کی تحقیق و تشریح اور فہارس کے ساتھ اس کا قیمتی نسخہ ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔

ابن کثیر نے بھی اپنے سیرت پاک کے حصہ میں اس عظیم الشان سیرت سے بھرپور استفادہ کیا اور ابن اسحٰق کے مجمل بیانات کی تفصیل، مبہم مقامات کی توضیح اور متروک معلومات کی تکمیل کے لئے ایک سو اکیاسی (۱۸۱) صفحات پر اس کے حوالے دیتے ہوئے اس کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا، ان کے ملاحظات سے فائدہ اُٹھایا اور ان کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور ان کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی ہے۔ اور ابن ہشام کے اعتراض کی وجہ سے ابن اسحٰق کے بیان کردہ بہت سے قصائد کو ابن کثیر نے مکمل نقل نہیں کیا ہے۔ جیسے غزوۃ الابواء کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ کا قصیدہ اور اس کے جواب میں الزبعری کا قصیدہ مکمل نقل کرنے سے اس لئے گریز کیا ہے کہ ابن ہشام نے ذکر کیا ہے کہ اکثر علمائے شعر ان دونوں قصائد کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں ان کے چچا ابو طالب کے قصیدہ کے بارے میں نہیں مانی ہے، بلکہ اس کو بہت تعریف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح ان کے

---

[۵۲] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۳۰۵/۲، ۵۰/۳، ۶۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۹، ۱۳۴، ۲۲۲، ۲۲۳، ۳۲۰، ۲۹۱/۴

[۵۳] الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲۹۹/۱، الیافعی، مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد ۱۳۳۷-۱۳۳۹ھ، ۴۶/۲

[۵۴] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۲۵/۳، ۳۳۲/۴، ۲۸۲/۶

[۵۵] ایضاً، ۱۲۵/۳، اور السہیلی، الروض الانف، مطبعۃ الجمالیۃ، مصر ۱۳۳۲ھ، ۲۵۸/۱

اُعشٰی بن قیس کے حرمتِ خمر کی وجہ سے اسلام سے اعراض کے قصہ کو ہجرت سے پہلے رکھنے پر اعتراض کیا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک مدینہ میں غزوۂ احد اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد خمر کی حرمت پر اجماع ہے، اسی طرح جعفر بن ابی طالبؓ اور معاذ بن جبل کے درمیان مؤاخاۃ کے قصہ پر شک کا اظہار کیا ہے، کیونکہ جعفرؓ فتح خیبر کے بعد مدینہ تشریف لائے تھے[۵۶] بہر حال یہ اور اس طرح کے دوسرے اعتراضات کے باوجود (کہ جن سے ابن کثیر کی معلومات کا کوئی مصدر نہیں بچ سکا ہے) یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ابن کثیر کی سیرت کی تشکیل میں ابنِ ہشام کا مرتبہ بھی ابن اسحٰق کے ہم پلہ ہے۔

اور سیرۃ ابنِ ہشام کے ضمن میں اس کی مشہور شرح الروض الأنف کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جو ابو القاسم عبد الرحمٰن السہیلی (۵۰۸ - ۵۸۱ھ) کی تالیف ہے اور ابن کثیر اس کی حسنِ ترتیب، واضح اسلوب بیان اور اس کے مصنف کی ذہانت، صلاحیت اور طباعی کے قائل تھے[۵۷] اسی لئے سیرۃ ابن ہشام پر ان کے اضافوں، استدراکات، ملاحظات اور دیگر مفید معلومات سے وسیع پیمانے پر فائدہ اٹھایا ہے، ان کے حوالے اکسٹھ[۶۱] صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جن میں کئی بار ان کی مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت ملتی ہے[۵۸]

بہر حال ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ابن اسحٰق اور ابن ہشام کے بعد السہیلی کے اہم مقام و مرتبہ کے باوجود ابن کثیر ان کی تمام آراء سے اتفاق نہیں کرتے، چنانچہ نجاشی کی وفات سہیلی کی طرح ۹ھ میں نہیں، بلکہ ۸ھ میں مانتے ہیں اور تاریخ اسلامی کی ماہِ ربیع الاوّل سے ابتداء کے سہیلی کے خیال کو رد کرتے ہوئے ماہِ محرم سے تسلیم کرتے ہیں اور آیت کریمہ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ ...... الخ سہیلی کی طرح مسجدِ قباؔ پر نہیں بلکہ مسجدِ نبوی پر محمول کرتے ہیں اور اسراء کے واقعہ کے ساتھ سہیلی کے اذان کے ذکر کو غلط تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس کی مشروعیت پہلے سال ہجری میں ہوئی ہے اور جبریل کے گھوڑے کے "حیزوم" نام سے اتفاق نہیں کرتے اور متعہ کی تین بار حرمت اور اباحت کو بعید سمجھتے ہیں اور صلاۃ الفتح کی آٹھ رکعت کو ایک سلام کے بجائے ہر دو رکعت پر سلام کے قائل ہیں[۵۹] بہر حال تحقیق و تنقید کے میدان میں ان اختلافی آرا سے اُن کی شخصیت مجروح نہیں ہوئی ہے، بلکہ معلومات کے سرچشمہ کی حیثیت سے ان کی اہمیت برقرار رہی ہے۔

مدینہ کے محافظ مدرسہ سیرت و تاریخ اور ابن اسحٰق کی نسبتاً آزادانہ روش کی طرف اشارہ کے بعد واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد کا تذکرہ ضروری ہے جن کے ہاتھوں اس فن کے آخری خدو خال متعین ہوئے، اور بعد کے لوگوں نے ان کی پیروی کی۔

محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰ - ۲۰۷ھ) جنھوں نے ابن اسحٰق کے مقابلہ میں زیادہ احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے زمانہ کے محدثین کے محافظ مکتب فکر کو مطمئن نہ کر سکے، لہٰذا ان کو حدیث میں ضعیف گردانا گیا، لیکن سیرت و مغازی اور فتوح و فقہ میں ان کو قابلِ اعتبار سمجھا گیا[۶۰] چنانچہ ان کی مغازی جو مدنی عہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، جس کی معلومات اور اسلوب میں وہ ابن اسحٰق کے مقابلہ میں

---

[۵۶] ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۴۴، ۵۷، ۱۰۲، ۱۰۳، ۲۲۷۔

[۵۷] ایضاً ۲/۱۸۳، ۱۲/۳۱۸۔ [۵۸] ایضاً ۲/۲۹۷، ۳/۲۲۰، ۳۴۱، ۵/۲۵۶، ۲۸۱۔

[۵۹] ایضاً ۳/۷۸، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۲۳، ۲۸۱، ۴/۱۹۲، ۳۰۰۔

[۶۰] یوسف ہورووِتس، المغازی الأولیٰ ومؤلفوھا ص ۱۲۳-۱۲۴

زیادہ وقتِ نظر کا ثبوت دیتے ہوئے مدنی مدرسہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے اپنے موضوع کا خاکہ پیش کرکے تفصیلات بیان کرتے ہیں، اپنی معلومات کے بنیادی مصادر اور غزوات کی فہرست فراہم کرتے ہیں، غزوات کی تاریخیں متعین کرتے ہوئے آپؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں متعین اُمراُ کے نام دیتے ہیں، پھر ان غزوات کے واقعات تاریخی تسلسل سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اسناد کے التزام تاریخوں کی تحقیق، اشعار کے اقتباس اور عوامی قصوں سے اجتناب میں ابن اسحٰق سے زیادہ محتاط ہیں[۶۱]۔ چنانچہ واقعات و غزوات کی تاریخوں اور اماکن و اشخاص کے تعین میں ان پر زیادہ اعتبار کیا جاتا ہے۔

ابنِ کثیر بھی ان کو تاریخ کے میدان کے بڑے اماموں میں شمار کرتے ہیں[۶۲]۔ اور ان کی قدردانی میں بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ سیرت نبوی کے مغازی کے حصہ میں ان کی روایات و اقوال ابن اسحٰق کی روایات کے درمیان بکثرت نقل کرتے ہیں، اسی طرح ان کے حوالے سے امہات المؤمنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، غلاموں و لونڈیوں، خدام، محررین اور شمائل و دلائل تک کی فصلوں میں بہت سی معلومات دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، لیکن بظاہر ابنِ کثیر کو ان سے براہ راست استفادہ کا موقعہ نہ مل سکا، صرف ایک جگہ کتاب الردۃ[۶۳] کا حوالہ آیا ہے، لیکن ان کی مغازی اور فتوح الشام وغیرہ کا کہیں ذکر تک نہیں کیا ہے اور ان روایات کے تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ ابن کثیر نے ان کی روایات "تاریخ طبری سے کم اور بیہقی کی دلائل النبوۃ سے زیادہ تر حاصل کی ہیں۔

محمد بن سعد (۱۶۸-۲۳۰ھ) جو کاتبِ واقدی کے نام سے بھی مشہور ہیں، ان تصنیفات میں ایک کتاب اخبار النبی (علیہ الصلاۃ والسلام) بھی ذکر کی گئی ہے[۶۴] جو غالباً طبقات ابن سعد کی ابتدائی دو جلدوں میں شائع شدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال ابن اسحٰق کی سیرت (یا سیرۃ ابن ہشام) کے بعد یہ دوسری سیرت ہے جو ہم تک مکمل پہنچی ہے۔ اور اس میں انہوں نے سیرت نبوی کے خاکہ کے آخری خد و خال متعین کئے ہیں اور واقدی سے زیادہ اپنی معلومات کی ترتیب اور تنظیم، دستاویزات کا زیادہ مکمل مجموعہ اور ملوک عالم کے نام آپؐ کے بھیجے ہوئے پیغامات اور قاصدین کی تفصیلات فراہم کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے ماقبل بعثت تاریخ میں ان انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ بھی بیان کی ہے جن کا آپ کی رسالت سے رشتہ ہے، پھر آپ کے آباؤ اجداد کے ذکر کے بعد آپ کے بچپن کے حالات، بعثت سے قبل و مابعد آپ کی نبوت پر شاہد علامات اور آپ کی دعوت کے ابتدائی حالات تا ہجرت مدینہ بیان کئے ہیں اور مدنی عہد میں آپ کے احکامات، عرب وفود کی آمد، آپ کے اخلاق، طریقہ زندگی، غزوات وفات، تجہیز و تکفین و تدفین، میراث وغیرہ کے متعلق معلومات مرتب کرنے کے بعد اور مراثی جمع کر دیئے ہیں۔ اور انہوں نے آپ کے شمائل و فضائل و دلائل کی بھی وسیع معلومات فراہم کیں جو بعد میں شمائل و دلائل کے ادب کے لئے نمونہ قرار پائیں[۶۵]۔

---

[۶۱] عبدالعزیز الدوری بحث فی نشاۃ علم التاریخ عند العرب ص ۳۱-۳۲۔ جواد علی، موارد تاریخ الطبری ۳/۱، ۱۳۷۳ھ ص ۴۱-۴۲۔

[۶۲] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۳۴-۲۳۵۔ [۶۳] ایضاً ۴/۱۹۔ [۶۴] ابن الندیم، الفہرست ص ۱۴۵۔

[۶۵] یوسف ہوروفتس، المغازی الاولی ومؤلفوہا، ص ۱۲۷-۱۲۸، محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمد"، کتاب ماساہم بہ المؤرخون العرب، ص ۷۲، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشاۃ علم التاریخ عند العرب ص ۳۲ جواد علی موارد تاریخ الطبری ۳/۱ ۱۳۷۳ھ ص ۴۲۔

بہرحال توقع کے برخلاف ابن کثیر نے ان سے زیادہ استفادہ نہیں کیا، حالانکہ ابن کثیر اور ابن سعد کی سیرتوں کا خاکہ ایک دوسرے سے بہت ملتا جلتا ہے، لیکن ابن کثیر نے ان کے صرف تیئیس صفحات پر حوالے دیئے ہیں، جن میں سے بعض روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، پیدائش، سفر شام، تحویل قبلہ، شرکائے غزوۂ بدر صحابہ کرام، فتح مکہ اور وفات سے متعلق ہیں اور زیادہ امہات المؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، غلاموں، خدام، محررین اور دیگر صحابہ کے تراجم میں پائی جاتی ہیں اور شمائل میں صرف تین بار ان کا حوالہ ہے، جبکہ دلائل میں ان کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔

سیرت کے ان ابتدائی اہم مصادر کے بعد اب ان دیگر مصادر سیرت کا سن وار تذکرہ کیا جائیگا، جن کے کم و بیش حوالے ابن کثیر نے دیئے ہیں۔

سیف بن عمر التیمی (وفات ۱۸۰ھ) عراقی مدرسۂ تاریخ کے مؤلفین میں شمار ہوتے ہیں، اور پہلے درجہ میں اپنے قبیلہ تمیم کی روایات سے استفادہ کرتے ہیں، ان کی سیرت پر مستقل کوئی کتاب بیان نہیں کی گئی ہے لیکن بعد کے واقعات پر ان متعدد کتابیں بتائی جاتی ہیں[۶۶]۔ وہ اگرچہ اکثر مؤرخین و محدثین کے نزدیک ضعیف شمار کئے گئے ہیں[۶۷] لیکن ابن کثیر نے طبری کی تقلید میں واقدی اور مدائنی (۱۳۵-۲۲۵ھ) جیسے مؤرخین کی روایات کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد اور فتوحات میں ان کی روایات طبری سے نقل کی ہیں، لیکن سیرت کے حصہ میں ابن کثیر نے ضمنی طور پر اُن کی جو روایات مسیلمہ کذاب کے قتل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور امہات المؤمنین کے بعد تراجم میں بیان کی ہیں[۶۸]، وہ "تاریخ طبری" میں نہیں ملتیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مصادر تاریخ سے ماخوذ ہیں۔

ہیثم بن عدی (۱۱۴-۲۰۷ھ) تاریخ و انساب کے مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان پر عدم تحقیق اور استاد کے بارے میں تساہل برتنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ بہرحال پچاس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں[۶۹]، جن میں سے، یہاں قابل ذکر عام تاریخ میں کتاب التاریخ علی السنین (سن وار تاریخ) انساب میں تاریخ الاشراف الکبیر اور اسلامی فرقوں کی تاریخ میں کتاب الخوارج ہیں اور اس آخری کتاب کو ابن کثیر نے "بہترین کتاب"[۷۰] قرار دیا ہے، اور خوارج کے بیان میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے[۷۱]، لیکن سیرت کے حصہ میں ان کے واسطہ سے صرف دو روایتیں کسی کتاب کے حوالے کے بغیر بیان کی ہیں[۷۲]۔

---

۶۶ ابن الندیم، الفہرست، ص۱۳۷، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، ص۳۷۔

۶۷ ابن حجر، تہذیب التہذیب ۴/۲۹۵، جواد علی، موارد تاریخ الطبری، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۷۳ھ ۱/۳ ص۱۴۸۔

۶۸ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۹، ۵/۲۵۶، ۲۶۲، ۲۷۱، ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۰۶

۶۹ ابن الندیم، الفہرست ص۱۴۶، ان کی کتابوں کے اقتباسات کے عنوانات کے لئے دیکھئے عبدالعزیز الدوری۔ بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص۴۲-۴۳، حاشیہ ۵۔

۷۰ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۷/۳۰۶۔

۷۱ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ ۷/۲۷۳-۳۲۸

۷۲ ایضاً ۳/۲۸، ۵/۳۰۷

ابن عائذ الدمشقی (۱۵۰ - ۲۳۳ھ) شرکائے غزوۂ بدر کے سلسلہ میں واقدی کے اقوال نقل کرتے ہوئے ابن کثیر نے صرف آٹھ بار ان کا حوالہ دیا ہے، جس میں ایک بار ان کی مغازی کی کتاب کی وضاحت بھی کی ہے، لیکن اس سے اپنی سیرت میں بالکل کام نہیں لیا ہے، شرکاء بدر کے علاوہ اس کا صرف ایک بار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں حوالہ ملتا ہے[43]۔

خلیفہ بن خیاط (وفات ۲۴۰ھ) محدث و مؤرخ و نسابہ کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کی تصنیفات میں تاریخ کے دس اجزاء اور طبقات کے آٹھ اجزاء بتائے جاتے ہیں[44]، اور خود ابن کثیر ان کو تاریخ کے اماموں میں شمار کرتے ہیں[45]، لیکن نہ ان کے حالات زندگی میں ان کی کسی تصنیف کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ان کے اقوال و روایات بیان کرتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ انھوں نے سیرت نبوی کے حصہ میں صرف چودہ صفحات پر ان کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر غزوات و فتوحات کی تاریخوں کے تعین اور اعیان کی تاریخ اور مکانِ وفات اور عمر کی تحدید وغیرہ میں بیان کئے ہیں، جو بظاہر دیگر مؤرخین سے حاصل کئے گئے ہیں۔

سعید بن یحییٰ الاموی (وفات ۲۴۹ھ) بھی صاحبِ مغازی ہیں۔ انھوں نے اپنے باپ یحییٰ بن سعید بن ابان (وفات ۱۹۴ھ) اور چچا سعید سے علمِ حدیث حاصل کیا[46]۔ ان کے باپ ابن اسحٰق کے خاص شاگردوں میں تھے، انھوں نے ان سے نہ صرف فن مغازی حاصل کیا، ان کی کتابیں روایت کیں، بلکہ اس فن کو پروان چڑھایا، اس میں اضافہ کیا اور فتنۂ ارتداد اور غزوات پر دو کتابیں بھی لکھیں[47]۔ اس طرح سعید بن یحییٰ کو اپنے خاندان سے فن مغازی اور اس کا کثیر مواد ورثہ میں ملا، جس سے انھوں نے اپنی مغازی ترتیب دی اور اس کو ہمارے سیرت نگار نے خود بھی دیکھا تھا اور بیالیس صفحات پر بکھرے ہوئے اس کے حوالوں سے سیرت نبوی خاص کر غزوۂ بدر و احد میں وہ روایتیں، اقوال اور اشعار اخذ کئے جو ان کو سیرۃ ابن اسحٰق میں نہ مل سکے اور بعض جگہ اس کو "مغازی" یا "السیرۃ" کے نام سے یاد کیا ہے[48]۔ ابن کثیر کی البدایۃ و النہایۃ میں اموی کی خاص روایات ماقبل سیرت بھی بیان کی گئی ہیں، اسی طرح مابعد سیرت بھی دو ایک روایات مل جاتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مغازی بھی عام تاریخی کتابوں کے انداز پر مرتب ہوئی تھی۔

---

[43] ابن کثیر ۳/۳۱۵، ۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۱-۳۲۳، ۳۲۵، ۵/۳۰۷

[44] الذہبی تذکرۃ الحفاظ، ۲/۲۲، ابن خلکان، وفیات الاعیان و أنباء أبناء الزمان، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ القاہرۃ، ۲/۱۴، حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۱/۲۹۳، ۲/۱۰۹۹، الزرکلی، الاعلام، الطبعۃ الثانیۃ مطبعۃ کوستاتسوماس و شرکاہ ۱۳۷۳-۷۸ھ، ۲/۳۶۱۔

[45] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۳۲۲۔

[46] البغدادی، تاریخ بغداد، مطبعۃ السعادۃ القاہرۃ، ۱۳۴۹ھ، ۹/۹۰، الذہبی تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۹۸، الذہبی، میزان الاعتدال، مطبعۃ السعادۃ القاہرۃ، ۱۳۲۵ھ، ۳/۲۳۰، ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۴/۷۹

[47] ابن الندیم، الفہرست، ص۱۳۶، ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ۱/۳۴۱، یاقوت الحموی معجم الادباء، مطبعۃ المامون القاہرۃ ۱۳۵۵-۵۷ھ، ۱۸/۹، جواد علی مقالہ "موارد تاریخ الطبری"، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۸۰ھ ج۸، ص۴۳۴۔

[48] ابن کثیر، البدایہ والنہایۃ ۳/۳۱۵، ۳۳۹، ۴/۳۰

الزبیر بن بکار (۱۷۲-۲۵۶ھ) انساب و تاریخ کے عالم اور صاحبِ کتب مصنف تھے[۷۹]، ابن کثیر نے ان سے خاص کر عربوں اور قریش کے انساب سے متعلق معلومات حاصل کیں، لیکن سیرت نبوی میں صرف بارہ دفعہ ان کا حوالہ ملتا ہے اور وہ روایات و اقوال آپ کی ولادت والدین کی وفات، مقتولین غزوۂ اُحد اور حضرت خدیجہ سے آپؐ کی اولاد سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد عباسی تراجم میں ۲۵۵ھ تک ان کے اقوال و روایات ملتے ہیں، لیکن کہیں بھی ان کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، البتہ سہیلی کی روایات کے ضمن میں ان کی چند روایات[۸۰] سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سہیلی اور دیگر مؤرخین کے واسطہ سے ابن کثیر نے ان کی روایات اَخذ کی ہیں۔

یعقوب بن سفیان الفسوی (وفات ۲۷۷ھ) ایران نژاد بڑے حفاظ حدیث میں سے تھے اور ان پر حضرت عثمانؓ کے خلاف بولنے کا الزام تھا لیکن ذہبی اور ابن کثیر کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے، ان کی تصنیفات میں التاریخ الکبیر اور کتاب المعرفۃ بیان کی جاتی ہے جو تراجم کی کتاب ہے[۸۱]۔ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں اور خاص کر اس کے شمائل و دلائل کے حصہ میں ان کے حوالے ستاون[۸۰] صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کی روایات بیہقی کی دلائل النبوۃ کے واسطے سے بیان کی گئی ہیں۔

ابن ابی خثیمہ (۱۸۵-۲۷۹ھ) محدث و فقیہ اور مؤرخ و ادیب تھے۔ انہوں نے بھی عام تاریخ میں ابتدائے آفرینش سے حضرت علیؓ کے زمانہ تک کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دی، جس میں محدثین کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے سند کے ذکر کا التزام کیا[۸۲]۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی ابن کثیر کی پہنچ سے دور رہی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان سے عقد مبارک، آپؐ کی اولاد، غلاموں، لونڈیوں، محررین اور دلائل نبوت کے باب میں صرف گیارہ جگہ جو روایات و اقوال بیان کئے ہیں وہ دیگر مؤرخین کی مدد سے حاصل کئے۔

امام نسائی (۲۱۵-۳۰۳ھ) کی مشہور سنن اور خصائص علی کا تذکرہ آگے آئے گا، یہاں ان کی کتاب الیوم واللیلۃ جس کے حوالے سے عام تاریخی نوعیت کی چار روایات، اور کتاب السیر جس کا صرف ایک بار حوالہ آیا ہے[۸۳] کا ذکر ضروری ہے۔

ابن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی تاریخ الرسل والملوک مشہور، قدیم ترین عام "تاریخ کی کتاب اپنے زمانہ تک اسلامی" تاریخ نگاری کے عروج و ترقی کی نمائندہ مثال اور نمونہ ہے۔ وہ نہ خود زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ رہی، بلکہ اس نے اپنے سے پہلے کے اکثر سیر و مغازی اور تاریخ کے مؤلفین کی تاریخی روایات، اقوال اور معلومات کا بنیادی سرمایہ ہم تک پہنچایا اور ان کی تحریروں کے نمونے فراہم کئے، جو اکثر نادر و نایاب

---

۷۹ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۶۰-۱۶۱، جواد علی، مقالہ "موارد تاریخ الطبری" مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۸/۴۲۶-۴۲۷۔

۸۰ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۰۴، ۴/۴۲ اور السہیلی، الروض الانف، ۱/۷۲، ۲/۱۴۲

۸۱ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲/۱۴۵-۱۴۶- ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۵۹-۶۰، ابن حجر، تہذیب التہذیب ۱۱/۳۸۵، السخاوی، الاعلان ۱۷۶، ۲۳۹، ۳۱۷، ۳۳۰۔

۸۲ ابن الندیم، الفہرست ۳۲۱، الذہبی، تذکرۃ الحفاظ ۲/۱۵۶

۸۳ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۳/۲۷۶، ۴/۳۹، ۲۵۴، ۵/۳۲۲، الیوم واللیلۃ) ۴/۲۵۲ (السیر)

ہیں۔ بعد کے تمام مؤرخین نے اس سے فیض حاصل کیا، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ اسلامی تاریخ کے بنیادی اہم اور ناگزیر مصدر کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا، جو آئندہ بھی کم نہ ہوگا۔

ابن کثیر نے ناگزیر حالات کے علاوہ ہمیشہ اپنے مصادرِ معلومات کے انتخاب میں احتیاط برتی۔ انہوں نے محدثین کے پسندیدہ اصول کو اپنانے والے راویوں کی روایات اور مؤلفین کی کتابوں پر اعتماد کیا۔ وہ خاص کر عام تاریخ کے مؤلفین سے استفادہ میں زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ چنانچہ المدائنی (وفات ۲۲۵ھ) ابن قتیبہ[۸۴] (وفات ۲۷۶ھ) البلاذری (وفات ۲۷۹ھ) الدینوری (وفات ۲۸۲ھ) اور الیعقوبی (وفات ۲۸۴ھ) جیسے تیسری صدی ہجری کے مشہور ائمہ فن کو نہ صرف اپنی سیرت کے حصہ بلکہ عام تاریخ میں بھی حیرت انگیز طور پر نظر انداز کیا ہے لیکن طبری کے سلسلہ میں ان کا رویہ طبعاً مختلف تھا، کیونکہ اس قیمتی "تاریخی خزانہ" کے مؤلف سے ان کی علمی، فکری، مزاجی اور تصنیفی مناسبت مماثلت، مشابہت اور ہم آہنگی تھی، دونوں مفسر، محدث، فقیہ و مؤرخ تھے اور ان فنون میں دونوں کی عظیم تصنیفات تھیں، اس لئے ابن کثیر کے نزدیک ان کی قدر و منزلت فطری بھی تھی۔ اور ان سے وسیع پیمانے پر استفادہ قرین قیاس بھی، چنانچہ انہوں نے جہاں ان کی تفسیر سے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصہ میں بنیادی کام لیا، وہیں تاریخ اسلام، خاص کر خلافت راشدہ سے ان کی تاریخ کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا اور سیرت نبوی کے حصہ میں سیرۃ ابن اسحٰق، سیرۃ ابن ہشام اور حدیث کے بعض مجموعوں کے بعد ان ہی کی تاریخ کو زیادہ تر اور بعض جگہ تفسیر کو بھی اپنی معلومات کا سرچشمہ قرار دیا، ان کی بے شمار روایات، اقوال و اختیارات اُخذ کئے اور اکثر قدیم مفسرین کی تفسیری روایات و نکات اور مؤرخین و سیرت نگاروں کے تاریخی بیانات ان سے نقل کئے اور بار بار قدر دانی اور احسان مندی کے ساتھ ان کے حوالے دیئے۔

ابو محمد علی بن حزم الاندلسی (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) عالم و ادیب اور صاحب مذہب (ظاہری) فقیہ کی کتاب السیرۃ کا حوالہ غزوۂ بنی قریظہ کے لئے نفیر کے موقع پر ان کی فقہی رائے کے ضمن میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں "اگر ہم وہاں ہوتے تو نمازِ عصر بنی قریظہ پہنچ کر ہی پڑھتے، خواہ وہاں کئی دن بعد ہی کیوں نہ پہنچتے" جو ابن کثیر کے "نزدیک" ان کے ظاہری مذہب کے عین مطابق ہے۔" اور غالباً ان کی اسی سیرت سے ابن کثیر نے ام المؤمنین ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے رسول اللہ سے عقد مبارک اور غزوۂ خیبر کے موقع پر گھی پیاز اور لہسن کی حرمت کے سلسلہ میں ان کی روایات اُخذ کی ہیں[۸۵] حجۃ الوداع پر ان کی ایک اور کتاب کا ذکر آگے آئے گا۔

الخطیب البغدادی (۳۹۲ - ۴۶۳ھ) مشہور محدث و مؤرخ جن کی کتاب تاریخ بغداد ان کی دیگر تصانیف کے مقابلہ میں زیادہ مقبول اور زبان زدِ عام و خاص ہے، انہوں نے اس میں بغداد اور اس کے گرد و نواح کی تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی معلومات کو جمع کیا اور بغداد میں وارد ہونے والے صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا، اور پھر اس مردم خیز خطہ کے علماً و فضلاً (خاص کر علم حدیث سے تعلق رکھنے والے) نیز خلفاً و وزراً اور امراً سلطنت کے حالات زندگی ابجدی حروف کی ترتیب سے بیان کئے، پھر کینت سے مشہور اشخاص کے تراجم لکھے اور

---

[۸۴] ابن قتیبہ کی کتاب المعارف کا حوالہ ابن کثیر نے صرف ایک بار بحیریٰ راہب کے قصہ میں دیا ہے، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۸۶

[۸۵] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۱۸، ۱۴۵، ۱۹۳

آخر میں خواتین کے حالات پر اس کو ختم کیا ۔ اس طرح انہوں نے شہروں سے نسبت کی بنیاد پر تراجم کی بنیاد ڈالی اور آنے والوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ فراہم کیا، جس نے بعد میں بہت رواج پایا۔ لیکن ابن کثیر کی سیرت کے حصہ میں ان کے حوالے معدودے چند ہیں[86] جبکہ ان کی تاریخ میں عصرِ عباسی کے اوائل سے لے کر ۴۵۲ھ تک کے اعیان کے حالاتِ زندگی ان کے حوالوں سے پٹے پڑے ہیں۔

القاضی عیاض بن موسیٰ السبتی المالکی (۴۷۶-۵۴۴ھ) کی مشہور کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ سے ابن کثیر نے رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے اسم مبارک اور ولادت کے بارے میں تین خبروں کے علاوہ دلائل کے باب میں حدیث ردّ الشمس بعد مغیبہا ۔ شہادتِ نبوت دیتے ہوئے حیوانات کے کلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آپؐ کے معجزات کا مقابلہ کرتے ہوئے ان سے معدودے چند روایات لی ہیں[87] جن میں سے بعض سے اختلاف کیا ہے اور بعض جگہ ان کی مذکور کتاب کا حوالہ دیا ہے۔

ابن عساکر الدمشقی (۴۹۹-۵۷۱ھ) جن کی تصنیفات میں تاریخ دمشق بہت مشہور ہوئی ، انہوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے دمشق سے ربط و تعلق کو واضح کر کے خطیب کی تاریخ بغداد کے نمونہ پر دمشق سے تعلق رکھنے والے نامی گرامی اشخاص کے حالاتِ زندگی ترتیب دیے ۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ابتداءً سے انتہا تک تہتر[73] صفحات پر ان کی روایات ، اقوال ، اختیارات اور تاریخی تراجم کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص کر دلائل نبوت کے حصہ میں ابن عساکر کی مذکور تاریخ کی ابتداء میں دلائل نبوت کے باب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور جا بجا ان کی تاریخ کے نام کی وضاحت کی ہے[88] نیز ان کی قدر و منزلت کے اعتراف کے باوجود ان کے ضعیف احادیث کی نشاندہی کئے بغیر گذر جانے پر تعجب کا اظہار کیا ہے[89]۔

سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ سیرت کے ضمنی موضوعات کو بیان کرتے ہوئے ابن کثیر نے ان موضوعات پر لکھی ہوئی مستقل کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں ، جن کا ذکر یہاں کر دینا مناسب ہے ۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی کے جامعین کے ضمن میں شارح ترمذی ابو بکر بن العربی (۴۶۸-۵۴۳ھ) کی الاحوذی کا ایک بار حوالہ[90] آیا ہے اور ابو بکر محمد بن جعفر بن سہل الخرائطی (۲۴۰-۳۲۷ھ) کی ھواتف الجان و عجائب ما یحکی عن الکھان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی رات ظاہر ہونے والی نشانیوں سے لے کر، سیف بن ذی یزن اور راہبوں و کاہنوں کی پیش گوئیوں اور ان کے تابع جنات و شیاطین سے سنے سنائے اشاروں کو بکثرت اخذ کیا ہے اور کئی جگہ مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت بھی کی ہے[91]۔ اسی طرح اسراءً و معراج کے بیان میں باری تعالیٰ کی رؤیت بالعین کے مسلک کا تذکرہ کرتے ہوئے ابو زکریا محی الدین النواوی (۶۳۱-۶۷۶ھ) کے فتاویٰ کا حوالہ

---

۸۶ ایضاً ۵/۳۳۸، ۳۴۸، ۶/۷۸ ۸۷ ایضاً ۲/۲۵۹، ۲۶۴، ۶/۱۰، ۸۶، ۱۴۶، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۲ -

۸۸ ایضاً ۲/۲۷۰، ۳۴۷، ۳/۷۱، ۵/۳۵۴، ۶/۱۱۳، ۲۹۶ -

۸۹ ایضاً ۵/۲۰۸، ۳۵۴-۳۵۵ — ۹۰ ایضاً ۲/۲۵۲ ،

۹۱ ایضاً ۲/۲۹۸، ۲۸۴، ۳۲۸-۳۴۶ —

دیا ہے[92] اور غزوۂ بدر کے بیان میں حضرت حسان بن ثابتؓ کے ایک شعر کے سلسلہ میں ابن عبدربہ کی العقد الفرید کا حوالہ آیا ہے[93] - اور شرکائے غزوۂ بدر کے اسمائے گرامی کی فہرست ضیاء الدین محمد بن عبدالواحد المقدسی کی کتاب الاحکام الکبیر کی بنیاد پر ابجدی حروف سے ترتیب دی ہے اور اس میں تصحیح و اضافہ کیا ہے[94]۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہودِ خیبر سے نصف محصولاتِ اراضی پر معاملہ کے بیان میں ضمناً حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ان کے جلا وطنی کا تذکرہ کرتے ہوئے، یہودیوں کی ان کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے جو انہوں نے سنہ ۳۰۰ھ کے بعد سے مؤلف کے زمانہ تک وقتاً فوقتاً جزیہ معاف کرانے کے لئے جھوٹے گھڑے ہوئے مکتوباتِ نبوی پیش کر کے کیں اور اس ذیل میں ابنِ کثیر نے خود اپنی کتاب بطلان الجزیۃ عن یہود خیبر کے حوالہ کے ساتھ ساتھ ابن الصباغ (۴۰۰ - ۴۷۷ھ) کی المسائل اور ابو حامد محمد بن یونس الفقیہ (۵۲۵ - ۶۰۸ھ) کی تعلیقۃ اور ابن المسلمۃ کی اس موضوع پر مستقل کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے[95]۔

اسی طرح لقیط بن عامر کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے ضمن میں عبداللہ بن الامام احمد بن حنبل کی روایت بیان کر کے اس کے دیگر شواہد کے ضمن میں امام بیہقی کی البعث والنشور (جو ان کی کتاب الاسماء والصفات کا ایک باب ہے) عبدالحق الاشبیلی کی العاقبۃ اور القرطبی (وفات ۶۷۱ھ) کی التذکرۃ فی احوال الآخرۃ کا حوالہ دیا ہے[96] اور حجۃ الوداع کے بیان میں ابوذر الھروی کی المناسک[97] اور امام ابن حزم (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) کی حجۃ الوداع پر ایک جلد میں مستقل کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ جس کے بارے میں ابنِ کثیر کی رائے تھی کہ "وہ اچھی کتاب ہے، لیکن اس میں ابن حزم کو کہیں کہیں وہم ہوا ہے[98]۔" لہٰذا اس کتاب سے معلومات لیتے وقت ضروری موقعوں پر ابنِ کثیر اپنے اختلاف کا اظہار کرتے جاتے ہیں[99]۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی میں سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں اور ان کے مؤلفین کے اس مختصر جائزہ اور تعارف کے بعد اب شمائل کی کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔

۲۔ شمائل کی کتابیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، آپ کی صفات و اخلاق و عادات کی ہر چھوٹی بڑی بات اور اہم اور غیر اہم پہلوؤں سے مسلمانوں کو ہمیشہ عشق و شیفتگی و وارفتگی کا تعلق رہا ہے چنانچہ پہلے راویوں نے اس باب کی معلومات زبانی ایک سے دوسری نسل تک پہنچائیں اور پھر اہل تصنیف و تالیف علماء نے اس باب کے مواد کو بہت اہتمام سے جمع اور محفوظ کیا، چنانچہ حدیث نبوی کے مجموعوں کی چھوٹی بڑی ہر کتاب کے عبادات و معاملات، اخلاق و آداب اور زہد و تقشف کے ابواب میں اس سلسلہ کا مواد جابجا بکھرا ہوا ملتا ہے لیکن ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ)

---

[92] ایضاً ۳/۱۱۲، ۶/۲۷۷

[93] ایضاً ۳/۲۷۹

[94] ایضاً ۳/۳۱۴ - ۳۲۸

[95] ایضاً ۴/۲۱۹ - ۲۲۰، ۵/۳۵۲، ۱۲/۱۰۲، ۱۴/۱۹

[96] ایضاً ۵/۸۲ - ۸۳

[97] ایضاً ۵/۱۶۳،

[98] ایضاً ۵/۱۰۹

[99] ایضاً ۵/۱۰۹ - ۲۰۷

کے زمانہ سے پہلے اس موضوع پر مستقل و منفرد کتابوں میں امام ترمذی - ابوعیسیٰ محمد بن سورۃ - (۲۰۹ - ۲۷۹ھ) کے علاوہ ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری (وفات ۴۳۲ھ) کی کتاب شمائل النبی کے نام سے بیان کی جاتی ہے[۱۰۰] لیکن امام ترمذی کی شمائل کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ آخر الذکر کو حاصل نہ ہوسکی، غالباً اسی لئے ابن کثیر نے بھی اس کو نظر انداز کیا۔ جبکہ امام ترمذی کی مذکور شمائل سے انہوں نے اپنی سیرت نبوی کے حصہ میں مدد لینے کے ساتھ اس سے فطری طور پر اپنی شمائل کے حصہ کا خاکہ حاصل کیا ہے اور اس کو اپنی معلومات کا بنیادی ماخذ و مصدر بنایا ہے اور جابجا اس کے نام کا حوالہ دیا ہے اور اس حصہ کی ابتداء ہی میں بہت صفائی سے یہ وضاحت کی ہے کہ :

"علمائے ماضی و حال نے اس باب میں مستقل اور غیر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں - ان میں سب سے بہتر طریقہ پر جمع کرنے والے امام ترمذی ہیں - جنہوں نے اس باب میں اپنی مشہور کتاب منفرداً تصنیف کی، جس کے ان تک متصل سند کے ساتھ سماع کا شرف ہم کو حاصل ہے، اس کتاب سے ہم ان کی جمع کی ہوئی بنیادی معلومات حاصل کریں گے اور اس پر محدث و فقیہ کے لئے ناگزیر اہم معلومات کا اضافہ کریں گے۔"[۱۰۱]

اور حسب وعدہ انہوں نے اپنے اس ارادہ کی تکمیل سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ خاص کر حدیث کے تمام معروف و مشہور مجموعوں سے وسیع پیمانے پر مدد لے کر کی ہے، جس پر غالباً اب مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۳- دلائل کی کتابیں

دلائل نبوت کا مواد بھی قدیم علماء و محدثین کی توجہ سے محروم نہیں رہا ہے - بلکہ ابتدا تدوین ہی سے حدیث کے مجموعوں کے مختلف ابواب سیرت، علامات نبوت اور معجزات وغیرہ میں اس باب سے متعلق معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور اس کے بعد اس موضوع پر مستقلاً لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ چنانچہ صرف دلائل النبوۃ کے نام سے کتابیں لکھنے والے مصنفین کے نام ترتیب وار اس طرح بیان کئے جاتے ہیں - ابن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) امام ابوداؤد (وفات ۲۷۵ھ) ابواسحٰق ابراہیم بن اسحٰق الحربی (وفات ۲۸۵ھ) ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی (وفات ۴۳۰ھ) ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری (وفات ۴۳۲ھ)، ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی (وفات ۴۵۸ھ) ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی (وفات ۵۳۵ھ)[۱۰۲] لیکن ابن کثیر نے ان کتابوں میں سے صرف ابونعیم الاصبہانی اور امام بیہقی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور باقی کو نظر انداز کر دیا ہے - نیز اس نام سے لکھنے والے دیگر مصنفین کے حوالے بھی دیئے ہیں جیسے ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم الرازی (وفات ۲۶۴ھ)، قاسم بن ثابت العوفی (وفات ۳۰۲ھ) ابن شاہین (وفات ۳۸۵ھ) اور ابو محمد عبداللہ بن حامد الفقیہ -

---

[۱۰۰] حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۲/۱۰۵۹، امام ترمذی کی شمائل کی متعدد متاخر شرحوں کا ذکر بھی اسی حوالہ میں مل جائے گا۔

[۱۰۱] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۶/۱۱

[۱۰۲] حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۱/۷۶۰

بہرحال اب یہاں ہم صرف ان ہی کتابوں کا تذکرہ کریں گے جن سے ابن کثیر نے استفادہ کیا ہے یا ان کا حوالہ دیا ہے:

ابوزرعة الرازی (۲۰۰-۲۶۴ھ) کی دلائل النبوة کا ابن کثیر نے "عظیم الشان کتاب" کی حیثیت سے تعارف کرایا ہے[103] اور خلافِ عادت ان کی روایات پر سکوت اختیار کیا ہے، جس سے ان پر ابن کثیر کا اعتماد ظاہر ہوتا ہے، لیکن ان سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکے صرف معدودے چند بار سیرت کے آخر اور دلائل کے باب میں ان کی روایات بیان کی ہیں[104] جن میں بعض جگہ ان کی دلائل کی بھی وضاحت کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی روایات دیگر مصنفین کے واسطہ سے حاصل کی گئی ہیں۔

اسی طرح قاسم بن ثابت العوفی (۲۵۵-۳۰۲ھ) کی دو[105] روایتوں میں سے ایک بار اگرچہ ان کی کتاب الدلائل کا حوالہ دیا ہے لیکن خود سہیلی کے واسطہ کی وضاحت کر دی ہے اور دوسری روایت بھی سہیلی کے ہاں موجود ہیں[106] لہٰذا ظاہر ہے کہ اس میں بھی وہی ان کا ماخذ ہے۔

اسی طرح ابن شاہین (۲۹۷-۳۸۵ھ) کی دلائل النبوة کا حوالہ بھی ابن کثیر کی سیرت و دلائل کے حصوں میں ہماری نظر سے صرف دو بار گذرا ہے[107] جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ابن کثیر کا ماخذ دوسرے مصنفین ہیں۔

لیکن ابونعیم الاصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ) کی دلائل النبوة اس فن کی وہ قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی اور ابن کثیر نے بھی اس سے کما حقہ فائدہ حاصل کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آسمانی کتابوں میں آپ کے ذکر کو بیان کرنے کے بعد آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے اعجازی پہلو پیش کئے ہیں، جن سے آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن اس باب میں انہوں نے غیر محتاط روش اختیار کرتے ہوئے کھوٹا کھرا سب جمع کر دیا ہے[108] مگر ابن کثیر اس کتاب کی تعریف میں رطب اللسان معلوم ہوتے ہیں۔ اور تین جلدوں کی اس کتاب کے "معلومات سے بھرپور ہونے" اور اس میں "اسلام لانے والوں کے بیان کی جامعیت" اور "آپؐ کی ولادت باسعادت کے باب میں مسیحی اور یہودی علماء اور عربوں کی زبانی مفصل روایات اور بیانات جمع کرنے" کی خاص طور پر تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی تینتیسویں فصل میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات کا موازنہ دیگر انبیاء کے فضائل و معجزات سے کیا ہے[109]۔ بہرحال ابن کثیر نے اس تاثر کے نتیجہ میں اس کتاب سے مغازی کے حصہ کے علاوہ اپنی سیرت کے ہر حصہ میں بہت زیادہ اخذ کیا ہے، تقریباً سو[110] صفحات پر ان کے حوالے بکھرے ہوئے ہیں، جن میں بار بار ان کی دلائل کے نام کی وضاحت ملتی ہے اور اکثر ان کی روایات کے ضعف پر تنبیہ و تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔

اس باب کی دوسری کتاب جس سے ابن کثیر نے بہت فائدہ اٹھایا ہے امام بیہقی کی دلائل النبوة ہے۔ بیہقی نے اس میں خاص طور پر

---

۱۰۳ ابن کثیر، البدایة والنہایة ۴/۲۵۹۔

۱۰۴ ایضاً ۴/۲۵۹، ۵/۳۵۶، ۶/۶۰، ۷۵، ۷۷، ۲۷۸، ۲۸۳، ۲۸۴۔

۱۰۵ ایضاً ۳/۲۷۲، ۳۰۸۔

۱۰۶ السہیلی، الروض الانف ۱/۶۹، ۸۵ ۱۰۷ ابن کثیر، البدایة والنہایة ۲/۳۰۷، ۶/۷۸۔

۱۰۸ ابن کثیر، شمائل الرسولؐ، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد

۱۰۹ ابن کثیر، البدایة والنہایة ۲/۳۱۹، ۳/۳۷، ۶/۲۵۸، ۲۶۲، ۲۹۸۔

حسّی معجزات کے سلسلہ میں بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، لیکن روایات و احادیث کے اکثر جامعین کی طرح اس میں ضعیف، موضوع اور جھوٹی روایات کی بھی بھرمار کر دی ہے[۱۱۰]

لیکن ابن کثیر کے ہاں اس کتاب کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے، چنانچہ ابن کثیر کی سیرت نبوی کے لگ بھگ پانچ سو[۵۰۰] صفحات پر ان کے حوالے بکھرے ہوئے ہیں، جن میں اکثر ان کی دلائل کی کتاب کے نام کی وضاحت کی گئی ہے انہوں نے اس کتاب سے نہ صرف دلائل کے حصہ میں جو اس کی روایات سے پٹا پڑا ہے، بلکہ سیرت نبوی کے تمام اجزا خاص کر مغازی کے باب میں بھی ایسی روایات نقل کیں جن پر ان کو کسی حد تک اطمینان ہوا، نیز انہوں نے اپنی سیرت کے اکثر ابواب کی ترتیب بھی ان سے لی[۱۱۱]۔ اور واقدی اور یعقوب بن سفیان وغیرہ کے اقوال و روایات بھی ان سے حاصل کئے۔ اس طرح ابن کثیر کی سیرت نبوی کی مجموعی تشکیل میں اس کتاب کا بھی اہم اور بنیادی مقام ہے۔

آخر میں اس فن کی ایک اور کتاب ابو محمد عبداللہ بن حامد الفقیہ کی دلائل النبوۃ کا ذکر ضروری ہے، جس کے حوالے ابن کثیر کی سیرت کے دلائل کے حصہ میں سترہ[۱۷] صفحات پر ملتے ہیں، جن میں کئی جگہ مذکور کتاب کے نام کی وضاحت بھی کی ہے اور انہوں نے اس کو "پُر از نفیس معلومات اور عظیم فوائد والی کتاب[۱۱۲]" کی حیثیت سے بار بار پیش کیا ہے اور خاص کر ان میں انبیائے سابقین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے درمیان موازنات کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور ان کو بکثرت نقل کیا ہے[۱۱۳]۔

اور دلائل کے ضمن میں جن دیگر کتابوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں قرب قیامت کے وقت ظاہر ہونے والے فتنوں پر لکھی ہوئی مخصوص کتابوں میں پہلی کتاب امام بخاری کے شیخ نعیم بن حماد الخزاعی (وفات ۲۲۸ھ) کی کتاب الفتن والملاحم ہے، اس کے حوالے سے ابن کثیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی پیش گوئیوں کے مطابق پیش آنے والے واقعات کے ذیل میں متعدد روایات لی ہیں، جو سولہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں[۱۱۴]۔ اور اس سلسلہ کی دوسری کتاب ابوصالح الخلیل بن احمد بن عیسیٰ بن الشیخ کی کتاب کتاب الفتن والملاحم ہے، جس کا حوالہ صرف ایک بار اس روایت کے ذیل میں آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت میں کبھی کوئی خلافت حاصل نہ کر سکے گا[۱۱۵]۔

اسی طرح بعث و نشور یا حیات بعدالموت پر لکھی ہوئی کتابوں میں ھشام بن عمّار (۱۵۲ھ - ۲۴۵ھ) کتاب المبعث کے حوالے دلائل کے حصہ میں شہادت رسالت اور معجزات کے مقارنہ کے سلسلہ میں آئے ہیں، جن میں ان کی کتاب کے دو بابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، پہلا باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کے معجزات اور دوسرا باب آپؐ کی نبوت کی تصدیق میں فوت شدہ لوگوں کی گفتگو اور ان کے عجیب و غریب حالات اور اس کو ابن کثیر نے مذکور کتاب کا آخری باب بتایا ہے[۱۱۶]۔ لیکن صلح حدیبیہ کے بارے میں ان کی ایک روایت امام بخاری کے حوالے

---

[۱۱۰] ابن کثیر، شمائل الرسولؐ، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد ص ح

[۱۱۱] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۹۵، ۳/۳۴، ۳۶، ۸۳، ۱۰۷، ۱۰۸، ۲۱۳، ۳۰۷، ۴/۸۱، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۷۸ وغیرہ

[۱۱۲] ایضاً ۶/۱۴۲، ۲۵۸، ۲۶۳، ۲۷۷۔ [۱۱۳] ایضاً ۶/۱۳۷-۲۹۸۔

[۱۱۴] ایضاً ۶/۲۰۴-۲۵۲ [۱۱۵] ایضاً ۶/۲۳۲۔

[۱۱۶] ایضاً ۶/۱۵۷، ۱۵۸، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۸، ۲۸۱۔

سے بیان کی ہے[117]۔ اس موضوع سے متعلق دوسری کتاب حافظ، محدث اور ہر فن مولا مصنف ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا (۲۰۸-۲۸۱ھ) کی کتاب من عاش بعد الموت سے اولیائے امت کی کرامات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ان سے ایسے قصے بیان کئے ہیں جن سے احیائے موتی ثابت ہوتا ہے[118]۔ اس کے علاوہ ان کا حوالہ مغازی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں چار بار آیا ہے[119]، اور ان روایات کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مذکورہ کتاب ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب محدث و مؤرخ محمد بن المنذر بن سعید الھروی (وفات ۳۰۳ھ) جو شکّر کے لقب سے معروف ہیں۔ کی کتاب العجائب الغریبہ سے جو روایت بیان کی ہے ابن کثیر سے طعام کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احیائے موتی کا معجزہ بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کتاب کا نام دوسری جگہ الغرائب والعجائب بتایا گیا ہے[120]، جبکہ اس کا نام عمر رضا کحالہ نے العجائب والجواھر بیان کیا ہے[121]۔ اس سلسلہ میں امام بیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ) کی البعث والنشور کا حوالہ صرف ایک جگہ آیا ہے[122] اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس کتاب سے کس حد تک فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

دلائل کے ضمن ہی میں ابن کثیر کے استاد کمال الدین ابو المعالی محمد بن علی (۶۶۶-۷۲۷ھ)، جو ابن الزملکانی کے نام سے مشہور ہیں۔ کی کتاب مولد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جو خود ابن کثیر کی وضاحت کے مطابق ان کی دلائل کے آخری باب "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر انبیاء کے مشابہ بلکہ برتر معجزات پر دلیل" کے اضافہ کا باعث بنی۔ اس کو ابن الزملکانی نے سیرۃ ابن اسحٰق وغیرہ سے خلاصۃً اخذ کیا تھا اور خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ابن کثیر کے زیرِ نظر تھا، لیکن ان کے خیال میں اس کے آخر میں فضائل کے ذیل کی ایک فصل کا ابن الزملکانی احاطہ نہ کر سکے تھے۔ لہٰذا ابن کثیر نے مذکورہ فصل کے مواد کو اس باب کی بنیاد بنا کر از سرِ نو ترتیب و تبویب اور تہذیب و اضافوں کے ذریعہ اس کو مکمل کیا اور بار بار مذکورہ مولد کے حوالے دیے[123]۔

اسی ضمن میں ابن کثیر کے دوسرے نامی گرامی استاد امام ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کی ردِّ نصاریٰ میں کتاب الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اخلاق و اعمال کو دلائل نبوت کے اعتبار سے پیش کیا ہے اور ابن کثیر نے ان کے "صحیح نتیجہ خیز مسلک اور بلیغ اندازِ بیان جس کے سامنے ہر سوچنے سمجھنے والا سپر ڈال دیتا ہے" کی تعریف کرتے ہوئے اس فصل کو پورا کا پورا نقل کیا ہے[124]۔ نیز اہلِ کتاب کے ہاں بارہ عظماء (بڑوں) کی روایت کو بارہ شیعی اماموں پر محمول کرنے کے خلاف بھی ان کا قول ایک جگہ نقل کیا ہے[125]۔

---

[117] ایضاً ۴/۱۶۳۔ [118] ایضاً ۶/۱۵۳-۱۵۸، ۲۹۲-۲۹۳۔ [119] ایضاً ۳/۲۸۹، ۴/۴۵، ۵/۲۶۶، ۲۷۲۔

[120] ایضاً ۶/۱۰۹، ۲۹۳۔ [121] عمر رضا کحالۃ، معجم المؤلفین، مطبعۃ الترقی، دمشق، ۱۳۷۶-۱۳۸۱ھ ۱۲/۵۱۔

[122] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۵/۸۳۔ [123] ایضاً ۶/۲۵۸-۲۹۳۔

[124] ایضاً " " ۶/۷۰-۷۴۔

[125] ایضاً " " ۶/۲۵۰۔

سیرت نبوی کے آخر امور دلائل کے باب شیعہ سنی اختلافی احادیث کا ذکر ضمناً آیا۔ اور ابن کثیر ان کی تحقیق و جستجو پر مجبور ہوئے تو انہوں نے اس سلسلہ کا سارا مخالف اور موافق دفتر کھنگال ڈالنے کی کوشش کی۔ یہاں اس موضوع کی دو حدیثیں قابلِ ذکر ہیں، پہلی حدیث غدیرِ خم کے نام سے مشہور ہے، یہ در اصل وہ مشہور و معروف خطبہ نبوی ہے جو آپؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں جحفہ کے قریب غدیرِ خم نامی مقام پر دیا تھا اور دوسری حدیث "ردّ الشمس بعد مغیبہا" ہے جس کا پسِ منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہے تھے، جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کی نمازِ عصر قضا ہوگئی، بیداری پر جب آپؐ کو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو آپؐ نے دعا فرمائی۔ اور سورج حضرت علیؓ کی نمازِ عصر کی ادائیگی کے لئے واپس ہوگیا۔

بہرحال یہ دونوں ان احادیث میں سے ہیں جن کو حضرت علیؓ کے طرفداران کی دوسرے صحابہ کرامؓ پر فضیلت اور فوقیت پر محمول کرتے ہیں اور ابن کثیر اس غلط ترجمانی کے بخیئے ادھیڑنے کے لئے مستعد اور بے چین نظر آتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں حدیثوں کی مختلف روایتوں کو نقل کرتے ہوئے اور ان کے سند و متن پر کلام کرتے ہوئے حدیث و تاریخ کے تمام اہم مجموعوں اور ان موضوعات پر مستقلاً لکھی ہوئی مخصوص کتابوں کے حوالوں کے انبار لگا دیتے ہیں اور صفحات پر صفحات سیاہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پہلی حدیث سے صرف حضرت علیؓ کی ان الزامات جور و جفا سے برائت ظاہر ہوتی ہے، جو ان پر یمن کے قیام کے زمانہ میں لگائے گئے تھے، لیکن دیگر صحابہ پر ان کی فضیلت و فوقیت کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتی۔

اس سلسلہ میں امام نسائی (۲۱۵-۳۰۳ھ) کی کتاب خصائص علی قابلِ ذکر ہے، جو انہوں نے حضرت علیؓ سے اہلِ دمشق کے تنفّر کو دور کرنے کے لئے لکھی تھی[۱۲۶] اور ابن کثیر نے اس سے مذکورہ حدیث کی بحث میں استفادہ کیا[۱۲۷] اسی طرح ابن کثیر نے ابن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی حدیث غدیرِ خم کے بارے میں دو جلدوں پر مشتمل کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے، جس کا علم ان کو ان کے استاد شمس الدین ابوعبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی معرفت ہوا تھا، اور ذہبی نے اس کو طبری کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخہ سے نقل کی ہوئی کتاب میں پایا تھا اور ابن کثیر نے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ "طبری نے اس کتاب میں اکثر محدثین کی عادت کے مطابق کھرا کھوٹا اور صحیح و سقیم سب جمع کر دیا ہے"[۱۲۸]

دوسری حدیث کو ابن کثیر موضوع سمجھتے تھے اور اس کے بیان میں انہوں نے جن مصادر کا حوالہ دیا ہے، ان میں مؤرخ و محدث ابوبشر محمد بن احمد الدولابی (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی کتاب الذریۃ الطاھرۃ ہے، لیکن ان کی روایات کو موضوع بتایا ہے[۱۲۹]۔ اور ابن حزم (۳۸۴-۴۵۶ھ) کی الملل والنحل کا حوالہ اس حدیث کے رد میں دیا ہے[۱۳۰] اور ابوبکر محمد بن حاتم بن زنجویہ البخاری کی اثبات امامۃ ابی بکر الصدیق میں ان کے استدلال سے فائدہ اٹھایا ہے[۱۳۱] اور ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن احمد الحسکانی کے ایک

---

۱۲۶ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲/۲۴۲ - ۲۴۳

۱۲۷ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۵/۲۱۰،۱۶۳، ۶/۸۵-

۱۲۸ ایضاً ۵/۲۰۸-۲۱۴، ۷/۳۴۶-۳۵۰

۱۲۹ ایضاً ۶/۷۸، ۸۶ -

۱۳۰ ایضاً ۶/۸۷

۱۳۱ ایضاً ۶/۷۹، ۸۵، ۲۸۲ -

جز بعنوان مسالة فی تصحیح رد الشمس و ترغیم النواصب المشمس سے ان کی روایات کے بہت سے طُرق حذف و اضافہ کے ساتھ لئے اور ان کے استدلال سے بھی فائدہ اٹھایا[۱۳۲] اور مشہور شیعی عالم جمال الدین ابو منصور حسن بن یوسف المطہر الحلی (۶۴۸-۷۲۶ھ) کی کتاب منہاج الاستقامة فی إثبات الامامة کے بارے میں ابن کثیر کی رائے تھی کہ " انہوں نے اس میں معقول و منقول میں گڈمڈ کیا ہے، پھر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جائیں کیونکہ وہ صحیح راستہ سے ہٹ گئے تھے[۱۳۳]" لہٰذا ان کی روایات کو مردود ٹھہرایا ہے، ان کے نتائج پر غلط مبحث کا الزام لگایا ہے اور سخت تنقید کی ہے[۱۳۴] اور یہاں پر انہوں نے پھر اپنے استاد ابن تیمیہ کی طرف رجوع کیا ہے اور ان کی کتاب منہاج السنة فی نقض کلام الشیعة والقدریة کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جس میں ابن المطہر کی مذکور کتاب کا رد کیا گیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اس سے استفادہ کیا ہے[۱۳۵]

ابن کثیر کی سیرت نبوی کے تینوں حصوں سیرت، شمائل اور دلائل سے براہ راست تعلق رکھنے والے مصادر کی علٰحدہ مستقل فنی کتابوں کے اس تعارف کے بعد اب ان مصادر کا ذکر کیا جائے گا، جن کا تعلق صرف کسی ایک حصہ سے نہیں بلکہ وہ ان کی سیرت کے مذکور تینوں حصوں میں مشترک ہیں جیسے تفاسیر، آسمانی کتابیں اور احادیث کے مجموعے اور رجال و تراجم اور جرح و تعدیل کی کتابیں ان مصادر میں بھی خاص طور پر ان مصادر کو نمایاں کیا جائیگا جن سے اس سیرت کی تشکیل میں وسیع پیمانہ پر مدد لی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ مصادر عام طور پر وہ ہیں جو ابن کثیر کی حقیقی تعلیم و تربیت، علمی اختصاص، فکری مزاج اور ان کے تصنیفی کارناموں سے پوری طرح میل کھاتے ہیں۔

۴- قرآن شریف کی تفسیریں

ابن کثیر خود صاحب طرز مفسّر تھے، ان کی تفسیر القرآن الکریم معروف و مشہور اور مقبول عام ہے۔ اس میں انہوں نے " قرآن کی تفسیر قرآن، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صحابہ و تابعین کرام کے آثار کی روشنی میں بیان کی ہے۔ مجرد رائے سے تفسیر ان کے نزدیک حرام ہے" اور اسرائیلیات کے باب میں ان کا موقف یہ ہے کہ اگر وہ " قرآن و حدیث کے موافق ہوں تو اُن کو قبول کرتے ہیں، مخالف ہوں تو رَدّ کر دیتے ہیں اور اگر موافق یا مخالف نہ ہوں تو وہ نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب بلکہ ان کو موقوف سمجھتے ہوئے تقویت یا استشہاد کے لئے ان کے بیان کو جائز سمجھتے ہیں[۱۳۶]"

مذکورہ تفسیر میں اس طریقۂ کار کی پابندی تو فطری تھی، لیکن یہ ابن کثیر کا امتیاز تھا کہ انہوں نے اس کو اپنی "تاریخ" کے ابتدائی حصہ یعنی سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات میں بھی کامیابی سے اپنانے کی کوشش کی اور اس کو آیات قرآنی سے استشہاد، تفسیری نکات سے استدلال اور مختلف قدیم معتبر تفسیروں کے حوالوں سے بھر دیا، اس کے بعد سیرت نبوی کے حصہ میں ضروری مقامات پر اگرچہ آیات قرآنی سے استشہاد میں کوتاہی

---

۱۳۲ ابن کثیر، البدایة والنہایة ۶/۸۰-۸۲۔ ۱۳۳ ایضاً ۱۴/ ۱۲۵

۱۳۴ ایضاً ۶/۸۶، ۸۷، ۲۸۲، ۲۸۳۔

۱۳۵ ایضاً ۶/ ۸۳، ۸۵-۸۶، ۲۵۰۔

۱۳۶ ابن کثیر، تفسیر القرآن الکریم ۱/۳-۵، ۳/۱۸۱-۱۸۲، ابن کثیر، البدایة والنہایة ۱/۶-۷، ۲/۱۳۲-۱۳۴۔

نہیں کی گئی، لیکن تفسیری نکات اور کتابوں کے حوالوں کے بارے میں گزشتہ روش برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ سیر و مغازی اور تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متعلقہ مواد کی فراوانی نے ان کو تفسیری کتابوں میں موجود کمیاب مواد سے بے نیاز کر دیا لہٰذا سیرت و مغازی کے حصہ میں محسوس طور پر تفسیری کتابوں کا غالب رنگ کم ہوگیا لیکن معدوم نہیں ہوا، بلکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ، مغازی اور دیگر واقعات سے متعلق تمام آیاتِ قرآن سے استشہاد اور بوقت ضرورت تفسیری کتابوں سے مدد حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی ہے اور ما بعد سیرت بھی ان فصلوں میں ان کے حوالے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں، جن کا تعلق دینی اعتقادات اور مذہبی اختلافات سے ہے۔

بہر حال اس دھندلاتے ہوئے رنگ کے زیرِ اثر بھی جن تفسیروں کے کم و بیش حوالے ابن کثیر کی سیرت اور مغازی کے حصوں میں مل جاتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

تفسیر السُدّی الکبیر (وفات ۱۲۷ھ) جن پر طبری اور ابن ابی حاتم کی طرح ابن کثیر نے بھی اعتماد کیا، لیکن سیرت میں ان کا ذکر بہت کمیاب ہے[137]۔ تفسیر عبدالرزاق (۱۲۶ - ۲۱۱ھ) یہ بھی ابتداً تاریخ سے ابن کثیر کا اہم مصدر ہے، لیکن سیرت میں معدودے چند حوالے آئے ہیں[138]۔ تفسیر بقی بن مخلد (۲۰۱ - ۲۷۶ھ) جن کا ذکر صرف ایک مرتبہ سہیلی کے حوالے سے آیا ہے[139]۔ تفسیر طبری (۲۲۴ - ۳۱۰ھ) جو صحابہ و تابعین سے ماثور تفسیری روایات، نکات اور معلومات کا خزانہ ہے، اور جس کو خود ابن کثیر "بے نظیر" سمجھتے تھے[140]، اور اس سے ابتدائی تاریخ کے علاوہ سیرت میں بھی استفادہ کیا ہے[141]۔ تفسیر ابن ابی حاتم (۲۴۰ - ۳۲۷ھ) جس کو ابن کثیر نہ صرف تفسیر طبری بلکہ اپنے زمانہ تک کے تمام مفسرین پر مکمل طور سے آثار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے[142]" فوقیت دیتے تھے۔ لہٰذا اس سے بھی ابتدائی تاریخ کے بعد سیرت و مغازی کے حصہ میں خاصا فائدہ اٹھایا ہے[143]۔ تفسیر ابن مردویہ (۳۲۳ - ۴۱۰ھ) جس کا ذکر ابن کثیر کی تاریخ میں بھی نسبتاً کم آیا ہے لیکن غزوۂ بدر تک اس کے حوالے مل جاتے ہیں[144]۔ تفسیر القاضی الماوردی (۳۶۴ - ۴۵۰ھ) کا حوالہ صرف ایک بار دیا ہے[145] اور ان سب کے علاوہ ابن کثیر نے خود اپنی تفسیر القرآن الکریم کا ابتداً تاریخ سے انتہا سیرت تک بار بار حوالہ دیا ہے۔

۵۔ آسمانی کتابیں

ابن کثیر اسلامی علوم و فنون میں مہارت کے ساتھ ساتھ دیگر آسمانی مذاہب اور ان کی کتابوں کا بھی گہرا ناقدانہ مطالعہ رکھتے تھے۔

---

۱۳۷ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۱۶، ۲۰، ۲۵۱، ۲۷۵، ۲۸۴، ۳۰۱، ۳۰۳، ۴/۱۴۵، ۶/۳۵۔

۱۳۸ ایضاً 〃 ۲/۲۵۵، ۲۸۷، ۳/۱۹، ۲۰۹، ۲۱۷، ۴/۳۰، ۲۱۳، ۳۰۴۔

۱۳۹ ایضاً ۲/۲۶۶۔ ۱۴۰ ایضاً ۱۱/۱۴۵۔

۱۴۱ ایضاً ۳/۴۴، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۴/۱۴۶، ۱۴۸، ۵/۱۷۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۶/۲۸۴ وغیرہ۔ ۱۴۲ ایضاً ۱۱/۱۹۱۔

۱۴۳ ایضاً ۳/۴۰، ۴۴، ۴۴، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۹۳، ۲۷۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۴/۲۵، ۷۴، ۱۱۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۳۲۵، ۶/۱۰، ۶۱، ۱۹۱۔

۱۴۴ ایضاً ۳/۶، ۲۲، ۱۲۹، ۲۶۳، ۲۲۴، ۲۹۸۔ ۱۴۵ ایضاً ۴/۱۱۰، ۳۰۱۔

جس پر ان کی تفسیر و تاریخ اور زیر بحث سیرت میں آسمانی کتابوں کے حوالے اور تنقیدیں شاہد ہیں۔ نیز وہ مناظرہ بھی ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے ایک عیسائی عالم متبرک بشارۃ (لقب منخائیل) سے ۷۶۷ھ میں اہل کتاب کے دین اور ان کے تینوں طوائف، ملکیتہ، یعقوبیتہ اور نسطوریتہ کے اعتقادات کی نصوص" کے بارے میں کیا تھا اور پھر اس عالم کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ" وہ کچھ کچھ سمجھتا ہے"۔[۱۴۶]

بہر حال ابن کثیر کی سیرت نبوی میں بھی ان آسمانی کتابوں کا مجا حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی سابق بشارتوں اور پیش گوئیوں کے سلسلہ میں آیا ہے۔ جہاں پر توراۃ کے پانچوں اسفار (اجزاء) سفر زبور (یا مزامیر داؤد) اور ارمیا، اشعیا اور حزقیل کے صحف اور کتاب النبوات والانجیل سے معلومات حاصل کی گئی ہیں۔[۱۴۷] لیکن اس کے علاوہ جہاں آسمانی کتابوں کی معلومات ملتی ہیں وہ براہ راست مذکورہ مصادر سے ماخوذ معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ مسلمان مفسرین و محدثین اور مؤرخین و سیرت نگاروں سے حاصل کی ہوئی لگتی ہیں۔

۶۔ حدیث کے مجموعے

ابن کثیر بنیادی طور پر بلند پایہ محدث تھے، اکثر حدیث کے مجموعے ان کو حفظ یا مستحضر تھے، محدثین کے مسلک کی ان پر گہری چھاپ تھی۔ شرح حدیث، طبع و تخریج احادیث، فن رجال اور اصطلاح حدیث میں ان کی متعدد قیمتی تصنیفات تھیں۔[۱۴۸] اور غالباً صحیح احادیث کی روشنی میں اسلامی تاریخ مرتب کرنا ان کا مقصد تھا، اس لئے ان کی تاریخ کے ابتدائی حصہ سے سیرت نبوی کی انتہا تک حدیث کا اتنا گہرا رنگ نظر آتا ہے کہ اکثر قاری کو تاریخ و سیرت کے بجائے مجموعۂ احادیث کی کتاب کے مطالعہ کا گمان (بلکہ بدگمانی) ہونے لگتی ہے۔ کسی واقعہ کے سلسلہ میں کوئی تاریخی خبر یا روایت نقل کرتے ہوئے ان کا ذہن بہت سرعت سے دوسرے حدیثی مصادر کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور وہاں وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے، بلکہ متعلقہ تاریخی خبر یا روایت کے حدیثی نظائر و شواہد کو ایک پر ایک کر کے جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر اولیٰ و اصلح کی تلاش میں ان پر علم حدیث کی روشنی میں فنی بحث شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس خبر یا روایت کی ان کے اطمینان کی حد تک ایک محدث کے نقطۂ نظر سے تصدیق یا تردید ہو جائے۔

حدیث کے ان مجموعوں میں قدیم ترین معتبر کتاب صاحب مسلک فقیہ اور مشہور مدنی محدث امام مالک بن انس (۹۳ - ۱۷۹ھ) کی مؤطا

---

[۱۴۶] ایضاً ۱۴/ ۳۱۹ - ۳۲۰ -   [۱۴۷] ایضاً ۶/ ۱۷۸-۱۸۱ -

[۱۴۸] ان تصنیفات میں قابلِ ذکر کتابیں یہ ہیں :

۱- صحیح البخاری کی غیر مکمل شرح ، ۲- صحیح مسلم پر زیادات و حواشی ، ۳- مختصر ابن حاجب کی احادیث کی تخریج ،
۴- جامع المسانید والسنن کے نام سے ایک عظیم الشان مجموعۂ احادیث ۵- رجال و نقد میں التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل
۶- اصطلاح حدیث میں اختصار علوم الحدیث لابن صلاح ، ۷- اختصار کتاب المدخل الی کتاب السنن البیہقی -
۸- کتاب المقدمات اور دیگر رسالے، ان کتابوں کے تفصیلی تعارف کے لئے راقم کی کتاب ابن کثیر: حیاتہ و مؤلفاتہ کے چوتھے باب کی تیسری فصل ملاحظہ فرمائیں ص۹۲ - ۱۴۹

ہے، جو انہوں نے عباسی خلیفہ المنصور (۱۳۶ - ۱۵۸ھ) کی فرمائش پر ترتیب دی تاکہ وہ لوگوں کو اس کے مطابق عمل پر آمادہ کر سکے۔ ابن کثیر نے امام مالک کی عظمت و تحسین کے ساتھ چالیس[۴۰] صفحات پر ان کے حوالے دیے ہیں، جس میں ان کی روایات یا فقہی اقوال نقل کئے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کی مذکور کتاب کے نام کی وضاحت کی ہے[۱۴۹]

اور صحاح حدیث میں امام بخاری[۱۵۰] (۱۹۴ - ۲۵۶ھ)، امام مسلم[۱۵۱] (۲۰۴ - ۲۶۱ھ) ابن خزیمہ[۱۵۲] (۲۲۳ - ۳۱۱ھ) اور ابن حبان[۱۵۳] (وفات ۳۵۴ھ) کے مشہور و معروف صحیح احادیث کے مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔ خاص کر امام بخاری اور امام مسلم کی صحیحین سے (جن کے وہ بجا طور پر قائل و مداح تھے) ابتدا تاریخ کی طرح سیرت نبوی کی تقریباً ہر فصل میں بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی بیان کی ہوئی اکثر احادیث کو کبھی اصل و بنیاد بنا کر اور کبھی نظیر و شاہد کے طور پر نقل کیا ہے۔ اس لیے زیر بحث سیرت کی تشکیل میں صحیحین کا مقام بھی سیر و مغازی و تاریخ کے بنیادی اہم مصادر کے ہم پلہ ہے۔ اور حدیث کی کتابوں میں امام احمد بن حنبل کی مسند کے سوا کوئی اور کتاب ان دونوں کی شریک اور سہیم نہیں ہے۔

اور صحیحین کے ذیل میں ان پر استدراک یا شرح یا اطراف کے طور پر مرتب کی ہوئی کتابوں کا ذکر بھی مناسب ہے، جیسے امام الحاکم (۳۲۱ - ۴۰۵ھ) کی المستدرک جو انہوں نے بخاری و مسلم کی شرائط کی رعایت کرتے ہوئے ترتیب دی، اور ابن کثیر نے ان کی روایات اور استدراکات کے حوالے اڑتیس[۳۸] صفحات پر دیئے، اور کہیں کہیں خود امام حاکم پر بھی استدراک کیا[۱۵۴] اور ایک جگہ ان کے تشیع کی طرف بھی اشارہ کیا[۱۵۵]۔ اسی طرح مہلب بن ابی صفرة (وفات ۴۳۵ھ) کی شرح البخاری[۱۵۶] اور قاضی عیاض (۴۷۶ - ۵۴۴ھ) کی شرح مسلم[۱۵۷] کے ناموں کی ایک ایک بار وضاحت کی ہے۔ اور محی الدین النواوی (۶۳۱ - ۶۷۶ھ) کی شرح مسلم کا اگرچہ نام نہیں لیا ہے، لیکن سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بعض روایات مذکورہ شرح سے ماخوذ ہو سکتی ہیں[۱۵۸]۔ اور ابن کثیر نے اپنے استاد اور خسر جمال الدین ابو الحجاج یوسف المزی (۶۵۴ - ۷۴۲ھ) کی تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف سے بھی استفادہ کیا ہے، اور اس کا حوالہ متعدد جگہ دیا ہے[۱۵۹]۔

حدیث کی دیگر کتابوں میں امام ترمذی (۲۰۹ - ۲۷۹ھ) الجامع الکبیر[۱۶۰] کی روایات کا بھی ابن کثیر کی سیرت نبوی میں قابلِ لحاظ حصہ ہے۔ دو سو سے زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے ان کے حوالوں میں سے بیشتر ان کی مذکور کتاب سے لی گئی ہیں، باقی ان کی شمائل سے ماخوذ ہیں۔

---

[۱۴۹] ایضاً ۵/۱۱۱، ۱۲۹، ۲۳۷ وغیرہ۔

[۱۵۰] تقریباً سات سو صفحات پر ان کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں اکثر ان کی صحیح کی وضاحت کی گئی ہے۔

[۱۵۱] پانچ سو صفحات سے زیادہ پر ان کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی صحیح کا نام بھی حوالے کے طور پر بار بار لیا گیا ہے۔

[۱۵۲] ان کی صحیح کے حوالے بہت کم ملتے ہیں ۳/۲۰۹، ۲۳۲، ۵/۳۸۶، ۳۰۳، ۶/۱۹۳، ۲۷۷

[۱۵۳] ان کے حوالے صرف ستائیس[۲۷] صفحات پر دیئے گئے ہیں۔ [۱۵۴] ایضاً ۲/۲۴۲ اس کے علاوہ ایک ایک بار ان کی الاکلیل اور الصحیح کا حوالہ بھی ایک ایک بار آیا ہے ۳/۲۴۲، ۲۹۸۔ [۱۵۵] ایضاً ۲/۲۳۳۔ [۱۵۶] ایضاً ۳/۱۱۵ جو غالباً سہیلی کے واسطہ سے لیا گیا ہے، دیکھئے الروض الانف ۱/۲۴۴۔ [۱۵۷] ایضاً ۳/۸۔ [۱۵۸] ایضاً ۳/۷، ۱۸، ۶/۲۷۷۔

[۱۵۹] ایضاً ۳/۲۶۱، ۴/۲۰۴، ۵/۱۶، ۵، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۸۰، ۶/۳۴، ۶۱، ۳۰، ۱ - [۱۶۰] ایضاً ۳/۱۶۹، ۴/۹۲۔

جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اسی طرح اس کتاب پر ابوبکر بن العربی کی شرح جو الاحوذی کے نام سے مشہور ہے اس کا حوالہ بھی ایک بار آیا ہے[161]۔

حدیث کی کتابوں میں سنن کے مجموعوں نے بھی ابن کثیر کی سیرت کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے، لیکن وہ صحاح کی مذکورہ کتابوں سے فروتر ہے، جیسے سنن ابن ماجہ (۲۰۹ - ۲۷۳ھ) جس کے نام کی وضاحت کے ساتھ اگرچہ تاریخ کے ابتدائی حصہ میں صرف ایک بار حوالہ آیا ہے[162]، لیکن سیرت کے حصہ میں ابن ماجہ کی روایات ایک سو سینتالیس[147] صفحات پر مذکور رہیں۔ جو بظاہر ان کی سنن ہی سے ماخوذ ہیں اور سنن ابی داؤد (۲۰۲ - ۲۷۵ھ) جس کی روایات، سیرت و شمائل میں دو سو دس[210] صفحات پر نقل ہوئی ہیں اور اکثر اس کتاب کا حوالہ دیا ہے[163]۔ نیز ان کا مرسل احادیث کا مجموعہ المراسیل بھی ابن کثیر کے زیرِ نظر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے نام کی صراحت بھی دو جگہ کی ہے[164] اور النسائی (۲۱۵ - ۳۰۳ھ) کی چھوٹی اور بڑی دونوں سنن سے ابن کثیر نے فائدہ اٹھایا ہے اور تقریباً دو سو صفحات پر بکھرے ہوئے ان کے اقوال و روایات میں بعض جگہ ان کے ابواب تک کے حوالے دیئے ہیں[165] اور بیان کیا ہے کہ ان کو ان دونوں کے سماع کا شرف حاصل تھا[166]۔ الدارقطنی (۳۰۶ - ۳۸۵ھ) کی سنن کے نام کی اگرچہ ابن کثیر نے وضاحت نہیں کی ہے لیکن سولہ[16] صفحات پر ان سے ماخوذ روایات بظاہر اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ اگرچہ تاریخ کے شروع میں ایک جگہ ان کی کتاب الافراد کا حوالہ بھی دیا ہے[167]۔ اور سنن البیہقی (۳۸۴ - ۴۵۸ھ) بھی اُن ہی کتابوں میں سے ہے جن سے ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کا مواد حاصل کیا ہے اور بعض جگہ نام کے ساتھ اس کے حوالے بھی دیئے[168] لیکن جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابن کثیر کی توجہ کا اصل مرکز ان کی کتاب دلائل النبوۃ تھی، جس کے سامنے ان کی دیگر کتابوں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے جیسے الاسماء والصفات (جس کے ایک باب البعث والنشور کا حوالہ بھی علیحدہ آیا ہے) اور الخلافیات جن کا نام کے ساتھ صرف ایک ایک بار حوالہ آیا ہے[169] اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر کس حد تک اعتماد کیا گیا ہے۔

حدیث کے مذکورہ مجموعوں کے بعد ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل میں مسند کے نام سے مشہور حدیث کے مجموعوں کا نمبر آتا ہے، جن میں اہم ترین مقام مسند الامام احمد بن حنبل (۱۶۴ - ۲۴۱ھ) کا ہے، جس کو حقیقتاً ان کے بنیادی مصادر میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ابن کثیر کو اس کتاب سے اتنا شغف تھا کہ احمد محمد شاکر کے بقول وہ ان تین اشخاص میں سے ایک تھے، جن کو "اس مسند کی صحیح معرفت حاصل تھی، اور گویا کہ وہ ان کے نوکِ زبان پر تھی"[170] لیکن ان کی تفسیر، تاریخ اور سیرت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو حدیث کے تمام قدیم مشہور مجموعے بھی اسی طرح مستحضر تھے جیسے کہ مسند مذکور، اور ان کو ان کا صحیح علم، استفادہ کا ملکہ اور استعمال کا وہ سلیقہ حاصل تھا، جو کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مسند سے بھی صحیحین بخاری و مسلم کی طرح بہت زیادہ کام لیا، تقریباً چھ سو[600] صفحات پر اس کے حوالے ابن کثیر کی سیرت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقتاً انہوں نے مذکورہ تینوں کتابوں کے بیشتر حصہ کو اپنی

---

[161] ایضاً ۲ / ۲۵۲ ـ [162] ایضاً ۱ / ۲۴۴ ـ [163] ایضاً ۳ / ۲۵۵، ۴ / ۴۲، ۳۳۲، ۵ / ۱۶۷، ۶ / ۲، ۲۰۹ وغیرہ

[164] ایضاً ۵ / ۷۷، ۲۶۱ ـ [165] ایضاً ۴ / ۲۵۲، ۵ / ۲۰۹ ـ [166] ایضاً ۱۱ / ۱۲۳ ـ

[167] ایضاً ۱ / ۳۳۳ ـ [168] ایضاً ۵ / ۱۱۲، ۱۵۸، ۱۶۳ ـ

[169] ایضاً ۲ / ۲۵۲، ۵ / ۸۳، ۱۲۹، [170] احمد بن حنبل، المسند، مقدمہ و تحقیق احمد محمد شاکر، طبع سوم دار المعارف، القاہرہ ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹م

تاریخ و سیرت میں سمویا ہے اور ان کی مدد سے ان معلومات کی تصدیق، تصحیح یا تردید کی ہے جو ان کو سیر و مغازی و تاریخ یا شمائل و دلائل کی کتابوں سے حاصل ہوئی تھیں، اور ہمارے اندازہ کے مطابق سیرت کی ابتداء سے انتہا تک ابن کثیر کے بنیادی مصادر سیرۃ ابن اسحٰق اور سیرۃ ابن ہشام کا مقابلہ کرنے والی حدیث کی یہی تین کتابیں ہیں جنہوں نے ان کا قدم بہ قدم ساتھ دیا ہے اور ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل میں وہی بنیادی مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے جو مذکورہ دونوں سیرتوں اور شمائل ترمذی اور دلائل اصبہانی اور دلائل بیہقی کو ان کے متعلقہ حصوں میں حاصل ہوا ہے۔

ابن کثیر نے امام احمد بن حنبل کی کچھ روایات ان کے بیٹے عبداللہ (۲۱۳ - ۲۹۰ھ) کے واسطے سے بھی حاصل کی ہیں[171]۔ اور ابتداً تاریخ میں ایک جگہ عبداللہ مذکور کی کتاب الزیادات کا بھی حوالہ دیا ہے[172]۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی مسند پر دس ہزار حدیثوں کا اضافہ کیا تھا[173]۔

امام احمد کی مذکورہ مسند کے علاوہ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں دیگر مشہور مسانید کے مؤلفین کی روایات بھی نقل ہوئی ہیں بعض سے کم اور بعض سے زیادہ، جیسے مسند ابی داؤد الطیالسی (۱۳۳ - ۲۰۴ھ) جن کی روایات تریسٹھ صفحات پر ملتی ہیں۔ جن میں ایک بار مسند مذکور کا حوالہ دیا ہے[174] اور مسند الامام الشافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) جن کے اقوال و روایات کے حوالے سینتالیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اکثر سیرت کے آخری حصہ میں ہیں اور ان میں ایک بار ان کی مسند کا نام لیا ہے جیسے کہ ایک بار ان کی مشہور کتاب الرسالۃ کا بھی حوالہ دیا ہے[175] اور مسند عبد بن حمید (وفات ۲۴۹ھ) ان کی صرف تین روایات بیان کی ہیں۔ جن میں ایک بار اس مسند کی طرف بھی اشارہ کیا ہے[176]۔ اور مسند ابی بکر البزار (وفات ۲۹۲ھ) ان کے حوالے ترپن صفحات پر دیے گئے ہیں، جن میں اکثر ان کی مسند کی وضاحت ہوتی ہے[177] اور مسند ابی یعلی الموصلی (وفات ۳۰۷ھ) جن کے حوالے پینتالیس صفحات پر ملتے ہیں۔ جو اکثر سیرت کے آخری حصہ میں ہیں اور ان میں کئی بار ان کی مسند کے نام کی وضاحت ملتی ہے مثلاً[178]

اور حدیث کی دیگر کتابوں کے مصنفین میں ابن ابی شیبہ (وفات ۲۳۵ھ) کی روایات کا بیس صفحات پر ذکر ہے، جن میں سے بعض جگہ ان کی کتاب المصنف کا حوالہ بھی آیا ہے[179]۔ اور اس کتاب کے بارے میں ابن کثیر کا خیال تھا کہ "ایسی کتاب نہ کسی نے پہلے کبھی لکھی۔ اور نہ بعد میں[180]" اسی طرح ابن ابی عاصم (۲۰۶ - ۲۸۶ھ) کا سیرت کے حصہ میں دوبارہ تذکرہ آیا ہے، جن میں ایک بار اُن کی کتاب المولد کا حوالہ دیا ہے، جبکہ تاریخ کے شروع میں ان کی کتاب السنۃ کا حوالہ دیا تھا[181]۔ جو "سلف کے طریقہ پر احادیث صفت کا مجموعہ ہے[182]"

---

[171] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۵/۴، ۳۸، ۷۳، ۸۰، ۲۱۰، ۲۱۱ ـ [172] ایضاً ۱/۷۶ ـ

[173] الزرکلی، الاعلام ۴/۱۸۹ بحوالہ ابن حجر، تہذیب التہذیب ـ [174] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۳۳۱ ـ

[175] ایضاً ۵/۱۵۲، ۱۴۲ ـ [176] ایضاً ۳/۶۲، ۱۴۱، ۶/۲۷۶ ـ [177] ایضاً ۳/۱۲۵ وغیرہ ـ

[178] ایضاً ۵/۱۱۳ وغیرہ [179] ایضاً ۲/۲۶۰، ۵/۱۱۱، ۶/۲۷۶ ـ [180] ایضاً ۱۰/۳۱۵ ـ

[181] ایضاً ۲/۳۲۳، ۶/۲۸۳، ۱/۱۱ ـ [182] ایضاً ۱۱/۸۴ ـ

اور عین ممکن ہے کہ مذکور کتاب المولد اسی کا حصہ ہو۔

اور معاجم حدیث میں طبرانی (۲۶۰-۳۶۰ھ) کی المعجم الکبیر کا تذکرہ ان کے پینتیس[۳۵] صفحات پر پھیلے ہوئے حوالوں میں کئی جگہ ملتا ہے[۱۸۳] اور عادت کے مطابق ان کی روایات کی تعریف کے ساتھ کمزور مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ نیز ایک بار ان کی کتاب المناسک کا بھی حوالہ دیا ہے[۱۸۴]

۷۔ تراجم اور نقد رجال کی فنی کتابیں

حدیث کے ان تمام قدیم مجموعوں کے علاوہ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں معاجم صحابہ کرام کے مؤلفین سے بھی بعض جگہ روایات اور اکثر جگہ فنی معلومات اور ناقدانہ آراء یعنی توثیق و تضعیف کے اقوال وغیرہ حاصل کئے گئے ہیں اور بعض موقعوں پر ان کی کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ جیسے ابوالقاسم عبداللہ البغوی (۲۱۳-۳۱۷ھ) کے سترہ[۱۷] حوالوں میں بعض جگہ ان کی معجم الصحابۃ کا ذکر کیا ہے[۱۸۵] اور ابوعبداللہ محمد بن اسحٰق بن مندہ (۳۱۰-۳۹۵ھ) کے بیس حوالوں میں ان کی کتاب دو نام سے ذکر کی گئی ہے۔ یعنی معرفۃ الصحابۃ اور معجم الصحابۃ[۱۸۶] جو بظاہر ایک ہی کتاب کے دو نام معلوم ہوتے ہیں اور ابو موسیٰ المدینی جن کی کسی کتاب کی ابن کثیر نے وضاحت نہیں کی ہے، لیکن ان کا نام اسماء صحابہ کرام کے جمع کرنے والوں کے ذیل میں آیا ہے[۱۸۷] اور ابونعیم الاصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ) کی معرفۃ الصحابۃ جس کا مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ابن کثیر کے پاس موجود تھا[۱۸۸] مگر حوالہ کے طور پر اس کے نام کی وضاحت ابن کثیر نے صرف ایک بار کی ہے[۱۸۹]۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ امہات المؤمنین اور آپؐ کی اولاد، غلام، لونڈیوں اور کتاب وغیرہ کے حصہ کی ابونعیم کے حوالہ سے دی ہوئی معلومات و اقوال ان کی مذکور کتاب ہی سے لئے گئے ہیں، ان کے علاوہ ابن عبدالبر (۳۶۸-۴۶۳ھ) کے سترہ حوالوں میں ان کی کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کی وضاحت بھی متعدد جگہ ملتی ہے[۱۹۰] اور ابن الاثیر (۵۵۵-۶۳۰ھ) کے تیس حوالوں میں انکی مشہور کتاب اُسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ کا سیرت اور تراجم صحابہ کرام میں بار بار تذکرہ آیا ہے[۱۹۱]۔ اور اس کتاب کی جمع و ترتیب کی تعریف کی ہے[۱۹۲]

---

۱۸۳ ایضاً ۴/۳۶۶، ۵/۵۹، ۶/۴۰۔ ۱۸۴ ایضاً ۵/۱۷۵۔

۱۸۵ ایضاً ۵/۳۱۳، ۳۱۵، ۳۳۲،

۱۸۶ ایضاً ۳/۱۲۷، ۳۴۶، ۳۹۹، ۵/۳۳۲، عمر رضا کحالۃ ان کی معرفۃ الصحابۃ کے علاوہ ایک اور کتاب طبقات الصحابۃ والتابعین کا ذکر کرتے ہیں، لیکن معجم الصحابۃ ان کے لئے بھی نامعلوم ہے۔ معجم المؤلفین ۹/۴۲)

۱۸۷ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۵/۹۴، ۳۵۶۔ ۱۸۸ ایضاً ۱۲/۴۵، ۱۳/۳۹

۱۸۹ ایضاً ۵/۹۴۔ ۱۹۰ ایضاً ۲/۲۶، ۴/۳۹، ۳۷۳، ۵/۵۷، ۲۹۹، ۳۳۰، ۳۵۴، ۳۵۶، وغیرہ۔

۱۹۱ ایضاً ۳/۱۵۶، ۱۶۱، ۳۲۹، ۳۷۰، ۴/۹۰ وغیرہ۔

۱۹۲ ایضاً ۵/۳۵۶۔

حدیث کے متذکرہ بالا متنوع عظیم ذخیرہ کو اپنی سیرت میں سموتے وقت ظاہر ہے کہ ابن کثیر کو صحیح و غیر صحیح احادیث میں تمیز کرنے کے لیے غریب، مشکل اور موضوع احادیث کے ماہر مؤلفین کے اقوال اور ان کی فنی کتابوں کی مدد کی ضرورت پڑی، چنانچہ ان علماء کے اقوال بکثرت اور کہیں کہیں ان کی کتابوں کے ناموں کے حوالے بھی ابن کثیر نے دیے، جیسے قاسم بن ثابت العوفی (۲۵۵-۳۰۲ھ) کی غریب الحدیث[193] ابو جعفر الطحاوی (۲۳۹-۳۲۱ھ) کی مشکل الحدیث[194] اور ابن الجوزی (۵۰۸-۵۹۷ھ) کی الموضوعات[195]

اسی طرح اس عظیم الشان ذخیرہ حدیث میں سے اولی و اصلح کی تلاش و جستجو کے دوران متنازع راویوں کے حالات کی چھان بین سے واسطہ پڑا اور وہ تمام مذکور محدثین کے اقوال کے علاوہ قدیم ترین ماہر علمائے نقد کے اقوال و آثار کا ذکر کرنے پر بھی مجبور ہوئے جیسے یحییٰ بن معین (۱۵۸-۲۳۳ھ) علی بن المدینی (۱۶۱-۲۳۴ھ) عمرو بن علی الفلاس (۱۶۰-۲۴۹ھ) ابو سلیمان الجوزجانی (وفات ۲۵۹ھ) ابو حاتم الرازی (۱۹۵-۲۷۷ھ) اور ابو زرعۃ الدمشقی (وفات ۲۸۱ھ) اور ان کے علاوہ انہوں نے مندرجہ ذیل علمائے نقد کے اقوال اور جابجا ان کی کتابوں کے حوالے بھی دیے جیسے ابن عدی (۲۷۷-۳۶۵ھ) کی کتاب الکامل[196] اور الدارقطنی (۳۰۶-۳۸۵ھ) کی کتاب الافراد جس کے بارے میں ابن کثیر کا خیال تھا کہ "بڑے بڑے مردِ میدان ناقد امام اور نادرۂ روزگار حفاظ حدیث کے لیے اس جیسی کتاب ترتیب دینا تو الگ رہا، ان کے لیے اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے[197]۔" اس کتاب کا حوالہ تو ابن کثیر نے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصہ میں صرف ایک بار ہی دیا ہے[198]۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کے تمام اقوال جو اکثر راویوں کی توثیق یا تضعیف میں بیان ہوئے ہیں، وہ دارقطنی کی اسی نادرۂ روزگار کتاب سے لئے گئے ہیں۔ اس باب میں ابن کثیر نے اپنے ناقد استاد اور خسر جمال الدین ابوالحجاج یوسف المزی (۶۵۴-۷۴۲ھ) کے بھی توثیق و تضعیفِ رواۃ میں بکثرت اقوال نقل کیے ہیں اور بعض جگہ ان کی مشہور کتاب تہذیب الکمال فی أسماء الرجال کے حوالے بھی دیے ہیں[199] اور ان سے حاصل کی ہوئی زبانی معلومات بھی جابجا جمع کر دی ہیں[200]۔ اسی طرح اگرچہ ان کے دوسرے استاد شمس الدین ابو عبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی میزان الاعتدال فی نقد أسماء الرجال کے نام کا حوالہ سیرت کے حصہ میں نہیں ملتا، لیکن ان کی ناقدانہ آراء متنازعہ احادیث و رجال کے سلسلہ میں مل جاتی ہیں[201]۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی کے مذکورہ متنوع مصادر و مآخذ کے اس مختصر جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی محنت جاں فشانی اور صبر و استقامت سے اس جامع و شامل سیرت کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا ہے اور اپنے زمانہ تک کے سیرت و شمائل و دلائل

---

[193] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۹۲۔
[194] ایضاً ۶/۸۵، ۸۶، ۲۸۲۔
[195] ایضاً ۳/۱۳۴، ۷۸، ۷۹، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۲۸۲۔
[196] ایضاً ۵/۳۴۷۔
[197] ایضاً ۱۱/۳۱۷۔
[198] ایضاً ۱/۳۲۳۔
[199] ایضاً ۳/۳۱۵۔
[200] ایضاً ۴/۱۹۴، ۵/۳۴۷، ۶/۲۴۴، ۲۵۸، ۲۷۶۔
[201] ایضاً ۵/۲۰۹، ۲۱۲-۲۱۴، ۶/۷۹، ۲۵۱، ۲۸۲۔

کے اہم مواد کو اس میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور بڑی حد تک تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب آئندہ صفحات میں ان کی سیرت کے ان اہم موضوعات کو مختصراً سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں بکھرا ہوا ہے جیسے طریقہ کار، علمی دیانت، ترتیب کتاب، اسلوب بیان اور مذکورہ سیرت کی مقبولیت وغیرہ۔

حاصل بحث

ا۔ طریقۂ کار

ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کی ترتیب و تدوین کے طریقۂ کار کی الگ سے کوئی وضاحت نہیں کی ہے، سوائے ان اشاروں کے جو ان کی تاریخ البدایۃ والنہایۃ کے ابتدائی حصہ میں ان کے تفسیر قرآن کے مسلک اور مقبول و مردود اور موقوف اسرائیلی روایات سے متعلق ہیں[۲۰۲] اور جن کا ذکر قرآنی تفاسیر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

لیکن ان کا یہ تفسیری طریقۂ کار اور اسرائیلیات کے بارے میں مذکورہ مؤقف جس طرح ان کی عام تاریخ کے لیے کافی بنیاد نہیں فراہم کرتا، اسی طرح ان کی مذکورہ سیرت کی تدوین کے لئے بھی اس کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ اسرائیلی روایات کا اصل میدان سابق انبیاء کرام اور ان کی قوموں کی تاریخ تھی، جن کا مجمل ذکر قرآن کریم نے صرف عبرت و موعظت کے نقطۂ نظر سے کیا تھا اور بعد میں ان مجمل اشاروں کی غیر ذمہ دارانہ تفصیلی خانہ پُری عیسائی اور یہودی علماء سے سنے سنائے قصوں اور داستانوں کی بنیاد پر رکھی گئی اور ان کو رواج دیا گیا، لیکن مستند مسلمان علماء نے ان کو کبھی قابلِ اعتنا نہ کیا، ان کے ذکر کو بھی مستحسن نہ سمجھا، بلکہ ان کو اسرائیلیات کا مخصوص نام دے کر اسلامی روایات و احادیث سے بالکل الگ تھلگ رکھا اور ان کا گذر سیرت پاک کی روایات میں اس لئے نہیں ہو پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ روزِ روشن کی طرح عیاں رہی اور اس میں باہر سے درآمد کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی اور قصہ گو واعظین کے زیبِ داستان کے لئے خیال آرائی اور مبالغہ آمیزی پر مبنی بیانات کو نہ صرف یہ کہ وقت کے علماء نے پسند نہ کیا بلکہ ان کے نامۂ اعمال میں ان کے میلانات و رجحانات اور ان کی غیر محتاط روش کا پردہ چاک کر کے بعد کے آنے والوں کو ان کی روایات سے محتاط رہنے کے لئے ہوشیار کر دیا۔

بہرحال زیرِ بحث سیرت نبوی میں ابن کثیر کا طریقۂ کار معلوم کرنے کے لئے ان کی سیرت کا تتبع ضروری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیرت کے بنیادی مصادر اصحابِ سیر و مغازی و تاریخ اور اہلِ حدیث علماء اس سلسلہ میں ان کے لئے نمونہ و مثال رہے ہیں، خاص کر ابن اسحٰق، ابن ہشام، سہیلی اور طبری جن سے انہوں نے اپنی سیرت کا ڈھانچہ اخذ کیا اور انہی کے طریقۂ کار پر عمل پیرا ہوئے اور شمائل کے حصہ میں امام ترمذی کی اتباع کی اور دلائل کے حصہ میں امام بیہقی اور ابو نعیم الاصبہانی کے طریقِ کار کو عمومی طور پر اپنا رہنما بنایا اور سیرت کے تینوں مذکور حصوں میں امام بخاری، امام مسلم اور امام احمد بن حنبل سے بھی گہرا تاثر قبول کیا، اور ان کے اور

---

[۲۰۲] ایضاً ۱/۶-۷، ۱۳۲/۲-۱۳۴۔

دیگر محدثین کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سند کے ساتھ روایت اور سلسلۂ سند اور کبھی کبھی متن کی تنقیدی بحث و تحقیق اور احادیث و روایات کی صحت و ضعف اور استناد و اعتبار کا درجہ بیان کرنے کا اہتمام و التزام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

لیکن دلائل نبوت کے باب میں ان کا تساہل حیرت انگیز بھی ہے اور تعجب خیز بھی اور اس کا عذر خواہ وہ سابقین کی تقلید ہو یا عجائب و غرائب سے دلچسپی یا احاطہ و شمول کا شوق جنون[۲۰۳]، بہر حال عذر بدتر از گناہ کے مصداق ہے۔ لیکن اس لئے قابل درگذر بھی ہے کہ وہ اکثر خود ہی اس کی طرف توجہ مبذول کراتے جاتے ہیں۔

۲۔ علمی دیانت

ان کی عالمانہ شان و عظمت کے مطابق یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ اپنے مصادر و مآخذ کی خود ہی نشاندہی کرتے جاتے ہیں اور عام طور پر احادیث کے علاوہ سیر و مغازی و تاریخ کے مواد میں بے ضرورت نقل حرفی سے کام نہیں لیتے، کیونکہ ان کے سامنے جو وافر مواد تھا اس کو اپنی سیرت میں ضم کرنے میں یہ ممکن بھی نہ تھا اور مسلسل مربوط سیرت نگاری کے لئے ایک مستحسن اور مطلوب قدم بھی۔ اس لئے حتی الامکان وہ اپنے سامنے ایک واقعہ سے متعلق تمام روایات کو رکھ کر اختصار و تلخیص حذف و اضافہ، زیادتی و کمی اور تقدیم و تاخیر سے کام لیتے ہوئے، ان کو اپنی زبان میں ایک سیاق میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بوقت ضرورت اس میں اضافی معلومات اور اختلافی نکات کو نمایاں کرنے کے لیے اکثر ان مؤلفین کے نام اور کبھی کبھی اُن کی کتابوں کے حوالے دیتے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار کے ضمنی فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ سابق مؤلفین کی حق شناسی اور قدر دانی کے فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ان کی بہت سی ایسی کتابوں کے نام، ان کی آراء اور اُن کے اقتباسات کے نمونے محفوظ ہو گئے جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ نیز خود ان کے مصادر و مآخذ پر بعد کے زمانہ میں تحقیقی کام کرنے والوں کو سہولت فراہم ہو گئی۔ جس کے لیے کم از کم راقم تو بہت زیادہ شکر گزار ہے۔

۳۔ تنقیدی غیر جانبداری

ان کی ایک اور قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذکورہ مصادر و مآخذ سیرت میں سے کسی کو بھی آنکھ بند کر کے قبول یا رد نہیں کیا ہے، بلکہ ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں اور اپنے علم و بصیرت اور ضمیر کی روشنی میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے معلومات اور اقتباسات حاصل کئے ہیں اور بوقت ضرورت ان پر کلام بھی کیا ہے، تعریف و تحسین کے موقعوں پر بخل سے کام نہیں لیا، اور بھول چوک، مغالطہ، بے محل استنتاج اور غلط رائے پر خاموش نہیں رہے، بلکہ قدماء کی سبقت اور عظمت کا خیال کئے بغیر کھل کر گرفت کی، چنانچہ ہماری نظر سے مذکورہ مصادر میں کوئی ایسا اہم مصدر نہیں گذرا، جس کی بوقت ضرورت انہوں نے تصحیح و تنقید یا اس پر استدراک نہ کیا ہو۔

---

۲۰۳ ایضاً ۲/۳۱۹، ۳۵۶، ۳/۱۴۵، ۵/۹۶-۹۷، ۶/۲۹۶،

۴۔ ترتیب کتاب

سیرت کی ترتیب کے سلسلہ میں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ابن کثیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہجرت مدینہ سے پہلے تک کے حالات و واقعات و حوادث "موضوعات کی ترتیب زمانی" کے لحاظ سے بیان کئے ہیں، جس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک واقعہ سے متعلق تمام مواد ایک جگہ مل جاتا ہے جبکہ ہجرت کے بعد کے حالات و واقعات اور غزوات و فتوحات "سن وار" ترتیب کے لحاظ سے بیان کئے ہیں، لیکن مہینہ تاریخ اور دن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ قدیم تاریخی واقعات میں اس کا لحاظ رکھنا ناممکن تھا۔ بہر حال اس طریقۂ کار کا سقم اس وقت بری طرح محسوس ہوتا ہے جب کئی سالوں میں پیش آنے والے واقعات جنگوں وغیرہ کی تفصیلات کے لئے قاری کو مسلسل کئی کئی سالوں کے حالات کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے اور اس تسلسل کے ٹوٹنے کا اثر خود مؤرخ یا سیرت نگار پر کبھی تکرار کی شکل میں اور کبھی سہو و نسیان کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

لیکن ابن کثیر کی سیرت کے مابعد ہجرت حصہ میں "سن وار" تقسیم کے باوجود اس عیب کو ابھرنے نہیں دیا گیا ہے، جیسا کہ بعد کے تاریخی حصہ میں پیش آیا ہے، کیونکہ ہجرت کے ابتدائی دس گیارہ سال میں ایسے واقعات پیش نہیں آئے، ابن کثیر نے مذکورہ ابتدائی سالوں کے واقعات کو "........ سن ہجری کے واقعات" یا "........ سن ہجری کے واقعات کا ذکر" یا صرف "..... سن ہجری" کے عنوان سے شروع کیا ہے اور پھر انہوں نے ہر سال کے واقعات کو بھی حسب سابق موضوعات یا علیحدہ مستقل فصول کے تابع کر دیا ہے بعض سالوں کے آخر میں اس سال کے "جملہ حوادث" کی فصل قائم کی ہے، لیکن اس کا التزام نہیں کیا ہے وفیات کا ذکر اکثر سال کے درمیان میں گذر چکا ہے، اس لئے سال کے آخر میں ان کے ذکر کی پابندی بھی نہیں کی گئی ہے اور ان کے حالاتِ زندگی کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہے۔

۵۔ اسلوبِ بیان

ابن کثیر کی بہترین علمی استعداد کے ساتھ ساتھ ان کی "ادبی صلاحیت بھی اچھی تھی، اور وہ شعر بھی کہہ لیتے تھے"[۲۰۴] لیکن وہ کوئی پیشہ ور ادیب و شاعر نہ تھے کہ بات میں بات پیدا کرنے کے لیے لفظی سجع و صنع اور اسلوب کی زیبائی اور عبارت کی جمال آرائی میں اپنا فنی کمال ثابت کرنے پر زور دیتے، ان کی علمی تحریر جان دار پختہ، بے عیب اور فکر و معانی سے لبریز ہے اور انداز بیان تصنع اور تکلف سے پاک سادہ سلجھا ہوا، اور دلنشین ہے۔

۶۔ مقبولیت

ابن کثیر ان خوش قسمت مصنفین میں ہیں جن کی تصنیفات ان کی زندگی میں بھی مشہور اور مقبول عام و خاص ہوئیں اور ان کے بعد بھی

۲۰۴ء ابن قاضی شہبہ، طبقات الشافعیہ، ۳/۱۱۵، النعیمی، الدارس فی تاریخ المدارس مطبعۃ الترقی، دمشق، ۶۷-۱۳۷۰ھ ۱/۳۷، طاشکبری زادہ، مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۲۸-۱۳۵۶ھ ۱/۲۴، ابن العماد، شذرات الذہب ۶/۲۳۱۔

متداول رہیں۔ چنانچہ ان کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ "اُن کی تصنیفات ان کی زندگی ہی میں ملک ملک پہنچیں اور ان کی وفات کے بعد بھی لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا[۲۰۵]" اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر و بیشتر مشہور کتابیں زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ رہیں اور ہم تک پہنچ سکیں۔

ان کی زیرِ بحث سیرت کے سلسلہ میں بھی مقبولیتِ عام و خاص کی بات صحیح ہے، جس کی مندرجہ ذیل واقعہ تصدیق کرتا ہے جو خود ابنِ کثیر کی زبانی ان کی تاریخ میں نقل ہوا ہے۔ اوّل عشرہ ماہ رجب ۷۶۳ھ کے واقعات میں وہ رقم طراز ہیں کہ "قاضی عماد الدین الشیرازی ایک صاحبزادہ نے ایک درسِ حدیث کا پروگرام ترتیب دیا جس میں عماد الدین بن السراج نے البدایۃ والنہایۃ میں جو کچھ آیا ہے، اس پر گفتگو فرمائی، ان کے پاس بہت سے لوگ اور ایک جمِ غفیر جمع تھا، اور انہوں نے میرے ہاتھ سے لکھی ہوئی سیرت نبوی دمشق کے قبۃ النسر کے نیچے اس کرسی پر سے پڑھی جہاں سے قرآن شریف کی تلاوت کی جاتی ہے[۲۰۶]۔"

اسی طرح ان کے ترجمہ نگاروں نے بھی ان کی اس سیرت کی تعریف و توصیف کی ہے۔ چنانچہ ابن قاضی شہبہ کا خیال تھا کہ "ابن کثیر کی تاریخ میں سب سے بہتر ان کی سیرت نبوی ہے[۲۰۷]" اور سخاوی نے بھی اس سیرت کی تعریف کی ہے[۲۰۸]۔ اور لکھا ہے کہ شہاب الدین احمد بن اسمٰعیل الابشیطی (وفات ۸۳۵ھ) کی سیرت کی جامع کتاب میں منجملہ اور مصادر کے ابنِ کثیر کی تاریخ میں مذکور سیرت پر مشتمل ہے[۲۰۹]۔

خاتمہ

اس بحث میں ابنِ کثیر کی سیرت نبوی کے اس مختصر جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سیرت کی ترتیب و تدوین میں کتنی عرق ریزی اور جگر سوزی سے کام لیا ہے، انہوں نے علم حدیث کے فنی اختصاص کی روشنی میں اپنے مصادرِ سیرت کا انتخاب کیا اور عام طور پر ان مؤرخین و سیرت نگاروں کو جیا جن کی فن حدیث سے علمی یا در تصنیفی مناسبت مسلّم تھی اور تقریباً ساڑھے سات سو سال پر پھیلی ہوئی طویل مدت میں اسلامی علوم و فنون کی متعلقہ علمی و فنی اور اختصاصی تخلیقات کو کھنگال ڈالا اور سیر و مغازی و تاریخ کی معروف و مشہور کتابوں کے علاوہ آسمانی کتابوں، قرآنی تفسیروں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی جزئی پہلوؤں سے متعلق اکثر و بیشتر عام و خاص کتابوں کے مواد کو قابلِ اعتبار ذخیرۂ حدیث کے ساتھ بہت تفصیل سے پہلی بار ایک جگہ سلیقہ سے جمع کر دیا اور پھر اس کو علم حدیث کے ماہرانہ فنی ادراک کی روشنی میں پرکھا اور اس طرح "تاریخ و سیرت کے باب میں" قابلِ قدر نئے طریقے اور عظیم علمی ذخیرہ کا اضافہ کیا، جو ایک طرف ان کو دوسرے مؤرخین اور سیرت نگاروں سے ممتاز کرنے والی خصوصیت ہے، تو دوسری طرف ان کے بعد سیرت پر کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ۔

۲۰۵ـــہ ابنِ حجر، الدرر الکامنۃ فی اعیان المئۃ الثامنۃ، دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۳۵۰ھ، ۱/۳۷۴، السیوطی، ذیل طبقات الحفاظ الذہبی، مطبعۃ توفیق، مصر، ۱۳۴۷ھ، ۳۶۱ - ۳۶۲، الشوکانی، البدر الطالع بمحاسن القرن السابع، مطبعۃ السعادۃ، القاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۱/۱۵۳ ـ

۲۰۶ـــہ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۴/۲۹۴ ـ

۲۰۷ـــہ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۱/۲۲۸ ـ ۲۰۸ـــہ السخاوی، الجواہر والدرر، ضمیمہ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ ص ۳۵۹ ـ

۲۰۹ـــہ السخاوی، الاعلان ص ۱۶۲-۱۶۳ ـ

علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی

محمد عبدالحکیم شرف قادری

حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل بن یوسف بن اسماعیل بن ناصر الدین نبہانی قدست اسرارہم فلسطین کی شمالی جانب واقع قصبہ اجزم میں ۱۲۶۵ھ/ ۹-۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے یہ قصبہ اس وقت حیفا کے حدود میں واقع ہے، عرب کے ایک بادیہ نشین قبیلہ بنو نبہان کی نسبت سے نبہانی کہلاتے ہیں، قرآن پاک والد ماجد شیخ اسماعیل نبہانی سے پڑھا، اسی سال کی عمر کے باوجود ان کے حواس بالکل صحیح اور صحت بہت عمدہ تھی اکثر و بیشتر اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرتے وہ ہر روز دس پارے کی تلاوت کرتے پھر ایک ہفتے میں تین قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے۔

پھر علامہ نبہانی جامع ازہر مصر میں داخل ہوئے اور محرم ۱۲۸۳ھ سے رجب ۱۲۸۹ھ تک تکمیل علم میں مصروف رہے، علامہ فرماتے ہیں میں نے وہاں ایسے ایسے محقق اساتذہ سے استفادہ کیا کہ اگر ان میں ایک بھی کسی ولایت میں موجود ہو تو وہاں کے رہنے والوں کو جنت کی راہ پر چلانے کے لیے کافی ہو اور تن تنہا تمام علوم میں لوگوں کی ضروریات کو پورا کر دے۔

چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

۱۔ علامہ سید محمد دمنہوری شافعی (۱۲۸۶ھ)

۲۔ علامہ شیخ ابراہیم الزور خلیلی شافعی (م ۱۲۸۷ھ)

۳۔ علامہ شیخ احمد الاجھوری شافعی نابینا (م ۱۲۹۳ھ)

۴۔ علامہ شیخ حسن العدوی المالکی (م ۱۲۹۸ھ)

۵۔ علامہ شیخ سید عبدالہادی نجا الابیاری (م ۱۳۰۰ھ)

۶۔ علامہ شیخ شمس الدین محمد الانبابی الشافعی (اس وقت کے شیخ الازہر)

۷۔ علامہ شیخ عبدالرحمٰن الشربینی الشافعی

۸۔ علامہ شیخ عبدالقادر الرافعی الحنفی الطرابلسی:
(شامی پر التحریر کے نام سے دو جلدوں میں ان کا حاشیہ ہے)

۹۔ علامہ شیخ یوسف برقادی حنبلی، شیخ المشائخ علامہ ابراہیم السقا الشافعی (م ۱۲۹۸ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ۔

علامہ نبہانی سب سے زیادہ اپنے استاذ علامہ ابراہیم السقا کے معترف اور مداح دکھائی دیتے ہیں، ان سے شیخ الاسلام زکریا انصاری کی شرح تحریر اور شرح منہج اور ان پر علامہ شرقاوی اور بجیرمی کے حواشی پڑھے اور تین سال تک اُن سے فیض یاب ہوئے، انہوں نے علامہ نبہانی کو سند دیتے ہوئے ان القاب سے نوازا ہے۔

الامام الفاضل والھمام الکامل والجھبذ الابر، اللوذعی الاریب والالمعی الادیب
ولدنا الشیخ یوسف بن الشیخ اسمٰعیل النبھانی ایدہ اللہ بالمعارف ونصرہ

اندازہ کیجیے کہ اساتذہ کی نظر میں علامہ نبہانی کی کتنی قدر و منزلت تھی، اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ مذہباً شافعی تھے۔

جب علامہ کے علم و فضل کا چرچا ہوا تو بیروت میں محکمۃ الحقوق العلیا کے رئیس (وزیر انصاف) مقرر کئے گئے، ایک عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے، آخر عمر میں انہوں نے اپنے اوقات عبادت اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیئے اور ایک عرصہ مدینہ طیبہ میں رہے۔

حضرت علامہ نبہانی قدس سرہ نے اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، ان کی تمام تصانیف مفید ہیں اور مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ ان کی تمام تصانیف حدیث شریف اور اس کے متعلقات سے وابستہ ہیں، حدیث شریف کے علاوہ انہوں نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی فرمائی ہے سیرت مبارکہ، علم الاسانید، اکابر علماء و مشائخ کا تذکرہ درود شریف اور بارگاہ رسالت میں پیش کئے جانے والے قصائد و جواہر جو خود علامہ نے لکھے یا مذاہب اربعہ کے متقدمین اور متاخرین علمائے لکھے، ان کی تصانیف کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی تمام کتابیں چھپ چکی ہیں، بلکہ بعض کتابوں کے تو کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا عطا محمد گولڑوی مدظلہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی، امام احمد رضا بریلوی اور علامہ نبہانی کا وصف مشترک یہ تھا کہ انہوں نے پوری زندگی نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں بسر کی اور تا حیات عشق رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا درس دیتے رہے، دین اسلام کی خدمت ان کا سرمایۂ حیات اور قرآن و حدیث کی تبلیغ و اشاعت ان کا وظیفۂ زندگی تھا۔

علامہ نبہانی نے سات سو پچاس اشعار پر مشتمل قصیدۃ الرائیۃ الکبریٰ لکھا جس میں دین اسلام اور دیگر ادیان کا تقابل پیش کیا ہے بالخصوص عیسائیت کا تفصیلی رد کیا ہے کیونکہ عیسائی آئے دن اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے، دوسرا قصیدۃ الرائیۃ الصغریٰ پانچ سو پچاس اشعار پر مشتمل لکھا جس میں سنت مبارکہ کی تعریف و توصیف اور بدعت کی مذمت کی اور اُن اہل بدعت مفسدین کا بھرپور رد کیا جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کی زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

ان قصائد کو آڑ بنا کر بعض کفار اور منافقین نے سلطان عبدالحمید، سلطان ترکی کے کان بھرے کہ علامہ نبہانی ان قصائد کے ذریعے تمہاری رعایا میں انتشار پھیلا رہے ہیں چنانچہ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں جب علامہ مدینہ طیبہ پہنچے تو انھیں شاہی حکم کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔

علامہ فرماتے ہیں:

حُبِستُ فِی المَدِینَۃِ مُدَّۃً اُسبُوعٍ لٰکِن بِالاِکرَامِ وَالاِحتِرَامِ[2]

"مجھے مدینہ طیبہ میں ایک ہفتے تک قید رکھا گیا، لیکن عزت و احترام کے ساتھ"

قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنی خلیفہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہما اس واقعہ کا عینی شاہد تھے انہوں نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا اور مولانا الحاج محمد منشا تابش قصوری نے اسے قلم بند کیا، انہی کے الفاظ میں تفصیل ملاحظہ ہو:

ایک دفعہ سلطان عبدالحمید نے مدینہ منورہ کے گورنر بصری (پاشا) کو علامہ نبہانی کی گرفتاری کا حکم دیا، گورنر بصری علامہ کا انتہائی معتقد تھا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلطان کا حکم نامہ پیش کیا، علامہ نبہانی ملاحظہ فرماتے ہی گویا ہوئے:

سَمِعتُ وَقَرَأتُ وَاَطَعتُ

میں نے سنا، پڑھا اور اطاعت کی

گورنر بصری عرض کرنے لگا حضرت! گرفتاری تو ایک بہانہ ہے گورنر ہاؤس تشریف لائیے آپ میرے ہاں حیثیت

مہمان ہی ہوں گے، اس بہانے مجھے میزبانی کا شرف حاصل ہو جائے گا جو علماء و فضلا اور مشائخ آپ سے ملاقات کے لئے آئیں گے وہ بھی میرے ہی مہمان ہوں گے، آپ کے عقیدت مندوں پر گورنر ہاؤس کے دروازے ہر وقت کھلے رہیں گے، آپ کا گورنر ہاؤس میں قیام قید نہیں محض سلطان کے حکم کی تعمیل کا ایک حیلہ ہے۔

حضرت علامہ یوسف نبہانی عالم اسلام کی ممتاز شخصیت تھے، ہم عصر علماء و مشائخ کے ان کے ساتھ گہرے مراسم تھے ان کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح بڑی تیزی سے عالم اسلام میں پھیل گئی خاص و عام سراپا احتجاج بن گئے، مگر علامہ یوسف بالکل مطمئن، گھبراہٹ اور پریشانی کا نام تک نہیں تھا پھر بھی علماء و زعماء ملت نے ملاقات کے دوران علامہ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کی رہائی کے لئے سلطان سے اپیل کرتے ہیں علامہ نے فرمایا: اگر آپ کو اپیل کرنا منظور ہے تو سلطان وقت کی بجائے سلطان کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں صلوٰۃ و سلام کے ساتھ یوں استغاثہ عرض کریں:

صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ صَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ صَلٰوۃً وَّسَلَامًا عَلَیْکَ
یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَلَّتْ حِیْلَتِیْ اَنْتَ وَسِیْلَتِیْ اَدْرِکْنِیْ یَا سَیِّدِیْ
یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

حضرت قطب الوقت (مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنی قدس سرہ) نے فرمایا چنانچہ ہم نے اگلی تین دن تک ہی اس درود شریف کے ساتھ استغاثہ پیش کیا تھا کہ سلطان عبدالحمید کے گورنر بصری کو پیغام ملا حضرت الشیخ یوسف النبہانی کو باعزت بری کر دیا جائے۔

علامہ نبہانی فرماتے ہیں:

جب حکومت پر واضح ہو گیا کہ میں پورے خلوص کے ساتھ دین اسلام کی خدمت کر رہا ہوں اور دین متین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کر رہا ہوں تو میری رہائی کا حکم صادر کر دیا گیا اور حکومت کے ذمہ دار افراد نے گرفتاری پر معذرت پیش کی۔

علامہ نبہانی کی تصانیف عالیہ کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ الفتح الکبیر فی ضم الزیادات الی الجامع الصغیر، جامع صغیر اور اس کے حاشیہ "زیادۃ الجامع الصغیر" پر مشتمل ہے، یہ دونوں کتابیں چودہ ہزار چار سو پچاس حدیثوں پر مشتمل تھیں علامہ نبہانی نے انھیں حروف معجم کے مطابق مرتب کیا ہر حدیث کے بارے میں بتایا کہ یہ کس نے روایت کی ہے اور ان کا اعراب بھی بیان کیا، یہ کتاب مطبوعہ مصطفےٰ البابی الحلبی و اولادہ مصر کی طرف سے تین جلدوں میں علامہ کے وصال کے بعد چھپی۔

۲۔ منتخب الصحیحین: تین ہزار دس حدیثوں پر مشتمل ہے اور اعراب و حرکات مکمل طور پر لگائے گئے ہیں۔

۳۔ قرۃ العینین علی منتخب الصحیحین: منتخب الصحیحین پر حاشیہ۔

۴۔ وسائل الوصول الی شمائل الرسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم۔

۵۔ افضل الصلوات علےٰ سید السادات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

۶ - الاحادیث الاربعین فی وجوب طاعۃ امیر المومنین -

۷ - النظم البدیع فی مولد الشفیع صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم -

۸ - الہمزیۃ الالفیہ (طیبۃ الغراء) فی مدح سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم -

۹ - الاحادیث الاربعین فی فضائل سید المرسلین -

۱۰ - الاحادیث الاربعین فی امثال افصح العالمین -

۱۱ - قصیدہ سعادۃ المعاد فی موازنۃ بانت سعاد -

۱۲ - مثال نعلہ الشریف صلی اللہ علیہ وسلم

۱۳ - حجۃ اللہ علی العالمین فی معجزات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم -

۱۴ - سعادۃ الدارین فی الصلوٰۃ علی سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم -

۱۵ - السابقات الجیاد فی مدح سید العباد صلی اللہ علیہ وسلم -

۱۶ - خلاصۃ الکلام فی ترجیح دین الاسلام -

۱۷ - ہادی المرید الی طرق الاسانید ثبتہ الجامع النافع -

۱۸ - الفضائل المحمدیۃ ترجمہا لبعض السادات العلویۃ للغۃ الجاویہ -

۱۹ - الورد الشافی یشتمل علی الادعیہ والاذکار النبویۃ -

۲۰ - المزدوجۃ الغراء فی الاستغاثۃ باسماء اللہ الحسنیٰ -

۲۱ - المجموعۃ النبہانیۃ فی المدائح النبویہ واسماء رجالہا (چار جلدوں میں)

۲۲ - نجوم المہتدین فی معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم، والرد علی اعداء اخوان الشیاطین -

۲۳ - ارشاد الحیاری فی تحذیر المسلمین من مدارس النصاری التی اہلکت دین المسلمین -

۲۴ - جامع الثناء علی اللہ وہو یشتمل علی جملۃ من احزاب اکابر الاولیاء -

۲۵ - مفرج الکروب، ویلیہ حزب الاستغاثات، ویلیہ احسن الوسائل فی نظم اسماء النبی الکامل -

۲۶ - ویلیہ کتاب الاسماء فیما لسیدنا محمد من الاسماء -

۲۷ - البرہان المسدد فی اثبات نبوۃ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ودلیل التجار الی اخلاق الاخیار -

۲۸ - والرحمۃ المہداۃ فی فضل الصلاۃ وحسن الشرعۃ فی مشروعیۃ صلاۃ الظہر بعد الجمعہ ورسالۃ -

۲۹ - التحذیر من اتخاذ الصور والتصویر، وتنبیہ الافکار لحکمۃ اقبال الدنیا علی الکفار -

۳۰ - سبیل النجاۃ فی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ -

۳۱ - القصیدۃ الرائیۃ الکبریٰ فی مجموعۃ منہا سعادۃ الانام فی اتباع دین الاسلام -

۳۲ ۔ مختصر ارشاد الحیاری۔

۳۳ ۔ الرائیۃ الصغریٰ فی ذم البدعۃ و مدح السنۃ الغرأ۔

۳۴ ۔ جواہر البحار فی فضائل النبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم (چار جلدوں میں)

۳۵ ۔ تہذیب النفوس فی ترتیب الدروس مختصر ریاض الصالحین للنووی۔

۳۶ ۔ اتحاف المسلم جعلہ خاصا بما ذکرہ صاحب الترغیب والترہیب من احادیث البخاری ومسلم۔

۳۷ ۔ جامع کرامات الاولیائ ومعہ رسالۃ لہ فی اسباب التالیف (دو جلدوں میں)۔

۳۸ ۔ دیوان المدائح المسمی العقود اللؤلؤیۃ فی المدائح النبویۃ۔

۳۹ ۔ الاربعین، اربعین من احادیث سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، وہو کتاب نفیس جامع۔

۴۰ ۔ الدلالات الواضحات شرح دلائل الخیرات، دیلیہا المبشرات المنامیۃ۔

۴۱ ۔ صلوات الثنا علی سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴۲ ۔ القول الحق فی مدح سید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴۳ ۔ الصلوات الالفیۃ فی الکمالات المحمدیۃ۔

۴۴ ۔ ریاض الجنۃ فی اذکار الکتاب والسنۃ۔

۴۵ ۔ الاستغاثۃ الکبریٰ باسمار اللہ الحسنیٰ۔

۴۶ ۔ جامع الصلوات علی سید السادات۔

۴۷ ۔ الشرف فی المؤبد لآل محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴۸ ۔ الانوار المحمدیۃ مختصر المواہب اللدنیۃ۔

۴۹ ۔ صلوات الاخیار علی النبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم۔

۵۰ ۔ تفسیر قرۃ العین من البیضاوی والجلالین۔

۵۱ ۔ البشائر الایمانیۃ فی المبشرات المنامیۃ۔

۵۲ ۔ الاسالیب البدیعۃ فی فضل الصحابۃ واقناع الشیعۃ[۵]۔

علامہ نبہانی اسلام کا درد رکھنے والے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے انہوں نے اپنے زمانے میں دیکھا کہ مسلمان اپنے بچوں کو عیسائی مشنری سکولوں میں داخل کرواتے ہیں جہاں انھیں انگریزی زبان اور کچھ دنیاوی علوم سکھائے جاتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بچے، عیسائیوں کی عبادت میں شریک ہوتے ہیں، اس کیفیت نے انھیں شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا، چنانچہ انہوں نے ایک رسالہ "ارشاد الحیاری فی تحذیر المسلمین من مدارس النصاریٰ" لکھا اور بڑے زوردار انداز میں مسلمانوں کو اس قبیح طریقے سے منع کیا، یہ رسالہ ایک مقدمہ، چالیس فصول اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

اس رسالہ میں انھوں نے اپنا ایک نوٹ بھی نقل کیا ہے جو کئی سال پہلے انھوں نے اپنی تصنیف " افضل الصلوات علیٰ سید السادات" کے آخر میں لکھا تھا اس کا عنوان تھا۔

غظیم مصیبت جس کا نوٹس لیا جانا ضروری ہے

فرماتے ہیں:

فرنگی جو سکول اسلامی ممالک میں کھولتے ہیں، ان میں طالب علم کے داخلے کے لیے اہم ترین شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر دن عیسائی لڑکوں کے ساتھ عبادت کے لیے گرجا جائے گا اور ان جیسے دینی افعال سرانجام دے گا اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اور جسے یہ شرط منظور نہ ہو اسے وہ داخلہ نہیں دیتے۔ بیروت میں بھی ایسے سکول موجود ہیں اور ان میں مسلمانوں کے کچھ بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں مثلاً مدرسہ لیسوعیہ اور مدرسہ المطران المارونیہ۔

ہم اس بنا پر عیسائیوں کو ہدف ملامت نہیں بنا سکتے کیوں کہ وہ اپنے سکولوں میں اپنے مقاصد کے تحت کام کر رہے ہیں اپنی شرائط صاف صاف بیان کر دیتے ہیں اور کسی کو داخلے پر مجبور نہیں کرتے، البتہ وہ مسلمان ضرور عظیم ملامت کے مستحق ہیں جو راضی خوشی اپنے بچوں کو ان سکولوں میں داخل کرواتے ہیں، بچہ وہیں رہتا اور سوتا ہے اور شرط کے مطابق گرجے میں بھی جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ سچا مسلمان اپنی اولاد کو اس خطرے میں صرف اسی صورت میں داخل کر سکتا ہے کہ یا تو اسے ان شرائط اور قواعد کا علم نہیں یا پھر اس بارے میں اسے حکم شرعی معلوم نہیں۔ جہاں تک ان کی شرط کا تعلق ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے۔ رہا حکم شرعی تو وہ شریعت مبارکہ کی کتابوں میں مذکور ہے اور کسی عالم پر مخفی نہیں ہے۔

میں اس جگہ شفا شریف سے امام قاضی عیاض کی عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ ہر کسی کو یہ حکم معلوم ہو جائے اور کسی پر مخفی نہ رہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے آخر میں متعدد امور کفریہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"اسی طرح ہم اس شخص کو کافر قرار دیں گے جس سے ایسا فعل سرزد ہو جس کے بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہو کہ وہ کافر ہی سے صادر ہو سکتا ہے اگرچہ وہ اس فعل کے باوجود مسلمان ہونے کی تصریح کرتا ہو، مثلاً بت، سورج، چاند، صلیب اور آگ کو سجدہ کرنا، یہود و نصاریٰ کے ہمراہ ان کی عبادت گاہوں (گرجوں وغیرہ) میں جانا، ان کا خصوصی لباس پہننا۔ مثلاً زنار (جینو) باندھنا اور سر کا درمیانی حصہ منڈوانا۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ افعال کافر ہی سے صادر ہو سکتے ہیں اور یہ افعال کفر کی علامت ہیں اگرچہ ان کا مرتکب مسلمان ہونے کی تصریح کرتا ہو۔"

اس امام کی عبارت کے ظاہر ہونے، دین اسلام کے حکم شرعی کے پہچاننے اور ان سکولوں میں داخلے کی شرائط واضح ہو جانے کے بعد کسی مسلمان کے لیے بے خبری کا عذر باقی نہیں رہتا ——— اس کے بعد بھی جو شخص اپنے بچوں کو ان جیسے سکولوں میں رکھے گا وہ یقین سے محروم اور دین کے معاملہ میں بے پروا واقع ہوا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے غضب سے اس کی پناہ مانگتے ہیں۔[1] ایک جگہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے عیسائیوں کے اہتمام، بے پناہ دولت صرف کرنے اور سکولوں کے قیام کے علاوہ دور دراز دیہات میں جا کر بچوں اور جہلاء کو جمع کر کے پادریوں کا عیسائیت کی تبلیغ

کرنے کا ذکر کرکے مسلمانوں کی حالت زار پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ایک طرف عیسائیوں کی یہ حالت ہے دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر مسلمان اپنے دین اسلام کی اشاعت کی پروا نہیں کرتے ، ان لوگوں کی طرح مال و دولت خرچ نہیں کرتے ، اپنے شہروں اور اولاد پر وارد ہونے والے شرک اور شکوک و اوہام کو دور کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے ، کیا یہ قبیح ترین رسوائی ، شدید ترین خسارہ اور خوفناک محرومیت نہیں ہے ؟ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ کفر، ایمان پر حملہ آور ہے ، گمراہی بڑھ چکی ہے اور سرکشی پھیلتی جا رہی ہے "[۵]

اللہ تعالٰے نے علامہ نبہانی کو نظم و نثر میں حیرت انگیز قدرت عطا فرمائی تھی۔ ان کے بعض قصائد تو کئی کئی سو اشعار پر مشتمل ہیں، ایک قصیدہ " النظم البدیع فی مولد الشفیع صلی اللہ علیہ وسلم " میں عرض کرتے ہیں :

یا ربنا بجاھہ لدیکا　　انا توسلنا بہ الیکا

معتمدین ربنا علیکا　　وطالبین الخیر من یدیکا

فالھمہ اکل سبیل الرشد

ترجمہ : " اے اللہ ! نبی اکرم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی جو عزت و منزلت تیری بارگاہ میں ہے ہم تیری بارگاہ میں اس کا وسیلہ پیش کرتے ہیں ۔

تجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور تجھ سے بہتر کی دعا کرتے ہوئے (عرض کرتے ہیں کہ) تو سب کو راہِ ہدایت عطا فرما ۔ "

یا رب وارحم امۃ المختار　　فی کل عصر وبکل دار

واحرسھم من سلطۃ الاغیار　　فی سائر البلاد والاقطار

فی کل غور وبکل نجد[۶]

ترجمہ : " اے اللہ ! نبی مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں رحم فرما ۔

اور انھیں تمام شہروں اور اطراف میں سربلند اور پست جگہ غیروں کے تسلط سے محفوظ فرما ۔

عرب ممالک میں علامہ نبہانی اور ہندوستان میں امام احمد رضا بریلوی نہ صرف یہ کہ ہم عصر تھے بلکہ افکار و نظریات میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی رکھتے تھے ، علامہ نے امام احمد رضا کی تصنیف لطیف " الدولۃ المکیہ " پر زوردار تقریظ لکھی ہے ، فرماتے ہیں :

سید عبدالباری سلمہ اللہ تعالیٰ (ابن سید امین رضوان مدنی) نے یہ کتاب الدولۃ المکیہ میرے پاس بھیجی میں نے اول سے آخر تک اس کا مطالعہ کیا اور اسے تمام دینی کتابوں میں بہت ہی نفع بخش اور مفید پایا ، اس کے دلائل بہت قوی ہیں جو بڑے امام اور علامۂ اجل سے ہی ظاہر ہو سکتے ہیں اللہ تعالٰے ان سے راضی رہے اور اپنی نوازشات سے انھیں راضی رکھے اور ان کی پاکیزہ امیدوں کو برلائے ، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے توسل سے بارگاہِ الٰہی میں دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مصنف ایسے افراد زیادہ سے زیادہ پیدا فرمائے جو ائمۂ اعلام ہوں ، اسلام کے حامی ہوں اور کفار اور اہلِ بدعت کے رد میں مشغول رہیں ، ایسے علمائے عظیم مجاہد اور دین کی حدود کے محافظ ہیں[۷]

حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی قدس سرہ کا وصال بیروت میں ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۲ء ماہ رمضان المبارک کی ابتدا میں ہوا آپ کا آخر تک یہ معمول رہا کہ باقاعدگی سے فرض ادا کرنے کے علاوہ کثرت سے نوافل ادا کرتے اور بارگاہ رسالت میں ہدیۂ درود وسلام پیش کرتے، عبادت اور اتباع سنت کا نور آپ کے چہرہ پر جگمگاتا رہتا تھا۔[۱]

حجۃ اللہ علی العالمین

علامہ نبہانی کی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ علی العالمین فی معجزات سید المرسلین" ہے اس میں انہوں نے وہ تمام دلائل یکجا کر دیئے ہیں جو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے ثبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ کتاب ایک مقدمہ چار اقسام اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ معجزہ کا معنی اور اس کا دیگر خوارق سے فرق۔

۲۔ دیگر انبیاء و مرسلین کو جو معجزہ اور جو فضیلت بھی دی گئی اس جیسی بلکہ اس سے بڑھ کر فضیلت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دی گئی اور یہ کہ آپ نبی الانبیاء ہیں۔

۳۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ظہور میں بھی زیادہ ہیں نیز ان کے معجزات ختم ہو گئے اور آپ کے بعض معجزات قیامت تک باقی رہیں گے۔

۴۔ متعدد طریقوں سے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی روایات سے آپ کی نبوت یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے۔

کتاب کی پہلی قسم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بشارتوں پر مشتمل ہے اور اس میں آٹھ باب ہیں۔

۱۔ کتب سماویہ کی بشارتیں
۲۔ احبار (علماء اہل کتاب) کی بشارتیں
۳۔ راہبوں کی بشارتیں
۴۔ کاہنوں کی بشارتیں
۵۔ جنوں کی بشارتیں
۶۔ بتوں سے سنی گئی بشارتیں
۷۔ متفرق بشارتیں
۸۔ قلم قدرت کی بشارتیں

دوسری قسم نور محمدی کی خلقت سے ولادت باسعادت تک ظاہر ہونے والے خوارق اور دلائل نبوت، یہ قسم چار ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ تخلیق نور کی ابتدا سے پاکیزہ پشتوں اور طاہر رحموں سے منتقل ہوتے ہوئے شکم مادر تک پہنچنے کی تفصیلات۔

۲۔ مدت حمل اور وقت ولادت کے بعض عجائب۔

۳۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں قیام کے دوران پیش آنے والے خرق عادت واقعات۔

۴۔ بعثت سے پہلے واقع ہونے والے بعض خوارق۔

تیسری قسم میں اعلانِ نبوت سے وصال تک کے معجزات ہیں، اس میں بارہ ابواب ہیں۔

۱۔ معجزہ قرآن پاک اس باب کو چار فصلوں میں تقسیم کر کے بتایا ہے کہ (۱) قرآن پاک اکمل اور اعظم معجزہ ہے۔ ۲۔ قرآن پاک کے اعجاز کے چند پہلو، ۳۔ گزشتہ و آئندہ مغیبات کی خبر۔ ۴۔ قرآن پاک کی فضیلت، تلاوت کی فضیلت اور آداب۔

۲۔ عالم بالا سے متعلق معجزات، اس میں واقعہ معراج، فرشتوں کا دیکھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا، سورج کا پلٹنا اور شیاطین کو شہاب مارے جانے کا بیان ہے۔

۳۔ مردوں کو زندہ کرنے سے متعلق معجزات، مثلاً والدین کریمین کا زندہ کیا جانا اور آپ پر ایمان لانا اور دیگر مردوں کا زندہ کرنا۔

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے بیماریوں کی شفا اور اخلاق و اعیان کی تبدیلی۔

۵۔ پتھروں کا بولنا، رسالت کی گواہی دینا اور اطاعت کرنا۔

۶۔ حیوانات کا گفتگو کرنا، رسالت کی گواہی دینا اور اطاعت کرنا۔

۷۔ گزشتہ اور آئندہ کی غیبی خبریں دینا۔

۸۔ دعا کی قبولیت سے متعلق معجزات

۹۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے طعام اور دودھ کا زیادہ ہونا۔

۱۰۔ آپ کی مبارک انگلیوں سے پانی کا نکلنا اور آپ کی دعا سے بارش کا برسنا۔

۱۱۔ متفرق معجزات۔

۱۲۔ معنوی معجزات یعنی فضائل و شمائل کا کمال۔

چوتھی قسم میں بعد از وصال ظاہر ہونے والے معجزات بیان کئے ہیں جو نبوت و رسالت کی سچائی کی دلیل ہیں، اس میں تین باب ہیں

۱۔ وصال کے بعد رونما ہونے والے متفرق معجزات

۲۔ آپ کی بارگاہ میں عرض حاجت کرنے والوں کی مرادوں کا بر آنا، قیدیوں، جنگل میں گم کردہ راہوں اور بھوک پیاس کے ماروں کا فریاد کرنا اور مشکلات کا حل ہونا۔

۳۔ علامات قیامت۔

خاتمہ میں کرامات اولیا کو ثابت کر کے یہ بتایا ہے کہ اولیا کی کرامتیں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معجزہ ہیں، اس اعتبار سے آپ کے معجزات کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔

مختصر یہ کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق جس قدر فضائل و کمالات اور معجزات میسر ہو سکے علامہ نبہانی نے بڑی خوب صورتی سے اپنی اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں، اس سے اس احساس کو تقویت ملے گی کہ جب اتنی عظیم اور جامع کمالات ہستی کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کی اطاعت ضروری ہے اور آپ نے کبھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں کہ احکام خداوندی سے بے نیاز رہ سکیں اور حبیب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اتنی کامل و اکمل

ذات کو ہمارا رہبر درہنما بنایا ہے تو ہم آپ کی راہ سے ہٹ کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میندار سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

مآخذ

۱۔ علامہ نبہانی کے خود نوشت حالات جو" الشرف المؤبد لآل محمد" کے آخر اور" شواہد الحق" کی ابتدا میں درج ہیں:

۲۔ یوسف بن اسماعیل نبہانی علامہ : الدلالات الواضحات ص ۱۳۹

۳۔ محمد منشا تابش قصوری، مولانا : اغثنی یا رسول اللہ ص ۱۵

۴۔ یوسف بن اسماعیل نبہانی علامہ : الدلالات الواضحات ص ۱۲۹

۵۔ شواہد الحق (تعارف مصنف) ص ۸ - ۹

۶۔ یوسف بن اسماعیل النبہانی، امام : ارشاد الحیاری (مطبع حمیدیہ، مصر) ص ۱۶ - ۱۵

۷۔ ایضاً " " ص ۵۱

۸۔ یوسف بن اسماعیل النبہانی، امام : حجۃ اللہ علی العالمین ص ۳ - ۲۵۲

۹۔ ایضاً ضمیمہ الدلالات الواضحات ص ۱۲۹

۱۰۔ الدولۃ المکیہ مطبوعہ کراچی ص ۷۷

۱۱۔ محمد حبیب اللہ بن مایابی الجکنی: شواہد الحق (تعارف) ص ۱۰

ابن الجوزی اور سوانح رسول صلی اللہ علیہ وسلم

غلام جیلانی برق

ابن الجوزی کا پورا نام ابوالفرج عبدالرحمٰن جمال الدین بن علی بن محمد القرشی البکری الحنبلی (۵۱۰ - ۵۹۷ھ = ۱۱۱۶ - ۱۲۰۰ء) تھا۔ آپ بغداد کے ایک محلہ جوزہ میں سکونت پذیر تھے۔ اور اسی نسبت سے جوزی کہلاتے تھے۔ مختلف اساتذہ سے درس لیا۔ اور رفتہ رفتہ اپنے مطالعہ و محنت کی بدولت تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ آپ ایک فصیح البیان واعظ، بلند پایہ محقق اور عظیم المرتبت مصنف تھے۔ اندازاً تین سو کتابیں لکھیں جن میں سے المنتظم فی تاریخ الملوک الأمم، کتاب صفۃ الصفوہ (اولیاء و صوفیہ کے حالات)، کتاب القصاص (داستان سراؤں کا ذکر)، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، الوفاء فی فضائل المصطفیٰ، قصص الانبیاء، مولد النبی صلعم، فی مفردات القرآن بہت وقیع و اہم ہیں۔ آپ نے ایک کتاب تلقیح فہوم الاثر کے نام سے حضور صلعم کے حالات پر بھی لکھی تھی، جسے مولانا محمد یوسف بریلوی نے ۱۲۸۶ھ = ۱۸۶۹ء میں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیا۔ یہ جید برقی پریس دہلی میں چھپی تھی۔

یہ کتاب ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ایک ہزار کے قریب عنوانات ہیں۔ ان میں سے چند عنوانات کا ملخص حاضر ہے:

حضورؐ کی ولادت

اس بات پر تو سب سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ حضور صلعم ماہِ ربیع الاول میں سوموار کو پیدا ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ میں اختلاف ہے۔ کوئی[1] ۲ ربیع الاول بتاتا ہے، کوئی آٹھ، کوئی دس اور کوئی بارہ۔ حضورؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی وفات حضورؐ کی ولادت سے پہلے ہوگئی تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق اُس وقت آپ کی عمر دو ماہ تھی۔ بعض سیرت نگار سات ماہ بتاتے ہیں اور بعض دیگر دو سال چار ماہ۔ لیکن پہلا قول صحیح تر سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی وفات پر حضرت آمنہؓ (والدۂ رسول مقبول) نے ایک مرثیہ کہا تھا، جس کا ایک شعر یہ تھا، ؎

---

[1] ابن خلدون اور طبری ۱۲۔ ربیع الاول کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ابوالفداء ۱۰۔ ربیع الاول لکھتے ہیں۔ اور قاضی سلیمان منصور پوری ۹۔ ربیع الاول مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء کو صحیح مانتے ہیں۔ ریاضی کے ایک فارمولے کے مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء کو سوموار تھا اس لیے یہی تاریخ درست معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو رحمۃ للعالمین ج ۱۔ طبع لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۴۲۔

دَعَتْـهُ الْمَنَـايَا دَعْـوَةً فَـأَجَابَـهَا
وَمَا تَرَكَتْ فِي النَّاسِ مِثْلَ ابْنِ هَاشِمٍ

(موت نے اسے دعوت دی اور اُس نے قبول کرلی۔ اب دنیا میں ابنِ ہاشم (عبداللہ) کی نظیر باقی نہیں رہی)

حسب و نسب

حضور صلعم کا نسب نامہ اکیس پشتوں یعنی عدنان تک تو مُتَّفَقْ علیہ ہے۔ لیکن بعد کے ناموں میں اختلاف ہے۔ متفق علیہ نسب نامہ (بریکٹ میں اصلی نام درج ہے):

محمد بن عبداللہ[1] بن عبدالمطّلِب[2] (اصلی نام عامر یا شیبہ) بن ہاشم[3] (عَمْرو) بن عبدِمَناف[4] (مُغیرہ) بن قُصَیّ[5] (زید) بن کِلاب[6] بن مُرّہ[7] بن کعب[8] بن لُوَیّ[9] بن غالِب[10] بن فِہر[11] بن مالِک[12] بن نَضْر[13] بن کِنانہ[14] بن خُزَیمہ[15] بن مُدرکہ[16] بن اِلیاس[17] بن مُضَر[18] بن نِزار[19] بن مَعَدّ[20] بن عَدْنان[21]۔

عدنان کے بعد ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تین کالم ملاحظہ فرمایئے:

تنقیح کے مطابق	"نسب نامۂ رسولؐ" کے مطابق (اختلافات عربی رسم الخط میں)	بائبل کے مطابق ابراہیم و آدم کے درمیان ناموں کا اختلاف
عدنان بن اُدَدْ[22] بن زید[23]	عدنان بن آدّ بن اُدَدْ	
بن یَقْدُد[24] بن یقدُم[25]	بن ہمیع بن سلامان	
بن اَلْیَمْسَع[26] بن نَبْت[27]	بن ثابت بن حمل	
بن قیذار[28] بن اسماعیل[29]	بن قیذار بن اسماعیل	
بن ابراہیم[30] بن تارِح[31]	بن ابراہیم بن آزر	
بن ناحُور[32] بن سارُوع[33]	بن ناخور بن شاروخ	اردو بائبل میں ناحُور
بن ارعو[34] بن فالِغ[35]	بن ارعو بن فالغ	" " " ارعو
بن عابِر[36] بن شالخ[37]	بن غابر بن شالخ	" " " عابِر
بن اَرْفَخْشَد[38] بن سام[39]	بن ارفخشد بن سام	
بن نُوح[40] بن ملک[41]	بن نوح بن لامِک	
بن متوشلخ[42] بن اخنوخ[43]	بن مُتَوَشْلِخ بن اخنوخ	

بن البردؑ بن مہلائیلؑ	بن بیارد بن مہلائیل	اردو بائبل میں یارد
بن قینانؑ بن انوشؑ	بن قینان بن انوش	
بن شیثؑ بن آدمؑ علیہ السلام	بن شیث بن آدمؑ۔	

حضورؐ کی والدہ، نانیاں اور دادیاں

حضورؐ کی والدہ کا اسم مبارک آمنہ بنتِ وَہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ تھا۔ والدہ کی طرف سے شجرہ یُوں چلتا ہے:

آمنہ بنتِ مُرّہ بنتِ اُمِّ حُبَیب بنتِ بَرّہ بنتِ قلابہ بنتِ ہند۔

حضورؐ کی چند دادیاں یہ تھیں:

۱۔ فاطمہ بنتِ عمر بن عائذ والدۂ حضرت عبداللہ

۲۔ صَخرہ بنتِ عبد بن عمران والدۂ فاطمہ

۳۔ تَخمُر بنتِ عَبد بن قُصَیّ والدۂ صخرہ

حضورؐ کی رِضاعی مائیں

سب سے پہلے حضورؐ کو ابولہب کی ایک کنیز ثُوَیبَہ نے دُودھ پلایا تھا۔ پھر آپ حلیمہ بنتِ عبداللہ السعدیہ کے سپرد ہو گئے حلیمہ آپ کو اپنے قبیلے میں لے گئی اور اڑھائی برس کے بعد واپس لائی۔ ابنِ قُتَیبہ دینا وری (۸۲۸ - ۸۹۸ء) لکھتے ہیں کہ پانچ برس بعد واپس لائی تھی۔

حضرت آمنہ کی وفات اور مابعد

حضورؐ چھ برس کے تھے کہ حضرت آمنہ اپنے بعض اقارب کو ملنے کے لیے مدینہ گئیں وہاں ایک ماہ رہیں۔ حضورؐ بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر اَبْوَاء (مدینہ کے جنوب میں اسّی میل دُور) میں بیمار پڑ گئیں۔ چند روز بعد اللہ سے جا ملیں۔ اور ابواء ہی میں دفن ہُوئیں۔ اس کے بعد آپؐ کو آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ تقریباً دو برس بعد آپ کے دادا بھی چل بسے اور آپؐ اپنے چچا ابوطالب کے سپرد ہو گئے۔

تجارتی سفر

جب آپؐ کی عمر بارہ برس دو ماہ اور دس دن ہُوئی تو ابوطالب آپ کو ایک تجارتی سفر میں اپنے ہمراہ لے گئے۔ جب

مدینہ سے کوئی دو سو میل شمال کی طرف ایک بستی تیماء میں وارد ہوئے۔ تو وہاں کے راہب نے کہا کہ اگر آپ اپنے اس بھتیجے کے ہمراہ شام میں پہنچے تو وہاں کے یہود اسے قتل کر ڈالیں گے کیونکہ اس میں آنے والے نبی کی تمام علامات پائی جاتی ہیں اور یہود کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ وہ عرب میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ ابو طالب وہیں سے لوٹ آئے۔

پچیس برس کی عمر میں آپ حضرت خدیجہ کا مالِ تجارت لے کر شام کی طرف گئے اور اتنے کامیاب رہے کہ حضرت خدیجہ نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا جو آپ نے منظور فرما لیا۔ اور ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ جب آپ کی عمر ۴۹ سال ۸ ماہ اور ۱۱ دن ہوئی تو ابو طالب وفات پا گئے اور صرف تین دن (اور بروایتے پانچ یوم) بعد حضرت خدیجہؓ بھی دار الخلد کو روانہ ہو گئیں۔ آپ کو معراج کی سعادت پچاس سال اور تین ماہ کی عمر میں نصیب ہوئی تھی اور ۵۳ برس کی عمر میں ہجرت فرمائی۔

حضورؐ کے چچے

حضورؐ کے گیارہ چچے تھے:

۱۔ سب سے بڑا حارث تھا۔ اس نے چاہِ زمزم کھودنے میں اپنے والد کی مدد کی تھی۔

۲۔ ابُوطاہر زُبَیر۔ جو شجاعت اور گھڑ سواری میں مشہور تھا۔

۳۔ ابو طالب۔ آپ کا اصلی نام عبد مناف اور کنیت ابو عتبہ تھی۔ حضرت علیؓ آپ ہی کے فرزند تھے۔

۴۔ حضرت ابُو یَعلیٰ حمزہؓ۔ جو غزوۂ اُحُد میں ایک غلام وحشی بن حَرب کی ضرب سے شہید ہوئے تھے۔

۵۔ ابولہب کا اصلی نام عبد العزیٰ تھا۔ یہ حضورؐ کا شدید دشمن تھا۔ جب بدر میں کفارِ مکہ کو شکست ہوئی تو یہ غم اور صدمے سے صرف سات دن بعد مر گیا۔

۶۔ غیداق حُجَل بن عبد المطلب جو فیاضی میں مشہور تھا۔

۷۔ المُقوِّم، جو حضورؐ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔

۸۔ ضرار۔ یہ بھی اسلام آنے سے پہلے مر گیا تھا۔

۹۔ حضرت عباسؓ۔ یہ اسلام و جاہلیت ہر دو میں حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کا انتظام کیا کرتے تھے۔ آپ کا جنازہ حضرت عثمانؓ نے پڑھایا تھا۔

۱۰۔ قُثَم۔ ان کے حالات ہم تک نہیں پہنچے۔

۱۱۔ حَجل۔ 〃 〃 〃 〃

حضورؐ کی پھوپھیاں

حضورؐ کی چھ پھوپھیاں تھیں: یعنی (۱) اُمِ حکیم البیضاء (۲) بَرّہ (۳) عاتکہ (۴) صَفیّہ (۵) اَرْوٰی اور

(۹) اُمیمَہ۔ ان میں صرف حضرت صفیہ اسلام لائی تھیں۔

حضورؐ کی کنیزیں

حضورؐ کی کنیزیں یہ تھیں:

۱۔ ماریہ قبطیہ، جو آپ کی خدمت میں اسکندریہ کے امیر مُقَوقِس نے بھیجی تھی۔
۲۔ ریحانہ بنتِ زید بن عَمرو بنو نضیر سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے اسے آزاد کر کے زوجیت میں لے لیا تھا۔
۳۔ بعض سیرت نگار اس فہرست میں جمیلہ، میمُونہ، اُمِّ ایمن، خضرہ، خولہ، اُمیمہ، رُقیّہ اور صفیہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔

حضورؐ کے خدّام و غلام

سیرت نگاروں نے غلاموں اور خادمانِ رسول کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ یہ لوگ مختلف اوقات پر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تھے۔ اِن سب کو حضورؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ اِن کے نام یہ ہیں:

ابُو رافع اَسلم (جو حضورؐ کو حضرت عباسؓ نے دیا تھا)، احمر، اُسامہ بن زید، اَفلَح، اَیمَن، ثوبان، ذکوان، رافِع، رباح الاسْوَد، زید بن حارثہ (جو آپ کو حضرت خدیجہؓ نے دیا تھا)، سابق، سالِم، سلمان الفارسی، سُلَیمُ الدَّوسی، سعید بن کندیر، شقران صالح (جو آپ کو عبدالرحمٰنؓ بن عَوف نے پیش کیا تھا)، ضُمَیرہ، عبیداللہ بن اَسلَم، عُبَید بن عبد الغفار، فَضالہ یمانی، فَضالہ، مِدعَم، نافِع، نُفَیع، نُبَیہ، واقِد، وَردان، ہِشام، یَسار (یہ حضور کے اونٹ چراتا تھا)، ربیعہ (آپ کو وضو کراتا تھا)، ابنِ مسعود (آپ کے جوتوں کا خیال رکھتا تھا)، عقبہ (خچر پر متعین تھا)، ابو اُثیلہ، ابوالحمراء، ابورافِع، ابوالسَّمح، ابوضُمیرہ، ابو عُبَید، ابو مُویَہبہ اور ابو واقد۔ بعض سیرت نگاروں نے کچھ اور نام بھی لکھے ہیں، مثلاً: مُجَبِّر، ثعلبہ، بلال بن حارث وغیرہ۔ لیکن ہم انھی ناموں پہ اکتفا کرتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اسّی کے قریب تھی۔

حضورؐ کی اولاد

آپ کی اولاد کے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہَیثَم بن عدی، ہِشام بن عُروہ سے روایت کرتا ہے اور یہ اپنے والد سے، کہ حضورؐ کے تین بچے تھے، عبد مناف، عبدالعزّٰی اور قاسم۔ باقی سیرت نگار ہیثم کو کذاب قرار دیتے ہیں۔ بایں دلیل کہ جس رسول نے زندگی بھر توحید کا درس دیا ہو، وُہ اپنے بچّوں کو مشرکانہ نام کیسے دے سکتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ کے چار بیٹے تھے: قاسم، طاہر، عبداللہ اور مُطَیَّب (یا طیّب)۔ بعض کے ہاں طاہر ہی کا دوسرا نام طیب تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ طیب اور مطیب توام بھائی تھے اور اسی طرح طاہر و مطہر بھی۔ نیز یا وہ قابلِ اعتماد

روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے تین ہی بیٹے تھے: قاسم، جو دو سال زندہ رہا۔ عبداللہ اور طیب، یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ حضورؐ کا چوتھا فرزند ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھا۔ وفات کے وقت اسکی عمر سولہ یا اٹھارہ ماہ تھی۔

آپؐ کی چار بیٹیاں تھیں۔ سب کی سب حضرت خدیجہؓ کی اولاد۔ سب سے بڑی کا نام زینب تھا جس کی شادی حضرت خدیجہ کے بھانجے ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اُمامہ جو بعض اوقات نماز میں حضورؐ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی تھی، زینب ہی کی بیٹی تھی۔ غزوۂ بدر میں ابوالعاص بھی کفارِ مکہ کے ہمراہ شریک ہُوا تھا اور قید ہو گیا۔ حضرت زینب نے انھیں رہا کرانے کے لیے اپنا ہار بطور فدیہ حضورؐ کے پاس بھیجا۔ حضورؐ نے ہار کو دیکھا تو اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسو ٹپکنے لگے۔ آپ نے ابوالعاص کو رہا کر دیا۔ ہار واپس بھیج دیا۔ اور ابوالعاص سے کہا کہ یا تو اسلام لاؤ اور یا میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ اس نے یہ بات مان لی۔ حضورؐ نے زید بن حارثہ کو اس کے ساتھ کر دیا اور وُہ چند روز بعد حضرت زینبؓ کو مدینے میں لے آیا۔ زینبؓ کی وفات ۸ھ میں ہُوئی تھی اور خود حضورؐ نے اسے قبر میں اتارا تھا۔

دوم: اُمِ کلثوم، جس کا نکاح ابولہب کے بیٹے عُتبہ سے ہُوا، ابھی رخصتی نہیں ہُوئی تھی کہ آیت تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ خود ہلاک ہو) نازل ہُوئی۔ ابولہب نے بیٹے کو حکم دیا کہ محمد (صلعم) کی دونوں بیٹیوں رُقیہ اور اُمِ کلثوم، جن سے تمہارا نکاح ہو چکا ہے، کو طلاق دے دو۔ اور اس نے تعمیل کی۔ رُقیہ کا نکاح چوتھے سالِ نبوت میں حضرت عثمانؓ سے ہوا تھا۔ آپ کا ایک ہی بیٹا تھا، نام عبداللہ۔ دس سال کے بعد آپ بیمار پڑ گئیں اور ہجرت کے سترھویں ماہ میں، جب حضورؐ غزوۂ بدر سے واپس آرہے تھے، فوت ہو گئیں۔ حضورؐ مدینہ میں داخل ہُوئے تو آپ دفن ہو چکی تھیں۔

سوم: رقیہ کی وفات کے بعد حضورؐ نے اُمِ کلثوم بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دے دی۔ آپ کی وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی تھی۔[1]

چہارم: فاطمۃ الزہراء، جنھیں بعض سیرت نگار رقیہ سے دو سال بڑی قرار دیتے ہیں۔ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ سال پہلے یعنی ۶۰۵ء میں ہُوئی تھی۔ حضرت علیؓ سے آپ کا نکاح ۲ھ میں ہوا۔ آپ کی چار اولادیں تھیں: حسنؓ، حسینؓ، زینبؓ اور اُمِ کلثوم۔ بعض نے محسن اور رُقیہ کا بھی نام لیا ہے۔ لیکن ان کی روایات قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اُمِ کلثوم کا نکاح حضرت فاروقِ اعظم عمرؓ بن خطاب سے ہوا تھا۔ اس سے زید پیدا ہوا۔ فاروقِ اعظمؓ کی وفات کے بعد عون بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ اس کی وفات کے بعد محمد بن جعفر سے نکاح ہوا۔ یہ بھی جلد وفات پا گئے اور آخر میں عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات رحلتِ رسول سے چھ ماہ بعد اور بروایتے تین ماہ بعد ہُوئی تھی۔ اُس وقت آپ کی عمر ۲۹ برس (قمری) کے قریب تھی۔ آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بعض روایات میں حضرت عباسؓ کا نام آیا ہے اور بعض میں خود حضرت علیؓ کا۔ لیکن پہلا قول صحیح تر ہے۔

حضورؐ کے مرکب

مرکب سے مراد سواری کا جانور ہے، خواہ وُہ گھوڑا، خچر اور اونٹ ہو یا خر۔ آپؐ نے زندگی میں صرف سات گھوڑوں

[1] درست اس طرح ہے کہ حضرت رقیہ عتبہ بن ابولہب اور حضرت ام کلثوم عتبہ کے بھائی عتیبہ کی زوجہ تھیں۔ جب سورۂ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی تو دونوں بھائیوں نے باپ کے کہنے پر ان کو طلاق دے دی۔ دونوں بیبیاں بعد ازاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنیؓ کے عقد میں آئیں اور اسی نسبت سے آپ ذوالنورین کے لقب سے مشہور ہُوئے۔ (ادارہ)

پہ سواری کی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ اَلسَّکب ۔ یہ حضورؐ کا پہلا گھوڑا تھا۔
۲۔ مُرتَجِز ۔ یہ ایک اعرابی سے خریدا تھا۔
۳۔ لزاز ۔ یہ اسکندریہ کے بادشاہ مُقوقِس نے بھیجا تھا۔
۴۔ اَلظَّرِبُ۔ جو ربیعہ بن البرا نے پیش کیا تھا۔
۵۔ اَلوَرْدُ ۔ جو تمیم الداری نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔
۶۔ نُحَیف یا لُحَیف
۷۔ یَعسُوب

اُونٹ:

۸۔ قَصواء ۔ اسے عَضْباء اور جَدْعاء بھی کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے سو درہم میں خریدی تھی اور اسی پر سوار ہو کر ہجرت فرمائی تھی۔

خچّر اور گدھا:

۹، ۱۰۔ مُقوقِس نے حضورؐ کی خدمت میں ایک خچر بھیجا تھا، جس کا نام تھا شَہباء یا دُلدُل ۔ اور ایک گدھا جو یعفور کہلاتا تھا۔

حضورؐ کے دُودھیالے جانور

حضورؐ نے دُودھ کی خاطر کئی جانور پال رکھے تھے۔ ان میں کچھ اُونٹنیاں تھیں اور کچھ بھیڑ بکریاں۔ اونٹنیوں کے نام یہ تھے:

عَجْوَہ ، زَمزَم ، سُقیا ، بَرَکہ ، وَرسہ ، اَطلال ، اَطراف ، غَوثہ (یا غُیَیثہ) ، یُمن ، قَمَر ، حَنّاء ، سَمراء ، عُرَیس ، سَعدِیہ ، بِسیرہ ، لعُوم ، رَیا ، مُہرَہ ، شَعراء اور بُردہ۔

حضورؐ کی تلواریں

آپؐ کی تلواروں کے نام یہ تھے: قلعیا ، جو صحرا کے ایک گاؤں قلع سے آئی تھی۔ بتّار ۔ حَتف ۔ مِخذَم ۔ رسُوب ۔ عَضْب اور ذوالفقار جو آپؐ نے حضرت علیؓ کو عنایت کر دی تھی۔

حضورؐ کی کمانیں

روحاء ، بیضاء ، صفراء (یا شوحط) ، اَلکتوم ، زَوراء ، سداد۔

طبقات کے مصنف ابنِ سَعد لکھتے ہیں کہ جب حضورؐ کو مدینہ کے ایک یہودی قبیلہ بنو قَینُقاع سے لڑنا پڑا تو وہاں سے آپؐ کو تین نیزے اور تین کمانیں ملیں۔ کمانوں کے نام بیضاء، صفراء اور روحاء تھے۔

حضورؐ کے نیزے

آپؐ کے پاس کل چار نیزے تھے۔ یعنی اَلمُثوِیٰ، اَلمُتَثَنیٰ۔ باقی دو کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔

حضورؐ کی ڈھالیں

آپؐ کے پاس تین ڈھالیں تھیں، الزَّلُوق۔ اَلفُتَق۔ اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔

حضورؐ کی زرہیں

سَعدِیَہ، فِضَّہ، ذاتُ الفُضول، ذاتُ الوِشاح، ذات الحواشی، بَترا، سُغدِیَہ اور خِرنِق۔

رسولِ اکرمؐ کے سیرت نگار

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

مشرق و مغرب کی اکثر علمی زبانوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر مختلف درجہ اور مختلف ضخامت کی اس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں کہ حصر و شمار سے باہر ہے چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر مارگولیتھ نے "محمدؐ اور ظہور اسلام" کے نام سے آں حضرتؐ کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی تو اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

"حضرت محمد (صلعم) کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کو ختم کرنا ناممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا باعث شرف ہے۔"[1]

تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ جس کی طرف پروفیسر ممدوح نے اشارہ کیا ہے، بدستور جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مقالہ ہذا میں سردست ان عربی کتابوں کا ذکر بطور تعارف کیا جاتا ہے جو فن سیرت میں اصلی یا ثانوی مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور فی زمانہ مروج و متداول ہیں اور جن کا دینی اور تاریخی مقالوں اور کتابوں میں اکثر حوالہ آتا ہے۔ اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مستند اور تازہ ترین معلومات فراہم کی جائیں اور مطبوعہ کتابوں کے بہترین اڈیشنوں اور ان کے مستند اور متداول تراجم کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے تاکہ اہلِ ذوق کو ان کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہو۔

سیرت کے مطالعہ کی ضرورت

غیر مسلموں کا سیرت نبوی کے ساتھ اعتنا بیشتر اس وجہ سے ہے کہ وہ اس جلیل القدر داعی دین کے حالات زندگی معلوم کرنا چاہتے ہیں، جس کی تعلیم نے دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا اور ایک ایسی امّت تیار کر دی، جس نے اپنے شاندار کارناموں سے جریدۂ روزگار پر اپنا نام ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا ہے۔ مگر مسلمانوں کے لیے سیرتِ نبوی کا مطالعہ محض ایک علمی مشغلہ نہیں ہے بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے۔ خداوند کریم نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " اے ایمان والو! تمہارے لئے پیغمبر خدا کی ذات گرامی میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے۔" (سورۂ احزاب)

لہٰذا مسلمانوں کے لئے ضروری ٹھہرا کہ وہ اس بات کو دریافت کریں کہ رسول اللہؐ نے وہ کون سا نمونہ پیش کیا ہے جس کو قرآن کریم میں اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔ رسولِ مقبولؐ کا اسوہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں لامحالہ ان کی سیرت پاک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

جو لوگ رسول خدا (صلعم) کے ہم وطن اور ہمعصر تھے اور جن کو آپ سے بالمشافہ اصولِ اسلام سیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، آپؐ کا

---

[1] "MOHAMMED AND THE RISE OF ISLAM" BY D.S. MARGOLIOUTH, P iii - LONDON, 1905

اُسوہ ان کے سامنے تھا، لیکن جب آنحضرتؐ نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی، تو بعد کی نسلوں کے لئے آپ کی سیرت مبارک احادیث اور روایات کی روشنی ہی میں شمع ہدایت کا کام دے سکتی تھی۔ اس دینی ضرورت کے اقتضاء سے اہل اسلام نے اپنے ہادیٔ برحق کے احوال و اقوال کو اس احتیاط اور تفصیل سے محفوظ کر لیا ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ :

"اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا اور اس کے حلیہ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا ہے۔"

آپؐ کی شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، طرزِ معاشرت، خورد و نوش، لباس و پوشش اور نشست و برخاست کی ایک ایک تفصیل اس طرح قلمبند کر لی ہے کہ کسی شخص کے حالاتِ زندگی آج تک اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکے۔ آنحضرتؐ کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے اکثر بانیوں کی تصویریں نا تمام ہیں، چنانچہ زرتشت کے متعلق آج تک یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایران کے کس خطہ میں اور کس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس بارے میں جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ علماء کا محض قیاس اور تخمینہ ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ۳۳ سالہ زندگی کے صرف آخری تین سالوں کا حال معلوم ہے جو انہوں نے یہود کی اصلاح کی کوشش میں گزارے تھے اور جن کی کیفیت مروجہ اناجیل میں مذکور ہے۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ تاریکی کے پردے میں مستور ہے حتیٰ کہ ان کی پیدائش اور وفات دونوں کے متعلق مختلف مذاہب اور اقوام کی روایات اور آراء میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے، جس سے ایک عام آدمی کے لئے ان کی زندگی ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس داعیٔ اسلام کی زندگی اور ان کے متن کے ہر شعبہ کے متعلق اس قدر کثیر اور وافر مواد اور مسالہ موجود ہے جس کا سمیٹنا ایک مؤرخ کے لئے بے حد مشکل کام ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار   گلچینِ تو از تنگیٔ داماں گلہ دارد

سیرت نگاری کی ابتداء

رسولِ خدا کی ذاتِ گرامی ابتدائے نبوت ہی سے ان کے اصحاب کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی، چنانچہ آنحضرتؐ کے حین حیات یہ دستور شروع ہو چکا تھا کہ جب ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آنحضرتؐ کے حالات دریافت کرتا اور وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی یا آنحضرتؐ کے کسی تازہ فرمان کا ذکر کرتا۔ آپؐ کی وفات کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، آپ کے پیروؤں کے دل میں اپنے پیشوا کی ذات مبارک، ان کے اخلاق و عادات اور ان کی تعلیم و تلقین کے دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔ اس شوق جستجو سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع ذخیرہ پیدا ہو گیا جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا۔ آخر کار جب مسلمانوں کے ہاں دوسری صدی ہجری میں تصنیف و تالیف کا رواج ہوا تو اہلِ علم نے ان روایات کو قلمبند کرنا اور ان کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنا شروع کیا جن روایات کا تعلق عقائد و عبادات سے تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہو سکتے تھے، ان سے علم حدیث کی کتابیں مدون ہوئیں اور ان روایات سے جن میں آنحضرتؐ کے حالاتِ زندگی مذکور تھے۔ فن سیرت کا سرمایہ تیار ہوا۔ اور وہ روایات جن میں رسول پاکؐ کے غزوات یعنی جنگوں کے واقعات مذکور تھے، فن مغازی کا موضوع قرار پائیں، چونکہ رسول مقبولؐ کی زندگی میں ان کے غزوات کو تاریخی لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے بعض اوقات "مغازی" کا اطلاق تمام فن سیرت پر ہوتا ہے۔

سیرت نبوی کے قدیم مصادر

صحابہ کرامؓ کے عہد میں صرف قرآن مجید کے جمع و تسطیر کا اہتمام ہو سکا اور پہلی صدی ہجری میں اسلام

اور داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق مختلف نوع کی جو روایات مسلمانوں میں شائع ہوئیں وہ سینہ بسینہ نقل ہوتی رہیں۔ ان کو اس خیال سے قلمبند نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں قرآن پاک کے متن کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔ پہلی صدی کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ نے دیکھا کہ جن صحابہ کرامؓ کے سینوں میں رسولِ خداؐ کے ارشادات اور دیگر تاریخی روایات کا ذخیرہ محفوظ تھا وہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ اس سے ان کو اندیشہ ہوا کہ اسلامی اخبار و روایات کے مٹنے سے کہیں سنت نبوی کا علم بھی نہ مٹ جائے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر اسلامی روایات کی جمع و کتابت شروع ہوئی۔

رسولِ پاکؐ نے اپنی عمر عزیز کے آخری دس سال مدینہ میں گزارے تھے، اور ان کی وفات کے بعد اکثر صحابہ نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے مدینہ ہی حدیث نبوی اور روایات اسلامی کا سب سے پہلا مرکز قرار پایا۔ یہاں کے سب سے بڑے عالم امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری تھے، جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی فرمائش پر اسلامی روایات و آثار کی جمع و کتابت کا آغاز کیا۔ خلیفہ ممدوح کی مدت خلافت صرف ڈھائی سال ہے اس لئے اس مختصر سے عرصہ میں روایات کی تدوین کا کام مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن ان کی تحریک سے مختلف علمی مرکزوں میں روایات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا کام شروع ہو گیا۔ مدینہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بصرہ میں امام حسن بصری اور ابراہیم نخعی اور کوفہ میں امام شعبی نے روایات کے جمع کرنے میں خاص کوشش صرف کی۔

امام زہری مکہ میں ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ہے۔ آپ قریش کے مشہور خاندان بنو زہرہ میں سے تھے، اس لئے زہری کہلائے۔ آپ تابعی تھے اور آپ نے بہت سے صحابہ کرامؓ کو بذاتِ خود دیکھا تھا اور ان سے معلومات حاصل کی تھیں۔ مدینہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے اور ان سے رسولِ کریمؐ کے حالات اور ارشادات کے بارے میں پوچھتے اور ان کو قلمبند کرتے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں دمشق کے اموی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اموی حکمرانوں کی فرمائش پر انہوں نے سیرت اور مغازی پر مستقل کتابیں لکھی تھیں، لیکن وہ کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں، لیکن ان کی سند سے بہت سی متفرق روایات بعد کے مصنفین کے ہاں ملتی ہیں۔ آپ نے ۱۲۴ھ میں وفات پائی اور حجاز میں شغب کے مقام پر مدفون ہوئے جہاں ان کی اراضی تھی۔ امام زہری کی علمی جستجو اور ان کے درس کی وجہ سے لوگوں میں سیرت و مغازی کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے حلقہ درس سے جو باکمال لوگ اٹھے۔ ان میں سے دو عالموں یعنی موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے اس فن میں خاص شہرت پائی۔

موسیٰ بن عُقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) حضرت زبیر بن العوام کے موالی میں سے تھے۔ انہوں نے عہدِ رسالت کی اخبار و روایات کے جمع کرنے میں کمال جانفشانی کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ "صاحب المغازی" کے لقب سے مشہور رہے۔ امام مالک بن انس ان کے بڑے مداح تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو۔ ان کی کتاب مغازی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی صحت کا بڑا اہتمام کیا۔ چنانچہ آپ کم عمر اور بے سمجھ لوگوں کی روایت نہیں لیتے تھے بلکہ ہمیشہ پختہ عمر اور پختہ فہم کے لوگوں سے روایت حاصل کرتے تھے۔ اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب دیگر کتب مغازی سے مقابلتہً مختصر ہے۔ عقبہ کی کتاب المغازی مدت تک شائع رہی اور واقدی، ابن سعد اور

ؔ امام زہری کے لیے ملاحظہ کیجیے تہذیب التہذیب لابن حجر بذیل "محمد بن مسلم"۔

طبری کی کتابوں میں اس کے اکثر حوالے ملتے ہیں، لیکن مرورِ ایام سے آخر کار ناپید ہو گئی۔ اس وقت تک اس کا ایک قطعہ ملا ہے، جسے پروفیسر زخاؤ نے جرمن ترجمہ کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں شائع کر دیا تھا۔[1]

محمد بن اسحٰق

دیگر علوم کی طرح تاریخ نویسی کا آغاز بھی بنو عباس کے زمانے میں ہوا اور اس کی ابتدا سیرت نگاری سے ہوئی۔ فنِ سیرت میں محمد بن اسحٰق مطلبی (متوفی ۱۵۰ھ) نے اس قدر شہرت پائی کہ امام فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہوئے۔ محمد بن اسحٰق تابعی تھے، اور مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ انہوں نے متعدد صحابہ کو دیکھا تھا اور ان سے عہدِ رسالت کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ ابن اسحٰق نے مصر کا سفر اختیار کیا اور بعد ازاں بغداد گئے جہاں انہوں نے خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور اسکی خدمت میں اپنی سیرت پیش کی۔ علامہ بلاذری کا بیان ہے ابن اسحٰق نے یہ کتاب خلیفہ مذکور ہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ بہر حال جس زمانے میں امام مالک بن انسؒ نے علمِ حدیث میں اپنی مشہور عالم کتاب "موطا" تالیف کی تھی، تقریباً انہی ایام میں ابن اسحٰق نے اپنی سیرت تصنیف کی اور اپنی زندگی کے آخری دن بغداد ہی میں بسر کئے اور اپنی وفات کے بعد وہیں مدفون ہوئے۔

ابن اسحٰق کی سیرت میں اس قدر جامعیت، تفصیل اور معلومات کی فراوانی تھی کہ اکثر اہلِ علم نے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے سیرتِ نبوی کے بارے میں اس پر پورا پورا اعتماد کیا اور اس کو اپنا ماخذ بنایا۔ چنانچہ امام طبری اور دیگر مورخین نے ابن اسحٰق سے بکثرت روایت کی ہے اور ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ کے سیرت والے حصہ میں اس کا جا بجا حوالہ دیا ہے۔ غرضیکہ ابن اسحٰق کی سیرت اپنے فن میں ایک منفرد اور اساسی حیثیت رکھتی ہے اور بعد کے زمانے میں جس کسی نے سیرتِ نبوی کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اسے ابن اسحٰق کی خوشہ چینی کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا۔ ساتویں صدی ہجری میں فارس کے حکمران ابوبکر سعد زنگی کی فرمائش پر سیرت ابن اسحٰق کا فارسی ترجمہ تیار ہوا تھا، جس کے قلمی نسخے پیرس کے قومی کتب خانہ، الٰہ آباد پبلک لائبریری اور دار العلوم دیوبند میں پائے جاتے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے ابن اسحٰق کی تالیف ناپید ہو گئی لیکن حال ہی میں اس کے بعض اجزاء مراکو میں دریافت ہوئے ہیں، جن کو ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) ایڈٹ کر رہے ہیں۔ ان کے تازہ مراسلہ سے معلوم ہوا کہ مطبوعہ اوراق کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہو گی۔

سیرت ابن ہشام

محمد بن اسحٰق کے بعد عبد الملک بن ہشام نحوی کا زمانہ آیا، جس کا سنہ وفات ۲۱۳ ہجری اور بعض کے نزدیک ۲۱۸ھ ہے۔ اس نے ابن اسحٰق کی سیرت کی تلخیص و تہذیب کی۔ اس کے ابتدائی حصہ کا تعلق سیرت نبوی سے نہ تھا اس لئے اسے چھوڑ دیا، مشکل اور غریب الفاظ کے معنے لکھے۔ اشعار مذکورہ کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق اپنی رائے قلمبند کی اور بعض واقعات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی تالیف کو جو صورت دی وہ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اصل کتاب کو فراموش کر دیا، چنانچہ آج کل لوگوں کے درمیان ابن اسحٰق کی جو کتاب متداول ہے وہ یہی ابن ہشام کی تلخیص ہے، جو "سیرت ابن ہشام" کے نام سے مشہور ہے۔ سیرت ابن ہشام کو سب سے پہلے جرمن مستشرق ویسٹن فیلڈ (WUSTENFELD) نے ۱۸۶۰ء میں گوٹنگن سے اصل عربی میں شائع کیا۔ ایک مدت کے بعد یہ کتاب مصر میں کئی مرتبہ طبع ہوئی۔ ان طباعتوں میں بہترین ایڈیشن وہ ہے جسے مصطفیٰ السقاء، ابراہیم ابیاری

---

[1] EDWARD SACHAU : DAS BERLINER FRAGMENT DES MUSA IBN UQBA IN SITZUNGSBERICHTE D. PREUSS. AKADEMIC DER WISSENSCHAFTEN. BERLIN 1904, P. 449.

اور عبدالحفیظ شبلی کی تصحیح و تحشیہ سے مطبع مصطفیٰ بابی حلبی نے ۱۳۵۵ھ (مطابق ۱۹۳۶ء) میں قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع کیا۔ بہت سے مشکل الفاظ کو مشکول کرنے کے علاوہ ایڈیٹر صاحبان نے بہت سے توضیحی حواشی بھی لکھے ہیں، جو اکثر سہیلی کی شرح سے ماخوذ ہیں اور ازبس مفید ہیں۔

سیرت ابن ہشام کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر وائل (GUSTAV WEIL) نے ۱۸۶۴ء میں اس کا جرمن ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس کے نوے سال بعد پروفیسر الفریڈ گیوم (GILLAUME) نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ پروفیسر مذکور کو چند ایک عرب علما کا تعاون حاصل تھا۔ اس لئے ان کا ترجمہ اپنی صحت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔ اس انگریزی ترجمہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ فاضل مترجم نے ابن اسحٰق کے ان مقامات کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جن کو ابنِ ہشام نے چھوڑ دیا تھا لیکن وہ تاریخ طبری وغیرہ میں محفوظ ہیں[۱] سیرت ابن ہشام کے چند ایک اُردو تراجم بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک ترجمہ وہ ہے جسے مولوی محمد انشا اللہ ایڈیٹر اخبارِ وطن نے مولوی محمد حلیم انصاری کی مدد سے ۱۹۱۴ء میں مکمل کیا اور لاہور سے دو حصوں میں شائع کیا۔ یہ ترجمہ ملخص ہے۔ دوسرا اُردو ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی نے تیار کیا اور عبدالرحیم اینڈ برادرز تاجران کتب نے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں دو حصوں میں شائع کیا۔ مترجم نے اکثر عربی اشعار بغیر ترجمہ کے چھوڑ دیے ہیں لیکن باقی ترجمہ خاصا گوارا ہے لیکن یہ ترجمہ اب نایاب ہو چکا ہے۔ تیسرا ترجمہ مولوی قطب الدین احمد محمودی کے قلم سے ہے جو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے پہلے دو حصے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء میں طبع ہوئے تھے، لیکن یہ ترجمہ دکن کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

سیرت ابن ہشام کی اہمیت کے پیشِ نظر امام ابوالقاسم عبدالرحمٰن سُہیلی نے اس کی ایک شرح "الروض الاُنف" کے نام سے لکھی تھی، جو سلطان مراکش کے صَرفہ سے مصر میں ۱۳۳۲ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ امام موصوف اندلس کے ضلع مالقہ میں وادی سُہیل کی ایک بستی میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے سُہیلی کہلائے۔ علم تفسیر، حدیث نبوی اور رجال کے علاوہ تاریخ اور انساب کے بڑے ماہر تھے۔ تمام عمر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ان کے حافظہ اور تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ الروض الاُنف جیسی ضخیم شرح کی املا چار پانچ ماہ کی مدت میں ختم کر دی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "میں نے یہ شرح ایک سو بیس کتابوں کی مدد سے لکھی اور اس کی املا محرم ۵۶۹ھ میں شروع کر کے اسی سال کے جمادی الاُولیٰ میں ختم کر دی۔ میں نے اس میں ایسے علمی نکات بیان کئے ہیں جو میں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کئے تھے۔"[۲]

غرضکہ اس شرح میں ایسی معلومات ملتی ہیں جو خود اصل کتاب میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی لئے بعد کے مصنفوں نے سیرت نبوی کے سلسلہ میں سُہیلی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

---

[۱] THE LIFE OF MUHAMMAD: A TRANSLAION OF IBN ISHAQUE SIRAT RASUL ALLAH, WITH AN INTRODUCTION AND NOTES BY A GUILLAUME, OXFORD U. PRESS 1955.

[۲] الروض الاُنف تالیف الامام السُّہیلی جزو اوّل صفحہ ۳ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۲ھ) ابن ہشام کے دو اُردو ترجمے (۱) عبدالجلیل صدیقی۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۳ء (۲) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مقبول اکیڈمی لاہور (ادارہ)

متقدمین کی مؤلفات

سیرت ابن ہشام کے علاوہ متقدمین کی تالیف میں سیرت نبوی کے سلسلہ میں ذیل کی چار کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں :

۱۔ کتاب المغازی مؤلفہ الواقدی

محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ تا ۲۰۷ھ) کا شمار اسلام کے اکابر مؤرخین میں ہوتا ہے۔ ابن سعد کے قول کے مطابق وہ ۱۳۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور اپنے جدِ امجد واقد کے نام پر واقدی کہلائے۔ اسلامی اخبار و روایات کو جمع اور مدون کرنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید جب ۱۷۰ھ میں حج کے لیے حجاز آیا اور مدینہ منورہ میں وارد ہوا۔ تو اس موقع پر واقدی ہی نے اس کی رہبری کی تھی اور اسے مدینہ کے قدیم آثار اور تاریخی مقامات دکھائے تھے۔ بعد ازاں خلیفہ المامون نے اسے بغداد کے مغربی حصہ کا قاضی مقرر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقدی کو خلیفہ موصوف کا خاصا تقرب حاصل تھا کیونکہ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا اور اس نے اپنا وصیت نامہ لکھوایا تو خلیفہ وقت کو اپنا وصی بنایا اور خلیفہ نے بذاتِ خود اس کی وصیت کا اجرار کیا۔

ابن الندیم بغدادی نے کتاب الفہرست میں اور یاقوت حموی نے معجم الادباء میں واقدی کی بیس اکیس کتابوں کے نام گنوائے ہیں[۱] جو بیشتر تاریخی نوعیت کی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ غزوات نبوی اور فتوحات اسلامی کے متعلق ہیں۔ ان میں سے "کتاب المغازی" ہم تک اپنی مکمل صورت میں پہنچی ہے۔ اس میں رسول کریمؐ کے غزوات کا جو بیان ہے وہ ابن اسحاق کے بیان سے زیادہ مفصل اور مبسوط ہے۔ امام طبری اور دوسرے مؤرخوں نے واقدی کو مغازی کے بارے میں سند مانا ہے اور اپنی کتابوں میں اس سے بہت سے اقتباسات لئے ہیں۔ واقدی نے واقعات کی تاریخیں معین کرنے کا خاص التزام کیا ہے اور مستشرقین کی تحقیق یہ ہے کہ واقدی نے ملکی فتوحات اور دیگر تاریخی واقعات کے جو سنین لکھے ہیں، ان کی سریانی تاریخوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

خان کریمر نے گزشتہ صدی میں واقدی کی کتاب المغازی کا جو اڈیشن کلکتہ سے شائع کرایا تھا ایک ناقص اور نامکمل نسخہ پر مبنی تھا۔ کتاب المغازی کا ایک مکمل، صحیح اور خوشخط نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اور جرمن مستشرق ولہاؤزن (WELLHAUSEN) نے کتاب کا جو جرمن ترجمہ ۱۸۸۲ء میں برلن سے شائع کیا تھا، وہ اسی نفیس نسخہ پر مبنی تھا۔ حال میں مسٹر جونز (JONES) نے اس نسخہ کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر دیا ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے تین ضخیم جلدوں میں ۱۹۶۴ء میں شائع کر دیا[۲]۔ مسٹر جونز نے کتاب المغازی کو بصورت احسن منظر عام پر لا کر تاریخ اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

۱۔ کتاب الفہرست لابن الندیم البغدادی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۴۔ واقدی کے لئے دیکھئے نیز وفیات الاعیان لابن خلکان جلد ثانی۔ (مطبوعہ قاہرہ)

۲۔ KITAB AL-MAGHAZI OF AL-WAQDI, EDITED BY J.M.B. JONES 3 VOLS 1200 PP. OXFORD PRESS, 1964.

۲۔ کتاب الطبقات الکبیر لابن سعد

محمد بن سعد (۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ) واقدی کے شاگرد تھے اور اس کی تالیفات کی کتابت کیا کرتے تھے، اسی لئے "کاتب الواقدی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بعد ازاں بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ اور تابعین کے حالات میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو اپنی ضخامت اور جامعیت کی بنا پر "کتاب الطبقات الکبیر" کہلاتی ہے۔ ابتدائی حصہ میں خاص رسول کریمؐ کی سیرت کا بیان ہے۔ اس کے بعد صحابہ، صحابیات اور تابعین کے حالات مندرج ہیں۔ ابتدائی حصہ یعنی "اخبار النبی" میں ابن سعد نے اپنے استاد واقدی کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے، تاہم بعض واقعات کے متعلق اس نے دوسرے مصادر سے بھی معلومات حاصل کی ہیں، جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ بہر حال یہ کتاب اسلام کی پہلی دو صدیوں کے مشاہیر کے حالات میں ایک بے مثال تالیف ہے، اور سیرت نبوی کے قدیم اور نہایت قیمتی مصادر میں شمار ہوتی ہے۔

ابن سعد کی اس لاجواب تالیف کو اختصار کے خیال سے "طبقات ابن سعد" بھی کہتے ہیں۔ پروفیسر زخاؤ (SACHAU) نے چند دیگر جرمن فضلاء کے تعاون سے اسے آٹھ جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ اشاریے ان کے علاوہ ہیں۔ پہلی دو جلدیں سیرت نبوی کے لیے وقف ہیں اور آٹھویں جلد صحابیات کے حالات میں ہے۔ چند سال ہوئے بیروت میں طبقات ابن سعد کا جو ایڈیشن طبع ہوا تھا وہ پروفیسر زخاؤ والے ایڈیشن کی نقل ہے۔ طبقات ابن سعد کے اکثر حصوں کا اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ کے اہتمام سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ "انساب الاشراف" مؤلفہ علامہ بلاذری

احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں۔ انہوں نے بغداد میں نشوونما پائی تھی اور وہاں کے نامور علماء مثل ابن سعد اور المدائنی وغیرہ سے علم حاصل کیا تھا۔ ان کی متعدد تالیفات میں سے دو اہم کتابیں ہم تک پہنچی ہیں: کتاب فتوح البلدان اور کتاب انساب الاشراف۔ "انساب الاشراف" عربوں کی ایک جامع تاریخ ہے، جس کی ترتیب ان کے نامور خاندانوں کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کا بیان ہے جو رسول خدا (صلعم) کا خاندان ہے اور اس ضمن میں پوری سیرت نبوی آ گئی ہے۔ اس کے بعد بنو عباس، بنو امیہ اور دیگر خاندانوں کا ذکر ہے۔ اس عہد کے دیگر مؤرخوں کی طرح بلاذری نے بھی انساب الاشراف کی تالیف میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ مختلف عنوان قائم کر کے ان کے ذیل میں متعدد روایات کو ان کے اسناد کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور ان کو ایک مسلسل بیان کی صورت نہیں دی جیسا کہ آج کل کی تاریخی کتابوں کا دستور رہا ہے۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، انساب الاشراف کا ابتدائی حصہ سیرت نبوی پر مشتمل ہے۔ اس میں اکثر روایات وہی ہیں جو دوسرے مورخین نے اپنے اسناد کے ساتھ بیان کی ہیں، لیکن بعض روایات ایسی بھی ہیں جو اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ بہر حال انساب الاشراف کا یہ ابتدائی حصہ بھی سیرت کے بنیادی مصادر میں شمار ہونے کے لائق ہے، جس کو فاضل معاصر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایڈٹ کر کے ایک مستقل مجلد کی صورت میں ۱۹۵۹ء میں قاہرہ سے شائع کر دیا ہے۔ یہ ایڈیشن جس کے صفحات کی تعداد ۲۲۷ ہے، استنبول کے ایک نادر قلمی نسخہ پر مبنی ہے۔

۴۔ تاریخ الرسل والملوک مؤلفہ امام طبری

امام محمد بن جریر طبری (متوفی سنہ ۳۱۰ھ) طبرستان میں پیدا ہوئے اسی لئے طبری کہلائے۔ ایام جوانی میں تحصیلِ علم کے لیے بغداد آئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ساری عمر یہیں تعلیم و تالیف میں بسر کر دی۔ تاریخی روایات کے جمع و تدوین میں اپنے تمام پیشرو مورخین پر سبقت لے گئے۔ چنانچہ ان کی تاریخ اسلام کی پہلی تین صدیوں کے متعلق معلومات کا ایک ایسا بے بہا خزانہ ہے جو عربی ادب میں عدیم النظیر ہے۔ امام موصوف نے بہت سی تاریخی روایات کو مختلف مصادر سے بے کراسناد کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور ان کو ترتیب زمانی کے اعتبار سے سن وار لکھا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کو مختلف راویوں کی زبانی مختلف صورتوں میں قلمبند کیا ہے۔ اس طرزِ تالیف سے اگرچہ سلسلہ کلام طویل ہو گیا ہے لیکن راویوں کی اور ان کی روایات کی تنقید آسان ہو گئی ہے۔ تاریخ طبری گویا تاریخ اسلام کی ایک SOURCE - BOOK ہے۔

زمانے کی دست بُرد سے تاریخ طبری کے اجزاء بکھر گئے تھے اور اکثر علماء اس کے مکمل نسخہ کے حصول سے ناامید ہو چکے تھے۔ ان حوصلہ فرسا حالات میں لائیڈن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈی خویے (DE GOEJE) نے اس کو مکمل طور پر شائع کرنے کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ اس کے منتشر اجزاء کو مختلف کتب خانوں سے جمع کیا اور چند دیگر فضلاء کے تعاون سے بیس سال کی مسلسل محنت کے بعد اس کا ایک شاندار اڈیشن بارہ جلدوں میں شائع کیا اور اشاریہ کے علاوہ مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی تیار کی جو ۷۰۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ طبری تقریباً نایید ہو چکی تھی۔ مگر پروفیسر ڈی خویے کی ہمت اور علم دوستی قابلِ صد ستائش ہے کہ انھوں نے امام طبری کی بے نظیر تاریخ کو از سرِ نو زندہ کیا۔ مصر میں تاریخ طبری کے جو نسخے چھپے ہیں، وہ اسی مغربی اڈیشن کی نقل ہیں۔ ان مصری طباعتوں میں بہترین اڈیشن وہ ہے جو محمد ابو الفضل ابراہیم کی تصحیح سے قاہرہ کے دار المعارف کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ (قاہرہ سنہ ۱۹۶۰ء) تاریخ طبری کا جو حصہ سیرت نبوی سے متعلق ہے وہ خاصا ضخیم ہے اور جامعہ عثمانیہ کے اہتمام سے اُردو میں منتقل ہو کر حیدر آباد دکن میں طبع ہو چکا ہے۔ تاریخ طبری کا یہ حصہ بھی سیرت نبوی کے نہایت اہم مصادر میں شمار ہوتا ہے۔

متاخرین کی تالیفات

سیرت نبویؐ کے متعلق متاخرین کی کتابیں بکثرت ہیں، جن کا حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ذیل کی کتابیں زیادہ مشہور رہیں اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں :-

۱۔ کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفےٰ

اس معروف اور مقبول کتاب کے مصنف قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض ہیں جو بالعموم قاضی عیاض کے نام سے مشہور رہے ہیں آپ سنہ ۴۹۶ھ میں سبتہ (مراکو) کے شہر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ پھر قرطبہ چلے گئے، اور وہاں ابو الولید ابن رشد اور بہت سے دیگر فضلاء سے فیض حاصل کیا اور علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔ بعد ازاں سبتہ کے قاضی مقرر ہوئے اور داد گستری میں بڑا نام پایا۔ آپ نے تقریباً بیس کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "کتاب الشفا" ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے رسول پاکؐ کے فضائل، محاسنِ اخلاق اور معجزات و کرامات کو ایسے مؤثر اور دلپذیر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے رسولِ مقبولؐ کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت ٹپکتی ہے۔

کتاب الشفا، استنبول، قاہرہ اور ہندوستان میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے اور اس کا اُردو ترجمہ حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی کے قلم سے "شمیم الریاض" کے نام سے مطبع منشی نولکشور لکھنؤ کی طرف سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مصر کے مشہور ادیب شہاب الدین خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ) نے کتاب الشفا کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی جو ۱۲۶۷ھ میں استنبول میں چار جلدوں میں طبع ہوئی تھی۔[1]

۲۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر

اس کتاب کے مؤلف مصر کے مشہور عالم حافظ ابوالفتح ابن سید الناس (۶۷۱ھ تا ۷۳۴ھ) ہیں۔ انہوں نے علوم اسلامیہ دینیہ میں سے حدیث نبوی میں تخصص پیدا کیا اور ایک مدت تک مدرسہ طاہریہ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ مذکورہ بالا کتاب جس کا موضوع سیرت نبوی ہے، بڑی جامع اور متین ہے اور معتبر اور مستند روایات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے، محدثین کے طریق پر سند کے ساتھ نقل کیا ہے قاہرہ میں دو جلدوں میں ۱۳۵۶ھ میں طبع ہو چکی ہے۔

۳۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد

اس کتاب کے مصنف حافظ ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱ھ تا ۷۵۱ھ) ہیں، جو آٹھویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم دین تھے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید اور زندگی بھر کے رفیق تھے کتب سیرت میں "زاد المعاد" اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں رسول پاکؐ کے حالات اور عہد رسالت کے واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر موقع پر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول مقبولؐ کے فلاں قول یا فلاں فعل سے کیا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان کے حالات اور معمولاتِ زندگی میں ہمارے لئے کیا کچھ سامانِ موعظت موجود ہے۔ غرضکہ اس کتاب میں امت کے سامنے رسول کریمؐ کا اسوۂ حسنہ اس طرح کھول کر رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے شمع ہدایت کا کام لے سکتی ہے۔ یہ قابلِ قدر کتاب اپنی غیر معمولی دلچسپی اور افادیت کی وجہ سے مصر میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ عہد حاضر کے ایک مصری عالم شیخ محمد ابو زید نے "ہدی الرسول" کے نام سے اس کا اختصار کر دیا ہے اور اس سے ان دقیق مسائل کو نکال دیا ہے جو طبقہ علماء کے ساتھ مخصوص تھے تاکہ عوام بھی اس مفید کتاب سے براہِ راست فیض یاب ہو سکیں۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس اختصار کا اُردو میں ترجمہ کر دیا تھا جو الہلال بک ایجنسی کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ (پوری کتاب کا ترجمہ از رئیس احمد جعفری ۱۹۶۲ء میں نفیس اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا۔ ادارہ)

۴۔ المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ تالیف القسطلانی

ابوالعباس احمد بن محمد شہاب الدین قسطلانی مصر کے ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے جو ۸۵۱ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۹۲۳ھ میں رحلت کر گئے۔ انہوں نے صحیح البخاری کی شرح "ارشاد الساری" کے نام سے لکھ کر بڑی شہرت پائی۔ ان کی دوسری اہم کتاب

---

[1] قاضی عیاض کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو حافظ ابوالعباس المقری کی تالیف "ازہار الریاض فی اخبار قاضی عیاض" جو تونس میں طبع ہو چکی ہے۔ کتاب الشفا کا ایک اردو ترجمہ منزل نقشبندیہ لاہور سے ۱۳۲۱ء میں شائع ہوا۔ از حافظ احمد علی شاہ بٹالوی (ادارہ)

"المواہب اللدنیہ" فنِ سیرت میں ہے اور بڑی مشہور اور مقبول ہے اور دو ضخیم جلدوں میں ۱۲۸۱ھ میں قاہرہ میں طبع ہو چکی ہے۔[1]

"المواہب اللدنیہ" کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مفصل شرح محمد بن عبدالباقی زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) کی ہے جو علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ زرقانی جو مصر کے ایک قریہ زرقان کی طرف منسوب ہیں، اپنے وقت کے ایک جید عالم اور مشہور استاد تھے۔ انکی کتاب سیرت نبوی کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہے فاضل شارح نے ہر واقعہ اور ہر موضوع کے متعلق مختلف مصادر سے ضروری مواد یکجا کر دیا ہے، جس سے مختلف روایات کا باہمی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اور تحقیق و تدقیق میں آسانی رہتی ہے۔ یہ شرح کیا ہے گویا سیرت نبوی کی ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے وسیع النظر مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ زرقانی کی شرح سب سے پہلے بولاق کے سرکاری مطبع میں ۱۸۷۲ء میں آٹھ ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی۔ یہ طبع اول سب سے بہتر ہے، کیونکہ بعد کی طباعتیں کاغذ اور چھپائی کے لحاظ سے ناقص ہوتی چلی گئی ہیں۔

۵۔ الخمیس فی احوال انفس نفیس

یہ کتاب شیخ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۹۶۶ھ) کی تالیف ہے اور چونکہ پانچ حصوں میں منقسم ہے، اس لیے بالعموم "تاریخ الخمیس" کے نام سے مشہور رہی ہے، اس کا بیشتر حصہ جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، سیرت نبوی کے لیے وقف ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کتب سیرت کے علاوہ تفاسیر قرآن، کتب حدیث اور دیگر نوعیت کی بہت سی کتابوں سے ماخوذ ہے جن کی تعداد ایک سو بائیس ۱۲۲ ہے اور جن کے نام مصنف نے اپنی کتاب کی ابتداء میں لکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے اس کے مضامین میں جامعیت کے ساتھ ساتھ بڑا تنوع پیدا ہو گیا ہے اور علمائے نے اسے ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے فن سیرت کی اہم اور مستند کتابوں میں شمار کیا ہے۔ تاریخ الخمیس کے ایک قلمی نسخہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دیار بکری نے اس کی تالیف سے ۹۴۰ھ میں فراغت پائی تھی۔ تاریخ الخمیس سب سے پہلے قاہرہ کے مطبع وہبیہ میں ۱۲۸۳ھ میں مصطفیٰ بن محمد کی تحقیق و تصحیح سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا ایک اور اڈیشن مطبع عبدالرزاق میں ۱۳۰۲ھ میں دو جلدوں میں طبع ہوا۔

۶۔ انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون

سیرت کی یہ مقبول کتاب علامہ علی بن برہان الدین حلبی (متوفی ۱۰۴۴ھ) کی تالیف ہے، اسی لئے اپنے مؤلف کے نام پر "سیرتِ حلبیہ" کے نام سے مشہور رہی ہے، جیسا کہ مؤلف نے اپنی تالیف کی ابتداء میں صراحت کر دی ہے یہ کتاب فن سیرت کی دو معروف کتابوں سے ماخوذ ہے یعنی حافظ ابن سید الناس کی "عیون الاثر فی فنون السیر" اور شمس الدین شامی کی "سبل الھدیٰ والارشاد فی سیرۃ خیر العباد" جو عام طور پر "سیرت الشامی" کے نام سے مشہور رہی ہے۔ جہاں تک "عیون الاثر" کا تعلق ہے بڑی معتبر اور مستند کتاب ہے لیکن اسناد کے التزام نے اسے طویل تر بنا دیا ہے، لہٰذا علامہ حلبی نے اس سے استفادہ کرتے وقت اس کی

---

[1] علامہ قسطلانی کے لیے دیکھئے شذرات الذہب لابن العماد ذیل ۹۲۳ھ
المواہب اللدنیہ کا اردو ترجمہ از عبدالجبار خاں حیدر آباد دکن سے ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوا۔ (ادارہ)

اسناد کو حذف کر دیا ہے۔ باقی رہی "سیرت الشامی" اس میں ہر قسم کی ضعیف اور سقیم روایتیں بھی شامل ہیں۔ اس لئے حلبی نے ان کے بارے میں انتقاد و احتیاط سے کام لیا ہے۔

"سیرت حلبیہ" مصر میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک اڈیشن ۱۳۲۰ھ میں قاہرہ سے تین جلدوں میں شائع ہوا تھا جس کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات کے قریب ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دیگر کتب سیرت کے مقابلہ میں "سیرت حلبیہ" کافی مفصل ہے۔ اس ضخامت اور تفصیل کی وجہ یہ ہے کہ سیرت اور مغازی کے واقعات لکھنے کے علاوہ مصنف نے بہت سے ایسے مسائل سے بھی بحث کی جن کا تعلق عقائد اور عبادات وغیرہ سے ہے۔

بہرحال "سیرت حلبیہ" اپنے فن کی مشہور اور متداول کتابوں میں سے ہے۔

نقشہ شمار حروفِ تہجّی

قرآن مجید میں جتنی بار ہر ایک حرف آیا ہے

حرف	تعداد	حرف	تعداد
ا	۴۸۹۹۲	ض	۶۸۲
ب	۱۲۲۲۸	ط	۱۳۰۷
ت	۲۴۰۴	ظ	۷۸۲
ث	۳۱۰۵	ع	۹۲۷۴
ج	۴۲۳۲	غ	۹۲۱۱
ح	۴۱۲۰	ف	۴۴۱۸
خ	۲۱۰۵	ق	۶۶۱۲
د	۵۹۷۲	ک	۱۰۶۲۸
ذ	۴۷۳۹	ل	۳۳۵۲۰
ر	۱۲۶۴۰	م	۲۶۵۱۵
ز	۳۵۸۰	ن	۴۴۱۹۰
س	۵۹۷۶	و	۲۵۵۸۹
ش	۲۱۱۵	ہ	۱۶۰۷۰
ص	۲۰۰۸۳	ی	۲۵۹۰۹ [1]

[1] نقشہ میں کُل حروف کا مجموعہ نہیں دیا گیا تھا جو کہ جمع کرنے سے ۳۴۶۹۹۸ بنتا ہے۔

سیرتِ نبوی کی اوّلین کتابیں اور اُن کے مؤلفین

تحریر: جوزف ہورووِتس / ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

یہ فاضلانہ مضمون مشہور جرمن مستشرق جوزف ہورووِتس JOSEPH HOROVITZ نے جرمن زبان میں لکھا تھا جسے ۱۹۲۶ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم نے انگریزی زبان میں منتقل کیا اور یہ اسلامک کلچر کی پہلی جلد (۱۹۲۷ء) اور دوسری جلد (۱۹۲۸ء) میں بالاقساط شائع ہوا۔ عربی زبان میں اس کا ترجمہ حسین نصار نے کیا جو مصر سے ۱۹۴۹ء میں چھپا۔ میں نے اسے اُردو میں منتقل کرتے ہوئے انگریزی اور عربی تراجم سے مساوی طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور خود بھی بعض جگہ وضاحتی اشارے شامل کر دیئے ہیں۔

(نثار فاروقی)

باب (۱)

مغازی کی ابتداء

عربی ادب کے تین میدان ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کا ماخذ کہنا چاہیے یعنی: حدیث سیرۃ اور تفسیر۔ ان میں سے ہر ایک کا بنیادی عنصر "شخصی روایت" ہے جو تینوں میں ایک ہی طرح آتی ہے، یعنی متنِ حدیث کو سلسلۂ اسناد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے لیکن تینوں موضوعات کی کتابیں جو انھیں روایات پر مشتمل ہیں ان کو مختلف ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں۔ حدیث کے مجموعے انھیں موضوعاتی تقسیم سے ترتیب دیتے ہیں، (مثلاً: مصنّفات، جن میں صحاح ستّہ شامل ہیں) یا اُن اصحابِ رسول کے ناموں سے جن تک سلسلۂ اسناد پہنچتا ہے (مثلاً: مسانید جیسے مُسند احمد بن حنبل) — البتہ سیرۃ کی کتابوں میں یہ روایات، حوادث کی تاریخی ترتیب سے آتی ہیں۔ اور تفسیر بالحدیث میں انھیں اُن آیاتِ قرآنی کے لحاظ سے رکھا جاتا ہے۔ جن سے یہ متعلق ہوں۔

حقیقتہً ان تینوں موضوعات میں سے کوئی بھی باعتبارِ مواد یکساں کتابیں پیش نہیں کرتا بلکہ انفرادی تالیفات اس مجموعۂ روایات سے مواد کا انتخاب کرنے میں خاصی مختلف ہیں۔ یہ اختلاف کبھی تو مؤلف کے اُن نظریات کی وجہ سے ہوتا ہے جنھیں سامنے رکھ کر وہ تالیف کرتا ہے کبھی اُس معیارِ نقد و جرح کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جو اِن روایات سے اخذ کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے مگر تینوں موضوعات کی وہ تالیفات جنھیں ممکن حد تک جامع کہا جا سکے مثلاً: واقدی کی کتاب المغازی اور امام احمد بن حنبل کی مُسند — بنیادی طور پر ایک ہی مواد رکھتی ہیں۔ ہمیں واقدی کے ہاں مشکل سے کوئی ایسی حدیث ملے گی جو مسند احمد بن حنبل میں درج نہ

ہوئی ہو۔ احادیث نبوی کے سارے ذخیرے کو یک جا کرنے کی ایک قابل ذکر کوشش A HANDBOOK OF EARLY MUHAMMADAN TRADITION کے نام سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ پروفیسر ونسنک WENSINCK نے لائڈن میں یہ کتاب چھاپ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اسی طرح اگر آئندہ یہ ممکن ہوا کہ الطبری نے جو احادیث اپنی تفسیر میں درج کی ہیں انھیں یک جا کر دیا جائے تو احادیث کی حد تک تینوں موضوعات کے کل بنیادی مواد کا جائزہ لینا آسان ہو جائیگا۔

اصحاب رسول کے بعد تابعین کی نسل نے رسول اللہ کے اقوال اور افعال کی اُن روایتوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا جو اُن کے زمانے میں رائج تھیں۔ اگرچہ ان روایات کی قدر و قیمت مشکوک ہے کہ بعض صحابہ احادیث نبوی کو صحائف یا کتب کی شکل میں مدون کرتے تھے[1]۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تابعین کی نسل میں اس طرح کی کتابیں ناپید نہیں تھیں جنھوں نے اپنا مواد اصحاب رسول سے حاصل کیا تھا۔ تابعین میں ایسے حضرات موجود تھے جو مغازی کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مغازی کا مطلب ہے "جنگیں" لفظی معنوں کے لحاظ سے تو اس صنف تحریر کو غزوات رسولؐ و اصحاب رسولؐ تک محدود ہونا چاہیے تھا، مگر عموماً اس کا اطلاق رسول اللہؐ کی مکمل حیات مبارکہ (سیرۃ) پر کیا جانے لگا۔ یہاں ہم مغازی کے اُن علما کا ذکر کریں گے جو بالخصوص تابعین میں ہوتے اور انکی تالیفات کا بیان ہوگا۔ ہم اُن کے صرف اسی کارنامے کو نہیں لیں گے بلکہ اُن سے متعلق جو بھی اہم باتیں ہمیں معلوم ہیں ان سب سے بحث ہوگی۔ پھر ایک یا دو فصلوں میں اُن کے بعد آنے والی نسل یعنی تبع تابعین سے تعلق رکھنے والے علمائے مغازی کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد اولین کتب سیرۃ کے باقاعدہ مؤلفین مثلاً ابن اسحٰق اور اس کے معاصرین اور واقدی و ابن سعد کو لیں گے۔

۱۔ ابان بن عثمان

تابعین میں مغازی کے عالم کی حیثیت سے ہم سب سے پہلے ابان بن عثمان اور اُم عمرو بنت جُندب کا نام لے سکتے ہیں[2]۔ اُن کی پیدائش کسی طرح ۲۰ھ سے بعد کی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ۳۶ھ میں وہ اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ساتھ اُس مہم میں[3] شریک ہو سکیں جو اُنھوں نے قتل عثمان (۳۵ھ) کا قصاص طلب کرنے کو شروع کی تھی۔ اس مہم کے دوران انھیں حضرت عائشہ کے پاس ایک قیدی کے بارے میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟[4] اس کے بعد چالیس برس تک انھوں نے سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ تا آں کہ عبدالملک نے ۷۵ھ میں انھیں مدینہ کا والی مقرر کیا[5]۔ انھیں گورنر بنانے میں خلیفہ نے کچھ نہیں کیا بلکہ یہ سبب ہوا کہ ان کا پیشرو بغیر خلیفہ سے اجازت لیے دربار میں حاضری دینے دمشق پہنچ گیا اور انھیں اپنا وکیل بنا کر چھوڑ گیا[6]۔ ابان ۸۳ھ تک سات سال مدینہ کے گورنر رہے۔ پھر عبدالملک نے انھیں برطرف کر دیا[7]۔ گورنری کے زمانے میں خلیفہ انھیں ہر سال امیر حج نامزد کرتا تھا۔ بلکہ ۸۱ھ میں جنگی دشواریوں کی وجہ سے انھیں خلیفہ کا حکم بروقت نہیں مل سکا اور انھوں نے بطور خود امارت حج کا اعزاز حاصل کرنا چاہا تو اپنے نسب کی بزرگی کی بنا پر اور اپنے قرابت داروں کی اعانت سے یہ عہدہ اپنے قبضے میں رکھنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکا[8]۔ ان کے عہد امارت ہی میں مدینہ کی بعض بڑی شخصیتوں مثلاً جابر ابن عبداللہ صحابی رسول، محمد ابن الحنفیہ حضرت علی کے فرزند اور عبداللہ بن جعفر حضرت علی کے بھتیجے کا انتقال ہوا۔ ان سب کی نماز جنازہ ابان ہی نے پڑھائی[9]۔ اس کے سوا

ان کی سرکاری مصروفیات کا ہمیں زیادہ علم نہیں ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے ایک نیا قاضی مقرر کیا[11] جعلی سکّے بنانے والوں کو سزا دی[12] اور اہلِ مدینہ کے صاع (ناپ کا پیمانہ) میں اضافہ کیا[13]

ان کی وفات کے بارے میں ہماری معلومات غیر یقینی ہیں۔ انھیں وفات سے ایک سال پہلے فالج کا اثر ہو گیا تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ الولید کے عہد (۸۶ - ۹۶ھ) میں مرے اور ابن سعد کا خیال ہے کہ اُن کی وفات یزید ثانی (۱۰۱ - ۱۰۵ھ) کے زمانے میں ہوئی۔ بلکہ بعض لوگ عہد یزید ثانی کے اواخر (۱۰۵ھ) میں بتلاتے ہیں۔

ابان کا شمار فقہائے مدینہ میں ہوتا ہے[14] کہا جاتا ہے کہ انھیں اپنے باپ کے فتاویٰ حفظ تھے[15] کچھ روایات اس کی نفی کرتی ہیں کہ انھوں نے اپنے والد سے احادیث کی سماعت کی تھی[16]

ابان کو زمرۂ محدثین میں اچھی شہرت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کے علاوہ ابوالزناد اور الزہری نے ان سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ اگرچہ احادیث کی سندوں میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے مگر سیرۃ کی کتابوں سے قطعاً غیر حاضر ہے۔ ہمیں ان کا ذکر ابن اسحٰق اور الواقدی کے یہاں یا ابن سعد کی کتاب کے ان حصوں میں جو سیرۃ سے متعلق ہیں ہرگز نہیں ملے گا[17] یہ صحیح ہے کہ ابن سعد نے واقعۂ بدر میں العباس اور دوسرے ہاشمیوں کی گرفتاری کا حال ابان بن عثمان کی روایت سے لکھا ہے[18] لیکن اس خبر کا اسناد (ابان عن معاویہ بن عمّار عن جعفر بن محمد متوفی ۱۴۸ھ) ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں ابان بن خلیفہ عثمان مراد نہیں ہیں بلکہ یہ شیعی مؤلف ابان بن عثمان البجلی ہے[19] مؤخر الذکر نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا موضوع "المبدأ والمبعث والمغازی" ہے اور شاید یہ وہی ہے جس کا تذکرہ یاقوت نے معجم البلدان (۴ : ۵۵) میں کیا ہے اور اسے "صاحب المغازی" کہتا ہے لیکن ہمارے ابان خلیفہ کے بیٹے ہیں اور انہوں نے بھی مغازی میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی۔

ابن سعد میں ایک مغیرہ بن عبدالرحمٰن کے بارے میں کہا گیا ہے:[20] "یہ قابلِ اعتماد تھے مگر انھوں نے بہت کم احادیث کی روایت کی ہے۔ البتہ کچھ مغازی جو انھوں نے ابان بن عثمان سے اخذ کیے تھے، ان کے سامنے کثرت سے پڑھے جاتے تھے اور وہ ہمیں ان کی تعلیم کی اجازت دیا کرتے تھے۔"[21] یہ مغیرہ مسلمہ کی فوج میں تھے جس نے ۹۶ھ میں ایشیائے کوچک کا رُخ کیا تھا[22] اور جسے ۹۹ھ میں عمر ثانی (بن عبدالعزیز) نے واپس آنے کا حکم دے دیا تھا[23] مغیرہ ابان بن عثمان الخلیفہ ہی سے مغازی اخذ کر سکتے تھے۔ ابان بن عثمان البجلی سے نہیں، جو اُن سے دو یا تین نسلوں کے بعد پیدا ہوئے۔

یہ مغازی جو ابان سے مغیرہ نے روایت کیے، اصطلاحی معنوں میں "کتاب" نہیں تھے بلکہ سیرۃ سے متعلق اخبار کا مجموعہ تھے اور غالباً اس مجموعے میں سے بھی جو مذکورۂ بالا صحائف یا کتب کے مماثل تھے ہم تک کچھ نہیں پہنچا۔

بہرحال ابان کا تذکرہ اس اعتبار سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک خاص مجموعہ مغازی کا فراہم کیا۔ فی الواقع قتل عثمان کے بعد مدینہ اسلامی حکومت کا مرکز نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ ایک طویل عرصے تک عرب کی اعلیٰ سوسائٹی کا مرکز رہا جو مدینے کے انصار اور مکّہ کے مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اس میں خاندان بنی امیہ کے انصار بھی شامل تھے جنھوں نے اب دمشق میں اپنی

حاصل کر لی تھی۔ مدینے کے ان حلقوں میں صرف مذہبی علوم ہی ذوق و شوق سے حاصل نہیں کیے جاتے تھے بلکہ موسیقی اور شعر و شاعری کا بھی چرچا ہو رہا تھا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ علما اور شاعروں میں کوئی ربط نہیں تھا یا سب علمائے دین شعر کے مخالف تھے بلکہ خود مدینے میں ایسے علمائے دین موجود تھے جو اعلیٰ درجے کے شاعر تھے جس کی بہترین مثال عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے پوتے ہیں جو رسول اللہؐ کے ساتھ احد میں شریک جنگ تھے۔

ان عبیداللہ کے لیے ابوالفرج الاصفہانی نے کتاب الاغانی میں ایک فصل مخصوص کی ہے[24] جس میں ان کی شاعری کے نمونے ہیں۔ ایسا ہی ابن سعد نے کیا ہے[25] یہ مدینہ کے سات فقیہوں میں سے ایک ہیں۔ جب وہ قبیلہ ہذیل کی ایک دوشیزہ پر عاشق ہوئے تو انہوں نے باقی چھ فقہا کے نام ایک قصیدے میں محبوبہ کو خطاب کر کے گنوائے ہیں اور انھیں اپنی محبت کی شدت پر گواہ بنایا ہے[26]:

أُحِبُّكِ حُبًّا لَوْ عَلِمْتِ بِبَعْضِهِ ... لَجُدْتِ وَلَمْ يَصْعُبْ عَلَيْكِ شَدِيدُ

وَحُبُّكِ يَا أُمَّ الصَّبِيِّ مُدَلِّهِي ... شَهِيدِيَ أَبُوبَكْرٍ وَ أَيُّ شَهِيدُ

وَ يَعْلَمُ وَجْدِي القَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ ... وَعُرْوَةُ مَا أَلْقَى بِكُمْ، وَ سَعِيدُ

وَ يَعْلَمُ مَا أُخْفِي سُلَيْمَانُ عِلْمَهُ ... وَخَارِجَةٌ يُبْدِي لَنَا وَ يُعِيدُ

مَتَى تَسْأَلِي عَمَّا أَقُولُ فَتُخْبَرِي ... فَلِلْحُبِّ عِنْدِي طَارِفٌ وَ تَلِيدُ

۱۔ میں تجھ سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں کہ اگر تجھے اس کا ذرا بھی علم ہو جائے تو تیرا دل نرم پڑ جائے اور محبت کی یہ شدت تجھے کسی مشکل میں ڈالنے والی نہیں ہے۔

۲۔ اور تیری محبت نے، اے بچے کی ماں — میرے حواس چھین لیے ہیں، اس پر ابوبکر گواہ ہیں اور کیسے گواہ ہیں۔

۳۔ اور قاسم بن محمد کو بھی میرا دردِ دل معلوم ہے اور تجھ سے جو مجھ پر گذری ہے وہ عروہ اور سعید بھی جانتے ہیں۔

۴۔ سلیمان بھی اپنی گواہی نہیں چھپائیں گے اور خارجہ بھی اس کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں۔

۵۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر تو اس کی تصدیق کرے گی تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میری محبت تازہ اور شاداب ہے۔

ان مشہور فقہا میں جو شاعر تو نہیں تھے لیکن نقدِ شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے، ایک سعید بن المسیب بھی ہیں جو ان چھ فقیہوں میں شامل ہیں جنھیں عبیداللہ نے اپنی محبت پر گواہ کیا ہے۔ یہ ابوہریرہ کی بیوی کے فرزند اور علم حدیث کے مستند عالم تھے۔ جب نوفل بن مساحق نے مسجد نبوی میں انھیں سلام کیا۔ یہ اپنے شاگردوں اور مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھے تھے۔ نوفل نے پوچھا: "سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ عبداللہ بن قیس الرقیات یا عمر بن ابی ربیعہ"[27] اس وقت خود عبداللہ بن قیس ان کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے تازہ ترین کلام کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی[28] کتاب الاغانی میں ایک روایت ہے[29] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محتاط رائے دینے کو یہ جماعت کتنا پسند کرتی تھی۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: "میں حج کرنے چلا، راستے میں ایک حسین عورت کو دیکھا جو اپنی گفتگو میں فحش ادائیں دکھاتی تھی، میں نے اپنا اونٹ اس کے قریب لا کر کہا: "اے اللہ

کی بندی، تو حج کو جا رہی ہے، کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتی؟" اس پر اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی جو خوبصورتی میں سورج کو شرما رہا تھا، اور بولی:

"چچا میاں، ذرا سوچو تو، میں وہ عورت ہوں کہ العرجی نے جس کے بارے میں یہ کہا ہے:

مِنَ اللَّاءِ لَمْ يَحْجُجْنَ يَبْغِيْنَ حِسْبَةً ولٰكِنْ لِيَقْتُلْنَ الْبَرِيَّ الْمُغَفَّلا

(یہ ان عورتوں میں سے ہے جو اس لیے حج نہیں کرتیں کہ اللہ کی رضا حاصل کریں، بلکہ بے گناہ اور معصوم لوگوں کا قتل عام کرنے جاتی ہیں)

میں نے کہا: "اچھا تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ اس حسین چہرے کو دوزخ کی آنچ سے بچائے۔"

سعید بن المسیب نے یہ قصہ سنا تو بولے: خدا کی قسم اگر عراق کے قابل نفرت لوگوں میں سے کوئی ہوتا تو اس عورت سے یوں کہتا: "دفان ہو، خدا تجھے سمجھے" مگر ابن عمر کا جواب اہل حجاز کی ذہانت لیے ہوئے ہے۔"

اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم اصل موضوع سے زیادہ دور نہیں گئے ہیں، اگرچہ بظاہر یہی محسوس ہو گا، اصل میں یہاں سعید کے کچھ حالات بیان کرنا ضروری تھے اس لیے کہ ہم ان کے اس قول کے ممنون ہیں کہ "مدینہ کے اشراف کی سوسائٹی میں مغازی گفتگو کا پسندیدہ موضوع تھا۔" الطبری نے ان کا بیان نقل کیا ہے:[۳۰] "جب ہم مروان بن الحکم کے پاس تھے" ــ یقیناً یہ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب غالباً ۵۶ھ میں مروان مدینہ کا گورنر تھا ــ "دربان اندر آیا اور بولا: ابو خالد حکیم بن حزام آئے ہیں۔"

اس نے کہا "آنے دو۔"

جب حکیم اندر آئے تو اس نے کہا "خوش آمدید ابو خالد ـ قریب آ جاؤ۔"

مروان صدر مجلس سے ہٹ گیا یہاں تک کہ دونوں کے درمیان تکیہ آ گیا ـ اب مروان نے ان سے کہا "ہمیں بدر کا قصہ سنائیے!"

تب حکیم نے کہنا شروع کیا: "ہم چلے ......" وغیرہ ـ

ایسا ہی عمل عبدالملک بن مروان نے خلیفہ ہونے کے بعد کیا ـ وہ کبار تابعین سے بدر کے حالات معلوم کیا کرتا تھا ـ

اب ہم پھر ابان کی طرف آتے ہیں ـ بڑے فقہا اور محدثین کے بارے میں یہ جاننے کے بعد کہ وہ شاعری کا ذوق رکھتے تھے ہمیں یہ سن کر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ابان بھی شعر کے رسیا تھے ـ ابو الزناد کہتے ہیں[۳۱] کہ میں نے مشکل سے ان کی کوئی مجلس ایسی دیکھی ہو گی جس میں انہوں نے مدینہ کے یہودی شاعر الربیع بن الحُقَیق کے اشعار نہ پڑھے ہوں ـ

سَئِمْتُ وَأَمْسَيْتُ رهنَ الفرا ... شِ مِنْ جُرْمِ قَوْمِي وَمِنْ مَغْرَمِ

وَمِن سَفَهِ الرَّأيِ بَعْدَ النُّهَى ... وَغَيِّبِ الرشادِ وَلَمْ يُفْهَمِ

فَلَوْ أَنَّ قَوْمِي أَطَاعُوا الحَلِيمَ ... لَمْ يَتَعَدَّوْا وَلَمْ يُظْلَمِ

وَلَكِنَّ قَوْمِي أَطَاعُوا الْغُــوا ةَ، حَتّى تَعَاسَ أَهْلُ الـذَّمْ

فَأَوْدَى السَّفِيهُ بِرَأْيِ الْحَلِيمِ وَانْتَشَرَ الأَمْرُ لَهُمْ مُبْرَمْ

۱- اب جو میں بستر میں پڑا ہوں تو اپنی قوم کے جرم و خطا سے عاجز ہوں۔
۲- اور ان کی احمقانہ حرکتوں سے جو سمجھانے کے باوجود سرزد ہوئیں، انھوں نے سیدھے راستے میں عیب نکالے اور بات کو سمجھ کر ہی نہ دیا۔
۳- اگر میری قوم نے عاقلوں کی رائے پر عمل کیا ہوتا تو نہ ان پر زیادتی ہوتی نہ ظلم ہوتا۔
۴- مگر انھوں نے تو بہکانے والوں کا اتباع کیا یہاں تک کہ دشمن (کاٹنے کے بعد سانپ کی طرح) اُلٹ گئے۔
۵- احمقوں نے عقلمندوں کے معاملے کا ایسا ستیاناس کر دیا کہ اب کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا۔

یزید بن عیاض کہتے ہیں[۳۱] کہ اپنے گورنری کے زمانے میں ابان نے صرف یہی غلطی کی تھی کہ حضرت علی کے بھتیجے عبداللہ بن جعفر کو خوش کرنے کے لیے خود دمشق کے دربار میں پہنچے جبکہ عبداللہ اپنے بانسری بجانے والے غلام کو بھیجنے پر آمادہ تھے ......

۲- عروۃ بن الزبیر

ابان کی ولادت کے کچھ ہی زمانے بعد عروۃ بن الزبیر پیدا ہوئے۔ یہ بھی مغازی کے ایسے ہی عالم تھے۔ ان کے مجموعہ روایات سے، ابان کے برعکس بہت کچھ ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے۔ عروۃ بھی اسلام کے قدیم طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حجاج بن یوسف کے ایک طنزیہ جملے کے جواب میں[۳۲] اس پر فخر کیا ہے کہ وہ صدر اول کی سب سے زیادہ شریف مسلمان خاتون سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مکالمہ غالباً ۷۵ھ میں ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ عروہ نے عبدالملک سے باتیں کرتے ہوئے اپنے بھائی عبداللہ کا تذکرہ اُن کی کنیت ابوبکر سے کیا۔ حجاج نے اس پر ملامت کی:

"تیری ماں مرے، تو ایک منافق کا ذکر امیرالمومنین کے سامنے کنیت کے ساتھ کرتا ہے۔"

"یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟" عروۃ نے جواب دیا۔ "جو جنّت کی سردار عورتوں کا بیٹا ہے۔ میری ماں اسما بنت ابی بکر ہے، نانی صفیہ بنت عبدالمطلب ہے، خالہ عائشہؓ ہے اور پھوپھی خدیجہؓ بنت خویلد؟"

عروۃ کے دادا العوام حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے، ان کے باپ الزبیر سابقون الاولون میں سے تھے اور ان کے بھائی عبداللہ جن کا ابھی ذکر ہوا ان مکی اور مدنی اصحاب رسولؐ کی اولاد کے قائد تھے جنھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک مکہ میں حکومت کی۔

عروۃ، عبداللہ سے کئی سال چھوٹے تھے اس لیے کہ عبداللہ نے اپنے چھوٹے بھائی کی ولادت کی خبر اس وقت سنی تھی جب وہ ۲۶ھ میں افریقہ[۳۳] پر چڑھائی کر کے مدینہ واپس آئے ہیں۔ عروۃ نے جنگ جمل (۳۶ھ) میں شرکت نہیں کی تھی جس میں ان کے باپ کام آئے۔ اس لیے کہ یہ اس وقت صرف دس سال کے تھے۔ ان کے مقابلے

میں ابان کچھ ہی بڑے تھے[۳۵] مگر وہ معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ اس زمانے میں عروۃ شہر ہی میں رہے۔ ۴۶ھ میں پہلی بار ان کا نام ایک سیاسی واقعہ کے ذیل میں آتا ہے: جب خالد بن المہاجر نے اپنے مقتول چچا عبدالرحمٰن بن خالد کے خون کا قصاص لیا[۳۶]

معاویہ کی حکومت (۴۱ھ - ۶۰ھ) کے آخری زمانے میں اور ۵۵ھ کے بعد کسی وقت عروۃ اپنے کچھ حامیوں کے ساتھ مسجد نبوی میں روزانہ رات کو باقاعدہ اجتماع کرتے تھے اور قبیصہ کا بیان ہے[۳۷] جو اس جماعت کا ایک رکن تھا اور بعد کو خلیفہ عبدالملک کا معتمد بن گیا تھا کہ اس جماعت کے ممبروں میں اُس کے اور عروہ کے علاوہ مصعب بن الزبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبدالملک بن مروان، عبدالرحمٰن بن مسور، ابراہیم بن عبدالرحمٰن اور عبیداللہ بن عبداللہ شامل تھے[۳۸] رات کے اُن جلسوں کی ایک کہانی ہمارے لیے ابن خلکان نے محفوظ کر دی ہے[۳۹] مگر اس قصے میں موازنے کے لیے اس نے عبداللہ بن الزبیر کا نام بھی شرکا میں شامل کر دیا ہے جب کہ ایسے نام چھوڑ دیے ہیں جو قصے کی مناسبت سے غیر ضروری تھے۔ وہ کہتا ہے: "عبدالملک بن مروان، عبداللہ بن الزبیر اور اُن کے دونوں بھائی عروۃ اور مصعب، معاویہ بن ابی سفیان کے عہد حکومت میں مسجد حرام میں جمع تھے۔ کسی نے کہا: "آؤ ہم سب اپنی اپنی خواہش بیان کریں۔" عبداللہ نے کہا: "میری تمنا ہے کہ دونوں مقدس شہروں (مکہ اور مدینہ) پر حکومت کروں اور خلیفہ بن جاؤں۔" مصعب بولے: "میری آرزو ہے کہ دونوں عراقوں پر قبضہ کروں اور قریش کی دو حسین ترین عورتیں سکینہ بنت الحسین اور عائشہ بنت طلحہ میرے نکاح میں ہوں۔" عبدالملک بن مروان نے کہا "میری تمنا یہ ہے کہ ساری دنیا پر حکومت کروں اور معاویہ کا جانشین ہوں۔" عروۃ نے کہا: "مجھے ان میں سے کوئی تمنا نہیں ہے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ دنیا میں زاہدانہ زندگی گذاروں، آخرت میں سرخرو ہوں اور اُن لوگوں میں شمار کیا جاؤں جن سے علم کی روایت کی جاتی ہے۔" چناں چہ زمانہ بدلا۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی مراد کو پہنچا اسی لیے عبدالملک کہا کرتا تھا کہ "جو کوئی دنیا میں جنتی آدمی کو دیکھنا چاہے وہ عروۃ بن الزبیر کو دیکھ لے۔"

مدینہ میں عروۃ کا قیام تقریباً سات سال نہیں رہا جب وہ مصر میں تھے۔ اس بارے میں خود عروۃ کہا کرتے تھے:[۴۰]

"میں نے سات سال مصر میں گذارے اور وہاں شادی کی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، اُن پر اُن کی طاقت سے زیادہ بار ڈال دیا گیا ہے۔ اگرچہ عمرو نے یہ ملک صلح اور معاہدے کی رُو سے حاصل کیا تھا اور ان پر کچھ ٹیکس لگا دیئے تھے۔"

ہمیں یہ معلوم ہے کہ جس زمانے میں اُن کے بھائی نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے[۴۱] عروۃ مصر میں تھے۔ دوسری طرف عبداللہ نے ۶۴ھ میں مصر کے لیے جو گورنر نامزد کیا تھا اسے اگلے ہی سال وہاں سے آنا پڑا تھا اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عروۃ نے جو سات سال مصر میں گذارے یہ ۵۸ھ سے ۶۵ھ تک کا زمانہ ہوگا۔ عبداللہ کی خلیفہ سے جنگ میں عروۃ بھی اپنے بھائی کے ساتھ تھے اور جب ۷۲ھ میں اپنے بھائی کی خاطر لڑتے ہوئے مصعب بھی مارے گئے تو عروۃ کو اُن کا ترکہ پہنچا تھا[۴۲] اور جب عبداللہ کا محاصرہ مکہ میں ہوا تو یہ اپنے بھائی کے ساتھ رہے[۴۳]۔ عبداللہ کے قتل اور اُن کے مقصد

کی ناکامی کے بعد (۷۳ھ) عروۃ سیدھے عبدالملک کے دربار میں پہنچ گئے جو اب مستقل طور پر خلیفہ تھا اور جس کے ساتھ آخر عہد معاویہ میں عروۃ راتوں کو مسجد نبوی میں جمع ہوتے تھے، جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے۔ عبدالملک کے دربار میں عروۃ کی حاضری سے متعلق متعدد مماثل روایات ملتی ہیں[44] یہاں عبداللہ بن قائد کی روایت درج کی جاتی ہے:

"عروۃ ایک بہترین اونٹ پر سوار ہوئے اور اس سے پہلے دمشق جا پہنچے کہ حجاج کے قاصد عبداللہ بن الزبیر کے مقتول ہو جانے کی خوش خبری لائیں۔ جب وہ عبدالملک کے دروازے پر آئے تو انھیں باریابی دی گئی۔ انہوں نے "خلیفہ" کہہ کر سلام کیا، عبدالملک نے جواب دیا، خوش آمدید کہا اور گلے سے لگایا۔ پھر انھیں تخت پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ پھر عروۃ نے کہا:

متمتّ بأرحامٍ إليك قريبة
ولا قربَ للأرحامِ ما لم تُقرَّبِ

(ہم تجھ سے قریبی رشتہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر کوئی رشتہ قریبی نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے قریب کیا نہ جائے)

پھر باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ عبداللہ کا تذکرہ ہوا۔ عروۃ نے کہا: "ابوبکر[45] ہم سے جدا ہو گئے۔" عبدالملک نے کہا: "کیا ہوا؟" کہا: "قتل کر دیے گئے، خدا اُن پر رحمت کرے۔" اس پر عبدالملک سجدے میں گر پڑا۔ عروہ نے کہا: حجاج نے ان کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا ہے اس سے کہو کہ لاش ان کی ماں کے حوالے کر دے۔" اس نے کہا: بہتر۔ اور سولی دینے کے بارے میں جو اطلاع ملی تھی اس پر اظہار رنج کیا اور حجاج کو لکھا: "خبردار عروہ کو میں نے امان دے دی ہے۔" تیس دن کے اندر وہ شام سے مکہ واپس آ گئے۔ حجاج نے سولی سے عبداللہ کا جسد اُتار کر اُن کی ماں کے حوالے کر دیا تھا (ماں نے لاش کو غسل دیا، مگر پانی پڑنے سے جسم اُدھڑنے لگا۔ وہ کہنے لگیں: "مجھے خواب میں اُم المنقطع (ٹکڑے ہونے والے بچے کی ماں) کہا گیا تھا، میں المنذر کو سمجھی تھی کیونکہ تلوار سے اس کے ٹکڑے کیے گئے تھے۔ اپنے بیٹے کو نہیں سمجھی تھی" پھر ایک ایک عضو علیحدہ دھویا، ان کو جوڑ کر دفن کیا[46] عروہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

عبدالملک عروہ کا اتنا ہی احترام کرتا تھا جتنی اس سے توقع کی جا سکتی تھی، مگر عروہ کے بیٹے ہشام کا کہنا ہے کہ عروہ کو بعض دمشق والوں سے شکایت تھی[47] ایک دن عروہ عبدالملک کے ساتھ بیٹھے تھے، کچھ لوگ آئے اور عبداللہ بن الزبیر کا ذکر شروع کیا عروہ دربان سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے "عبداللہ بن الزبیر میرے ماں باپ کا فرزند تھا جب تمھیں اس کا تذکرہ کرتا ہو تو مجھے باریابی نہ دیا کرو۔"

عبدالملک کو جب معلوم ہوا تو کہا "ہم نے تمہارے بھائی کو عداوت سے قتل نہیں کیا، بلکہ اس نے حکومت طلب کی ہم نے بھی طلب کی، اس میں وہ مارا گیا۔ اہل شام کا یہ وطیرہ ہے کہ جسے قتل کرتے ہیں اُسے بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ اگر ہم کسی کو تم سے پہلے باریابی دیں اور ایسا شخص آ جائے جو بدزبانی کرنے والا ہو تو تم اندر مت آؤ، اور اگر کسی دوسرے کو باریابی مل جائے جب کہ تم یہاں بیٹھے ہو تو اُٹھ کر باہر چلے جاؤ۔"

عبدالملک سے عروہ کی اور ملاقاتوں کا حال ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں یہ جانتے ہیں کہ عروہ کے مدینے واپس آنے کے

بعد علمی موضوعات پر ان دونوں میں خط و کتابت رہتی تھی۔

دوبارہ پھر عروہ دمشق گئے جب ۸۶ھ میں ولید تخت حکومت پر بیٹھا[۴۹] اس وقت ان کے ہم رکاب ان کا بیٹا اور ان کے خاندان کا ایک دوست شاعر اسماعیل بن یسار بھی تھا۔ اس دوسرے سفر دمشق میں عروہ پر ایک بلا نازل ہوگئی۔ ان کا بیٹا محمد شاہی اصطبل کی چھت سے گر پڑا، جہاں سے جھانک کر وہ گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے الف ہو رہے تھے۔ انہوں نے دولتیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ خود عروہ کو بھی زہر پھیل جانے کی وجہ سے اپنی ایک ٹانگ کٹوانی پڑی تھی۔

محمد کے مرثیے میں اسماعیل بن یسار نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ کتاب الاغانی میں محفوظ ہے اور اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں ہشام بن عروہ کی روایت بھی درج ہے، وہ کہتا ہے: "پھر عروہ ولید بن عبدالملک کے پاس پہنچے اور اپنے پیر کے زخم کی شکایت کی۔ ان سے کہا گیا کہ اسے قطع کرا دو۔ بولے مجھے لنگڑا بننا پسند نہیں۔ اب وہ زخم گھٹنے تک پہنچ گیا۔ ان سے کہا گیا: "یہ اگر گھٹنے تک آگیا تو تم مر جاؤ گے۔ مجبوراً کٹوا دیا، اور ان کے چہرے پر کوئی ناگواری کا اثر نہیں تھا۔ کاٹنے سے پہلے اُن سے کہا: ہم آپ کو ایسی دوا دیتے ہیں جس کو پی کر درد کا احساس نہیں ہوگا۔ بولے "کوئی ضرورت نہیں، یہ دیوار مجھے اس تکلیف سے بچائے گی۔۔۔۔" اور محمد بن عروہ بن الزبیر — جن کی ماں الحکم بن ابی العاص بن امیہ کی بیٹی تھی — ولید کے اصطبل میں ایک چبوترے سے گر پڑے۔ ایک گھوڑی نے اپنے سُموں سے مار مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔ ایک شخص عروہ کے پاس تعزیت کے لئے آیا تو عروہ نے کہا، اگر تم میری ٹانگ پر افسوس کرنے آئے ہو تو میں اس پر صبر کر چکا۔" اس نے کہا کہ میں تو محمد کی تعزیت کو حاضر ہوا ہوں۔" بولے "اسے کیا ہوا؟" تب انھیں یہ ماجرا سنایا گیا، انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

وَكُنْتُ إذَا الأَيَّامُ أَحْدَثْنَ هَالِكًا أَقُولُ شَوًى، مَا لَمْ يُصِبْنَ حَمِيمِي

(جب زمانہ کوئی ستم ایجاد کرتا تھا تو میں کہا کرتا تھا" یہ تو کچھ بھی نہیں! مگر یہ اُس وقت تھا کہ میرے کسی عزیز پر آفت نہیں آئی تھی۔")

"یا اللہ! تو نے میرا ایک عضو چھین لیا مگر باقی اعضا تو موجود ہیں، ایک بیٹے کو مجھ سے جُدا کر دیا تو دوسرے بیٹے ہیں، اگر تو انھیں لیتا ہے تو باقی بھی تو ہی رکھتا ہے، اور آزمائش میں ڈالتا ہے تو عافیت بھی تجھی سے ملتی ہے۔" جب وہ مدینے آئے تو اپنے العقیق والے محل میں مقیم ہوئے۔

دوسرے متعدد بیانات میں بھی عروہ کی ٹانگ کٹ جانے کا یہی حال ملتا ہے[۵۱]۔ ان میں سے ایک یہ ہے:[۵۲]

"عیسٰی بن طلحہ، عروہ کے پاس آئے، یہ اس وقت الولید بن عبدالملک کے دربار سے واپس آئے تھے اور ٹانگ کٹ چکی تھی۔ عروہ نے اپنے کسی بیٹے سے کہا: "ذرا میری ٹانگ کھول دو تاکہ یہ تمہارے چچا دیکھ لیں۔" اس نے ایسا ہی کیا۔ عیسٰی نے کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے ابو عبداللہ ہم نے تمھیں کشتی لڑنے یا دوڑ لگانے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ہمارے لیے اس چیز کو باقی رکھا جس کے ہم محتاج تھے یعنی تمہارا علم اور ذہانت۔"

عروہ نے کہا: "تمھاری طرح کسی نے بھی میری ٹانگ کے بارے میں میری ڈھارس نہیں بندھائی۔"

امرا بنی امیہ میں سے ایک امیر عمر بن عبدالعزیزؒ جب مدینے کے گورنر تھے (۸۷ھ یا ۹۳ھ) تو عروہ ان کے پاس اکثر جایا کرتے تھے۔ عروہ ان دس فقہا میں سے ایک تھے جنھیں مدینے کا والی ہونے کے بعد عمرؓ نے مشورے کے لئے طلب کیا۵۵۔ ابن سعد نے ایک حدیث بنوی عروہ سے روایت کی ہے جو عمرؓ نے اس وقت بیان کی تھی جب وہ مدینے میں مسجد تعمیر کر رہے تھے (۸۸ھ) اس کے باوجود عروہ نے گورنر سے اس وقت شدید احتجاج کیا تھا جب اس نے ان کے قول کو جھٹلایا کہ "حضرت عائشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والدین کے سوا کسی سے اتنی محبت نہیں کرتی تھیں جتنی عبداللہ بن الزبیر سے۵۶"۔

مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی آگ بھڑکانے سے عروہ بہت بچتے تھے چنانچہ ان سے یہ قول منسوب۵۷ ہے کہ "علیؓ اس سے بہت زیادہ متقی تھے کہ وہ قاتلین عثمانؓ کی مدد کرتے اور عثمانؓ بھی اس سے کہیں زیادہ پرہیزگار تھے کہ علی ان کو قتل کرا دیتے" عروہ حضرت کے ایک پوتے علی بن الحسین (ف ۹۲ھ یا ۹۴ھ) کے ساتھ مسجد نبوی کے عقبی حصے میں ہر شام کو بیٹھا کرتے تھے۔ ایک بار ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی اس میں عبداللہ بن حسن بھی شریک تھے وہ بیان کرتے ہیں۵۸: "ایک رات ہم باتیں کر رہے تھے۔ یہ عبدالملک یا الولید کا زمانہ تھا"۔ بات کا رخ بنو امیہ کے جور و ستم کی طرف پھر گیا جو انھوں نے اپنے عہد اقتدار میں کیے اور سب لوگ بے بسی سے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے اللہ کے عذاب سے خوف ظاہر کیا جو بنی امیہ پر کیا جائے گا۔ اس پر عروہ نے علی سے کہا: "اے علیؓ جو شخص ظلم سے خود کو علیحدہ رکھتا ہے اور جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ ظالموں کے فعل سے نفرت کرتا ہے تو خواہ وہ ان کی طرف تھوڑا سا میلان رکھتا ہو، جب ظالموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا، تو خدا سے امید کی جاتی ہے کہ وہ شخص محفوظ رہے گا"۔

پھر عروہ نے مدینہ چھوڑ دیا اور العقیق چلے گئے۵۸۔ عبداللہ نے کہا: "اور میں وہاں سے نکل کر سویقہ میں مقیم ہوگیا"۔

یہاں جو کلمات عروہ سے منسوب ہوئے ہیں جس میں امویوں کے استبداد کا حوالہ ہے، یہ غالباً انھوں نے حکام دمشق سے اپنا تعلق باقی رکھنے پر اپنے دفاع میں کہے ہیں جن سے انھوں نے اپنی اطاعت کا انکار نہیں کیا اور مدینے میں رہ کر بھی ان سے رابطہ قائم رکھا۔

عروہ کے سال وفات کے بارے میں ہمیں قطعیت سے معلوم نہیں ہے۵۹۔ البتہ بہت سے ثقات اُن کا انتقال ۹۴ھ میں بتلاتے ہیں۔ انھوں نے الفُرع کے پاس اپنی جاگیر مُجاج میں وفات پائی۔ اُن کے بیٹوں میں محمد اور ہشام کا ہم نے پہلے بھی کئی بار نام لیا ہے، ان کے سوا چھ بیٹوں کے نام ہمیں اور معلوم ہیں۶۰۔

عروہ بحیثیتِ محدث بڑی شہرت کے مالک ہیں، اور وہ مدینہ کے سات فقہا میں سے ایک ہیں۔ اپنے خاندانی رشتوں کی وجہ سے انھیں صدر اسلام کی بہت سی روایات اولین ذرائع سے فراہم کرنے کے مواقع حاصل تھے، یعنی اپنے والد بزرگوار سے، اپنی ماں سے اور سب سے زیادہ خالہ عائشہ سے۔ جن سے وہ کثرت سے ملتے اور سوالات کرتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں۶۱ کہ میں نے اور عروہ نے ابن عمر سے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ نے کتنے عمرے کیے تھے، اُن کے جواب سے ہماری تشفی نہیں ہوئی تو عروہ عائشہؓ کے پاس گئے۔ انھوں نے دوسرا ہی جواب دیا۔

جن حضرات نے عروہ سے روایت کی اُن میں ہشام بن عروہ اور محمد بن مسلم بن شہاب الزہری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے بیٹے ہشام اطلاع دیتے ہیں کہ واقعہ حرّہ کے دن (۶۳ھ) جس میں یزید نے مدینے والوں کو شکست دی تھی، عروہ نے اپنی فقہ کی کتابیں جلا ڈالی تھیں[۶۲] بعد میں اس نقصان پر بہت رنج کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کتابوں کے بارے میں علم نہیں جو اُن کے پاس ہوں یا جن پر انہوں نے کچھ شرح وغیرہ لکھی ہو[۶۳]

عروہ نے ثقہ راویوں سے جو اخبار حاصل کیے تھے وہ اپنے شاگردوں کو زبانی ہی منتقل نہیں کیے بلکہ صدرِ اسلام کے حوادث پر انھوں نے اپنی معلومات کو مدوّن بھی کیا تھا۔ اس طرح کے کئی مدون رسائل ہمیں ابن اسحٰق، الواقدی اور الطبری کی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ الطبری میں جو اقتباسات درج ہیں اُن کا خطاب غالباً خلیفہ عبدالملک سے ہے۔ دوسروں میں ابن ابی ہُنَیدہ مخاطب ہے جو خلیفہ الولید کے دربار سے متوسل تھا۔

ابتداً ابن عبدالملک اکثر فقہا کی صحبت میں بیٹھتا تھا[۶۴] اور نوجوانی میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کا شائق تھا[۶۵] خلیفہ عثمان کے فتاویٰ اُسے زبانی یاد تھے اور ابوہریرہ، ابوسعید الخُدری وغیرہ صحابہ سے اس نے احادیث سُنی تھیں[۶۶]۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اس نے مدینہ کی طرف رجوع کیا[۶۷] جسے وہ علم حدیث کا مرکز جانتا تھا اور مغازی کے موضوع پر عروہ سے معلومات حاصل کیں۔ جن کو وہ اپنے زمانۂ قیام مدینہ سے ہی اس موضوع پر سند سمجھتا تھا اور جن سے عبداللہ کی بغاوت کے فرو ہونے کے بعد خوشگوار تعلقات ہو گئے تھے۔

عبدالملک کے نام عروہ کے رسائل کا پہلا اقتباس جو الطبری[۶۸] میں محفوظ ہے، حبشہ کو ہجرت کرنے سے متعلق ہے اس کے ساتھ طویل سلسلۂ اسناد ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے:

"ابان العطار قال: ثنا هشام بن عروة عن عروة، انه كتب الى عبد الملك بن مروان......"

(ابان العطار نے کہا: مجھ سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا، ان سے عروہ نے بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو لکھا......)

دوسرے اقتباس میں بھی ہمیں یہی سند ملتی ہے[۶۹] فرق اتنا ہے کہ اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: "عن عروة انه قال...." اس میں یہ نہیں ہے کہ "كتب إلى عبد الملك"۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ بھی عبدالملک کے نام اُن کے مراسلے کا ہی ایک اقتباس ہے اس لیے کہ باعتبار موضوع یہ پچھلے اقتباس سے مربوط ہے کیونکہ پہلے میں حبشہ کو ہجرت کرنے کا بیان ہے جس کا باعث پہلا "فتنہ" تھا اور دوسرا اقتباس مدینہ کو اصحاب رسول کی ہجرت کا بیان پیش کرتا ہے جو دوسرے "فتنے" کے سبب ہوئی۔ عروہ نے لفظ "فتنہ" قرآن کی آیۃ (۸: ۳۹) کی رُو سے استعمال کیا ہے اور دوسرے اقتباس میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جس میں ہجرتِ نبوی کا ذکر ہے[۷۱]۔ یہاں بھی سلسلۂ اسناد وہی ہے بس وہی فرق ہے کہ آخر میں ہے: "انھوں نے کہا"۔ یہ نہیں ہے کہ "انھوں نے عبدالملک کو لکھا"۔ بظاہر یہ تینوں اقتباس ایک ہی مراسلے سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے عبدالملک کو لکھا تھا۔ آگے چل کر ہمیں یہ بات زیادہ واضح لفظوں میں ملتی ہے۔ اُسی سلسلۂ اسناد کے بعد[۷۲]۔

"ثنا هشام بن عروة عن عروة أنه كتب إلى عبد الملك بن مروان: أما بعد: فإنك كتبت إليّ في أبي سفيان ومخرجه تسألني كيف كان شأنه ....."

(ہم سے ہشام بن عروہ نے بہ روایت عروہ بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو لکھا: "امابعد تم نے ابوسفیان اور اُن کے حملے کے بارے میں لکھا ہے اور مجھ سے پوچھا ہے کہ اس کا ماجرا کیا تھا ......")

اس کے بعد غزوہ بدر کا مفصل حال ہے جو ان لفظوں سے شروع ہوا ہے: "كان من شأنه ان أبا سفيان":

.... (ابوسفیان کا یہ حال تھا ....) وغیرہ - اس میں بھی عروہ نے کثرت سے قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے -

ایک اور اقتباس کا آغاز یوں ہے:[۳]

ثنا هشام بن عروة عن عروة أنه كتب إلى عبد الملك بن مروان: فإنك كتبت إليّ تسألني عن خالد بن الوليد: هل أغار يوم الفتح وبأمر من أغار؟"

(ہشام بن عروہ نے، اُن سے عروہ نے، بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو خط لکھا۔ امابعد: تم نے خط لکھ کر خالد بن الولید کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا ہے کہ کیا انہوں نے فتح مکہ کے دن حملہ کیا تھا اور کس کے حکم سے کیا تھا؟")

اور جواب اس طرح شروع ہوتا ہے "إنه كان من شأن خالد ....." (خالد کا حال یہ تھا .....) وغیرہ

اس لیے اگر ہم دوسرے اقتباسات میں، اُسی سلسلہ اسناد کے بعد صرف یہ دیکھتے ہیں کہ "ہشام بن عروہ نے بیان کیا اُن سے عروہ نے بیان کیا، کہا:" وغیرہ ——— تو اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ بھی عبدالملک کو لکھے گئے جواب ہی کا مزید اقتباس ہے اس لیے کہ پہلے اقتباس کے آخری الفاظ،[۴] اس اقتباس کے شروع میں آ گئے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبدالملک کو مراسلے کا ایک ٹکڑا[۵] دوسرے اقتباس میں[۶] پیش کر دیا گیا ہے۔ نیز الطبری نے عبدالملک کو عروہ کے جواب کا ایک مختصر ٹکڑا محفوظ کر دیا ہے جس میں خلیفہ نے حضرت خدیجہ کی وفات کا سنہ پوچھا تھا۔[۷] دوسرا اقتباس عبدالملک کے اس سوال کا جواب ہے کہ کیا رسول اللہ نے الاشعث بن قیس کی بہن سے نکاح کیا تھا؟[۸]

عبدالملک یا الولید کے استفسار میں جو کچھ عروہ نے رسائل لکھے اُن کی روایت تو ہشام بن عروہ نے کی ہے اور ابن ابی ہُنیدہ کو،[۹] عروہ نے جو جواب لکھا اس کا متن الزہری کی بدولت ہم تک پہنچا ہے - ابن ابی ہُنیدہ خلیفہ الولید کا گہرا دوست تھا اس نے قرآن کی سورہ (۶۰ : ۱۰) کے متعلق استفسار کیا تھا- عروہ نے اس تاریخی پس منظر کی وضاحت کی ہے جس کی طرف سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔[۱۰]

عروہ کی جو روایات یہاں نقل کی گئیں یہ رسول اللہ کی حیات طیبہ کے خاص وقائع سے متعلق تدوین کی ہوئی قدیم ترین روایات ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں، ساتھ ہی یہ عربی زبان کی مورخانہ نثر کا سب سے پرانا نمونہ بھی ہیں۔ اگرچہ کسی قدیم ماخذ میں[۱۱] یہ نہیں کہا گیا کہ عروہ نے مغازی کے موضوع پر کوئی تالیف کی تھی، لیکن اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے حیاتِ رسول کے بہت سے

اہم واقعات جمع کیے اور انھیں آیندہ نسلوں کو منتقل کیا۔ جو اقتباسات ہم تک پہنچے ہیں ان سے بھی بظاہر ہوتا ہے کہ عروہ اپنے تحریری رسائل کا مواد ان احادیث سے حاصل کرتے تھے جو انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ اگرچہ عام طور پر وہ اپنے مراجع کا حوالہ نہیں دیتے، لیکن ہجرت نبوی کے بیان میں اس کا استثنا موجود ہے جہاں انہوں نے بتا دیا ہے کہ یہ ان معلومات پر مبنی ہے جو انہوں نے حضرت عائشہ سے حاصل کی تھیں[۸۲]۔ مزید برآں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے احادیث نبوی کا حوالہ دیا ہے وہ بھی انھیں اسی ماخذ سے ملی ہوں گی[۸۳]۔ لہذا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ عروہ اسانید کے خلاف تھے یا اپنا ماخذ چھپاتے تھے۔ خود رسائل بتا رہے ہیں کہ وہ سند کا التزام کرتے تھے اگرچہ انہوں نے مکتوبات میں اسناد کا چنداں اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس زمانے میں — ۷۵ھ کے لگ بھگ — اسناد کا طریقہ پوری طرح رائج ہو چکا تھا لہذا کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ عروہ کی سند سے، اور دوسرے معتبر حضرات کی توثیق سے، جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں بغیر تحقیق کیے ان کی صحت سے محض اس لیے منکر ہو جائے کہ عروہ کے مراسلوں میں سند کا حوالہ کہیں کہیں آیا ہے۔

ایک سے زیادہ مواقع پر عروہ نے حدیث کی اہمیت کا اظہار کیا ہے[۸۴]۔ وہ برابر اپنے بیٹوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ علم حدیث حاصل کر کے وہ اپنے وجود کو ناگزیر بنا سکتے ہیں[۸۵]۔ ان کے بیٹے ہشام کا کہنا ہے کہ عروہ کبھی اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کہتے تھے[۸۶]۔ بلکہ حدیث سے استنباط کرتے تھے۔ عروہ کی بہت سی حدیثیں ہمیں ملتی ہیں جو زیادہ تر ان کے فرزند ہشام نے اور الزہری نے روایت کی ہیں اور یہ احادیث کے مستند مجموعوں میں اسی طرح شامل ہیں جیسے سیرۃ کی کتابوں میں۔ ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور طبری نے خاص طور پر ان احادیث کا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے۔ سیرۃ رسول کی قدیم ترین کتابیں جو ہمارے پاس ہیں ان کا بہت بڑا حصہ عروہ کے مجموعۂ روایات پر مبنی ہے۔ اگرچہ بعض اخبار ان سے غلط بھی منسوب ہو گئے ہوں پھر بھی سیرۃ کے بڑے حصے پر عروہ کے حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان اخبار میں بھی اکثر حضرت عائشہ کی سند دی گئی ہے۔ ان کے اور بہت سے صحابہ و صحابیات کے سوا، ایسی متعدد روایات ہیں جن کے لیے عروہ نے کوئی سند نہیں بتائی ہے۔ یقیناً اس عہد میں اسناد کا رواج تھا لیکن اس وقت تک یہ لازماً ضروری نہیں ہوا تھا۔ علاوہ بریں عروہ لکھی ہوئی دستاویزات کو بھی اپنا ماخذ بناتے تھے۔ مثلاً انہوں نے وہ خط نقل کیا ہے[۸۷] جو رسول اللہؐ نے اہل ہجر کو لکھا تھا عروہ سے جو روایات پہنچی ہیں وہ رسول اللہؐ کی حیات کے ہر دور سے متعلق ہیں، اس کے علاوہ ابتدائی خلفاء کے عہد کا حال بھی بتاتی ہیں

یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ عروہ نے صرف احادیث نبوی جمع کرنے کا اہتمام کیا یا اس عہد کے اخبار ہی فراہم کیے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر فقیہ اور محدث تھے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہی ان کے بہت سے معاصرین کا حال تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بھی شاعری کے مخالف نہ تھے۔ ابوالزناد نے ان کے بارے میں کہا ہے[۸۸]: "میں نے عروہ سے زیادہ شعر کی روایت کرنے والا کسی کو نہیں پایا۔"

لوگوں نے ان سے کہا: "آپ کتنے شعر پڑھتے ہیں، اے ابو عبداللہ!"

انہوں نے جواب دیا: "کیا جتنے شعر میں پڑھتا ہوں یہ اس سے بھی زیادہ ہیں جو عائشہ پڑھتی ہیں؟ شاید ہی کوئی بات ایسی ہوئی

ہو جس پر انہوں نے ایک آدھ شعر نہ سُنا دیا ہو۔"

اگرچہ یہاں حضرت عائشہ کی مثال بے محل ہے اس سے صرف مغازی میں اشعار کے استعمال کا جواز پیش کرنا مقصود ہوگا، لیکن اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ عروہ شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اسمٰعیل بن یسار شاعر سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے[۸۹] جسے وہ اپنے ساتھ عبدالملک اور الولید کے دربار میں لے گئے تھے اور جس نے اُن کے بیٹے محمد کا مرثیہ لکھا تھا۔ قبیلۂ قریش کے مشہور غزل گو شاعر عمر بن ابی ربیعہ سے بھی ان کی دوستی تھی[۹۰]۔ البتہ رسول اللہ کے شاعر خاص حسان بن ثابت کے بارے میں اُن کی رائے اچھی نہیں تھی[۹۱]۔

مزید برآں شاعری کا یہ ذوق ان کے گھرانے کے دوسرے افراد کو بھی ملا تھا: ان کے بھائی عبداللہ، جن پر الزام لگایا گیا تھا[۹۲] کہ معن بن اوس کے اشعار کو اپنے نام سے منسوب کر دیتے ہیں، شعر کے زندہ دل نقاد معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے بھائی جعفر بحیثیت شاعر معروف تھے، ان کے متعلق کتاب الاغانی میں ایک علیحدہ باب ہے جس میں ان کا کلام بھی درج ہے جو عروہ کو خطاب کر کے لکھا گیا تھا[۹۳]۔ خود عروہ کے کچھ طنز یہ اشعار کتاب الاغانی میں محفوظ ہیں[۹۴] جو عائشہ بنت طلحہ کے حج پر کہے گئے تھے۔ اُن اخبار تاریخی میں بھی جو اُن سے مروی ہیں عروہ شعر چسپاں کرنے سے نہیں جھجکتے[۹۵]۔ یہ اشعار ان لوگوں سے منسوب ہیں جنھوں نے خود اُن حوادث میں حصہ لیا تھا۔ بنا بریں ابوالزناد کے اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عروہ نے رسول اللہؐ کی حیات سے متعلق جو اخبار و احادیث اپنے تلامذہ کو روایت کیں اُن میں ایسے اشعار بھی سمو دیے جو اُن وقائع میں حصہ لینے والوں نے لکھے تھے، جیسا کہ بعد کو ابن اسحٰق نے کیا۔

۳۔ شرحبیل بن سعد

ابان اور عروہ کے برخلاف، جو دونوں مسلمانوں کے طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے، مغازی لٹریچر کی تاریخ میں تیسرا قابلِ ذکر نام ایک غلام کا ہے: یعنی شرحبیل بن سعد جو مدینے والے بنی خطمہ کے مولی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی (ف ۴۰ ھ) کو دیکھا تھا[۹۶]۔ ۱۲۳ھ میں ان کا انتقال ہوا[۹۷] اور سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ جن صحابہ سے انھوں نے حدیث اخذ کی، ان میں زید بن ثابت، ابوہریرہ اور ابوسعید الخدری شامل ہیں[۹۸]۔ خود شرحبیل کا بیان ہے کہ وہ الاسواف میں[۹۹] زید بن ثابت کی جاگیر میں جا کر رہے تھے اور موسیٰ بن عقبہ شہادت دیتے ہیں کہ شرحبیل نے مدینہ کو ہجرت کرنے والوں کی فہرست بنائی تھی، اسی طرح ان اصحاب کے نام لکھ لیے تھے جنھوں نے بدر اور احد کے غزوات میں حصّہ لیا۔ سفیان بن عُیینہ کا قول ہے[۱۰۰] کہ مغازی اور اصحاب بدر کے حالات کا ان سے بہتر جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن بڑھاپے میں ان کے حواس ذرا مختل ہو گئے تھے[۱۰۱] اور ان کے افلاس کی وجہ سے کوئی ان کی بات کو سچ نہیں مانتا تھا۔ اس لیے کہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر یہ کسی کے پاس جائیں[۱۰۲] اور وہ انھیں کچھ نذر نہ دے تو یہ کہہ دیں گے کہ "تیرا باپ بدر میں موجود نہیں تھا۔" یا ایک اور موقع پر کہا گیا ہے[۱۰۳] کہ یہ "مغازی کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے لیکن لوگوں نے الزام لگایا کہ جس کا کوئی تعلق واقعہ سے نہ ہو یہ پیدا کر دیتے تھے۔ چونکہ یہ محتاج تھے اس لیے لوگ ان کے مغازی کو ساقط الاعتبار سمجھتے تھے۔"

جب موسیٰ بن عقبہ نے یہ الزامات سُنے تو کہا: "لوگ خواہ مخواہ اس شخص کے خلاف ہو گئے ہیں جو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے بہ تکلیف وہ زندگی گزار رہا ہے۔"

موسیٰ بن عقبہ نے تو اس طرح ان کی حمایت کی مگر ابن اسحٰق کو ان سے کد تھی، جب کسی نے سوال کیا کہ "شرحبیل سے تم نے کتنی احادیث لی ہیں؟" تو اس نے کہا تھا: [۵۰] "اچھا کیا کسی نے شرحبیل کی حدیث کو بھی اخذ کیا ہے؟"

دوسری کتابوں میں بھی شرحبیل کے خلاف رائیں ملتی ہیں، لیکن سب کا یہ خیال نہیں ہے۔ ابن حبّان نے انھیں ثقات میں شمار کیا ہے۔ ابن اسحٰق اور الواقدی ان سے روایت نہیں لیتے مگر ابن سعد نے رسول اللہ ﷺ کے قبا سے مدینہ کو ہجرت کرنے کی خبر ان سے اخذ کی ہے۔ اس خبر میں شرحبیل نے کوئی سلسلۂ اسناد نہیں دیا، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ دوسری روایات میں بھی ان کا یہی معمول رہا ہوگا۔ اس اقتباس سے دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ شرحبیل نے اپنے آپ کو اصطلاحی معنوں میں مغازی تک ہی محدود نہیں رکھا تھا۔

۴۔ وہب بن منبہ

مغازی کے یہ تین عُلَما جن کا ہم نے ذکر کیا یعنی ابان، عروہ اور شرحبیل مدینہ کے رہنے والے تھے اور وہیں انھوں نے زندگی بسر کی۔ لیکن ان کے خلاف چوتھی شخصیت وہب بن منبہ [۱] جو تابعین کی نسل میں تھے اور انھیں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جنوبی عرب کے باشندے تھے، اور ان کی اصل ایرانی تھی۔ ان کی ولادت ایک ایسے فارسی خاندان میں ہوئی جو اسلام سے پہلے نوشیرواں کسریٰ کے عہد میں ایران سے آکر جنوبی عرب میں بس گیا تھا۔ یہ لوگ ابنا کہلاتے تھے۔ وہب کے پردادا اُسوار کا نام بھی فارسی تھا۔ ایک صریحاً غلط بیان کے مطابق وہب نے ۱۰ھ میں اسلام قبول کیا [۹] جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہجرۃ سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام کا قول [۹] جو ابن الندیم نے نقل کیا ہے ناقابل تسلیم ہے کہ وہب اہلِ کتاب تھے اور بعد میں ایمان لے آئے تھے۔ یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ وہ مسلمان ہی پیدا ہوئے اور واقدی کا اشارہ شاید ان کی طرف نہیں بلکہ ان کے باپ کی طرف ہے جن کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ انھوں نے ۱۰ھ میں اسلام قبول کیا۔

اس میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہب ۳۴ھ میں پیدا ہوئے [۱۰]۔ یہ ان حالات سے بھی مطابقت رکھتا ہے جو اُن کی زندگی کے متعلق ہمیں معلوم ہیں صنعا کے قریب ایک جگہ ذمار اُن کا مولد بتائی جاتی ہے۔ ان کے بھائیوں میں ہمام، معقل اور غیلان کا نام آتا ہے۔ الثعلبی [۱۱] نے معاویہ اور وہب کے ایک مکالمے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ خلیفہ الولید کو مسجد دمشق کی تعمیر کے وقت (۸۶ھ) پتھر کا ایک ٹکڑا ملا جس پر کسی اجنبی زبان میں کچھ کندہ تھا وہ اس نے پڑھوانے کے لیے وہب کے پاس بھیجا [۱۲]۔ وہب ایک زمانے تک اپنے وطن میں قاضی رہے۔ سماک بن الفضل [۱۳] نے اس دور کا ایک قصہ بیان کیا ہے: "ہم عروہ بن محمد امیر یمن کے پاس [۱۴] تھے۔ ان کے ساتھ وہب بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ آئے اور انھوں نے عامل کی شکایت کی اور اس کے بارے میں بُری رپورٹ دی۔ وہب نے عروہ کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر عامل کے سر پر اس زور سے مارا کہ خون نکل آیا۔ اس پر عروہ ہنسے اور کہا: "تم ابو عبداللہ ہمیں الزام دیتے تھے اور خود بھڑک گئے!" وہب نے کہا: "کیوں نہ بھڑکوں، ان سے تو خوابوں کا پیدا کرنے والا بھی ناراض ہے اور کہتا ہے (سورۃ ۴۳ آیہ ۵۵):

"فلما اسفونا انتقمنا منھم" جب وہ ہمیں غضب دلاتے ہیں تو ہم ان سے انتقام لیتے ہیں
یہاں وہب نے خدا کو "خالق احلام" (خوابوں کا پیدا کرنے والا) کہا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ خوابوں کو بہت اہمیت دیتے تھے اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر آخر میں یہ بات جاتی رہی تھی[۱۱۵] اور اُن کا خیال تھا کہ یہ قاضی کا عہدہ قبول کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یہ صرف وہب ہی کا خیال نہیں ہے۔ بہت سے دیندار لوگوں کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ سرکاری عہدے قبول کرنے کو ناپسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے صفائے باطن جاتی رہتی ہے۔

ایک اور موقع پر وہب کو زاہدانہ زندگی بسر کرنے والا بتایا گیا ہے[۱۱۶] کہا جاتا ہے کہ "انھوں نے چالیس سال تک کسی جاندار کو گالی نہیں دی، بیس سال تک عشا اور فجر کے درمیان وضو نہیں کیا۔ . . . اور چالیس سال تک بستر پر نہیں سوئے"
کہتے ہیں ایک زمانے میں وہ عقیدۂ قدر کے قائل تھے[۱۱۷] لیکن بعد میں اس سے رجوع کر لیا تھا کیوں کہ یہ وحی کے خلاف تھا۔
۱۰۰ھ میں وہ مکہ میں موجود تھے[۱۱۸] یہاں انہوں نے متعدد ممتاز فقیہوں سے ملاقات کی۔ عمر کے بالکل آخری حصے میں وہ قید کر دیے گئے تھے مگر اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا[۱۱۹] البتہ وہ دین کی خاطر اس قید و بند پر راضی تھے اور کہتے تھے "خدا نے ہمارے لیے قید کا حکم دیا تو ہم نے اس کی عبادت اور زیادہ کر دی"۔ بظاہر یہ قید یمن کے گورنر یوسف بن عمر الثقفی کے حکم سے تھی جو ۱۰۶ھ سے ۱۲۰ھ تک والیٔ یمن رہا۔ کسی نامعلوم سبب سے اس نے ۱۱۰ھ میں وہب کے کوڑے لگوائے یہاں تک کہ وہ مر گئے[۱۲۰]

وہب کو عام طور سے ثقہ راوی سمجھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ابن عباس، جابر اور ابو ہریرہ وغیرہ سے روایت کی مگر رواۃ نے مدینہ کے دوسرے تابعین کے مقابلے میں ان سے بہت کم اخذ کیا ہے۔ امام بخاری نے ان سے ایک حدیث درج کی ہے جس کا سلسلۂ اسناد وہب نے اپنے بھائی ہمام کے واسطے سے ابو ہریرہ تک پہنچایا ہے لیکن ادبِ عربی میں جو کثیر روایات وہب سے منسوب ہیں ان کا سلسلہ اسناد ہمیں شاذ و نادر ہی ملتا ہے[۱۲۱]

وہب بعض باتوں میں مدنی اصحاب سے مختلف ہیں، مثلاً: وہ اہل کتاب کی احادیث پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ وہب سے جو مغازی منسوب ہیں ان کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اُن روایات کو جانچنا ہوگا جو دوسرے موضوعات سے متعلق انہوں نے چھوڑی ہیں۔ جن میں خاص طور سے تاریخ اہل کتاب کا موضوع ہے یا ان کے وطن (یمن) کی تاریخ ہے۔ اہل کتاب کی روایات سے وہب کی خصوصی دلچسپی کا حال اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ستر یا بہتر یا تہتر یا بانوے صحائف سماوی کا مطالعہ کر رکھا تھا[۱۲۲]۔ ان دعووں کی تصدیق کرنا ضروری نہیں اس لیے کہ کتب مقدسہ (صحف) کی یہ تعداد خود ہی بتا رہی ہے لیکن اس میں تو شک نہیں کہ وہب نے اپنے ہم وطن یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے جو یمن میں خاصی تعداد میں بستے تھے، اہل کتاب کے مذہبی صحیفوں سے اچھی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ وہب کے بیشتر اقوال یہودی اور مسیحی کتابوں کے مندرجات سے کلی مطابقت رکھتے ہیں البتہ کچھ اُن مختلف علمی اِن کے بیانات بقول ابن سعد[۱۲۳] "احادیث انبیا کے علاوہ زاہدوں کے قصے اور بنی اسرائیل کے اخبار" پر مشتمل ہیں۔ یہ اقوال بعد کی نسلوں کو ان کے تلامذہ نے منتقل کیے جن میں سے کچھ اُن کے خاندانی افراد بھی تھے۔ وہب نے جو مراد جمع کیا تھا اسے خصوصیت سے ان کے پوتے عبدالمنعم

نے محفوظ رکھا اور آئندہ نسل تک پہنچایا۔ وہب کی "کتاب المبتدا" جسے الثعلبی نے اپنی تالیف عرائس المجالس میں عبدالمنعم کی روایت سے استعمال کیا ہے، الفہرست میں ان کی "تالیف" بتائی گئی ہے[۱۲۴] "المبتدا" سے مُبتدأ الخلق مراد ہے۔ لیکن اس رسالے میں اہلِ کتاب کے اخبار کی بنیاد پر صرف نوعِ انسانی کے آغاز کی تاریخ ہی پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ قصص الانبیاء یعنی قدیم رسالت کی تاریخ بھی موجود ہے[۱۲۵]

قصص الانبیاء کی روایات میں خاص طور سے وہب ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر انھوں نے بقول ابن سعد اُن عُبّاد کی تاریخ بھی لکھی تھی جو نبوت کے مرتبے تک نہیں پہنچے اور جب حاجی خلیفہ، وہب کی تالیف قصص الاخیار کا حوالہ دیتا ہے[۱۲۶] تو اس سے شاید یہی عُبّاد مراد ہیں جن کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے۔

حاجی خلیفہ نے وہب سے ایک اور "کتاب الاسرائیلیات" بھی منسوب کی ہے لیکن غالباً یہ قدیم زمانے میں اس نام سے مشہور نہیں تھی۔ مثلاً یاقوت اس کے بارے میں یوں کہتا ہے کہ "وہب نے پرانی کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے جو اسرائیلیات کے نام سے مشہور ہیں"[۱۲۷]۔ یعنی اس نے یہ لفظ وہب کے اسرائیلی مصادر کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حاجی خلیفہ جسے 'کتاب الاسرائیلیات' کہتا ہے، وہ یہی "کتاب المبتدأ" ہے اور اسے بعد کے زمانے میں "اسرائیلیات" کہا گیا ہے۔ بہر حال متاخرین کی کتابوں میں وہب کی "اسرائیلیات" نامی کتاب کے بہت سے اقتباسات ملتے ہیں، مگر چونکہ اُن سے بہت سی غیر صحیح روایات بھی منسوب کر دی گئی ہیں اس لیے ان بیانات پر بہت کم اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ اقتباسات اتنے کافی نہیں ہیں کہ ان کی مدد سے وہب کی مبینہ کتاب "اسرائیلیات" کی بازیافت ہو سکے۔ اگر اس نے فی الواقع اس نام سے کوئی کتاب لکھی تھی۔ بہر حال وِمی شودین (V. CHAUVIN) نے اُسے جمع کرنے کی کوشش کی ہے[۱۲۸]

یہ طے ہے کہ وہب نے اپنی کتاب المبتدأ میں صرف یہودی مآخذ ہی استعمال نہیں کیے بلکہ مسیحی اخبار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابن قتیبہ، الطبری، المسعودی اور الثعلبی کی متعدد روایات اسے ثابت کرتی ہیں۔ ان قدیم کتابوں میں وہب سے منسوب روایات اکثر ایک دوسرے سے معارض ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ان اخبار میں طرح طرح کی تحریف اور اختلافِ نسخ شامل ہوتے رہے ہیں اور بعد میں آنے والے علماء نے اُن تمام قصص کی چھان بین نہیں کی ہے جو وہب سے منسوب ہیں اور جن کی اصلیت مشتبہ ہے۔ ابن قتیبہ نے اصلی "کتاب پیدائش" اور وہب کے اخبار کے کچھ اختلافات ظاہر کیے ہیں۔ مگر ابن ہشام کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہب نے "کتاب مقدس" کا متن بڑی احتیاط سے استعمال کیا ہے۔ اس اختلاف کی توضیح میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو وہب کی جمع کردہ روایات کو بعد میں نشر کرنے والوں نے پیشہ ور قصہ گویوں کے انداز پر ڈھال کر بدل دیا ہے یا پھر وہب ہی نے یہ ترمیم کر دی ہو گی۔

وہب نے اپنی ایک خاص تالیف "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر و اخبارہم و غیر ذلک"[۱۲۹] میں اپنے وطن (یمن) کی قدیم اُسطوری تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب ہمیں دستیاب نہیں ہے لیکن بظاہر یہ وہی ہے جس سے ابن ہشام نے اپنی ہنوز غیر مطبوعہ کتاب التیجان کا مقدمہ تیار کیا ہے۔ اپنی اس کتاب میں جس سے ابن ہشام نے فائدہ اُٹھایا ہے

وہب نے اہلِ کتاب کے مصادر کو نوعِ انسانی کی آفرینش کی "تاریخ" بیان کرنے میں استعمال کیا ہے۔ وہ نہ صرف کتاب پیدائش کے

ناموں اور اعداد کے عبرانی متن کے مطابق حوالے دیتے ہیں بلکہ اس کے سریانی ترجمے کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں

وہب کی تالیف "فتوح" جس کا حاجی خلیفہ نے ذکر کیا ہے[۱۳۲] دوسرے مؤرخوں کے علم میں نہیں ہے مگر ابن سعد نے وہب کی تالیف "حکمت" کا نام لیا ہے[۱۳۳] اور ہسپانوی فہرست نگار ابو بکر محمد بن خیر[۱۳۴] (متوفی ۵۷۵ھ) کو اس کتاب کے ایک نسخے کا علم تھا جس کی سند وہب کے بھتیجے عقیل تک پہنچتی ہے۔ یہ اس نے اپنے چچا سے اخذ کیا تھا۔ اس تالیف میں حکیمانہ مقولے ہیں اسی طرح کی ایک تالیف "موعظہ" تھی جس کا حوالہ اسی ہسپانوی نے دیا ہے[۱۳۵] ابو بکر محمد ابن خیر نے وہب سے زبور کا ایک ترجمہ بھی منسوب کیا ہے جسے وہ "زبور داؤد ترجمہ وہب بن منبہ" کہتا ہے۔ اس بحث کی تکمیل کے لئے یہاں کتاب القدر کا تذکرہ بھی کر دینا چاہیے جسے بقول یاقوت وہب نے تصنیف کیا تھا۔[۱۳۶]

وہب کی یہ ساری کتابیں جن کا اب تک ہم نے ذکر کیا ہے مغازی سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں جو ہماری موجودہ بحث کا اصل موضوع ہے۔ لیکن اگر ہم مغازی کے مفہوم کو وسیع تر معنوں میں سمجھ لیں جس کی ضرورت بھی ہے اور جیسا کہ ابتدائے اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سمجھا بھی گیا ہے اور پھر رسول اللہؐ کی پوری حیاتِ مبارکہ پر اس کا اطلاق کریں تو وہب کی یہ سب کتابیں ہماری بحث کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ یہ سیرۃ کا دیباچہ ہیں اور آنحضرت سے قبل رسالت کی تاریخ بتاتی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے وہب کے بارے میں لکھا ہے[۱۳۷] کہ انھوں نے مغازی جمع کیے تھے مگر قدیم کتب سیرۃ میں کہیں بھی ان کا حوالہ رسول اللہ کی زندگی کے راویوں میں نہیں آتا ہے۔ پھر بھی حاجی خلیفہ کا بیان درست ہے۔ سی ایچ بیکر (C. H. BECKER)[۱۳۸] نے شوت رائنہارڈ (SHOTT-REINHARDT) کے ذخیرۂ اوراقِ بَردی PAPYRI میں جو اب ہائیڈل برگ HEIDELBERG میں محفوظ ہے ایک مجموعہ دریافت کیا ہے جو بظاہر اسی "کتاب المغازی" کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ جزو ۲۲۸ھ میں گویا وہب کی وفات سے تقریباً سو سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:۔

> "محمد بن بکر ابو طلحہ نے ہم سے بیان کیا، اس نے کہا کہ ہم سے عبدالمنعم نے اپنے باپ ابو الیاس سے اور انہوں نے وہب سے روایت کی......"

یہ سند جو اس کتاب کے مشمولات کو وہب کی روایت ثابت کرتی ہے بار بار اس کے متن میں دہرائی گئی ہے۔ مگر وہب یہ کبھی بیان نہیں کرتے کہ انھوں نے اپنا مواد کن راویوں سے لیا ہے۔ ہائیڈل برگ کا مخطوطہ اس امر کی تائید کرتا ہے جو ہمیں الطبری وغیرہ سے معلوم تھا کہ وہب عموماً "اسناد" کا استعمال نہیں کرتے تھے۔

یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہب کے پوتے عبدالمنعم اپنے دادا کی کتابوں کی روایت اپنے باپ اور وہب کے داماد ادریس سے کرتے ہیں[۱۳۹]۔[۱۴۰] لیکن ادریس نے براہ راست وہب سے کچھ روایت نہیں کیا ہے بلکہ وہ ابو الیاس کے طریق سے کہتے ہیں[۱۴۱] جنھوں نے بقول ابو بکر محمد بن خیر وہب کی "موعظہ" کی روایت بھی کی ہے۔

ہائیڈل برگ کا بَردیہ ظاہر کرتا ہے کہ وہب نے 'مغازی' کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے چنانچہ اس میں عقبۂ کبریٰ کی تاریخ بھی موجود ہے، دار الندوہ میں قریش کی میٹنگ کا حال بھی ہے، ہجرت کی تیاریوں کا ذکر ہے پھر خود ہجرت کا بیان ہے، رسول اللہؐ کے مدینہ پہنچنے اور غزوہ بنو خثیمہ کی روداد بھی ہے۔ اگر ہمیں ان اوراقِ بَردی سے کوئی ایسی نئی معلومات حاصل

نہیں ہوئیں جو سیرۃ اور مغازی کی بعد میں لکھی جانے والی مکمل کتابوں میں نہیں ہیں۔ تو اس سے یہ اہم نکتہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۰۰ھ میں یا اس سے بھی پہلے سیرۃ اور مغازی اسی طرح بیان ہوتے تھے جیسے وہ بعد کی تصنیفات میں ضبط ہوتے ہیں۔

کتب متاخرین سے وہب ان امور میں نمایاں ہیں کہ وہ اپنے رواۃ کا نام نہیں لیتے اگرچہ اُن سے بالالتزام اخذ کرتے ہیں، یا نثری قصے میں قصیدے اور اشعار شامل کر دیتے ہیں جنھیں اُن حوادث میں حصہ لینے والوں یا اُن کے معاصروں سے منسوب کرتے ہیں، اور یہی قدیم زمانے سے عرب کے قصہ گویوں کی عادت رہی ہے۔

باب (۲)

ابنِ اسحٰق کے شیوخ

۱۔ عبداللہ بن ابی بکر بن حزم

تابعین کے بعد آنے والی نسل میں بہت سے علمائے حدیث ہوئے، مگر اُن میں سے تین نام ایسے ہیں جن کا یہاں خاص طور پر ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ انہوں نے مغازی کی طرف خصوصی توجہ کی تھی۔ ہماری مُراد عبداللہ بن ابی بکر بن محمد، اور عاصم ابن عُمر بن قتادۃ اور محمد بن مسلم الزہری سے ہے۔ یہ تینوں مدینہ اسکول کے پیرو اور ابنِ اسحٰق کے اہم شیوخ میں سے ہیں۔

عبداللہ بن ابی بکر ایک مدنی خاندان میں پیدا ہوئے۔ عہدِ نبوی میں اُن کے اجداد نے اسلام کی بڑی خدمت کی تھی۔ چنانچہ عبداللہ کے جدِ اعلیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہاں کے باشندوں میں اسلامی تعلیمات کا پرچار کریں[142] اور وہ نجران میں رسولؐ کے گورنر کی حیثیت سے رہے تھے[143]۔ عبداللہ کے دادا محمد بن عمرو واقعۂ حرّہ (۶۳ھ) میں کام آ گئے تھے[144] جب اُمویوں نے اہلِ مدینہ کو شکست دی تھی۔ مروان بن الحکم جو بعد کو خلیفہ ہو گیا تھا، اُنھیں میدانِ جنگ میں پڑا ہوا دیکھ کر ٹھہر گیا تھا اور کہتا تھا "خدا تم پر رحمت کرے۔ میں نے کتنے ستونوں کے پاس تمھیں نماز میں طویل قیام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" پھر عبداللہ کے باپ ابوبکر ۸۶ھ سے مدینہ کے قاضی رہے۔ اِسی سال عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے[145]۔ یہ فقہِ اسلامی کے ماہر سمجھے جاتے تھے[146] اور اس علم میں اَبان بن عثمان کے شاگرد تھے[147]۔ خلیفہ سلیمان نے ۹۶ھ میں عہدۂ قضا کے ساتھ انھیں[148] مدینہ کا گورنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ اُن سے پہلے اُمویوں کی حکومت میں کسی مدنی کو یہ عہدہ[149] نہیں ملا تھا مگر ان کے پاس یہ منصب عمرِ ثانی کے آخر عہد تک[150] رہا۔ انھیں یزید ثانی نے گورنری[151] سے معزول کیا مگر وہ نئے گورنر کے زمانے میں بھی قضا کے منصب پر طویل عرصے تک برقرار رہے[152] جس سے اُن کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور جس نے ایک بار اُنھیں پٹوایا بھی تھا[153]۔ ابوبکر کو دوبارہ ۱۰۴ھ میں چند سال کے لیے مدینے کی گورنری ملی تھی[154]۔ اُنھوں نے ۱۲۰ھ میں یا اس سے چند سال قبل انتقال کیا[155]۔

ابوبکر نے جب علمِ حدیث میں اپنے بیٹے کی دلچسپی کا حال دیکھا تو انھیں نصیحت کی کہ ہر حدیث کے مواد کا پورے سیاق و سباق کے ساتھ

مطالعہ کیا کریں۔ انھیں عمر ثانی کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث یا کوئی قدیم روایت یا عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کی حدیث ہاتھ آئے اُسے قلمبند کر لو، اس لیے کہ مجھے علم کے ضائع ہو جانے اور عالموں کے گذر جانے کا خوف پیدا ہو گیا ہے۔"

عمرۃ جن کا ابھی ذکر آیا ہے حضرت عائشہ زوجِ النبیؐ[156] سے قریبی تعلقات کی وجہ سے اُن احادیث و اخبار کا اچھا علم رکھتی تھیں جو انھیں عائشہ سے ملی تھیں۔ ابوبکر کو اُن کا بھتیجا[157] ہونے کے ناتے اُن سے اخذ کرنے کے اچھے مواقع ملے تھے۔ بایں ہمہ عمر ثانی کے حکم سے مرتب کی ہوئی یہ کتابیں اگلی ہی نسل تک ناپید ہو چکی تھیں[158]۔ ابوبکر کے بیٹوں میں سے محمد بن ابی بکر (متوفی ۱۳۲ھ) بھی اپنے باپ کی طرح مدینے کے قاضی ہو گئے تھے[159]۔

البتہ اُن کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر۔ جن کی وجہ سے ہم نے اُن کے اِتنے رشتہ داروں کا حال لکھا ہے۔ حکومت کی ملازمت سے کنارہ کش رہے۔ الزہری کا بیان ہے (اور ان کے بارے میں اُس کی رائے یہ ہے کہ مدینہ میں اِن کا ثانی نہیں تھا) کہ ان کے باپ جب تک زندہ رہے[160] تو اُن کی دنیوی حیثیت اور شہرت کے سامنے ان کی شہرت دبی رہی۔ عبداللہ اپنے باپ کی وفات کے بعد تقریباً دس یا پندرہ سال زندہ رہے اور ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ میں[161] انھوں نے انتقال کیا۔

عدالتی نظام اور اہلِ مدینہ کے مروّجہ قانون میں جو تعارض پیدا ہوتا تھا اُس کا اظہار ایک مکالمے میں ہوتا ہے جو عبداللہ اور اُن کے بھائی قاضی محمد کے درمیان ہوا[162]۔ "جب انہوں نے ایک مقدمے میں حدیث کے خلاف فیصلہ دیا تو گھر واپس آنے پر اُن کے بھائی نے، جو ایک دیندار انسان تھے، اُن سے پوچھا کہ "بھائی جان میں نے سُنا ہے آج آپ نے ایک ایسے ایسے مقدمے میں یہ فیصلہ دیا ہے۔" محمد نے کہا: "جی ہاں"۔ اس پر عبداللہ نے کہا: "تو پھر حدیث کہاں گئی؟ حالانکہ معاملات کا تصفیہ حدیث کے مطابق ہونا چاہیئے" قاضی محمد نے کہا: "مگر میں سماجی قانون کو کیسے نظر انداز کر دیتا"۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ اہلِ مدینہ کا رواجی ضابطہ جس پر وہ صدیوں سے عامل ہیں، اُن کی نظر میں حدیث سے زیادہ قابلِ عمل تھا۔

ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور الطبری کے مختلف اقتباسات سے ہم راویانِ حدیث میں عبداللہ کی سرگرمیوں کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں، خصوصاً جو کچھ انہوں نے مغازی کے میدان میں کیا ہے اور الفہرست سے ہمیں معلوم ہوتا ہے[163] کہ انہی عبداللہ کے بھتیجے عبدالملک بن محمد القاضی نے جو خود بھی قاضی تھے اور ۱۷۶ھ میں فوت ہوئے ایک کتاب المغازی" لکھی تھی۔ یہ کتاب جو بظاہر ناپید ہو چکی ہے، اُن روایات سے تیار ہوئی ہو گی جو انہوں نے اپنے چچا سے سُنی تھیں[164]۔ چنانچہ انہی عبدالملک کے ایک بھائی عبدالرحمٰن سے بہت سی روایات "واقدی" نے نقل کی ہیں جو انہوں نے اپنے چچا سے اخذ کی تھیں۔ عبداللہ کے اقوال لفظ "مغازی" کے محدود معنوں ہی پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ انھوں نے رسول اللہؐ کے ابتدائی عہد اور ایّامِ شباب کے بارے میں بھی روایات جمع کی تھیں، مگر عام طور پر ان کا نام اخبارِ غزوات کے سلسلے میں ہی سامنے آتا ہے۔ انھوں نے "وفود" (قبائل عرب کے وفود جو رسول اللہ کی خدمت میں آئے) کے متعلق خاص طور سے مواد فراہم کیا ہے اور رسول اللہ کی وفات کے بعد قبائل عرب کے ارتداد (ردّہ) کے اخبار کی روایت کی ہے۔ اس کے بعد آنے والے زمانے کے حوادث مثلاً: عثمانِ غنی کے آخری ایّام کی خبریں بیان کی ہیں[165] عبداللہ کا خاندانی مکان

اُس گھر سے ملا ہوا ہی تھا جس میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تھے[۱۶۶] اور اُن کے پردادا کو اُن حالات کا علم تھا جن کا انجام حضرت عثمانؓ کی شہادت کی شکل[۱۶۷] میں رونما ہوا تھا۔ عبداللہ نے اپنی بیشتر روایتوں میں راویوں کا نام نہیں بتایا، مگر بعض حالتوں میں وہ نام بھی لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسناد کو لازمی نہیں سمجھتے۔ اُن کے اخبارات کا ایک قابلِ لحاظ حصّہ اُن کی بڑی خالہ عُمرۃ کی سند پر منتہی ہوتا ہے، جو انھوں نے زبانی حاصل کیا تھا۔ کہیں انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ کے واسطے سے بھی یہ روایات لی ہیں۔ جنھوں نے عُمرۃ سے براہِ راست اخذ کی تھیں[۱۶۸]۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دکھانے کے لیے کہ اس عہد میں عورت مرد بے تکلف ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے، ہم ایک روایت کو بطورِ مثال پیش کریں، جو عبداللہ کے شاگرد ابن اسحٰق کو عُمرۃ سے پہنچی تھی[۱۶۹]۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ جب میں عبداللہ سے ملا تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا: "تم نے جو کچھ عُمرۃ بنتِ عبدالرحمٰن سے سُنا ہے وہ محمد کو بتا دو"۔ تب اُن کی بیوی نے عُمرۃ کے اقوال سُنائے۔ مزید برآں بعض اوقات عبداللہ نے ایسے سوالوں کا جواب دینے سے قصداً احتراز بھی کیا ہے جن کو وہ چاہتے تو حل کر سکتے تھے، مثلاً انھوں نے مدینے کے اُن دو شخصوں کے نام بتانے سے انکار کر دیا جنھوں نے رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی اُس وقت کی تھی جب آپ کی فوجیں 'الحجر' کے پاس خیمہ زن تھیں۔ اُن دونوں اشخاص کو اِس خلاف ورزی کی سزا بھی دی گئی تھی، اگرچہ آخر میں اُن کی جاں بخشی ہوگئی تھی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں:

"عبداللہ بن ابی بکر نے کہا کہ اُن دونوں کے نام مجھے عبّاس بن سہل نے بتا دیے تھے مگر یہ وعدہ لیا تھا کہ میں اِسے راز میں رکھوں گا، چنانچہ عبداللہ نے مجھے وہ نام بتانے سے انکار کر دیا[۱۷۰]۔"

عبداللہ نے صرف اُن اخبار کو جمع کر لینے پر اکتفا نہیں کیا جو انھیں ملتے رہے بلکہ اِتنے ابتدائی دور میں انھوں نے اِن اخبار کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مدوّن کرنے کی کوشش بھی کی تھی[۱۷۱]۔ چنانچہ انھوں نے غزواتِ نبوی کی فہرست تاریخی ترتیب کے ساتھ تیار کی تھی جو ابن اسحٰق نے اپنی کتاب میں درج کی ہے[۱۷۲]۔ راویوں کے بیانات کے علاوہ انھوں نے لکھی ہوئی کتابوں اور دستاویزوں کی طرف بھی توجہ کی مثلاً وہ خط جو رسول اللہؐ نے ملوکِ حِمیر کو بھیجا تھا[۱۷۳]۔ یا وہ دستاویز جو آنحضرتؐ نے اُن کے پردادا عمرو بن حزم کو ساتھ رکھنے کے لیے اُس وقت دی تھی جب انھیں اہلِ نجران کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے روانہ کیا تھا[۱۷۴]۔ اپنے دوسرے پیشرو راویوں کی طرح ۔ جن کا ہم شروع میں تذکرہ کر چکے ہیں ۔ عبداللہ بھی وقائع بیان کرتے ہوئے، ان میں حصّہ لینے والوں کی زبان سے بکثرت اشعار پڑھوا تے ہیں[۱۷۵]۔ اس کی مثالیں مغازی میں، یا رسول اللہؐ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے حوادث کے بیان میں خوب ملیں گی[۱۷۶]۔ عبداللہ کا گھرانا شاعری کا رسیا تھا۔ 'کتاب الاغانی' میں ایک قصّہ ملتا ہے کہ ابوبکر بن محمد کے ایک بیٹے نے (اور یہ طے نہ ہو سکا کہ یہ خود عبداللہ تھے یا اُن کے بھائیوں میں سے کوئی تھا) ایک بار فرزدق کو چیلنج کیا کہ وہ حسّان بن ثابت کے ایک قصیدے کا جو اُن کا پسندیدہ تھا، جواب لکھکر دکھائے[۱۷۷]۔

یربوعی نے کہا کہ ابراہیم بن محمد بن سعد بن ابی وقاص الزہری نے بیان کیا کہ اَبان بن عثمان کی گورنری کے زمانے میں (۷۵-۸۲ھ) الفرزدق آیا۔ الفرزدق کُثیّر اور میں مدینہ کی مسجد میں بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ چھریرے بدن کا ایک نوجوان ہلکے پیلے رنگ

کے کپڑے پہنے نمودار ہوا۔ وہ ہماری طرف بڑھا اور بغیر سلام کیے بولا: "تم میں فرزدق کون ہے؟" میں نے اس ڈر سے کہ یہ بھی (ابراہیم کی طرح) قریشی نہ ہو، اُس سے کہا: "کیا عربوں کے ایک شاعر اور سردار سے اس طرح خطاب کرتے ہیں؟" وہ بولا کہ "اگر یہ سچ ہوتا تو میں کبھی اس طرح بات نہ کرتا۔" اس پر الفرزدق نے اُس سے کہا: "صاحبزادے تم ہو کون؟" وہ بولا: "میں بنو انصار میں سے ایک ہوں، پھر بنو نجار کا فرد ہوں، پھر ابوبکر بن حزم کا بیٹا ہوں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اپنے تئیں عرب کا شاعر اعظم سمجھتے ہو اور یہی رائے تمہارے بارے میں بنو مُضَر بھی رکھتے ہیں۔ (انصار خود کو جنوبی عرب کی نسل سے سمجھتے تھے اور بنو مضر شمالی عرب کے تھے، اسی قبیلے سے الفرزدق کا تعلق تھا) دیکھو ہمارے شاعر حسان بن ثابت نے (یہ مدینہ کے تھے اور رسول اللہؐ کے صحابی شاعر تھے) ایک قصیدہ لکھا ہے، جو میں تمھیں سناتا ہوں اور ایک برس کی مہلت دیتا ہوں، اگر اس مدت میں تم نے اس قصیدے کا جواب لکھ لیا، تب تو تم عرب کے شاعر اعظم مان لیے جاؤ گے ورنہ محض جھوٹے اور مکار ہو۔" پھر اُس نے حسان کے یہ شعر پڑھے:

لَنَا الْجَفَنَاتُ الْغُرُّ يَلْمَعْنَ بِالضُّحٰى
وَأَسْيَافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَجْدَةٍ دَمَا
مَتٰى مَاتَزُرْنَا مِنْ مَعَدٍّ بِعُصْبَةٍ
وَغَسَّانَ نَمْنَعْ حَوْضَنَا أَنْ يُهَدَّمَا
أَبِيْ فِعْلُنَا الْمَعْرُوْفَ أَنْ نَنْطِقَ الْخَنَا
وَقَائِلُنَا بِالْعُرْفِ أَلَّا تَكَلَّمَا
وَلَدْنَا بَنِي الْعَنْقَاءِ وَابْنَيْ مُحَرِّقٍ
فَأَكْرِمْ بِنَا خَالًا وَأَكْرِمْ بِنَا ابْنَمَا

۱۔ ہمارے شاندار گھوڑے دن کی روشنی میں چمکتے ہیں اور ہماری تلواریں میدانِ کارزار میں لہو ٹپکاتی ہیں۔

۲۔ جب مَعَدّ اور غسان والے اپنی جماعت لے کر ہمارے مقابلے پر آتے ہیں تو ہم انھیں اپنی حوضوں کو ڈھانے نہیں دیتے۔

۳۔ ہمارا اچھے کام کرنے کا جذبہ، ہمیں لغو باتیں بکنے سے روکتا ہے اور ہمارا اچھی باتیں کہنا ہمیں یاوہ گوئی نہیں کرنے دیتا۔

۴۔ ہم نے بنو العنقاء کو اور مُحَرِّق کے دو بیٹوں کو جنم دیا ہے۔ ہم ننھیال کی طرف سے بھی شریف ہیں اور اپنے بیٹوں کے اعتبار سے بھی۔)

یہ قصیدہ اُس نے آخر تک پڑھا اور کہنے لگا: "میں اس کے لیے تمھیں ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر چلا گیا تو فرزدق غصے میں بھرا ہوا اُٹھا، اُس کی چادر کا پلو زمین میں گھسٹ رہا تھا مگر اس وقت فرزدق کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ مسجد سے نکل گیا تو کُثَیّر میرے قریب آیا اور کہنے لگا: "کیسا فصیح و بلیغ کلام تھا، اس انصاری کا، اور کتنی روشن دلیلیں تھیں، کیا

پیارا قصیدہ تھا۔" اُس روز ہم دن بھر فرزدق اور انصاری کی گفتگو کرتے رہے۔ اگلی صبح کو میں اپنے گھر سے نکل کر پھر اسی ٹھکانے پر پہنچا اور کثیر بھی آ کر بیٹھ گیا اور وہی فرزدق کی بات چھڑ گئی۔ ہم نے کہا: "یہ تو معلوم ہو کہ اس بھلے آدمی نے کیا کیا؟" اتنے میں فرزدق کئی رنگوں کا دھاری دار یمنی لباس پہنے نمودار ہوا، اور اس کے بال دولٹوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ اسی جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں کل بیٹھا تھا اور بولا: "انصاری نے کیا کیا ہے؟" ہم نے فرزدق کی دلجوئی کے لیے انصاری کی مذمت شروع کر دی تو فرزدق کہنے لگا: "خدا اُسے غارت کرے، نہ میں کبھی ایسے کسی شخص سے ملا ہوں، نہ میں نے ایسے اشعار سُنے ہیں"۔ پھر فرزدق کہنے لگا کہ جب میں کل تم سے جدا ہو کر اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو میں نے شاعری کے ہر فن میں زور لگا کر دیکھ لیا مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں گونگا ہوں اور گویا میں نے کبھی شعر کہا ہی نہ تھا۔ جب فجر کی اذان ہو گئی تو میں نے اپنی اونٹنی کا کجاوہ کسا اور اس کی مہار سنبھال کر اسے مدینے کے قریب ذُباب کی پہاڑیوں تک لے گیا اور وہاں اونچی آواز سے پکار پکار کر کہا: (اس مؤکل یا جن سے جو فرزدق کی شاعری میں مدد کرتا تھا) "ارے ابو لُبینہ اپنے بھائی کی مدد کرو"۔ تب میرا سینہ اس طرح جوش کھانے لگا جیسے ہانڈی میں اُبال آتا ہے۔ میں نے اونٹنی کو وہیں باندھ دیا اور اس کے بازوؤں سے تکیہ لگا کر بیٹھ گیا اور جب تک ۱۱۳ شعر نہ ہو گئے وہیں بیٹھا رہا۔" جب فرزدق ہمیں یہ اشعار سنا رہا تھا، وہی انصاری جوان اچانک آ گیا۔ اس نے ہمارے قریب آ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ "میں نے جو مہلت تمھیں دی تھی اُسے گھٹانے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ تم جب بھی ملو گے تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے کیا کیا"۔ فرزدق نے کہا: "بیٹھ جاؤ" اور پھر اشعار سنانے شروع کیے:

عَزَفْتَ بِاَعشاشٍ وَمَا كِدْتَ تَعْزِفُ

وَاَنْكَرْتَ مِنْ حَدْرَاءَ مَا كُنْتَ تَعْرِفُ

(اب تو اعشاش (جگہ کا نام) سے کترا کر جا رہا ہے حالانکہ تیرا اس سے کترانا مشکل ہے اور تو نے حُدرار کی (نام محبوبہ) اُن باتوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے جنھیں تو خوب جانتا تھا)

جب فرزدق یہ قصیدہ پڑھ چکا تو وہ نوجوان مُنہ لٹکائے ہوئے اُٹھا اور ہمارے درمیان سے کھسک گیا، ادھر وہ گیا اور اُدھر اس کے باپ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کچھ اور انصاری شیوخ کے ساتھ وہاں آ پہنچے، اُن سب نے ہمیں سلام کیا اور کہنے لگے "اے ابو فراس (یہ فرزدق کی کنیت ہے) تمھیں ہمارا حال اور رسول اللہ کی نظر میں ہماری قدر و منزلت کا حال معلوم ہے اور انھوں نے ہمارے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ بھی تم جانتے ہو ہمیں پتا چلا ہے کہ ہمارے ایک بیوقوف شخص نے تم سے معارضہ کیا ہے ہم تمھیں خدا اور رسول کا واسطہ دے کر اور رسول اللہ نے ہمارے بارے میں جس سلوک کی ہدایت فرمائی ہے اُسے یاد دلا کر تم سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ہجو لکھ کر رسوا نہ کرنا۔"

یرمُوعی نے کہا کہ ابراہیم بن محمد بن سعد نے کہا کہ میں اور کثیر بھی سفارش کرتے رہے جب ہم نے زیادہ اصرار کیا تو فرزدق کہنے لگا: "جاؤ اس قریشی (یعنی ابراہیم بن محمد بن سعد) کی وجہ سے تمھیں بخشے دیتا ہوں۔"

یہ واقعہ عبداللہ یا اُن کے کسی بھائی کے زمانۂ شباب کا معلوم ہوتا ہے، اس سے ایک بار پھر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اہلِ فقہ و حدیث شاعری اور اس کی تنقید کی طرف بھی کتنا قوی میلان رکھتے تھے۔

۲۔ عاصم بن عمر

عاصم بن عمر بن قتادۃ ایک مدنی گھرانے میں پیدا ہوئے جو اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں میں سے تھا۔ اُن کے دادا قتادۃ بنو ظفر میں سے تھے۔ یہ انصاری قبیلہ تھا جس نے غزوۂ بدر میں رسول اللہ کے ساتھ مل کر جہاد کیا تھا۔[۱۷۸] قتادۃ حُنین میں اپنے قبیلے کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے۔[۱۷۹] البتہ عاصم کے والد عمر کے بارے میں ہمارے مآخذ کچھ زیادہ نہیں بتاتے۔[۱۸۰] بس اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے حدیث کی سماعت کی اور پھر یہ علم اپنے بیٹے کو منتقل کیا۔ عبداللہ بن ابی بکر کے باپ کی مثال کے برعکس انہوں نے مدینے کی شہری زندگی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا نہ کسی سرکاری خدمت سے متعلق رہے۔ اُن کے بیٹے عاصم، اقتصادی مشکلات سے آزاد نہیں تھے اسی سبب سے انہوں نے مجبور ہو کر دارالخلافہ کا رُخ کیا، جیساکہ اُن کے زمانے میں اکثر اہلِ علم، اضطراری حالت میں کرتے تھے اور دربارِ خلافت سے مالی مدد پاتے تھے۔ چنانچہ اس میں انھیں کامیابی ہوئی اور اُس وقت کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے (جو اُموی خلفاء میں اس لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت تھے کہ انھیں مدینے کے صالحین کو دیکھنے ہی سے خوشی حاصل ہوتی تھی) اُن کی مالی امدد کی۔ ابن سعد ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے[۱۸۱] کہ عاصم، عمر بن عبدالعزیز سے ملے تو انہوں نے اُن کا قرضہ ادا کر دیا اور اُن کو حکم دیا کہ دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو رسول اللہ کے مغازی کی تعلیم دیا کریں، چنانچہ یہ ایسا ہی کرتے تھے، پھر مدینے واپس آ گئے تھے۔" خلیفہ عمر بن عبدالعزیز، جنھوں نے جمع و تدوینِ حدیث کا خصوصی اہتمام کیا تھا، جیساکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اسے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ دمشق کے عام آدمیوں کو کوئی عالم اور فقیہ مغازی کی تعلیم دیتا رہے۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عاصم سیرۃ اور مغازی کے مشہور عالم تھے[۱۸۲] اور وہ ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔[۱۸۳] ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اُمویوں کو خوش کرنے کے لیے رسول اللہ کی تاریخ میں کتر بیونت کی ہوگی، جس طرح ہم یہ نہیں مانتے کہ اسماعیل عمر بن عبدالعزیز پسند کر سکتے تھے یا انھیں اس کی ترغیب دے سکتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کا زمانۂ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک رہا اور عاصم زیادہ سے زیادہ ۱۰۱ھ تک مدینہ واپس آ چکے تھے، جہاں وہ تقریباً بیس سال تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے اور ۱۱۹ھ یا اس کے کچھ ہی بعد انھوں نے انتقال فرمایا۔[۱۸۴]

عاصم، ابن اسحٰق اور الواقدی کے اہم رُواۃ میں سے ایک ہیں جنھوں نے اُن سے خاص طور پر مغازی کی روایات اخذ کی ہیں، مگر عاصم نے رسول اللہ کے زمانۂ شباب اور آپ کی مکّی زندگی کی تفصیلات جمع کرنے پر بھی توجہ کی ہے، جیساکہ ابن سعد کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ عاصم اکثر اپنی اسناد بھی بیان کرتے ہیں۔ مگر کبھی انھیں نظر انداز بھی کر جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اسناد کے معاملے میں اُن کا رویہ بھی وہی ہے جو عبداللہ بن ابی بکر کا ہے۔ وہ جن وقائع کی روایت کرتے ہیں اُن کے بنیادی کردار ہی کی زبان سے اکثر اشعار بھی پڑھواتے ہیں۔[۱۸۵] ابن اسحٰق کے ایک فقرے سے ظاہر ہوتا ہے[۱۸۶] کہ وہ صرف اخبار ہی جمع نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی اپنی رائے کا اظہار کر کے اس حادثے کے محرکات کی طرف بھی اشارہ کر دیتے تھے۔ ابن اسحٰق کہتا ہے: "عاصم بن عمر نے کہا واللہ العباس بن قتادۃ نے رسول اللہؐ کو یہ مشورہ (کہ وہ انصار سے باقاعدہ حلف کر لیں۔ حالانکہ انصار اس کے بغیر بھی ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے آمادہ تھے) اس لیے دیا تھا کہ معاہدہ سے انھیں قابو میں کر لیا جائے۔" اور عبداللہ بن ابی بکر نے بھی اس رائے کو اور اس کے معارض عاصم کی رائے کو قابلِ توجہ انداز میں پیش کیا ہے۔

۳- ابن شہاب الزہری

عبداللہ اور عاصم دونوں انصاری تھے ہ محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا نام بنو زہرہ ہے - اسی سے ان کا لقب الزہری ہوا ہے - یہ ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں پیدا ہوئے، بعض روایات میں سالِ ولادت ۵۶ھ یا ۵۷ھ یا ۵۸ھ بھی ملتا ہے[187] اُن کے پردادا عبداللہ بن شہاب معرکۂ بدر میں اہلِ مکہ کے ساتھ رسول اللہ ؐ سے لڑتے تھے[188]، اور جنگِ اُحد میں انہوں نے تین مکیوں کے ساتھ مل کر رسول اللہ ؐ کو قتل کرنے کی سازش بھی کی تھی[189] اور عملاً انھیں زخمی کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے[190] یہ بات اُن کے پرپوتے کے لیے قدرتی طور پر تکلیف دہ رہی ہوگی، اسی لئے وہ جہاں اِس سازش کا تذکرہ کرتا ہے وہاں اپنے پردادا کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ انہوں نے اس میں کیا حصہ لیا تھا[191] - الزہری کے باپ عبداللہ بن الزبیر کے ساتھ تھے جب انہوں نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا[192] مگر خود الزہری اپنے لڑکپن کے زمانے میں ہی ۷۴ھ میں مروان سے ملے تھے[193]، جیسا کہ خود انہوں نے ہمیں بتایا ہے، پھر وہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے اور آخرکار دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی، مگر وہ اکثر اپنے شہر مدینہ جاتے رہتے تھے - دمشق کو اُن کی ہجرت سے پہلے ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا تھا جس کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے[194]:

" الزہری سے غیرارادی طور پر ایک قتل ہو گیا تھا، چنانچہ یہ اپنے گھر سے نکلے اور آبادی سے باہر خیمہ لگا کر بیٹھ گئے اور کہتے تھے کہ کسی گھر کی چھت مجھے پناہ نہیں دے سکتی - ایک دن علی بن الحسین اُن کے پاس سے گذرے اور فرمایا کہ " ابن شہاب تمھاری مایوسی تو تمھارے گناہ سے بھی زیادہ شدید ہے تم اللہ سے ڈرو اور استغفار کرو، اور مقتول کے وارثوں کے پاس خون بہا ادا کرنے کا پیغام بھیجو اور اپنے گھر کو واپس چلے جاؤ" الزہری کہا کرتے تھے کہ لوگوں میں سب سے بڑا احسان میرے اوپر علی بن الحسین کا ہے "

اگر شیعی مورخ الیعقوبی[195] کا بیان درست ہے تو الزہری نے اپنی جوانی کے زمانے میں عبداللہ بن الزبیر سے لڑائی میں خلیفہ عبدالملک کو اپنی خدمات پیش کی تھیں، اور جب عبدالملک نے حج بیت اللہ کی طرح بیت المقدس کا حج کرنے کا قصد کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ مکہ میں خلیفہ کے مخالفوں کی طاقت عروج پر تھی - تو جن لوگوں نے مکہ کی زیارت پر پابندی لگ جانے کا شکوہ کیا اُن سے خلیفہ نے کہا تھا: " یہ ابن شہاب الزہری موجود ہیں، اِن سے پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ (بمکۃ) ومسجدی (بالمدینۃ) مَسْجِدُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ (بآورشلیم)" یعنی تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کیا جا سکتا ہے، ایک مسجد الحرام، دوسری مسجدِ نبوی، اور تیسری مسجد بیت المقدس "

فی الواقع صحاحِ ستہ میں، معمولی لفظی تغیر کے ساتھ، اس مفہوم کی حدیث موجود ہے اور مُسند احمد بن حنبل میں بھی پائی جاتی ہے، عموماً اس کی سند یوں ہے: " الزُّهری عَنْ سَعِيْدِ بنِ الْمُسَيِّبِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَة " لیکن بعض جگہ الزہری کا نام ندارد ہے - یہ بات کہ عبدالملک نے اِس حدیث کو ثقہ بنانے کیلئے الزہری کو استعمال کیا ہو اسی وقت درست ہو سکتی تھی - جب اس واقعہ کے ساتھ الزہری کے رُواۃ کا تذکرہ بھی کیا جاتا - اگر خلیفہ نے مذکورۂ بالا الفاظ واقعی کہے تھے تو یہ ۶۵ھ سے ۷۳ھ کے درمیان کا قصہ ہوگا جب عبداللہ بن الزبیر نے بغاوت کر رکھی تھی؛ اور زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ

۷۲ھ کی بات ہو، یہی وہ سال ہے جب عبدالملک نے " قُبّۃُ الصَّخرۃ " تعمیر کیا تھا، جیسا کہ آج تک اُس مسجد میں لگا ہوا کتبہ ظاہر کر رہا ہے۔ مگر ۷۲ھ میں الزُّہری صرف ۲۲ سال کے تھے اور اتنی کم عمر میں بحیثیت محدث کے انھیں ایسا امتیاز مل جانا خلافِ قیاس ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت میں تنہا ان کا نام لینا ہی کافی سمجھا جاتا ہو۔ اگر ہم یعقوبی کے بیان کو صحیح سمجھیں تو یہ ماننا چاہیے کہ الزُّہری مدینے سے چل کر خلیفہ کے دربار میں پہنچے ہوں اور انھوں نے یہ حدیث جو رواۃ مدینہ سے سُنی تھی، خلیفہ کو پہنچائی ہو تاکہ وہ اس سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر سکے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ الزہری نے خود ہی یہ حدیث گھڑ لی ہوگی۔ اُس دَور میں اہلِ دمشق کے لیے یہ دشوار نہیں تھا کہ وہ حدیث کے مانتے ہوئے علماء سے کسی روایت کی تصدیق حاصل کر لیں اور اگر کسی کو اس حدیث پر شبہ ہوتا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ چھان بین نہ کرتا۔ اِس حدیث کی صحت کے بارے میں خواہ کسی کا کچھ بھی خیال ہو، لیکن یہ باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ الزُّہری نے یہ حدیث سعید بن المُسیّب کی زبان سے سُنی ہوگی جن کے بارے میں اکثر یہ کہا گیا ہے [196] (یہ خوابوں کی تعبیر دینے میں مشہور تھے) کہ انھوں نے ایک خواب کی تعبیر بیان کی تھی جو اِس مقصد سے اُن تک پہنچایا گیا تھا اور اس تعبیر میں عبدالملک کے حریف عبداللہ بن الزبیر کی بدبختی اور عبدالملک کی خوش بختی ظاہر ہوتی تھی۔

عمر بن حبیب بن قُلَیع بیان کرتے ہیں [197] " ایک دن میں سعید بن المسیّب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اُس زمانے میں میری معاشی حالت بہت خراب تھی اور قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کیا کروں، اِس لیے سعید بن المُسیّب کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور کہنے لگا: " ابو محمد (یہ سعید کی کنیت تھی) میں نے ایک خواب دیکھا ہے "۔ انھوں نے پوچھا " کیا دیکھا "۔ اُس نے کہا کہ " میں نے دیکھا کہ عبدالملک بن مروان کو میں نے پکڑ کر زمین پر گرا دیا ہے، پھر اُسے اوندھا کر کے اُس کی کمر میں چار میخیں ٹھونک دی ہیں "۔ سعید نے کہا کہ " یہ خواب تمھارا دیکھا ہوا نہیں ہو سکتا "۔ اُس نے کہا: " نہیں میں نے ہی دیکھا ہے "۔ سعید نے کہا: " ہرگز نہیں، تم خود ہی سچ سچ بتا دو، نہیں تو میں نام ظاہر کیے دیتا ہوں "۔ تب اُس نے کہا کہ " الزبیر نے دیکھا ہے اور انھی نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے "۔ سعید نے کہا کہ " اگر اُن کا خواب سچا ہے تو عبدالملک انھیں قتل کر دے گا اور عبدالملک کے صُلب سے چار بیٹے پیدا ہوں گے جو خلیفہ بنیں گے "۔ عمر بن حبیب نے کہا کہ اب میں شام میں خلیفہ عبدالملک سے جا کر ملا اور انھیں سعید بن المسیّب کی بیان کردہ تعبیر سنائی، جس سے وہ خوش ہوئے، مجھ سے سعید کی خیر و عافیت اور حال چال پوچھتے رہے۔ میں نے انھیں بتایا۔ پھر خلیفہ نے میرے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بھی میرے ساتھ سلوک کیا "۔

عمر بن حبیب ہی کی طرح الزُّہری نے بھی کیا۔ بشرطیکہ ہم یعقوبی کی بات صحیح مانیں کہ انعام کی اُمید میں سعید کے مُنہ سے سُنی ہوئی حدیث خلیفہ تک پہنچانے کے لیے دمشق گئے۔ بہرحال اُس وقت الزُّہری زیادہ دنوں تک دمشق میں نہیں ٹھہرے ہوں گے، اگر وہ وہاں واقعی گئے ہی ہوں۔ دمشق کو اُن کی مستقل ہجرت بعد کا واقعہ ہے، جیسا کہ خود انھوں نے " الاشعث کی بغاوت کا زمانہ " [198] بتایا ہے یہ ۸۱ھ یا ۸۲ھ کا واقعہ ہے [199]۔ پہلے وہ قبیصہ سے ملے تھے جو عبدالملک کا خاتم بردار تھا [200] اور یہ خلیفہ کا اُس زمانے سے معتمد علیہ تھا جب خلیفہ مدینے کا گورنر تھا [201]۔ قبیصہ نے انھیں عبدالملک سے ملوایا [202]۔ اس کے لیے تقریب یہ

پیدا ہو گئی کہ ایک دن خلیفہ نے پوچھا : "امہاتُ الاولاد کی وراثت کا مسئلہ تم میں سے کسے معلوم ہے ؟" اُس وقت الزُّہری کا نام لیا گیا اور انھیں خلیفہ کے دربار میں طلب کیا گیا۔ پہلے خلیفہ نے اُن کا نسب پوچھا پھر یاد دلایا کہ الزُّہری کے والد نے عبداللہ بن الزبیر کے ساتھ خروج میں شرکت کی تھی۔ اِس کے بعد اُنھیں بیٹھنے کی اجازت دی اور اُن کا قرض ادا کر دیا۔[۲۰۳] الزُّہری اپنے قبیل کے بہت سے لوگوں کی طرح اسی اُمید میں دمشق گئے تھے کہ اُن کی تنگ دستی دُور ہو جائے گی۔[۲۰۴]

ایک اور روایت یہ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے خلیفہ نے اپنے مدینے کے گورنر کے ذریعے سعید بن المُسیّب سے الزُّہری کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں[۲۰۵] اور یہ سب روایات یعقوبی کے اُس بیان سے میل نہیں کھاتیں جس کی رُو سے عبدالملک الزُّہری کو ایک طویل عرصے سے جانتا تھا اور الزُّہری کو خلیفہ کے دربار میں کسی تقریب تعارف کی یا سعید بن المسیّب کی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ غالباً یعقوبی کا بیان اس امر واقعہ پر مبنی ہے کہ بعد کے زمانے میں الزُّہری ایک مشہور و معروف محدث تھے اور یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ خلیفہ سے اُن کے گہرے روابط تھے، مگر لوگ ان تعلقات کا آغاز واقعی زمانے سے تقریباً دس سال قبل سمجھتے رہے تھے۔ اِس گمان کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ جس حدیث کا ہم ابھی حوالہ دے چکے ہیں اُس کی اسناد میں الزُّہری کا نام آتا ہے۔

عبدالملک کے جانشین خلفا کے زمانے میں بھی الزُّہری دمشق میں مقیم رہے جنھوں نے الزُّہری کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔[۲۰۶] خود الزُّہری ہمیں اطلاع[۲۰۷] دیتے ہیں کہ وہ اپنے چچا مالک بن شہاب کی بیٹی کا پیغام لے کر ولید بن عبدالملک کے پاس گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ داستان طرازوں نے اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس لئے کہ ہمیں 'الفہرست'[۲۰۸] میں ایک کتاب کا نام ملتا ہے جس کا عنوان ہے : "کتب الزّھری وابنۃ عمّہ الذین ساروا الی ھشام بن عبدالملک"[۲۰۹]۔ یہ الولید کی جگہ ہشام کا نام ایک اور موقع پر بدلا گیا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے۔ عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت (۹۹ھ - ۱۰۱ھ) میں الزُّہری مفتی شرع تھے۔[۲۱۰] یہ بات ایک سے زیادہ ماخذوں میں بتائی گئی ہے[۲۱۱] کہ عمر کے جانشین یزید نے انھیں قاضی مقرر کیا تھا۔ مگر یزید ثانی الزُّہری سے ایسی علمی قابلیت کی توقع رکھتا تھا جو عام قاضیوں کی لیاقت سے مختلف ہو۔ اسی لیے ایک بار اُس نے ایک قصیدے کے مصنف کا نام دریافت کرنے کے لیے اُن سے رجوع کیا تو یہ استفسار بے سبب نہیں تھا۔[۲۱۲]

"یزید ثانی اور اس کی کنیز حبّابہ ایک رات کو چھت پر بیٹھے تھے اور وہ الأحوص کے شعر گا رہی تھی۔ یزید نے اُس سے پوچھا" یہ اشعار کس کے ہیں ؟" اُس نے کہا : "بخشانِ شما، مجھے معلوم نہیں" آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی مگر اُس نے کہا کسی کو الزُّہری کے پاس بھیجو، شاید انھیں معلوم ہو گا۔ الزُّہری حاضر کیے گئے، تو وہ یزید کے خوف سے سراسیمہ ہو رہے تھے۔ جب وہ یزید کے پاس اُوپر چھت پر لے جائے گئے تو اُس نے کہا : "ڈرو نہیں، میں نے تمھیں ایک اچھی بات کے لیے بلایا ہے یہ بتاؤ کہ یہ اشعار کس کے ہیں ؟" انھوں نے جواب دیا کہ "اے امیرالمومنین الأحوص بن محمد کے ہیں"۔ (یہ مدنی شاعر تھا۔ اسے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے دہلک کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔) خلیفہ نے پوچھا : "آج کل وہ کیا کر رہا ہے ؟" انھوں نے کہا ایک مدت سے دہلک میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہا ہے"۔ خلیفہ نے کہا : "مجھے عمر (ابن عبدالعزیز۔ سلیمان کے جانشین) پر

حیرت ہے کہ انھوں نے اُس کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتی"۔ حکم ہوا کہ اُسے آزاد کیا جائے اور چار سو دینار بطور انعام مرحمت ہوتے اُس رات کو الزُّہری اپنی قوم انصار کے لوگوں کی طرف واپس آئے اور یہ مژدہ سُنایا۔

جیسے اِس موقع پر ایک مدنی کو آزاد کرانے میں الزُّہری نے حصہ لیا ایسے ہی متعدد مواقع پر انہوں نے اہلِ مدینہ کی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لی۔ یزید ثانی نے ۱۰۱ھ میں حجاز کا نیا گورنر مقرر کیا تو الزُّہری نے گورنر کو بعض اہم اور مفید مشورے دیئے۔ اگرچہ نئے گورنر نے اپنی خاص مصلحتوں کی وجہ سے اُن مشوروں پر عمل نہیں کیا۔[۲۱۳]

الزُّہری سخاوت میں مشہور تھے۔ خالد بن اثرم نے ایک قصیدے[۲۱۴] میں اُن کی مدح کی ہے اور قرّۃ بن عبدالرحمٰن،[۲۱۵] الزُّہری کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "میں نے کوئی اور شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نظر میں دینار و درہم اتنے بے وقعت ہوں گویا وہ مینگنیاں ہیں"۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ یہ قرضہ خلیفہ ہشام[۲۱۶] (۱۰۵ھ - ۱۲۵ھ) نے ادا کیا تھا۔ الزُّہری ہشام کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں[۲۱۷] مدد دیتے تھے۔ خلیفہ نے انھیں اور ابوالزّناد کو اپنا مقرّب بنا لیا تھا۔ ایک دن الزُّہری ہشام بن عبدالملک کی مجلس میں پہنچے اور ابوالزّناد عبداللہ بن ذکوان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ہشام نے اُن سے پوچھا: "اہلِ مدینہ کو عموماً کس مہینے میں تنخواہ تقسیم ہوتی ہے؟" الزُّہری نے کہا: "مجھے علم نہیں"۔ پھر ابوالزّناد سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محرم میں۔ اِس پر ہشام نے الزُّہری سے کہا کہ ابوبکر لو آج تمھاری معلومات میں بھی اضافہ ہوگیا"۔ الزُّہری نے جواب دیا کہ امیرالمؤمنین کی مجلس ہے ہی ایسی جگہ جہاں سے علم حاصل کیا جاتا ہے"۔[۲۱۸]

خلیفہ اور اُس کے درباری فقیہ علّامہ (الزُّہری کو "علّامہ" کہا جاتا تھا) کے درمیان ہمیشہ ایسی نرم گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ الشافعی[۲۱۹] ہمیں اپنے چچا کے واسطے سے یہ روایت بھی سُناتے ہیں: "ایک دن سلیمان بن یسار ہشام کی مجلس میں پہنچے تو اُس نے پوچھا: "قرآن کی آیۃ" اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ " (سورۃ ۲۴ - آیۃ ۱۱) میں کس شخص کی طرف اشارہ ہے (یہ آیۃ واقعۂ افک سے متعلق ہے) سلیمان نے جواب دیا کہ "عبداللہ ابن اُبَیّ بن سَلول کی طرف"۔ اس پر ہشام نے کہا: "تم جھوٹ بولتے ہو، یہ علی کی طرف ہے۔ ابنِ شہاب تم بتاؤ کس کی طرف ہے؟" الزُّہری نے بھی کہا: "عبداللہ بن اُبَیّ مراد ہے"۔ خلیفہ نے کہا: "تم بھی جھوٹے ہو، یہاں علی ہی مراد ہیں"۔ الزُّہری نے کہا: "میں جھوٹا ہوں؟ خدا کی قسم اگر آسمانوں سے ندا دی جائے کہ خدا نے جھوٹ بولنا حلال کر دیا ہے میں تب بھی نہ بولوں گا۔ مجھ سے سعید بن المسیّب نے، عُروہ نے، عبیداللہ اور علقمۃ بن وقّاص نے، خود عائشہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ" اِنَّ الَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ عَبْدُ اللّٰہِ بْنَ اُبَیّ "۔ (قرآن میں جس کے لیے کہا گیا ہے کہ اُس نے بات کا تبنگڑ بنا دیا وہ شخص عبداللہ بن اُبَیّ تھا)۔ اس پر حاضرین بحث کرنے لگے تو ہشام نے کہا: "یہاں سے چلے جاؤ، خدا کی قسم ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ تم جیسوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں"۔[۲۲۰] الزُّہری نے کہا: "کیا بات ہے، نہ تم میری دھونس میں ہو، نہ میں تمھاری۔ مجھے الگ کر دو"۔ خلیفہ نے کہا: "نہیں، تم لاکھوں کے مقروض ہو"۔ الزُّہری نے کہا کہ "یہ بات تم خوب جانتے ہو، اور تم سے پہلے تمھارے باپ بھی جانتے تھے کہ میں نے یہ قرض تمھارے بھروسے پر نہیں لیا ہے"۔ اس پر ہشام نے کہا: "ہمیں شیخ کو غضبناک نہیں کرنا چاہیئے، وہ فوراً کھری کھری سُنانے لگتے ہیں"۔ پھر حکم[۲۲۱] دیا اور اُن کا لاکھوں روپے کا قرض ادا کر دیا گیا۔

جب کسی نے یہ بات الزّہری کو بتائی تو انھوں نے کہا: "خدا کا شکر و احسان ہے، یہ سب اُسی کی طرف سے ہوتا ہے"۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہشام کا قصہ نہیں ہے[۲۲۲] بلکہ الولید تھا جس نے یہ بے سود کوشش کی تھی کہ الزّہری کو استعمال کر کے ابنِ اُبَیّ کا الزام حضرت علی کی طرف منتقل کر دے۔

ابو الزّناد نے الزّہری اور ہشام کے درمیان ہونے والا ایک اور مکالمہ بھی نقل کیا ہے[۲۲۳] "میں ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پہنچا تو دیکھا کہ الزّہری بھی بیٹھے ہیں اور یہ دونوں الولید کی بُرائی بیان کر رہے ہیں۔ میں الگ تھلگ بیٹھا رہا اور میں نے اس بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ذرا دیر کے بعد معلوم ہوا کہ الولید باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ اُسے اجازت دی گئی، وہ آیا، مگر غصّے میں بھرا ہوا تھا، ذرا دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ جب ہشام مرا، اور الولید نے حکومت سنبھالی، اُس نے مدینے (کے گورنر) کو لکھ کر مجھے طلب کیا۔ میں حاضر کیا گیا تو مجھ سے کہنے لگا: "تمھیں اُس بھینگے (ہشام مراد ہے) کی اور الزّہری کی گفت گو یاد ہے؟" میں نے کہا: "جی ہاں۔ مگر میں نے تو اُس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا"۔ اُس نے کہا: "تم سچ کہتے ہو۔ مگر جانتے ہو مجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا: "نہیں"۔ تو بولا کہ اُس کی پشت پر جو خادم کھڑا تھا اُس نے مجھے بتایا تھا۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ فاسق الزّہری اگر آج زندہ ہوتا تو میں اُسے قتل کروا دیتا"۔

لیکن الزّہری بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر الولید حاکم ہو گیا تو انھیں کیا پھل ملے گا۔ انہوں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ جیسے ہی ہشام کی آنکھیں بند ہوں گی وہ فوراً بازنطینی[۲۲۴] حکومت کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ مگر وہ الولید کی تخت نشینی (۱۲۵ھ) تک زندہ ہی نہ رہے اور ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ کو وفات پا گئے[۲۲۵]۔ انھیں حجاز کے علاقہ "شغب" میں دفن کیا گیا، یہ وہ جگہ ہے جو انھیں اُمویوں[۲۲۶] سے جاگیر میں ملی تھی۔

الزّہری اکثر حجاز جاتے رہتے تھے، حتی کہ دمشق کو ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ ۱۱۹ھ میں حج کرنے گئے تھے[۲۲۸]۔ مگر سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ الزّہری نے اپنا طالب علمی کا زمانہ مدینہ میں گزارا تھا اور اسی شہر میں اُن کے اُس علم کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کی وجہ سے انھیں دارالخلافہ میں اتنا اثر و رسوخ مل سکا۔ خود الزّہری ہمیں بتلاتے ہیں[۲۲۹] کہ انہوں نے کس طرح سب سے پہلے عبداللہ بن ثعلبہ سے اپنی قوم کا نسب سیکھا۔ ایک دن اُن کے اُستاد سے کسی نے طلاق کا کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے اُسے سعید بن المسیب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تب یہ بھی سعید سے ملے۔ "سعید کو لوگوں میں بڑی عزت حاصل تھی، اس لیے کہ وہ متقی اور پرہیزگار تھے اور بادشاہ کے یا کسی کے بھی آگے حق بات کہنے سے نہ جھجکتے تھے، خود کو دربار سے الگ تھلگ رکھتے تھے اور اپنے علم میں بھی یکتا تھے۔ اس کے ماسوا بڑی جچی تُلی رائے دیتے تھے۔ میری یہ ہمت تو نہیں تھی کہ اُن سے براہِ راست مسئلہ پوچھ لوں، یوں کہتا تھا کہ 'فلاں شخص کا یہ خیال ہے مگر فلاں یوں کہتا ہے'، تب وہ اپنا جواب بتلاتے تھے"۔

اسی طرح ایک اور موقع پر ہمیں یہ رپورٹ ملتی ہے[۲۳۰]: "ہم سعید بن المسیب کی صحبت میں رہتے تھے مگر اُن سے مسئلہ نہیں پوچھتے تھے۔ ہاں کوئی شخص آتا تھا اور اُن سے کچھ دریافت کرتا تھا تو وہ بولنا شروع کرتے تھے یا کسی وقت خود بھی آمادۂ سخن ہو جاتے تھے"۔

ثعلبہ بن ابی مالک نے بھی الزہری کو سعید کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا تھا، اور الزہری "دس سال تک متواتر یوں حاضر رہے گویا ایک دن رہے ہیں[۲۳۱]" الزہری نے سعید بن المسیب کو "قریش کے چار سمندر" (بُحُور قریش الاربعۃ) میں شمار کیا ہے، جن میں باقی تین عروۃ، اور ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ ہیں[۲۳۲]۔ ایک موقع پر انھوں نے اُس علمی خزانہ کا موازنہ کیا ہے جو انھیں عروۃ سے ملا (جنھیں وہ "بحرِ بے کراں" البحر لا ینزف[۲۳۳]) کے لقب سے یاد کرتے ہیں) اور جو عبیداللہ سے پہنچا تھا، پھر کہتے ہیں: "میں نے جن عالموں کی صحبت اختیار کی اُن کے پاس جو کچھ تھا سب حاصل کر لیا۔ عروۃ کی خدمت میں بیٹھنا شروع کیا یہاں تک کہ اُن کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا وہ مانوس معلوم ہونے لگا۔ مگر عبیداللہ بن عتبہ کا معاملہ اُن سے مختلف تھا، اُن کے پاس جب بھی گیا کوئی نئی بات لے کر اٹھا۔"

الزہری عبیداللہ کی ایسی خدمت گذاری بھی کرتے تھے جو ایک شاگرد اپنے اُستاد کی کرتا ہے[۲۳۵]۔ "میں عبیداللہ بن عبداللہ کے لیے پانی بھرتا تھا، جب وہ اپنی باندی سے پوچھتے تھے کہ دروازے پر کون کھٹکا کر رہا ہے تو وہ کہتی تھی کہ آپ کا چندھا غلام ہے[۲۳۶]" (غلامک الاعمش)

عبیداللہ نے، جو شاعر بھی تھے (جیسا کہ ہم ایک اور مضمون میں بحث کر چکے ہیں) اور اس پایہ کے تھے کہ ابن عبدالبر نے انھیں "افقہ الشعراء و اشعر الفقہاء" (شاعروں کے زمرے میں سب سے زیادہ فقہ کے جاننے والے اور فقیہوں میں سب سے اچھے شاعر) کہا ہے۔ اپنے بعض اشعار میں الزہری سے خطاب کیا ہے جو کتاب الاغانی میں نقل ہوئے ہیں[۲۳۷]۔

عراک بن مالک نے الزہری کو اہلِ مدینہ کا سب سے بڑا عالم کہا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عروۃ، سعید اور عبیداللہ کا علم سمیٹ لیا تھا۔ اُن کے بارے میں اس طرح کی بہت سی رائیں ملتی ہیں، بس اگر اُن پر کوئی اعتراض ہے تو یہی ہے کہ وہ اُموی خلیفہ سے میل جول رکھتے تھے۔ مکحول کہتے ہیں[۲۳۸]: الزہری بھی کیا آدمی تھے، اگر بادشاہوں کے دربار میں جا کر خود کو خراب نہ کیے ہوتے۔"

اور الزہری خود فخر یہ کہا کرتے تھے، جب اپنے ہی ایک شاگرد کی کم کوشی اور اس کے مقابلے میں اپنے علم کو عام کر دینے کی صلاحیت کا موازنہ کرتے تھے کہ[۲۳۹]: "کسی نے میری طرح علم کو شائع کیا ہے نہ اُسے میری طرح بے دریغ خرچ کیا ہے۔"

اُن کی ہمہ دانی بھی ضرب المثل تھی[۲۴۰]۔ اللیث کہتے ہیں: "نہ میں نے ابن شہاب جیسا کوئی جامع علوم دیکھا، نہ اُن سے بڑا عالم کسی کو پایا اگر تم انھیں وعظ کہتے ہوئے سنتے تو بے اختیار بول اٹھتے کہ ان سے اچھا کوئی نہیں کہتا اور علم الانساب میں اُن کی واقفیت کا حال دیکھتے تو کہتے کہ ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر وہ قرآن اور حدیث کی گفتگو کرتے تھے تو اُن کی تقریر میں ایک طرح کی جامعیت ہوتی تھی۔"

ابراہیم بن سعد نے اپنے باپ سعد سے پوچھا کہ ابن شہاب نے آپ لوگوں پر کس بات میں فوقیت حاصل کی[۲۴۱]۔ تو سعد نے کہا: "وہ مجلسوں میں سامنے سے داخل ہوتے تھے، اُن کے پیچھے سے نہیں آتے تھے اور محفل میں کوئی مرد یا عورت جوان یا بوڑھا باقی نہیں رہتا تھا جس سے وہ معلومات فراہم نہ کرتے ہوں، پھر انصار کے گھروں میں جاتے تھے اور وہاں بھی پوچھ تاچھ کرتے تھے اور ان میں بھی کوئی جوان یا بوڑھا یا بڑھیا ایسی نہ بچتی تھی، جس سے وہ سوالات نہ کرتے ہوں۔ حد یہ ہے کہ پردہ نشین عورتوں

تک سے معلومات جمع کر لاتے تھے۔"

ابن سعد[۲۴۲] کے یہاں یہ جواب ذرا مختلف انداز میں ملتا ہے: "ابن شہاب علم میں ہم سے اس لحاظ سے برتر تھے کہ ہم مجلسوں میں ادب سے بیٹھتے تھے اور ابن شہاب دَنّانہ داخل ہوتے تھے، اپنی چادر کو سینے پر سمیٹ کر بیٹھ جاتے اور جو جی میں آتا، پوچھتے رہتے جبکہ ہم نو عمری کی وجہ سے لحاظ میں ہی رہ جاتے تھے۔"[۲۴۳]

زیادہ سے زیادہ اخبار جمع کرنے کا انھیں شوق تھا اور اس کے لیے بہت قوی حافظہ درکار تھا۔ الزُّہری حافظے کی تقویت کے لیے شہد کا استعمال کرتے تھے۔[۲۴۴] وہ اپنی شبینہ محفلیں اُسی طرح شہد نوشی سے آراستہ کرتے تھے جیسے مے نوش شراب سے کرتے ہیں اور کہتے تھے: "بس پلائے جاؤ اور باتیں کیے جاؤ۔"

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ہشام نے اُن کی قوّتِ حافظہ کا امتحان لینے کا ارادہ کیا، اُس نے الزُّہری سے کہا کہ اُس کے کسی لڑکے کے واسطے کچھ احادیث املا کرا دیں۔ انھوں نے کاتب کو بُلوایا اور اُسے چار سو حدیثیں لکھوا دیں۔ کچھ زمانے کے بعد جب الزُّہری ہشام سے ملے تو اُس نے اُن سے کہا کہ وہ کتاب تو ضائع ہو گئی۔ الزُّہری نے کہا کوئی بات نہیں، پھر کاتب کو بُلوایا اور احادیث لکھوا دیں۔ جب ہشام نے اُس کا پہلی کتاب سے مقابلہ کرکے دیکھا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں احادیث جمع کرنے والوں میں اپنے ہی استعمال کے لیے ان حدیثوں کو کتابی صورت میں مدوّن کر لینا تابعین کے وقت تک ایک عام بات ہو چکی تھی۔ ابوالزناد جو الزُّہری کے ہم سبق اور دربارِ خلافت میں اُن کے رفیق رہے ہیں، کہتے ہیں:[۲۴۵] "ہم اور الزُّہری (معلومات فراہم کرنے کے لیے) دَورے پر نکلتے تو الزُّہری کے پاس کتابیں اور تختیاں ہوتی تھیں اور ہم اس پر ہنسا کرتے تھے مگر وہ جو کچھ سنتے تھے اُسے قلمبند کر لیتے تھے۔"

اور محمد بن عکرمہ کہتے ہیں:[۲۴۶] "ابن شہاب اکثر الاعرج کے پاس جایا کرتے تھے۔ الاعرج قرآن لکھتے ہوتے تھے۔ وہ ان سے کوئی حدیث پوچھتے اور اُس کو لکھ لیتے پھر زبانی یاد کرتے اور جب یاد ہو جاتی تو وہ پرچہ پھاڑ دیتے تھے۔"

صالح بن کیسان بھی روایت کرتے ہیں:[۲۴۸] "میں اور الزُّہری ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آؤ احادیث لکھ لیں۔" کہا: "جو کچھ رسول اللہ سے پہنچا تھا، ہم نے لکھ لیا۔" پھر کہا: "آؤ — جو کچھ صحابہ سے پہنچا ہے وہ بھی لکھ ڈالیں۔" کہا: "انھوں نے لکھ لیا اور میں نے نہیں لکھا، چنانچہ وہ کامیاب رہے اور میں پھسڈی رہ گیا۔" اِن سب روایات میں اُن یادداشتوں کی طرف اشارہ ہے جو ذاتی استعمال کے لئے مرتب کی جاتی تھیں، البتہ ان یادداشتوں کا عوام کے لیے دستیاب ہونا زمانہ[۲۴۹] مابعد کا رواج ہے اور غالباً عمر ثانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علما کو یہ طریقِ کار اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ ہم ابھی پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن ابی بکر سے ایسی ہی فرمایش کی تھی اور بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی طرف سے الزُّہری کو بھی ایسا ہی حکم ملا تھا۔[۲۵۰] بہرحال ایک موقع پر بروایت معمر الزُّہری نے "اِن اُمراء" (ھؤلاء الاُمراء) کو اپنی بسیار نویسی کی عادت کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ کہتے ہیں:

"كُنَّا نَكْرَهُ كِتَابَ الْعِلْمِ حَتّٰى اَكْرَهَنَا عَلَيْهِ هٰؤُلَاءِ الْاُمَرَاءُ فَرَاَيْنَا اَلَّا يَمْنَعَهُ اَحَدٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔"

(ہم علم کو لکھنا پسند نہیں کرتے تھے مگر ان امیروں نے ہمیں مجبور کیا تو ہم نے بھی طے کر لیا کہ اب کسی مسلمان کو اس سے محروم نہ رکھا جائے)[۲۵۱]۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ہشام نے انھیں کاتب کو املا کرانے پر آمادہ کیا تھا، یہ بات ذہن میں رکھیے اور پھر دیکھئے کہ وہ ابتدا میں حدیث لکھوانے یا اپنے لکچروں کو قلمبند کرانے کے مخالف بھی تھے تو اس گروں قدر قول جواب کا مطلب واضح ہو جاتا ہے جو الزہری نے اللیث کو دیا تھا۔ اللیث نے کہا: "ابوبکر (الزہری کی کنیت) اگر تم عام لوگوں کے لیے ان کتابوں کو مرتب کر دو تو تحنت ہو جاؤ گے"۔ الزہری نے جواب دیا: "اس علم کو کسی نے مجھ سے زیادہ عام نہیں کیا ہے"۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص چاہے وہ مجھ سے حدیث کی سماعت کر سکتا ہے مگر جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ میں اسے کتابی شکل میں مدون کر دوں تو میں یہ نہیں کر سکوں گا۔ ممکن ہے کہ یہ تصریح اس عہد سے پہلے کی ہو جس کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے اور جہاں وہ کہتے ہیں: "جب ہم اپنی کتابیں امراء تک پہنچانے کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کتابوں سے عام مسلمانوں کو محروم رکھا جائے"۔ اس معاملے میں وہ اس حد تک گئے کہ ان پر یہ نکتہ چینی کی گئی کہ حدیث کا ایک مجموعہ جو الزہری ہی کی روایات پر مشتمل تھا، آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے کے لئے مرتب ہوا اور الزہری کے سامنے نظر ثانی کے لیے پیش کیا گیا، تو انھوں نے اسے سرسری نظر سے بھی نہیں دیکھا اور اسے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔[۲۵۲] ایک روایت کے مطابق یہ اجازت ابراہیم بن الولید کو دی گئی تھی لیکن جیسا کہ گولڈزیہر نے اچھی طرح وضاحت کر دی ہے[۲۵۴]۔ اس روایت میں وہ ابراہیم مراد نہیں ہو سکتا جو بعد میں خلیفہ بنا تھا۔ بہرطور اس صورت میں یہ بات ممکن ہو جاتی ہے کہ اس مجموعہ میں وہ روایات داخل ہو جائیں جو الزہری نے کبھی سنی بھی نہ ہوں خواہ ان میں الزہری کا نام لیا جاتا ہو۔ مگر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ الزہری نے اموی خلفاء کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے خود روایات گھڑ کر شامل کر دی ہوں گی۔

الزہری کے شاگرد معمر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دمشق میں اموی خلفاء کے کتب خانے میں ڈھیر ساری جلدیں تھیں جن میں الزہری کا جمع کیا ہوا علمی مواد تھا۔ معمر کے الفاظ یہ ہیں[۲۵۵]:

"كُنَّا نَرَى أَنَّا قَدْ أَكْثَرْنَا عَنِ الزُّهْرِيِّ حَتّٰى قُتِلَ الْوَلِيْدُ فَإِذَا الدَّفَاتِرُ قَدْ حُمِلَتْ عَلَى الدَّوَابِّ مِنْ خَزَائِنِهٖ، يَقُوْلُ: (معمر) مِنْ عِلْمِ الزُّهْرِيِّ"

"ہم یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہم نے الزہری سے بہت زیادہ علم حاصل کر لیا ہے، تا آنکہ الولید قتل ہوا تو اس کے خزانوں سے کتابوں کا ذخیرہ چوپایوں پر لاد کر لایا گیا (معمر نے) کہا یہ سب الزہری کے علم پر مشتمل تھا"۔

اس بیان میں زمانہ ولید ثانی کے قتل کا بتایا گیا ہے اور یہ ۱۲۶ھ کا واقعہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ الولید الزہری کا دشمن تھا مگر بظاہر اس کے لیے کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے اسلاف کے حکم سے جمع کی ہوئی کتابوں اور یادداشتوں کے ذخیرے کو ضائع کرنے کا حکم دے سکتا تھا۔ معمر کے اس بیان کے مقابلے میں جو ایک تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے الزہری کی زوجہ کے مقولے کی اہمیت ایک چٹکلے کی سی رہ جاتی ہے جس نے کہا تھا: "یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ شاق ہیں"۔ یہ قول

صرف متاخر مصادر میں پایا جاتا ہے[۲۵۶] اور اس میں وہی کتابیں مراد ہو سکتی ہیں جو الزُّہری نے اپنے استعمال کے لیے بطور یادداشت تیار کی تھیں۔ یہاں وہ مدوّنات یقیناً مقصود نہیں ہیں جو الزُّہری نے جمہور کے لیے یا اپنے خاص طلب گاروں کے لئے تیار کی ہوں گی۔ الزُّہری خود ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ انہوں نے "اسنانُ الخلفاء" (خلفاء کے سنین) اپنے دادا کے لیے مرتّب کی تھی۔ یہ وقائع کی ایک فہرست تھی جس سے طبری نے بھی دو اقتباسات لیے ہیں[۲۵۸]۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خالد بن عبداللہ القسری کی فرمائش سے انہوں نے شمالی عرب کے قبائل سے متعلق ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی[۲۵۹] مگر یہ کبھی مکمل نہیں ہوئی۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرۃ بن عبدالرحمٰن کا قول کہ

"لم یکن للزُّھری کتاب اِلّا کتابُ نسبِ قومِہٖ" — الزُّہری نے سوائے اپنی قوم کے نسب پر ایک کتاب کے اور کوئی کتاب نہیں لکھی۔

اسی سے متعلق ہے۔ خالد نے اپنے لئے سیرۃ کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش بھی الزُّہری سے کی تھی[۲۶۰]۔

لہٰذا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ الزُّہری نے اپنی یادداشت کے لیے جو کچھ لکھا ہو اُس کے علاوہ خالد کی اور اُمویوں کی فرمائش سے بھی کتابیں لکھی تھیں اور خاص طور سے ایک کتاب سیرۃ کے موضوع پر بھی تھی۔ لیکن ان کی کوئی مستقل تصنیف ہمارے ہاتھوں میں نہیں پہنچی ہے بلکہ احادیث کے مجموعوں میں "الزُّھریات" کے عنوان سے جو کچھ ملتا ہے وہ بعد کے مؤلفوں نے جمع کیا ہے، یا وہ فقرے اور اقتباسات ہیں جو سیرۃ کی کتابوں اور اسلام کے صدرِ اوّل کی تاریخوں میں منتشر ہیں۔ جیسا کہ ابن سعد کے دیے ہوئے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے، الزُّہری نے "مغازی" کو محدود معنوں میں نہیں لیا ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ کی طرف توجہ کی ہے اور انہوں نے خالد کی فرمائش[۲۶۱] سے جو کتاب مرتّب کی تھی اُس کے لیے خود ہی لفظ "سیرۃ" استعمال کیا ہے[۲۶۲]۔

الزُّہری اپنی جمع کردہ روایات زیادہ تر اسناد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مگر وہ انھیں حذف بھی کر جاتے ہیں کبھی وہ ایک ہی حادثہ کے بارے میں متعدد روایات جمع کر دیتے ہیں اور پھر اُن سے مجموعی خبر نکال لیتے ہیں اور اُسے سب راویوں کی مجموعی سند کے ساتھ درج کرتے ہیں[۲۶۳]۔ وہ حوادث میں حصہ لینے والوں کی طرف سے اشعار بھی داخل کر دیتے ہیں۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ وہ شعر کے رسیا تھے۔ حمّاد بن زید روایت کرتے ہیں کہ الزُّہری احادیث بیان کرنے کے بعد کہا کرتے تھے کہ آؤ اب کچھ گپ شپ اور شعر و شاعری ہو جائے اس لیے کہ کان تھک چکے ہیں مگر ابھی روح پیاسی ہے۔"

باب (۳)

۳۔ الزُّہری کے تلامذہ

۱۔ موسیٰ بن عقبہ ہمیں الزُّہری کے تلامذہ میں تین شخصیتوں کا حال معلوم ہے، جنھوں نے مغازی کے موضوع پر کتابیں تالیف کیں۔ ان کے نام ہیں: موسیٰ بن عقبہ، مَعمَر بن راشد اور محمد بن اسحٰق۔ اور اتفاق سے یہ تینوں مسلمانوں

کے طبقۂ اشراف سے نہیں تھے بلکہ موالی تھے۔

موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش، الزبیر بن العوام کے خاندان کے موالی تھے یا زیادہ قطعیت سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ الزبیر کی بیوی[۲۶۵] اُمّ خالد کے موالی تھے اور ان کے نانا خود ابن الزبیر کے موالی تھے۔[۲۶۶] ان دونوں کے خاندانی روابط بہت گہرے تھے۔ ان کا سالِ ولادت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ موسیٰ نے ایک سوال کے جواب میں کہ کیا تم نے کسی صحابی کو دیکھا ہے[۲۶۷]؟ یہ کہا تھا کہ "میں نے جب (پہلا) حج کیا تو عبداللہ بن عمر مکہ میں موجود تھے، اور اسی سال نجدۃ الحروری (خارجیوں کا ایک لیڈر) بھی حج کو آیا تھا۔ مکہ میں نجدہ اور اس کے پیروؤں کی موجودگی سے متعلق الطبری نے ایک روایت محفوظ کر دی ہے، وہ کہتا ہے: "۶۸ھ میں (اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبداللہ بن الزبیر کی خلافت کے زمانے میں) میدانِ عرفات میں چار پھریرے اُڑ رہے تھے۔ ابن الحنفیۃ اور ان کے اصحاب ایک جھنڈے کے نیچے تھے ...... ابن الزبیر کا دوسرا جھنڈا تھا ...... ان دونوں کے پیچھے نجدۃ الحروری تھا اور اُن کے بائیں طرف بنو اُمیّہ کا عَلَم لہرا رہا تھا۔" پھر الطبری کہتا ہے: "ابن عمر اس اندھیرے کے خلاف ابن الزبیر کے بعد ہی صف آرا ہوئے تھے۔"[۲۶۸]

بنابریں اس میں شک نہیں کہ موسیٰ بن عقبہ نے ۶۸ھ میں حج کیا ہوگا اور اُن کی ولادت بہر حال ۵۵ھ تک ہو چکی ہوگی۔ الواقدی کہتا ہے:[۲۶۹]

كانَ لابراهيمَ وموسىٰ ومحمّد بني عُقبةَ حلقةٌ في مَسجدِ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وكانوا كلُّهم فُقهاءَ ومُحدِّثين وكانَ موسىٰ يُفتي"

عقبہ کے تینوں بیٹے ابراہیم، موسیٰ اور محمد مسجدِ نبوی میں اپنا حلقۂ درس رکھتے تھے۔ یہ سب فقہ و حدیث کے عالم تھے مگر (سب سے چھوٹے) موسیٰ سے فتویٰ لیا جاتا تھا۔

ہمیں موسیٰ کی پبلک لائف کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے۔ بظاہر وہ اُموی دربار سے الگ تھلگ رہے اور زوالِ بنی اُمیّہ کے تقریباً دس سال بعد یعنی ۱۴۱ھ میں انتقال کیا۔[۲۷۰]

موسیٰ بن عقبہ کا شمار مغازی کے ماہر علماء میں ہوتا ہے۔ مالک بن انس کا قول ہے:[۲۷۱]

عليكم بمغازي موسى بن عقبة فانّه ثقةٌ ...... وفي روايةٍ فانّه رجلٌ ثقةٌ طلبها على كبر السنّ ولم يكثر كما كثُر غيرُه۔

موسیٰ بن عقبہ سے مغازی کا علم حاصل کرو اس لیے کہ وہ بھروسے کے قابل ہیں ...... اور ایک روایت میں یوں ہے کہ وہ ثقہ انسان ہیں کیونکہ انہوں نے بڑی عمر کے باوجود علم حاصل کیا اور دوسروں کی طرح (روایات کا) ڈھیر نہیں لگایا۔

اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی "کتاب المغازی" ضخامت میں کم رہی ہوگی اور اس جملے میں مالک بن انس نے

غالباً "الواقدی" پر چوٹ کی ہے جن کی کتاب المغازی میں وہ اکثر عیب نکالتے رہتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کے مغازی کی روایت ان کے بھتیجے اسمٰعیل بن ابراہیم بن عقبہ نے کی ہے[۲۷۲]، جو ۱۵۸ھ میں فوت ہوئے۔ ان مغازی کو یاقوت[۲۷۳] نے ابو نعیم کے مختصر میں استعمال کیا ہے اور کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ الوئس اسپرنگر ALOYS SPRENGER کو دمشق میں بعض حضرات نے اس کتاب کی موجودگی کا یقین دلایا تھا لیکن وہ اس کی زیارت کرنے میں ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تاریخ الخمیس" کے مؤلف دیار بکری نے اس سے استفادہ کیا تھا[۲۷۴]۔ اس کی کتاب ۹۴۰ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ ہمارے پاس اس کتاب کے دس اجزا میں سے ہر جز کا ایک یا اس سے زیادہ احادیث پر مشتمل ایک ملخص موجود ہے۔ یہ پرشن اسٹیٹ لائبریری PRUSSIAN STATE LIBRARY کی ملکیت ہے اور اس کے عربی متن کو جرمن ترجمے کے ساتھ ایڈورڈ زخاؤ E. SACHAU نے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس رسالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب (جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی) محدود معنوں میں مغازی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں کم سے کم ہجرۃ کا بیان تو موجود ہی ہے۔ الزہری سے موسیٰ نے سب سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ یہ بات ہمیں ابن معین کے بیان سے بھی معلوم تھی۔

كتابُ موسى بن عقبة مِنْ أَصَحِّ هذه الكُتُبِ[۲۷۵]	مغازی کی کتابوں میں موسیٰ بن عقبہ کی کتاب بروایت الزہری صحیح ترین ہے۔

یہ جو بغیر کسی سند کے ادعا کیا گیا ہے[۲۷۶] کہ موسیٰ نے الزہری سے حدیث کی سماعت کی ہی نہیں تھی، اسے ہم کسی حال میں تسلیم نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ نے براہ راست الزہری سے کوئی مواد اخذ نہ کیا ہو بلکہ ان کے کسی اور شاگرد کے ذریعہ یا ان کی تحریری یادداشتوں سے حاصل کیا ہو۔ مذکورہ بالا رسالہ برلن کے متعدد مقامات پر جہاں موسیٰ کہتے ہیں: قالَ ابنُ شهابٍ یا "زَعَمَ ابنُ شهابٍ" وہاں بھی یہ حوالہ الزہری کے مدونات کی طرف ہو سکتا ہے۔ لیکن کم سے کم ایک موقع پر اسی رسالہ برلن میں یہ بھی ہے کہ

"حَدَّثني الزُّهريُّ"	مجھ سے الزہری نے بیان کیا

اس رسالہ برلن کے علاوہ بھی ہمیں ابن سعد کے یہاں موسیٰ کے متعدد اقتباسات ملتے ہیں جس نے اس کتاب کی وہ روایت استعمال کی ہے جو موسیٰ کے بھتیجے اسمٰعیل نے کی تھی[۲۷۷]۔

ابن سعد کی تیسری اور چوتھی جلد کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب میں حبشہ کو ہجرت کرنے والوں کی فہرستیں شامل تھیں۔ اسی طرح اس میں العقبہ کی دونوں بیعتوں میں حصہ لینے والوں۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنگ بدر میں لڑنے والوں کی فہرست تھی۔ یہ اسی طرح کی فہرست ہوگی جیسی شرحبیل بن سعد نے تیار کی تھی[۲۷۸] (ملاحظہ ہو باب اول) ان فہرستوں کے بارے میں مالک کا بیان ہے کہ:

مَن كانَ في كتابِ موسى قد شهد بدرًا فقد شهدها، ومن لم يكن فيه فلم يشهدها۔	موسیٰ کی کتاب میں جس شخص کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ بدر میں موجود تھا، وہ ضرور موجود تھا، اور جس کا نام اس میں نہیں ہے وہ وہاں نہیں تھا[۲۷۹]

ابن سعد کے اُستاد الواقدی نے موسیٰ کی کتاب سے مختلف احادیث اخذ کی ہیں مگر "کتاب المغازی" میں وہ ان کا حوالہ شاذ و نادر ہی دیتا ہے[۲۸۱] یہ واقعہ ہے کہ الواقدی کے ذریعے سے ابن سعد نے موسیٰ کی روایات کثرت سے لی ہیں۔ الطبری نے بھی اپنی "تاریخ" میں موسیٰ کی بہت سی روایات درج کی ہیں، ان میں عہد نبوی کے حوادث کے علاوہ بعض روایات خلفائے راشدین کے عہد سے بھی متعلق ہیں بلکہ بعض تو عہد اموی تک پہنچی ہیں[۲۸۲] کتاب الاغانی میں زید بن عمرو کا ایک بیان ظاہر کرتا ہے کہ موسیٰ نے تاریخ ماقبل اسلام پر بھی توجہ کی تھی۔[۲۸۳]

موسیٰ کے اوّلین راوی اور پیش رو اُن کے نانا ابو حبیبہ ہیں، جن کے حوالے سے انھوں نے بعض حوادث ۹۱ھ تک کے بیان کیے ہیں[۲۸۴]۔ موسیٰ اِسناد کا التزام کرتے ہیں اور ان کے جو اقتباسات محفوظ ہیں اُن میں شاید ہی کہیں کوئی سند محذوف ہوئی ہو۔ مگر ان اسناد سے یہ اندازہ ہوتا بہت مشکل ہے کہ موسیٰ نے ان میں کتنا مواد کتابوں سے لیا ہے۔ ایک موقع[۲۸۵] پر تو انھوں نے صریحاً ابن عباس کے ایک صحیفے کا حوالہ دیا ہے: "وَضَعَ عِنْدَنَا کُرَیب (مولیٰ عبداللّٰہ بن عباس المتوفّٰی عام ۹۸ھ). حِمْلَ بَعِیرٍ أَوْ عِدْلَ بَعِیرٍ مِنْ کُتُبِ ابْنِ عَبَّاسٍ. قَالَ: عَلِیُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ إِذَا أَرَادَ الْکِتَابَ کَتَبَ إِلَیْہِ: اِبْعَثْ إِلَیَّ بِصَحِیفَۃِ کَذَا وَکَذَا قَالَ: فَیَنْسَخُہَا فَیَبْعَثُ إِلَیْہِ بِإِحْدَاہُمَا"

(کریب مولیٰ ابنِ عباس متوفیٰ ۹۸ھ) نے ابن عباس کی کتابوں میں سے ایک بارِ شتر ہمارے پاس لاکر رکھ دیں اور بتایا کہ اگر کبھی ابن عباس کے بیٹے علی کو کسی کتاب کی ضرورت ہوتی، تو وہ لکھ کر بھیجتے تھے کہ فلاں کتاب میرے پاس بھیج دو، پھر اُسے نقل کر کے واپس کر دیتے تھے۔"

ان صحیفوں کے علاوہ موسیٰ کے پاس کچھ اصلی دستاویزیں بھی تھیں، چنانچہ وہ اس خط کا حوالہ دیتے ہیں جو رسول اللہؐ نے المنذر بن ساوی کو بھیجا تھا[۲۸۶]۔ موسیٰ کی کتاب میں تاریخی ترتیب سے لکھے ہوئے واقعات بھی ملتے ہیں[۲۸۷] اور کبھی کبھی وہ قصائد بھی بطورِ شہادت پیش کرتے ہیں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے[۲۸۸]۔

۲۔ مَعْمَر بن راشد

معمر بن راشد ۹۶ھ کے لگ بھگ بصرہ[۲۸۹] میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قبیلہ اَزد کی شاخ بنو حُدّان کے مولیٰ تھے[۲۹۰]۔ معمر نے اپنی جوانی کے زمانے میں بصرہ کے مشہور محدث قتادۃ بن دعامۃ (متوفی ۱۱۷ھ) سے حدیث کی سماعت کی تھی[۲۹۱]۔ پھر طلب علم کی خاطر سیاحت اختیار کی[۲۹۲]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیاحت کا آغاز حسن بصری کی وفات (۱۱۰ھ) کے بعد ہوا، کیونکہ یہ اُن کے جنازے میں شریک تھے[۲۹۳]۔ انھوں نے یمن کی طرف رحلت کی تھی[۲۹۴]۔ یہاں اِن سے پہلے کوئی محدث نہیں گیا تھا[۲۹۵]۔ یمن کی راجدھانی صنعاء میں لوگوں نے انھیں مستقل قیام اختیار کرنے کی ترغیب دی اور اس میں وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے، اس لیے کہ انہوں نے وہاں شادی کر لی تھی[۲۹۶]۔ اس کے بعد وہ کبھی کبھی بصرہ جاتے رہتے تھے، مثلاً اپنی والدہ کے انتقال پر گئے تھے[۲۹۷]۔ مگر پھر یمن کو واپس آ گئے تھے اور وہیں ۱۵۴ھ میں (یا بعض دوسری روایات کے مطابق اس سنہ سے ذرا پہلے) اٹھاون سال کی عمر میں[۲۹۸] وفات پائی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے یہ اڑا دی تھی کہ یہ مرے نہیں، روپوش ہو گئے ہیں مگر ان کے شاگرد عبدالرزاق نے صراحت کی ہے کہ وہ صنعاء میں اپنے خاندان ہی میں مرے اور ان کی بیوہ سے صنعاء

کے قاضی نے عقد کر لیا تھا۔[299]

معمر بن راشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے اخلاق اور کردار[300] کے مالک تھے۔ انھیں حدیث کے میدان میں بھی اچھی شہرت حاصل ہے۔ ان کے بارے میں ابن جریج کا قول بتایا جاتا ہے کہ: "اس شخص کی پیروی کرو، کیونکہ اس کے معاصرین میں کوئی بھی اس سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے"[301]۔ "الفہرست" سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک "کتاب المغازی[302]" لکھی تھی۔ مگر ہم تک اس کتاب کے صرف چند فقرے ہی پہنچے ہیں۔ یہ زیادہ تر الواقدی اور ابن سعد کی کتابوں میں ہیں اور کچھ البلاذری اور الطبری کے یہاں ملیں گے ان کی بیشتر روایات الزہری تک پہنچتی ہیں معمر نے صراحتہً بتایا[303] ہے کہ انھوں نے الزہری سے سوالات کیے تھے۔ جب انھوں نے طلب علم کے لیے خود کو وقف کیا تھا تو الزہری کی مجالس میں خاص طور سے حاضر رہے ہوں گے۔ ابن معین[304] نے مالک اور یونس کے ساتھ معمر کو الزہری کے ثقہ ترین راویوں میں شمار کیا ہے۔ معمر نے بھی مغازی کو محدود معنوں میں نہیں رکھا ہے بلکہ قدیم انبیاؑ اور اہل کتاب کی تاریخ کی طرف بھی توجہ کی ہے اور الطبری نے اس حصے سے اپنی کتاب میں خاصا اخذ کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے رسول اللہ کی ہجرت سے پہلے کی تاریخ پر مواد فراہم کیا ہے۔[305] مزید براں ابن سعد اور الطبری کی تاریخوں میں معمر کے حوالے سے عہد عثمان و معاویہ کے اہم واقعات نقل ہوئے ہیں۔

معمر ان رُواۃ میں سے ہیں جن سے الواقدی نے کثرت سے روایات لی ہیں۔ ابن سعد نے اُن کے اخبار عبدالرزاق بن ہمام کے واسطے سے لیے ہیں۔ موخر الذکر یمن کے باشندے اور معمر کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۲۱۱ھ میں ہوا اور الفہرست[306] سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک "کتاب المغازی" بھی تالیف کی تھی۔ یہ کتاب شاید ان کے استاد کی تالیف ہی کا نیا ایڈیشن ہوگی۔ معمر کے یمنی شاگردوں میں وہب بن منبہ کے بھتیجے عبدالمنعم بن ادریس بھی تھے۔[307]

۳۔ محمد بن اسحاق

الزہری کے تلامذہ کی صف میں تیسرے محمد بن اسحاق ہیں جن کی تالیف "کتاب المغازی" نے اُن کے سب ہم عصروں اور پیشروؤں کی شہرت کو ماند کر دیا ہے۔ ان کی تالیف سیرۃ کے موضوع پر پہلی تحریر ہے جو ہمیں اقتباسات کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک مکمل اور خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں ملی ہے۔ اگرچہ اس میں بہت سے نقائص بھی ہیں۔ ابن اسحاق کی حیات و تصنیفات پر یوحنا فیوک JOHANN FÜCK نے اپنی کتاب "محمد بن اسحاق" میں تفصیل سے بحث کی ہے، یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں فرانکفرٹ کنار رود ماین FRANKFURT-AM-MAIN سے شائع ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم نے اس کتاب کے مطالب سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور جہاں ضروری معلوم ہوا ہے اُس کے بیانات کی مزید وضاحت بھی کر دی ہے۔

ابن اسحاق کا جنم بھی ایک موالی گھرانے میں ہوا۔ ان کے دادا یسار جو غالباً عیسائی عرب تھے، ۱۲ھ میں عراق کے مقام عین التمر پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد گرفتار کر کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مدینہ[308] کو بھیجے گئے تھے، جہاں وہ قیس بن مخرمہ بن عبدالمطلب کے خاندان کے غلام بن کر رہے اور اسلام لانے پر آزاد کر دیے گئے تھے۔ یسار کے تین بیٹے تھے ان میں سے اسحاق نے صبیح[309] نامی ایک غلام کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا، جس کے بطن سے ایک لڑکا محمد پیدا ہوا، یہی آگے چل کر "کتاب المغازی" کا مشہور عالم مصنف ہوا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق ۸۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اس کا قرینہ یہ ہے، اور اس کی طرف اگسٹ فیشر (AUGUST FISCHER) نے بھی اشارہ کیا ہے کہ جن رُواۃ سے ابن اسحاق نے براہِ راست اخذ کیا وہ سب ۱۰۰ھ کے بعد مرے ہیں اور مدینے کے مشہور محدثین کی وہ جماعت جس کے افراد ۹۰ھ تک زندہ تھے اُن میں سے کسی کا نام ابن اسحاق کے شیوخ کی فہرست میں نہیں آتا۔ الواقدی نے بھی ایک خبر ایسی نقل کی ہے جس سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے۔[۳۱۱] وہ کہتا ہے:

"کان محمد بن اسحاق یجلس قریباً من النساء فی موخر المسجد فیُروی عنه أنه کان یُسامرُ النساءَ فرُفعَ إلی هشام وهو امیر المدینة وکانت له شعرة حسنة فرَقَّقَ رأسه وضربه أسواطاً ونهاه عن الجلوس هنالک۔"

"محمد بن اسحاق مسجد کے پچھلے حصے میں عورتوں کے قریب جا کر بیٹھتے تھے۔ اُن کے بارے میں یہ کہا گیا کہ عورتوں سے گپ شپ کرتے ہیں۔ یہ معاملہ ہشام تک پہنچایا گیا وہ اُس وقت مدینے کا گورنر تھا۔ ابن اسحاق کے بہت خوب صورت بال تھے، گورنر نے حکم دیا کہ ان کا سر مونڈ دیا جائے علاوہ بریں کوڑے بھی لگوائے اور کہہ دیا کہ خبردار آئندہ اس جگہ نہ بیٹھنا۔"

اسمٰعیل کی گورنری کا زمانہ ۱۰۶ھ سے ۱۱۴ھ تک رہا، اس لئے ابن اسحاق کی عمر اس وقت بیس اور تیس سال کے درمیان ہوگی۔

محمد سے پہلے ان کے باپ اسحاق احادیث جمع کرنے سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیٹے نے اپنی کتاب میں ان کی اکثر روایات درج کی ہیں۔ اس لیے یہ خیال بے جا نہیں ہے کہ ابن اسحاق کو بھی بچپن ہی سے روایات جمع کرنے کا شوق رہا ہوگا، بعد میں انھوں نے عاصم بن عمرؓ، عبداللہ بن ابی بکرؓ اور الزہری جیسے نامور عالموں کی خدمت میں حاضری دے کر اپنے علم کو اور وسعت دی، ان تینوں حضرات کو ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں اپنی معلومات کے سرچشمے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی مواد فراہم کیا ہے۔ چنانچہ تقریباً ایک سو راوی تو صرف مدینے کے ہیں جن کا حوالہ ابن اسحاق کی کتاب میں ملتا ہے۔

ابن اسحاق ۱۱۵ھ میں اسکندریہ آئے[۳۱۲] اور یہاں بطورِ خاص یزید بن ابی حبیب (متوفی ۱۲۸ھ) سے حدیث کی سماعت کی، یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے علم حدیث کا پودا مصر کی سرزمین[۳۱۳] میں لگایا تھا۔ ابن اسحاق مصر سے براہِ راست عراق کو نہیں گئے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہاں سے پہلے مدینہ آئے تھے، یہی خیال پروفیسر فیوک FUCK نے بھی ظاہر کیا ہے۔ غالباً ایسے ہی کسی موقع[۳۱۴] پر وہ مدینے آئے ہوئے تھے جب ۱۲۳ھ میں[۳۱۵] استاد الزہری نے حاضرین سے ان کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۳۲ھ میں سُفیان بن عُیینۃ ان سے مدینے میں ملے ہیں[۳۱۶]۔ لیکن ہشام بن عروۃ اور مالک بن انس سے اختلافات کے باعث انھیں اپنے وطن میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ ہشام کے باپ عُروۃ کی (جن پر پچھلے باب میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے) روایات ابن اسحاق نے الزہری کے واسطے سے لی تھیں۔ ان کے علاوہ عروۃ کے مولیٰ یزید بن رومان سے بھی بھرپور استفادہ کیا تھا۔ خود ہشام بن عروۃ بھی کبھی کبھی ابن اسحاق کے رُواۃ کی صف میں نظر آجاتے ہیں، جنھوں نے (الزہری اور یزید بن رومان کی طرح) اپنے

باپ کا جمع کیا ہوا ذخیرۂ علم بڑی مقدار میں ہم تک منتقل کیا ہے لیکن انھوں نے بعض خاص مواقع پر ابن اسحاق کو غیر ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ اس بارے میں ابن قتیبہ کہتا ہے:[۲۱۷]

"وكانَ (ابن اسحٰق) يروي عن فاطمة بنت المنذر بن الزبير وهي امرأة هشام بن عروة فبلغ ذلك هشاماً فأنكره وقال: أهو كانَ يدخل على امرأتي"؟

(ابن اسحاق فاطمہ بنت المنذر بن الزبیر سے روایت بیان کیا کرتے تھے، یہ ہشام کی بیوی تھیں جب ہشام کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی تردید کی اور کہا "کیا وہ میری بیوی سے ملتا ہے؟")

اسی طرح کا ایک بیان الفہرست[۲۱۸] میں پایا جاتا ہے:

"يروي (ابن اسحاق) عن فاطمة بنت المنذر (زوجة هشام بن عروة) فبلغ هشاماً ذلك، فأنكره وقال، متى دخل إليها ومتى سمع منها۔"

(ابن اسحاق فاطمہ بنت المنذر، زوجۂ ہشام بن عروۃ سے روایت کیا کرتے تھے، جب ہشام نے سنا تو اس سے انکار کیا اور کہا یہ میری بیوی سے کب ملے اور اس سے کب سنا ہے؟)

ہشام کا جواب جو یاقوت نے معجم[۲۱۹] میں نقل کیا ہے اس کے مقابلے میں ذرا مبہم ہے:۔

"أهو كانَ يدخل على امرأتي ۔ كأنه ينكر ذلك" — کیا وہ میری بیوی سے ملے ہیں؟ یہ انھوں نے اس لہجے میں کہا جیسے اس بات کی تردید کر رہے ہوں۔

لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی ہم بہت سے جامعینِ احادیث کے بارے میں سنتے ہیں کہ انھوں نے عورتوں سے روایات اخذ کی تھیں۔ عبداللہ بن ابی بکر بھی عروۃ کی طرح اشرافِ مدینہ میں سے تھے اور ان کے بیان میں ہم پہلے پڑھ چکے ہیں (ملاحظہ ہو باب دوم) کہ انھیں اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اُن کی بیوی عمرۃ اُن کے ایک شاگرد سے خود روایت بیان کر دے اور یہ شاگرد ابنِ اسحاق کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا اور غالباً ہشام کو بھی اپنی بیوی کے روایت کرنے پر اعتراض نہ ہوا ہوگا۔ جو خود ہشام سے عمر میں خاصی بڑی تھیں، اور ابن اسحاق سے تو ۳۰۔ ۴۰ سال بڑی ہوں گی۔ البتہ ہشام کو ابن اسحاق کے کبھی اپنے گھر آنے کا حال معلوم نہیں ہوگا اس لیے انھوں نے ان روایات پر شک کا اظہار کیا۔

ہاں المؤطا کے مشہور مؤلف مالک بن انس کی مخالفت کے اور ہی اسباب ہیں۔ یہ بات متعدد بار کہی گئی ہے کہ ابن اسحاق قدریہ عقائد[۲۲۱] رکھتے تھے۔ ابوزرعۃ کا بیان ہے کہ دحیم (متوفی ۲۴۵ھ) نے اُن سے کہا کہ ابن اسحاق سے مالک بن انس کی خصومت ان کے قدری عقائد کی بنا پر تھی۔[۲۲۲] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابن اسحاق مالک کی علمیت کے قائل نہ تھے اور ابن اسحاق کے ایک شاگرد عبداللہ بن ادریس نے مالک کا ایک قول نقل کیا ہے:[۲۲۳]

"كنتُ عند مالك بن أنس فقالَ له رجلٌ: إنَّ محمدَ بن اسحٰق يقول: إعرضوا عليَّ علمَ مالك بن أنس فإني أنا بيطاره. فقال مالك: أنظروا إلى دجّالٍ من الدجاجلة يقول إعرضوا

عَلٰی عِلْمِ مَالِکٍ"

(میں مالک بن انس کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ "مالک کا علم میرے سامنے رکھو کیونکہ میں ہی اُس کا جراح ہوں" مالک کہنے لگے "ذرا گروہ دجاجلہ کے اس دجّال کو تو ذرا دیکھو کہتا ہے کہ مالک کا علم میرے سامنے رکھو۔۔۔!")

راوی، جسے اس روایت سے دلچسپی صرف ایک لغوی نظیر کی وجہ سے تھی، کہتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے کسی کو دجّال کی جمع دجاجلہ استعمال کرتے نہیں سنا۔

اپنے استاد الزہری کے برخلاف ابن اسحاق کا دمشق کے دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ غالباً اُموی خاندان کا زوال (۱۳۲ھ) اور عباسیوں کا تختِ خلافت پر قبضہ بھی ابن اسحاق کے ترکِ وطن کا ایک اضافی سبب رہا ہوگا۔ بہرحال ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ وہ[۳۲۴] مدینہ چھوڑ کر پہلے کوفہ پہنچے، وہاں سے الجزیرہ اور رَے ہوتے ہوئے بغداد آئے، جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت تک رہے۔ ایک اور روایت ان مقامات پر اُن کے قیام کی بعض جزوی تفصیلات بھی مہیا کرتی ہے[۳۲۵]:

"وکَانَ محمّد بن اسحاق مع العبّاس بن محمّد بالجزیرة (حَیثُ کانَ العبّاسُ والیاً فی عَام ۱۴۲ھ) وکَانَ قَصَدَ أَبَا جَعفَر المنصُور (الذی تولّی الخلافة من عام ۱۳۶ إلی ۱۵۸ھ ولکنّه تحوّل إلی بَغدَادَ فی عام ۱۴۶ھ للمرّة الأولی) بالحِیرَة فکتبَ إلیه المغازی۔ فسَمع منه أهلَ الکوفة لذلکَ السّبب وسَمعَ منه أهلُ الجزیرة حین کانَ مَعَ العبّاسِ بن محمّد۔ وأتی الرّی (حیثُ کان یَعیشُ ولیّ العَهد المهدی مِن قبل عام ۱۵۱ھ) فسَمِعَ منه أهلهَا۔ فرواته من هذه البلدان اکثر ممّن روی عنه من أهلِ المدینة۔ وأتی بَغدادَ فأقَامَ بهَا إلی أن مَاتَ بِهَا"

(محمد بن اسحاق الجزیرۃ میں العباس بن محمد کے ساتھ رہے (العباس ۱۴۲ھ میں یہاں کے گورنر تھے) پھر وہ ابوجعفر المنصور کے دربار میں الحیرہ پہنچے (یہ ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ تک خلیفہ رہا مگر پہلی بار اس نے ۱۴۶ھ میں بغداد کو راجدھانی بنایا تھا) یہاں انھوں نے المنصور کے لیے مغازی قلمبند کیے۔ اس لیے اُن سے اہلِ کوفہ کو بھی روایات سننے کا موقع ملا، جیسے اُن کے العباس بن محمد کے ساتھ رہنے کے زمانے میں الجزیرۃ کے لوگوں کو ملا تھا۔ پھر وہ رَے چلے آئے۔ (یہاں ۱۵۱ھ سے پہلے ولی عہد المہدی رہتا تھا) تو یہاں کے باشندوں نے بھی اُن سے روایات اخذ کیں۔ اسی لیے ان علاقوں میں اُن سے روایت کرنے والوں کی تعداد اہلِ مدینہ سے زیادہ ہے۔ رَے سے وہ بغداد پہنچے اور تا آخر حیات وہیں رہے۔")

ابنِ اسحاق بغداد میں ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ[۳۲۶] میں مرے اور خیزران کے قبرستان میں دفن کیے گئے[۳۲۷]۔

اس روایت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انھوں نے خلیفہ کے لیے مغازی قلمبند کیے، اس کا لازماً یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ

اس کے لیے سرکاری طور پر مامور کیے گئے تھے۔ کیونکہ "کتاب المغازی" کے راویوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو یہ مواد اُن روایات کی بنیاد پر تیار کیا جو انھیں مدینے میں دستیاب ہوئیں، پھر جو کچھ انھیں مصر میں ملا وہ اس کتاب میں شامل کیا گیا لیکن اس میں کہیں بھی عراق کے کسی راوی کا نام نہیں آیا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ کتاب ابن اسحاق نے اپنا آبائی وطن ہمیشہ کے لیے چھوڑنے سے پہلے ہی ختم کر لی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک مدنی کا حال بھی معلوم ہے جس نے ابن اسحاق کی کتاب سے روایت کی ہے یعنی ابراہیم بن سعد (متوفی ۱۸۴ھ)۔ ہاں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کو خوش کرنے کے لیے ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں معمولی تبدیلیاں کیں یا ایسے حصّوں کو حذف کر دیا جنھیں خلیفہ ناپسند کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہمیں اس کتاب میں کم سے کم ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس کا تذکرہ خلیفہ کے خلاف مزاج ہو سکتا تھا یعنی خلیفہ کے جدِ اعلیٰ العباس نے بدر کی لڑائی میں مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر رسول اللہؐ کا مقابلہ کیا تھا۔ اور ابن اسحاق نے اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے[۴۲۸] وہ بدر کے قیدیوں میں العباس کا نام بھی لکھتا ہے مگر العباس نے اپنی مرضی کے خلاف رسول اللہؐ سے جنگ کی تھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے، جو ابن اسحاق کے ہاں ابن عباس کے حوالے سے آئی ہے[۴۲۹]۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ العباس اور ان کی زوجہ ایک مدت سے اسلام کے حامی تھے، اگرچہ انہوں نے کھلم کھلا بدر کے دن تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اس طرح کی ایک اور روایت کی سند العباس کے ایک مولیٰ تک پہنچتی ہے[۴۳۰] اس کا امکان کہ محمد بن اسحاق نے یہ روایات اپنی کتاب میں عباسیوں کو خوش کرنے کے لیے داخل کی ہوں، نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے مدنی شاگرد ابراہیم بن سعد نے، جن کا پہلے نام لیا جا چکا ہے، یہ قول نقل کیا ہے کہ العباس نے قید ہونے کے بعد اپنے بھتیجے[۴۳۱] کی نبوت کا اقرار کر لیا تھا۔ لیکن ابن اسحاق کے یہ اقوال خواہ پہلی بار اُس وقت کتاب میں داخل کیے گئے ہوں جب وہ اپنا وطن ترک کر کے نکلے ہیں، انہوں نے یہ نہیں کیا کہ العباس کے رول کو سرسری طور پر بیان کر دیں، جیسا کہ بعد میں ابن ہشام اور الواقدی نے کیا ہے۔

ابن اسحاق کی کتاب کا نام "کتاب[۴۳۲] المغازی" ہے اور یہ فی الاصل تین حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے یعنی "المبتدا"، "المبعث" اور "المغازی"۔ اس لیے کہ اس میں اسلام سے پہلے نبوت کی تاریخ بھی ہے اور رسول اللہؐ کے ایام شباب اور آپ کی مکی زندگی کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے آخر میں مدنی زندگی کا حال ہے۔ یہ کتاب ہمارے پاس اپنی اصلی اور مکمل صورت میں نہیں آئی ہے[۴۳۳] اس کا ایک مخطوط قسطنطنیہ کی کوپرولو لائبریری (KUPRULU LIBRARY) میں محفوظ ہے اور کتب خانے کی وضاحتی فہرست دیکھنے والے کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ 'کتاب المغازی' کو اصلی شکل میں پیش کرتا ہے۔ مگر میں نے اس کا بغور معائنہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ بھی ابن ہشام ہی کا نسخہ ہے۔ یہ نسخہ وستنفیلڈ ایڈیشن (گوٹنجن (GOTTINGEN) ۱۸۵۹ء) اور طبع بولاق[۴۳۴] کی صورت میں عام طور پر دستیاب ہے۔ الطبری اور دوسرے مورخوں کے ہاں ابن اسحاق کے جو اقتباسات ملتے ہیں اُن کا تقابلی مطالعہ نسخۂ ابن ہشام سے کیا جائے تو ہمیں کتاب کی اصلی صورت کا اندازہ کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

ابن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ) جس نے ابن اسحاق کے بلاواسطہ راوی البکائی (متوفی ۱۸۳ھ) سے روایت کی ہے، اپنے مقدمے میں خود لکھتا ہے کہ اس نے ابن اسحاق کی کتاب میں اپنی طرف سے کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ چنانچہ اس نے آدم سے ابراہیم

تک اہلِ کتاب کی تاریخ کو خارج کر دیا ہے' اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سوائے رسول اللہؐ کے اجداد کے اور کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔۱۰ اسی طرح اس نے ابن اسحاق کی اُن روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن میں رسول اللہؐ کا تذکرہ نہیں ہے' یا جن کی طرف قرآن کوئی اشارہ نہیں کرتا' یا جن میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ابن اسحاق کی دوسری روایات کی تائید ہوتی ہو' یا کسی نکتے کی شرح ہو' یا کوئی اور مناسبت پائی جاتی ہو۔ یہ سب حذف کرنے کا مقصد کتاب کو مختصر کرنا تھا۔ مگر بعض محذوفات کے دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً اس نے وہ قصائد ترک کر دیئے ہیں جن کے بارے میں علمائے شعر نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی طرح جن واقعات سے کسی کی دل آزاری ہوسکتی تھی وہ بھی نکال دیئے گئے' یا جن باتوں سے کسی پر الزام عائد ہوتا تھا انھیں بھی باقی نہیں رکھا گیا اور آخری بات یہ کہ ان روایتوں کو بھی شامل نہیں کیا گیا جو اگرچہ ابن اسحاق کے ہاں موجود تھیں مگر البکائی نے ان سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ ابن ہشام نے اس میں بہت سی تصحیحات کی ہیں۔ انساب اور لغت سے متعلق موضوعات پر مفید اضافے کیے ہیں اور ایسے مواقع پر بتا بھی دیتا ہے کہ یہ اُس کا اضافہ ہے' لیکن اس نے ابن اسحاق کے متن میں کوئی تغیر نہیں کیا۔ اس کی تلخیص میں صرف انھیں مواقع پر توجیہی اشارات ملتے ہیں جہاں اس نے کوئی عبارت حذف کر دی ہے ابن اسحاق کی اصلی کتاب کے جو اقتباسات دوسری کتابوں میں ملتے ہیں اور ابن ہشام نے ترک کر دیئے ہیں اُن کی مدد سے ہم حذف شدہ حصوں کی بازیافت کر سکتے ہیں' اس طرح نسخۂ ابن ہشام کا خلا بڑی حد تک پُر ہو جاتا ہے۔ الطبری نے اپنی تاریخ ہی میں نہیں' تفسیر میں بھی انبیاے بنی اسرائیل سے متعلق ابن اسحاق کے طویل اقتباسات بکثرت نقل کر دیئے ہیں۔ اسی طرح الازرقی نے مکّہ کی تاریخ قدیم پر ابن اسحاق کا جا بجا حوالہ دیا ہے اور وہ عبارتیں نقل کی ہیں جو ابن ہشام کی تلخیص میں موجود نہیں ہیں۔ ابن ہشام کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "المبتدا" والے حصّے کو چھوڑ کر دوسرے حصوں میں برائے نام کشُوتی ہوئی ہے۔ اس موقع پر ہمیں سب سے بڑھ کر الطبری سے مدد ملتی ہے کہ ہم ابن ہشام کے محذوفات کی بازیافت کر سکیں مثلاً اس نے بدر میں العباس کی گرفتاری کا حال درج کیا ہے[۲۳۶] جو ابن ہشام نے "بعض لوگوں" کے خوف سے نکال دیا تھا' جیسا کہ ہم ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں' ظاہر ہے کہ یہ "لوگ" عباسی حکمران ہی ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم اس مواد کا بغور مطالعہ کریں جو اقتباسات کی شکل میں دوسری تاریخوں میں محفوظ ہے اور ابن ہشام کے نسخے میں نہیں ملتا تو ابن اسحاق کی اصلی کتاب کا خاکہ کچھ اس طرح کا تیار ہوتا ہے

(الف) تاریخ ماقبل اسلام — "المبتدا" — جسے چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلا حصّہ ابتداے آفرینش سے حضرت عیسٰیؑ تک وحی و رسالت کی تاریخ ہے اور اسی سے ابن ہشام نے سب سے زیادہ حذف کیا ہے۔ چونکہ ہر موقع پر ابن اسحاق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ واقعات' تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع ہوں' اُس نے اس فصل میں بھی ایسے حسابات لگائے ہیں۔ اس میں وہب بن منبّہ کی روایات اور ابن عباس کی روایات کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ یہودی اور مسیحی مصنفوں کے اقوال' کتاب مقدس (توراۃ) سے اقتباسات اور قرآنی آیات کے حوالے بکثرت دیئے گئے ہیں۔ رجالِ توراۃ کے علاوہ قدیم عرب اقوام میں سے عاد و ثمود کا ذکر ہے' جن کی طرف خدا نے انبیا بھیجے تھے' جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی طسم و جدیس کا بیان بھی کیا ہے' جن کا قرآن نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ "المبتدا" کی دوسری فصل جس پر کچھ مواد ابن ہشام کے نسخے میں محفوظ ہے[۲۳۷] اور جس کی تکمیل تاریخ طبری

کی مدد سے کی جا سکتی ہے[۳۳۸]، وہ عہد جاہلیّۃ میں یمن کی تاریخ ہے۔ قرآن کے مطالعے نے یمن کی تاریخ سے علما کی دلچسپی پہلے ہی بڑھا دی تھی، سورۃ ۸۵ میں "اصحاب الاخدود" کا بیان ہے، اس سے ہمارے علما اس طرف متوجہ ہوئے کہ یمن میں عیسائیت اور یہودیت کے فروغ کا زمانہ تحقیق کریں، کیونکہ تفاسیر ماثورہ کہتی ہیں کہ ان آیات میں یہودی بادشاہ ذونُواس کے سقوط کی طرف اشارہ ہے اسی طرح "اصحاب الفیل" (سورۃ ۱۰۵) کا مطالعہ کرتے ہوئے یمن کے حبشی گورنر ابرہہ کی فوج کی تفصیلات درکار تھیں، جو کعبہ کو ڈھانے کی اپنی اسکیم میں خدا کے حکم سے ناکام ہوگیا تھا۔ مبتدأ کا تیسرا حصہ عرب قبائل اور ان کی اصنام پرستی[۳۳۹] سے بحث کرتا ہے اور چوتھے میں رسول اللہؐ کے قریبی اجداد اور اہلِ مکہ کے رسوم[۳۴۰] و عقائد سے بحث کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی "المبتدأ" کے حصے میں اسناد نہیں ہیں۔ اس کی پہلی فصل میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

(ب) المبعث۔ اس حصے میں رسول اللہؐ کی مکی زندگی، آپ کی ہجرت اور شاید مدنی زندگی کے پہلے سال کی مہمات کا بیان ہوتا ہے۔ اس جزو میں اسانید کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور ابنِ اسحاق زیادہ تر اپنے مدنی اساتذہ کے حوالے سے روایات درج کرتا ہے۔ انھیں وہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے اور آغاز میں انفرادی روایات کے بیشتر مشمولات کا خلاصہ بھی دے دیتا ہے اسی حصے میں اُن اخبار کے علاوہ جو سند کے ساتھ یا بغیر سند کے پیش کیے گئے ہیں، ایک ایسی دستاویز بھی ملتی ہے جسے صرف ابنِ اسحاق نے شامل کیا ہے اور زمانۂ مابعد کے کسی مغازی نویس نے نہیں لیا ہے۔ یہ رسول اللہؐ کا وہ معاہدہ ہے جو آپؐ نے مدنی قبائل سے کیا تھا، اور جسے مدینے کا "سماجی ضابطہ" کہا گیا ہے[۳۴۱]۔ اس کے علاوہ مختلف فہرستوں کا ایک سلسلہ ہے[۳۴۲] جس میں پہلے ایمان لانے والوں کی فہرست، حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے نام، انصار میں سے پہلے مسلمان ہونے والوں کی فہرست، العقبۃ کی دونوں بیعتوں میں شرکت کرنے والوں کی فہرست، اُن مہاجرین و انصار کی فہرست جنھوں نے مہاجرین کا مدینے میں استقبال کیا تھا، اور اُن لوگوں کے نام جن سے رسول اللہؐ نے مُواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تھا، یہ سب شامل ہیں۔

(ج) المغازی۔ یہ رسول اللہؐ کی مدنی زندگی کی تاریخ ہے، جس میں مشرکینِ عرب سے پہلی جنگ سے لے کر آنحضرتؐ کی وفات تک کے حالات آجاتے ہیں۔ اس حصہ میں شروع سے آخر تک غزوات ہی کا بیان ہے، بس آپ کے آخری مرض اور وفات کا حال قدرتے تفصیل سے آجاتا ہے۔ یہاں باضابطہ اسناد کی پابندی ہوتی ہے۔ ابنِ اسحاق کے رُواۃ اُس کے مدنی شیوخ ہیں، جن میں نمایاں حیثیت الزہری، عاصم بن عُمر، اور عبداللہ بن ابی بکر کی ہے، جن سے ابن اسحاق تاریخی ترتیبِ واقعات میں بھی بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ان حضرات سے اخذ کیے ہوئے مُواد میں ابنِ اسحاق نمایاں اضافے بھی کرتا ہے، یہ اضافات کچھ تو وہ اخبار ہیں جو اُسے دوسرے ذرائع سے دستیاب ہوئے اور کچھ اُن حوادث میں حصّہ لینے والے مردوں اور عورتوں کے رشتہ داروں کے اقوال ہوتے ہیں[۳۴۳]۔ غزوات کا حال لکھنے میں ابنِ اسحاق ایک مقررہ ضابطے کی پابندی کرتا ہے، پھر اپنے ثقہ اُستادوں کے بیانات سے مرتب کی ہوئی ایک مجموعی رپورٹ درج کرتا ہے پھر اُس بنیادی واقعہ سے متعلق وہ انفرادی روایات بیان کرکے اس خبر کی تکمیل کر دیتا ہے جو اس نے دوسرے ذرائع سے فراہم کی ہوں[۳۴۴]۔ مغازی میں بھی فہرستیں بکثرت شامل ہوتی ہیں چنانچہ اُس نے بدر میں لڑنے والوں زخمی اور گرفتار ہونے والوں، اُحد میں شہید ہونے والوں، اور غزوہ خندق، خیبر، موتہ اور طائف میں

شہادت پانے والوں اور حبشہ سے واپس آنے والے مہاجروں کی فہرستیں دی ہیں۔

فیوک (Fück) نے ابنِ اسحاق کے پندرہ شاگردوں[۳۴۵] کی فہرست بنائی ہے، جن کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ انھوں نے ابن اسحاق کی 'کتاب المغازی' سے روایت کی تھی۔ ان میں سے ایک ابراہیم بن سعد ہیں، جن کا نام پہلے بھی آچکا ہے، یہ مدینے کے باشندے تھے۔ باقی سب شاگردوں نے سیرۃ النبی سے متعلق ابنِ اسحاق کی اس کتاب کو کوفہ، رَے یا بغداد میں حاصل کیا۔ ان روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور نسخۂ البکّائی کا ہے جس پر ابنِ ہشام نے اعتماد کیا ہے۔ الطبری کے بہت سے اقتباسات کی روایت سلمۃ بن الفضل (متوفی ۱۹۱ھ) تک پہنچتی ہے۔ ایک خط سے جو از راہ کرم مسٹر ایف کرنکو (F. KRENKOW) نے میرے پاس بھیجا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حاکم نیشاپوری کی 'مستدرک' میں جو اب حیدر آباد سے چھپ گئی ہے، مغازی سے متعلق ایک خاص فصل ہے جس میں ابنِ اسحاق کی کتاب کے متعدد اقتباسات ہیں، اور ان میں سے بیشتر یونس بن بکیر (متوفی ۱۹۹ھ) کے نسخے سے لیے گئے ہیں۔ ایسا ہی ابن الاثیر نے اسد الغابۃ میں اور ابن حجر نے الاصابۃ میں کیا ہے۔ ابنِ اسحاق کے سب سے آخری اقتباسات بظاہر ابنِ حجر[۳] کے یہاں محفوظ ہیں لیکن ابنِ ہشام کی تلخیص کے عام طور پر شائع ہو جانے کی وجہ سے بہت پہلے سے اصل کتاب کی ضرورت کا احساس ختم ہو چکا تھا، چنانچہ الیعقوبی (متوفی تقریباً ۳۰۰ھ) اسی ملخص ابن ہشام کے اقتباسات دیتا ہے[۳۴۷]۔

ابن اسحاق کے شیوخ میں سب سے اہم شخصیت الزُّہری کی ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو ارتباط تھا اس کا اظہار کبھی کبھی اسانید کے الفاظ میں ہوتا ہے مثلاً: وہ کہتا ہے: "حَدَّثَنِی محمّد بن مسلم الزُّهریُّ" یا "سَألتُ ابنَ شِهَاب الزُّهری" یا "حَدَّثَنِی الزُّهریُّ ..... قَد جَمعتُ لکَ النّبی حَدَّثَنِی القَومُ[۳۴۸]"۔ ابنِ اسحاق نے الزُّہری کو ایک دستاویز بھی بھیجی تھی جو اُسے مصر میں یزید بن حبیب سے ملی تھی۔ یہ اُن وفود سے متعلق تھی جو رسول اللہ ؐ نے مختلف حکمرانوں کی طرف سفارتی مشن پر بھیجے تھے۔ ابنِ اسحاق اس دستاویز کے مشمولات کی تصدیق الزُّہری سے کرانا چاہتے تھے[۳۴۹]۔

ابنِ اسحاق کے شیوخ میں الزُّہری، عبداللہ بن ابی بکر اور عاصم بن عمر کے علاوہ بھی کچھ حضرات ہیں، جن میں عبداللہ بن الزبیر کے حامیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ابن اسحاق نے عروۃ بن الزبیر کے مولیٰ یزید بن رومان[۳۵۰] ہی سے عروۃ کی روایات اخذ نہیں کیں بلکہ آلِ زبیر کے دوسرے موالی[۳۵۱] سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ خاندانِ زبیر کے دوسرے افراد مثلاً عروۃ کے دونوں بیٹے یحییٰ اور ہشام[۳۵۲]، یا عروۃ کے بھتیجے عمر بن عبداللہ[۳۵۳] اور محمد بن جعفر[۳۵۴] اور یحییٰ بن عباد بن عبداللہ[۳۵۵] بھی اس کے شیوخ میں شامل ہیں۔

جس طرح ابن اسحاق نے حدیث اور تفسیر میں علمائے اسلام سے استفادہ کیا (اور میدان میں اُس کے سب سے بڑے اُستاد ایک مولیٰ، محمد بن ابی محمد[۳۵۶] تھے) یا اُن سے مغازی کی تعلیم حاصل کی، اسی طرح اُس نے یہودیوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے غیر مسلم عالموں کی مدد بھی حاصل کی۔ چنانچہ وہ اپنے رُواۃ میں "بعضُ اهلِ العلمِ من أهلِ الکتابِ الأوّل" (بعض یہودی علماء) کا حوالہ دیتا ہے، کبھی اُنھیں "أهلُ التّوراۃ" کہتا ہے، کہیں عجمیوں کی تاریخ کے جانکار

کو "مَن یَسُوق الاحادیثَ عن العجم"[۳۵۷] کہہ کر یاد کرتا ہے۔ بظاہر علمائے مدینہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے ان لوگوں کے اقوال کو قبول کیا ہے اور بعد میں اس بات پر اُسے مطعون بھی کیا گیا۔ جنوبی عرب میں وُہب بن منبّہ نے ابن اسحاق سے پہلے اسی طرح کے غیر اسلامی اخبار بتکلف جمع کیے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اہلِ کتاب کے قصوں میں ابن اسحاق نے متعدد مواقع پر وُہب بن منبّہ کا حوالہ دیا ہے، اور اُسے وہب کی روایات المغیرۃ بن ابی زبید کے واسطے سے ملی ہیں۔[۳۵۸] وہب کے بعد ابن اسحاق قدیم ترین عرب مصنّف ہے جس نے توراۃ اور انجیل کی عبارتیں لفظی ترجمہ کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کی ہیں چنانچہ وہ کتاب پیدائش (۲۲/۵۰) کے فقرے یہ کہہ کر درج کرتا ہے[۳۵۹] "وفی التوراۃ" اسی طرح کتاب پیدائش (۴/۹-۱۶) کا حوالہ "ویزعم اھل التوراۃ" کہہ کر دیتا ہے۔ یوحنا (۲۳/۱۵) کی عبارت کے ساتھ لکھتا ہے مما اثبت یوحنس الحواری[۳۶۱] (یہ JOHN THE EVANGELIST کی عبارت ہے)۔ لیکن جہاں ابنِ اسحاق نے برقلیطس اغریقی (GREEK PARACLETE) کی جگہ مُنحمنّا (MANAHHAMANA) کا نام لکھ دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فقرے اُسے اُس ترجمے کے مطابق ملے ہیں جسے (PALESTINIAN-CHRISTIAN) "فلسطینی مسیحی" کہا جاتا ہے۔[۳۶۲]

بعض شجرہ ہائے نسب سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب مقدس کے عین مطابق ہیں مثلاً، اولادِ اسمٰعیل کا شجرۂ نسب کتاب پیدائش (۲۵/۱۳-۱۶) سے حرف بحرف مطابقت رکھتا ہے۔[۳۶۳]

ابنِ اسحاق بعض فہرستیں، خطوط اور دستاویزیں بھی عموماً بغیر اسناد کے درج کرتا ہے۔ یہ اُسے اُن کتابوں سے حاصل ہوئی ہوں گی جو اُس کی دسترس میں تھیں۔ عبداللہ بن ابی بکر اس کے استاد تھے جن کے خاندان میں رسول اللہؐ کا وہ خط محفوظ تھا جو انھیں یمن بھیجتے وقت دیا گیا تھا، اور جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو باب دوم) انھیں عبداللہ نے رسول اللہؐ کے وثائق کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور اِن دستاویزوں کو ابنِ اسحاق ہمیشہ اُن کے ہی حوالے سے درج کرتا ہے۔[۳۶۵] ایک دستاویز اس کے مصری شیخ یزید بن حبیب کے حوالے سے بھی ملتی ہے۔[۳۶۶]

ابنِ اسحاق کے پیش رو حضرات نے اپنے مجموعوں میں نثری دستاویزوں اور اخبارات کے ساتھ پہلے ہی سے اشعار کی آمیزش شروع کر دی تھی، مگر جہاں تک ہمیں علم ہے جتنی کثرت سے اشعار کا استعمال ابنِ اسحاق نے کیا ہے متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ الفہرست کا مؤلف ابن الندیم کہتا ہے:[۳۶۷]

وَیُقَالُ کَانَ یُعْمَلُ لَہُ الأَشْعَارُ وَیُؤْتیٰ بِھَا، وَیُسْأَلُ أَن یُدْخِلَھَا فِی کِتَابِہٖ فِی السِّیرۃ، فَیَفْعَل۔ فَضَمَّنَ کِتَابَہٗ مِنَ الاشعارِ مَا صَارَ بِہٖ فَضِیْحَۃً عِنْدَ رُوَاۃِ الشِّعْرِ۔	کہا جاتا ہے کہ ابن اسحاق کے لیے اشعار گھڑے جاتے تھے پھر اس کے پاس لائے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ انھیں اپنی کتاب سیرۃ میں شامل کر لے اور وہ کر لیتا تھا۔ چنانچہ اس کی کتاب میں ایسے اشعار آ گئے جن سے رواۃِ شعر رسوا ہو گئے۔

اس سے پہلے محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۱ھ) بھی ابن اسحاق پر نکتہ چینی کر چکا ہے اور کہتا ہے کہ ابن اسحاق اپنی صفائی میں یہ کہتے

ہیں کہ میں شعر کا نقاد تو ہوں نہیں، لوگ جو کچھ مجھے دیتے ہیں اُسے قبول کر لیتا ہوں۔ لیکن یہ تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے، کیونکہ ابن اسحاق نے اپنی روایات میں ایسے مردوں اور عورتوں کی زبان سے شعر پڑھوا دیئے ہیں جنھوں نے زندگی میں ایک مصرع بھی موزوں نہ کیا ہوگا۔ ان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہی ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ عاد اور ثمود کے قصائد نقل کیے ہیں۔ اور یہ نہ سوچا کہ ان اقوام کو صفحۂ ہستی سے مٹے ہوئے بھی ہزاروں سال ہو چکے، اتنے طویل زمانے تک کن لوگوں نے ان اشعار کو زبانی یاد رکھا ہوگا؟ الطبری نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالے سے عاد و ثمود کے زمانے کے کچھ قصائد نقل کیے ہیں۔ اور ابن ہشام یہ صراحت کرتا ہے کہ ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں زیادہ تر ایسے قصائد درج کیے ہیں جن سے علمائے شعر ناواقف ہیں اور خود ابن اسحاق شاذ ہی ان راویوں کا نام ظاہر کرتا ہے جن سے یہ اشعار اُسے ملے ہیں۔ مدنی زندگی کے بعض حوادث سے متعلق اشعار اُسے اپنے استاد عبداللہ بن ابی بکر سے ملے ہیں[270]۔ جیسا کہ وہ خود ہی اظہار کرتا ہے۔ لیکن عبدالمطلب کی لڑکی کا ایک مرثیہ جو اُس نے اپنے باپ کی وفات پر لکھا تھا اور جسے ابن اسحاق نے تمام و کمال نقل کیا ہے اس کے بارے میں ابن ہشام یہ وضاحت کرتا ہے[271]۔

"ولم أرى أحداً من أهل العلم بالشعر	مجھے کوئی عالم شعر ایسا نہیں ملا جو ان اشعار سے واقفیت
يعرف هذا الشعر إلا أنه لما رواه	کا مُدعی ہو مگر چونکہ ابن اسحاق نے ان کی روایت سعید
عن محمد بن السعيد بن المسيب	بن المسیب کے بیٹے محمد کے نام سے کی ہے اس لیے
كتبناه"	یہاں درج کر لیے گئے ہیں۔"

یہاں اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ اشعار اُس مدنی فقیہ کے بیٹے نے صرف روایت ہی نہیں کیے بلکہ وہی ان کے خالق بھی ہو سکتے ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا اگرچہ ان کے والد کو ان شعروں کا مؤلف نہ بھی سمجھا جائے جنھیں شعر و شاعری سے خصوصی اور گہرا تعلق تھا[272]۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح جو اشعار داخل کر لیے گئے ہیں انھیں کیسے پرکھا جائے اور کیا ابن اسحاق پر الجمحی کی تنقید درست ہے؟ بہت سے قصائد جو ابن اسحاق نے اپنے یہاں درج کیے ہیں اور خصوصاً وہ جو مدنی حوادث سے متعلق ہیں، ان کی صحت پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کا بڑا حصہ ابن ہشام کے زمانے تک علمائے شعر کے نزدیک مستند سمجھا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ خود ابن اسحاق ان قصائد کے بڑے حصے کو علی الاطلاق مستند نہ سمجھتا ہو، البتہ اُس نے علمائے شعر کی طرح ان کے استناد کو پرکھنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، اور نہ اس مسئلے کو اس سے زیادہ اہمیت ہی دی۔ جہاں اس نے ان اشعار کا درج کرنا مناسب سمجھا انھیں شامل کر لیا، ایک تو اس سبب سے کہ اشعار سے قصہ میں رنگینی پیدا ہوتی تھی اور دوسرے اس لیے کہ یہ پرانے داستان سراؤں کی روایت بھی تھی کہ وہ قصہ میں جابجا اشعار شامل کر دیا کرتے تھے[273]۔ "سیرۃ نبوی میں شعری اقتباسات" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں ہم نے بتایا تھا کہ ایسے اقتباسات ایام العرب اور اسلامی غزوات کی روایتوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں بلکہ سیرۃ ابن اسحاق کی طرح ان میں شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا ذکر بھی ہے، جن میں دو متحارب قبیلوں کے شاعر ایک دوسرے کی ہجو گوئی کرتے ہیں اور دوسرا شاعر پہلے فریق کو اسی بحر و قافیہ میں جواب دیتا ہے۔ عہدِ جاہلی میں ہمیں اوس و خزرج کی لڑائیوں کا حال بھی معلوم ہے، جن میں شاعر اپنے قبیلے کے ترجمان کا رول ادا کرتا ہے۔ یہی معاملہ بعد کو مغازی میں ملتا ہے (مثلاً حسان بن ثابت

اور عبداللہ بن رواحہ)۔ ابن اسحاق نے ان قصائد کے درج کرنے میں غیر معمولی غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ رسول اللہؐ کے دشمنوں کے ہجویہ اشعار بھی بے تکلف لکھتا ہے بلکہ بعض مواقع پر ابن ہشام کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ زیادہ تیکھے اشعار کو دھیما بنا دے یہاں اس بات پر زور دینا بھی ضروری ہے کہ یہ نظمیں لازماً بیانیہ انداز کی نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں بکثرت حوالے نثری روایات و اخبار کے پائے جاتے ہیں اور یہ صرف ابن اسحاق کی درج کردہ نظموں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ ابتدائی دور کے تمام مورخوں اور راویوں کے بارے میں علی الاطلاق درست ہے۔ یہ اشعار رزمیہ سے زیادہ غنائی رنگ کے ہوتے ہیں، اور خود راوی کی تصنیف نہیں ہوتے بلکہ یا تو اُن حوادث میں حصہ لینے والا کوئی کردار ان کی تخلیق کرتا ہے کبھی خود ہیرو یا اس کے قبیلے کا اور کوئی فرد ان اشعار کا خالق ہوتا ہے، اور وہ اُس مخصوص حادثے سے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ کبھی یہ اشعار عورتوں کی زبان سے بھی ادا کرائے جاتے ہیں خصوصاً جب کسی کی موت پر ماتم کرنا مقصود ہوتا ہے اور ابن اسحاق شاید پہلا مؤلف ہے جس نے بعض حوادث سے متعلق کثیر منظوم مواد کو متعلقہ فصل کے آخر میں یکجا بھی کر دیا ہے، جب کہ دوسرے مواقع پر وہ بھی قدیم قصہ گویوں کی طرح نثر میں اشعار کا پیوند لگاتا جاتا ہے[۳۷۴]

ابن اسحاق کو اپنے شیوخ سے جو روایات ملیں اُن میں اُس نے اپنی جمع کی ہوئی بہت سی روایتیں اور اقوال شامل کر کے سیرۃ نبوی کو بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اپنی اس پیش کش میں وہ ناموں کی فہرستیں، متعلقہ دستاویزیں اور اشعار بھی شامل کرتا جاتا ہے۔ ان میں بھی کچھ مواد اُسے اپنے استادوں سے پہنچا تھا، اور کچھ اُس نے بطور خود جمع کیا تھا۔ یہ ترتیب و تنظیم بجائے خود ایک بڑا کام ہے چاہے ابن اسحاق سے پہلے کچھ اور لوگوں نے بھی یہ کام کیا ہو، تب بھی اُسے اس لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل رہے گا کہ اُس نے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے مختلف ادوار کو نہ صرف ایک تناسب کے ساتھ اپنی تالیف میں پیش کیا ہے، بلکہ انبیائے سابقین کے حالات شامل کر کے سیرۃ کے موضوع میں وسعت پیدا کر دی اور اُسے تاریخ رسالت بنا دیا۔ یہاں تک اس مواد کی ترتیب کا تعلق ہے، ابن اسحاق نے مختلف انفرادی روایات کو بڑی خوش اسلوبی سے باہم مربوط کیا ہے اور اُن کے آغاز میں ایسی مختصر عبارتیں خود درج کر دی ہیں جن میں اُن روایات کے مطالب کا خلاصہ آجاتا ہے[۳۷۵]۔ دوسرے یہ کہ وہ اکثر مختلف راویوں کی متعدد خبروں کو ملا کر ایک عمومی روایت تیار کر لیتا ہے، ایسا ہی پہلے اُس کے استاد الزہری نے بھی اکثر احوال میں کیا ہے۔

ابن اسحاق کی جمع کردہ روایات کے پایۂ استناد کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ وہ خود بھی اکثر مواقع پر "فیما یزعمون واللہ اعلم" (اور لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے) جیسے معترضہ جملے لکھ کر اپنے شک کا اظہار کر دیتا ہے۔ لیکن ادبی حیثیت سے اس کتاب کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس لحاظ سے اس کی قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ عربی نثر کی ان قدیم ترین کتابوں میں سے ہے جو دستبرد زمانہ سے بچ بچا کر ہم تک پہنچی ہیں۔

"الفہرست" میں ایک "کتاب الخلفا" ابن اسحاق سے اور منسوب ہوئی ہے[۳۷۶] اور الطبری نے اپنی تاریخ میں خلفائے راشدین کے عہد کے حالات بیان کرتے ہوئے ابن اسحاق کو اکثر بطور سند پیش کیا ہے۔ بظاہر اس نے مغازی فراہم کرنے کا خصوصی اہتمام کیا تھا اور پھر انھیں تاریخ وار مرتب کیا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے دوسرے حوادث مثلاً: حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت،

کے بارے میں بھی ابن اسحاق نے مواد جمع کیا تھا۔ اس سے ایسے اخبار بھی روایت کیے گئے ہیں جو عہدِ اُموی کے متفرق حوادث سے علاقہ رکھتے ہیں، لیکن جو اقتباسات محفوظ رہ گئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ اُن کی مدد سے ہم ابنِ اسحاق کی "کتاب الخلفا" کا خاکہ دریافت کر لیں یا اُس کے موضوع کی نوعیت سمجھ سکیں۔

باب (۴)

۴۔ ابنِ اسحٰق کے بعد

۱۔ ابو معشر السندی

اب ہمیں ابنِ اسحٰق کے ایک نوجوان معاصر کا تذکرہ کرنا ہے، جس کے مغازی کے اقتباسات ہمارے لیے واقدی اور ابنِ سعد وغیرہ نے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ ابو معشر ہے، جسے عام طور پر السندی کہا جاتا ہے۔ اس لقب سے ظاہر ہے کہ یہ خود یا اس کے اجداد میں سے کوئی ترکِ وطن کرکے سندھ سے عرب پہنچا تھا۔ اگر ابو نعیم[۳۷۷] کا قول درست ہے، جس میں وہ اپنا ماخذ ظاہر کئے بغیر کہتا ہے کہ:

"اِنّ اَبا مَعشرٍ سِندیٌّ، وکانَ اَلکَنَ یَقُول: حَدَّثَنَا مُحمّدُ بنُ قَعبٍ یُرِیدُ کَعبَ"

ابو معشر سندھ کے رہنے والے تھے۔ اُن کی زبان میں ہکلاہٹ تھی، یوں کہا کرتے تھے کہ ہم سے محمد بن قعب نے بیان کیا اور کعب مراد لیتے تھے۔

تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُن کے والدین عربی الاصل نہیں تھے۔ مگر "السندی" کے لقب کا اطلاق اُس عرب پر بھی ہو سکتا ہے جو سندھ میں بس گیا ہو، کیونکہ ۹۲ھ سے سندھ بھی عرب خلافت کا ایک صوبہ تھا۔ ابو معشر کے پوتے داؤد بن محمد بیان کرتے ہیں کہ[۳۷۸] اُن کے دادا یمن کے باشندے تھے۔ اس سے ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ ابو معشر کے والد نے سندھ سے یمن کو ہجرت کی ہوگی یہی پوتا خاص طور سے بیان کرتا ہے کہ ابو معشر کا رنگ گورا[۳۷۹] تھا، درآں حالیکہ ابو مسہر نے اُن کا رنگ کالا بتایا ہے۔[۳۸۰] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ابو معشر اپنا شجرہ ماں کی طرف سے حنظلہ بن مالک کے خاندان سے ملاتے تھے۔ اُن کا اصلی نام عبد الرحمٰن بن الولید تھا، جیسا کہ ان کے ایک اور پوتے الحسین نے بیان کیا ہے۔[۳۸۱] جب انھیں "سرقہ" کرکے مدینہ کے بازار میں غلام کی حیثیت سے بیچا گیا تو اُن کے آقاؤں نے، جو قبیلہ بنی اسد کے لوگ تھے، ان کا نام 'نجیح' رکھا تھا۔[۳۸۲] یہاں جو "سرقہ" کہا گیا ہے یہی بات اُن کے مذکورۂ بالا پوتے داؤد کے ایک اور بیان میں ہے[۳۸۳] اور اس سے شاید اُن کی "گرفتاری" مراد ہے۔ یہ یمامہ اور بحرین میں یزید بن المہلب سے جنگ کے دوران پکڑے گئے تھے۔ پھر یہ غلام ہی کی حیثیت سے اُمّ موسیٰ بنت منصور الحمیریہ کے ہاتھ لگے جو خلیفہ المنصور کی بیوی اور خلیفہ المہدی کی ماں تھی۔[۳۸۴] اس نئی مالکہ نے ان کو آزاد کیا۔[۳۸۵] دوسرے مصادر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی دوسری عورت سے اپنی آزادی (بذریعہ مکاتبت۔ جس میں مقررہ رقم بالاقساط ادا کی جاتی ہے۔) خریدنی شروع کی تھی کہ اس اثنا میں انھیں اُمّ موسیٰ نے خرید لیا، اور آزاد کر دیا۔[۳۸۶] پھر انہوں نے عباسیوں سے نسبتِ ولایت قائم کر لی۔ چنانچہ یہ

بنو حنظلہ سے اپنی نسبت پر اتنا ناز نہیں کرتے تھے جتنا حکمراں خاندان سے اس تعلق پر فخر کرتے تھے[۳۸۷]۔ جب خلیفہ المہدی حج کرنے کے لیے مدینے[۳۸۸] آیا، تو ابو معشر کو اپنے ساتھ بغداد لیتا گیا، جیسا کہ ہمیں خود ابو معشر نے بتایا ہے[۳۸۹]۔ وہاں انھیں خلیفہ نے ایک ہزار دینار دیے اور حکم دیا کہ یہیں دربار میں رہو اور درباریوں کو فقہ کی تعلیم دیا کرو۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں یہ بہت کچھ بدل گئے تھے اور ان کی عقل ماؤف ہوگئی تھی[۳۹۰]۔ یہ ۱۷۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے[۳۹۱]، وہاں کے بڑے قبرستان میں دفن کیے گئے اور ہارون الرشید نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی[۳۹۲]۔

محدث کی حیثیت سے ابو معشر کی شہرت کو بعض لوگوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ البخاری کہتے ہیں[۳۹۳]: "ان کی حدیثوں سے اختلاف کیا جاتا ہے۔" اور ابنِ سعد کا قول ہے کہ ان کی احادیث تو بہت ہیں مگر ضعیف ہیں[۳۹۴]۔ ابنِ حجر نے بہت سی رائیں نقل کی ہیں[۳۹۵] جو سب ان کے خلاف جاتی ہیں۔ مگر مغازی کی روایات میں انھیں سند سمجھا گیا ہے۔ احمد بن حنبل انھیں "بصیر فی المغازی" (مغازی میں بصیرت رکھنے والا) کہتے ہیں اور الخاطی کا خیال[۳۹۷] ہے کہ "ابو معشر کا علم میں اور تاریخ میں ایک مقام ہے۔ ائمہ نے ان کی تاریخ سے استناد کیا ہے، مگر انھیں حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔"

"الفہرست"[۳۹۸] سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو معشر نے ایک "کتاب المغازی" بھی لکھی تھی اور اس کتاب کے متعدد اقتباسات الواقدی کی "کتاب المغازی" میں پائے جاتے ہیں کسی فصل کے شروع میں، جب وہ تمام رُواۃ کے نام گنا تا ہے، تو وہاں خاص طور پر ان کا حوالہ بھی دیتا[۳۹۹] ہے۔ ابنِ سعد کے یہاں سیرۃ کے اقتباسات دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابو معشر نے اپنے مغازی میں رسول اللہؐ کی مکمل حیاتِ مبارکہ سے متعلق روایات فراہم کی تھیں۔ ابن سعد اپنے مغازی کے شیوخ کی فہرست میں بھی ان کا نام دیتا ہے اور ان کے حوالے سے تراجم صحابہ بھی بیان کرتا ہے[۴۰۰]۔ رسول اللہؐ کی ابتدائی زندگی کے واقعات میں بھی ابنِ سعد اور الطبری دونوں کے یہاں[۴۰۱] ابو معشر کا نام ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'مغازی' کے علاوہ ابو معشر نے صدر اسلام کے حوادث کی ایک تجزیاتی "تاریخ" بھی سنہ وار لکھی تھی۔ یہ ۱۷۰ھ تک کے وقائع تھے۔ آخری واقعہ جو اُن کی کتاب سے الطبری نے اخذ کیا ہے، وہ خلیفہ الہادی کی وفات ہے، جو ۱۷۰ھ کے موسم بہار میں ہوئی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد خود ابو معشر بھی مر گئے۔ مغازی میں وہ لازماً نہیں تو اکثر اپنی سند بیان کرتے ہیں۔ مگر تاریخ میں انہوں نے کوئی اِسناد نہیں دیا۔ اُموی خلیفہ عبدالملک سے متعلق مندرجۂ ذیل بیان جو ابنِ سعد کے یہاں ملتا ہے، وقائعِ تاریخی کے سلسلے میں ابو معشر کے طریقِ کار کی شاید مناسب مثال ہے[۴۰۲]:

"عبدالملک بن مروان دمشق میں جمعرات کے دن، ۱۵ شوال ۸۶ھ کو مرا۔ اس وقت وہ ساٹھ سال کا تھا۔ جس دن سے اُس کی بیعت لی گئی، اُس دن سے وفات تک، اُس کی مدتِ حکومت اکیس سال اور ڈیڑھ مہینہ رہی۔ اس میں سے نو سال عبداللہ بن الزبیر سے جنگ کرنے میں صرف ہوئے۔ پھر شام کی خلافت اُس پر مسلّم ہوگئی، اور مصعب کی شہادت کے بعد وہ عراق کا بھی تنہا مالک ہوگیا۔ عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے بعد، اور لوگوں کے اُس پر متفق ہونے کی حالت میں وہ تیرہ سال اور چار ماہ خلیفہ رہا، اس میں سات راتیں کم رہ گئیں۔ (یعنی ۱۳ سال ۳ ماہ اور ۲۳ یوم) یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ ۶۵ سال کی عمر میں مرا۔ مگر پہلا قول ثابت

ہے اور یہی صورت تاریخ ولادت کے معاملے میں ہے۔"

۲۔ الواقدی

ابو معشر کی طرح محمد بن عمر الواقدی کا تعلق بھی مدینے کے موالی طبقے سے ہے۔ اُن کے دادا کا نام واقد تھا اس لیے انھیں واقدی کہا جاتا ہے اور مدینے کے قبیلے بنی اسلم کے فرد عبداللہ بن ابی بریدہ سے اُن کی نسبتِ ولایت تھی، اس لیے الاسلمی بھی کہلاتے ہیں۔[۴۰۳] اپنے شاگرد ابن سعد کی روایت کے مطابق الواقدی ۱۳۰ھ[۴۰۴] مدینے میں پیدا ہوئے۔ یہ مروان ثانی کی خلافت کا زمانہ تھا۔ ان کی ماں سائب خاثر کی پرپوتی تھیں۔[۴۰۵] یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے مدینے میں شاعری کی تھی[۴۰۶] اور اس کے باپ جنگی قیدی بنا کر ایران سے لائے گئے تھے، اس لحاظ سے الواقدی کی رگوں میں کچھ عجمی خون بھی گردش کر رہا تھا۔ اپنے وطن مدینہ میں الواقدی نے مشہور محدثوں سے احادیثِ نبوی کی سماعت کی تھی اور جب خلیفہ ہارون الرشید مدینے کی زیارت کے لیے آیا ہے ــ یہ غالباً ۱۷۰ھ کا واقعہ ہے[۴۰۷] ـــ تو مدینے کے مقاماتِ مقدسہ کی رہ نمائی کے لیے الواقدی ہی کا نام تجویز ہوا تھا۔ اس بارے میں خود الواقدی کا تفصیلی بیان موجود ہے جو ہمارے لیے ابن سعد[۴۰۸] نے محفوظ کر دیا ہے:

"جب امیر المومنین ہارون الرشید نے حج کیا تو وہ مدینے بھی آئے اور انھوں نے یحییٰ بن خالد سے کہا کہ میرے لیے کوئی ایسا شخص تلاش کرو جو مدینے سے اور یہاں کے قابلِ دید مقامات سے واقفیت رکھتا ہو اور یہ بتا سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام کس طرح آتے تھے اور وہ کس طرف سے آتے تھے؟ نیز شہیدوں کے مزارات کی نشاندہی کر سکے۔ یحییٰ بن خالد نے پوچھ تاچھ کی تو ہر ایک نے میرا ہی نام لیا، چنانچہ اس نے مجھے بلوایا۔ میں گیا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ بولا: "شیخ صاحب! امیر المومنین، خدا ان کا اقبال رکھے، یہ چاہتے ہیں کہ تم عشاء کی نماز یہیں پڑھو، پھر ہمارے ساتھ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے چلو۔ ان کے بارے میں ہمیں ضروری باتیں بتاؤ، اور وہ جگہ دکھاؤ جہاں جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے اور تم ہمارے ساتھ ساتھ رہو۔ جب میں عشا کی نماز سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ شمعیں روشن ہو چکی تھیں۔ میں دو آدمیوں کے پاس آیا جو دو خچروں پر سوار تھے۔ یحییٰ نے پوچھا: "وہ شخص کہاں ہے؟" میں نے کہا: "حاضر ہوں جناب!" پھر انھیں ساتھ لے کر مسجد سے متصل گھروں تک آیا اور بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنی سواریوں سے اُتر پڑے اور وہ دو رکعتیں پڑھیں، پھر دیر تک خدا سے دُعا مانگتے رہے، پھر سوار ہو گئے اور میں آگے آگے چل رہا تھا۔ میں نے کوئی قابلِ زیارت جگہ نہیں چھوڑی جہاں انھیں لے کر نہ گیا ہوں، ہر مقام پر وہ نماز پڑھتے تھے اور گڑگڑا کر دعا مانگتے تھے اسی طرح گھوم پھر کر ہم مسجد نبوی میں واپس آ گئے، پو پھٹ چکی تھی اور موذن اذان دے رہا تھا۔ جب وہ شاہی فرودگاہ پر گئے تو مجھ سے یحییٰ نے کہا: "شیخ صاحب ابھی چھوڑو نہیں، میں نے صبح کی نماز وہیں مسجد میں ادا کی۔ اب وہ مکہ کو روانہ ہونے والے تھے۔ دن نکلنے پر یحییٰ بن خالد نے مجھے اپنی مجلس میں باریاب کیا۔ اس نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھایا اور کہنے لگا: امیر المومنین، خدا اُن کا اقبال رکھے، اب تک برابر رو رہے ہیں تم نے انھیں جن مقامات کی زیارت کرائی، اُن سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمھارے لیے دس ہزار درہم کا حکم دیا ہے' یہ کہہ کر اُس نے ایک مُنہ بند تھیلی میرے

آگے ڈال دی اور کہنے لگا: "لو شیخ صاحب، خدا تمھیں مبارک کرے۔ ہم تو آج روانہ ہو رہے ہیں، اگر ہم جہاں کہیں بھی ٹھہرے ہوئے ہوں، تمھیں ہم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، ان شاء اللہ۔ چنانچہ امیرالمومنین چلے گئے۔ میں اپنے گھر آیا اور وہ مال میرے ساتھ تھا، اس سے میں نے جتنا قرضہ تھا وہ ادا کیا، ایک لڑکے کی شادی کی اور چین سے بسر ہونے لگی۔"

دربارِ خلافت سے اپنے ان تعلقات کا الواقدی نے ۱۸۰ھ میں فائدہ اُٹھایا[۴۰۹]۔ اس زمانے میں اس کا حال پتلا تھا، وہ سیدھا بغداد پہنچا اور وہاں سے رقہ آیا جہاں ان دنوں خلیفہ ہارون الرشید ٹھہرا ہوا تھا[۴۱۰]۔ اس سفر کا حال بھی ابن سعد نے خود الواقدی کی روایت سے بیان کیا ہے[۴۱۱]:

"پھر ہمیں زمانے نے ستایا تو اُمّ عبداللہ (واقدی کی بیوی۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی) نے کہا یہاں کیوں پڑے ہو، تمھیں تو امیرالمومنین کے وزیر جانتے ہیں اور انھوں نے تم سے کہا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں، تم ان سے آکر مل سکتے ہو۔ چنانچہ میں مدینے سے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ عراق میں ملیں گے۔ عراق آیا، اور امیرالمومنین کے بارے میں پوچھا، تو معلوم ہوا کہ وہ رقہ میں ہیں۔ میں نے مدینے کو واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر پھر خیال آیا کہ وہاں تو میری حالت بہت سقیم ہے، اس لیے رقہ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نخاس پہنچا تاکہ سواری کرایہ پر لوں، وہاں کچھ نوجوان سپاہی مل گئے، جو رقہ ہی جا رہے تھے، انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے: "شیخ صاحب کہاں جاؤ گے؟" میں نے اپنا آتا پتا بتایا اور کہا کہ مجھے رقہ جانا ہے۔ پھر ہم نے ساربانوں کے کرایہ پر غور کیا تو وہ ہماری برداشت سے باہر تھا۔ تب انہوں نے کہا: "بڑے میاں، کیا تم کشتی میں سفر کر سکتے ہو؟ کیونکہ وہ سستی رہے گی اور سفر بھی اچھا گذرے گا۔" میں نے کہا میں یہ سب باتیں نہیں جانتا تم ہی فیصلہ کر لو۔ چنانچہ ہم کشتیوں کی طرف گئے اور ان کا کرایہ چکایا۔ میں نے اُن لوگوں سے زیادہ نیک، رحمدل اور محتاط لوگ کم ہی دیکھے ہیں، وہ میری اس طرح خدمت کرتے تھے اور میرے لیے کھانے کا انتظام کرتے تھے، جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کے لیے کرتا ہے۔ آخر ہم رقہ کے گھاٹ پر اُترے۔ یہ گھاٹ بہت خراب تھا انھوں نے اپنے کپتان کو اپنی تعداد لکھ کر دے دی تھی اور مجھے بھی اس فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ ہم کچھ دن وہیں پڑے رہے، پھر ہم سب کے پرمٹ آ گئے جن میں ہر ایک کا نام درج تھا۔ اب ہم سب لوگ گھاٹ پر اُترے اور میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ایک سرائے میں ٹھہر گیا، یہاں چند روز رہا۔ پھر میں نے یحییٰ بن خالد تک باریابی کی کوشش کی، مگر یہ کام کٹھن معلوم ہوا تو میں ابوالبختری کے پاس آیا، یعنی وہب ابنِ وہب کے پاس جو اُن دنوں قاضی تھے۔ وہ مجھے جانتے تھے، میں اُن سے ملا تو کہنے لگے: "ابو عبداللہ تم نے غلطی کی اور دھوکا کھا گئے۔ خیر میں تمھارا تذکرہ کر دیکھوں گا۔ اب میں صبح شام اُن کے دروازے کے چکر لگانے لگا، یہاں تک کہ جو کچھ میری گرہ میں تھا سب خرچ ہو گیا اور مجھے اپنے ساتھیوں سے شرم آنے لگی، کپڑے سب پھٹ گئے، اور آخر کار میں ابوالبختری کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ میں نے ساتھیوں سے تو کچھ کہا نہیں، چپکے سے مدینے کا رستہ لیا، کبھی کشتی میں سوار ہوتا تھا کبھی پیدل چلتا تھا۔ اسی طرح سلیحین تک آ گیا۔ ایک دن وہاں کے بازار میں سرگشت کر رہا تھا کہ ایک قافلہ مل گیا، جو بغداد سے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ مدینے والے ہیں اور امیرِ قافلہ بکار الزبیری ہیں، جنھیں امیرالمومنین نے مدینے کا قاضی بنانے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ زبیری سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ ذرا سستا لیں، تب ان سے جا کر ملوں گا۔ جب انہوں نے کچھ دیر آرام

کر لیا تو میں جا پہنچا۔ وہ ناشتا کر چکا تھا۔ میں نے ملنے کی اجازت طلب کی، اس نے بلا لیا۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ اس نے پوچھا، "ابو عبداللہ وطن سے غیر حاضری کے اس زمانے میں کیا کرتے رہے؟" اب میں نے ساری کتھا سنائی اور ابو البختری کا معاملہ بھی بتایا، وہ کہنے لگا، "تم ابو البختری کو جانتے نہیں، وہ نہ کسی سے تمھاری تعریف کرے گا، نہ کسی کے سامنے تمھارا تذکرہ کرنا گوارا کرے گا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: "اب تو یہی ٹھانی ہے کہ مدینے واپس چلا جاؤں۔" بولا "یہ بھی غلط ہے۔ مدینے سے تم جن حالات میں نکلے ہو، وہ تمھیں معلوم ہی ہیں، مناسب اقدام یہ ہوگا کہ تم میرے ساتھ چلو، میں یحییٰ سے تمہارا تذکرہ کر دوں گا۔"

میں اُس قافلے کے ساتھ سوار ہو کر پھر رقہ آ گیا، جب ہم نے گھاٹ کو پار کر لیا، تو اُس نے پوچھا: "کیا میرے ساتھ ہی ٹھہرو گے؟" میں نے کہا: "نہیں میں اپنے دوستوں میں جا کر ٹھہروں گا اور تم سے تڑکے ہی آ کر ملوں گا، تاکہ ہم اکٹھے یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی تک چلیں، انشاءاللہ۔"

اب میں اپنے دوستوں میں پہنچا تو وہ بھونچکے رہ گئے، جیسے میں آسمان سے ٹپک پڑا ہوں۔ پھر کہنے لگے: "ابو عبداللہ کیا حال ہے؟ ہمیں تو تمھاری بہت فکر تھی۔" میں نے سارا ماجرا سنایا۔ سب لوگوں نے کہا کہ "ہاں زبیری کا پیچھا مت چھوڑنا، کھانے پانی کی تم فکر مت کرو، یہاں موجود ہے۔"

تڑکے ہی میں الزبیری کے دروازے پر جا پہنچا، مجھے بتایا گیا کہ وہ یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر گئے ہیں، تو میں بھی وہیں پہنچا۔ باہر انتظار میں کھڑا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ برآمد ہوا، اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا: "ارے ابو عبداللہ، میں تمھارا تذکرہ کرنا تو بھول ہی گیا، خیر، تم یہیں ڈیوڑھی پر ہی ٹھہرو، میں ابھی آیا۔" تھوڑی دیر کے بعد دربان میرے پاس آیا، اور کہنے لگا: "اندر آ جاؤ" میں بہت پھٹی ٹوٹی حالت میں اندر داخل ہوا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور اس کے ختم ہونے میں تین یا چار روزے اور رہ گئے تھے، جب مجھے یحییٰ نے ان حالوں میں دیکھا تو اس کے چہرے پر غم کے تاثرات اُبھر آئے۔ اُس نے سلام کا جواب دیا اور اپنے نزدیک ہی بٹھا لیا۔ اس کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے ایک کے بعد ایک بات کرتا رہا، اور میں جواب سے کتراتا رہا، جب بولتا تھا تو بے تکی اور بے موقع بات کہتا تھا اور لوگ صحیح جواب دیتے تھے، تو چپ رہ جاتا تھا۔

جب مجلس برخاست ہوئی، سب لوگ نکلے، میں بھی چلا۔ اتنے میں یحییٰ بن خالد کا نوکر آیا اور مجھے باہر پردے کے پاس ملا۔ کہنے لگا کہ "وزیر نے یہ حکم دیا ہے کہ تم رات کا کھانا اُن کے ساتھ ہی کھاؤ۔" میں نے واپس آ کر سارا معاملہ اپنے ساتھیوں کو بتایا اور یہ بھی کہا کہ ڈر یہ ہے کہ اُس نوکر نے کسی اور کے دھوکے میں مجھے مدعو نہ کر لیا ہو، کچھ ساتھی کہنے لگے "تو کیا ہے؟ یہ دو روٹیاں اور تھوڑا پنیر موجود ہے اور یہ سواری ہے، تم سوار ہو کر چلو، غلام پیچھے رہے گا، اگر دربان نے تمھیں باریابی دے دی تب تو یہ توشہ تم غلام کو دے دینا اور اگر باریابی نہ ملے تو کسی مسجد کا رُخ کرنا، وہاں بیٹھ کر کھا لینا اور مسجد سے پانی لے کر پی لینا۔

میں گھر سے نکلا، اور یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا۔ لوگ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، جب دربان نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا: "شیخ صاحب کہاں رہ گئے تھے؟ آپ کی تلاش میں کئی بار ہرکارہ دوڑ چکا ہے۔" میں نے اپنی پوٹلیا تو غلام کو تھمائی اور اُس سے انتظار کرنے کو کہہ کر خود اندر داخل ہوا، تو دیکھا کہ سب لوگ جمع ہیں۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اب وضو کے

لیے پانی لایا گیا ہم نے وضو کیا اور میں سب لوگوں کے مقابلے میں وزیر سے قریب بیٹھا تھا۔ اب روزہ افطار کیا۔ تھوڑی دیر میں عشا کا وقت ہو گیا تو ہم نے یحییٰ کے پیچھے نماز پڑھی، پھر اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ اب یحییٰ نے سوالات کرنے شروع کیے اور میں خاموش رہا، دوسرے لوگ جواب دیتے رہے، مگر وہ جوابات میری رائے کے خلاف تھے۔

جب رات ڈھلنے لگی، تو سب لوگ اُٹھے۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ اب مجھے ایک غلام ملا۔ اور بولا کہ "وزیر کا حکم ہے کہ تم کل پھر آؤ، مگر آج جس وقت آئے تھے اس سے ذرا پہلے"۔ اس نے مجھے ایک تھیلی تھما دی، یہ تو پتا نہیں چلا کہ اس میں کیا تھا، پر میں خوشی سے پھول گیا۔ اب میں اپنے غلام کی طرف چلا اور سوار ہوا۔ وہ حاجب میرے ساتھ تھا۔ میں لپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور اُن سے کہا: "ذرا چراغ منگاؤ"۔ اب تھیلی کھول کر دیکھا تو اس میں دینار تھے۔ وہ لوگ کہنے لگے "کیا دیا"۔ میں نے کہا کہ غلام یہ کہہ گیا ہے کہ کل پھر بلایا ہے، اور اس وقت سے ذرا پہلے جب آج گیا تھا۔ دینار گنے تو پانسو تھے۔ کسی نے کہا: "تمھارے لیے ساری خریدنا میرا کام رہا"۔ کوئی بولا: "زین لگام اور دوسری ضروریات میں خرید لاؤں گا"۔ تیسرا بولا: "تمھیں حمام کرانا، داڑھی کو خضاب لگانا اور خوشبو میں بسانا میری ڈیوٹی ہوگی"۔ ایک کہنے لگا: "کپڑے میں خرید کر لاؤں گا۔ دیکھو لوگ کیسے بڑھیا لباس میں رہتے ہیں"۔ میں نے سو دینار گن کر اس شخص کو دیے جس کے پاس خرچ کا حساب کتاب رہتا تھا۔ اور سب لوگ قسم کھا کر کہنے لگے کہ ہم تمھارے مال میں ایک دینار یا درہم کی بھی گڑبڑ نہیں کریں گے۔

صبح کو سب نکلے، اور جس نے میرے لیے جو سامان لانے کا ذمہ لیا تھا وہ اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ ظہر کی نماز پڑھتے وقت تک میں اچھا خاصا مردِ معقول نظر آنے لگا۔ باقی رقم لے کر میں زبیری کے پاس پہنچا۔ اُس نے مجھے ذرا ٹھاٹ میں دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ میں نے سارا ماجرا سنایا۔ پھر بولا: "میں مدینے جا رہا ہوں، کچھ کہنا سننا ہے؟" میں نے کہا: "ہاں میں نے بیوی بچوں کو جس حال میں چھوڑا تھا، وہ تمھیں معلوم ہی ہے"۔ اُسے دو سو دینار دیے کہ اُن کو پہنچا دے۔ پھر وہاں سے نکلا اور بچی کھچی رقم لے کر اپنے ساتھیوں میں آیا۔

اب میں نے عصر کی نماز پڑھی اور خوب بن سنور کر یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا۔ دربان نے مجھے دیکھا تو کھڑا ہو گیا، اور اندر جانے کی اجازت دی۔ میں یحییٰ کے سامنے آیا اور اس نے میرے ٹھاٹ دیکھے تو اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کی مجلس میں بیٹھا اور اس سے اب باتیں کرنی شروع کیں اور پہلے اُس نے جو باتیں پوچھی تھیں ان کے جو جوابات تھے، سب دیے، یہ سب باتیں دوسرے لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں سے مختلف تھیں میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ لوگوں کی بھویں چڑھی ہوئی ہیں یحییٰ ادھر ادھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ میں ہر بات کا جواب دیتا رہا، اور سب مُہر بلب بیٹھے رہے، کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

مغرب کا وقت ہوا تو یحییٰ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی پھر کھانا لایا گیا ہم سب نے مل کر کھایا پھر یحییٰ نے عشا کی نماز پڑھائی۔ اب سب اپنی اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ گئے اور باتیں شروع ہوئیں۔

اب یحییٰ لوگوں سے کوئی سوال کرتا تھا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتے تھے۔ جب اُٹھنے کا وقت آیا تو سب کے ساتھ میں بھی چلا آیا۔ دیکھا تو پھر ہرکارہ میرے پیچھے ہے۔ کہنے لگا کہ وزیر کا حکم یہ ہے کہ تم روزانہ شام کو اسی وقت آیا کرو جیسے آج آئے تھے، یہ کہہ کر ایک تھیلی پکڑا دی۔ میں گھر آیا اور دربان کا ہرکارہ مجھے گھر تک چھوڑ گیا۔ اپنے ساتھیوں میں آکر میں نے چراغ بیچ میں رکھا، اور وہ تھیلی اپنے

ساتھیوں کی طرف لڑھکا دی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ باغ باغ ہو گئے۔

اگلا دن آیا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے قریب ہی کہیں میرے لیے ایک مکان تلاش کر دو اور ایک باندی خرید دو، ایک غلام روٹی پکانے والا ہونا چاہیے اور گھر کا سارا دھندا جمع کر دو۔ ظہر سے پہلے پہلے انہوں نے یہ سب چیزیں بھی فراہم کر لیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آج روزہ میرے ساتھ ہی افطار کرو، اس پر وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔

میں مقررہ وقت پر روزانہ یحییٰ بن خالد کے دربار میں جاتا رہا، ہر بار مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھتا تھا اور ہر رات کو مجھے پانسو دینار دیتا تھا۔ اب عید کی چاند رات آ گئی۔ اس نے کہا: "ابو عبداللہ، کل امیر المومنین سے ملنے کے لئے بہترین لباس قاضیوں کا سا پہن کر آنا اور اُن کے سامنے بیٹھ جانا، وہ لازماً پوچھیں گے یہ کون ہے، تو میں تمھارا تعارف کرا دوں گا۔ عید کی صبح کو میں بڑے طمطراق سے نکلا اور بھی ہزاروں انسان تھے۔ امیر المومنین بھی عید گاہ کی طرف تشریف لائے، وہ بار بار میری طرف دیکھتے تھے۔ میں برابر اُن کے مصاحبوں میں ڈٹا رہا۔ واپس آکر میں یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور امیر المومنین کے محل میں تشریف لے جانے کے بعد یحییٰ سے ملاقات کی، وہ کہنے لگا: "ابو عبداللہ، تمھارے بارے میں امیر المومنین برابر مجھ سے پوچھتے رہے، میں نے انھیں حج کا قصہ یاد دلایا اور بتایا کہ تم وہی شخص ہو جس نے ہمیں اُس رات کو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرائی تھی۔ انھوں نے تمھارے لیے تیس ہزار درہم کا عطیہ مرحمت فرمایا جو میں تمھیں ان شاء اللہ کل ادا کر دوں گا۔"

آج پھر میں واپس آ گیا اور اگلے دن پھر یحییٰ بن خالد سے ملا، اور اس سے کہا کہ خدا وزیر کی ہر دلی مراد پوری کرے ـــ میری ایک حاجت اور ہے جو وزیر سے، خدا انھیں اقبال مند رکھے، مانگنی ہے۔ کہنے لگا: "وہ کیا ہے؟" میں نے کہا گھر جانے کی اجازت چاہتا ہوں، کیونکہ بیوی بچوں سے ملنے کا اشتیاق حد سے سوا ہو گیا ہے۔ کہنے لگا ابھی مت جاؤ۔ مگر میں برابر اُس سے اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ اُس نے اجازت دے ہی دی۔ پھر مجھے تیس ہزار درہم ادا کرائے۔ میرے لیے ایک کشتی مع تمام لوازم کے تیار کیے جانے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ میرے لیے شام کی نادر چیزیں خرید کر ساتھ کر دی جائیں "تاکہ مدینے کو بطورِ سوغات لے جا سکوں۔ نیز اپنے عراقی وکیل کو حکم دیا کہ میرے لیے مدینے تک کی سواری کا انتظام کرے، اور مجھے ایک دھیلا اس مد میں خرچ کرنا نہ پڑے۔ میں اپنے ساتھیوں میں آیا تو یہ سب قصہ انھیں سنایا۔ میں نے اُن لوگوں کو قسم دلا کر کہا کہ مجھ پر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا وہ سب مجھ سے لے لیں مگر وہ قسم کھانے لگے کہ ہرگز ایک درہم بھی نہیں لیں گے۔ خدا کی قسم میں نے ایسے اخلاق والے لوگ کم ہی دیکھے ہیں۔ اب بتاؤ کہ اگر میں یحییٰ بن خالد سے محبت رکھتا ہوں تو کیا یہ بات قابلِ ملامت ہے؟")

یہ آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ الواقدی نے یہ واقعہ یحییٰ برمکی کے زوال (۱۸۷ھ) کے بعد بیان کیا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے تو اُسے یحییٰ سے محبت ظاہر کرنے پر ملامت کا خوف ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ایک اور موقع پر بھی اس نے یحییٰ کی داد و دہش کا بہت اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

یحییٰ دوسروں کی امداد کرنے میں کتنا فراخ حوصلہ تھا، اس کی ایک اور مثال الواقدی کے شاگرد ابنِ سعد کے یہاں ملتی ہے[۴۱۲] جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں، اس مثال سے اُس دَور کی گھریلو زندگی اور سماجی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

" مجھ سے عبیداللہ بن عبیداللہ نے بیان کیا:" میں الواقدی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ یحییٰ بن خالد کا ذکر چھڑ گیا۔ الواقدی نے اُس کے لیے دعائے مغفرت کی اور دیر تک رحمت کی دعا کرتا رہا تو ہم نے اُس سے کہا کہ ابو عبداللہ تم اس کے لیے اس قدر دعائے رحمت کر رہے ہو، کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ ایسے شخص کے لیے بھلا کیوں نہ دُعائے مغفرت کروں جس کا ایک واقعہ تمھیں ابھی سناتا ہوں۔ شعبان کا مہینا ختم ہوتے میں دس دن سے بھی کم رہ گئے تھے اور گھر میں نہ آٹا تھا، نہ ستو تھے، نہ کوئی اور ساز و سامان تھا۔ میں نے اپنے دل میں تین دوستوں کو چھانٹا اور سوچا کہ اُن سے اپنی ضرورت بیان کروں۔ میں اپنی بیوی امّ عبداللہ کے پاس آیا تو وہ کہنے لگی:" ابو عبداللہ، تمھیں آخر ہو کیا گیا ہے؟ یہ وقت آ گیا اور گھر میں کھانے پینے کی کوئی شے موجود نہیں ہے اور رمضان سر پر کھڑا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے تین دوستوں کے نام سوچ رکھے ہیں، اُن سے اپنی حاجت بیان کروں گا۔ اُس نے پوچھا کہ وہ عراقی ہیں یا مدنی؟ میں نے بتایا کہ اُن میں سے کوئی عراقی ہے اور کوئی مدنی ہے۔ بولی میں بھی تو سنوں کون کون ہیں؟ میں نے نام لیا کہ فلاں۔ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو خاندانی پیسے والا بھی ہے، مگر احسان جتائے گا، میری رائے میں اُس سے سوال کرنا مناسب نہیں"۔ پھر میں نے دوسرا نام لیا تو بولی کہ" یہ بھی اچھے خاندان کا، اور مالدار ہے، مگر کنجوس ہے، میری رائے میں اس کے پاس جانا بھی مناسب نہیں"۔ پھر میں نے کہا: اچھا تو" فلاں"۔ کہا: یہ بھی شریف آدمی ہے، دریا دل بھی ہے، مگر اس کے پلّے کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے اس سے کہنے میں کچھ حرج نہیں۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس سے ملاقات ہوئی، تو بہت خندہ پیشانی سے ملا، اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا، پھر کہنے لگا:" ابو عبداللہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے اُسے بتایا کہ رمضان سر پر ہے اور میرا ہاتھ ان دنوں تنگ ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا: اچھا اس تکیے کی تہ کھولو اور وہ تھیلی نکال لو، جو کچھ اس میں ہے سب جھاڑ لو اور اپنے کام میں لاؤ"۔ میں نے دیکھا تو وہ کھلائے ہوئے درہم تھے۔ خیر وہ تھیلی میں نے اُٹھا لی اور اپنے گھر پہنچا اور اُس شخص کو بلایا جو بازار سے میرا سودا سلف لایا کرتا تھا اور کہا لکھو:" دس قفیز (ایک پیمانہ ہے) ایک قفیز چاول، اتنی ہی شکر وغیرہ، اسی طرح سب ضروریات لکھوا دیں۔

ابھی میں لکھوا ہی رہا تھا کہ دروازہ پر کھٹکا ہوا، میں نے کہا دیکھو تو کون ہے؟ باندی نے آکر بتایا کہ" فلاں بن فلاں بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا:" اندر بلا لو۔ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا، انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ" سیدی کیسے تشریف آوری ہوئی؟" وہ کہنے لگے:" چچا میاں اس لیے گھر سے نکلا ہوں کہ رمضان سر پر آ گئے ہیں اور میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے"۔ میں ذرا دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، پھر اُن سے کہا کہ" اس تکیے کی تہ کھولو، اور تھیلی میں جو کچھ ہے سب لے لو"۔ انہوں نے تھیلی نکال لی، میں نے اپنے ساتھی سے کہا بس تم چلے جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ اب پھر امّ عبداللہ آئیں اور بولیں:" یہ نوجوان جو آیا تھا اس کے لیے تم نے کیا کیا؟" میں نے کہا:" ساری تھیلی اُس کو دے دی"۔ اُس نے کہا:" بہت اچھا ہوا، خدا نے تمھیں نیکی کی توفیق دی"۔

اب میں نے ایک اور دوست کا خیال کیا جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا تھا اور جوتے پہن کر سیدھا اُس کے گھر پہنچا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی اُس نے اندر بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو اُس نے آداب تسلیمات کے ساتھ اپنے قریب بٹھا لیا اور

پوچھا کہ "ابو عبداللہ کیسے زحمت کی"۔ میں نے اُسے بتایا کہ "رمضان قریب ہے، اور میرے پاس کچھ نہیں ہے"، تو وہ کچھ دیر تک فکر میں ڈوبا رہا، پھر کہنے لگا کہ "اچھا اس تکیے کے نیچے سے تھیلی نکالو، اور آدھی رقم تم لے لو، آدھی میرے لیے چھوڑ دو"۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بالکل میری والی ہی تھیلی ہے میں نے اُس میں سے پانسو درہم نکال لیے اور پانسو چھوڑ دیے، اب اپنے گھر آیا اور اس شخص کو پھر بلوایا جو میرا سودا لایا کرتا تھا اور اُسے لکھوانا شروع کیا: پانچ قفیز آٹا۔۔۔۔ وغیرہ"۔ اس نے سب ضروریات لکھ لیں۔

ابھی ہم اس سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے نوکر سے کہا، "دیکھو کون ہے؟" اس نے واپس آکر بتایا کہ "کوئی شریف لازم معلوم ہوتا ہے"۔ میں نے کہا "اندر بلا لو۔ وہ آیا تو اُس نے یحییٰ بن خالد کا ایک خط دیا، جس میں اُس نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ میں نے قاصد سے کہا تم ذرا باہر چلو۔ پھر میں نے کپڑے بدلے اور اپنی سواری پر گھر سے نکلا۔ وہ خادم میرے ساتھ تھا۔ جب یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر آیا اور اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ صحن میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو میں نے سلام کیا۔ اس نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا، اپنے قریب بٹھایا، اور آواز دی: "ارے لڑکے ان کے لیے تکیہ لاؤ"۔ اب میں اُس کے نزدیک بیٹھ گیا، وہ کہنے لگا: "ابو عبداللہ جانتے ہو۔ میں نے اس وقت کیوں بلایا ہے؟" میں نے کہا: "نہیں"۔ بولا: "مجھے تمھارا خیال کر کے رات بھر نیند نہیں آئی کہ یہ ماہِ مبارک آ رہا ہے اور تمھارے پاس کچھ نہیں ہے"۔ میں نے کہا: "خدا وزیر کو سلامت رکھے، میری داستان تو بڑی طولانی ہے"۔ کہنے لگا: "جتنی زیادہ طویل کہانی ہوگی میں اتنی ہی دلچسپی سے سنوں گا"۔ میں نے اسے اپنی بیوی کی بات سنائی اور اپنے اُن تین دوستوں کا قصہ سنایا اور اُس نے اُن تینوں کے بارے میں جو رائیں ظاہر کی تھیں، وہ بتائیں پھر اُس طالبی (سیدزادہ) کا آنا بتایا اور اُس دوست کا قصہ بھی سنایا۔ جس نے اپنی تھیلی میں سے آدھی رقم میرے حوالے کر دی تھی۔ اب یحییٰ نے نوکر کو آواز دی: "لڑکے دوات لاؤ" اور اپنے خزانچی کو ایک رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں پانسو دینار آ گئے۔ کہنے لگا: "ابو عبداللہ لو اس سے اپنا رمضان کا خرچ چلاؤ"۔ پھر ایک اور چٹھی خزانچی کو لکھی، تو ایک تھیلی آ گئی، جس میں دو سو دینار تھے اور بولا "یہ اُم عبداللہ کے لئے ہیں، اُن کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا صلہ"۔ پھر ایک اور چٹ اٹھائی، اور ایک تھیلی آ گئی، جس میں دو سو دینار تھے، وہ بولا یہ اس سیدزادہ کے لیے ہیں۔ پھر ایک اور رقعہ لکھا اور دو سو دینار کی ایک اور تھیلی آ گئی، بولا یہ تمھارے ساتھ سلوک کرنے والے شخص کا صلہ ہے، پھر کہنے لگا: "ابو عبداللہ اب جاؤ خدا حافظ"۔ میں فوراً سوار ہوا اور پہلے اُس دوست کے پاس آیا جس نے اپنی تھیلی میں سے آدھا مال مجھے دیا تھا اور اُسے میں نے اس کے دو سو دینار ادا کیے اور یحییٰ بن خالد کا معاملہ اُسے بتایا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ پھر میں اُس طالبی کے پاس گیا اور اُس کی تھیلی اُسے دی اور یحییٰ بن خالد کا قصہ سنایا، اُس نے دعائیں دیں اور شکر ادا کیا۔ پھر میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اُم عبداللہ کو بلایا اور اسے تھیلی دکھائی، اس نے بھی دعائیں دیں اور جزائے خیر طلب کی۔ تو اب بتاؤ کہ برامکہ سے خصوصاً یحییٰ بن خالد سے محبت کرتے پر میں ملامت کا مستحق ہوں؟"

المسعودی[413]، یاقوت[414] اور ابن خلکان[415] نے یہی قصہ بعض جزوی اختلافات کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مامون الرشید کے عہد کا واقعہ ہے، مگر ابن سعد کا بیان قدیم ترین ہے اور خود الواقدی سے مروی ہے۔

ایک اور روایت، جس کا راوی مجہول[416] ہے، یہ ہے کہ ہارون الرشید نے الواقدی کو بغداد کے مشرقی حصے کا قاضی بنا دیا تھا۔

دوسری خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۰ھ میں قاضی تھا، یہ ہارون الرشید ہی کا عہد ہوا۔ مگر قدیم ترین تراجم میں اس کا حوالہ نہیں پایا جاتا۔[۴۱۸] بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ المامون نے الواقدی کو المہدی کے لشکر کا قاضی بنا دیا تھا، یہ جگہ رصافہ بھی کہلاتی تھی[۴۱۹] اور یہی بغداد سے جانب شرق واقع تھی۔[۴۱۹] مگر یہ ۲۰۴ھ کے اوائل کی بات ہے،[۴۲۰] جب الواقدی بغداد آیا تھا۔ مامون الرشید الواقدی پر اعتماد کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار الواقدی نے خلیفہ سے درخواست کی کہ اس پر قرض بہت ہو گیا ہے، اسے ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔[۴۲۱] الواقدی اپنی فیاض طبیعت کے باعث اکثر مقروض رہتا تھا۔[۴۲۲] خلیفہ نے درخواست کے حاشیے پر لکھا: "تمہارے اندر دو صفات ہیں، سخا اور حیا۔ سخاوت کے سبب سے تو یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تمہیں ملتا ہے سب اڑا دیتے ہو اور حیا تمہیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ اپنا صرف تھوڑا سا قرضہ ظاہر کرو، اس لیے ہم نے حکم دیا ہے کہ جو تمہارا مطالبہ ہے اس کا دوگنا تمہیں دیا جائے۔ اگر اب بھی ہم تمہاری حاجت کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہوں تو یہ تمہاری اپنی کوتاہی ہے اور اگر اس سے تمہاری ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو آئندہ اور بھی کشادہ دستی سے خرچ کرو، اس لیے کہ اللہ کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور نیکی میں اعانت کے لیے اس کے ہاتھ ہمیشہ وسیع ہیں۔ تمہیں نے ایک بار مجھے یہ حدیث سنائی تھی، جب تم ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الزبیر سے فرمایا تھا کہ اے زبیر رزق کے خزانوں کی کنجیاں عرش کے سامنے پڑی رہتی ہیں اور اللہ سبحانہ بندوں کے رزق ان کے خرچ کے مطابق نازل کرتا رہتا ہے، جو زیادہ خرچ کرتا ہے اس کے رزق میں زیادتی کر دی جاتی ہے جو اپنا خرچ گھٹاتا ہے (کنجوسی کرتا ہے) اس کا رزق بھی گھٹا دیا جاتا ہے۔" الواقدی نے کہا کہ میں اس حدیث کو بھول چکا تھا، اس کے یاد دلانے کی خوشی مجھے خلیفہ کے انعام سے زیادہ ہوئی۔"

الواقدی نے خلیفہ المامون کے عہد میں وفات پائی، خلیفہ کو الواقدی نے اپنی وصیتیں جاری کرنے کے لیے نگراں بھی بنایا تھا۔[۴۲۳] اس کی وفات ۲۰۷ھ کے اواخر میں ۷۸ سال کی عمر میں ہوئی اور خیزران کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔[۴۲۴]

الواقدی اپنے عہد کے تمام علوم حاصل کرنے کا شائق تھا، چنانچہ جتنی کتابیں بھی اسے مل سکیں اس نے سب کی نقل حاصل کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وفات کے وقت اس نے چھ سو پیٹیاں کتابوں سے بھری ہوئی چھوڑی تھیں۔[۴۲۵] یہ ان دو غلاموں کی لکھی ہوئی تھیں جو اس کے لیے دن رات نقل کا کام کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دو ہزار دینار اس نے کتابوں کی خریداری پر صرف کیے تھے۔ یہی کتب خانہ اس کی ان تمام علمی سرگرمیوں کی اساس تھا جو مختلف شعبہ ہائے علوم پر حاوی تھیں۔ الفہرست میں اس کی ۲۸ تصانیف کے نام ملتے ہیں۔[۴۲۶] اسی طرح یاقوت نے معجم الادباء میں ایک فہرست درج کی ہے جو بنیادی باتوں میں ابن ندیم کے بیان سے مختلف نہیں ہے۔[۴۲۷] یہاں وہ فہرست درج کی جاتی ہے:

(الف) کتب فقہ و علوم قرآنی و حدیث وغیرہ .....

۱۔ کتاب الاختلاف — اس کتاب میں کوفی اور مدنی فقہا کے اختلافات بیان ہوئے ہیں جو شفعہ، صدقہ، حج وغیرہ فقہی مسائل سے متعلق ہیں۔[۴۲۸]

۲۔ کتاب غلط الحدیث

۳۔ کتاب السنة والجماعة وذمّ الھویٰ[۴۲۹]
۴۔ کتاب الذکر القرآن
۵۔ کتاب الأدب
۶۔ کتاب الترغیب فی عِلمُ القرآن[۴۳۰]

(ب) کتب تاریخی

۷۔ التاریخ الکبیر
۸۔ التاریخ والمغازی والبعث
۹۔ اخبار مکّة
۱۰۔ ازواج النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم
۱۱۔ وفاة النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم
۱۲۔ السّقیفة وبیعة أبی بکر
۱۳۔ سیرة ابی بکر ووفاتہ
۱۴۔ الردّة والدّار
۱۵۔ السّیرة
۱۶۔ أمر الحبشة والفیل
۱۷۔ حرب الأوس والخزرج
۱۸۔ المناکح[۴۳۱]
۱۹۔ یوم الجمل
۲۰۔ صفّین
۲۱۔ مولد الحسن والحسین
۲۲۔ مقتل الحُسین[۴۳۲]
۲۳۔ فتوح الشّام
۲۴۔ فتوح العراق
۲۵۔ ضرب الدّنانیر والدّراھم
۲۶۔ صراعی قریش والانصار فی القطائع ووضع عمر الدواوین[۴۳۳]

۲۷- طبقات

۲۸- تاریخ الفقہاء

مندرجہ بالا فہرست میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ ابن سعد نے ایک "کتاب طُعَم النّبی" بھی الواقدی سے منسوب کی ہے[۴۳۴] بظاہر اس کتاب میں اُن محاصل کا بیان ہوگا جو خیبر کی جاگیر سے رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات اور دوسرے افراد کو دیے جاتے تھے اور غالباً یہ "المراعی" کی ایک فصل رہی ہوگی - اسی وجہ سے ابن الندیم اور یاقوت کے یہاں اس کا نام موجود نہیں ہے۔ کتب تاریخی میں سے دو (یعنی نمبر ۱۶، ۱۷ ابلکہ شاید ۱۹ بھی) مکہ اور مدینے کی دور جاہلیت کی تاریخ سے بحث کرتی ہیں۔ باقی میں سے چار کتابیں (۸- ۱۰- ۱۱- ۱۵) سیرۃ نبوی یا اُس سے متعلقہ موضوعات پر ہیں اور بقیہ تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رونما ہونے والے تاریخی حوادث کا ذکر ہے۔ ان کتابوں کے بہت سے اقتباسات دوسری تاریخوں میں محفوظ ہیں مثلاً "کتاب الردۃ والدار" کے طویل اقتباسات ابن حُبَیش (متوفی ۵۸۴ھ) کی ہنوز غیر مطبوعہ "کتاب غزوات" میں پائے جاتے ہیں جس سے CAETANI لیونی کیتانی ڈیوک آف سرمونیٹا نے اپنی تالیف "حولیاتِ اسلام" ANNALI DELL' ISLAM کی فصل "ردّۃ" میں فائدہ اٹھایا ہے - اس میں رسول اللہ کی وفات کے بعد ہونے والی عرب قبیلوں کی بغاوت کا حال ہے۔ الواقدی کی یہ کتاب پہلے زمانے میں اسپین میں بھی معروف رہی ہے، چنانچہ ابو خیر (متوفی ۵۷۵ھ) اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتا ہے[۴۳۵] اور اسے "کتاب الردۃ" کہتا ہے، جبکہ یہ زمانہ ما بعد کی کتابوں میں "کتاب الردۃ والدار" کے نام سے مذکور ہوئی ہے - ہوسکتا ہے کہ "یوم الدار" سے ان لوگوں کی مراد خلیفہ عثمان کی شہادت کا دن ہو، جیسا کہ یہ پہلے کہلاتا تھا مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ۱۱ھ کے واقعۂ ردۃ کو الواقدی نے ۳۵ھ کے یوم الدار سے ایک ہی کتاب میں کس طرح مربوط کیا ہوگا - شاید یہ دو الگ الگ مستقل تالیفات رہی ہوں اور بعد کو غلطی سے انھیں جوڑ دیا گیا ہو[۴۳۶] شہادت عثمان سے متعلق الطبری کے یہاں الواقدی کے متعدد اقتباسات ہیں جن کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ "کتاب الدار" سے ماخوذ ہوں گے[۴۳۷] "التاریخ الکبیر" کے بارے میں بظاہر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ کے سارے اہم واقعات تاریخی ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہوں گے اور یہ کم سے کم ۱۷۹ھ تک کے حوادث ہوں گے[۴۳۸] الطبری نے اس کتاب سے بھی بہت سے اقتباسات لیے ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الواقدی نے یہ کتاب اپنے بغداد میں قیام پذیر ہونے سے پہلے تمام کر لی تھی۔

الواقدی کی کتاب الطبقات سے (اور الہیثم بن عدی کے بعد الواقدی اس انداز پر کتاب لکھنے والا پہلا شخص ہے)[۴۳۹] ہمیں اُس کے شاگرد ابن سعد کی اسی قسم کی تالیف کی اساس معلوم ہوتی ہے - مؤخر الذکر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ الواقدی نے زیادہ تر مدنی اصحاب رسول اور ان کی اولاد کے طبقات سے بحث کی تھی - ان کے ساتھ کوفہ اور بصرہ کے محدثین کے طبقات کا بیان تھا اگرچہ اس میں کچھ زیادہ نظم و ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا[۴۴۰] الواقدی کی کتاب الطبقات کو ہم ایک طرح سے سیرۃ کے موضوع پر اس کی دوسری تالیفات کا تکملہ سمجھ سکتے ہیں - ابن سعد نے اپنی کتاب کے متعلقہ ابواب میں ان کتابوں میں سے اُن سے فائدہ اٹھایا ہے جن میں ازواج مطہرات کا ذکر ہے یا رسول اللہ کی وفات کا بیان ہے - ایک اور کتاب کی ایک فصل سے بھی اُس نے مواد

حاصل کیا ہے، جس میں رسول اللہ کے مکتوبات یک جا کر دیے گئے تھے۔ مگر اس کا تذکرہ علیحدہ تالیف کی حیثیت سے نہیں آتا اور شاید یہ "سیرۃ" ہی کا ایک باب تھا۔ الواقدی کی سیرۃ یا "کتاب البعث" (جس میں ظاہر البعثت نبوی سے ہجرت تک کے واقعات قلمبند ہوئے تھے) کے اقتباسات بھی ابن سعد کے یہاں مختلف مواقع پر پائے جاتے ہیں ابن سعد نے تاریخ اہل کتاب کے سلسلے میں ایک یا دو جگہ الواقدی کا حوالہ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو الواقدی زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مگر مکی زندگی کے واقعات کے ذیل میں الواقدی کا حوالہ کثرت سے ملتا ہے۔

الواقدی کی اتنی ساری تصانیف میں اگر کوئی کتاب مکمل حالت میں ہم تک آئی ہے تو وہ اس کی "کتاب المغازی" ہی ہے، الفریڈ خان کریمر نے اس کتاب کا پہلا تہائی حصہ "بلوتھکا انڈیکا" میں شائع کیا تھا یہ اس ناقص مخطوطہ پر مبنی تھا جو اُسے دمشق میں ملا تھا[442]۔ اِسی کتاب کا ایک ناقص اور دوسرا کامل مخطوطہ برٹش میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ جرمن زبان میں اس کا خلاصہ جو لیس ویل ہاؤزن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے شائع کیا ہے وہ انھیں نسخوں پر مبنی ہے۔ آوگسٹ فشر اب اس کا پورا عربی متن لائپزش میں اشاعت کے لئے تیار کر رہے ہیں[443]۔

اپنی "کتاب المغازی" کے آغاز میں الواقدی نے اُن راویوں کی ایک فہرست درج کی ہے جن سے وہ بکثرت روایت کرتا ہے۔ اس میں ۲۵ نام ہیں۔ اس کے شاگرد ابن سعد نے بھی ان میں سے گیارہ راویوں کے لیے کہا ہے کہ یہ الواقدی کے اہم رواۃ میں سے ہیں[444]۔ اس فہرست پر ایڈورڈ زاخاؤ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[445]۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ الواقدی نے بہت کم عمری میں اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے بعض رواۃ سنہ ۱۵۰ھ کے تھوڑے ہی عرصے بعد مر گئے، اس وقت الواقدی کی عمر ۲۵ سال یا اس سے بھی کم رہی ہوگی۔ ان راویوں میں تقریباً سب ہی یا تو مدینے کے باشندے ہیں یا وہاں مقیم رہے ہیں، اس لحاظ سے ہم الواقدی کو "مدینہ اسکول" کا نمایندہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فہرست ان سب ناموں کی نہیں ہے جن کی روایات الواقدی نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں بلکہ یہ اُن لوگوں کے نام ہیں جن سے وہ بنیادی روایت اخذ کرتا ہے۔ اس میں کبھی انفرادی روایت بیچ میں آجاتی ہے جس کے لیے ہر بار وہ علیحدہ اسناد بھی درج کرتا ہے۔ ویل ہاؤزن نے اپنے ترجمے کے ساتھ جو فہرست رواۃ کی دی ہے۔ اس میں الواقدی کے سارے ہی راویوں کا نام آگیا ہے۔ ان سب بالواسطہ یا بلا واسطہ راویوں میں ممتاز یہی مؤلفین مغازی ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، یعنی الزہری، معمر اور ابو معشر۔ کبھی کبھی موسیٰ بن عقبہ کا نام بھی نظر آجاتا ہے۔ مگر ابنِ اسحاق کا قطعاً کہیں حوالہ نہیں آیا۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے، کیونکہ الواقدی نے ایک بیان میں جس کا اقتباس الطبری کے یہاں موجود ہے، ابنِ اسحاق کی بہت تعریف کی ہے[446]۔ وہ کہتا ہے:

"وہ مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عربوں کے ایام، انساب اور اخبار کا علم رکھنے والوں میں سے تھے اور کثرت سے اشعار کی روایت کرتے تھے، کثیر الحدیث تھے، عالم متبحر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے شائق تھے، ساتھ ہی اِن سب فنون میں قابلِ اعتماد بھی تھے۔"

اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں[447] ہے کہ الواقدی نے ابن اسحاق کی کتاب سے فائدہ اٹھایا تھا، بلکہ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے متقدمین میں سب سے زیادہ مواد اُسی سے اخذ کیا، شاید یہی سبب ہو کہ اس نے ابن اسحاق

کا نام ہی سرے سے اُڑا دیا تاکہ اُس کا بار بار ذکر کرنے سے یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ کتنا زیادہ استفادہ اس سے کر رہا ہے۔ بس آخر میں اس نے "وغیرھم قد حدثنی ایضاً" ہی کے تحت ابن اسحاق کو رکھنا گوارا کر لیا۔

مگر الواقدی نے ابن اسحاق کے علاوہ بھی اُن تمام مصادر سے استفادہ کیا تھا جن کا حصول کسی طرح بھی اُس کے لیے ممکن تھا۔ اُس کے یہاں بہت کچھ وہ ہے جو ابن اسحاق کے یہاں بھی نہیں ملتا یا کم سے کم ابن اسحاق نے اُن راویوں کے حوالے سے بیان نہیں کیا ہے جن کا نام الواقدی لکھتا ہے۔ چنانچہ مدنی زندگی کے اخبار و حوادث میں اُس کی تالیف ابن اسحاق کی کتاب سے زیادہ جامع ہے، اگرچہ اس حصے کی بیشتر احادیث تاریخی نوعیت کی نہیں ہیں بلکہ انھیں فقہی مسائل سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے الواقدی کی "کتاب المغازی" کتب احادیث کے زمرے میں آ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ الواقدی ایک کے بعد دوسری حدیث درج کر دیتا ہے اور اپنی کوئی شرح یا حاشیہ لکھ کر دونوں میں ربط و تسلسل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جیسا کہ ابن اسحاق کا معمول ہے۔

الواقدی قصائد کا استعمال بھی کثرت سے کرتا ہے۔ اگرچہ اُس کی کتاب کے جو مخطوطات ہمیں ملتے ہیں اُن میں بہت سے قصائد نہیں پائے جاتے، اس کا سبب یا تو یہ ہوگا کہ خود الواقدی نے ان مواقع پر یہ اشعار چسپاں نہیں کیے تھے، یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کے ناقلوں میں سے کسی نے تلخیص کرتے ہوئے ان اشعار کو حذف کر دیا ہوگا۔

لیکن اگر ہم ان سب اشعار کو بھی شمار میں رکھیں تب بھی ان کی تعداد ابن اسحاق کے درج کیے ہوئے اشعار کی مقدار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اپنے متقدمین کی تحریروں کے علاوہ الواقدی نے بنیادی وثائق اور دستاویزوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔[۴۴۸] ان دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کبھی تو اپنے شیوخ کے نقل کردہ متن پر انحصار کرتا ہے اور کبھی اپنی تحقیق ذاتی سے اس کی عبارت درج کرتا ہے۔ یہ کبھی تو متقدمین کی عبارت سے مطابق ہوتی ہے، کبھی اُس کی اپنی معلومات پر مشتمل ہوتی ہے۔[۴۴۹] "کتاب المغازی" میں الواقدی نے رسول اللہؐ کے بعض احکام اور معاہدے درج کیے ہیں۔ ابن سعد کے یہاں اُس فصل میں جو رسائل نبوی سے متعلق ہے، زیادہ تر الواقدی ہی کے اس مجموعہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو اس نے اپنی اور اپنے شیوخ کی محنت سے فراہم کیا تھا۔

مغازی کی ترتیب میں الواقدی نے ایک سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کیا ہے۔ وہ اس طرح شروع کرتا ہے کہ کسی غزوہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے کس سنہ میں نکلے اور کب واپس تشریف لائے۔ اس کے بعد غزوہ کی خبریں ہوتی ہیں۔ جو ابواب ذرا طویل ہیں ان میں پہلے ایک بنیادی روایت درج کر دیتا ہے جو بہت سی انفرادی روایات کا مجموعہ ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ خاص خاص اخبار جوڑ دیے جاتے ہیں۔ آخر میں عموماً یہ بتاتا ہے کہ مدینے سے رسول اللہؐ کی غیر حاضری کے زمانے میں وہاں کس کس نے نیابت کی۔ پھر اس حادثے کی طرف اشارہ کرنے والی قرآنی آیات یا اشعار وغیرہ درج کر دیتا ہے اسی طرح ناموں کی فہرستیں وغیرہ......"

الواقدی اپنی کتاب میں ضمیر واحد متکلم کا استعمال شاذ ہی کرتا ہے۔ ہاں اسناد میں کبھی کبھی وہ خود آ جاتا ہے مثلاً "حدثنی

کذا وکذا" (مجھ سے ایسا ایسا بیان کیا گیا) اس کے باوجود الواقدی کو صرف متقدمین کی روایات کا جامع اور مرتب ہی نہیں سمجھنا چاہیے۔ حوادث کی تاریخوں کا تعین کرنے میں وہ اپنے پیش رو حضرات پر فوقیت رکھتا ہے اور اس کی کتاب نری معلوم حقائق کی تکرار ہی نہیں ہے بلکہ مستقل ریسرچ کا نتیجہ ہے[۵۰]۔ علاوہ بریں، الواقدی نے اصولِ حدیث سے متعلق اپنے ریمارکس بھی لکھے ہیں۔ ابن سعد نے[۵۱] الواقدی کا ایک مفصل رسالہ محفوظ کر دیا ہے جس میں وہ کسی اور کی سند دیے بغیر اپنے (ذاتی) خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسناد کا اتنا اہتمام کرنے والے کسی مصنف کے لیے جو اپنی سوانحی تفصیلات کے سوا (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کبھی کوئی تفصیلی عبارت بغیر ضروری اسناد درج کیے ہوئے نہ لکھتا ہو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اگرچہ محدثین الواقدی کو ثقہ نہیں سمجھتے[۵۲] مگر سیرۃ، مغازی، فتوح اور فقہ میں وہ سند کا درجہ رکھتا ہے[۵۳]۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی فی الواقع ظہورِ اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ ابن اسحاق کے علی الرغم اس نے زمانۂ جاہلیت کے وقائع پر بہت ہی کم توجہ دی ہے اور اس سے بھی کمتر وہ تاریخ رسالت کی طرف التفات کرتا ہے، چنانچہ ابراہیم الحربی کا قول ہے[۵۴] کہ "الواقدی عہدِ اسلامی کی تاریخ کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا، مگر دورِ جاہلیت پر اُس کی معلومات صفر ہیں۔"

"الفہرست" میں الواقدی کو شیعہ بتایا گیا ہے[۵۵]۔ مگر وہ معتدل شیعہ تھا۔ اس کی تائید میں خود الواقدی کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ حضرت علیؓ کی ذات من جملہ معجزات نبوی تھی۔ جس طرح وہ عصائے موسوی جو اژدر میں تبدیل ہو گیا تھا، حضرت موسیٰؑ کا معجزہ تھا، اور جس طرح مُردوں کو جِلانا حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ تھا وغیرہ۔" مگر قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اللہ کے تعریفی کلمات جو مثلاً ہمیں ابنِ اسحاق کے یہاں ملتے ہیں الواقدی نے یا تو نقل ہی نہیں کیے یا انھیں ہلکا کر کے پیش کیا ہے۔ چنانچہ الواقدی نے حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل نہیں کیا[۵۶] جو ابن اسحاق کی سیرۃ میں موجود ہے:

"أفلا ترضی یا علی ان تکون منّی بمنزلة هارون من موسیٰ" — اے علی کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہارا وہی درجہ ہے جو ہارون کا موسیٰ کے ساتھ تھا۔

اسی طرح وہ کلمات جو رسول اللہ نے سورۂ توبہ نازل ہونے کے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جو ابنِ اسحاق نے نقل کیے ہیں[۵۷]:

"لا یؤدّی عنّی الا رجل من أهلِ بیتی" — تبلیغ رسالت کا کام میرے اہلِ بیت میں سے صرف ایک شخص پورا کرے گا۔

حضرت علی کی منقبت کے کلمات کو حذف کر دینا یا انھیں ہلکا کر کے پیش کرنا ایک ایسے مؤلف سے حیرت انگیز ہے جسے شیعیت سے متصف کیا جاتا ہو، اور اس کی تاویل میں بس وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ابن الندیم نے اپنے قول پر بطور توضیح کہی ہے کہ الواقدی تقیّہ کیے ہوئے تھا[۵۸] یعنی وہ اپنے تشیع کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بعض دوسرے مقامات پر الواقدی نے اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جہاں حضرت علی کے لیے مدح کے اقوال لکھے ہیں وہیں ایسی باتیں بھی درج کر دی ہیں جو اُن کے خلاف پڑتی ہیں؛ مثلاً اُس نے یہ خبر نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات حضرت عائشہ کی گود میں ہوئی اور یہ قول بھی نقل کر دیا ہے کہ حضرت علی کی گود میں انتقال فرمایا تھا[۵۹]۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ الفہرست کا مؤلف سب سے پہلا اور شاید تنہا مؤلف ہے جس نے الواقدی کو شیعہ بتایا

ہے حتیٰ کہ شیعوں کی کتب رجال میں بھی اُس کا نام نہیں پایا جاتا۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں دیکھ چکے ہیں، الواقدی کو عباسی خلفاء کی سرپرستی حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ یہ صرف حکمران خاندان کا احترام ہی تھا کہ اس نے بدر میں گرفتار ہونے والے دشمنانِ رسول کی فہرست میں سے العباس کا نام حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے مشرکین قریش کے لشکر کو سامانِ رسد فراہم کیا تھا۔ (مطعمون) اُن کی فہرست[۴۰] میں العباس کے نام کی جگہ صرف "فلاں" لکھا ہے۔ اسی طرح یہ قول بھی حاکموں کو خوش کرنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے وظیفہ پانے والوں کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں سب سے پہلا نام العباس کا تھا۔[۴۱]

۳۔ محمدؐ بن سعد

مغازی کے جن مؤلفین کا ہم یہاں تذکرہ کر رہے ہیں اُن میں آخری نام محمدؐ بن سعد کا ہے جسے الواقدی کا کاتب کہا جاتا ہے، اس کی کتاب کو ایڈورڈ ز خاؤ نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر ایڈٹ کیا ہے[۴۲] اور اس کے بارے میں اوٹو لوتھ نے ۱۸۶۹ء میں ایک کتاب بھی[۴۳] لکھی ہے۔

محمد بن سعد بن منیع ۱۶۸ھ میں بصرے میں پیدا ہوا۔[۴۴] پھر وہ مدینے اور دوسرے شہروں میں رہا۔ ہم اُسے ۱۸۹ھ میں مدینے میں پاتے ہیں۔[۴۵] اُسے اگر الحسین بن عبداللہ بن عبیداللہ بن العباسؓ[۴۶] کا مولیٰ کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ وہ خود الحسین کا مولی تھا بلکہ یہ نسبت اُس کے دادا اور شاید باپ کو حاصل تھی کیونکہ الحسین کا انتقال ۱۴۰ھ یا ۱۴۱ھ میں ہو چکا تھا۔[۴۷] خود ابن سعد کے قول سے ظاہر ہے کہ عباسی خاندان کی یہ شاخ الحسین کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی[۴۸] اور ابن سعد کو اس شاخ سے کسی طرح کا علاقہ نہیں رہا تھا۔ بعض مراجع میں ابن سعد کو الزہری کی نسبت سے یاد کیا گیا ہے، اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ خود اُس نے یا اُس کے باپ نے قبیلہ قریش کی شاخ بنو زُہرہ سے نسبت ولایت قائم کر لی ہوگی۔ الواقدی سے اُس کے روابط بغداد میں پیدا ہوئے اور بقول مُرتِّب الفہرست اس نے الواقدی کی تصانیف سے اپنی کتابوں کا زیادہ تر مواد حاصل کیا۔ ابن الندیم نے ابن سعد کی تصانیف میں صرف "کتاب اخبار النبی" کا ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے صرف یہی کتاب اس شکل میں تالیف کی تھی جس میں یہ زمانہ مابعد میں شائع ہوئی۔ یہ اس نے اپنے شاگردوں کو روایت کی تھی تاکہ وہ اس کی روایت دوسروں سے کر سکیں۔ مگر "الطبقات" اپنی موجودہ صورت میں سب سے پہلے الحسین بن فہم (۲۱۱-۲۸۹ھ) نے محفوظ کی۔ پھر ۳۰۰ھ کے لگ بھگ ابنِ معروف نے ان دونوں کتابوں کو یکجا کر دیا[۴۹] اور "کتاب اخبار النبی" کو طبقات کا پہلا جزء بنا دیا۔

اخبار النبی جو برلن ایڈیشن کے جزء اول، قسم اول، اور جزء ثانی کی قسم اول و ثانی پر مشتمل ہے، اس میں ایک تمہیدی فصل بھی ہے جس میں انبیائے پیشین کی تاریخ بیان ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہؐ کے اجداد کا بیان بھی ہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایامِ طفولیت سے زمانۂ بعثت تک کا حال ہے، اسی میں دو فصلیں وہ ہیں جن میں وحی اول سے پہلے اور بعد کی علامات نبوۃ بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد پہلی دعوتِ اسلام سے ہجرت تک کے واقعات بیان ہوئے ہیں پہلی جلد کے دوسرے جزء میں مدنی زندگی کے حالات ہیں جن میں وہ خاص طور پر رسول اللہ کے فرامین، عرب قبائل کے وفود آپ کے شمائل، طرزِ زندگی اور اثاث البیت کا تذکرہ کرتا ہے دوسری جلد کا پہلا جزء غزوات نبوی کے لیے مخصوص ہے یعنی اس میں

مغازی اپنے لفظی معنوں میں ملحوظ رہے ہیں۔ دوسری جلد کے دوسرے حصے میں سیرۃ نبوی کا اختتامیہ ہے۔ یہ کئی مفصل فصلوں میں ہے، جن میں آپ کے مرض الموت، انتقال، تدفین اور میراث کا بیان ہے۔ اسی میں وہ مراثی بھی شامل ہیں جو مختلف لوگوں نے آپ کی وفات پر لکھے تھے۔ ان سب امور کے بعد اسی جلد میں جو کچھ ہے اس کا سیرۃ نبوی سے براہِ راست کوئی علاقہ نہیں بلکہ یہ مدینے کے نامور فقہا کے تراجم ہیں، یہاں سے گویا "طبقات" کا عملاً آغاز ہوتا ہے۔ اس ضمیمے کے پہلے باب کا عنوان "آخر اخبار النبی" یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ بیان ہوگا وہ سیرۃ سے متعلق نہیں ہے۔

ابن اسحاق کے بعد ابن سعد ہی وہ اولین مؤلف سمجھا جاتا ہے جس کی لکھی ہوئی سیرۃ مکمل حالت میں ہم تک پہنچتی ہے اور چونکہ الواقدی کی کتاب المغازی کے سوا ہمارے پاس سیرۃ پر کوئی مکمل کتاب نہیں ہے، اس لیے اس کو پہلا ہی مؤلف کہا جا سکتا ہے۔ ابن سعد نے بعض بعض مواقع پر ابن اسحاق سے زیادہ تفصیلات دی ہیں مثلاً ان فصلوں میں جو رسول اللہ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں یا آپ کے رسائل و سفارات سے بحث کرتی ہیں، خصوصاً وہ حصے جو مرض اور وفات کے بارے میں ہیں جبکہ بعض دوسرے امور میں وہ سرسری گذر جاتا ہے، جن سے ابن اسحاق نے مفصل بحث کی ہے، جیسے اسلام سے پہلے عربوں کی وہ تاریخ، جس کا رسول اللہ کے اجداد سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ ابن سعد کے یہاں مواد کی باضابطہ تنظیم کا رجحان بھی ملتا ہے۔ وہ غالباً پہلا مؤلف بھی ہے جس نے "علامات النبوۃ" کو یکجا کیا ہے، اس سے زمانہ ما بعد میں "دلائل النبوۃ" جیسی کتابوں کی تالیف کی گئی۔ اسی طرح اس نے اپنی کتاب کی فصل "صفۃ اخلاق رسول اللہ" لکھ کر "شمائل" کے موضوع پر تصانیف کا راستہ ہموار کر دیا۔[۴۷]

ابن سعد اپنے "تاریخی مواد" میں الواقدی پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ الواقدی کا حوالہ تاریخ اہل کتاب کے ذیل میں بہت ہی کم دیتا ہے اور اس موضوع پر اس کا سب سے بڑا راوی ہشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے۔ مگر مدنی دور کے حوادث پر اس کا اہم مرجع الواقدی ہی ہے، اگرچہ ابن سعد نے دوسرے ذرائع سے فراہم کی ہوئی معلومات کو سمو کر ان روایات قصص کو کہیں کہیں طویل بھی کر دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی مدنی زندگی اور وہاں آپ کے کارناموں کے بارے میں بھی سب سے بڑا ذریعہ معلومات الواقدی ہی ہے اور اسی کی روایات کو دوسرے رُواۃ کے بیان سے جوڑ کر ابن سعد نے زیادہ تفصیلی بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس جن فصول میں رسول اللہ کے اخلاق و عادات کا بیان ہوا ہے، وہاں ابن سعد الواقدی سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ان مواقع پر الواقدی کا نام شاذ ہی نظر آتا ہے۔ جہاں عملاً "مغازی" ہی کا بیان آیا ہے ابن سعد شروع میں اپنے اہم راویوں کی فہرست درج کرتا ہے،[۴۸] جس میں الواقدی کا نام وہ نمایاں طور پر اور اپنے بلا واسطہ راوی کی حیثیت سے دیتا ہے، اسی طرح ابن یزید جس سے اس نے ابن اسحاق کی روایات اخذ کی اور حسین بن محمد جس نے ابو معشر کی روایات منتقل کیں اور اسماعیل بن عبداللہ جو موسیٰ بن عقبۃ کا راوی ہے اس فہرست میں ملتے ہیں۔ اس طرح ابن سعد کو اپنے علمائے متقدمین کے سرمایہ تک پہنچنے کے مواقع ملے ہیں، مگر "مغازی" کے معاملے میں وہ زیادہ تر الواقدی ہی پر اعتماد کرتا ہے۔ اگر ہم الواقدی کی "کتاب المغازی" سے ابن سعد کے بیانات کا تقابلی مطالعہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ وہ الواقدی پر بیشتر اور ابن اسحاق، ابو معشر یا موسیٰ بن عقبہ پر اس سے کمتر اعتماد کرتا ہے۔ ان غزوات میں سے ہر غزوہ کی تفصیلی روایت وہ اپنا ماخذ بتائے بغیر درج کرتا ہے، کیونکہ اس نے ابتدا ہی میں سب راویوں کے نام اکٹھے لکھ دیئے

ہیں، پھر اُس بڑی روایت کے بعد وہ انفرادی روایتیں دیتا ہے، یہ بعض غزوات کے بارے میں بہت کثیر ہیں؛ ان میں سے ہر انفرادی روایت کے ساتھ اُس کا خاص اسناد بھی بیان کرتا ہے، اس اعتبار سے مغازی کے بیان میں ابن سعد کو الواقدی سے ایسی ہی نسبت ہے جیسی الواقدی کو ابن اسحاق سے ہے۔ مگر الواقدی کبھی کبھی ابنِ اسحاق کا سرے سے نام ہی نہیں لیتا، جبکہ ابن سعد کبھی یہ حقیقت نہیں چھپاتا کہ اس کا اہم ماخذ الواقدی ہے۔ ہمیں یہ بات شروع ہی میں بتا دینی چاہیے کہ ابن سعد اپنی تالیف کی یکسانی کو باقی رکھنے کی خاطر بڑی روایت یا اساسی قصہ کے بیچ میں اپنے جمع کیے ہوئے اضافی مواد کو درج نہیں کرتا، بلکہ ایسی سب معلومات وہ لازماً آخر میں دیتا ہے، یہ طریقہ الواقدی کے برعکس ہے۔ ایک خصوصیت میں ابن سعد نے بھی الواقدی کے انداز کو پوری طرح نبھایا ہے، یعنی وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ رسول اللہ کی مدینے سے غیر حاضری کے زمانے میں وہاں کون حاکم رہا تھا، اور یہ کہ لشکر میں جھنڈا کس کے پاس تھا۔ یہ صحیح ہے کہ الواقدی نے بھی یہ سوالات اُٹھائے ہیں، مگر وہ ہر موقع پر لازماً ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکا ہے۔ ابن سعد نے رسول اللہ کے مرض الموت اور پھر وفات سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں غیر معمولی محنت کی ہے، یہاں بھی اُس کا خصوصی ماخذ الواقدی ہی نظر آتا ہے اور ابنِ سعد نے اُس کی "کتاب وفات النبی" سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن خود اُس نے ان روایات میں بہت عظیم اضافے کیے ہیں۔

ابن سعد اپنی کتاب میں مشکل ہی سے کہیں ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ قصہ سے متعلق بعض اقوال کو چھوڑ کر وہ شاید ہی کوئی بات ایسی کہتا ہو جس کا ماخذ نہ بتاتا ہو۔ اس نے اپنے شیوخ سے جو زبانی روایات لی ہیں۔ اُن کے علاوہ بعض دستاویزوں کے پورے متن بھی درج کیے ہیں۔ اسی طرح جن قصائد کا اس نے حوالہ دیا ہے، خصوصاً مراثی، اُن کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ مگر اس معاملے میں وہ الواقدی سے بہت مختلف ہے اور ابن اسحاق کے ساتھ ہم اس کا نام ایک ہی سانس میں نہیں لے سکتے۔

ابن سعد کی کتاب میں "الطبقات" جو زخاؤ ایڈیشن کی تیسری جلد سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کے آغاز میں وہ اپنے اہم رواۃ کی فہرست بھی دیتا ہے، اس میں بھی الواقدی کے علاوہ ہمیں ابن اسحاق، ابومعشر و موسیٰ بن عقبۃ کے نام نظر آتے ہیں، جن کی روایات اُس نے ان کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگردوں سے حاصل کی ہیں۔ یہاں وہ اپنے راویوں میں معن بن عیسیٰ مدنی (متوفی ۱۹۸ھ) الفضل بن دُکین کوفی (متوفی ۲۱۹ھ) اور ہشام بن محمد بن السائب الکلبی الکوفی (متوفی ۲۰۴ھ) کا ذکر بھی کرتا ہے، موخر الذکر کا باپ محمد بن السائب مشہور نسّاب ہوا ہے۔ لیکن انصار کے نسب پر وہ شاید ایک اور راوی سے اخذ کرتا ہے جس کا نام عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری ہے؟ یہ کتاب نسب الانصار کا مؤلف بھی تھا اور غالباً یہی عبداللہ بن محمد بن عمارۃ بن القداح ہے جس کا حال الذہبی کی "میزان" میں ملتا ہے، اس کے بارے میں ہمیں اور کچھ علم نہیں ہے۔

جہاں تک صحابہ و صحابیات کے تراجم و احوال کا تعلق ہے، "طبقات" کو سیرۃ نبوی کا اہم تکملہ سمجھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں پوری کتاب کی آٹھ جلدیں مخصوص ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ آپ کی گھریلو یا پبلک زندگی میں حصہ لیا، یا وہ اصحاب ہیں جنھوں نے آپ کے اعمال و اقوال کی روایت کی۔ اصحاب رسول کے تراجم کے بعد تابعون کا حال آتا ہے، جنھیں ذات نبوی سے براہِ راست کوئی شخصی ربط قائم کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہاں میں طبقات کی دوسری خصوصیات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کیوں کہ لوتھ نے نہ صرف اپنے رسالے میں جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے، ان خصائص سے سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ اس کے علاوہ اپنے ایک مضمون

"طبقات کی اصل اور ان کی اہمیت" میں اس نے طبقات ابن سعد اور طبقات الواقدی کا موازنہ بھی کیا ہے[۴۷۹]۔ ابھی حال ہی میں ایڈورڈز خاؤ نے تیسری جلد (پہلا حصہ) کے ابتدائیہ میں بڑی دقت نظر کے ساتھ ابن سعد کے طریق کار سے بحث کی ہے۔

زمانۂ مابعد کی تاریخی تالیفات میں جن میں مثلاً الطبری، المسعودی یا الیعقوبی کی کتابوں کے نام لیے جا سکتے ہیں، سیرۃ نبوی تاریخ عالم کے ایک حصے کی حیثیت سے شامل کی جاتی ہے۔ یہ بہت مؤخر زمانے میں ہوا ہے کہ مؤلفوں نے علیحدہ سیرۃ ہی کے موضوع پر کتابیں لکھنے کی طرف دھیان دیا ہو، ان میں الحلبی[۴] (متوفی ۱۰۴۴ھ) اور ابن سیدالناس (متوفی ۷۳۴ھ) بھی ہیں جن کی کتابوں میں ان مؤلفین مغازی کا، جن سے ہم بحث کر رہے تھے، پھر بار بار حوالہ دیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گولڈ تیہر نے اس موضوع پر کچھ مواد اکٹھا کیا ہے۔ دیکھو: GOLDZIEHER : MUHAMMDANISCHE STUDIEN. VOLUME II P. 9 (اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ فاروقی)

نیز ZEITSCHRIFT DER DEUTSCHEN MORGANLADISCHEN GASELLSCHAFT VOL. 71 P. 439

(یعنی جرمن مستشرقین کی جماعت کا مجلّہ۔ جلد ۷۱، ص ۴۳۹)

(لیکن یہ خیال درست نہیں۔ تدوین حدیث کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی کتاب کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مرتبہ رسالہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" طبع حیدرآباد ۱۹۵۶ء بھی ملاحظہ ہوں۔ فاروقی)

۲۔ الطبری ۱/۳۰۵۶

۳۔ 〃 ۱/۳۱۰۴

۴۔ 〃 ۱/۳۱۲۶

۵۔ 〃 ۲/۸۷۳

۶۔ ابن سعد ۵/۱۱۲

۷۔ الطبری ۲: ۱۱۲۷

۸۔ الطبری ۲: ۹۴۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۵، ۱۰۳۹، ۱۰۴۶، ۱۰۸۵۔

۹۔ الاغانی ۳: ۱۰۷

۱۰۔ الطبری ۳: ۲۳۳۹، ابن سعد ۵: ۱۱۳

۱۱۔ ابن سعد ۵: ۱۱۳

۱۲۔ البلاذری: الفتوح ۴۷۰

۱۳۔ الواقدی (ترجمہ ولہوزن) ۲۸۸

۱۴۔ النووی ۱۲۵، ابن حجر: تہذیب ۱ : ۹۷

۱۵۔ ابنِ حجر : تہذیب ۱ : ۹۷

۱۶۔ 〃 ۱ : ۹۷

۱۷۔ ابن سعد نے ابان کا ذکر سیرۃ کے موضوع سے ہٹ کر کیا ہے جہاں حضرت عمرؓ کے آخری کلمات کا بیان ہے جنھیں ابان نے اپنے باپ سے سُنا تھا۔ ابن قتیبہ (کتاب الشعر والشعراء) کہتا ہے کہ یہ اس خبر کے راوی ہیں کہ رسول اللہ نے کعب بن زہیر کو اپنی چادر عطا فرمائی تھی جسے معاویہ نے خرید لیا تھا اور اسے اموی خلفا خاص موقعوں پر اوڑھتے تھے۔

۱۸۔ ابن سعد ۴ : ۲۹، الطبری ۱ : ۱۴۲۱

۱۹۔ فیوک Fück : محمد بن اسحاق ۸، ۲۷۔

۲۰۔ ابن سعد ۵ : ۱۵۶

۲۱۔ ابن سعد ۵ : ۱۸۵

۲۲۔ الطبری ۲ : ۱۳۰۵

۲۳۔ ایضاً ۲ : ۱۳۴۶

۲۴۔ کتاب الاغانی ۸ : ۹۲ - ۱۰۱

۲۵۔ طبقات ۵ : ۱۸۵

۲۶۔ الاغانی ۸ : ۹۶ یہ سات گواہ ہیں: ابُوبکر بن عبدالرحمٰن، القاسم بن محمد، عروۃ بن الزبیر، سعید بن المسیّب، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید اور خود عبیداللہ۔

۲۷۔ الاغانی ۱ : ۵۰

۲۸۔ 〃 ۴ : ۱۶۳

۲۹۔ 〃 ۱۷ : ۱۲۰

۳۰۔ الطبری ۱ : ۱۳۱۳

۳۱۔ الاغانی ۲۱ : ۹۲

۳۲۔ البلاذری : الانساب (مرتبہ اہلورد) ۲۰۹

۳۳۔ البلاذری : الانساب ۶۳

۳۴۔ الاغانی ۶ : ۵۹ ابن خیثمہ کا قول ہے (ابن حجر: تہذیب ۷ : ۱۸۴) کہ یوم جمل کے موقع پر عروہ تیرہ سال کے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا سنہ ولادت ۲۳ھ ہوا۔

۳۵- ابن سعد ۵ : ۱۳۳، الطبری ۱ : ۳۱۰۳ تا ۳۱۱۳

۳۶- الطبری ۲ : ۸۲، نیز LAMMER : ETUDES SUR LE REGNE DE MUAWIYA LER 3:218 SEQ.
(یعنی معاویہ اول کے عہد حکومت کا تاریخی مطالعہ جلد ۳ ص ۲۱۸ و بعدہ)

۳۷- قبیصہ بن ذؤیب الخزاعی

۳۸- البلاذری : الانساب ۲۵۷

۳۹- ابن خلکان : الوفیات طبع بولاق ۱ : ۳۹۹

۴۰- البلاذری : الفتوح (تحقیق دی غویہ) ۲۱۷

۴۱- الجمحی : طبقات الشعراء (تحقیق ہل) ۳۵

۴۲- الأغانی : ۱۴ : ۱۶۸

۴۳- البلاذری : الانساب : ۴۷

۴۴- الواقدی بحوالہ البلاذری : الانساب ۶۵، ۶۱، امیر بن حفص کی روایت ۶۳ المدنی عن عبداللہ بن سعید ۶۲

۴۵- عبداللہ بن الزبیر کی کنیت ہے، اس کے استعمال پر الحجاج کے اعتراض کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔

۴۶- قوسین کی عبارت انگریزی مضمون میں نہیں ہے، بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھی ہے، حسین نصار نے عربی متن کو اپنے ترجمے میں شامل کر لیا ہے۔ ہم نے اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔ (اشارہ)

۴۷- الاغانی ۱۶ : ۴۵۔

۴۸- ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴- عروہ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔

۴۹- الاغانی ۴ : ۱۱۹

۵۰- الاغانی ۱۶ : ۴۵ (طبع بولاق)

۵۱- ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴، ابن خلکان ۱ : ۵۶۸، الذہبی : تہذیب ۵، عروہ ایضاً

۵۲- ابن الماجشون فی کتاب الاغانی ۱۶ : ۴۶۔

۵۳- الطبری ۲ : ۱۱۸۳ (احکام شریعت میں مشورہ طلب کرنے کے لیے بلایا تھا۔)

۵۴- ابن سعد ۳ (الف) : ۸۲

۵۵- الاغانی ۸ : ۹۳

۵۶- المبرد : الکامل ۴۴۴

۵۷- ابن سعد ۵ : ۱۳۵

۵۸- العقیق میں ایک کنواں بھی "بئر عروہ" کے نام سے مشہور تھا۔ دیکھو : معجم البلدان ۱ : ۴۲۳ ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴۔

۵۹- ابن سعد ۵ : ۱۳۵، ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴، البخاری : تاریخ

۶۰- ابن قتیبہ : المعارف ۱۴۴

۶۱- الطبری ۱ : ۱۷۶۵

۶۲- ابن سعد ۵ : ۱۴۴

۶۳- الذہبی : تہذیب (تحقیق FISCHER) ان رجال کے تراجم جن سے ابن اسحاق نے روایت کی۔

۶۴- ابن سعد ۵ : ۱۶۷

۶۵- ایضاً ۵ : ۱۶۴

۶۶- ایضاً ۵ : ۱۷۴

۶۷- ایضاً ۵ : ۱۷۳

۶۸- الطبری ۱ : ۱۱۸۰

۶۹- 〃 ۱ : ۱۲۲۴

۷۰- 〃 ۱ : ۱۲۳۴

۷۱- آیتہ یہ ہے : "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ فان انتھوا فان اللہ بما یعملون بصیر" (القرآن ۸ : ۳۹)

۷۲- الطبری ۱ : ۱۲۸۴

۷۳- 〃 ۱ : ۱۶۳۴

۷۴- 〃 ۱ : ۱۶۵۴

۷۵- 〃 ۱ : ۱۶۳۶

۷۶- 〃 ۱ : ۱۹۷۰

۷۷- 〃 ۱ : ۱۷۷۰

۷۸- 〃 ۳ : ۲۴۵۸

۷۹- ابن ہشام ۳ : ۲۴۰، الطبری : تفسیر ۸ : ۴۲

۸۰- آیۂ کریمہ ہے : یٰایھا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن وآتوھم ما انفقوا، ولاجناح علیکم ان تنکحوھن اذا آتیتموھن اجورھن، ولا تمسکوا بعصم الکوافر و سئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا، ذلکم حکم اللہ یحکم بینکم واللہ علیم حکیم۔ (القرآن ۶۰ : ۱۰)

۸۱- دیکھو حاجی خلیفہ۔

۸۲۔ الطبری ۱ : ۱۲۳۵

۸۳۔ ایضاً ۱ : ۱۲۳۷، ۱۲۸۸، ۱۶۲۵

۸۴۔ ابن سعد ۵ : ۱۳۳

۸۵۔ ابن حجر: تہذیب ۷ : ۱۸۲

۸۶۔ ایضاً ۷ : ۱۸۳

۸۷۔ البلاذری: فتوح ۱۷۹

۸۸۔ ذہبی بحوالہ FISCHER : BIOGRAPHIEN

۸۹۔ الاغانی ۴ : ۱۱۹

۹۰۔ ایضاً ۱ : ۶۴

۹۱۔ ایضاً ۴ : ۱۵

۹۲۔ المبرد : الکامل ۳۵۷

۹۳۔ الاغانی ۱۳ : ۱۰۵ و بعد

۹۴۔ ایضاً ۱۰ : ۶۰

۹۵۔ الطبری ۱ : ۲۳۴۸، الاغانی ۳ : ۱۵

۹۶۔ ابن حجر : تہذیب ۴ : ۳۲۱ و مابعد

۹۷۔ ایضاً ۴ : ۳۲۱

۹۸۔ ابن سعد ۵ : ۲۲۸، ابن حجر ۴ : ۳۲۱، الذہبی (تحقیق فیشر) نیز مجلہ جماعۂ مستشرقین جرمنی ۴۴ : ۱۲ Z.D.M.G XLIV.12

۹۹۔ یاقوت: معجم البلدان ۱ : ۲۶۹

۱۰۰۔ ابن حجر ۱۰ : ۳۶۱ (ابن حجر نے یہ خبر اس طرح بیان کی ہے: شرحبیل ابو سعد مغازی کے عالم تھے۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ جن لوگوں نے غزوہ بدر میں شرکت نہیں کی تھی یہ انھیں بھی شامل کر دیتے ہیں یا جو اُحد میں موجود نہیں تھے انھیں وہاں مقتول بتا دیتے ہیں۔ چونکہ یہ مفلس تھے اس لیے ان کا اعتبار جاتا رہا تھا۔ موسیٰ بن عقبہ نے جب سُنا تو کہا کہ لوگ اس شخص پر زیادتی کرتے ہیں جو بڑھاپے میں گھسٹ رہا ہے۔ انھوں نے شہدائے بدر و احد کے نام رجسٹر میں درج کر لیے اسی طرح مہاجرین حبشہ و مدینہ کو بھی لکھ لیا۔" اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ رجسٹر میں درج کرنے والے موسیٰ بن عقبہ تھے نہ کہ شُرحبیل بن سعد جیسا کہ جوزف ہورووتس نے سمجھا ہے۔ حسین نصار)

۱۰۱۔ ابن حجر ۴ : ۳۲۱

۱۰۲۔ ابن سعد ۵ : ۲۲۸

۱۰۳۔ ابن حجر ۴ : ۳۲۱

۱۰۴- الذہبی : ۴۳۷
۱۰۵- ابن حجر ۴ : ۳۲۱
۱۰۶- ابن سعد ا : ۱۶۰
۱۰۷- دہب کے لیے دیکھو:

LIDZBATSKI : DE LEGENDIS QUAE DICUNTUR PROPHETICIS

۱۰۸- الطبری ا : ۱۷۶۳
۱۰۹- ایضاً ا : ۱۷۶۳
۱۱۰- ابن حجر ۱۱ : ۱۶۸
۱۱۱- مصنف کتاب عرائس المجالس فی قصص الانبیاً ۔
۱۱۲- المسعودی : مروج الذہب ۲ : ۱۱۹ (طبع بولاق)
۱۱۳- الذہبی (تحقیق فیشر) : ۴۴۰
۱۱۴- ایسامعلوم ہوتا ہے کہ یمن کے اس گورنر کا تذکرہ دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔ ان کی گورنری کا زمانہ ۵۷ھ سے ۴۷ھ کے درمیان کسی وقت ہوگا جس عہد کے یمنی عالموں کے نام پردۂ خفا میں ہیں ۔
۱۱۵- الذہبی : ۴۴۰
۱۱۶- ایضاً : ۴۳۹، ابن سعد ۵ : ۳۹۶
۱۱۷- یاقوت : معجم الادباً ۷ : ۲۳۲، الذہبی : ۴۴۰
۱۱۸- الذہبی : ۴۴۰ ۔
۱۱۹- ایضاً : ۴۴۲
۱۲۰- الذہبی : ۴۴۲، ابن حجر ۱۱ : ۱۶۸ دہب کا سنہ وفات معلوم کرنے کے لیے دیکھو معجم الادباً ۷ : ۲۳۲ و ابن سعد ۵ : ۳۹۶ ۔
۱۲۱- باستثناء الطبری ا : ۱۴۱۶
۱۲۲- ابن سعد ۵ : ۳۹۶ - لزبرسکی ۴۴ و بعد
۱۲۳- ابن سعد ۷ : ۹۷
۱۲۴- ابن ندیم : الفہرست ۹۴
۱۲۵- دیکھو ابن قتیبہ : کتاب المعارف ۴ - جس میں "مبتدأ الخلق وقصص الانبیاً" کو فنون المعارف میں سے پہلا "فن" ظاہر کیا گیا ہے ۔
۱۲۶- منبر ۶ ۳ ۹۴
۱۲۷- معجم الادباً ۷ : ۲۳۲ ۔

۱۲۸- نسخۂ مصریہ من الف لیلۃ ولیلۃ : ۵۷

LA RECENCION EGYPTIENNE DES MILLE ET UNE NUITS 57 F

۱۲۹- یاقوت : معجم الادباء ۷ : ۲۳۲

۱۳۰- لزبرسکی : ۸ LIDZBARSKI : 8

۱۳۱- "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر" اور "کتاب التیجان" دونوں دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے چھپ گئی ہیں۔ انھیں علما کی ایک جماعت نے مستشرق کرنکوف کے مشورے سے ترتیب دیا ہے۔ موخرالذکر نے اسلامک کلچر (۱۹۲۸ء) میں اس پہ ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا۔ (مترجم)

۱۳۲- نمبر ۸۹۳۲ -

۱۳۳- ابن سعد ۷ : ۹۷ جہاں وہب کے پوتے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ وہب کی کتابوں اور "حکمت" کے پڑھنے والے تھے۔

۱۳۴- BIBLIOTHECA ARAB - HISPANA IX 129

۱۳۵- BIBIOTHECA ARAB-HISPANA VOl. IX P. 294

۱۳۶- معجم الادباء ۷ : ۲۳۲ - ابن حجر ۹ : ۱۶۸

۱۳۷- رقم ۱۲۴۶۴

۱۳۸- PAPYRI SCHOTT-REINHART NO. 8

۱۳۹- ابن سعد ۷ : ا : ۹۷ - ابن قتیبہ : معارف ۲۶۱ - فہرست : ۹۴ -

۱۴۰- "عبدالمنعم بن ادریس بن سنان بن ابنتہ وہب"۔ وہب کی دختر کے شوہر ادریس نہیں تھے جیسا کہ جوزف ہوروتس نے لکھا ہے بلکہ صحیح صورت وہ ہے جو ہم نے اوپر لکھی یعنی ادریس کے باپ سنان وہب کے نواسے تھے۔ ابوالیاس غالباً ان کی کنیت ہے۔ (فاروقی)

۱۴۱- مجھے کتب رجال میں ابوالیاس کے بارے میں کچھ نہیں ملا۔ وہب کے داماد ادریس بن سنان کی کنیت بھی ابوالیاس ہے۔ مگر ہائیڈل برگ کے اوراق بردی میں عام طور سے یوں ملتا ہے : "عبدالمنعم عن ابیہ عن ابی الیاس"۔ (ج۔ ھ)

عبدالمنعم کے باپ ابوالیاس کا ترجمہ دیکھیے ابن حجر : "تہذیب التہذیب ۱ : ۱۹۴"، بظاہر ہائیڈل برگ کے بردیہ کی عبارت محرّف ہے اور اس میں ایک "عن" زائد ہے۔ (مترجم)

۱۴۲- ابنِ ہشام ۴/۲۴۱ : "اور جب اُن کا وفد واپس ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عمرو بن حزم کو اُن کی طرف بھیجا تاکہ انھیں اسلامی شعائر اور اصولِ دین کی تعلیم دیں اور اُن سے صدقات وصول کریں۔"

۱۴۳- الطبری ۱/۱۸۵۲ : "رسول اللہ نے سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے بعد جن عالموں کو یمن کی طرف بھیجا تھا یہ اُن میں سے ایک تھے۔ باذام کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کی ولایت شہر بن باذام، عامر بن شہر الہمدانی، عبداللہ بن قیس، ابوموسیٰ الأشعری، خالد بن سعید بن العاص، طاہر بن ابی ہالہ، یعلی بن اُمیّہ اور عمرو بن حزم میں تقسیم کر دی گئی تھی۔" الطبری تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب رسول اللہؐ نے انتقال فرمایا تو عمرو بن

حزم نجران کے عامل تھے (۱/۱۹۸۲)

۱۴۴- الطبری ۲/۴۱۷

۱۴۵- الطبری ۲/۱۱۹۱: "یہ اس سال (۸۰ھ) مدینہ کی قضا پر فائز تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے ابوبکر بن عمرو بن حزم فائز تھے"۔ نیز الطبری کا بیان ہے (۲/۱۲۵۸) کہ عثمان بن حیان ۹۳ھ میں مدینے کے والی ہو کر آئے اور انہوں نے ابوبکر بن حزم کو قاضی مقرر کیا"۔

۱۴۶- الذہبی: (تحقیق: فیشر۔ تراجم ۹۰) "ابنِ وہب نے مالک سے روایت کی کہ اہلِ مدینہ میں کسی کو اتنا علم اور تجربہ قضا کا نہیں تھا جتنا ابوبکر بن حزم کو تھا۔ نیز دیکھو: ابنِ حجر ۱۲/۳۹۔

۱۴۷- الذہبی: ۹۰ "عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے بیان کیا کہ اُن کے باپ نے ابان بن عثمان سے قضا سیکھی تھی"۔

۱۴۸- الذہبی: ۸۹ "انھیں سلیمان سے اور عمر بن عبدالعزیز سے قضا اور امارۃ اور موسم (امارۃ حج) مدینہ کے لیے حاصل تھا"۔ نیز دیکھو: الطبری ۲/۱۲۸۲ و ۱۳۰۵۔

۱۴۹- ابن حجر: ۱۲/۳۹ "ابوبکر بن حزم کے سوا انصارِ مدینہ میں سے کوئی امیر نہیں ہوا۔ یہ وہاں کے قاضی بھی تھے"۔

۱۵۰- الطبری ۲/۱۳۴۶ "اس سال (۹۹ھ) ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے لوگوں کے ساتھ حج کیا یہ مدینہ میں عمر ثانی کے گورنر تھے"۔ نیز الطبری کہتا ہے "اس سال (۱۰۰ھ) ابوبکر بن محمد بن حزم نے لوگوں کے ساتھ حج کیا"۔ (الطبری/۱۳۵۸)

۱۵۱- الطبری ۲/۱۳۷۳ "ابوبکر بن حزم سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ: جب عبدالرحمٰن ابن الضحاک مدینے میں داخل ہوا اور اس نے مجھے معزول کیا تو ایک دن میں اُس سے ملنے گیا"۔

۱۵۲- الطبری ۲/۱۳۷۳۔ "اور یہ معاملہ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس بنو فہر (یعنی قریش) کے ایک شخص اور ایک نجاری (انصاری) کا مقدمہ پیش ہوا تو اُنھوں نے نجاری کے حق میں فیصلہ دیا۔ [یہاں قومی عصبیت کی پاسداری مراد ہے۔ بنو نجار انصاری مدنی تھے اور بنو فہر قریشی مکی] (نثار احمد فاروقی)

۱۵۳- الطبری ۲/۱۴۵۲۔ الواقدی کہتا ہے کہ خالد کی معزولی کے دن ابوبکر بن عمرو بن حزم کو خط ملا، جس میں اسے مدینے کا والی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ وہ منبر پر چڑھے اور چھ دن تک نماز پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ محمد بن ہشام مکہ سے آکر مدینے کے گورنر ہوئے۔

۱۵۴- الذہبی/۹۱۔ "الہیثم بن عدی، یحییٰ بن بکیر اور ابو مثنیٰ نے کہا کہ انھوں نے ۱۱۷ھ میں انتقال کیا۔ واقدی، ابن سعد اور ایک جماعت کا قول ہے کہ ۱۲۰ھ میں فوت ہوئے"۔

۱۵۵- الذہبی/۹۱ "یہ اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا کرتے تھے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم حدیث سے شغف رکھتے ہو، اور محدثوں کی صحبت میں بیٹھتے ہو کسی حدیث میں آگے نہ بڑھنا جب تک اس کا پچھلا حصہ نہ سن لو اور پھر پورے سیاق و سباق کی روشنی میں استدلال کرنا"۔

۱۵۶- ابن سعد ۲/۱۳۴ "عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد ابن عمرو بن حزم کو لکھا: "أن أنظر ما كان من حديثِ رسولِ اللهِ صلّى اللهُ عليهِ وسلّمَ أو سنّةٍ ماضيةٍ أو حديثِ عمرةَ بنتِ عبدِ الرحمنِ فاكتبه. فإنّي قد خِفتُ

أهل العلم وذهابَ أهلِه" اور ابن حجر کہتا ہے (۱۲/۳۹) ابن وہب نے مالک سے روایت کی "جنھیں عمر بن عبدالعزیز نے والی بنایا تھا۔ اور انھیں لکھا کہ عَمْرۃ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اُسے قلمبند کر لیں"۔

۱۵۷۔ ابن حجر ۱۲/۴۳۸ "عَمرۃ بنت عبدالرحمٰن بن سَعد بن زرارۃ، انصار مدینہ میں سے تھیں اور حضرت عائشہؓ کی سہیلی تھیں، جن سے انھوں نے روایت کی ہے۔ اُمِ ہشام بنت حارثہ بن النعمان اور حبیبہ بنت سَہل ان کی خالائیں تھیں"۔

۱۵۸۔ ابن حجر ۱۲/۳۹ "میں نے اُن کے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر سے ان کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ضائع ہو گئیں۔

۱۵۹۔ الطبری ۳/۲۵۰۵ "اور محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمر بن حزم مدینے کے قاضی تھے۔ یہ مسجد میں مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بنو عباس کے ابتدائی عہد یعنی ۱۳۲ھ میں وفات پائی اس وقت اُن کی عمر ۷۲ سال تھی۔

۱۶۰۔ ابن حجر/۱۶۵ ج ۵ "مالک نے کہا کہ: مجھ سے ابن عزابہ نے بیان کیا۔ کہا: کہ مجھ سے ابن شہاب نے کہا" مدینے میں کون ہے (یعنی سب سے ممتاز عالم) بتاؤں؟" اور کہا کہ: عبداللہ بن ابی بکر کی مثل کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ پسند نہیں کرتے کہ جب تک اُن کے والد بقید حیات ہیں ان کی قابلیت کا شہرہ زیادہ کیا جائے"۔

۱۶۱۔ ابن حجر/ج ۵ ص ۱۶۵۔ "انھوں نے ۱۳۵ھ میں انتقال کیا، بعض نے ۱۳۰ھ لکھا ہے، یہ بھی کہتے ہیں، انھوں نے ۷۰ سال کی عمر پائی"۔

۱۶۲۔ الطبری ۳/۲۵۰۵۔

۱۶۳۔ الفہرست/۲۲۶ "عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم انصاری ۱۷۶ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، جہاں وہ ہارون کی طرف سے قاضی تھے۔ اُن کی کئی کتابیں ہیں، جن میں سے ایک "کتاب المغازی" ہے"۔ اور ابن سعد (۷، ق ۲ ص ۶۵) کہتا ہے کہ: "یہ قلیل الحدیث تھے"۔

۱۶۴۔ وِلہوزن نے اپنی فہرست میں سَہواً ان کا نام بجائے عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی بکر کے عبدالرحمٰن بن ابی بکر لکھ دیا ہے۔

۱۶۵۔ الطبری ج ۱: ص ۳۰۰۹ "محمد نے کہا، مجھ سے عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز نے، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے حوالے سے بیان کیا کہا کہ" موذن آیا اور اس نے عثمان کو نماز کی اطلاع دی تو انھوں نے کہا کہ میں گھر سے نکل کر نماز نہیں پڑھوں گا، جو لوگ پڑھنے والے ہیں اُن سے جا کر کہو"۔

۱۶۶۔ الطبری ۱/۳۰۰۵ " لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے کہ عمرو بن حزم نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ اُن کا گھر عثمان بن عفان کے پڑوس میں تھا"۔

۱۶۷۔ الطبری ۱/۲۹۸۹ "عمرو بن حزم انصاری نکل کر مصریوں کے پاس آئے، جو 'ذی خشب' میں موجود تھے اور انھیں یہ خبر سُنائی، پھر اُن کے ساتھ چل کر مدینے آئے"۔ نیز دیکھو الطبری ۱/۳۰۰۱۔ ۳۰۲۱۔

۱۶۸۔ ابن ہشام ۴/۳۱۴ "ابن اسحٰق نے کہا: مجھ سے عبداللہ بن ابی بکر نے اُن سے اُن کی بیوی فاطمہ بنت عمارۃ نے اور اُن سے عَمرۃ بنت

عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارۃ نے اور اُن سے عائشہ نے "۔

۱۶۹ - الطبری ۱/۱۸۲۷۔ مگر ابن ہشام صرف یہ کہتا ہے کہ " محمد بن اسحٰق نے کہا کہ مجھ سے یہ واقعہ فاطمہ نے بیان کیا "۔

۱۷۰ - ابن ہشام ۴/۱۶۵

۱۷۱ - ابنِ جریر الطبری ۳/۲۴۳۱ - " عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو ابن حزم نے کہا کہ رسول اللہ کی صاحبزادی زینب کی وفات شروع سنہ ۸ھ میں ہوئی "۔ نیز ۳/۲۴۴۷ میں ہے : " عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے کہا کہ جس نے اِن کی (مراد اُمّ حبیبہؓ زوج النبیؐ) شادی کرائی اور جس شخص کے پاس نجاشی نے (حبشہ میں) شادی کا پیغام بھیجا وہ خالد بن سعید بن العاص تھے اور یہ ۷ھ کا واقعہ ہے "۔

۱۷۲ - الطبری ۱/۱۷۵۹ - " محمد بن اسحٰق نے کہا کہ عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا آپؐ نے جن غزوات میں بنفسِ نفیس شرکت فرمائی - اُن کی تعداد ۲۶ ہے۔ ان میں پہلا غزوہ ' ودّان ' ہے اسی کو " غزوۃ الابواء " بھی کہتے ہیں پھر غزوۂ بواط "۔ الخ - نیز دیکھیے الطبری ۱/۱۷۵۸ - " مجھ سے محمد بن اسحٰق نے اُن سے عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا اور کہا کہ مدینے آنے کے وقت سے وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعوث و سرایا کی تعداد ۳۵ ہوتی ہے "۔

۱۷۳ - الطبری ۱/۱۷۱۷ " مجھ سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے عبداللہ بن ابی بکر نے، بیان کیا : کہا کہ رسول اللہ کے پاس ملوکِ حمیر کا خط آیا تو رسول اللہ نے انھیں جواب میں لکھا : " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - من محمد النبی رسول اللہ إلی الحارث بن عبد کلال ...... الخ "۔

۱۷۴ - ابنِ ہشام ۴/۲۴۱ " ان کے وفد کی واپسی کے بعد رسول اللہ نے اُن کی طرف عمرو بن حزم کو ارسال فرمایا تاکہ وہاں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کریں، انھیں سنت اور معالم اسلام سکھائیں، اُن سے صدقات وصول کریں - انھیں رسول اللہ نے ایک خط لکھ کر دیا تھا جس میں اُن کی ذمہ داریاں درج تھیں اور احکامات بیان کیے گئے تھے، وہ یوں تھا : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - ھذا بیان من اللہ ورسولہ ..... الخ "۔

۱۷۵ - ابنِ ہشام ۳/۱۰۸ -

۱۷۶ - ابنِ ہشام ۴/۱۳ و ۱۸ - الطبری ۱۷۲۲ اور ۱۷۲۴ - ابن ہشام کے یہاں ان فقروں میں عبداللہ کا نام نہیں آیا ہے - دیکھو ابنِ ہشام ۴/۲۲۸ و ۲۳۰ نیز الطبری ۱۹۰۵ و ۲۳۵۴ -

۱۷۷ - النقائض (تحقیق : بیون) ۵۴۶ - نیز ملاحظہ ہو : الاغانی ۸/۱۹۳ - ۱۹/۲۸ -

۱۷۸ - ابنِ ہشام ۲/۳۴۳ " ومن بنی ظفر ثم من بنی سواد بن کعب وکعب ھو ظفر ... قتادۃ بن النعمان "

۱۷۹ - الواقدی (نشر، ولہوزن) ۳۵۸ -

۱۸۰ - ابنِ حجر ۷/۴۸۹ " عمر بن قتادۃ بن نعمان الظفری الانصاری المدنی - روی عن أبیہ وله صحبة، عن علی بن الحسین - روی عنه ابنه عاصم "

۱۸۱ - ابنِ سعد کا جو مخطوطہ ہمیں دستیاب ہے - اُس میں عاصم کا ترجمہ نہیں ملتا، مگر الذہبی (نشر فیشر) اور ابنِ حجر ۵/۵۳ - نیز المزی

(رک: سخاؤ "دراسات") ۴۱ - نے اُس کا اقتباس دیا ہے - ابن سعد کہتا ہے: "كَانَ رَوايَةٌ لِلعِلمِ وَلَهُ عِلْمٌ بالمغازي وَالسِّيرَةِ - اَمَرَهُ عُمَرُ بنُ عَبدِ العَزِيزِ أنْ يَجْلِسَ فِي مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَيُحَدِّثَ النَّاسَ بالمغازي وَمَنَاقِبِ الصَّحَابَةِ فَفَعَلَ"

اور الذہبی ۲۲ میں ہے: "وَفَدَ عَلَى عُمَرَ بنِ عبدِ العَزيزِ فَقَضَى دَيْنَهُ وَاَمَرَهُ أنْ يَجْلِسَ فِي مَسْجِدِ

۱۸۲ - ابن قتیبہ: المعارف ۲۳۶: "دِمَشْقَ فَيُحَدِّثَ النَّاسَ فَفَعَلَ. ثُمَّ رَجَعَ الَى المَدِينَةِ"

هوصاحبُ السِّيَرِ وَالمَغَازِي"

۱۸۳ - الذہبی ۲۲: "وَثَّقَهُ ابن معين وجماعة" ابن معین اور ایک گروہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔

۱۸۴ - ابن قتیبہ، المعارف ۲۳۶: "تُوفي سَنَةَ عشرين ومِئَة" ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔

۱۸۵ - ابن ہشام: ۲/۶۷/۴/۱۳

۱۸۶ - ابن ہشام: ۲/۸۹: "وَأَمَّا عاصِمِ بن عمر بن قَتَادَة فَقَالَ: وَاللهِ، مَاقَالَ ذلكَ العَبَّاسُ إلَّا لِيَشُدَّ العَقْدَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَأَمَّا عَبدُ اللهِ بن ابي بكر فَقَالَ مَا قَالَ ذلكَ العَبَّاسُ إلَّا لِيُؤَخِّرَ القَوْمَ تِلْكَ اللَّيْلَةَ رَجَاءَ أنْ يَحْضُرَهَا عَبدُ اللهِ بنُ أبي سَلُول فَيَكُونَ أقْوَى لِأَمْرِ القَوْمِ" (اور عاصم بن عمرو بن قتادہ نے کہا کہ خدا کی قسم العباس نے یہ بات اس نیت سے کہی تھی کہ قوم کو رسول اللہ سے کیے ہوئے عہد کا پابند بنا دیں۔ مگر عبداللہ بن ابی بکر کا قول ہے کہ اس کا مقصد اُس رات میں لوگوں کو اتنا ٹھہرانا تھا کہ عبداللہ بن ابی سلول آ جاتے جو قوم کا ایک با اثر شخص تھا۔)

۱۸۷ - الذہبی/۴۳" المزی نے کہا، احمد بن صالح المصری نے کہا کہ لوگ اُن کی ولادت ۵۰ھ میں بیان کرتے ہیں اور خلیفہ نے کہا کہ ۵۱ھ ہے اور ابن بکیر نے کہا کہ ۵۶ھ صحیح ہے۔"

۱۸۸ - ابن قتیبہ: المعارف: ۲۳۹" ان کے دادا عبداللہ بن شہاب معرکۂ بدر میں مشرکین کے ساتھ لڑے تھے۔"

۱۸۹ - ایضاً۔ یہ اُن لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے یوم اُحد میں باہم عہد کیا تھا کہ اگر رسول اللہؐ ہماری نظر پڑیں گے تو ہم انھیں قتل کر دیں گے یا اُن سے لڑتے ہوئے کام آ جائیں گے۔ یہ لوگ عبداللہ بن شہاب، اُبَیّ بن خلف، ابن قمیئہ اور عتبہ بن ابی وقاص تھے۔"

نیز ملاحظہ ہو: الواقدی (ولہوزن) ۱۱۶ - ابن سعد ج ۲ ق ۱ ص ۴۲

۱۹۰ - ابن ہشام ۳/۸۴" ابن ہشام نے کہا کہ ربیع بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید الخُدری نے اپنے باپ سے اور انھوں نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا کہ اُس دن عتبہ بن ابی وقاص نے رسول اللہ پر تیر چلاتے جن سے آنحضرت کے نچلے داہنی طرف کے دانت شہید ہو گئے اور نچلا ہونٹ زخمی ہوا اور عبداللہ بن شہاب الزہری نے آپ کی پیشانی کو زخمی کیا۔"

۱۹۱ - ابن ہشام ۳/۸۵ نیز الطبری ۱/۱۴۰۷ -

۱۹۲ - ابن قتیبہ ۲۳۹" وَكَانَ أبُو مُسْلِمٍ بن عَبدِ اللهِ مع ابن الزُّبَير"

۱۹۳ - ابن حجر ۹/۴۵۱ " وَرَوَى عَنْبَسَةُ عن يونس عن ابن شِهاب قال: وَفَدْتُ الى مروان وَأنَا مُحْتَلِمٌ" (ابن

شہاب سے کہا جب میں مروان سے ملا ہوں تو بالغ ہو چکا تھا۔)

۱۹۴۔ ابن سعد ۵/۱۵۸

۱۹۵۔ تاریخ الیعقوبی (تحقیق: ہوتسما) ۲/۳۱۱ "وقالوا: وتمنعنا من حج بیت اللہ الحرام وھو فرض من اللہ علینا۔ فقال لھم عبد الملک: ھذا ابن شہاب الزھری یحدثکم أن رسول اللہ قال: لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد المسجد الحرام ومسجدی ومسجد بیت المقدس۔ (لوگوں نے کہا کہ تم ہمیں حج سے روکتے ہو حالانکہ وہ ہم پر اللہ کی طرف سے فرض ہوا ہے۔ عبدالملک نے کہا یہ ابن شہاب الزہری موجود ہیں تمھیں حدیث سنائیں گے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تین مسجدوں کے لیے سفر کیا جاتا ہے، ایک مسجد بیت الحرام، دوسری میری مسجد اور تیسری مسجد بیت المقدس"۔ (عبدالملک کا مطلب یہ تھا کہ وہاں مکہ میں عبداللہ بن الزبیر کا قبضہ ہے تو دمشق والے بیت المقدس کی زیارت کے لیے جا سکتے ہیں۔ اس کا بھی اتنا ہی ثواب ہے جتنا بیت اللہ کی زیارت کا ہے۔ فاروقی)

۱۹۶۔ البلاذری: الانساب (نشر آہورڈ): ۱۵۹ "المدائنی عن ابراھیم بن سعد: ان عبد الملک رأی فی منامه کان أمراتہ المخزومیة قلعت رأسه، ثم قطعت منه عشرین قطعة فبعث الی سعید بن المسیب من سأله عن الرؤیا، فقال: تلد منه ولدا یملک عشرین سنة۔" (المدائنی نے ابراہیم بن سعد سے روایت کی کہ عبدالملک نے ایک بار خواب میں دیکھا گویا اس کی مخزومی بیوی نے اُس کا سر اکھاڑ لیا ہے اور اُس پر بیس ٹھوکریں لگائی ہیں۔ خلیفہ نے سعید بن المسیب سے تعبیر معلوم کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا۔ سعید نے یہ تعبیر دی کہ اس عورت سے تمھارے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بیس سال حکومت کرے گا۔") اور اسی کتاب میں (۲۲۳) ہے: "المدائنی قال: رأی عبد الملک کانه بال فی الکعبة فبعث الی سعید بن المسیب من سأله عن ذلک" (المدائنی نے کہا کہ عبدالملک نے خواب میں دیکھا کہ خانۂ کعبہ میں پیشاب کر رہا ہے تو اُس نے سعید بن المسیب کے پاس تعبیر پوچھنے کے لیے آدمی بھیجا۔")

۱۹۷۔ ابن سعد ۵/۹۱۔ مگر انساب البلاذری (ص ۲۲۳) میں راوی کا نام حبیب بن منیع ملتا ہے۔

۱۹۸۔ الطبری ۲/۱۰۵۱ "اور اس سال (۸۱ھ) عبدالرحمٰن ابن محمد بن الاشعث نے حجاج کی مخالفت کی اور اس سے جنگ کے لیے خروج کیا۔ یہ ابومخنف کا قول ہے جس کی روایت اس نے ابوالمخارق الراسبی کے حوالے سے کی ہے۔ مگر الواقدی کا خیال ہے کہ یہ واقعہ ۸۲ھ کا ہے۔

۱۹۹۔ البخاری۔ تاریخ/۹۳ "میں ابن الاشعث کی بغاوت کے زمانے میں دمشق آیا۔"

۲۰۰۔ ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۵۷ "قبیصۃ بن ذویب ..... ان سے الزہری نے روایت کی ہے اور یہ عبدالملک بن مروان کے خاتم بردار تھے۔"

۲۰۱۔ البلاذری الانساب ۲۵۷ "قبیصۃ بن ذویب نے کہا: "معاویہ کی خلافت کے آخر زمانے میں رات کو ہم مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، یعنی میں مصعب بن الزبیر ..... اور عبدالملک بن مروان"

۲۰۲- ابن سعد ۷/ ۱۵۷ "انھوں نے الزہری کو عبدالملک بن مروان کے دربار میں داخل کرایا تھا" نیز دیکھو ابن قتیبہ: المعارف ۲۲۸-

۲۰۳- الذہبی: ۷۰ "قبیصۃ بن ذؤیب کی صحبت میں رہا۔ پھر عبدالملک نے ایک دن حلقے میں ایک آدمی بھیج کر دریافت کرایا کہ تم میں سے امہات الاولاد کی وراثت کے قانون کسے یاد ہیں تو میں نے کہا: "مجھے" چنانچہ عبدالملک کے پاس مجھے بھیج دیا گیا۔ اس نے پوچھا: تم کون ہو۔ میں نے اپنا نام و نسب ظاہر کیا، تو کہنے لگا اگرچہ تمہارا باپ فتنوں میں خوں ریزیاں کرتا تھا، مگر خیر بیٹھو پھر کچھ مسئلے پوچھتا رہا اور آخر میرا قرض ادا کر دیا"

۲۰۴- الذہبی: ۷۰ "ضاقت حالُ الزّهري فخرج الى الشّام" (الزہری کا حال تنگ ہوا تو وہ شام کو چلے گئے۔)

۲۰۵- البخاری (تاریخ) ۹۳ "قال: مَنْ انتَ قلتُ: محمّد بن مُسلم بن عُبَيد الله. ثمّ كَتَبَ الى هشام بن اسمٰعيل ان ابعَثْ الى سَعِيد بن المسيّب فسَلْهُ" (اس نے پوچھا، تم کون ہو۔ میں نے کہا: میں محمد بن مسلم بن عبید اللہ ہوں۔ پھر خلیفہ نے ہشام بن اسمٰعیل کو لکھا کہ سعید بن المسیب کے پاس کسی کو بھیج کر معلومات حاصل کرو۔)

۲۰۶- ابن سعد ۷/ ۱۵۷- ابن قتیبۃ: المعارف ۲۲۸ "ووصله ففرض له وصار من اصحابه" (یہ اس سے ملے، اس نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ اس کے ندیموں میں شامل ہو گئے۔)

۲۰۷- البخاری: (تاریخ) ۱۰۴ "قال: سمعت الزّهريّ قال: قَدِمْتُ على الوليد ابن عبدالملك اخطب اليه ابنة عمّي، ابنة مالك بن شهاب. تتخشّينا فخرجنا..." (کہا میں نے الزہری کو کہتے سنا، میں الولید بن عبدالملک کے پاس اپنے چچا مالک بن شہاب کی بیٹی کا رشتہ لینے گیا۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا، پھر چلے.....)

۲۰۸- الفہرست میں کتاب کا یہی نام لکھا ہے، مگر یہ غلط ہے۔ صحیح یوں ہوگا: "كتاب الزّهري وابنةعمّه الذين سار الى هشام بن عبد الملك" (ح- نصار)

۲۰۹- الفہرست ۳۰۷

۲۱۰- ابن عبدالحکم، (تحقیق: ٹوری) ۱۰۴: "ثمّ خاصمهما الاصبغ اليه، وابنُ شهاب قاضيه يومئذٍ فقضى ابن شهاب لابن خارجة بالدّار" (اس کے بارے میں الاصبغ نے جھگڑا کیا۔ ابن شہاب اس زمانے میں قاضی تھے انہوں نے گھر کا فیصلہ ابن خارجہ کے حق میں کیا۔)

۲۱۱- الذہبی: ۷۲- "جعل يزيدُ بن عبد الملك ابنَ شهاب قاضياً" (یزید بن عبدالملک نے ابن شہاب کو قاضی بنا دیا تھا) ابن قتیبۃ: ۲۳۹- "وكان يزيد بن عبد الملك استقضاه" (اور یزید بن عبدالملک ان سے مقدمات فیصل کراتا تھا)

۲۱۲- الاغانی ۴/ ۴۹

۲۱۳- الطبری ۲/ ۱۴۵۶- "قال محمّد بن عمر حدّثني ابراهيم بن عبد الله بن ابي فروة عن الزّهري: قال: قلتُ لعبيد الرّحمن بن الضحّاك انّك تَقدم على قومك وهم ينكرون كلّ شيءٍ خالفت فعدّ فمالُم ما اجمعوا عليه..... قال الزّهري فلم يأخذ بشيءٍ من ذلك وعادى الانصار طرًّا وضرب ابابكر بن حزم ظلماً وعدواناً

نزیطن فما بقی منہم شاعر الا عیابہ ولا صاحب الا عابہ ولا ثناہ بانتقیم " (محمد بن عمر نے کہا: مجھ سے ابراہیم بن عبداللہ بن ابی فروۃ نے الزہری کے حوالے سے بیان کیا، کہا: " میں نے عبدالرحمن بن الضحاک سے کہا، "تم اپنی قوم میں (گورنر ہو کر) جا رہے ہو۔ یہ لوگ ہر اُس بات کو ناپسند کرتے ہیں جو اُن کے قومی رواج کے خلاف ہو، اس لیے جس بات پر اُن کا اجماع ہو تم بھی اُسی کی پابندی کرنا ..... الزہری نے کہا، مگر اُس نے ان میں سے ایک بات بھی نہیں مانی، اور سارے انصاریوں کو دشمن بنا لیا اُس نے ابوبکر بن حزم کو بلا وجہ ظلم وتشدد کر کے پٹوایا۔ ایک شاعر بھی ایسا نہیں بچا جس نے اُس کی ہجو نہ لکھی ہو اور نہ کوئی ورد نشیں ایسا تھا جس نے اُس پر ملامت نہ کی ہو، اور بُرا بھلا نہ کہا ہو۔"

۲۱۴ - الذہبی : ۷۱

ذرذا ۔ داثنِ علیٰ اکریم محمدٍ   واذکر فواضلہ علی الاصحاب

واذا یُقال مَن الجواد بمالہ   قیل الجواد محمد بن شہاب

اهلُ المدائن یعرفون مکانہ   وربیعُ نادیہ علی الاعراب

("یہ سب چھوڑو، اور دریا دل محمد کی ثنا خوانی کرو، اور اُسے اپنے ساتھیوں پر جو فضیلتیں حاصل ہیں اُن کا بیان کرو، جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ سخاوت کرنے والا کون ہے ؟ تو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ محمد بن شہاب۔ مدائن والے بھی اُس کا مرتبہ جانتے ہیں اور اُسے عربوں میں جو عزت حاصل ہے اُس سے واقف ہیں۔")

۲۱۵ - الذہبی : ۶۸۔

۲۱۶ - ایضاً ۷۰/۱ قال : سعید بن عبد العزیز: ادی هشام عن الزهری سبعة آلاف دینارٍ دیناً" (سعید بن عبدالعزیز نے کہا کہ ہشام نے الزہری کا سات ہزار دینار کا قرض چکایا تھا۔)

۲۱۷ - ایضاً ۷۰/۱ "وکان یؤدب ولدہ" (یہ اُس کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔)

۲۱۸ - ابن خلکان ۵۷۱/۱۔

۲۱۹ - الذہبی : ۷۲

۲۲۰ - یہاں بھی فاضل مضمون نگار سے ترجمے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل عبارت ہے "إنا إن نھتیج الشیخ وذکر کلمۃ" اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو ہم نے درج کیا۔ (فاروقی)

۲۲۱ - فاضل مضمون نگار نے یوں لکھا ہے کہ "ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تمہاری روایت اخذ کریں"۔ لیکن الذہبی کی اصل عبارت ہے۔

" ما ینبغی لنا ان نحمل عن مثلک" جس کا ترجمہ ہماری رائے میں وہی ہے جو اوپر درج کیا گیا۔ (فاروقی)

۲۲۲ - البخاری : (مغازی) "عن الزھری، قال : قال لی الولید بن عبد الملک ابلغک ان علیاً کان فیمن قذف عائشۃ" (الزہری نے کہا کہ مجھ سے ولید بن عبدالملک نے پوچھا کیا تمہیں ایسی کوئی روایت ملی ہے کہ عائشہ پر الزام لگانے والوں میں سے ایک علی بھی تھے) نیز ملاحظہ ہو فتح الباری میں اس کے ہم مضمون فقرے (ج ۳۳۶/۷) اور محمد بن اسحٰق (ت : فیوک) ۱۰۔ توضیح نمبر ۳۴۔

۲۲۳ - کتاب الاغانی ۶/۱۰۶ -

۲۲۴ - ایضاً "حدثنی ..... مصعب عن ابی الزناد، قال: اجمع الزهری علی ان یدخل الی بلاد الروم ان ولی الولید بن یزید - فمات الزہری قبل ذلک (مجھ سے کہا .... مصعب نے ابوالزناد سے روایت کیا کہ الزہری نے طے کر رکھا تھا کہ جب الولید بن یزید حاکم ہوگا تو وہ رومی مملکت میں چلے جائیں گے مگر الزہری اس کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی مر گئے -)

۲۲۵ - الذہبی : ۱۴۷ "قال ضمرة بن ربیعة وغیره، مات سنة ثلاث وعشرین وهذا وهم - وقال ابراهیم بن سعد وطائفة سنة اربع وعشرین - وقال الزبیر بن بکار وغیره سنة اربع فی سابع عشر رمضان بشغب فی امواله - وشذ ابن یونس الصدفی فقال: فی رمضان سنة خمس وعشرین ومائة والصحیح سنة اربع " (ضمرة بن ربیعہ وغیرہ نے کہا کہ ۱۲۳ھ میں مرے مگر یہ مغالطہ ہوا ہے - ابراہیم بن سعد اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ ۱۲۴ھ سال وفات ہے - الزبیر بن بکار وغیرہ کا قول ہے ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ کو شغب میں اپنی جاگیر میں فوت ہوئے ابن یونس الصدفی اپنے اس قول میں تنہا ہے کہ رمضان ۱۲۵ھ میں انتقال کیا - ان میں صحیح قول ۱۲۴ھ ہی ہے -

۲۲۶ - ابن قتیبہ ۲۳۹ " ودفن بماله علی قارعة الطریق لیمر مار فیدعو له والموضع الذی به آخر عمل الحجاز واول عمل فلسطین وبه ضیعته " (یہ اپنی جاگیر میں شارع عام پر دفن کیے گئے تاکہ ادھر سے گذرنے والے فاتحہ پڑھیں اور یہ جگہ صوبۂ حجاز کی آخری حد اور صوبۂ فلسطین کی ابتدائی حد پر واقع ہے، یہاں ان کا گانو ہے -)
نیز دیکھو : محمد بن اسحق (فیوک) ۱۰ - توضیح نمبر ۳۹ -

۲۲۷ - الذہبی : ۱۴۰ " وفد الزهری علی عبد الملک واستوطن الشام وکان یتردد الی الحجاز ویحج " (الزہری عبدالملک سے ملے اور شام کو اپنا وطن بنا لیا مگر وہ حجاز کو جاتے رہتے تھے اور حج بھی کرتے تھے)

۲۲۸ - الطبری ۲/۱۴۳۵ " وحج بالناس فی هذه السنة (یعنی سنه ۱۱۹ھ) ابو شاکر مسلمة بن هشام بن عبد الملک وحج معه ابن شهاب الزهری فی هذه السنة "
(اس سال یعنی ۱۱۹ھ میں ابو شاکر مسلمہ بن ہشام بن عبدالملک امیر حج تھے اور اسی سال اُن کے ساتھ ابن شہاب الزہری نے بھی حج کیا -)

۲۲۹ - ابن سعد ۲/۱۳۱ " کنت اجالس عبد الله بن ثعلبة بن صعیر العذری اتعلم منه نسب قومی، فاتاه رجل جاهل یسأله عن المطلقة واحدة تنتین ثم تزوجها رجل فدخل بها ثم طلقها، علی کم ترجع الی زوجها الاول - قال " لا ادری، اذهب الی ذاک الرجل واشار له الی سعید بن المسیب - قال: فقلت فی نفسی، هذا اقدم من سعید یذکر انه عقل رسول الله صلی الله علیه وسلم مج علی وجهه تمره، فاتبعت السائل حتی سأل سعید بن المسیب فلزمت سعیداً فکان هو الغالب علی علم المدینة والمستفتی ..... وکان لسعید بن المسیب عند الناس قدر کبیر " (میں عبداللہ بن ثعلبہ بن صعیر العذری کی صحبت میں بیٹھتا تھا اور اُن سے اپنی قوم کا نسب سیکھتا تھا - ایک دن اُن کے پاس ایک جاہل شخص آیا اور اس نے ایک ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ پوچھا جسے پہلے دو بار طلاق دی گئی پھر اس سے دوسرے شخص نے نکاح کیا اور خلوت صحیحہ کے بعد اُسے طلاق دے دی - تو اب وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس کتنی عدت گذار کر واپس

جا سکتی ہے - انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں - تم اس شخص کے پاس جاؤ اور سعید بن المسیب کی طرف اشارہ کیا - الزُّہری نے کہا کہ میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو عمر میں سعید سے بڑے ہیں اور مجھے بتلاتے تھے کہ انہوں نے (عالم شیرخوارگی میں) رسول اللہ کا زمانہ پایا تھا اور آنحضرتؐ نے (برکت کے لئے) ان کے منہ میں کلی کی تھی - میں اُٹھ کر سائل کے پیچھے ہو لیا، یہاں تک کہ اس نے سعید سے مسئلہ پوچھ لیا - اب میں نے سعید کی خدمت میں حاضری کو لازم کر لیا - وہ مدینہ کے علم پر حاوی تھے اور اُن سے فتاوی لیے جاتے تھے۔ ... سعید بن المسیب کو لوگوں میں بڑی عزت حاصل تھی .....)

۲۳۰ - الذہبی ۹۹ -

۲۳۱ - ابن سعد ۱۳۱/۲ "كنتُ اجالس ثعلبة بن ابي مالك قال: فقال لى يوماً تريد هذا. قال. قلتُ: نعم. قال: عليك بسعيد بن المسيب قال فجالسته عشر سنين كيوم واحد" (میں ثعلبۃ بن ابی مالک کے پاس بیٹھا کرتا تھا - ایک دن انھوں نے کہا کیا تم یہ (فقہی مہارت) چاہتے ہو - میں نے کہا "جی ہاں" بولے تو پھر سعید بن المسیب کی خدمت کو لازم کر لو - بولے: "میں پھر دس سال تک ان کی مجلس میں اس طرح (بلا ناغہ) حاضر رہا جیسے یہ ایک ہی مسلسل دن تھا -)

۲۳۲ - ایضاً "عن معمر قال، سمعتُ الزهرى يقول: ادركتُ من قريش اربعة بحورٍ: سعيد بن المسيب وعروة بن الزبير وابا سلمة بن عبد الرحمٰن وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة" معمر نے کہا میں نے الزہری کو کہتے سنا ہے کہ میں نے قریش میں (علم کے) چار سمندر دیکھے: سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبۃ -)

۲۳۳ - ابن سعد ۱۳۴/۲ "حدثنى ابو يوسف الماجشون انه سمع ابن شهاب يقول: كنتُ اذا حدثنى عروة ثم حدثتنى عمرة، يصدق عندى حديث عروة فلما تبحرتهما اذا عروة بحر لا ينزف" (ابو یوسف الماجشون نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ابن شہاب کو یہ کہتے سنا ہے - جب مجھ سے عروۃ کوئی حدیث بیان کرتے تھے اور پھر (وہی حدیث) عمرۃ بیان کرتی تھیں، تو میرے نزدیک عروۃ کی روایت زیادہ معتبر ہوتی تھی اور جب میں نے ان دونوں کے علم کو جانچا تو یہ دیکھا کہ عروۃ ایک بحر بے پایاں ہیں -)

۲۳۴ - ابن حجر ۲۳/۷

۲۳۵ - الذہبی: ۷۱ -

۲۳۶ - فاضل مضمون نگار نے غلام الاعمش کا ترجمہ یہ کیا ہے: "آپ کا غلام جس کی آنکھوں میں آنسو بھرے رہتے ہیں۔" (فاروقی)

۲۳۷ - الاغانی: ۹۵/۸ "قال عبيد الله لابن شهاب الزهرى -

اذا قلتَ اما بعد، لم يكن منطقى | فحاذر اذا ما قلتَ كيف اقول
اذا شئتَ ان تلقى خليلا مصافياً | لقيتَ واخوان الثقات قليل

(عبیداللہ نے ابن شہاب الزہری کے لیے کہا ہے: "جب میں اما بعد کہہ کر تقریر شروع کرتا ہوں تو پھر میری زبان فر فر چلتی ہے - مگر جب میں خود یہ کہنے لگوں کہ "کیا کہیے" تو پھر سمجھ لو - تم اگر کسی مخلص دوست سے ملنا چاہتے ہو تو مل سکتے ہو مگر دنیا میں بھروسے کے لائق ثقہ انسان

بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔")

۲۳۸- ابن حجر ۹/۴۴۸: "وقال اللیث عن جعفر بن ربیعة قلت لعراک ابن مالک من افقہ اھل المدینة، فذکر سعید بن المسیب و عروة و عبید اللہ بن عبد اللہ قال عراک واعلمھم عندی جمیعاً ابن شھاب لانہ جمع علمھم علی علمہ"

(اللیث نے جعفر بن ربیعہ کے حوالے سے کہا میں نے عراک بن مالک سے پوچھا کہ مدینہ کا سب سے بڑا فقیہہ کون ہے تو انہوں نے سعید بن المسیب، عروہ اور عبیداللہ بن عبداللہ کے نام لیے۔ عراک نے کہا، مگر میرے نزدیک ان سب میں بڑے عالم ابن شہاب ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے علم میں اُن کا علم جمع کر لیا ہے۔")

۲۳۹- الذہبی : ۶۹

۲۴۰- ابن حجر ۹/۴۴۹

۲۴۱- ابن حجر ۹/۴۴۹

۲۴۲- ابن سعد ۲/۱۳۵

۲۴۳- لسان العرب میں تحت مادہ "نتل" "وفی حدیث سعد بن ابراھیم ما سبقنا ابن شھاب من العلم بشیٔ الا انا کنا ناتی المجلس فیستنتل ویشد ثوبہ علی صدرہ ای یتقدم" (ح۔ نضاد)

۲۴۴- الذہبی ۷۰۔

۲۴۵- ایضاً ۶۹۔

۲۴۶- ایضاً ۶۷۔

۲۴۷- ایضاً ۶۷

۲۴۸- ایضاً ۶۷

۲۴۹- عبدالملک نے عروۃ سے وہ اخبار طلب کیے ہوں گے جو بعض حوادث سے متعلق قلمبند کیے گئے۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اُس خاص حادثہ کے بارے میں "حدیث" بیان کریں اور شاید یہی وجہ تھی کہ عُروۃ نے سندوں کو ترک کر دیا تھا۔

۲۵۰- گولڈزیہر : دراساتِ اسلامیہ۔ ۲/۲۱۰۔

۲۵۱- ابن سعد : ۲/۱۳۵- الذہبی ۷۱ "فرأیت ألا أمنعہ مسلما" (تو میں نے سوچا کہ کسی مسلمان کو اس سے محروم نہ رکھوں۔") نیز دیکھو۔ گولڈزیہر : دراساتِ اسلامیہ ۲/۳۸۔

۲۵۲- الذہبی : ۶۸

۲۵۳- ایضاً : ۶۹ "وقال انس بن عیاض عن عبید اللہ بن عمر، قال کنت أری الزھری یعطی الکتاب فلا یقرؤہ ولا یقرأ علیہ فیقال لہ: نروی ھذا عنک؟ فیقول نعم" (انس بن عیاض نے عبیداللہ بن عمر کے حوالے سے کہا کہ

ہم دیکھتے تھے کہ الزہری کتاب دیتے تھے : نہ وہ اسے پڑھتے تھے نہ وہ انھیں پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ پھر کوئی کہتا کیا ہم اسے آپ کے حوالے سے روایت کرسکتے ہیں۔ تو وہ کہتے : "ہاں")

۲۵۴ - گولڈزیہر : دراساتِ اسلامیہ ۲/ ۳۸ - نوٹ ۲-

۲۵۵ - ابن سعد ۲/۱۳۶- نیز الذہبی :۱/ ۱۰۷-

۲۵۶ - ابن خلکان ۱/۵۷۱ " وکان اذا جلس فی بیته وضع کتبه حوله فیشتغل بها عن کل شیٔ من امور الدنیا فقالت له امرأته یوماً: واللّٰه لهذه الکتب اشدّ علیّ من ثلاث ضرائر" (یہ جب گھر میں بیٹھتے تو ان کے چاروں طرف کتابیں ہوتی تھیں اور دنیا ومافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتے تھے، اس پر ایک دن اُن کی بیوی نے کہا کہ یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ شاق ہیں۔") نیز دیکھو ابوالفداء ۱/۲۵۶

۲۵۷ - الطبری ۲/۲۴۸

۲۵۸ - ایضاً : اس کا ایک اقتباس یہ ہے " ومات یزید بن معاویة وهو ابن تسع وثلاثین، وکانت ولایته ثلاث سنین وستة اشهر فی قول بعضهم ویقال ثمانیة اشهر" (یزید بن معاویہ مرا تو وہ ۳۹ سال کا تھا اور اس کی حکومت بعض کے قول کے مطابق تین سال چھ ماہ اور بعض کے نزدیک تین سال آٹھ ماہ رہی")

ایضاً ۱۲۶۹- " الزہری اس بارے میں کہتے ہیں" ما حدثت عن ابن وهب عن یونس، عنه: ملک الولید عشر سنین الا اشهراً " (اس بارے میں ابن وہب کی یونس سے روایت ہے بحوالہ الزہری کہ الولید نے ایک ماہ کم دس سال حکومت کی")

۲۵۹ - الاغانی ۱۹/ ۵۹ " قال المدائنی فی خبره واخبرنی ابن شهاب قال : قال لی خالد بن عبد اللّٰه القسری اکتب لی النسب، فبدأت بنسب مضر وما اتممته۔ فقال اقطعه قطعه اللّٰه مع اصولهم" (المدائنی نے اپنی خبر میں کہا کہ مجھے ابن شہاب نے خبر دی کہا کہ مجھ سے خالد بن عبداللہ القسری نے کہا : میرے لیے نسب لکھو۔ تو میں نے مُضر سے شروع کیا مگر اُسے اختتام تک نہیں پہنچا سکا۔ پھر کہا میں نے اس کو قطع کیا خدا نے اس کی جڑیں ہی کاٹ دیں۔)

۲۶۰ - الاغانی ۱۹/ ۵۹ " قال واکتب لی السیرة، فقلت له فانه یمر بی الشیٔ من سیرة علی بن ابی طالب صلوات اللّٰه علیه فاذکره؟ فقال : لا الا ان تراه فی قعر الجحیم" (کہا میرے لیے سیرۃ پر ایک کتاب لکھو۔ میں نے اس سے کہا : اگر سیرۃ علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیہ سے متعلق کچھ باتیں اس میں آئیں تو کیا انھیں بھی بیان کردوں : کہنے لگا : نہیں۔ مگر یہ کہ تم انھیں غلطیاں کرتے ہوئے دیکھو، تو لکھو) "

۲۶۱ - دیکھو فیوک : " محمد بن اسحٰق " ۲ - توضیح ۲۴-

۲۶۲ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الزہری کی کچھ اور تصانیف بھی تھیں جن تک فاضل مضمون نگار پروفیسر ہورووتس کی رسائی نہیں ہوسکی۔ مثلاً شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی نے اپنی کتاب " الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اهل التوریخ " میں لکھا ہے:-

" دَرَی یونس بن یزید مشاهد النبی صلی الله علیہ وسلم عن الزهری" (یونس بن یزید نے الزہری کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی جنگوں کا حال قلمبند کیا تھا۔)

۲۶۳۔ دیکھو ابن ہشام ۳/۳۰۹۔ (نیز الطبری ۱/۱۵۱۸، مسند احمد بن حنبل ۲/۱۹۴۔ البخاری: (صحیح) (حدیث الافک)
" حدثنی الزهری عن علقمة بن وقاص وعن سعید بن جبیر وعن عروة بن الزبیر عن عبید الله بن عبد الله بن عتبة قال: کل قد حدثنی بعض هذا الحدیث وبعض القوم کان أوعی له من بعض قد جمعت لک الذی حدثنی القوم" (الزہری نے علقمہ بن وقاص اور سعید بن جبیر اور عروہ بن الزبیر اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ کے حوالے سے مجھ سے بیان کیا اور کہا کہ اس حدیث کا ایک ایک حصہ ان میں سے ہر ایک نے روایت کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ محتاط ہے۔ میں نے تمھارے لیے سب کے اقوال کو یک جا کر دیا ہے۔")

۲۶۴۔ الذہبی: ۴۳ ۔

۲۶۵۔ ابن حجر: تہذیب ۱۰/۳۶۰۔ الذہبی (تحقیق: نیفتر) ۱/۴۳۷

۲۶۶ - ابن سعد: ۵/۲۲۱

۲۶۷۔ ابن حجر: ۳۶۲

۲۶۸ - الطبری: ۲/۷۸۲

۲۶۹۔ ابن حجر: ۳۶۲۔ الذہبی: ۴۳۸

۲۷۰۔ ابن حجر: ۳۶۲ - الذہبی: ۴۳۸ ۔ البخاری (تاریخ) ۱۹۹

۲۷۱ - ابن حجر: ۳۶۱

۲۷۲۔ ابن سعد: ۵/۳۱۰ نیز

SACHAU(E) DAS BERLINER FRAGMENT DES MUSA IBN UQBA (SITZUNGS-BERICHTE DER PREUSSICHEN AKADEMIE DER WISSENSCHAFTEN. 1904)
(یعنی پرشیا کی علمی اکادمی کی سالانہ روداد ۱۹۰۴ء)

۲۷۳۔ تحقیق وستنفیلڈ ۴/۱۰۰۸ نیز دیکھیے: ۳/۸۴۲

۲۷۴۔ تاریخ الخمیس ۲/۹۶۔ نیز دیکھیے: ۱/۵۳۹

۲۷۵۔ ابن حجر: ۳۶۱

۲۷۶ - ابن حجر: ۳۶۲

۲۷۷۔ ابن سعد: ۲/۱۔۳/۱

۲۷۸۔ یہ ہم شرحبیل کے حالات میں لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے ایسی کوئی فہرست تیار نہیں کی تھی۔ (احسین نقارہ)

۲۷۹- ابنِ حجر، ۲۶۱ا-

۲۸۰- دیکھو ترجمۂ ولہوزن ۸۰- ۴۴۴-۴۰۳-۴-

۲۸۱- ابنِ سعد: ۳/۲۴۱-۸/۱۰،۱۱،۱۷۱،۱۹۰،۱۹۱- اِن حوالوں کے لیے اور ابنِ سعد کے یہاں مذکور دوسرے راویوں کے حوالے کے لیے، میں ہرڈاکٹر گوٹشلک HERR DR. W. GOTTSCHALK کا ممنون ہوں جنھوں نے لطفاً اپنے قلمی انڈکس سے انھیں نقل کرکے بھیجا۔ (ج-ص)

۲۸۲- ابنِ سعد: ۵/۲۸۳- البلاذری: (تحقیق: اہلورڈ) ۲۳۰

۲۸۳- کتاب الاغانی: ۱۶/۳

۲۸۴- الطبری: ۲/۱۲۳۱

۲۸۵- ابنِ سعد: ۵/۲۱۶

۲۸۶- البلاذری: (تحقیق: دی غویہ) ۸/۳

۲۸۷- تاریخ الخمیس: ۱/۵۳۹

۲۸۸- ابنِ سعد: ۳/۲۴۱

۲۸۹- ابن حجر، ۳ ۲۴۳

۲۹۰- ایضاً: ۲۴۳

۲۹۱- البخاری (تاریخ) ۱۱۸- ابنِ سعد: ۷-۲/۲- النووی: ۵۶۹

۲۹۲- ابنِ حجر: ۲۴۳

۲۹۳- ابنِ حجر: ۲۴۳- النووی: ۵۶۹

۲۹۴- ابنِ حجر: ۳-۲۴۳- النووی: ۵۶۹- ابنِ قتیبۃ: المعارف ۲۵۳- ابنِ سعد: ۵/۲۹۷

۲۹۵- النووی: ۵۶۹

۲۹۶- ابنِ حجر: ۲۴۵- النووی: ایضاً

۲۹۷- ابنِ سعد: ۵/۲۹۷

۲۹۸- ابنِ حجر: ۲۴۵- الطبری: ۳/۲۵۲۲

۲۹۹- ابنِ سعد: ۵/۲۹۷- ابنِ حجر: ۲۴۵

۳۰۰- ابنِ سعد: ۵/۲۹۷ -

۳۰۱- ابنِ حجر: ۲۴۵-

۳۰۲- تحقیق: خلوجل (یہاں انھیں غلطی سے کوفی بتایا گیا ہے) ص ۹۴

۳۰۳ - البلاذری : (تحقیق : دی غویہ) ۲۲

۳۰۴ - النّووی : ۶۹ ۵

۳۰۵ - ابنِ رُستہ : ۶۳ BIBLIOTHECA GEOGRAPHORUM VOl III

(یعنی مکتبۂ جغرافیہ ج ۳ - اس میں عہد جاہلی کے یثرب کی تاریخ سے متعلق اخبار محفوظ ہیں -)

۳۰۶ - تحقیق : فلوجل ۲۲۸

۳۰۷ - ابنِ سعد : ۷ ب / ۹۷

۳۰۸ - الطبری ۱/ ۲۱۲۲ - البلاذری : (تحقیق : دی غویہ) ۲۴۷ - فیوک : ۱۷ - توضیح ۲ -

۳۰۹ - القسطلانی ۴ / ۳۲۸

۳۱۰ - یاقوت : (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/ ۴۰۰ - الفہرست ۹۲ -

۳۱۱ - یاقوت نے ہشام کا نام لکھا ہے، اگرچہ ۸۲ھ سے ۸۶ھ تک مدینہ کا گورنر تھا، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اس موقع پر پڑ والی سے وہ مراد ہو، یہاں یقیناً اس کا بیٹا اسمٰعیل مراد ہے - الفہرست میں گورنر کا نام نہیں بتایا گیا ہے -

۳۱۲ - ابنِ ہشام - مقدمہ - ص " م " (نسخہ مصطفیٰ البابی)

۳۱۳ - GOLDZIHER : MUHAMMADANISCHE STUDIEN VOl. II P. 73

(یعنی درسات اسلامیہ - ج ۲ ص ۷۳) نیز فیوک : (FÜCK) ۲۰ - توضیح نمبر : ۲۷ -

۳۱۴ - البخاری (التاریخ) ۲۲۱

۳۱۵ - ابنِ خلکان ۱/ ۶۱۲

۳۱۶ - البخاری (التاریخ) ۱۵۵ -

۳۱۷ - ابنِ قتیبہ : کتاب المعارف (تحقیق : وستنفیلڈ (WIUSTENFELD) : ۲۴۷

۳۱۸ - الفہرست (تحقیق : فلوجل (FLÜGEL) ۹۲ -

۳۱۹ - معجم البلدان (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/ ۳۹۹

۳۲۰ - ان کی ولادت سنہ ۸۴ھ میں ہوئی - دیکھو ابن حجر : تہذیب التہذیب : ۱۲/ ۴۴۴

۳۲۱ - ابنِ قتیبہ : کتاب المعارف ۲۰۱ -

۳۲۲ - ابنِ حجر : تہذیب التہذیب ۹/ ۴۲ - فیوک : (FÜCK) ۲۰ - توضیح ۴۰ -

۳۲۳ - یاقوت (تحقیق : مارگولیتھ MARGLIOUTH) ۶/ ۴۰۰

۳۲۴ - ابنِ سعد : ۷/ ۹۷ -

۳۲۵ - یاقوت (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/ ۳۹۹) - نیز ابن قتیبہ : المعارف ۲۴۷ -

۳۲۶- ابن سعد: ۷/ ۶۷- اور دوسرے سوانحی تراجم۔

۳۲۷- یاقوت (تحقیق: مارگولیتھ) ۶/ ۳۹۹

۳۲۸- الطبری ۱/ ۱۳۴۱- ابن سعد: ۴/ ۷- الطبری: ۱/ ۱۳۴۴-

۳۲۹- ابن ہشام: ۲/ ۲۸۱- الطبری: ۱/ ۱۳۲۳- ابن سعد: ۴/ ۵

۳۳۰- ابن ہشام: ۲/ ۳۰۱- الطبری: ۱/ ۱۳۳۹-

۳۳۱- ابن سعد: ۴/ ۷

۳۳۲- ابن سعد: ۶/ ۲۷۶- ۷/ ۸۱- ابن قتیبۃ: کتاب المعارف ۲۴۷- مزید عبارت دیکھو: فیوک (FÜCK) ۳۴- توضیح: ۱

۳۳۳- فیوک (FÜCK) ۳۴- توضیحات: ۵- ۶ (دو فقرات درج کئے ہیں جن میں یہ اشارے ملتے ہیں)

۳۳۴- وستنفیلڈ (WUSTENFELD- GOTTINGEN. 1859) "مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہٗ" کا ایڈیشن (قاہرہ: ۱۹۳۶ء) اس مضمون کی تحریر کے وقت تک شائع نہیں ہوا تھا چونکہ وہی اب آسانی سے دستیاب ہے اس لیے اس کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں (حسین نصار)

۳۳۵- ابن ہشام: ۱/ ۴ (مصطفیٰ البابی)

۳۳۶- الطبری ۱/ ۱۳۴۱- دیکھو فیوک (FÜCK) ص ۳۶- توضیحات ۲۲- ۳۲- ان سے معلوم ہوگا کہ ابن اسحاق کے اصل نسخے سے دوسری کتابوں میں کون سی عبارتیں ملتی ہیں۔

۳۳۷- ہورووتس نے سیرۃ ابن ہشام کے حوالے وستنفیلڈ کے مرتبہ ایڈیشن ہی سے دیے ہیں مگر عربی ترجمہ میں حسین نصار نے مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ کا شائع کردہ نسخہ سامنے رکھا ہے، جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے سلسلۂ مطبوعاتِ تراث الاسلام میں چھاپا تھا ہمارے سامنے اس کا ۱۹۵۵ء والا ایڈیشن ہے۔ (فاروقی)

۳۳۸- الطبری ۱: ۸۰۱- ۸۵۸

۳۳۹- ابن ہشام وستنفیلڈ ۴۹- ۷۰- مصطفیٰ البابی ۱/ ۸۷- ۹۳-

۳۴۰- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۷۱- ۱۰۱- مصطفیٰ البابی) ۹۳- ۱۶۶-

۳۴۱- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۳۴۱ (مصطفیٰ البابی ایڈیشن) ۲/ ۱۴۷

دوسرا مولف ابن سید الناس ہے جو ابن اسحاق کے بعد اس دستاویز کا حوالہ اپنی کتاب "عیون الآثار" میں دیتا ہے، نیز دیکھو:

WENSINCK: MOHAMMED EN DE JODEN TE MEDINA, LEYDEN, 1908

یعنی "محمد اور یہود مدینہ میں" (لیدن ۱۹۰۸ء) ص ۸۲

۳۴۲- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۶۲- ۲۰۸- ۲۰۷- ۲۸۸- ۳۰۵- ۳۲۲- ۳۴۴- (مصطفیٰ البابی) ۱/ ۳۴۴- ۲/ ۳- ۴۳- ۸۶- ۹۷- ۱۲۰- ۱۵۰-

۳۴۳- فیوک (FÜCK) ۴۴- توضیحات ۴۷- ۸۲ (اس حصے میں اسناد کے ساتھ ایسے کئی اقوال درج ہوئے ہیں)

۳۴۴- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۴۸۵-۵۱۵-۶۱۱-۶۰۷-۶۹۷-۷۶۸-۸۸۷-۷۸۱-۸۰۱-۸۷۵ (مصطفی البابی) ۲/۳۳۳-
۳/۸ و ۱۲۹ تا ۱۳۵ اور ۲۶۴ و ۳۵۷ - ۴/۱-۱۲ و ۳۰ و ۱۰۱-

۳۴۵- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۴۴-

۳۴۶- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۴۴- توضیح : ۸

۳۴۷- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۳۲-

۳۴۸- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۵، ۱۵۶، ۳۱۷، ۷۵۵، ۷۷۹ (مصطفی البابی) ۱/۳۵۷، ۲/۱۳۳، ۳/۲۱۳، ۲۰۹/۳، ۲۷۱- نیز ملاحظہ ہو
فیوک : ۱۰- توضیح : ۳۸-

۳۴۹- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۷۲ (مصطفی البابی) ۴/۲۵۵ الطبری ۱/۱۵۶۰۔

۳۵۰- الذہبی (تحقیق فیشر؛ FISCHER) تراجم الصحابہ ۸۴- ابن حجر تہذیب التہذیب - ج ۱۱ ص ۳۲۵-

۳۵۱- "وہب بن کیسان" ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۵۱ (مصطفی البابی) ۱/۳۶۴۔ "اسمٰعیل بن ابی حکیم" (وستنفیلڈ) ۱۵۴
(مصطفی البابی) ۱/۲۵۴-

۳۵۲- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۷۷، ۴۱۳ (مصطفی البابی) ۱/۳۰۹-۳۳۶-۳۴۰-۵۸۲۔

۳۵۳- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۲۷۷-۴۱۲- (مصطفی البابی) ۲/۵۷، ۲۳۸

۳۵۴- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۳۴۸، ۴۷۱، ۷۹۱، ۷۹۷، ۸۰۹، ۸۲۰، ۸۱۵، ۹۸۱- (مصطفی البابی) ۲/۲۷، ۱۵۶، ۲۲۳،
۲۱۶، ۳/۴۷، ۱۰۱، ۲۵۲، ۳۰۷،

۳۵۵- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۴۴۷- ۴۶۱- ۴۹۵- ۴۸۰- ۵۷۰- ۶۸۰- ۷۹۴- ۸۱۵- (مصطفی البابی) ۲/۱۳۳- ۱۸۳
۳۰۲ - ۳۰۷- ۳۲۶- ۲/۸۲- ۹۱- ۱۸۲-

۳۵۶- فیوک : (FUCK) محمد ابن اسحاق : ۲۹ توضیح ۲۲۔

۳۵۷- الطبری ۱۰، ۱۱، ۱۲۰، ۱۸۹، ۲۱۲، ۴۱۳، ۴۳۷ (ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۹۷ (مصطفی البابی) ۱/۳۲۸)-
نیز مقابلہ کیجیے : GOLDZIHER : DIE RICHTUNGEN IN DER ISLAMISCHER KORANAUSLEGUNG. P. 90
(یعنی گولڈ تسیہر : مسلمانوں میں تفسیر کے رجحانات ص ۹۰)

۳۵۸- فیوک : ۲۶

۳۵۹- الطبری : ۱/۱۳۱۲

۳۶۰- الطبری : ۱/۱۴۱

۳۶۱- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۴۹- (مصطفی البابی) ۱/۲۴۸

۳۶۲- NOLDEKE-SCHWALLEY: GESCHICHTE DES QORANS, V. I P. 9 (یعنی نولدکے شوالے : تاریخ القرآن جلد ۱ ص ۹)

۳۶۳ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۴ (مصطفی البابی) ۲/۱ - ۳۶۴ - ابن اسحٰق نے رسول اللہؐ کے ایک خط کے بارے میں، جو آپؐ نے کسی قبیلے کو لکھا تھا، یہ بیان کیا ہے "وَکَتَبَ لَهُم کِتَاباً وَهُوَ عِنْدَ هُم" (آپؐ نے ان کو ایک خط لکھا تھا جو اس قبیلے کے پاس محفوظ تھا)

۳۶۵ - ابن ہشام (WÜSTENFELD) ۹۵۵ (مصطفی البابی) ۴/۲۳۵ - الطبری ۱/۱۷۱۷، ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۵۹ (مصطفی البابی) ۴/۲۳۷ - الطبری ۱/۱۷۲۴ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۶۱ (مصطفی البابی) ۴/۲۳۹ - الطبری ۱/۱۷۲۷ -
ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۶۵ (مصطفی البابی) ۲/۲۴۱ - الطبری ۱/۱۷۴۸ -

۳۶۶ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۶۲ (مصطفی البابی) ۴/۲۴۵ - الطبری ۱/۱۷۴۰ ۳۶۷ - الفہرست (تحقیق فلوجیل FLÜGEL) ۹۲ معجم البلدان (تحقیق: مارگولیتھ MARGOLIOUTH) جلد ۲ ص ۴۰۰ -

۳۶۸ - الجمحی: طبقات الشعراء: (تحقیق ہیل HELL) ۴۰ - ۳۶۹ - الطبری/۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۴۱ - ۲۴۲ -

۳۷۰ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۶۸۹، ۶۹۳، ۸۱۸ (مصطفی البابی) ۴/۱۳، ۱۸، ۲۹ -

۳۷۱ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۰۸ (مصطفی البابی ۱/۱۷۹ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۱۱ (مصطفی) ۱/۱۸۳ اسے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ باقی مرثیوں کا تعلق بھی محمد ابن سعید سے ہے۔

۳۷۲ - جوزف ہورووتس کی اس رائے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف ایک روایت محمد بن سعید بن المسیب پر اشعار گھڑنے کا الزام لگانے کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح محض یہ بات کہ سعید بن المسیب شعر و شاعری کو پسند کرتے تھے، انھیں وضع و تحریف کا مرتکب قرار دینے کا ثبوت فراہم نہیں کر سکتی حالانکہ وہ عظیم المرتبہ تابعی تھے اور زمرۂ محدثین میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا جب بیٹے ہی کا مرتکب وضع ہونا محلِ نظر ہے تو باپ کا معاملہ تو اور بھی زیادہ بعید از قیاس بات ہے (حسین نصار)

۳۷۳ - ISLAMICA II 308 یعنی مجلۂ الاسلام، جلد ثانی ص ۳۰۸ و بعد

۳۷۴ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۵۱۶، ۶۱۱، ۶۴۳، ۶۵۶، ۷۰۰، ۷۲۳، ۷۷۲، ۷۹۸، ۸۲۸، ۸۵۷، ۹۲۹ - (مصطفی البابی) ۳/۸ - ۴۵، ۱۳۵ - ۱۷۷، ۱۸۵، ۲۰۴، ۲۶۶ - ۲۸۳ - اس سے پہلے عبید بن شریۃ نے اپنے اخبار میں کثرت سے اشعار و قصائد کا استعمال کیا ہے۔ دیکھو "اخبار عبید بن شریۃ الجرہمی طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد" (نثار فاروقی)

۳۷۵ - اس سے میری مراد ابن ہشام (نسخہ وستنفیلڈ) کے عنوانات نہیں ہیں جو نہ ابن اسحاق کے یہاں ہیں نہ ابن ہشام سے لیے گئے ہیں بلکہ زمانہ مابعد کے کسی ناقل نسخہ کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں، یہاں وہ عبارتیں مراد ہیں جو ابن اسحاق اپنے اخبار کے شروع میں تمہیداً درج کرتا ہے۔

۳۷۶ - الفہرست (تحقیق۔ فلوجیل FLÜGEL) ۹۱ - معجم البلدان (تحقیق مارگولیتھ MARGOLIOUTH) ۶/۴۰۱ -

۳۷۷ - یاقوت: (تحقیق وستنفیلڈ) ۳/۱۹۶ نیز السمعانی: الانساب ۳۱۳۳ -

۳۷۸ - ابن حجر: تہذیب التہذیب ۱۰/۲۲۱ "قال داؤد بن محمد بن ابی معشر حدثنی ابی انہ کان اصلہ من الیمن... وکان ابیض ازرق سمیناً" (داؤد بن محمد بن ابی معشر نے بیان کیا کہ مجھے میرے باپ نے بتایا کہ ان کی اصل یمن کی تھی..... وہ گورے تھے، آنکھیں نیلی تھیں اور موٹے تھے)

۳۷۹ - کبھی کبھی بصرے کو بھی السند کے نام سے پکارا گیا ہے، کیونکہ اس شہر میں اس نام کا ایک محلہ تھا جس میں کثرت سے اہل سند آباد تھے۔ بصرہ بندرگاہ بھی تھی جہاں سے مسافر سوار ہوا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ابو معشر کی نسبت اسی محلّہ کی طرف ہو۔ (حسین نصار)

۳۸۰ ۔ الذہبی: التحقیق: زخاؤ (نیز ۱۱ STUDIEN P. (یعنی دراساتِ اسلامیہ)

۳۸۱ ۔ الذہبی: (ماسبق) ۱۰) "کانَ ابو معشرٍ یذکرُ أنّہ من وُلدِ حنظلۃ بن مالکٍ" (اور ابو معشر کہا کرتے تھے کہ وہ حنظلۃ بن مالک کی اولاد میں ہیں)

۳۸۲ ۔ حوالۂ ماسبق "وقال ابوبکر الحسین بن محمد بن أبی معشر: حدّثنی أبی، قال: کانَ إسم أبی معشر قبل أن یسرق عبد الرحمن بن الولید بن ھلالٍ" (ابوبکر الحسین بن محمد بن ابی معشر نے کہا کہ ان کے باپ نے انھیں بتایا کہ ابو معشر کے "چرائے جانے" سے پہلے ان کا نام عبد الرحمن بن الولید بن ہلال تھا)

۳۸۳ ۔ حوالۂ ماسبق "فسرق فبیع بالمدینۃ فاشتراہ قومٌ من بنی أسد فسمّوہ نجیحًا" (پھر انھیں اغوا کر لیا گیا اور یہ مدینے میں بیچے گئے اور انھیں بنو اسد کے لوگوں نے خرید کر ان کا نام نجیح رکھا)

۳۸۴ ۔ ابن حجر ۱۰/ ۴۲۱ "وسُبی فی وقعۃ یزید بن المھلب بالیمامۃ والبحرین" (اور یہ بحرین و یمامہ میں یزید بن مہلب کی جنگ میں اسیر ہوئے تھے)

۳۸۵ ۔ الطبری ۳/ ۴۲۳ ۔ وکانت أمّ موسیٰ الحمیریۃ ولدت لہ (یعنی للمنصور) جعفرًا والمھدی" (اُمّ موسیٰ حمیری تھی اور اس نے خلیفہ المنصور کے دو بیٹوں جعفر اور المہدی کو جنم دیا تھا)

۳۸۶ ۔ حوالۂ ماسبق (ابن حجر) ثم اشترتہ لامّ موسیٰ بن المھدی فاعتقتہ (پھر انھیں موسیٰ بن المہدی کی ماں کے لیے خریدا گیا۔ اس نے انھیں آزاد کر دیا)

۳۸۷ ۔ ابن الندیم: الفہرست ۹۳ "وکانَ مکاتبًا لامرأۃٍ من بنی مخذوم وعتق" (اور یہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب تھے پھر آزاد ہو گئے)

ابن سعد ۵/ ۳۰۹ "وکانَ مکاتبًا لامرأۃ من بنی مخذوم فادّی وعتق۔ فاشترت أمّ موسیٰ بنت المنصور الحمیریۃ ولائہ" یہ بنو مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب تھے پھر انھوں نے مقررہ رقم ادا کر دی تو آزاد ہو گئے اور اُمّ موسیٰ بنت المنصور حمیری نے ان کی ولایت خرید لی، نیز المقدسی مرتبۂ سخاؤ (E. SACHAU: STUDIEN) اور البخاری نے اپنی "تاریخ" میں کہا ہے کہ یہ اُمّ سلمۃ کے مولیٰ تھے۔

۳۸۸ ۔ المقدسی، ۱۰ "قال لی: ولاؤنا فی بنی ھاشم أحبّ الیّ من نسبی فی بنی حنظلۃ" (انھوں نے مجھ سے کہا کہ بنو ہاشم سے میری نسبت ولایت بنی حنظلہ کے نسبی تعلق سے مجھے زیادہ پیاری ہے)

۳۸۹ ۔ الطبری ۳/ ۴۸۲ ۔

۳۹۰ ۔ ابن حجر: تہذیب التہذیب ۱۰/ ۴۲۱ "وقدم المھدی فی سنۃ ستین ومئۃ فاستصحبہ معہ الی العراق" (اور المہدی سنہ ۱۶۰ھ میں حج کرنے) آیا تو انھیں اپنے ساتھ عراق لیتا گیا۔)

الذہبی ۱۰ ۔ ان المھدی قدم المدینۃ سنۃ ستین ومئۃ فاشخص ابا معشر معہ الی العراق: وامر لہ بالف دینارٍ وقال تکون بحضرتنا فتفقہ من حولنا" (المہدی ۱۶۰ھ میں مدینہ آیا تو انھیں اپنے ساتھ عراق لے گیا۔ وہاں ان کو ایک ہزار دینار بخشش دی اور کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہو اور ہمارے متعلقین کو فقہ کی تعلیم دیا کرو۔"

۳۹۱ ۔ ابن حجر حوالۂ ماسبق ۴۲۲ "وتغیّر قبل أن یموت بسنتین تغیرًا شدیدًا" (اور انتقال سے دو سال پہلے ان میں بہت تبدیلی پیدا ہو گئی تھی)

الذہبی: ۲ کہتا ہے "حتّی کانَ یخرج منہ الریح ولا یشعر بھا" (حتیٰ کہ ان کا وضو ٹوٹ جاتا تھا اور انھیں خبر نہ ہوتی تھی)

السمعانی ۳۱۳ "وکانَ ممّن اختلط فی آخر عمرہ۔ وبقی قبل ان یموت سنین فی تغیر شدید لا یدری ما یحدث بہ لکثرۃ المناکیر فی روایتہ من قبل اختلاطہ" (یہ ان لوگوں میں سے تھے جو بڑھاپے میں سٹھیا جاتے ہیں، چنانچہ مرنے سے کئی سال پہلے

سے حواس باختہ ہو گئے تھے انھیں یہ خبر ہی نہ ہوتی تھی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اس بدحواسی سے پہلے بھی اپنی روایات میں متضاد باتیں کہہ جاتے تھے)

۳۹۲ - ابن سعد ۵/ ۳۰۹ - ابن قتیبۃ : المعارف ۲۵۳ - السمعانی ۳۱۳

ابن حجر ۱۰/ ۴۲۲ - الفہرست ۹۳ کے مطابق انھوں نے الہادی (متوفی ۱۶۹ھ) کے زمانے میں انتقال کیا۔

۳۹۳ - السمعانی ۳۱۳ - الذہبی ۲ ۳۹۴ - البخاری : تاریخ ۱۹۹ ۳۹۵ - ابن سعد ۵/ ۳۰۹

۳۹۶ - تہذیب ۱۰/ ۴۲۰ ۳۹۷ - المقدسی ۹ ۳۹۸ - ابن حجر ۱۰/ ۴۲۲

۳۹۹ - تحقیق : فلوجل (FLÜGEL) ۹۳ ۴۰۰ - دیکھو ولہاؤزن کا اشاریہ ولہاؤزن ۳۲۱ ہیں الواقدی نے ان سے ایک خبر معلوم کی ہے جو اسے کسی اور راوی سے ملی تھی۔ ۴۰۱ - ابن سعد ۲ ق ۱/ ۳/ ۲۱ ۴۰۲ - الطبری ۱/ ۱۱۹۵

۴۰۳ - ابن سعد ۵/ ۴/ ۷۱ وما بعد الطبری ۲/ ۷/ ۱۱ - ۴۰۴ - ابن سعد ۷/ ۷۷ (۲ ق ۲/ ۷۷) "محمد بن عمر بن واقد الاسلمی مولیٰ عبداللہ بن بریدۃ الاسلمی"

۴۰۵ - ابن سعد ۵/ ۳۲۱ "قال محمد بن سعد اخبرنی (یعنی محمد بن عمر) انہ ولد فی سنۃ ثلاثین ومئۃ فی آخر خلافۃ مروان بن محمد" کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۳۰ھ میں یعنی مروان بن محمد کی خلافت کے آخری زمانے میں پیدا ہوا تھا)

۴۰۶ - کتاب الاغانی ۷/ ۱۳۹" وزعم ابن خرداذبہ أن ام محمد بن عمر الواقدی ..... بنت عیسیٰ بن جعفر بن سائب خاثر" (ابن خرداذبہ کا خیال ہے کہ محمد بن عمر الواقدی کی ماں عیسیٰ بن جعفر بن سائب خاثر کی بیٹی تھی)

۴۰۷ - جوزف ہورووتس کی اس رائے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ سائب خاثر عربی قصائد لکھنے والا پہلا مدنی شاعر نہیں تھا بلکہ یہ ایک خاص غنائیہ انداز کی شاعری میں پہل کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اختلافِ آرا ہے اور طوالت کے خوف سے یہاں صرف ہم الاغانی کی روایت (۷/ ۱۸۸) کا اقتباس دے رہے ہیں ابو الفرج الاصفہانی کہتا ہے۔ "وقال ابن الکلبی وابوغسان وغیرہما وھو اول من حمل العود بالمدینۃ وغنّی بہ ..... قال ابن الکلبی : وھو اول صوت غنی بہ فی الاسلام فی الغناء العربی المتقن الصنعۃ ..... وقال ابن الکلبی : سائب خاثر اول من بالعربیۃ الغناء الثقیل" (ابن الکلبی اور ابو غسان وغیرہ نے کہا کہ یہ مدینے میں پہلا شخص ہے جس نے عود بجایا اور اس پر گایا ..... اور ابن الکلبی نے کہا : یہ اسلام میں پہلی گانے والی آواز تھی جس نے عرب موسیقی کے فنی کمال کے ساتھ گانا گایا ..... اور ابن الکلبی نے کہا کہ سائب خاثر پہلا شخص تھا جس نے عرب کا پکا گانا گایا ۔ (حسین نصار)

۴۰۸ - الطبری ۳/ ۵/ ۹۰ - ہارون الرشید نے ۱۸۰ھ میں دوبارہ حج کیا تھا۔ الطبری ۳/ ۶۴۵ میں ہے کہ ۱۸۰ھ میں حج سے واپس آتے ہوئے ہارون الرشید بصرہ میں ٹھہرا تھا۔

۴۰۹ - ابن سعد ۵/ ۳۱۸ وما بعد "وحدثنی احمد بن صبیح، قال : حدثنی عبداللہ بن عبیداللہ قال : قال لی الواقدی حج امیر المؤمنین ہارون الرشید فورد المدینۃ فقال لیحیی بن خالد - (احمد بن صبیح نے مجھ سے بیان کیا کہ مجھے عبداللہ بن عبیداللہ نے بتایا کہ مجھ سے الواقدی نے کہا کہ امیر المومنین ہارون الرشید نے حج کیا تو وہ مدینہ آئے اور انھوں نے یحییٰ بن خالد سے کہا ...") (آگے وہی روایت ہے جو متن میں درج ہوئی (نثار فاروقی)

۴۱۰ - ابن سعد ۷/ ۷۷ "وکان من اہل المدینۃ فقدم بغداد فی سنۃ ثمانین ومئۃ فی دین لحقہ فلم یزل بہا وخرج

الی الشام والرقۃ۔" (یہ مدنی تھے اور سنہ ۱۸۰ھ میں بغداد آئے تھے۔ کیونکہ یہ مقروض ہو گئے تھے وہاں رہتے رہے پھر شام اور رقۃ کی طرف چلے گئے)

۴۱۱ ۔ الطبری ۳/۶۴۶ "ثم شخص (یعنی ھارون الرشید) من مدینۃ السلام الی الرقۃ" (سنۃ ۱۸۰ھ) "پھر وہ ہارون الرشید) بغداد سے سنہ ۱۸۰ھ میں رقۃ چلا گیا"۔

۴۱۲ ۔ ابن سعد ۵/ ۳۱۵ وما بعد ۴۱۳ ۔ ابن سعد ۵/ ۳۱۹ ۴۱۴ ۔ مروج الذہب (طبع قاہرہ) ۲/ ۲۶۲

۴۱۵ ۔ یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۵ ۴۱۶ ۔ یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۶ ۴۱۷ ۔ ابن حجر ۹/ ۳۶۴

۴۱۸ ۔ الطبری ۳/ ۱۰۳۷ ۴۱۹ ۔ یاقوت (تحقیق وستنفیلڈ) ۳/ ۶۷۷ ۴۲۰ ۔ ابن سعد ۵/ ۳۱۴-۷/ ۷۷ ۔

ابن قتیبۃ: کتاب المعارف ۲۵۸ ۔ یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۵ ۔ السمعانی: ۷۷ ۵ ۔ (ابن خلکان ۱/ ۲۳ نے ابن قتیبہ کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ الواقدی بغداد کے مغربی علاقے کے قاضی تھے۔ حالانکہ ابن قتیبہ کہتا ہے کہ غربی علاقے کے قاضی نے الواقدی کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔) نیز ابن سعد ۵/ ۳۲۱ ۔

۴۲۱ ۔ ابن حجر ۹/ ۳۶۵ "وکان جواداً کریماً مشہوراً بالسخاء" (یہ بہت دریا دل تھے اور اپنی سخاوت کے لیے مشہور تھے)

۴۲۲ ۔ یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۶ ۔

۴۲۳ ۔ ابن سعد ۔ ۵/ ۳۲۱ "واوصی محمد بن عمر الی عبد اللہ بن ھارون امیر المومنین فقبل وصیتہ وقضی دینہ"

(الواقدی نے ہارون الرشید کے بیٹے عبداللہ کو اپنا وصی بنایا تھا، اس نے وصیت کی تکمیل کی اور اس کا سارا قرض ادا کر دیا)

۴۲۴ ۔ ابن سعد ۵/ ۳۲۱-۷/ ۷۷ ۔ ابن قتیبۃ: ۲۵۸ ۔ الفہرست: ۹۸ ۴۲۵ ۔ الفہرست: ۹۸ ؛

۴۲۶ ۔ الفہرست (تحقیق فلوگل FLUGEL ۹۸) "وترک الخوارج فی الفتن" ۴۲۷ ۔ یاقوت: معجم الادبا ۷/ ۵۸

۴۲۸ ۔ الفہرست میں اس کتاب کے کچھ اور الواب بھی بتائے گئے ہیں۔ ۴۲۹ ۔ الفہرست میں یہ اضافہ ہے ۔

۴۳۰ ۔ اصل میں نام یوں تھا ہے "کتاب الترغیب فی علم القرآن وغلط الرجال" اسلامک کلچر میں طباعت کی غلطی سے اس حاشیے کا نشان کتاب نمبر ۱۷ پر لگ گیا ہے (نثار فاروقی)

۴۳۱ ۔ یہ غالباً عورتوں سے متعلقہ مسائل شریعت کی کتاب ہو گی، مگر یاقوت نے اسے تاریخی کتابوں کے ذیل میں شمار کیا ہے، توقع ہے کہ اس میں کچھ تاریخی مواد بھی رہا ہو گا۔

۴۳۲ ۔ الفہرست میں ایک مخصوص تالیف "مقتل الحسن" کا حوالہ بھی ہے ۔

۴۳۳ ۔ الفہرست نے آخر میں یہ اضافہ کیا ہے "وتصانیف القبائل ومراتبھا وانسابھا"۔

۴۳۴ ۔ ابن سعد ۸/ ۳۲ ۴۳۵ ۔ BIBLIOTHECA ARABO-HISPANA IX, 237

یعنی اسپین کی کتب عربی کی فہرست جلد ۹ ۔ صفحہ ۲۳۷ ۔

CAETANI : ANNALI DELL 'ISLAM, ANNO 11, 70 F - ۴۳۶

(یعنی کیتانی : حولیات اسلام ۱۱ھ / ۷۰ ف

۴۳۷ - الطبری ۱/ ۲۹۹۱ - ۳۰۶۰   ۴۳۸ - الطبری ۳ / ۶۳۹

LOTH : ZEITSGHRIFT DER DEUTSCHEN MORGENLANBISCHEN - ۴۳۹

GELLSCHAFT VOL. 23 P. 603

(یعنی مجلۂ جماعتِ مستشرقینِ جرمنی جلد ۲۳ صفحہ ۶۰۳ پر لوٹ کا مضمون)

۴۴۰ - لوٹ (LOTH) حوالۂ ماسبق صفحہ ۶۰۴ ، ۶۰۷ نوٹ نمبر ۴ -

ابن سعد ۵ / ۳۱۴ - الواقدی نے ایک محدث کی تاریخ وفات درج کی ہے جن کا انتقال مدینے میں ۱۸۶ھ میں ہوا تھا - یہ کتاب بھی غالباً مدینے میں مکمل ہوئی مگر بعد کو اس میں کچھ اضافات بغداد میں کیے گئے -

۴۴۱ - ابن سعد کی کتاب کے باب سیرۃ میں اور الواقدی کی کتاب میں ربط تلاش کرنے کے لیے دیکھو :

BANETH (D.H) : BEITRAGE FAR KRITIK AND ZUR SPRACHLICHLICHEN

VERSTANDIS DER SCHREIBEN MUHAMMADS. DISSERTATIONS ——

AUSZUG BERLIN 1920

(یعنی ڈی - ایچ - بانث : مراسلات نبوی پر تنقیدی اضافات اور ان کے لغوی مطالب "چیدہ مقالات" برلن ۱۹۲۰ء)

۴۴۲ - دیکھو کتاب المغازی - الواقدی بتحقیق الفرڈ ون کریمر - کلکتہ ۱۸۵۶ء

KREMER (ALFRED VON) : WAQIDI'S HISTORY OF MOHAMMA 'S

COMPAIGNS, CALCUTTA, 1856.

اس میں الواقدی کی تالیف کتاب کے صفحہ ۲۰ کی سطر ۱۰ تک ہے - بعد میں جو کچھ ہے یہ زمانۂ مابعد کی ایک اور تالیف سے ماخوذ ہے اسی طرح صفحہ ۱ سطر ۹ سے صفحہ ۹ سطر ۲ تک جو کچھ ہے اس کا بھی الواقدی سے کچھ سروکار نہیں -

۴۴۳ - تحقیق کریمر (KREMER) نمبر ۱ سطر ۹ تا ۲ سطر ۶

۴۴۴ - ابن سعد ۲ / ۱ سطور ۳ - ۱۰ - الواقدی کے شیوخ کی ایک فہرست جو چند ناموں پر مشتمل ہے ، جنھوں نے الواقدی کو مغازی رسول کی روایت دی ، تمہیں ابن سعد جزء اول قسم ثانی کے صفحہ ۱۵ پر ملتی ہے - دوسرے آٹھ ناموں کی فہرست جس میں الواقدی کے اساسی رواۃ کے نام ہیں اور جنھوں نے "طبقات" کی روایت کی ہے وہ اسی کتاب کے جز ثالث میں صفحہ ۱ پر ملے گی -

۴۴۵ - SACHAU : STUDIEN FUR ALTESTEN GESCHICHTSUBERLIEFERUNGBER

ARABER, P. 21.

(یعنی ایڈورڈ سخاؤ : "تاریخِ عرب کے قدیم راویوں کا مطالعہ" ص ۲۱ .

۴۴۶ - الطبری ۳ / ۲۵۱۲ ۴۴۷ - اس کے ثبوت میں ذیل ہاؤزن ۱۲ میں ملیں گے۔ نیز ملاحظہ ہو:

HOROVRTTZ (JOSEPH): DE WAQIPIT LIDROQUI KITAB AL MAGAZI

INSCRIBITUR BERLIN, 1898, 9 sea.

یعنی جوزف ہورووٹس "الواقدی کی کتاب المغازی کے مخطوطے کے بارے میں" برلن ۱۸۹۸ء صفحہ ۹ و مابعد۔

۴۴۸ - ابن سعد ۱/ ۳۹ "یقول الواقدی حدثنی عبد اللہ بن جعفر الزھری قال وجدت فی کتاب ابی بکر بن عبد الرحمٰن بن المسور...... الخ (الواقدی کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر الزہری نے کہا کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن المسور کی کتاب میں دیکھا ہے ...... الخ")

اور اسی کتاب میں (۲/ ۶۹) یہ ہے "حدثنی موسیٰ بن محمد بن ابراھیم بن الحارث التیمی، قال: وجدت ھذا فی صحیفة بخط ابی فیھا......" (موسیٰ بن محمد بن ابراہیم بن الحارث التیمی نے کہا میں نے اپنے باپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں دیکھا۔

۴۴۹ - یہی الواقدی نے کہا ہے۔ ابن سعد۔ ق ۲ / ۳۷ "قال محمد بن عمر نسخت کتاب اھل اذرح، فاذا فیہ......" (الواقدی نے کہا میں نے اہل اذرح (جگہ کا نام) کی ایک کتاب نقل کی تھی تو اس میں دیکھا......")

۴۵۰ - ولہوزن ۱۵ - ۴۵۱ - ابن سعد ۲ ق ۲ / ۱۲۶ سطر ۲۵ تا ۱۲۸ سطر ۱۲

۴۵۲ - الواقدی کی جرح کے لیے دیکھو: ابن حجر ۹ / ۳۶۳ - و مابعد نیز یاقوت: معجم الادباء ۷/ ۵۵ -

۴۵۳ - ابن سعد ۵ / ۳۱۴ - یاقوت، حوالۂ سابق ۴۵۴ - ابن حجر ۹ / ۳۶۵ -

۴۵۵ - تحقیق فلوجل (FLUGEL) ۹۸ "وکان یتشیع حسن المذھب ...... وھو الذی روی ان علیا علیہ السلام؛

"کان من معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کالعصا لموسیٰ علیہ السلام واحیاء الموتی لعیسیٰ بن مریم علیہ السلام، وغیر ذلک من الاخبار" (یہ شیعہ تھے اور معتدل مذہب رکھتے تھے.... انھوں نے ہی یہ روایت کی ہے کہ حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک تھے، بالکل اسی طرح جیسے عصا حضرت موسیٰ کا معجزہ تھا، یا مُردوں کو زندہ کرنا حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ تھا، یا اسی طرح کے اور اخبار" (جوزف ہورووٹس)

" (ابن الندیم کے سوا کسی نے الواقدی کو شیعہ نہیں لکھا۔ وہ کہتا ہے " کان یلزم التقیة" (یہ تقیہ کیے رہتے تھے) مؤلف اعیان الشیعہ (جلد ۴۶ صفحہ ۱۷۱) اور مؤلف " الذریعہ الی تصانیف الشیعة" (جلد ۳ ص ۲۹۳) نے الفہرست ہی کی بنیاد پر اس کا ترجمہ اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے لیکن ابن ابی الحدید جہاں الواقدی کی کوئی روایت درج کرتا ہے اور اس کے بعد کسی شیعی ماخذ کا حوالہ دیتا ہے تو " وفی روایة الشیعة" کے الفاظ سے حد بندی کر دیتا ہے، اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ الواقدی کی روایت کو مسلک شیعہ کی نمائندہ نہیں سمجھتا۔ خود الواقدی نے اپنے مغازی میں ایسی روایات بیان کی ہیں جو کسی شیعہ مؤلف کے قلم سے نہیں نکل سکتیں، خواہ وہ تقیہ کئے ہوئے ہو۔ مثلاً: ابن اسحٰق نے یوم بدر کے مقتولین کی فہرست میں لکھا ہے کہ طعیمہ بن عدی کو حضرت علی نے قتل کیا۔ مگر الواقدی نے اس کی تردید کی ہے اور کہتا ہے کہ طعیمہ کو قتل کرنے والے حمزہ تھے، علی نہیں تھے - اسی طرح یوم

احد میں صُؤاب کو کس نے قتل کیا، اس میں اختلافِ روایات ہے اور مختلف رُواۃ نے تین نام لیے ہیں کوئی کہتا ہے اُس کے قاتل سعد بن ابی وقاص تھے، کوئی حضرت علی کا نام بتاتا ہے، اور کسی کا بیان ہے کہ قزمان نے اُسے ہلاک کیا تھا۔ الواقدی نے تینوں بیانات کا حوالہ دے کر اپنی رائے بھی لکھی ہے کہ قزمان کا قاتل ہونا ثابت ہے۔ الواقدی کی کتاب المغازی، جواب مکمل حالت میں مرتب ہو کر ہمارے سامنے ہے اُس میں اُن صحابیوں کی فہرست ملتی ہے جو یوم اُحد میں بھاگے تھے، اسے الواقدی نے اس طرح شروع کیا ہے "کان ممن تولی فلان والحارث بن حاطب۔۔۔" جو لوگ بھاگے ان میں فلاں اور الحارث بن حاطب وغیرہ تھے۔۔۔۔۔) ابن ابی الحدید نے اس فہرست میں حضرات عمر و عثمان کے نام بھی لکھے ہیں۔ البلاذری نے یہی فہرست الواقدی سے نقل کی ہے تو اُس میں عثمان کا نام ہے۔ عمر کا نہیں ہے (انساب ۱/۳۲۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی مخطوط میں عمر و عثمان دونوں کے نام تھے یا ان میں سے ایک کسی کا نام تھا، مگر اس نسخہ کے ناقل کو اس فہرست میں عمر و عثمان کے نام ناگوار ہوئے اور اُس نے اُن کی جگہ لفظ "فلان" لکھ دیا۔ جن لوگوں نے بنیادی مخطوطہ کے مطابق لکھے ہوئے نسخے دیکھے ہوں گے، انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ الواقدی شیعہ تھا۔ بہر حال الواقدی کے تشیع کو تسلیم کرنے کے لیے صرف ابن الندیم کا قول ناکافی ہے، جب کہ اسی کا معاصر الطوسی اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کرتا۔ دوسرا قیاس اس سے بنا ہوگا کہ الواقدی سے "مقتل الحسن"، "مقتل الحسین" اور "مولد الحسن والحسین" جیسی کتابوں کی تالیف منسوب ہے۔

(نثار احمد فاروقی)

۴۵۶۔ ابن ہشام ۴/۱۶۳ (وستنفیلڈ، ۵۸۹) نیز الواقدی (ولہوزن) ۲۹۳

۴۵۷۔ ابن ہشام ۴/۱۹۰ (وستنفیلڈ ۹۲۱) الواقدی (ولہوزن) ۴۱۶ اور ابن سعد ۲/۱۲۷ کا نوٹ

۴۵۸۔ الفہرست ۹۸ ،

۴۵۹۔ ابن سعد ۲ ق ۲/۵۰ سطر ۱۲ تا ۱۵ اور سطر ۲۴ ۔

۴۶۰۔ ابن سعد ۲ ق ۲/۵۰ سطر ۱۲ تا ۱۵ اور سطر ۲۴ ۔

تحقیق کریمر ۱۴۰۔ الواقدی ایک خبر میں جو ابن سعد (۴/۶) کے یہاں موجود ہے العباس کی گرفتاری کا بیان کرتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو:

NOLDEKE IN THE Z.D.M.G. VOL. 52, P. 21 SEQ.

(یعنی مضمون نولدکہ در مجلۂ جماعۂ مستشرقین جرمنی جلد ۵۲، صفحہ ۲۱ و مابعد

۴۶۱۔ ابن سعد ۳ ق ۱/۲۱ نیز

CAETANI: ANNALI DELL' ISLAM, ANNO 20, PP. 264, 266, 341.

(یعنی کیتانی: حولیات اسلام، سنہ ۲۰ ھ، صفحہ ۲۶۴، ۲۶۶، ۳۴۱۔

۴۶۲۔ IBN SAD: BIOGRAPHIEN MUHAMMADS SEINER GEFAHRTEN UND DER SPAREREN TRAGER DES ISLAMS BIS SUM 230 DER FLUCHT, 19 VOLS. LEIDEN, F. J BRILL, 1904-28

(یعنی ابن سعد: تراجم محمد والصحابہ والتابعین تا سال ۲۳۰ ھ۔ ۱۹ جلدیں۔ ای جے بریل لائیڈن۔ ۱۹۰۴ء تا ۱۹۲۸ء)

۴۶۳۔ LOTH (OTTO): DAS CLASSENBUCH DES IBN SA'D, LEIPZIG, 1869.

یعنی اٹولوث : طبقات ابن سعد، لیپزگ ۱۸۶۹ء)　　۴۶۴ ۔ ابن سعد، ق ۲/ ۹۹

۴۶۵ ۔ ابن سعد ۳/ ۳۱۴ ۔ لکتہ (ابا علقمہ الفزاوی) عمر حتی لقیناہ سنۃ تسع وثمانین ومئۃ بالمدینۃ (کہ ابو علقمۃ الفزاوی زندہ رہا، یہاں تک کہ ہم اس سے ۱۵۸ھ میں مدینے میں ملے تھے)

۴۶۶ ۔ ابن سعد، ق ۲/ ۹۹ ۔ البلاذری فتوح ۳۱۹ میں ہے کہ یہ بنو ہاشم کے مولی تھے ۔　　۴۶۷ ۔ ابن حجر ۲/ ۳۴۲

۴۶۸ ۔ ابن سعد ۵/ ۲۳۱　　۴۶۹ ۔ ابن خلکان ۱/ ۶۴۲　　۴۷۰ ۔ الفہرست (تحقیق فلوجل) ۹۹

۴۷۱ ۔ LOTH (OTTO) : DAS CLASSENBUCH DES IBN SA' DLEIPZIG, 1869 .

(یعنی اوٹو لوتھ : طبقات ابن سعد صفحہ ۲۵ ومابعد)

۴۷۲ NOLDEKE-SCHWALLY : GESCHICHTE DES QORANS' VOL. II, P. 135.

۴۷۳ (یعنی نولدکہ شوالی : تاریخ القرآن ۔ ۲، ص ۱۳۵)

۴۷۴ ۔ ابن سعد ق ۱/ ۲۱ ۔ ۲۲

۴۷۵ ۔ ابن سعد ۲ ق ۱/ ۱

دیکھو زخاؤ : مقدمہ ابن سعد، جلد سوم صفحہ (XXVII)

ہورو وتس : مقدمہ ابن سعد، جلد سوم ق ۲ صفحہ (V) ومابعد

SACHAU : STUDIEN P. 32 SEQ

(یعنی زخاؤ : دراسات ۳۲ ومابعد

DE GOEJE : Z.D.M.G VOL. 57, P. 379.

یعنی مضمون دی غویہ در مجلہ مستشرقین جرمنی جلد ۵۷ صفحہ ۳۷۹

RECKENDORF. IN ORIENTALISTISCHE LITERATRZEITUNG, 1923. P. 352.

۴۷۶ ۔ یعنی رانمدورف در صحیفۂ آداب شرقیہ ۱۹۲۳ء، صفحہ ۳۵۱

Z. D. M. G. VOL. 23, P. 593 SEQ.

۴۷۷ ۔ یعنی مجلہ جماعت مستشرقین جرمنی، جلد ۲۳، صفحہ ۵۹۳ ومابعد

یہ السیرۃ الحلبیۃ کے مؤلف علی بن برہان الدین الحلبی ہیں ۔ (حسین نو...)

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ